اِقبال

دَورِ عروج

۱۹۲۳ء سے ۱۹۳۰ء تک

خرم علی شفیق

اقبال اکادمی پاکستان

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اُس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے طاق میں چراغ ہو، چراغ شیشے کی قندیل میں ہے، قندیل گویا کہ موتی کی طرح چمکتا ہوا ستارا ہے، زیتون کے ایک مبارک درخت سے روشن جو نہ مشرق سے ہے اور نہ مغرب سے، جس کا تیل بغیر آگ دکھائے ہی چمک اُٹھے۔ نُور پر نُور! اللہ اپنے نُور کی طرف ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے اور اِنسانیت کے لیے مثالیں پیش کرتا ہے، اور اللہ ہر چیز کا جاننے والا ہے۔

قرآن، سورہ ۲۴، آیت ۳۵

صدیوں سے مشرق کے دل و دماغ اس سوال میں اُلجھے چلے آرہے ہیں کہ کیا خدا وجود رکھتا ہے؟ میں ایک نیا سوال اُٹھانا چاہتا ہوں ـــ یعنی مشرق کے لیے نیا۔ کیا انسان وجود رکھتا ہے؟

اقبال، جون ۱۹۲۵ء

پہلی بات

علامہ اقبال کی سوانح کا پیش لفظ لکھنے کے لیے میں سینٹ جیمز س پیلس کے پیچھے باغ میں آ گیا ہوں۔ اس کتاب کا آغاز بھی سینٹ جیمز س پیلس سے ہوتا ہے جیسا کہ پہلے باب کے شروع میں معلوم ہو گا۔ یہیں گول میز کانفرنس بھی ہوئی جس کا ذکر کتاب کے آخری باب میں ہے۔ میرا خیال تھا کہ یہاں آ کر پورا پیش لفظ نہیں تو کم سے کم پہلا پیراگراف لکھنے کے لیے مواد مل جائے گا۔ مل گیا۔

اب مسئلہ بقیہ پیراگرافوں کا ہے۔ اپنی ہر کتاب کا پیش لفظ لکھتے ہوئے مجھے ابن صفی کی یہ بات یاد آتی ہے کہ کتاب لکھنے سے زیادہ پیش لفظ لکھنا مشکل ہوتا ہے۔ کتاب اس لیے لکھی جاتی ہے کہ مصنف کے پاس کہنے کی کوئی بات ہوتی ہے۔ وہ بات کتاب میں لکھ دی جاتی ہے۔ اس لیے سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر پیش لفظ میں کیا لکھا جائے؟

فی الحال یہی سمجھ میں آتا ہے کہ ایک بات کی وضاحت کر دوں جو مجھے اِس سیریز کی پچھلی کتابوں کے حوالے سے سننا پڑی ہے۔ گزارش ہے کہ اِس سیریز کی ہر کتاب اپنی جگہ مکمل ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ کسی کی پوری زندگی کے حالات بیان ہوں تب ہی سوانح کہلائے۔ سوانح کسی کی زندگی کے ایک دور بلکہ صرف ایک واقعے پر مبنی بھی ہو سکتی ہے۔ امریکی صدر کینیڈی کے قتل کے بارے میں کتابیں لکھی گئی ہیں جو سوانح کہلاتی ہیں۔ یہ کتاب بھی علامہ کی زندگی کے ایک مخصوص دَور کی مکمل سوانح ہے۔

مجھے اس سے پہلے کوئی کتاب مکمل کرنے کی اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی اس دفعہ ہو رہی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اِس دفعہ موقع ملا ہے کہ تصوّرِ پاکستان سے متعلق بہت سے تاریخی حقائق پیش کروں جن کی تفصیلات شاید پہلے کبھی اس طرح سامنے نہیں آئی تھیں۔ ان میں سے بعض چیزیں ایسی ہیں جن کا ابھی تک ہماری تاریخ میں سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں کیا گیا تھا۔ بعض چیزوں کا ذکر موجود ہے لیکن

اتنا سرسری کہ اس سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہوتا۔ بعض کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور تاریخی دستاویزات بھی جمع کر کے شائع کی جا چکی ہیں لیکن انہیں مکمل باقاعدگی کے ساتھ ترتیب دینے کا کام باقی تھا جس کی میں نے یہاں کوشش کی ہے۔ اس کی ایک مثال مسلم لیگ کا جلسہ الٰہ آباد ہے۔

قدم قدم پر مجھے محسوس ہوا کہ اپنی تاریخ کے اہم ترین واقعات کے بارے میں لکھتے ہوئے ہمارے یہاں عام طور پر یہی طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ جہاں معلومات میسر نہ ہوں یا اُلجھاوے ہوں، وہاں نشاندہی کرنے کی بجائے ایک مبہم اندازِ بیان اختیار کر کے دامن چُھڑایا جائے۔ جو قوم اپنی تاریخ سے اس حد تک بے پرواہو کہ حقائق کی صحیح تدوین اور تصدیق پر توجہ نہ دے مگر نظریاتی بحثوں میں زمین آسمان ایک کر کے رکھ دے، جن کی بنیاد محض مفروضوں اور سُنی سنائی باتوں پر ہو، وہ کس طرح اپنی آزادی برقرار رکھ سکتی ہے؟ میرے پاس اِس سوال کا کوئی جواب نہیں ہے، سوائے اس کے کہ اس خرابی کو دُور کرنے کے لیے جو کچھ مجھ سے ہو سکے وہ کر دوں:

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ و خِشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

اس لیے یہ کتاب حاضر ہے۔ اِسے لکھنے میں جن دوستوں نے مدد کی ہے، اُن کا شکریہ، سوائے اختر وسیم ڈار، عامر اقبال ارائیں، امجد سلیم علوی اور حامد محمود کے۔ ان کے شکریے کے لیے میرے پاس کافی الفاظ نہیں ہیں۔

خرم علی شفیق

لندن، ۱۸ر جولائی ۲۰۱۷ء

فہرست

ہر اِک مقام سے آگے گزر گیا مہِ نَو

باب ۱ کائنات کی سرحد

باب ۲ نیا مشرق

باب ۳ قافلے کا راستہ

باب ۴ ادب کی درس گاہ

باب ۵ پراَسرار باغ

باب ۶ قصرِ حکومت

باب ۷ شہید کی قبر

باب ۸ شیطانی طلسم

باب ۹ خدا کا شہر

ضمیمہ

ماخذ

باب ۱

کائنات کی سرحد

جنوری سے اپریل ۱۹۲۳ء

1

یکم جنوری ۱۹۲۳ء کو پیر کا دن تھا۔ لندن کے سینٹ جیمز س پیلس سے نئے سال کی خوشی میں خطابات کا اعلان ہوا۔ جن ہندوستانیوں کو "سر" کا خطاب ملا اُن میں ڈاکٹر شیخ محمد اقبال اور ڈاکٹر تیج بہادر سپرو نمایاں تھے۔[1] ہندوستان میں وائسرائے کی طرف سے اقبال کے استاد مولوی میر حسن کو شمس العلما کا خطاب ملا۔ روایت ہے کہ اقبال ہی نے تجویز کیا تھا۔[2]

ہندوستان کے شہر گیا(Gaya) میں اُس روز آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی میٹنگ تھی۔ سالانہ اجلاس کل ختم ہوا تھا۔ چت رنجن داس صدر تھے۔ سی آر داس(C. R. Das) کہلاتے تھے۔ لقب "دیش بندھو" یعنی محب وطن تھا۔ چاہتے تھے کہ انتخابات میں حصہ لیا جائے۔ عدم تعاون اسمبلی کے اندر سے ہو۔ اجلاس میں تجویز مسترد ہوئی تھی۔ میٹنگ میں کانگریس کی صدارت سے استعفا دیا۔ رکنیت رکھی۔ نئی جماعت بنائی۔ "کانگریس خلافت سوراجیہ پارٹی" نام تھا۔ کانگریس کے منشور سے متفق تھی۔ لیکن انتخاب میں حصہ لیتی۔ ارکان میں حکیم اجمل خاں، پنڈت موتی لال نہرو، وی جے پٹیل، کے این سی کیلکر، ایم وی ابیانکر، ڈاکٹر مونجے، روچی رام ساہانی، اے رنگاسوامی آینگر، ستیامورتھی اور جیکر نمایاں تھے۔[3]

---

[1] Anonymous (1923) 'No. *32782', The London Gazette (Supplement), 29 December 1922,* pp.2, 4

[2] خرم علی شفیق (۲۰۱۲) اقبال: درمیانی دور، ص۷۷۴-۷۷۵

[3] Mitra: *The Indian Annual Register 1923, Vol. 1,* pp.801-870(o)

2

انگریزی میں "ڈاکٹر سر محمد اقبال" لکھا جانے لگا۔ قاعدے کے مطابق سر کے خطاب کے ساتھ نام کا پہلا حصہ بولا جاتا تھا۔ اس لیے "سر محمد" بھی کہلاتے تھے۔ اُردو میں اُن کے لیے علامہ کا لقب شاید چھ سات برس پہلے استعمال ہوا تھا۔ اب زیادہ ہونے لگا: "علامہ اقبال"۔[1]

۳۴؍ میکلوڈ روڈ پر کوٹھی تھی۔[2] گزشتہ برس کے اواخر میں کرایے پر لی تھی۔ پہلی بیوی کریم بی بی علیحدگی کے بعد سے اپنے والدین کے ساتھ تھیں۔ لڑکا آفتاب انہی کے پاس تھا۔ باقی دونوں بیگمات سردار اور مختار علامہ کے ساتھ رہتی تھیں۔ بھتیجیاں عنایت اور وسیمہ بھی پرورش پا رہی تھیں۔ کھانا گھر کی خواتین ہی پکاتیں۔ موچی دروازے کی کشمیری خاتون رحمت بی سردار بیگم کی شادی کے وقت ساتھ آئی تھیں۔ غالباً بیٹی کی شادی کر چکی تھیں۔ اَدھیڑ عمر تھیں۔ کھانا پکانے میں مدد کرتی تھیں۔ "اماں وڈی" (بڑی اماں) کہلاتیں۔[3] روایت ہے کہ علامہ نے ضیافت کی۔ سب نے کھانے کی تعریف کی مگر سمجھا کہ کسی ماہر باورچی کی خدمات حاصل کی گئیں۔ کچھ عرصہ بعد قریبی دوست نواب سر ذوالفقار علی خاں نے تقریب کا اہتمام کرتے ہوئے علامہ سے دریافت کیا۔ علامہ نے کہا کہ کھانا اُن کی بیگم ہی پکاتی ہیں۔ گھر میں سردار بیگم کو یہ واقعہ سناتے ہوئے کسی کا مصرع پڑھا، "کہتی ہے تجھ کو خلقِ خدا غائبانہ کیا"۔[4]

منشی طاہر الدین علامہ کے معاون تھے۔ دلروز مرہم ایجاد کر کے بازار میں متعارف بھی کروایا تھا۔ روایت ہے کہ مولانا گرامی کا برسوں پرانا ناسور درست کر دیا۔ انہوں نے مصرع کہا، "اطہر کرد م طاہر از ناسور"۔ علامہ نے دوسرا مصرع کہہ کر شعر مکمل کیا، "عرقش بہ زمرہمِ کافور"۔[5]

---

[1] اقبال کے لیے علامہ کا لقب ظفر علی خاں نے ستمبر ۱۹۱۷ء میں ستارۂ صبح میں اور تاجور نجیب آبادی نے ستمبر ۱۹۱۸ء میں مخزن میں استعمال کیا؛ خرم علی شفیق (۲۰۱۲) اقبال: درمیانی دور۔ ص۴۱۱، ۳۳۲۔

[2] اب اس کوٹھی کا نمبر ۱۱۶؍ میکلوڈ روڈ ہے۔ اقبال اکادمی پاکستان کا سیلز آفس یہیں ہے۔

[3] ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۴) زندہ رود، ص ۳۶۳

[4] خالد نظیر صوفی، اقبال درونِ خانہ، ص ۷۱۔ مصنف نے اپنی والدہ وسیمہ مبارک سے روایت کیا۔

[5] ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی (۱۹۷۶)، خطوط اقبال، ص ۲۰۳

علامہ کے نوجوان ملاقاتی خلیفہ عبدالحکیم کا بیان ہے، ''غالباً زیادہ تر ہائی کورٹ کی اپیلوں کے کچھ مقدمے لیتے تھے۔ زراندوزی کی ہوس نہیں تھی۔ بس اپنے اخراجات ہی پورے کرنے کی حد تک پریکٹس کرتے تھے۔ مجھ سے ایک روز فرمانے لگے کہ کوئی آٹھ سو روپیہ ماہوار تک کا وکالت کا کام کر لیتا ہوں۔''[1] پچھلے برس انکم ٹیکس گوشوارے میں سالانہ آمدنی ۱۰۰۸۴/ روپے لکھی تھی۔[2]

نوجوان دوست چودھری محمد حسین نے علامہ کی تصانیف کی ترتیب و اشاعت کا کام سنبھالا تھا۔ ظرافت اور خوش طبعی علامہ جیسی تھی۔ زبردست انتظامی صلاحیت پائی تھی۔ علامہ کے مفادات کی حد تک کاروباری رویہ بھی رکھتے تھے۔ ان کے دوست نواب سر ذوالفقار علی خاں کے بچوں کے اتالیق تھے۔[3] قلعہ گوجر سنگھ ہی کے علاقے میں احاطہ محمد سعید میں رہتے تھے۔[4] قریباً ہر روز آتے تھے۔

علامہ کی نظمیں پہلے بھی کتابچوں کی صورت میں شائع ہوا کرتی تھیں۔ اب اُن کی اشاعت بھی محمد حسین کے زیرِ اہتمام ہو رہی تھی۔ اخبارات میں اشتہار شائع ہوتے۔ عموماً منشی طاہر الدین کا پتہ ''انارکلی لاہور'' درج کیا جاتا۔ قیمت کے لیے آنہ کی علامت ظاہر کی جاتی: ۔/[5]

علامہ ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے

کی تازہ نظم ''خضرِ راہ''

اس کے علاوہ مکمل ''ترانہ'' ۲/، ''شکوہ'' ۲/، ''جوابِ شکوہ'' ۴/، ''فریاد امت'' ۲/، ''نالۂ یتیم'' ۲/، ''اکبری اقبال'' ۳/۔ طاہر دین: انارکلی لاہور سے طلب کیجیے۔

---

[1] خلیفہ عبدالحکیم (۱۹۳۲)، 'اقبال'۔ خالد نظیر صوفی نے اقبال درونِ خانہ، ص۴۶ پر اپنی والدہ وسیمہ بیگم کے حوالے سے لکھا ہے کہ علامہ نے کسی کا مقدمہ لینے سے اس لیے انکار کیا کہ مقدمہ کمزور تھا۔ فیس حرام سمجھی۔

[2] صفدر محمود (۱۹۷۳) 'علامہ اقبال کا گوشوارۂ آمدنی (انکم ٹیکس ریکارڈ کی روشنی میں)'

[3] ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۳) مئے لالہ فام، ص۳۲۵-۳۱۱

[4] چٹان یکم مئی ۱۹۶۷ء میں سید ظفر ہاشمی کی تحریر؛ شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص۳۱۴

[5] کئی مثالیں اپنی جگہ پر پیش کی جا رہی ہیں۔

یہ اشتہار زمیندار میں ۶/ جنوری کو شائع ہوا۔ ۱۱، ۱۳، ۱۵، ۱۹، ۲۱ تاریخ کو دوبارہ شائع کروایا گیا۔[1]

"ایک روز کا واقعہ یاد آتا ہے،" میاں بشیر احمد کا بیان ہے، "چیف کورٹ کے سامنے سڑک پر میں ڈاکٹر صاحب [علامہ اقبال] سے باتیں کرنے لگا۔ دورانِ گفتگو میں نے دورِ حاضر کی اشتہاریت کی شکایت اور مذمت کی۔ فرمانے لگے خدا کی طرف دیکھو، وہ سب سے بڑا پراپیگنڈا کرنے والا ہے۔ یہ کائنات ساری کی ساری اُس کا پراپیگنڈا نہیں تو اور کیا ہے۔ ہزاروں لاکھوں بے شمار مظاہرے ہیں۔ پھر مسکرا کر کہا تم پراپیگنڈا کو اتنا برا نہ سمجھا کرو۔"[2] جو لوگ کتاب پڑھ نہیں سکتے انہیں خریداری کی ترغیب نہیں دیتے تھے۔ "ایک قسم کی ناانصافی" سمجھتے تھے۔[3]

باقاعدہ ملاقاتیوں میں غلام رسول مہر بھی تھے۔ نوجوان صحافی تھے۔ زمیندار میں ملازمت کرتے تھے۔ دل محمد روڈ پر رہتے تھے۔ "میں اپنے مکان سے پانچ سات منٹ میں حضرت علامہ تک پہنچ جاتا،" مہر کا بیان ہے، "رات کو میں اور چودھری محمد حسین ایک دو گھنٹے ضرور حاضرِ خدمت ہوتے۔"[4] مہر کے مطابق یہ نشستیں دو سے گیارہ گھنٹوں پر محیط رہیں۔ اُن کا کہنا ہے:

> میں نے اُنہیں کبھی بدمزاج نہ پایا؛ البتہ بعض مقامات اور معاملات میں اُن کے چہرے پر تکدر اور ملال کا عکس پڑنے لگتا ... مذہب کی رُوح سے ناآشنا نوجوان اُلٹے سیدھے سوال لے کر آتے، اُن سے بحث کرتے، لیکن وہ ہر بات ٹھنڈے دل و دماغ سے سنتے اور جواب دیتے ... اکثر نوجوان رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا نام احترام سے نہ لیتے۔ اُنہیں دُکھ ہوتا لیکن اس کے باوجود اُن کی باتوں میں تلخی نہ آتی۔ وہ اسے نوجوانوں کی کم فہمی اور بیماری سمجھتے تھے، اور کہا کرتے، "اِس کا علاج ہونا چاہیے۔" وہ انہیں نرمی سے سمجھانے اور اصلاح کرنے کی کوشش کرتے، لیکن اِس انداز سے کہ سننے والے کو گمان

---

[1] اختر النسا (۲۰۱۰) اقبال اور زمیندار، ص ۹۴

[2] میاں بشیر احمد، 'اقبال کی یاد میں'، ص ۵۰

[3] مکتوب بنام نیاز الدین خاں ۲۵/ جون ۱۹۲۳ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیب اقبال، جلد دوم، ص ۴۸۵

[4] اُردو ڈائجسٹ اپریل ۱۹۶۴ء میں غلام رسول مہر کی یادداشت؛ شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۳۴۷

نہ ہو، بلکہ باتیں اُس کے دل و دماغ میں اُترتی جائیں اور جب رخصت ہو تو لاشعوری طور پر متاثر ہو چکا ہو۔[1]

3

۴؍ جنوری کو کالج کے زمانے کے دوست میر غلام بھیک نیرنگ کا خط ملا۔ اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ خطاب ملنے کے بعد علامہ سچ کہنے سے معذور نہ ہو جائیں۔ علامہ نے فوراً لکھا:

> میں آپ کو اِس اعزاز کی خود اطلاع دیتا مگر جس دُنیا کے میں اور آپ رہنے والے ہیں‘ اُس دنیا میں اِس قسم کے واقعات احساس سے فروتر ہیں۔ سینکڑوں خطوط اور تار آئے اور آرہے ہیں‘ اور مجھے تعجب ہو رہا ہے کہ لوگ ان چیزوں کو کیوں گراں قدر جانتے ہیں۔ باقی رہا وہ خطرہ جس کا آپ کے قلب کو احساس ہوا ہے، سو قسم ہے خدائے ذوالجلال کی جس کے قبضہ میں میری جان و آبرو ہے‘ اور قسم ہے اُس بزرگ و برتر وجود کی جس کی وجہ سے مجھے خدا پر ایمان نصیب ہوا اور مسلمان کہلاتا ہوں، دنیا کی کوئی قوت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی۔ انشأ اللہ[2]

سر ہو گئے اقبال

از عبدالمجید سالکؔ

لو۔ مدرسۂ علم ہوا قصرِ حکومت	افسوس کہ ”علّامہ“ سے ”سر“ ہو گئے اقبال
پہلے تو مسلمانوں کے سر ہوتے تھے اکثر	تنگ آ کے اب انگریزوں کے سر ہو گئے اقبال
پہلے تو سرِ ملّتِ بیضا کے وہ تھے تاج	اب اور سنو۔ ”تاج“ کے سر ہو گئے اقبال
کہتا تھا یہ کل ٹھنڈی سڑک پر کوئی گستاخ	سرکار کی دہلیز پہ سر ہو گئے اقبال

[1] اُردو ڈائجسٹ اپریل ۱۹۶۶ء میں مہر کا انٹرویو؛ شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۳۵۰

[2] برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۱۶-۴۱۷

-

کیا کہنے ہیں اِس شیوۂ تسلیم و رضا کے — سرکار ہوئی تیغ تو سر ہو گئے اقبال
سر ہو گیا ترکوں کی شجاعت سے سمرنا — سرکار کی تدبیر سے سر ہو گئے اقبال

-

سودائے غمِ عشق سے سالک تو ہوا قید — اور خوبیٔ قسمت ہے کہ "سر" ہو گئے اقبال

زمیندار (لاہور)، ۶/ جنوری ۱۹۲۳ء[1]

نوجوان سالک نے اپنے دوست غلام رسول مہر کے ساتھ مولانا ظفر علی خاں کی عدم موجودگی میں زمیندار کی ادارت سنبھال رکھی تھی۔ علامہ کے پاس اُٹھنے بیٹھنے والوں میں رہے تھے۔ تحریک عدم تعاون کے سلسلے میں جیل کاٹی تھی۔ اس لیے یہ اشعار لکھ بیٹھے۔ شائع کر دیئے۔[2] علامہ کے قریبی دوست مولوی الف دین نفیس نے ایک قطعے میں طنز کیا۔ 'خضرِ راہ' کے شعر کو علامہ پر منطبق کر دیا:

جادوئے محمود کی تاثیر سے چشمِ ایاز — دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں سازِ دلبری[3]

دیانرائن نگم اب بھی کانپور سے زمانہ نکال رہے تھے۔ ابتدائی زمانے میں علامہ کی نظمیں اس میں شائع ہوئی تھیں۔ جنوری ۱۹۲۳ء کے شمارے میں "علمی خبریں اور نوٹ" کے تحت درج ہوا:

> ڈاکٹر شیخ محمد اقبال صاحب بیرسٹر ایٹ لا لاہور کو اس سال گورنمنٹ نے سر کا خطاب عطا فرمایا ہے۔ علامہ اقبال اپنی عالمگیر شہرت کی وجہ سے محتاجِ تعارف نہیں۔ آپ کے علمی و ادبی کارنامے ہندوستان کے علاوہ یورپ و امریکہ میں بھی عزت کی نظر سے دیکھے

---

[1] زمیندار ۶/ جنوری ۱۹۲۳ء۔ تراشہ مجد سلیم علوی کے فائل سے حاصل کیا گیا۔ مرزا جلال الدین نے کہا ہے کہ علامہ کے خطاب پانے کے خلاف "زمیندار میں مولانا ظفر علی خاں نے ایک نظم بھی چھاپ ماری"؛ 'میرا اقبال'، ص ۱۰۹۔ زمیندار میں اِس موقع پر یہی نظم شائع ہوئی۔ اسے سالک نے لکھا تھا۔

[2] عبدالمجید سالک (۱۹۸۳) ذکرِ اقبال، ص ۱۱۷

[3] پروفیسر اختر راہی (۱۹۹۱-۱۹۹۰) 'علامہ اقبال اور مولوی الف دین نفیس'، ص ۲۶۷

جاتے ہیں۔ شکوہ، ترانہ، شمع وشاعر وغیرہ وغیرہ آپ کی بے مثل نظمیں ہیں مگر یہ قصہ ہے جب کا کہ آتش جوان تھا یعنی اُس وقت آپ علامہ اقبال یا ترجمانِ حقیقت اقبال کے نام سے مشہور تھے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ سر کے خطاب کے بعد آپ کے علمی وادبی شغف کا کیا رنگ ہوتا ہے۔ بہرحال ہم علامہ اقبال کی خدمت میں مخلصانہ مبارکباد پیش کرتے ہیں۔ ہمارے ایک دوست نے خوشی میں ایک شعر کہا ہے:

پہلے تھے علامہ اقبال اب سر ہو گئے　　　قومیت پر آگئی غالب حکومت کی ادا[1]

"ڈاکٹر صاحب [علامہ اقبال] کو اپنے دوستوں کے اِس طرزِ عمل پر نہ حیرت تھی نہ افسوس،" قریبی دوست کے لڑکے فقیر سید وحید الدین کا بیان ہے، "وہ یہ مضامین اور اشعار سن کے مسکراتے اور کبھی کبھی تو ان اشعار کو پڑھوا کر سنتے اور داد دیتے۔"[2]

نوجوان مولانا عبدالماجد دریابادی ندوۃ العلمأ کے رسالے المعارف کے لیے 'اسرارِ خودی' پر تبصرہ لکھ رہے تھے۔ خطاب قبول کرنے پر حوصلہ افزا خط بھیجا۔ علامہ نے ۶/ جنوری کو جواب دیا:

> حالات مختلف ہوتے تو میرا طریقِ عمل بھی اس بارے میں مختلف ہوتا۔ لیکن یہ بات دُنیا کو عنقریب معلوم ہو جائے گی کہ اقبال کلمۂ حق کہنے سے باز نہیں رہ سکتا۔ ہاں کھلی کھلی جنگ اس کی فطرت کے خلاف ہے۔
>
> اسرارِ خودی کا ریویو دیکھنے کا منتظر ہوں۔ سی، آر، داس کا خطبۂ صدارت کانگریس آپ نے دیکھا ہو گا۔ اُس نے اسی رُوحانی اصول کو سیاسی رنگ میں پیش کیا ہے۔ امید کہ مزاج بخیر ہو گا۔[3]

داس نے کہا کہ سوراج یعنی اقتدارِ اعلیٰ (sovereignty) کی بنیاد صرف ایسی حکومت ہے جو عوام کے

---

[1] زمانہ جنوری ۱۹۲۳ء ص ۶۹ پر دیا نرائن نگم کا نوٹ؛ شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۴۳۰

[2] فقیر سید وحید الدین (۱۹۸۸)، روزگارِ فقیر جلد اول، ص ۴۱

[3] برنی (1991) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۱۸

لیے اور عوام کے ذریعے (for the people and by the people) ہو۔ جمہوریت کی موجودہ صورت یہ نہیں ہے۔ امریکی مصنفہ میری پارکر فولیٹ (Mary Parker Follett) کی تصنیف نئی ریاست *(The New State)* کا حوالہ دیا۔ وہی خیالات داس بھی ۱۹۰۷ء سے پیش کرتے آرہے تھے۔ خدا کی لیلا اپنے بیرونی پہلو کو تاریخ کی صورت میں ظاہر کرتی ہے۔ فرد، معاشرہ، قوم اور انسانیت اُسی کے مظاہر ہیں۔ حکومتی ڈھانچے کے لیے پانچ بنیادی نکات پیش کیے:

۱ مقامی مراکز کی تشکیل کم و بیش ہندوستان کے قدیم دیہی نظام کی طرز پر

۲ ان دیہی مراکز کے ارتباط کے ذریعے زیادہ بڑے گروہوں کی نشوونما

۳ متحد کرنے والی ریاست اس نچلی سطح کی نشوونما کا نتیجہ ہو

۴ مابقی اختیارات (residuary power of control) مرکزی حکومت کے پاس ہوں لیکن صرف خاص حالات میں استعمال ہوں۔ مناسب تحفظات اس بات کو یقینی بنائیں۔

۵ مقصد یہ ہے کہ مقامی مراکز کی عملی خوداختیاری (practical autonomy) برقرار رکھی جائے اور مرکزی حکومت کی نشوونما اس طرح ہو کہ متحد کرنے والی ریاست بن جائے۔[1]

سرجوگندر سنگھ رسالہ ایسٹ اینڈ ویسٹ کے مدیر تھے۔ 'اسرارِ خودی' کا موازنہ بھگوت گیتا کے ساتھ کرنے لگے۔ انگریزی میں لکھنے کا ارادہ تھا۔[2]

"ایک روز میں نے بعض سیاسی لیڈروں کا ذکر کیا،" میاں بشیر احمد کا بیان ہے۔ "[علامہ اقبال] جوش میں آکر فرمانے لگے کہ یہ لوگ سب خود غرض ہیں اور ایثار نہیں کرسکتے۔ لیڈر امیروں کی جماعت میں موجود ہیں ہی نہیں۔ مسلمانوں کے لیڈر عوام میں سے پیدا ہوں گے۔ تم دیکھ لینا ایسا ہو کر رہے گا۔ پھر وہ لوگ رہنمائی کرسکیں گے۔"[3]

---

[1] مزید تفصیل کے لیے دیکھیے انگریزی میں: C. R. Das (1922), *Freedom Through Disobedience* اور Marry Parker Follett (1918), *The New State*

[2] مکتوب بنام عبدالماجد دریاآبادی، اپریل ۱۹۲۳ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۴۳، ۴۴۴

[3] میاں بشیر احمد، 'اقبال کی یاد میں'، ص ۵۴

4

۷/ جنوری کو انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کا اجلاس ہوا۔ مولوی فضل الدین نے صدارت کی۔ علامہ کی علمی صلاحیتوں کی تعریف اور سر کا خطاب ملنے پر مبارکباد کی قرارداد منظور ہوئی۔ [1]

اُس روز علامہ نے مولانا گرامی کو خطاب کے حوالے سے وہی لکھا جو نیرنگ کو لکھا تھا، ”جس دنیا کے میں اور آپ رہنے والے ہیں، وہاں اس قسم کے واقعات احساسِ انسانی سے بہت نیچے ہیں۔“[2]

حیدرآباد سے سابق وزیرِاعظم مہاراجہ کشن پرشاد کا خط موصول ہوا، ”خار جاً سنا گیا ہے کہ یکم جنوری ۲۳ء کو آپ کو سر کا خطاب برٹش گورنمنٹ سے عطا فرمایا گیا ہے۔ فقیر شاد یہ سن کر بیحد خوش ہوا اور دلی خوشی کے ساتھ آپ کو مبارکباد دیتا ہے۔ آپ اس کی تصدیق اپنے قلم سے کیجیے۔“

جن پانچ بیٹیوں کی شادیاں کر چکے تھے اُن کے شوہروں کے کوائف بھی بھیجے۔ دس باقی تھیں۔ سب سے چھوٹی دو برس کی تھی۔ کچھ ہندو تھیں۔ کچھ مسلمان تھیں۔ دو کے متعلق نظام کا خیال تھا کہ اپنے لڑکوں سے منسوب کریں۔ تین کے لیے رشتہ چاہیے تھا۔[3] علامہ کی نظر میں تھا۔ مزید معلومات جمع کرنے لگے۔ نئے سال کا کارڈ بھی ملا۔ شاد اور اُن کے لڑکوں کی تصویریں چھپی ہوئی تھیں۔ [4]

۸/ جنوری کے زمیندار میں عبدالمجید سالک نے اپنے نثری کالم 'افکار و حوادث' میں لکھا، ”میاں محمد شفیع بالقابہ کو سر کا خطاب ملا تو کسی قومی اخبار نے ایک لفظ تک نہ لکھا“ کیونکہ انہیں قوم اپنا نہیں سمجھتی۔ ”حضرت علامہ اقبال کے سر ہو جانے پر تمام دُنیائے ادب و سیاست میں تہلکہ مچ رہا ہے“ کیونکہ ”'ہمارا اقبال، قوم کی آنکھوں کا تارا اقبال' اگر ہم سے چھن جائے اور حکومت ایک دو حرفی لفظ دکھا کر اسے موہ لے تو یقیناً ماتم کا مقام ہے۔“[5]

---

[1] انجمن کی قلمی روداد؛ محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶)، اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص۱۷۸

[2] برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص۴۱۹-۴۲۰

[3] محمد عبداللہ قریشی (۱۹۸۶) اقبال بنام شاد، ص۳۶۰-۳۵۷

[4] مکتوب بنام شاد ۲۴/ جنوری ۱۹۲۳ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص۴۲۰، ۴۲۱

[5] اختر النساء (۲۰۱۰) اقبال اور زمیندار، ص۲۶۸

یہ سب کی رائے نہ تھی۔ گجرات میں مولوی محمد سلام اللہ شائق جید عالمِ دین اور شاعر تھے۔ خطاب ملنے کی ہجری تاریخ ۱۳۴۱ھ، ''خطابِ عزت و اقبال عالی'' سے نکالی۔ قطعہ لکھ کر علامہ کو پیش کیا۔[1] قاضی محمد اسلم گورنمنٹ کالج لاہور میں ایم اے فلسفہ کے طالب علم تھے۔ اُن کا بیان ہے، ''مسلمانوں کو ہندوؤں کی طرف سے سننا پڑتا تھا کہ مسلمان ہر چیز میں پسماندہ ہیں، ذہانت میں، تجارت میں، ہنر میں، ملازمتوں میں، علیٰ ہذا القیاس... یہ بڑی اچھی خبر تھی کہ اقبال کو نائٹ ہڈ کے اعزاز کے لیے منتخب کیا گیا ہے... اقبال سیاست یا کسی دوسرے ایسے شعبے سے تعلق نہیں رکھتے تھے جہاں انگریز انہیں اعزاز دینے سے کوئی استعماری مقصد حاصل کر لیتے۔''[2]

ایک سہ پہر قاضی اسلم علامہ کی کوٹھی پر پہنچے۔ ہندو، مسلمان اور سکھ طلبہ ساتھ تھے۔ کالج کی بزمِ فلسفہ ''بریٹ سوسائٹی'' کی طرف سے تقریب کی اجازت لینی تھی۔ علامہ برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ طلبہ نے صدر شعبہ فلسفہ پروفیسر چیٹرجی کا خط پیش کیا۔ علامہ نے رسمی سوالات کر کے دعوت قبول کر لی۔ طے پایا کہ ۲۳ / جنوری کو طلبہ آ کر ساتھ لے جائیں گے۔

علامہ نے سوالات پوچھے۔ ''ہم جواب میں کچھ زیادہ نہ کہہ سکتے تھے،'' قاضی اسلم کا بیان ہے، ''لیکن یوں لگتا تھا جیسے وہ ہماری بات کو سنجیدگی سے لے رہے ہیں اور ہم سے برابری کی سطح پر بات کر رہے ہیں۔ صاف دیکھا جا سکتا تھا کہ ایک بہت بڑا موضوع اُن کے ذہن میں ہے، جس کا اظہار کچھ اُسی نشست میں کر دیا اور کچھ تقریب کے دوران۔'' موضوع آئن سٹائن کا نظریۂ اضافیت تھا۔[3]

5

مرزا جلال الدین علامہ کے پرانے دوستوں میں سے تھے۔ وہ کہتے ہیں، ''ہم نے کئی مرتبہ ڈاکٹر صاحب [علامہ اقبال] کو مشورہ دیا کہ وہ کبھی کبھی کھانے پر حکام کو اپنے ہاں مدعو کر لیا کریں۔ انگریز کو رام کرنے

---

[1] صحیفہ اقبال نمبر میں احمد حسین قریشی قلعداری کا مضمون؛ شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۱۰۹

[2] Qazi Muhammad Aslam (1970), 'Iqbal at a College Reception in Lahore'

[3] ایضاً

کا بہترین طریقہ اکل و شرب کی دعوت ہے... مگر ڈاکٹر صاحب... یہی جواب دیتے کہ وہ ایسی تقریبات پر روپیہ ضائع کرنا پسند نہیں کرتے کیونکہ اول تو انگریز کو رام کرنے کا سوال ہی اُن کی دلچسپیوں کے دائرے سے باہر تھا، دوسرے اگر کھانا کھانے کے بعد بھی انگریز رام نہ ہوا تو اس دردِ سر کا فائدہ؟"[1]

۱۷ر جنوری کو شام ۴ر بجے شاہدرہ میں شہنشاہ جہانگیر کے مقبرے کے احاطے میں گارڈن پارٹی ہوئی۔ علامہ کو سر کا خطاب ملنے کی خوشی میں تھی۔ دعوت نامہ جاری کرنے والوں میں گورنر پنجاب کی انتظامیہ کونسل کے ممبر سر جان مینارڈ، میاں فضل حسین وزیر تعلیم، لالہ ہر کشن لعل وزیر صنعت و حرفت، نواب سر ذوالفقار علی خان، نواب سر فتح علی خان قزلباش، چوہدری شہاب الدین اور میاں احمد یار خان دولتانہ شامل تھے۔ گورنر پنجاب سر ایڈورڈ میکلیگن دعوت کے صدر تھے۔ یورپین لیڈیوں کے علاوہ ہندوستانی خواتین بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ لاہور کے اسکولوں اور کالجوں کے پروفیسر، اساتذہ اور شاید طالب عالم بھی خاصی تعداد میں موجود تھے۔

کھانے کے دوران اسکول کے کچھ لڑکے گورنر پنجاب اور سر جان مینارڈ کی کرسیوں کے قریب کھڑے ہو گئے۔ علامہ کی نظم "سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا" گانے لگے۔ کھانے کے بعد سر ذوالفقار علی خاں نے تقریر کی۔ علامہ نے جواب دیا۔ کاروائی انگریزی میں تھی۔ علامہ نے کہا کہ مغربی ممالک میں ایشیائی خصوصاً عربی و فارسی علوم کے متعلق دلچسپی پیدا ہو گئی ہے۔ مجھ کو خطاب دے کر گورنمنٹ نے اردو فارسی کے ادیبوں کی عزت افزائی کی ہے۔[2] مرزا جلال الدین کہتے ہیں کہ اِس موقع پر علامہ نے "وہ اشعار سنائے جو 'طلوعِ اسلام' کے ابتدا میں درج ہیں۔" اگر یہ درست ہے تو انجمن حمایتِ اسلام کے جلسے کے لیے نظم ابھی سے لکھنا شروع کر دی ہو گی۔[3]

جلسے کے اختتام پر فوٹو لیا گیا۔ علامہ کے علاوہ سر ایڈورڈ میکلیگن، سر جان مینارڈ، سر ذوالفقار علی خان، راجہ نریندر ناتھ اور دیوان کشن کشور شریک ہوئے۔ میاں فضل حسین، سردار سندر سنگھ مجیٹھیہ

---

[1] مرزا جلال الدین، 'میرا اقبال'، ص ۱۰۷

[2] ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۴) زندہ رود، ص ۳۳۱

[3] مرزا جلال الدین، 'میرا اقبال'، ص ۱۰۹

ممبر انتظامیہ کونسل گورنر پنجاب اور لالہ کشن لعل فوٹو میں نہیں تھے۔ [1]

۱۹/ جنوری کو لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس عبدالرؤف نے کسی جعفر حسین کے خلاف اپیل خارج کر دی۔ علامہ پیروی کر رہے تھے۔ اپیل مسماۃ بیگم نے دائر کی تھی۔ اُن کی پیروی عمر بخش کر رہے تھے۔ [2]

بندے ماترم اُردو کا اخبار تھا۔ لاہور سے شائع ہوتا تھا۔ انتہاپسند ہندو سوچ کی ترجمانی کرتا تھا۔ ۲۰/ جنوری کو تین دن پہلے علامہ کے اعزاز میں ہونے والی پارٹی پر طنز آمیز تنقید شائع کی۔ [3]

6

۲۳/ جنوری کو قاضی محمد اسلم گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبۂ فلسفہ کے کچھ طلبہ کے ساتھ میکلوڈ روڈ پر علامہ کی کوٹھی پر پہنچے۔ علامہ اُن کے ساتھ پیدل ہی کالج کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے بھر گفتگو ہوتی رہی۔ طلبہ نے پھر محسوس کیا جیسے علامہ انہیں برابری کا درجہ دے رہے ہوں۔

کالج کے مینار کے مغربی جانب ایک چھوٹے لان پر تقریب منعقد ہوئی۔ انگریز پرنسپل اے ایس ہیمی اور صدر شعبہ فلسفہ پروفیسر چیٹر جی بھی موجود تھے۔ پہلے گروپ فوٹوگراف کھینچا گیا۔ چائے کے لیے لورینگز (Lorangs) کی خدمات حاصل کی گئیں۔ دعوتوں کا انتظام کرنے کی ایک اچھی کمپنی سمجھی جاتی تھی۔ کالج کی طرف سے قاضی اسلم نے ایک ہلکی پھلکی تقریر کی۔ ایک طالب علم اُرگاسین، کالج میگزین میں روئیداد شائع کرنے کے لیے تقریب کے نوٹ لے رہا تھا۔

قاضی اسلم کی تقریر کے بعد علامہ نے تقریر کی۔ قاضی نے محسوس کیا جیسے اُسی گفتگو کا تسلسل ہو جو چند روز قبل کوٹھی پر ملاقات کے دوران ہوئی تھی۔ کالج کے راستے میں بھی ہوئی ہو گی۔ برسوں بعد قاضی نے اپنی یادداشت اور بعض اشاروں کی مدد سے تقریر کا بنیادی مفہوم مرتب کرنے کی کوشش کی۔ علامہ کی تقریر اور قاضی کی تلخیص انگریزی میں تھیں۔ مفہوم کچھ یوں ہے:

---

[1] ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۴) زندہ رود، ص ۳۳۱

[2] ظفر علی راجا ایڈووکیٹ (۲۰۱۳) قانون دان اقبال، ص ۱۲۱

[3] ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۴) زندہ رود، ص ۳۳۱

فلسفے میں میری دلچسپی پچھلے کئی برسوں سے زمان(time) اور مکان(space) کے مسئلے پر مرکوز ہے۔ ہماری زمین اور اس کے گرد جو کچھ بھی ہے وہ مکان میں ہے۔ زمین خود بھی مکان ہے اور مکان میں حرکت کرتی ہے مگر وجود زمان میں رکھتی ہے۔ ہم میں سے زیادہ تر لوگ شاید یہی کہیں گے لیکن زمان اور مکان ہمیں عام زندگی میں جس طرح دکھائی دیتے ہیں، ایک فلسفی یا سائینسدان کے لیے ویسے نہیں ہوتے۔ زمان و مکان کے بارے میں ہمارا روزمرہ کا تجربہ محض نظر کا دھوکہ قرار دیا جاسکتا ہے۔ ہیگل کے زمانے سے فلسفی یہی کہتے آرہے ہیں۔ لیکن زمان و مکان حقیقت میں کیا ہیں، ہم یہ معلوم کرنے کے وسائل نہیں رکھتے۔ چونکہ یہ کسی کو معلوم نہیں اس لیے یہ مسئلہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ زمان و مکان خدا کی نظر میں کیا ہیں۔ یہ مسائل مذہبی مفکرین کے لیے بھی اہم ہیں اور اُنہوں نے اس پر غور و فکر بھی کیا ہے۔ مسلمانوں کے صحیفے قرآن شریف میں وقت کی اہمیت کے بارے میں اشارے ملتے ہیں۔ نیز یہ کہ انسان کا وقت خدا کے وقت سے مختلف ہے۔ اسی طرح خدا کا لامحدود علم ہے جو کسی جہت کا پابند نہیں ہے۔ اس میں ماضی اور مستقبل نہیں، سوائے بعض اشاروں کے جنہیں بڑی احتیاط کے ساتھ متعین کرنے کی ضرورت ہے ورنہ بنیادی طور پر خدا کے علم میں ماضی، حال اور مستقبل کی تفریق نہیں ہے۔

مسلم صوفی شعرا اور فلسفیوں نے اس موضوع میں کشش محسوس کی اور اُن کی بعض معروضات حیرت انگیز طور پر جدید معلوم ہوتی ہیں۔ جدید دور میں جرمن پروفیسر البرٹ آئن اسٹائن اُن کے متوازی دکھائی دیتا ہے۔ ریاضی کے ذریعے ثابت کیا ہے کہ ہمارے زمان و مکان صرف حوادث ہیں۔ حادثاتی اعتبار سے وہ اہم ہوسکتے ہیں مگر وہ اصلی نہیں ہیں۔ اپنے طور پر وہ کچھ بھی نہیں ہیں۔ وہ ایک زیادہ اصلی حقیقت کے آثار ہیں جنہیں روایتی انداز سے کافی مختلف طور پر بیان کرنا چاہئیے۔

آئن اسٹائن کے افکار فی الحال صرف ریاضی دانوں تک محدود ہیں۔ میں بھی اس موضوع پر ریاضی کے پروفیسروں سے گفتگو کرتا رہا ہوں۔ وہ ایک عام شخص کے لیے

آئن اسٹائن کے افکار کی افادیت بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ ہمیں بتاتے ہیں کہ ریاضی کی زبان میں آئن اسٹائن کی بات بڑی معقول معلوم ہوتی ہے۔ میرے خیال میں ٹھیک کہتے ہیں۔ لیکن آئن اسٹائن ایک عام شخص اور ایک فلسفی کی سمجھ میں بھی آنا چاہئیے۔ اس میں شاید کچھ وقت لگے۔ میں آئن اسٹائن کے ریاضی کے کارناموں کی تشریحات پڑھتا رہا ہوں۔ سب نے انہیں حیرت انگیز قرار دیا ہے۔ اصل میں کیا بات حیرت انگیز ہے، یہ بتانا پھر بھی مشکل ہے۔ یہ موضوع جسے اضافیت کہتے ہیں، اس پر میرا اپنا مطالعہ گزشتہ کئی برسوں پر پھیلا ہوا ہے۔ میری دلچسپی بڑھتی ہی گئی ہے۔ اس لیے کہ یہ موضوع اسلام، قرآن شریف اور صوفیائے اسلام کو جدید طبعیات اور ریاضی سے قریب لے آتا ہے۔ میرا ارادہ ہے کہ ان دونوں دھاروں کو نمایاں کروں اور انہیں ساتھ رکھ کر دکھاؤں کہ یہ کتنے اہم اور ایک دوسرے سے کتنے ملتے جلتے ہیں۔

عام طور پر ہم سمجھتے ہیں کہ دنیا ٹھوس اشیأ پر مشتمل ہے اور وقت کے دھارے میں بہہ رہی ہے۔ گویا مکان اور ٹھوس اشیأ کی دنیا پر سے وقت گزر رہا ہے۔ اِس سمجھ کو بدلنا ہو گا۔ زمان اور مکان واقعات کے اشارے ہیں۔ دنیا واقعات کی بنی ہوئی ہے۔ ان میں سے کوئی بھی واقعہ زمان و مکان کے حوالے سے یعنی کچھ حد تک وقت اور کچھ حد تک مقام کے تعین سے بیان نہیں کیا جاسکتا۔ بیک وقت پورے زمان اور پورے مکان کے حوالے سے بیان کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ ضرور ہے کہ ہم پھر بھی زمان اور مکان کی بات کر سکتے ہیں۔ البتہ مکان کی منجمد حیثیت ختم کرنی ہو گی۔ بہر حال یہ کہنا مشکل ہے کہ اصل میں کیا زیادہ اہم ہے، زمان یا مکان؟ شاید زمان۔

اُمید ہے کہ آپ سے ملاقات کا ایک اور موقع ملے گا۔ مجھے اپنے خیالات پر مزید غور کرنے کی مہلت درکار ہے۔ مزید تبادلۂ خیال کی ضرورت بھی ہے۔ اُس کے بعد شاید میں زیادہ بہتر طور پر واضح کر سکوں کہ کس طرح صوفی مذہب یا کم سے کم بعض صوفی مفکرین اور جدید سائنس ایک دوسرے سے قریب آرہے ہیں۔ دونوں

ایک ہی بات ظاہر کرنے کی کوشش میں ہیں۔ نتیجہ سب کے لیے دلچسپی رکھتا ہے،
مذہب کے طلبہ کے لیے بھی اور سائنس کے طلبہ کے لیے بھی۔

قاضی اسلم کا بیان ہے کہ علامہ کی تقریر نے ایک سماں باندھ دیا۔ اس کے بعد ایک طالب علم کاظم حسین نے علامہ کی منظومات گائیں۔ علامہ نے بڑی توجہ اور انہماک کے ساتھ سنا:

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں   یہ عاشق کون سی بستی کے یارب رہنے والے ہیں

تقریب کے بعد وہ طلبہ کے ساتھ پیدل ہی واپس گئے۔[1]

7

۲۴ر جنوری کو شاد کے ۴ر جنوری کے خط کا جواب دیا، ''سرکار نے میرے خطاب کے متعلق جو کچھ سنا ہے صحیح ہے۔ یہ اسرارِ خودی کا انگریزی ترجمہ ہونے اور اس پر یورپ اور امریکہ میں متعدد ریویو چھپنے کا نتیجہ ہے۔ دنیوی نقطۂ نگاہ سے یہ ایک قسم کی عزت ہے مگر ہر عزت فقط اللہ کے لیے ہے۔''[2]

بنگلور میں علامہ کے مداح عبدالواحد بنگلوری تھے۔ چار روز بعد اُن کے ایک خط کا جواب دیا۔

بنام عبدالواحد بنگلوری

مخدومی! تسلیم۔ خطاب جو مجھ کو دیا گیا۔ اسرار خودی کے انگریزی ترجمے اور یورپ اور امریکہ میں جو ریویو اس پر شائع ہوئے ہیں ان کا نتیجہ ہے۔ آپ مطمئن رہیں کہ اس کا کوئی سیاسی مفہوم نہیں ہے۔ نہ دنیا کی عزت و دولت مجھ ایسی فطرت والے آدمی کو اپیل کرنے والی چیزیں ہیں۔ اگر آپ کو میری طرز زندگی میرے مقاصد ادبی اور ملک کے موجودہ حالات میں ان مقاصد کی تکمیل کے لیے جو طرز عمل میں نے اختیار کر رکھا ہے۔ ان سب امور سے آپ کی واقفیت کماحقہ ہوتی تو آپ کو شاید اس استفسار کی ضرورت ہی پیش نہ آتی جو آپ نے اپنے خط میں مجھ سے کیا ہے۔ بہر حال اس استفسار کا بہترین جواب

---

[1] Qazi Muhammad Aslam (1970), 'Iqbal at a College Reception in Lahore'

[2] برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۲۰، ۴۲۱

میری آیندہ زندگی دے گی۔ باقی رہی ہندوستانی سیاست سو میں فطرتاً اس کے لیے موزوں نہیں ہوں۔ عملی طور پر آج تک میرا کوئی سروکار اس سے نہیں رہا۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ یہ بات لٹریری مقاصد کی تکمیل میں سدِراہ ہے۔ جن کی تکمیل کے لیے امن و سکون کی ضرورت ہے۔ خصوصاً ایسے آدمی کے لیے جس کی صحت اچھی نہیں رہتی۔ اسرار خودی کے متعلق جو کچھ آپ نے لکھا ہے اس کی نسبت یہ عرض ہے اس وقت کے حالات کو مدنظر رکھ کر اگر آپ غور کریں گے تو آپ پر ہر حقیقت منکشف ہو جائے گی۔ زیادہ کیا عرض کروں امید کہ مزاج بخیر ہو گا۔

مخلص محمدؐ اقبال ۲۸ر جنوری ۲۳ء،

لاہور[1]

8

۳۰ر جنوری کو ترکی اور یونان کے درمیان معاہدے پر دستخط ہوئے۔ مذہب نسل کے مترادف قرار پایا۔ گریک اور تھوڑوکس عیسائی (Greek Orthodox Christians) خواہ ترک ہوں یا یونانی، سب یونانی شہری قرار پائے۔ سابقہ عثمانی سلطنت میں قریباً گیارہ لاکھ تھے۔ ہجرت کر کے یونان جانا تھا۔ مسلمان باشندے ترک شہری قرار پائے خواہ نسلاً یونانی ہوں۔ یونان میں قریباً تین لاکھ اسی ہزار تھے۔ زیادہ تر مقدونیہ اور کریٹ میں تھے۔ ترکی آنا تھا۔ غازی مصطفیٰ کمال پاشا اسی اصول کے تحت "ترک" قرار پائے۔ سالونیکا جہاں پیدا ہوئے تھے، اب یونان کا حصہ تھا۔ یونان سے ہجرت کر کے آنے والے ترک جتنی جائیداد چھوڑ کر آتے اُس کے برابر ترکی میں یونانیوں کی چھوڑی ہوئی جائیداد میں سے ملتی۔ ترکی کی تاریخ میں شاید پہلی دفعہ تقریباً پوری آبادی مسلمانوں پر مشتمل ہو گئی۔[2]

۳۱ر جنوری کو اُردو کے ہندو اخبار بندے ماترم نے علامہ کے خطاب کی خوشی میں ۱۷ر جنوری کو دی جانے والی گارڈن پارٹی پر تنقید کی دوسری قسط شائع کی۔ پہلی قسط گیارہ روز پہلے چھپی تھی:

جو اصحاب اس دعوت میں شریک ہوئے وہ زیادہ تر ایسے تھے جن کو دیکھ کر اس خیال کی

---

[1] مظفر حسین برنی (۱۹۹۱)، کلیاتِ مکاتیبِ اقبال دوم

[2] Andrew Mango (2000). *Ataturk,* pp.390-391

> تردید ہوتی تھی کہ یہ دعوت کسی شاعر کی عزت افزائی کی خوشی میں دی گئی ہے...ایک اور بات جو دیکھنے والوں کی نگاہ سے پوشیدہ نہیں رہ سکتی، وہ ہندو اصحاب کی کمی تھی اور اس سے اس امر کا ایک زبردست ثبوت مہیا ہو رہا تھا کہ جذبۂ سرکار پرستی، ہندو مسلمانوں کے گلے ملوانے میں جذبۂ قوم پرستی کا ہرگز مقابلہ نہیں کر سکتا...[1]

حیدر آباد دکن میں کوئی شکور علی خاں افسرؔ، علامہ کے مداحوں میں سے تھے۔ علامہ کے خطاب پانے کی خبر اور پھر سالک کی طنزیہ نظم نے اثر کیا۔ خود بھی ایک فارسی رباعی میں کہہ اُٹھے کہ اقبال کو اُلٹنے سے ''لابقا'' بن جاتا ہے۔ ۱۵ر جنوری کے زمیندار میں سالک اپنے کالم 'افکار و حوادث' میں یہ رباعی شامل کر چکے تھے۔ اب حیدرآباد دکن کے کسی مقامی اخبار میں کشن پرشاد کی نظر سے گزری۔ فارسی میں جوابی قطعہ لکھ کر اخبار کو بھجوایا۔[2]

''وہ ایک فوری جذبہ تھا،'' عبدالمجید سالک نے بعد میں اپنے اشعار ''سر ہو گئے اقبال'' کے بارے میں لکھا۔ ۶ر جنوری کو شائع ہو کر لوگوں کی زبانوں پر چڑھ چکے تھے۔ ''اشعار چھَپ جانے کے بعد... ندامت کا غلبہ ہوا اور چند ہفتے علامہ کی خدمت میں حاضری کی جرأت نہ کر سکا لیکن جب آخر ڈرتے ڈرتے حاضر ہوا تو علامہ کے طرزِ تپاک اور محبت آمیز سلوک میں کوئی فرق نہ آیا تھا بلکہ وہ شاکی تھے کہ اتنی مدت تک ملنے کیوں نہ آئے۔''[3]

9

یکم فروری کو مراکش کے علاقے ریف میں آزاد اسلامی ریاست قائم ہو گئی۔ عبدالکریم سربراہ قرار پائے۔ ڈھائی برس پہلے صرف تین ہزار کی فوج کے ساتھ پانچ ہزار حملہ آور اسپینی سپاہیوں کو ہلاک اور تیرہ ہزار کی اسپینی فوج کو ملک چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور کر کے عالمگیر شہرت حاصل کی تھی۔

---

[1] ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۴)، زندہ رود، ص ۳۳۱

[2] مکتوب شاد بنام اقبال ۱۱ر فروری ۱۹۲۳ء؛ محمد عبداللہ قریشی (۱۹۸۶) اقبال بنام شاد، ص ۳۶۱

[3] عبدالمجید سالک (۱۹۸۳) ذکرِ اقبال، ص ۱۱۷

پیامِ مشرق کے لیے چند ضروری نظمیں ذہن میں تھیں۔ فرصت نہ مل رہی تھی۔ والد صاحب شیخ نور محمد کا اصرار تھا کہ مجموعہ جلد شائع ہو۔ فروری میں اشاعت کی تیاری شروع ہو گئی۔ [1]

عبدالمجید پرویں رقم کتابت کر رہے تھے۔ شیخ مبارک علی ناشر تھے۔ [2] چودھری محمد حسین تمام بندوبست میں مدد کر رہے تھے۔ ان کی وجہ سے کام تیزی سے ہونے لگا۔ [3]

۸ر فروری کو لاہور ہائی کورٹ نے نبی بخش وغیرہ بنام محمد سلیم اللہ وغیرہ کے مقدمے کا فیصلہ سنایا۔ جسٹس بی روسگنال اور جسٹس ہیری سن نے سماعت کی تھی۔ ظفر اللہ خاں نے نبی بخش وغیرہ کی پیروی کی تھی۔ سلام اللہ وغیرہ کی طرف سے علامہ اور خورشید زماں تھے۔ اُن کے خلاف فیصلہ ہوا۔ [4]

اُس روز عبدالواحد بنگلوری کا جواب آیا۔ بنگلور کی تعریف کر کے آنے کی دعوت دی تھی۔ علامہ نے لکھا، ''مجھے کسی نے پہلے بھی بتایا ہے کہ بنگلور نہایت خوشگوار مقام ہے۔ آپ سے اس کی تصدیق ہو گئی۔ انشاَاللہ میں اس امر کی کوشش کروں گا کہ کچھ عرصہ وہاں گزاروں۔ اس کے علاوہ سلطان شہید [سلطان ٹیپو] سے مجھے ایک خاص عقیدت بھی ہے۔'' [5]

حکیم احمد شجاع کے رسالے ہزار داستاں میں پٹنہ کے بیرسٹر ہمایوں مرزا کی اہلیہ صغرا بیگم کا خط شائع ہوا۔ ۱۸ر فروری کو علامہ کو بھی خط موصول ہوا۔ اُسی وقت جواب لکھا، ''آپ کے شوہر ہمایوں مرزا صاحب سے مجھے نیاز حاصل نہیں ہے۔ لیکن میں نے آپ کا خط جو ہزار داستان میں شائع ہوا ہے، پڑھا ہے۔ اس خط کے پڑھنے سے مجھے خاص مسرت ہوئی۔ فریاد مرحوم کی لٹریری عظمت میں کس کو کلام ہو سکتا ہے جن کے شاگردوں میں شاد عظیم آبادی ہوں۔'' [6]

---

[1] ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ

[2] اقبال (۱۹۲۳) پیامِ مشرق

[3] چودھری محمد حسین کا ذکر پیامِ مشرق کے دیباچے میں ہے

[4] ظفر علی راجا ایڈووکیٹ (۲۰۱۳) قانون دان اقبال، ص۱۱۹، ۱۲۱

[5] برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص۴۲۵

[6] برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص۴۲۵، ۴۲۶

۲۰ر فروری کو انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کا اجلاس ہوا۔ مولوی فضل الدین صدارت کر رہے تھے۔ علامہ کو جنرل کونسل کا رُکن بنایا گیا۔[1]

علامہ پنجاب یونیورسٹی کی اورئینٹل اور آرٹس فیکلٹیز کے فیلو تھے۔ پروفیسروں کے تقرر کے لیے پرفیسر شپ کمیٹی مقرر کی جاتی تھی۔ اس برس اُس میں شامل ہوئے۔ ۲۲ر فروری کے پنجاب گزٹ کے صفحہ ۴۳-۴۴ پر شائع ہوا۔[2]

انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے کے لیے نظم لکھ رہے تھے۔ عنوان 'طلوعِ اسلام' تھا۔[3] جلسہ حسبِ معمول ایسٹر کی تعطیلات میں ہونا تھا۔ اگلے ماہ کے اواخر میں تھیں۔ انبالے سے میر غلام بھیک نیرنگ آ رہے تھے۔ اراکین نے علامہ سے درخواست کی کہ مولانا گرامی کو دعوت دیں۔ ۲۳ر فروری کو علامہ نے گرامی کو لکھا، "اب میری عزت آپ کے ہاتھ میں ہے۔"[4]

10

محمد دین فوق سیالکوٹ کے شعرا کے بارے میں کتاب لکھ رہے تھے۔ مولوی سید میر حسن سے کچھ ناموں کی فہرست موصول ہوئی۔ علامہ سے رجوع کیا۔ انہوں نے ۴ر مارچ کو جواب دیا:

> مخدومی جناب مولوی صاحب نے جو نام لکھے ہیں ان میں سے میں کسی کو نہیں جانتا سوائے عشق پیچہ شاعر کے جو کوئی شاعر نہ تھا۔ ہاں ٹک بند ضرور تھا۔
>
> سیالکوٹ کے قدیم مشہور شعرا میں سے شیخ محمد علی رائج تھے۔ ان کا دیوان فارسی میں بہت ضخیم میں نے خود دیکھا ہے۔ غالباً شاہ جہاں یا عالمگیر کے عہد میں تھے۔ ٹیک چند نے بہارِ عجم میں جابجا ان کے اشعار کو محاورات فارسی کی سند میں لکھا ہے۔

[1] انجمن کی قلمی روداد؛ محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶)، اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص ۱۷۸

[2] ڈاکٹر حسن اختر ملک، اقبال، ایک تحقیقی مطالعہ ص ۱۲۵

[3] مکتوب بنام گرامی ۲۳ر فروری ۱۹۲۳ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۲۶، ۴۲۹

[4] ایضاً

ایک شعر ان کا مجھے بھی یاد ہے

از جوانے سرو قد دیگر بہ بند افتادہ ام　　　　دوستاں جے کہ از بام بلند افتادہ ام

غالباً کسی نہ کسی تذکرے میں ان کا ذکر آپ کو ضرور مل جائے گا۔ مولوی صاحب قبلہ میر حسن صاحب کے متعلق جہاں تک مجھے یاد ہے میری کوئی نظم نہیں۔ شاید کوئی شعر اشارتاً کسی نظم میں ہو۔[1]

پیامِ مشرق کاتب کے حوالے ہو چکی تھی۔ خیال تھا کہ دو ماہ میں چھَپے گی۔ حیدرآباد دکن سے نظام کے پرائیویٹ سیکرٹری امینِ جنگ نواب احمد خاں نے اسلام کے معارف و حقائق کے بارے میں اپنی انگریزی کتاب بھجوائی۔ علامہ کے زبردست مداح تھے۔ کتاب کے آخر میں اُن کا تذکرہ کیا تھا۔[2]

۷/مارچ کو گرامی کا خط ملا۔ تازہ رباعیات بھیجی تھیں۔ انجمن کے جلسے میں آنے کا وعدہ کیا تھا۔ اگلے روز علامہ نے جواب میں لکھا، ''اگر حسب عادت یہ وعدہ پورا نہ کیا تو ارکانِ انجمن کی نگاہ میں میری بہت کرکری ہو گی۔ آپ خود تو آنے سے رہے۔ مہربانی کر کے اطلاع دیجیے کہ کب آدمی کو یہاں سے آپ کے لانے واسطے ہوشیار پور بھیجا جائے، چند روز پہلے آ جایئے۔ بلکہ اگر تیار ہوں تو فوراً مطلع کیجیے کہ میں انجمن کی طرف سے ابھی آدمی بھجوا دوں۔''[3]

11

میاں بشیر احمد کے مطابق علامہ نے اپنی فارسی تصانیف کے حوالے سے انگریزی میں کہا، ''وسط ایشیا کے قلب پر ایک پپڑی جمی ہوئی ہے، میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتا ہوں۔''[4]

---

[1] برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۲۹، ۴۳۰

[2] مکتوب بنام گرامی ۸/مارچ ۱۹۲۳ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۳۰، ۴۳۱

[3] ایضاً

[4] میاں بشیر احمد، 'اقبال کی یاد میں'، ص ۵۴-۵۵؛ انگریزی میں فقرہ یوں تھا:
"There is a crust at the heart of Central Asia, I want to break through it."

آئن سٹائن کے جن نظریات پر مسلسل غور کر رہے تھے، اُن پر گزشتہ چند برسوں میں لندن کی ارسٹوٹیلین سوسائٹی نے بھی سمپوزیم منعقد کیے تھے۔ بحث ابھی جاری تھی۔[1] پروفیسر ٹی پرسی نن (T. Percy Nunn) کہتے تھے کہ زمانی و مکانی جسم کا انحصار دیکھنے والے کے ذہن پر نہیں ہے۔ اس کا انحصار کائنات کے اُس نقطے پر ہے جس سے دیکھنے والے کا جسم وابستہ ہے۔ دیکھنے والے کی جگہ ریکارڈ کرنے والا آلہ بھی استعمال کیا جائے تو نتیجہ وہی نکلے گا۔[2]

علامہ سمجھتے تھے کہ آئن سٹائن کا نظریہ سائنس کا نظریہ ہے۔ اسے صرف اشیا کی ترکیب سے بحث ہے۔ اس سے نہیں کہ اس ترکیب کا حامل کیا ہے اور ان کی ماہیت بالآخر کیا ہے۔[3] ورنہ حقیقت اپنی اصل میں محض رُوح ہے۔ آئن سٹائن نے مادیت (materialism) کی نفی کی تھی۔ فطرت کے وجود سے انکار نہیں کیا تھا۔ اب جوہر (atom) کی تعریف یوں کی جارہی تھی کہ یہ آپس میں مربوط حوادث کا نظام ہے۔ علامہ کے نزدیک یہ اس نظریے کی پہلی خوبی تھی۔[4]

دوسری خوبی یہ تھی کہ اس کی رُو سے مکان کا دارومدار مادے پر تھا۔ آئن سٹائن کے نزدیک کائنات کی مثال ایک ایسے جزیرے کی نہیں تھی جو مکانِ لامتناہی (infinite space) میں واقع ہو۔ مکان غیر محدود ہونے کے باوجود متناہی (finite) تھا۔ اس کے ماورا مکانِ محض کا کوئی وجود نہ تھا۔ اگر مادے کا وجود نہ ہوتا تو کائنات بھی سمٹ کر ایک نقطے پر آجاتی۔[5]

12

قدیم یونانی فلسفی زینو (Zeno) نے کہا تھا کہ حرکت (movement) محض فریب ہے۔ ایک نقطے سے دوسرے تک پہنچنے کے لیے پہلے ضروری ہے کہ فاصلے کا نصف طے کیا جائے۔ اُس سے پہلے نصف کا

---

[1] ان میں سے ہالڈین، کار اور نن کے مقالات کا تذکرہ علامہ نے کیا؛ Iqbal (1934), *Reconstruction*
[2] Iqbal (1934), *The Reconstruction of Religious Thought in Islam*, p.36
[3] ایضاً
[4] ایضاً، صفحہ ۳۶-۳۷
[5] ایضاً، صفحہ ۳۷

نصف، اُس سے پہلے نصف کے نصف کا نصف، اور اِسی طرح غیر نہایت (infinity) تک۔ ایک نقطے سے دوسرے کے بیچ میں نقطوں کی لامتناہی (infinite) تعداد سے گزرنا پڑے گا۔ زمانے کے متناہی وقفے (finite period) میں ممکن نہیں۔ چنانچہ تیر محض پرواز کرتا نظر آتا ہے۔ اصل میں ضرور کسی نہ کسی نقطے پر ٹھہرا ہوا ہے۔ حقیقت ایک ہے، تغیر (change) سے پاک ہے۔[1]

حرکت کی نفی کرنے پر مکانِ مطلق (absolute space) کی بھی نفی کرنی پڑتی تھی۔ عباسی عہد میں مسلم مفکرین کے اشعری مکتبِ فکر نے یہ نظریہ رد کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ زمان و مکان اور حرکت جن لمحوں اور نقطوں پر مشتمل ہے اُن کا مزید تجزیہ ممکن نہیں۔ حرکت کو ثابت کرنے کے لیے لایتجزات (infinitescimals) کا اثبات کرنا پڑا۔ مراد تھی اتنی چھوٹی اشیاً یا اعداد کہ اُن کی پیمایش نہ کی جا سکے۔ اشعری مفکرین کے نزدیک لمحے اور نقطے ایسی ہی چیزیں تھے۔ اس لیے ہم وقت کے ایک متناہی وقفے میں مکان کے ایک نقطے سے دوسرے تک سفر کر سکتے تھے۔ بعد میں ہسپانیہ کے عظیم مفکر ابنِ حزم نے لایتجزات کے وجود سے انکار کیا۔[2] اب وِلڈن کار (Wildon Carr) نظریۂ اضافیت سے یہ نتیجہ نکال رہے تھے کہ حی و مدرک افراد (monads) کا وجود ثابت ہوتا تھا جیسا کہ قدیم نوافلاطونی فکر نے سمجھا تھا۔ علامہ کے خیال میں یہ درست نہ تھا۔[3]

فرانسیسی مفکر برگساں غالباً اشعری مفکروں اور ابن حزم کے نظریات سے واقف نہ تھا۔ ۱۸۸۹ء میں زینو کے استدلال کو دوسری طرح رَد کیا۔ حرکت کو حقیقی تغیر (true change) ثابت کر کے اصل حقیقت (fundamental Reality) قرار دیا۔ زینو کے نظریۂ زمان و مکان کو غلط ٹھہرایا کہ صرف تب قائم ہوتا ہے جب حرکت کا مطالعہ عقل کی عینک سے کیا جائے۔[4]

---

[1] ایضاً، صفحہ ۳۴-۳۳

[2] ایضاً، صفحہ ۳۴

[3] Iqbal (1934), p.36۔ سعید شیخ (Saeed, ed.; 2003) کے مطابق علامہ نے یہ بات اِن تصانیف کی مدد سے کہی:
Wildon Carr (1922), *The General Principle of Relativity*. Wildon Carr (1922), *A theory of monads; outlines of the philosophy of the principle of relativity*

[4] ایضاً، صفحہ ۳۴۔ سعید شیخ (Saeed, ed.; 2003) کے مطابق علامہ نے یہ بات اِن تصانیف کے حوالے سے کی:

انگریز ریاضی داں برٹرینڈ رسل، برگساں کے نظریے کو سنجیدگی سے نہ لیتے تھے۔ زینو کے مفروضے کو روسی نژاد جرمن ریاضی داں کانٹور (Cantor) کے ریاضیاتی تواصل (mathematical continuity) کے نظریے سے رد کیا۔ رسل کے نظریے کی تلخیص ولڈن کار نے یوں کی تھی:

> …there is no next position to any position, no next moment to any moment because between any two there is always another. If there were infinitesimals, movement would be impossible, but there are none. Zeno therefore is right in saying that the arrow is at rest at every moment of its flight, wrong in inferring that therefore it does not move, for there is a one-one correspondence in a movement between the infinite series of positions and the infinite series of instants. According to this doctrine, then it is possible to affirm the reality of space, time, and movement, and yet avoid the paradox in Zeno's arguments.

علامہ کے نزدیک مشکل حل نہ ہوئی۔ تسلسل کا یہ تصور کہ ایک سلسلہ لامتناہی ہے، صرف حرکت کی اُس تصویر پر منطبق ہوتا جو خارج سے دیکھتے ہوئے تصور میں آتی ہے۔ نہ کہ حرکت کے عمل پر جیسا کہ فی الواقع سرزد ہوتا ہے۔ ایک عام شخص کے لیے یہ مسائل دلچسپ نہ تھے۔ ان سے نکلنے والا نتیجہ اُس کے لیے بھی اہم تھا۔ مکان، زمان اور حرکت وجود رکھتے ہیں۔ پھر بھی ضروری نہیں کہ ویسے ہوں جیسے دکھائی دیتے ہیں۔[1]

آئن سٹائن کے نظریۂ اضافیت سے ایک مشکل بھی پیدا ہوتی تھی۔ زمانے یعنی وقت کا وجود غیر حقیقی ثابت ہو جاتا تھا۔ اس کی حیثیت چوتھی سمت (fourth dimension) سے زیادہ نہ رہتی تھی۔ ماضی کی طرح مستقبل کا وجود بھی پہلے ہی سے قائم تھا۔ متعین تھا۔ وقت کوئی آزادانہ تخلیقی حرکت نہ تھا۔ حوادث رونما نہیں ہوتے تھے۔ ہم صرف اُن سے دوچار ہوتے تھے۔ عظیم مسلمان مورخ ابن

Bergson (1910), *Time and Free Will: an Essay on the Immediate Data of Consciousness.* Bergson (1922*), Creative Evolution*

[1] ایضاً، ص ۳۵۔ ماخذ کی نشاندہی سعید شیخ (Saeed, ed.; 2003) نے کی:
Carr (1922), *The General Principle of Relativity,* p.36

خلدون نے وقت کو آزاد تخلیقی حرکت سمجھا تھا۔ علامہ بھی سمجھتے تھے۔[1] انہوں نے سوچا کہ نظریۂ اضافیت میں زمانے (time) کی بعض خصوصیات نظر انداز کی گئی ہیں۔ آئن سٹائن کا مقصد صرف عالمِ فطرت کے اُن پہلوؤں کی تشریح کرنا ہے جو اصولِ ریاضی کا موضوع ہیں۔[2]

نظریۂ ارتقا سے بھی یہ بات واضح ہوتی تھی۔ چارلس ڈارون ایک معمہ چھوڑ گیا تھا۔ ماحول میں پیدا ہونے والی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ جانداروں میں تبدیلی آتی ہے۔ مگر کیسے؟ حال ہی میں ایک جواب مقبول ہونے لگا تھا۔ اسے انگریز ماہرِ حیوانیات کونوی لائیڈ مارگن (Conwy Lloyd Morgan) نے "صدوری ارتقا" (emergent evolution) کا نام دیا تھا۔ اپنی کتاب کا عنوان بھی یہی رکھا۔ اس نظریے کے مطابق ارتقا کے خاص خاص مراحل پر بعض بالکل نئی خصوصیات پیدا ہو جاتی ہیں۔ یہ عموماً پہلے سے موجود چیزوں کی غیر متوقع نئی ترتیب کی وجہ سے ہوتا ہے۔ ذہن اور شعور بھی انہی خصوصیات میں سے ہیں۔ ارتقا کے دوران پیدا ہوتے تھے۔[3]

یہ نظریہ قریباً پچاس برس سے موجود تھا۔ اب زیادہ مقبول ہو رہا تھا۔ علامہ نے سوچا کہ شاید اِس نظریے کی بدولت حیاتیات (biology) اپنی آزادانہ حیثیت تسلیم کروالے۔[4]

اسی برس آر ایف الفریڈ ہارنلے (R. F. Alfred Hornle) کی کتاب مادہ، زندگی، ذہن اور خدا (*Matter, Life, Mind and God*) شائع ہوئی۔ اس زمانے کے فکری رجحانات پر پانچ لیکچروں کا مجموعہ تھی۔ مادے کے بارے میں مادیت پرستانہ نظریے کو رَد کیا تھا۔ پچھلی صدی میں یہ کام برکلے اور موجودہ زمانے میں وہائٹ ہیڈ بھی کر چکے تھے۔

مادیت پرستانہ نظریے کی بنیاد یہ تھی کہ مظاہرِ فطرت میں ہمیں جو کچھ دکھائی دیتا ہے وہ اُن میں موجود نہیں ہے۔ رنگ و آواز وغیرہ سب اثرات ہیں جو فطرت ہمارے حواسِ خمسہ کے ذریعے

---

[1] Iqbal (1934), *Reconstruction,* pp.37, 134

[2] ایضاً، ص ۳۷

[3] Morgan (1923), *Emergent Evolution.* Iqbal (1934), *Reconstruction,* p.102

[4] Iqbal (1934), *Reconstruction*, p.102

ہمارے ذہن پر مرتب کرتی ہے۔ اس لیے ہماری تمام ذہنی کیفیات درحقیقت خارجی دنیا کے اثرات ہیں۔ یہ اثرات میکانکی طور پر مرتب ہوتے ہیں۔ ہارنلے نے بحث کی تھی کہ خود طبیعیات (science of physics) کے طریقِ کار سے اس مفروضے کی تردید ہوتی ہے۔ ایک سائینسدان اپنے حواسِ خمسہ اور ذہن کی بدولت ہی فطرت کا مطالعہ کرتا ہے۔ لیکن اس مطالعے کے حاصل کو وہ فطرت کے "اثرات" کا نام نہیں دیتا۔ وہ اسے فطرت کے خواص تسلیم کرلیتا ہے۔[1]

13

علامہ سمجھتے تھے کہ سو سال پہلے کے جرمنی اور موجودہ مشرق میں ایک مماثلت ہے۔ سو سال پہلے جرمن قوم کا انحطاط انتہا پر تھا۔ تب جرمن شعرا نے "تحریکِ مشرقی" کی بنیاد رکھی۔ وہ مشرقی تخیل کی مدد سے انحطاط دور کر کے اپنی قوم کو توانائی فراہم کرنا چاہتے تھے۔ آج مشرق اپنے انحطاط سے نجات پانے کے لیے مغربی ادبیات سے استفادہ کر رہا تھا۔ علامہ چاہتے تھے کہ پیامِ مشرق کے دیباچے میں، جسے اُردو میں لکھ رہے تھے، جرمن ادب کی تحریکِ مشرقی کی تفصیل فراہم کریں۔ ہندوستان میں مناسب مواد دستیاب نہ ہو سکا۔ جرمنی میں تلاش کروایا۔ وہاں بھی وہ مقالہ نہ مل سکا جس کی طلب تھی۔ یادداشت پر بھروسہ کیا۔ آرتھر فرینک ریمی کی ایک مختصر کتاب اِس موضوع پر موجود تھی۔[2] نجانے کیوں مصنف کا نام وہ غلطی سے چارلس ریمی لکھ گئے۔

گوئٹے ۱۷۴۹ء میں فرینکفرٹ میں پیدا ہوا اور ۱۸۳۲ء میں ویمر میں وفات پائی۔ جوانی کے زمانے ہی سے طبیعت مشرقی تخیلات کی طرف مائل تھی۔ جرمن ادبیات کی اہم شخصیت گوٹفریڈ فان ہرڈر (Johann Gottfried von Herder) سے بھی ملاقات ہوئی۔ ہرڈر نے شیخ سعدی شیرازی کی گلستان کے بعض حصوں کا فارسی میں ترجمہ کیا تھا۔ ایک اور ہمعصر فریڈرک فان شلر (Friedrich von Schiller) نے مولانا نظامی گنجوی کی مثنوی ہفت پیکر کی چوتھی کہانی سے اپنے ڈرامے توران دُخت کا پلاٹ اخذ کیا۔

---

[1] Hoernlé (1923), p.69-72. Iqbal (1934), *Reconstruction,* pp.30-32

[2] Remy (1901) *The Influence of India and Persia on the Poetry of Germany*

پھر بھی ہرڈر، گوئٹے اور شِلر کی شاعری مجموعی طور پر مشرقی اثرات سے آزاد رہی۔ ۱۸۱۲ء میں جوزف فان ہیمر (Joseph von Hammer) کا خواجہ حافظ شیرازی کے مکمل دیوان کا جرمن ترجمہ شائع ہوا۔ ''اسی ترجمے کی اشاعت سے جرمن ادبیات میں مشرقی تحریک کا آغاز ہوا،'' علامہ نے لکھا:

> گوئٹے کی عمر اس وقت ۶۵ سال کی تھی اور یہ وہ زمانہ تھا جب کہ جرمن قوم کا انحطاط ہر پہلو سے انتہا تک پہنچ چکا تھا۔ ملک کی سیاسی تحریکوں میں عملی حصہ لینے کے لیے گوئٹے کی فطرت موزوں نہ تھی اور یورپ کی عام ہنگامہ آرائیوں سے بیزار ہو کر اُس کی بے تاب اور بلند پرواز روح نے مشرقی فضا کے امن و سکون میں اپنے لیے ایک نشیمن تلاش کر لیا۔ حافظ کے ترنم نے اُس کے تخیلات میں ایک ہیجانِ عظیم برپا کر دیا۔

اِس اثر کے تحت گوئٹے نے مغربی دیوان (*West–östlicher Divan*) تخلیق کیا۔ ۱۸۱۹ء میں شائع ہوا۔ اس طرح جرمن ادبیات میں عجمی روح پیدا کرنے کی کوشش کی۔ اُس عہد کے نوعمر شعرا نے بعد میں اس تحریک کو تکمیل تک پہنچایا۔ ان میں سے آگسٹ فان پلاٹن (August von Platen)، فریڈرک روکرٹ (Friedrich Rückert) اور فریڈرک فان بوڈن سٹاٹ (Friedrich von Bodenstedt) قابلِ ذکر ہیں۔

گوئٹے نے شیخ فریدالدین عطار، سعدی شیرازی، فردوسی نیشاپوری اور عام اسلامی ادب کا مطالعہ بھی کیا اگرچہ مولانا روم کی طرف خاص توجہ نہ گئی۔ ردیف کی قید سے غزل لکھی۔ اشعار میں فارسی استعاروں مثلاً ''گوہرِ اشعار''، ''تیرِ مژگان'' اور ''زلفِ گرہ گیر'' وغیرہ کے ترجمے استعمال کیے۔ فارسی شعرا کی طرح ہم جنس پرستی کی طرف اشارے بھی کر دیئے۔ اپنے دیوان کے حصوں کے نام فارسی میں رکھے، جیسے مغنی نامہ، ساقی نامہ، عشق نامہ، تیمور نامہ، حکمت نامہ وغیرہ۔ بعد میں آنے والے شاعروں نے ان رجحانات کی تکمیل کی۔ بوڈن سٹاٹ نے تو مرزا شفیع (Mirza Schaffy) کا قلمی نام بھی اختیار کیا۔ تحریک کے اِس تعارف کے ساتھ علامہ نے لکھا، ''ممکن ہے کہ یہ مختصر ساخاکہ کسی نوجوان کے دل میں تحقیق و تدقیق کا جوش پیدا کر دے۔''

یہ درست ہے کہ گوئٹے سے اگلی نسل کے سب سے بڑے شاعر ہنرخ ہائنا (Heinrich

(Heine نے اپنا دامن بچانے کی کوشش کی۔ پھر بھی مشرقی رنگ اُس کی شاعری میں کہیں کہیں ظاہر ہو گیا۔ ویسے وہ جرمن ادب کی مشرقی تحریک کے سرمائے میں سے صرف گوئٹے کے دیوانِ مغربی ہی کی قدر کرتا تھا، جس کے بارے میں اُس نے لکھا، "یہ ایک گلدستۂ عقیدت ہے جو مغرب نے مشرق کو بھیجا ہے... اس دیوان سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ مغرب اپنی کمزور اور سرد روحانیت سے بیزار ہو کر مشرق کے سینے سے حرارت کا متلاشی ہے۔"

علامہ نے یہ قول اپنے دیباچے میں نقل کیا۔ ساتھ ہی لکھا، "پیام مشرق کی تصنیف کا محرک جرمن 'حکیم حیات' گوئٹے کا 'مغربی دیوان' ہے۔" یہ صاف ظاہر ہے کہ جس طرح گوئٹے کچھ عرصے کے لیے اپنے تخیل میں حافظ شیرازی بن گیا تھا، اُسی طرح علامہ بھی کچھ عرصے سے اپنے اور گوئٹے کے درمیان گہری مماثلت محسوس کر رہے تھے۔ گوئٹے کی طرح اُنہوں نے بھی زمانے کی ہنگامہ آرائیوں سے تنگ آ کر تخیل کے دامن میں پناہ لے رکھی تھی۔ اتفاق سے گوئٹے کو بھی عجمی تصوّف سے کوئی دلچسپی پیدا نہ ہوئی۔ علامہ بھی عجمی تصوّف سے بیزار ہو چکے تھے۔ گوئٹے، جیسا کہ علامہ نے دیباچے میں لکھا، مشرق کے لالہ زاروں میں گیت گاتے ہوئے بھی "اپنی مغربیت کو کبھی ہاتھ سے نہیں دیتا اور اس کی نگاہ صرف انہی مشرقی حقائق پر پڑتی ہے جن کو اس کی مغربی فطرت جذب کر سکتی ہے۔" علامہ بھی مغرب کی سیر کرتے ہوئے اسلامی ثقافت سے دُور نہ ہوئے تھے۔

اس کے علاوہ دونوں ادب کے ذریعے اپنی قوم کے انحطاط کا علاج کرنا چاہتے تھے۔ گوئٹے اِس مقصد کے لیے ایک ایسی ادبی تحریک سے منسلک ہو گیا جو مشرقی ادب سے متاثر تھی۔ علامہ اُس ادبی تحریک سے منسلک تھے جو مولانا الطاف حسین حالی سے شروع ہوئی تھی۔ اس نے مشرق کا انحطاط دُور کرنے کے لیے مغربی ادب کے اثرات قبول کیے تھے۔ اگر گوئٹے جرمن ادب کی "مشرقی تحریک" کا علمبردار تھا تو حالی سے شروع ہونے والا رجحان اسلامی ادب کی "مغربی تحریک" کہلا سکتا تھا۔ علامہ اس تحریک کے سب سے بڑے علمبردار قرار دیئے جا چکے تھے۔ ان کی وجہ سے یہ اُردو تک محدود نہ رہی۔ فارسی کے ذریعے دوسری مسلم اقوام تک بھی پہنچنے لگی تھی۔

پیامِ مشرق اس بات کا اعلان بھی تھا کہ مقصد حاصل ہو چکا ہے۔ مشرق کا انحطاط دُور ہو گیا ہے۔

آیندہ کے لیے مشرقی اقوام خبردار ہو جائیں کہ توانائی فراہم کرنے والا ادب مغرب سے مزید نہیں ملے گا۔ اب اسے اپنے ضمیر میں ہی دریافت کرنا پڑے گا۔[1]

پیامِ مشرق

دیباچہ

[اقتباس]

"پیام مشرق" کے متعلق جو "مغربی دیوان" سے سو سال بعد لکھا گیا ہے مجھے کچھ عرض کرنے کی ضرورت نہیں۔ ناظرین خود اندازہ کر لیں گے کہ اس کا مدعا زیادہ تر ان اخلاقی، مذہبی اور ملّی حقائق کو پیشِ نظر لانا ہے جن کا تعلق افراد و اقوام کی باطنی تربیت سے ہے۔ اس سے سو سال پیشتر کی جرمنی اور مشرق کی موجودہ حالت میں کچھ نہ کچھ مماثلت ضرور ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اقوامِ عالم کا باطنی اضطراب جس کی اہمیت کا صحیح اندازہ ہم محض اس واسطے نہیں لگا سکتے کہ خود اس اضطراب سے متاثر ہیں، ایک بہت بڑے روحانی اور تمدّنی انقلاب کا پیشہ خیمہ ہے۔ یورپ کی جنگِ عظیم ایک قیامت تھی جس نے پرانی دنیا کے نظام کو قریباً ہر پہلو سے فنا کر دیا ہے اور اب تہذیب و تمدن کی خاکستر سے فطرت زندگی کی گہرائیوں میں ایک نیا آدم اور اُس کے رہنے کے لیے ایک نئی دنیا تعمیر کر رہی ہے جس کا ایک دھندلا سا خاکہ ہمیں حکیم آئن سٹائن اور برگساں کے تصانیف میں ملتا ہے۔ یورپ نے اپنے علمی، اخلاقی اور اقتصادی نصبُ العین کے خوفناک نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھ لئے ہیں اور سائز ینٹی (سابق وزیرِ اعظم اطالیہ) سے "انحطاطِ فرنگ" کی دلخراش داستان بھی سن لی ہے۔ لیکن افسوس ہے کہ اس کے نکتہ رس مگر قدامت پرست مدبرین اس حیرت انگیز انقلاب کا صحیح اندازہ نہیں کر سکے جو اِنسانی ضمیر میں اس وقت واقع ہو رہا ہے۔ خالص ادبی اعتبار سے دیکھیں تو جنگِ عظیم کی کوفت کے بعد یورپ کے قوائے حیات کا اضمحلال ایک صحیح اور پختہ ادبی نصب العین کی نشوونما کے لیے نامساعد ہے۔ بلکہ اندیشہ ہے کہ اقوال کی طبائع پر وہ فرسودہ۔ سُست رگ اور زندگی کی دشواریوں سے گریز کرنے والی عجمیت

---

[1] یہ تمام نکات پیامِ مشرق کے دیباچے سے لیے گئے ہیں۔

غالب نہ آجائے جو جذباتِ قلب کو افکارِ دماغ سے متمیز نہیں کر سکتی۔ البتہ امریکہ مغربی تہذیب کے عناصر میں ایک صحیح عنصر معلوم ہوتا ہے اور اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ یہ ملک قدیم روایات کی زنجیروں سے آزاد ہے اور اس کا اجتماعی وجدان نئے اثرات و افکار کو آسانی سے قبول کر سکتا ہے۔

مشرق اور بالخصوص اسلامی مشرق نے صدیوں کی مسلسل نیند کے بعد آنکھ کھولی ہے مگر اقوامِ مشرق کو یہ محسوس کر لینا چاہئے کہ زندگی اپنے حوالی میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتی جب تک کہ پہلے اُس کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب نہ ہو اور کوئی نئی دنیا خارجی وجود اختیار نہیں کر سکتی جب تک کہ اُس کا وجود پہلے انسانوں کے ضمیر میں متشکّل نہ ہو۔ فطرت کا یہ اٹل قانون جس کو قرآن نے اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَومٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوا مَابِاَ نفُسِھِم کے سادہ اور بلیغ الفاظ میں بیان کیا ہے، زندگی کے فردی اور اجتماعی دونوں پہلوؤں پر حاوی ہے اور میں نے اپنے فارسی تصانیف میں اسی صداقت کو مدِ نظر رکھنے کی کوشش کی ہے۔

اِس وقت دنیا میں اور بالخصوص ممالک مشرق میں ہر ایسی کوشش جس کا مقصد افراد و اقوام کی نگاہ کو جغرافی حدود سے بالاتر کر کے ان میں ایک صحیح اور قوی انسانی سیرت کی تجدید یا تولید ہو، قابلِ احترام ہے۔ اِسی بنا پر میں نے اِن چند اوراق کو اعلیٰحضرت فرمانروائے افغانستان کے نامِ نامی سے منسوب کیا ہے کہ وہ اپنی فطری ذہانت و فطانت سے اِس نکتے سے بخوبی آگاہ معلوم ہوتے ہیں۔ اور افغانوں کی تربیت انہیں خاص طور پر مدِّ نظر ہے۔ اِس عظیم الشان کام میں خدا تعالےٰ اُن کا حامی و ناصر ہو۔

آخر میں مَیں اپنے دوست چودھری محمدؐ حسین صاحب ایم۔ اے کا سپاس گذار ہوں کہ اُنہوں نے "پیامِ مشرق" کے مسوّدات کو اشاعت کے لئے مُرتّب کیا۔ اگر وہ یہ زحمت گوارا نہ کرتے تو غالباً اِس مجموعے کی اشاعت میں بہت تعویق ہوتی۔

اقبال

14

پیامِ مشرق کی کسی کاپی کا حصہ خالی تھا۔ علامہ نے کچھ اشعار بھجوائے۔ مسودے کے آخر میں حکیمانہ

اشعار پر مبنی حصہ 'خردہ' تھا۔ اس میں اضافے کا ارادہ ہوا۔ شیخ مبارک علی کو مختصر چٹھی لکھی۔[1] اس کے بعد کسی وقت ایک اور خط لکھا:

مندرجہ ذیل کاغذ مرسل ہیں۔

(۱) پیش کش (۲) ٹائٹل پیج۔ اس پر حسبِ فرمایش وغیرہ نہ لکھا جائے نہ کتاب کی پُشت پر کسی اور کتاب کا اشتہار دیا جائے۔ کاغذ کے ایک طرف کتاب کا نام وغیرہ ہے، دوسری طرف وسط میں لفظ "کاپی رائٹ" ہے۔ (۳) دیباچہ (۴) گزشتہ کاپی میں جو جگہ خالی رہ گئی تھی اس کے لیے اشتہار۔ مہربانی کر کے عبدالمجید سے میری طرف سے درخواست کیجیے کہ وہ اب اس کام کو ختم کر کے کہیں باہر جائے، اس سے پہلے نہ جائے کیونکہ اس تھوڑے سے کام کے لیے تمام کتاب میں دیر ہو جائے گی۔ ایک دو دن کا کام ہے اور وہ آسانی سے ایک دو روز کے لیے اپنا سفر ملتوی کر سکتے ہیں۔ اگر ان کو روکنا ناممکن ہو تو کیا یہ ممکن نہیں کہ پیش کش اور دیباچہ وغیرہ آپ کسی سے لکھوا لیں؟ مجھے اندیشہ ہے کہ عبدالمجید کو سفر میں زیادہ دن لگ جائیں گے اور کام رُکا رہے گا۔ بہرحال مَیں یہ کام آپ پر چھوڑتا ہوں۔ اگر وہ ایک دو روز کے لیے اپنا سفر ملتوی کر دیں تو ان کی مہربانی ہے، نہیں تو جس طرح آپ مناسب سمجھیں کریں۔

باقی کاپیاں جو کل ختم ہو گئی ہوں گی ارسال کیجیے کہ مَیں ان کو دیکھ لوں۔[2]

۱۱؍مارچ کی شام سرد ہوا چلی۔ علامہ نے دردِ گردہ کی آہٹ محسوس کی۔ فوراً احتیاطی تدابیر کر لیں۔ اگلی صبح خان نیازالدین خاں کا خط ملا۔ اشعار بھجوائے تھے۔ اُسی روز جواب لکھا:

رموزِ بےخودی کے ترجمے کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں، مگر اُمید نہیں کہ اس کا ترجمہ یورپ میں ہو کہ اُس کے مضمون سے یورپ والوں کو چنداں دلچسپی نہیں ہے۔

---

[1] بلا تاریخ ہے۔ مظفر حسین برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیب اقبال دوم، ص ۴۳۶

[2] بلا تاریخ ہے۔ ایضاً، ص ۳۷-۴۳۶

مسلمان ہی اس کا مفہوم سمجھ جائیں تو غنیمت ہے۔ البتہ پیام مشرق کا ترجمہ ہونا ممکن ہے، لیکن مجھے اس قدر فرصت نہیں کہ اُس کا ترجمہ کروں۔ اگر اُن کو اُس کی ضرورت محسوس ہوئی تو خود کر لیں گے۔ آپ کے اشعار خوب ہیں۔ مولوی گرامی صاحب کی خدمت میں خط لکھا تھا۔ وہ ۲۰ مارچ تک لاہور آنے کا وعدہ بھی کرتے ہیں، مگر اُمید نہیں کہ آئیں۔ [1]

۱۸/ مارچ کو کشن پرشاد کا خط ملا۔ بابا تاج الدین اولیاؒ کے حالات لکھے تھے۔ علامہ نے اگلے روز جواب دیا، ”افسوس ہے کہ پنجاب میں ہندو مسلمانوں کی رقابت بلکہ عداوت بہت ترقی پر ہے۔ اگر یہی حالت رہی تو آیندہ تیس سال میں دونوں قوموں کے لیے زندگی مشکل ہو جائے گی۔“[2]

اُس مہینے زمیندار میں پیامِ مشرق کے متعلق چودھری محمد حسین کا مضمون تین قسطوں میں صفحۂ اول پر شائع ہوا۔ قریباً آٹھ برس پہلے 'اسرارِ خودی' کے پہلے ایڈیشن میں علامہ نے حافظ شیرازی پر کچھ اعتراضات کیے تھے۔ نظرِ ثانی کے بعد کتاب سے نکال دیئے تھے۔ بعض ذہنوں میں یہ تاثر موجود تھا کہ علامہ ابھی تک حافظ کے مخالف ہیں۔ محمد حسین نے تردید کی:

> 'اسرارِ خودی' کے پرانے معترضین جنھوں نے اُس نادر و جدید مجموعۂ حکمت و شعر کی قدر تو کیا کی، شعرِ حافظ پر تنقید پر بے سوچے سمجھے چراغ پا ہو گئے، کیا آج بتائیں گے کہ گوئٹے کا دیوانِ حافظ کے جواب میں مغربی دیوان لکھنا اور آج گوئٹے کے جواب کے جواب میں اقبال کا پیامِ مشرق لکھ کر روحِ حافظ کی طرف سے جواب دینا خود حافظ علیہ الرحمۃ کی کرامت ہے یا اقبال کی طرف سے حافظ کی خدمت میں اصلی قدر دانی کا تحفہ؟ صوفی ہو کر کرامت کہہ دینا نہایت آسان ہو گا۔ ہم جب جانیں اگر سخن فہم و نکتہ

---

[1] برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۳۴

[2] برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۳۹

شناس بن کر اِس قدر دانی کی اہمیت کا اندازہ لگائیں۔ [1]

انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور کا سالانہ جلسہ

۳۱،۳۰/مارچ یوم جمعہ اور ہفتہ کو اسلامیہ ہائی سکول دروازہ شیر انوالہ میں ہو گا۔ یکم اپریل اتوار کو چونکہ شالامار باغ کا میلہ قرار پایا ہے، لہٰذا اتوار کا دن مجبوراً چھوڑنا پڑا۔

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب ایک عدیم النظیر نظم پڑھیں گے۔ برادرانِ اسلام کثرت سے شریکِ جلسہ ہو کر اس سے مستفیض ہوں اور فراخ دل سے چندہ دے کر حقِ داد اور خراجِ تحسین ادا کریں۔

غلام محی الدین، زمیندار ۲۲/مارچ ۱۹۲۳ء [2]

اشتہار دو روز بعد پھر شائع ہوا۔ اکابرین نے دعوت قبول کی تھی۔ نام درج تھے: جناب مولوی سیّد سلیمان صاحب ندوی اعظم گڑھ، جناب مولوی حاجی محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹ، جناب مولوی ابوالوفا ثناء اللہ صاحب امرتسر، جناب مولوی اصغر علی صاحب روحی ایم اوایل پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور، جناب مولوی محمد علی صاحب امیر جماعت احمدیہ لاہور، جناب آنریبل نواب سر ذوالفقار علی خان صاحب لاہور، جناب ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال صاحب ایم اے بیرسٹر ایٹ لا لاہور، جناب خواجہ دل محمد صاحب ایم اے پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور، جناب خان احمد حسین خان صاحب بی اے اڈیٹر شباب اُردو لاہور، جناب مولوی عبدالمجید صاحب وکیل لائلپور، جناب مولانا تاجور نجیب آبادی سب اڈیٹر ہمایوں لاہور، جناب نشتر صاحب جالندھری، جناب مولوی غلام قادر صاحب گرامی شاعر حضور خسرو دکن ہوشیارپور، جناب مسٹر محمد تیمور صاحب ایم اے پروفیسر اسلامیہ کالج پشاور، جناب مولانا مولوی احمد علی صاحب امام مسجد دروازہ شیر انوالہ لاہور۔ [3]

---

[1] چودھری محمد حسین کا مضمون مجھے امجد سلیم علوی نے اخبار کے فائل سے فراہم کیا۔

[2] اختر النسا (۲۰۱۰) اقبال اور زمیندار، ص ۲۱۰

[3] ایضاً

علامہ کی سلیمان ندوی کے ساتھ خط کتابت کم از کم نو دس برس سے جاری تھی۔ ملاقات نہ ہوئی تھی۔ سوچا کہ جلسے سے ساتھ لے آئیں گے۔ پھر معلوم ہوا کہ ندوی نہیں آئیں گے۔[1]

۲۴ مارچ ہی کو امریکی میگزین ٹائم کے سرورق پر مصطفیٰ کمال پاشا کی تصویر شائع ہوئی۔ نوجوان مستشرق آرنلڈ ٹوائن بی نے مضمون لکھا تھا، 'ترک اپنا مالک کہاں ہے؟'[2]

۲۶ مارچ کو شام پانچ بجے پنجاب یونیورسٹی کی سینٹ کا اجلاس وائس چانسلر سر جوہن مینارڈ کی صدارت میں ہوا۔ سات ارکان اکیڈمک کونسل کے لیے نامزد ہوئے۔ علامہ اقبال بھی تھے۔[3]

15

تاریخ کے دھارے نے اپنا رُخ پھر تبدیل کر لیا ہے۔ ایک دفعہ پھر ہمارے دل و دماغ اور ہماری سیاست کے لیے روشنی مشرق کی طرف سے آ رہی ہے۔ آج پھر مغرب کو مشرق سے سبق سیکھنا ہو گا۔ ہماری طرح ترکوں نے بھی جنگِ عظیم میں شکست کھائی تھی۔ جو ذلت ہم اُٹھا رہے ہیں وہی اُن کی جھولی میں بھی پھینکی گئی تھی۔ اُنہوں نے کیسے عزم و یقین کے ساتھ کہا ہے، "ہرگز نہیں!" کاش ہمیں بھی ویسا ہی رہنما میسر آ جائے جیسا ترکوں نے غازی مصطفیٰ کمال پاشا کی صورت میں دریافت کیا ہے۔

اِس قسم کے خیالات جرمنی کے وطن پرست اخبارات میں عام ہو چلے تھے۔[4] غازی پاشا کے لیے "فیوہرر" (Führer) کا لقب استعمال ہوتا تھا۔[5] جرمن زبان میں راہبر یا رہنما کو کہتے تھے۔ متاثر ہونے والوں میں ایک چھوٹی سی سیاسی تنظیم کا چونتیس سالہ کارکن اڈولف ہٹلر (Adolf Hitler) بھی

---

[1] مکتوب بنام سید سلیمان ندوی ۴ر جولائی ۱۹۲۳ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۶۱

[2] Arnold J. Toynbee (1924), 'Where is a Turk his own master?'

[3] ڈاکٹر حسن اختر ملک، اقبال، ایک تحقیقی مطالعہ، ص ۱۲۵-۱۲۴

[4] Stefan Ihrig (2014), *Ataturk in the Nazi Imagination*, pp.43-50 تلخیص میری اپنی ہے۔

[5] ایضاً ص ۴۲۔ نیز باب ۴ جس کا موضوع یہی ہے۔

تھا۔ پچھلی جنگ میں جرمنی کی شکست پر ہمت ہار بیٹھا تھا۔ "فیوہرر" کے کارناموں سے ہٹلر نے پھر ہمت پکڑی۔ بعد میں کہا، "مصطفیٰ کمال پاشا کا پہلا شاگرد مسولینی تھا اور دُوسرا میں تھا۔"[1]

علامہ یقیناً باخبر رہے ہوں گے کہ جرمنی میں "فیوہرر پاشا" کے بارے میں کیا لکھا جا رہا ہے۔ وہاں اُن کے دوست اور مداح موجود تھے۔ جنگ کے خاتمے پر خط کتابت بحال ہو چکی تھی۔ انجمن حمایتِ اسلام کے لیے جو نظم لکھ رہے تھے، اُس میں اِن خیالات کی بازگشت سنی جا سکتی تھی۔ یہاں تک کہہ دیا تھا کہ تورانی (ترک)، المانی (جرمن) سے زیادہ پایندہ نکلا ہے۔[2]

انجمن کا اڑتیسواں سالانہ اجلاس ۳۰ مارچ کو لاہور میں اسلامیہ ہائی اسکول دروازہ شیرانوالہ میں شروع ہوا۔ دو روز جاری رہنا تھا۔

۳۱ مارچ کو دوسرے دن کی کاروائی شروع ہوئی۔[3] اُسی روز لاہور سے دُور لکھنؤ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا پندرھویں سالانہ اجلاس شروع ہوا۔[4] لیگ کے آئین کے مطابق صدر کا انتخاب تین برس کے لیے ہوتا تھا۔ ان دنوں محمد علی جناح صدر تھے۔ کچھ عرصے سے جماعت کی حالت خراب تھی۔ گزشتہ برس سالانہ اجلاس بھی نہ ہو سکا تھا۔ ۱۰۹۷ رُکن تھے۔ صرف ۲۶۴ نے اس برس رکنیت کی فیس ادا کی تھی۔[5] سالانہ اجلاس کے اعزازی صدر میر غلام محمد بھرگری تھے۔ استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین لیفٹننٹ شیخ شاہد حسین تھے۔ خطبۂ استقبالیہ میں کہا، "خلافت کا مسئلہ خلافت کے محافظوں کی تلوار نے حل کر دیا ہے جن کی قیادت اسلام کے عظیم ہیرو، غازی مصطفیٰ کمال پاشا کر رہے ہیں۔" بھرگری نے خطبۂ صدارت میں کہا کہ مشرقِ وسطیٰ اور عرب علاقوں کے بارے میں ترکوں، عربوں

---

[1] ایضاً صفحات ۱۱۶-۱۱۵

[2] نظم 'طلوعِ اسلام'۔ دیکھیے ۳۱ مارچ ۱۹۲۳ء۔ اُس وقت یہی مطلب لیا گیا۔ مثلاً زمیندار میں منتخب بند شائع ہوئے تو "عقابی شان سے جھپٹے تھے جو بے بال و پر نکلے" والے بند کے ساتھ لکھا گیا کہ یہاں جرمنی اور ترکی کا موازنہ ہے۔

[3] اختر النسا (۲۰۱۰)، اقبال اور زمیندار، ص ۲۱۰

[4] Mitra: *The Indian Annual Register 1923, Vol. 1,* p.929

[5] Muhammad Rafique Afzal (2013), p.160

اور ہندستانیوں کا موقف ایک ہے۔ عربوں کو حقِ خود ارادیت ملنا چاہیے۔ "جمعیتِ اقوامِ مشرق" قائم کرنے کی ضرورت ہے۔

شام ڈھلے سبجکٹس کمیٹی کی میٹنگ ہوئی۔ لیگ نے ۱۹۲۰ء میں انتخاب کے بائیکاٹ کی قرارداد منظور کی تھی۔ اس برس دوبارہ انتخاب ہونے والے تھے۔ جناح چاہتے تھے کہ لیگ حصہ لے۔ میٹنگ طویل ہوتی چلی گئی۔[1]

یہی وقت تھا جب لاہور میں انجمن کے سالانہ جلسے کا آخری اجلاس شروع ہوا۔ تلاوت ہوئی۔ پھر علامہ نے ترنم کے ساتھ نظم سنائی۔[2]

طلوعِ اسلام

دلیلِ صبح روشن ہے ستاروں کی تنک تابی
افق سے آفتاب اُبھرا، گیا دَورِ گراں خوابی
عروقِ مردۂ مشرق میں خونِ زندگی دوڑا
سمجھ سکتے نہیں اِس راز کو سینا و فارابی
مسلماں کو مسلماں کر دیا طوفانِ مغرب نے
تلاطم ہائے دریا ہی سے ہے گوہر کی سیرابی
عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی، ذہنِ ہندی، نطقِ اعرابی
اثر کچھ خواب کا غنچوں میں باقی ہے تو اے بلبل!
"نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی"
تڑپ صحنِ چمن میں، آشیاں میں، شاخساروں میں

---

[1] Mitra: *The Indian Annual Register 1923, Vol. 1,* pp.929-935

[2] محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶)، اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص ۸۹-۸۸

جدا پارے سے ہو سکتی نہیں تقدیرِ سیمابی
وہ چشمِ پاک بیں کیوں زینتِ برگستواں دیکھے
نظر آتی ہے جس کو مردِ غازی کی جگرتابی

ضمیر لالہ میں روشن چراغِ آرزو کر دے
چمن کے ذرّے ذرّے کو شہیدِ جستجو کر دے

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہؑ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا
ربود آں ترکِ شیرازی دلِ تبریز و کابل را
صبا کرتی ہے بوئے گل سے اپنا ہمسفر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا
جہاں بانی سے ہے دشوار تر کارِ جہاں بینی
جگر خوں ہو تو چشمِ دل میں ہوتی ہے نظر پیدا
ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا
نواپیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

ترے سینے میں ہے پوشیدہ رازِ زندگی کہہ دے
مسلماں سے حدیثِ سوز و سازِ زندگی کہہ دے

خدائے لم یزل کا دستِ قدرت تُو، زباں تُو ہے
یقیں پیدا کر اے غافل کہ مغلوبِ گماں تُو ہے
پرے ہے چرخِ نیلی فام سے منزل مسلماں کی
ستارے جس کی گردِ راہ ہوں، وہ کارواں تُو ہے
مکاں فانی، مکیں آنی، ازل تیرا، ابد تیرا
خدا کا آخری پیغام ہے تُو، جاوداں تُو ہے
حنابندِ عروسِ لالہ ہے خونِ جگر تیرا
تری نسبت براہیمی ہے، معمارِ جہاں تُو ہے
تری فطرت امیں ہے ممکناتِ زندگانی کی
جہاں کے جوہر مضمر کا گویا امتحاں تو ہے
جہانِ آب و گل سے عالمِ جاوید کی خاطر
نبوت ساتھ جس کو لے گئی وہ ارمغاں تُو ہے
یہ نکتہ سرگزشتِ ملتِ بیضا سے ہے پیدا
کہ اقوامِ زمینِ ایشیا کا پاسباں تُو ہے
سبق پھر پڑھ صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دُنیا کی اِمامت کا
یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمزِ مسلمانی
اخوت کی جہاں گیری، محبت کی فراوانی
بتانِ رنگ و خوں کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ تورانی رہے باقی، نہ ایرانی نہ افغانی
میانِ شاخساراں صحبتِ مرغِ چمن کب تک!

ترے بازو میں ہے پروازِ شاہینِ قہستانی
گمان آبادِ ہستی میں یقیں مردِ مسلماں کا
بیاباں کی شبِ تاریک میں قندیلِ رہبانی
مٹایا قیصر و کسریٰ کے استبداد کو جس نے
وہ کیا تھا، زورِ حیدرؓ، فقر بوذرؓ، صدقِ سلمانیؓ
ہوئے احرارِ ملت جادہ پیما کس تجمل سے
تماشائی شگافِ در سے ہیں صدیوں کے زندانی
ثباتِ زندگی ایمانِ محکم سے ہے دنیا میں
کہ اَلمانی سے بھی پائندہ تر نکلا ہے تُورانی

جب اِس انگارۂ خاکی میں ہوتا ہے یقیں پیدا
تو کر لیتا ہے یہ بال و پرِ رُوح الامیں پیدا

غلامی میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
کوئی اندازہ کر سکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا!
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں
ولایت، پادشاہی، علمِ اشیا کی جہاں گیری
یہ سب کیا ہیں، فقط اِک نکتۂ ایماں کی تفسیریں
براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں
تمیزِ بندہ و آقا فسادِ آدمیّت ہے
حذر اے چیرہ دستاں! سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

حقیقت ایک ہے ہر شے کی، خاکی ہو کہ نوری ہو
لہو خورشید کا ٹپکے اگر ذرّے کا دل چیریں
یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مَردوں کی شمشیریں

چہ باید مرد را طبع بلندے، مشرب نابے
دلِ گرمے، نگاہِ پاک بینے، جانِ بیتابے

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو، بے بال و پر نکلے
ستارے شام کے خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے
ہوئے مدفونِ دریا زیر دریا تیرنے والے
طمانچے موج کے کھاتے تھے جو، بن کر گہر نکلے
غبارِ رہ گزر ہیں، کیمیا پر ناز تھا جن کو
جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو، اکسیر گر نکلے
ہمارا نرم رَو قاصد پیامِ زندگی لایا
خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بیخبر نکلے
حرم رسوا ہوا پیر حرم کی کم نگاہی سے
جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے
زمیں سے نوریانِ آسماں پرواز کہتے تھے
یہ خاکی زندہ تر، پائندہ تر، تابندہ تر نکلے
جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیرِ ملت ہے

یہی قوت ہے جو صورت گرِ تقدیرِ ملت ہے

تو رازِ کن فکاں ہے، اپنی انکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا
ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل! اُچھل کر بے کراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تُو اے مرغِ حرم! اُڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا
خودی میں ڈوب جا غافل! یہ سرِ زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا
مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گزر جا بن کے سیلِ تند رَو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

ابھی تک آدمی صیدِ زبونِ شہریاری ہے
قیامت ہے کہ انساں نوعِ انساں کا شکاری ہے
نظر کو خیرہ کرتی ہے چمک تہذیبِ حاضر کی
یہ صناعی مگر جھوٹے نگوں کی ریزہ کاری ہے

وہ حکمت ناز تھا جس پر خردمندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجۂ خونیں میں تیغِ کارزاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بنا سرمایہ داری ہے
عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی، جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے
خروش آموزِ بلبل ہو، گرہ غنچے کی وا کر دے
کہ تو اس گلستاں کے واسطے بادِ بہاری ہے
پھر اٹھی ایشیا کے دل سے چنگاری محبت کی
زمیں جولاں گہِ اطلس قبایانِ تتاری ہے

بیا پیدا خریدارست جانِ ناتوانے را
"پس از مدت گذار افتاد بر ما کاروانے را"

بیا ساقی نوائے مرغِ زار از شاخسار آمد
بہار آمد نگار آمد، نگار آمد قرار آمد
کشید ابرِ بہاری خیمہ اندر وادی و صحرا
صدائے آبشاراں از فرازِ کوہسار آمد
سرت گردم تو ہم قانونِ پیشیں ساز دہ ساقی
کہ خیلِ نغمہ پرداز اں قطار اندر قطار آمد
کنار از زاہداں برگیر و بیباکانہ ساغر کش
پس از مدت ازیں شاخِ کہن بانگِ ہزار آمد
بہ مشتاقاں حدیثِ خواجۂ بدر و حنین آور

تصرف ہائے پنہانش بچشمم آشکار آمد
دگر شاخِ خلیلؑ از خونِ ما نمناک می گردد
ببازارِ محبت نقدِ ما کامل عیار آمد
سرِ خاکِ شہیدے برگہائے لالہ می پاشم
کہ خونش با نہالِ ملتِ ما سازگار آمد
"بیا تا گل بیفشانیم و مے در ساغر اندازیم
فلک را سقف بشگافیم و طرحِ دیگر اندازیم"[1]

16

عبدالمجید سالک نے بعد میں لکھا، "حقیقت یہ ہے کہ 'خضرِ راہ' اور 'طلوعِ اسلام' نے اُس زمانے میں مسلمانوں کو بہت بڑا اسہارا دیا۔ اور اُن کے جذبات و خیالات کو ایک طوفانی دَور کے بعد صراطِ مستقیم پر لگانے میں بڑا کام کیا۔"[2] غالباً آخری موقع تھا کہ علامہ نے اس طرح مجمعِ عام میں کوئی طویل نظم سنائی۔ اُن کے مداح جلیل قدوائی کا کہنا ہے، "اس کے بعد آپ کا کلام مجموعوں کی شکل میں یکے بعد دیگرے بازار میں آیا۔ متفرق کلام آپ نے نہ سنایا نہ رسالوں میں شائع کرایا۔" قدوائی کے مطابق ایک موقع پر علامہ نے یہ وجہ بتائی کہ اُن کی شاعری قوم کی اصلاح کے لیے تھی۔ خاطر خواہ نتیجہ بر آمد نہ ہوا۔[3]

اگلے روز یکم اپریل تھی۔ عبداللہ چغتائی کا بیان ہے کہ صبح آٹھ نو بجے علامہ کی کوٹھی پر آئے۔ مشہور مصوّر عبدالرحمٰن چغتائی کے بھائی تھے۔ کافی عرصہ سے لدھیانہ میں ایک اسکول میں پڑھا رہے تھے۔ علامہ انہیں "ماسٹر صاحب" کہتے تھے۔ آج اپنے دوست راؤ علی محمد خاں کو ساتھ لائے تھے۔ وہ لدھیانہ کے قریب رائے کوٹ کے رہنے والے تھے۔ کئی برس بعد امریکہ سے واپس آئے تھے۔

---

[1] بانگِ درا

[2] عبدالمجید سالک (۱۹۸۳) ذکرِ اقبال، ص ۱۱۱-۱۱۰

[3] قدوائی کا انٹرویو سیارہ مئی ۱۹۶۳ء؛ شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۲۸۰؛ نیز دیکھیے ۲۲ر نومبر ۱۹۲۹ء کے واقعات

امریکہ کی مسلم ایسوسی ایشن کے صدر چودھری رحمت علی خاں نے راوؤ کے ہاتھ علامہ کے لیے کتاب بھجوائی تھی۔ عبداللہ نے پیش کی۔

چغتائی کی روایت ہے کہ علامہ نے خوشی کا اظہار کیا۔ فوراً عینک لگا کر مطالعہ شروع کر دیا۔ چغتائی اور راوؤ نے رخصت طلب کی۔ سہ پہر تین چار بجے کے قریب چغتائی واپس آئے۔ علامہ کتاب کا مطالعہ کر چکے تھے۔ چغتائی ہمیشہ محسوس کرتے تھے جیسے چند لمحوں میں پوری کتاب کا لُبِ لباب علامہ کے سامنے آجاتا ہو۔

چغتائی کو دیکھ کر کہا، ''ماسٹر !وہ کتاب جو تم دے گئے تھے بہت دلچسپ ہے۔ اُس میں ایک مقام ایسا بھی ہے جس کی تحقیق لازمی ہے۔'' صفحہ ۹۰/ پر تھا۔ علامہ نے نشان لگا لیا تھا۔ لکھا تھا کہ حنفی اور معتزلہ فقہ میں اجماع قرآن و سنت کی نص کو منسوخ کر سکتا ہے۔ حوالہ موجود نہ تھا۔ علامہ کے نزدیک یہ بیان درست نہ تھا۔[1]

اُس روز لکھنؤ میں لیگ کے اجلاس میں انتخاب میں حصہ لینے کے حق میں جناح کی قرارداد مسترد ہو گئی۔ فریقین کے درمیان ٹھن گئی۔ اجلاس غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کرنا پڑا۔[2]

17

علامہ کے حسابات منشی طاہر الدین تیار کرتے تھے۔ گزشتہ برس یکم اپریل سے اس برس ۳۱/ مارچ تک تشخیص شدہ آمدنی ۱۹۲۷/ روپے ہوئی تھی۔ پیشہ ورانہ اخراجات نکال کر یہ رقم متعین کی جاتی تھی۔ اس دفعہ کی تشخیص شدہ آمدنی میں یونیورسٹیوں سے ۲۰۰۹/ روپے اور وکالت سے ۲۰۶۸/ روپے شامل تھے۔ ۱۴۵/ روپے ''سود'' بھی تھا۔ خیال ہے کہ بنک سے حاصل ہوا۔ فتوے موجود تھے۔ رقم بنک سے وصول نہ کی جاتی تو مشنری اداروں اور عیسائیت کے فروغ میں صرف ہوتی۔ بعض مسلمان

---

[1] عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۳۰۰-۲۹۹۔ اغنیدس سے یہ اقتباس علامہ نے تشکیلِ جدید کے چھٹے خطبے میں نقل کیا؛ Iqbal (1934), p.162

[2] Mitra: *Register 1923, Vol. 1,* pp.935; and Afzal (2013), p.163

وصول کر کے غربا میں تقسیم کر دیتے تھے۔ ۲۲۴ روپے ٹیکس عائد ہوا۔[1]

پنجاب یونیورسٹی کے بی اے کے عام نصاب میں، جسے "پاس کورس" کہا جاتا تھا، اسلامی تاریخ کا مضمون غالباً اُسی برس شامل کیا گیا۔ علامہ پنجاب یونیورسٹی کے لیے بی اے آنرز اور ایم اے کے پرچے جانچنے والے تھے۔ دونوں جماعتوں میں فلسفہ کے مضمون کا پہلا پرچہ ان کے پاس تھا۔[2]

18

غلام احمد مہجور کشمیری کا تعلق ایک صوفی گھرانے سے تھا۔ کشمیر میں محکمۂ بندوبست میں پٹواری تھے۔ خوشی محمد ناظر کے دوستوں میں سے تھے۔ علامہ سے بھی ملاقات تھی۔ اپنی کتاب حیاتِ رحیم بھیجی۔ ۶ اپریل کو علامہ نے تعریف کرتے ہوئے لکھا، "بالخصوص کشمیر کے شعرا کے تذکرے کی طرف جلد توجہ کیجیے۔"[3]

'طلوعِ اسلام' کتابچے کی صورت میں شائع ہو گئی۔ "مبارک علی صاحب تاجرِ کتب لوہاری دروازہ، لاہور سے چار آنے میں مل سکتی ہے،" ۶ اپریل کے زمیندار میں لکھا گیا، "قارئینِ کرام ضرور منگا کر ملاحظہ فرمائیں۔"[4]

۹ اپریل کو امیر امان اللہ خاں نے "نظام نامۂ اساسیٔ دولتِ عالیۂ افغانستان" نافذ کیا۔ نیا آئین تھا۔ اسلام ریاست کا مذہب تھا۔ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کو بھی برابر حقوق دیئے گئے۔ غلامی ممنوع قرار پائی۔ بادشاہت موروثی تھی مگر عوام کی رضامندی اور آئین کی پابند قرار پائی۔

یہ امیر امان اللہ کی متعدد اصطلاحات میں سے ایک تھی۔ تعلیم لازمی قرار دی جا رہی تھی۔ لڑکیوں کے لیے بھی اسکول کھولے گئے تھے۔ شادی کے لیے لڑکی کی کم سے کم عمر اٹھارہ برس قرار

---

[1] صفدر محمود (۱۹۷۳)، 'علامہ اقبال کا گوشوارۂ آمدنی'

[2] ملک حسن اختر (۱۹۸۸)، ص ۱۳۱۔ بحوالہ پنجاب گزٹ حصہ سوم ۴ مئی ۱۹۲۳ء ص ۲۰۱ اور ۲۰ جولائی ۱۹۲۳ء ص ۲۵۹

[3] برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۴۱

[4] اختر النسا (۲۰۱۰) اقبال اور زمیندار، ص ۱۳۵

پائی۔ جبری شادی پر پابندی لگائی جارہی تھی۔ خواتین کے لیے پردے کی قید ختم کردی گئی تھی۔

مصر میں بھی ایک نئے آئین کی تیاریاں تھیں۔ سلطان فواد اول کی بادشاہت کو دستوری بادشاہت میں تبدیل کرنے کی کوشش تھی۔ جمہوریت کی طرف پیش رفت ہورہی تھی۔

محمد دین فوق نے چودھری محمد حسین کے قلم سے نکلا ہوا اقبال کے مضمون کا ترجمہ کتابچے کی صورت میں شائع کردیا۔ موجودہ حالات کی مطابقت سے نیا عنوان دیا: خلافتِ اسلامیہ۔ "عرضِ حال" کے آخر میں ۲۳ر مارچ ۱۹۲۳ء کی تاریخ درج تھی۔ کتابچہ اوائل اپریل میں شائع ہوا ہوگا۔

ظفر برادرس تاجرانِ کتب لاہور کا سلسلۂ تالیفات ۹

خلافتِ اسلامیہ

جس میں بتایا گیا ہے کہ جمہوریتِ اسلام اور آئینِ انتخابِ خلیفہ
مذہب وسیاست کا مشترک وواحد مطمحِ نظر ہے

از

علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی بیرسٹر ایٹ لا

مترجمہ

چودھری محمد حسین صاحب۔ ایم۔ اے

ظفر برادرس تاجرانِ کتب "ظفر منزل" لاہور نے ۱۹۲۳ء میں چھپوایا

قیمت ۳ر

اسلامیہ سٹیم پریس لاہور میں باہتمام مولوی عبدالرشید مینجر چھپی

مضمون کے ترجمے کے بعد دریوزۂ خلافت والے اشعار 'حکومت و خلافت' کے عنوان سے شامل تھے۔ غالباً اسی وجہ سے غلط فہمی پیدا ہوئی کہ علی برادران پر طنز ہے۔ ورنہ جب اشعار لکھے گئے، اُس وقت وفد میں شریک ہونے والوں کے نام طے نہیں پائے تھے۔ طریقِ کار بھی متعین نہ ہوا تھا۔ اشعار سلیمان ندوی کے رسالے میں شائع ہوئے جو بعد میں خود بھی وفد کا حصہ بنے۔

کتابچے کے آخر میں مطبوعات کے اشتہار تھے۔ فوق کی تاریخ حریتِ اسلام پر علامہ کی رائے درج تھی۔ علامہ نے مسلمانوں کے لیے کتاب کی اہمیت بتانے کے بعد کہا تھا، ''اس زمانہ میں جبکہ جمہوریت کی رُوح ہندوستان میں نشوونما پارہی ہے دیگر اہلِ ملک کے لیے بھی یہ کتاب سبق آموز ہوگی۔'' شیخ جان محمد الہ بخش تاجرانِ کتب لاہور بنگلہ ایوب شاہ کی طرف سے علامہ کی منظومات کا اشتہار تھا۔ مثنوی اسرارِ خودی کے لیے لکھا تھا، ''چاہئیے کہ ہمارے خطیب اور آئمہ ٔ مساجد مثنوی مولانا روم کے ساتھ ساتھ اسکے اشعار سے بھی اپنے مقتدیوں کو وعظ و نصیحت کیا کریں۔'' رموزِ بیخودی کے بارے میں درج تھا، ''ہمارے آئمہ ٔ مساجد کا فرض ہونا چاہئیے کہ وہ اسے ہر خطبہ ٔ جمعہ میں اپنے مقتدیوں کو پڑھ کر سنایا کریں۔ اور اس کے مطالب کو اُن کے ذہن نشین کیا کریں۔''

19

ہندو مسلم فسادات کی عام وجوہات یہ تھیں: نماز کے وقت مسجد کے باہر سے ہندوؤں کے جلوس باجے بجاتے ہوئے گزرتے تھے۔ مسلمان گائے ذبح کرتے تھے۔ پیپل کا درخت ہندوؤں کے نزدیک مقدس تھا۔ محرم کے جلوس کا تعزیہ راہ میں آنے والے پیپل کی شاخوں سے اونچا ہو تو مسئلہ تھا۔

کچھ خاص وجوہات بھی تھیں۔ سنگھٹن تحریک شروع ہوئی۔ مقصد ہندوؤں کی جتھہ بندی تھا کہ ''دشمنوں'' سے نمٹ سکیں۔ سوامی شردھانند نے شدھی شروع کی۔ مقصد مسلمانوں کو ہندو بنانا تھا۔ میاں فضل حسین کو پنجاب میں وزارت ملی۔ وہ سرکاری ملازمتوں اور تعلیمی اداروں میں مسلمانوں کو وہ حصہ دلوانے لگے جسے میثاقِ لکھنؤ میں کانگریس نے منظور کیا تھا۔ کئی سکھ اور ہندو ناخوش ہوئے۔

اپریل کے آغاز میں سوامی شردھانند نے اعلان کیا کہ ہزاروں ملکانہ راجپوت اسلام چھوڑ کر ہندومت میں واپسی پر تیار ہیں۔ پھر امرتسر میں خبر مشہور ہوئی کہ مسلمان بدمعاشوں نے ایک ہندو لڑکی پر مجرمانہ حملہ کیا ہے۔ زبردست فساد ہوا۔ فوج بلوانی پڑی۔ کانگریسی رہنماؤں نے پنجاب کا دورہ کیا۔ ان میں سی آر داس، سروجنی نائیڈو، مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت موتی لال نہرو شامل تھے۔

معلوم نہیں اس موقع پر علامہ اقبال اور سی آر داس کی ملاقات ہوئی یا نہیں۔ البتہ مولانا

بوالکلام نے میاں عبدالعزیز کی کوٹھی پر مسلم رہنماؤں کا جلسہ کیا۔ علامہ بھی شریک ہوئے۔ مولانا نے کہا کہ مسلمانوں کو بیس کروڑ ہندوؤں کے دل اپنے قبضے میں لینے چاہییں۔ علامہ نے جواب دیا کہ پنجاب کے ایک کروڑ ہندوؤں کے دل اپنے قبضے میں لینے کا ذمہ ہم مسلمانانِ پنجاب لیتے ہیں۔ بقیہ انیس کروڑ کو "بنگالہ کا سحر" مسحور کرے گا۔ مراد مولانا آزاد یا چت رنجن داس یا دونوں تھے۔

کسی مسلمان اخبار نے خبر لگائی کہ علامہ نے فرمایا کہ گیارہ کروڑ ہندوؤں کا ذمہ لیا جا سکتا ہے۔ ہندو اخبارات نے "ذمہ لینے" کا کچھ اور مطلب سمجھا۔ تنقید شروع ہوئی۔ زمیندار نے تصحیح کی ضرورت محسوس کی۔[1]

20

مولانا گرامی نے غزل کہی۔ ایک شعر علامہ کو خاص طور پر پسند آیا۔ آنحضور صلیٰ اللہ علیہ وسلم کے چاند کو دو ٹکڑے کرنے کے معجزے کو فقر کی سپہ سالاری قرار دیا تھا:

فقر را تر کمانئے ہم ہست　　　ماہ را برفلک دو نیم کند

علامہ نے تضمین لکھی۔ شعر میں بیان کیے ہوئے نکتے کو "رمزِ ترک و خلافتِ عربی" قرار دیا۔ بندش پسند نہ آئی۔ پیامِ مشرق میں شامل نہ کی۔[2]

۱۵/اپریل کے لگ بھگ علامہ لدھیانہ گئے۔ دوسری بیوی مختار بیگم کا میکہ تھا۔[3] ۱۶/اپریل کو شیخ فیض محمد کا خط ملا۔ کوئی تعلیمی تحریک چلانا چاہتے تھے۔ علامہ نے اُسی وقت جواب لکھا، "میری رائے میں اس وقت مسلمان لڑکوں اور لڑکیوں کی تعلیم میں انقلاب کی ضرورت ہے۔ گذشتہ پچاس سال کی تعلیمی مساعی کا نتیجہ ہمارے سامنے ہے اور یہ نتیجہ کس طرح بھی امید افزا نہیں ہے۔ اگر اس وقت حالات میں تبدیلی نہ لائی گئی تو مسلمانوں کی آیندہ نسل کا خدا حافظ ہے۔ آپ کی تحریک سے مجھے دلی

---

[1] اختر النسا (۲۰۱۰)، اقبال اور زمیندار، ص ۱۲۲-۱۲۱

[2] مکتوب بنام سید سلیمان ندوی ۵/جولائی ۱۹۲۴ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۶۱

[3] مکتوب بنام گرامی ۲۴/اپریل ۱۹۲۳ء؛ ایضاً، ص ۴۴۵، ۴۴۶

ہمدردی ہے...‘‘[1]

۷ار اپریل کو عبدالماجد دریا آبادی کو جواب لکھا۔ مولانا روم کے ملفوظات کا مجموعہ ناپید تھا۔ تین برس پہلے رامپور کے کتب خانے میں عبدالماجد کو ملا۔ انہوں نے علامہ کو لکھا تھا۔ علامہ نے لکھا:

مجھے آپ سے قلبی تعلق ہے اس واسطے ہمیشہ آپ کے خط سے مسرت ہوتی ہے... مولانا کی کتاب فیہ مافیہ کو آپ خود ایڈٹ کریں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یورپ میں وسائل ایڈٹ کرنے کے بہت زیادہ ہیں، لیکن آخر ہندی مسلمانوں کو بھی تو یہ کام کچھ نہ کچھ شروع کرنا ہے۔ میری رائے میں آپ یہ ضروری کام خود کریں بعد میں یورپین ایڈیشن بھی نکل آئے گی۔ جوہر کے نعتیہ کلام کو میں نے بھی خاص طور پر نوٹ کیا ہے، بلکہ میں تو ان کے رُوحانی انقلاب کو ایک مدت سے دیکھ رہا ہوں۔[2]

دو روز بعد لاہور سے زمیندار میں پیامِ مشرق کے متعلق طویل ادارتی نوٹ شائع ہوا۔ کاپیاں کتابت ہو چکی تھیں۔ کتاب چھپ رہی تھی۔ آٹھ دس دن میں اشاعت کی توقع تھی:

ہندوستان کی سرزمین میں جس شخص کی نظر سب سے پہلے وحدت اسلامی کی حقیقت پر پہنچی اور جس نے سب سے پہلے یہاں وطن، نسل، رنگ اور خون کے غیر اسلامی رشتوں کو توڑ کر مذہب کی صحیح اسلامی اساس قومیت کی دعوت دی، وہ علامہ اقبال ہیں...

اگر آج اقبال یورپ کے کسی ملک میں ہوتا تو اس کی ایک ایک نظم موتیوں سے تلتی لیکن قدرت نے اسے ایک غلام، محکوم اور اپنی اصل سے دور افتادہ قوم کو حقیقی زندگی کی راہ دکھانے اور اسے اپنا بھولا ہوا سبق یاد کرانے کے لیے ہندوستان میں پیدا کیا۔ وہ موتیوں کا طالب نہیں ہے، گوہروں کا آرزومند نہیں ہے، دولت اور عزوجاہ کا خواہاں نہیں ہے، صرف یہ چاہتا ہے کہ اس کی بربطِ وجود سے زندگی کی جو نوا نکلتی ہے،

---

[1] برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۴۱، ۴۴۳

[2] ایضاً، ص ۴۴۳، ۴۴۴

لوگ اُس کی حقیقت کو سمجھیں اور وہ جو صحیح اور سچا اسلامی راستہ دکھا رہا ہے، اُس کی پیروی کریں۔[1]

شاہ ولی اللہ دہلوی نے تفہیماتِ الٰہیہ میں وارداتِ قلبی اور وجدانی مضامین درج کیے تھے۔ ان دنوں علامہ کو اس کتاب کی جستجو ہوئی۔[2]

۲۴/ اپریل کو مولانا گرامی کا خط لاہور سے ہوتا ہوا لدھیانہ پہنچا۔ مولانا عبدالرحمٰن جامی کی غزل پر دو شعر لکھ کر بھیجے تھے۔ علامہ نے اُسی روز جواب میں لکھا، ''اردو نثر میں بھی ایک کتاب لکھ رہا ہوں۔ انشاٗاللہ شائع ہونے پر آپ کی خدمت میں ارسال ہوگی۔''[3] اُردو نثر میں چار کتابیں اس کے بعد سامنے آئیں۔ علامہ نے اپنے شاگرد حکیم احمد شجاع کے ساتھ مل کر تالیف کیں۔ درسی کتابیں تھیں۔ اردو کورس کے نام سے اگلے برس اشاعت شروع ہوئی۔[4]

21

لدھیانہ سے لاہور واپسی غالباً ۲۵/ اپریل کو ہوئی۔[5] پھر مہاراجہ کشن پرشاد کا خط ملا۔ ۲۳/ اپریل کو لکھا گیا تھا۔ چھوٹے صاحبزادے مسہری پر گرے تھے۔ آنکھ کے نیچے کیل چُبھ گیا۔

ایک ہندو جوگی کا بیس پچیس برس پہلے کا واقعہ بھی شاد نے درج کیا تھا۔ اجمیر سے چھ میل دُور لشکر کی سنگلاخ پہاڑیوں میں رہا کرتے۔ ایک لڑکی اُن کے پاس روزانہ آتی۔ ایک روز دو مردوں اور ایک عورت نے اُسے پکڑ لیا۔ دعویٰ تھا کہ ساس، سسر اور شوہر ہیں۔ لڑکی نے فریاد کی۔ جوگی نے کہا کہ اگر لڑکی ہے تو لے جائیں، لڑکا ہے تو نہیں لے جا سکتے۔ پہلے وہ لوگ ہنسے۔ پھر معلوم ہوا کہ لڑکی سچ

---

[1] اختر النسا (۲۰۱۰)، اقبال اور زمیندار، ص ۸۳-۷۸

[2] مکتوب بنام سلیمان ندوی ۴/ جولائی ۱۹۲۳ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۶۱

[3] برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۴۶، ۴۴۵

[4] دیکھیے ۱۹۲۴ء کے واقعات

[5] مکتوب بنام گرامی ۲۴/ اپریل ۱۹۲۳ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۴۶، ۴۴۵

مچ لڑکا بن گئی تھی۔ شاد نے ایک مسلمان عامل سے سنا تھا۔ اُس کا دعویٰ تھا کہ موقع پر موجود تھا۔ شاد نے لکھا، "ہائے! اب بھی کہیں ایسا فقیر، ایسا سالک، ایسا مجذوب کوئی ہے؟ کیوں کر کہوں کہ نہیں ہے، ہے مگر ہماری آنکھوں سے نہاں۔"[1] علامہ بیمار تھے۔ کئی روز تک جواب نہ دے سکے۔[2]

۲۹/ اپریل کے زمیندار میں ادارے کی طرف سے پیامِ مشرق کے بارے میں اعلان شائع ہوا:

> یہ نادرہ روزگار کتاب دوشنبہ کو تیار ہو جائے گی۔ علامہ اقبال کے حیات پرور خیالات و افکار کے شیدائی اسے دوشنبہ کو بعد دوپہر مبارک علی کتب فروش: اندرون لوہاری دروازہ، لاہور سے خرید سکتے ہیں۔[3]

پیامِ مشرق ۳۰/ اپریل کو دوپہر کے بعد شیخ مبارک علی کی دکان سے شائع ہوئی۔ قیمت آٹھ آنہ تھی۔ مجلد کتاب کی قیمت ایک روپیہ تھی۔ ایک ہزار کی تعداد میں طبع ہوئی تھی۔

---

[1] قریشی (۱۹۸۶) اقبال بنام شاد، ص ۳۶۸-۳۶۶

[2] مکتوب بنام شاد ۱۸/ مئی ۱۹۲۳ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۴۶، ۴۴۷

[3] اختر النسا (۲۰۱۰)، اقبال اور زمیندار، ص ۱۳۵۔ وہاں سنہ ۱۹۲۴ء سہوِ کتابت ہے۔ اصل سنہ ۱۹۲۳ء ہی ہے۔ نیز ص ۱۳۶ پر زمیندار ۴/ مئی ۱۹۲۳ء کی ایک اور خبر درج ہے کہ "پیام مشرق دوشنبہ کے روز شائع ہو گیا۔"

باب ۲

نیا مشرق

مئی سے دسمبر ۱۹۲۳ء تک

لِلّٰہِ المَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ

پیامِ مشرق

(در جواب دیوانِ شاعرِ المانوی گوئٹے)

اقبال

(عبد المجید خوشنویس لاہور یمنڈی لاہور)

1

سرورق کے اندرونی طرف "کاپی رائٹ" درج تھا۔ فہرست شامل نہ کی گئی تھی۔ آخری صفحے پر متن کے نیچے انگریزی میں "Iqbal" لکھا تھا۔ اُس کے نیچے، "کَتَبہٗ:- عبد المجید خوشنویس لوہاریمنڈی لاہور"۔[1] کتاب کی ترتیب یوں تھی: دیباچہ، پیشکش، لالۂ طُور، افکار، مےٴ باقی (غزلیات)، نقشِ فرنگ، خُردہ۔

- 'پیشکش بحضور اعلیٰ حضرت امیر امان اللہ خان فرمانروائے دولتِ مستقلۂ افغانستان' سات بند پر مشتمل نظم تھی۔ امیر امان اللہ خاں سے خطاب کیا گیا۔

---

[1] اقبال (۱۹۲۳) پیامِ مشرق طبع اول۔

○ 'لالۂ طور' ۱۵۵/ نمبروار ٹکڑوں پر مشتمل تھا۔ زیادہ تر رباعیات تھیں۔ ۱/ شہیدِ نازِ او بزمِ وجود است؛ ۲/ دلِ من روشن از سوزِ درون است؛ ۳/ بباغاں بادِ فروردیں دہد عشق؛ ۴/ عقاباں را بہائے کم نہد عشق؛ ۵/ بہ برگِ لالہ رنگ آمیزیٔ عشق؛ ۶/ نہ ہر کس از محبت مایہ دار است؛ ۷/ دریں گلشن پریشاں مثلِ بویم؛ ۸/ جہاں مُشتِ گِل و دل حاصلِ اوست؛ ۹/ سحر می گفت بلبل باغباں را؛ ۱۰/ جہانِ ما کہ نابود است بودش؛ ۱۱/ نوائے عشق را ساز است آدم؛ ۱۲/ نہ من انجام و نے آغاز جویم؛ ۱۳/ دلا نارائیِ پروانہ تا کے؛ ۱۴/ تنے پیدا کن از مشتِ غبارے؛ ۱۵/ زآب و گِل خدا خوش پیکرے ساخت؛ ۱۶/ بہ یزداں روزِ محشر برہمن گفت؛ ۱۷/ گذشتی تیز گام اے اخترِ صبح؛ ۱۸/ شنیدم کرمکِ شب تاب می گفت [چھ مصرعے]؛ ۱۹/ ترا اے تازہ پرواز آفریدند؛ ۲۰/ چہ لذت یارب اندر ہست و بود است؛ ۲۱/ شنیدم در عدم پروانہ می گفت؛ ۲۲/ مسلماناں! مرا حرفے است در دل؛ ۲۳/ بہ کُویش رہ سپاری اے دل! اے دل! ۲۴/ بگردوں فکرِ تُو دارد رسائی؛ ۲۵/ سحر در شاخسارے بوستانے؛ ۲۶/ ترا ایک نکتۂ سربستہ گویم؛ ۲۷/ بہل افسانۂ آں پاچراغے؛ ۲۸/ ترا از خویشتن بیگانہ سازد؛ ۲۹/ زیاں بینی ز سیرِ بوستانم؛ ۳۰/ برہمن شیخ را روزے چہ گفت [چھ مصرعے]؛ ۳۱/ ز مرغانِ چمن نا آشنایم؛ ۳۲/ جہاں یارب چہ خوش ہنگامہ دارد؛ ۳۳/ سکندر با خضر خوش نکتۂ گفت؛ [1]۳۴/ سریرِ کیقباد، اکلیلِ جم خاک؛ ۳۵/ اگر در مشتِ خاکِ تو نہادند؛ ۳۶/ دمادم نقشہائے تازہ ریزد؛ ۳۷/ چو ذوقِ نغمہ ام در جلوت آرد؛ ۳۸/ چہ می پرسی میانِ سینہ دل چیست؛ ۳۹/ خرد گفت او بچشم اندر نگنجد؛ ۴۰/ کنشت و مسجد و بتخانہ و دیر؛ ۴۱/ نہ پیوستم دریں بستانسرا دل؛ ۴۲/ بخود باز آور د رندِ کہن را؛ ۴۳/ سفالم را مۓ او جامِ جم کرد؛ ۴۴/ خرد زنجیریٔ امروز و دوش است؛ ۴۵/ خرد اندر سرِ ہر کس نہادند؛ ۴۶/ گدائے جلوہ رفتی بر سرِ طور؛ ۴۷/ بگو جبریلؑ را از من پیامے؛ ہُمائے علم تا افتد بدامت؛ ۴۹/ خرد بر چہرۂ تو

[1] نمبر ۳۲ اور ۳۳ پر غلطی سی بالترتیب ۳۳ اور ۳۴ لکھے گئے؛ پیامِ مشرق طبع اول ص ۱۹

پردہ ہا بافت؛ ۵۰/ دلت می لرزد از اندیشۂ مرگ:۵۱/ ز پیوندِ تن و جانم چہ پرسی؛ ۵۲/ مرا فرمود پیرِ نکتہ دانے؛ ۵۳/ زرازی معنیٔ قرآں چہ پرسی؛ ۵۴/ من از بود و نبودِ خود خموشم؛ ۵۵/ ز من باشاعرِ رنگیں بیاں گوے؛ ۵۶/ ز خوب و زشتِ تو ناآشنایم؛ ۵۷/ تو اے شیخِ حرم شاید ندانی؛ ۵۸/ چو تاب از خود بگیرد قطرۂ آب؛ ۵۹/ من اے دانشوراں در پیچ و تابم؛ ۶۰/ میا را بزم بر ساحل کہ آنجا؛ ۶۱/ سراپا معنیٔ سربستہ ام من؛ ۶۲/ مگو از مدّعائے زندگانی؛ ۶۳/ اگر کردی نگہ بر پارۂ سنگ؛ ۶۴/ وفا نا آشنا بیگانہ خو بود؛ ۶۵/ مپرس از عشق و از نیرنگیٔ عشق؛ ۶۶/ مشو اے غنچۂ نورستہ دلگیر؛ ۶۷/ مرا روزے گلِ افسردۂ گفت؛ ۶۸/ جہانِ ما کہ پایانے ندارد؛ ۶۹/ بمرغانِ چمن ہمداستانم؛ ۷۰/ نماید آنچہ ہست ایں وادیٔ گُل؟؛ ۷۱/ تو خورشیدی و من سیّارۂ تو؛ ۷۲/ خیالِ او درونِ دیدہ خوشتر؛ ۷۳/ دماغم کافرِ زُنّار دار است؛ ۷۴/ صنوبر بندۂ آزادۂ اُو؛ ۷۵/ ز انجم تا بہ انجم صد جہاں بود؛ [1]۷۶/ عقابِ دُور بیں جوئینہ را گفت [چھ مصرعے]؛ ۷۷/ دلِ من در طلسمِ خود اسیر است؛ ۷۸/ نوادر سازِ جاں از زخمۂ تو؛ ۷۹/ نفس آشفتہ موجے از یمِ اوست؛ ۸۰/ ترا در یکی سینہ پیچد؛ ۸۱/ کرا جوئی چرا در پیچ و تابی؟؛ ۸۲/ تو اے کودک منش خود را ادب کُن؛ ۸۳/ نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم؛ ۸۴/ نہاں در سینۂ ما عالمے ہست؛ ۸۵/ دلِ من! اے دلِ من!! اے دلِ من!!!؛ ۸۶/ چہ گویم نکتۂ زشت و نکو چیست؛ ۸۷/ کسے کُو دردِ پنہانے ندارد؛ ۸۸/ چہ پرسی از کجایم چیستم من؛ ۸۹/ بچندیں جلوہ در زیرِ نقابی؛ ۹۰/ دل از منزل تہی کن پا برہ دار؛ ۹۱/ بیا اے عشق، اے رمزِ دلِ ما؛ ۹۲/ سخن درد و غم آرد، درد و غم بہ؛ ۹۳/ ز من بر مرکبِ ختلی سوارم؛ ۹۴/ کمالِ زندگی خواہی؟ بیاموز؛ ۹۵/ تو می گوئی کہ آدم خاک زاد است ۹۶/ دلِ بیباک از ضرغام، رنگ است؛ ۹۷/ ندانم بادہ ام یا ساغرم من؛ ۹۸/ تو گوئی طائرِ ما زیرِ دام است؛ ۹۹/ چناں گنجید دل اندر گلِ ما؟؛ ۱۰۰/ چو در جنّت خرامیدم پس از مرگ؛

---

[1] نمبر ۷۵ پر نمبر شمار درج نہیں؛ پیامِ مشرق طبعِ اول ص ۴۰

۱۰۱؍ جہانِ ما کہ جز انگارۂ نیست؛ ۱۰۲؍ چساں اے آفتابِ آسماں گرد؛ ۱۰۳؍ تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش؛ ۱۰۴؍ بمنزل رہروِ دل در نسازد؛ ۱۰۵؍ بیا با شاہدِ فطرت نظر باز؛ ۱۰۶؍ میانِ آب و گِل خلوت گزیدم؛ ۱۰۷؍ ز آغازِ خودی کس را خبر نیست؛ ۱۰۸؍ دلا رمزِ حیات از غنچہ دریاب؛ ۱۰۹؍ فروغِ او بہ بزمِ باغ و راغ است؛ ۱۱۰؍ ز خاکِ نرگستاں غنچۂ رست؛ ۱۱۱؍ جہاں کز خود ندارد دستگاہے؛ ۱۱۲؍ دلِ من رازدانِ جسم و جان است؛ ۱۱۳؍ گلِ رعنا چو من در مشکلے ہست؛ ۱۱۴؍ مزاجِ لالۂ خود روشناسم؛ ۱۱۵؍ جہاں یک نغمہ زارِ آرزوئے؛ ۱۱۶؍ دلِ من بے قرارِ آرزوئے؛ ۱۱۷؍ دوامِ ما سوزِ ناتمامم؛ ۱۱۸؍ مرنج از برہمن اے واعظِ شہر؛ ۱۱۹؍ حکیماں گرچہ صد پیکر شکستند؛ ۱۲۰؍ جہاں ہارویدا ز مشتِ گِلِ من؛ ۱۲۱؍ ہزاراں سال با فطرت نشستم؛ ۱۲۲؍ بگو اے چارہ گر ایں شعلۂ چیست؟ ۱۲۳؍ درونم جلوۂ افکار ایں چیست!؛ ۱۲۴؍ بخود نازم گدائے بے نیازم؛ ۱۲۵؍ اگر آگاہی از کیف و کمِ خویش؛ ۱۲۶؍ چہ غم داری، حیاتِ دل زدم نیست؛ ۱۲۷؍ تو اے دل تا نشینی در کنارم؛ ۱۲۸؍ ز من گو صوفیانِ باصفارا؛ ۱۲۹؍ چو نرگس ایں چمن نادیدہ مگذر؛ ۱۳۰؍ تراشیدم صنم بر صورتِ خویش؛ ۱۳۱؍ بہ شبنم غنچۂ نورُستہ می گفت؛ ۱۳۲؍ زمیں را رازدانِ آسماں گیر؛ ۱۳۳؍ ضمیرِ کن فکاں غیر از تو کس نیست؛ ۱۳۴؍ زمیں خاکِ درِ میخانۂ ما؛ ۱۳۵؍ سکندر رفت و شمشیر و عَلَم رفت؛ ۱۳۶؍ ربودی دل ز چاکِ سینۂ در من؛ ۱۳۷؍ ز پیشِ من جہانِ رنگ و بو رفت؛ ۱۳۸؍ مرا از پردۂ ساز آگہی نیست؛ ۱۳۹؍ نوا مستانہ در محفل زدم من؛ ۱۴۰؍ عجم از نغمہ ہائے من جواں شد؛ ۱۴۱؍ عجم از نغمہ ام آتش بجان است؛ ۱۴۲؍ ز جانِ بیقرار آتش کشادم؛ ۱۴۳؍ مرا مثلِ نسیم آوارہ کردند؛ ۱۴۴؍ رگِ مسلم ز سوزِ من تپید است؛ ۱۴۵؍ ز شاخِ آرزو برخوردہ ام من؛ ۱۴۶؍ خیالم کو گُل از فردوس چیند؛ ۱۴۷؍ عجم بحریست ناپیدا کنارے؛ ۱۴۸؍ مگو کارِ جہاں نااستوار است؛ ۱۴۹؍ رمیدی از خداوندانِ افرنگ؛ ۱۵۰؍ قبائے زندگانی چاک تا کے؛ ۱۵۱؍ میانِ لالہ و گُل آشیاں گیر؛ ۱۵۲؍ بجانِ من کہ جاں نقشِ تن انگیخت؛ ۱۵۳؍ بگوشم آمد از خاکِ مزارے؛ ۱۵۴؍ مرا ذوقِ سخن خوں در

جگر کرد؛ ۱۵۵ ر گریز آخر ز عقلِ ذو فنوں کرد۔

- 'افکار' نظموں پر مشتمل تھا — گُلِ نخستیں؛ دعا؛ ہلالِ عید؛ تسخیرِ فطرت؛ بوئے گل؛ نوائے وقت؛ فصلِ بہار؛ حیاتِ جاوید؛ افکارِ انجم؛ زندگی؛ محاورہ علم و عشق؛ شبنم؛ لالہ؛ حکمت و شعر؛ محاورہ مابین خدا و انسان؛ ساقی نامہ؛ شاہین و ماہی؛ اگر خواہی حیات اندر خطر زی؛ دنیائے عمل؛ زندگی؛ حکائت؛ الملکُ لِلّٰہ؛ نامۂ عالمگیر؛ بہشت؛ کشمیر؛ عشق؛ بندگی؛ غلامی؛ چیستانِ شمشیر؛ جمہوریت؛ بہ مبلّغِ اسلام در فرنگستان؛ لسان العصر اکبرؔ مرحوم[1]؛ غنی کشمیری؛ خطاب بہ مصطفیٰ کمال پاشا ایدہ اللہ (جولائی ۱۹۲۲ء)؛ طیّارہ؛ عشق؛ تہذیب۔
- 'مے باقی' غزلیات پر مشتمل تھا — بہار تا بہ گلستاں کشید بزمِ سرود؛ حلقہ بستند سرِ تربتِ من نوحہ گراں؛ می تراشد فکرِ ما ہر دم خداوندے دگر؛ مرا ازدیدۂ بینا شکایت دگر است؛ بایں بہانہ دریں بزم محرمے جویم؛ خیز د نقاب برکشا، پردگیانِ ساز را؛ بملازمانِ سلطاں خبرے دہم ز رازے؛ بیا کہ ساقیِ گُل چہرہ دست بر چنگ است؛ صورت نہ پرستم من، بتخانہ شکستم من؛ ہوائے فرودیں در گلستاں میخانہ می سازد؛ از ما بگو سلامے آں ترکِ تُند خو را؛ آشنا ہر خار را از قصّۂ ما ساختی؛ خوش آنکہ رختِ خرد را بہ شعلۂ مے سوخت؛ بیار بادہ کہ گردوں بکامِ ما گردید؛ تیر و سنان و خنجر و شمشیرم آرزوست؛ دانۂ سبحہ بہ زنّار کشیدن آموز؛ ز خاکِ خویش طلب آتشے کہ پیدا نیست؛ موج را از سینۂ دریا گسستن می تواں؛ صد نالۂ شبگیرے، صد صبحِ بلاخیزے؛ باز بہ سرمہ تاب دہ چشمِ کرشمہ زائے را؛ فریبِ کشمکشِ عقل دیدنی دارد؛ حسرتِ جلوۂ آں ماہِ تمامے دارم؛ بشاخِ زندگیِ ما نمے ز تشنہ لبی است؛ فرقے نہ نہد عاشق در کعبہ و بتخانہ؛ بے تو از خوابِ عدم دیدہ کشودن نتواں؛ ایں گنبدِ مینائی، ایں پستی و بالائی؛ ہوسِ منزلِ لیلیٰ نہ تو داری نہ من (بہ یکے از صوفیہ نوشتہ شُد)؛ دلیلِ منزلِ شوقم بدامنم آویز؛ در جہانِ دلِ ما دورِ قمر پیدا نیست؛ تب و تابِ بتکدۂ عجم نرسد بسوز و گدازِ من؛ گریۂ ما بے اثر نالۂ ما نارسا

[1] یہ نظم اگلے ایڈیشن سے خارج کر دی گئی۔

است۔

- 'نقشِ فرنگ' میں مغربی موضوعات پر نظمیں تھیں—پیام؛ زندگی و عمل (در جوابِ نظمِ ہائنا موسوم بہ سوالات)؛ جمعیّت الاقوام؛ شوپن ہار و نیٹشا؛ فلسفہ و سیاست؛ صحبتِ رفتگاں (در عالمِ بالا)؛ نیٹشا؛ حکیم آئن سٹائن؛ بائرن؛ نیٹشا؛ جلال و ہیگل؛ پٹوفی (شاعرِ جوانامرگ ہنگری کہ در معرکہ کارزار در حمایتِ وطن کشتہ شد و نعشِ او نیافتند تا یاد گارِ خاکی ازو نماند)؛ محاورہ مابین حکیم فرنسوی اگسٹس کومٹ و مردِ مزدور؛ ہیگل؛ جلال و گوئٹے؛ پیغامِ برگساں؛ میخانۂ فرنگ؛ موسیو لینن و قیصر ولیم؛ حکما؛ شعرا؛ خراباتِ فرنگ؛ خطاب بہ انگلستان؛ قسمت نامۂ سرمایہ دار و مزدور؛ نوائے مزدور۔
- 'خُردہ' میں مختصر اقوال نظم کیے گئے تھے—می خورد ہر ذرہ ءِ ما پیچ و تاب؛ دُرِ دانہ اداشناسِ دریاست؛ کلک رانالہ از تہی مغزاست؛ منم کہ طوفِ حرم کردہ ام بتے بہ کنار؛ گُل گفت کہ عیشِ نوبہارے خوشتر؛ سخنگو طفلک و برنا و پیر است؛ چشم را بینائی افزاید سہ چیز؛ اے برادر من را از زندگی دادم نشاں؛ طاقتِ عفو در تُو نیست اگر؛ از نزاکت ہائے طبعِ موشگافِ او مپرس؛ در جہاں مانندِ جوئے کوہسار؛ اے کہ گل چیدی منال از نیشِ خار؛ مزن وسمہ بر ریس و ابروئے خویش؛ ندارد کار بادوں ہمتاں عشق؛ نقدِ شاعر در خورِ بازار نیست؛ بطے می گفت بحر آزاد گردید۔[1]

2

جلوۂ حسن کو محرومِ تماشائی کر   بے نیازی صفتِ لالۂ صحرائی کر

حفیظ جالندھری، ۱۹۲۳ء[2]

---

[1] دوسرے اڈیشن میں ترمیم و اضافہ تھا۔ دیکھیے ۷مارچ ۱۹۲۴ء کے واقعات

[2] حفیظ کے اس شعر میں لالہ صحرائی کا تذکرہ ہے۔ یہ علامت اُسی برس علامہ نے پیامِ مشرق میں متعارف کروائی تھی۔

3

پیامِ مشرق کی اشاعت کے ساتھ ہی علامہ اقبال بیمار پڑ گئے۔ مسوڑا پھول گیا۔[1]

احباب کہہ رہے تھے کہ انتخاب میں لاہور کے حلقے سے کھڑے ہوں۔ علامہ کے دوست شیخ عبدالعزیز اُمیدوار تھے۔ علامہ کہتے تھے، ''میاں عبدالعزیز سے مقابلہ کرنا میں نہیں چاہتا۔ اُن سے دیرنیہ تعلقات ہیں۔ اگرچہ مقابلے کے بعد انتخاب ہو جانا قریباً یقینی ہے، تاہم یہ بات میرے نزدیک مروّت کے خلاف ہے کہ ایک موہوم دنیوی فائدے کی خاطر دیرینہ تعلقات کو نظر انداز کر دوں۔''[2]

اُس ماہ میاں بشیر احمد کے ہمایوں میں احضاد حسین کا مضمون 'اعترافِ کمال پر طعنہائے دلخراش' کے عنوان سے شائع ہوا۔ مضمون نگار نے لکھا کہ سر کا خطاب قبول کرنا علامہ کے لیے اُس صورت میں قابلِ اعتراض ہوتا جب کسی قومی مفاد کے خلاف سیاسی کارنامے پر عطا کیا جاتا۔ ادبی خدمات کے اعتراف میں ملا ہے۔ قابلِ اعتراض نہیں ہے۔ ہندوؤں میں بہت سے لوگ خطاب لیے بیٹھے ہیں مگر وہ وطن پرست ہندوؤں کی آنکھ کے تارے بھی بنے رہتے ہیں۔ مسلمان ایک ہم مذہب کو خطاب ملنے پر طعنہ آزما ہو رہے ہیں۔[3]

علامہ کی ہدایت پر پبلشر نے پیامِ مشرق مہاراجہ کشن پرشاد کو بھیجی تھی۔ ۱۸/ مئی کو مہاراجہ کا سفر نامہ علامہ کی نظر سے گزرا۔ غالباً ان کا ذکر بھی تھا۔ پھر مہاراجہ کا خط ملا۔ بچے کی آنکھ کی وجہ سے پریشان تھے۔ پیامِ مشرق کے بعض مقامات دیکھ کر لکھا تھا کہ اقبال ''جانتے ہیں کہ کاروانِ سخن میں سب شامل ہیں،'' محمل کی ظاہری دلکشی سے دلچسپی رکھنے والے بھی محمل نشیں کی زیارت کے خواہشمند بھی۔ ''آپ وہ اقبال مند ناقہ بانِ سخن ہیں کہ دونوں دِلوں کی ڈوریں اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے ہیں۔''[4]

اُس روز علامہ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے ۲۳/ اپریل والے خط کا جواب بھی دیا۔ بچے کی آنکھ کا

---

[1] مکتوب بنام نیازالدین خاں ۲۵/ مئی ۱۹۲۳ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۴۸

[2] مکتوب بنام نیازالدین ۲۰/ جولائی ۱۹۲۳ء؛؛ برنی (۱۹۹۱) کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۶۳

[3] احضاد حسین، 'اعترافِ کمال پر طعنہائے دلخراش'، ص ۳۴۰-۳۳۸

[4] مکتوب شاد بنام اقبال ۱۴/ مئی ۱۹۲۳ء؛؛ قریشی (۱۹۸۶) اقبال بنام شاد، ص ۳۷۰-۳۶۹

زخم ٹھیک ہونے کی دعا دی۔ جوگی کے واقعے کے حوالے سے لکھا، "اللہ والے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا ضلع گورکھپور میں اسی قسم کا ایک واقعہ سننے میں آیا تھا۔"[1]

مسوڑے کا آپریشن کروایا۔ تکلیف میں اضافہ ہو گیا۔

4

۲۰ر مئی کو برطانوی وزیرِ اعظم اینڈریو بونار لا (Andrew Bonar Law) نے صحت کی خرابی کی وجہ سے استعفا دیا۔ کنزرویٹو پارٹی سے تھے۔ گزشتہ ۲۳ر اکتوبر کو عہدہ سنبھالا تھا۔ ۲۱۱ر دن عہدے پر رہے۔ تین روز بعد اُن کی جماعت کے اسٹینلے بالڈوِن (Stanley Baldwin) وزیرِ اعظم بنے۔

5

۲۵ر مئی کو مسوڑے کی تکلیف میں کچھ آرام آیا۔ نیاز الدین کو خط لکھا، "شیخ مبارک علی صاحب مجھ سے نہیں ملے۔ وہ یہاں سے بہت دور ہیں۔ اگر وہ آ گئے تو میں اُن سے کہہ دوں گا کہ آپ کی خدمت میں کتاب [پیامِ مشرق] ارسال کر دیں۔" نیاز کے انگریزی مضمون 'اقبال اور اُس کا عہد' ('Iqbal and His Times') کی پہلی قسط مسلم آؤٹ لک میں شائع ہوئی تھی۔ کوئی تجویز پیش کی تھی۔ علامہ نے لکھا، "تجویز خوب ہے، مگر ابھی اس ملک کے لوگ ان اُمور کی شناخت نہیں رکھتے۔"[2]

پچیس دن میں پیامِ مشرق کے قریباً پانچ سو نسخے فروخت ہو چکے تھے۔[3] ایک تصویر بھی اتاری گئی۔ اُن کے مداح شجاع ناموس اُن سے کتاب وصول کر رہے ہیں۔ ایک اور تصویر بالکل اسی موقع کی ہے۔ اُس میں علامہ تنہا ہیں۔[4] ناموس نے دو برس قبل ایم ایس سی کا امتحان پاس کیا تھا۔ اکثر علامہ کے

---

[1] برنی (۱۹۹۱) کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۴۷

[2] برنی (۱۹۹۱) کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۴۷

[3] ایضاً

[4] دوسری تصویر کے مطابق اکیسویں صدی کے آغاز میں عجب خاں نے ایک رنگین پورٹریٹ بنائی جو بیحد مقبول ہے۔

پاس آتے تھے۔ اُن کا بیان ہے کہ علامہ کے مشورے پر فارسی، عربی اور پشتو کے امتحانات بھی پاس کیے۔ اُن کے مطابق علامہ نے کہا کہ مسلمانوں کی پانچ عظیم زبانیں ہیں۔ مذہبی زبان عربی اور ثقافتی زبان فارسی ہے۔ ترکی اسلام کی تلوار ہے۔ اُردو سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان ہے۔ پشتو پڑھے بغیر پشتون عوام کی تاریخ و ثقافت کا مطالعہ کر کے اُن پر لکھا نہیں جا سکتا۔[1]

مولوی نجف علی خاں ضلع گجرات میں جلالپور جٹاں میں رہتے تھے۔ افغانستان میں امیر امان اللہ خاں کی حکومت قائم ہونے سے پہلے کابل میں قید تھے۔ تب اپنے بیٹے کے لیے نصیحت پر مبنی مثنوی لکھی تھی۔ امان اللہ خاں کے اتالیق رہ چکے تھے۔ اُن کے بادشاہ بننے پر رہائی حاصل ہوئی۔ مثنوی کو اُن سے منسوب کر کے تحفۂ امانیہ کے نام سے شائع کروایا۔ آخر میں ”ترجمانِ حقیقت علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال ملک الشعرا مشرق“ کی طرف سے مختصر تقریظ بھی شامل تھی۔ علامہ نے لکھا تھا، ”میں نے یہ نظمیں سرسری نظر سے دیکھی ہیں۔ مصنف کا جوشِ عقیدت قابل داد ہے۔“[2]

علامہ کو میر خورشید احمد کا خط ملا۔ کشمیری تھے۔ شملہ میں رہتے تھے۔ پیامِ مشرق کی نظم 'ساقی نامہ' پر کسی نے اعتراض کیا تھا۔ اُسے کشمیریوں کی ہجو معلوم ہوئی تھی۔ شیخ سعدی نے بھی کشمیریوں کی ہجو لکھی تھی۔ میر خورشید نے علامہ کو خط لکھا۔ سائل دہلوی اور نیاز فتحپوری کے درمیان ”دُرِّ یکتا“ کے استعمال پر کوئی بحث چھڑی ہوئی تھی۔ اُس کے بارے میں بھی دریافت کیا۔ علامہ نے ۲۶ مئی کو وضاحت کے ساتھ لکھا، ”نیاز صاحب فتحپوری کا استدلال صحیح نہیں معلوم ہوتا۔“ 'ساقی نامہ' پر تنقید پر تعجب تھا۔ ”جو لوگ میرے اشعار کو کشمیریوں کی ہجو تصور کرتے ہیں وہ شعر کے مذاق اور مقاصد سے بالکل بے بہرہ ہیں،“ علامہ نے لکھا، ”اُن کے لیے یہی جواب کافی ہے کہ میرے آباؤ اجداد اہلِ خطہ میں سے ہیں۔“[3]

---

[1] امروز لاہور ۲۱ اپریل ۱۹۷۴ء میں ڈاکٹر محمد شجاع ناموس کا مضمون؛ شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۳۸۱-۳۷۹

[2] شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۴۴۶-۴۴۵

[3] برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۴۹-۴۴۸

۳۱؍ مئی کے زمیندار میں پیامِ مشرق پر طویل تبصرہ چھپا۔[1] اُس روز علامہ نے ''دُرِّ یکتا'' کی سند میں فارسی کے شاعر فرخی کا شعر میر خورشید کے نام مختصر چٹھی میں لکھا۔ اگلے روز امام شرف الدین بُصیری کا قصیدہ بُردہ پڑھ رہے تھے۔ وہاں بھی سند ملی۔ میر خورشید احمد کو بھجوا دی۔[2]

6

چارلی ڈنبر بروڈ (C. D. Broad) کی عمر چھتیس برس تھی۔ ٹرنٹی کالج کیمبرج کے فیلو رہ چکے تھے۔ برسٹل یونیورسٹی میں پروفیسری کر کے واپس ٹرنٹی کالج آئے تھے۔ اس برس ان کی کتاب سائنٹفک سوچ (*Scientific Thought*) شائع ہوئی۔ سائنس اور فلسفے کے جدید رجحانات کا تجزیہ کیا تھا۔

نامور انگریز فلسفی پروفیسر میک ٹیگرٹ کیمبرج میں علامہ کے استاد رہے تھے۔ اُن کا مشہور نظریہ تھا کہ زمان یعنی وقت غیر حقیقی ہے کیونکہ ایک ہی واقعہ پہلے کچھ لوگوں کے لیے مستقبل ہوتا ہے، پھر حال ہو جاتا ہے اور بعد میں آنے والوں کے لیے ماضی ہوتا ہے۔ اس طرح ہر واقعے میں مستقبل، حال اور ماضی کی کیفیات موجود ہوتی ہیں۔ یہ متضاد کیفیات ہیں اور متضاد کیفیات ایک ہی چیز میں اکٹھی نہیں ہو سکتیں۔ چونکہ ہر واقعے میں یکجا ہوتی ہیں اس لیے وقت وجود نہیں رکھتا۔

بروڈ نے لکھا کہ واقعہ جب تک پیش نہیں آجاتا، اُسے واقعہ نہیں کہہ سکتے۔ محض امکان ہوتا ہے۔ اس لیے کسی واقعے میں ماضی، حال اور مستقبل کا اکٹھا ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ جس چیز میں مستقبل کی صفت تھی، وہ واقعہ نہ تھی۔ صرف واقعے کا امکان تھی۔[3]

7

۲؍ جون کو انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کا اجلاس ہوا۔ مولوی فضل الدین صدارت کر رہے

---

[1] اختر النسا (۲۰۱۰)، اقبال اور زمیندار، ص ۸۰

[2] مکتوب بنام میر خورشید احمد ۳۱ مئی ۱۹۲۳ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۵۰

[3] Broad (1923), *Scientific Thought*, pp.79-82ع۔ علامہ نے ذکر کیا: Iqbal (1934), pp.54-55

تھے۔ روداد میں لکھا گیا کہ اقبال کو جنرل کونسل کا رُکن بنایا گیا ہے۔[1]

۹؍جون کو پنجاب یونیورسٹی کی سنڈیکیٹ کا اجلاس ہوا۔ علامہ کا یونیورسٹی کی سینیٹ کی اکیڈمک کونسل سے استعفا پیش ہوا۔ ۲۶؍مارچ کو نامزد کیے گئے تھے۔ استعفا کی وجہ یہ بتائی تھی کہ ادبی کاموں میں مصروفیت کی وجہ سے جلد جلد ہونے والے اجلاسوں میں نہیں آسکتے۔[2]

ضامن نقوی کے مضامین میاں بشیر کے ہمایوں میں شائع ہوتے تھے۔ 'اسرارِ خودی' کی حمایت میں لکھا تھا۔ اب اسی مضمون پر 'مثنوی اسرارِ ہستی' لکھ کر علامہ کو بھیجی۔ ۱۱؍جون کو علامہ نے لکھا، "آپ کی فلسفیانہ مثنوی موسوم بہ 'اسرارِ ہستی' نہایت سبق آموز ہے اور اس کا طرزِ بیان بھی دلچسپ ہے۔"[3]

۱۹؍جون کو عطر چند کپور اینڈ سنز کے ساتھ علامہ کے معاہدے پر دستخط ہوئے۔ فارسی ادبیات کے انتخاب پر مبنی درسی کتاب کے لیے تھا۔ دو ہزار روپے معاوضہ طے ہوا۔ نصف رقم ناشر نے فوراً ادا کرنی تھی۔ بقیہ مسودے کی تکمیل پر ملتی۔ رائلٹی الگ تھی۔[4]

پیامِ مشرق کا دوسرا ایڈیشن گرمیوں کی چھٹیوں میں ترتیب دینے کا ارادہ تھا۔ جولائی کے اواخر میں ہائی کورٹ بند ہو جاتی۔ پھر فرصت مل سکتی تھی۔ ارادہ تھا کہ طباعت جرمنی میں کروائیں۔[5]

شملہ سے پھر میر خورشید احمد کا خط آیا۔ غالباً قصیدہ بردہ کے مصنف بصیری کے متعلق پوچھا تھا جن کا ایک عربی شعر علامہ نے سند کے طور پر یکم جون کو بھیجا تھا۔ کسی مضمون یا نظم کی اشاعت کے لیے مشورہ بھی طلب کیا تھا۔ ۲۰؍جون کو علامہ نے جواب دیا، "مجھے کوئی اعتراض نہیں، جہاں آپ چاہیں چھپوائیں۔ ہمایوں بھی اچھا رسالہ ہے۔ امام شرف الدین کا لقب 'بصیری' ہے۔ عربوں میں

---

[1] انجمن کی قلمی روداد؛ محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶)، اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص ۱۷۸

[2] ڈاکٹر حسن اختر ملک، اقبال، ایک تحقیقی مطالعہ، ص ۱۲۵

[3] برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۵۱

[4] معاہدے کی دستاویز علامہ اقبال میوزیم لاہور میں اور عکس اقبال اکادمی پاکستان کے پاس موجود ہے۔

[5] مکتوب بنام نظیر غازی پوری ۲۹؍جون ۱۹۲۳ء؛ بنام خورشید احمد ۲۰؍جون ۱۹۲۳ء

تخلص کا دستور نہ تھا۔ میں نے مثنوی رموزِ بے خودی میں بھی ان کا ذکر کیا ہے۔"[1]

انہی دنوں 'اسرارِ خودی' کے مترجم آر اے نکلسن کا خط ملا کہ پیامِ مشرق جدید اور اوریجنل خیالات سے مملو ہے۔ گوئٹے کے مغربی دیوان کا قابلِ تحسین جواب ہے۔ ترجمے کا ارادہ بھی تھا۔[2]

سید عابد علی عابد نوجوان تھے۔ ایک بیرونی یونیورسٹی میں اُردو کی پروفیسری کے لیے درخواست دی تھی۔ علامہ سے سفارش کروانا چاہتے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ ۱۹۲۳ء یا ۱۹۲۴ء کی گرمیوں کی ایک شام ایک دوست کے ساتھ علامہ کے پاس آئے۔ علامہ نے انگریزی میں کہا، "جو آپ مناسب سمجھیں لکھ لائیں میں دستخط کر دوں گا۔" عابد نے پیر تاج الدین کی علامہ کے ساتھ بے تکلفی خاص طور پر نوٹ کی۔[3]

8

پروفیسر غلام حسین، بولشویک یعنی کمیونسٹ تھے۔ کبھی ایڈورڈ کالج پشاور میں پڑھاتے تھے۔ پچھلے برس استعفا دیا۔ پھر حکومت کے خلاف سازش پر گرفتار ہوئے۔ اُن کے ساتھی شمس الدین کا مضمون ۲۳ جون کے زمیندار میں آیا۔ دعویٰ تھا کہ اقبال بھی کمیونسٹ ہیں:

> ہمارے ملک کا سب سے بڑا شاعر ڈاکٹر سر محمد اقبال کیوں قانون کی زد سے بچ سکتا ہے۔ کیونکہ بالشویک نظامِ حکومت کارل مارکس کے فلسفۂ سیاسیات کا لبِ لباب ہے اور کارل مارکس کے فلسفہ کو عام فہم زبان میں سوشلزم اور کمیونزم کہا جاتا ہے۔ ان حالات میں اگر کوئی تھوڑی سی عقل کا مالک بھی سر محمد اقبال کی "خضرِ راہ" اور "پیامِ مشرق" کو بغور دیکھے تو وہ فوراً اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ علامہ اقبال یقینا ایک اشتراکی ہی نہیں بلکہ

---

[1] برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۵۲

[2] مکتوب بنام سید سلیمان ندوی ۵ جولائی ۱۹۲۳ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۶۲–۴۶۱

[3] عابد علی عابد، 'دوملاقاتیں'، ص ۲۲۱–۲۱۸

اشتراکیت کے مبلغِ اعلیٰ ہیں...[1]

علامہ نے ایک دوست سے سنا۔ فوراً تردید لکھی۔ زمیندار کو بھجوائی۔ اہم نکات یوں تھے:

۱ بولشویک یعنی کمیونسٹ خیالات رکھنا اسلام کے دائرے سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے۔ وجہ یہ ہے کہ اسلام بجائے خود معاشرے کے اقتصادی امراض کا حل ہے کیونکہ قرآن کے مطابق مسلمان خدا کے فضل و کرم سے بھائی بھائی بنے ہیں [فأصبحتم بنعمته اخوانا] اور کسی قوم کے افراد صحیح معنوں میں ایک دوسرے کے بھائی نہیں بن سکتے جب تک وہ ہر پہلو سے ایک دوسرے کے ساتھ مساوات نہ رکھتے ہوں۔

۲ اس لیے سرمایہ داری کی قوت کو مناسب حدود میں رکھنا ضروری ہے کہ اس کی وجہ سے ایک جماعت دوسری کو مغلوب نہ کر سکے۔ اس کے لیے قرآن مجید نے میراث، حرمتِ رِبا اور زکوٰۃ وغیرہ کا نظام تجویز کیا ہے۔ یہ نظام صحیح طرح نافذ کیا جائے تو سرمایہ داری کی قوت اپنی حدود سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ اقتصادی میدان میں اسلام کا مقصود یہی ہے۔

۳ یہ حل انسانی فطرت کے مطابق ہے۔ انسان فطرتاً نیک ہے اور یہ نظام بھی اخوت اور باہمی محبت کے جذبات کو اُبھارتا ہے۔ انسان کو اُس کی پوشیدہ عظمت یاد دلاتا ہے۔ [چند ماہ پہلے کی نظم 'طلوعِ اسلام' میں بھی کہا تھا: یہی مقصودِ فطرت ہے، یہی رمزِ مسلمانی / اخوت کی جہانگیری، محبت کی فراوانی]۔ یہ اعتدال کی راہ بھی ہے۔

۴ مغربی سرمایہ دارانہ نظام اور روسی بولشوزم افراط و تفریط پر مبنی ہیں۔ ایک یہ بات بھول جاتا ہے کہ سرمایہ داری کی قوت کو حدود میں رکھنا ضروری ہے۔ دوسرا معاشی نظام سے اِس قوت کو بالکل ہی خارج کرنا چاہتا ہے۔ یہ طرزِ عمل کسی مسلمان کو پسند نہیں آ سکتا۔

۵ مسلمانوں نے اِس نقطۂ نظر سے اسلام کا مطالعہ نہیں کیا۔ یورپ کی اقتصادیات پڑھ کر فوراً متاثر ہو جاتے ہیں۔ اِس دور میں سخت ضرورت ہے کہ وہ قرآن کریم کی اقتصادی تعلیم پر

---

[1] برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۵۳

گہری نظر ڈالیں۔ رُوسی بولشوزم ایک عارضی شے ہے۔ یہ بات یقینی ہے کہ روسی قوم بھی تجربے کے بعد بولشوزم کی بجائے ایک ایسے نظام کی طرف رجوع کرے گی جس کے بنیادی اصول خالص اسلامی یا اسلام سے ملتے جلتے ہوں گے۔

لاہور میں لیبر یونین بنی تھی۔ علامہ نے اُس کے مسلمان ارکان کو نصیحت کی کہ اِن نکات پر توجہ دیں۔ کوئی ایسی روش اختیار نہ کریں جو قرآن کے منافی ہو۔

بنام مدیر زمیندار

مکرمِ بندہ جناب ایڈیٹر صاحب زمیندار،

السلام علیکم

میں نے ابھی ایک دوست سے سنا ہے کہ کسی صاحب نے آپ کے اخبار میں یا کسی اور اخبار میں (میں نے اخبار ابھی تک نہیں دیکھا) میری طرف بولشویک خیالات منسوب کیے ہیں۔ چونکہ بولشویک خیالات رکھنا میرے نزدیک دائرۂ اسلام سے خارج ہو جانے کے مترادف ہے۔ اس واسطے اس تحریر کی تردید میرا فرض ہے۔

میں مسلمان ہوں۔ میرا عقیدہ ہے اور یہ عقیدہ دلائل وبراہین پر مبنی ہے کہ انسانی جماعتوں کے اقتصادی امراض کا بہترین علاج قرآن نے تجویز کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ سرمایہ داری کی قوت جب حدِ اعتدال سے تجاوز کر جائے تو دنیا کے لیے ایک قسم کی لعنت ہے لیکن دنیا کو اس کے مضر اثرات سے نجات دلانے کا طریق یہ نہیں کہ معاشی نظام سے اس قوت کو خارج کر دیا جائے۔ جیسا کہ بولشویک تجویز کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے اس قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھنے کے لیے قانونِ میراث، حرمتِ ربا اور زکوٰۃ وغیرہ کا نظام تجویز کیا ہے۔ اور فطرتِ انسانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے یہی طریق قابلِ عمل بھی ہے۔ روسی بولشوزم یورپ کی ناعاقبت اندیش اور خود غرض سرمایہ داری کے خلاف ایک زبردست ردِ عمل ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ مغرب کی سرمایہ داری اور روسی بولشوزم دونوں افراط و تفریط کا نتیجہ ہیں۔ اعتدال کی راہ وہی ہے جو قرآن نے ہم کو بتائی ہے اور جس کا میں نے اوپر اشارۃً ذکر کیا ہے۔ شریعتِ حقۂ اسلامیہ کا

مقصود ہے کہ سرمایہ داری کی بنا پر ایک جماعت دوسری جماعت کو مغلوب نہ کر سکے اور اس مدعا کے حصول کے لیے میرے عقیدے کی رو سے وہی راہ آسان اور قابلِ عمل ہے جس کا انکشاف شارع علیہ السلام نے کیا ہے۔ اسلام سرمایہ کی قوت کو معاشی نظام سے خارج نہیں کرتا بلکہ فطرتِ انسانی پر ایک عمیق نظر ڈالتے ہوئے اسے قائم رکھتا ہے اور ہمارے لیے ایک ایسا معاشی نظام تجویز کرتا ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے یہ قوت کبھی اپنے مناسب حدود سے تجاوز نہیں کر سکتی۔ مجھے افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کے اقتصادی پہلو کا مطالعہ نہیں کیا ورنہ ان کو معلوم ہوتا کہ اس خاص اعتبار سے اسلام کتنی بڑی نعمت ہے۔ میرا عقیدہ ہے فأصبحتم بنعمته اخوانا [''اس کے فضل و کرم سے تم بھائی بن گئے''] میں اِسی نعمت کی طرف اشارہ ہے، کیونکہ کسی قوم کے افراد صحیح معنوں میں ایک دوسرے کے اخوان نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ وہ ہر پہلو سے ایک دوسرے کے ساتھ مساوات نہ رکھتے ہوں اور اس مساوات کا حصول بغیر ایک ایسے سوشل نظام کے ممکن نہیں جس کا مقصود سرمایہ داری کی قوت کا مناسب حدود کے اندر رکھنا ہے۔ یورپ اس نکتہ کو نظر انداز کر کے آج آلام و مصائب کا شکار ہے۔ میری دلی آرزو ہے کہ بنی نوعِ انسان کی تمام قومیں اپنے اپنے ممالک میں ایسے قوانین وضع کریں جن کا مقصود سرمایہ کی قوت کو مناسب حدود کے اندر رکھ کر مذکورہ بالا مساوات کی تخلیق و تولید ہو۔ اور مجھے یقین ہے کہ خود روسی قوم بھی اپنے موجود نظام کے نقائص تجربے سے معلوم کر کے ایسے نظام کی طرف رجوع کرنے پر مجبور ہو جائے گی جس کے اصولِ اساسی یا تو خالص اسلامی ہوں گے یا ان سے ملتے جلتے ہوں گے۔ موجودہ صورت میں روسیوں کا اقتصادی نصب العین خواہ کیسا ہی محمود کیوں نہ ہو۔ ان کے طریق عمل سے کسی مسلمان کو ہمدردی نہیں ہو سکتی۔ ہندوستان اور دیگر ممالک کے مسلمان جو یورپ کی ایکانمی پڑھ کر مغربی خیالات سے فوراً متاثر ہو جاتے ہیں ان کے لیے لازم ہے کہ اس زمانے میں قرآن کریم کی اقتصادی تعلیم پر نظرِ غائر ڈالیں۔ مجھے یقین ہے کہ ہ اپنی تمام مشکلات کا حل اس کتاب میں پائیں گے۔ لاہور کی لیبر یونین کے مسلمان ممبر بالخصوس اس طرف توجہ کریں۔ مجھے ان کے اغراض و مقاصد کے ساتھ دلی ہمدردی ہے۔ مگر مجھے امید

ہے کہ وہ کوئی ایسا طریق یا نصب العین اختیار نہ کریں گے جو قرآنی تعلیم کے منافی ہو۔

محمد اقبال، بیرسٹر ایٹ لاء، لاہور[1]

9

۲۴ر جون کو انجمن حمایت اسلام کی مجلس عاملہ کا اجلاس ہوا۔ عہدیداروں کا انتخاب ہوا۔ خان صاحب عبدالعزیز اور خان صاحب ملک کرم الدین کو انجمن کی کونسل کا رُکن بنانے کی تجویز منظور ہوئی۔ منشی محمد عبدالرحمٰن نے کہا کہ ملک کرم الدین شملہ جارہے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان کی جگہ کسی دوسرے کو رُکن بنایا جائے۔ یہ بات ایک چٹھی میں لکھ کر جوائنٹ سیکرٹری کو پیش بھی کر دی۔

کرم الدین اجلاس میں موجود نہ تھے۔ انہیں خبر ہوئی تو صاف تردید کی۔ انجمن کے معززین میں سے شیخ عظیم اللہ کے سامنے یہی بات دہرائی۔ انجمن کے بانی حاجی شمس الدین بانیٔ انجمن کے نام چٹھی لکھی۔ علامہ کے پاس بھی آئے۔ علامہ نے کہا کہ اگلے اجلاس میں آئیں۔ خود بھی شریک ہو رہے تھے۔ ۸ر جولائی کو تھا۔[2]

10

ابھی تک لوگ اصرار کر رہے تھے کہ علامہ انتخابات میں کھڑے ہوں۔ آئے دن کوئی وفد پہنچ جاتا۔ علامہ اک انکار قائم تھا۔ نیازالدین خاں کے مضمون 'اقبال اور اُس کا عہد' ('Iqbal and His Times') کی دوسری قسط مسلم آؤٹ لُک میں شائع ہوئی۔ تجویز پیش کی تھی کہ اقبال فنڈ قائم کیا جائے۔ قوم چندہ اکٹھا کرے۔ علامہ غمِ روزگار سے آزاد ہو کر مشن کی تکمیل کر سکیں۔ مرزا جلال الدین نے تائید میں مضمون لکھنا شروع کیا۔[3] ۲۵ر جون کو علامہ کو نیازالدین کا خط ملا۔ فوراً جواب دیا:

---

[1] برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۵۷-۴۵۳؛ بحوالہ زمیندار، ۲۴ر جون ۱۹۲۳ء

[2] محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶)، ص ۱۰۹-۱۰۶ پر عبدالرحمٰن کی چٹھی پر ۲۴ر جولائی درج ہے۔ سہوِ کتابت معلوم ہوتی ہے۔

[3] مکتوب بنام نیازالدین خاں، ۲۵ جون ۱۹۲۳ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۵۸

> اقبال فنڈ قائم کرنا میری رائے میں، جس میں، میرے ضمیر کی آواز بھی شامل ہے، درست نہیں۔ مسلمان غریب قوم ہیں اور باوجود اس غریبی کے گذشتہ دس بارہ سال میں ایک کروڑ روپے سے زیادہ چندوں میں دے چکی ہے... باقی رہا میں، سو میری طرح اُمتِ مرحومہ میں سیکڑوں آدمی آگے گزر گئے ہیں جنھوں نے رکاوٹوں کے ہوتے ہوئے کام کیا ہے۔ مجھ سے بھی جہاں تک ہو سکے گا، اُنہی کی تقلید کروں گا۔[1]

اگلے روز علامہ نے میر خورشید کو خط لکھا۔ اُن کا خط پھر آیا تھا۔ علامہ نے جو عربی شعر سند کے طور پر بھیجا وہ ''نگار'' کو کسی عجمی شاعر کا معلوم ہوتا تھا۔ ''نگار'' سے مراد غالباً نیاز فتحپوری کا رسالہ تھا۔ کسی امین صاحب کا قطعہ بھی بھجوایا۔ علامہ نے لکھا کہ بصیری خالص عرب تھے۔ امین صاحب کا شکریہ ادا کیا جائے۔ قطعہ کسی اخبار میں شائع کروایا جائے۔ زمیندار بہتر ہو گا۔ اگست میں شملہ آنے کا ارادہ تھا۔[2]

نظیر احمد ہاشمی کا تعلق غازی پور سے تھا۔ پیامِ مشرق کا نثری ترجمہ کیا۔ تمہید لکھی۔ علامہ کے پاس آ رہے تھے کہ بیمار پڑ گئے۔ ۲۹/جون کو خط کا جواب دیتے ہوئے علامہ نے لکھا کہ اشاعت کی اجازت دینے سے پہلے پڑھنا چاہیں گے۔ اواخر نومبر سے پہلے ممکن نہ ہو گا۔ علامہ نے لکھا، ''اگر آپ اتنی دیر انتظار نہیں کر سکتے تو شاید میر غلام بھیک صاحب آپ کے کام پر غائر نظر ڈال کر رائے دے سکیں۔''[3]

11

''گرمیوں میں تپش کی وجہ سے برآمدے میں بیٹھنا دشوار ہو جاتا تو ڈرائنگ روم میں صوفے پر جا بیٹھتے،'' غلام رسول مہر کا بیان ہے۔[4]

کوٹھی کے پیچھے دیال سنگھ کالج کا گراؤنڈ برسات کے پانی سے بھر گیا۔ مچھر اور مینڈک نمودار

---

[1] ایضاً

[2] مکتوب بنام میر خورشید احمد، ۲۶/جون ۱۹۲۳ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۵۹

[3] برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۶۰-۴۵۹

[4] خالد نظیر صوفی، اقبال درونِ خانہ، ص ۲۲

ہوئے۔ ''مینڈک رات کو اِس شدّت سے ٹرّاتے کہ سونا حرام کر دیتے،'' وسیمہ مبارک کا بیان ہے۔ سردار بیگم نے پریشانی کا اظہار کیا تو علامہ کہنے لگے، ''یہ تو بڑی اچھی بات ہے، لوگ شب بیداری کے لیے کیا کیا جتن کرتے ہیں لیکن آپ کے لیے تو قدرت نے خود ہی انتظام کر دیا ہے۔''[1]

علیگڑھ والے یہودی پروفیسر جوزف ہارووِیٹز واپس جرمنی جا چکے تھے۔ پیامِ مشرق پر تبصرہ لکھ رہے تھے۔ برلن سے ایک پروفیسر نے علامہ کو لکھا تھا کہ حیرت انگیز کتاب ہے۔ کیمبرج کے آر اے نکلسن جنہوں نے تین برس پہلے 'اسرارِ خودی' کا انگریزی ترجمہ شائع کیا تھا، پیامِ مشرق کی بعض نظموں کا انگریزی میں ترجمہ کر رہے تھے۔ علامہ کے نام نجی خط میں کتاب کی تعریف کی۔[2]

علامہ نے محمد دارابی کی چھوٹی سی کتاب لطیفہ غیبیہ ایران سے منگوائی۔ معارف میں اس کا تذکرہ نظر سے گزرا۔ جون کے شمارے میں پیامِ مشرق پر سید سلیمان ندوی کا شذرہ بھی شائع ہوا:

> ''پیامِ مشرق'' مختلف اوزان و بحور میں مواعظ و حکم اور حقائق و معارف کا ایک بحرِ ذخار ہے۔ یقیناً یہ ڈاکٹر اقبال کے دماغ و قلم کا شاہکار (ماسٹر پیس) ہے اور شاید اقبال بھی اس سے بہتر کبھی نہ کہہ سکیں۔[3]

''میرے لیے آپ کی رائے پروفیسر نکلسن کی رائے سے زیادہ قابل افتخار ہے،'' علامہ نے ۵ر جولائی کو ندوی کو لکھا۔[4]

۸ر جولائی کو انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کا اجلاس ہوا۔ علامہ ۱۹۲۰ء میں آنریری جنرل سیکرٹری بنے تھے۔ میعاد پوری ہو چکی تھی۔ مولوی احمد دین نے تحریک پیش کی کہ پھر بنایا جائے۔ امرتسر کے میونسپل کمشنر میاں حسام الدین نے توثیق کی۔ مجلس عاملہ نے اتفاقِ رائے سے منظور کیا۔ علامہ کھڑے ہوئے اور کہا، ''جو حالات اس وقت مجھے معلوم ہو رہے ہیں ان حالات کے

---

[1] ایضاً ص ۶۷۔ مصنف نے اپنی والدہ وسیمہ مبارک سے روایت کیا۔

[2] مکتوب بنام سید سلیمان ندوی ۵ر جولائی ۱۹۲۳ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۸۱

[3] اختر راہی (۱۹۷۸) اقبال سید سلیمان ندوی کی نظر میں، ص ۶۵

[4] برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۶۱

ہوتے ہوئے میں انجمن کا سکرٹری کیا ممبر بھی نہیں رہنا چاہتا۔" چٹھی پڑھ کر سنائی جس میں منشی عبدالرحمٰن خاں نے کرم الدین کی طرف سے کہا تھا کہ وہ اپنی جگہ خالی کرتے ہیں۔ کرم الدین نے ایسی کوئی بات نہ کہی تھی۔ علامہ نے کہا، "جس کونسل کے ممبر اِس قسم کے ہوں میں اس کونسل کا ممبر بھی نہیں ہونا چاہتا۔" اتفاق سے کرم الدین موجود نہ تھے۔ تب بھی منشی عبدالرحمٰن نے اپنی غلطی تسلیم کی۔ کرم الدین کی جگہ جو انتخاب ہوا تھا، منسوخ ہوا۔ ملک فیروز خاں نون نے کہا کہ واقعات معلوم ہو گئے، کاروائی شروع کی جائے۔ انجمن کی روداد میں لکھا گیا، "ڈاکٹر محمد اقبال صاحب نے فرمایا کہ جب عبدالرحمٰن خانصاحب اپنی غلطی تسلیم کرتے ہیں تو ہمیں منظور ہے۔ مزید کاروائی کی ضرورت نہیں اور اپنا انتخاب قبول فرمالیا۔"[1]

۷۸۶

مثنوی

اسرار و رموز

یعنی

اسرارِ خودی و رموزِ بیخودی

(ہر دو یکجا)

اقبال

(عبدالمجید خوشنویس لاہور)

دیباچہ

اِس ایڈیشن میں ناظرین کی سہولت کے لیے دونوں مثنویاں یعنی اَسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی یکجا شائع کی جاتی ہیں۔ معمولی لفظی ترمیم کے علاوہ مطالب کی مزید تشریح کے

[1] زمیندار ۱۴/ جولائی ۱۹۲۳ء اور انجمن کی جنرل کونسل کی قلمی روداد؛ محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶)، ص ۱۰۹-۱۰۶

لیے بعض جگہ اشعار کا بھی اِضافہ ہے، جن کی مجموعی تعداد سوا سو ہو گی۔ ایک دو جگہ نئے عنوان بھی قائم کیے گئے ہیں، مگر کتاب کی ترتیب میں کوئی فرق نہیں۔

محمدؐ اقبال

دیباچہ سرورق کے اندرونی طرف شائع کیا گیا تھا۔ فہرست شامل نہ تھی۔ مثنوی کے دونوں حصوں کے آغاز میں پورے صفحے پر صرف حصے کا عنوان درج تھا۔ اگلے صفحے پر صرف رومی کا شعر بطور ابتدائیہ درج تھا۔ اصل حصہ اس کے بعد شروع ہوتا تھا۔ پہلے حصے کے آخر میں "تمّت" اور "(کاپی رائٹ)" لکھا تھا۔ دوسرے کے آخر میں "کتبہٗ عبدالمجید خوشنویس لوہاری منڈی لاہور" درج تھا۔ آخری صفحے پر صرف "(کاپی رائٹ)" لکھا تھا۔ پشت کے سرورق کے اندرونی طرف درج تھا: "در مطبع کریمی واقع لاہور باہتمام میر امیر بخش طبع گردید"۔ پشت کے سرورق پر لکھا تھا: "کتاب ہذا ملنے کا پتہ شیخ مبارک علی تاجر کتب اندرون لوہاری دروازہ لاہور"[1]

جس باب میں قرآن کو مسلم امت کا آئین قرار دیا تھا اُس میں تقلید کا درس تھا۔ انحطاط کے زمانے میں اجتہاد سے بہتر ہے کہ دورِ عروج میں کیے گئے اجتہاد کی تقلید کی جائے۔ اب انحطاط کا زمانہ گزر چکا تھا۔ فتحِ سمرنا سے نئے دَور کا آغاز ہوا تھا۔ تقلید کے موضوع کو قرآن شریف والے باب سے نکال دیا۔ علیحدہ باب بنا کر عنوان رکھا کہ انحطاط کے زمانے میں تقلید، اجتہاد سے بہتر ہے۔ واضح ہوا کہ تقلید صرف انحطاط کے ساتھ مشروط ہے۔ یہ اَسرار و رموز کی وہ صورت تھی جس میں پھر کبھی ترمیم کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔

۲۰ جولائی کے زمیندار میں لکھا گیا، "علامہ اقبال کی دونوں گراں پایہ مثنویاں نہ صرف مسلمانانِ ہند بلکہ تمام دنیائے اسلام سے جو خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں وہ محتاجِ تعارف نہیں۔ ضرورت ہے کہ اسلامی مدارس کی اعلیٰ جماعتوں میں علامہ کی تصانیف نصابِ فارسی میں داخل کی

[1] اسرار و رموز (یکجا) اسی سال (شائد شروع میں) کسی وقت شائع ہوا۔ پہلے ایڈیشن کی فوٹو کاپی لاہور میں اقبال اکادمی پاکستان کی لائبریری میں موجود ہے۔

جائیں۔ جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن کو اس بارے میں خاص توجہ کرنی چاہیے۔"[1]

12

اس دفعہ لاہور میں گرمی کم رہی تھی۔ ۲۰ جولائی کو نیاز الدین خاں کا خط ملا۔ علامہ اس وقت کچہری جا رہے تھے۔ واپس آکر پڑھا۔ پیامِ مشرق کے اثر سے نیاز پر شعر نازل ہوئے تھے۔ علامہ نے چھ برس پہلے مثنوی کے تیسرے حصے کا منصوبہ تیار کیا تھا۔ پیامِ مشرق آڑے آیا۔ اُس روز نیاز کو لکھا، "مثنوی کے تیسرے حصے کے لیے دل و دماغ تیار ہو رہے ہیں۔ تکمیل اس کام کی اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ کیا عجب کہ اپنے حبیب پاک کے صدقے میں ان مضامین کو معرضِ شہود میں لانے کی توفیق عطا فرمائے ... مثنوی کے تیسرے حصے میں مسلمانوں کے آیندہ سو سال کے افکار و اعمال کے لیے مواد ہو گا۔"[2]

پیامِ مشرق کا دوسرا اڈیشن پہلے مکمل کرنا تھا۔ غزلیں اور نظمیں لکھی گئیں۔ بعض غزلیں اُسی بیاض میں درج ہوئیں جس میں متفرق نظمیں لکھتے رہے تھے۔ مطلعوں کے مفہوم یوں تھے:

- آپ جو روح سے زیادہ قریب مگر نگاہوں سے غائب ہیں۔ آپ کا ہجر مجھے اوروں کے وصال سے بڑھ کر ہے۔
- آپ نہ حرم میں سماتے ہیں نہ بتخانے میں۔ لیکن آرزو مندوں کی طرف کیسی چاہت سے آتے ہیں!
- پہاڑ سے ہیبت اور جلال چھین کر ایک تنکے کو بخش دیتے ہیں۔ راستے میں پڑے ہوئے کسی فقیر کو جمشید کا تاج عطا کر دیتے ہیں۔
- شاعری میں یہ سوز دل کی مستانہ پکار سے ہے۔ اِس شمع کا اُجالا دل کے پروانے کے دم سے ہے۔ رصد گاہ میں بیٹھا ستارہ شناس بھی دل کے ویرانے کی سرحد تلاش کر رہا ہے۔
- ہمارے پِیر نے مصلحتاً مجاز کی طرف رخ کیا ہوا ہے ورنہ اُسے حسینوں سے کوئی سروکار

---

[1] اختر النسا (۲۰۱۰)، اقبال اور زمیندار، ص ۸۳

[2] مکتوب بنام نیاز الدین خاں، ۲۰ جولائی ۱۹۲۳ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۶۵-۴۶۳

نہیں۔

- میرا جسم جنتِ کشمیر کی کیاری کا پھول ہے۔ دل حجاز کے حرم سے اور نوا شیراز سے ہے۔
- عرب میرے خون کے آنسوؤں سے سب کا سب لالہ زار بن جائے۔ مرجھائے ہوئے عجم کو میری سانس بہار ہو جائے۔
- ہم مٹی ہیں مگر ستارے کی طرح تیز رفتار ہیں۔ ایک بیکراں نیلے سمندر میں کنارہ ڈھونڈ رہے ہیں!
- تمہاری نظر غلطی اور عقل خامی ہے۔ کلیم اللہ جیسی طلب کے بغیر وہاں نہ پہنچو گے۔
- آؤ اقبال کا دامن تھام لیں کیونکہ وہ کسی خانقاہ کے خرقہ فروشوں میں سے نہیں ہے۔

ان میں سے ایک غزل میں غالباً پہلی دفعہ قلندری کی صفت اپنی طرف منسوب کی: اقبال کی مجلس میں آؤ اور ایک دو پیالے نوش کرو۔ وہ اگرچہ سر نہیں منڈاتا مگر قلندری جانتا ہے۔

بیا بمجلسِ اقبالؔ و یک دو ساغر کش   اگرچہ سر نتراشد قلندری داند

'سرودِ انجم' کے عنوان سے ستاروں کا نغمہ تحریر کیا:

ہماری ہستی ہمارا نظام
ہماری مستی ہماری چال
ہماری نہ رکنے والی گردش
ہماری دائمی زندگی
آسمان کی گردش ہماری آرزو سے سازگار، ہم دیکھتے ہیں اور چلتے رہتے ہیں!
شہود کی جلوہ گاہ کو
وہم کے بتکدے کو
ہستی اور نیستی کے معرکے کو
وجود کی کشمکش کو

حال اور آئندہ کی دنیا کو ہم دیکھتے ہیں اور چلتے رہتے ہیں!
جنگوں کا گھمسان
پختہ کاروں کی خامی
تاج اور تخت اور سولیاں
بادشاہوں کی دربدری
زمانے کی چالیں ہم دیکھتے ہیں اور چلتے رہتے ہیں!
آقا، آقا نہ رہا
غلام، غلامی سے نکل گیا
زار کی حکومت اور قیصر کی سلطنت ختم ہو گئی
سکندر کا زمانہ لد گیا
بت گری کا چلن بیت گیا، ہم دیکھ رہے ہیں اور چلتے رہتے ہیں!
ساکت مٹی مگر متحرک
سست فطرت مگر سخت کوش
کبھی راگ رنگ کی محفل کی زینت
کبھی کاندھے پر دھرا ایک جنازہ
دنیا کا سردار مگر غلام، ہم دیکھ رہے ہیں اور چلتے رہتے ہیں!
تم کیسے اور کتنے کے طلسم میں کھوئے ہوئے
تمہاری عقل الجھاؤ سلجھاؤ میں
پھندے میں آئی ہوئی ہرنی کی طرح
بے بس، لاچار اور دُکھی!
اپنے اُونچے نشیمن میں سے ہم دیکھ رہے ہیں اور چلتے رہتے ہیں!
چھپاؤ کس لیے؟ ظہور کیا ہے

تاریکی اور نور کی اصلیت کیا ہے
آنکھ اور دل اور شعور کیا ہے
بے کل فطرت کیا ہے
یہ سب نزدیک اور دور کیا ہے؟ ہم دیکھ رہے ہیں اور چلتے رہتے ہیں!
تمہارا زیادہ ہمارے نزدیک کم ہے
تمہارا سال ہمارے آگے ایک پل ہے
اے کہ تمہارے بر میں ایک سمندر رہے
تم نے فقط شبنم پر کفایت کر لی ہے
ہم ایک نئی دنیا کی کھوج میں ہیں، ہم دیکھ رہے ہیں اور چلتے رہتے ہیں!

سرودِ انجم

ہستیٔ ما نظامِ ما　　　مستیٔ ما خرامِ ما
گردشِ بے مقامِ ما　　　زندگیٔ دوامِ ما
دورِ فلک بکام ما می نگریم و میرویم
جلوہ گہِ شہود را　　　بتکدۂ نمود را
رزمِ نبود و بود را　　　کشمکشِ وجود را
عالمِ دیر و زود را می نگریم و میرویم
گرمیٔ کارزارہا　　　خامیٔ پختہ کارہا
تاج و سریر و دارہا　　　خواریٔ شہریارہا
بازیٔ روزگارہا می نگریم و میرویم
خواجہ ز سروری گذشت　　　بندہ ز چاکری گذشت

زاری و قیصری گذشت　　　دَورِ سکندری گذشت

شیوۂ بتگری گذشت می نگریم و میرویم

خاکِ خموش و در خروش　　　سُست نہاد و سخت کوش

گاہ بہ بزم نا و نوش　　　گاہ جنازۂ بدوش

میر جہان و سفتہ گوش می نگریم و میرویم

تو بہ طلسمِ چون و چند　　　عقلِ تو در کشاد و بند

مثلِ غزالہ در کمند　　　زار و زبون و دردمند

ما بہ نشیمنِ بلند می نگریم و میرویم

پردہ چرا ظہور چیست؟　　　اصلِ ظلام و نور چیست؟

چشم و دل و شعور چیست؟　　　فطرتِ ناصبور چیست؟

ایں ہمہ نزد و دور چیست می نگریم و میرویم

بیشِ تو نزدِ ما کے　　　سالِ تو پیشِ ما دمے

اے بکنارِ تو یمے　　　ساختۂ بہ شبنمے

ما بہ تلاشِ عالمے می نگریم و میرویم[1]

حجاز میں اونٹ ہانکنے والا ساربان بھی ویسا ہی نغمہ گانے لگا جیسا تارے گا رہے تھے:

میری اونٹنی!

میری تاتاری ہرنی!

میرا چاندی سونا!

---

[1] ترجمہ احمد جاوید (۲۰۰۰) سے معمولی تبدیلی کے ساتھ لیا گیا اور پیامِ مشرق کی ترتیب اختیار کی گئی ہے۔ موجودہ نمبروں کے حساب سے بیاض میں ان کی ترتیب یوں ہے: ۵، ۲، ۸، ۱، ۶، ۳، ۴، ۷

میری کُل پونجی!
میری جاگتی قسمت!
اک ذرا تیز چل ہماری منزل دُور نہیں ہے!

ناقۂ سیّارِ من آہوے تاتارِ من
درہم و دینارِ من اندک و بسیارِ من
دولتِ بیدارِ من
تیز ترک گام زن منزل ما دور نیست

'نغمۂ ساربان' کے آٹھ بند درج ہوئے۔ پھر قطع برید ہوئی اور بعض بندوں کی ترتیب بدلی گئی۔[1] نظم 'شبنم' میں بعض اشعار کا اضافہ ہوا۔ 'کرمکِ شب تاب' کے عنوان سے جگنو کے بارے میں آٹھ بند بیاض میں درج ہوئے: ایک ناچیز ذرے نے زندگی کی دولت فراہم کر لی۔ شوق نے ایسی آگ دکھائی کہ پروانگی سیکھ گیا۔ اُس نے رات کا الاؤ روشن کر دیا۔ وہ جگنو تھا۔ قطع برید ہوئی اور ترتیب بدلی گئی۔[2]

13

۲۳ رجولائی کو لاہور ہائی کورٹ نے کسی محمد شفیع اور بعض دوسروں کی اپیل جزوی طور پر منظور کی۔ علامہ پیروی کر رہے تھے۔ اپیل مسماۃ کلثوم بی بی اور دوسروں کے خلاف تھی۔ اُن کی پیروی عزیز احمد، غلام رسول اور سید محسن شاہ کر رہے تھے۔ جسٹس عبدالرؤف اور جسٹس ایف فورڈ نے سماعت کی۔[3]

اُس روز انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کا اجلاس ہوا۔ مولوی فضل الدین صدارت کر رہے تھے۔ علامہ کالج کمیٹی اور جلسہ کمیٹی کے رکن بنائے گئے۔ ان کمیٹیوں میں سید مراتب علی شاہ،

---

[1] پیامِ مشرق میں شامل کرتے ہوئے اسے 'حدی (نغمۂ ساربانِ حجاز)' کا عنوان دیا گیا۔ ترجمہ معمولی تبدیلی کے ساتھ احمد جاوید (۲۰۰۰) سے لیا ہے۔

[2] اس فصل کی تمام غزلیں اور منظومات بیاض متفرقات سے لی گئی ہیں۔ پیامِ مشرق کی طبعِ دوم میں شامل کی گئیں۔

[3] ظفر علی راجا ایڈووکیٹ (۲۰۱۳) قانون دان اقبال ص ۱۲۲-۱۲۱

مولوی احمد دین، شیخ عظیم اللہ اور حاجی شمس الدین بھی شامل تھے۔[1]

اُس روز علامہ نے کسی غریب آدمی کے لیے ایک تعارفی رقعہ بھی لکھا۔ شیخ دین محمد کے نام تھا۔ گوجرانوالہ میں وکیل تھے۔ علامہ سے مراسم تھے۔[2]

۲۴؍ جولائی کو سید محمد سعید الدین جعفری کا خط ملا۔ عقیدتمند تھے۔ جالندھر سے تعلق تھا۔ کشمیر سے واپس آ رہے تھے۔ ملاقات کرنا چاہتے تھے۔ نئی کوٹھی کا پتہ درکار تھا۔ علامہ نے اُسی روز جواب لکھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ملاقات ہوئی۔ پہلی ملاقات تھی۔[3]

علامہ سیالکوٹ جانے کا ارادہ رکھتے تھے۔ ۲۹؍ کو روانگی تھی۔ واپس آ کر شملہ بھی جانا چاہتے تھے۔[4] نواب سر ذوالفقار علی خاں اپنے لڑکوں اور چودھری محمد حسین کے ساتھ جا رہے تھے یا جا چکے تھے۔ ۲۷؍ جولائی کو سید سلیمان ندوی کا خط ملا۔ کچھ عربی اشعار بھیجے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کے بعض فارسی اشعار میں اصلاح بھی تجویز کی تھی۔ علامہ نے اُسی وقت جواب لکھا۔ اپنی نظم 'نغمۂ ساربان' معارف میں اشاعت کے لیے خط کے ساتھ ارسال کر دی۔[5]

اگلے روز شہر میں گرمی بڑھ گئی۔ مسلم آؤٹ لُک میں کوئی چیز شائع ہوئی جو علامہ نے نیاز الدین خاں کو دکھانی چاہی۔ نیاز نے دانشوروں کی اُن آرا کی اشاعت کا ارادہ ظاہر کیا تھا جو علامہ نے سابقہ خط میں درج کی تھیں۔ علامہ کے نزدیک مناسب نہ تھا۔ اُس روز جواب دیتے ہوئے لکھا، ''یورپین لوگوں

---

[1] انجمن کی قلمی روداد؛ محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶)، اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص ۱۷۸

[2] مکتوب بنام شیخ محمد دین ۲۳؍ جولائی ۱۹۲۳ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۶۶-۴۶۵

[3] مکتوب بنام سعید الدین ۱۳؍ اگست ۱۹۲۴ء میں لکھا ''مجھے آپ سے دوبارہ مل کر بڑی مسرت ہو گی۔'' دونوں خطوط ڈاکٹر اکبر حسین قریشی کے توسط سے شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۱۱۸-۱۱۷ پر موجود ہیں۔

[4] مکتوب بنام نیاز الدین خاں ۲۸؍ جولائی ۱۹۲۳ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۶۸

[5] مکتوب بنام ندوی ۲۷؍ جولائی ۱۹۲۳ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۲۶-۵۲۴۔ مؤلف نے سالِ تحریر ۱۹۲۴ء لکھا۔ عکس میں ۱۹۲۳ء لگتا ہے۔ اگلے برس تک نظم پیامِ مشرق (طبع ثانی) میں چھپ چکی تھی۔

کے نزدیک پرائیویٹ خطوط یا اُن کا اقتباس، بغیر اُن کی اجازت کے، چھاپنا ٹھیک نہیں۔"[1]

معلوم ہوتا ہے کہ ۲۹ جولائی کو سیالکوٹ چلے گئے۔[2] نیازالدین خاں نے اقبال فنڈ قائم کرنے کی جو تجویز مسلم آؤٹ لُک میں شائع کروائی تھی۔ حمایت میں غالباً مرزا جلال الدین نے بھی لکھا تھا۔ اُس کے خلاف قارئین کے خطوط شائع ہو رہے تھے۔ کسی دل جلے کا مضمون بھی آ گیا۔[3]

14

۱۸۷۳ء میں گوئٹے کی ایک نظم شائع ہوئی، 'نغمہ' (Gesang)۔ یہ حضرت علیؓ اور بی بی فاطمہؓ کے درمیان مکالمہ تھا۔ وہ ایک بہتی ندّی کا سفر بیان کر رہے تھے۔ کچھ عرصہ بعد گوئٹے نے ایک اسلامی ڈرامہ لکھنے کا منصوبہ بنایا۔ یہ نظم حضرت علیؓ اور بی بی فاطمہؓ کے مکالمے کی بجائے کسی اور طرح شامل کرنے کا ارادہ ہوا۔ 'نغمۂ محمدؐ' (Mahomets Gesang) عنوان ہو گیا۔ ڈرامہ نہ لکھا جا سکا مگر 'نغمۂ محمدؐ' بیحد مشہور ہوا۔ علامہ اقبال سمجھتے تھے کہ اس میں گوئٹے نے "زندگی کے اسلامی تخیل کو نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔" فارسی میں نظم کا "نہایت آزاد" ترجمہ کیا۔ صرف گوئٹے کا نقطۂ نگاہ دکھانے کے خیال سے پیامِ مشرق کے دوسرے اڈیشن میں شامل کرنا چاہتے تھے۔[4]

دیکھو، ندی کیسی مستانہ چلی جا رہی ہے، جیسے مرغزار کے سینے پر کہکشاں!
بادل کے گہوارے میں میٹھی نیند سوئی ہوئی تھی، کہسار کے آغوش میں چشمِ شوق کھولی۔
اس کا بہاؤ سنگریزوں سے نغمے نکالتا ہے۔ اس کی پیشانی آئینے کی طرح بے رنگ اور بے غبار!
بیکراں سمندر کی طرف کیسی مستانہ چلی جا رہی ہے! اپنے آپ میں یگانہ، سب سے بیگانہ چلی جا رہی ہے!

---

[1] مکتوب بنام نیازالدین خاں ۲۸ جولائی ۱۹۲۳ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۶۸

[2] مکتوب بنام شاد ۲۱ ستمبر ۱۹۲۳ء؛ ایضاً، ص ۴۷۹-۴۷۷

[3] مکتوب بنام نیازالدین خاں ۲۸ جولائی ۱۹۲۳ء محولہ بالا

[4] پیامِ مشرق میں نظم 'جوئے آب' پر علامہ کا حاشیہ

اس کے راستے میں بہار نے پریخانہ ایجاد کر دیا؛ نرگس پھوٹی، لالہ اُگا اور چنبیلی کھلی،
گلاب نے ناز دکھائے اور کہا، ”ذرا ہمارے پاس ٹھہر!“ کلی ہنسی اور اُس کے دامن کا کنارہ کھینچا۔
جلوے لٹانے والے سبز پوشوں سے انجان، صحرا سر کیا اور کوہ و کمر کے سینے میں شگاف ڈالا،
بیکراں سمندر کی طرف کیسی مستانہ چلی جا رہی ہے! اپنے آپ میں یگانہ، سب سے بیگانہ چلی جا رہی ہے!

صحرا، مَرغزار، پہاڑ، باغ اور وادی کی سیکڑوں ندیوں نے کہا، ”اے کہ تیرے لیے زمین کی وُسعت ساز گار ہے!
ہم جنہیں پانی کی کمی کی وجہ سے راستہ نہیں ملتا، ہمیں صحرا کی ریت کی دستبرد سے بچا!“
پورب اور پچھم کی ہواؤں کے لیے سینہ کشادہ کئے، گرے پڑے ہمسفروں کو آغوش میں لیے،
بیکراں سمندر کی طرف کیسی مستانہ چلی جا رہی ہے! ہزاروں بے مثال موتی لیے چلی جا رہی ہے!

ٹھاٹھیں مارتا دریا! ہر رکاوٹ اور اونچ نیچ سے گزر گئی۔ گھاٹی، پہاڑ اور ٹیلوں کی تنگی سے نکل گئی۔
سیلاب کی طرح نشیب اور فراز کو یکساں کر کے شاہی محل، قلعے، کھیتی اور چمن سے گزر گئی۔
بیتاب، تند و تیز، جگر سوز اور بیقرار! ہر لمحہ نئے تک پہنچنا اور پرانے کو چھوڑ دینا!
بیکراں سمندر کی طرف کیسی مستانہ چلی جا رہی ہے! اپنے آپ میں یگانہ، سب سے بیگانہ چلی جا رہی ہے![1]

جوئے آب

بنگر کہ جوئے آب چہ مستانہ میرود　　مانندِ کہکشاں بگریبانِ مَرغزار
در خوابِ ناز بود بہ گہوارۂ سحاب　　وا کرد چشمِ شوق بہ آغوشِ کوہسار
از سنگریزہ نغمہ کشاید خرامِ او　　سیمائے او چو آئینہ بے رنگ و بے غبار

[1] ترجمہ احمد جاوید (۲۰۰۰) سے معمولی تبدیلی کے ساتھ لیا گیا۔

زی بحرِ بیکرانہ چہ مستانہ میرود
در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ میرود

در راہِ او بہار پریخانہ آفرید — نرگس دمید و لالہ دمید و سمن دمید
گُل عشوہ داد و گفت یکے پیشِ ما بایست — خندید غنچہ و سرِ دامانِ او کشید
ناآشنائے جلوہ فروشانِ سبز پوش — صحرا برید و سینۂ کوہ و کمر درید

زی بحرِ بیکرانہ چہ مستانہ میرود
در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ میرود

صد جوئے دشت و مَرغ و کہستان و باغ و راغ — گفتند "اے بسیطِ زمیں با تو ساز گار
ما را کہ راہ از تنک آبی نہ بردہ ایم — از دستبردِ ریگِ بیاباں نگاہ دار"
واکردہ سینہ را بہ ہواہائے شرق و غرب — در بر گرفتہ ہمسفرانِ زبون و زار

زی بحرِ بیکرانہ چہ مستانہ میرود با
صد ہزار گوہرِ یکدانہ میرود

دریائے پر خروش ز بند و شکن گذشت — از تنگنائے وادی و کوہ و دمن گذشت
یکساں چو سیل کردہ نشیب و فراز را — از کاخِ شاہ و بارہ و کشت و چمن گذشت
بیتاب و تند و تیز و جگرسوز و بیقرار — در ہر زماں بتازہ رسید از کہن گذشت

زی بحرِ بیکرانہ چہ مستانہ میرود
در خود یگانہ از ہمہ بیگانہ میرود[1]

۲؍ اگست کو علامہ سیالکوٹ سے واپس آئے۔ ایک روز پہلے ایک بیوی کو بخار چڑھا تھا۔ خیال تھا کہ ایک دو روز میں ٹھیک ہوں تب یہ شملہ چلے جائیں۔ اُس روز علامہ کو نیازالدین کا خط ملا۔ وہ بھی بخار میں مبتلا تھے۔

---

[1] پیامِ مشرق۔ یہ نظم پہلے اڈیشن میں نہیں تھی۔ دوسرے میں شامل کی گئی۔

مضمون کا جواب لکھنا چاہتے تھے۔ علامہ نے منع کر دیا، "اُن خطوط سے جو مسلم آؤٹ لُک میں شائع ہوئے ہیں، مجھے اچھی طرح سے معلوم ہو گیا ہے کہ ہمارے ملک کے لوگ حقیقتِ حال سے آگاہ نہیں..."[1]

بیگم کا بخار ٹائیفائیڈ ثابت ہوا۔ علامہ شملہ نہ جاسکے۔ بخار ۱۰۲ر اور ۱۰۴ر کے درمیان رہتا تھا۔ علامہ نے مشہور نعت قصیدہ بردہ کا ایک شعر لکھ کر پیشانی پر لگا دیا۔ "اب مریضہ اسمِ شافی کے سب سے بڑے انسانی مظہر کے سپرد ہے،" اُن کا خیال تھا۔ تردد خود بخود کم ہو گیا۔ علیگڑھ میگزین کے مئی جون جولائی کے شمارے میں پیامِ مشرق پر مضمون نظر سے گزرا۔ پسند آیا۔ شملہ سے سردار اُمراؤ سنگھ اور محمد حسین کے خطوط آئے۔ اُمراؤ سنگھ سے ٹیلی فون پر بات کا ارادہ تھا (جسے علامہ "طلیفون" لکھتے تھے)۔ محمد حسین کو ۹ر اگست کو خط لکھا۔ "ڈیر ماسٹر صاحب" کہہ کر مخاطب کیا کیونکہ نواب ذوالفقار کے بچوں کے اتالیق تھے۔[2]

حیدرآباد دکن سے دو تین تار آئے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے بارے میں مشورے کی ضرورت تھی۔ بیگم کی علالت کی وجہ سے علامہ نہ جاسکے۔ پروفیسر فلسفہ لاہور آئے۔ دو روز رہے۔ علامہ سے مشورہ کر لیا۔[3] کسی وقت نئی کوٹھی خریدنے کا منصوبہ بنا۔ علامہ کے مطابق "سودا تو ہو گیا تھا مگر تمام امور زبانی طے ہو جانے کے بعد، بایع جو ہندو تھا، مکر گیا۔"[4] ۱۵ر اگست کو بیگم کا ٹائیفائید اُترا۔ کمزوری بیحد تھی۔ علامہ اس مرحلے کو بیماری سے زیادہ خطرناک سمجھتے تھے۔[5] اگلے مہینے ہی شملہ جاسکتے تھے۔[6]

علامہ سمجھتے تھے کہ قرآن شریف میں جو قصّے بیان ہوئے ہیں، عام طور پر اُن کا مقصد تاریخی معلومات فراہم کرنا نہیں ہے۔ اخلاقی یا فلسفیانہ مقصد ہے۔ بعض پرانے قصّوں میں تبدیلی لا کر اُن

---

[1] مکتوب بنام نیازالدین خاں ۲ر اگست ۱۹۲۳ء؛ برنی (۱۹۹۱)، ص ۴۶۹

[2] مکتوب بنام محمد حسین ۹ر اگست ۱۹۲۳ء؛ ثاقب نفیس (۲۰۰۴) مکتوباتِ اقبال، ص ۱۴، ۷-۳۶-۳

[3] مکتوب بنام گرامی ۲۷ر اگست اور بنام شاد ۲۹ر ستمبر ۱۹۲۳ء؛ برنی (۱۹۹۱)، ص ۴۷۹، ۴۷۳

[4] مکتوب بنام گرامی ۲۲ر اگست ۱۹۲۳ء؛ برنی (۱۹۹۱)، ص ۴۷۰

[5] ایضاً

[6] مکتوب بنام محمد حسین ۱۹ر اگست ۱۹۲۳ء؛ ثاقب نفیس (۲۰۰۴) مکتوباتِ اقبال، ص ۱۵، ۳۹-۳۸

میں نے تصوّرات کی روح پھونک دی ہے۔ اس طرح انہیں وقت کی بڑھتی ہوئی رفتار کا ساتھ دینے کے قابل بنایا ہے۔[1] ابنِ عربی اور اُن کے بعض شارحین اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ فرشتے اور ابلیس شخصیات نہیں ہیں۔ سر سید احمد خاں نے اِسی روشنی میں آدمؑ کے قصے کو دیکھ کر مزید نکات پر غور کرنے کی دعوت دی تھی۔[2] معلوم ہوتا ہے کہ محمد حسین نے اگلے خط میں یہ موضوع چھیڑا۔ اعتراض کیا کہ اگر شیطان کو شخصیت کی بجائے قوائے بہیمیہ یا کچھ اور سمجھا جائے تو اُسے ازلی اور ابدی تسلیم کرنا پڑے گا۔ علامہ نے ۱۹/ اگست کو جواب دیا:

> تعجب ہے کہ شیطان کو اگر ہستی سمجھا جائے تو آپ اُس کو مخلوق مانتے ہیں، اور جب اُس کو ہستی نہ تصوّر کیا جائے بلکہ ایک محض حقیقت سمجھا جائے تو اُس کے ازلی و ابدی ہونے کی بحث اُٹھاتے ہیں ... حق بات تو یہ ہے کہ قرآنی روایت کا مقصد علمِ انسانی کی حقیقت کو واضح کرنا ہے، کسی فلسفیانہ بحث کا فیصلہ کرنا مقصد نہیں ہے ... یہ بھی نہ سمجھا جائے کہ آدم و شیطان کی روایت ایک تاریخی واقعہ ہے۔ حقائق کو بیان کرنے کا ایک طریق یہ بھی ہے کہ عام فہم قصے کے پیرائے میں اسے بیان کر دیا جائے ... اِس مقصد میں مذہب اور لٹریچر متحد ہیں۔[3]

سردار عبدالرب چوبیس برس کے نوجوان تھے۔ صوبہ سرحد سے تعلق تھا۔ علیگڑھ سے قانون کی سند حاصل کر رہے تھے۔ علامہ کی شاعری سے عشق تھا۔ اُردو کے حوالے سے کوئی رائے لکھ کر بھیجی۔ رہنمائی چاہتے تھے۔[4]

---

[1] Iqbal (1934) *The Reconstruction,* pp.77

[2] 'فرشتوں اور شیطان کی حقیقت'؛ سر سید احمد خاں (۱۹۹۳) مقالاتِ سر سیّد حصہ سیزدہم، ص ۱۸۵-۱۷۷

[3] مکتوب بنام محمد حسین ۱۹/ اگست ۱۹۲۳؛ ثاقب نفیس (۲۰۰۴) مکتوباتِ اقبال، ص ۱۵، ۳۹-۳۸

[4] مکتوب بنام عبدالرب نشتر ۱۹/ جولائی ۱۹۲۳ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۷۰-۴۶۹

بنام عبدالرب نشتر

مکرم بندہ

السلام علیکم

آپ کا جواب درست ہے۔ میں اس میں کوئی اضافہ نہیں کرنا چاہتا، سوائے اس کے کہ زبان کو میں ایک بُت تصور نہیں کرتا جس کی پرستش کی جائے، بلکہ اظہارِ مطالب کا ایک انسانی ذریعہ خیال کرتا ہوں۔ زندہ زبان انسانی خیالات کے انقلاب کے ساتھ بدلتی رہتی ہے اور جب اس میں انقلاب کی صلاحیت نہیں رہتی تو مردہ ہو جاتی ہے۔ ہاں تراکیب کے وضع کرنے میں مذاقِ سلیم کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیے۔

محمد اقبال۔ لاہور

۱۹/ اگست ۱۹۲۳ء

اُس روز ہندو مہاسبھا کا ساتواں اجلاس بنارس کے کاشی نریش ہال میں شروع ہوا۔ پندرہ ہزار مندوبین تھے۔ مزید ساڑھے چار ہزار کے قریب سامعین تھے۔ ان میں خواتین بھی تھیں۔ سیلون سے بدھ مت کے نمایندے آئے تھے۔ سکھ، جین اور بعض اچھوت بھی شامل تھے۔ استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین راجہ موتی چند تھے۔ پنڈت مدن موہن مالوی نے صدارت کی۔ پنڈت جواہر لال نہرو، سوامی شردھانند، ڈاکٹر مونجے، سی وائی چنتامنی، سوامی دیانند اور سیٹھ جگل کشور برلا بھی موجود تھے۔

اجلاس ۲۲/ اگست تک جاری رہا۔ پنڈتوں کی منظوری درکار تھی کہ ملکانہ راجپوت دوبارہ ہندو ہو سکتے ہیں۔ ہندومت میں دوسری نسل کے شخص کو قبول کرنے کا تصور نہ تھا۔ پنڈتوں کی اجازت سے قرارداد پیش کی گئی کہ بعض صورتوں میں کچھ کڑی شرائط کے ساتھ غیر ہندو کو ہندو بنایا جا سکتا ہے۔

باقی تقریروں اور قراردادوں کا زور اِس پر تھا کہ مہاتما گاندھی عظیم ترین ہندو ہیں لیکن اُن کے عدم تشدد کے فلسفے نے انگریزوں کے دلوں سے ہندوؤں کا خوف دُور کر دیا۔ میثاقِ لکھنؤ کی وجہ سے مسلمانوں اور ہندوؤں کے باہمی اختلافات بڑھ گئے ہیں۔ ہندوؤں کو منظم کرنے کے لیے ہر قصبے اور شہر میں تنظیمیں قائم کی جائیں۔ ان کا نام سماج سیوک دَل (Servants of India Leagues) ہو گا۔

اجلاس میں کہا گیا کہ ہندو مت، بدھ مت اور سکھ مذہب میں کچھ فرق نہیں۔ ان کے درمیان اتحاد ہونا چاہیئے۔ کشمیری مسلمانوں میں سے نوے فیصد ہندو اور بدھ ہیں جنہیں زبردستی مسلمان کیا گیا۔ ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمانوں میں سے بمشکل پچاس لاکھ کے اجداد باہر سے آئے ہوں گے۔ باقی سب ہندو مت سے اسلام میں داخل کیے گئے۔ غالباً مطلب یہ تھا کہ ان پچاس لاکھ کے سوا باقی سب کو دوبارہ ہندو بنایا جا سکتا ہے۔

اچھوت نچلی ذات سے تعلق رکھتے تھے۔ ہندو کہلاتے تھے مگر مندر میں قدم نہ رکھ سکتے تھے۔ اونچی ذات کے ہندو کسی اچھوت سے براہِ راست گفتگو کرنا بھی دھرم کے خلاف جانتے تھے۔ اجلاس میں قرارداد منظور ہوئی کہ اچھوتوں کو حقیر نہ سمجھا جائے۔ پنڈتوں نے خوب حمایت کی۔ ایک اچھوت قرارداد کی تائید میں تقریر کرنے لگا۔ پنڈتوں نے ہنگامہ کر دیا کہ اچھوت اُنہیں مخاطب نہ کرے۔ دھرم کے خلاف ہے۔[1]

15

مولانا گرامی نے یہ سن کر کہ علامہ نئی کوٹھی خرید رہے ہیں، فارسی میں مبارکباد کہی۔ کسی رقعے میں بھجوائی جو علامہ کی بجائے کسی اور کے نام تھا۔ ۲۲/اگست کو علامہ نے جواب دیا:

لکھو سلام غیر کے خط میں غلام کو　　　بندہ کا بس سلام ہے ایسے سلام کو[2]

پانچ روز بعد گرامی کا خط ملا۔ ذیابیطس میں مبتلا تھے۔ علامہ کے کسی فارسی شعر میں اصلاح کر کے بھیجی تھی۔ علامہ کو پسند آئی۔ آیندہ ایڈیشن کے لیے محفوظ کر لی۔ جواب فوراً لکھا:

> ذیابیطس کا ایک مجرد نسخہ میں نے خان بہادر اللہ بخش خاں مرحوم سے سنا تھا۔ جامن کی گٹھلی سائے میں خشک کیجیے، پھر اسے پیس کر کپڑے میں چھان کر اور ذرا سا نمک ملا کر پانی کے ساتھ بقدر دو تین ماشہ صبح کھایا کیجیے۔ وہ کہتے تھے کہ بیماری کی ابتدا ہو تو اس سے

---

[1] Mitra: *Register 1923, Vol. 2,* pp.129-139

[2] مکتوب بنام گرامی ۲۲/اگست ۱۹۲۳ء؛ برنی (۱۹۹۱)، ص ۴۷۰

صحت ہو جاتی ہے۔ سو اگر آپ کا ذیابیطس جوانی کی غلط کاریوں کا نتیجہ ہے، تو شاید یہ نسخہ مفید نہ ہو گا۔ لیکن اگر بڑھاپے کی غلط کاری کا نتیجہ ہے تو ضروری مفید ہو گا...[1]

۲۹/ اگست کو مولانا محمد علی [جوہرؔ] قید سے رہا ہوئے۔ دو روز بعد کے زمیندار میں اُن کی غزل شائع ہوئی۔ شانِ نزول درج تھی۔ جیل میں چہیتی بیٹی آمنہ کی بیماری کی خبر ملی تھی۔ تب کہا تھا:

ہم کو تقدیرِ الٰہی سے نہ شکوہ نہ گلہ
اہلِ تسلیم و رضا کا تو یہ دستور نہیں
تیری صحت ہمیں مطلوب ہے لیکن اُس کو
نہیں منظور تو پھر ہم کو بھی منظور نہیں[2]

16

دہلی سے پیرزادہ محمد حنیف صدیقی کی تصنیف موصول ہوئی۔ یکم ستمبر کو علامہ نے شکریے کا خط لکھا۔[3]

معلوم ہوتا ہے کہ نواب سر ذوالفقار علی خاں نے اقبال فنڈ کے معترضین کے جواب میں مسلم آؤٹ لُک کو خط لکھا۔ نیازالدین خاں نے بھی علامہ کے منع کرنے کے باوجود کچھ لکھ کر اخبار کو بھجوا دیا۔ ۱۰/ ستمبر کو نیاز کا خط علامہ کو ملا۔ جواب میں لکھا، "نواب صاحب کا خط میں نے بھی دیکھا تھا۔ آپ کا خط بھی اُمید ہے نظر سے گزرے گا۔ پیام مشرق کی دوسری اڈیشن تیار ہو رہی ہے۔ اس میں بہت سا اضافہ ہو جائے گا۔"[4]

'پیام' میں مغربی دانشور کو مخاطب کیا تھا۔ پہلے اڈیشن میں یہ نظم صرف ایک بند پر مشتمل تھی۔

[1] مکتوب بنام گرامی ۲۷/ اگست ۱۹۲۳ء؛ ایضاً، ص ۴۷۶-۴۷۳
[2] زمیندار کا عکس امجد سلیم علوی نے اپنے فائل سے فراہم کیا ہے۔
[3] علامہ اقبال میوزیم میں موجود ہے۔
[4] مکتوب بنام نیاز الدین خاں ۱۰/ ستمبر ۱۹۲۳ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۷۷

آٹھ نئے بند لکھے۔ کُل نَو بند کی نظم ہو گئی۔ ۱۱ر ستمبر کو کاغذ پر بھی لکھ لی۔ غالباً اگلے روز نظرِ ثانی ہوئی۔ [1]

اے صبا میری طرف سے مغرب کے فلسفی سے کہنا کہ عقل جتنا پر کھولتی ہے پھنستی ہی چلی جاتی ہے!

عقل بجلی کو قابو میں کر لیتی ہے مگر عشق اُسے اپنے جگر پر سہتا ہے لہٰذا زیادہ بہادر ہے۔

آنکھ لالہ و گل کے رنگ کے علاوہ کچھ نہیں دیکھتی ورنہ جو کچھ رنگ کی اوٹ میں ہے وہ زیادہ ظاہر ہے۔

حیرت کی بات وہ نہیں کہ تم مسیحائی کا معجزہ رکھتے ہو بلکہ حیرت اِس پر ہے کہ تمہارے بیمار کی حالت بگڑتی ہی چلی جاتی ہے!

تم نے علم ذخیرہ کر لیا مگر دل ہاتھ سے دے دیا۔ آہ! وہ انمول دولت جو تم گنوا بیٹھے!

سائنس اور فلسفہ وہ کام ہے جس کا کوئی انجام نہیں ہے۔ اس کے مدرسے میں عشق و محبت کا طمانچہ نہیں ہے۔

اکثر جاگے ہوؤں ہی کا دل لوٹتی ہے۔ کوئی فتنہ نہیں جو اس کی ہوشیار آنکھوں میں نہیں ہے۔

دل اس کی ٹھنڈی ادا سے تڑپنے نہیں پاتا۔ اس کے چھپے چھپے اشاروں کی کھٹک میں کوئی لذت نہیں ہے۔

اس نے بن اور پہاڑ ایک کر دیئے مگر کوئی ہرن ہاتھ نہ آیا۔ باغ کے پھیرے لگائے لیکن اس کے گریبان میں ایک پھول بھی نہیں ہے۔

علاج یہ ہے کہ ہم عشق سے دستگیری چاہیں۔ اس کے آگے ماتھا ٹیکیں اور مرادمانگیں۔

عقل نے جب اس پیچ در راہ میں قدم رکھا، پانی میں شعلہ دوڑایا اور دنیا الٹ پلٹ کے رکھ دی۔

اس کی کیمیا گری نے اڑتی ہوئی ریت کو سونا بنا دیا۔ جلے ہوئے دل پر محبت کی اکسیر نہ رکھی۔

---

[1] مکتوب بنام محمد حسین ۱۲ر ستمبر ۱۹۲۳ء؛ ثاقب نفیس (۲۰۰۴) مکتوباتِ اقبال، ص ۱۷

ہماری سادگی پر افسوس کہ اس کے دام میں آ گئے۔ ایک رہزن تھا جس نے گھات لگائی اور انسان
کی راہ مار دی۔
اس کے ہنر نے فرنگی تہذیب کی خاک اڑائی۔ پھر وہی خاک مریم کے بیٹے کی آنکھوں میں
جھونک دی۔
یہ چنگاری بونا اور شعلے کاٹنا کب تک؟ دل پر گرہ ڈالنا اور پھر کھولنا کب تک؟

اپنا عرفان رکھنے والی عقل اور ہے، دنیا کو دیکھنے والی عقل اور ہے۔ بلبل کا پر اور ہے، شاہین کا شہپر
اور ہے۔
اور ہے وہ جو مٹی پر پڑا ہوا دانہ چگتا ہے۔ جو ثریا کے خوشے سے خوراک جھپٹتا ہے، وہ اور ہے۔
اور ہے وہ جو باغ میں نسیم کی طرح چکراتا پھرتا ہے۔ جو گلاب اور نسرین کے باطن میں اتر گیا، وہ
اور ہے۔
اور ہے نو پردوں کے اُس طرف دیکھنا۔ پردے کے اِدھر ادھر اندازے لگانا اور ہے۔
مبارک ہے وہ عقل کہ دونوں جہاں کا پھیلاؤ اس کے جلو میں ہے۔ فرشتے کا نور اور آدم کے دل کا
سوز اس میں سمایا ہوا ہے۔

ہم عشق کے خلوت کدے سے باہر نکلے ہیں۔ ہم نے پاؤں کی مٹی کو آئینے کی طرح چمکایا ہے۔
ہماری ہمت دیکھو کہ ہم نے داؤ پر لگا دیے ہیں وہ دونوں جہاں جنہیں ہم چھپا کر لائے اور دکھا کر ہار
گئے ہیں۔
ہمارے آگے صبح اور شام کا سلسلہ رہتا ہے۔ ہم نے بہتی ہوئی ندی کے کنارے پر خیمہ لگا رکھا
ہے۔
ہمارے دل میں، جس نے اس دنیا پر شب خون مارا، ایک آگ تھی جو ہم نے سارے جہاں میں
دکھا دی۔
ہم شعلہ تھے، ٹوٹ گئے اور چنگاری بن گئے۔ مستی اور عشق اور آنکھ والے ہو گئے۔

عشق نے ہوس کا چلن اختیار کر لیا اور ہر روک گرا دی۔ اس کے فتنے سے آدمی جیسے کانٹے میں پھنسی ہوئی مچھلی!

اس نے رزم کو بزم پر ترجیح دی اور لشکر ترتیب دیا۔ اس کی تلوار دوستوں ہی کے سر اور چھاتی پر گری۔

اس نے رہزنی کی بِنا ڈالی اور اُسے جہانبانی بتایا۔ اِس کی ملوکیت کے ستم نے مجبوروں کی کمر توڑ کر رکھ دی۔

دف و نَے کی آواز پر دیدہ دلیری سے دھمال ڈال رہا ہے، گرے پڑے عزیزوں کے خون سے بھرا پیالہ ہاتھ میں لیے!

وقت آگیا ہے کہ ایک اور نظام کی بنیاد ڈالیں۔ دل کی تختی صاف کر کے نئے سرے سے شروع کریں۔

بادشاہت کا تاج گیا اور لُوٹ میں گیا۔ سکندر کی بانسری اور دارا کا ترانہ فنا ہو گیا۔

کوہکن ہاتھ میں تیشہ لیے آیا اور پرویزی طلب کی۔ بادشاہی کا عیش اور غلامی کی سختی رخصت ہو گئی۔

یوسفی قید سے چھٹ کے بادشاہت تک پہنچ گئی۔ ساری زلیخائی گھاتیں ہوا ہو گئیں۔

وہ راز جو چھپے ہوئے تھے، بازار میں آ گئے۔ وہ باتیں بنانا اور وہ بزم سجانا ختم ہو گیا۔

آنکھ کھولو اگر تمہاری آنکھ نظر رکھتی ہے۔ زندگی ایک اور ہی دنیا تعمیر کرنے کی دُھن میں ہے۔

میں اِس فرسودہ مٹی میں زندگی کا جوہر دیکھ رہا ہوں۔ ہر ذرے کی آنکھ ستاروں کی طرح بیدار دیکھ رہا ہوں۔

وہ بیج جو ابھی زمین کے آغوش میں ہے، میں اُسے گھنیرا، پھلدار اور ہرا بھرا دیکھ رہا ہوں۔

پہاڑ کو گھاس کی پتی کی طرح ہلکا پاتا ہوں۔ تنکے کو اٹل پہاڑ دیکھ رہا ہوں۔

وہ انقلاب جو افلاک کے سینے میں نہیں سماتا، اُسے دیکھ رہا ہوں مگر کچھ نہیں جانتا کہ کیونکر دیکھ رہا

ہوں!

مبارک ہے وہ شخص جو اِس گرد میں سوار کو دیکھ لے۔ تار ہلنے سے نغمے کی روح بوجھ لے۔

زندگی بہتی ہوئی ندی ہے اور بہتی ہی رہے گی۔ یہ پرانی شراب نشے سے بھری ہوئی ہے اور بھری ہی رہے گی۔

جو کچھ ہے مگر نہیں ہونا چاہیے، وہ مٹ جائے گا۔ جو ہونا چاہیے تھا لیکن نہیں ہوا، وہ ہو جائے گا۔

عشق دیدار کی لذت سے سراپا نظر بن گیا ہے۔ حسن رونمائی چاہتا ہے اور بے نقاب ہو کر رہے گا۔

وہ زمیں جس پر میں نے خون کے آنسو گرائے ہیں، میرا اشک اُس کے جگر میں یاقوت بن جائے گا۔

"مجھے اِس اندھیری رات میں صبح کی بشارت دی گئی۔ شمع بجھا دی گئی مگر سورج کی جھلک مجھے دکھا دی گئی۔"

آخری شعر مرزا غالبؔ کا تھا۔

پیام

از من اے باد صبا گوے بدانائے فرنگ — عقل تا بال کشود است گرفتار تر است

برق را ایں بہ جگر میزند آں رام کند — عشق از عقل فسوں پیشہ جگردار تر است

چشم جز رنگِ گل و لالہ نبیند ورنہ — آنچہ در پردۂ رنگ است پدیدار تر است

عجب آں نیست کہ اعجاز مسیحا داری — عجب این است کہ بیمارِ تو بیمار تر است

دانش اندوختۂ دل ز کف انداختۂ
آہ زاں نقدِ گرانمایہ کہ در باختۂ

حکمت و فلسفہ کاریست کہ پایانش نیست — سیلیٔ عشق و محبت بہ دبستانش نیست

بیشتر راهِ دل مردمِ بیدار زند — فتنۂ نیست کہ در چشمِ سخندانش نیست
دل ز نازِ خنکِ او بہ تپیدن نرسد — لذتے در خلش غمزۂ پنہانش نیست
دشت و کہسار نَوَردید و غزالے نگرفت — طوفِ گلشن زد و یک گل بگریبانش نیست
چارہ این است کہ از عشق کشادے طلبیم
پیشِ او سجدہ گذاریم و مُرادے طلبیم

عقل چوں پاے دریں راہِ خم اندر خم زد — شعلہ در آب دوانید و جہاں برہم زد
کیمیاسازیٔ او ریگِ رواں را زر کرد — بر دلِ سوختہ اکسیرِ محبت کم زد
واے بر سادگیٔ ما کہ فسونش خوردیم — رہزنے بود کمیں کرد و رہِ آدم زد
ہنرش خاک بر آورد ز تہذیبِ فرنگ — باز آں خاک بہ چشمِ پسرِ مریم زد
شررے کاشتن و شعلہ درودن تا کے؟
عقدہ بر دل زدن و باز کشودن تا کے؟

عقلِ خود بیں دگر و عقلِ جہاں بیں دگر است — بالِ بلبل دگر و بازوے شاہیں دگر است
دگر است آنکہ برد دانۂ اُفتادہ زخاک — آنکہ گیرد خورش از دانۂ پرویں دگر است
دگر است آنکہ زند سیر چمن مثلِ نسیم — آنکہ در شد بہ ضمیرِ گل و نسریں دگر است
دگر است آنسوے نُہ پردہ کشادن نظرے — ایں سوے پردہ گمان و ظن و تخمیں دگر است
اے خوش آں عقل کہ پہناے دو عالم با اوست
نورِ افرشتہ و سوزِ دلِ آدم با اوست

ما ز خلوت کدۂ عشق بروں تاختہ ایم — خاکِ پا را صفتِ آینہ پرداختہ ایم
در نگر ہمتِ ما را کہ بہ داوے فلکنیم — دو جہاں را کہ نہاں بردہ عیاں باختہ ایم
پیشِ ما میگذرد سلسلۂ شام و سحر — بر لبِ جوے رواں خیمہ بر افروختہ ایم

در دلِ ما کہ بریں دیرِ کہن شبخوں ریخت　　آتشے بود کہ در خشک و تر انداختہ ایم

شعلہ بودیم، شکستیم و شرر گردیدیم

صاحبِ ذوق و تمنّا و نظر گردیدیم

عشق گردید ہوس پیشہ و ہر بند گسست　　آدم از فتنۂ او صورتِ ماہی در شست

رزم بر بزم پسندید و سپاہے آراست　　تیغِ اُو جز بہ سر و سینۂ یاراں ننشست

رہزنی را کہ بنا کرد جہانبانی گفت　　ستمِ خواجگیِ او کمرِ بندہ شکست

بے حجابانہ ببانگِ دف و نے می رقصد　　جامے از خونِ عزیزانِ تنک مایہ بدست

وقت آن است کہ آئینِ دگر تازہ کنیم

لوحِ دل پاک بشوئیم و ز سر تازہ کنیم

افسرِ پادشہی رفت و بہ یغمائی رفت　　نیٔ اسکندری و نغمۂ دارائی رفت

کوہکن تیشہ بدست آمد و پرویزی خواست　　عشرتِ خواجگی و محنتِ لالائی رفت

یوسفے را ز اسیری بہ عزیزی بُردند　　ہمہ افسانہ و افسونِ زلیخائی رفت

راز ہائے کہ نہاں بود ببازار افتاد　　آں سخن سازی و آں انجمن آرائی رفت

چشم بکشاے اگر چشمِ تو صاحب نظر است

زندگی در پیٔ تعمیرِ جہانِ دگر است

من دریں خاکِ کہن گوہرِ جاں می بینم　　چشمِ ہر ذرہ چو انجم نگراں می بینم

دانۂ را کہ بہ آغوشِ زمین است ہنوز　　شاخ در شاخ و بُرومند و جواں می بینم

کوہ را مثلِ پرِ کاہِ سبک می یابم　　پرِ کاہے صفتِ کوہِ گراں می بینم

انقلابے کہ نگنجد بہ ضمیرِ افلاک　　بینم و ہیچ ندانم کہ چساں می بینم

خرّم آنکس کہ دریں گرد سوارے بیند

جوہرِ نغمہ ز لرزیدنِ تارے بیند

زندگی جوے روان است و رواں خواہد بود — ایں مئ کہنہ جوان است و جواں خواہد بود

آنچہ بود است و نباید ز میاں خواہد رفت — آنچہ بایست و نبود است ہماں خواہد بود

عشق از لذّتِ دیدار سراپا نظر است — حسن مشتاقِ نمود است و عیاں خواہد بود

آں زمینے کہ بروگریۂ خونیں زدہ ام — اشکِ من در جگرش لعلِ گراں خواہد بود

"مژدۂ صبح دریں تیرہ شبانم دادند

شمع کشتند و ز خورشید نشانم دادند"[1]

۱۲/ ستمبر کو مہارانی بڑودہ کے پرائیویٹ سیکرٹری رام بابو کا خط ملا۔ شکایت تھی کہ نواب ذوالفقار نے اے وائس فرام دی ایسٹ نہیں بھیجی۔ علامہ نے اُسی وقت محمد حسین کو لکھا کہ بھجوادیں۔ "اگر کوئی نسخہ باقی نہ رہا تو بابو مذکورہ کو جواب ضرور لکھ دیجیے ورنہ وہ مجھے خط لکھتا رہے گا،" علامہ نے لکھا۔[2] شملہ جانے کا ارادہ منسوخ ہو گیا۔ محمد حسین کے کسی معاملے کے بارے میں خلیفہ شجاع الدین کو خط لکھا۔ وہ شملہ جانے کی تیاریوں میں تھے۔ مرزا جلال الدین بھی شملہ چلے گئے۔

۱۷/ ستمبر کو محمد حسین کا خط ملا۔ جواب دیا۔[3] پھر ٹائیفائیڈ میں مبتلا ہو گئے۔[4] جوڑوں میں شدید درد تھا۔ 'اسرارِ خودی' اور 'رموزِ بیخودی' کی ابتدا بیماریوں کے دوران ہوئی تھی۔ اس دفعہ تیسرے حصے کی ابتدا ہو گئی۔ "معلوم نہیں اِس میں کیا راز ہے،" علامہ نے سوچا۔[5] اِس حصے کا ذیلی عنوان 'حیات مستقبلۂ اسلامیہ' تھا۔ موضوع یہ تھا کہ ملّتِ اسلامیہ "کیا کیا واقعات و حوادث آیندہ صدیوں

---

[1] بیاض متفرقات؛ پیامِ مشرق کی طبع دوم میں شامل کی گئی۔

[2] مکتوب بنام محمد حسین ۱۲/ ستمبر ۱۹۲۳؛ ثاقب نفیس (۲۰۰۴) مکتوباتِ اقبال، ص ۱۷

[3] مکتوب بنام محمد حسین ۱۷/ ستمبر ۱۹۲۳؛ ثاقب نفیس (۲۰۰۴) مکتوباتِ اقبال، ص ۱۸

[4] مکتوب بنام شاد ۲۹/ ستمبر ۱۹۲۳ء؛ حوالہ اور حاشیہ اس تاریخ کے تحت دیکھیے۔

[5] مکتوب بنام محمد حسین بلا تاریخ۔ ڈاکخانے کی مہر ۲۷/ ستمبر ۱۹۲۳ء ہے؛ ثاقب نفیس (۲۰۰۴)، ص ۳۴، ۷۵

میں دیکھنے والی ہے اور بالآخر ان سب واقعات کا مقصود و غایت کیا ہے۔" علامہ کی سمجھ اور علم کے مطابق یہ تمام باتیں قرآن شریف میں موجود تھیں۔ کسی تاویل کی ضرورت نہ تھی۔[1] "ایک قسم کی نئی منطق الطیر" تھی۔[2] "آیندہ سو سال کے افکار و اعمال کے لیے مواد" ضرور تھا۔[3] ارادہ تھا کہ اسے ایک دفعہ لکھ لیں۔ اشاعت وفات کے بعد ہو۔ ورنہ جب وقت آئے تب ہو جائے۔[4] سب سے پہلے یکم جولائی ۱۹۱۷ء کو گرامی کے نام میں خط میں ذکر کیا۔ پھر یکم فروری ۱۹۱۸ء کو کشن پرشاد کو لکھا کہ آغاز ہو گیا ہے۔ قریباً سات برس بعد ۲۰ر جولائی ۱۹۲۳ء کو نیازالدین کو لکھا کہ دل و دماغ دوبارہ اس طرف مائل ہو رہے ہیں۔ ۲۷ر ستمبر ۱۹۲۳ء کو محمد حسین کو لکھا کہ "مثنوی کے تیسرے حصے کی ابتدا اِس بیماری میں ہو گئی۔" بیماری کا عرصہ قریباً ۱۷ر ستمبر سے ۲۷ر ستمبر تھا۔

بیاض میں دو اندراجات ملتے ہیں۔ فیصلہ نہیں ہو سکتا کہ ۱۹۱۸ء والے اشعار ہیں یا ۱۹۲۳ء والے ہیں۔ دونوں صفحات کاٹ دیئے گئے ہیں۔ پہلے اندراج کا عنوان 'مثنوی حصہ سویم' ہے۔ اس کے نیچے 'تمہید' لکھا ہے۔ اُس کے بعد سات اشعار درج ہیں۔ حاشیے میں مزید تین اشعار ہیں۔ لکیر کے اشارے سے ظاہر کیا ہے کہ انہیں چوتھے شعر کے بعد رکھا جائے۔ اس طرح ترتیب دینے پر یہ دس اشعار نئی دنیا کے بارے میں ہیں۔ آنحضورؐ کی نگاہ کے فیض نے اس کا بیج حضرت عمر فاروقؓ کے دل میں بویا تھا۔ ابھی وجود میں نہیں آئی۔ مسلمانوں کے دلوں میں ہے۔ اقبال کی نگاہ اسی کے نور سے روشن ہے۔ ابھی اس نیا انسان نہیں آیا کہ اس کے قابل ہو۔ اقبال کے دل کو پیغام دیتی ہے کہ کچھ دیر تنہا چلتے رہو:

ساقیا از من رخِ زیبا مپوش | اے فدائے تو متاعِ عقل و ہوش
تیغِ لا در دستِ ایں کافر بدہ | خیز و جامِ بادۂ احمر بدہ

[1] مکتوب بنام گرامی یکم جولائی ۱۹۱۷ء؛ خرم علی شفیق (۲۰۱۲) اقبال درمیانی دور، ص ۳۱۰
[2] مکتوب بنام شاد یکم فروری ۱۹۱۸ء؛ ایضاً، ص ۳۱۵
[3] مکتوب بنام نیازالدین ۲۰ر جولائی ۱۹۳۲ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۶۵-۴۶۴
[4]

عشق را در خود رمیدن آرزوست　　عالمے نوآفریدن آرزوست
عالمے در سینۂ من گم ہنوز　　عالمے در انتظارِ قُم ہنوز
عالمے بے امتیازِ خون و رنگ　　شامِ او روشن تر از صبحِ فرنگ
عالمے پاک از سلاطین و عبید　　چوں دلِ مومن کرانش ناپدید
عالمے رعنا کہ فیضِ یک نظر　　تخمِ او افگند در جانِ عمرؓ
صورتِ انجم درخشاں دیدمش　　از ضمیرِ لامکاں دزدیدمش
خاکم از فیضِ ہوائے او بصیر　　فکرم از آفتابش مستنیر
تا ندارد آدمے دیگر ہنوز　　با دلم گوید یکے تنہا بسوز

یہ اشعار کاٹ کر علیحدہ صفحے پر 'حصہ سویم' کا عنوان لکھا گیا ہے۔ تین اشعار درج ہیں۔ بظاہر پچھلے بیان کا تسلسل ہیں کہ اُس دنیا میں زندگی دوام حاصل کر لیتی ہے۔ پہلے مصرع لکھا گیا کہ یہ رنگ و بو کی دنیا ہمارے افکار کا میدان ہے۔ پھر کاٹ کر آخری شعر میں شامل کر دیا۔ قطع برید کے بعد اشعار یوں ہیں:

کوکبِ اندیشہ در شبہائے اُو رخشندہ تر　　عشق در پہنائے او جویندہ تر تابندہ تر
زندگی در حلقۂ آئینِ او پایندہ تر　　ایں شرارِ جستہ در خاشاکِ او سوزندہ تر

ایں جہانِ رنگ و بو جولانگہِ افکارِ ماست!
جادۂ ما امتحانِ گرمیٔ رفتارِ ماست!

'مثنوی حصہ سویم' کے تحت لکھے ہوئے دس اشعار میں سے اکثر جاویدنامہ میں شامل ہوئے۔ اُسے ۱۹۲۷ء میں لکھنا شروع کیا۔ ۱۹۳۲ء میں اشاعت ہوئی۔ جاویدنامہ مثنوی ہے۔ ''ایک قسم کی نئی منطق الطیر''بھی ہے۔ منطق الطیر میں پرندے سات وادیوں سے گزر کر سیمرغ تک پہنچتے ہیں۔ اُسے روحِ بزمِ کائنات، وحدتِ انسانی یا حقیقتِ مطلقہ سمجھا جا سکتا ہے۔ جاویدنامہ میں مسافر سات مقامات سے گزر کر خدا کے سامنے پہنچتا ہے۔ جاویدنامہ کی مناجات میں کتاب کے بارے میں ویسی ہی باتیں کہیں جیسی مثنوی کے تیسرے حصے کے متعلق کہتے آ رہے تھے۔ سمجھا جا سکتا ہے کہ مثنوی کے

تیسرے حصے ہی سے جاوید نامہ برآمد ہوا۔

'حصہ سویم' کے تحت لکھے ہوئے تین اشعار میں سے آخری کا مضمون غزلیات کے ایک سلسلے کا نقطۂ آغاز بنا۔ بیاض کے اگلے صفحات میں درج ہے۔ تیرہ غزلیات ہیں۔ لکھنے کے بعد ترتیب بدلی گئی۔ اسے ظاہر کرنے کے لیے نمبر ڈالے۔ "۱۴" خالی ہے۔ یہ بھی "ایک قسم کی نئی منطق الطیر" ہے۔ مختلف مراحل سے گزرا جا رہا ہے۔ مطلعوں کا مفہوم یوں ہے:

۱ یہ رنگ و بو کا جہاں ہمارے سامنے ہے اور تم کہتے ہو کہ یہ راز ہے۔ ذرا خود اس کے تار کو چھیڑ کر دیکھو کہ تم مضراب ہو اور یہ ساز ہے۔

۲ اے لالۂ صحرائی مجھے تم سے ایک بات کہنی ہے۔ اُس کے فراق کے داغ نے میرے دل کو ایک چمن بنا ڈالا ہے۔

۳ جب میں نے ایک آشنا کی نگاہ سے لالہ کے اندر دیکھا تو اسے سراپا ذوق و شوق اور سراپا آہ و فریاد پایا۔

۴ یہ بھی ایک عظیم جہان ہے اور وہ بھی عظیم جہان ہے، یہ بھی بیکراں ہے اور وہ بھی بیکراں ہے۔

۵ بہار کی آمد ہے اور میری نگاہ آتشِ لالہ میں لوٹ رہی ہے۔ اس پارہ پارہ دل میں سے ہزاروں فریادیں نکل رہی ہیں۔

۶ وہ مصوّر جس نے روز و شب کا یہ پیکر تخلیق کیا ہے، ان کے نقش سے وہ خود اپنا نظارہ کرتا ہے۔

۷ اس پرانی دنیا کو پھر سے جوان ہونا چاہیئے۔ گھاس کے پتے کو صفت میں کوہِ گراں ہونا چاہیے۔

۸ اس پرانے مندر میں کس نے ہنگامہ برپا کیا ہے کہ سارے زنّاری بانسری کی طرح سراپا فریاد ہیں۔

۹ اے لالہ! اے کہستان، باغ اور سبزہ زاروں کے چراغ! میری طرف نظر کر کہ میں تجھے

زندگی کا سراغ دیتا ہوں۔

۱۰ عشق نے ہماری فریاد سے ہنگامے تخلیق کئے۔ ورنہ خاموشوں کی اس محفل میں کوئی شور و غوغا نہ تھا۔

۱۱ میں آزاد بندہ ہوں اور عشق میرا امام ہے۔ عشق میرا امام ہے اور عقل میری غلام ہے۔

۱۲ کم سخن غنچہ کہ اپنے دل میں راز چھپائے بیٹھا تھا، گل و ریحان کے ہجوم میں اسے کسی دمساز کے نہ ہونے کا غم تھا۔

منطقُ الطیر کے اختتام پر جو ہوتا ہے، بالکل وہی مضمون تیرھویں غزل کا ہے:

میں اپنے آپ کو سجدہ کرتا ہوں کیونکہ دَیر و حرم نہیں رہے۔ یہ عرب میں اور وہ عجم میں نہیں رہا!

لالہ اور گُل کی پتیوں میں رنگ و آب نہیں رہا۔ پرندوں کے نالوں میں وہ زیر و بم نہیں رہا۔

اس کارگاہِ دنیا میں مجھے اب کوئی نیا نقش نظر نہیں آتا۔ شاید عدم کے اندر ہی اب کوئی نیا نقش نہیں رہا۔

آسمان کے سیّارے کسی تبدیلی کے ذوق سے بے بہرہ نظر آتے ہیں۔ شاید روز و شب کو اپنی لگی بندھی راہ سے ہٹانے کی توفیق نہیں رہی۔

منزل سے پہلے ہی سکون سے آرام کرنے لگے ہیں اور طلب سے پاؤں روک لئے ہیں۔ شاید خاکی انسانوں کے سینوں میں دم ہی باقی نہیں رہا۔

یا ممکنات کی بیاض میں ایک بھی سادہ صفحہ نہیں بچا۔ یا پھر قضا کے قلم کو اب مزید لکھنے کی تاب نہیں رہی۔

خود را کنم سجودے، دیر و حرم نمانده — ایں در عرب نماندے آں در عجم نمانده

در برگِ لالہ و گُل آں رنگ و نم نمانده — در نالہ ہائے مرغاں آں زیر و بم نمانده

در کارگاہِ گیتی نقشِ نوی نہ بینم — شاید کہ نقشِ دیگر اندر عدم نمانده

سیارہ ہائے گردوں بے ذوقِ انقلابے — شاید کہ روز و شب را توفیقِ رَم نمانده

بے منزل آرمیدند پا از طلب کشیدند　　شاید کہ خاکیاں را در سینہ دم نماندہ

یا در بیاضِ امکاں یک برگِ سادۂ نیست　　یا خامۂ قضا را تابِ رقم نماندہ!

یہ کہنا مشکل ہے کہ یہ تیرہ غزلیات کب لکھی گئیں۔ اِن میں سے اکثر زبورِ عجم کے حصہ اول اور دوم میں شامل ہیں۔ یہاں کی آخری غزل زبورِ عجم حصہ اول کا اختتام ہے۔ زبورِ عجم کو بھی اُسی مضمون سے مربوط سمجھنا پڑتا ہے جو مثنوی کے تیسرے حصے کا موضوع تھا۔[1]

17

۲۷/ ستمبر کو علامہ کو ٹائیفائیڈ سے نجات ملی۔ کمزوری باقی تھی۔ اس مرحلے کو بخار سے زیادہ خطرناک سمجھتے تھے۔ طاہر الدین ایک دو روز کے لیے لاہور سے باہر گئے۔ شملہ سے چودھری محمد حسین کا خط آیا۔ "بخار جاتا رہا، میں باقی رہ گیا،" اُس روز بستر پر لیٹے لیٹے جواب لکھا۔[2]

اگلے روز محمد حسین کا خط آیا۔ نواب ذوالفقار کے ایک قریبی عزیز فوت ہوئے تھے۔ وہ آبائی جاگیر مالیر کوٹلہ جا رہے تھے۔ علامہ نے وہاں کے پتے پر تعزیت کا تار دیا۔ مرزا جلال الدین غالباً شملہ سے واپس آچکے تھے۔ اُن کی بیوی اور دونوں بیٹے ٹائیفائیڈ میں مبتلا رہے تھے۔ اب خود تھے۔[3]

۲۹/ ستمبر کو علامہ نے محمد حسین کو جواب لکھا۔ اُس روز کشن پرشاد کا خط ملا۔ بیٹے کی آنکھ ابھی خراب تھی۔ صرف بہت تیز روشنی میں دھندلا سا دکھائی دیتا۔ بابا تاج الدین ناگپور، شاہ نیاز احمد صاحب فیض آباد، شاہ نجم الدین احمد صاحب فتح پور، فرخ شاہ جمال اللہ شاہ صاحب کانپور، آپا سنی مہاراج ساکوری ضلع احمد نگر اور دیگر فقرا سے دعا کروائی تھی۔ علامہ سے کہا کہ لاہور کے فقرا سے دعا کروائیں۔[4] علامہ نے بستر پر لیٹے لیٹے لکھا، "وہ جس کا وجود سینکڑوں ہزاروں آنکھوں کے لیے

---

[1] بیاض زبورِ عجم

[2] مکتوب بنام محمد حسین بلا تاریخ۔ ڈاکخانے کی مہر ۲۷/ ستمبر ۱۹۲۳ء ہے؛ ثاقب نفیس (۲۰۰۴)، ص ۳۴، ۷۵

[3] مکتوب بنام محمد حسین ۲۹/ ستمبر ۱۹۲۳ء؛ ثاقب نفیس (۲۰۰۴)، ص ۱۹

[4] مکتوب شاد بنام اقبال ۱۹/ ستمبر ۱۹۲۳ء؛ قریشی (۱۹۸۶) اقبال بنام شاد، ص ۳۷۲-۳۷۱

ٹھنڈک ہے، اللہ تعالیٰ کی غیرت کبھی گوارا نہ کرے گی کہ اس کے نورِ نظر کو زخمِ چشم پہنچے۔ انشأاللہ استدعائے دعا کروں گا۔"[1]

18

جامعہ ملیہ علیگڑھ کے رسالے میں اسلم جیراجپوری نے پیامِ مشرق پر تبصرہ کیا۔ نظم 'بوئے گُل' کے آخری مصرعے میں "آہے گذاشت" کی ترکیب انہیں مکروہ معلوم ہوتی تھی:

آہے گذاشت است کہ بُونام دادہ اند[2]

۱۱/ اکتوبر کو علامہ نے عبدالماجد دریابادی سے رائے مانگی۔ ندوی سے بھی پوچھنا تھا۔ "چونکہ دوسری ایڈیشن جلد نکالنے کا ارادہ ہے اس واسطے اگر آپ کا جواب جلد مل جائے تو بہتر ہو،" ماجد کو لکھا۔[3]

پٹنہ کی لائق خاتون صغرا ہمایوں بیگم کو پیامِ مشرق بھجوانا بھول گئے تھے۔ معلوم ہوتا ہے اُن کا خط ملا۔ کسی مضمون کے بارے میں بھی استفسار تھا۔ ۱۴/ اکتوبر کو علامہ نے لکھا، "کل پبلشر کو لکھ بھیجوں گا، کہ وہ پیامِ مشرق کی ایک جلد آپ کی خدمت میں بھیج دے۔ مضمون لکھنے کی فرصت نہ ملی، اور نہ ابھی کچھ مدت تک ایسی فرصت ملنے کی توقع ہے کیونکہ فرصت کے اوقات میں مجھے بعض ضروری لٹریری کاموں کی تکمیل کرنا ہے۔"[4]

مہاراجہ کشن کو حیدرآباد کی وزارتِ عظمیٰ دوبارہ ملنے کی اُمید بندھی تھی۔ اولادوں میں سے بارہ لڑکے اور پانچ لڑکیاں فوت ہو چکے تھے۔ چھٹی لڑکی ان دنوں فوت ہوئی۔ غم غلط کرنے کے لیے

---

[1] مکتوب بنام شاد ۲۹/ ستمبر ۱۹۲۳ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۷۹-۴۷۷۔ برنی نے تاریخ ۲۱/ ستمبر سمجھی ہے۔ خط میں ہے، "پرسوں سے بخار اُترا ہے۔" مکتوب بنام محمد حسین ۲۷/ ستمبر سے ظاہر ہے کہ ۲۷/ کو اُترا۔

[2] مکتوب بنام عبدالماجد دریابادی ۱۱/ اکتوبر ۱۹۲۳ء۔ ایضاً، ص ۴۸۰-۴۷۹

[3] ایضاً

[4] مکتوب بنام صغرا ہمایوں بیگم ۱۴/ اکتوبر ۱۹۲۳ء۔ ایضاً، ص ۴۸۰

کرمن گھاٹ کے شاد پیلس چلے گئے۔ وہاں سے علامہ کو خط لکھا تھا۔[1]

لاہور میں وائسرائے آنے والے تھے۔ اسٹیشن اور راستے کی سجاوٹ ہو رہی تھی۔ علامہ کو مولانا گرامی کا خط ملا۔ رباعیات بھیجی تھیں۔ علامہ نے جیب میں رکھ لیں۔ نواب سر ذوالفقار اور شیخ اصغر علی آنے والے تھے۔ انہیں سنانے کا ارادہ تھا۔ پیامِ مشرق کی نظم 'بوئے گل' میں گرامی نے ترمیم تجویز کی تھی۔ علامہ کے خیال میں ترمیم سے زبان بہتر ہو گئی تھی مگر وہ خیال ظاہر نہ ہوتا تھا جسے ظاہر کرنا چاہتے تھے۔ سائل دہلوی سے گرامی کی کچھ تکرار ہوئی تھی۔ غالباً گرامی نے اس کا حال بھی لکھا تھا۔ لاہور آنے کا ارادہ بھی تھا اور لکھا تھا، "ممکن ہے کہ گرامی اقبال کی کوٹھی پر ہی فروکش ہو۔" علامہ نے خط پڑھتے ہی جواب لکھا، "آپ نے یہ کیا لکھ دیا کہ 'ممکن ہے کہ گرامی اقبال کی کوٹھی پر ہی فروکش ہو'۔ کیا آپ کے کسی اور جگہ ٹھہرنے کا بھی امکان ہے؟... سائل صاحب کو تو آپ نے خوب سنائی۔ شاعروں سے ڈرنا چاہیے۔ بھائی یہ لوگ بڑے بے ڈھب ہوتے ہیں۔"[2]

۲۳/ اکتوبر کو وائسرائے ارل آف ریڈنگ نے لاہور ہائی کورٹ کی توسیعی عمارت کا افتتاح کیا۔ گورنر پنجاب سر میکلیگن بھی موجود تھے۔ چیف جسٹس سر شادی لال نے سپاس نامہ پیش کیا۔ وائسرائے کی جوابی تقریر علامہ کے مطابق "نہایت دلکش" تھی اور "نہایت عمدگی کے ساتھ ادا کی گئی۔" وائسرائے نے کہا کہ چیف جسٹس نے جو تعریف کی ہے، کاش وہ اسے ایک جج کا فیصلہ سمجھ سکتے! انکساری مجبور کرتی ہے کہ وہ سمجھیں کہ اس موقع پر جج صاحب کے اندر کا وکیل بیدار ہو گیا ہے جس نے وکالت کی ہے۔ لاہور ہائی کورٹ سے وابستہ افراد میں علامہ کا ذکر خاص طور پر کیا۔ بقول علامہ، "سب کو تعجب ہوا کہ اس کی توقع نہ تھی۔" وائسرائے نے کہا:

> …apart from its eminent lawyers and politicians, this Bar has the distinction of possessing as a practising Member Sir Mohammad Iqbal the celebrated Urdu and Persian poet.[3]

---

[1] مکتوب شاد بنام اقبال ۸/ اکتوبر ۱۹۲۳ء؛ قریشی (۱۹۸۶) اقبال بنام شاد، ص ۳۷۵-۳۷۲

[2] مکتوب بنام گرامی ۲۱/ اکتوبر ۱۹۲۳ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۸۴-۴۸۱

[3] Reading (1926), p.53۔ نیز مکتوب بنام شاد ۲۴/ اکتوبر ۱۹۲۳ء، برنی (۱۹۹۱)، ص ۴۸۶-۴۸۴

19

علامہ کا مسوڑا پھول گیا تھا۔ سخت تکلیف تھی۔ ۲۴؍ اکتوبر کو مہاراجہ کشن پرشاد کو تعزیت کا خط لکھا۔[1] تین روز بعد مسوڑے کی تکلیف کم ہوئی۔[2]

۲۸؍ اکتوبر کو گرامی کا خط ملا۔ حیدرآباد دکن جانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ اقبال کو حضرت علیؓ سے منسوب قول یاد آیا، "میں نے اپنے رب کو اپنے ارادوں کے ٹوٹنے سے پہچانا۔" علامہ نے اُسی وقت گرامی کو جواب میں لکھا، "دکن تو اَب آپ جا چکے۔ اگر 'عرفت ربی بفسخ العزائم' صحیح ہے تو آج دنیا بھر میں آپ سے بڑھ کر کوئی عارفِ کامل موجود نہیں۔" پیامِ مشرق کی نظم 'بوئے گل' پر مولانا اسلم جیراجپوری نے جو اعتراض کیا تھا وہ بھی خط میں لکھ کر گرامی سے رائے طلب کی۔[3]

اُس روز کے زمیندار میں آل انڈیا مسلم کشمیری کانفرنس کے دسویں سالانہ اجلاس کا اشتہار شائع ہوا۔ چوتھا اجلاس ساڑھے چار بجے سہ پہر سے شام چھ بجے تک ہو رہا تھا۔ لکھا گیا کہ ڈاکٹر سر محمد اقبال چار بجے سے ساڑھے چار بجے تک نظم پڑھیں گے۔ اجلاس کی کاروائی دستیاب نہیں ہے۔ تصدیق نہیں ہو سکی کہ علامہ شریک ہوئے یا کوئی نظم پڑھی۔[4]

20

۲۹؍ اکتوبر کو اَنقرہ میں ترک اسمبلی نے تین سال پرانے آئین میں ترمیم کی۔ ترکی اب جمہوریہ تھا۔

صدر کا انتخاب پارلیمنٹ نے اپنے ارکان میں سے کرنا تھا۔ وہ وزیرِاعظم نامزد کرتا اور وزیرِاعظم کابینہ نامزد کرتا۔ اس کی توثیق پارلیمنٹ سے کروائی جاتی۔ صدر نہ صرف اسمبلی بلکہ کابینہ کے اجلاس کی صدارت بھی کر سکتا تھا۔ غازی مصطفی کمال پاشا نئی جمہوریہ کے پہلے صدر تھے۔

---

[1] مکتوب بنام شاد ۲۴؍ اکتوبر ۱۹۲۳ء۔ ایضاً

[2] مکتوب بنام گرامی ۲۴؍ اکتوبر ۱۹۲۳ء۔ ایضاً، ص ۴۸۴-۴۸۱

[3] ایضاً

[4] اختر النسا (۲۰۱۰) اقبال اور زمیندار، ص ۲۱۱

ریاست کا مذہب اسلام تھا۔ سرکاری زبان ترکی تھی۔ اسمبلی کے رکن ایک عالمِ دین نے کہا کہ جمہوریہ کا تصور بالکل اسلام کے مطابق ہے۔ خلافتِ راشدہ کی روایت تازہ کی جا رہی ہے۔

غیر ملکی فوجیں استنبول سے جا چکی تھیں۔ اب خلیفہ عبدالمجید کے پاس اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ محل میں اپنی چاروں بیویوں کے ساتھ آیندہ احکامات کا انتظار کریں۔[1]

لاہور میں اُس رات پنجاب یونیورسٹی کے فارسی تعلیمی بورڈ کی میٹنگ ہوئی۔ علامہ بورڈ میں تھے۔ ڈاکٹر ریوبن لیوی (Reuben Levy) کے فارسی ادب پر کتابچے کو بی اے کے فارسی نصاب میں شامل کیا۔ انگریز نوجوان تھے۔ جنگ عظیم کے دوران میسوپوٹیمیا میں برطانوی انٹیلی جنس کے ساتھ رہ چکے تھے۔ اب آکسفورڈ میں اسلام اور فارسی پر لیکچر دیتے تھے۔ اگلے روز علامہ نے پیامِ مشرق کا ایک نسخہ اپنے خط کے ساتھ ارسال کیا کہ رائے سے آگاہ فرمائیں۔[2]

21

عبدالماجد دریا آبادی کی کتاب پیامِ امن شائع ہوئی۔ فرانسیسی مصنف پال رچرڈ کی کتاب کے انگریزی ترجمے سے ماخوذ تھی۔ چھ برس پہلے یورپ کی جنگِ عظیم کے دوران امریکہ سے *To the Nations* کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ مصنف نے لکھا تھا کہ حریت، مساوات اور اخوت جنہیں فرانس نے صرف اپنے لیے طلب کیا تھا، اب تمام قوموں کے لیے تسلیم کیے جائیں۔ دیباچہ ٹیگور کے قلم سے تھا:

> The peoples are living beings. They have their distinct personalities. Therefore the French and the Germans, who not only live in close neighborhood, but also contain in themselves in a large measure a racial similarity, have their individual differences that cannot be overlooked.
>
> But the nations are not living beings, they are organizations of power. Their physical and mental aspects are monotonously

---

[1] Andrew Mango (2000). *Ataturk,* p.394

[2] مکتوب بنام ڈاکٹر لیوی (انگریزی)؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۹۲-۴۹۱

the same everywhere. Their differences are merely the differences in degree of efficiency.[1]

عبدالماجد دریابادی کی پیامِ امن میں بارہ ابواب ترجمے پر مشتمل تھے۔ سات ابواب اضافہ تھے۔ کئی مقامات پر مصنف سے اختلاف کیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب علامہ کو بھجوائی گئی۔ ۳؍ نومبر کو شکریہ ادا کرتے ہوئے انہوں نے لکھا، ''آپ کا تبصرہ بجائے خود ایک نہایت مفید رسالہ ہے۔''[2]

22

۶؍ نومبر کو لاہور ہائی کورٹ نے گوبند رام اور بعض دوسروں کی اپیل مسترد کر دی۔ پیروی جیون لال کپور، ہری گوپال اور فقیر چند کر رہے تھے۔ اپیل کسی محمد علی اور بعض دوسروں کے خلاف تھی۔ اُن کی پیروی علامہ کر رہے تھے۔ سماعت جسٹس اسکاٹ اسمتھ اور جسٹس ایف فورڈ نے کی تھی۔[3]

دو روز بعد لندن میں امپیریل کانفرنس اختتام کو پہنچی۔ یکم اکتوبر کو شروع ہوئی تھی۔ تاجِ برطانیہ سے وابستہ ریاستیں عام طور پر تین درجات میں تقسیم کی جاتی تھیں۔ کینیڈا، آسٹریلیا، نیوزی لینڈ، جنوبی افریقہ اور آئرلینڈ کی آزاد ریاست وغیرہ ''مستعمرات'' (dominions) تھے۔ انہیں اپنی مرضی کی حکومت کا اختیار حاصل تھا۔ دوسرے درجے پر ''نوآبادیات'' (colonies) تھیں۔ وہاں کے عوام حکومت کرنے کے اہل نہ سمجھے جاتے تھے۔ ''ہندوستان'' (India) کا نام ہمیشہ علیحدہ لیا جاتا تھا۔ عملاً اس کی حیثیت نوآبادی جیسی تھی۔ امپیریل کانفرنس میں تینوں درجات کی ریاستوں کی نمایندگی تھی۔

فیصلہ ہوا کہ کسی ڈومینین کی اجازت کے بغیر تاجِ برطانیہ اُس کی طرف سے جنگ کا اعلان نہیں کر سکتا۔ ڈومینین تاجِ برطانیہ سے پوچھے بغیر بھی کسی دوسرے ملک کے ساتھ کوئی معاہدہ کر سکتا ہے۔ دفاع اور خارجی امور تاجِ برطانیہ کے تسلط سے نکل کر مستعمرات کے پاس چلے گئے۔

ہندوستان کی نمایندگی ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو اور مہاراجہ الوَر کر رہے تھے۔ سپرو نے کہا کہ

---

[1] Paul Richard (1917), *To the Nations,* p.vii

[2] مکتوب بنام عبدالماجد دریابادی ۳؍ نومبر ۱۹۲۳ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۹۲

[3] ظفر علی راجا ایڈووکیٹ (۲۰۱۳) قانون دان اقبال، ص ۱۲۲

ہندوستانیوں کے درمیان ہر چیز متنازعہ ہو سکتی ہے لیکن ایک بات پر سب متفق ہیں۔ دوسرے مستعمرات اور نو آبادیوں میں رہنے والے ہندوستانیوں کو وہاں برابری کی بنیاد پر حقوق ملنے چاہئیں۔[1]

اسپین میں دستوری بادشاہت تھی۔ ۱۳/ نومبر کو فوج نے منتخب وزیر اعظم کو برطرف کر کے آئین معطل کر دیا۔ کیپٹن جنرل پرائمو ڈی ریوئیرا (Capt. General Primo de Rivera) وزیر اعظم بن گئے۔ اعلان کیا، "ہم اسپین کی آئینی زندگی میں ایک مختصر وقفہ دینا چاہتے ہیں۔ جیسے ہی ملک ہمیں ایسے افراد پیش کرے گا جو سیاسی تنظیموں کی آلودگی سے پاک ہوں، آئین بحال کر دیا جائے گا۔"

23

جالندھر والے سعید الدین جعفری کا خط آیا۔ کچھ سوالات پوچھے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک سوال اسلام اور عصری تقاضوں کے بارے میں تھا۔ بعض لوگوں کے اس اعتراض کا تذکرہ بھی تھا کہ علامہ نے اسلام کو اپنی شاعری کا موضوع کیوں بنایا ہے، اِس طرح کے خیالات سے ہندوستانی اقوام کے درمیان دشمنی پھیلتی ہے۔ بہتر ہو گا اگر علامہ انسان دوستی کے موضوعات تک محدود رہیں۔ پین اسلامزم کی سیاسی تحریک کا دائرہ بہت محدود ہے۔

ان اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے علامہ نے محسوس کیا کہ اتنا طویل خط پہلے کبھی نہیں لکھا۔

بنام سعید الدین جعفری

لاہور، ۱۴/ نومبر ۲۳ء

مکرمی السلام علیکم

(۱) ایشیا کے قدیم مذاہب کی طرح اسلام بھی زمانہ حال کی روشنی میں مطالعہ کیے جانے کا محتاج ہے۔ پرانے مفسرینِ قرآن اور دیگر اسلامی مصنفین نے بڑی خدمت کی ہے۔ مگر

---

[1] Mitra: *Register 1923, Vol. 2,* p.390

اُن کی تصانیف میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جو جدید دماغ کو اپیل نہ کریں گی۔ میری رائے میں بہ حیثیتِ مجموعی زمانہ حال کے مسلمانوں کو امام ابنِ تیمیہ اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ ان کی کتب زیادہ تر عربی میں ہیں مگر شاہ صاحب موصوف کی حجۃ اللہ البالغہ کا اردو ترجمہ ہو چکا ہے۔ حکما میں ابنِ رشد اس قابل ہے کہ اُسے دوبارہ دیکھا جائے۔ علیٰ ہٰذا القیاس غزالی اور رومی علیہم الرحمۃ۔ مفسرین میں معتزلی نقطۂ خیال سے زمخشری، اشعری نقطۂ خیال سے رازی اور زبان و محاورہ کے اعتبار سے بیضاوی۔ نئے تعلیم یافتہ مسلمان اگر عربی زبان میں اچھی دستگاہ پیدا کر لیں تو اسلام کے Re-Interpretation میں بڑی مدد دے سکیں گے۔ میں نے اپنی تصانیف میں ایک حد تک یہی کام کرنے کی کوشش کی ہے۔ انشأ اللہ اس پر نثر بھی لکھوں گا۔

(۲) الفاظ کے انتخاب میں لکھنے والا (شاعر) اپنی حسِ موسیقیت سے کام لیتا ہے اور مضامین کے انتخاب میں اپنے فطری جذبات کی پیروی پر مجبور ہوتا ہے۔ اس امر میں کسی دوسرے شخص کے مشورے پر خواہ وہ کتنا ہی نیک مشورہ کیوں نہ ہو، عمل نہیں کیا جا سکتا۔ دوسرے اعتراض کے متعلق یہ بھی عرض ہے کہ میرے نزدیک اسلام نوعِ انسان کی اقوام کو جغرافی حدود سے بالاتر کرنے اور نسل و قومیت کے مصنوعی مگر ارتقائے انسانی کے ابتدائی مراحل میں مفید امتیازات مٹانے کا ایک عملی ذریعہ ہے۔ اسی وجہ سے اور مذاہب (یعنی مسیحیت، بدھ ازم وغیرہ) سے زیادہ کامیاب رہا ہے۔ چونکہ اس وقت ملکی اور نسلی قومیت کی لت یورپ سے ایشیا میں آ رہی ہے اور میرے نزدیک انسان کے لیے ایک بہت بڑی لعنت ہے۔ اس واسطے بنی نوعِ انسان کے مفاد کو ملحوظ رکھتا ہوں۔ ابتدا میں میں بھی قومیت پر اعتقاد رکھتا تھا اور ہندوستان کی متحدہ قومیت کا خواب شاید سب سے پہلے میں نے دیکھا تھا لیکن تجربے اور خیالات کی وسعت نے میرے خیال میں تبدیلی کر دی اور اب قومیت میرے نزدیک محض ایک عارضی نظام ہے جس کو ہم ایک ناگزیر زشتی سمجھ کر گوارا کرتے ہیں۔ آپ Pan-Islam کو ایک پولیٹیکل یا قومی تحریک تصور

کرتے ہیں۔ میرے نزدیک یہ ایک طریق چند اقوام انسانی کو جمع کرنے اور ان کو ایک مرکز پر لانے کا ہے۔ اس غرض سے ایک مرکزِ شہودی پر مجتمع ہو جانے اور ایک ہی قسم کے خیالات رکھنے اور سوچنے کے باعث یہ اقوام نسلی اور قومی اور ملکی امتیازات وتعصبات کی لعنت سے آزاد ہو جائیں۔ پس اسلام ایک قدم ہے نوعِ انسانی کے اتحاد کی طرف۔ یہ ایک سوشل نظام ہے جو حریت ومساوات کے ستونوں پر کھڑا ہے۔ پس جو کچھ میں اسلام کے متعلق لکھتا ہوں اس سے میری غرض محض خدمتِ بنی نوع ہے اور کچھ نہیں اور میرے نزدیک عملی نقطۂ خیال سے صرف اسلام ہی Humanitarian Ideal کو Achieve کرنے کا ایک کارگر ذریعہ ہے۔ باقی ذرائع محض فلسفہ ہیں۔ خوشنما ضرور ہیں مگر نا قابلِ عمل۔ مجھے یہ معلوم کر کے تعجب ہوا کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ خالص اسلامی حقائق پر لکھنے اور ان کو نمایاں کرنے سے ہندوستان کی اقوام میں باہمی عناد بڑھتا ہے۔ اس بات میں میں آپ سے متفق ہوں کہ مسلمانوں کو محبت کا طریق اختیار کرنا چاہیے۔ نبی کریمؐ کی حدیث ہے کہ مسلمان دنیا کے لیے سراپا شفقت ہے مگر اس اخلاقی انقلاب کو حاصل کرنے کے لیے بھی یہ ضروری ہے کہ اسلام اپنی اصل روشنی میں پیش کیا جائے۔ میرا ذاتی طریق یہی ہے کہ میں دنیا کی تمام مذہبی تحریکوں کو ادب اور احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہوں، گو یہ احترام مجھے ایسی تنقید سے باز نہیں رکھ سکتا جس کی بنا دیانت پر ہو اور جس میں سوائے خلوص کے اور کچھ نہ ہو۔ غرض یہ کہ میرا عقیدہ ہے اور یہ عقیدہ محض خاندانی تربیت اور ماحول کے اثرات کا نتیجہ نہیں بلکہ بیس سال کے نہایت آزادانہ غور وفکر کا نتیجہ ہے کہ اس وقت اقوامِ انسانی کے لیے سب سے بڑی نعمت اسلام ہے اور جو شخص مسلمان کہلاتا ہے اس کا فرض ہے کہ قومی تعصب کی وجہ سے نہیں بلکہ خالصتاً للہ اپنی زندگی میں ایک عملی انقلاب پیدا کرے اور اگر دماغی قوت رکھتا ہے تو اپنی بساط کے مطابق اسلام کے سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کرے تاکہ نوعِ انسان قدیم توہمات سے نجات پائے۔ مسلمانوں کو تو سیاسیات سے پہلے اشاعتِ اسلام کا کام ضروری ہے تاہم دونوں کام ساتھ

ساتھ بھی ہو سکتے ہیں۔

منظر علی صاحب کے مذہبی عقائد کا حال سن کر مجھے کچھ تعجب نہیں ہوا کیونکہ Nationalism نے قریباً ہر ملک میں مذہب کو Displace کیا ہے لیکن الحمدللہ ان کے خیالات نے اس طرف پلٹا کھایا اور ان کو تحقیق کا شوق پیدا ہوا۔ چند مصنفین کے نام میں اوپر لکھ چکا ہوں۔ میری رائے میں سید سلیمان ندوی اور مولانا ابوالکلام اس بارے بہتر مشورہ دے سکیں گے۔

مجموعہ شائع کرنے کی فکر میں ہوں۔ انشأاللہ ۲۴ء میں ضرور شائع ہو جائے گا۔ معلوم نہیں آپ کی سب باتوں کا جواب اس خط میں آیا یا نہیں۔ میں نے آج تک اتنا طویل خط کسی کو نہیں لکھا اور نہ حقیقت میں ایسا کرنے کی فرصت ہے۔[1]

امید ہے کہ مزاج بخیر ہو گا۔ مخلص

محمد اقبال[2]

24

اُردو مجموعہ کلام کی فرمایش کی جاتی تو علامہ عموماً معذرت کر لیتے تھے۔ اِس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ ترتیب دینے کا ارادہ ہو چکا تھا۔

اسی برس مولوی احمد دین نے کتاب اقبال تصنیف کر کے چھپوائی۔[3] اسٹاکسٹ کے طور پر شیخ مبارک علی کا نام درج تھا۔[4] اُردو میں علامہ کی شخصیت اور شاعری پر پہلی کتاب تھی۔ حکیم احمد شجاع اس کا موازنہ ایڈورڈ ڈاؤڈن (Edward Dowden) کی شیکسپیئر ہز مائنڈ اینڈ آرٹ (*Shakespeare—A Critical Study of His Mind and Art*) کے ساتھ کیے بغیر نہ رہ

---

[1] طوالت میں مکتوب بنام حسن نظامی ۳۰/ دسمبر ۱۹۱۵ء سے موازنہ کیا جا سکتا ہے؛ برنی (۱۹۸۹)، ص ۴۵۷-۴۴۸

[2] یہ خط ڈاکٹر اکبر حسین قریشی کے توسط سے شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۱۱۸-۱۲۱ پر ہے۔

[3] مشفق خواجہ (مرتب: ۲۰۰۶) اقبال از احمد دین، ص ۴۶، ۹۸

[4] مشفق خواجہ (مرتب: ۲۰۰۶) اقبال از احمد دین، ص ۴۷

سکے۔ احمد دین نے ''سب سے پہلے اقبال کو اُن کے اصلی رنگ میں دیکھا اور اُن کی شاعری کو اصلی رنگ میں سمجھا،'' شجاع نے بعد میں لکھا، ''اس طرز پر تشریح کی جس پر مائنڈ اینڈ آرٹ آف شیکسپئیر لکھی گئی تھی ...اِس خیال سے کہ ان کی کتاب کی اشاعت سے بانگِ درا کی اشاعت کو نقصان پہنچے گا، اپنی کتاب خود ہی تلف کر دی۔''[1] اسٹاکسٹ شیخ مبارک علی، احمد دین کے بیٹے خواجہ ریاض احمد، غلام رسول مہر اور فوق کے شاگرد محمد عبداللہ قریشی نے بھی تصدیق کی ہے کہ احمد دین نے کتاب تلف کر دی تھی۔ نوے برس بعد بھی صرف دو کاپیاں دستیاب ہیں۔ احمد دین کے قانونی ورثا کے پاس ہیں۔ یقیناً کتاب تلف کی گئی۔

بعد یہ روایت مشہور ہوئی کہ علامہ نے کتاب پر اعتراض کیا تھا۔ محمد عبداللہ قریشی نے ۱۹۵۶ء میں لکھا، ''شیخ گلاب دین نے اِس [کتاب] کے متعلق اقبال کی رائے دریافت کی تو اقبال نے مذاق ہی مذاق میں کہہ دیا کہ میں تو نظرِ ثانی کے بعد اپنے کلام کا مجموعہ ابھی مرتب ہی کر رہا تھا کہ مولوی صاحب نے اقبال کو بیچنا بھی شروع کر دیا۔ کم از کم وہ میری کتاب کا انتظار کر لیتے۔''[2] ۱۹۶۶ء میں غلام رسول مہر سے پوچھا گیا تو اُنہوں نے کہا، ''ایک کاپی دیکھ کر غالباً اقبال نے اِسی خیال سے [کہ اس میں ایسی نظمیں بھی شامل ہیں جنہیں اقبال اپنے کلام سے خارج کر چکے تھے] ہلکے انداز میں ناپسندیدگی کا اظہار کیا، بلاواسطہ نہیں بالواسطہ۔''[3] ۱۹۶۶ء ہی میں شیخ مبارک علی سے استفسار کیا گیا۔ اُنہوں نے جواب لکھوایا، ''ڈاکٹر صاحب قبلہ [علامہ اقبال]...نے دیکھ کر یہ کہا کہ اِس کتاب کے ہوتے ہوئے میرے دوسرے مجموعہ کلام کی کیا ضرورت ہے؟ بظاہر وہ ناراض نہ تھے۔''[4] اُسی برس احمد دین کے بیٹے خواجہ ریاض احمد سے دریافت کیا گیا۔ اُنہوں نے بتایا کہ شیخ گلاب دین نے احمد دین سے کہا کہ کتاب کہیں علامہ کے مجموعہ کلام پر اثر انداز نہ ہو۔ احمد دین نے جواب دیا کہ اُن کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ

[1] مشفق خواجہ (مرتب: ۲۰۰۶) اقبال از احمد دین، ص ۴۵، ۹۸

[2] عبداللہ قریشی (۱۹۵۶)، 'حیاتِ اقبال کی گمشدہ کڑیاں'، ص ۴۵

[3] مشفق خواجہ کے نام مہر کا خط ۱۳/ مارچ ۱۹۶۶ء؛ مشفق خواجہ (مرتب: ۲۰۰۶) اقبال از احمد دین، ص ۴۵، ۹۸

[4] مشفق خواجہ کے نام احمد علی شیخ کا خط منجانب شیخ مبارک ۲۸/ فروری ۱۹۶۸؛ مشفق خواجہ محولہ بالا، ص ۴۶، ۹۸

اقبال کو نقصان ہو۔ کتاب کو صحن میں رکھ کر بالکل جلا دیا۔[1] ۱۹۷۷ء میں عبداللہ چغتائی نے لکھا، ”علامہ خود مولوی احمد دین کے پاس تشریف لے گئے اور اُنہیں بتایا کہ اِس طرح بغیر ترمیم و اِصلاح کے اور بغیر نظرِ ثانی کے کتاب کی اشاعت انہیں ہرگز پسند نہیں آئی۔“[2] اِن میں سے کسی روایت میں بھی دعویٰ نہیں کیا گیا کہ خود علامہ یا احمد دین سے بات سنی گئی۔ اس لیے یہ نکتہ اُٹھایا گیا ہے کہ:

> اقبال اور احمد دین کے بے انتہا گہرے تعلقات کے پیشِ نظر یہ ممکن نہیں کہ اقبال کو احمد دین کی کتاب کی طباعت کا پہلے سے علم نہ ہو۔ کوئی تعجب نہیں کہ انہوں نے اِس سلسلے میں اقبال سے مشورہ بھی کیا ہو... یہ بھی ممکن نہیں کہ احمد دین کو یہ علم نہ ہو کہ جلد ہی اقبال کے اُردو کلام کا مجموعہ شائع ہونے والا ہے ... دوسری اور اہم بات یہ ہے کہ احمد دین کو تو اقبال نے اُن لوگوں کے خلاف قانونی کاروائی کرنے پر مامور کر رکھا تھا جو بلا اجازت اقبال کا کلام شائع کرتے تھے۔ ایسی صورت میں یہ کیسے ممکن تھا کہ احمد دین خود اس جرم کا ارتکاب کرتے جس کے سدِّباب کے لیے انہیں مامور کیا گیا تھا۔[3]

یہ روایت مسترد کرنی پڑتی ہے کہ علامہ نے اشاعت پر کوئی اعتراض کیا۔ یہ بھی محال ہے کہ احمد دین نے چھپوانے سے پہلے تسلی نہ کی کہ علامہ کے کاروباری مفادات پر برا اثر نہ پڑے گا۔ ان روایات کو مسترد کرنے کے بعد یہ امکان بھی ختم ہو جاتا ہے کہ احمد دین نے علامہ سے مشاورت کے بغیر ہی کتاب لکھ دی۔[4] ۱۹۲۲ء میں انگریزی میں اے وائس فرام دی ایسٹ (*A Voice from the East*) شائع ہوئی تھی۔ تیاری کے دوران نواب ذوالفقار علی خاں اور سردار امراؤ سنگھ نے علامہ کے

---

[1] ریاض کا خط مشفق خواجہ کے نام ۲۷/ اپریل ۱۹۶۶ء؛ مشفق خواجہ (۲۰۰۶) اقبال از احمد دین، ص ۴۹-۴۸

[2] عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۱۷۰

[3] مشفق خواجہ محولہ بالا، ص ۴۸؛ تعجب ہے کہ مشفق خواجہ نے ان دلائل کی بنیاد پر جن روایات کو مسترد کیا، اگلے صفحے پر اُنہیں دوبارہ قبول کر کے کسی معنی خیز نتیجے پر پہنچنے سے اجتناب کر لیا۔

[4] یہ مفروضہ میں نے بھی اقبال درمیانی دور، ص ۶۵۱ پر قبول کیا تھا۔

ساتھ صلاح مشورہ کیا۔[1] پھر احمد دین کیوں صلاح مشورے کے بغیر کتاب لکھتے؟ ان کی کتاب کی داغ بیل بھی انہی دنوں پڑی۔ عبداللہ چغتائی کو "۱۹۲۲ء کے اخیر میں" ہی اس کے بارے میں معلوم ہو چکا تھا کیونکہ "اس کا ذکر اُن کے صاحبزادے بشیر احمد اکثر اپنے احباب سے کیا کرتے تھے اور یہ بھی کہا کرتے تھے کہ بابو جی (مولوی احمد دین) کا ارادہ اسے شائع کرنے کا ہے۔"[2]

اُس وقت علامہ نے اُردو مجموعے کے بنیادی اصول طے نہ کیے تھے۔ سنجیدگی سے متوجہ ہوئے تو فیصلہ کیا کہ کلام کا بہت بڑا حصہ موجودہ معیار سے نیچے ہے۔ ترک کریں گے۔ کیا اُس کے بعد احمد دین گوارا کر سکتے تھے کہ ایک ایسی کتاب بازار میں لے آئیں جس میں متروک کلام کی بھرمار ہو؟ جس وجہ سے علامہ نے کلام کا بڑا حصہ ترک کیا وہی احمد دین سے کتاب تلف کروانے کے لیے بھی کافی سمجھی جا سکتی ہے۔ اس صورت میں یہ کہنا پڑے گا کہ علامہ نے کلام کے بڑے حصے کو ترک کرنے کا فیصلہ اُس وقت کیا جب احمد دین کی کتاب پریس سے آچکی تھی۔ زیادہ فروخت نہ ہوئی تھی۔ بہتر تھا کہ فی الحال تلف کر دی جائے۔ علامہ کا مجموعہ شائع ہونے کے بعد دوبارہ مرتب کی جائے۔ چنانچہ ۱۹۲۶ء میں مناسب ترمیم کے ساتھ پھر شائع ہو گئی۔[3]

مالی نقصان کی تلافی کے متعلق شیخ مبارک علی نے کہا، "کچھ عرصے بعد مولوی احمد دین نے اپنی کتاب سرگزشتِ الفاظ لکھی جس پر ڈاکٹر اقبال نے سفارش کر کے پانچ صد روپے انعام دلوایا۔"[4] سرگذشتِ الفاظ اسی برس چھپی۔[5]

25

نومبر میں ہندوستان میں انتخاب کا ہنگامہ گرم رہا۔ ووٹ ڈالنے کا دن مختلف مقامات کے لیے مختلف تھا۔

---

[1] Zulfiqar Ali Khan, *A Voice from the East,* pp.ii-iii

[2] عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۴۴۵

[3] دیکھیے مئی ۱۹۲۶ء کے واقعات

[4] مشفق خواجہ (مرتب: ۲۰۰۶) اقبال از احمد دین، ص ۴۷

[5] ایضاً

مقابلہ در حقیقت تین فریقین کے درمیان تھا۔

نیشنل لبرل فیڈریشن یعنی لبرل پارٹی کا دعویٰ تھا کہ کانگریس کی حقیقی روح اُن کے ساتھ ہے۔ یہ کانگریس کے پرانے رہنما تھے۔ ۱۹۱۸ء میں علیحدہ ہوئے تھے۔ گاندھی سے اختلاف رکھتے تھے۔ ان کے نزدیک ہندوستان کی آزادی کا مطلب درجۂ مستعمرات (dominion status) حاصل کرنا تھا۔ حکومت کے ساتھ تعاون کر کے پارلیمانی طریقے سے اسے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ گزشتہ انتخاب میں حصہ لیا۔ تین برس حکومت میں رہے۔ سر تیج بہادر سپرو بھی اسی گروہ سے تعلق رکھتے تھے۔

آزاد اُمیدواروں کا گروہ بھی تھا۔ محمد علی جناح اس کے سرکردہ رہنماؤں میں شمار ہوتے تھے۔ مسلم لیگ کے صدر تھے مگر لیگ انتخاب کے بائیکاٹ کے حق میں تھی۔ اس لیے آزاد اُمیدوار بننے پر مجبور تھے۔ گزشتہ انتخابات میں بھی کامیاب رہے تھے۔ مرکزی اسمبلی میں بمبئی کی نشست کے اُمیدوار تھے۔ جداگانہ نیابت کے اصول کے تحت مسلم حلقے سے تعلق رکھتے تھے۔ لیکن اسمبلی میں تمام ہم خیال فریقین کے ساتھ تعاون کیا۔

تیسرا گروہ سوراج پارٹی تھی۔ پہلی دفعہ انتخاب میں حصہ لے رہی تھی۔ صدر سی آر داس تھے۔ جنرل سیکرٹری پنڈت موتی لال نہرو تھے۔ کانگریس کے جتنے اراکین انتخاب کے حق میں تھے، اس جماعت میں تھے۔ ہندو مہاسبھا سے تعلق رکھنے والے کانگریسی بھی شامل تھے۔ مستقل منشور میں داس کے خطبۂ صدارت کانگریس کے پانچ اصولوں کو وسعت دی گئی۔ انتخابی منشور علیحدہ تھا۔ اکتوبر میں جنرل سیکرٹری کی طرف سے الٰہ آباد سے جاری ہوا۔ صرف ایک نکتے پر مشتمل تھا: ''دستور بنانے کا حق جس کے لیے ایسی مشینری اور نظام استعمال کیا جائے جو ملک کی حالت اور عوام کے مزاج کے لیے موزوں ترین ہو۔''[1]

برطانوی ہندوستان کی آبادی چوبیس کروڑ سے کچھ اوپر تھی۔ ان میں سے قریباً ترپن لاکھ افراد ووٹ ڈالنے کے مجاز تھے۔ گزشتہ انتخابات میں تو کم ہی لوگوں نے دلچسپی لی تھی۔ اس دفعہ بعض بعض

---

[1] Mitra: *The Indian Annual Register 1923, Vol. 2*, pp.217-222

حلقوں میں چالیس پچاس فیصد ووٹروں نے ووٹ ڈالے۔ مرکزی اسمبلی میں سوراجیوں نے نصف سے کچھ کم نشستیں حاصل کیں۔ لبرل پارٹی کے بڑے بڑے رہنماؤں کو شکست دی۔ ان میں سر سریندر ناتھ بینرجی بھی شامل تھے۔ کانگریس کے بانیوں میں شمار ہوتے تھے لیکن ۱۹۱۸ء میں لبرل پارٹی میں چلے گئے تھے۔ آزاد اُمیدوار زیادہ تر جاگیر دار اور بارسوخ افراد تھے۔ اُن کے خلاف سوراجی کچھ زیادہ کامیابی حاصل نہ کر سکے۔

سوراج پارٹی نے صوبہ جاتِ وسطی (Central Provinces) کی صوبائی کونسل میں واضح اکثریت حاصل کی۔ بنگال کی صوبائی کونسل کی ۱۱۴/ عام نشستوں میں سے ۴۰/ سوراج پارٹی نے حاصل کیں۔ صوبے کی کسی اور جماعت سے زیادہ تھیں۔ بمبئی اور صوبہ جاتِ متحدہ (United Provinces) کی کونسلوں میں خاصی نشستیں حاصل ہوئیں۔ مگر دونوں جگہوں پر کوئی نہ کوئی دوسرا گروہ اُن سے آگے تھا۔ مدراس کی کونسل میں بہت کم نشستیں حاصل کر سکے۔ پنجاب کی کونسل کی ۷۱ عام نشستوں میں سے صرف ۹/ حاصل ہوئیں۔ صوبۂ بہار و اُڑیسہ میں بھی حالت کمزور رہی۔[1]

انتخابات کو مجموعی طور پر سوراجیوں کی فتح قرار دیا گیا۔ اُن کے انتخابی منشور نے عوام کے ذہنوں کو نیا راستہ دکھایا تھا۔ نوجوان صحافی ایچ این مترا کلکتہ سے انڈین اینوئیل رجسٹر (*The Indian Annual Register*) شائع کرتے تھے۔ اُن کے خیال میں یہ ہلچل گاندھی کی عدم تعاون کی تحریک کے انتہائی عروج کے زمانے کے جوش و خروش کے قریباً برابر تھی۔[2]

26

۳۰/ نومبر کو پنجاب یونیورسٹی کی سینٹ کا اجلاس ہوا۔ اکیڈمک کونسل کی رکنیت سے علامہ کا استعفا ۹/ جون کو پیش ہوا تھا۔ وائس چانسلر کی درخواست پر علامہ نے واپس لے لیا۔[3]

---

[1] *Ibid,* pp.225-232

[2] *Indian Quarterly Journal, Jan-Mar 1924*, p.63

[3] ڈاکٹر حسن اختر ملک، اقبال، ایک تحقیقی مطالعہ، ص ۱۲۵ بحوالہ پنجاب گزٹ حصہ سوم ۲۱ دسمبر ص ۴۷۲

مہاراجہ کشن پرشاد کا خط ملا۔ حیدرآباد کی وزارتِ عظمیٰ کے امکانات کے حوالے سے لکھا تھا:

> موجودہ حالت میں ایک الجھا ہوا ریشم ہے جس کا سرا ہاتھ آنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت کے موجودہ انتظام کی اصلاح کے لیے ایک ایسے تجربہ کار کی سخت ضرورت ہے، جو یہاں کے حالات، مذاق اور معاشرت کا تجربہ رکھتا ہو، لیکن ایسے ہی شخص کا انتخاب مشکل نظر آتا ہے، اور نہ اپنے کو یہ فقیر ایسا تجربہ کار سمجھتا ہے، مگر خدمت گزاری کرنے کا عادی ہوں۔ حتی الامکان کوتاہی نہ ہو گی۔ السعی منی والاتمام من اللہ۔ ہمت ہارنا کھتری کے خون میں نہیں لکھا۔[1]

علامہ اُس برس جواب نہ دے سکے۔[2]

27

پیرزادہ محمد ابراہیم صدیقی اُردو کے پروفیسر تھے۔ فلسفے پر کتاب لکھی۔ تکمیل کے لیے علامہ سے مدد چاہی۔ غالباً نصاب میں بھی داخل کروانا چاہتے تھے۔ یکم دسمبر کو علامہ نے معذرت کا خط لکھا، "میں ایک عرصے سے فلسفے کا مطالعہ چھوڑ بیٹھا ہوں۔ صرف ایک آدھ مسئلہ سے دلچسپی باقی ہے جس کا تعلق آپ کے مضمون سے نہیں۔"[3]

علیگڑھ سے خواجہ منظور حسین کا خط ملا۔ علیگڑھ میگزین کی ادارت کر رہے تھے۔ کانووکیشن کے موقع پر خاص نمبر نکل رہا تھا۔ علامہ کا کلام اور دستخطی تصویر شائع کرنا چاہتے تھے۔ سید سجاد حیدر یلدرم یونیورسٹی کے رجسٹرار ہو گئے تھے۔ ان سے بھی کہا کہ علامہ کو خط لکھیں۔ علامہ نے منظور کے خط کے خالی حصے پر یلدرم کے نام خط لکھا اور پشت پر نظم 'تنہائی' نقل کر دی۔

میں سمندر کی طرف گیا اور ایک بے کل لہر سے پوچھا

---

[1] مکتوب شاد بنام اقبال ۳/ نومبر ۱۹۲۳ء؛ قریشی (۱۹۸۶) اقبال بنام شاد، ص ۳۷۶

[2] مکتوب بنام شاد ۱۴/ جنوری ۱۹۲۴ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۰۳

[3] مکتوب بنام پیرزادہ محمد ابراہیم صدیقی یکم دسمبر ۱۹۲۳ء؛ برنی (۱۹۹۱)، ص ۴۹۸

تو ہمیشہ جستجو میں رہتی ہے، تجھ پر کیا افتاد آپڑی ہے؟
تیرے گریبان میں ہزاروں چمکتے موتی ہیں
تُو میری طرح سینے میں کوئی دل کا گوہر بھی رکھتی ہے؟
وہ تڑپ کے ساحل سے لوٹ گئی اور کچھ نہ بولی۔

میں پہاڑ کے پاس گیا اور اس سے پوچھا: یہ کیا سنگدلی ہے!
کسی دکھیارے کا واویلا تیرے کانوں تک پہنچتا ہے؟
اگر تیرے پتھروں میں لہو کی بوند سے بنا ہوا کوئی لعل ہے
تو ذرا مجھ ستم کے مارے سے کلام کر
وہ اپنے آپ میں سمٹ گیا اور دم سادھ لیا اور کچھ نہ بولا۔

ایک لمبا راستا طے کر کے میں نے چاند سے پوچھا
اے سفر نصیب! تیری قسمت میں کوئی منزل ہے کہ نہیں
تیری پیشانی کے نور سے دنیا سمن زار
تیرے داغ کی چھوٹ دل کی تجلی سے ہے کہ نہیں؟
اس نے ستاروں کی طرف رقابت سے دیکھا اور کچھ نہ بولا۔

چاند اور سورج سے گذر کے میں خدا کے حضور میں پہنچا
کہ تیری کائنات میں ایک ذرہ بھی میرا آشنا نہیں ہے
دنیا دل سے خالی اور میری مشت خاک دل ہی دل
چمن خوب ہے لیکن میری نوا کے لائق نہیں
اس کے ہونٹوں پر ایک تبسم سا آیا اور کچھ نہ بولا۔

تنہائی

بہ بحر رفتم و گفتم بہ موجِ بیتابے ہمیشہ در طلب استی چہ مشکلے داری؟
ہزار لُولوی لالاست در گریبانت درونِ سینہ چو من گوہرِ دلے داری؟
تپید و از لبِ ساحل رمید و ہیچ نگفت

بہ کوہ رفتم و پرسیدم این چہ بیدردیست؟ رسد بگوشِ تو آہ و فغانِ غم زدہ ئی
اگر بہ سنگِ تو لعلے ز قطرۂ خونست یکے در آبہ سخن با من ستم زدہ ئی
بخود خزید و نفس در کشید و ہیچ نگفت

رہ دراز بریدم ز ماہ پرسیدم سفر نصیب، نصیبِ تو منزلے است کہ نیست
جہاں ز پرتوِ سیمائے تو سمن زارے فروغِ داغِ تو از جلوۂ دلے است کہ نیست
سوئے ستارہ رقیبانہ دید و ہیچ نگفت

شدم بحضرتِ یزداں گذشتم از مہ و مہر کہ در جہانِ تو یک ذرّہ آشنایم نیست
جہان تہی ز دل و مشتِ خاکِ من ہمہ دل چمن خوش است ولے در خورِ نوایم نیست
تبسّمے بلبِ او رسید و ہیچ نگفت

خط ملتے ہی یلدرم نے خواجہ منظور حسین کو دفتر بلوا بھیجا۔ "کہنے کو تو یہ دفتر تھا مگر اس کی فضا شعر و ادب کے چرچوں سے معمور رہتی تھی،" منظور کا بیان ہے۔ "سجاد صاحب کا اپنے خاص مرتعش انداز میں، رُک رُک کر، چٹخارے لے لے کر ہر بند کا بار بار پڑھنا، خود بھی جھومنا اور اپنا تاثر مجھ پر بھی طاری کرنا، یہ عالم اب بھی میری نظروں میں پھرتا ہے اور دل پر نقش ہے۔"[1]

چودھری محمد حسین علامہ کی ایک پرانی اُردو نظم سے موازنہ کیے بغیر نہ رہ سکے۔ اُس کا عنوان

[1] شاہین ص ۹۵–۹۳؛ نیز خواجہ منظور حسین (۱۹۸۶)، ص ۱۵–۱۴۔ شفیق (۲۰۱۲) اقبال: درمیانی دور پہلے اڈیشن میں یہ واقعہ دسمبر ۱۹۲۲ء میں درج ہو گیا کیونکہ منظور کے خط پر یکم دسمبر ۱۹۲۲ء کی تاریخ ہے، جو غالباً کتابت کی غلطی ہے۔

بھی 'تنہائی' تھا۔ آخری شعر تھا:

کس شے کی تجھے ہوس ہے اے دل!　　　　قدرت تری ہم نفس ہے اے دل!

محمد حسین نے علامہ سے کہا کہ کبھی وہ وقت تھا کہ بزمِ کائنات کے پاس آپ کے دل کے لیے کوئی رسپانس (response) تھا۔ آج خود خدا بھی کماحقہ رسپانس نہیں کرتا۔ علامہ نے جواب دیا، ''نہیں تبسم کی حد تک تو کرتا ہی ہے اور خدا سے مراد یہاں روحِ بزمِ کائنات ہی ہے۔''[1]

۶/ دسمبر کو برطانیہ میں عام انتخابات ہوئے۔ پچھلے برس بھی ہوئے تھے۔ کنزرویٹو پارٹی ابھی مزید چار برس حکومت کر سکتی تھی۔ وزیر اعظم بالڈوِن زیادہ اکثریت حاصل کرنا چاہتے تھے تاکہ اپنی اصلاحات نافذ کر سکیں۔ ۱۹۱۸ء کے قانون کے تحت اکیس برس یا زیادہ عمر کے تمام مردوں کو ووٹ کا حق حاصل تھا۔ تیس برس یا زیادہ عمر کی وہ عورتیں ووٹ ڈال سکتی تھیں جو کسی جائیداد کی مالک ہوں یا لوکل گورنمنٹ رجسٹر کی رکن ہوں، کسی صاحبِ جائیداد یا لوکل گورنمنٹ رجسٹر کے رکن کی بیوی ہوں یا پھر کسی یونیورسٹی کی گریجویٹ ہوں اور یونیورسٹی کے حلقۂ انتخاب سے ووٹ ڈال رہی ہوں۔ کنزرویٹو پارٹی بہت سی نشستوں سے محروم ہو گئی۔ وہ لبرل اور لیبر پارٹی کے پاس چلی گئیں۔ اب بالڈوِن کا وزیر اعظم رہنا مشکل تھا۔

بنگال کبھی ہندو اکثریت کا صوبہ ہوا کرتا تھا۔ جب ۱۹۰۵ء میں انگریزوں نے اسے تقسیم کیا تو مشرقی بنگال کی صورت میں ایک مسلم صوبہ وجود میں آ گیا۔ تب ہندوؤں کی طرف سے ردِ عمل ہوا۔ انگریزوں نے ۱۹۱۱ء میں بنگال کو دوبارہ متحد کر دیا۔ مسلم صوبہ ختم ہو گیا۔ بعد میں صوبے کی مسلم آبادی زیادہ تیزی سے بڑھی۔ اب آدھا نہیں بلکہ پورا بنگال ایک مسلم اکثریتی صوبہ تھا۔ مسلمان پھر بھی ہر میدان میں پیچھے تھے۔ ڈیڑھ سو برس کی پسماندگی تھی۔

۱۶-۱۷/ دسمبر کو کلکتہ میں سی آر داس نے سوراج پارٹی کی میٹنگ طلب کی۔ بنگال کے ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی حقوق طے کیے گئے۔ خود مختار حکومت کی بنیاد پڑنے پر حاصل ہوتے:

---

[1] ڈاکٹر ثاقب نفیس (نومبر ۲۰۰۸)، ص ۱۲-۹

۱ بنگال لیجسلیٹو کونسل یعنی صوبائی اسمبلی میں نمایندگی آبادی کے تناسب سے جداگانہ نیابت کے اُصول پر ہوگی۔ مجلسِ خلافت، کانگریس اور جس قومی معاہدے کو وہ عنقریب پیش کرنے والے ہیں، اُن کے مطابق اس میں ضروری تبدیلی کی جاسکتی ہے۔

۲ ہر ضلع کے لوکل باڈیز میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان نمایندگی کا تناسب ۶۰/ فیصد اور ۴۰/ فیصد ہوگا (اس پر نظرِ ثانی ہوسکتی ہے)۔ ۶۰/ فیصد نمایندگی اُس ملت کی ہوگی جس کی ضلع میں اکثریت ہے۔ ۴۰/ فیصد نماندگی ضلع کی اقلیتی ملت کی ہوگی۔ اس انتخاب کے جداگانہ یا مخلوط ہونے کا فیصلہ دونوں ملتوں کی آرا معلوم ہونے کے بعد کیا جائے گا۔

۳ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا حصہ ۵۵/ فیصد ہوگا۔ ابھی بہت کم ہے اس لیے جب تک یہ تناسب حاصل نہ ہو جائے، نئی اسامیوں میں سے ۸۰/ فیصد مسلمان اُمیدواروں کو دی جائیں بشرطیکہ قابلیت کے کم سے کم معیار پر پورے اُترتے ہوں۔

۴ مذہبی رواداری:

۱ کوئی قانون جو کسی ملت کے مذہب پر اثرانداز ہو سکتا ہو، صوبائی کونسل میں منظور نہ کیا جائے جب تک اُسے اُس ملت کے منتخب نمایندوں میں سے ۷۵/ فیصد کی حمایت حاصل نہ ہو۔

۲ کسی جلوس کو مسجد کے سامنے موسیقی کی اجازت نہ ہوگی۔

۳ مذہبی قربانی کے طور پر گائے ذبح کرنے میں مداخلت نہ کی جائے گی۔

۴ خوراک کے لیے گائے کو عام طور پر ذبح کرنے کے لیے کوئی قانون اسمبلی میں پیش نہ کیا جائے گا۔ کوشش کی جائے گی کہ اس معاملے میں اسمبلی کے باہر دونوں ملتوں کے درمیان تصفیہ ہو جائے۔

۵ گائے کی قربانی اس طرح ہو کہ ہندوؤں کے مذہبی جذبات مجروح نہ کیے جائیں۔

۶ ہر سب ڈویژن میں ہر سال نمایندہ کمیٹیاں بنائی جائیں۔ نصف ارکان مسلم اور نصف ہندو ہوں۔ ہر ملت اپنا صدر منتخب کرے جسے اختیار ہو کہ دونوں ملتوں کے درمیان

تنازعوں کا تصفیہ مندرجہ بالا شرائط کے مطابق طے کر لے۔[1]
انڈین نیشنل کانگریس کے سالانہ اجلاس میں منظوری لینی تھی۔ اسی ماہ ہونے والا تھا۔

28

سید یامین ہاشمی نے علیگڑھ سے تعلیم حاصل کی تھی۔ نظم اصلاح کے لیے بھیجی۔ ساتھ قطعہ بھی تھا:

ڈاکٹر اقبال تو ہے ملہمِ رازِ حیات   واقفِ اسرارِ ہستی، صاحبِ رازِ حیات
ہمت افزائے دلِ مسلم ہے تیری شاعری   پست ہمت بھی نظر آتے ہیں جانبازِ حیات
بادۂ عرفاں جو ساقی نے پلائی ہے تجھے   ہاشمی کو بھی چکھا دے وہ مۓ رازِ حیات

علامہ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا کہ صرف تخیل کی کمی ہے، ''اِس وقت عرب کے قدیم شعرا کو پیش نظر رکھنا چاہئیے۔''[2]

29

زمیندار میں اُردو مجموعے کی اہمیت پر زور دیا گیا۔ اس پر چودھری محمد حسین نے لکھا کہ فارسی کلام کی اشاعت بھی ضروری تھی لیکن بہرحال اُردو مجموعہ اگلے برس کے نصف اول میں شائع ہو جائے گا۔[3]

محمد حسین سے روایت ہے کہ علامہ اُن کے ساتھ مل کر مجموعہ ترتیب دینے لگے۔ عام طور پر محمد حسین نظم پڑھ کر سناتے تھے۔ علامہ ترمیم کرنا چاہتے تو کہہ دیتے۔ نظم 'موٹر' کے شروع میں تھا:

کیسی پتے کی بات جگندر نے کل کہی
موٹر ہے ذوالفقار علی خاں کا کیا خموش

---

[1] *Indian Quarterly Register, Jan-March 1924,* pp.63-64

[2] ہاشمی کی تصنیف اقبال کی پیش گوئیاں (بار دوم فروری ۱۹۶۲) ص ۷ سے؛ شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۱۸۷-۱۸۶؛ خط پر تاریخ نہیں مگر موٴلف نے لکھا ہے کہ نظم اور قطعہ ۱۹۲۳ء میں بھیجے گئے تھے۔

[3] اختر النسا (۲۰۱۰)، اقبال اور زمیندار، ص ۸۴

اصل میں سردار جگندر سنگھ کے لڑکے جتندر نے یہ بات کہی تھی۔ علامہ روانی میں جگندر لکھ گئے۔ اب مشہور ہو چکا تھا۔ علامہ نے درست کرنا چاہا۔ محمد حسین نے کہا، "لڑکا، لڑکا ہے اور یہ شعر ہے، تاریخ نہیں۔ ذوالفقار علی خاں صاحب کے نام کے ساتھ لڑکے کے والد کا نام ہی آ جائے تو اچھا ہے۔ دونوں صاحب آپ کے دوست ہیں۔ اُن کے نام باقی رہیں گے۔ جتندر کو شاید لوگ سمجھیں بھی نہ کہ کون تھا۔" علامہ نے کوشش کی کہ یہ شعر ہی نظم سے نکال دیں۔ تسلسل میں فرق آیا۔ آخر کہا، "چلو رہنے دو۔ ہمارے دوست ہیں۔ ان کے نام بیچ میں آ جائیں تو کیا حرج ہے۔ لوگوں کو یاد رہیں گے۔"[1]

۲۶/ دسمبر کے زمیندار میں لکھا گیا، "ملک و قوم کی خدمت کے ساتھ ساتھ شاعر کا ایک فرض زبان کی خدمت بھی ہے۔ علامہ اقبال نے زبان اُردو کی شاعری کو چار چاند لگا دیے ہیں اور کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان؛ اقبال کے اُردو کلام سے محروم رہے۔"[2]

اُس روز کوکناڈا (Cocanada) میں کانگریس کا اجلاس شروع ہونا تھا۔ ریلوے کے نظام میں کچھ خرابی کی وجہ سے بنگال سے آنے والے مہمان وقت پر نہیں پہنچ سکتے تھے۔ وہاں کی صوبائی کانگریس اور دیش بندھو چترنجن داس نے درخواست کی۔ جلسہ دو روز تک ملتوی کر دیا گیا۔ مولانا محمد علی [جوہر] صدر تھے۔ دو روز پہلے پہنچے تھے۔ ساتھ اُن کی بیگم، والدہ بی اماں، بھائی شوکت علی اور گاندھی جی کی بیگم کستوری بائی تھیں۔

کوکناڈا ہندوستان کے جنوب مشرقی ساحل پر خوبصورت اور پرسکون شہر تھا۔ قریباً دس ماہ سے یہاں کانگریس کے سالانہ اجلاس کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ جلسہ گاہ شہر کی مغربی جانب ایک سو بیس ایکڑ پر پھیلی ہوئی تھی۔ بجائے خود چھوٹا سا شہر تھی۔ میونسپل کمیٹی کی طرف سے اسے گاندھی نگر کا نام دیا گیا تھا۔ وہاں تک پہنچنے کے لیے ریل گاڑی کا خصوصی پلیٹ فارم بنایا گیا۔ دریا پر کشتیوں کا پُل باندھا

---

[1] ڈاکٹر ثاقب نفیس (اپریل ۲۰۰۸)، ص ۲۲۱-۲۲۰۔ مرزا جلال الدین نے موٹر والا واقعہ بیان کرتے ہوئے فقرہ سر جگندر سے منسوب کیا ہے؛ مرزا جلال الدین، 'میرا اقبال'، ص ۹۵

[2] اختر النسا (۲۰۱۰)، اقبال اور زمیندار، ص ۸۴

گیا۔ ٹریفک اور گاڑیوں کے لیے گاندھی نگر کے اندر تک سڑکیں بچھائی گئیں۔ دوڈائنامو لگا کر بجلی مہیا کی گئی۔ آگ بجھانے والے دو انجن موجود تھے۔ پرنٹنگ پریس، ریلوے بکنگ آفس، ڈاکخانہ، تار گھر، بینک، رِیڈنگ ہال، میڈیکل وارڈز، ڈسپنسری او غیرہ سبھی کچھ تھا۔ رہنماؤں اور خصوصی مہمانوں کے لیے چھتیس ہٹ تعمیر کیے گئے تھے۔ عام ڈائننگ ہال میں بیک وقت چار ہزار لوگوں کے کھانے کی گنجایش تھی۔ اس کے علاوہ مختلف صوبوں اور مذاہب کے لیے علیحدہ کچن اور ڈائننگ ہال بھی تھے۔ اکالی دل کا علیحدہ لنگر موجود تھا۔ خلافت کانفرنس کا بھی علیحدہ پنڈال اور کچن تھا۔ اُسے مولانا شوکت علی کے نام پر شوکت آباد کا نام دیا گیا تھا۔ وہاں علمائے کرام کے ٹھہرائے جانے کا انتظام بھی تھا۔ گاندھی نگر میں پینے کا صاف پانی بھی دستیاب تھا۔ نلکے لگے ہوئے تھے۔ غسلخانوں میں گرم پانی بھی ملتا تھا۔ سات سو سے زیادہ لیٹرینیں بنائی گئی تھیں۔

گاندھی نگر کے بیچوں بیچ میونسپل پارک تھا۔ وہاں کھدر کا تین سو فُٹ طویل اور دو سو بیس فُٹ چوڑا خیمہ نصب تھا۔ یہ پنڈال تھا۔ گیلری سمیت اس کی قیمت سینتیس ہزار روپے تھی۔ بارہ سو افراد کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ بارہ دروازے تھے۔ اندر مغربی حصے میں نوے فُٹ لمبا اور ساٹھ فُٹ چوڑا ڈائس تھا۔ اُس کے سامنے کانگریس کے تمام سابقہ صدور اور ممتاز رہنماؤں کی تصاویر آویزاں تھیں۔ انہی کے درمیان اور پنڈال کے تقریباً درمیان میں چھ فُٹ چوڑا لکڑی کا روسٹرم تھا جس کے پیچھے کھڑے ہو کر مقررین کو تقریر کرنی تھی۔ ڈائس کے دائیں ہاتھ خواتین کے بیٹھنے کی جگہ تھی۔ بائیں طرف گیت گانے والے لڑکے لڑکیاں، وید کے ماہرین، ہندو پنڈت اور موسیقار بٹھائے جانے تھے۔

پنڈال کے باہر گھومنے والا فوارہ نصب تھا۔ اس کے پیندے کا قُطر چھتیس فُٹ تھا۔ اس میں بطخیں بھی تیر رہی تھیں۔ دوسری جانب سبجکٹس کمیٹی کا پنڈال تھا۔ ایک سو بیس فُٹ لمبا اور نوے فُٹ چوڑا تھا۔ اس میں ہزار لوگ بیٹھ سکتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی دو پلیٹ فارم تھے جہاں سے رہنما حاضرین کو خطاب کر سکتے۔[1]

---

[1] کانگریس کے اجلاس کی تمام تفصیلات کانگریس کی مطبوعہ رپورٹ سے لی گئی ہیں۔ دیکھیے:
Indian National Congress. *Report of the Thirty-Eighth Indian National Congress*

جوہر آور مہمانوں کی آمد پر لوگ ۲۴ر کو گھنٹوں پہلے سے ریلوے اسٹیشن اور سڑکوں پر جمع ہوئے۔ جلوس قریباً چار گھنٹے میں ہی اُس خصوصی ہٹ تک پہنچ سکا جہاں مہمانوں کو قیام کرنا تھا۔ دو روز بعد جلسہ ملتوی ہوا تو مہمانوں نے دوسری سرگرمیوں میں وقت گزارا۔ گاندھی نگر میں اور بہت سی تنظیموں کے اجلاس ہو رہے تھے۔ ان میں آل انڈیا خلافت کانگریس، جمعیت العلمائے ہند کانفرنس، آل انڈیا اسٹوڈنس کانفرنس، ہند ساہتیہ سمیلان، آل انڈیا پبلک لائبریری کانفرنس، آل انڈیا اسٹرولوجیکل کانفرنس، آل انڈیا سائیکک اینڈ اسپرچوئیلسٹک کانفرنس، آل انڈیا تھیسٹک کانفرنس، آل انڈیا لیڈیز کانفرنس، انڈین نیشنل سوشل کانفرنس اور آل انڈیا والنٹئیرز کانفرنس شامل تھیں۔ آل انڈیا کھڈی اینڈ ہینڈی کرافٹس ایگزبیشن بھی تھی۔[1]

سیکڑوں میل دُور پونا میں ۲۶، ۲۷ر اور ۲۸ر دسمبر کو نیشنل لبرل فیڈریشن (”لبرل پارٹی“) کا چھٹا سالانہ اجلاس ہوا۔ انتخاب میں شکست خاص موضوع تھا۔ استقبالیہ کمیٹی کے چئرمین نے کہا کہ عوام دوست دشمن کی پہچان نہیں رکھتے۔ خطبۂ صدارت میں ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو نے کہا کہ جماعت نے رائے عامہ کی تربیت کرنے کی کافی کوشش نہیں کی ہے۔ مسلمانوں کے حوالے سے کہا کہ جداگانہ نیابت میں خرابی ہے۔ پھر بھی ختم کرنے کی کوشش نہ کی جائے جب تک مسلمان اسے اہمیت دیتے ہیں۔[2]

30

اس برس شائع ہونے والی کتابیں جو کبھی علامہ کے ذخیرۂ کتب میں شامل ہوئیں یہ ہیں:

Anand, Chuni Lal. *An Introduction to the History of Government in India—the British Period.* The Punjab Printing Works, Lahore

Beesly, Mrs. *Stories from the History of Rome.* Macmillan, London

Cassirer, Ernst (translated by William Curtis Swabey). *Substance and function and Einstein's Theory of Relativity.* Open Court Pub, Chicago

---

[1] کانگریس کے اجلاس کی تفصیلات کے لیے دیکھیے: Indian National Congress (1924)

[2] لبرل پارٹی کے اجلاس کی تفصیلات کے لیے دیکھیے: National Liberal Federation of India (1924)

Erikson, Richard. *Consciousness, Life and the Fourth Dimension—A Study in Natural Philosophy.* Gyldendal, London
Hoernle, R. F. Alfred. *Matter, Life, Mind and God: five lectures on contemporary tendencies of thought.* Methuen, London
Morier, James (first published 1824). *The Adventures of Hajji Baba of Ispahan.* Oxford University Press, London
Shastri, Prabhu Dutt. *Elementary textbook of Inductive Logic.* Macmillan, Calcutta
Tagore , Rabindranath. *The Cycle of Spring.* Macmillan, London
Tagore, R. *Stray Birds.* Macmillan, London
Tagore, Rabindranth. *Nationalism.* Macmillan, London
Waterfield, William. *Fruit Gathering.* Panini Office, Allahabad

اسی برس شائع ہونے والی ایک کتاب مصنف نے ۱۰ر جنوری ۱۹۲۹ء کو میسور میں دستخط کر کے علامہ کو دی:

Svamin, V. Govindacharya. *A Metaphysique of Mysticism—Vedically Viewed.* Vedagriham, Mysore[1]

31

کوکناڈا کے "گاندھی نگر" میں سو فُٹ اونچے کھمبے پر کانگریس کا تین رنگوں والا جھنڈا نصب تھا۔ سرخ رنگ ہندومت کی نمایندگی کرتا تھا۔ اُس کے اوپر سبز رنگ اسلام کی اور سب سے اوپر سفید رنگ باقی تمام مذاہب کی علامت تھا۔ جھنڈے پر چرخے کی تصویر بھی تھی۔ دو برس پہلے کانگریس نے "قومی پرچم" کے طور پر اپنایا تھا۔ اجلاس سے پہلے صدر کو پرچم کشائی کرنی تھی۔ قریباً تیس ہزار کا مجمع اکٹھا ہو گیا۔ جوہرؔ نے کہا کہ اس قومی پرچم کی کوئی اہمیت نہیں اگر یہ پرچم آزادی نہ ہو مگر یہ پرچم آزادی نہیں ہو سکتا جب تک یہ ہمارے قومی اتحاد کا پرچم بھی نہ بن جائے۔ کیا آپ ہر دُشواری کے باوجود ہندی قومیت کو برقرار رکھنے پر تیار ہیں؟

ہجوم نے اثبات کے نعرے لگائے۔ جوہرؔ نے اُن سے کہا کہ ہندوستان کے اتحاد کے ہر بیرونی اور داخلی دشمن کے مقابلے کا وعدہ کریں۔ داخلی دشمن ہماری اپنی برائی ہے جو قوم کی عزت، آزادی اور خودمختاری پر ہمارے ذاتی مقاصد کو ترجیح دیتی ہے۔ ہجوم نے پھر نعرے لگائے۔ جوہر نے کہا کہ آج بھلانا پڑے گا کہ آپ کے درمیان ہندو اور مسلمان کا فرق ہے۔ قومی پرچم کی حفاظت آپ کا مشترکہ

[1] Muhammad Siddique, *Descriptive Catalogue*

عقیدہ ہے۔ موڈریٹ، نیشنلسٹ اور لبرل کا فرق مٹانا ہو گا۔ آپ تیار ہیں؟ ہجوم نے دوبارہ اثبات کے نعرے لگائے۔ جوہر نے خدا کو گواہ بناتے ہوئے اور خدا کا نام لے کر ترنگا جھنڈا لہرا دیا۔

۲۸/دسمبر کو تین بجے سہ پہر کانگریس کے اجلاس کا آغاز ہوا۔ دیش بندھو داس بھی پہنچ چکے تھے۔ کانگریس کے قریباً وہ سبھی رہنما موجود تھے جو جیل میں نہیں تھے۔ قید رہنماؤں میں سب سے اہم گاندھی جی تھے۔ اجلاس کے آغاز سے پہلے اکالی سکھوں نے جوہر کو گارڈ آف آنر پیش کیا۔

جوہر کا خطبۂ صدارت طویل تھا۔ ملت کے گزشتہ ستر برس کی مختصر تاریخ تھی۔ بعض نکات خاص اہمیت رکھتے تھے:

- سر سید احمد خاں کے خلاف غلط پروپیگنڈا ہو رہا ہے۔ سچے حریت پسند تھے۔ مسلمانوں کو کانگریس سے دُور رہنے کی ہدایت کی۔ اُس زمانے میں مسلمانوں اور کانگریس دونوں کے حق میں یہی بہتر تھا۔
- تعلیم کے اثرات قریباً تیس برس بعد قوم میں ظاہر ہوتے ہیں۔ ایک نسلِ انسانی کی عمر بھی قریباً اتنی ہے۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں نے مدراس، بمبئی اور کلکتہ میں یونیورسٹیاں قایم کیں۔ وہاں سے تعلیم حاصل کرنے والی نسل نے ۱۸۸۵ء میں کانگریس کی بنیاد رکھی۔ اُن تصوّرات پر قایم تھی جو مغربی تعلیم کے نتیجے میں پیدا ہوئے تھے۔
- مسلمانوں نے ۱۸۷۷ء میں علیگڑھ کالج کی بنیاد رکھی۔ مقصد مسلمانوں کو جدید تعلیم سے اس طرح آراستہ کرنا تھا کہ اپنی تہذیب کے ساتھ جُڑے رہیں۔ اس نسل نے ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا مسلم لیگ بنائی جس کی بنیاد مسلم تہذیب پر تھی۔
- ۱۹۰۷ء سے ایک نیا دَور شروع ہوا۔ اسلامی ممالک میں سیاسی تحریکوں کا آغاز ہوا جیسے ایران اور ترکی وغیرہ۔ ہندوستان کے مسلمانوں کا مطالبہ جداگانہ حقِ نیابت تھا۔ لیگ اِسی کی خاطر وجود میں آئی تھی۔ یہ اصول ہندوستان کے حق میں اچھا ثابت ہوا ہے۔ ۱۹۱۶ء میں کانگریس نے یہ حق تسلیم کیا تب ہی ہندو مسلم اتحاد کا مثالی دَور شروع ہوا۔ یہ سوچنا درست نہیں کہ جداگانہ نیابت کی وجہ سے دونوں ملتیں ایسے نمایندے منتخب

کریں گی جو دوسری ملت کے خلاف بغض رکھتے ہوں۔ تجربے نے دکھایا ہے کہ زیادہ تر وہی نمایندے منتخب ہوئے جو دونوں ملتوں کے درمیان اشتراکِ عمل کے قائل ہیں۔

- مسلمان ایک طویل مدت تک کانگریس سے بیگانہ رہے۔ اُس وقت مائل ہوئے جب اُن کے اپنے ملّی مفادات کو ٹھیس پہنچی۔ انگریزوں کی طرف سے ان مفادات کی حفاظت کی اُمید نہ رہی۔ جنگِ طرابلس، جنگِ بلقان اور پھر پہلی جنگِ عظیم کے خاتمے پر فلسطین و عرب کا مسئلہ، اور تُرکوں کے ساتھ ناانصافی وغیرہ۔ ہندوستان کے ساتھ انگریزوں کی ناانصافی بھی دیکھ رہے تھے۔ مسلمانوں کی سیاسی سوچ یہی ہے کہ حکومتیں غلطی کے ازالے میں دیر نہیں لگاتیں۔ انتظار کیا جائے۔ طویل انتظار کے بعد ہی مسلمان اس بات سے نااُمید ہوئے کہ انگریز حکومت اپنی غلطیوں کا ازالہ کرے گی۔ تب کانگریس کی طرف متوجہ ہوئے۔ ہندوؤں کے ساتھ مل کر جدوجہد شروع کی۔ خود جوہر بھی شروع ہی سے مسلم لیگ کے ساتھ تھے۔ کانگریس میں صرف چار برس پہلے شامل ہوئے۔
- ''ریاست ہائے متحدہ امریکہ'' کے وفاق میں ہر ریاست داخلی طور پر خودمختار ہے۔ ہندوستان بھی ایک براعظم کی مانند ہے۔ اسے ''مذاہبِ متحدہ ہندوستان'' ہونا چاہیے۔ ہر ملت اپنے وجود کو برقرار رکھے۔ خطے کی آزادی اور ترقی میں اپنا کردار بھی اَدا کرتی رہے۔ یہاں مختلف مذاہب جس طرح آباد ہیں، قدرت کی مصلحت معلوم ہوتی ہے کہ اُن کے ذریعے مذہبی مسئلے کا حل دریافت کروائے جو باقی انسانیت کے لیے مشعلِ راہ بنے۔
- اس برس ہندو مسلم فسادات شروع ہوئے ہیں۔ وجہ جداگانہ نیابت نہیں ہے۔ کچھ عرصہ پہلے عوام کے محبوب رہنما جیل چلے گئے۔ اُن کے پیچھے شرپسند عناصر کو موقع ملا کہ عوام کو اپنے پیچھے چلائیں۔ غلامی میں جھوٹی اُمید کی وجہ سے ایک خاص قسم کی ذہنیت پیدا ہوتی ہے۔ بنی اسرائل میں بھی رومنوں کی غلامی میں یہی ذہنیت پیدا ہوئی۔ چار نئے فرقے وجود میں آئے۔ ان میں ایک انتہاپسند فرقہ بھی تھا۔ یہ لوگ تورات کے نجی قوانین پر سختی کے ساتھ عمل کرنے اور کروانے پر بہت زور دیتے تھے۔ ساتھ ہی

رومنوں کے خلاف مسلح جدوجہد کے حامی تھے۔ بنی اسرائیل کے چار فرقوں جیسے گروہ
ہندوستان میں بھی وجود میں آرہے ہیں۔ بنی اسرائیل کی تاریخ کے اُس عہد میں حضرت
عیسیٰ علیہ السلام نمودار ہوئے۔ لوگوں کے سامنے ایک روحانی نصبُ العین پیش کیا۔
ذہنی سطح بلند کی۔ ہندوستان میں مہاتما گاندھی نمودار ہوئے ہیں۔

اجلاس پانچ روز جاری رہا۔ ۳۰ر دسمبر کو قرارداد پیش کی گئی۔ بعض ہندو مقررین نے کہا کہ اس میں سے یہ شق نکال دی جائے کہ کانگریس میثاقِ بنگال پر غور کرے۔ بنگال سے ہر دیال ناگ نے تیز و تند تقریر کی۔ چھوٹے لال جانی باری نے تائید کی۔ پنڈت گوری شنکر مسرا نے میثاقِ بنگال کو غیر ضروری قرار دیا۔ بنگال کے ایک اور رہنما پرشوتم رائے نے کہا کہ بنگال کے ہندو سمجھتے ہیں کہ اگر میثاقِ بنگال منظور ہوا تو پورے ملک میں اس کے خلاف احتجاج ہو گا۔

دیش بندھو داس سے رہا نہ گیا۔ کہنے لگے کہ ابھی تو میثاق کو منظور کرنے کے لیے بھی نہیں کہا جا رہا۔ صرف غور کرنے کے لیے کہا جا رہا۔ اُس کے بعد بھی رد کیا جا سکتا ہے۔ ابھی سے یہ واویلا کیا معانی رکھتا ہے؟ "آخر بنگال کے خلاف یہ نفرت کیوں؟" انہوں نے کہا۔ "بنگال کا کیا قصور ہے؟ آپ میثاقِ بنگال کو قرارداد سے نکال سکتے ہیں۔ لیکن یقین جانئیے کہ آپ بنگال کو انڈین نیشنل کانگریس یا ہندوستان کی تاریخ سے نہیں نکال سکتے!"

بابو شیام سندر چکرورتی نے کہا کہ میثاقِ بنگال سے ہندو مسلم اتحاد کو نقصان پہنچے گا۔ بنگال کے مسلمان رہنما تصدق شیروانی نے بڑے درد کے ساتھ کہا:

> میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایک مسلمان کو کانگریس کے پلیٹ فارم سے یہ کہنا پڑے گا کہ اُس کے حقوق کانگریس کے ہاتھوں میں محفوظ نہیں ہیں... کانگریس کے ایک خادم کے طور پر میں سوراج کے نام پر ہندو راج بھی قبول کر لوں گا۔ لیکن میں یہاں بیٹھ کر یہ ضرور سوچتا رہا ہوں کہ کیا ہندو مسلمانوں کو حقوق دینے کے بارے میں غور کرنے پر بھی تیار نہیں ہیں؟ یہ تمام لوگ جو یہاں جمع ہیں، یہی تاثر لے کر واپس جائیں گے ... مجھ جیسے لوگ جو گیارہ برس سے کانگریس کے ساتھ ہیں وہ بھی یہی سمجھنے پر مجبور ہو

جائیں گے ... آپ نے قرارداد میں سے میثاقِ بنگال نکال دیا تو مطلب یہی ہو گا کہ آپ کسی ایسی قرارداد پر سرے سے غور ہی نہیں کرنا چاہتے جس کے ذریعے مسلمانوں کو کچھ بھی حقوق ملتے ہوں... سچ یہ ہے کہ میں تو میثاقِ بنگال کے حق میں بھی نہیں! پہلے ہی اس کی مخالفت کر چکا ہوں۔ میں تو کہہ چکا ہوں کہ کسی معاہدے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ مگر میں آپ کو یقین دلانا چاہتا ہوں کہ ابھی جو باتیں ہوئی ہیں، اُن کا اثر ہر مسلمان پر وہی ہوا ہے جو مجھ پر ہوا ہے۔

مدراس کے ہندو رہنما پرکشم نے تائید کی اور کہا کہ ہندو مسلم فسادات گاندھی جی کی عدم موجودگی میں ہو رہے ہیں۔ مالوی جی کے سنگھٹن اور شدھی کی وجہ سے بڑھے ہیں۔ سروجنی نائیڈو اور راج گوپال اچاریہ نے قرارداد کی حمایت کی۔ مدراس کے مسلم رہنما یعقوب حسن نے کہا کہ ہندو مسلم اتحاد کا آغاز میثاقِ لکھنؤ سے ہوا تھا۔ اُس کے بعد ہی مسلمان کانگریس میں شامل ہوئے اور کانگریس صحیح معنوں میں ملک گیر جماعت بن سکی۔ کیا آپ میثاقِ لکھنؤ کو ختم کر دینا چاہتے ہیں؟ حاضرین نے زور زور سے کہا، ''نہیں! نہیں!'' یعقوب حسن نے کہا کہ پھر میثاقِ بنگال کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ڈاکٹر انصاری نے کہا کہ میثاقِ بنگال پر ضرور غور کیا جائے۔ موتی لال نہرو نے کہا کہ میثاقِ بنگال پر غور نہ کرنے کا مطلب ہر جگہ یہی سمجھا جائے گا کہ کانگریس ہندوستان کے کسی ایسے خطے کی بات سننے پر تیار نہیں ہے جہاں مسلمانوں کو بہتر حقوق دیے جا رہے ہوں!

جوہرؔ نے صدر کی حیثیت میں روسٹرم پر آ کر کہا کہ جو لوگ قرارداد میں سے میثاقِ بنگال کو نکالنے کے حق میں ہیں وہ ہاتھ اُٹھائیں۔ ہجوم کا جائزہ لینے کے بعد اعلان کیا کہ کم ہاتھ اُٹھے ہیں۔ قرارداد میں میثاقِ بنگال کو شامل رکھا جائے گا۔

شور مچ گیا۔ مطالبہ ہوا کہ باقاعدہ گنتی ہو۔ مہمانوں اور استقبالیہ کمیٹی سے کہا گیا کہ کچھ دیر کے لیے پنڈال سے چلے جائیں۔ گنتی مکمل ہونے میں ایک گھنٹے سے کچھ اوپر وقت لگا۔ ۴۵۸ ووٹ میثاقِ

بنگال پر غور کرنے کے حق میں تھے۔ ۶۷۸ ووٹ خلاف تھے۔[1]

32

خیال کیا جاتا ہے کہ ۱۹۲۳ء کے اواخر میں آئینۂ عجم کی سو جلدیں شائع کر کے کتاب اسکول بورڈ کی سب کمیٹی میں پیش کی گئی۔ علامہ نے میٹرک کے طلبہ کے لیے فارسی نظم اور نثر کا انتخاب کیا تھا۔ قریباً ڈھائی سو صفحات تھے۔ بعد میں کم کر دیئے گئے۔[2]

---

[1] کانگریس کے اجلاس کی تفصیلات کے لیے دیکھیے: Indian National Congress (1924)

[2] اقبال (۱۹۲۷) آئینۂ عجم؛ اور ڈاکٹر حسن اختر ملک، اقبال، ایک تحقیقی مطالعہ، ص ۱۶۸-۱۵۳۔ ڈاکٹر ملک کو ۱۹۲۳ء کے اڈیشن کا اندرونی سرورق اور ابتدائی صفحے ملے۔ فہرست کے مطابق آخری سبق کا آغاز ص ۲۳۶ تھا۔ اُن کا اندازہ ہے کہ سو کاپیاں اواخر ۱۹۲۳ء میں شائع کر کے سکول بورڈ کی سب کمیٹی کی منظوری طلب کی گئی۔ مجوزہ ترمیمات کے مطابق نیا ایڈیشن ۱۹۲۷ء میں شائع ہو کر ۳ مارچ ۱۹۲۷ء کو منظور ہوا۔ اِس دوران تراجم چَھپ چکے تھے۔

باب ۳

قافلے کا راستہ

جنوری سے اگست ۱۹۲۴ء تک

*

آئینۂ عجم

انتخاباتِ نثر و نظمِ فارسی برائے طلبائے میٹریکولیشن

مرتّبہ و مولفۂ

ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم اے + پی۔ ایچ۔ ڈی۔ بیرسٹر ایٹ لا

سنہ ۱۹۲۳ء

پبلشرز

میسرز عطر چند کپور اینڈ سنز انار کلی۔ لاہور

حصۂ نثر میں چودہ اسباق تھے: ہزیمتِ ہمایوں (ہمایوں نامہ)، حکایات (کلیلہ و دمنہ)، در افزونیٔ گہر از افزونیٔ ہنر (کابوس نامہ)، زنبور و مورچہ، حکایاتِ حکیم قاآنی، آشیانِ بلبل، محاورۂ سیّاحے با یکے از وحشیانِ امریکاے شمالی، مجادلہ درمیان علوم و فنون، پروانہ، ماہ و انجم، ملّت و دولتِ ایران (سید محمد علی جمال زادہ)، ماطلید (محمود طرزی)، سرگذشتِ شاہ قلی میرزا (تیاتر؛ ناظم الدّولہ میرزا ملکم خاں)، سیاحت نامۂ ابراہیم بیگ [دو اسباق]۔

حصۂ نظم میں علامہ کی تین منظومات بھی شامل تھیں۔ ستائیس اسباق تھے: مناظرۂ تیر و کمان،

کشیدن موش شتر را (رومی)، شکایتِ ایام (سعدی)، نے و چنار (حُسین دانش)، کدو و چنار (سعدی)، موش و گربہ (عبید زاکانی)، اعرابیٔ طامع (لوائی)، طائرِ باہمت (میرزا نصیر)، سکندر و دیوجانس کلبی (میر حسینی)، شبلی و مور (سعدی)، عمرؓ و مردِ گدا (سعدی)، خودبینیِ عقاب (سعدی)، مور و عقرب (دہ خدا)، دخمۂ شاپور (فرصت شیرازی)، پندنامۂ نوشیرواں (بدایع بلخی)، باد (جبلی غُرجستانی)، ابر (جبلی غُرجستانی)، آب (جمال الدین اصفہانی)، بہار (مرزا نصیر)، بہار (فرصت شیرازی)، فصلِ بہار (اقبال)، خوش دلی (نظامی)، قلم (ظہوری)، نغمۂ سارباں (اقبال) مداین (حُسین دانش)، اسپِ ضعیف و شاعرِ ظریف (عِصمتُ اللہ)، قِطعات (ابنِ یمین، جنّتی، انوری، قاآنی، سعدی، ادیب صابر، عماد فقیہ، فردوسی، ہاتفی، سنائی، اقبال)۔

جدید مصنفین میں سے افغانستان کے محمود طرزی اور ایران کے سید محمد علی جمال زادہ خاص طور پر قابلِ ذکر تھے۔ علامہ کا مقصد بھی یہی تھا کہ "فارسی کے ذریعے سے بھی جدید خیالات اور احساسات طلبۂ ہند تک پہنچیں۔"[1] جمال زادہ نے 'ملّت و دولتِ ایران' ایک فرضی یوروپین کے نقطۂ نگاہ سے لکھا جو پہلی دفعہ ایران آیا ہے اور وہاں کے رسم و رواج سے بالکل واقف نہیں۔ اس طرح مصنف کو موقع ملا کہ ایرانی اپنے معاشرے کی جن باتوں کو مدت سے قبول کیے بیٹھے، اُنہیں بالکل ہی نئے زاویے سے دکھا سکے۔ اِس طنزیہ تحریر کے ایک حصے کا ترجمہ یوں کیا جا سکتا تھا:

> ایرانی عموماً میانہ قد اور گندمی رنگ کے ہوتے ہیں۔ باتیں بہت بناتے ہیں مگر کام تھوڑا کرتے ہیں۔ نہایت خوش طبع اور زندہ دل ہیں لیکن روتے بہت ہیں۔ اُن کی زبان ایسی میٹھی اور دلکش ہے کہ سانپ کو اُس کے سوراخ سے باہر نکال لاتی ہے۔ مگر ایک نہایت عجیب بات اِس ملک میں یہ ہے کہ یہاں عورت کا وجود نہیں ہے۔ گلی کُوچوں میں چار پانچ سال عمر کی چھوٹی لڑکیاں تو دیکھی جا سکتی ہیں مگر عورت کہیں نظر نہیں آتی ... یورپ میں کہا جاتا ہے کہ ایرانیوں میں سے ہر ایک شخص ایک حرم سرائے رکھتا ہے

[1] مکتوب بنام پروفیسر محمد اکبر منیر ۳۰/ جنوری ۱۹۲۲ء؛ خرم علی شفیق (۲۰۱۲) اقبال: درمیانی دور، ص ۱۰۷

جس میں عورتیں بھری پڑی ہوتی ہیں۔ فی الحقیقت میرے ہموطن [یعنی یورپ والے] دنیا سے نہایت ہی بے خبر ہیں۔ ایران میں جہاں عورت مطلق دیکھنے میں نہیں آتی کس طرح ہو سکتا ہے کہ وہاں ہر ایک شخص کا گھر عورتوں سے بھرا ہو... ایک دن میں نے ایک ایرانی سے جو میرا گہرا دوست تھا اور کئی ایک اولاد بھی رکھتا تھا، دریافت کیا کہ آخر آپ کی بی بی کہاں ہے۔ میں نے دیکھا کہ یہ بات سنتے ہی فوراً اُس کا چہرہ غضب سے سرخ ہو گیا اور اُس کی آنکھیں دیوانوں کی طرح حلقوں سے نکل پڑیں اور حال بالکل متغیر ہو گیا۔ میں نے سمجھا کہ میں کسی بڑی بھاری خطا کا مرتکب ہوا ہوں۔ آخر میں نے عذر خواہی کی اور اُس دن سے سمجھ لیا کہ اِس ملک میں نہ صرف عورت کا وجود نہیں بلکہ عورت کا ذکر بھی زبان پر نہیں لایا جا سکتا۔

ایک اور بات جو اِیران میں نہایت عجیب ہے یہ ہے کہ لوگوں کی ایک معقول تعداد جو باشندگانِ ملک کے تقریباً نصف کے برابر ہے اپنے آپ کو سر سے لے کر پاؤں تک ایک سیاہ تھیلے میں باندھے رکھتے ہیں [مراد برقعہ ہے اور در حقیقت یہ عورتیں ہیں مگر یورپین سیاح اس بات سے واقف نہیں ہے]۔ حتیٰ کہ سانس لینے کے لیے بھی کوئی سوراخ نہیں چھوڑتے اور اِسی طرح اُن سیاہ تھیلوں میں بندھے بندھائے گلی کُوچوں میں آتے جاتے ہیں۔ اُن لوگوں کی آواز کسی کے کانوں تک نہیں پہنچنی چاہیے اور اُنہیں یہ حق بھی حاصل نہیں ہے کہ قہوہ خانوں یا کسی اور ایسی جگہ میں داخل ہو سکیں۔ اُن کے حمام بھی مخصوص ہیں اور پبلک جلسوں مثلاً مرثیہ خوانی اور مجلسِ ماتم داری میں بھی اُن کی جگہ خاص ہوتی ہے۔ یہ لوگ جب تک الگ الگ ہوں اِن کی آواز ہرگز نہیں نکلتی لیکن جونہی آپس میں مل بیٹھیں ایک عجیب شور وغُل پیدا ہو جاتا ہے۔[1]

[1] ترجمہ مولوی محمد چراغ جلال پوری (۱۹۲۷) شرح آئینۂ عجم، ص ۱۱-۸ سے لے کر کچھ تبدیلیاں کی گئی ہیں۔

1

کرنال کے نواب صاحبان جن میں نوابزادہ لیاقت علی خاں شامل تھے، اُن کے مقدمے کے لیے علامہ اقبال کو یکم جنوری ۱۹۲۴ء کو پنجاب سے باہر جانا پڑا۔[1]

۶ر جنوری کو انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کا اجلاس ہوا۔ علامہ نے جنرل سکرٹری شپ سے استعفا دیا تھا۔ طے پایا کہ ایک وفد جائے۔ اُن سے استعفا واپس لینے کی درخواست کرے۔ تین روز بعد علامہ لاہور واپس پہنچے۔ انجمن کا وفد آیا۔ علامہ استعفا پر مصر رہے۔[2]

غالباً ان دنوں اُردو کی درسی کتابوں کا سلسلہ بھی مرتب کر رہے تھے۔ حکیم احمد شجاع اس میں شریک تھے۔ چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعتوں کی کتابوں کی تدوین ہو رہی تھی۔[3] شبیر حسن لکھنؤ کے نوجوان تھے۔ جوشؔ ملیح آبادی کے نام سے شاعری کرتے تھے۔ ان کی لکھی ہوئی حمد بھی کتاب میں شامل ہوئی۔ ۱۴ر جنوری کو کشن پرشاد کے نام جوشؔ کی معرفی کے لیے رقعہ لکھا:

> یہ خط شبیر حسن صاحب جوش ملیح آبادی لکھنوی کی معرفی کے لیے لکھتا ہوں۔ یہ نوجوان نہایت قابل اور ہونہار شاعر ہیں۔ میں نے ان کی تصانیف کو ہمیشہ دلچسپی سے پڑھا ہے۔ اس خداداد قابلیت کے علاوہ لکھنؤ کے ایک معزز خاندان سے ہیں، جو اثر و رسوخ کے ساتھ لٹریری شہرت بھی رکھتا ہے۔ مجھے امید ہے کہ سرکار ان کے حال پر نظرِ عنایت فرمائیں گے اور اگر ان کو کسی امر میں سرکارِ عالی کے مشورے کی ضرورت ہو گی تو اس سے دریغ نہ فرمائیں گے۔
>
> سرکارِ والا کی شرفا پروری کے اعتمار پر اِس درخواست کی جرأت کی گئی ہے...[4]

---

[1] مکتوب بنام شاد ۱۴ر جنوری ۱۹۲۴ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۰۴-۵۰۳

[2] انجمن کی قلمی روداد؛ محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶)، اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص ۱۷۸

[3] یہ کتب اس برس کسی وقت شائع ہوئیں۔ تفصیلات اگلے باب کے آخر میں آئیں گی۔ ان کی اشاعت و تدوین کے بارے میں معلومات کے لیے دیکھیے ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی، تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ ہے۔

[4] مکتوب بنام شاد ۱۴ر جنوری ۱۹۲۴ء محولہ بالا

اس ماہ علیگڑہ میگزین میں علامہ کی نظم 'تنہائی' شائع ہوئی۔[1]

2

ضلع کرنال میں دہلی سے سو میل شمال کے فاصلے پر کنج پورہ کی جاگیر تھی۔ مغل عہد میں ایک رئیس نجابت خاں نے اس پر قبضہ کر کے ۱۸۴۸ء میں احمد شاہ ابدالی سے سند حاصل کی۔ اُن کی نسل میں سے نواب ابراہیم علی خاں اب یہاں جاگیر دار تھے۔ نیازالدین خاں مینجر مقرر ہوئے۔ ۲۰؍ جنوری کو اُن کا خط علامہ کو ملا۔ فوراً جواب لکھا:

> لوگوں کو ان باتوں کے متعلق سوچنے کی فرصت نہیں اور نہ وہ اس کام کو فی الحال سمجھ سکتے ہیں، جو میں نے کیا ہے، اس واسطے ان کو معذور سمجھ کر میں خاموش ہوں اور کسی ایسی تحریک میں کوئی خاص دلچسپی بھی نہیں رکھتا۔ اُمید کہ آپ کنج پورہ میں کوئی مفید کام کر سکیں گے۔ نواب کنج پورہ نہایت نیک نفس آدمی ہیں۔ اُن سے آپ کا نباہ بھی خوب ہو گا۔[2]

3

۲۲؍ جنوری کو لیبر پارٹی کے ریمزے میکڈونلڈ (Ramsay McDonald) برطانیہ کے وزیر اعظم بنے۔ اُن کی پارٹی کے لارڈ اولیویئر (Lord Olivier) وزیرِ ہند ہوئے۔

چھ روز پہلے کنزرویٹو وزیر اعظم بالڈوِن عہدے سے محروم ہوئے تھے۔ نئی پارلیمنٹ نے انہیں اعتماد کا ووٹ نہ دیا تھا۔ یہ پارلیمنٹ گزشتہ ماہ کے انتخابات کے نتیجے میں بنی تھی۔

4

انڈونیشیا کے شہر جاوا سے رسالہ ذخیرۃ الدینیہ نکلتا تھا۔ ہر مہینے حدیثِ نبوی کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا۔ علامہ کو مدیر "واقفِ کار" معلوم ہوا۔ گزشتہ دسمبر کے پرچے میں اُس حدیث کی صحت پر

---

[1] شاہین (۱۹۶۵) اوراقِ گم گشتہ، ص ۹۵-۹۳؛ نیز خواجہ منظور حسین (۱۹۸۶)، ص ۱۵-۱۴

[2] مکتوب بنام نیازالدین خاں ۲۰؍ جنوری ۱۹۲۴ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۰۵-۵۰۳

اعتراض کیا تھا جس میں حضرت اویس قرنیؒ کو اُمتِ مسلمہ کا خلیل قرار دیا گیا تھا۔ نیز لکھا کہ امام مالک کے نزدیک اویس قرنی کا کوئی تاریخی وجود نہ تھا۔ ممکن ہے کہ یہ پرچہ جنوری میں علامہ تک پہنچا ہو۔ ۲۳؍ جنوری کو سید سلیمان ندوی سے خط میں تذکرہ کرتے ہوئے پوچھا، ''آپ حضرت اویسؓ اور اُن تمام صوفی روایات کے متعلق جو اُن سے منسوب ہیں کیا خیال رکھتے ہیں؟ اگر حضرت امام مالک کی تحقیق زیرِ نظر ہو تو ازراہِ عنایت حوالے سے آگاہ فرمایئے گا۔''[1]

5

۲۶؍ جنوری کو مصر میں سعد زاغلول پاشا وزیرِ اعظم بنے۔ قومی ہیرو تھے۔ جلاوطنی کاٹ کر آئے تھے۔ دو ہفتے قبل انتخابات میں ان کی وفد پارٹی نے فتح حاصل کی تھی۔

دس روز پہلے رُوس میں لینن کا انتقال ہوا تھا۔ ۳۱؍ جنوری کے زمیندار میں تصدیق کی خبر چھپی:

> آج دنیا ٹالسٹائی اور کارل مارکس کی جس قدر بھی تعریف کرے اُس کا حق ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان دونوں بزرگوں کے پیش کردہ اصول جب تک کتابوں کے اندر تھے جلوۂ سراب کا حکم رکھتے تھے... لینن نے ان تمام اصول پر عمل کر کے دکھا دیا۔ اور تمام دنیا کی پست و واماندہ پیشہ ور، مزدور اور مظلوم جماعتوں کو اُن کے حقوق کا ایسا احساس دلایا جو قیامت تک فراموش نہیں ہو سکتا... یاد رکھو لینن نے جو بیج روس میں بویا اُس کا پھل ساری دنیا کھائے گی۔ بادشاہیاں مٹ رہی ہیں اور رہی سہی مٹ جائیں گی۔ مزدور اپنے حقوق حاصل کر رہا ہے اور عنقریب ساری دنیا کا انتظام اپنے ہاتھ میں لینے والا ہے۔ چند سال کے اندر دنیا دیکھے گی کہ ہر جگہ اشتراکی جمہوریتیں قایم ہوں گی اور لینن اعظم کا نام تاریخِ عالم میں نہایت عزت و احترام سے درج کیا جائے گا... ہمیں بولشویت کے تمام و کمال عقائد سے اتفاق نہیں لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ دنیا کے معدے سے سرمایہ

[1] مکتوب بنام سلیمان ندوی ۲۳؍ جنوری ۱۹۲۴ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۰۷-۵۰۵

داری کے سدّوں کا اخراج ایسے ہی زبردست مسہل کا متقاضی تھا۔[1]
اُس روز رُوس میں نئے آئین کی توثیق ہوئی۔ نئی دہلی میں نئی قانون ساز مجلس کا افتتاح بھی ہوا۔

6

سید سلیمان ندوی نے اویس قرنیؓ والے استفسار کے جواب میں معلومات سے لبریز خط لکھا۔ یکم فروری کو علامہ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے معارف میں شائع ہونے والے اُن کے مضامین کی تعریف بھی کی: ''آپ کی نثر معانی سے معمور ہونے کے علاوہ لٹریری خوبیوں سے بھی مالامال ہوتی ہے۔'' معجزۂ شقِ قمر کے بارے میں مولانا گرامی کے شعر کی جو تضمین لکھی تھی اور پیامِ مشرق میں شامل نہ کی تھی وہ معارف کے لیے پیش کر دی۔ استقرائی منطق کے بارے میں حوالوں کی فرمایش کی:

> مسلمانوں نے منطقِ استقرائی پر جو کچھ لکھا ہے اور جو جو اضافے اُنہوں نے یونانیوں کی منطق پر کیے ہیں، اس کے متعلق میں کچھ تحقیق کر رہا ہوں۔
>
> میں آپ کا نہایت شکرگذار ہوں گا اگر ازراہِ عنایت اپنی وسیع معلومات سے مجھے مستفیض فرمائیں۔ کم از کم ان کتابوں کے نام تحریر فرمایئے جن کو پڑھنا ضروری ہے۔ جرمن زبان میں کچھ مسالا اس کے لیے ہے اور چند کتابیں اسلامی حکما پر حال ہی میں شائع ہوئی ہیں جو میں نے پنجاب یونی۔ ورسٹی کے لیے خرید لی تھیں۔
>
> عربی و فارسی کتب سے آپ آگاہ فرمائیں، مگر کتابیں ایسی ہوں جو دستیاب ہو سکتی ہوں۔ جو دستیاب نہ ہو سکتی ہوں اُن کے ناموں پر نشان کر دیجیے گا۔ قیاس پر اعتراض غالباً سب سے پہلے امام رازی نے کیا تھا۔ امام غزالی، ابنِ تیمیہ اور شاید شیخ سہروردی مقتول نے بھی اس مضمون پر لکھا ہے۔ مؤخر الذکر کی تحقیق زمانۂ حال کے خیالات کے بہت قریب ہے۔[2]

---

[1] زمیندار ۳۱ جنوری ۱۹۲۴ء۔ بشکریہ امجد سلیم علوی۔

[2] مکتوب بنام سلیمان ندوی یکم فروری ۱۹۲۴ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۱۲-۵۰۷

اگلے روز پروفیسر محمد اکبر منیر کا خط ملا۔ بغداد سے کچھ اشعار بھیجے تھے۔ ایک شعر نے علامہ کو رُلا دیا۔ فوراً جواب لکھا، ''دنیا کے دل میں انقلاب ہے۔ اِس واسطے قلوبِ انسانی اس سے متاثر ہو رہے ہیں۔''[1]
علیگڑھ کے اُستاد ڈاکٹر ہادی حسین کو بھی خط لکھا۔ اُن کے شاگرد سید یامین ہاشمی نے علامہ کی ۱۹۲۲ء کی نظم 'خضرِ راہ' کا انگریزی نثر میں ترجمہ کر کے اُس پر تعارف لکھا تھا۔ اُستاد کے ذریعے علامہ کو بھجوایا تھا۔ علامہ نے لکھا کہ کبھی کبھی محسوس کرتے ہیں کہ کوئی غیر مرئی قوت لکھنے پر مجبور کر رہی ہے۔ ورنہ خودی کے تصور کو سمجھانا مشکل ہے۔ ضروری ہے کہ سمجھنے والا ایک روحانی تجربے سے گزر چکا ہو جس کا تعلق اجتماعی زندگی سے ہے۔ خودی کی بقا کے بغیر حیات بعدُ الموت کا تصور معانی نہیں رکھتا۔ مشرقی اقوام کا اصل مرض اس بات سے غفلت ہے۔ اس کی وجہ خدا کے وجود میں خودی کے فنا ہو جانے کا تصوّر ہے۔ ترجمے کے بارے میں لکھا کہ شعر کے نثری ترجمے میں بھی شعریت ضرور ہونی چاہئیے۔[2]

7

ڈاکٹر میجر حیدر عصمت بے اور لیفٹیننٹ الیاس آفندی کا تعلق ترک حکومت سے تھا۔ ۴/ فروری کو افغانستان سے لاہور پہنچے۔ شاندار استقبال ہوا۔ آفندی، علامہ کی شاعری فارسی میں یا ترجمے میں پڑھ چکے تھے۔ اسٹیشن پر ہی علامہ کے متعلق پوچھنا شروع کیا۔ وہ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے نہیں آئے تھے۔

اگلے روز ۵/ فروری کو کوچہ چابک سواراں کے نوجوانوں نے ترک مہمانوں کے لیے جلسے کا اہتمام کیا۔ علامہ صدارت کر رہے تھے۔ مولوی محبوب عالم، مرزا جلال الدین، حاجی شمس الدین بھی نمایاں تھے۔ رنگ محل مشن اسکول کے سامنے کوچہ چابک سواراں کے دروازے پر نمایشی دروازہ بنایا گیا تھا۔ ڈاکٹر میجر حیدر عصمت بے اور لیفٹیننٹ الیاس آفندی کی آمد پر بینڈ باجے سے خیر مقدم ہوا۔ ہجوم نے اللہ اکبر اور زندہ باد کے نعرے لگائے۔ اکابرین سے ترک مہمانوں کا تعارف کروایا گیا۔ اُنہوں نے ہاتھ ملایا، گلے ملے اور منہ چومے۔

''یہ دونوں حضرات علامہ اقبال پر فدا ہو رہے تھے،'' زمیندار کا بیان ہے۔ ''جناب الیاس

[1] مکتوب بنام محمد اکبر منیر ۲/ فروری ۱۹۲۴ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۱۵
[2] B. A. Dar, *Letters of Iqbal*

آفندی بار بار فرماتے تھے کہ آج میں اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھتا ہوں کہ میں نے اس بزرگ سے ملاقات کا شرف حاصل کیا جس کے لیے میں ہمیشہ مضطرب رہا کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ اقبال صاحب کو عمر خضر عطا فرمائے اور وہ اسی طرح خدمت اسلام انجام دیتے رہیں!'[1]

اُس روز حکومت نے گاندھی کو صحت کی خرابی کی وجہ سے رہا کر دیا۔ باقی سزا معاف ہو گئی۔

8

پیامِ مشرق کا دوسرا ایڈیشن طباعت کے مراحل میں تھا۔ اُردو مجموعہ تقریباً تیار تھا۔ سردی اور بارش کی وجہ سے علامہ کی کمر میں درد رہنے لگا۔ جوڑوں کے درد کا خطرہ ہوا۔ یورک ایسڈ دُور کرنے کی دوا پینے لگے۔ علیگڑھ کا ارادہ تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ ملتوی کیا۔ ۱۱ر فروری کو کنج پورہ سے نیازالدین خاں کا خط ملا۔ بعض مغربی فلسفیوں کے متعلق پوچھا تھا۔ اپنا ایک مصرع بھی بھیجا تھا۔ علامہ نے فوراً جواب دیا۔ [2]

صوفی پرنٹنگ اینڈ پبلشنگ کمپنی لمیٹڈ کے مینجر کی طرف سے پیامِ مشرق کے متعلق شائع ہوا: ”علامہ اقبال کی تازہ تصنیف کا دوسرا اڈیشن پہلے سے اسّی صفحہ زیادہ، قیمت ساڑھے چار روپے۔“ چودھری محمد حسین نے زمیندار کو اطلاع دی کہ اشتہار علامہ کی اجازت کے بغیر شائع ہوا ہے۔ مینجر صوفی کمپنی کے خلاف قانونی چارہ جوئی کی جائے گی۔ دوسرے اڈیشن کی قیمت وہی رکھی جا رہی ہے جو پہلے اڈیشن کی تھی۔ اُردو مجموعے کی پیش رفت سے بھی آگاہ کیا۔ [3]

روایت ہے کہ غزنی سے ایک بزرگ تشریف لائے۔ علامہ ملاقات کے لیے گئے۔ بزرگ نے پوچھا کہ اسلام اور کفر میں اُن کے نزدیک کیا فرق ہے۔ علامہ نے جواب دیا، ”جہاں تک تاریخ پر میری نظر ہے، مجھے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ جو بات اسلام کے لیے رحمت ہے وہ کفر کے لیے لعنت اور جو کفر کے لیے رحمت ہے وہ اسلام کے لیے لعنت۔“[4]

---

[1] اختر النساص ۱۱۵-۱۱۶۔ بحوالہ زمیندار فروری ۱۹۲۴ء

[2] مکتوب بنام نیازالدین خاں ۱۱ فروری ۱۹۲۴ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۱۶

[3] یہ وضاحت زمیندار میں ۵ر مارچ کو شائع ہوئی۔ دیکھیے اختر النسا (۲۰۱۰)، اقبال اور زمیندار، ص ۹۶-۹۵۔

[4] ڈاکٹر ثاقب نفیس (اپریل ۲۰۰۸)، 'چودھری محمد حسین مرحوم کی ڈائری کے چند اَوراق'

9

ہستی سے دل کی گرم ہیں ہستی کی محفلیں اِس صدرِ انجمن کی کہیں انجمن نہیں ہے

*

چل چلے چلتے ہیں مسجد کو مگر یہ تو بتا تیرے کوچے میں کوئی اے شیخ میخانہ بھی ہے؟

چودھری محمد حسین[1]

علامہ نے چودھری محمد حسین کو مشورہ دیا کہ شاعری ترک کر کے نثر پر توجہ دیں۔[2] ایک کتاب اس موضوع پر لکھیں کہ پنجابی مسلمان نسلاً تورانی یعنی ترک ہیں۔[3] ۱۳/ فروری کو محمد حسین نے ایک ڈائری لکھنا شروع کی۔ ارادہ تھا کہ اس میں علامہ کے ساتھ ملاقاتوں کی تفصیل درج کیا کریں گے۔[4]

ایک خاتون علامہ کو خطوط لکھتی تھیں کہ اُن کے ساتھ شادی کرنا چاہتی ہیں۔ علامہ جواب نہ دیتے تھے۔ ایک روز کوئی اجنبی ملاقات کے لیے پہنچ گیا۔ علامہ کے پاس صرف محمد حسین تھے۔ کتابوں کی الماری میں کوئی کتاب تلاش کر رہے تھے۔ اجنبی نے پوچھا کہ دونوں میں سے ڈاکٹر اقبال کون ہیں۔ علامہ نے بتایا۔ معلوم ہوا اجنبی اُسی خاتون کی طرف سے آیا ہے۔ رشتہ طے کرنا چاہتا ہے۔ علامہ نے معذرت کی۔ وہ چلا گیا۔ محمد حسین بول اُٹھے، "واہ! آپ کو چاہئیے تھا کہ میری طرف اشارہ کر کے کہہ دیتے کہ ڈاکٹر اقبال میں ہوں۔ اگر آپ کو خود شادی نہ کرنی تھی تو کم از کم میرا بندوبست تو ہو جاتا۔" محمد حسین شادی شدہ تھے۔ علامہ کو نہیں بتایا تھا۔[5]

۱۹/ فروری کی صبح خواجہ حسن نظامی علامہ کی کوٹھی پر آئے۔ جموں کے کسی اسلامی جلسے سے

---

[1] ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۳) مۓ لالہ فام، ص ۳۱۵-۳۱۴

[2] ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۳) مۓ لالہ فام، ص ۳۱۵

[3] ڈاکٹر ثاقب نفیس (اپریل ۲۰۰۸)، ص ۲۱۰

[4] ڈاکٹر ثاقب نفیس (اپریل ۲۰۰۸)، ص ۲۰۷ کے مطابق ڈائری کے "۲۷۰ صفحات ہیں۔ ۱۳ فروری ۱۹۲۴ء سے ۷ مارچ ۱۹۲۴ء تک کی ملاقاتوں کی تفصیل درج ہے۔" وہ محمد حسین کے فرزند ہیں۔ ڈائری انہی کے پاس ہے۔ اقتباسات مجلہ بزمِ اقبال میں شائع کروائے۔ ڈاکٹر جاوید اقبال نے بھی ڈائری سے استفادہ کیا تھا؛ مۓ لالہ فام، ص ۳۱۷

[5] ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۳) مۓ لالہ فام، ص ۳۱۷؛ ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۴) زندہ رُود، ص ۳۶۲

واپسی تھی۔ مہاراجہ سر کشن پرشاد نے پیامِ مشرق کی رباعیات کے جواب میں رباعیات لکھی تھیں۔ خواجہ سے کہا تھا کہ علامہ کی رباعیات کے ساتھ شائع کی جائیں۔ کاپی رائٹ کا معاملہ تھا۔ علامہ نے کہا کہ شاد کی رباعیات انہیں دکھائیں۔ پھر صرف علامہ کی رباعیات کے نمبر دے کر شائع کر سکتے ہیں۔[1]

نو بجے کے قریب محمد حسین بھی پہنچ گئے۔ کچھ دیر بعد خواجہ چلے گئے۔ محمد حسین سے روایت ہے کہ اُس کے بعد علامہ نے کہا، "تُو نے سنا ایچ جی ویلز رومن کیتھولک ہو گیا ہے۔" محمد حسین نے حیرت ظاہر کی۔ علامہ نے کہا، "بس وہی امامت کی تلاش۔ اتھارٹی کی تقلید کا اندرونی جذبہ۔ مشرق و مغرب دونوں اِس وقت مہدی کے منتظر ہیں۔ ویلز چونکہ عیسائیت کی آغوش میں پلا ہے... اس لیے پروٹسنٹ ازم چھوڑ کر رومن کیتھولک ہو گیا۔" کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد کہا کہ ایولوشن (evolution) اور ریٹروگریشن (retrogression) کے لیے ارتقا اور انحطاط کی بجائے "نمو" اور "زبول" زیادہ اچھے معلوم ہوتے ہیں۔ پھر کسی مقدمے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ محمد حسین سے شام چار بجے آنے کا کہہ دیا۔

محمد حسین شام پانچ بجے واپس آئے۔ علامہ کے پاس ملک عبدالقیوم، مولوی عبدالقادر قصوری اور ملک لعل خاں بیٹھے تھے۔ ایک اور شخص بھی موجود تھا۔ شاید ریاست حیدرآباد (دکن) کا ملازم تھا۔ ریاست کے مستقبل کے بارے میں خدشات ظاہر کیے جا رہے تھے۔ محمد حسین کے مطابق علامہ نے کہا، اس وقت مسلمانوں کو سب تحریکوں کو چھوڑ کر اشاعتِ اسلام کی طرف متوجہ ہونا چاہیئے۔ حیدرآباد (دکن) میں ضرورت سب سے زیادہ ہے مگر وہیں یہ کام دشوار ہے۔ مولانا ظفر علی خاں دوسری دفعہ وہاں سے غالباً اسی جرم میں نکالے گئے۔

"تمام ہندوستان میں ایک عالم تھا جو کم و بیش مجتہدانہ حیثیت رکھنے کا اہل ہو سکتا تھا یعنی ابوالکلام آزاد،" علامہ نے کہا، "افسوس ہے کہ وہ بھی اسی موج ['قومیتِ ہند'] کے ساتھ ساتھ بہہ گیا۔ مذہبی حلقے کے اندر اندر اگر اُن کی مساعی اپنے دائرے کو رکھتیں تو وہ یقیناً مسلمانوں کے لیے موجودہ حالت

---

[1] ڈاکٹر ثاقب نفیس (اپریل ۲۰۰۸)، ص ۲۱۱-۲۰۷

کی نسبت زیادہ مفید ثابت ہوتے۔ 'ہندوستانیت' اسلام کے حق میں مفید نہیں۔"

مولانا عبدالقادر بھی "قومیتِ ہند" کے حامی تھے۔ اعتراض کیا کہ ترک اور دوسرے اسلامی ممالک بھی تو قومیت ہی قومیت پکار رہے ہیں۔ علامہ نے کہا کہ ترکوں کا علاقائیت (territorialism) کی طرف مائل ہونا اسلام کے منافی نہیں پڑے گا۔ چند روز قبل کی غزنی والے بزرگ سے جو بات کہی تھی اُسے دہراتے ہوئے کہا کہ علاقائیت یورپ کے لئے تباہی کی باعث ہوئی اور جنگِ عظیم میں یورپ کی اینٹ سے اینٹ بج گئی لیکن اسلامی دنیا میں ایسا ہرگز نہ ہو گا۔ جس قوم کی بنیاد مذہب ہو نہ کہ نسل و وطن، اُس کے لیے علاقائیت بھی ارتقا کے مدارج میں ایک درجہ ہے جس کے معنی تفویضِ کار(division of labour) ہیں۔ اس سے آگے اسلامی اصول خودبخود اُسے ہڑپ کر جائیں گے۔ "ہر اسلامی ملک میں چند بااثر نفوس ایسے رہیں گے جو پین اسلامزم کی تصویر مسلمانوں کی آنکھوں کے سامنے رکھیں۔ اس منزل پر قدم رکھنے کا جس وقت موقع آ گیا تمام مسلمان قومیں متحد و متفق ہو کر ایک نظام میں منسلک ہو جائیں گی۔" مانچسٹر گارڈین کے نامہ نگار گوئن کا حوالہ دیا۔ اُس نے دو برس قبل علامہ سے کہا تھا کہ بالآخر مسلمان یورپ کو قومیت سکھائیں گے۔

ترکی میں تورانیت (Pan-Turanianism) کا تصور رائج ہو رہا تھا۔ علامہ نے کہا کہ یہ پین اسلامزم کا مترادف ہے۔ تمام تورانی قومیں قریباً قریباً مسلمان ہیں۔ لوزان کانفرنس کے دوران جب ترک کی تعریف کی جانے لگی تو عصمت پاشا نے کہا حکومتِ ترکی کی حدود میں رہنے والے تمام مسلمان ترک ہیں۔ آزربائیجان اور داغستان کے باشندے بھی احتجاج کر رہے ہیں کہ وہ ترک ہیں اس لیے انہیں ترک ریاست میں شامل کیا جائے، رُوس میں نہیں۔ قبرص میں مسلمان صرف پچاس ہزار کی اقلیت ہیں۔ اُن میں سے کم ہی ترک نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ پھر بھی اپنے آپ کو ترک کہہ کر حقوق طلب کرتے ہیں۔ ہندوستان میں بھی مسلمانوں کے موجودہ رہنما کتنی ہی "ہندوتیت" اختیار کر لیں، پین اسلام ازم کے علمبردار یہاں اپنا کام کرتے رہیں گے۔ "اِس موجودہ زمانے میں یہ خدمت بندہ کے سپرد ہے،" علامہ نے کہا۔

مولانا عبدالقادر نے کہا کہ لاجپت رائے کہتے ہیں کہ میثاقِ بنگال کے معاملے میں ابوالکلام، سی

آر داس کو کھا گیا ہے۔ علامہ نے پھر بھی اصرار کیا کہ ابوالکلام قوم کی اصل خدمت سے دُور چلے گئے ہیں، ''وہ فطرتاً مذہبی کام کے آدمی ہیں... ہندوستان کو کبھی بھی یہاں کے علما نے اصل اسلام دینے کی کوشش نہ کی۔ یہ موجود مسلمان بھی جو کچھ نظر آرہے ہیں تین علما کی توجہ کا نتیجہ ہے: اورنگ زیب، مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ۔''

مہمان چلے گئے۔ محمد حسین نے علامہ کا اُردو کلام سنانا شروع کیا۔ مجموعہ کلام کی ترتیب کے لیے یہ دوسری خواندگی تھی۔ اس کے بعد ایک دفعہ پھر نظر ڈالی جانی تھی۔ یہ کام رات نو بجے تک جاری رہا۔ پھر علی بخش طلب ہوا۔ اُس نے کہا کہ دوسرا نوکر مہر الٰہی بھی کہتا ہے کہ کوئی مربعہ دلوا دیں۔ محمد حسین نے کہا کہ یہ خواہش ہر شخص کی فطرت میں ہے۔ علامہ نے کہا، ''معلوم ہوتا ہے آدم کو کسی نے بہشت سے زبردستی نہیں نکالا... یہ حضرت مربعوں کی دھن میں خود ہی زمین پر اُترے ہوں گے۔''[1]

۲۲ر فروری کو محمد حسین شام پانچ بجے علامہ کے پاس پہنچے۔ اُردو کلام کی ترتیب پر کام ہونے لگا۔ پھر حاجی شمس الدین پہنچ گئے۔ انجمن حمایت اسلام کے بانیوں میں سے تھے۔ اصرار کر رہے تھے کہ علامہ سالانہ جلسے میں نظم پڑھیں۔ علامہ معذرت کرتے رہے۔ جلسے کی تاریخوں میں لاہور سے باہر ہوتے۔ ان دنوں شعر بھی نازل نہ ہو رہے تھے۔

اتنے میں خواجہ عبدالرحمٰن آ گئے۔ اسسٹنٹ سنٹری کمشنر تھے۔ ساتھ کسی لائف انشورنس کمپنی کا ایجنٹ تھا۔ بنگالی تھا۔ بہت دنوں سے پنجاب سیکریٹریٹ کے سپرنٹنڈنٹ ملک سلیمان خاں کا لائف انشورنس (بیمہ) کرنے کی کوشش میں تھا۔ اُنہوں نے کہہ دیا تھا، ''اگر ڈاکٹر اقبال کہہ دیں کہ لائف انشورنس کرانا شرعاً جائز ہے تو میں یہ مان لوں گا... وہی میرے مفتی ہیں، وہی میرے مرشد ہیں۔'' ایجنٹ اب علامہ کی رائے لینے آیا تھا۔ محمد حسین کے مطابق علامہ نے شرعی نقطۂ نگاہ سے رائے دینا حکمائے شریعت پر چھوڑ دیا۔ ذاتی رائے یہ دی کہ مسلمانوں میں جو لوگ مذہبی رجحان کے حامل ہوں گے اور دنیا کی ظاہری خوبیوں سے مسحور ہونے کی بجائے آخرت کو ترجیح دیتے ہوں گے وہ طبعاً

---

[1] ڈاکٹر ثاقب نفیس (اپریل ۲۰۰۸)، ص ۲۱۱-۲۰۷

لائف انشورنس کے خلاف ہوں گے۔ صرف اپنی ملکیت کی انشورنس کروانی چاہئیے مگر زندگی اپنی ملکیت نہیں ہے۔ لائف انشورنس میں نفع نقصان محض اتفاق پر موقوف ہے۔ یہ ایک طرح سے جوا ہے۔ ایجنٹ نے کہا کہ لندن کی ایک عدالت فیصلہ دے چکی ہے کہ یہ جوا نہیں ہے۔ علامہ نے کہا کہ مشرقی طبائع کو یقین دلانا مشکل ہے۔ ایجنٹ نے کہا کہ اولاد کے لیے انتظام کرنا چاہئیے۔ علامہ نے کہا کہ قرآن میں وراثت کا تذکرہ ''جو کچھ تم چھوڑ جاؤ'' کہہ کر ہوا ہے۔ پابندی عائد نہیں کی گئی کہ ضرور چھوڑ جاؤ۔ پس ماندگان کو رزق دینے والا بھی خدا ہی ہے۔ البتہ سلیمان اپنی لائف انشورنس کروانا چاہیں تو علامہ اعتراض نہیں کریں گے۔ انہیں بھی شرعی فتویٰ کسی مفتی سے لینا چاہئیے۔

یہ لوگ رخصت ہوئے۔ پانچ سات منٹ بعد علامہ کے پرانے دوست سردار اُمراؤ سنگھ آئے۔ ایک سکھ دوست ساتھ تھے۔ علامہ کے مداح تھے اور ملاقات کی خواہش تھی۔ امراؤ سنگھ نے بیٹھتے ہی محمد حسین کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ چودھری صاحب بھی چھپے رستم نکلے۔ اپنے آپ کو غیر شادی شدہ ظاہر کرتے ہیں۔ کسی سے معلوم ہوا کہ ایک دفعہ والدہ اور بیوی کی بیماری کا تذکرہ کیا تھا۔ علامہ نے کہا، ''ہندوستان کے لوگ لندن جائیں تو... وہاں نئے تعلقات قائم کرنے کے لیے کہہ دیتے ہیں کہ ہم تو کنوارے ہیں... اب یہ بھی دیہاتی ہے۔ ہمارے ہاں کے دیہاتیوں کو لاہور بھی لندن سے کم نہیں...''

ذکر ہوا کہ یورپ رُوس کو دوبارہ استعماری مقاصد کی طرف راغب کر رہا ہے۔ عام انسانوں اور بالخصوص ایشیائی اقوام کے لیے مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ فری میسن سوسائٹی کا ذکر ہوا۔ پھر یہودیوں کا تذکرہ نکل آیا۔ محمد حسین کے مطابق علامہ نے کہا، ''ان کے ہر فرد بشر کو دنیا میں اب بھی آیندہ یہودی سیاسی عروج کا یقین ہے۔ جس دل و دماغ کے انسان یہودی آج اِس زمانے میں بھی پیدا کر رہے ہیں، دنیا کی کوئی قوم مقابلہ نہیں کر سکتی۔ کارل مارکس، برگساں، آئن سٹائن سب یہودی ہیں۔'' حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اپنے زمانے کا سب سے عظیم یہودی قرار دیا۔ کئی اعتبار سے اسپنوزا بھی کم نہیں رہا۔ یہودیت کا مستقبل شاندار نظر آتا تھا۔

امراؤ سنگھ نے اُٹھتے ہوئے علامہ سے کہا، ''بارہ پلیٹیں تصویریں کھینچنے کے لئے آج خرید کر لایا ہوں اور یہ سب آپ ہی پر ختم ہوں گی۔'' اخبار مسلم آؤٹ لُک آ گیا۔ احمدی مبلغ ڈاکٹر مفتی محمد صادق

امریکہ سے واپس لوٹے تھے۔ اسلامیہ کالج لاہور میں 'امریکہ میں اسلام' پر لیکچر دیا تھا۔ اخبار میں اُس کی رپورٹ شائع ہوئی تھی۔ ایک بات پر علامہ جذباتی ہو گئے۔ شکاگو کی کسی بوڑھی عورت کا تذکرہ تھا۔ اُس نے خدا کے حضور التجا کی تھی کہ دنیا کے تمام مذاہب کا مطالعہ کرنا اُس کے لیے ممکن نہیں کہ وہ فیصلہ کر سکے کہ کون سا مذہب سچا ہے۔ خدا ہی اُس کی رہنمائی فرمادے۔ محمد حسین کے مطابق یہ عبارت پڑھتے ہوئے علامہ رو رہے تھے۔ ایک ایک لفظ پر رکنا پڑتا تھا۔ آخر میں کہا، "انسان کے دل میں صداقت کے لیے کس درجہ تڑپ ہے۔ نہیں ملتی تو اضطراب اور سرگردانی میں مبتلا ہوتا ہے۔"

شام ہو چلی تھی۔ اُردو مجموعہ کلام کی ترتیب کا کام پھر شروع ہوا۔ ایک نظم سناتے ہوئے محمد حسین نے "زُباں" کہا۔ علامہ مدت سے تاکید کر رہے تھے کہ "زَباں" کہا کرو۔ ٹوک دیا۔ اس روز کی گفتگوئیں بھی محمد حسین کی ڈائری میں لکھی گئیں۔[1]

محمد حسین کا بیان ہے کہ اگلی صبح علامہ کے پاس ایک مولوی صاحب آئے۔ شرقپور میں ایک بزرگ مولوی شیر محمد رہتے تھے۔ یہ اُن کے مرید تھے۔ پہلے بھی ایک آدھ دفعہ آئے تھے۔ اس دفعہ مولوی صاحب کی کرامات کا تذکرہ کرنے کے بعد کہنے لگے کہ سائیں [شیر محمد] کے خدام بتاتے ہیں کہ ایک رات کوئی دو بجے کے قریب سائیں کے پاس کوئی بوٹ سوٹ والا نئی وضع کا جنٹلمین سائیں سے ملاقات کے لیے آیا۔ شرقپور میں اکثر لوگوں کا خیال ہے کہ وہ علامہ اقبال تھے۔ علامہ نے کہا، "میں تو وہاں نہیں گیا۔" مولوی صاحب سر ہو گئے کہ کسی دن اُن کے ساتھ شرقپور چلیں۔ علامہ پہلے خاموش رہے۔ پھر کوئی کتاب اُٹھا کر چپ چاپ پڑھنا شروع کر دی۔ اُس نے پھر پوچھا۔ علامہ نے جواب دیا، "نہیں۔" وہ کچھ چپ سا رہ گیا۔ علامہ نے کہا، "افسوس ہے کہ آپ نے مجھ کو صاف صاف جواب دینے پر مجبور کر دیا ہے... میں تمام مشائخ کی بلا امتیاز قدر و منزلت کرتا ہوں مگر آپ معاف فرمایئے گا۔ اُن میں کیسے ہی جوہر کیوں نہ ہوں کم از کم ہندوستان میں اِس وقت جتنے اِس روش کے بزرگ ہیں، اُن میں ایک بھی وہ چیز اپنے اندر نہیں رکھتے جس کی اِس وقت مسلمانوں کو ضرورت ہے... صحیح اسلام

---

[1] ڈاکٹر ثاقب نفیس (اپریل ۲۰۰۸)، ص ۲۲۰-۲۱۱

کو سمجھنے، اُس کو مسلمانوں تک پہنچانے اور غیر مسلموں کو سمجھانے سے جب یہ لوگ قاصر ہیں تو ہوا کریں اِن کی کرامات! دیکھا کریں جو خواب یہ دیکھتے ہیں! ہمیں اُس سے کیا سروکار... [تصوّف] کبھی عوام کے لئے تھا، اب اُن کے لیے بھی ہے جو اپنے آپ کو خواص میں شمار کرنے کے مدعی ہیں!"
مولوی صاحب سرد ہوگئے۔ علامہ نے کہا، "میں خود شرقپور گیا بھی ایک دفعہ مگر میں اُن سے [مولوی شیر محمد سے] بالکل نہیں ملا اور دانستہ نہیں ملا۔ آخر کچھ بات ہے تو نہیں ملا۔"[1]

یہ باتیں ہو رہی تھیں جب چودھری محمد حسین پہنچے۔ دن کے گیارہ بجے تھے۔ مولوی صاحب کے رخصت ہونے کے بعد علامہ نے پوری گفتگو محمد حسین کو بتائی۔ ریاست نبھا کے سکھ راجہ کی معزولی کے خلاف سکھوں کا احتجاج کئی ماہ سے جاری تھا۔ محمد حسین نے بتایا کہ پرسوں ریاست میں گولی چل گئی۔ سرکاری بیان کے مطابق چودہ سکھ ہلاک ہوئے۔ چونتیس زخمی ہیں۔

اُردو مجموعہ کلام کی ترتیب پر کام ہونے لگا۔ محمد حسین چاہتے تھے کہ ابتدائی زمانے کی مشہور نظم 'فریادِ اُمت' (۱۹۰۳) شامل کی جائے۔ کئی دفعہ کہہ چکے تھے۔ اب پھر اصرار کیا۔ علامہ نے جواب دیا، "اس میں ہے کچھ نہیں، محض سنٹی مینٹل (sentimental) ہے۔" نظم پر دوبارہ نظر ڈالی۔ ایک بند منتخب کر کے کہا، "اِس کو چاہو تو 'دل' کا عنوان دے کر درج کر لو۔" اُس میں سے بھی دو شعر کاٹ دیئے۔ اگلے بند میں مشہور شعر تھا:

---

[1] یہ گفتگو محمد حسین نے علامہ سے سن کر اپنی ڈائری میں لکھی؛ دیکھیے ڈاکٹر ثاقب نفیس (نومبر ۲۰۰۸)، ص ۱۲-۹۔ عبدالمجید سالک (۱۹۸۳) ذکرِ اقبال، ص ۱۳۱-۱۳۰ میں کسی حوالے کے بغیر لکھا کہ علامہ اقبال، سائیں شیر محمد سے دعا کروانے شرقپور گئے۔ سائیں نے انکار کیا کیونکہ ڈاڑھی منڈھی ہوئی تھی۔ پھر کسی نے سائیں کو بتایا کہ یہ اقبال تھے۔ سائیں اُٹھے۔ علامہ کو جا لیا جب وہ واپسی کے لیے تانگے میں سوار ہو رہے تھے۔ قرینِ قیاس نہیں کہ علامہ موٹر رکھتے ہوئے تانگے میں شرقپور جائیں یا اُن جیسی مشہور شخصیت بھری محفل میں آئے اور موقع پر ظاہر نہ ہو کہ کون ہے۔ سالک نے کوئی حوالہ نہیں دیا۔ انہی کی سند پر ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۶) زندہ رود، ص ۳۴۴ پر یہ روایت پیش کی گئی۔ محمد حسین کی ڈائری کی روشنی میں اسے محض افسانہ سمجھنا پڑتا ہے۔ یہی بات دوسری روایات کے بارے میں کہی جاسکتی ہے جو علامہ اقبال اور شیر محمد کی مبینہ ملاقات کے بارے میں بغیر حوالوں کے سننے میں آتی ہیں۔

یہ شہادت گہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے   لوگ آسان سمجھتے ہیں مسلماں ہونا

سننے میں آیا تھا کہ مولانا شوکت علی کہتے ہیں کہ یہ شعر پڑھ کر وہ مسلمان ہوئے۔ محمد حسین نے اس طرف توجہ دلائی۔ علامہ نے کہا، ''یہ شعر اچھا ہے اور ایک دو ہوں گے۔ باقی کچھ نہیں۔'' مجموعے میں شامل نہ کیا۔ محمد حسین دن کے کام نمٹانے چلے گئے۔ [1]

دن کے دوسرے حصے میں مولوی محمد شفیع آئے۔ ساتھ کوئی اور مہمان بھی تھے۔ ٹیکسٹ بک کمیٹی کے جلسے سے آرہے تھے۔ علامہ کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھے۔ منوہر لعل نے کہیں لیکچر دیا تھا۔ 'اسرارِ خودی' کے بارے میں کہا کہ اس کے مطالعے کے بعد خیال ہوا کہ اس کا مصنف خدا پر ایمان نہیں رکھتا۔ مولوی شفیع نے علامہ کو بتایا۔ علامہ نے اندازہ لگایا کہ یہ ان کے جملے 'Man can assimilate God' کو غلط سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ وہ حدیث کا ترجمہ تھا، تخلقو بہ اخلاق اللہ۔ علامہ کے نزدیک یہ امام حنبل کا عقیدہ تھا۔ معتزلہ اِنہیں اشعری خیالات سمجھ کر مخالفت کرسکتے تھے۔ [2]

محمد حسین دن کے کام نمٹا کر واپس آئے۔ شام ہو چلی تھی۔ ایم اے فارسی کے دو اُمیدوار بھی آبیٹھے۔ مولوی شفیع، اویس قرنی کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے۔ علامہ نے کہا کہ ایک مستقل مضمون لکھ کر شائع کریں۔ مولوی شفیع انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے اندراج کا انتظار کرنا چاہتے تھے۔ چلے گئے۔ ایم اے فارسی کے اُمیدوار لڑکوں نے علامہ سے درخواست کی کہ غالب وغیر پر لیکچر دیں۔ سن رکھا تھا کہ علامہ اُمیدواروں کو لیکچر دیا کرتے ہیں۔ یہ درست نہ تھا۔ علامہ نے کہا کہ مجھے وقت ملے تو غالب کی ایک فلسفی اور مذہبی معلم کی حیثیت پر کتاب لکھوں۔

لڑکے چلے گئے۔ علامہ اپنے کمرے میں آ گئے۔ اُردو مجموعے کی ترتیب پر کام ہونے لگا۔ نظم 'فلسفۂ غم' پر کہا کہ نظامِ دکن کو زبانی یاد ہے۔ جہاں ندی کے آبشار بن کر دوبارہ ندی بننے کی مثال دی گئی ہے، اُس پر کہا کہ وحدت سے انفرادیت اور دوبارہ وحدت بننے کا نقشہ آنکھوں کے سامنے کھینچا

---

[1] ڈاکٹر ثاقب نفیس (نومبر ۲۰۰۸)، ص ۱۲-۹

[2] ڈاکٹر ثاقب نفیس (نومبر ۲۰۰۸)، ص ۱۳

ہے۔ پیام مشرق کی نظم 'پیام' میں بھی یہ مضمون ہے۔ محمد حسین نے کہا، 'والدہ مرحومہ کی یاد میں' میں بھی۔ علامہ نے کہا، عام طور پر ذہنِ انسانی کی ترقی چالیس برس تک ہوتی ہے۔ پھر پختہ ہو جاتا ہے۔ لیکن اُن کا ذہن ابھی تک ترقی پذیر ہے۔ نجانے مزید کن مدارج سے گزرے گا۔

'ایک حاجی مدینے کے راستے میں' پڑھتے ہوئے مصرعہ آیا:

ہائے یثرب دل میں لب پر نعرۂ توحید تھا

محمد حسین کے مطابق علامہ نے کہا، "یہ ہے ناں خاص ٹچ شعر کے اندر جسے بہت کم لوگ سمجھ سکتے ہیں ... عشق دل کی گہرائیوں میں موجزن ہو مگر لب سے جو کچھ نکلے وہ لا الٰہ الا اللہ ہی ہو۔"[1]

۲۴/ فروری کو علامہ نے محمد حسین سے اُردو مجموعے کی فروخت پر بات کی۔ علامہ چاہتے تھے کہ ان سے یک مشت کتابیں خریدی جائیں۔ روپیہ پیشگی دے دیا جائے۔ معقول کمیشن دینے پر تیار تھے۔ محمد حسین کے مطابق اُن کا کہنا تھا، "میں حسابات نہیں رکھ سکتا نہ اقساط کا جھگڑا کر سکتا ہوں۔"[2]

اگلے روز محمد حسین نے تجویز کیا گیا کہ نظم 'فلسفۂ غم' پر نوٹ ڈالا جائے کہ میاں فضل حسین کو مخاطب کر کے لکھی گئی۔ علامہ نے کہا کہ اس طرح تو نظم کی ہسٹری ساتھ آ جائے گی۔ پھر تمام نظموں کی ہسٹری درکار ہو گی۔ فیصلہ محمد حسین پر چھوڑ دیا۔ اُنہوں نے نوٹ ڈال دیا۔[3]

علامہ چاہتے تھے کہ محمد حسین سرکاری ملازمت کریں۔ ۲۸/ فروری کو کہا کہ عرضی لکھیں۔[4] وہ اگلے روز لکھ کر لائے۔ شام کے ساڑھے چار بجے تھے۔ میاں اللہ یار خاں آف لڈن بیٹھے ہوئے تھے۔ چائے آئی۔ علامہ نے محمد حسین سے تازہ خبر کے لیے استفسار کیا۔ انہوں نے کہا کہ انگورہ (انقرہ) نیشنل اسمبلی میں آئین میں خلافت و سیاست کی علیحدگی پر بہت بحث ہوئی ہے۔ خلیفہ کے حمایتی بھی مضبوط معلوم ہوتے ہیں۔ علامہ نے تشویش ظاہر کی اور کہا کہ بہتر تھا کہ خاندانِ عثمانی کی

---

[1] ڈاکٹر ثاقب نفیس (نومبر ۲۰۰۸)، صفحات ۱۴-۱۲

[2] ڈاکٹر ثاقب نفیس (نومبر ۲۰۰۸)، صفحات ۱۵-۱۴

[3] ڈاکٹر ثاقب نفیس (اپریل ۲۰۰۸)، ص ۲۲۰

[4] ڈاکٹر ثاقب نفیس (اپریل ۲۰۰۸)، ص ۲۲۱

پرواہی نہ کی جاتی۔ نیشنل اسمبلی کے صدر ہی کو خلیفہ قرار دے دیا جاتا۔ علامہ اس تجویز کے بھی حق میں تھے کہ اگر مسلمانوں کا کوئی بین الاقوامی نظام قائم ہو جائے تو خلیفہ اُس کی رہنمائی کرے۔ ترکی کے داخلی معاملات سے اُسے کوئی سروکار نہ ہو۔ مقاماتِ مقدسہ کی حفاظت کے لیے تمام مسلم اقوام کی رائے کے مطابق اقدامات کرے۔

یکم مارچ کی صبح تھی۔ جہلم کے علاقے کا ایک راجپوت زمیندار آیا۔ گلاب نام تھا۔ ستر برس عمر تھی۔ برادری میں اثر رسوخ رکھتا تھا۔ کم پڑھا لکھا تھا لیکن اُردو فارسی سے واقف تھا۔ جوانی میں شیعہ سنی کے جھگڑے دیکھ کر عیسائی ہو گیا لیکن اسلام اور مسلمانوں کی محبت دل سے نہ گئی۔ علامہ کی تحریروں سے اور بڑھ گئی۔ اس نے بتایا کہ بعض لوگوں کے مقدمات بھی علامہ کے پاس بھیجتا رہا ہے۔ بیوی بچے سب عیسائی تھے۔ کہنے لگا، ’’عیسائی تو اب میں ہوں مگر عیسیٰ علیہ السلام کو خدا کا بیٹا نہیں مانتا۔‘‘ روایت ہے کہ علامہ نے جب سنا کہ اسلام چھوڑ کر عیسائی ہو گیا تو پہلے ذرا متعصب سے ہوئے۔ پھر کہا، ’’بابا بس پھر اگر تم عیسیٰ کو خدا یا خدا کا بیٹا نہیں مانتے تو تم مسلمان ہو۔‘‘[1]

ہندو اخبارات مسلم ریاستوں پر سخت تنقید کر رہے تھے۔ خاص طور پر حیدرآباد دکن اور بھوپال ان کے عتاب کا نشانہ بن رہی تھیں۔ مسلم اخبارات اور کشمیری کانفرنسیں ریاست جموں و کشمیر پر تنقید کر رہی تھیں۔ خواجہ حسن نظامی نے مہاراجہ کشمیر کی حمایت شروع کر دی تھی۔ محمد حسین آئے۔ اخبار کشمیری میں سے حسن نظامی والی خبر علامہ کو سنائی۔ اُن سے روایت ہے کہ علامہ نے کہا کہ ترکی، مصر، ایران اور افغانستان میں اب صحیح رہنما پیدا ہو رہے ہیں۔ مصطفیٰ کمال، زاغلول، رضا خاں اور امان اللہ خاں ہیں۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت ابھی بری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دلوں میں اسلام کے لیے کشش پیدا نہیں ہوتی۔ گلاب راجپوت کا ذکر بھی کیا۔

محمد حسین رخصت ہوئے۔ کریمی پریس گئے۔ چار بجے سردار اُمراؤ سنگھ کے ساتھ واپس آئے۔ اُنہوں نے علامہ کی ایک تصویر لی جس میں علامہ کرسی پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک اور تصویر بھی

[1] ڈاکٹر ثاقب نفیس (اپریل ۲۰۰۸)، ص ۲۲۳

لی جس میں وہ کھڑے ہوئے تھے۔[1] غالباً یہ وہی تصویر تھی جس میں علامہ کُھل کر ہنس رہے ہیں۔[2] بعد میں ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ علامہ نے امراؤسنگھ سے پوچھا کہ تھیوسوفیکل سوسائٹی سے تعلق کیوں ختم کیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ وہ ایک بڑا بھاری فراڈ ہے۔ پندرہ سولہ برس کے تجربے کے بعد بھی لوگ یوگا کو سمجھنے سے قاصر رہتے ہیں اور مسز اینی بیسنٹ نے دو تین ماہ مطالعے کے بعد بنارس میں اس پر لیکچر دے دیا۔ اُمراؤسنگھ نے اُس میں اتنی غلطیاں دیکھیں کہ اُس کی دعا ہی سے بد ظن ہو گئے۔ مسٹر لیڈ بیٹر کا قصہ اور کرشن مورتی کے واقعات نے بھی بدگمان کیا۔ تھیوسوفیکل سوسائٹی بظاہر دنیا کے تمام عقائد کے احترام کا دعویٰ کرتی ہے مگر حقیقت میں خود عقیدہ ہے۔ اس کے اپنے ابدال اور قطب وغیرہ ہیں جو خاص خاص ابواب کے ذریعے خطاب کرتے ہیں۔ مسز بیسنٹ بھی باب کی حیثیت رکھتی ہیں۔

سوال اُٹھا کہ حقیقتِ حیات کے لیے روح، محبت اور زندگی میں سے کون سا لفظ زیادہ موزوں ہے۔ علامہ نے "زندگی" پسند کیا۔[3]

10

۳ مارچ تھی۔ استنبول کا گورنر، پولیس چیف کے ساتھ باسفورس کے کنارے اُس عظیم الشان شاہی محل میں داخل ہوا جہاں خلیفہ عبدالمجید ثانی اپنے خاندان کے ساتھ قیام پذیر تھے۔ کچھ ہی دیر قبل اسمبلی نے قانون منظور کیا تھا:

۱ شرعی قوانین کا محکمہ ختم کر کے تمام عدالتی نظام ریاست کے ماتحت کیا جا رہا ہے۔
۲ علیحدہ اسلامی مدرسوں کا نظام ختم کر کے ملک میں یکساں تعلیمی نظام رائج کیا جا رہا ہے۔
۳ خلیفہ کا عہدہ ختم کیا جا رہا ہے۔ عثمانی خاندان کے تمام افراد دس روز میں ملک چھوڑ دیں۔

---

[1] ڈاکٹر ثاقب نفیس (اپریل ۲۰۰۸)، ص ۲۲۳

[2] اب یہ تصویر کافی عام ہے۔ علامہ کی زندگی میں شائع نہ ہوئی۔ روایت ہے کہ علامہ نے اس کی اشاعت منع کر دی تھی کیونکہ دانت دکھائی دے رہے تھے۔ اُس زمانے میں معیوب سمجھا جاتا تھا۔

[3] ڈاکٹر ثاقب نفیس (اپریل ۲۰۰۸)، ص ۲۲۴-۲۲۳

کچھ عرصہ پہلے ترکی کے اخبارات میں ایک خط شائع ہوا تھا۔ ہز ہائی نس آغا خاں اور سید امیر علی نے لندن سے ترکی کے وزیر اعظم عصمت پاشا کے نام لکھا تھا۔ درخواست کی تھی کہ خلیفہ دنیا بھر کے سنّی مسلمانوں کے لیے امام کا درجہ رکھتا ہے۔ اُس کے اختیارات بحال کیے جائیں۔ اس خط کی اشاعت کے بعد ترک حکومت نے خلیفہ سے پیچھا چھڑانا ضروری سمجھا۔

عبدالمجید کا نیا لقب اب رئیسِ خاندانِ عثمانیہ تھا۔ محل کا محاصرہ ہو چکا تھا۔ ٹیلی فون کے تار کاٹ دیئے گئے تھے۔ اُن کے لیے دس روز کی مہلت نہ تھی، فوراً سامان باندھنا تھا۔ چار میں سے دو بیویوں، ایک بیٹے، ایک بیٹی اور چند ملازموں کے ساتھ ۴/ مارچ کو صبح پانچ بجے روانہ ہوئے۔ گاڑیاں حکومت نے بھیجی تھیں۔ شتلجہ لے گئیں۔

اورینٹ ایکسپریس مشہور ریل گاڑی تھی۔ ترکی سے چل کر یورپ میں سے گزرتی تھی۔ یورپی سیاست کی بڑی بڑی ہستیوں نے اس پر سفر کیا تھا۔ ۴/ اور ۵/ مارچ کی درمیانی رات بارہ بجے وہ شتلجہ کے اسٹیشن پر پہنچی تو اُس میں ایک خصوصی ڈبہ بھی لگا ہوا تھا۔ اُس میں سے استنبول کا گورنر اُترا۔ ایک لفافہ عبدالمجید ثانی کے حوالے کیا۔ اُس میں سفر خرچ کے دو ہزار برطانوی پونڈ موجود تھے۔ ریل گاڑی یورپ کی طرف روانہ ہو گئی۔ عبدالمجید بھی ساتھیوں سمیت اس میں تھے۔[1]

11

محمد حسین کی عرضی دفتر میں کسی نے گم کر دی تھی۔ ۵/ مارچ کی شام پانچ چھ بجے کے قریب علامہ کے پاس آئے۔ انہوں نے عرضی کے بارے میں استفسار کیا۔ محمد حسین نے بتایا۔ ان کا کہنا ہے کہ علامہ ذرا بگڑے کہ دوسری عرضی لکھ کر علامہ سے اس پر دستخط کروا لیتے۔

علیگڑھ کے کسی طالب علم کا خط آیا تھا۔ 'شمع و شاعر' کے ایک شعر کا مطلب پوچھا تھا۔ علامہ نے محمد حسین سے کہا کہ جواب لکھ دیں۔ انسان کے بچے کی فطرت کے بارے میں گفتگو شروع ہو گئی۔ علامہ نے کہا کہ حسِ لامسہ یعنی چھونے کی حس پیدائش سے پہلے رحمِ مادر میں بھی اپنا کام کرتی ہے۔

[1] Andrew Mango (2000). *Ataturk,* pp.404-406

پیدایش کے بعد سب سے پہلے حسِ سامعہ یعنی سننے کی حِس ترقی کرتی ہے۔ بچہ آواز کو سنتا ہے۔ خود بھی آواز نکالنا اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لیے روتا ہے۔ دروازے کی زنجیر وغیرہ ہلا کر بچے کی آواز کو زنجیر کی آواز میں گم کر دیا جائے تو بچہ خاموش ہو جاتا ہے۔ حسِ باصرہ یعنی دیکھنے کی حس بھی ابتدائی دنوں ہی میں ترقی کرنے لگتی ہے۔ شعور کا ارتقا انہی سے شروع ہوتا ہے۔ محمد حسین نے 'عہدِ طفلی' کا مصرعہ پڑھا: "شورشِ زنجیرِ در میں لطف آتا تھا مجھے"۔ سمجھ گئے کہ نظم کے دونوں بندوں کی شرح انہیں بتائی جا رہی ہے۔[1] دو روز بعد بھی محمد حسین نے ڈائری لکھی۔ پھر علامہ سے ملاقاتوں کا احوال لکھنا بند کر دیا۔[2]

خیال ہے کہ پیامِ مشرق کا دوسرا ایڈیشن مارچ کے پہلے ہفتے میں منظرِ عام پر آیا۔

پیامِ مشرق

اشاعتِ دوم

دوسری اشاعت میں متعدد نظموں، غزلوں اور رباعیات کا اضافہ ہے۔ بعض بعض جگہ لفظی ترمیم بھی ہے۔ کتاب کی ترتیب بحیثیتِ مجموعی وہی ہے، جو پہلے تھی۔

اقبال

فہرستِ مضامین کا اضافہ ہوا تھا۔ دوسری ترمیمات اور اضافے کچھ یوں تھے:

- 'دیباچہ' میں ایک آدھ لفظ تبدیل کیا گیا۔
- 'پیشکش' میں کوئی تبدیلی نہ ہوئی۔
- 'لالۂ طور' میں اب ۱۶۴ ٹکڑے شامل تھے۔ طبعِ اول کے نمبر ۲۴، ۱۳۰ اور ۱۲۲ نکال

---

[1] ڈاکٹر ثاقب نفیس (اپریل ۲۰۰۸)، ص ۲۲۶-۲۲۵

[2] ڈاکٹر ثاقب نفیس (اپریل ۲۰۰۸)، ص ۹

دیئے گئے تھے۔ کئی مصرعوں کی ترتیب بدلی گئی۔ نمبروں کی ترتیب میں فرق آیا۔ نئے ٹکڑوں کے پہلے مصرعے تھے: تہی از ہاے وہو میخانہ بودے؛رہے در سینۂ انجم کشائی؛بروں ازورطۂ بود وعدم شو؛بپاے خود مزن زنجیرِ تقدیر؛بہ پہنائے ازل پر می کشودم؛خرد کرپاس را زرینہ سازد؛ مشو نومید ازیں مشتِ غبارے؛ جہانِ رنگ و بو فہمیدنی ہست؛ تو می گوئی کہ من ہستم خدا نیست؛بساطم خالی از مرغِ کباب است؛ بحرف اندر نگیری لامکاں را؛ بہر دل عشق رنگِ تازہ بر کرد؛ہنوز از بندِ آب و گِل نرستی۔

- 'افکار' میں سے نظم 'لسان العصر اکبرؔ مرحوم' خارج کر دی گئی۔ کئی نظموں میں سے کچھ مصرعے نکال دیئے۔ بعض نظموں کی جگہ بدلی گئی۔ نئی نظمیں بھی شامل تھیں: سرودِ انجم؛ نسیمِ صبح؛پندِ باز با بچۂ خویش؛کرمِ کتابی؛ کبروناز؛کرمکِ شب تاب؛حُدی؛قطرۂ آب؛تنہائی؛ عشق؛حور و شاعر؛جوئے آب۔
- 'مےِ باقی' میں بعض غزلوں کی ترتیب بدلی گئی تھی۔ نئی غزلیات شامل تھیں:سوزِ سخن زنالۂ مستانۂ دل است؛ سطوت از کوہ ستانند و بکاہے بخشند؛نہ تُو اندر حرم گنجی نہ در بتخانہ می آیی؛ مثلِ آئینہ مشو محوِ جمالِ دگراں؛ جہانِ عشق نہ میری نہ سروری داند؛خواجہ ی نیست کہ چوں بندہ پرستارش نیست؛ بیا کہ بلبلِ شوریدہ نغمہ پرداز است؛ خاکیم و تند سیر مثالِ ستارہ ایم؛عرب از سرشکِ خونم ہمہ لالہ زار بادا؛ نظرِ تو ہمہ تقصیر و خرد کوتاہی؛ سرخوش از بادۂ تو خم شکنی نیست کہ نیست؛اگرچہ زیبِ سرش افسروکلاہے نیست؛شعلہ در آغوش دارد عشقِ بے پروائے من؛بتانِ تازہ تراشیدہ ای دریغ از تو۔
- 'نقشِ فرنگ' کی کچھ نظموں میں ترمیم ہوئی۔ایک نظم 'آزادئ بحر' کااضافہ ہوا۔پہلے اڈیشن میں 'خُردہ' میں بلاعنوان شامل تھی۔
- 'خُردہ' میں کوئی اضافہ نہ تھا۔ایک ٹکڑا حذف کرکے 'نقشِ فرنگ' میں شامل کیا گیا تھا۔[1]

[1] رفیع الدین ہاشمی (۲۰۰۱)، ص ۱۳۳

اس برس فرانسیسی مصنف آندرے سروئیر نے لکھا کہ ترکوں پر اسلام کا اثر کم ہے۔ فرانس کو چاہیے کہ عربوں کے بجائے انہیں دوست بنائے۔[1] علامہ کے نزدیک اس بات کو یوں کہنا بہتر تھا کہ ترک اسلامی دنیا میں استحکام کا عنصر (the element of stability) ہیں۔[2] ۸ر مارچ کو برطانوی ہفت روزہ اکنامسٹ نے مضمون 'خلافت کی معزولی' ('The Abolition of the Caliphate') شائع کیا:

۱ ۱۹۲۲ء تک خلیفہ کے پاس دنیاوی اقتدار بھی تھا۔ پھر اُسے صرف روحانی سربراہ بنا دیا گیا۔

۲ خلیفہ کی معزولی مکمل طور پر مغربی سیاسی افکار کا نتیجہ تھی۔

۳ خلیفہ کی معزولی پر مصر، ایران اور افغانستان وغیرہ کو تکلیف نہیں جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ جہاں اقلیت میں ہیں، جیسے ہندوستان، وہاں فکر مند ہیں کہ عالمگیر ملتِ اسلامیہ کا وجود ختم ہونے پر وہ اپنے اپنے ملک کی غیر مسلم قوموں میں ضم ہو جائیں گے۔[3]

اکنامسٹ کی پہلی بات ترک اسمبلی کے موقف کے برعکس تھی۔ اسمبلی کی قرارداد کے مطابق اُس نے خلیفہ کو اقتدار سے محروم نہ کیا بلکہ خلیفہ پہلے ہی دستبردار ہو چکا تھا۔ اُس نے اقتدار غیر ملکی طاقتوں کے سپرد کیا تھا۔ دوسری بات متنازعہ تھی۔ ترک اسمبلی کے نزدیک خلیفہ کی معزولی اسلام کی روح کے عین مطابق تھی۔ وزیرِ اعظم عصمت پاشا واضح کر چکے تھے۔ غازی مصطفی کمال پاشا نے بھی ابھی تک اپنی تمام اصلاحات کی بنیاد اسلام کو قرار دیا تھا۔ تیسری بات میں بحث کی گنجایش نہ تھی۔ بمبئی سے مرکزی خلافت کمیٹی نے ترک حکومت کو تار بھیجے تھے۔ یورپی ذرائع ابلاغ پر بھروسہ نہ تھا اس لیے ترکی سے تصدیق چاہتے تھے۔ ۱۰ر مارچ کو غازی پاشا کی طرف سے تار موصول ہوا:

> گرینڈ نیشنل اسمبلی ترکی نے جو قانون منظور کیا ہے وہ حسبِ ذیل ہے: (۱) خلیفہ کو معزول کر دیا گیا ہے۔ (۲) خلافت کی روح چونکہ حکومت اور جمہوریہ میں موجود ہے اس لیے یہ منصب موقوف کیا گیا۔ ترک جموریہ میں خلافت کا علیحدہ منصب ترکی کے

---

[1] Servier (1924), *Islam and the Psychology of the Musulman,* p.267

[2] Iqbal (1934); Sheikh (2003)

[3] Anonymous (1924) 'The Abolition of the Caliphate'

خارجی اور داخلی اتحاد میں خلل ڈال رہا تھا۔ ایک اور پہلو سے منصبِ خلافت کا تصوّر جسے مدتوں اس لیے محفوظ رکھا گیا کہ دنیا میں ایک متحدہ مسلم حکومت کی بنا اُستوار کی جا سکے، کبھی حقیقت نہیں بن سکا بلکہ اس کے برعکس یہ مسلمانوں میں چپقلش اور دوغلے پن کا مستقل سبب رہا ہے۔ جبکہ حقیقی مفادات اِس اصول کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ بزمِ معاشرت اپنے آپ کو خودمختار حکومتوں کی صورت میں ترتیب دے۔ مسلم اقوام کے درمیان روحانی اور حقیقی رشتے کی آگہی اِس آیۂ مقدسہ کی اہمیت تسلیم کرنے میں ہے کہ انماالمومنون اخوۃ [بیشک تمام مومن آپس میں بھائی ہیں]۔ [1]

لاہور میں اُس روز ہائی کورٹ نے کسی امام دین کی اپیل جزوی طور پر خارج کر دی۔ اُس کی پیروی نیاز محمد اور رام چند من چندرا کر رہے تھے۔ اپیل محمد دین اور بعض دوسروں کے خلاف تھی۔ اُن کا دفاع علامہ کر رہے تھے۔ سماعت جسٹس عبدالرؤف اور جسٹس ہیری سن نے کی تھی۔ [2]

اُردو مجموعہ کلام کی ترتیب مکمل ہو چکی تھی۔ مسودہ کاتب کے حوالے کر دیا گیا۔ [3]

خلافت کانفرنس اور جمعیت العلمائے نے ترک اسمبلی سے درخواست کی کہ اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرے۔ شریفِ مکہ نے اپنی خلافت کا اعلان کیا۔ معزول خلیفہ عبدالمجید نے اپنی بحالی کے لیے مسلمانوں سے مدد مانگی۔ یورپی طاقتوں کی طرف سے مسلمانوں کو سمجھایا جا رہا تھا کہ تُرک اسلام سے دُور ہو گئے ہیں۔ خلافت کانفرنس اور جمعیت العلمائے نے، جن میں علی برادران، مفتی کفایت اللہ اور مولانا حسین احمد مدنی پیش پیش تھے، مسلمانوں سے کہا کہ انگریزوں کی ہمدردی کے جال میں نہ آئیں۔ [4] آزمایش کا لمحہ ہے۔ استقامت کی ضرورت ہے۔

علامہ ۱۹۰۸ء ہی میں لکھ چکے تھے کہ ملّتِ اسلامیہ کا ایک حکومت کے تحت ہونا لازمی نہیں

---

[1] Mitra: *The Indian Quarterly Register Jan.-Mar. 1924*, p.89

[2] ظفر علی راجا ایڈووکیٹ (۲۰۱۳) قانون دان اقبال، ص ۱۲۳

[3] اختر النسا (۲۰۱۰ء) اقبال اور زمیندار، ص ۹۶-۹۵

[4] Mitra: *The Indian Quarterly Register Jan.-Mar. 1924*, pp.89-96(b)

ہے۔ گزشتہ برس مقالے کا ترجمہ خلافتِ اسلامیہ کے عنوان سے شائع ہو چکا تھا۔ بعد میں یہ بھی کہا کہ ترک اسمبلی کا اجتہاد درست ہے۔ منصبِ خلافت کے لیے فردِ واحد ضروری نہیں۔ منتخب پارلیمنٹ کو تفویض کیا جا سکتا ہے۔[1]

13

سردار بیگم ناک میں زیور پہنتی تھیں۔ روایت ہے کہ میاں جی نے کہا، "ناک کا زیور اُتارے گی تو بچہ ہو گا۔" اُنہوں نے اُسی وقت اُتار دیا۔[2] نوجوان فقیر سید وحید الدین نے بعد میں لکھا کہ ایک شام علامہ نے دیکھا کہ سردار بیگم طوطے کے بچے کو پاس بٹھا کر بڑی شفقت سے پھل کھلا رہی ہیں۔ علامہ کی زبان سے نکلا، "الٰہی! اس خاتون میں مادرانہ شفقت پیدا ہو چکی ہے۔ اب اسے اولاد بھی عطا فرما۔"[3]

سردار بیگم اور مختار بیگم ایک ساتھ اُمید سے ہوئیں۔ وسیمہ مبارک کے مطابق آپس میں عہد کیا کہ ایک دوسرے کے بچے کو حقیقی اولاد کی طرح پرورش کریں گی۔[4]

14

۷ا/مارچ تھی۔ لاہور ہائی کورٹ نے سرکار کے خلاف کسی رنگا رام کی اپیل خارج کر دی۔ اُس کی پیروی علامہ کر رہے تھے۔ سرکار کی وکالت پبلک پراسیکیوٹر نے کی تھی۔ سماعت جسٹس اسکاٹ اسمتھ اور جسٹس ایف فورڈ نے کی تھی۔[5]

امکان ہے کہ ۱۹/مارچ سے پہلے علامہ دہلی گئے۔ وائسرائے کے ہاں تمغے عطا کرنے کی تقریب تھی۔ ۲۵/مارچ کے بعد کسی روز واپس آئے۔ مہینے کے اواخر میں سیالکوٹ گئے۔ بھتیجے شیخ عطا محمد کی

---

[1] Iqbal (1934), p.149

[2] خالد نظیر صوفی اقبال درونِ خانہ، ص ۳۵۔ وسیمہ مبارک کی روایت ہے۔

[3] فقیر سید وحید الدین (۱۹۸۸) روزگارِ فقیر اول، ص ۵۲-۵۱

[4] خالد نظیر صوفی اقبال درونِ خانہ، ص ۳۶-۳۵۔ وسیمہ مبارک کی روایت ہے۔

[5] ظفر علی راجا ایڈووکیٹ (۲۰۱۳) قانون دان اقبال، ص ۱۲۲

شادی کی تقریب تھی۔[1] شادی امرتسر کے ایک معزز گھرانے میں ہوئی۔ دلہن کا نام چاند تھا۔[2]

15

گزشتہ برس یکم اپریل سے اس برس ۳۱/مارچ تک علامہ کی تشخیص شدہ آمدنی ۱۳۶۰۸/روپے تھی۔ یونیورسٹیوں سے ۲۲۷۶، اور وکالت سے ۲۶۰ ۷/کی آمدنی شامل تھی۔ کتابوں کی فروخت سے ۳۸۰۰/روپے آمدنی اور ۲۷۰۰/روپے رائلٹی حاصل ہوئی تھی۔ ۷۶۳/روپے ٹیکس لگا۔[3]

اس برس پنجاب یونیورسٹی کے جو پرچے جانچ رہے تھے، یہ تھے: ایل ایل بی (دوسرا پرچہ)، ایم اے (فلسفہ پہلا پرچہ)، بی اے آنرز (فلسفہ پہلا پرچہ)، ایم اے (فلسفہ چوتھا پرچہ) اور ایم اے (فارسی دوسرا پرچہ)۔[4]

16

یوسف سلیم چشتی مشن کالج لاہور میں پڑھتے تھے۔ فلسفہ سے رغبت رکھتے تھے۔ مولانا محمد حسین آزادؔ کے پوتے آغا طاہر نے پیامِ مشرق دی۔ ابھی تک علامہ کے کلام پر توجہ نہ دی تھی۔ پیامِ مشرق میں مغربی فلسفیوں پر تنقید دیکھ کر متاثر ہوئے۔ فقیر سید وحید الدین نے ان سے روایت کی ہے کہ مارچ یا اپریل ۱۹۲۴ء میں علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ دوست عبدالحمید بھی ساتھ تھے۔ مشن ہائی اسکول رنگ محل میں فارسی پڑھاتے تھے۔ یوسف سے روایت ہے کہ حقے کی چلم کے لیے "ٹوپی" کا لفظ پہلی دفعہ علامہ ہی کی زبان سے سنا۔ ملاقات کا مقصد بیان کیا کہ فلسفیوں نے خدا کے وجود کے جو

---

[1] ڈاکٹر ثاقب نفیس (اپریل ۲۰۰۸)، ص ۲۲۰-۲۱۱

[2] خالد نظیر صوفی، اقبال درونِ خانہ جلد دوم، ص ۹۸

[3] صفدر محمود (۱۹۷۳)، 'علامہ اقبال کا گوشوارۂ آمدنی'

[4] ڈاکٹر حسن اختر ملک، اقبال، ایک تحقیقی مطالعہ، ص ۱۳۱۔ ان کے مطابق علامہ کا ایل ایل بی کا ممتحن ہونا پنجاب گزٹ حصہ سوم ۲۲ فروری ۱۹۲۴ء ص ۵۶؛ ایم اے فلسفہ پہلا پرچہ ۲۵ اپریل ۱۹۲۴ء ص ۱۷۱؛ بی اے آنرز اور ایم اے فلسفہ چوتھا پرچہ ۱۳ جون ۱۹۲۴ء ص ۲۳۳؛ اور ایم اے فارسہ دوسرا پرچہ ۱۳ جون ۱۹۲۴ء ص ۲۲۴ پر چھپا۔

دلائل پیش کیے تھے وہ کانٹ نے رد کر دیئے۔ اب ذاتِ واجب کا اثبات کیسے کیا جائے؟

"علامہ نے میرے اس سوال کا جو جواب دیا، سچ تو یہ ہے کہ اُس نے میری زندگی میں ایک بہت بڑا ذہنی انقلاب برپا کر دیا،" یوسف سے روایت ہے۔ "انہوں نے فرمایا عقلی دلائل کی مدد سے واجب الوجود کا اثبات نہیں ہو سکتا۔ اس کے اثبات کا طریقہ باطنی مشاہدہ یا مذہبی تجربہ ہے، خدا شناسی کا ذریعہ خرد نہیں، عشق ہے، جسے فلسفہ کی اصطلاح میں وجدان کہتے ہیں۔"[1]

اُن کا بیان ہے کہ چند ملاقاتوں کے بعد علامہ نے انہیں برگساں کے مطالعہ کا مشورہ دیا۔ یہ بھی کہا کہ قرآنِ کریم کو فلسفے کے مسائل کے زاویے سے نہیں بلکہ اس زاویۂ نگاہ سے پڑھا جائے کہ اللہ تعالیٰ سے میرا رشتہ کیا ہے اور کائنات میں میرا کیا مقام ہے۔[2]

چودھری محمد حسین نے سردار جوگندر سنگھ کے لیے کچھ مسودات ٹائپ کروائے۔ پھر لاہور میں طاعون کا زور ہو گیا۔ صرف مارچ میں ہلاک ہونے والوں کی تعداد قریباً ۲۹ ہزار بتائی گئی۔ اپریل میں بڑھنے کا امکان تھا۔ علامہ اہل و عیال سمیت لدھیانہ چلے گئے۔ مختار بیگم کا میکہ تھا۔[3] امکان ہے کہ علامہ نے لدھیانہ کے بعض شرفأ اور علمائے کرام کے ساتھ اسلام میں اجماع کے موضوع پر گفتگو کی۔ مدرسۂ اہلِ حدیث کے مولوی محمد امین لدھیانوی علمِ معقولات میں ٹھوس قابلیت رکھتے تھے۔ علامہ کے کہنے پر عبداللہ چغتائی انہیں لائے۔[4]

نواب ذوالفقار غالباً اپنے لڑکوں اور چودھری محمد حسین کے ساتھ شملہ چلے گئے تھے۔ اُن کے خط سے معلوم ہوا کہ محمد حسین کی والدہ بیمار تھیں۔ وہ پسرور کے قریب اپنے گاؤں پہاڑنگ چلے

---

[1] فقیر سید وحید الدین (۱۹۸۸) روزگارِ فقیر، جلد اول، ص ۱۰۵

[2] ایضاً ص ۱۷۹-۱۷۸

[3] مکتوب بنام نیاز الدین خاں ۲۲/ اپریل ۱۹۲۴ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۴۱۷

[4] عبداللہ چغتائی (۱۹۷۷) اقبال کی صحبت میں، ص ۳۰۲-۳۰۱؛ چغتائی کے مطابق علامہ نے واپسی کے بعد گرمی کی چھٹیوں میں اجتہاد کے موضوع پر مقالہ تحریر کیا۔ اس لیے چغتائی کی یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی کہ یہ گفتگوئیں مختار بیگم کی وفات کے بعد ہوئیں۔ وہ سانحہ گرمی کی چھٹیوں کے بعد پیش آیا (دیکھیے اکتوبر ۱۹۲۴ء کے واقعات)۔

گئے۔[1] نیازالدین خاں کا خط ملا۔ بو علی قلندر جن کی مثنوی کی پیروی میں علامہ نے 'اسرارِ خودی' لکھی تھی اور اُس میں اُن کے ایک واقعے کو نظم کیا تھا، اُن کے بارے میں نیازالدین خاں نے خط میں کوئی بات لکھی تھی جس کے جواب میں ۲۲/ اپریل کو علامہ نے لکھا، "قلندر صاحب بڑے پائے کے بزرگ تھے۔ اُن کے عرس پر روپیا صرف کرنا اور مسکینوں کو کھانا کھلانا بڑی برکت کا باعث ہے۔"[2]

محمد حسین کا خط ملا۔ والدہ کی طبیعت بہتر تھی۔ ۲۴/ اپریل کو علامہ نے لکھا کہ جوگندر سنگھ کے لیے ٹائپ کیے ہوئے مسودے انہیں اور کاپی علامہ کو بھجوا دیں، "میں کل لاہور جاتا ہوں۔ اب بارش کا زور کم ہو رہا ہے۔"[3] اگلے روز واپس لاہور چلے آئے۔[4] ممکن ہے کہ جلد ہی اجتہاد کے موضوع پر مقالہ لکھنا شروع کر دیا ہو۔[5]

17

لاہور میں طاعون کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ گرمی بھی کم تھی۔ نواب ذوالفقار واپس نہیں آئے تھے۔ چودھری محمد حسین گاؤں گئے ہوئے تھے۔ جاننے والوں میں کوئی جمیل تھے۔ ۳۰/ اپریل کو اُنہوں نے علامہ سے محمد حسین کے بارے میں پوچھا۔ یکم مئی کو ڈاکٹر عبدالرحمٰن سے گفتگو ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ اب بہت کم کیس ہوتے ہیں۔ شہر میں وہ بے چینی نہیں ہے۔

عالمِ اسلام کی بیداری کے حوالے سے بعض سوالات علامہ کے ذہن میں آ رہے تھے۔ اُس روز سلیمان ندوی کو لکھا، "کیا روسی مسلمانوں میں ابن تیمیہ اور محمد ابن عبدالوہاب نجدی کے حالات کی اشاعت ہوئی؟... مفتی عالم جان جن کا حال میں انتقال ہو گیا ہے، ان کی تحریک کی اصل غایت کیا

---

[1] مکتوب بنام محمد حسین ۲۴/ اپریل ۱۹۲۴ء؛ ثاقب نفیس (۲۰۰۴) مکتوباتِ اقبال، ص ۲۰

[2] ایضاً

[3] مکتوب بنام محمد حسین ۲۴/ اپریل ۱۹۲۴ء؛ ثاقب نفیس (۲۰۰۴) مکتوباتِ اقبال، ص ۲۰

[4] مکتوب بنام محمد حسین ۲/ مئی ۱۹۲۴ء؛ ثاقب نفیس (۲۰۰۴) مکتوباتِ اقبال، ص ۲۱

[5] عبداللہ چغتائی محولہ بالا کے مطابق مقالہ لدھیانہ سے واپسی کے بعد گرمیوں کی چھٹیوں میں تحریر ہوا۔ مکتوبات بنام محمد حسین ۲۰/ جولائی اور ۳/ اگست میں کسی نامکمل مضمون کا ذکر ہے جسے ٹائپ کروانے کے لیے محمد حسین کو دیا تھا۔

تھی؟ کیا یہ محض تعلیمی تحریک تھی یا اس کا مقصود ایک مذہبی انقلاب بھی تھا؟"[1]

اگلے روز بادل چھائے۔ چودھری محمد حسین کا خط ملا۔ انہیں شاید علامہ کا پچھلا خط نہیں ملا تھا۔ علامہ نے جواب لکھا۔[2]

اورینٹل کالج کے پروفیسر محمد شفیع کچھ برس پہلے کیمبرج سے ڈگری لائے تھے۔ غالباً ان کے کسی عزیز کو سفارش درکار تھی۔ علامہ سمجھتے تھے کہ اس سے فائدہ نہیں ہوتا۔ حکام کا اپنا طریقِ کار ہوتا ہے۔ بہرحال سفارش کر دی۔ کچھ حاصل نہ ہوا۔[3]

18

سرہند میں شیخ احمد سرہندی کا مزار تھا۔ مجدد الف ثانی کے لقب سے مشہور تھے۔ روایت ہے کہ اس برس گرمیوں میں علامہ وہاں گئے۔ دعا مانگی کہ اگر خدا اولادِ نرینہ سے نوازے تو اُسے احیائے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت انجام دینے کی توفیق بھی عطا کرے جس طرح مجدد کو عطا کی تھی۔[4]

19

۱۹ر مئی کو انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کا اجلاس ہوا۔ علامہ کا جنرل سکرٹری شپ سے استعفا پھر زیرِ غور آیا۔ ملک برکت علی نے کہا کہ استعفا منظور کیا جائے۔ پھر بھی کسی نہ کسی صورت میں علامہ کا انجمن سے منسلک رہنا انجمن کے حق میں مفید ہے۔ انہیں صدر بنایا جائے۔ ان کی قابلیتوں اور احترام کی وجہ سے پبلک کی نگاہ میں ان کا صدر ہونا اُن کے سکرٹری رہنے سے زیادہ مفید ہو گا۔[5]

۲۳ر مئی کو لاہور میں مسلم لیگی رہنماؤں کی آمد ہوئی۔ محمد علی جناح، مولانا محمد علی [جوہرؔ]، رضا

---

[1] مکتوب بنام سلیمان ندوی یکم مئی ۱۹۲۴ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۱۸-۵۱۷

[2] مکتوب بنام محمد حسین ۲ر مئی ۱۹۲۴ء؛ ثاقب نفیس (۲۰۰۴) مکتوباتِ اقبال، ص ۲۱

[3] مکتوب بنام پروفیسر محمد شفیع، ۲ر مئی ۱۹۲۴ء (انگریزی)؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۱۹

[4] جاوید اقبال (۲۰۰۴)، زندہ رود، ص ۳۴۴۔ فقیر وحید الدین نے لکھا کہ جاوید کی ولادت سے پانچ چھ برس پہلے علامہ نے مجدد کی قبر پر دعا مانگی کہ بیٹا ہو، جسے "اپنی زندگی میں اعلیٰ تعلیم دے سکیں"؛ وحید الدین (۱۹۸۸)، ص ۵۲-۵۱

[5] انجمن کی قلمی روداد؛ محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶)، اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص ۶۵، ۱۷۸

علی، ڈاکٹر انصاری، شعیب قریشی، مولانا ابوالکلام آزاد، شیخ مشیر حسین قدوائی، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، ڈاکٹر ضیاؑ الدین احمد، مولوی محمد یعقوب، چودھری خلیق الزماں، بیرسٹر ظہور احمد، آصف علی، معظم علی، ابوالقاسم اور مولوی سید مباضا شامل تھے۔ میر غلام بھیک نیرنگ نے علامہ کے گھر قیام کیا۔

۲۵-۲۴ر مئی کو گلوب تھیٹر میں لیگ کا اجلاس ہوا۔ پچھلے برس لکھنؤ میں ادھورا رہ جانے والے اجلاس کی تکمیل ہو رہی تھی۔ اجلاس کے صدر میر غلام محمد بھرگری وفات پا چکے تھے۔ لیگ کے صدر جناح نے اجلاس کی صدارت بھی کی۔ مقامی شرکأ میں میاں فضل حسین، سر شاہنوز، بیگم جہان آرا شاہنواز، ملک فیروز خاں نون، شیخ عبدالقادر، خلیفہ شجاع الدین اور پیر تاج الدین شامل تھے۔ مجلس خلافت کے "احرار" میں سے افضل حق نمایاں تھے۔ جماعت احمدیہ کے افراد میں ڈاکٹر مرزا محمد یعقوب بیگ نمایاں تھے۔ ہندو مہمانوں میں رائے صاحب ہنس راج، ڈاکٹر ستیاپال، لالہ گوردھن داس اور لالہ دُونی چند شامل تھے۔ کانگریس سے تعلق رکھتے تھے۔ بعض رہنماؤں نے شریک نہ ہوسکنے پر معذرت کے پیغامات بھیجے تھے۔ ان میں گاندھی، پنڈت مدن موہن مالوی، راجہ صاحب محمود آباد، حاجی عبداللہ ہارون، حکیم اجمل خاں اور ظہور احمد شامل تھے۔ استقبالیہ کمیٹی کے صدر آغا محمد صفدر تھے۔ اُن کے موضوعات میں خلافت کا مسئلہ بھی تھا:

> غازی مصطفی کمال پاشا کے شاہزادہ عبدالمجید کو ملک بدر کر دینے اور آیندہ مرکزِ خلافت کا کوئی خاطر خواہ فیصلہ نہ کرنے سے طبیعتوں میں ایک ہیجان ہے۔ اور مشکل اور مصیبت کے وقت صبر و صلٰوۃ کی استعانت کے بجائے جوش اور غصے کو جگہ دی جارہی ہے۔ کوئی ترکی قوم کو برا بھلا کہتا ہے۔ کوئی غازی مصطفی کمال کی تصویر اُتار پھینکتا ہے۔ اور کوئی کارکنانِ مجلسِ خلافت کو گالیاں دے کر جی ٹھنڈا کر لیتا ہے۔ مختصراً یہ حالات ہیں جن کے باعث اس وقت مسلمانوں کو ایک جگہ جمع ہو کر ان مشکلات کا حل کرنا ہے کہ مسلمانوں کے تعلقات دوسری ہمسایہ قوموں کے ساتھ کیا ہوں۔ مسئلہ خلافت کے متعلق کیا کیا جائے۔ اور مسلمانوں کے باہم انتشار اور تنزل کا کیا علاج ہو۔

جناح نے کہا کہ خطبۂ صدارت پیش نہیں کریں گے۔ صرف بعض تازہ واقعات پر تبصرہ ضروری ہے۔

خلافت کے مسئلے پر کوئی فوری تجویز پیش نہیں کی جا سکتی۔ مسلمانوں کی بین الاقوامی کانفرنس کی کوشش کی جا رہی ہے۔ اُمید ہے کہ وہاں یہ پیچیدہ سوال حل کیا جائے۔ لیگ کو تمام ہندوستان میں از سرِ نو زندہ کرنے کی تجویز پیش کی جا رہی ہے۔ ہندوستان میں ہندو اور مسلم ملتیں جس دن متحد ہو گئیں، سوراج حاصل ہو جائے گا:

> I am almost inclined to say that India will get Dominion Responsible Government the day the Hindus and Mohammedans are united. Swaraj is an almost interchangeable term with Hindu-Muslim unity.

میاں فضل حسین نے میثاقِ لکھنؤ کے حوالے سے کہا، ''مسلمانوں نے ہندوستان کی آزادی کے لئے... اپنی اکثریت کو اقلیت میں بدل لیا۔ کیا کوئی دوسری قوم اِس ایثار کی مثال پیش کر سکتی ہے؟''

چودہ قراردادیں منظور ہوئیں۔ ایک نئی حکمتِ عملی کی مظہر تھیں۔ موجودہ دستورِ ہند ۱۹۱۹ء کی اصلاحات پر مبنی تھا۔ افسر شاہی منتخب نمایندوں کو جواب دہ نہ تھی۔ دونوں اپنی اپنی جگہ قائم رہتے تھے۔ اسے دوعملی (diarchy) کہتے تھے۔ لیگ نے طے کیا کہ یہ غیر موزوں ثابت ہو چکا ہے۔ کوئی ترمیم کافی نہ ہو گی۔ نئے دستور کی ضرورت ہے۔ اُس کی بنیاد سوراج کے اصول پر مبنی ہو۔ یعنی ہندوستان کا فیصلہ یہاں کے عوام کے ہاتھ میں ہو۔ لیگ نے ایک کمیٹی تشکیل دی کہ کانگریس، سوراج پارٹی اور مجلسِ خلافت کے ساتھ مل کر ہندوستان کے لیے دستور بنائے۔

آیندہ دستور کے لیے بعض نکات پر زور دیا گیا۔ انہیں یوں بیان کیا جا سکتا تھا:

۱ طرزِ حکومت وفاقی ہو۔ زیادہ سے زیادہ اختیارات صوبوں کے پاس ہوں۔

۲ صوبوں کی موجودہ سرحدوں میں کوئی بھی تبدیلی کرتے ہوئے خیال رکھا جائے کہ پنجاب، بنگال اور صوبۂ سرحد میں مسلمانوں کی اکثریت برقرار رہے۔

۳ قانون ساز نیز دیگر تمام منتخب اداروں میں صوبے کی اقلیتوں کی موثر نمایندگی ہو۔ مگر صوبے میں جس ملت کی اکثریت ہو، وہ اکثریت برقرار رہے۔

۴ اگر کسی ملت کے نمایندوں کے مطابق کسی مجوزہ قانون سے کوئی ملت متاثر ہوتی ہے تو قانون

کی منظوری اُس ملت کے کم سے کم تین چوتھائی نمایندوں کی رضامندی کے بغیر نہ ہو۔

۵ مسلمانوں کے لیے جداگانہ نیابت برقرار رکھی جائے جیسی کہ اس وقت ہے۔ یہ تجویز مناسب نہیں ہے کہ صرف نشستوں کی تعداد مقرر ہو مگر طریقِ انتخاب مخلوط ہو۔ یہ طریقہ نہ صرف مختلف ملتوں کی مناسب نمایندگی کے لیے بیکار ہے بلکہ یہ ملتوں کے درمیان مزید نااتفاقی کا سبب بھی بن جائے گا۔

۶ صوبہ سرحد میں باقی صوبوں کے برابر اصلاحت نافذ کی جائیں۔

۷ تمام ملتوں کو مکمل مذہبی آزادی حاصل ہو۔ مذہبی آزادی سے عقیدے، عبادت، رسومات اور تہوار، تبلیغ، جماعت سازی اور تعلیم کی آزادی مراد ہے۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اتحاد پر خاص زور تھا۔ اس کے لیے تمام عوامی ادارے کوشش کریں۔ ہر ضلع میں تمام ملتوں پر مبنی مصالحتی بوڑ قائم ہو۔ سب ایک صوبائی بورڈ کے ماتحت ہوں۔

ملک بھر کے مزدوروں اور کسانوں کی اقتصادی اور سیاسی صورت حال کو بہتر بنانے کی اہمیت محسوس کی گئی۔ طے پایا کہ اس مقصد کے لیے اُن کی تنظیم کی جائے۔ کانگریس کمیٹی نے اس کے لیے بعض خطوط کی نشاندہی کر رکھی تھی۔ اُن کے مطابق کام کیا جائے۔

مسلمانوں کے انتشار پر تشویش ظاہر کی گئی۔ سیاسی، سماجی اور اقتصادی ترقی کے ذریعے ان کے درمیان اخوت کو یقینی بنایا جائے۔ ملک بھر میں صوبے، ضلع، تحصیل، پرگنہ اور گاؤں کی سطح پر لیگ کی شاخیں کھولی جائیں۔ فنڈ جمع کیے جائیں۔ مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے تعاون سے ہر گاؤں میں ابتدائی تعلیم کے اسکول کھولے جائیں۔ ممکن ہو تو مساجد اور پیش اماموں کو بھی استعمال کیا جائے۔ لڑکیوں کی تعلیم، تعلیمِ بالغاں اور مسلم بوائے اسکاؤٹس تحریک کو فروغ دیا جائے۔ کھدر اور سودیشی مصنوعات کی حوصلہ افزائی کی جائے۔ مسلم بینکوں کے قیام کی کوشش کی جائے۔ سرکاری ملازمتوں کے حوالے سے مسلمانوں کی شکایات کا جائزہ لینے کے لیے لیگ کی کمیٹی تشکیل دی جائے۔ مجلسِ خلافت کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے لیے سماجی سرگرمیوں کی جامع اسکیم بھی بنائی جائے۔

لیگ کے موجودہ عہدیداروں کی میعاد ختم ہو رہی تھی۔ ان سب کو تین تین برس کے لیے

منتخب کر لیا گیا۔ جناح دوبارہ لیگ کے صدر بنے۔ اعزازی جوائنٹ سیکرٹری چودھری خلیق الزماں اور مسعود الحسن تھے۔ اعزازی سیکرٹری سید ظہور احمد تھے۔

معلوم ہوتا ہے کہ علامہ شریک نہیں ہوئے۔ لیگ کا آیندہ اجلاس سال کے آخر میں بمبئی میں ہونا تھا۔ ایک مورخ کے مطابق جناح نے اس کی صدارت کے لیے علامہ اقبال، حسن امام اور سید رضا علی کے نام تجویز کیے۔ اگر ترتیب یہی تھی تو پہلے علامہ سے پوچھا گیا ہو گا۔ اُن کے انکار کے بعد حسن امام سے اور پھر رضا علی کا تقرر ہوا۔[1]

20

ڈاکٹر سیموئیل مارینس زویمر (Samuel Marinus Zwemer) عیسائی مشنری تھے۔ امریکی تھے مگر قاہرہ میں رہتے تھے۔ مشہور رسالے دی مسلم ورلڈ کے مدیر تھے۔ علامہ سمجھتے تھے کہ رسالے کا مقصد اسلام کی مخالفت کرنا ہے۔[2] ۲۷ مئی کو لاہور آئے۔[3] علامہ سے بھی ملاقات ہوئی۔ بعد میں علامہ نے لکھا، "انہوں نے جرمن زبان میں مجھے ایک کتاب دکھائی تھی جس میں اسلام اور ملل اسلام پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں ان کے عنوانات درج تھے۔"[4] فان ملر (D. Gustav Pfanmuller) کی اسلامی ادبیات کی گائیڈ (*Handboch der Islam Literatur*) رہی ہو گی۔ گزشتہ برس لپزگ سے چھپی تھی۔[5]

---

[1] اجلاس کی تفصیلات کے لیے میرے ماخذ مندرجہ ذیل ہیں: (۱) زمیندار کے اُس زمانے کے پرچے جن کے عکس امجد سلیم علوی نے فراہم کیے؛ (۲) شریف الدین پیرزادہ کی کتاب فاؤنڈیشنز آف پاکستان (انگریزی)؛ محمد رفیق افضل کی آل انڈیا مسلم لیگ (انگریزی)؛ میری لوئیس بیکر کی آل انڈیا مسلم لیگ (انگریزی)۔ لیگ کے مؤرخ سے مراد محمد رفیق افضل ہیں؛ دیکھیے: M. Rafique Afzal (2013), p.94

[2] مکتوب بنام خالد خلیل بلا تاریخ۔ دیکھیے جنوری ۱۹۲۵ء کے واقعات

[3] Zwemer (*n.d.*) *Report of a Visit,* p.5

[4] مکتوب بنام خالد خلیل بلا تاریخ۔ دیکھیے جنوری ۱۹۲۵ء کے واقعات

[5] Zwemer (*n.d.*) *An Analysis of A Bibliography of Islam,* p.3

21

۳۱مئی کو پنجاب کے گورنر میکلیگن کی مدت ختم ہوئی۔ نئے گورنر سر میلکم ہیلی تھے۔

22

اُردو مجموعہ کلام دو ہزار کی تعداد میں چھپوانے کا فیصلہ ہوا۔ دارُالاشاعت پنجاب نے تمام نسخے فروخت کرنے کا معاہدہ کر لیا۔ ادارے کے مالک تہذیبِ نسواں والے مولوی ممتاز علی تھے۔ ان کے لڑکے سید امتیاز علی تاج بھی ایک ادیب، ڈرامہ نگار اور ناشر کے طور پر مشہور ہو رہے تھے۔

جون کے آغاز تک طباعت شروع ہو چکی تھی۔ علامہ امتحانی پرچے جانچ رہے تھے۔ چودھری محمد حسین شملہ میں تھے۔ نواب ذوالفقار کے لڑکوں کے ساتھ گئے ہوں گے۔ ذوالفقار مالیر کوٹلے میں تھے۔ بہن سخت بیمار پڑ گئی تھیں۔ ۴ جون کو خط آیا۔ ۵ جون کو پریس سے اُردو مجموعے کے دو پروف آئے۔ دو پہلے آ چکے تھے۔ اُمید تھی کہ ایک ماہ تک شائع ہو جائے۔ اُس روز محمد حسین کا خط ملا۔ والدہ کی طبیعت ابھی خراب تھی۔ علامہ نے فوراً جواب دیا۔ عیادت کے بعد لکھا، ''معارف نے ابنِ خلدون کے حوالے سے لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہ جاٹ قوم سے تھے نہ ایرانی۔ پنجاب کے جاٹوں کو اِس پر فکر ہونا چاہیے۔ معلوم ہوتا ہے اِس قوم کو قدیم سے قانون کے ساتھ تعلق ہے۔''[1]

۸ جون کو انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کا اجلاس ہوا۔ مولوی فضل دین نے صدارت کی۔ انجمن کے صدر کے طور پر علامہ تقرر کی توثیق کی گئی۔[2] کسی وقت انجمن کا وفد آیا تو علامہ نے عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔[3] ان کا خیال تھا، ''کونسل میں اختلاف ہے اور عام حالت انجمن کی اچھی نہیں ہے۔ بعض ارکان ذاتی اغراض سے اس میں داخل ہیں اور ان کے نزدیک انجمن ان اغراض کے حصول کا ذریعہ ہے اور بس۔''[4]

---

[1] مکتوب بنام محمد حسین ۵ جون ۱۹۲۴؛ ثاقب نفیس (۲۰۰۴) مکتوباتِ اقبال، ص ۵۱،۲۲

[2] انجمن کی قلمی روداد؛ محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶)، اقبال اور انجمن حمایت اسلام،، ص ۱۷۸

[3] انجمن کی قلمی روداد؛ محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶)، اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص ۱۷۹

[4] مکتوب بنام سید سلیمان ندوی ۵ ستمبر ۱۹۲۴ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۴۷

23

گاندھی کو ہندوؤں کی طرف سے کچھ اس قسم کے پیغامات موصول ہو رہے تھے: ’’آپ کی تائید کی وجہ سے خلافت کے مسئلے کو وہ اہمیت ملی جو ویسے کبھی نہ ملتی۔ اس نے مسلمانوں کو بیدار کر دیا اور متحد کر دیا۔ مولویوں کا ایسا اعتبار قائم کیا جو پہلے نہ تھا۔ اب خلافت کا مسئلہ ختم ہوا ہے تو مسلمانوں نے ہندوؤں کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا ہے۔‘‘ مسلمانوں کی طرف سے الزام تھا کہ تعلیم، ملازمت اور کونسل کی ممبری چھڑوا کر نقصان پہنچایا۔ ہندوؤں نے عدم تعاون میں اتنا نقصان نہیں اٹھایا۔ مسلمانوں کی محنت سے بنا ہوا علیگڑھ کالج کا ادارہ برباد ہو گیا۔ ہندوؤں کے پاس کوئی ایسا ادارہ تھا ہی نہیں کہ برباد ہوتا۔ گاندھی نے اپنے انگریزی اخبار ینگ اِنڈیا میں جواب دیا کہ ہندو مسلم فسادات کی اصل وجہ یہ ہے کہ عدم تشدد کو ٹھیک سے سمجھا نہیں گیا تھا۔ عام طور پر مسلمان دھونس جمانے والے اور ہندو بزدل ہیں۔ اگر مسلمان حملہ کریں تو ہندوؤں کو ثابت قدمی کے ساتھ وار سہنے چاہئیں۔ یہ عدم تشدد کی عمدہ صورت ہو گی۔ یہ نہ ہو سکے تو ڈٹ کر مسلمانوں کا مقابلہ کریں۔ بھاگ جانا عدم تشدد نہیں ہے۔ دونوں ملتوں کو متفق ہو جانا چاہئیے کہ قانون کو اپنے ہاتھ میں نہیں لیں گی۔ جہاں بھی اختلافات ہوں، باہمی تصفیے یا عدالتوں کے ذریعے حل کیے جائیں۔

گاندھی نے ہندوؤں کی تحریک سنگھٹن اور مسلمانوں کی جوابی تحریک تنظیم کی مخالفت کی البتہ شدھی اور تبلیغ اِس شرط پر گوارا کی جا سکتی تھیں کہ دوسرے مذاہب کے بارے میں نفرت انگیز باتیں نہ کی جائیں۔ میثاقِ بنگال کی مخالفت کی۔ لکھا کہ گائے کی حفاظت کرنا ہندوؤں کا مذہبی فریضہ ہے۔ سیاسی مقاصد کے لیے اس پر سمجھوتہ نہیں کرنا چاہئیے۔ جب تک عوام کے کردار بلند نہ ہو جائیں، ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان میثاق بیکار ہے۔[1]

داس متفق نہ ہو سکے۔ جون میں سراج گنج میں کانگریس کی صوبائی شاخ کا اجلاس ہوا۔ داس نے کہا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے اتحاد کے بغیر سوراج ممکن نہیں۔ یہ سمجھنا خام خیالی ہے کہ دونوں ملتیں اپنا اپنا تشخص مٹا کر مدغم ہو جائیں گی۔ انسان کے ایک برتر تصوّر کو حقیقت بنانے کے لیے دونوں

---

[1] M. K. Gandhi: *Complete Works*, Vol. 28, pp.43-62

کے درمیان میثاق ضروری ہے:

So long as Hindus and Mohamedans do not unite, swaraj will be an impossibility, and will always remain a theme of impracticable fancy ... to think that the two communities will merge their respective individuality. Life is certainly greater than dogma and logic, and I want you to be men—whole men—who will obey none but the will of God, and the Pact is necessary for the growth of that high ideal of manhood and Indian nationality among the two communities.[1]

کانگریس کی صوبائی شاخ نے میثاق منظور کر لیا۔ بہت سے ہندوؤں کی طرف سے مخالفت جاری رہی۔

۱۹ر جون کو گاندھی نے ینگ اِنڈیا میں توجہ دلائی کہ کچھ عرصہ پہلے مسلمانوں کے پیغمبرؐ کے خلاف سخت نامناسب کتاب شائع ہوئی ہے۔ کتاب کا نام رنگیلا رسول ہے۔ لاہور کے آریہ سماجی پبلشر راجپال نے شائع کی۔ مصنف کا نام ظاہر نہ کیا۔ عیسائی مصنفین کی طرف سے پیغمبرِ اسلامؐ کے تعددِ ازدواج پر اعتراضات عام تھے کیونکہ عیسائیت میں صرف ایک بیوی کی اجازت تھی اور حضرت عیسیٰؑ نے شادی ہی نہیں کی تھی۔ یہی اعتراضات آریہ سماجیوں نے بھی اپنا لیے۔ راجپال کی کتاب میں طنزیہ انداز میں پیش کیے گئے۔ گاندھی نے ینگ انڈیا میں لکھا کہ یہ کتاب مسلمان کا ایمان کمزور نہیں کر سکتی، ہندو کا ایمان مضبوط نہیں کر سکتی، اس کا مقصد جذبات کو مشتعل کرنے کے سوا اور کیا ہے؟[2]

24

شاکر صدیقی نے علامہ کی نظم 'تنہائی' کا ترجمہ کر کے بھیجا۔ ۲۴ر جون کو علامہ نے لکھا، ''آپ کے حسنِ ظن کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ افسوس ہے آپ کا ترجمہ میری رائے ناقص میں اشاعت کے قابل نہیں... اگر آپ چاہیں تو مجھے اس کی اشاعت میں کوئی اعتراض نہیں۔''[3]

---

[1] S. R. Bakshi, et. al. (2005), p.213

[2] M. K. Gandhi: *Complete Works, Vol.28,* p.173؛ راجپال کی کتاب کے بارے میں معلومات مولانا ثناءَ اللہ امرتسری کی جوابی تصنیف مقدس رسول اور غازی علم الدین کیس کے عدالتی فیصلوں سے ماخوذ ہے۔

[3] مکتوب بنام شاکر صدیقی، ۲۴ جون ۱۹۲۴ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۲۰-۵۱۹

۲۸؍ جون کو انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کا اجلاس ہوا۔ مولوی فضل الدین کی صدارت میں طے پایا کہ انجمن کا وفد پھر علامہ سے صدارت قبول کرنے کی درخواست کرے۔

لاہور میں سخت گرمی پڑ رہی تھی۔ بارش نہ ہوئی تھی۔ محمد دین فوق نے خواب میں دیکھا کہ علامہ اقبال دوزخ میں ہیں۔ پریشان ہو کر خط لکھا۔ علامہ کو ۳۰؍ جون کو ملا۔ فوراً جواب لکھا، ''یہ بالکل صحیح ہے کیونکہ آج کل لاہور دوزخ سے کم نہیں۔''[1]

25

یکم جولائی کو لاہور میں کچھ بارش ہوئی۔ علامہ نے محمد حسین کو خط لکھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ نواب ذوالفقار کے لڑکے رشید نے براہِ راست خط لکھنے کی اجازت چاہی تھی۔ علامہ بھول گئے۔ اگلی صبح لکھا:

> میں اُس کے خط کا جواب ضرور دوں گا۔ تعجب ہے اُس کو ایسا سوال کرنے کی ضرورت ہے۔ مجھے اُس کے ساتھ ایسی ہی محبت ہے جیسا اُس کے باپ کے ساتھ۔ میری طرف سے اُسے کہیے کہ فارسی کا مذاق پیدا کرے، تمام عمر اس کی لذّت اُٹھائے گا۔ اور یہ لذت ایسی ہے کہ دنیا کے بڑے بڑے امرا کو بھی نصیب نہیں۔ قسم ہے خدا کی! دنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ چیزیں بھی اس لذت کے سامنے ہیچ ہیں۔ اور میرے نزدیک ایک غریب نادار آدمی جو اس لذت سے بہرہ یاب ہو، اُس دولت مند سے بدرجہا بہتر ہے جو لٹریچر کے مذاق کی لذت سے بے نصیب ہو۔

اُس صبح آسمان پر بادل تھے۔ کورٹ میں علامہ کا ایک مقدمہ تھا۔ اُس کے بعد ۲۴؍ جولائی کو کچہری بند ہونے تک کوئی مقدمہ نہ تھا۔[2] ارادہ تھا کہ شملہ جائیں۔ مسوڑا پھول گیا۔[3]

---

[1] مکتوب بنام فوق ۳۰ جون ۱۹۲۴ء؛ برنی (۱۹۹۱)، ص ۵۲۰

[2] مکتوب بنام محمد حسین ۲؍ جولائی ۱۹۲۴ء؛ ثاقب نفیس (۲۰۰۴) مکتوباتِ اقبال، ص ۲۳

[3] مکتوب بنام نیاز الدین ۱۲؍ جولائی ۱۹۲۴ء؛ برنی (۱۹۹۱)، ص ۵۲۲-۵۲۰ (وہاں ۱۳؍ جولائی غلط ہے)۔

26

ہلدوانی جیل پنجاب کے کنارے پر تھی۔ ۷؍جولائی کو وہاں تیس پینتیس برس کے ایک شخص کو پھانسی دی گئی۔ اُس کے ظلم، ہمدردی، سفاکی اور بہادری کے قصے مشہور تھے۔ نام سلطانہ ڈاکو تھا۔[1]

27

مسوڑا پھولنے کی وجہ سے سخت تکلیف تھی۔ موسم بھی دوبارہ جہنم جیسا ہو گیا تھا۔ فکرِ شعر کے لیے موزوں نہ تھا۔ "ایک چھوٹی سی کتاب" کا منصوبہ نازل ہوا۔ سوچا، "اِس کا نام غالباً یہ ہو گا":

Songs of Modern David[2]

بیاض میں یہ عنوان نہیں ملتا۔ قیاس کیا جا سکتا ہے کہ وہی کتاب تھی جس کے لیے جلد ہی "زبورِ جدید" کا عنوان ذہن میں آیا۔ ایک طرح سے انگریزی عنوان کا بامحاورہ ترجمہ ہی تھا۔ بالآخر زبورِ عجم کے نام سے ۱۹۲۷ء میں فارسی میں سامنے آئی۔ اس کی بیاض میں سب سے پہلے کچھ غزلیات درج ہیں۔ اُن کے مطلعوں کا مفہوم ہے:

- غزل سناؤ اور گزرے ہوئے نغمے واپس لاؤ۔ اِن افسردہ دلوں کے دلوں کو زندہ کرنے والی بات لاؤ۔[3]
- ہمارے سینے میں آرزو کا سوز کہاں سے آیا ہے؟ پیالہ ہم سے سہی مگر پیالے میں شراب کہاں سے آئی ہے؟
- اے چاند ستاروں کے خدا! ایک بکھری ہوئی خاک کو بھی دیکھ لیجیے۔ ایک ذرّے کو اپنے آپ میں تڑپ کر بیابان بنتے ہوئے بھی دیکھ لیجیے!

---

[1] معلومات بشکریہ عقیل عباس جعفری

[2] مکتوب بنام نیازالدین خاں ۱۲؍جولائی ۱۹۲۴ء محولہ بالا

[3] آٹھ اشعار کی یہ غزل کسی مجموعے میں شامل نہ ہوئی۔ فارسی میں مطلع یوں ہے:

غزل سرائے و نواہائے رفتہ باز آور   بایں افسردہ دلاں حرفِ دلنواز آور

دوسری اور تیسری غزلوں پر "خدا" (God) کا عنوان انگریزی میں ڈال کر کاٹا گیا۔ تیسری غزل کے حاشیے میں "آخر" لکھا۔ باقی غزلوں پر نمبر ڈالے۔ کونے میں ایک شعر لکھا۔ اُس پر نمبر "ا" ڈالا۔ جیسے غزلوں کے سلسلے میں ایک کہانی ہو۔ یہ اُس کا آغاز ہو:

دیوانگی پیدا کرنے والا عشق ہر راستے سے آپ ہی کے محلے میں لے گیا۔ اپنی تلاش پر کس قدر نازاں ہے کہ آپ کی طرف لے گیا۔[1]

عشقِ شورانگیز را ہر جادہ در کوئے تُو برد ‏ ‏ بر تلاشِ خود چہ می نازد کہ رہ سوئے تُو برد

اُردو مجموعے کی طباعت ہو چکی تھی۔ شیخ عبدالقادر دیباچہ لکھ رہے تھے۔ اُمید تھی کہ دو ہفتے تک وہ بھی چھپ جائے گا۔ ۱۱/ جولائی کو مسوڑے کا آپریشن کروایا۔ آرام آیا۔ ۱۲/ جولائی کو نیازالدین خاں کا خط ملا۔ فوراً جواب لکھا۔ رات بارش ہوئی۔[2] ۱۳/ جولائی کو موسم خنک ہو گیا۔ آسمان پر بادل چھائے۔ علامہ کا خیال تھا کہ مزید برسیں گے۔ شیخ عطا محمد کو خط لکھا۔[3] اُمید تھی کہ اُس روز شیخ عبدالقادر مجموعۂ کلام کا دیباچہ مکمل کریں گے۔[4]

۱۵/ جولائی کو عید الاضحیٰ تھی۔ دہلی میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان چند روز پہلے خون خرابہ ہوا تھا۔ اُس روز زبردست فساد ہوا۔ علامہ نے کہا، "خدا فضل کرے اور لوگوں کو امن صُلح سے رہنا سکھائے۔"[5] شیخ عبدالقادر کا دیباچہ ۱۸/ جولائی کو ملا۔

---

[1] بیاض زبورِ عجم

[2] مکتوب بنام نیازالدین ۱۲/ جولائی ۱۹۲۴ء محولہ بالا

[3] مکتوب بنام شیخ عطا محمد ۱۳/ جولائی ۱۹۲۴ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۲۲

[4] مکتوب بنام نیازالدین ۱۲/ جولائی ۱۹۲۴ء میں علامہ نے لکھا کہ دیباچہ اگلے روز مکمل ہونے والا ہے۔

[5] مکتوب بنام محمد حسین ۲۰/ جولائی ۱۹۲۴ء؛ ثاقب نفیس (۲۰۰۴) مکتوباتِ اقبال، ص ۲۵

دیباچہ

شیخ عبدالقادر بیرسٹر ایٹ لا سابق مدیر "مخزن"

[اقتباس]

کسے خبر تھی کہ غالب مرحوم کے بعد ہندوستان میں پھر کوئی ایسا شخص پیدا ہو گا جو اُردو شاعری کے جسم میں ایک نئی روح پھونک دے گا اور جس کی بدولت غالب کا بے نظیر تخیل اور نرالا اندازِ بیان پھر وجود میں آئیں گے اور ادبِ اُردو کے فروغ کا باعث ہوں گے؛ مگر زبانِ اُردو کی خوش اقبالی دیکھیے کہ اس زمانے میں اقبال سا شاعر اسے نصیب ہوا جس کے کلام کا سکہ ہندوستان بھر کی اُردو داں دُنیا کے دلوں پر بیٹھا ہوا ہے اور جس کی شہرت روم و ایران بلکہ فرنگستان تک پہنچ گئی ہے۔

غالب اور اقبال میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب کو اُردو اور فارسی کی شاعری سے جو عشق تھا، اُس نے اُن کی روح کو عدم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسد خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے؛ اور اُس نے پنجاب کے ایک گوشے میں جسے سیالکوٹ کہتے ہیں، دوبارہ جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا...

...فارسی میں اقبال کے قلم سے تین کتابیں اس وقت تک نکلی ہیں؛ 'اسرارِ خودی'، 'رموزِ بے خودی' اور 'پیام مشرق'۔ ایک سے ایک بہتر! پہلی کتاب سے دوسری میں زبان زیادہ سادہ اور عام فہم ہو گئی ہے اور تیسری دوسری سے زیادہ سلیس ہے۔ جو لوگ اقبال کے اردو کلام کے دلدادہ ہیں، وہ فارسی نظموں کو دیکھ کر مایوس ہوئے ہوں گے۔ مگر انھیں یاد رکھنا چاہیے کہ فارسی نے وہ کام کیا جو اُردو سے نہیں ہو سکتا تھا۔ تمام اسلامی دنیا میں جہاں فارسی کم و بیش متداول ہے، اقبال کا کلام اس ذریعے سے پہنچ گیا اور اس میں ایسے خیالات تھے جن کی ایسی وسیع اشاعت ضروری تھی اور اسی وسیلے سے یورپ اور امریکہ والوں کو ہمارے ایسے قابل قدر مصنف کا حال معلوم ہوا۔ 'پیام مشرق' میں ہمارے مصنف نے یورپ کے ایک نہایت بلند پایہ شاعر گوئٹے کے 'سلامِ مغرب' کا جواب لکھا ہے اور اس

میں نہایت حکیمانہ خیالات کا اظہار بہت خوب صورتی سے کیا گیا ہے۔ اس کے اشعار میں بعض بڑے بڑے عقدے حل ہوئے ہیں جو پہلے آسان طریق سے بیان نہیں ہوئے تھے۔ مدت سے بعض رسائل اور اخبارات میں ڈاکٹر محمد اقبال کو 'ترجمان حقیقت' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے اور ان کتابوں کے خاص خاص اشعار سے یہ ثابت ہے کہ وہ اس لقب سے ملقب ہونے کے مستحق ہیں، اور جس کسی نے یہ لقب ان کے لیے پہلے وضع کیا ہے، اُس نے کوئی مبالغہ نہیں کیا۔

فارسی گوئی کا ایک اثر اقبال کے اُردو کلام پر یہ ہوا ہے کہ جو نظمیں اُردو میں دورِ سوم میں لکھی گئی ہیں، اُن میں سے اکثر میں فارسی ترکیبیں اور فارسی بندشیں پہلے سے بھی زیادہ ہیں اور بعض جگہ فارسی اشعار پر تضمین کی گئی ہے۔ گویا یہ معلوم ہوتا ہے کہ اشہبِ قلم جو فارسی کے میدان میں گامزن ہے، اُس کی باگ کسی قدر تکلف کے ساتھ اُردو کی طرف موڑی جا رہی ہے۔

اقبال کا اُردو کلام جو وقتاً فوقتاً ۱۹۰۱ء سے لے کر آج تک رسالوں اور اخباروں میں شائع ہوا اور انجمنوں میں پڑھا گیا، اُس کے مجموعے کی اشاعت کے بہت لوگ خواہاں تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے احباب بارہا تقاضا کرتے تھے کہ اُردو کلام کا مجموعہ شائع کیا جائے مگر کئی وجوہات سے آج تک مجموعہ اُردو شائع نہیں ہو سکا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ آخر اب شائقینِ کلام اُردو کی یہ دیرینہ آرزو بر آئی اور اقبال کی اُردو نظموں کا مجموعہ شائع ہوتا ہے جو دو سو بانوے صفحوں پر مشتمل ہے اور تین حصوں پر منقسم ہے۔ حصہ اوّل میں ۱۹۰۵ء تک کی نظمیں ہیں، حصہ دوم میں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک کی اور حصہ سوم میں ۱۹۰۸ء سے لے کر آج تک کا اُردو کلام ہے۔ یہ دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ اُردو میں آج تک کوئی ایسی کتاب اشعار کی موجود نہیں ہے جس میں خیالات کی یہ فراوانی ہو اور اس قدر مطالب و معانی یکجا ہوں۔ اور کیوں نہ ہو، ایک صدی کے چہارم حصے کے مطالعے اور تجربے اور مشاہدے کا نچوڑ اور سیر و سیاحت کا نتیجہ ہے۔ بعض نظموں میں ایک ایک شعر اور ایک ایک مصرع ایسا ہے کہ اُس پر ایک مستقل مضمون لکھا جا سکتا ہے۔ یہ مختصر سا مضمون جو بطور دیباچہ لکھا گیا ہے، اس میں مختلف نظموں کی تنقید یا مختلف اوقات کی نظموں کے باہم مقابلے کی گنجائش نہیں، اس کے لیے اگر ہو سکا تو میں کوئی اور موقع تلاش کروں گا۔ سرِ دست میں صاحبانِ ذوق کو مبارک باد دیتا ہوں کہ اُردو کُلیّات اقبالؔ اُن کے

سامنے رسالوں اور گلدستوں کے اوراقِ پریشاں سے نکل کر ایک مجموعۂ دل پذیر کی شکل میں جلوہ گر ہے، اور اُمید ہے کہ جو لوگ مدّت سے اس کلام کو یکجا دیکھنے کے مشتاق تھے، وہ اس مجموعے کو شوق کی نگاہوں سے دیکھیں گے اور دل سے اس کی قدر کریں گے۔

آخر میں اُردو شاعری کی طرف سے میں یہ درخواست قابل مصنف سے کرتا ہوں کہ وہ اپنے دل و دماغ سے اُردو کو وہ حصہ دیں جس کی وہ مستحق اور محتاج ہے۔ خود انھوں نے غالب کی تعریف میں چند بند لکھے ہیں جن میں ایک شعر میں اُردو کی حالت کا صحیح نقشہ کھینچا ہے۔

گیسوئے اُردو ابھی منّت پذیر شانہ ہے　　　شمع یہ سودائی دلسوزی پروانہ ہے

ہم ان کا یہ شعر پڑھ کر ان سے یہ کہتے ہیں کہ جس احساس نے یہ شعر ان سے نکلوایا تھا، اُس سے کام لے کر اب وہ پھر کچھ عرصے کے لیے گیسوئے اُردو کے سنوارنے کی طرف متوجہ ہوں اور ہمیں موقع دیں کہ ہم اِس مجموعہ اُردو کو جو اس قدر دیر کے بعد چھپا ہے، ایک دوسرے کلیات اُردو کا پیش خیمہ سمجھیں۔[1]

28

۱۸/ جولائی کو علامہ نے محمد حسین کو دو خط لکھے۔ لندن سے خط ملا۔ 'اسرارِ خودی' کی تعریف تھی۔ نکلسن کا ترجمہ دیکھا ہو گا۔ فارسی کتاب کی درخواست تھی۔ علامہ نے ۱۹/ جولائی کو محمد حسین کو لکھا کہ نواب ذوالفقار کا "ریویو" (غالباً وائس فرام دی ایسٹ) ان حضرت کو ارسال کریں:

E. Maraden, Esq., Waltroyd, 12 Ellerdale Rd., Hampstead N.W.3, London.[2]

ترک سپہ سالار فخری پاشا نے جنگِ عظیم کے دوران کرنل لارنس کے منصوبوں کے خلاف مدینہ کا دفاع کیا تھا۔ جنگ کے بعد خلیفہ کے حکم پر بھی شہر کو شریفِ مکہ کے حوالے نہ کیا کہ شریف انگریزوں کا وفادار تھا۔ 'طلوعِ اسلام' کے شعر میں بھی غالباً اِس واقعے کی طرف اشارہ تھا: حرم رُسوا ہوا پیرِ حرم کی کم نگاہی سے / جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے۔ اب وہ کابل میں ترکی کے سفیر

[1] اقبال (۱۹۲۴) بانگِ درا

[2] مکتوب بنام محمد حسین ۱۹/ جولائی ۱۹۲۴ء؛ ثاقب نفیس (۲۰۰۴) مکتوباتِ اقبال، ص ۲۴

تھے۔ ۱۹؍ جولائی کو وہاں سے اُن کی تصویر علامہ کو موصول ہوئی۔[1] ممکن ہے علامہ نے منگوائی ہو۔

علامہ کے کوئی ہم نام محمد اقبال تھے۔ محمد حسین کسی سلسلے میں خط کتابت کر رہے تھے۔ ۲۰؍ جولائی کو علامہ نے محمد حسین کو اطلاع دی کہ محمد اقبال کا کوئی خط نہیں ملا۔ شیخ عبدالقادر کا دیباچہ کاتب کے پاس تھا۔ اُمید تھی کہ اُس روز کتابت مکمل ہو گی۔ دو تین روز تک چھپ جائے گا۔ ''وہ مضمون ٹائپ ہو گیا ہو تو بھیج دیجیے،'' علامہ نے لکھا، ''اصل مع نقل۔''[2] معلوم ہوتا ہے کہ اجتہاد والے مقالے کا کوئی حصہ تھا۔[3]

لاہور کے نامور اُردو صحافی لالہ دیناناتھ کا خط کچھ عرصہ پہلے ملا تھا۔ ۲۳؍ جولائی کو خیال آیا۔ خط کا مضمون بھول گئے تھے۔ خط بھی جگہ پر نہ تھا۔ لالہ جی کا پتہ ٹھیک سے یاد نہ تھا۔ ''جہاں تک میرا خیال ہے آپ نے میرے اُردو شعری مجموعے کے بارے میں دریافت فرمایا تھا،'' علامہ نے انگریزی میں لکھا، ''کتاب پریس میں ہے اور اُمید ہے کہ تقریباً ایک ہفتہ میں تیار ہو جائے گی۔''[4]

مجلس مرکزیہ خلافت کی خواہش تھی کہ ترکوں کو خلافت کی ذمہ داری قبول کرنے پر آمادہ کیا جا سکے۔ اس کے علاوہ تحریکِ خلافت کا موقف تھا کہ مسلمانوں کے لیے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم ہے کہ جزیرۃ العرب کو ہمیشہ قبضے میں رکھیں۔ اس میں جزیرہ نمائے عرب کے علاوہ عراق، شام اور فلسطین وغیرہ بھی شامل تھے۔ اُن علاقوں کو یورپی طاقتوں کی نگرانی سے چھڑانے کا مسئلہ برقرار تھا۔ مجلسِ عاملہ نے ایک نیا وفدِ خلافت بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری اور مولانا سید سلیمان ندوی کے نام شامل تھے۔ علامہ اقبال نہ تھے۔ ۲۴؍ جولائی کے زمیندار نے اعتراض کیا:

> زمیندار بیسیوں دفعہ علامہ کا اسم گرامی پیش کر چکا ہے ... ممالک اسلامی کے تعلیم یافتہ طبقے میں جو عزت و مقبولیت دنیائے اسلام کے اس سب سے بڑے شاعر اور فلسفی کو

---

[1] مکتوب بنام محمد حسین ۲۰؍ جولائی ۱۹۲۴ء؛ ایضاً ص ۲۵

[2] مکتوب بنام محمد حسین ۲۰؍ جولائی ۱۹۲۴ء؛ ایضاً ص ۲۵

[3] مکتوب بنام محمد حسین ۳؍ اگست ۱۹۲۴ء سے معلوم ہوتا ہے کہ مضمون تشنۂ تکمیل تھا۔

[4] مکتوب بنام لالہ دیناناتھ ۲۳ جولائی ۱۹۲۴ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۲۳

> حاصل ہے، وہ دیگر ابنائے ملک میں سے کسی کو نصیب نہیں لیکن افسوس ہے کہ مجلسِ عاملہ میں ہمارے جو نمائندے موجود ہیں، وہ دور حاضر کی اس عظیم الشان اور جلیل القدر شخصیت کی حقیقی اہمیت کو نہیں سمجھتے یا اگر سمجھتے ہیں تو تنگ خیالی کے جذبے سے متاثر ہو کر اتنی جرأت اپنے آپ میں نہیں پاتے کہ اس کا نام وفدِ خلافت کے لیے تجویز کریں۔ ہمارا یہ خیال ہے کہ اسلام کے ادارۂ جمہوریت، نظامِ خلافت اور بقائے مرکزیت کے متعلق علامہ اقبال جس قدر مجتہدانہ علم و بصیرت رکھتے ہیں، وہ بہت کم لوگوں کو میسر ہے۔[1]

زمیندار کی اس اشاعت میں محمد حسین کی طرف سے پیامِ مشرق میں کتابت کی غلطیوں کی اصلاح پر مشتمل اغلاط نامہ بھی شائع ہوا۔[2]

کرنال کے مقدمات کے تصفیے کے لیے مرزا جلال الدین کے ساتھ شملہ جانا تھا۔ نواب ذوالفقار نے تاریخ مقرر کروانی تھی۔ ارادہ ہوا کہ مرزا جلال الدین کے ساتھ ۳۰ر جولائی کی شام روانہ ہو کر اگلی دوپہر بارہ بجے کے قریب پہنچ جائیں۔ ۲۴ر جولائی کو محمد حسین کو لکھا، ”شاید مرزا اسلم بھی ہمراہ ہوں گے۔ سردار امراؤ سنگھ کو بھی فون کر دیجیے اور نواب صاحب کی خدمت میں بھی عرض کر دیجیے... اسٹیشن پر آجایئے۔“[3] پھر نواب ذوالفقار کی طرف سے تاریخ ملنے میں تاخیر ہوئی۔[4]

۲۶ر جولائی کو محمد حسین کا کارڈ ملا۔ علی گڑھ میگزین میں کچھ شائع ہوا تھا۔ اس کی تردید ضروری تھی۔ محمد حسین نے کر دی تھی۔ علامہ نے وہ شمارہ نہ دیکھا تھا۔ لکھا، ”آپ نے اچھا کیا۔“[5]

---

[1] اختر النسا (۲۰۱۰) اقبال اور زمیندار، ص ۲۴۷-۲۴۸

[2] ایضاً ص ۹۵-۹۴

[3] مکتوب بنام محمد حسین ۲۴ر جولائی ۱۹۲۴ء؛ ثاقب نفیس (۲۰۰۴) مکتوباتِ اقبال، ص ۲۶

[4] مکتوب بنام شیخ نور محمد ۱۰ر اگست ۱۹۲۴ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۳۰-۵۲۹

[5] مکتوب بنام محمد حسین ۲۶ر جولائی ۱۹۲۴ء؛ ثاقب نفیس (۲۰۰۴) مکتوباتِ اقبال، ص ۲۷

29
شیخ عطا محمد اپنے لڑکے اعجاز کے لیے ملازمت کی فکر میں تھے۔ علامہ کو لکھا کہ شیخ رحیم بخش سے سفارش کروائی جائے۔ جج تھے۔ علامہ کے کالج کے زمانے کے دوستوں میں سے تھے۔ اعجاز کے بارے میں اچھی رائے رکھتے تھے۔ مگر حال ہی میں اُن کے ایک فیصلے کے خلاف اپیل میں دوسرے ججوں نے نہایت خراب ریمارک لکھے تھے۔ شاید محتاط رہنا پسند کرتے۔ علامہ نے سفارش کے لیے کہنا مناسب نہ سمجھا۔ ۳۰ر جولائی کو عطا محمد کو لکھا، ''یہاں لاہور میں بھی سخت مقابلہ ہو گا کیونکہ ہر ضلع سے دو دو نام آئیں گے اور سفارشوں کی کوئی حد نہ رہے گی۔ بہر حال کوشش شرط ہے اور انشاًاللہ میں بھی کوشش کروں گا۔ جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں، چیف جج صاحب سے میں اس کا ذکر بھی کر چکا ہوں۔ اب موقع آنے پر پھر دوبارہ ذکر کروں گا۔''[1]

30
موجودہ دستور کے مطابق مرکزی اسمبلی کے دو ایوان تھے۔ نچلا ایوان لیجسلیٹو اسمبلی (Legislative Assembly) یعنی مجلسِ قانون ساز کہلاتا تھا۔ اس کے نمائندے منتخب ہوتے تھے۔ بالائی ایوان کونسل آف اسٹیٹ (Council of State) تھا۔ نمایندے منتخب کرنے کا اختیار یونیورسٹیوں کے فیلوز، مجلس قانون ساز کے ارکان، ایک خاص حد تک انکم ٹیکس ادا کرنے والے شہریوں، میونسپل کمیٹیوں کے صدور اور بعض دوسرے اشخاص تک محدود تھا۔ ان میں علامہ اقبال شامل تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کی اورئینٹل اور آرٹس فیکلٹیز کے فیلو تھے۔ یکم اگست کو پنجاب گزٹ کے حصہ سوم میں صفحہ ۱۵۴ پر ووٹرز کی فہرست میں نمبر ۵۰۵ پر اُن کے کوائف شائع ہوئے: محمد اقبال، ڈاکٹر شیخ سر، کے ٹی۔ ولدیت: نور محمد، شیخ۔ ذات: سپرو۔ پیشہ: بیرسٹر ایٹ لأ۔ اہلیت کی قسم: فیلو پنجاب یونیورسٹی۔ رہائش: لاہور، ۳۴ میکلوڈ روڈ۔[2]

لاہور میں شدید بارش ہوئی۔ مکانوں کے گرنے سے جانی نقصان بھی ہوا۔ ۳ر اگست کو بھی

---

[1] ایضاً

[2] ڈاکٹر حسن اختر ملک، اقبال، ایک تحقیقی مطالعہ، ص ۲۴۷-۲۴۶

آسمان پر بادل تھے۔ کچھ بوندا باندہ ہو چکی تھی۔ ہوا بند تھی۔ اُردو مجموعے کی طباعت مکمل ہو چکی تھی۔ دفتری سی رہا تھا۔ علامہ نے محمد حسین کو خط لکھا، "وہ انگریزی مضمون ٹائپ ہو کر ابھی تک نہیں پہنچا۔ میرا خیال تھا کہ میں لاہور سے باہر جانے سے پہلے اس کو ختم کر لیتا۔ پھر لکھنے لکھانے کا موقع کم ملے گا۔" نواب ذوالفقار نے کرنال کے مقدمات کے لیے کوئی تاریخ نہ بھیجی تھی۔ "فیصلہ ثالثی داخل کرنے کی آخری تاریخ ۲۹/ اگست ہے،" علامہ نے لکھا۔[1]

علامہ کی بہن کریم بی بی کچھ دن پہلے سیالکوٹ سے علامہ کے پاس آئی تھیں۔ باپ کے بغیر اُداس ہو گئیں۔ خط لکھا۔ ۱۰/ اگست کو سیالکوٹ سے اعجاز کا خط آیا۔ میاں جی بیٹی کا خط پڑھ کر اُداس ہو گئے تھے۔[2] علامہ نے اُسی وقت بھتیجے مختار سے کہا کہ اگر ریل کی روانگی میں کافی وقت ہے تو کریم بی بی کو ابھی لے جائے۔ ورنہ کل لے جائے۔ شیخ نور محمد کو لکھا، "میں بھی انشأاللہ چند روز کے بعد آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گا۔"[3] اعجاز کو بھی لکھا کہ دن میں ایک دفعہ وقت نکال کر ایک آدھ گھنٹہ ضرور میاں جی کے پاس بیٹھیں، "مجھے خود جو فائدہ ان کی ذات سے ہوا، اس کا احساس اب ہوا ہے اور میں اس کو ہر قسم کے علم اور دنیوی وجاہت پر ترجیح دیتا ہوں۔"

31

کچہری بند تھی۔ علامہ انگریزی میں اجتہاد پر مضمون لکھ رہے تھے: The idea of Ijtehad in the law of Islam۔[4] شریعت کے تین ماخذ تھے: قرآن، حدیث، اجماع اور قیاس۔ آخری دونوں ماخذ اجتہاد کے زمرے میں آتے تھے۔ اجتہاد کے لغوی معنی کوشش کرنے کے تھے۔ اسلامی فقہ میں یہ کسی قانونی مسئلے پر آزادانہ رائے قائم کرنے کی کوشش کا نام تھا۔ اس کے تین درجے تھے: اول، مکمل

---

[1] مکتوب بنام محمد حسین ۳/ اگست ۱۹۲۴ء؛ ثاقب نفیس (۲۰۰۴) مکتوباتِ اقبال، ص ۲۸

[2] احمد (۱۹۸۵) مظلوم اقبال، ص ۳۴۵-۳۴۶۔ فقیر سید وحید الدین (بلا تاریخ) روزگارِ فقیر، جلد دوم، ص ۱۲۹ پر اعجاز ہی کے حوالے سے لکھا گیا کہ کریم بی بی کے بغیر میاں جی اداس رہنے لگے۔ یہ روایت خط کے مضمون کے مطابق نہیں۔

[3] برنی، کلیات مکاتیب اقبال دوم، ص ۵۳۰-۵۲۹

[4] مکتوب بنام سید محمد سعید الدین جعفری ۱۳/ اگست ۱۹۲۴ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۳۲-۵۳۰

آزادی یعنی قرآن وسنّت کے سوا کسی ماخذ کی پابندی پر مجبور نہ ہونا، جیسے جس طرح امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام حنبل نے اجتہاد کیا۔ دوم، محدود آزادی یعنی فقہ کے کسی مکتبِ فکر کی حدود میں رہتے ہوئے اجتہاد کرنا۔ سوم، مخصوص آزادی یعنی کسی خاص مقدمے میں فقہی قانون کے اطلاق کے بارے میں رائے دینا جہاں فقہ خاموش ہو۔ علامہ کی خصوصی دلچسپی پہلے درجے کے اجتہاد میں تھی۔ سُنّی علمأ کے نزدیک اس درجے کے اجتہاد کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ علامہ اسے کھولنا چاہتے تھے۔ خلافتِ عباسیہ کے قیام سے پہلے مسلمانوں میں قرآن کے سوا کوئی تحریری قانون موجود نہ تھا۔ پہلی چار صدیوں میں فقہ اور قانون کے کم سے کم اُنیس مکاتیبِ فکر مسلمانوں میں پیدا ہوئے۔ فقہ کے جن چار مکاتیب کو آج حرفِ آخر سمجھا جا رہا تھا، ماضی میں وہ خود بڑے متنازعہ رہ چکے تھے۔ پھر شریعت میں مزید ارتقأ کے امکان سے کیوں انکار کیا جائے؟

علامہ کے خیال میں اسلامی قانون کے منجمد ہو جانے کی اصل وجوہات تین تھیں۔ اول، معتزلہ کی آزاد خیالی کی وجہ سے خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں اسلام کی وحدت کہیں بالکل ہی منتشر نہ ہو جائے۔ اس لیے قانون کے سانچے کو زیادہ سخت کر دیا گیا۔ دوم، راہبانہ تصوّف نے اسلام کے بہترین دماغوں کو سیاسی اور معاشرتی پہلوؤں سے ہٹا کر دوسری طرف لگا دیا۔ سوم، بغداد کی تباہی نے اسلام کے مستقبل کے بارے میں اندیشے پیدا کر دیئے۔ اس لیے اگلے وقتوں کے فقہأ کی روایت پر سختی سے قائم رہنے میں عافیت سمجھی گئی۔ ''لیکن وہ نہیں سمجھے اور ہمارے زمانے کے علما نہیں سمجھتے،'' علامہ کہتے تھے، ''کہ قوموں کی تقدیر اور زندگی کا انحصار اِس پر نہیں کہ اُن کا وجود کتنا منظم ہے، بلکہ اِس بات پر ہے کہ افراد کی ذاتی خوبیاں، قدرت اور صلاحیت کیا ہیں... انحطاط اور زوال کو روکنے کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ ہم اپنی گذشتہ تاریخ کو بیجا احترام کی نظر سے دیکھنے لگیں، یا اُسے مصنوعی طریقوں سے واپس لانے کی کوشش کریں۔ ایک جدید مصنف نے کیا خوب کہا ہے، 'تاریخ کا فیصلہ ہے کہ جن فرسودہ خیالات کو خود کسی قوم نے فرسودہ کر دیا ہو، ان کی تجدید پھر اس قوم میں نہیں ہو سکتی۔'''' چنانچہ آیندہ صدیوں میں ابن تیمیہ، سیوطی اور عبدالوہاب نے اس جمود کے خلاف بغاوت کی۔ وہابی تحریک کے براہِ راست یا

بالواسطہ اثر سے سنوسی، بابی اور پین اسلامک تحریکیں بھی پیدا ہوئیں۔[1]

"میں علامہ کے حکم پر اُن کی خدمت میں مولوی سید طلحہ، مولوی اصغر علی روحی اور مولوی غلام مرشد صاحب کو لے کر گیا اور اُن کے ساتھ طویل ملاقاتیں ہوئیں،" عبداللہ چغتائی کا بیان ہے، "اِسی طرح بعض دیگر حضرات سے بھی گفتگو اور استصواب کیا گیا۔ میں نے سید طلحہ کے مشورے سے امام شاطبی کی کتاب الموافقات خریدی جو علامہ کے زیرِ مطالعہ رہی۔"[2]

چودھری محمد حسین کے نام ۲۰/ جولائی اور ۳/ اگست کے خطوط میں کسی انگریزی مضمون کے بارے میں لکھ چکے تھے۔ اس کا مسودہ محمد حسین نے ٹائپ کر کے بھجوانا تھا۔ پھر علامہ اُسے مکمل کرتے۔ مسودہ مئی، جون یا اوائل جولائی میں لکھا گیا ہو گا۔ امکان ہے کہ اجتہاد والے مقالے کا حصہ تھا۔ ابوالکلام آزاد کو لکھا کہ کوئی مثال فراہم کریں جس سے امریکی مصنف اغنیدس کے اس بیان کی تردید ہو سکے کہ اجماعِ اُمت نصِ قرآنی کو منسوخ کر سکتا ہے۔ ۸/ اگست کو سلیمان ندوی کو بھی لکھا، "آیا مسلمانوں کے فقہی لٹریچر میں کوئی ایسا حوالہ موجود ہے؟ امرِ دیگر یہ کہ آپ کی ذاتی رائے اس بارے میں کیا ہے..."[3]

چغتائی کافی عرصہ لدھیانہ کے اسکول میں پڑھانے کے بعد لاہور آ چکے تھے۔ کوچہ چابک سواراں میں رہتے تھے۔[4] ان کا بیان ہے کہ گرمیوں کی چھٹیوں میں علامہ کے کہنے پر گھر سے ٹائپ رائٹر لے آئے۔ علامہ کی کوٹھی میں اُن کے زیرِ ہدایت مسودے کو ٹائپ کیا۔ "ٹائپ کے دوران میں وہ خود کہیں کہیں اصلاح بھی فرماتے تھے،" چغتائی کا بیان ہے، "پھر اِس بحث کو علامہ دیگر تحریروں میں بھی استعمال کرتے رہے۔ اِس دوران میں بعض لطائف بھی ہوئے..."[5]

---

[1] Iqbal (1934), *The Reconstruction,* pp.139-169

[2] چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۳۰۲؛ ان کے مطابق الموافقات بعد میں ایم ڈی تاثیر سے گم ہو گئی۔

[3] مکتوب بنام سلیمان ندوی ۸/ اگست ۱۹۲۴ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۳۵-۵۳۳

[4] علامہ اقبال میوزیم میں محفوظ علامہ کے ایک خط کے لفافے پر چغتائی کا پتہ درج ہے۔

[5] عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۳۰۲-۳۰۳

فارسی میں نئی کتاب کے اشعار بھی ہو رہے تھے۔ خیال تھا کہ کتاب مکمل ہونے میں وقت لگے گا۔ ۱۳/ اگست تک اس کا نام "زبورِ جدید" رکھ چکے تھے۔[1] بیاض کے پہلے صفحے پر یہ عنوان موجود ہے۔ شروع میں جو تین چار غزلیں لکھیں، اُن کے علاوہ کناروں پر دو اضافے ہیں۔ تین اشعار میں قاری سے خطاب ہے۔ سات اشعار میں مشرق کے نوجوانوں کے نام "پیشکش" ہے۔

کتابِ زبور پڑھنے والے سے

کبھی معمولی گھاس کی پتی میری آنکھوں پر پردہ ڈال دیتی ہے۔ کبھی میں نے ایک ہی نظر میں دونوں جہانوں کو دیکھ لیا ہے۔

اگرچہ عشق کی وادی بہت دور اور بہت وسیع و طویل ہے مگر کبھی کبھی سو برس کی راہ ایک آہ میں طے ہو جاتی ہے۔

طلب میں کوشش کیے جاؤ اور اُمید کا دامن ہاتھ سے مت دو۔ ایک ایسی عظیم دولت بھی ہے جو کبھی کبھی سرِراہ مل جاتی ہے!

می شود پردۂ چشمم پرِ کاہے گاہے — دیدہ ام ہر دو جہاں را بنگاہے گاہے

وادیٔ عشق بسے دور و دراز است ولے — طے شود جادۂ صد سالہ بآہے گاہے

در طلب کوش و مدہ دامنِ اُمید ز دست — دولتے ہست کہ یابی سرِ راہے گاہے!

پیشکش

عجم کے جوانو! میں تمہارے خیابان میں اپنی اور تمہاری روح کو لالے کے چراغ کی طرح جلا رہا ہوں۔ میری فکر نے زندگی کے باطن میں غوطہ لگایا ہے اس لیے میں تمہارے پوشیدہ خیالات جان گیا ہوں۔ میں نے سورج اور چاند کو دیکھا پھر میری نگاہ پروین سے بھی اوپر چلی گئی تب جا کر میں نے تمہارے

---

[1] مکتوب بنام سید محمد سعید الدین جعفری ۱۳/ اگست ۱۹۲۴ء محولہ بالا

کافرستان میں حرم کی بنیاد رکھی۔

تمہارے بیاباں میں ایک شعلہ آوارہ پھرتا تھا میں نے اس کو اس خیال سے لپیٹ لیا کہ اس کی کاٹ اور بھی تیز ہو جائے۔

لعل کا وہ ٹکڑا جو میں نے تمہارے بدخشاں سے حاصل کیا تھا اسے میری فکرِ رنگین نے مشرق کے تہی دستوں کی نظر کر دیا ہے۔

ایک ایسا انسان آنے والا ہے جو غلاموں کی زنجیر توڑ ڈالے گا میں نے تمہارے قید خانے کے روشندان سے اُسے دیکھا ہے۔

اے پیکرِ آب و گِل میرے گرد جمع ہو جاؤ میں نے اپنے سینے میں تمہارے بزرگوں کی آگ کو سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔[1]

پیشکش

چوں چراغِ لالہ سوزم درخیابانِ شما — اے جوانانِ عجم جانِ من و جانِ شما!

غوطہ ہا زد در ضمیرِ زندگی اندیشہ ام — تابدست آوردہ ام افکارِ پنہانِ شما

مہر و مہ دیدم نگاہم برتر از پروین گذشت — ریختم طرحِ حرم در کافرستانِ شما!

تاسنانش تیزتر گردد فرو پیچیدمش — شعلۂ آشفتہ بود اندر بیابانِ شما

فکرِ رنگینم کند نذرِ تہی دستانِ شرق — پارۂ لعلے کہ دارم از بدخشانِ شما

می رسد مَردے کہ زنجیرِ غلاماں بشکند — دیدہ ام وز روزنِ دیوارِ زندانِ شما

حلقہ گردِ من زنید اے پیکرانِ آب و گِل — آتشے در سینہ دارم از نیاگانِ شما

معلوم ہوتا ہے کہ بیاض میں غزلیں لکھتے گئے۔ اس کے بعد نمبر ڈال کر انہیں ترتیب دیا۔ دو حصوں میں تقسیم بھی کر رہے تھے۔ ایک حصے میں خدا سے اور دوسرے میں انسان سے خطاب تھا:

○ ہمارے جسم کی خاک آپ کی جدائی میں سیکڑوں نالے بلند کرتی ہے کیونکہ آپ میری

---

[1] بیاض زبورِ عجم

سانس سے بھی زیادہ قریب ہونے کے باوجود مجھ سے دور ہیں۔

- اے کہ جس نے میرے آہ و نالہ کی گرمی بڑھادی ہے، میری آواز سے ہزار سالہ وجود کو زندہ کر دیجیے!
- اُٹھو کہ آدم کی جلوہ فرمائی کا وقت آگیا ہے۔ ستارے اس مشتِ خاک کے سامنے سربسجود ہیں۔
- لالے کے پھول میں سے صبا کی طرح گزرا جاسکتا ہے۔ ایک پھونک سے غنچے کی گرہ کھولی جاسکتی ہے۔
- زمانہ اُس دل آرام کا ایک تیز رَو قاصد ہے۔ کیا قاصد ہے کہ اس کا تمام وجود ہی سراپا پیغام ہے!
- میں نے ذرّے کو چنگاری کی طرح اپنے وجود کو جلانا سکھایا۔ اپنے وجود کو جلانا سکھایا، پر پھیلانا سکھایا۔
- میں دونوں ہاتھوں سے چلائی جانے والی تلوار ہوں اور آسمان نے مجھے نیام سے نکال لیا۔ پھر سان پر تیز کر کے زمانے کے سامنے لا کھڑا کیا ہے۔
- میں اگرچہ تاریک مٹی سے بنا ہوں مگر مجھ میں ایک ننھا سا دل ہے جو میری کل متاع ہے۔ میری آنکھیں ایک حسن کو دیکھنے کے لیے ستاروں کی طرح کھلی رہتی ہیں۔

"[زبورِ جدید] شروع ہوئی تو اکثر روزانہ یا دوسرے تیسرے دن ایک، دو یا زیادہ غزلیں سنایا کرتے تھے،" غلام رسول مہر کا بیان ہے۔[1]

کشمیر سے سید محمد سعید الدین جعفری کا خط آیا۔ دعوت دی تھی۔ ۱۳/ اگست کو علامہ نے معذرت کا جواب لکھا، "سفر طویل ہے اور طویل سفر میں عموماً میری صحت خراب ہو جاتی ہے۔" کسی اور سوال کے حوالے سے لکھا، "آپ کے خط کا جواب انشاً اللہ سردیوں میں دوں گا۔ جب آپ

---

[1] اُردو ڈائجسٹ اپریل ۱۹۶۴ء میں مہر کی یادداشت؛ شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۳۴۷

تشریف لائیں گے۔ مجھے آپ سے دوبارہ مل کر بڑی مسرت ہو گی۔"[1]

گزشتہ ماہ حکیم محمد یوسف حسن نے نیرنگِ خیال شروع کیا تھا۔ محمد دین تاثیر جوائنٹ اڈیٹر تھے۔ عظیم مصوروں کی تخلیقات، بڑے چھوٹے ادیبوں اور شاعروں کے فن پاروں اور مختلف اشتہارات سے مزین تھا۔ اُن میں حکیم یوسف کی طرف سے بڑھاپا دُور کرنے والی ادویات کے اشتہار بھی شامل تھے۔ پہلے شمارے کے سرورق پر عبدالرحمٰن چغتائی نے 'تحفۂ لیلیٰ' کے عنوان سے تصویر بنائی تھی۔ علامہ نے ۱۷/ اگست کو لکھا کہ رسالہ "ہونہار معلوم ہوتا ہے۔ اس کے مضامین میں پختگی اور متانت پائی جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ یہ رسالہ پنجاب میں صحیح ادبی مذاق پیدا کرنے میں بہت مفید ثابت ہو گا۔ اڈیٹر دونوں نوجوان ہیں اور لٹریچر کی خدمت کا شوق رکھتے ہیں۔"[2]

32

مولانا ظفر علی خاں کو ایک کتاب موصول ہوئی۔ زمیندار میں تبصرے کی غرض سے بھیجی گئی تھی۔ کتاب کا نام تذکرہ تھا۔ قرآن کی ایک نئی تفسیر تھی۔ دس جلدوں میں مکمل ہونی تھی۔ یہ پہلی جلد فل اسکیپ سائز کے قریباً ساڑھے پانچ سو صفحات کی تھی۔ قیمت چار روپے تھی۔ سننے میں آیا کہ آٹھ روپیہ بارہ آنہ، دس روپے اور بارہ روپے والے اعلیٰ ایڈیشن بھی دستیاب تھے۔[3] مصنف عنایت اللہ مشرقی تھے۔ عمر چھتیس برس تھی۔ امرتسر کے مسلمان راجپوت تھے۔ والد صاحب ایک علمی شخصیت تھے۔ مشرقی خود کیمبرج سے مشرقی زبانوں اور ریاضی کی تعلیم حاصل کر کے آئے تھے۔[4]

مولانا ظفر نے کتاب محمد حسین کے حوالے کر دی۔ معلوم ہوتا ہے کہ شملہ سے واپس آ چکے تھے۔ تبصرہ لکھنے لگے۔ علامہ نے بھی توجہ دی۔ کتاب کے بارے میں عجیب و غریب باتیں سننے میں

[1] مکتوب بنام سعید الدین جعفری ۱۳/ اگست ۱۹۲۴ء محولہ بالا

[2] مکتوب بنام حکیم یوسف حسن ۱۷/ اگست ۱۹۲۴ء؛ شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۵۰

[3] چودھری محمد حسین کا مضمون 'تبصرہ بر تذکرہ' قسط ۴۔ زمیندار۔ بشکریہ امجد سلیم علوی

[4] مکتوب بنام سلیمان ندوی ۵/ ستمبر ۱۹۲۴ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۵۲-۵۴۶

آئیں۔ غالباً شبہ کیا جارہا تھا کہ انگریزوں کے کہنے پر لکھی گئی ہے۔ [1]

33

اس ماہ حافظ فضل حق آزادؔ عظیم آبادی نے ایک غزل معارف میں شائع کروائی۔ علامہ کی غزل ''بملازمانِ سلطاں خبرے دہم زرازے'' کی زمین میں تھی۔ ۲۳؍ اگست کو عبدالمجید سالک نے زمیندار میں اپنے کالم 'افکار و حوادث' میں لکھا، ''جب علامہ اقبال کی کوئی نظم شائع ہوتی ہے، اس کے چند ہی روز بعد بہت سے گرے پڑے شاعر اسی زمین میں طبع آزمائی شروع کر دیتے ہیں۔ ہم ان سب کی نیتوں پر حملہ نہیں کرتے لیکن اکثر 'برخود غلط' متشاعروں کا منشا فی الحقیقت 'مقابلہ' ہوتا ہے۔ اس مقابلے کا نتیجہ کچھ نہیں ہوتا۔''[2]

دو روز بعد علامہ کو شاد عظیم آبادی کا خط ملا۔ اصل نام خان بہادر علی محمد تھا۔ بزرگ ترین ادبی شخصیات میں سے تھے۔ تیس سے زیادہ تصانیف شائع ہو چکی تھیں۔ علامہ نے ان کے خط کو تبرک سمجھا۔ فوراً جواب لکھا:

> اس غائبانہ عقیدت کی وجہ سے جو آپ سے ہے، معلوم کر کے بڑی مسرت ہوئی کہ آپ اللہ کے فضل و کرم سے ہمہ وجوہ خیر وعافیت سے ہیں اور باوجود پیرانہ سالی کے آپ کی لٹریری مصروفیتیں کم نہیں ہوئیں۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی تصانیف تمام ملک کے لیے مفید ہوں گی اور دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو ان کی تکمیل کے لیے دیر تک سلامت رکھے۔ جس تمدنی نظام نے آپ کو پیدا کیا وہ تو اب رخصت ہو رہا ہے بلکہ ہو چکا ہے لیکن آپ کی ہمہ گیر دماغی قابلیت اور اس کے گراں بہا نتائج اس ملک کو ہمیشہ یاد دلاتے رہیں گے کہ موجودہ نظام تمدن پرانے نظام کا نعم البدل نہیں ہے۔ کاش عظیم

---

[1] عجیب و غریب باتوں کا حوالہ اقبال نے ندوی کے نام ۵؍ ستمبر ۱۹۲۴ء کے خط میں دیا۔ مشرقی پر انگریزوں کا ایجنٹ ہونے کا شبہ زمیندار ۱۹؍ نومبر ۱۹۲۶ء کے ایک مضمون میں ہے۔ اقتباس اس تاریخ کے تحت شامل کیا جارہا ہے۔

[2] اختر النسا (۲۰۲۰) اقبال اور زمیندار، ص ۲۷۵

آباد قریب ہوتا اور مجھے آپ کی صحبت سے مستفیض ہونے کا موقع ملتا۔[1]

بانگِ درا کی طباعت وغیرہ کا بِل کریمی پریس سے آ گیا تھا۔ عبدالمجید کاتب کا بِل نہیں آیا تھا۔ ۲۶؍ اگست کو علامہ نے شیخ مبارک علی کو لکھا کہ کریمی پریس کا بِل خود ادا کر دیں گے۔ عبدالمجید کا بِل شیخ مبارک نے ادا نہیں کیا تو وہ بھی بھجوا دیا جائے۔ ادا کر دیں گے۔[2]

اُس روز ترکی میں تجارتی بینک کا افتتاح ہوا۔ ریاست کا پہلا بینک تھا۔ مقصد قومی بنکاری پر غیر ملکی تسلط کم کر کے قوم کی اقتصادی آزادی کی حفاظت کرنا تھا۔ بنیاد ڈھائی لاکھ لیرے کے سرمائے پر تھی۔ ہندوستان کے مسلمانوں نے تحریکِ خلافت کے دنوں میں جمع کر کے بھجوایا تھا۔[3]

اگلے روز علامہ کو سید سلیمان ندوی کا خط ملا۔ علامہ کے استفسار کے جواب میں لکھا تھا کہ فقہا نے اجماع سے نص کی تخصیص یا تعمیم جائز سمجھی ہے۔ اگر صحابہؓ کا کوئی حکم نص کے خلاف ہے تو اس کو اس بات پر محمول کیا جائے گا کہ کوئی ناسخ حکم ان کے علم میں ہو گا جو ہم تک روایۃً نہیں پہنچا۔ علامہ نے اُسی وقت جواب لکھا۔ شکریے کے ساتھ چند وضاحتوں کی درخواست کی:

۱ ایسی تخصیص یا تعمیم کی مثال اگر کوئی ہو تو اس سے آگاہ فرمایئے۔ اس کے علاوہ یہ بھی معلوم کرنا ضروری ہے کہ ایسی تخصیص یا تعمیم صرف اجماعِ صحابہؓ ہی کر سکتا ہے یا علما و مجتہدینِ اُمت بھی کر سکتے ہیں۔ اگر مسلمانوں کی تاریخ میں صحابہؓ کے بعد کوئی ایسی مثال ہو تو اس سے بھی آگاہ فرمایئے، یعنی یہ کہ کس مسئلہ میں صحابہ نے یا علمائے اُمت نے نص کے حکم کی تخصیص و تعمیم کر دی۔ میں یہ نہیں سمجھ سکا کہ تخصیص یا تعمیمِ حکم سے آپ کی کیا مراد ہے۔

۲ کیا کوئی حکم ایسا ہے بھی جو صحابہؓ نے نصِ قرآن کے خلاف نافذ کیا ہو' اور وہ کون۔سا حکم ہے۔ یہ بات کہ کوئی ناسخ حکم اُن کے علم میں ہو گا، محض حسنِ ظن پر

---

[1] مکتوب بنام شاد عظیم آبادی ۲۵؍ اگست ۱۹۲۴ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۳۷-۵۳۵

[2] مکتوب بنام شیخ مبارک علی ۲۶؍ اگست ۱۹۲۴ء؛ برنی (۱۹۹۱)، ص۔ ایضاً، ص ۵۳۹-۵۳۷

[3] Andrew Mango (2000). *Ataturk,* p.410

مبنی ہے یا آج کل کی قانونی اصطلاح میں "لیگل فکشن" ہے۔ علامہ آمدی کے قول سے تو بظاہر امریکن مصنف کی تائید ہوتی ہے گو صرف اسی حد تک کہ اجماعِ صحابہؓ، نصِ قرآنی کے خلاف کر سکتا تھا، بعد کے علما ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ ان کے علم میں کوئی ناسخ حکم نہیں ہو سکتا۔

۳ اگر صحابہؓ کے اجماع نے کوئی حکم نصِ قرآنی کے خلاف نافذ کیا تو علامہ آمدی کے خیال کے مطابق ایسا کسی ناسخ حکم کی بنا پر ہوا ہے۔ وہ ناسخ حکم سوائے حدیثِ نبویؐ کے اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ حدیث ناسخِ قرآن ہو سکتی ہے، جس سے کم از کم مجھے تو انکار ہے اور غالباً آپ کو بھی ہو گا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں آپ کو دوبارہ زحمت دینے پر مجبور ہوا، لیکن آپ کے وسیع اخلاق پر بھروسہ کر کے یہ جرأت کی ہے۔

خط لکھنے کے بعد اٹھارویں انیسویں صدی کے قاضی شوکانی کی ارشاد الفحول کا مطالعہ کر رہے تھے۔ وہاں تخصیص اور تعمیم کے مسئلے کی وضاحت مل گئی۔ اگلے روز یا دو دن بعد سلیمان ندوی کو لکھا کہ اس کی وضاحت کی زحمت نہ کریں مگر خط کے باقی حصے کا جواب ضرور دیں۔ اس کے علاوہ:

علامہ آمدی کی کتاب جہاں تک مجھے معلوم ہے، یہاں نہیں ہے۔ ان شأاللہ سرما میں یونیورسٹی کے لیے ایک کاپی منگوانے کی کوشش کروں گا۔ پنجاب میں ایک صاحب نے حال میں قرآن کی تفسیر شائع کی ہے جس کا نام تذکرہ ہے۔ کیا آپ کی نظر سے گذری ہے؟ کتاب اس قابل ہے کہ اس کا ریویو مفصل آپ کے قلم سے نکلے ... [1]

علامہ اقبال کا کلام شائع ہو گیا

بانگِ درا

زمیندار کے صفحات پر علامہ اقبال کے اُردو کلام کی ترتیب و طباعت کا قبل ازیں بارہا

[1] مکتوب بنام سید سلیمان ندوی ۷ ۲/ اگست ۱۹۲۴ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۴۰-۵۳۹

ذکر آ چکا ہے۔ آج ہم انتہائی مسرت و شادمانی کے ساتھ قارئینِ کرام تک یہ جانفزا مژدہ پہنچانے کا شرف حاصل کرتے ہیں کہ علامہ ممدوح کے اُردو کلام کا مجموعہ بانگ درا کے نام سے شائع ہو گیا ہے۔ یہ ساڑھے تین سو صفحات پر مشتمل ہے جس میں تمام چھوٹی بڑی مطبوعہ و غیر مطبوعہ نظمیں، انتخاب و اصلاح کے بعد جمع کر دی گئی ہیں۔ کتاب کا کاغذ، لکھائی اور چھپائی نہایت عمدہ اور دیدہ زیب ہے۔

قیمت چار روپے

ہم اس مجموعے کے متعلق اپنی تفصیلی گزارشات دوسری صحبت میں پیش کریں گے۔ اربابِ شوق کو چاہیے کہ وہ اس نادر روزگار کتاب کو جلد خرید لیں، ورنہ دوسرے اڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔

ملنے کا پتا: مہتمم دارالاشاعت پنجاب، ۱۹۵/ ریلوے روڈ، لاہور

زمیندار ۳۰/ اگست ۱۹۲۴ء[1]

[1] اختر النسا (۲۰۱۰) اقبال اور زمیندار، ص ۹۶

باب ۴

ادب کی درس گاہ

اگست سے دسمبر ۱۹۲۴ء تک

بانگِ درا

اقبال

(جملہ حقوق مع حقِ ترجمہ محفوظ)

کاغذ پر واٹر مارک میں عبارت درج تھی:

Rose Brand—Manufactured by Allah Diya and Sons,
Lahore and Delhi[1]

کتاب کے شروع میں فہرست تھی۔ دیباچے کے بعد کتاب کے تین حصے تھے۔

- حصہ اول (...۱۹۰۵ء تک): ہمالہ؛ گلِ رنگیں؛ عہدِ طفلی؛ مرزا غالب؛ ابرِ کوہسار؛ ایک مکڑا اور مکھی؛ ایک پہاڑ اور گلہری؛ ایک گائے اور بکری؛ بچے کی دعا؛ ہمدردی؛ ماں کا خواب؛ پرندے کی فریاد؛ خفتگانِ خاک سے استفسار؛ شمع و پروانہ؛ عقل و دل؛ صدائے درد؛ آفتاب (ترجمہ گایتری)؛ شمع؛ ایک آرزو؛ آفتابِ صبح؛ دردِ عشق؛ گلِ پژمردہ؛ سید کی لوحِ تُربت؛ ماہِ نَو؛

---

[1] ڈاکٹر محمد رفیع الدین ہاشمی، تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ

انسان اور بزمِ قدرت؛ پیامِ صبح؛ عشق اور موت؛ زہد اور رندی؛ شاعر؛ دل؛ موجِ دریا؛ رخصت اے بزمِ جہاں!؛ طفلِ شیر خوار؛ تصویرِ درد؛ نالۂ فراق؛ چاند؛ بلالؓ؛ سرگذشتِ آدم؛ ترانۂ ہندی؛ جگنو؛ صبح کا ستارہ؛ ہندوستانی بچوں کا قومی گیت؛ نیا شوالہ؛ داغ؛ ابر؛ ایک پرندہ اور جگنو؛ بچہ اور شمع؛ کنارِ راوی؛ التجائے مسافر؛ غزلیات

- حصہ دوم (۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک): محبت؛ حقیقتِ حسن؛ پیام؛ سوامی رام تیرتھ؛ طلبۂ علی گڑھ کالج کے نام؛ اخترِ صبح؛ حسن و عشق؛... کی گود میں بلّی دیکھ کر؛ کلی؛ چاند اور تارے؛ وصال؛ سلیمیٰ؛ عاشقِ ہر جائی؛ کوششِ ناتمام؛ نوائے غم؛ عشرتِ امروز؛ انسان؛ جلوۂ حسن؛ ایک شام؛ تنہائی؛ پیامِ عشق؛ فراق؛ عبدالقادر کے نام؛ صقلیہ؛ غزلیات
- حصہ سوم (۱۹۰۸ء تک): بلادِ اسلامیہ؛ ستارہ؛ دوستارے؛ گورستانِ شاہی؛ نمودِ صبح؛ تضمین بر شعر انیسی شاملو؛ فلسفۂ غم؛ پھول کا تحفہ عطا ہونے پر؛ ترانۂ ملّی؛ وطنیّت؛ ایک حاجی مدینے کے راستے میں؛ قطعہ؛ شکوہ؛ چاند؛ رات اور شاعر؛ بزمِ انجم؛ سیر فلک؛ نصیحت؛ رام؛ موٹر؛ انسان؛ خطاب بہ جوانانِ اسلام؛ غرّۂ سوال یا ہلالِ عید؛ شمع اور شاعر؛ مسلم؛ حضور رسالت مآبؐ میں؛ شفاخانۂ حجاز؛ جوابِ شکوہ؛ ساقی؛ تعلیم اور اُس کے نتائج؛ قربِ سلطان؛ شاعر؛ نویدِ صبح؛ دُعا؛ عید پر شعر لکھنے کی فرمایش کے جواب میں؛ فاطمہ بنتِ عبداللہ؛ شبنم اور ستارے؛ محاصرۂ ادرنہ؛ غلام قادر رہیلہ؛ ایک مکالمہ؛ میں اور تُو؛ تضمین بر شعرِ ابوطالب کلیم؛ شبلی و حالی؛ ارتقا؛ صدّیقؓ؛ تہذیبِ حاضر؛ والدہ مرحومہ کی یاد میں؛ شعاعِ آفتاب؛ عرفی؛ ایک خط کے جواب میں؛ نانک؛ کفر و اسلام؛ بلالؓ؛ مسلمان اور تعلیمِ جدید؛ پھولوں کی شہزادی؛ تضمین بر شعر صائب؛ فردوس میں ایک مکالمہ؛ مذہب؛ جنگِ یرموک کا ایک واقعہ؛ مذہب؛ پیوستہ رہ شجر سے امیدِ بہار رکھ؛ شبِ معراج؛ پھول؛ شیکسپئیر؛ میں اور تُو؛ اسیری؛ دریوزۂ خلافت؛ ہمایوں؛ خضرِ راہ؛ طلوعِ اسلام؛ غزلیات؛ ظریفانہ

1

۳۱/ اگست تھی۔ کابل میں ایک احمدی کو مرتد ہونے کے جرم میں سنگسار کیا گیا۔ عدالت نے فیصلہ دیا تھا۔ انگلستان کے اخبارات ٹائمز، آبزرور، فنانشل ٹائمز، نئیر ایسٹ، ڈیلی ٹیلیگراف، مارننگ پوسٹ، ڈیلی نیوز اور ڈیلی میل نے مذمت کی۔ معزول عثمانی خلیفہ نے شکایت کی۔ ہندوستان میں شیعہ اخبار ذوالفقار اور ہندو اخبار بنگالی نے لکھا کہ امیرِ افغانستان امان اللہ خاں نے مذہبی آزادی کا اعلان کیا تھا۔ احمدی کو سنگسار کرنے کا مقصد علمائے کرام کو خوش کرنا ہے جو جدت پسندی کے مخالف ہیں۔[1]

علامہ اقبال سمجھتے تھے کہ اسلام اُس بحران سے گزرنے والا ہے جو عیسائیت کو مارٹن لوتھر کی صورت میں پیش آیا تھا۔ نئے نظریے سامنے آ رہے تھے۔ مولوی عبداللہ چکڑالوی نے حدیث کا انکار کیا۔ اپنی جماعت کو اہلِ قرآن کہتے تھے۔ رسالہ اشاعتُ القرآن امولوی حشمت علی کی ادارت میں جاری ہوتا تھا۔ مولوی خواجہ احمد الدین نے اُمتِ مسلمہ کے نام سے جماعت بنائی۔ اُن کا عقیدہ تھا کہ حدیث رہنمائی کر سکتی ہے مگر حجت نہیں ہے۔ اس برس امر تسر سے اُن کا رسالہ بلاغ نکلنا شروع ہوا۔ دونوں رسالے علامہ کی نظر سے گزرتے تھے۔[2] ''یونان کا فلسفہ ایک زمانے میں انسانی علوم کی انتہا تصور کیا گیا،'' علامہ سمجھتے تھے، ''جب مسلمانوں میں تنقید کا مادہ پیدا ہوا تو انہوں نے اسی فلسفے کے ہتھیاروں سے اس کا مقابلہ کیا۔ اِس عصر میں معاملات کے متعلق بھی ایسا ہی کرنا ضروری ہے۔''[3] اسلام میں کسی لوتھر کی گنجایش نہ تھی۔ عیسائیت میں لوتھر کی وجہ سے بہتری بھی ہوئی تو یہاں صرف

---

[1] دوست محمد شاہد (۲۰۰۷) تاریخ احمدیت جلد چہارم، ص ۴۸۵-۴۸۰

[2] شاہین (۱۹۹۰-۱۹۸۹) 'مکاتیبِ اقبال بنام صوفی غلام مصطفیٰ تبسم'، ص ۳۴۸-۳۴۴؛ عرشی امر تسری نے 'حیاتِ اقبال کا ایک گوشۂ پنہاں' (۱۹۷۴) میں لکھا ہے کہ اسلامی فقہ کی نئی تشکیل کے لیے علامہ کی نظر میں خواجہ احمد الدین اور اُن کے رفقا ''سب سے زیادہ موزوں تھے'' اور خطبات (*The Reconstruction*) کے لیے بھی قرآن سے جو رہنمائی چاہیے تھی ''اُس میں مدد کرنے والا ملک بھر میں اُن کو خواجہ صاحب کے علاوہ کوئی نظر نہیں آتا تھا۔'' عرشی نے یہ رائے اپنے اور صوفی تبسم کے نام علامہ کے خطوط کی بنیاد پر قایم کی۔ ویسی ہی مدح علامہ کے بعض دوسرے خطوط میں اوروں کے لیے بھی ہے جن کا نقطۂ نظر احمد الدین کے برعکس تھا، جیسے سلیمان ندوی۔

[3] مکتوب بنام سلیمان ندوی ۷/ اپریل ۱۹۲۶ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۳۲

خرابی کا امکان تھا۔

اجتہاد کے موضوع پر حال ہی میں جو مقالہ لکھا، اِسی سلسلے کی کڑی معلوم ہوتا ہے۔ ترمیم اور اضافے جاری تھے۔ عبداللہ چغتائی کہتے ہیں، "مجھے یاد ہے کہ ایک مرتبہ علامہ نے اپنے میکلوڈ روڈ والے مکان پر بھی [جماعتِ احمدیہ لاہور کے بانی] مولانا محمد علی سے اِسی طرح کی گفتگو کی تھی [یعنی 'نبی عام طور پر نئی شریعت لاتا ہے اور ماقبل کی شریعت میں ردوبدل کرتا ہے مگر آپ کی طرف سے ابھی تک کوئی ثبوت نہیں دیا گیا'] اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی حیات موضوعِ گفتگو تھی۔"[1]

"مدت ہوئی میں نے خواب میں دیکھا تھا کہ ایک سیاہ پوش فوج عربی گھوڑوں پر سوار ہے،" علامہ نے بعد میں کہا۔ یہ معلوم نہیں کہ کس زمانے میں دیکھا۔ بیان ۱۹۳۱ء کا ہے۔ اُس سے ایک "مدت" پہلے ہی دیکھا ہوگا۔ "مجھے تفہیم ہوئی کہ یہ ملائکہ ہیں،" علامہ کہتے ہیں، "میرے نزدیک اس کی تعبیر یہ ہے کہ ممالکِ اسلامیہ میں کوئی جدید تحریک پیدا ہونے والی ہے۔ عربی گھوڑے سے مراد روحِ اسلاف ہے۔"[2]

2

تذکرہ پر چودھری محمد حسین کا تبصرہ طویل ہو گیا۔ عنایت اللہ مشرقی کی تحریر خاصی اُلجھی ہوئی تھی۔ "کتاب کی عبارت آغاز سے انجام تک ایک عام مطالعہ کرنے والے کو یہ پتہ نہ لگنے دے گی کہ بالتخصیص و بالیقین میرے اندر کیا خاص مطالب و مقاصد مضمر ہیں،" محمد حسین نے لکھا، "اور دیباچہ جس کے متعلق دانہ میں خرمن اور قطرے میں دریا دکھانے کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ تقسیم و تعیینِ مضامین کا منت کش نہیں۔ نہ اس میں مفروضے قائم کیے گئے ہیں نہ کلئے، نہ ان کے لئے متواتر اور منطقی دلائل پیش کئے ہیں۔ اور نہ ان سے معقول و صحیح نتائج کا استنباط عمل میں آیا ہے۔" محمد حسین نے کتاب کی "غیر مسلسل عبارات اور غیر مربوط مضامین" میں سے پانچ بنیادی نکات دریافت کر لیے۔

---

[1]عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۳۰۳

[2]مکتوب بنام راغب احسن ۲۸/ مئی ۱۹۳۱؛ برنی، کلیات مکاتیب اقبال سوم، ص ۲۱۲

مشرقی کے نظریے کا پہلا نکتہ یہ قرار دیا جا سکتا تھا کہ کسی پیغمبر نے کوئی نیا دین پیش نہیں کیا۔ سب ایک ہی مذہب کو بار بار ظاہر کرتے رہے۔ محمد حسین نے پوچھا:

> معلوم نہیں آپ کے پاس کون سا علم ہے جس کی بنا پر آپ نے تمام مذاہبِ عالم کے متعلق جو ابتدائے آفرینش سے اس وقت تک دنیا میں ظہور پذیر ہوئے یہ فتویٰ دے دیا ہے کہ وہ ایک ہی "قانونِ خدا کو از سرِ نو عیاں کرتے رہے جسے عصیاں کار اور فطرت سے باغی انسانی امتیں بھولتی رہیں اور دردناک سزائیں پا پا کر ہلاک ہوتی رہیں۔
>
> فلسفہ کی بنا قیاسِ ظن اور تخیل ہے۔ آپ ایسے مفروضہ کو کیوں وضع کرتے ہیں جو آپ کے معیارِ 'علم' کے مطابق کبھی قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ ڈارون کے مسئلۂ ارتقا پر لکھتے وقت آپ نے اُس مسئلے کی تمام شقوں کو کھینچ تان کر قرآن سے استنباط کرنے کی سعی کی ہے (اگرچہ سعی لاحاصل ہے)۔ ممکن ہے ارتقا سے آپ کی مراد محض جسمانی و مادی ارتقا ہو کیونکہ اس کی تشریح کہیں نہیں دی گئی۔ اور اگر آپ ادراکی و روحانی، اخلاقی اور تمدنی ارتقا کے بھی قائل ہیں تو نہیں معلوم کس 'علم' کی بنا پر آپ نے تمام پیغمبروں کی وحی کو ایک ہی وحی قرار دیا ہے۔

مشرقی کا دوسرا نکتہ یہ تھا کہ اسلام پیغمبرِ خدا کی رحلت کے بعد فوراً ہی مسخ ہو گیا۔ قرآن کے معنی میں بھی تحریف ہو گئی۔ ایمان، شرک، عبادت، کفر، تقویٰ، ظلم اور فسق جیسی بنیادی اصطلاحات کے مفہوم مسلمانوں نے غلط سمجھے۔ قرآن کو سمجھنے کا صحیح معیار لغت، صرف و نحو، حدیث، اجماع وغیرہ نہیں بلکہ "علم" تھا۔ اسلام کے پانچ ارکان بھی درست نہیں بلکہ اصل ارکان دس تھے: (۱) توحید فی العمل (۲) وحدتِ امت (۳) اطاعتِ امیر (۴) جہاد بالمال (۵) جہاد بالسیف والنفس (۶) ہجرت (۷) استقامت فی السعی مع التوکل فی النتائج (۸) علم (۹) مکارمِ اخلاق (۱۰) ایمان بالآخرہ۔

محمد حسین نے لکھا، "آپ کا شُکریہ کہ آپ نبوت و الہام کے مدعی نہیں ہوئے۔ دعویٰ ہے تو صرف یہ کہ... قرآن حکیم کو یا تو خود رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم سمجھ سکے۔ اور یا اُس سے تیرہ سو سال بعد آج آنجناب نے سمجھا ہے۔" مصنف سے پوچھا:

سوال صرف یہ ہے کہ ان الفاظ و اصطلاحات کے مطالب و معانی اب آپ کو کس طرح ہاتھ آئے؟ آپ نے قرآن کی آیات و الفاظ کی دوسری قرآنی الفاظ و آیات سے تشریح کی مگر وہ دوسرے بھی تو اپنی جگہ باعتبارِ معانی جزواًیہ کلیۃً مسخ ہو چکے ہیں۔ اچھا بفرضِ استدلال ہم مان لیتے ہیں کہ اب آپ نے از سرِ نو قرآنی الفاظ کو اُن کے صحیح معانی عطا کیے ہیں۔ تو "علمِ لغت" کے متعلق جو "قانونِ قدرت" آپ خود بیان کر چکے ہیں، کیا وہ آپ کے لغات پر چسپاں نہ ہو گا۔ یہ تو آپ مانتے ہیں کہ رسول اللہ صلعم قرآنی الفاظ کے صحیح معانی جانتے تھے۔ جب اُن کے صحیح بتائے ہوئے صحیح معانی اگر تیس چالیس سال کے اندر اندر مسخ ہو گئے تو اب آپ کے بتائے ہوئے معانی کتنا عرصہ کاٹیں گے؟

مصنف نے قرآن کو سمجھنے کا اصل معیار علم کو قرار دیا تھا۔ محمد حسین نے دکھایا کہ تذکرہ اِس معیار پر خود پوری نہیں اُترتی۔ اپنی بے ربط عبارت کی وجہ سے قاری کو تاثر دے سکتی ہے جیسے کوئی گہری بات کہی گئی ہے لیکن اصل میں کچھ بھی نہیں۔ مثلاً علم کی تعریف قرآن شریف کی اس آیت پر قائم کی: ولا تقف مالیس لک بہ علم ان السمع والبصر والفواد کل اولٰئک کان عنہ مسؤلا [یعنی اُس چیز کے پیچھے مت پڑو جس کا تمہیں علم نہیں ہے، بیشک کان اور آنکھ اور دل ان سب سے سوال ہونا ہے] لیکن آگے چل کر کان اور آنکھ کی گواہی کو بعض اعتبار سے باطل قرار دے دیا۔ اِسی طرح "فواد" کے متعلق (۱) پہلے یہ لکھا کہ اس کا مفہوم دل ہے؛ (۲) پھر دکھایا کہ اِس میں وہ تمام اعضا شامل ہیں جو سوچنے سمجھنے سے تعلق رکھتے ہیں، اس لیے "قلبِ سلیم" صحیح ترجمہ ہے۔ دل ہی کے ذریعے انسان سوچتا بھی ہے؛ (۳) پھر کہا کہ دل کسی چیز کو قبول نہیں کرتا جب تک ذہن اُسے قبول نہ کر لے، اس لیے فواد کا صحیح ترجمہ "ذہنِ سلیم" ہے۔ محمد حسین نے لکھا، "عام زبان میں مراد غالباً آپ کی یہ ہے کہ لفظ فواد دل و دماغ دونوں پر حاوی ہے اور دماغ دل کا ایجنٹ ہے مگر اسطرح لکھتے تو عبارت مختصر ہو جاتی اور تشریح میں ابہام کی شکایت نہ پیدا ہوتی!" مشرقی نے "فواد" ہی میں باقی حواس یعنی چھونے، چکھنے، دیکھنے اور سننے کو بھی شامل کر دیا کیونکہ اُن کے تجربات کی اطلاع بھی ذہن کے ذریعے ملتی ہے۔

محمد حسین کے نزدیک اِس طرح دل کی حیثیت کم ہوتے ہوتے صفر تک پہنچ جاتی تھی۔

ارکان کے حوالے سے مشرقی نے ثابت کرنے کی کوشش کی کہ صلٰوۃ یعنی نماز دین کا رُکن نہیں ہے۔ اس کا مفہوم دل میں ایک کیفیت پیدا کرنا، نتیجہ خیز اطاعت، ضبطِ نفس، عمل کی اہمیت، اخوت، موالات، تعاون اور محافظت ہے۔ چونکہ ''صلٰوۃ'' کے لغوی معنوں میں یہ چیزیں موجود نہ تھیں اِس لیے انہیں نماز کے مروجہ ارکان اور ظواہر میں تلاش کر کے دکھایا لیکن اُس کے بعد کہہ دیا، ''الصلوٰۃ کو محمدی نماز [یعنی مروجہ طریقہ] کے ظواہر اور ارکان سے کچھ سروکار نہیں۔'' محمد حسین یہ کہے بغیر نہ رہ سکے کہ مشرقی کے دلائل ''جہاں اُٹھتے ہیں وہیں بیٹھ جاتے ہیں۔''

تیسرا نکتہ اس کتاب میں سے یہ اخذ کیا جا سکتا تھا کہ اسلام کے صحیح ارکان کے لحاظ سے اہلِ فرنگ حقیقی اور سچے مسلمان ہیں۔ موجودہ مسلمان کافر و مشرک ہیں۔ محمد حسین نے لکھا:

> آپ کے معینہ ایمان و کفر کے مطابق اہلِ فرنگ اِس وقت مسلمان ہیں۔ آپ ہم مسلمانوں کو اتحاد و حکومت کا پیغام کس بنا پر دیتے ہیں؟ ہمیں کس سعی و عمل پر آمادہ کرتے ہیں؟... آپ کو موجودہ مسلمان صحیح مسلمان نظر نہیں آتے تو آپ چپ چاپ اپنے ایمان کے مطابق حکمرانوں یعنی صحیح مسلمانوں میں مل جائیں۔

چوتھا نکتہ یہ تھا کہ اسلام عربوں میں پیدا ہوا لیکن اسے تباہ کرنے والے بھی وہی ہیں۔ اُن کے ورثے سے دُور رہنے کی ضرورت ہے۔ محمد حسین نے لکھا، ''جمہور مسلمانوں کا یہ عقیدہ چلا جا رہا ہے کہ یہ قوم فطرتاً حریت پسند ہے، جری ہے، غیور ہے، دنیا میں غالب ہو کر رہنے کے خیال کو کبھی ترک نہیں کر سکتی۔ ان کی زندگی صحرائی ہے، صحرائی رہے گی۔ وہ انحطاط و زوال پیدا کرنے والے تمدن و تہذیب سے طبعاً متنفر ہے۔ اسلامی سوسائٹی میں عرب عنصر کا ہمیشہ قائم و مضبوط رہنا مشیتِ ایزدی میں تھا۔'' مشرقی کے مطابق عربوں نے قرآن کے غلط معانی کو رواج دیا۔ مذہب کو فلسفے کی نذر کر دیا۔ لیکن مشرقی نے کوئی تاریخی ثبوت پیش نہ کیا۔

محمد حسین نے تاریخ سے مثالیں پیش کر کے تردید کی۔ پھر لکھا، ''عربوں کی جس بات پر آج کی اسلامی دنیا شاکی ہے۔ وہ اسلام سے ہٹ کر اُن کا محض 'سلطنت پرستی' میں غرق ہونا تھا جو آپ کے

نزدیک عین 'اسلام' ہے۔اور جو مسلمانوں کے نزدیک (اگر وہ محض 'سلطنت پرستی' ہے جیسی سلطنت کہ بنی امیہ نے قائم کی) اسلام کے حق میں مہلک ثابت ہوا۔'' جہاں تک عربوں کے علوم کا تعلق ہے:

> ان علوم کی تاریخ آپ کو بتائے گی۔ کہ یہی علوم جب ہسپانیہ میں پہنچے۔ اور وہاں سے فرانس میں منتقل ہوئے۔ تو یورپین اقوام اور ان کے تہذیب و تمدن کو موجودہ ارتقا پر لانے کے لئے کس درجہ ممد و معاون ہوئے۔ یورپ میں دو سب سے بڑی تحریکیں یعنی تحریکِ ''احیائےعلوم'' اور تحریکِ ''اصلاحِ مذہبی'' انہی عربی علوم نے پیدا کیں۔ اسلام کا جو کچھ بگڑا...اُس کے وجوہ کی تحقیق ایک وسیع و دقیق کام ہے۔ جو افسوس کہ اب تک کسی مسلمان نے تمام نہیں کیا۔ ان بیرونی علوم کی ترویج سے بھی ضرور مذہب اسلام کو صدمہ پہنچا مگر اِتنا نہیں۔ کہ مسلمانوں کے زوال کا تمام الزام اسی ایک بات پر مبنی کیا جائے۔ اور حقیقت یہ ہے۔ کہ ان علوم نے کوئی صدمہ نہیں پہنچایا۔ بلکہ اُن اقوام نے صدمہ پہنچایا۔ جو فطرتاً نہایت بری طرح ''غیر اسلامی'' واقع ہوئی تھیں۔ طوعاً و کرہاً محکوم ہو کر مسلمان ہو گئیں۔ اور پھر جب سر اُٹھانے کی فرصت ملی۔ اپنے اصل معتقدات کی طرف رجوع کر گئیں۔ اور اِسلامی جماعت میں تفرقوں کا بنیاد رکھنے کی مجرم بنیں۔ مسلمانوں میں بہ حیثیت جماعت و مذہب تفرقے پیدا کرنا ان کا اہم ترین مقصد تھا۔ اس لئے کہ ان تفرقوں کے بغیر وہ بہ حیثیت قوم دنیا میں دوبارہ حکومت حاصل نہیں کر سکتی تھیں۔

محمد حسین کے مطابق مشرقی کے پہلے تین دلائل یعنی وحدتِ مذہب، ارکانِ اسلام اور فرنگ کا اہلِ ایمان ہونا در حقیقت چوتھے اور پانچویں نکات کو ثابت کرنے کے لیے پیش کیے گئے تھے۔ پانچواں نکتہ یوں بیان ہو سکتا تھا کہ جن اقوام کے قبضے میں اس وقت حکومت و اقتدار ہے وہی وراثتِ زمین کی مستحق ہیں۔ اُن میں اسلام کے ''دس ارکان'' میں سے کم از کم پانچ ضرور پائے جاتے ہیں۔ مسلمانوں میں ایک بھی موجود نہیں۔ قرآنی تعلیم کا اصل مقصد بھی محض وراثتِ زمین ہے۔ اس لیے مسلمانوں کی برائے نام خلافت کا مسئلہ بھی بے معنی ہے۔ مشرقی نے خیال ظاہر کیا تھا کہ قرآن میں جنّت کی جمع

"الجنّات" سے اگلی دنیا کی جنتیں مراد ہیں مگر جہاں جہاں صرف "جَنّات" آیا ہے، وہاں اِسی دنیا کے زرخیز علاقے مراد ہیں۔ خدا نے مسلمانوں سے وعدہ کیا ہے کہ اگر متحد، طاقتور اور غالب رہیں تو سارے زرخیز علاقوں کے وارث بنا دیئے جائیں گے۔ اس پر محمد حسین نے لکھا:

> یہ بات بظاہر بہت دلفریب معلوم ہوتی ہے مگر یہ تو فرمایئے کہ خدا ایک قوم یا نسل کی زمینوں یا خطوں کو دوسری قوم کے حوالے کر دینے میں کس حد تک حق بجانب ہے۔ فرض کر لیجیے کہ حق بجانب ہے۔ پھر اگر مسلمان اپنے بنجروں اور ریگستانوں میں ابھی حملے اور فوج کشی کی تیاریوں ہی میں ہوں اور گردونواح کے زرخیز علاقوں والے پہلے ہی بذریعہ تبلیغ و تلقین اسلام قبول کر لیں تو خدا کے اِس وعدہ پر ریگستانی و صحرائی مسلمانوں کا عقیدہ کس حد تک باقی رہ جائے گا؟ پنجاب میں اسلام پہلے آیا ہو۔ کشمیر کے لوگ ابھی کافر ہی ہوں۔ پنجابیوں کو جنّتِ کشمیر کے وعدہ سے ابھی بھڑکایا ہی جارہا ہو کہ کشمیری پہلے ہی ڈر کر مسلمان ہو جائیں۔ فرمایئے پنجابی جاٹوں کی امیدوں کا کیا حشر ہو گا؟ وہ مسلمان ہی رہیں گے یا پھر "شُدھ" ہو جائیں گے؟ اور پھر قرآن میں جن آیتوں میں لفظ "جَنّات" بغیر الف لام کے آیا ہے وہ تو بعض ایسی بھی ہیں و الذین آمنوا و عملوا الصالحات سندخلھم جنّٰت تجری من تحتھا الانھار خالدین فیھا ابدا۔ لھم فیھا ازواج مطھرۃ وندخلھم ظلاً ظلیلا۔ وعدہ تو یہ ہے کہ یہ "دنیوی جَنّات" جب ایک دفعہ مسلمانوں کو مل جائیں گی تو پھر ابد الآباد تک انہی کے قبضہ میں رہیں گی۔ اب آپ ہی فرمایئے کہ ہسپانیہ و فرانس و صقلیہ و ہنگری کی "جَنّات" ایک دفعہ مسلمانوں کو دے کر پھر اُن سے واپس کیوں لے لی گئیں؟ یہ کہاں لکھا ہے کہ جنّت دے کر پھر چھین بھی لیں گے؟ چھن جانے والی جنّت پر مسلمان کبھی تھوکنا بھی گوارا نہ کریں۔ اور پھر یہ کیا کہ ہم وہاں کی "ازواجِ مطہرات" بھی تمہارے ہی سپرد کریں گے۔ "مطہرات" سے آپ غالباً کنواری عورتیں مراد لیں گے۔ افسوس ہے اگر خدا اس قسم کے لالچوں سے مسلمانوں کے دلوں میں دنیوی اقتدار و حکومت کا جذبہ پیدا کرے۔ ایسی بیہودہ اور

فضول امیدیں تو کبھی مسلمان کمانداروں نے اپنی افواج کو نہ دلائی ہوں گی۔ دنیوی باغات کے متعلق قرآن میں لفظ جنّت کئی دفعہ استعمال ہوا۔ آپ نے قرآن میں یہ کوئی نئی تحقیق نہیں کی مگر یہ کہنا کہ جنّات بغیر الف لام کے جہاں آیا ہے وہاں ہر جگہ دنیا کے زرخیز علاقے ہی مراد ہیں، بڑا ہی مضحکہ انگیز ہے۔

محمد حسین کے مطابق کتاب غیر صحیح و غیر فصیح ادب و انشا، غیر موزون و غیر مناسب تراکیب، غلط محاورات، پنجابی الفاظ و محاورات کی کثرت اور قرآنی آیات کی بے محل اور غلط تشریحات سے مزین تھی۔ "نہیں معلوم آپ نے کتنی تعداد میں تمام کتاب چھپوائی ہے،" انہوں نے آخر میں لکھا، "ابھی آپ فرماتے ہیں، ایسی نو جلدیں اور شائع ہوں گی۔ نصف لاکھ کے قریب روپیہ اس پر اُڑ جانا کوئی بڑی بات نہیں۔ مسلمان پبلک بڑی جاہل اور قدر ناشناس ہے۔ آپ کے دل کو خسارے کا اندیشہ المناک نہ کرتا ہو گا[؟]۔ ایسے مہمات الامور کے لیے قارون کا خزانہ ہی کام دے سکتا ہے۔ جو کچھ آپ دس جلدوں میں مسلمانوں کو کہنا چاہتے ہیں کیا وہ اِسی پانسو صفحوں کی جلد میں نہیں آ گیا؟ آپ کی قرآن کی تفسیر یہ ہے کہ اسلام دراصل فتح و غلبہ، حکومت و وراثتِ زمین کا نام ہے۔ کہیں دس جلدوں سے مسلمان اتنے نہ بھڑک اُٹھیں کہ حکومتِ وقت سے باغی ہو کر اُس سے جہاد و قتال پر آمادہ ہو جائیں۔ جوش و غیرت اور ہمت و آمادگی پیدا کرنے کے لیے میرے خیال میں یہی جلد ضرورت سے زیادہ کافی ہو گی۔"

تبصرہ مشرقی کے نام ایک کھلے خط کی صورت میں لکھا گیا۔ زمیندار نے قسط وار شائع کیا۔ عنوان تھا 'تبصرہ بر "تذکرہ" قرآن حکیم کی جدید تفسیر (؟) مسلمانوں کے لئے نیا فتنہ۔ مکتوبِ مفتوح بنام مصنف'۔ اقساط ۳۱/ اگست، یکم ستمبر، ۳/ ستمبر اور ۵/ ستمبر کو شائع ہوئیں۔[1]

3

شیخ اعجاز احمد کا نام ملازمت کی فہرست میں نہ آیا۔ سیالکوٹ میں کہا جا رہا تھا کہ سیالکوٹ کے وکلا کی حق تلفی ہوئی ہے۔ اعجاز نے علامہ کو خط لکھا۔ غالباً درخواست کی کہ ہائی کورٹ کے ججوں سے سفارش

[1] چودھری محمد حسین، 'تبصرہ بر تذکرہ'۔ زمیندار ۳۱/ اگست، یکم ستمبر، ۳/ ستمبر اور ۵/ ستمبر ۱۹۲۴ بشکریہ امجد سلیم علوی۔

کریں۔ شیخ عطا محمد کا خط بھی ملا۔ علامہ نے ۲/ستمبر کو جواب دیا۔ چیف جج سے خود بات کرنے کی حامی بھری۔ انہی دنوں اعجاز کے نام بھی لکھا، ”سیالکوٹ شہر کے وکلا کو خاص طور پر اِس امر کے خلاف احتجاج کرنا چاہیے کہ سیشن جج صاحب نے اپنی سفارشات میں اُن کے حقوق کو نظر انداز کر دیا ہے۔ بار کمیٹی کو چاہیے کہ وہ اس کے خلاف رزولیوشن پاس کر کے چیف جج صاحب کے نام بھیج دے۔“[1]

انجمن حمایت اسلام کی صدارت سے استعفادے دیا۔ طبیعت مضمحل تھی۔ سلیمان ندوی کا خط ملا۔ وہ کانگریس سے بددل ہو گئے تھے۔ علامہ نے بستر پر لیٹے لیٹے ہی جواب لکھا۔[2]

بنام سید سلیمان ندوی

لاہور

۵/ستمبر ۱۹۲۴ء

مخدومی

السلام علیکم

والانامہ ابھی ملا ہے جس کے مضمون سے بہت تسکین ہوئی۔

انجمن حمایتِ اسلام کا صدر مجھے منتخب کیا گیا تھا، مگر میں نے بعض وجوہ سے استعفادے دیا ہے۔ کونسل میں اختلاف ہے اور عام حالت اس انجمن کی اچھی نہیں ہے۔ بعض ارکان ذاتی اغراض سے اس میں داخل ہیں اور اُن کے نزدیک انجمن ان اغراض کے حصول کا ذریعہ ہے اور بس۔ اس وقت وہی جماعت جلسہ کی تیاریاں کر رہی ہے، مگر آپ ضرور تشریف لائیں۔ یہاں کے لوگوں کو ختمِ نبوت کے مسئلے میں بڑی دلچسپی ہے، اور آپ کی تقریر اِن۔شآٗ۔اللہ بے حد توجہ سے سُنی جائے گی۔ اس کے علاوہ میں ایک مدت سے آپ کی ملاقات کا اشتیاق رکھتا ہوں، میرے ہی غریب خانہ پر ٹھہریئے۔ یہاں سے انجمن کا جلسہ گاہ کچھ دور نہیں، موٹر پر چھ منٹوں کی راہ ہے۔

---

[1] مکتوباتِ اقبال بنام شیخ عطا محمد ۲/ستمبر ۱۹۲۴ء اور اعجاز احمد (بلا تاریخ)؛ برنی (۱۹۹۱) ص ۵۴۶-۵۴۵

[2] مکتوب بنام سلیمان ندوی ۵/ستمبر ۱۹۲۴ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۵۲-۵۴۶

جناب مشرقی امرتسر کے رہنے والے ہیں، نوجوان آدمی ہیں۔ کیمبرج میں ریاضی کا اعلیٰ امتحان پاس کیا۔ ہندوستان واپس آئے تو کچھ مدت کے لیے پشاور کالج کے وائس پرنسپل رہے، اس کے بعد گورنمنٹ آف انڈیا کے محکمہ تعلیم میں رہے۔ آج کل غالباً کسی سرکاری سکول کے ہیڈ ماسٹر ہیں۔ مجھے اُن کی قابلیت کا حال زیادہ معلوم نہیں مگر اس کتاب کے ریویو سے جو کچھ معلوم ہوا، وہ یہ ہے کہ مغربی افکار پر بھی ان کی نظر نہایت سطحی ہے۔ باقی، تفسیرِ قرآن و تاریخِ اسلام کے متعلق آپ مجھ سے بہتر اندازہ کر سکتے ہیں۔ اُن کی کتاب کے متعلق یہاں عجیب و غریب افواہیں ہیں، زبانی عرض کروں گا۔ زمیندار میں تذکرہ پر ایک ریویو مفصل شائع ہوا ہے جو مصنف نے محنت و کاوش سے لکھا ہے، مگر سید سلیمان ندوی کا اسٹائل اور وسعتِ نظر اس کو حاصل نہیں۔ مجھے تذکرہ کا علم اسی ریویو سے ہوا۔

جناب مشرقی جہاں تک مجھے معلوم ہے 'خود مدعی نہیں ہیں۔ "اُمتِ مسلمہ" سے ممکن ہے ان کا تعلق ہو کیونکہ آج کل "اُمتِ مسلمہ" کا سنٹر امرتسر ہے۔ بہائی فرقہ سے بھی، جہاں تک مجھے معلوم ہے 'اُن کا تعلق نہیں ہے۔ مختصر یہ ہے کہ یوروپین افکار کی تاریخ کا اعادہ آج کل دنیائے اسلام میں ہو رہا ہے۔ ان حالات میں جو اِس وقت کیفیت آپ کے قلب کی ہے، وہ ایک حد تک نیچرل اَمر ہے، میں مگر آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ آپ جو کام کر رہے ہیں، وہ اُمتِ مسلمہ کے لیے ازبس مفید ہے۔ دُنیائے اسلام اس وقت ایک روحانی پیکار میں مصروف ہے۔ اس پیکار و انقلاب کا رُخ متعین کرنے والے قلوب واذہان پر شک اور ناامیدی کی حالت کبھی کبھی پیدا ہو جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کا قلب قوی ہے اور ذہن ہمہ گیر، آپ اس حالت سے جلد نکل جائیں گے یا صوفیہ کی اصطلاح میں یوں کہیے کہ اس مقام کو جلد طے کر لیں گے۔ آپ قلندر رہیں، مگر وہ قلندر جس کی نسبت اقبال نے یہ کہا ہے:

قلندراں کہ براہِ تو سخت می کوشند
ز شاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند
بجلوت اند و کمندے بہ مہر و مہ پیچند
بخلوت اند و زمان و مکاں در آغوشند
دریں جہاں کہ جمالِ تو جلوہ ہا دارد

ز فرق تا بہ قدم دیدہ و دل و گوشند
بروزِ بزم سراپا چو پرنیان و حریر
بروزِ رزم خود آگاہ و تن فراموشند

آپ اس جماعت کے پیش خیمہ ہیں۔ اس جماعت کا دُنیا میں عنقریب پیدا ہونا قطعی اور یقینی ہے۔ باقی جس راہ پر آپ اس سے پہلے قدم زن تھے، اس کے متعلق انشأ اللہ بوقت ملاقات گفتگو ہو گی۔ ہندوستانی نیشنلزم کی انتہا یہی تھی جو آپ کے مشاہدہ میں آ گئی۔

امید کہ مزاج بخیر ہو گا۔ یہ خط بستر پر لیٹے لیٹے لکھا ہے، آج طبیعت بہت مضمحل ہے، بد خطی معاف فرمایئے گا۔

مخلص

محمد اقبال

4

خط میں جو فارسی اشعار لکھے وہ ابتدائی شکل تھی۔ قطع برید ہو رہی تھی۔ بعد میں کچھ اور صورت نکلی:

وہ قلندر جو دنیا کی تسخیر میں لگے رہتے ہیں، بادشاہوں سے خراج وصول کرتے ہیں اگرچہ خرقہ پوش ہیں۔

جلوت میں ہوں تو سورج اور چاند پر کمندیں پھینکتے ہیں اور خلوت میں زمان و مکاں ان کی آغوش میں سمائے ہوتے ہیں۔

بزمِ دوستاں میں ان کا سراپا ریشم و کمخاب سا ملائم ہوتا ہے اور جب یہ میدانِ عمل میں ہوتے ہیں تو اپنی خودی سے آگاہ اور تن سے بے نیاز ہوتے ہیں۔

یہ اس دوغلے اور دورنگے آسمان کو نیا نظام عطا کرتے ہیں اور پرانے ستاروں کا جنازہ اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں۔

زمانہ مستقبل کے چہرے سے نقاب کھینچ چکا ہے مگر یہ معاشرہ ابھی تک ماضی کی شراب سے

بدمست ہے۔

میرے لبوں نے وہ بات کہہ دی ہے جو کہنے کی نہیں تھی میں حیران ہوں کہ فقیہہِ شہر ابھی تک خاموش کیسے ہیں۔

قلندراں کہ بہ تسخیرِ آب و گِل کوشند   زشاہ باج ستانند و خرقہ می پوشند

بجلوت اند و کمندے بہ مہر و ماہ پیچند   بخلوت اند و زمان و مکاں در آغوشند!

بروزِ بزم سراپا چو پرنیان و حریر   بروزِ رزم خودآگاہ و تن فراموشند

نظامِ تازہ بچرخِ دورنگ می بخشند   ستارہ ہائے کہن را جنازہ بر دوشند!

زمانہ از رُخِ فردا کشود بندِ نقاب   معاشراں ہمہ سرمستِ بادۂ دوشند

بلب رسید مرا آں سخن نہ نتواں گفت   بحیرتم کہ فقیہانِ شہر خاموشند![1]

ندوی نے غالباً خط میں لکھا کہ پیغمبرِ اسلامؐ سے جب کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتا تو بعض دفعہ آپؐ وحی کا انتظار فرماتے۔ نازل ہوتی تو اس کے مطابق جواب دیتے۔ ورنہ قرآن شریف کی کسی آیت سے استدلال فرماتے۔ جواب کے ساتھ وہ آیت بھی پڑھ دیتے۔ علامہ کے ذہن میں سوال پیدا ہوا:

جو جواب وحی کی بنا پر دیا گیا، وہ تمام اُمت پر حجت ہے (اور وہ وحی بھی قرآن شریف میں داخل ہو گئی) لیکن جو جواب محض استدلال کی بنا پر دیا گیا جس میں وحی کو دخل نہیں، کیا وہ بھی تمام اُمت پر حجت ہے؟ اگر جواب اثبات میں ہو تو اس سے یہ لازم آئے گا کہ حضورؐ کے تمام استدلالات بھی وحی میں داخل ہیں۔ یا بالفاظِ دیگر یہ کہ قرآن وحدیث میں کوئی فرق نہیں۔[2]

زمیندار کے ۷/ستمبر کے پرچے میں بانگِ درا کا دوسرا اشتہار شائع ہوا۔ پھر ستمبر کی ۱۲/، ۱۵/اور

[1] بیاضِ زبورِ عجم

[2] مکتوب بنام ندوی ۱۶/اکتوبر ۱۹۲۴ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۵۳-۵۵۲

۱۸/ تاریخ کے علاوہ یکم اور ۴/ اکتوبر کو بھی شائع ہوا۔ [1]

ترجمانِ حقیقت، لسانِ اسلام ڈاکٹر سر محمد اقبال مدظلہٗ العالی
اُردو کلام کا مجموعہ شائع ہو گیا
بانگِ درا

جناب علامہ ممدوح کی تقریباً ڈیڑھ سو عالی پایہ حیات افروز اور جذبہ انگیز نظموں کا مجموعہ ہے جس میں جناب ممدوح نے اپنی شائع شدہ نظموں کو بعد اصلاح و انتخاب مرتب فرمایا ہے اور بہت سی غیر مطبوعہ نظمیں بھی شامل کی ہیں۔ جناب علامہ کا تخیل بلند، آپ کی ترجمانی فطرت، آپ کے رشحات خیال کا جوش و خروش، ہماری تعریف سے مستغنی ہے۔ ہم اقبال کے بادۂ تخیل کے سرشاروں کو صلاح عام دیتے ہیں کہ جہاں تک جلد ہو سکے، وہ اس بے بہا مجموعے کو خرید لیں۔ فرمائشوں کی اس قدر بھرمار ہے کہ چند ہی روز میں پہلا اڈیشن ختم ہو جائے گا اور دوسرے اڈیشن کا انتظار جیسا کچھ سوہان روح ہوا کرتا ہے، اسے اربابِ ذوق خوب جانتے ہیں۔ قیمت مجلد صرف چار روپے۔

کتابت و طباعت نہایت نظر فریب، کاغذ نفیس، ضخامت ساڑھے تین سو صفحات۔

ملنے کا پتا: سیّد ممتاز علی اینڈ سنز، دارالاشاعت پنجاب: ۱۹۵/ ریلوے روڈ، لاہور

5

ہندُو مسلم فسادات معمول بن چکے تھے۔ آئے دن کسی نہ کسی شہر سے خبر آ جاتی تھی۔ شر انگیز کتاب شائع کرنے کے جرم میں راجپال پر تعزیراتِ ہند کی دفعہ ۱۵۳/ الف کے تحت مقدمہ بھی قائم ہوا۔ ستمبر کے اوائل میں مولوی ثنأاللہ امرتسری کی کتاب مقدس رسول ؐ شائع ہوئی۔ راجپال کے جواب میں تھی۔ آریہ سماج کے اخبار پرتاب نے لکھا، ”ہم مولوی صاحب کی اِس تصنیف کا تہِ دل سے خیر مقدم کرتے ہیں۔ یہ ہے مذہبی میدان میں جوہرِ طبیعت دکھانے کا اصلی ڈھنگ۔“[2] مولوی

---

[1] اختر النسا (۲۰۱۰)، اقبال اور زمیندار، ص ۹۷-۹۶

[2] ثنأاللہ امرتسری، مقدس رسول ؐ، ص ۲۵-۲۴، ۳۵-۳۴

امرتسری کا موقف کچھ یوں تھا:

> برادرانِ اسلام! آج کل جو کچھ کلماتِ ناشائستہ آپ لوگ اسلام اور پیغمبرِ اسلام علیہ السلام کی شانِ والا شان میں سنتے ہیں اور اُن سے رنجیدہ خاطر ہونا لازمی ہے۔ مگر ایک معنی سے یہ جائے مسرت بھی ہے۔ وہ یوں کہ مخالفوں کی بدزبانی اور دل آزاری سے قرآن مجید کی ایک پیش گوئی کی تصدیق ہوتی ہے۔ پس آپ غور سے سنیئے۔ ارشاد ہے: "تم لوگ مخالفان اور منکرانِ اسلام سے سخت سخت باتیں سنو گے" (پارہ ۱۰۔ رکوع ۱۴)۔
>
> یعنی مخالفینِ اسلام تمہارے اور تمہارے مذہب کے حق میں سخت سے سخت بدگوئی کریں گے۔ جو تم ہمیشہ سنو گے۔ تو یہ ہے پیش گوئی۔ مگر تم مسلمانوں کا اس وقت فرض کیا ہو گا۔ وہ بھی سن لو: "اگر تم مسلمان (ان کی سخت کلامی سن کر) صبر کرو گے اور خدا سے ڈرتے رہو گے تو یہ خدا کے نزدیک پسندیدہ کام ہو گا۔"
>
> پس اے برادرانِ اسلام! آپ لوگوں کو جو ایسی سخت کلامی سے رنج ہوتا ہے تو اس رنج میں اس خدائی حکم کو اپنا نصب العین بنالیا کرو۔ اور سخت کلامی کرنے والوں کو خدائے ذوالانتقام کے حوالہ کر دیا کرو۔[1]

کوہاٹ صوبۂ سرحد کا شہر تھا۔ سرداروں کی آن باقی تھی۔ شان رخصت ہو چکی تھی۔ اقتدار فرنگی کے ہاتھ میں تھا۔ دولت ہندو مہاجنوں کے پاس جاچکی تھی۔ وہ تعداد میں کم تھے۔ قوت وشوکت میں زیادہ تھے۔ ایک شادی شدہ مسلمان عورت غائب ہوئی۔ مسلمان کہتے تھے کہ سردار مکھا سنگھ کے بیٹے نے اغوا کیا ہے۔ تفتیش ہوئی۔ نتیجہ نہ نکلا۔

ہندومت کے فروغ کے لیے سناتن دھرم سبھا قائم تھی۔ اُس کا سیکرٹری جیون داس راولپنڈی گیا۔ ایک خاص کتابچہ چھپوا کر لایا۔ سرورق پر شری کرشن کی تصویر تھی۔ اندر کچھ بھجن تھے۔ ہندو مسلم اتحاد پر نظمیں تھیں۔ انھی کے بیچ میں پیغمبرِ اسلامؐ کے بارے میں ایک گستاخانہ نظم بھی

---

[1] ثناءاللہ امرتسری، ایضاً، ص ۳۵-۳۴

تھی۔ مسلمانوں نے احتجاج کیا۔ خلافت کمیٹی کے سیکرٹری مولوی احمد گل نے ساتھ دیا۔ سناتن دھرم نے معافی مانگی۔ کتاب میں سے قابلِ اعتراض صفحات پھاڑ کر نکال دیئے گئے۔ مسلمانوں کی تسلی نہ ہوئی۔ کتابچے کے جتنے نسخے تنظیم کے پاس تھے، ٹاؤن ہال میں منگوائے گئے۔ اسسٹنٹ کمشنر موجود تھا۔ مسلمان جمع تھے۔ نسخے آگ میں جلائے گئے۔ ہندو کہتے تھے کہ تعداد نو سو سے زیادہ تھی۔ مسلمانوں کے مطابق پانچ سو سے کچھ اوپر تھی۔ جیون داس گرفتار ہوا۔ پشاور سے خلافت کمیٹی کا وفد آیا۔ مسلمانوں نے مطالبہ کیا کہ شرعی قوانین کے تحت مقدمہ چلے۔ ہندو چاہتے تھے کہ انگریز کی عدالت فیصلہ سنائے۔ تصفیہ نہ ہو سکا۔

۸ / ستمبر کو ہندوؤں نے حکام سے درخواست کی کہ جیون داس کو ضمانت پر رہا کر دیا جائے۔ حکم ملا کہ فوراً کوہاٹ سے نکل جائے۔ تین روز بعد سماعت کے لیے واپس آئے۔ وہ رخصت ہو گیا۔ مسلمان برہم ہوئے۔ آس پاس کے دیہات میں خبر بھیجی گئی۔ وہاں سے بھی لوگ پہنچ گئے۔

اگلی صبح قریباً دو ہزار مسلمانوں کا جلوس ڈپٹی کمشنر سے بات کرنے نکلا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے ساری نفری سڑکوں پر تعینات کر دی۔ جلوس ٹاؤن ہال کے باہر پہنچا۔ ڈپٹی کمشنر نے اندر سے کہلوایا کہ ایک وفد ہال میں آ کر بات کر لے۔ جلوس نے انکار کیا۔ ڈپٹی صاحب باہر آئے۔ جلوس کا مطالبہ تھا کہ جیون داس کی ضمانت منسوخ کی جائے۔ ڈپٹی صاحب مان گئے۔

جلوس واپس پلٹا۔ ہندوؤں کے محلے میں عالیشان دکانیں تھیں۔ وہاں گولی چل گئی۔ جب معاملہ پولیس کی سمجھ میں آیا تو دیکھا کہ ہندوؤں کے مکانوں کی چھتوں پر سے زبردست فائرنگ ہو رہی ہے۔ پولیس نے جوابی فائرنگ کی۔ وہ گولیاں سڑک پر موجود لوگوں کو لگیں جو مسلمان تھے۔ کچھ پولیس والے بھی گرے۔ پولیس رُک گئی۔ پھر حالات کسی کے قابو میں نہ رہے۔ اوپر سے گولیاں برستی رہیں۔ نیچے دکانوں کے دروازے ٹوٹتے رہے۔ مال نکل نکل کر سڑک پر ڈھیر ہو گیا۔ دکانوں میں آگ لگی۔ مہاجنوں کے بہی کھاتے جل کر خاک ہوئے۔

شام تک کافی جانیں ضائع ہو چکی تھیں۔ خبر سن کر قبائلی اُٹھ کھڑے ہوئے۔ شہر کے گرد مٹی کی فصیل تھی۔ دروازے بند تھے۔ رات کے اندھیرے میں فصیل میں شگاف ڈالنے لگے۔ صبح شہر میں

داخل ہو گئے۔ یہ ستمبر کی ۱۰؍ تاریخ تھی۔

شہر میں ہندوؤں نے قبائلیوں پر فائرنگ کی۔ انہوں نے جواب دیا۔ دو پہر تک ہندوؤں کے محلے کے سرے پر کئی مکانوں سے شعلے بلند ہو رہے تھے۔ اب معاملہ فوج کے بس سے بھی باہر تھا۔ بر گیڈ کمانڈر کے حکم پر فوج ہندوؤں کو شہر سے نکال کر چھاؤنی لے گئی۔ وہاں سے راولپنڈی بھیجا۔ شہر میں جائیداد غارت ہوئی۔ مندر گرائے گئے۔ بت ٹوٹ گئے۔ قبائلی کوئی رعائت برتنے پر تیار نہ تھے۔ مقامی مسلمانوں میں سے بعض نے ہندوؤں کو پناہ دی۔ اُن کے بال کٹوائے۔ زُنّار اُتروائے۔ قبائلیوں نے پوچھا تو کہا کہ یہ مسلمان ہیں۔ تب بھی فساد میں ڈیڑھ سو سے زیادہ ہندو مارے گئے۔ [1]

6

امریکہ میں اُس روز دو نوجوانوں کو عمر قید کے ساتھ نوے نوے برس کی سزا سنائی گئی۔

یہ اُس زمانے کا سب سے مشہور مقدمہ تھا۔ کچھ عرصہ پہلے شکاگو میں چودہ برس کے لڑکے کی لاش ملی تھی۔ اوزار سے سر پر وار کرنے کے بعد گلا گھونٹا گیا تھا۔ تیزاب ڈال کر لاش مسخ کرنے کی کوشش بھی کی گئی تھی۔

لاش کے قریب پولیس کو ایک عینک ملی۔ اس قسم کی صرف تین عینکیں شکاگو میں فروخت ہوئی تھیں۔ پہلی ایک خاتون نے خریدی تھی۔ دوسری ایک وکیل نے جو ملک سے باہر تھا۔ تیسری کالج کے ایک طالب علم لیوپولڈ (Leopold) نے جس کی عمر اُنیس برس تھی۔ اُس نے کہا کہ اُسے پرندے دیکھنے کا شوق ہے۔ اکثر جھیل پر جاتا ہے۔ وہیں ٹھوکر کھا کر گرنے سے عینک اُس کے کوٹ کی جیب سے نکلی ہو گی۔ عینک دوبارہ اُس کے کوٹ کی جیب میں رکھی گئی۔ اُس سے کہا گیا کہ اس طرح گر کر دکھائے کہ عینک جیب سے نکل پڑے۔ یہ ممکن نہ ہوا۔ اُس نے کہا کہ قتل والے دن وہ شہر میں نہ تھا۔ اپنے دوست لوئب (Loeb) کے ساتھ اپنی گاڑی میں گھومنے نکلا ہوا تھا۔ پولیس کو معلوم ہوا کہ اُس

---

[1] فسادات کوہاٹ کے احوال کے لیے ماخذ ہیں:
H. N. Mitra *The Indian Quarterly Register July-Dec. 1924*, pp.26-29; and H. N. Mitra *The Indian Quarterly Register Jan.-June 1925,* pp.97-106

روز گاڑی خراب تھی۔ گیراج میں کھڑی تھی۔

پہلے لوئب نے اعتراف کیا۔ بچپن ہی سے ایسی جاسوسی کہانیاں پڑھی تھیں جن میں سراغرساں صرف عقل کے بل بوتے پر مجرم کو پہچانتا تھا۔ خیال آیا کہ ایسا چالاک مجرم بھی ہو سکتا ہے جو سراغرساں کی ذہانت کو شکست دے دے۔

لیوپولڈ نے نیٹشے کی کتابیں پڑھی تھیں۔ نیٹشے کے مطابق اخلاق اور قانون صرف کمتر اور معمولی ذہانت کے لوگوں کے لیے تھے۔ فوق البشر یعنی سپرمین ایسی پابندیوں سے آزاد ہے۔ لیوپولڈ نے لوئب سے کہا کہ فوق البشر یقیناً ایسی واردات کر سکتا ہے کہ سراغرساں سر پٹک کر رہ جائیں۔

بڑے گھرانوں کے چشم و چراغ تھے۔ امریکہ کے مشہور وکیل کلیرنس ڈیرو (Clarence Darrow) کی خدمات حاصل کی گئیں۔ سننے میں آیا کہ ایک ملین ڈالر معاوضہ ادا کیا گیا ہے۔ بتیس روز مقدمہ چلا۔ سو سے زیادہ گواہ پیش ہوئے۔ ڈیرو نے جج کے سامنے بارہ گھنٹے تقریر کی۔

اُس نے کہا کہ اُس کے دونوں موکل اِس قابل ہیں کہ اُنہیں سلاخوں کے باہر نہ چھوڑا جائے۔ ہمیشہ کے لیے جیل بھیج دیا جائے۔ لیکن انہیں پھانسی نہ دی جائے ورنہ معاشرے میں وہ رجحان مزید تقویت پائے گا جس نے انہیں جرم کی راہ پر لگایا ہے۔ وہ انسانی زندگی کی قدر نہ کرنے کا رجحان ہے۔ حالیہ جنگِ عظیم کے دوران پورے چار برس تک اِسے فروغ دیا گیا۔ وطن کی محبت، بہادری اور شجاعت جیسی چیزوں کا واسطہ دے کر کہا گیا کہ خوب قتل کرو۔ اِسی سے ملک اور تہذیب کا نام روشن ہو گا۔ اٹھارہ اُنیس برس کے دو نوجوان آخر کس لیے اس راہ پر گامزن ہوئے؟ شکاگو میں نابالغ قارئین کے لیے جرائم پر مبنی کہانیاں پڑھنا منع تھا۔ لوئب کی آیا نے اُسے چھوٹی عمر سے پڑھنے دیں۔ لیوپولڈ سولہ برس کی عمر میں نیٹشے کی کتابیں پڑھ بیٹھا۔ بڑی عمر کے لوگ اُنہیں تخیل اور فلسفہ جانتے ہیں۔ لیوپولڈ نے اُن پر عمل کرنے کی ٹھانی۔ اگر پہلے سے بیمار ذہنیت کا حامل نہ تھا تو اُن کتابوں نے ضرور بیمار ذہنیت عطا کر دی۔ جو کچھ ہم خود ہی یونیورسٹی میں پڑھاتے ہیں کیا اُس پر عمل کرنے والے طالب علم

کی سزا موت ہے؟[1]

7

۱۰؍ستمبر کے زمیندار میں بانگِ درا کا مختصر اِشتہار چھپا۔ ستمبر کی ۱۱، ۱۲، ۱۴، ۱۵، ۱۸، ۱۹، ۲۰، ۲۱، ۲۴؍ اور ۲۵؍ اکتوبر کی ۱۳، ۱۶، ۱۸، ۲۰، ۲۳، ۲۵؍ اور نومبر کی ۵؍ تاریخ کے پرچوں میں بھی آیا۔[2]

علامہ ڈاکٹر سر شیخ محمد اقبال

اُردو کلام کا مجموعہ موسومہ بانگِ درا

چھپ کر تیار ہو گیا ہے، تعدادِ اشاعت محدود ہے۔ جلد منگوا لیجیے! قیمت چار روپے۔ محصول ڈاک بذمہ خریدار۔ المشتہر: شیخ طاہر الدین: متصل مسلم بنک، انار کلی، لاہور

8

علامہ کی بیاض میں ''زبورِ جدید'' کے بعض اندراجات اُس زمانے کے معلوم ہوتے ہیں۔ مطلعوں کے مفہوم کچھ یوں ہیں:

- اگر تم بحرِ محبت کا کنارہ پانا چاہتے ہو تو ہزار شعلہ دے کر محض ایک شرر پانا چاہتے ہو!
- دوست کی سادہ لوحی کے بارے میں اب کیا کہوں کہ میرے سرہانے بیٹھ کر میرے درد کے درماں کی بات کر رہا ہے۔
- میں اُن زندہ دلوں کا غلام ہوں جو عاشقِ صادق ہیں۔ اُن خانقاہوں کا نہیں جن کے دل عشق و مستی سے خالی ہیں۔
- پیاس سے دم توڑتی دنیا کے لیے میں نے اپنی دردمند اور دلپذیر صدا سے شرابِ زندگی کو

---

[1] اس واقعے کا تذکرہ اس لیے کیا گیا کہ نیٹشے کے منفی اثرات کے حوالے سے شہرت رکھتا ہے۔ علامہ اقبال بیرسٹر تھے اس لیے قریباً یقینی بات ہے کہ یہ حد سے زیادہ شہرت پانے والا مقدمہ اُن کے علم میں بھی آیا ہو گا۔

[2] اختر النسا (۲۰۱۰) اقبال اور زمیندار، ص ۹۸-۹۷

جاری کر دیا ہے۔

- اپنے پورے چاند پر سے نقاب ہٹا دیجیے۔ اپنی رحمتِ عام کفر اور دین دونوں پر برسا دیجیے۔
- اپنی خودی میں موج کی طرح مست رہو اور اِس مستی سے طوفان اُٹھادو۔ تمہیں کس نے کہا ہے کہ بیٹھے رہو اور کوشش ترک کر دو۔
- مقامِ رضا نے میرے کیا کیا مسائل حل کیے! مجھے ہونے اور نہ ہونے کے چکر سے نکال دیا۔

کوہاٹ کے فساد کی خبر پورے ملک میں پھیلی۔ ۱۲/ستمبر کو لکھنؤ میں ہندوؤں نے مسلمانوں پر حملہ کیا۔ اگلے روز مسلمانوں نے جوابی کاروائی کی۔ شہر میں فوج بلوانی پڑی۔[1]

اُس روز علامہ نے بیاض میں ایک غزل نما ٹکڑا لکھا۔ واضح ہوتا تھا کہ قارئین کو کیا دکھانا چاہتے ہیں۔ چھ اشعار ہوئے۔ ان میں سے چار کاٹ دیئے۔ مزید ردوبدل ہوئی۔ حاشیے میں مزید چار شعر لکھے۔ سات اشعار ہو گئے۔ بعد میں کبھی ان میں سے بھی تین کم کر دیئے:

دونوں جہاں اُس صراحی میں دیکھے جا سکتے ہیں جو میرے پاس ہے۔ کہاں ہے وہ آنکھ جو وہ تماشا دیکھنا چاہے جو میرے پاس ہے؟

ایک اور دیوانہ فرنگ کے شیشہ بازوں میں پہنچ گیا ہے۔ دو سو ہنگامے اُس دیوانگی سے اُٹھتے ہیں جو میرے پاس ہے۔

اے ناداں! چھائی ہوئی راتوں کی تاریکی کا غم مت کرو کہ میرے پاس جو پیشانی ہے اُس کا داغ ستارے کی طرح روشن ہے۔

تم مجھے اپنا دوست بنا رہے ہو لیکن مجھے ڈر ہے کہ تم اُس ہنگامے کی تاب نہیں رکھتے جو میرے پاس ہے۔

درونِ سینہ می سوزد تمنائے کہ من دارم	کجا چشمے کہ بیند آں تماشائے کہ من دارم
دگر دیوانۂ بر شیشہ بازانِ فرنگ افتد	دو صد ہنگامہ برخیزد ز سودائے کہ من دارم

---

[1] H. N. Mitra *The Indian Quarterly Register July-Dec. 1924,* p.29

مخور ناداں غم از تاریکیٔ شبہا کہ می آید   کہ چوں انجم درخشد داغِ سیمائے کہ من دارم
ندیمِ خویش می سازی مرا لیکن ازاں ترسم   نداری تابِ آں آشوب و غوغائے کہ من دارم[1]

اگلے صفحات میں درج منظومات کے ابتدائی اشعار کے مفہوم یوں ہیں:

- میری نوا اس لیے پرسوز، بیباک اور غم انگیز ہے کہ میرے وجود کے خس و خاشاک میں ایک چنگاری آن گری ہے جبکہ صبح کی ہوا بیحد تیز ہے اور اُسے خوب بھڑکا رہی ہے۔[2]
- اس باغ کا لالہ داغِ تمنا نہ رکھتا تھا۔ اس کی شوخ و بیباک نرگس نظارے والی آنکھ نہ رکھتی تھی۔
- اس زمانے کا خضر حجاز کے صحراؤں سے نکلے گا اور ایک کارواں پھر اس دور دراز کی وادی سے برآمد ہو گا۔
- ہر دم درویشی کے نشے میں مگن رہو اور جب اس میں پختہ ہو جاؤ تب سلطنتِ جمشید کے مقابل ڈٹ جاؤ۔
- اے صبح صبح بیدار ہونے والے پرندے! ایک بالکل نئی غزل سنا۔ پھولوں سے پھر وہی خوش کر دینے والی بات کہہ دے۔
- اگرچہ عقل کا شاہین اپنی پرواز میں لگا ہوا ہے مگر اس ریگستان میں ایک ایسا تیر انداز بھی چھپا بیٹھا ہے جس کا نشانہ کبھی خالی نہیں جاتا۔
- یہ دنیا کیا ہے؟ میرے پندار کا صنم خانہ! اس کا جلوہ میری بیدار نظر کا مرہونِ منت ہے۔
- ایسی فصلِ بہار اور ایسی خوش الحان بلبل کی آواز! اے میرے محبوب آپ بھی ایسے میں چہرے سے نقاب الٹ دیں، غزل سنائیں اور شراب لائیں۔

---

[1] بیاضِ زبورِ عجم

[2] اِس فصل میں اُن منظومات کے ابتدائی مصرعے درج کیے گئے ہیں جو ۱۳/ ستمبر اور ۱۸/ اکتوبر کے درمیان کہی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ یعنی بیاض میں ۱۳/ ستمبر ۱۹۲۴ء کی تاریخ کے تحت جو نظم لکھی گئی، وہاں سے لے کر اُس نظم تک جس کے بارے میں مکتوب بنام گرامی ۱۹/ اکتوبر ۱۹۲۴ء سے ظاہر ہے کہ ۱۸/ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو لکھی گئی۔

- ہوس ابھی تک جہانداری کا تماشا دکھانے میں لگی ہوئی ہے۔ ابھی اور کتنے فتنے آسمان کے اس نیلے پردے میں چھپے ہیں۔
- اگرچہ فرشتہ آسمانوں کے طلسم سے پرے ہے، اُس کی نگاہ اِسی مٹھی بھر خاک کے نظارے میں لگی ہوئی ہے۔
- وہ عرب کہاں ہے جو محفلِ شبانہ پھر سے بپا کر سکے؟ عجم کہاں ہے کہ عشق کی ندی کو پھر سے زندہ کر دے؟
- ہماری دنیا برباد ہو کر خاک ہو چکی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ گزرے ہوئے دن کبھی دوبارہ آئیں گے۔
- حق کی خدمت کے لیے دلائل اور اثرانگیز بیان پر بھی بھروسہ کیا جا سکتا ہے مگر کبھی شمشیر و سناں سے بھی کام لینا پڑتا ہے۔
- زندگی اپنے سیپ میں موتی تخلیق کرنے کا نام ہے۔ شعلہ کے دل میں اُتر جانا اور پھر بھی نہ پگھلنا ہی زندگی ہے۔
- اس چمن کے لالے ابھی تک رنگ سے آلودہ ہیں۔ ڈھال ہاتھ سے مت رکھو کہ جنگ ابھی جاری ہے۔
- انہوں نے کہا، "دل آزاد زیادہ اچھا ہے یا گرفتار؟"
- صبا کی مانند اٹھو اور نئے انداز سے جینا سیکھو۔ گل و لالہ کے دامن کو نئے انداز سے کھینچنا اور متوجہ کرنا سیکھو۔ غنچے کے ننھے سے دل کے اندر اتر جانے کے نئے انداز سیکھو!
- آپ شاید سمجھیں کہ گھر کا طواف کرنے سے میرا مقصد محض گھر ہے۔ نہیں بلکہ گھر کے طواف سے میرا مقصود خود صاحبِ خانہ ہے۔
- میرا محبوب سواری پر بیٹھے بیٹھے راہ نشینوں پر ایک نظر ڈال کر گزر جاتا ہے۔ کوئی مجھے تھامے کہ میرا معاملہ ہاتھوں سے نکلا جاتا ہے۔
- آسمانوں تک پہنچ جانے والی عقل پر بہادری کے ساتھ شب خوں مارنا چاہیے۔ دردِ دل کا ایک

ذرّہ افلاطون کے علم پر بھاری ہے۔

مرتد کے کامل میں سنگسار ہونے پر بحث چھڑی ہوئی تھی۔ جمعیت العلمأ نے فیصلے کی حمایت کی۔ زمیندار نے افغانستان کے عدالتی فیصلوں کی نقول حاصل کیں۔ ۱۴/ستمبر کے شمارے میں فارسی سے ترجمہ کر کے شائع کیں۔ واقعے کی تفصیلات درج کیں:

قادیانی ملحد کی سنگساری

افغانستان کی شرعی عدالتوں کا فیصلہ

آخیر دم تک یاوہ گوئی سے باز نہ آیا

کچھ عرصے سے شیرپور کی حدود میں ایک شخص نعمت اللہ قادیانی اسلام اور شریعت و مذہبِ حنفیہ کے مسلمہ عقائد و ایجابات کے خلاف خیالات و عقائد بیان کر رہا تھا۔ اور لوگوں کو اپنے باطل قادیانی عقائد کے اتباع کی طرف دعوت بھی دیتا تھا۔ یہ شخص محکمۂ شرعیۂ ابتدائیہ، محکمۂ فقہ مرکزی کابل اور وزارتِ جلیلہ عدلیہ کی ہئیتِ عالیہ تمیز کے علمائے کرام اور فضلائے کرام کے فیصلہ کے مطابق سنگسار کر دیا گیا۔ اس سیاہ کار بدکردار کی سنگساری کے موقع پر ملکی اور فوجی اشخاص کا بہت بڑا اجتماع جمع ہو گیا تھا۔ یہ شخص آخیر تک اپنی یاوہ گوئی اور ہرزہ سرائی سے باز نہ آیا۔ اگرچہ ایسے بدکردار لوگوں کی توبہ بھی شرعی حیثیت سے قابلِ قبول نہیں ہو سکتی۔ لیکن یہ شخص پرلے درجہ کی ہٹ دھرمی سے اپنے باطل عقائد پر جما رہا۔ اور ہلاک ہونے کے وقت تک تائب نہ ہوا۔ آخر چند لمحوں کے اندر اندر اوامر و نہی اور قواعدِ شرعی کے مطابق اس پر پتھروں کی بارش ہونے لگی۔ اور وہ سنگسار کر دیا گیا۔ کہ اُس کے مردود جسم پر پتھروں کا ڈھیر لگ گیا۔[1]

زمیندار کی اس اشاعت میں بانگِ درا پر تعارفی مضمون بھی شائع ہوا، ''غالب نے اُردو شاعری کی ممکنات ارتقا کا دھندلا سا نقشہ پیش کیا تھا۔ اقبال کے نادر روزگار دل و دماغ نے اس نقشے کو لے کر صدہا

---

[1] زمیندار ۱۴ ستمبر ۱۹۲۴ء۔ بشکریہ امجد سلیم علوی

نئی راہوں کی ایک ایک منزل آئینہ کردی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ایک بے روح وجود اور چند لمحوں کی دلچسپی کے ایک بے نتیجہ مشغلے کو قوم کے احیا، قوم کی بیداری اور حقائق حیات ملیہ کی تبین و تشریح کا موئثر ترین ذریعہ بنادیا۔"[1]

اگلے روز "آفاقی شاعری" سے "اسلامی شاعری" کی طرف علامہ کی مراجعت کا ذکر ہوا:

یہ ان کے جوش ایثار و قربانی کی ایک سخت آزمائش تھی۔ وہ دیکھتے تھے کہ آفاقی شاعری کا راستہ عالم گیر شہرت و ناموری اور بیش بہا دنیاوی فوائد و منافع کا سرچشمہ ہے اور حق یہ ہے کہ اگر وہ اس راستے پر قائم رہتے تو آج دنیا کا ہر حصہ ان کے قدم چومتا اور جس طرۂ امتیاز نے ٹیگور کو دنیا کے عظیم ترین شعرا کی بزم میں پہنچا دیا، وہ آج سے برسوں پیشتر علامہ اقبال کا زیب دستار بن چکا ہوتا۔ اس کے خلاف اسلام و مشرق کے لیے انتہاہی صدا "صدا بہ صحرا" سے زیادہ کی حیثیت نہ رکھتی تھی۔ اس وقت ہر قلب پر یورپی تقلید اور افرنگیت کے اثرات اس طرح غالب تھے کہ کسی کو ان کے خلاف زبان کشا ہونے کی بھی جرات نہ ہوتی تھی لیکن علامہ ممدوح کا درد مند، حق پرست اور حساس قلب شہرت و ناموری اور دنیاوی فوائد و منافع کی تمام دل خوش کن امیدوں سے بے نیاز ہو گیا اور انھوں نے فیصلہ کرلیا کہ اللہ تعالیٰ کی تمام عطا کردہ نعمتوں کا سب سے پہلا حق دارِ اسلام ہے، اس لیے جو کچھ بن آئے، وہ اسی کے لیے ہونا چاہیے۔[2]

سید سلیمان ندوی نے بھی مشرقی کی تذکرہ پر تبصرہ کیا۔ المعارف میں شائع ہوا۔ اُس روز زمیندار نے اقتباس پیش کیا۔ دار لعلوم دیوبند کے قائم مقام مہتمم مولانا حبیب الرحمٰن اور تمام علمائے دیوبند کی طرف سے چودھری محمد حسین کا شکریہ اور دعائے خیر بھی شائع ہوئی:

حقیقت یہ ہے کہ چودھری محمد حسین صاحب نے نہایت غور و خوض سے کتاب

---

[1] اختر النسا (۲۰۱۰) اقبال اور زمیندار، ص ۸۶

[2] ایضاً ص ۸۸

"تذکرہ" کو دیکھا اور اس کے طویل اور لاطائل طرزِ انشا سے اصل مطلب کو حاصل کر کے نہائت بلیغ طریقہ پر تردید کی ہے اور ان کے دلائل کی حقیقت واضح کر کے ایک بڑی اسلامی خدمت انجام دی ہے۔[1]

۱۷ر ستمبر کو گاندھی دہلی میں جوہرؔ کے گھر ٹھہرے ہوئے تھے۔ اعلان کیا کہ فسادات پر دل گرفتہ ہیں۔ اُن کی تحریر ہندوؤں اور مسلمانوں کو قریب نہیں لا سکتی۔ اب اکیس دن "برت" رکھنے کا فیصلہ ہے۔ صرف پانی پئیں گے یا اُس میں نمک ملا لیں گے۔ مولانا جوہرؔ، حکیم اجمل خاں اور سوامی شردھانند نے قریباً دو سو رہنماؤں کو دعوت دی کہ دہلی میں جمع ہو کر گاندھی کی زندگی بچائیں۔ ہندو مسلم اتحاد کی راہ نکالیں۔[2]

اگلے روز آکسفورڈ میں فرانسس ہربرٹ بریڈلے (Francis Herbert Bradley) انتقال کر گئے۔ انہوں نے علامہ کی پیدایش سے بھی پہلے خودی کے موضوع پر لکھنا شروع کیا تھا۔ چند برس پہلے خودی کی حقیقت سے انکار کر دیا تھا۔[3] تین ماہ قبل شاہِ برطانیہ سے آرڈر آف میرٹ کا اعزاز پایا تھا۔ پہلے کسی انگریز فلسفی کو نہیں ملا تھا۔ چھوٹے بھائی اینڈریو سیسل بریڈلے (A. C. Bradley) اپنے لیکچروں شیکسپیئرین ٹریجڈی (*Shakespearean Tragedy*) کی بدولت غیر معمولی شہرت حاصل کر چکے تھے۔

۲۶ر ستمبر کو سہ پہر تین بجے دہلی کے سنگم تھیٹر میں اتحاد کانفرنس (Unity Conference) کا آغاز ہوا۔ اسٹیج کے پیچھے گاندھی کی تصویر تھی۔ صدر کے ڈائس کے اوپر رُوسو کا قول انگریزی میں درج تھا: "انسان آزاد پیدا ہوا مگر ہر جگہ وہ زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔" (Man was born free, but he is everywhere in chains.) قریباً تین سو مندوبین جمع ہوئے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں

---

[1] زمیندار ۱۵ ستمبر ۱۹۲۴ء۔ بشکریہ امجد سلیم علوی

[2] H. N. Mitra *The Indian Quarterly Register July-Dec. 1924*, p.147-148

[3] یہ خیالات تشکیلِ جدید کے چوتھے خطبے میں ظاہر کیے: Iqbal (1934), *Reconstruction*

کے علاوہ عیسائی بھی تھے۔ استقبالیہ کمیٹی کے صدر جوہر تھے۔ صدارت کے لیے پنڈت موتی لال نہرو سے درخواست کی گئی۔ نمایاں ترین مہمانوں میں دیش بندھو داس، حکیم اجمل خاں، پنڈت مدن موہن مالوی، مولوی کفایت اللہ، سوامی شردھانند، مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی، اینی بیسنٹ، سروجنی نائیڈو، مدن موہن مالوی، چنتامنی، جواہر لال نہرو، ابوالکلام آزاد، لالہ لاجپت رائے، راجندر پرشاد، ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور شعیب قریشی شامل تھے۔ قرارداد منظور ہوئی کہ گاندھی سے درخواست کی جائے کہ برت توڑ دیں۔

اگلے روز کانفرنس میں گاندھی کا پیغام سنایا گیا۔ برت جاری رکھیں گے۔ رہنماؤں نے تقاریر کیں۔ اصرار کیا کہ تمام مذاہب کی تعلیمات میں ہم آہنگی ہے۔ جمعیت العلمأ کے صدر مولوی کفایت اللہ نے بھی یہی کہا۔ اُن سے پوچھا گیا کہ کیا اسلام میں مرتد کی سزا موت نہیں ہے۔ جواب دیا کہ وہ قانون صرف اسلامی ممالک میں نفاذ کے لیے ہے۔

قراردادیں منظور ہوئیں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فسادات کی مذمت کی جاتی ہے۔ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینا قانون اور مذہب کے خلاف ہے۔ تنازعے کی صورت میں ثالث سے رجوع کیا جائے۔ ضرورت پڑے تو عدالتوں سے بھی رجوع کر سکتے ہیں۔ ایک قومی پنچایت بنانے کا فیصلہ بھی ہوا۔ وہ اس قسم کے تنازعات کا تصفیہ کرے۔

۲ر اکتوبر کو کانفرنس ختم ہوئی۔[1] گاندھی کا برت مکمل ہونے میں چھ روز باقی تھے۔ اُن کا کہنا تھا کہ گناہوں کی تلافی کے لیے رکھا گیا ہے۔ لالہ لاجپت رائے کے مطابق ''گناہ'' سے گاندھی کا اشارہ ماضی میں مسلمانوں کا ساتھ دینے کی طرف تھا۔[2]

مرتد کے سنگسار کیے جانے کی بحث بھی خاصی دُور تک پہنچی تھی۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ اور لیڈر الٰہ آباد بھی اسے وحشیانہ حرکت قرار دے چکے تھے۔ آریہ پتر اخبار کے لیے ثابت ہو گیا کہ

---

[1] H. N. Mitra *The Indian Quarterly Register July-Dec. 1924,* p.149-160

[2] Lajpat Rai, 'The Hindu Muslim Problem'

اسلام تلوار کے زور سے پھیلتا ہے۔ کلکتہ کے انگریزی اخبار مسلمان اور لاہور کے اخبار مسلم نے بھی تنقید کی۔ پیسہ اخبار کے نزدیک واقعہ "افسوسناک" تھا۔ وکیل امرتسر نے لکھا، "یہ ایک حقیقتِ ثابتہ ہے کہ افغانستان کے اِس فیصلے سے پہلے ہمارے مسلم معاصرین فرقہ احمدیہ کو ایک اسلامی فرقہ تسلیم کرتے تھے... پھر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اب کونسا نیا تغیر فرقہ احمدیہ کے عقائد میں رُونما ہو گیا ہے کہ وہ ایک احمدی کو مرتد قرار دینے لگے ہیں۔"[1]

جواب میں دیوبند کے مولانا شبیر احمد عثمانی نے رسالہ شائع کیا۔ مولانا انور شاہ کاشمیری نے بھی قلم اٹھانے کی ضرورت محسوس کی۔ امیر امان اللہ کی خدمت میں فارسی میں طویل مراسلہ بھجوایا۔ مولانا ظفر علی خاں نے اُسے ۲/اکتوبر کے زمیندار میں ترجمے کے ساتھ شائع کیا:

> یہ فرقہ ہر ایسے شخص کو کافر کہتا ہے جو قادیانی کی نبوت کے باب میں متوقف ہوتا ہے۔ اس طرح ساری امتِ محمدی اس کے نزدیک کافر ہے۔ لہٰذا یہ کفر آلود عقیدہ خونریزی، لوٹ مار، تخریبِ بلاد کا موجب بن سکتا ہے۔ اور اسلام کے پادشاہوں اور حاکموں کے لئے ضروری ہے کہ اس کا استیصال کریں۔[2]

9

گورنمنٹ کالج لاہور کے مجلے راوی کا گولڈن جوبلی نمبر تیار کیا جا رہا تھا۔ دسمبر میں شائع ہونا تھا۔ محمد صغیر ہاشمی اس کے مدیر تھے۔ علامہ سے غیر مطبوعہ نظم کی فرمایش کی۔ اُن کا بیان ہے، "ڈاکٹر صاحب [علامہ اقبال] نے فرمایا کہ پچھلے چالیس سال کے تجربے نے مجھے 'نہیں' کہنے کی اخلاقی و روحانی جرأت عطا کی ہے۔" مشکل سے ایک صفحہ پر دستخط کرنے پر راضی ہوئے۔ اُسے شائع کیا جا سکتا تھا۔[3]

---

[1] دوست محمد شاہد (۲۰۰۷) تاریخ احمدیت جلد چہارم، ص ۴۸۵-۴۸۰

[2] زمیندار ۲/اکتوبر ۱۹۲۴ء۔ بشکریہ امجد سلیم علوی

[3] جعفر بلوچ (۱۹۹۵) علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں، ص ۳۲

10

علی بخش چھٹی پر گاؤں گیا تھا۔ ۳؍ اکتوبر کو واپس آیا۔ سیلاب کی خبریں تھیں۔ دہلی خطرے کی زد میں تھا۔ لاہور میں بالکل بارش نہ ہوئی تھی۔ دوپہر کے وقت کسی قدر گرمی ہوتی۔ تب بھی پنکھے کی ضرورت نہ پڑتی مگر یہ علامہ کی رائے تھی۔ انہیں ویسے بھی پنکھے کی زیادہ عادت نہ تھی۔ رات سرد ہو جاتی تھی۔ بانگِ درا کی پندرہ سو کاپیاں یا کچھ زیادہ بک چکی تھیں۔ خیال تھا کہ ڈیڑھ ماہ بعد دوسرے اڈیشن کی کتابت شروع کروادیں۔

محمد حسین شملے میں تھے۔ ۴؍ اکتوبر کو اُن کا خط ملا۔ مصر کے مقام لکسر میں پچھلے برس فرعون تونخ آمون (Tutankhamun) کے مقبرے سے خزانہ اور ممی برآمد ہوئے تھے۔ اب عجیب و غریب افواہوں کا بازار گرم تھا۔ شرلک ہومز کے خالق آرتھر کونن ڈائل نے بھی ایک پراسرار موت کو قدیم مصری پروہتوں کی کرامت سے وابستہ کر دیا۔ محمد حسین نے اپنے خط میں لکسر کے کسی واقعے کا ذکر کیا تھا۔ علامہ نے لکھا، "اگر صحیح ہے تو بہت افسوس ناک ہے۔ ایسا واقعہ شاید اِس سے پہلے کبھی نہیں ہوا۔ اللہ تعالیٰ مخلوق پر رحم فرمائے۔ پادری صاحب کو خط لکھ کر دریافت کر لیجیے۔" اپنے حالات کے حوالے سے لکھا، "آج شام میرے گھر کے لوگ ایک دو ماہ کے لیے سیالکوٹ جائیں گے۔ آپ آئیں گے تو رونق ہو جائے گی۔"[1]

۵؍ اکتوبر کو سیالکوٹ میں رات ساڑھے نو بجے سردار بیگم نے لڑکے کو جنم دیا۔ میاں جی شیخ نور محمد کی خوشی کا ٹھکانہ نہ تھا۔ خدا کے حضور سجدہ کیا۔ بچے کو گود میں لے کر پیشانی پر بوسہ دیا۔ کان میں اذان دی۔ عمر لمبی ہونے کی دعا دی۔ بچے کے سوتیلے بڑے بھائی آفتاب کی نسبت سے قمر الاسلام نام تجویز کیا۔[2]

علامہ کو اطلاع بھیجی گئی۔ وسیمہ مبارک کا بیان ہے کہ اُنہوں نے خط میں لکھا، "میرے لیے یہ امر باعثِ مسرت ہے کہ میرے بیٹے نے اپنے آباؤاجداد کے مسکن میں آنکھیں کھولیں اور وطنِ عزیز

---

[1] مکتوب بنام محمد حسین ۴؍ اکتوبر ۱۹۲۴ء؛ ثاقب نفیس (۲۰۰۴) مکتوباتِ اقبال، ص ۲۹

[2] وسیمہ مبارک کی روایت ہے؛ خالد نظیر صوفی، اقبال درونِ خانہ، ص ۳۶-۳۵۔ ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۴)، ص ۳۴۵

کی پاک فضاؤں میں پہلا سانس لیا۔"[1] وسیمہ مبارک کے مطابق علامہ نے قمرالاسلام نام پسند نہ کیا۔ خط میں متبادل نام بھیجے: جاوید، فاروق اور زبیر۔ تاریخی نام ظفرُالاِسلام (۱۳۴۳ھ) نکالا تھا۔ ایک نام سب کو زیادہ پسند آیا: جاوید اِقبال۔[2]

سردار اُمراؤ سنگھ شملہ میں تھے۔ اُن کی اہلیہ نے علامہ اقبال کو لڑکے کی پیدایش پر مبارکباد بھیجی۔[3] کبھی مس گوٹسمین کہلاتی تھیں جن کے لیے نظم 'پھول کا تحفہ عطا ہونے پر' لکھی گئی تھی۔

ایک روایت ہے کہ علامہ کے ایک پنڈت دوست نے اپنے استاد سے، جو بنارس میں علمِ نجوم کا بہت ماہر تسلیم کیا جاتا تھا، جاوید کی جنم پتری بنوائی۔ علامہ اس کے قائل نہ تھے۔ زیادہ توجہ نہ دی۔ البتہ اپنے کبوتر احباب میں بانٹ دیے۔ نہیں چاہتے تھے کہ جاوید بڑے ہو کر کبوتر اُڑانے کی عادت ڈال لیں۔[4]

اے سوئی ہوئی کلی، دیکھتی ہوئی نرگس کی طرح اُٹھو! ہمارا گھر غموں کی یلغار میں ڈھے گیا ہے، اُٹھو! باغ کے پرندوں کی فریاد سے، صبح کی اذان سے اُٹھو! آتش بیانوں کے ہنگامے کی گرمی سے اُٹھو!

گہری نیند، گہری نیند، گہری نیند سے اُٹھو!

گہری نیند سے اُٹھو!

دیکھو کہ سورج نے صبح کی پیشانی کو زینت بخش دی۔ صبح کے کان میں خونِ جگر کا آویزہ سجا دیا۔ صحراؤں اور پہاڑوں سے قافلوں نے رختِ سفر باندھے۔ اے دنیا کو دیکھنے والی آنکھ، دنیا کا نظارہ کرنے کے لیے اُٹھو!

گہری نیند، گہری نیند، گہری نیند سے اُٹھو!

گہری نیند سے اُٹھو!

---

[1] خالد نظیر صوفی اقبال درونِ خانہ، ص۳۶؛ خط موجود نہیں ہے۔ یہ اقتباس بظاہر یادداشت سے لکھا گیا۔

[2] خالد نظیر صوفی اقبال درونِ خانہ، ص۳۷-۳۶

[3] مکتوب بنام شیخ عطا محمد ۱۸؍ اکتوبر ۱۹۲۴ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص۵۵۴

[4] ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۴)، زندہ رود، ص۳۶۲

تمام مشرق راستے کی دُھول جیسا ہوا ہے۔ ایک خاموش فریاد اور بے اثر آہ ہے۔ اِس مٹی کا ہر ذرّہ ایک بھٹکی ہوئی نگاہ ہے۔ ہندوستان اور سمرقند اور عراق اور ہمدان سے اُٹھو!

گہری نیند، گہری نیند، گہری نیند سے اُٹھو!

گہری نیند سے اُٹھو!

تمہارا دریا بھی کوئی دریا ہے جو صحرا کی طرح پرسکون ہے۔ تمہارا دریا بھی کوئی دریا ہے جو نہ بڑھتا ہے، نہ اُترتا ہے۔ جو طوفان اور خطرے سے خالی ہے، یہ کیسا دریا ہے؟ اس کے چاک سینے سے اُمنڈتی ہوئی موج کی طرح اُٹھو!

گہری نیند، گہری نیند، گہری نیند سے اُٹھو!

گہری نیند سے اُٹھو!

یہ نکتہ چھپے ہوئے رازوں کو کھولنے والا ہے: ملک مٹی کا جسم ہے اور دین روحِ رواں ہے۔ جسم اور روح کے تعلق ہی سے جسم زندہ ہے اور روح زندہ ہے۔ خرقے اور جانماز، تلوار اور نیزے کے ساتھ اُٹھو!

گہری نیند، گہری نیند، گہری نیند سے اُٹھو!

گہری نیند سے اُٹھو!

ناموسِ ازل کے تم امین ہو، تم امین ہو۔ دنیا کی حکومت کا بایاں بازو تم ہو، دایاں بازو تم ہو۔ اے بندۂ خاکی تم زمانی ہو، تم زمینی ہو۔ یقین کی شراب پیو اور گمان کے بتکدے سے اُٹھو!

گہری نیند، گہری نیند، گہری نیند سے اُٹھو!

گہری نیند سے اُٹھو!

فریاد ہے افرنگ سے اور اُس کی دلآویزی سے! فریاد ہے افرنگ کے شیرینی اور پرویزی سے! دنیا تمام ویرانہ ہے افرنگ کی چنگیزی سے! حرم کے معمار، ایک بار پھر دنیا کی تعمیر کے لیے اُٹھو!

گہری نیند، گہری نیند، گہری نیند سے اُٹھو!

گہری نیند سے اُٹھو!

اے غنچۂ خوابیدہ چوں نرگس نگراں خیز　　کاشانۂ ما رفت بتاراجِ غماں خیز
از نالۂ مرغِ چمن، از بانگِ اذاں خیز　　از گرمیٔ ہنگامۂ آتش نفساں خیز
از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز!

خورشید کہ پیرایہ بسیمائے سحر بست　　آویزہ بگوشِ سحر از خونِ جگر بست
از دشت و جبل قافلہ ہارختِ سفر بست　　اے چشمِ جہاں بیں بہ تماشائے جہاں خیز
از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز!

خاور ہمہ مانندِ غبارِ سرِ راہے است　　یک نالۂ خاموش و اثرباختہ آہے است
ہر ذرّۂ ایں خاک گرہ خوردہ نگاہے است　　از ہند و سمرقند و عراق و ہمداں خیز
از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز!

دریائے تو دریاست کہ آسودہ چو صحرا است　　دریائے تو دریاست کہ افزوں نشد و کاست
بیگانۂ آشوب و نہنگ است چہ دریاست!　　از سینۂ چاکش صفتِ موجِ رواں خیز
از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز!

ایں نکتہ کشائندۂ اسرارِ نہاں است　　ملک است تنِ خاکی و دیں روحِ رواں است
تن زندہ و جاں زندہ زربطِ تن و جان است　　با خرقہ و سجّادہ و شمشیر و سناں خیز
از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز
از خوابِ گراں خیز!

ناموسِ ازل را تو امینی تو امینی!　　اے بندۂ خاکی تو زمانی تو زمینی

دارائے جہاں را تو یساری تو یمینی　　صہبائے یقیں درکش و از دیرِ گماں خیز

از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز

از خوابِ گراں خیز!

فریاد ز افرنگ و دل آویزیٔ افرنگ　　فریاد زشیرینی و پرویزیٔ افرنگ

عالم ہمہ ویرانہ زچنگیزیٔ افرنگ　　معمارِ حرم! باز بہ تعمیرِ جہاں خیز

از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز

از خوابِ گراں خیز!

بیاض میں یہ نظم ۱۳؍ ستمبر اور ۱۴؍ اکتوبر کی منظومات کے درمیان درج ہے۔ امکان ہے کہ انہی تاریخوں میں کہی گئی۔ تیسرے اور ساتویں بند میں آغا حشر کاشمیری کی گیارہ برس پرانی نظم 'شکریۂ یورپ' کی بازگشت سنی جاسکتی تھی۔ بند کسی اور ترتیب میں لکھے گئے۔ بعد میں کبھی حاشیے میں انگریزی میں نمبر ۱، ۲، ۴، ۵، ۷؍ اور ۶؍ ڈالے گئے۔ ایک جگہ "میثاقِ ازل" لکھا تھا۔ اُسے "ناموسِ ازل" بنایا۔ بیاض میں اس سے آگے درج منظومات انہی خیالات کا تسلسل معلوم ہوتی ہیں۔ ہر نظم کے ابتدائی شعر کے مفاہیم کچھ یوں ہیں:

- ہمیں اپنے گزرے ہوئے کل اور آنے والے دنوں پر ایک بار پھر سے نظر ڈالنی چاہیے۔ خبردار ہو جاؤ اور اٹھو کہ ایک بار پھر غور و فکر کی ضرورت ہے۔
- میرا تخیل آسمان کے نظارے میں محو رہا ہے۔ کبھی وہ چاند کے شانوں پر سوار رہا کبھی کہکشاں کی آغوش میں رہا۔ یہ مت سمجھو کہ صرف یہی زمین ہی ہمارا نشیمن ہے کہ ہر ستارہ ہمارا جہان ہے یا رہ چکا ہے۔
- نغموں نے مجھ پر قیامت ڈھادی مگر کسی کو خبر نہ ہوئی۔ محفل کے سامنے آواز کے زیر و بم اور مقام و راہ کے سوا کچھ نہیں۔
- اُٹھیے، پیاسی خاک پر زندگی کی شراب چھڑک دیجیے۔ اپنی آگ بھڑکا کر میری آگ ٹھنڈی

کر دیجیے۔

- میں نے تمہاری آنکھ کی پُتلی میں بینائی ڈال دی ہے۔ میں نے تمہارے باطن میں ایک نئی دنیا پیدا کر دی ہے۔
- سارا مشرق سویا پڑا تھا کہ ستاروں کی نگاہ بچا کر میں نے زندگی کے نغمے سے صبح تخلیق کر دی ہے۔[1]
- لدھیانہ سے خط آیا۔ مختار بیگم بھی خیریت سے تھیں۔[2]

11

ریاض کا شہر عرب کے حصے نجد میں واقع تھا۔ وہاں عبدالعزیز ابن سعود کی بادشاہت تھی۔ سعودی خاندان کی ہاشمی خاندان کے ساتھ پرانی رقابت تھی۔ ہاشمیوں نے جنگِ عظیم میں یورپ کی شہ پر حجاز کا علاقہ خلافتِ عثمانیہ سے چھینا تھا۔ اُس میں مکہ، مدینہ، طائف اور جدہ شامل تھے۔ علامہ کا مصرع ہندوستانی مسلمانوں میں ضرب المثل بن چکا تھا: ''بیچتا ہے ہاشمی ناموسِ دینِ مصطفیؐ''۔ ہاشمی سلطان حسین ابن علی عموماً شریفِ مکہ کہلاتے تھے۔ عثمانی خلیفہ کی معزولی کے بعد خلافت کے دعویدار بھی تھے۔ اِس برس ابن سعود نے اپنی افواج کے ساتھ حجاز کی طرف پیش قدمی کی۔ طائف پر قبضہ کیا۔ تین چار سو شہری قتل ہوئے۔ شریفِ مکہ نے تاج و تخت بیٹے کے حوالے کیا۔ جدہ چلے گئے۔ ۱۳/ اکتوبر کو سعودی فوجوں نے مکہ پر بھی قبضہ کر لیا۔

شریفِ مکہ کا بیٹا فیصل، عراق کا حکمراں تھا، جس کے بارے میں علامہ کا مصرعہ تھا، ''تُو نام و نسب کا حجازی ہے، پر دل کا حجازی بن نہ سکا۔'' تجویز پیش کی کہ دنیا بھر کے مسلمانوں کی مجلس بنا کر حجاز کا انتظام اُس کے سپرد کیا جائے۔ دوسری تجویز سامنے آئی کہ معزول عثمانی خلیفہ کو حجاز کی حکومت عطا کی جائے۔ علامہ نے مسلم آؤٹ لُک کے نمایندے سے بات کرتے ہوئے دونوں تجاویز کو غیر مناسب

---

[1] بیاضِ زبورِ عجم

[2] مکتوب بنام شیخ عطا محمد ۱۸/ اکتوبر ۱۹۲۴ء محولہ بالا

قرار دیا۔ انہوں نے کہا، "ابنِ سعود عام وہابیوں کا نمایندہ ہے اور سابق خلیفۃ المسلمین سُنّی دنیائے اسلام کے دینی پیشوا رہ چکے ہیں۔ حجاز اِس وقت عملاً وہابیوں کے قبضے میں ہے۔ اگر اِس حالت میں سابق خلیفۃ المسلمین کو حاکمِ حجاز بنانے کی کوشش کی گئی تو اندیشہ ہے کہ مسلمانوں کے اِن دو فرقوں میں سخت کشمکش شروع ہو جائے گی... مسلمانانِ عالم اگر سابق خلیفۃ المسلمین کی ذات سے کچھ کام لینا چاہتے ہیں تو انہیں چاہیے کہ اشاعتِ اسلام کا ایک عظیم الشان نظام قائم کریں اور سابق خلیفۃ المسلمین کو اس نظام کا صدر بنا دیں۔" ابن سعود نے بھی اسلامی دنیا کے نمایندوں کی مؤتمر [کانگریس] بلانے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ علامہ نے اس کی تائید کرتے ہوئے کہا:

> توقع ہے کہ وہ اس مؤتمر کے فیصلے کی پابندی کریں گے۔ بہت ممکن ہے کہ عرب میں ابنِ سعود کے ماتحت ایک زبردست قومی تحریک نشوونما پائے اور اس کے آثار و علائم نظر آ رہے ہیں۔ اِس "احساسِ خودی" کا ہمیں تہ دل سے خیر مقدم کرنا چاہیے، اگرچہ اس کی تہ میں تجرد و تفرید کے مادہ کی نشوونما کا بھی اندیشہ ہے۔ لیکن ہمیں کچھ مدت تک اس تجرد و تفرید کو بھی برداشت کرنا چاہیے۔ عرب فطرتاً جمہوریت پسند ہیں اور سرزمین عرب میں کوئی مطلق العنان حکومت زیادہ مدت تک قائم نہیں رہ سکتی۔

حجاز کی موجودہ صورت حال پر اطمینان اور ابن سعود پر اعتماد ظاہر کیا:

> میری رائے میں سلطانِ نجد ایک روشن خیال آدمی ہے اور جو لوگ سلطان موصوف سے ملے ہیں یا اُنہوں نے نجد کو دیکھا ہے، وہ میری اِس رائے کے مؤید ہیں۔ امریکہ کا ایک مصنف اپنی کتاب الاسلام میں سلطانِ نجد کو ایشیا کا بہترین حاکم اور سرزمینِ نجد کو زوال آمادہ دنیائے اسلام کی صاف اور پاک ترین جگہ بتاتا ہے۔[1]

12

۱۶ر اکتوبر کو علامہ نے سلیمان ندوی کو خط لکھا۔ ندوی نے جو لکھا تھا کہ بعض دفعہ آنحضورؐ اپنے

---

[1] محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتار اقبال، ص ۱۲-۱۰۔ ماخذ ۳ر نومبر ۱۹۲۴ء کا زمیندار ہے۔

استدلال سے صحابہ کے سوال کا جواب دیتے، اُس کے بارے میں پوچھا، ''اس کا حوالہ کون سی کتاب میں ملے گا؟ کیا یہ قاضی شوکانی کی کتاب ارشاد الفحول سے آپ نے لیا ہے۔'' وہ سوال بھی لکھ بھیجا جو ذہن میں پیدا ہوا تھا یعنی کیا آنحضورؐ کے استدلالات بھی تمام اُمت پر حُجت ہیں؟[1]

۱۸/ اکتوبر کو سنیچر تھا۔ فارسی کا ایک شعر ذہن میں آیا کہ عقل بھی عشق ہے۔ ذوقِ نگاہ بھی رکھتی ہے مگر ناپختہ ہے اور جراتِ رندانہ نہیں رکھتی:

عقل ہم عشق است و از ذوق نگہ بیگانہ نیست — لیکن ایں ناپختہ را آں جرأت زندانہ نیست[2]

اُس صبح ڈارلنگ صاحب کی بیگم کا خط ملا۔ اگلی اتوار ڈنر پر بلایا تھا۔ علامہ اُسی شام غالباً مقدمے کے لیے جھنگ جارہے تھے۔ اتوار تک واپسی نہ ہوتی۔ تار دے کر روانگی کی تاریخ ۲۹/ تاریخ کروائی۔[3]

شیخ عطا محمد کا خط اور پوسٹ کارڈ ملا۔ اُس روز جواب دیتے ہوئے علامہ نے اعجاز کے بارے میں لکھا، ''انشأاللہ کوئی نہ کوئی انتظام بہاولپور یا کوئی اور ایسی ہی جگہ تجویز کروں گا... بہتر ہو کہ اِتوار کی صبح کو وہ یہاں ہو تا کہ وہ چیف جج صاحب سے مل سکے۔'' اب تک سردار بیگم کا تذکرہ ''اعجاز کی چچی'' کہہ کر کرتے تھے۔ اِس خط میں بھی یہی کنیت استعمال کی مگر ایک نئی کنیت بھی لکھی: ''اُمید ہے جاوید کی ماں اب اچھی ہو گی۔''[4]

اعجاز کا بیان ہے کہ اُسی روز علامہ کو لدھیانہ سے خبر ملی کہ مختار بیگم کی حالت تشویشناک ہے۔ علامہ نے اُسی روز عطا محمد کو تار دیا۔ اعجاز کو بلوایا۔[5]

اگلے روز پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ لاہور کو چار نظمیں درسی کتابوں میں شامل کرنے کی اجازت دی۔ بورڈ پہلی، دوسری اور تیسری جماعتوں کی اُردو کی کتابوں پر نظرِ ثانی کر رہا تھا۔ 'ہمالہ'، 'پیامِ صبح'،

---

[1] مکتوب بنام سلیمان ندوی ۱۶/ اکتوبر ۱۹۲۴ء محولہ بالا

[2] مکتوب بنام گرامی ۱۹/ اکتوبر ۱۹۲۴ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۵۵-۵۵۴

[3] مکتوب بنام شیخ عطا محمد ۱۸/ اکتوبر ۱۹۲۴ء محولہ بالا

[4] ایضاً

[5] شیخ اعجاز احمد (۱۹۸۵) مظلوم اقبال، ص ۳۵۰

'جگنو' اور 'شعاعِ آفتاب' کو شامل کرنے کے لیے بورڈ کے سیکرٹری اسمتھ نے اجازت طلب کی تھی۔[1] اُسی روز لکھنؤ سے کسی مرزا صاحب کا خط آیا۔ گرامی سے تعارف چاہتے تھے۔ علامہ نے فوراً گرامی کو خط لکھا۔ لاہور آنے کی دعوت دی۔ پچھلے روز جو شعر ذہن میں آیا تھا وہ بھی درج کیا۔[2] صبح کی گاڑی سے اعجاز پہنچ چکے تھے۔ علامہ انہیں ساتھ لے کر لدھیانے پہنچ گئے۔[3]

مختار بیگم کو نمونیا تھا۔ بہترین ڈاکٹر دن میں دو دفعہ آنے لگے۔ ضرورت پڑنے پر تین دفعہ بھی آتے تھے۔ ۲۱/ اکتوبر تک مختار بیگم بیحد کمزور ہو چکی تھیں۔ زچگی کی زحمت برداشت کرنے کے قابل نہ تھیں۔ علامہ سے ان کی تکلیف دیکھی نہ جا رہی تھی۔ ڈاکٹروں سے کہا کہ جہاں تک ممکن ہو، زچہ کی جان بچانے کی کوشش کریں۔ بچے کا خیال نہ کریں۔[4]

اچانک دردِ زہ بند ہو گیا۔ تشویش ناک علامت تھی۔ ڈاکٹروں نے آلات کے ذریعے بچے کو رحم سے نکالنے کی تیاری شروع کی۔ جان بچنے کا امکان کم تھا۔ مختار بیگم بھی جانتی تھیں۔ پھر بھی علامہ نے حال پوچھا تو خدا کا شُکر اَدا کیا اور کہا کہ اچھی ہیں۔ ڈاکٹروں نے آلات کا استعمال شروع کیا۔[5]

مختار بیگم فوت ہو گئیں۔ اُن کی بہنیں زہرہ اور عائشہ رونے لگیں۔ اُن کا درد علامہ کو اپنی برداشت سے زیادہ محسوس ہوا۔ کسی نہ کسی طرح عطا محمد کو تار دیا۔ روایت ہے کہ نمازِ جنازہ پڑھانے کے لیے کوئی ایسا بزرگ تلاش کرنے کی کوشش کی جو قادری سلسلے سے ہو۔ نہ ملا تو خود پڑھائی۔

۲۲/ اکتوبر کو عطا محمد کا کارڈ ملا۔ اُسی وقت جواب لکھا۔ سردار بیگم کا تذکرہ نام لے کر کیا۔ وجہ شاید بدحواسی تھی۔

---

[1] مکتوب بنام اسمتھ ۱۹/ اکتوبر ۱۹۲۴ء؛ برنی (1991) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۵۵

[2] مکتوب بنام گرامی ۱۹/ اکتوبر ۱۹۲۴ء محولہ بالا

[3] شیخ اعجاز احمد (۱۹۸۵) مظلوم اقبال، ص ۳۵۰

[4] مکتوب بنام شیخ عطا محمد ۲۲/ اکتوبر ۱۹۲۴ء؛ برنی (1991) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۵۷-۵۵۶

[5] ایضاً

بنام شیخ عطا محمد

لدھیانہ، ۲۲/ اکتوبر ۲۴ء

برادر مکرم السلام علیکم

آپ کا کارڈ ابھی موصول ہوا ہے۔ کل میں آپ کی خدمت میں تار دے چکا ہوں۔ تقدیر الٰہی کا مقابلہ تدبیر انسانی سے نہیں ہو سکتا۔ مرحومہ کی موت کا منظر نہایت درد انگیز تھا۔ خدا تعالیٰ اس کو اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ بہترین ڈاکٹروں کا علاج تھا جو دن میں تین دفعہ اور اگر ضرورت ہو تو اس سے زیادہ دفعہ آتے تھے اور بعض دفعہ رات بھر یہیں رہتے تھے مگر اللہ کے علم میں مرحومہ کی زندگی کے دن ختم ہو چکے تھے۔ اس موقع پر آپ کا اور بھاوج صاحبہ یا گھر کا کوئی اور آدمی آ جائے تو بہت بہتر ہے۔ میں ۲۴/ اکتوبر تک یہیں رہوں گا اور قلوں کے بعد جاؤں گا۔ سرادر بیگم سے کہہ دیجیے کہ وہ زہرہ اور عائشہ کے نام بہت ہمدردی کا خط لکھے کیونکہ ان دونوں لڑکیوں کا رونا کوئی شخص کیسا ہی سنگدل ہو نہیں سن سکتا۔ ان کی ہر طرح تسلی کرنی چاہیے اور لکھنا چاہیے کہ میں تاعمر تمھاری بہن ہوں اور ہمیشہ تم کو ایسا ہی سمجھوں گی وغیرہ وغیرہ یوں بھی سردار بیگم کو ان دونوں لڑکیوں سے محبت ہے اور اس موقع پر وہ بہت ہمدردی کی مستحق ہیں آپ خود اس کو مضمون لکھ دیں وہ نقل کر کے اور اپنی طرف سے جو اضافہ ضروری ہو کر کے اُن کو خط لکھے۔ جب وہ اچھی ہو جائے تو لدھیانے بھی اظہار ہمدردی کے لیے آئے۔ مرحومہ نے نہایت طمانیت اور سکون سے جان دی۔ موت سے دس پندرہ منٹ پہلے میں نے اس کو دیکھا اور حال پوچھا تو اس نے خدا کا شکر ادا کیا اور کہا کہ اچھی ہوں۔ حالانکہ اس وقت اس کا وقت بالکل قریب تھا اور اس کو بھی یہ بات معلوم تھی۔ نمونیہ نے اسے سخت کمزور کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ ڈلیوری کی زحمت وہ برداشت کرنے کے ناقابل تھی۔ آخر میں ڈاکٹروں سے کہا کہ وہ جہاں تک ممکن ہو سکے اس کی جان بچانے کی کوشش کریں اور بچہ کا خیال نہ کریں۔ چنانچہ یہی تجویز قرار پائی۔ بچے کو رحم سے نکالنے کے لیے آلات کا استعمال شروع ہی ہوا تھا کہ اُس نے جان دے دی۔ مرنے سے قریباً دو گھنٹے پہلے تمام دردِ زہ بند ہو گیا تھا اور یہی علامت بڑی خراب تھی۔ غرض کہ درد کی حالت میں اُس کی حالت بیچارگی اور

بیکسی کی تھی کہ میرے لیے اُس کے چہرے کی طرف نگاہ کرنا بھی مشکل تھا اور میرا قلب سخت رقیق ہو گیا۔ ایک معمولی انسان کو دنیا میں لانے کے لیے جو پچاس ساٹھ سال سے زیادہ اس دارِ فانی میں نہیں ٹھہرتا نیچر اس قدر تکلیف ایک ضعیف عورت کو دیتی ہے۔

زیادہ کیا عرض کروں۔ خدا کے فضل کی دعا کیجیے۔ والد مکرم کی خدمت میں آداب عرض ہو۔

محمدؐ اقبال

13

کہتے ہیں کہ علامہ کا خط ملنے پر شیخ عطا محمد بھی رونے لگے۔[1]

ہائے افسوس! ایک ہمسفر کی موت سے میرا دل اُس کی جدائی میں سراپا درد!

ہاتف نے غیب سے مجھے تسکین دی۔ حدیث پاکِ رسولؐ یاد دلائی۔

اُس کے سالِ وفات کے لیے کہا: شہادت پائی اور منزل پر پہنچی۔

اے دریغا! ز مرگِ ہم سفرے ۔۔۔ دلِ من در فراقِ او ہمہ درد
ہاتف از غیب داد تسکینم ۔۔۔ سخن پاک مصطفی آورد
بہر سال رحیل او فرمود ۔۔۔ بشہادت رسید و منزل کرد

یہ مختار بیگم کی تاریخِ وفات کا قطعہ تھا۔ اعجاز کے مطابق علامہ نے لدھیانے ہی میں مختار بیگم کی وفات کے دوسرے یا تیسرے دن کہا۔ کاغذ اعجاز کے سپرد کر دیا کہ لاہور پہنچ کر دے دیں۔[2]

۲۵ر اکتوبر کو استنبول میں ترک شاعر ضیا گوکالپ کا انتقال ہو گیا۔ ان کی نظمیں جرمن ترجمے کی صورت میں علامہ کی نظر سے گزر چکی تھیں یا گزرنے والی تھیں:

جب تک عورتوں کی صحیح قدر و قیمت کا احساس نہیں ہو گا، حیات ملّی نامکمل رہے گی۔

اہل و عیال کی پرورش میں عدل و انصاف پر عمل کرنا چاہیے۔ اور اس لیے تین چیزیں ہیں جن میں

---

[1] خالد نظیر صوفی اقبال درونِ خانہ، ص ۳۶۔ وسیمہ مبارک کی روایت ہے۔

[2] فقیر سید وحید الدین (بلا تاریخ) روزگارِ فقیر، جلد دوم، ص ۱۹۳؛

مساوات ناگزیر ہے۔ طلاق میں، علیحدگی میں، وراثت میں۔

جب تک وراثت میں عورت کو مرد کا نصف اور رواج میں چوتھائی قرار دیا جاتا ہے عائلہ کا درجہ بلند نہیں ہوگا، نہ ملک کا۔ ہم نے دوسرے حقوق کے لیے عدالتیں کھول رکھی ہیں۔ لیکن عائلہ کی زمام مذاہبِ فقہ کے ہاتھوں میں دے دی ہے۔

مسلمانوں میں کوئی موثر سیاسی اتحاد پیدا ہوگا تو جب ہی کہ بلادِ اسلامیہ آزاد ہو جائیں اور پھر سب کے سب مل کر ایک خلیفہ کی اطاعت اختیار کرلیں۔ لیکن کیا اس امر کا آج امکان بھی ہے؟ اگر نہیں ہے تو پھر بجز انتظار کے چارہ کار ہی کیا ہے؟ لہٰذا خلیفہ کو چاہے اور نہیں تو اس اثنا میں اپنا گھر ہی درست کرلے۔ وہ ایک ایسی ریاست کی تاسیس کا بیڑا اٹھائے جو زمانہ حال میں چلنے کے قابل ہو۔

بین الاقوامی دنیا میں کمزوروں جسے کوئی ہمدردی کرتا... یہاں صرف طاقت کا احترام کیا جاتا ہے۔

نوعِ انسانی کے اوّلین رہنما کون تھے؟ انبیا اور انبیا کی طرح مقدس ہستیاں۔ مذہب نے ہر زمانے میں فلسفہ کی رہنمائی کی۔ اخلاق اور عمل کو اس سے روشنی ملی۔ لیکن پھر مذہب میں بتدریج جمود پیدا ہوتا گیا جس سے اس کا حقیقی جوش اور ولولہ قائم نہ رہا۔ نیک انسان مفقود ہو گئے۔ روحانی قیادت اور وہ بھی برائے نام فقہا کے ہاتھ میں آگئی۔ لیکن فقہا کا رہنما ستارہ روایات ہیں۔ وہ مذہب کو روایات کے راستے پر لے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس فلسفہ کہتا ہے میرا رہنما ستارۂ عقل ہے۔ تم نے دائیں جانب کا رُخ کیا تو میں بائیں جانب کا کروں گا۔

میرا فیصلہ یہ ہے کہ مذہب نام ہے علم قطعی کا اور اس کا مقصد یہ کہ قلب انسانی کو روحانیت سے بھر دے۔

وہ سر زمین جہاں ترکی میں اذان دی جاتی ہے، جہاں نمازی اپنے مذہب کو جانتے اور سمجھتے ہیں، جہاں قرآن پاک کی تلاوت ترکی زبان میں کی جاتی ہے، جہاں ہر چھوٹا بڑا احکام الٰہیہ سے واقف ہے۔

اے فرزندتر کی وہ ہے تیرا آبائی وطن![1]

اُس شام علامہ کی لدھیانہ سے واپسی تھی۔ مختار بیگم کے بھائیوں نے تمام زیور اور سامان واپس کر دیئے۔ علامہ نے کہا کہ شریعت کی رُو سے مرحومہ کے بھائی بہنوں کا حصہ زیادہ ہے۔ وہ نہ مانے۔ علامہ نے اندازہ لگایا کہ مختار بیگم شاید خود یہی وصیت کر گئی تھیں۔ فیصلہ کیا کہ کچھ روپیہ اپنی طرف سے ڈال کر مرحومہ کی کسی یادگار کی صورت میں صرف کریں۔[2] پھر گرامی کا خط لاہور سے ہوتا ہوا پہنچا۔ کوئی مصرع تجویز کیا تھا۔ علامہ نے لکھا:

> جو مصرع آپ نے تجویز فرمایا ہے اُس کے متعلق پھر عرض کروں گا۔ فی الحال یہ رنج دہ خبر آپ کو دینا ہے کہ میری لدھیانے والی بیوی ۲۱/ اکتوبر کو یہاں لدھیانے میں انتقال کر گئی ہے۔ ان کو نمونیا ہو گیا تھا اور انسانی علم طب کی کوئی تدبیر ان کی زندگی نہ بچا سکی۔ اناللہ و انا علیہ راجعون۔ مرحومہ گذشتہ دس بارہ سال میری زندگی میں شریک رہیں اور اس مدت میں انہوں نے میری خدمت گذاری کی، کم کسی بیوی نے اپنے شوہر کی کی ہو گی۔ خدا تعالیٰ ان کو اس کا اجر جزیل عطا فرمائے... آپ سے التماس ہے کہ کوئی عمدہ مادۂ تاریخ نکالیے جس کو ان کے مزار پر کندہ کرایا جائے۔ میں خود بھی فکر کروں گا۔ چونکہ آپ بزرگ ہیں اس واسطے تبرکاً آپ سے مادۂ تاریخ وفات کی درخواست کرتا ہوں۔ ۱۳۴۳ھ ہے۔[3]

اعجاز ساتھ لاہور آئے۔ اگلی شام ڈارلنگ صاحب کے گھر ڈنر تھا۔[4] معلوم نہیں علامہ جا سکے یا نہیں۔ گھر پر تعزیت کرنے والوں کا تانتا لگا تھا۔ ۲۷/ تاریخ کو عطا محمد کو لکھا، ''طبیعت نہایت پریشان ہے۔ پرسوں شام جھنگ مقدمہ کے لیے جاؤں گا۔ اس طرح طبیعت کے اور طرف لگ جانے سے اُمید ہے

---

[1] ضیا گوکالپ کی یہ نظمیں علامہ نے تشکیلِ جدید کے چھٹے خطبے میں نقل کی ہیں۔ ترجمہ نذیر نیازی، سے لیا گیا ہے۔

[2] مکتوب بنام شیخ عطا محمد ۲۷/ اکتوبر ۱۹۲۴ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۵۹–۵۵۸

[3] مکتوب بنام گرامی ۲۵/ اکتوبر ۱۹۲۴ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۵۸–۵۵۷

[4] مکتوب بنام شیخ عطا محمد ۲۷/ اکتوبر ۱۹۲۴ء محولہ بالا

خیالات میں اطمینان وسکون پیدا ہو گا۔"[1] اعجاز کے مطابق لاہور سے لوحِ مزار تیار کروا کے لدھیانے بھجوائی۔ قطع تاریخ درج تھا۔[2]

اعجاز نے مرزا ظفر علی اور سیّد عبدالرؤف بِجّا جان سے ملاقات کی۔ انہوں نے ڈسٹرکٹ جج سے اعجاز کا رول منگوایا۔ اُس نے رول کے ساتھ لکھ بھیجا کہ امیدوار سیاسی تحریکوں میں حصہ لیتا رہا ہے۔ علامہ نے چیف جسٹس سے مل کر حالات واضح کیے۔ مشکل یہ تھی کہ صوبائی کونسل کی قرارداد کے مطابق پہلے سترّ فیصد ملازمتیں زمینداروں کو ملنی تھیں۔[3]

پرانے دوست اور مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے رجسٹرار سید سجاد حیدر یلدرم مصر، سوئٹزرلینڈ اور ترکی کی سیر کے بعد اُسی روز واپس علیگڑھ پہنچے تھے جس روز لدھیانہ میں علامہ اقبال کی اہلیہ کا انتقال ہوا۔ ترکی کے مصنف، قانون داں اور مورخ خلیل خالد بے کا خط اشاعت کی غرض سے لائے تھے۔ شائع کروا دیا۔ قسطنطنیہ یونیورسٹی نے اسلامی علم الانساب پر کچھ کام کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ خالد یونیورسٹی سے منسلک تھے۔ خط اسی سلسلے میں تھا۔ یلدرم نے علامہ سے خاص طور پر تجاویز طلب کیں۔ علامہ نے اقدام کو پسند کیا مگر فوراً ہی تجاویز پیش نہ کر سکے۔[4]

۲۹/ اکتوبر کی شام علامہ جھنگ گئے ہوں گے۔ اگلے روز لاہور میں انجمن حمایت اسلام کا سالانہ جلسہ ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ شریک نہ ہوئے۔[5] طالب علم عبدالرشید طارق نے بھی بعد میں لکھا کہ

---

[1] مکتوب بنام شیخ عطا محمد ۲۷/ اکتوبر ۱۹۲۴ء محولہ بالا

[2] شیخ اعجاز احمد (۱۹۸۵) مظلوم اقبال، ص ۳۵۴

[3] مکتوب بنام شیخ عطا محمد ۵/ نومبر ۱۹۲۴ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۶۰-۵۵۹

[4] مکتوب بنام خالد خلیل بلا تاریخ؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۷۳-۵۶۷

[5] عبدالمجید سالک (۱۹۸۳) ذکرِ اقبال، ص ۱۲۶ کی روایت درست نہیں لگتی کہ ۳۰/ اکتوبر ۱۹۲۴ء کو علامہ نے انجمن کے جلسے میں غزل "نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا..." سنائی۔ زمیندار میں جلسے کی خبر میں علامہ کا ذکر نہیں۔ شاہد، اقبال اور انجمن حمایت اسلام میں انجمن کی روداوں کے حوالے سے ذکر نہیں۔ علامہ نے ۵/ ستمبر کو ندوی کو لکھا تھا کہ "ذاتی اغراض سے" انجمن میں داخل... جماعت جلسہ کی تیاریاں کر رہی ہے۔" جلسے والے دن جھنگ میں ہوں گے جیسا کہ عطا محمد کے نام

۱۹۲۳ء یا ۱۹۲۴ء میں سننے میں آیا کہ علامہ سالانہ جلسے میں شریک ہو کر نظم سنائیں گے۔ جلسہ بیرون بھاٹی گیٹ کے مدرسے میں ہوا۔ علامہ نہ آئے۔[1]

۳۰؍ اکتوبر کو انگلستان میں عام انتخابات ہوئے۔ تین دفعہ سے ہر برس ہو رہے تھے۔ حکومتیں میعاد پوری کرنے میں ناکام ہو رہی تھیں۔ اس دفعہ لبرل پارٹی اپنی ۱۵۸؍ نشستوں میں سے صرف ۴۰؍ نشستیں برقرار رکھ پائی۔ برطانوی سیاست میں ہمیشہ کے لیے اہمیت کھو بیٹھی۔ لیبر پارٹی نے ۱۵۱؍ نشستیں حاصل کیں۔ پچھلے برس سے کم تھیں۔ کنزرویٹو پارٹی ۴۱۲؍ نشستیں حاصل کر کے جیت گئی۔

اُسی روز عرب کے شہر ریاض میں مسلمان ملکوں کے نمائندوں کی مؤتمر منعقد ہوئی۔ ابنِ سعود کی حمایت کا اعلان ہوا۔ کچھ پابندیاں تجویز کی گئیں۔

۴؍ نومبر کو کنزرویٹو پارٹی کے اسٹینلے بالڈوِن دوبارہ وزیر اعظم بن گئے۔ پچھلے برس مئی سے اس برس جنوری تک اس عہدے پر فائز رہ چکے تھے۔ اُن کی جماعت کے ارل آف برکن ہیڈ (Earl of Birkenhead) وزیرِ ہند ہوئے۔

14

نومبر کا مہینہ علامہ کے لیے مصروفیت میں گزرنے والا تھا۔ نئے گورنر سر میلکم ہیلی کے بہت سے ڈنر تھے۔ علیگڑھ کے کوئی پروفیسر علامہ پر کتاب لکھ رہے تھے۔ وہ بھی ملاقات کے لیے آ رہے تھے۔[2]

علامہ جھنگ سے واپس آ چکے تھے۔ اعجاز سیالکوٹ چلے گئے تھے۔ ۵؍ نومبر کو عطا محمد کا پوسٹ کارڈ موصول ہوا۔ علامہ نے اُسی وقت جواب لکھا، ”اگر جاوید اور اُس کی والدہ تندرست ہیں تو بہتر ہے ۱۰؍ نومبر تک آ جائیں۔ لیکن اگر کوئی احتمال ابھی باقی ہے تو وہیں قیام کریں۔ ڈاکٹر حیدر صاحب کا نسخہ ہمراہ لیتے آئیں۔ اس کا استعمال جاری رہے گا... اعجاز کے ہمراہ آ جائیں۔ میں ان شاٗاللہ دسمبر میں والد

۲۷؍ اکتوبر کے خط میں ارادہ ظاہر کیا تھا۔ سالک کو غلطی لگی۔ ڈاکٹر جاوید اقبال، زندہ رود، ص ۳۴۶ پر دہرائی گئی۔

[1] عبدالرشید طارق، 'مے شبانہ'، ص ۲۳۹

[2] مکتوب بنام شیخ عطا محمد ۵؍ نومبر ۱۹۲۴ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۶۰-۵۵۹

مکرم کی زیارت کے لیے حاضر ہوں گا۔"[1]

۷ر نومبر ۱۹۲۴ء کو پنجاب یونیورسٹی سنڈیکیٹ کا اجلاس ہوا۔ کمیٹی تشکیل دی گئی کہ یونیورسٹی میں منتخب عناصر میں اضافے کے لیے گورننگ اور مشاورتی اداروں میں تبدیلیاں تجویز کرے۔ وائس چانسلر سر جوہن مینارڈ کمیٹی کے چیئرمین تھے۔ ارکان علامہ اقبال، سردار بہادر سنگھ مجیٹھہ، بخشی ٹیک چند، ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین، اے ایس ہیمی اور ڈاکٹر ای ڈی لوکس تھے۔[2]

"سردار چچی کو صحت ہوئی تو میں انہیں اور جاوید کو لاہور پہنچا آیا،" اعجاز کا بیان ہے، "چچا جان کی کوشش کامیاب ہوئی اور ہائی کورٹ کے ججوں کی کمیٹی نے مجھے جوڈیشل سروس کے لیے منتخب کر لیا۔"[3] سردار بیگم سے مختار بیگم کی جدائی برداشت نہ ہوتی تھی۔ بڑے ہو کر جاوید نے سنا:

> گھر میں تنہا بیٹھی روتی رہتیں۔ اقبال نے انہیں بارہا صبر کرنے کی تلقین کی، مگر سردار بیگم یہی کہتیں کہ مرحومہ کی گیارہ سالہ رفاقت کے بعد وہ شدید تنہائی محسوس کرتی ہیں۔ انہوں نے اقبال سے استدعا کی کہ مرحومہ کی کسی خالہ زاد بہن سے عقد کر لیں اور یوں سردار بیگم کو مختار بیگم کی بجائے گھر میں ان کی بہن کی رفاقت میسر آ جائے۔ اقبال اسے مذاق سمجھ کر ٹالتے رہے، لیکن سردار بیگم کا اصرار تھا کہ خاندانوں کا تعلق قائم رکھنے کے لیے مروت کا تقاضا یہی ہے کہ وہ اس سلسلے میں مرحومہ کے بھائی سے بات کریں۔[4]

عبداللہ چغتائی کا بیان ہے کہ ڈاکٹر سید محمد حسین کا مطب احمدیہ بلڈنگ میں تھا۔ ہر صبح نو دس بجے کے قریب اپنے تانگے میں آتے اور سیدھے عورتوں اور بچے کی صحت معلوم کرنے زنانے میں چلے

---

[1] ایضاً

[2] ڈاکٹر حسن اختر ملک، اقبال، ایک تحقیقی مطالعہ، ص ۸۹

[3] شیخ اعجاز احمد (۱۹۸۵) مظلوم اقبال، ص ۳۵۶

[4] ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۴) زندہ رود، ص ۳۴۶۔ مرزا جلال الدین سے روایت ہے کہ علامہ نے دہلی میں اُن سے اور نواب ذوالفقار سے سردار بیگم کی ضد کا تذکرہ کیا۔ نواب ذوالفقار کے مشورے پر جلال نے واپسی پر لدھیانہ اتر کر مختار بیگم کے بھائی غلام محمد سے بات چھیڑی۔ اُنہوں نے ٹال دی؛ عبداللہ چغتائی (۱۹۸۹) روایاتِ اقبال، ص ۱۲۷-۱۲۶

جاتے۔ علی بخش اُن کے ساتھ ہی اندر جاتا تھا۔ اگر دوا کی ضرورت ہوتی تو ڈاکٹر صاحب کے مطب سے لے آتا۔ ڈاکٹر صاحب علامہ سے بھی پوچھتے، "اقبال کیا حال ہے؟" علامہ ادب سے جواب دیتے، "شاہ صاحب خیریت ہے۔" ایک روز کہا کہ گوشت سے پرہیز کیجیے۔ اُن کے نکلتے ہی علامہ نے علی بخش کو بلا کر کہا کہ جا کر عمدہ سا گوشت لے آؤ۔ کباب بنائے جائیں۔ علی بخش نے ڈاکٹر کی نصیحت یاد دلائی تو جواب دیا کہ ڈاکٹر لوگ تو اِس قسم کی باتیں کیا ہی کرتے ہیں۔ عبداللہ چغتائی کی طرف دیکھ کر کہا، "ماسٹر تم بھی کباب کھا کر ہی جانا۔"[1]

روایت ہے کہ کسی حکیم دوست نے کئی قسم کے مربہ جات چینی کے مرتبانوں میں بھجوائے۔ نجانے کیا شبہ ہوا کہ علامہ نے باغیچے میں گڑھا کھدوا کر سب وہاں دفن کروا دیے۔[2]

15

۱۹ر نومبر کو مصر کے محبوب رہنما سعد زغلول پاشا نے وزیرِ اعظم کے عہدے سے استعفا دے دیا۔ مصر بعض معاملات میں ابھی تک برطانیہ کا پابند تھا۔ برطانیہ نے بعض مطالبات پیش کیے تھے۔ زغلول انہیں مصر کے مفاد کے خلاف سمجھتے تھے۔ استعفا دینا بہتر سمجھا۔

16

سر شادی لال کی کوٹھی لاہور میں ایڈورڈز روڈ پر تھی۔ ۲۲ر نومبر کی شام سوا چار بجے گورنر پنجاب اور اُن کی بیگم کے اعزاز میں گارڈن پارٹی تھی۔ علامہ کے نام بھی دعوت نامہ جاری ہوا تھا۔[3]

17

غلام جیلانی برق نوجوان طالب علم تھے۔ بڑے بھائی مولوی نور الحق علامہ کے واقف تھے۔ برق کوٹھی کے دروازے پر رُک کر علامہ کو دُور سے دیکھا کرتے تھے۔ ان سے روایت ہے کہ علامہ نے اورینٹل

---

[1] عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۴۹۶

[2] خالد نظیر صوفی اقبال درونِ خانہ، ص ۸۳۔

[3] علامہ اقبال میوزیم لاہور میں محفوظ ہے۔ اقبال اکادمی پاکستان کے پاس عکس ہے۔

کالج کے مولانا نجم الدین جہلمی کو دستی رقعہ بھجوایا۔ کسی فقہی مسئلے پر چاروں ائمہ کی رائے درکار تھی۔ رقعے میں تھا کہ کوئی ایسی کتاب مولوی نورالحق کے ہاتھ بھیجیے۔ برق نے علامہ سے ملنے کے شوق میں مولوی نجم الدین سے درخواست کی کہ بڑے بھائی کی بجائے انہیں بھیجیں۔ علامہ عینی کی شرح ہدایہ یا کوئی اور کتاب لے کر علامہ کے پاس پہنچے:

> آپ ایک کھردرے سے کمبل میں لپٹے آرام کرسی پر بیٹھے تھے اور حقہ پی رہے تھے۔ میں نے مؤدبانہ سلام کیا تو فرمایا: "جیتے رہو بیٹا۔ آؤ بیٹھو۔" اور معاً پوچھا "کہاں سے آئے ہو؟" میں نے انہیں ان کا رُقعہ دکھا کر کہا کہ آپ نے میرے بڑے بھائی نُورالحق کو یاد فرمایا تھا لیکن میں آپ سے ملنے کے لیے اتنا بیتاب تھا اور آج میں نے اس حد تک اصرار کیا کہ ان دونوں بزرگوں نے مجھے آپ سے ملنے کی اجازت دے دی۔ اس پر علامہ مسکرائے اور ایک کش لگا کر فرمانے لگے: "اچھا تو پڑھیے۔" میں نے بات کو واضح تو کیا۔ لیکن آپ کے مزید سوالات کا کوئی جواب نہ دے سکا۔ فرمانے لگے: تو پھر کل مولوی نورالحق کو بھیجیئے۔[1]

18

لارڈ اولیوئیر وزیرِ ہند تھے۔ کچھ عرصہ پہلے سوراجی رہنما ستیامور تھی کے نام خط میں جداگانہ نیابت کے اصول کو ہندوستان کے اتحاد کے لیے مضر قرار دیا تھا۔ شیر پنجاب لالہ لاجپت رائے یہی خیال لے کر برطانیہ سے واپس لوٹے تھے۔ ذہن میں اندیشہ تھا کہ افغانستان، ایران یا وسطِ ایشیا سے مسلمانوں کے لشکر ہندوستان پر حملہ کریں گے۔ ہندوستانی مسلمان اُن کا ساتھ دیں گے۔ انگریزی میں 'ہندو مسلم مسئلہ' ('The Hindu-Muslim Problem') کے عنوان سے طویل مضمون تحریر کیا۔ گاندھی جیسے رہنماؤں سے درخواست کی کہ ایسے حالات فرض کرنا چھوڑ دیں جو درحقیقت موجود نہیں۔ مضمون تیرہ اقساط میں ٹریبیون میں ۲۶، ۲۸ اور ۳۰ر نومبر اور ۳، ۵، ۷، ۱۰، ۱۱، ۱۲، ۱۳، ۱۴، ۱۶ اور

---

[1] مجلہ ضیأبار ۱۹۷۳ء میں برق کا مضمون 'میں اور اقبال'؛ شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۱۹۲–۱۹۱

۱۷ر دسمبر کے شماروں میں شائع ہوا۔

لالہ کا موقف تھا کہ ہندوستان کو واحد شناخت تسلیم کیا جائے۔ اس کے منافی تصورات کو مسترد کر دیا جائے۔ وہ مانتے تھے کہ یہ بات مسلمانوں کی نسبت ہندوؤں کے لیے زیادہ آسان ہے۔ ہندو صرف ہندوستان میں بستے تھے۔ ان کے لیے ہندو مت اور ہندی قومیت ایک ہی چیز تھے۔ ہندو مت میں مذہب کا مطلب یہی تھا کہ انسان جس ذات میں پیدا ہو اُس کے رسوم و رواج کے مطابق عمل کرے۔ اس لیے لالہ کے نزدیک ہندو مت سب سے زیادہ روادار مذہب تھا۔ اسے دوسروں کے عقائد سے سروکار ہی نہیں تھا۔ صرف اچھوتوں کے ساتھ بدسلوکی ختم کرنے کی ضرورت تھی۔ لالہ کا موقف تھا کہ شدھی کی تحریک ہندوؤں کی اصلاح کے لیے شروع ہوئی۔ جب مسلمانوں کی جداگانہ نیابت سے ہندوؤں کو تشویش ہوئی تب یہ مسلمانوں کو دوبارہ ہندو مت میں داخل کرنے کی تحریک بن گئی۔ لالہ کے مطابق سنگھٹن کی بنیاد بھی مسلم دشمنی نہیں تھی مگر یہ تحریک صرف اسی جذبے کے سہارے ہی پروان چڑھ سکتی تھی، جیسے تنظیم کی تحریک ہندو دشمنی کے بغیر نہیں چل سکتی تھی۔

ان کے خیال میں اسلام کے لیے رواداری اپنانا مشکل تھا۔ وہاں ایک خدا اور ایک رسولؐ کا تصور موجود ہے۔ اس لیے اسلام، ہندو مت اور ہندوستان کے ہر مذہب کی رسومات اور عقائد ساتھ ساتھ نہیں چل سکتے۔ کچھ مذہبی حقوق مسترد کرنے ہی پڑیں گے۔ ان میں مسلمانوں کی جداگانہ نیابت اور تحریکِ خلافت سرِ فہرست تھے۔ لالہ انہی دو چیزوں کو ہندو مسلم فسادات کی وجہ سمجھتے تھے۔

لالہ سمجھتے تھے کہ ہندی مسلمان جس عالمی مسلم برادری کا غم کھاتے ہیں، اُس کا ہندوستان سے باہر وجود ہی نہیں ہے۔ ترکی، ایشیائے کوچک، شام، فلسطین اور مصر کے مسلمان صرف اپنے ملکی مسائل پر سوچ بچار میں مصروف دکھائی دیتے ہیں۔ ترکی میں لالہ کی ملاقات ہندوستان سے ہجرت کر کے آنے والے دو نوجوانوں سے ہوئی۔ وہ اجنبیت محسوس کر رہے تھے کیونکہ ترک اپنی فوج میں صرف ترکوں کو بھرتی کرتے تھے۔ فلسطین میں امریکی اور یورپی سرمائے سے مسلمانوں کی زمینیں خرید کر یہودیوں کو دی جا رہی تھیں۔ عالمِ اسلام کے بیچوں بیچ ایک مغربی ریاست قائم کرنے کی کوشش تھی۔ لالہ کے خیال میں خلافت کے خاتمے کے ساتھ اسلامی اتحاد کا امکان بھی ختم ہو گیا تھا۔

لالہ نے سر فضلِ حسین پر بھی تنقید کی۔ سر فضل ۱۹۲۱ء سے پنجاب کے وزیرِ تعلیم تھے۔ سرکاری ملازمتوں میں مسلمان اپنی آبادی کے تناسب سے کم تھے۔ سر فضل نے انہیں ترجیحی بنیادوں پر بھرتی کرنے کی پالیسی اپنائی۔ لالہ کے خیال میں عام مسلمانوں کو فائدہ کم پہنچا۔ ہندوؤں کی بدگمانی زیادہ بڑھی۔ بہتر ہوتا کہ سر فضل مسلمانوں کے پسماندہ ضلعوں میں تعلیم کی عام فراہمی کے لیے خصوصی اقدامات کرتے خواہ اس کے لیے سرکاری فنڈز ہی استعمال کیے جاتے۔

لالہ کو علامہ اقبال سے بھی شکایت تھی۔ سمجھتے تھے کہ سر سید احمد خاں کے تین سیاسی عقائد تھے۔ اول، ہندوستان سے باہر کی مسلم ریاستوں کے تعلقات میں دخل نہ دینا۔ دوم، ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت بہتر بنانے پر تمامتر توجہ مرکوز کرنا۔ سوم، انگریز حکومت کا ساتھ دینا۔ مسلمانوں نے تینوں اصولوں کی خلاف ورزی کی۔ انگریز کی مخالفت کرنے پر لالہ کو اعتراض نہ تھا مگر پہلے دو اصولوں سے مسلمانوں کی روگردانی پر افسوس تھا۔ طرابلس اور بلقان کی جنگوں پر ردِ عمل اور پھر تحریکِ خلافت سے ظاہر تھا کہ مسلمان وطن پرستی پر بین الاقوامی جذبے کو غالب آنے دیتے ہیں۔

لالہ کے نزدیک بانگِ درا اس کی مثال تھی۔ اُنہیں اس کتاب میں حُب الوطنی صرف پہلے حصے میں دکھائی دی۔ دوسرے حصے تک پھر بھی ملیت کا رنگ نہیں چڑھا تھا۔ تیسرے حصے میں یہ رنگ غالب تھا۔ یہاں علامہ نے وطنیت کے تصوّر پر جو اعتراضات کیے، حُبُ الوطنی کے منافی تھے۔ اس طرح لالہ نے دو غلط فہمیوں کی بنیاد ڈالی جو مدت تک اقبال شناسی کا تعاقب کرنے والی تھیں۔ اول یہ کہ علامہ نے مسلم قومیت کا تصوّر پیش کرنے کے بعد غیر مسلموں کی تعریف کرنا چھوڑ دی۔ یہ غلط فہمی اِس لیے پیدا ہوئی کہ لالہ نے بانگِ درا کے تیسرے حصے کی اُن منظومات کا ذکر نہ کیا جو غیر مسلموں کی تعریف میں تھیں، جیسے 'رام'، 'نانک' اور 'شیکسپئیر'۔ یہ نہ لکھا کہ 'اسرارِ خودی' کے پہلے ایڈیشن کے دیباچے میں شری کرشن کے افکار کی اسلامی عقائد کے ساتھ مماثلت بیان ہوئی تھی۔ دوسری غلط فہمی یہ تھی کہ وطنیت کے سیاسی تصور پر علامہ کے اعتراضات حُبُ الوطنی سے متصادم تھے۔ لالہ نے یہ نہ بتایا کہ وہی اعتراضات چت رنجن داس بھی کرتے تھے۔ دیش بندھو کہلاتے تھے۔

لالہ کے نزدیک جداگانہ نیابت کے بغیر صرف صوبائی کونسلوں میں آبادی کے تناسب سے

مسلمانوں اور ہندوؤں کے لیے نشستیں مخصوص کی جا سکتی تھیں لیکن پنجاب میں صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ سکھ بھی رہتے تھے۔ پنجاب کے موجودہ صوبے میں اُن کی تعداد مجموعی طور پر بہت کم تھی اس لیے انہیں ایک "موثر اقلیت" بنانے کے لیے اضافی نشستیں دینے کی ضرورت پیش آتی۔ یہ نشستیں اگر مسلمانوں کے حصے میں سے دی جاتیں تو مسلمان اکثریت سے اقلیت میں بدل جاتے۔ اگر ہندوؤں کے حصے سے دی جاتیں تو وہ موثر اقلیت سے غیر موثر اقلیت بن جاتے۔

لالہ نے لکھا کہ اگر مسلمان اُن علاقوں پر حکومت چاہتے ہیں جہاں اکثریت میں ہیں تو جداگانہ نیابت کی بجائے درست طریقہ یہ ہے کہ ہندوستان کو تقسیم کر دیا جائے۔ مسلم ہندوستان اور ہندو ہندوستان ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جائیں۔ اس کے لیے:

۱ پنجاب کو تقسیم کیا جائے۔ مغربی پنجاب میں مسلمانوں کی اور مشرقی پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں کی اکثریت ہو۔

۲ بنگال کو بھی تقسیم کیا جائے تاکہ مغربی بنگال میں ہندوؤں کی اور مشرقی بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت ہو۔ اگر داس کا "میثاق" کامیاب ہو جاتا ہے تو بنگال کی تقسیم کی ضرورت پیش نہیں آئے گی لیکن لالہ جی سمجھتے تھے کہ بنگال کے دولتمند، ترقی پسند اور بااثر ہندو کبھی داس کے میثاق کو قبول نہیں کریں گے۔

۳ اگر بعض دوسرے علاقوں میں بھی مسلمانوں کی آبادی اس طرح اکٹھی ہو کہ اُن علاقوں کے صوبے بنائے جا سکیں تو وہاں بھی یہی کیا جائے۔

لالہ نے اپنی تجاویز کا خلاصہ تیرہ نکات کی صورت میں پیش کیا۔ کشیدگی کی ذمہ داری مسلمانوں پر عائد کرتے تھے۔ اس لیے زیادہ ہدایات مسلمانوں کے لیے تھیں:

1. Free your minds from the pernicious doctrine of absolute rights.
2. Purge your politics of "religion" (dogmatic religion).
3. Rationalise religion as much as possible, and lay emphasis only on essentials.
4. Remove social barriers which separate and estrange one community from another.

5. Love India above any other country in the world, and be Indians first and last.
6. Concentrate all efforts on improving conditions at home. That does not debar you from sympathising with your fellow-religionists abroad and helping them occasionally, provided that your duty to your own countrymen permits of it. In this respect follow Turkey and Egypt.
7. Don't fret at Shuddhi. It has come to stay.
8. You can try Sanghathan and Tanzim, if you can purge them of anti-Muslim and anti-Hindu feelings, which, in my opinion, is very difficult.
9. Have proportional representation in Legislature if you.may, but do not insist on separate electorates.
10. Divide the Punjab into two Provinces to make majority rule effective.
11. Don't insist on population being the rule of representation in local bodies. But if you must, do not insist on separate electorates.
12. Have Public Service Commissions to regulate the filling of Government posts on certain general broad principles.
13. No communal representation in Universities and educational institutions. But special facilities for backward classes may be provided, with special grants from public revenues for their benefit.[1]

19

علیگڑھ یونیورسٹی کے صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے کسی تجویز کے متعلق علامہ سے مشورہ کیا۔ ۲۶/ نومبر کو علامہ کو عبدالماجد دریابادی کے نام ایک خط ڈاک میں ڈالنے کے بعد کچھ خیال آیا۔ دوسری چٹھی لکھی، "آپ صاحبزادہ صاحب کی خدمت میں فوراً خط لکھیں کہ وہ تجویز معلومہ کورٹ کے سامنے پیش نہ کریں۔ کم از کم مجھ سے پوچھے بغیر پیش نہ کریں۔ والسلام۔ تاکید مزید عرض کرتا ہوں۔"[2]

کنج پورہ کے نواب ابراہیم علی خاں اپنے اختیارات میں اضافے کے لیے گورنر پنجاب کو میموریل پیش کرنا چاہتے تھے۔ گورنر کے ساتھ علامہ کے خصوصی مراسم کی وجہ سے نیازالدین خاں سے علامہ کو خط لکھوایا۔ کسی اور وکیل کی بجائے علامہ پیش کریں۔ ۲۹/ نومبر کو علامہ کو خط ملا۔ اُس

[1] Rai, 'The Hindu-Muslim Problem', pp.217-218

[2] مکتوب بنام عبدالماجد ۲۶/ نومبر ۱۹۲۴ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۶۱-۵۶۰

شام نواب سر ذوالفقار کے ساتھ غالباً کرنال کے نوابوں کے مقدمے کے سلسلے میں وہاں جا رہے تھے۔ فوراً جواب لکھا:

> نواب صاحب کے صفاتِ ستودہ کا میں مدت سے قائل ہوں، خاص کر اُن کی دین داری اور اسلامیت کا۔ اُن کے کام کے لیے میں دل و جان سے حاضر ہوں اور اپنی بساط کے مطابق اُن کے حقوق کے حصول کے لیے انشاًاللہ پوری کوشش عمل میں لاؤں گا۔ میری طرف سے اُن کی خدمت میں عرض کر دیں کہ میری خدمات اُن کے لیے حاضر ہیں۔ میں خود ہی گورنر صاحب کی خدمت میں اُن کا میموریل پیش کر دوں گا (اگر اُن کی ایسی خواہش ہو)۔ موجودہ گورنر کو میں جانتا بھی ہوں اور اس کے علاوہ میرے پرانے دوست اور اُستاد مسٹر آرنلڈ کے وہ نہایت گہرے دوست ہیں۔ غرض کہ میں ہر طرح سے حاضر ہوں۔ باقی رہا فیس کا معاملہ، سو اُس کے متعلق فکر کرنے کی ایسی ضرورت نہیں۔ اوّل تو مجھے اِس وقت معلوم نہیں کہ کام کی نوعیت اور مقدار کیا ہے۔ دوم: اگر یہ اُمور معلوم بھی ہوں تو خدانخواستہ یہاں دکان داری نہیں، خلوص اور خدمت ہے۔ نواب صاحب خود بفضلہ نکتہ رس ہیں اور آپ بھی تجربہ کار آدمی ہیں۔ معاملات کی اہمیت کا اندازہ کرنا جانتے ہیں۔ مجھے اس معاملے میں عرض کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ سوائے اس کے کہ آپ کے خیال میں جو کچھ فیس اس خدمت کے لیے ماڈریٹ ہو گی، وہی میرے خیال میں بھی ماڈریٹ ہو گی۔ آپ اگر لاہور تشریف لائیں تو مجھے کام کی مقدار اور نوعیت سے آگاہ فرمائیں۔[1]

کرنال میں ایک دو روز قیام رہا ہو گا۔ ممکن ہے کہ نیاز الدین یا نواب ابراہیم سے بھی ملاقات ہوئی ہو۔ دسمبر کی ابتدائی تاریخوں میں لاہور واپسی ہوئی ہو گی۔[2] محمد دین فوق نے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی کی

---

[1] مکتوب بنام نیاز الدین خاں ۲۹/ نومبر ۱۹۲۴ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۶۲-۵۶۱

[2] ایضاً

سوانح مرتب کی تھی۔ ۳۱؍ دسمبر کو علامہ نے طویل تقریظ لکھی۔ مولانا کے علمی کارنامے بیان کیے۔ "اس میں کچھ شک نہیں کہ ان کے خیالات کا بیشتر حصّہ اب تقویمِ پارینہ ہے،" انہوں نے لکھا، "لیکن اسلامی فلسفے کا مؤرّخ اس کو نظر انداز نہیں کر سکتا... منشی محمد الدین صاحب فوق نے جن کی تاریخی کرید مشہور ہے۔ مولانا مرحوم کے حالات زندگی لکھ کر ملک اور قوم پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ ان کی یہ تصنیف نہایت دلچسپی کے ساتھ پڑھی جائے گی۔"[1]

انجمن حمایت اسلام کے بارے میں ۵؍ ستمبر کو زمیندار میں اشاعت کے لیے خط بھیجا۔ سکریٹری کا نام لکھنا بھول گئے۔ ۷؍ ستمبر کو مہر کے نام خط میں تصحیح کی۔[2]

The Hindu-Muslim Problem

by Lala Lapat Rai
Part 7. *Tribune,* 10 December 1924
[Excerpt]

There was a time when the ablest and perhaps the most popular of Muslim poets sang the two songs, one beginning with the line *Sare jahan se accha Hindustan hamara* (of all the countries of the world, our Hindustan is the best), and the other a Mussaddas ending with the refrain: “The same is my country, the same is my country.” It will be interesting to insert here a few verses from these songs, showing the depth of patriotism and the height of nationalism which inspired their composer, and the broad spirit of tolerance that pervaded them. The first contained the following:

(Translation)–Religion does not teach mutual aniomsity.
We are Indians; our country is Hindustan.
Greece, Egypt and Rome have all been effaced from the world,
but our name and distinction is still living.
There is some reason why our life will not be extinct,
although changing time has been our enemy for centuries.

This song is often sung as a substitute tune for “Bande Mataram,” and has been raised to the dignity of a national anthem. Take the following from the other:

---

[1] مکتوب بنام محمد دین فوق ۳۱؍ دسمبر ۱۹۲۴ء؛ اقبالیات، جنوری-مارچ ۱۹۸۸ء

[2] مکتوب بنام مہر ۷؍ دسمبر ۱۹۲۴ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۶۳-۵۶۲

1. (Translation)–The land in which Chishti delivered his message of truth; the garden in which Nanak sang the song of theism; the land which Tartars adopted as their home; the land which made the people of Hedjaz leave the desert of Arabia; the same land is my native land, the same is my native land.
2. (The land) which aroused the wonder of the Greeks. (The land) which taught Science and Art to the whole world, etc. etc.
3. The place from where the world heard the song of theism; the place from where the Prophet of Arabia received cool breezes, etc. etc.
4. In the foot-note it is said that the first line refers to the flute of Shri Krishna, and the second is a hadis to the effect that the Prophet said [that] he was receiving cool breezes from the direction of India.
5. (The land) in whose atmosphere life is life of Paradise.
6. (The land) which is Gautama's country, (and thus) is the holy land of the Japanese, (the land) which is a smaller Jerusalem for the lovers of Christ.

There is another song composed by the same poet under tho name of the "New Shivala"–the temple dedicated to Shiva, which is full of the noblest possible sentiments of Hindu-Muhammadan unity. I used to often recite it in my exile in the United States of America, and translated it into English for an English magazine. My translation was versified by Dr. Ananda Coomarswami and published in one of the American magazines.

Equally remarkable and pathetic is a poem called Sada-i-Dard (a wail of pain) lamenting Hindu-Muslim disunity. Following tho same line and even more pathetic and impressive is a poem called Taswir-i-Dard (a picture of pain). I cannot resist the temptation of giving a few verses here:

(Tr.) Oh, Hindustan, the spectacle makes me weep. Thy story is the most instructive of all stories.

The next verses bewail the fact that the writer has been assigned by fate (the duty of) being a reader of mourning literature (Nauha khawan) on India.

(Tr.) Oh! plucker of flowers (evidently referring to the foreign rulers). You have not left a trace of the leaves even. By your good luck, the gardeners are engaged in warring with each other.

(This evidently refers to Hindu Muslim quarrels). Then come the following verses:

(Tr.) Oh, fool, think of your country; misfortune is about to overtake it as there are consultations in heavens to ruin it. See what is

happening and what is about to happen. What is the use of repeating old stories?

Oh! Indians, if you won't awaken in time, you will be effaced, and there will be no mention of you even in stories.

In a collection of Dr. Iqbal's Urdu poetry just published at Lahore, his poems are divided into three periods. The first ends with 1905. All the poems breathing the love of country and Hindu-Muhammadan unity belong to this period. The second ends with 1908. The third begins with 1908. It is remarkable that all the poems cited by me belong to the first period. The first and the second periods are comparatively free from sectarianism. [The] third period is full of sectarian religionism.

Compare these gems of Urdu literature and Indian nationalism with later songs in the days of Pan-Islamism, which begin with the verse:

(Tr.) China and Arabia is ours (and so) is India ours. We are Muslims, the whole world is our native land.

In a still later poem occurs the following:–

(Tr.) Your hem is free from the dust of native land: Thou art the Joseph [to] whom every Egypt is Canaan.

In a poem on patriotism or a love of country the poet sings of its evils and hints that the Prophet cut the roots of the tree of patriotism. This, he holds, is a new-fangled weapon of modern powers.

What a change! But even more remarkable are some of the folk songs composed during the best days of the Khilafat movement, which have been sung and are still being sung by the masses of Muslims in the Punjab.

Let the reader imagine what an attitude of mind must have been produced in the minds of the younger genenration of Mussal-mans by writings and songs like these.

Dr. Muhammad Iqbal is no ordinary versifier. He is an accomplished scholar and a poet of the highest order, who is master of several languages. His writings and poems are to be found in every educated Muslim's home, nay, even in most cultured Hindu homes too. He has by no means been the solitary propounder of these views. I have selected him because, being an admirer of his, I have been a constant reader of his compositions.[1]

20

اس برس ای.جی براؤن کی تاریخ ادبیات فارس (*A Literary History of Persia*) کی چوتھی اور

---

[1] Rai, 'The Hindu-Muslim Problem', pp.197-200

آخری جلد شائع ہوئی۔ ملا صدرا اور ملا ہادی سبزواری کے بارے میں علامہ کے ڈاکٹریٹ کے مقالے کے حوالے دیئے گئے تھے۔ ایک اقتباس نقل بھی کیا گیا۔ بابی مذہب کے آغاز کے بارے میں اُن کے نظریے سے اتفاق کیا۔[1] 'اسرارِ خودی' کے بارے میں لکھا کہ لاہور یونیورسٹی پریس میں طبع ہوئی۔ یہ درست نہ تھا۔ یہ بھی لکھا کہ مشرقی رنگ میں نیٹشے کے فلسفے کا چربہ ہے۔ یہ بات عجیب تھی۔ تین برس پہلے خود براؤن نے اِس مفروضے کی تردید کرتے ہوئے لکھا تھا، "ڈاکٹر نکلسن لکھتے ہیں کہ زیادہ تر نیٹشے اور برگساں اور بہت کم جدید فلسفۂ افلاطون کے ماہرین اور اُن کے مشرقی جانشین کا مرہونِ منت ہے۔ حالانکہ کسی حالت میں بھی مغربی فلسفہ نہیں بلکہ صراحتاً فلسفی حیثیت سے اخوتِ اسلام کی تعلیم ہے، جو استغراق، انسدادِ خودی و ہمہ اوست کے امراض کے علاج کے لیے لکھی گئی ہے۔"[2]

معلوم ہوتا ہے کہ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ سے جلیل احمد نے علیگڑھ میگزین کے لیے علامہ کے اشعار کی فرمایش کی۔ علامہ نے سید سجاد حیدر ریلدرم کو تازہ فارسی غزل کے اشعار بھجوا دیے، "آخر کے تین شعر اگر پسند نہ ہوں یا علی گڑھ کی فضا کے لیے موزوں نہ ہوں تو کاٹ دیجیے۔"[3]

ایک مداح، امجد نجمی نے اصلاح کی غرض سے اشعار بھیجے۔ ۱۲/ دسمبر کو علامہ نے شکریہ ادا کر کے لکھا، "شعرا کے لیے بہترین ہدایت یہ ہے کہ بہترین اساتذہ کے کلام کا مطالعہ کیا جائے۔"[4]

21

ٹریبیون کے ۱۳/ دسمبر کے شمارے میں لالہ لاجپت رائے کے مضمون کی دسویں قسط آئی۔ شدھی، سنگھٹن اور تنظیم کی تحریکوں کے بارے میں تھی۔ ۱۴/ دسمبر کے شمارے میں، جو ۱۳/ دسمبر کو شائع

---

[1] E. G. Browne (1924), *A Literary History of Persia,* p.430

[2] اقتباس کا ترجمہ عبداللہ چغتائی کے مضمون 'پیامِ مشرق' کے حاشیے سے لیا گیا ہے۔ یہ مضمون دراصل نکلسن کے تبصرے کا ترجمہ ہے جس کے حواشی عبداللہ چغتائی نے علامہ کی نگرانی میں تحریر کیے تھے۔ "مولوی محمد عبداللہ" کے نام سے شائع ہوا۔ مشمولہ ڈاکٹر سلیم اختر، اقبال ممدوحِ عالم۔

[3] مکتوب بنام سجاد حیدر ریلدرم بلا تاریخ؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۲۱

[4] مکتوب بنام امجد نجمی ۱۲/ دسمبر ۱۹۲۴ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۶۳-۵۶۲

ہوا ہو گا، گیارہویں قسط تھی۔ تجویز تھی کہ ملک کو "مسلم ہندوستان" اور "ہندو ہندوستان" میں تقسیم کر دیا جائے۔ آبادیوں کا تبادلہ ہو۔ ایک حصے میں صرف مسلمان اور دوسرے میں صرف ہندو رہیں۔

The Hindu-Muslim Problem

by Lala Lapat Rai
Part 11. *Tribune*, 14 December 1924
[Excerpt]

Under the circumstances, I would suggest that a remedy should be sought by which the Muslims might get a decisive majority without trampling on the sensitiveness of the Hindus and the Sikhs. My suggestion is that the Punjab should be partitioned. into two provinces, the Western Punjab with a large Muslim majority, to be a Muslim-governed Province; and the Eastern Punjab, with a large Hindu-Sikhs majority, to be a non-Muslim-governed Province. I do not discuss Bengal. To me it is unimaginable that the rich and highly progressive and alive Hindus of Bengal will ever work out the Pact agreed to by Mr. Das. I will make the same suggestion in their case, but if Bengal is prepared to accept Mr. Das's Pact, I have nothing to say. It is its own look-out.

Maulana Hasrat Mohani has recently said that the Muslims will never agree to India's having Dominion status under the British. What they aim at are separate Muslim States in India, united with Hiudu States under a National Federal Government. He is also in favour of smaller States containing compact Hindu and Muslim populations. If communal representation with separate electorates is to be the rule, then Maulana Hasrat's scheme as to smaller provinces seems to be the only workable proposition. Under my scheme the Muslims will have four Muslim States: (1) The Pathan Province or the North-West Frontier, (2) Western Punjab, (3) Sindh, and (4) Eastern Bengal. If there are compact Muslim communities in any other part of India, sufficiently large to form a Province, they should be similarly constituted. But it should be distinctly understood that this is not a united India. It means a clear partition of India into a Muslim India and a non-Muslim India.[1]

۱۳ دسمبر کو اِسلامیہ کالج لاہور کے حبیبیہ ہال میں علامہ نے اسلام میں اجتہاد کے موضوع پر انگریزی میں مضمون پڑھا۔ شیخ عبدالقادر صدارت کر رہے تھے۔ مولانا ظفر علی خاں بھی آئے۔ عبداللہ چغتائی بھی موجود تھے۔ چودھری محمد حسین کا نام نہیں لیا گیا لیکن اُن کی موجودگی قریباً یقینی ہے۔ احمدی

[1] Rai, 'The Hindu-Muslim Problem', pp.212-213

حاضرین میں ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ اور جماعت احمدیہ لاہور کے بانی محمد علی [لاہوری] شامل تھے۔[1] "تمام ہال سامعین سے بھرا ہوا تھا،" چغتائی سے روایت ہے۔ علامہ کے گوجرانوالہ کے دوست خان بہادر محمد حسن کے سترہ سالہ صاحبزادے ممتاز حسن نے علامہ کو پہلی دفعہ دیکھا۔ اُن کے مطابق علامہ نے گہرے رنگ کا انگریزی سوٹ پہن رکھا تھا۔ سر پر ترکی ٹوپی تھی۔[2]

چغتائی سے روایت ہے، "مضمون پڑھنے سے پیشتر علامہ نے اس کی اہمیت اور اس کا پس منظر بھی بیان کیا۔ پھر مولوی محمد علی امیر جماعتِ احمدیہ کو خطاب کر کے فرمایا کہ میں نے بارہا آپ سے عرض کی ہے کہ اگر مرزا غلام احمد صاحب کوئی نئی شریعت لے کر آئے ہیں تو آپ لوگوں کا فرض تھا کہ آپ اُسے پیش کرتے۔ نبی عام طور پر نئی شریعت لاتا ہے اور ما قبل کی شریعت میں ردوبدل کرتا ہے مگر آپ کی طرف سے ابھی تک کوئی ثبوت نہیں دیا گیا۔"[3]

ممتاز حسن کے مطابق علامہ نے پہلے سے لکھا ہوا لیکچر پڑھا۔ پیچھے سے کسی نے انگریزی میں ہانک لگائی، "اونچا اور ٹھہر ٹھہر کر، پلیز! ہمیں آپ کی سمجھ نہیں آ رہی، ڈاکٹر اقبال!" (Loudly and slowly, please! We cannot follow you, Doctor Iqbal!)۔ حاضرین کی نظریں اُس شخص کی طرف اُٹھیں۔ علامہ کے چہرے پر ماورائی قسم کی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔ کاغذ سے نظریں اُٹھائے بغیر انگریزی میں کہا کہ زیادہ ٹھہر ٹھہر کر بول سکتے ہیں مگر زیادہ اونچا نہیں:

"I can speak more slowly if you like, but I cannot speak more loudly."

سامعین پر پہلے سے زیادہ گہری خاموشی طاری ہو گئی۔ لیکچر کے دوران ترکی شاعر ضیآ کے اشعار کا ترجمہ پڑھتے ہوئے علامہ کی آواز میں خاصا جوش پیدا ہو گیا۔[4] چغتائی کا بیان ہے، "اختتامِ مضمون پر علامہ نے یہ بھی فرمایا کہ مضمون ہنوز نامکمل ہے۔ فی الحال یہ مقصد مدِ نظر ہے کہ لوگوں کو اِس طرف متوجہ

---

[1] چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۳۰۳

[2] فقیر سید وحید الدین (بلا تاریخ) روزگارِ فقیر، جلد دوم، ص ۸۷

[3] عبد اللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۳۰۳

[4] Mumtaz Hasan (1982), pp.16-17۔ فقیر سید وحید الدین (بلا تاریخ) روزگارِ فقیر، جلد دوم، ص ۸۷

کیا جائے اس لیے اس پر کسی قسم کی تنقید یا تبصرے کی ضرورت نہیں۔" وہ لکھتے ہیں:

> حاضرین نے یہ مضمون نہایت توجہ سے سنا لیکن چونکہ مضمون انگریزی زبان میں تھا اس لیے لوگوں نے اس سے کماحقہ استفادہ نہ کیا۔ لوگ عام طور پر علامہ سے نظم سننے کے عادی تھے۔ مضمون کے اختتام پر صدرِ جلسہ شیخ عبدالقادر نے اپنے صدارتی کلمات میں فرمایا کہ اقبال کا یہ علمی کارنامہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ پھر مولانا ظفر علی خاں نے مشورہ دیا کہ یہ مضمون اُردو زبان میں منتقل ہونا چاہیے جس پر علامہ نے کہا کہ میں بہ طیبِ خاطر اِس کے لیے تیار ہوں بشرطیکہ مولانا ظفر علی خاں صاحب خود اس کا اُردو ترجمہ کرنے کی زحمت فرمائیں، کیونکہ وہی اس کا بہتر ترجمہ کر سکتے ہیں۔

یہ مضمون موجود نہیں ہے۔ صرف کچھ ہی معلومات دستیاب ہیں:

۱ مضمون کا موضوع اسلام میں اجتہاد تھا۔ اِس کا عنوان علامہ نے 'The idea of Ijtehad in the law of Islam' بتایا تھا لیکن تب مضمون مکمل نہ ہوا تھا۔ عبداللہ چغتائی نے 'الجتہاد فی الاسلام' لکھا ہے۔ عبدالماجد دریابادی نے صرف 'اجتہاد' لکھا۔

۲ یہ ایک طویل مضمون تھا۔ علامہ نے اسے اپنی دوسری تحریروں میں بھی استعمال کیا۔

۳ عبادات میں کسی قسم کی ترمیم و تنسیخ پیشِ نظر نہ تھی۔ ان کی ازلیت و ابدیت پر دلائل قائم کرنے کی کوشش کی۔

۴ معاملات کے بارے میں سوال اُٹھایا کہ کیا ان سے متعلق احادیث پوری اُمت کے لیے حُجت ہیں۔ مطلب یہ نہ تھا کہ احادیث سرے سے بیکار ہیں۔

۵ زمانۂ حال کے اصولِ قانون (jurisprudence) کی روشنی میں اسلامی معاملات کا مطالعہ کرنے کی ضرورت پر زور دیا، مثلاً میراث میں لڑکی کو لڑکے سے آدھا حصہ ملنا عورت کو مرد سے کمتر رُتبہ دینے کی وجہ سے نہیں بلکہ انصاف پر مبنی ہے۔ برابر حصہ ملنے سے انصاف قائم نہیں رہتا۔

۶ احادیث میں ایسے بیش بہا اصول تھے کہ سوسائٹی باوجود اپنی ترقی و تعالی کے اب تک ان کی

بلندیوں تک نہیں پہنچی۔ مثلاً ملکیتِ شاملاتِ دہ کے متعلق المرعیٰ للہ و رسولہ (بخاری) یعنی
''چراگاہیں اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہیں۔''

ے ترکی شاعر ضیا گوکالپ کی نظم سے اقتباس بھی شامل تھا۔[1]

چغتائی کے مطابق ''اخبارات میں اِس مضمون کا بہت چرچا ہوا اور اِس سے لوگوں کو علامہ کی تازہ علمی تحقیقات کا علم ہوا۔''[2] اخبارات کی وہ تحریریں ابھی اکٹھی نہیں کی جا سکی ہیں۔ علامہ کا بیان ہے کہ مضمون پر اعتراضات ہوئے۔ بعض تحقیقات سے اپنا دل مطمئن نہ تھا۔ اشاعت ملتوی کر دی۔ کسی وقت مسودہ عبدالماجد دریا آبادی کو بھجوایا کہ رائے دیں۔[3]

22

علامہ کو نیازالدین خاں کا خط ملا۔ فوراً جواب نہ دے سکے۔[4] مہاراجہ کشن پرشاد کی طرف سے کرسمس کارڈ ملا۔ ۲۲/ دسمبر کو علامہ نے شکریے کا خط لکھا:

> ایک مدت ہوئی سلسلۂ خط کتابت سے محروم ہوں۔ اس عرصے میں بہت سے آلام و مصائب کا شکار رہا۔ بیوی کا انتقال ہو گیا، جس سے اب تک قلب پریشان ہے۔ دوسری بیوی کے ہاں خدا کے فضل و کرم سے لڑکا ہوا، جس سے کسی قدر تلافی ہوئی... بچے کا نام جاوید رکھا گیا ہے۔[5]

پھر نیازالدین خاں کا ایک اور خط ملا۔ ۲۳/ دسمبر کو علامہ نے جواب دیا، ''نواب صاحب کی خدمت

---

[1] یہ نکات اپنی اپنی جگہ پر درج ہیں۔ حوالہ جات ہیں: چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۳۰۴-۳۰۲؛ علامہ اقبال کے مکاتیب بنام سعید الدین جعفری اگست ۱۹۲۴؛ بنام سلیمان ندوی ۷/ اپریل ۱۹۲۶ء اور ۲۴/ اپریل ۱۹۲۶ء؛ عبدالماجد دریابادی (۱۹۷۹) اقبالیاتِ ماجد، ص ۲۱؛ Mumtaz Hasan (1982) pp.16-17۔

[2] ص ۳۰۴-۳۰۳

[3] مکتوب بنام عبدالماجد دریابادی ۲۲/ مارچ ۱۹۲۵ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۸۲

[4] مکتوب بنام نیازالدین خاں ۲۳ دسمبر ۱۹۲۴ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۶۷-۵۶۶

[5] مکتوب بنام شاد ۲۲/ دسمبر ۱۹۲۴ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۶۶-۵۶۵

میں عرض کر دیجیے کہ میموریل لکھنے کے] لیے [حاضر ہوں۔ مگر آپ مہربانی کر کے تمام کاغذاتِ متعلقہ لاہور لے آویں تاکہ کام کی کیفیت و کمیت کا اندازہ کر سکوں۔ اس کے علاوہ ان کو پڑھ کر اور سمجھ کر یہ رائے بھی لگا سکوں کہ آیا اس میں کامیابی کی توقع ہے یا نہیں..."[1] اس کے بعد ایک اور خط ملا۔ بانگِ درا کی فرمایش کی تھی۔[2] علامہ نے بھجوا دی۔[3]

افسانہ نگار راشد الخیری اس برس سرگودھا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس سے واپسی پر لاہور آئے۔ روایت ہے کہ علامہ سے ملاقات کے لیے آئے۔ علامہ دُور سے دیکھتے ہی کھڑے ہو گئے۔ کہا، "ارے مولانا آپ کس طرح گھر سے نکل آئے۔"[4]

23

اس برس سید عبداللطیف کی انگریزی تصنیف اُردو ادب پر انگریزی ادب کا اثر (*The Influence of English Literature on Urdu Literature*) لندن سے شائع ہوئی۔ موضوع سر اسرائیل گولانکز (Sir Israel Gollancz) نے تجویز کیا تھا۔ سر ٹامس آرنلڈ نے مدد کی تھی۔ مصنف کے مطابق انگریزی ادب کے زیرِ اثر اُردو میں پرانے ادبی نصبُ العین کے خلاف بغاوت ہوئی۔ نظم اور نثر میں نئی اصاف اور صنعتیں متعارف ہوئیں۔ نیا مواد آیا۔ آزادی، تحقیق و انکشاف اور ترقی کی روح بیدار ہوئی۔ علامہ کے بارے میں سر ذوالفقار علی کی انگریزی تصنیف اے وائس فرام دی ایسٹ پرانی مشرقی طرز کی مداحی تھی۔ ادبی تنقید کے جدید معیار پر پوری نہ اُترتی تھی۔ حالیؔ یہ معیار قائم کر چکے تھے۔ انہوں نے شاعری میں بھی سادگی اور وضاحت کا بلند معیار قائم کیا تھا۔ اقبالؔ نے اس میں دوبارہ پرانی تراکیب اور استعاروں کی آمیزش کر دی، جو جنہیں مشرق میں عشقیہ اور صوفیانہ شاعری میں صدیوں سے رائج رہے تھے۔ 'شکوہ' مختلف احساسات کا مجموعہ ہے۔ ان میں سے ہر ایک مسلم سامعین کو متاثر

---

[1] مکتوب بنام نیاز الدین خاں ۲۳/ دسمبر ۱۹۲۴ء محولہ بالا

[2] مکتوب شاد بنام اقبال ۱۵/ دسمبر ۱۹۲۴ء؛ قریشی (۱۹۸۶) اقبال بنام شاد، ص ۳۷۹

[3] مکتوب بنام شاد ۴/ جنوری ۱۹۲۵ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۷۶

[4] عصمت جولائی ۱۹۶۴ء، ص ۲۵۲ پر رازق الخیری کی تحریر؛ شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۶۳

کرتا ہے لیکن مجموعی طور پر کسی واضح خیال کی عکاسی نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس مسدسِ حالی میں ایک ٹھوس خیال کا اظہار کیا گیا تھا۔ طرابلس اور بلقان کی جنگوں کے زمانے سے مغرب کے خلاف ردِ عمل بھی ہوا ہے۔ اِس کا سب سے بڑا مظہر بھی ڈاکٹر اقبال ہیں۔ 'جوابِ شکوہ' میں یورپی تہذیب کی مقبولیت کو شبہ کی نظر سے دیکھا۔ 'خضرِ راہ' میں موجودہ جمہوریت اور جمہوری اداروں پر عدم اعتماد کا اظہار کیا۔ ماضی کی طرف واپس جانے کا نصبُ العین پیش کرتے ہیں۔ پیغمبرِ اسلامؐ کی سنت پر عمل کرنے کا درس دیتے ہیں۔ اِس نصبُ العین اور جدید تہذیب کی روح کے درمیان تصادم پر روشنی نہیں ڈالتے۔ غالباً اُن کا مطلب یہی ہے کہ زندگی میں ترقی کے ساتھ ساتھ مذہب کی اہمیت بھی یاد رکھی جائے۔ حالیؔ کے زمانے میں یہ بات کہنے کی ضرورت نہ تھی، اقبال کو کہنے کی ضرورت پیش آ رہی ہے:

> Whatever interpretation may be put on Iqbal's attitude in this respect, we find that there is in the literature of the period taken as a whole a strong and deep undercurrent of the spirit of progress, a spirit which, like rationalism and the spirit of freedom described already, has, in spite of temporary set-backs and limitations, steadily grown stronger with the growing consciousness of the Muslim community as an important and integral element in the national life of India.[1]

فیمنزم کی مخالفت کرنے والی خواتین میں اٹلی کی جینالومبروسو (Gina Lombroso) شامل تھیں۔ مغربی جرائد میں تنقید کا نشانہ بنتی تھیں۔[2] اس برس ان کی کتاب عورت کی روح انگریزی میں ترجمہ ہو کر شائع ہوئی۔ بعض ابواب نے علامہ کی خاص توجہ حاصل کی۔[3] اِس برس شائع ہونے والی کتابیں جو کبھی اقبال کے ذخیرۂ کتب میں شامل ہوئیں یہ ہیں:[4]

Dickinson, Eric. *Laolus and Other Poems.* Jamia Press, Aligarh

---

[1] Latif, *The Influence of English Literature,* pp. iii-vii, xii-xiii,74-75, 104, 133-134

[2] مثال کے طور پر دیکھیے: Ruth Hale 'A Sick Book and a Healthy One'

[3] یہ کتاب اقبال کے ذخیرۂ کتب میں شامل ہے۔ بعض مقامات پر نشان لگائے گئے ہیں۔

[4] Muhammad Siddique, *Descriptive Catalogue*

Lodge, Sir Oliver. *Making of Man: A Study in Evolution.* Hodder and Stoughton, London

Lombroso, Gina. *The Soul of Woman.* Jonathan Cape, London

Schiller, F. C. S. *Tantalus, or the Future of Man.* Kegan Paul (Reprinted 1926), London

Steiner, Rudolf (in German). *Grundlinien einer Erkenntnistheorie der Geothechen Weltan Schauung mit befonderer Ruckficht auf Schiller: Zugleich eine Zugabe zu Geothes, Naturwiffenfchaftlichen Schriften in Krufschnners Deutfcher National-Literature.* Der Komends Taga. G. Verlag, Stuttgart

Tagore, R. *Letters from Abroad.* S. Ganesan, Madras

Tsanoff, A. Radoslav. *The Problem of Immortality—Studies in Personality and Value.* Allen and Unwin, London

Vaihinger, Hans (translated by C. K. Ogden). *The Philosophy of "As If"—A System of the Theoretical, Practical and Religious Fictions of Mankind.* Kegan Paul, London

Wellock, Welfred (with an introduction by Bertrand Russell). *The Spiritual Basis of Democracy.* S. Ganesan, Madras

34

۲۶/ اور ۲۷/ دسمبر کو بیلگام میں انڈین نیشنل کانگرس کا اُنتالیسواں سالانہ اجلاس ہوا۔ شہر سے متصل اَسّی ایکڑ زمین استعمال کی گئی تھی۔ وجیانگر کا نام دیا گیا تھا۔ کسی زمانے میں علاقے پر بادشاہت کرنے والے ہندو خاندان کا نام تھا۔ گاندھی نے صدارت کی۔ چرخے پر زور دیا۔ مسلمانوں کی جداگانہ نیابت کو غیر پسندیدہ قرار دیا۔ صرف عارضی طور پر گوارا کی جا سکتی تھی۔

> Our goal must be removal, at the earliest-possible moment, of communal or sectional representation. A common electorate must impartially elect its representatives on the sole ground of merit. Our services must be likewise impartially manned by the most qualified men and women. But till that time comes and communal jealousies or preferences become a thing of the past, minorities who suspect the motives of majorities must be allowed their way. The majority must set the example of self-sacrifice.[1]

۲۷/ سے ۲۹/ دسمبر تک لکھنؤ کے رفاہِ عام ہال میں نیشنل لبرل فیڈریشن عرف لبرل پارٹی کا ساتواں

Report of the Thirty-Ninth Indian National Congress[1]

سالانہ اجلاس ہوا۔ ڈاکٹر پرنجپائی نے صدارت کی۔ خطبۂ صدارت میں کہا کہ عدم تعاون کی تحریک نے کوئی مقصد حاصل نہیں کیا۔ عوام میں قانون شکنی کے جس رویے کو فروغ دیا ہے صرف وہی باقی رہ جائے گا۔[1] ۳۰ دسمبر کو بیلگام میں ہندو مہاسبھا کا اجلاس کانگریس کے وجیانگر میں منعقد ہوا۔ پنڈت مالوی نے صدارت کی۔

۳۰ دسمبر کو بمبئی میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سولھواں اجلاس ہوا۔ رضا علی نے صدارت کی۔ لیگی رہنماؤں میں محمد علی جناح، مولانا محمد علی [جوہر]، مولانا شوکت علی، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، مولانا ظفر علی خاں اور محمد یعقوب نمایاں تھے۔ غیر مسلم بھی بطور مہمان موجود تھے۔ ان میں گاندھی، موتی لال نہرو، جواہر لال نہرو، سروجنی نائیڈو، اینی بیسنٹ اور پٹیل برادران شامل تھے۔ رضا علی نے خطبۂ صدارت میں بعض نکات پر زور دیا:

۱ تحریک عدم تعاون ناکام ہو چکی ہے۔ یہ بھی ظاہر ہوا ہے کہ ہندوستانی کسی بات پر متفق نہیں ہیں، جیسے کسی نے اسپینیوں کے بارے میں کہا تھا کہ اگر سات اسپینی ایک سیاسی جماعت بنائیں گے تو وہ بہت جلد تین جماعتوں اور ایک آزاد امیدوار میں تقسیم ہو جائے گی!

۲ ضروری ہے کہ تمام سیاسی جماعتیں مل کر کسی قومی نصب العین پر متفق ہو جائیں۔ اُس کے حصول کے لیے اپنے اپنے طور پر کوشش کریں۔

۳ سوراج یعنی ہندوستان کی آزادی ہی وہ قومی مقصد ہے جس پر تمام ہندوستانی متفق ہیں۔ ہندوستان صرف ہندوؤں کا وطن نہیں ہے۔ یہ مسلمانوں کا وطن بھی ہے۔ دونوں ملتوں کے درمیان فسادات پیدا کرنے میں صرف عوام ہی قصوروار نہیں ہیں۔ اصل ذمہ داری اُن تعلیم یافتہ افراد پر عائد ہوتی ہے جو عوام کی غلط رہنمائی کرتے ہیں۔

۴ سوراج کے لیے ضروری ہے کہ اقلیتوں کو تحفظ فراہم کیا جائے۔ میثاقِ لکھنؤ پر نظرِ ثانی کی ضرورت ہے۔ صوبۂ سرحد میں جمہوری حکومت قائم ہونی چاہیئے۔ سندھ اور بلوچستان کو

---

[1] *Report of the Proceedings of the 7th Session of the National Liberal Federation*

صوبوں کا درجہ ملنا چاہئیے۔ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت تسلیم کی جانی چاہئیے۔

۵ کابل میں نعمت اللہ قادیانی کی سنگساری سے جو سوالات اُٹھے ہیں وہ عارضی نہیں بلکہ مستقل حیثیت رکھتے ہیں۔ اس معاملے کا مذہبی پہلو علیحدہ ہے مگر کسی حکومت کے پاس جواز نہیں کہ وہ مذہبی عقائد کی بنیاد پر کسی کو سزائے موت دے۔ اگر یہ تاثر عام ہو گیا کہ مسلم حکومتیں شہریوں کو مکمل مذہبی آزادی فراہم کرنے پر تیار نہیں ہیں تو دنیا میں ایک عظیم اخلاقی قوت کے طور پر اسلام کی حیثیت کمزور ہو جائے گی۔

Prudence and experience point to the absolute necessity of the various political parties drawing up, by common agreement, a national programme which can be worked by all. It need not be a very elaborate scheme. The fewer the points on which concerted action is to be taken the greater will be the facility in working it out. But two conditions ought not to be transgressed. In the first place, the programme should not ignore stern realities. Second, the methods employed should be practical. This would leave every party free to act as it likes with regard to the measures not included in the national programme ...

... If the flames of internal dissentions are not to envelop and consume both communities, they must find means to live in peace ... And in this connection I cannot help saying a word about the mentality of a certain type of the educated man ... He is the leader of the hapless masses in the sense that he knows when it suits his purpose, how to put them on the wrong path ... The simple point is that the foundation of democracy is and should be mutual security.

…The execution of Moulvi Niamatullah Khan at Kabul raises a question of more than temporary interest to our fellow-religionists. With the political activities, if any, of this gentleman we are not concerned. Had he been tried for and found guilty of a political offence against the State, it would have been a matter exclusively between him and the Afghan Government. But the judgement, the full text of which was published in the press, shows that on some matters of belief, his opinions were held to be inconsistent with the generally prevalent beliefs of the orthodox Muslim faith. And it is this aspect of the question which cannot be viewed with unconcern by Indian Musalmans. Without going into the merits of a delicate ecclesiastical controvery, for

which I do not feel myself competent, I must say that no Muslim state is justified in countenancing a movement for taking the lives of its subjects, natural born or domiciles, in order to save their souls. If once the idea gets abroad that Muslim Governments are not prepared to allow full religious liberty to their subjects, it will weaken the world position of Islam as a great moral force.

قراردادیں منظور کی گئیں۔ صوبۂ سرحد میں آئینی اصلاحات کے مطالبے اور تمام مسلم جماعتوں کی کانفرنس کے انعقاد کے حق میں تھیں۔ جداگانہ نیابت کے مسئلے پر مسلمانوں کے مطالبات کے تعین کے لیے کمیٹی بنانے کا فیصلہ ہوا۔ جناح نے کہا کہ وہ ذاتی طور پر جداگانہ نیابت کے مخالف ہیں لیکن مسلمانوں کی اکثریت اس کے حق میں ہے۔ حقائق نظرانداز نہیں کیے جاسکتے۔ اتحاد موجود نہیں ہے اور صرف ملتوں کے درمیان کسی مناسب سمجھوتے کے ذریعے ہی اسے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

کوہاٹ کے فسادات کی مذمت پر قرارداد مولانا ظفر علی خاں کو پیش کرنی تھی۔ جوہرؔ کا اصرار تھا کہ اس میں یہ نکتہ شامل کیا جائے کہ مسلمانوں کا ردِ عمل بے وجہ نہ تھا۔ تشدد کی ابتدا بھی ہندوؤں ہی کی طرف سے ہوئی۔ قرارداد میں یہ نکتے شامل کر دیئے گئے۔ مولوی رفیع الدین احمد نے انہیں حذف کرنے کے لیے ترمیم پیش کی۔ جناح نے تائید کی۔ مولانا شوکت علی اور مولانا جوہرؔ نے مخالفت کی۔ اکثریت نے اُن کا ساتھ دیا۔[1]

گاندھی کوہاٹ کے فسادات میں ہندوؤں کی کوئی ذمہ داری نہ سمجھتے تھے۔ اجلاس میں مہمان تھے، خاموش رہے۔ اُن کے اور علی برادران کے درمیان اختلافات کا آغاز تھا۔[2]

24

جرمنی کے تین یہودی ماہرینِ نفسیات نے دس بارہ برس قبل گسٹالٹ نظریہ (Gestalt Theory) قائم کیا تھا۔ تحقیقات مکمل کر کے پیش کرنے کا موقع جنگ کے بعد ملا۔ اب مقبول ہو رہا تھا۔ اُن میں سے وولف گینگ کوہلر (Wolfgang Kohler) کبھی کبھی اس بات پر جھلاتا تھا کہ اُس کا ایک جملہ انگریزی میں غلط ترجمہ ہو کر مشہور ہو رہا ہے۔ کوہلر نے کہا تھا کہ کُل اپنے اجزا کے مجموعے سے مختلف

[1] Mitra: *The Indian Quarterly Register July-Dec. 1924,* pp.472-482

[2] Mitra: *Indian Quarterly Register January-June 1925,* pp. 97-206

ہے۔ انگریزی میں ترجمہ ہونا چاہئیے تھا: "The whole is different from the sum of its parts." اس کی بجائے ترجمہ ہوا: "The whole is greater than the sum of its parts"۔

گسٹالٹ نظریے سے علامہ کو اُمید تھی کہ جدید نفسیات کو میکانکی رجحانات سے آزاد کروائے گا۔ چند برس بعد انگریزی میں لکھا، "اِس نئی نفسیات کا کہنا یہ ہے کہ اگر ہم اپنے عقلی کردار کا مطالعہ کریں تو اس میں حواس کے تواتر کے علاوہ ایک اور چیز یعنی بصیرت بھی کام کرتی نظر آئے گی۔ بصیرت کیا ہے؟ خودی کا یہ اعتراف کہ اشیا کے درمیان زمانی، مکانی اور تعلیلی نسبتیں کام کر رہی ہیں۔"[1]

"[علامہ اقبال نے] بچوں کے لیے تعلیمی نصاب کی ترتیب و تشکیل کی جانب عملی قدم اٹھایا،" فقیر سید وحید الدین کا بیان ہے۔ "میرے محترم بزرگ حکیم احمد شجاع سے کہا کہ وہ اُن کی نگرانی میں اِس کام کا آغاز کریں۔ اُردو کورس کے نام سے چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعت کے لئے تین کتابیں ڈاکٹر صاحب کے خیال و رجحان کے مطابق مرتب ہوئیں۔ ان کتابوں میں نظم و نثر کے جو منتخب شہپارے شامل کئے گئے وہ بچوں کی نفسیات، ذہنی ہم آہنگی اور احساسِ ذمہ داری کے آئینہ دار تھے۔"[2]

کتابوں کے سلسلے کا نام اُردو کورس تھا۔ چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعت کی کتابیں ۱۹۲۴ء میں شائع کر کے پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کی منظوری کے لیے پیش کی گئیں۔ اُس کا اجلاس جنوری ۱۹۲۵ء میں تھا۔[3]

دیباچہ

اُردو کی مروجہ درسی کتابوں میں یہ کمی عام طور پر محسوس کی جاتی ہے۔ کہ وہ نفسِ مضمون-اندازِ تحریر اور طریقۂ انتخاب کے اعتبار سے زمانۂ حال کے مطالبات کو پورا نہیں کرتیں۔ یہ کتابیں ایک ایسے زمانے میں مرتب ہوئیں۔ جب انتخاب کے مواقع کم تھے۔ اور زبانِ اُردو نے وہ رنگ اختیار نہ کیا تھا۔

---

[1] یہ خیالات تشکیلِ جدید کے چوتھے خطبے میں ظاہر کیے: Iqbal (1934), *Reconstruction*

[2] فقیر سید وحید الدین (۱۹۸۸) روزگار فقیر، جلد اول، ص ۱۰۵

[3] فقیر سید وحید الدین (۱۹۸۸) روزگار فقیر، جلد اول، ص ۱۰۵

جو مغربی ادب کے تاثر کا لازمی نتیجہ ہے۔ اُن کتابوں کے نقائص بیان کرنے کی بجائے یہ بہتر معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس سلسلہ کی امتیازی خصوصیات ہی بیان کر دی جائیں۔

سلسلہٗ ادبیہ کی ترتیب میں اس امر کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے۔ کہ پرانے اساتذہٗ فن کے نتائجِ فکر کے ساتھ ساتھ زمانہٗ حال کے اُن انشا پردازوں اور شاعروں کے مضامینِ نظم و نثر بھی طالبِ علم کی نظر سے گذریں جنھوں نے اُردو کو ایک ایسی زبان بنانے کے لیے انتھک اور کامیاب کوشش کی ہیں جو موجودہ ضروریات کے مطابق اور ادائے مطالب پر قادر ہو۔ مضامین کے انتخاب کے تنوع کو مدِّ نظر رکھتے ہوئے اس امر کی کوشش کی گئی ہے کہ ہر مضمون ادبی خوبیاں رکھنے کے باوجود نئی معلومات کا حامل ہو۔

درسی کتابوں پر بالعموم متانت کا رنگ اس قدر غالب ہوتا ہے کہ طالبِ عالم ان میں زیادہ دلچسپی نہیں لے سکتے۔ اس نقص کو دور کرنے کے لیے اس سلسلہ میں ظریفانہ مضامین نظم و نثر کی چاشنی بھی شامل کر دی گئی ہے۔ کیونکہ نوعمر بچوں کے دل و دماغ تک دلچسپ پیرایہٗ اظہار کی وساطت ہی سے رسائی ممکن ہے۔ مضامین زیادہ تر ایسے ہی منتخب کیے گئے ہیں جن میں زندگی کا روشن پہلو جھلکتا ہو۔ تاکہ طالب علم اس کے مطالعہ کے بعد کشاکشِ حیات میں زیادہ استقلال۔ زیادہ خودداری اور زیادہ اعتماد سے حصہ لے سکیں۔ حقیقت میں ادبیات کی تعلیم کا یہی مقصد ہونا چاہیے۔ کہ ادبی ذوق کی تربیت کے ساتھ ساتھ طلبا کی وسیع النظری اور اُن کے دل کے دل و دماغ کی جامعیت نشو و نما پائے۔ ہمیں اُمید ہے کہ اس سلسلے کی کتابوں کے مطالعہ سے طلبا زبانِ اُردو کے ادبی محاسن سے بھی واقف ہو جائیں گے۔ اور ان کو اس زبان کی روز افزوں ترقی، وسعت اور قدرتِ اظہار کا علم بھی ہو جائے گا اس مجموعہ میں ایسے مضامین بھی ہیں۔ جن مین مناظر فطرت، ذہنی کیفیات اور طبعی جذبات کی تصویریں الفاظ میں کھینچی گئی ہیں اور ایسے بھی جن میں علم طبیعات کے انکشافات، صنعت و حرفت کی اختراعات اور عام علمی تحقیقات کو زبان اُردو میں بیان کیا گیا ہے۔ اخلاقی مضامین کے انتخاب میں اس امر کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ کہ ان کا اسلوبِ بیان ایسا ہو جو طالب علم کو کمزور اور بُزدل بنانے کی بجائے نیک اور بہادر بنائے۔ اور اس امر کا لحاظ تو بالخصوص رکھا گیا ہے۔ کہ منتخبہ نظم و نثر پر وطنیت کا رنگ

غالب ہو۔ تاکہ طلبا کے دلوں میں اخلاقِ حسنہ اور علم ادب کی تحصیل کے دوران میں اپنے وطن کی محبت کا پاک جذبہ موجزن ہو۔ اور وہ ہندوستان کو جس کی عظمت کے نشان اس مجموعہ میں جگہ جگہ پر موجود ہیں۔ زیادہ پُر عظمت بنانے میں حصہ لیں۔

سلسلہ ٔادبیہ کو زبانِ اُردو کے طلباء کی ادبی رہنمائی کے لیے ہر طرح مکمل بنانے کی کوشش کی گئی ہے۔ خدا کرے یہ طلبا کے مذاقِ ادب کو لطیف اور معیارِ لیاقت کو بلند کرنے میں کامیاب ثابت ہو۔ اس ضمن میں شیخ عبد الحمید صاحب ایم-اے، آئی-ای-ایس پروفیسر طریقۂ تعلیم ٹریننگ کالج لاہور کی عنایت خاص طور پر قابل ذکر ہے۔ جنھوں نے اس سلسلے کی موجودہ تین کتابوں کے مسودات کو بغور ملاحظہ کیا اور جن کے قیمتی مشورے اس سلسلے کی ترتیب و تدوین میں بہت مفید ثابت ہوئے۔

مؤلفین[1]

چھٹی جماعت کے لیے

جگنو

کاشانۂ چمن انجمن مہتاب ظلمت

گہن حسنِ قدیم پوشیدہ خلوت

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں — یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

آیا ہے آسماں سے اُڑ کر کوئی ستارہ! — یا جان پڑ گئی ہے مہتاب کی کرن میں

چھوٹے سے چاند میں ہے ظلمت بھی روشنی بھی — نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں

حُسنِ قدیم کی یہ پوشیدہ اِک جھلک تھی — لے آئی جس کو قدرت خلوت سے انجمن میں

سوالات

۱ نظمِ بالا کا مطلب آسان اُردو میں لکھو؟

---

[1] یہ دیباچہ اس سلسلے کی تمام کتابوں میں مشترک ہے۔

۲ پہلے شعر کی نثر بناؤ؟
۳ تیسرے شعر کی تشریح کرو۔ اور بتاؤ کہ "نکلا کبھی گہن سے آیا کبھی گہن میں" کا کیا مطلب ہے اور گہن سے یہاں کیا مراد ہے؟
۴ نظمِ بالا میں جو اسمِ واحد ہیں۔ اُن کی جمع اور جو جمع ہیں۔ اُن کے واحد لکھو؟[1]

آٹھویں جماعت کے لیے

ہوشیار سراغرساں

ڈرامہ

اشخاص

یوسف جی اسمٰعیل بھائی: بمبئی کا ایک امیر جوہری۔

سلیم: یوسف جی کا ایک معتبر ملازم۔

شاہد حسین: خفیہ پولیس کا افسر۔

ہدایات: یوسف جی اپنے آراستہ کمرے میں بحالت پریشان بیٹھے ہیں۔ اس کمرے کے بائیں گوشے میں ایک دروازہ ہے۔ جو اُن کی خوابگاہ میں کھلتا ہے۔ دائیں جانب اس کمرے کا بیرونی دروازہ ہے۔

یوسف جی: (وفورِ پریشانی میں دونوں ہاتھوں سے سر تھام کر) کس قدر تعجب ہے۔ کس قدر حیرت ہے۔ کل میں نے اپنے ہاتھوں سے اس ہیرے کو تجوری میں بند کیا۔ تجوری ویسی کی ویسی بند ہے۔ کنجی میرے پاس ہے۔ اور ہیرا غائب (اُٹھ کر اور کمرے میں ٹہل کر) آخر یہ پولیس کس مرض کی دوا ہے۔ میرے ہی گھر کا کونہ کونہ تلاش کرنے اور مجھ ہی سے سوالات کرنے کے سوا اور کچھ نہیں کرتی۔ اگر میں ہی بتا سکتا۔ تو ان کو یہ تکلیف کیوں دیتا (پھر کچھ سوچ کر) آہ! اگر یہ ہیرا گم ہو گیا۔ تو...

(سلیم چائے کی کشتی ہاتھوں میں لیے داخل ہوتا ہے)

---

[1] اُردو کورس چھٹی جماعت کے لیے

سلیم: چائے حاضر ہے۔

یوسف جی: چائے! مگر سلیم اس کمرے میں میرے یا تمہارے سوا اور کوئی نہیں آتا۔ پھر یا تو تم چور ہو یا میں۔

سلیم: (رونی صورت بنا کر) تو حضور کو مجھ پر شک ہے حضور کے نمک ہی کی مار پڑے۔ جو میں نے آنکھ اُٹھا کر کبھی آپ کے مال کو دیکھا ہو۔ لیجیے میں کہیں گیا تو نہیں۔ میری تلاشی لے لیجیے۔

(ایک ایک کرکے ٹوپی، واسکٹ اور پھر جوتا اُتار کر دکھاتا ہے)

یوسف جی: (جوتے کو دیکھ کر) بس بھائی بس تلاشی ہو چکی۔ (سلیم پھر بسورنا شروع کرتا ہے) اے بھائی میں نے کب کہا ہے کہ تم چور ہو۔

سلیم: (روتے ہوئے) ابھی ابھی آپ نے ہی تو کہا تھا کہ چور یا تم ہو یا میں۔

یوسف جی: (چائے پیتے پیتے) تو بھئی میں نے کیا خطا کی۔ تم کو چور کہا تو اپنے آپ کو کب بخشا اچھا جانے دو۔ بھائی معاف کرو۔ تم چور نہیں۔ چور میں ہوں۔ مگر یہ تو...

(ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی ہے)

یہ کون؟ سلیم ذرا دیکھنا تو۔

(سلیم ٹیلی فون پر باتیں کرتا ہے)

سلیم: ہاں ہاں۔ تشریف رکھتے ہیں۔ ذرا ٹھہریئے۔ (یوسف جی سے مخاطب ہو کر) کوئی صاحب آپ سے باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ خفیہ پولیس کے دفتر سے... اُنہوں نے شاید یہی کہا ہے۔

یوسف جی: (جلدی سے چائے کا پیالہ رکھ کر) اب خوابِ غفلت سے جاگے۔ خیر! (ٹیلی فون پر) میں ہوں... یوسف جی... جی، میں ہی یوسف جی اسمٰعیل بھائی ہوں۔ فرمایئے... جی ہاں۔ چوری میرے ہی ہاں ہوئی ہے کون آئے گا۔ آپ؟... آپ کون صاحب ہیں... شاہد حسین... آپ کی تعریف؟... انسپکٹر خفیہ پولیس۔ آیئے صاحب ضرور آیئے۔ اور جلد آیئے۔ میں آپ ہی کے انتظار میں ہوں... دس بجے سے پہلے نہیں آسکتے؟ (قریب کی کرسی پر بیٹھ کر اور ذرا اطمینان سے گھڑی دیکھ کر) ابھی نو بجے ہیں۔ افوہ ایک گھنٹہ باقی ہے! خیر میں اتنے میں کپڑے پہن لیتا ہوں۔

سلیم تم یہاں ٹھہرو۔ میں ذرا کپڑے بدل لوں۔

(خواب گاہ میں جاتے ہیں۔ سلیم ذرا سی دیر انتظار کرتا ہے۔ اور پھر احتیاط سے چاروں طرف دیکھ کر ٹیلی فون پر باتیں کرتا ہے)

سلیم: دیکھو۔ میں ہوں ٹالی۔ جلدی کرو۔ مجھ پر شبہ کیا جارہا ہے۔ دس بجے خفیہ پولیس کا افسر آرہا ہے... اُس کا نام؟ شاہد حسین۔ مگر پولیس نے مکان گھیر رکھا ہے۔ میں باہر نہیں جاسکتا۔ دس بجے... ٹھیک دس بجے۔ خدا کے واسطے جلدی کرو۔ میں کیا کروں... بہت بہتر۔

(واپس آکر بڑے اطمینان سے دیواروں پر لگی ہوئی تصویروں کو دیکھنے میں مصروف ہو جاتا ہے۔ یوسف جی داخل ہوتے ہیں)

یوسف جی: ہاں بھئی سلیم! تو تم کو پورا اطمینان ہے کہ میرے اور تمھارے سوا کل سے اس کمرے میں کوئی نہیں آیا۔

سلیم: (پھر رونی صورت بناکر) خدا کا غضب ٹوٹے جو میں نے کل سے آپ کے کمرے میں قدم بھی رکھا ہو۔

یوسف جی: (گھبرا کر) نہیں۔ میں نے تو یونہی ایک سوال کیا تھا۔ تم پھر رونے لگ گئے۔ جاؤ آرام کرو۔ ہاں چائے کے برتن اُٹھالے جاؤ۔

(سلیم برتن اٹھاکر روتا ہوا چل دیتا ہے)

سلیم بالکل بے گناہ ہے۔ کس قدر معصوم ہے میں نے اُسے ناحق رُلایا۔ کتنے برس سے میرے پاس کام کر رہا ہے۔ نہیں یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔

(سلیم داخل ہوتا ہے)

یوسف جی: کیوں کیا ہے؟

سلیم: حضور! انسپکٹر شاہد حسین آپ سے ملنے کے لیے آئے ہیں۔

یوسف جی: (گھڑی دیکھ کر) انسپکٹر شاہد حسین! ابھی تو سوا نو ہی بجے ہیں۔ خیر بلالو۔

(انسپکٹر شاہد حسین داخل ہوتے ہیں۔)

شاہد حسین: آداب عرض ہے۔ میں معافی چاہتا ہوں۔ ذرا وقت سے پہلے ہی آ گیا۔ مجھے آپ کی پریشانی کا خیال تھا۔

یوسف جی: تسلیم۔ تسلیم۔ آپ نے بہت مہربانی کی۔ میں آپ ہی کا انتظار کر رہا تھا۔

شاہد حسین: اگر تکلیف نہ ہو تو اس چوری کا مفصل حال مجھے بتا دیجیے تاکہ میں اپنی تحقیقات شروع کر سکوں۔

یوسف جی: جی مفصل حال کیا ہے۔ جو عرض کروں۔ میں جواہرات کی تجارت کرتا ہوں۔ کوئی آٹھ دن گذرے میں نے ایک ہیرا دس ہزار روپے پر خریدا۔ اور اپنی دانست میں بہت سستا خریدا۔ کل رات تک وہ میری تجوری میں محفوظ تھا۔ اور آج غائب۔ بس

شاہد حسین: (سوچتے ہوئے) ہوں ہوں۔ اس کمرے میں کل رات سے اس وقت تک کون آیا؟

یوسف جی: صرف میں یا میرا ملازم۔ مگر وہ بہت معتبر ہے۔ مدت سے میرے پاس ہے۔ مجھے اس پر کوئی شبہ نہیں۔

شاہد حسین: خیر۔ مگر یہ تو بتائیے کہ یہ ملازم کل سے کہیں باہر تو نہیں گیا۔

یوسف جی: بالکل نہیں۔

شاہد حسین: (سوچتے ہوئے) کیا میں اس تجوری کو دیکھ سکتا ہوں۔

یوسف جی: بڑی خوشی سے۔ ادھر آیئے۔ وہ میرے سونے کے کمرے میں رکھی ہے۔

(دونوں اُٹھ کر جانا چاہتے ہیں کہ سلیم داخل ہوتا ہے)

سلیم: کوئی صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں اور وہ بھی اپنا نام انسپکٹر شاہد حسین بتاتے ہیں۔

یوسف جی: انسپکٹر شاہد حسین!

شاہد حسین: (ذرا بیتاب ہو کر سوچتے ہوئے) ہوں ہوں۔ انسپکٹر شاہد حسین۔ ہاں سیٹھ صاحب انھیں بلایئے۔ اچھا ہوا کہ میں وقت سے کچھ پہلے ہی آ گیا۔ (سلیم سے) جاؤ اُنھیں بلا لاؤ۔ (یوسف جی سے) مگر سنیے۔ میرا نام نہ بتایئے گا۔ فقط یہی کہہ دیجیے کہ میں آپ کا ایک دوست ہوں۔

(سلیم اور انسپکٹر شاہد حسین نمبر ۲ داخل ہوتے ہیں)

شاہد حسین نمبر ۲: تسلیمات۔ (سلیم کو غور سے دیکھتے ہوئے یوسف جی سے مخاطب ہو کر) سیٹھ جی اسمٰعیل بھائی آپ ہی کا نام ہے۔ میں خفیہ پولیس... (شاہد حسین نمبر ا کی طرف مشتبہ نظروں سے دیکھ کر) اہم اہم۔

یوسف جی: کوئی مضائقہ نہیں۔ یہ میرے دوست ہیں۔ آپ فرمائیے۔

شاہد حسین نمبر ۲: خیر۔ کیا میں آپ کے ملازم سے دو تین سوالات پوچھ سکتا ہوں؟

یوسف جی: بڑی خوشی سے (پکار کر) سلیم! سلیم! میاں اِدھر آؤ۔

سلیم: (داخل ہو کر) جی سرکار!

شاہد حسین نمبر ۲: (سلیم کو بنظرِ غائر دیکھ کر) تم یہاں کب سے ملازم ہو؟

سلیم: ایک مدت ہو گئی ہے

شاہد حسین نمبر ۲: کتنے روز؟ کتنے مہینے؟ کتنے برس؟

سلیم: یہ تو میں نہیں جانتا صاحب۔ مگر ہو گئے ہوں گے یہی کوئی دس بارہ برس۔

شاہد حسین نمبر ۲: مگر چھ برس ہوئے۔ تم الٰہ آباد میں تھے۔

سلیم: (رو کر) میں الٰہ آباد میں؟ صاحب میں نے تو الٰہ آباد کی صورت بھی نہیں دیکھی۔

شاہد حسین نمبر ۲: اب رونے دھونے سے کام نہیں چلے گا۔ دیکھیں تمھارا جوتا۔ یہ تم نے کہاں سے خریدا ہے؟

سلیم: یہیں سے (دائیں پاؤں کا جوتا اُن کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ اور چپکے سے بائیں پاؤں کا جوتا دائیں پاؤں میں پہن لیتا ہے)

شاہد حسین نمبر ۲: ٹھیک (جوتا واپس دے کر) لاؤ تو دوسرا پاؤں (سلیم جوتے کو لے کر اور دائیں پاؤں میں ڈال کر پھر اُسی کو واپس دے دیتا ہے)

سلیم: لیجیے۔

شاہد حسین نمبر ۲: خوب دونوں دائیں پاؤں۔ (اسے اپنے اپنے ہاتھ پر رکھ کر) ذرا دیکھیں دوسرا پاؤں۔ وہ جو اَب تمہارے بائیں پاؤں میں ہے۔

سلیم: (بحالت مجبوری دوسرا جوتا دے کر) لیجیے۔

شاہد حسین نمبر ۲: (جوتے کی ایڑی کو ٹھوک بجا کر باہر کی طرف کھینچتا ہے۔ اس میں سے ہیرا نکال کر خوشی اور کامیابی کے اظہار سے) لیجیے سیٹھ صاحب یہ ہے آپ کا ہیرا۔ اب میں آپ کے اس معتبر ملازم کو ذرا بڑے گھر کی ہوا کھلانے کے لیے تکلیف دینے کی اجازت چاہتا ہوں۔

شاہد حسین نمبر ۱: (ایک پستول کی نالی شاہد حسین نمبر ۲ کی طرف کر کے) ایسی جلدی کیا ہے؟

شاہد حسین نمبر ۲: آپ کا اِس حرکت سے مطلب؟

شاہد حسین نمبر ۱: صرف یہی کہ میں آپ کی چال سمجھ گیا۔ (یوسف جی سے) سیٹھ صاحب! یہ شخص بھی آپ کے ملازم کا رازدار ہے۔ اور چور ہے۔ جو ہیرا اِس وقت آپ کے ہاتھ میں ہے۔ صرف موم کا بنا ہوا نقلی ہیرا ہے۔ اصلی ہیرا اِس وقت اِس کی جیب میں ہے۔ (شاہد حسین نمبر ۲ سے مخاطب ہو کر) ہاں ذرا اپنے ہاتھ تو اُٹھائیے۔ (وہ ہاتھ اُٹھاتا ہے) سیٹھ صاحب! اب آپ اِس کی جیب سے اپنا ہیرا نکال لیجیے۔

(باہر کے دروازے پر کوئی شخص آواز دیتا ہے)

یوسف جی: یہ کون؟

شاہد حسین نمبر ۱: ٹھہریئے۔ یہ بھی شاید انہی کا کوئی ساتھی ہے۔ ان دونوں کو آپ اپنی خواب گاہ میں بند کر دیجیے۔ (سلیم اور شاہد حسین نمبر ۲ سے مخاطب ہو کر) چلئے تھوڑی دیر کے لیے اس کمرے میں آرام فرمائیے۔

(خواب گاہ میں داخل کر کے دروازہ بند کر دیتا ہے)

(یوسف جی سے) اب تھوڑی دیر کے لیے سیٹھ صاحب مجھے یوسف جی اسمٰعیل بھائی بننے کی اجازت دیجیے۔ آپ میرے وکیل ہیں اور کسی قانونی مشورہ کے لیے اِس وقت میرے ہاں تشریف لائے ہیں۔

(بیرونی دروازہ کھولتا ہے)

آیئے آیئے۔ جناب کا اسم شریف۔

ملاقاتی: میرا نام انسپکٹر شاہد حسین ہے۔

(یوسف جی نام سُن کر چونک پڑتے ہیں)

شاہد حسین نمبر ا: آپ وکیل صاحب ذرا مسودہ تیار کر لیجیے۔

(شاہد حسین نمبر ۲ سے مخاطب ہو کر)

آیئے اس کمرے میں تشریف لایئے۔ اسی میں وہ تجوری رکھی ہے۔

(کمرے میں داخل ہوتے ہیں۔ تھوڑی سی دیر میں کسی کے چیخنے کی آواز سنائی دیتی ہے۔ انسپکٹر شاہد حسین نمبر ا واپس آتا ہے)

سب کے سب گرفتار ہو گئے۔ آج کا دن بھی کتنا اچھا ہے۔ چوروں کا ایسا خطرناک جتھا اور ایک ہی موقع پر قابو میں آگیا۔ صرف میری خوش قسمتی ہے۔ آیندہ سے سیٹھ صاحب ذرا اپنے ہیروں کو سنبھال کر رکھا کیجیے۔

(شاہد حسین نمبر ۲ اور سلیم چپ چاپ خوابِ گاہ کا دروازہ کھول کر اور پستول ہاتھ میں لیے داخل ہوتے ہیں)

چوروں کا کچھ اعتبار نہیں۔ عین اِس وقت جب آپ اپنے آپ کو بالکل محفوظ خیال کرتے ہوں۔ ممکن ہے کہ وہ آپ کی تجوری کی تاک میں ہوں مثلاً اس وقت آپ کو کیا معلوم ہے۔ کہ آپ اس شہر کے تین ہوشیار اور چالاک چوروں کے نرغے میں پھنسے ہوئے ہیں۔

(یوسف جی گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھتے ہیں۔ اور اپنے آپ کو گھرا ہوا پاتے ہیں)

یوسف جی: (بہت پریشانی سے) آپ کا ان باتوں سے مطلب؟

شاہد حسین نمبر ا: یہی کہ ذرا ہم کو اجازت دیجیے۔ کہ آپ کو اس کرسی کے ساتھ مضبوط باندھ دیں۔ تاکہ کم از کم تھوڑی دیر کے لیے آرام تو کر سکیں (ایک رسی سے یوسف جی کو کرسی کے ساتھ باندھ دیتا ہے) لیجیے سیٹھ صاحب خدا حافظ اب جب آپ پھر کسی عجیب و غریب ہیرے کو بہت ہی سستے داموں پر خرید لیں گے تو ہم آپ کی ملاقات کا شرف حاصل کریں گے۔ آداب عرض۔

(پستول جیب میں ڈال کر دروازے تک جاتے ہیں۔ اتنے میں دروازہ کھلتا ہے اور ایک شخص پستول کی نالی سامنے کیے داخل ہوتا ہے)

کون تم کون؟

آنے والا: (بڑے اطمینان سے) خفیہ پولیس کا انسپکٹر شاہد حسین۔

شاہد حسین نمبر ا: (بہت گھبرا کر) بغیر اطلاع اس طرح اندر آنے سے تمہارا مطلب؟

انسپکٹر شاہد حسین: یہی کہ میں ایک ہوشیار سراغ رساں ہوں۔ اور وہ شخص جس کو تم شاہد حسین سمجھ کر کمرے میں بند کر آئے ہو۔ صرف میر اسارجنٹ تھا۔ اب میں ذرا تم سے بے تکلف ہونے کی اجازت چاہتا ہوں۔ ذرا ہاتھ بڑھا دیجیے۔ دیکھیے اب منہ بنانے سے کیا فائدہ۔ شاباش۔ ایسے! کیا کہنا!!

(تینوں کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ڈال دیتا ہے)

یوسف جی: (بہت حیرت اور مسرت سے) تو اصلی انسپکٹر شاہد حسین آپ ہیں۔ ہاہاہا

حکیم احمد شجاع بی۔اے علیگ

سوالات

۱ سلیم نے جب ٹیلی فون پر چوروں کو شاہد حسین انسپکٹر پولیس کے آنے کی اطلاع کی۔ تو چوروں نے اس سے کیا فائدہ اُٹھایا؟

۲ جس شخص کو چوروں نے انسپکٹر شاہد حسین سمجھ کر کمرے میں بند کر دیا۔ کون تھا؟

۳ اصلی انسپکٹر شاہد حسین چوروں کو دھوکا دینے کے لیے کیا چال چلا؟

۴ مندرجۂ ذیل میں سے مذکر کون کون سے ہیں اور موئنث کون کون سے؟

تجوری۔ مرض۔ جوتا۔ خطا۔ اطمینان

۵ ”پولیس کس مرض کی دوا ہے“ کا مطلب بیان کرو۔ نیز بتاؤ کہ بڑے گھر کی ہوا کھلانے کے کیا معنی؟[1]

---

[1] اُردو کورس آٹھویں جماعت کے لیے؛ ڈرامے کا مکمل متن پیش کیا گیا ہے۔ اس کے مکالموں میں تین نقطے (...) حذف کی علامت نہیں بلکہ اصل متن کے مطابق ہیں۔

باب ۵

پُراسرار باغ

جنوری ۱۹۲۵ء سے جُون ۱۹۲۷ء تک

سلسلۂ ادبیّہ

اُردُو کورس

مُؤلّفۂ

ڈاکٹر سر محمد اقبال ایم-اے۔پی-اے-ڈی۔بیرسٹر ایٹ لا

(و)

حکیم احمد شجاع بی-اے(علیگ)

اسسٹنٹ سکرٹری پنجاب لیجسلیٹو کونسل

۱۹۲۴ء

گلاب چند کپور اینڈ سنز

بک سیلرز و پبلشرز انارکلی لاہور

(مرکنٹایل پریس لاہور میں باہتمام بابو نظام الدین پرنٹر چھپا)[1]

---

[1] چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعتوں کی کتابوں کے سرورق پر یہ عبارت مشترک ہے۔ ہر کتاب پر جماعت کا اضافہ ہے مثلاً "چھٹی جماعت کے لیے" یا "6th Class" جسے یہاں حذف کر دیا گیا ہے۔ میرے پاس ۱۹۲۹ء کے اڈیشن کا عکس موجود ہے۔ اُس میں جہاں "۱۹۲۹ء" ہے اُس کی بجائے میں نے "۱۹۲۴ء" لکھ دیا ہے۔

چھٹی کی کتاب میں چھیالیس اسباق شامل تھے۔ ان میں سے بائیس منظومات تھیں: دعا؛ سرزمینِ ہند؛ ہندوستانی بچوں کا گیت؛ صفائی؛ شرافت؛ دہنا ہاتھ؛ پہلے کام بعد میں آرام؛ مکڑی اور مکھیاں؛ ابر؛ اپنا گھر؛ سپوت؛ زلزلہ؛ رونقِ بارش؛ مرغِ اسیر اور صیاد؛ جگنو؛ کام؛ صبح کی چہل پہل؛ عزت؛ پردیس؛ گنگا کا کنارہ؛ میرا جھونپڑا؛ محنت۔

چوبیس اسباق نثر کے تھے: دنیا کی آبادی (۲ سبق)؛ یدھشٹر کا پہلا سبق؛ راجہ ہریشچندر؛ زمین کی سرگذشت (۳ سبق)؛ جیمس فرگسن؛ راجہ مایاداس؛ نیک دل شہزادہ؛ حُب الوطنی؛ مہماں نوازی؛ کنگ لئیر؛ دنیا کی سب سے بڑی چیز؛ مینا؛ سکندراعظم (۳ سبق)؛ تمباکو اور چائے؛ دانت اور بال؛ سکندراعظم؛ بابر کا بچپن (۳ سبق)؛ مکتوبات۔[1]

ساتویں اور آٹھویں جماعت کی کتابوں میں اسباق کے مصنفین کے نام بھی شامل کیے گئے۔ ساتویں کی کتاب میں چھتیس اسباق تھے۔ ان میں سے سترہ منظومات تھیں: وقتِ سحر (منشی تلوک چند محروم)؛ خدا کی نعمتیں (جوش ملیح آبادی)؛ کہسار ہمالہ (سُہا)؛ گنگا (محمد عثمان مقبول)؛ برسات (سید احمد عاشق)؛ اِس ہاتھ دے اُس ہاتھ لے (منشی تلوک چند محروم)؛ صبحِ چمن (سید علمدار حسین)؛ نور جہاں کا مزار (منشی تلوک چند محروم)؛ گمنام نامور (حبیب کنتوری)؛ زندگی (عجز)؛ ندی کا راگ (مولانا ظفر علی خاں)؛ بہار (بینظیر)؛ خدمتِ خدا و خلق (اعجاز حسین بی۔اے)؛ دال (مولانا محمد حسین آزاد)؛ ایثار (میر انیس)؛ موج اور حباب (اکبر الہ آبادی)؛ میرا وطن (ڈاکٹر سر محمد اقبال)؛ آغاز اور انجام (سید علی سجاد دہلوی)۔

اس جماعت میں نثر کے اُنیس اسباق تھے۔ 'رام شاستری' اور 'سر سالار جنگ' پر مصنف کا نام درج نہ تھا۔ بقیہ تھے: رام چندر جی (۲ سبق - مولانا محمد حسین آزاد)؛ شیر شاہ سوری (سعید احمد مارہروی)؛ اُلّو (خواجہ حسن نظامی)؛ وضعداری (محمد الواحدی)؛ ایک وکیل اور اُس کا بیٹا (خان بہادر شیخ عبدالقادر)؛ ویل مچھلی (سید راحت حسین بی۔اے)؛ جانوروں کی الف لیلہ (۳ سبق-پنڈت رتن ناتھ

[1] اُردو کورس چھٹی جماعت کے لیے

سرشار)؛ رنگ و بیرنگی (اشرف حسین)؛ حجِ اکبر (منشی پریم چند)؛ سرائے کا نقشہ برسات میں (باقر علی داستان گو)؛ مکتوباتِ اکبر (اکبر الہ آبادی)؛ دروپدی کا سوئمبر (منشی سورج نرائن مہر دہلوی)؛ کلیم کی سرگذشت (مولوی نذیر احمد دہلوی)۔[1]

آٹھویں کی کتاب میں بتیس اسباق تھے۔ نصف منظومات تھیں: معرفتِ الٰہی (جوش ملیح آبادی)؛ حبِّ وطن (مولانا محمد حسین آزاد)؛ رام چندر جی کا بن باس (پنڈت شیو نرائن چکبست)؛ جوگی (خوشی محمد ناظر)؛ ریچھ کا بچہ (نظیر اکبر آبادی)؛ ستارہ (ڈاکٹر سر محمد اقبال)؛ سرورِ قناعت (منشی نائک پرشاد طالب)؛ گنگا (مولانا سہاعلیگ)؛ کسان (سید محمد فاروق)؛ موسمِ گرما (پیارے لال شاکر)؛ مناظرہ ہمت و تدبیر (سید علمدار حسین)؛ حضرت قاسم کی جنگ (میر انیس)؛ اندھی پھول والی کا گیت (مہدی حسن احسن)؛ لڑکیوں کی تعلیم (اکبر الہ آبادی)؛ کنارِ راوی (ڈاکٹر سر محمد اقبال)؛ برسات کی بہاریں (نظیر اکبر آبادی)۔

نثر کے اسباق میں سے 'دیاسلائی'، 'چاند اور ستارے' اور 'زمین کی فرسودگی' پر مصنف کا نام درج نہ تھا۔ بقیہ تھے: دنیا کی دلچسپیاں (شیخ سر عبدالقادر)؛ قلعۂ شاہجہاں (سر سید احمد خاں)؛ مسٹر دادا بھائی نوروجی (پنڈت تلوکی ناتھ کول)؛ زبان کی تمیز اور اُس کا فرق (سید احمد دہلوی)؛ ایمان کا فیصلہ (منشی پریم چند)؛ ہوشیار سراغرساں (حکیم احمد شجاع)؛ گھر سے نکل کے دیکھو (شیخ سر عبدالقادر)؛ مجھے میرے دستوں سے بچاؤ (سید سجاد حیدر یلدرم)؛ موعظۂ حسنہ (ڈاکٹر حافظ نذیر احمد خاں)؛ پیسہ کا سفر نامہ (خواجہ حسن نظامی)؛ اخلاقی جرأت (ڈپٹی لال نگم)؛ سائنس کے حیرت انگیز کرشمے (پروفیسر فیروز الدین مراد ایم۔ ایس۔ سی)؛ خدائی فوجدار (پنڈت رتن ناتھ سرشار)۔[2]

ہر کتاب کے آخر میں فرہنگ شامل تھی۔ مصنفین کے ناموں کے ساتھ القاب لگائے تھے، جیسے حضرت، جناب، مدظلہٗ۔ جو فوت ہو چکے تھے اُن کے ناموں کے ساتھ عموماً ''مرحوم'' لگایا گیا تھا۔

---

[1] اُردو کورس ساتویں جماعت کے لیے

[2] اُردو کورس آٹھویں جماعت کے لیے

آٹھویں جماعت کی کتاب میں پنڈت رتن ناتھ سرشار کے نام کے ساتھ بھی "مرحوم" درج تھا۔

1

جنوری ۱۹۲۵ء میں علیگڑھ میگزین میں علامہ اقبال کی فارسی غزل چھپی۔[1]

2

علامہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں میں متحد ہونے کی خواہش بیدار ہو چکی ہے۔ ۱۹۰۶ء میں ایران کا دستوری انقلاب اس کی مثال تھا۔ شیعہ مجتہدین نے انتخاب کا اصول قبول کیا جو خالص سُنّی اصول تھا۔ علامہ نے ۱۹۰۸ء میں انگریزی مقالے خلافتِ اسلامیہ ('Political Thought in Islam') میں تذکرہ بھی کیا تھا۔ ممکن ہے کہ یہ بات بھی پیشِ نظر رہی ہو کہ آل انڈیا مسلم لیگ نے تمام فرقوں کے مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کیا تھا۔

علامہ نے ایک حلقہ قائم کیا۔ رواداری کے معاملے میں اُن حدود سے آگے تھا جو عام طور پر ذہن میں آ سکتی تھیں۔ محسوس ہوا کہ ایک چھوٹی سی بزم سے آگے نہ بڑھ سکے گا۔ اسے ایک ہمہ گیر تحریک بنانے کے لیے جیسے رہنما کی ضرورت ہے، وہ ایک ارتقا کے بعد ہی تیار ہو سکتا ہے۔ فی الحال علامہ میں بھی وہ صلاحیت نہ تھی خواہ بعد میں پیدا ہو جاتی۔ جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ حلقہ ختم کر دیا۔ اِس نتیجے پر پہنچے کہ اسلامی فرقوں کی باہمی رقابت اِس لیے ہے کہ مسلمان اُس حقیقی روحانی تجربے سے محروم ہو گئے ہیں جو مذہبی زندگی کا اصل سرچشمہ ہوتا ہے۔[2] آگے چل کر روحانی جمہوریت (spiritual democracy) کی اصطلاح استعمال کی۔ امریکی شاعر والٹ وٹمین (Walt Whitman) سے منسوب تھی۔ وٹمین نے اس سے کسی مذہب کے تمام فرقوں کا ایک مرکز پر جمع ہونا مراد لیا تھا۔

---

[1] ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی (۱۹۷۶)، خطوط اقبال، ص ۱۵۲ کے مطابق زبورِ عجم کی غزل ہے (نمبر ۳۸ بتایا ہے مگر حصہ اول یا دوم کی نشاندہی نہیں کی ہے)۔

[2] دیکھیے ۲۱ اکتوبر ۱۹۲۵ء کے واقعات میں انگریزی مکتوب بنام چنگیزی۔

علامہ سمجھتے تھے کہ یہی اسلام کا حتمی مقصد ہے۔[1]

۱۹۲۵ء میں کسی وقت قسطنطنیہ یونیورسٹی کے خالد خلیل کو بھی جواب دیا۔ اُن کا خط اکتوبر میں سید سجاد حیدر یلدرم نے شائع کروا کے تجاویز طلب کی تھیں۔ قسطنطنیہ یونیورسٹی کا ادارۂ دینیات مسلم قوموں کے علم الانساب (geneaology) پر باقاعدہ کام کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ علامہ کے نزدیک اس کے لیے کم سے کم دس برس کی مستقل محنت درکار تھی۔ اُس کے نتیجے میں دنیائے اسلام کے بارے میں ترکوں کا دائرۂ نظر وسیع ہو سکتا تھا۔ شاید نسلی خصوصیتوں کی تہہ میں روحانی وحدت کے عوامل بھی سامنے آتے۔ انسانی علوم میں ایک اضافہ ہوتا۔ ایشیا کی سیرت کی تشکیل کا راز ابھی تک معلوم نہ کیا جا سکا تھا۔ ممکن ہے کہ اس میں تاتاری نسل کی بعض اہم شاخیں کارفرما رہی ہوں اور اِس تحقیق کے نتیجے میں یہ بات سامنے آ جائے۔

علامہ نے پانچ تجاویز پیش کیں:

۱ مختلف ممالک کے مسلمانوں کے بارے میں جتنی کتابیں لکھی گئی ہیں، جمع کی جائیں۔ یورپین کتابیں عموماً تبلیغی، سیاسی یا تجارتی مقاصد کے تحت لکھی گئی ہیں لیکن ان میں مفید معلومات بھی ملتی ہے۔

۲ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام مستقل طور پر پیش نظر رہے۔ ایران کے متلعق نکولس خانیکوف (Nicolas de Khanikof) کی *Memoir Sur I Ethnographic de la perse* کام کی نوعیت اور ترتیب کا ایک عام اندازہ لگانے میں مفید ہو سکتی ہے۔

۳ ابتدائی نوعیت کے خطبات سے آغاز کیا جائے، جیسے: اناٹومی کے نقطۂ نظر سے نسل کی حیثیت؛ وہ اسباب جن سے نسلوں کی تفریق پیدا ہوئی؛ علم الانساب کے اغراض و مقاصد؛ کیا مذہب بھی نسل کی تخلیق کر سکتا ہے؟ کیا دنیائے اسلام کا ادب زبانوں کے فرق کے باوجود ایک مشترک بنیاد پر قائم ہے؟ اسلامی نسلوں کا ایک سرسری جائزہ: سامی، آریائی،

---

[1] علامہ نے تشکیلِ جدید کے چھٹے خطبے کی آخری سطر میں یہ بات کہی ہے؛ Iqbal (1934), *Reconstruction*

تاتاری اور حبشی یا بربری؛ سامی نسلوں میں عربوں کے علاوہ افغانی اور کشمیری (اگر یہ مانا جائے کہ یہودی نسل سے تعلق رکھتے ہیں)؛ آریائی میں ایرانی اور ہندی اگرچہ ہندی مسلمان مخلوط النسل ہیں جن میں جاٹوں اور راجپوتوں کے بارے میں خیال ہے کہ شاید تاتاری ہیں؛ تاتاریوں میں وسط ایشیا کے تاتاری، منگولین یعنی کاشغری اور تبتی، چینی اور عثمانی ترک شامل ہیں۔

۴ خصوصی موضوعات پر لیکچرز میں مثال کے طور پر افغانوں پر پانچ ہو سکتے ہیں۔ اول: افغان، افغانستان میں نسلوں کا خلط ملط؛ فارسی بولنے والے افغان اور پشتو بولنے والے افغان؛ کیا افغان اور پٹھان میں کوئی چیز مابہ الامتیاز ہے؟ کیا افغان عبرانی ہیں؟ اپنی اصلیت کے متعلق ان کی اپنی روایات؛ کیا پشتو زبان میں عبرانی الفاظ ملتے ہیں؟ کیا وہ ان یہودیوں کی نسل سے ہیں جنہیں سائرس نے غلامی سے نجات دلائی تھی؛ جدید افغانستان کے بڑے بڑے قبائل؛ ان کی آبادی کا اندازہ۔ دوم: افغانوں کے اسلام لانے کے زمانہ سے ان کی سیاسی تاریخ پر سرسری تبصرہ۔ سوم: افغانوں کو متحد کرنے کی جدوجہد۔ مذہبی اعتبار سے پیر روشن اور اُن کے جانشین؛ سیاسی اعتبار سے شیر شاہ سوری، خوشحال خاں خٹک، احمد شاہ ابدالی، افغانستان کے سابق امیر عبدالرحمن خاں؛ موجودہ امیر امان اللہ خاں۔ چہارم: موجودہ افغانی تمدن؛ ان کی قدیم اور جدید صنعت و صناعت؛ ان کی ادبیات ان کی آرزوؤں اور حوصلہ مندیوں کی ترجمان کی حیثیت سے۔ پنجم: افغانی نسل کا مستقبل۔

۵ ادارۂ دینیات کو چاہیے کہ دینیات کی ایک پروفیسر شپ قائم کرے۔ کسی ایسے شخص کو متعین کیا جائے جس نے اسلامی دینیات اور جدید یورپین فکر و تصور کا مطالعہ کیا ہو۔

آخر میں علامہ نے لکھا کہ قدیم اسلامی دینیات زیادہ تر یونانی فلسفے سے اخذ کی گئی تھی۔ اُس کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ ایک جدید علمِ کلام کی ضرورت ہے۔ دینیات کی دوبارہ تدوین کی جائے۔ یورپ نے عقل اور وحی کے درمیان ہم آہنگی دریافت کرنا مسلمانوں سے سیکھا اور اِس میں بہت آگے نکل گیا۔ مسلمانوں کو پیچھے نہیں رہنا چاہیے۔ ترکی اس طرف توجہ دے کر ہی اپنے نوجوانوں کو یورپ کی

لامذہبیت سے محفوظ کر سکتا ہے۔ یورپ نے تعلیم و تربیت میں سے مذہب کا عنصر عام طور پر نکال دیا ہے جس کا نتیجہ شاید ایک نئی جنگ کی صورت میں سامنے آئے۔ مذہب قوم میں ایک متوازن سیرت پیدا کرتا ہے جو قومی زندگی کے مختلف پہلوؤں کے لیے سرمائے کی حیثیت رکھتی ہے۔ [1]

3

سردار بیگم اور وسیمہ مبارک کو انگریزی سیکھنے کا شوق ہوا۔ قاعدہ منگوا کر وسیمہ کے بھائی مختار سے سبق لینا شروع کیا۔ وہ کوٹھی کے مہمان خانے میں مستقل طور پر ٹھہرے ہوئے تھے۔ ''چچی جان [سردار بیگم] بلند آواز سے ہِل ہِل کر C-A-T اور R-A-T کا وِرد کر رہی تھیں کہ چچا جان [علامہ] تشریف لے آئے،'' وسیمہ مبارک کا بیان ہے۔ وسیمہ کے مطابق انہیں اور سردار بیگم نے آہٹ نہ سنی۔ علامہ نے قریب آ کر کہا، ''اونہوں، آج تو یہاں انگریزی مدرسہ لگا ہوا ہے۔'' پھر مسکرا کر اپنا شعر پڑھا:

لڑکیاں پڑھ رہی ہیں انگریزی ڈھونڈ لی قوم نے فلاح کی راہ

سردار بیگم نے جواب دیا کہ گھر پر معمولی شدبد حاصل کر لینے میں کیا برائی ہے تو کہا، ''اچھا بابا! اچھا۔'' اُن کے پوچھنے پر سردار بیگم نے بتایا کہ مختار تھوڑا بتا دیتا ہے۔ علامہ نے کہا، ''اگر چاہو تو میں بھی بتانے کے لیے تیار ہوں۔'' [2]

اس برس انجمن حمایت اسلام کے تحت لڑکیوں کے لیے چلنے والے مدرسوں میں سے ایک کو مڈل کا درجہ دے کر انگریزی تعلیم شروع کی گئی۔ [3]

---

[1] مکتوب بنام خالد خلیل، بلا تاریخ؛ برنی (۱۹۹۱)، ص ۵۷۳-۵۷۶۔ برنی نے اسے نومبر یا دسمبر ۱۹۲۴ء کی تحریر سمجھا لیکن اس میں ہے کہ زویمر گزشتہ برس لاہور آئے۔ وہ ۲۷ رمئی ۱۹۲۴ء کو آئے تھے (دیکھیے اُس دن کے واقعات)۔

[2] خالد نظیر صوفی، اقبال درونِ خانہ، ص ۷۲-۷۱

[3] محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶)، اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص ۳۴

4

۴؍ جنوری کو کشن پرشاد کا خط ملا۔ اُسی وقت جواب دیا۔[1]

۹؍ جنوری کو لاہور ہائی کورٹ نے کسی سردار خاں اور بعض دوسروں کا قانونی اعتراض مسترد کر دیا۔ اُن کی پیروی ساگر چند، شیخ چراغ دین اور نیاز محمد کر رہے تھے۔ اعتراض مسماۃ عائشہ بی بی اور بعض دوسروں کے خلاف کیا گیا تھا۔ اُن کا دفاع علامہ کر رہے تھے۔ سماعت چیف جسٹس شادی لعل، جسٹس کیمبل اور جسٹس ظفر علی نے کی تھی۔[2]

اُس روز مہاراجہ کشن پرشاد نے حیدرآباد دکن کے حالات کے حوالے سے لکھا، ''پیارے اقبال! جو کچھ میں کہہ سکتا ہوں وہ کہنا نہیں چاہتا اور جو کہنا چاہتا ہوں وہ کہہ نہیں سکتا۔''[3] افواہ گرم تھی کہ میاں سر محمد شفیع کو حیدرآباد کی وزارتِ عظمٰی دینے پر غور کیا جا رہا ہے۔ ۱۱؍ جنوری کو شاد نے لکھا، ''کاش سر محمد شفیع کے عوض آپ ہی براجمان ہو جائیں تو شاد کے لیے باعثِ شادمانی ہو گا۔''[4] علامہ شاید جواب نہ دے سکے۔

۱۲؍ جنوری کو دوپہر ڈیڑھ بجے پنجاب ٹیکسٹ بک کمیٹی کی اُردو سب کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ حاجی منشی محبوب عالم نے صدارت کی۔ علامہ اقبال، منوہر لال، عبدالحامد، لالہ بہاری لال باٹیا، محمد دین بی اے، خلیفہ شجاع الدین، رائے بہادر رگوناتھ سہائے، مِس ایل ایم اسٹریٹفورڈ (Miss. L. M. Stratford)، سردار صاحب بھائی موہن سنگھ، خانصاحب سید مقبول شاہ، لالہ دیوی دیال، لالہ رامچندر اور ای اسمتھ (E. Smith) شریک ہوئے۔ جن کتابوں کو نصاب میں شامل کرنے کی منظوری دی گئی، اُن میں علامہ اقبال اور حکیم احمد شجاع کے مرتب کیے ہوئے اردو کورس کی چھٹی، ساتویں اور آٹھویں

[1] مکتوب بنام شاد ۴؍ جنوری ۱۹۲۵ء محولہ بالا

[2] ظفر علی راجا ایڈووکیٹ (۲۰۱۳) قانون دان اقبال، ص ۱۲۳

[3] مکتوب شاد بنام اقبال ۹؍ جنوری ۱۹۲۵ء؛ قریشی (۱۹۸۶) اقبال بنام شاد، ص ۳۸۲

[4] مکتوب شاد بنام اقبال ۱۱؍ جنوری ۱۹۲۵ء؛ قریشی (۱۹۸۶) اقبال بنام شاد، ص ۳۸۵

جماعت کی کتابیں شامل تھیں۔[1]

۱۶؍ جنوری کو علامہ کی گائے نے بچھڑا دیا۔ کھیس طشت میں بھر کر نقرئی ورق لگا کر زمیندار کے دفتر بھیجی گئی۔ علی بخش لے کر گیا۔ ظفر علی خاں نے "انعام" کے طور پر نظم لکھ دی:

جو اپنی میٹھی کھیس زمیندار کو کھلائے   دودھوں نہائے ڈاکٹر اقبال کی وہ گائے

نظم ۱۹؍ جنوری کے زمیندار میں آئی۔[2] اگلے روز نیازالدین خاں کا خط ملا۔ نواب کنج پورہ کے میموریل کی فرمایش تھی لیکن ضروری دستاویزات لاہور لانے کی جو ہدایت علامہ نے کی تھی وہ غالباً پوری نہیں ہونے والی تھی۔ علامہ پیرزادہ مظفر حسین فضلی کی مثنوی 'رازِ بیخودی' کا تذکرہ بھی تھا جو چند برس پہلے 'اسرارِ خودی' کے جواب میں شائع ہوئی تھی۔ علامہ نے فوراً جواب دیتے ہوئے لکھا کہ تمام ضروری دستاویزات کے بغیر میموریںڈم لکھنا فضول ہے بالخصوص اس زمانے میں جب اُمرائے ہند کے متعلق خیالات عموماً اچھے نہیں ہیں۔ دوسرے معاملے کے بارے میں لکھا:

> پیرزادہ صاحب کی مثنوی کا حال مجھے معلوم ہے۔ مسلمانانِ ہند کے دل و دماغ پر عجمی تصوّف غالب ہے۔ وہ عربیت کے تخیلات کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ میں تو ایک معمولی آدمی ہوں۔ مجھے یقین ہے اگر نبی کریمؐ بھی دوبارہ پیدا ہو کر اِس ملک میں اسلام کی تعلیم دیں تو غالباً اس ملک کے لوگ اپنی موجودہ کیفیات اور اثرات کے ہوتے ہوئے حقائقِ اسلامیہ کو نہ سمجھ سکیں۔
>
> اسلام نہایت سادہ مذہب ہے۔ لیکن اُس کی بدیہیات کے اندر ایسی ایسی مشکلات ہیں جن کی حقیقت کا سمجھنا آسان کام نہیں۔ خاص کر اُن لوگوں کے لیے جن کو عجمی "بلند خیالی" کے افسوں نے محسوس فراموش کر دیا ہے۔[3]

---

[1] فقیر سید وحید الدین (۱۹۸۸) روزگار فقیر، جلد اول، ص ۱۰۶-۱۰۵
Rahim Bakhsha Shaheen (n.d.) *Mementos of Iqbal,* pp.60-62

[2] جعفر بلوچ (۱۹۹۵) علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں، ص ۳۳-۳۴

[3] مکتوب بنام نیازالدین خاں ۲۰؍ جنوری ۱۹۲۵ء

جرمنی کے شہر لیپزگ (Liepzig) سے اسلامیات کے بارے میں رسالہ اسلامیکا (*Islamica*) جاری ہوا۔ نکلسن کے قلم سے پیامِ مشرق پر مفصل تبصرہ اس میں شائع ہوا۔[1] کئی منظومات کا ترجمہ شامل تھا۔ وہ نظم بھی تھی جس میں گوئٹے جنت میں مولانا روم کو فاؤسٹ سنا رہے تھے۔ آیندہ برسوں میں اس مضمون کے ایسے ہی اقتباسات پڑھ کر وہ نوجوان جرمن طالبہ علامہ کے کلام کی طرف متوجہ ہونے والی تھی جس کا نام اینامیری شمل تھا۔

نکلسن کے تبصرے میں کچھ خامیاں تھیں:

۱ انہوں نے لکھا کہ ہندوستان کے مسلمان شعرا میں علامہ کا مقام سب سے جدا ہے۔ بات اپنی جگہ درست تھی مگر علامہ ایک ادبی تحریک سے وابستہ تھے جو مولانا حالی سے شروع ہوئی تھی۔ نواب ذوالفقار علی خاں ۱۹۲۲ء میں اپنی انگریزی تصنیف میں واضح کر چکے تھے۔

۲ ایک عجیب بات یہ لکھی کہ علامہ کا اُردو کلام اہلِ وطن کو ہندوستان کے درد سے آشنا کرتا ہے جبکہ فارسی شاعری مسلمانوں کو ملت کا پیغام دیتی ہے اور یہ دو علیحدہ آوازیں ہیں۔ چار برس پہلے 'اسرارِ خودی' کے ترجمے پر تبصرہ کرتے ہوئے ای ایم فارسٹر لکھ بیٹھے تھے کہ علامہ پہلے ملّتِ اسلامیہ کے گیت گاتے تھے اور بعد میں گاندھی کی تحریک سے متاثر ہو کر وطن پرستی کی نظمیں لکھنے لگے۔ علامہ نے جواب میں لکھا کہ فارسٹر اُن کے کلام کی ترتیبِ نزول سے واقف نہیں ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نکلسن یہ سمجھے کہ علامہ بیک وقت وطنیت اور ملت کے نغمے چھیڑتے ہوں گے مگر علیحدہ زبانوں میں۔

۳ نکلسن کے مطابق ایک تہذیب کا شخص کتنا ہی بڑا اہلِ علم ہو، دوسری تہذیب کو نہیں سمجھ سکتا اس لیے علامہ مغربی تہذیب کے اصولِ انسانیت (humanism) کو نہیں سمجھ سکے۔ پہلی بات درست تسلیم کی جاتی تو پوچھا جا سکتا تھا کہ نکلسن جیسے مستشرقین کیونکر مشرقی تہذیب کے ماہر سمجھے جاتے ہیں اور کیمبرج میں اس مقصد کے لیے کوئی مولوی یا پنڈت

[1] Dr. Riffat Hasan (1977), *The Sword and the Spectre*

کیوں نہ رکھا گیا۔ دوسری بات بغیر دلیل کے الزام تراشی تھی۔ کوئی مثال پیش نہ کی گئی کہ علامہ نے یورپی اصولِ انسانیت کو کہاں غلط سمجھا ہے۔

۴ نکلسن کو تعجب تھا کہ کیوں اقبال نے اپنی خیالی مجلس کے دروازے غیر مسلموں پر بند رکھے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ نکلسن نے محض وہ اعتراض دہرایا تھا جو 'اسرارِ خودی' کے ترجمے پر ڈکنسن نے کیا تھا ورنہ نکلسن کے اسی مضمون میں پیامِ مشرق کی اُس نظم کا ترجمہ شامل تھا جہاں گوئٹے جنت میں مولانا روم کا ہمنشیں تھا!

جرمنی کے شہر ڈارمسٹارڈ (Darmstadt) میں کاؤنٹ ہرمن کیسرلنگ (Count Hermann Keyserling) نے اسکول آف وِزڈم قائم کیا تھا۔ جنگِ عظیم سے پیدا ہونے والی نئی دنیا کی تشکیل میں حصہ لینا چاہتے تھے جو نسل، قومیت اور علاقائیت سے ماوراہو۔ ان کا سفر نامہ *(The Travel Diary of a Philosopher)* شائع ہوا۔ سفر تیرہ چودہ برس پہلے کیے تھے۔ لاہور بھی آئے تھے۔ علامہ نے ان کے self-realization کے تصور کو "یک رخا" (one-sided) قرار دیا۔[1]

5

بانگِ درا کے لیے نیا اشتہار مرتب ہوا۔ ۲/ فروری کو زمیندار میں شائع ہوا۔ پھر فروری میں ۵، ۷، ۹، ۱۲، ۱۶، ۲۰، ۲۵، ۲۶ اور ۲۷/ تاریخ، مارچ میں یکم، ۴، ۵، ۷، ۹، ۱۱، ۱۸، ۱۹، ۲۱، ۲۶، ۲۸ اور ۳۰/ تاریخ، اپریل میں ۲، ۴، ۱۰، ۱۱، ۱۳، ۲۳، ۲۵ اور ۲۹/ تاریخ، مئی میں ۲، ۴، ۷، ۹، ۱۱، ۱۵، ۲۰، ۲۲، ۲۴، ۲۷، ۲۹ اور ۳۱/ تاریخ، جون میں ۲، ۵، ۷، ۱۰، ۱۲، ۱۴، ۱۷، ۲۰، ۲۳، ۲۵ اور ۲۸/ تاریخ اور جولائی میں یکم، ۵، ۸، ۱۰/ اور ۱۲/ تاریخ کو دہرایا گیا۔

ترجمانِ حقیقت علامہ اقبال کی بانگِ درا

جناب علامہ کی اُردو نظموں کا مجموعہ ہے، ہزاروں جلدیں ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گئیں، بہت تھوڑے

[1] ڈائری کا تذکرہ علامہ اقبال نے اپنے مضمون 'Self in the Light of Relativity' میں کیا ہے جو ۱۹۲۵ء میں اسلامیہ کالج کے جریدے کریسنٹ میں شائع ہوا۔ ماخذ: Razzaqi , *Discourses of Iqbal*

نسخے باقی رہ گئے ہیں، اس لیے نہایت جلد منگا لیجیے، ورنہ دوسرے اڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔ قیمت صرف چار روپے۔ سیّد ممتاز علی اینڈ سنز۔ دارالاشاعت پنجاب: ۱۹۵۔ ریلوے روڈ، لاہور۔[1]

6

شیخ عطا محمد کے لڑکے مختار کو کوئی غلط اطلاع ملی۔ شاید ملازمت کا معاملہ تھا۔ شیخ عطا محمد نے خط لکھا۔ علامہ بیمار تھے۔ بہر حال تحقیق کی۔ ۷/ فروری کو جواب لکھا کہ اطلاع غلط تھی۔ اگلے برس کوشش کی جائے گی۔ علامہ کے پرانے دوست شیخ گلاب دین سیالکوٹ جا رہے تھے۔ وہاں کچھ لوگوں کے ساتھ تنازعہ تھا۔ ان کی مدد کے لیے بھی لکھا۔ اعجاز سے بھی کہہ دیں۔[2]

۱۵/ فروری کو علیگڑھ میگزین کے حوالے سے زمیندار میں علامہ کی غزل 'حقائق و معارف' کے عنوان سے شائع ہوئی:

کمال معرفت نوریاں ہمیں خاک است

بتایا گیا کہ زیرِ تکمیل فارسی تصنیف کا حصہ ہے۔[3]

بانگِ درا (مجلّد)

مولوی سیّد ممتاز علی صاحب اینڈ سنز اطلاع دیتے ہیں کہ بانگِ درا (علامہ اقبال) ان کے ہاں سے مجلّد بھی مل سکتی ہے۔ جلد نہایت نفیس ولایتی انداز کی بندھی ہوئی ہے جس پر خوش خط سنہری حروف میں بانگ درا اور علامہ کا اسم گرامی چھپا ہوا ہے۔ غیر مجلّد کی قیمت چار روپے اور مجلّد کی سوا پانچ روپے مقرر کی گئی ہے۔ ملنے کا پتا: سیّد ممتاز علی اینڈ سنز، سنٹرل پبلشنگ ہاؤس: ۱۹۵۔ ریلوے روڈ، لاہور۔

زمیندار ۲۱/ فروری ۱۹۲۵[4]

---

[1] اختر النسا (۲۰۱۰)، اقبال اور زمیندار، ص ۱۰۱-۹۸

[2] مکتوب بنام عطا محمد ۷/ فروری ۱۹۲۵ء؛ برنی (۱۹۹۱)، ص ۵۷۸؛ شیخ اعجاز احمد (۱۹۸۵)، ص ۳۵۷

[3] اختر النسا (۲۰۱۰)، اقبال اور زمیندار، ص ۱۵

[4] اختر النسا (۲۰۱۰)، اقبال اور زمیندار، ص ۱۰۱

7

پروفیسر سردار محمد کا خط آیا۔ اُن کے کسی دوست نے علامہ کے ایک شعر میں "خجستہ پا" یا ایسی ہی کسی ترکیب پر اعتراض کر کے سند مانگی تھی۔ کئی دن تک جواب نہ دے سکے۔ ۶/مارچ کو جواب دیا:

زبان کے متعلق میرا نقطۂ نگاہ اور ہے مگر اس ملک میں جہاں لوگ علم اللّسان جدید سے واقف نہیں، وہ نقطۂ نگاہ بدعت سمجھا جائے گا۔ اِس واسطے اس کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں ورنہ آپ کے دوست کی تنقید کا وہ کافی جواب ہوتا۔ ان کی تسلی صرف سند ہی سے ہو سکتی ہے جس کی تلاش انشاءاللہ کروں گا۔[1]

لاہور میں بہار کا آغاز تھا۔[2]

مولانا احمد علی کی انجمن خدام الدین کا جلسہ ہونے والا تھا۔ اس ادارے کے اجتماعات میں لاہور کے رؤسا بھی شرکت کرتے تھے۔ "علما کے ایسے ایسے شاندار اجتماعات ہوئے کہ لاہور کی تاریخ میں اُن کی کوئی مثال نہیں مل سکتی،" عبداللہ چغتائی کا بیان ہے۔ اس دفعہ علمائے دیوبند بلائے گئے تھے۔ ۱۲/مارچ کو چغتائی نے علامہ سے تذکرہ کیا۔ علامہ نے اُسی وقت مولانا سید انور شاہ کشمیری کے نام لکھا:

میں اسے اپنی بڑی سعادت تصوّر کروں گا اگر آپ کل شام اپنے دیرینہ مخلص کے ہاں کھانا کھائیں۔ جناب کی وساطت سے حضرت مولوی حبیب الرحمٰن صاحب، قبلہ عثمانی حضرت مولوی شبیر احمد صاحب اور جناب مفتی عزیز الرحمٰن صاحب کی خدمت میں بھی یہی التماس ہے... آپ کو قیام گاہ سے لانے کے لیے سواری یہاں سے بھیج دی جائے گی۔[3]

چغتائی کے مطابق مولانا نے خط کی پشت پر فارسی میں قبولیت کا پیغام لکھا، "احقر و دیگر حضرات ہمگی ارشادِ جناب قبول کردند۔" اس دعوت میں چغتائی کے مولانا انور کے علاوہ خدام الدین کے مولانا احمد

---

[1] مکتوب بنام پروفیسر سردار محمد ۶/مارچ ۱۹۲۵ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۷۹

[2] مکتوب بنام اکبر منیر ۱۷/مارچ ۱۹۲۵ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۸۲–۵۸۱

[3] مکتوب بنام مولانا انور شاہ کشمیری ۱۲/مارچ ۱۹۲۵ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۸۰

علی، سید عطاؐاللہ بخاری، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور دیگر علمائے دیوبند موجود تھے۔ مسئلہ سُود پر گفتگو ہوئی۔ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی نے علامہ سے پوچھا کہ زمیندار میں عنایت اللہ مشرقی کی تذکرہ پر تبصرہ کس نے لکھا۔ علامہ نے چودھری محمد حسین کی طرف اشارہ کیا۔ اُنہیں خوب داد ملی۔

جلسے کے دنوں میں ایک صبح مولانا انور نے درسِ حدیث دیا۔ ''ہزارہا علما اور دوسرے حضرات بطور تبرک شریک ہوئے،'' چغتائی کا بیان ہے۔ علامہ نے بھی فجر کی نماز کے بعد بخاری شریف کی پہلی حدیث ''انما الاعمال بالنیات'' پر تقریر کی۔ ایک گھنٹہ جاری رہی۔ ''مقامِ حدیث کے متعلق چند ایسے قیمتی نکات ارشاد فرمائے جو عوام کے لیے بالکل نئے تھے۔ آپ کے اس خطبے میں عظمتِ حدیث، صداقتِ حدیث اور ضرورتِ حدیث کو بوضاحت بیان کیا گیا تھا۔''[1]

8

زبورِ جدید کی بیاض میں موجود بعض منظومات کے ابتدائی مصرعوں کے مفہوم یوں ہیں:

- تم نے اپنے آپ کو نہیں دیکھا جب تک انجمن میں نہ دیکھا۔
- میرے میکدے کی شراب جمشید کی یادگار نہیں ہے۔
- میں لالہ صحرا ہوں مجھے خیاباں سے پرے لے جاؤ۔
- میں نئی بات کرتا ہوں مگر کوئی اس کی تہہ کو نہیں پہنچ پاتا۔
- اس محفل میں جہاں معاملہ شراب و ساقی سے گزر چکا ہے، میں ایسا دوست کہاں سے لاؤں کہ اُس کے جام میں اپنی بچی ہوئی مے ڈال دوں!
- اے ساقی میرے جگر میں بھیگا ہوا شعلہ ڈال دیجیے!
- یارب! میرے سینے میں باخبر دل عطا فرمائیے۔[2]

---

[1] عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۱۲۸-۱۲۶

[2] بیاض زبور عجم میں ۷ شعر پر مشتمل ہے۔ پہلے شعر نمبر ۱، ۲، ۳، ۵، ۶ اور ۷ لکھے گئے۔ پھر شعر نمبر ۴ حاشیے میں تیسرے اور پانچویں کے درمیان لکھا گیا۔ زبورِ عجم میں حصہ اول کے شروع میں 'دعا' کے طور پر شامل کی گئی۔

- مغربیوں کی شراب روح کا جوہر رکھتی تھی۔ اس کا جام بھی ایک جہان کا نظارہ کرواتا تھا۔[1]
- میں آزاد بندہ ہوں، عشق میرا امام ہے۔
- ہم خدا سے گم ہو گئے ہیں، وہ ہماری جستجو میں ہے۔
- آپ کی جستجو کی لذت ہی زندگی کا سوز و گداز ہے۔
- ایک جہان کی تمنا ایک حرف سے بیان کی جاسکتی ہے۔
- اس صحرا میں شاید کسی قافلے کا گزر ہوا ہے۔
- لوگوں کے ساتھ میل جول خودی کی نارسائی کی علامت ہے۔
- اے لالہ! ایک کہستان، باغ اور سبزہ زاروں کے چراغ!
- اگرچہ میں جانتا ہوں کہ ایک روز وہ بے نقاب نکلے گا اور میں اس کا دیدار کر سکوں گا مگر یہ گمان نہ کرو کہ اس سے میری جان اس پیچ و تاب اور اضطراب سے نکل جائے گی!
- مشرق کہ جس کی کمندِ خیال میں آسمان بھی گرفتار ہے، افسوس کہ اب وہ خود اپنے آپ سے دور اور سوزِ آرزو سے خالی ہو چکا ہے۔[2]
- اے ساقی، آپ مجھے اس شراب کا ایک بڑا پیالہ عطا کر دیجیے جو مجھ میں لالے کے پھول کھلا دے۔
- میرا بے قید دل نورِ ایمان کے ساتھ کافری بھی کرتا رہا ہے۔
- میں نے اس بغیر دروازے کے گنبد سے باہر نکلنے کا راستہ پایا ہے۔

نسوانیت پر تین اشعار لکھ کر قلمزد کیے گئے ہیں۔ مفہوم تھا: ”عورت کا دل موتی کی طرح اپنے آپ میں رہے تو بہتر ہے۔ اُس کی زندگی کا چشمہ نظر سے پوشیدہ رہے تو بہتر ہے۔ زندگی طوفانی سمندر رہے اور

---

[1] بادۂ مغربیاں جوہرِ جانے دارد / جامِ ایں بادہ تماشائے جہانے دارد۔ زبورِ عجم میں شامل کرتے ہوئے مطلع بدل دیا گیا: عاشق آں نیست کہ لب گرمِ فغانے دارد۔

[2] بیاض زبور عجم میں ۱۱ شعر درج ہیں۔ ان میں سے تین کاٹے گئے ہیں۔ آخر میں مختلف قافیے کا شعر ڈال کر اِسے ترکیب بند بنایا گیا۔ اُسے نکال کر بقیہ ٹکڑے کو ترمیم کے ساتھ زبورِ عجم میں حصہ اول کے نمبر ۴ کے طور پر شامل کیا گیا۔

عورت اُس میں تیرتی ہے۔ اُس کے بھنور کی موج دیکھو۔ اُس کی تیراکی نہ دیکھی جائے تو بہتر ہے۔ ظاہر ہو جانا تخلیق کے راز سے دُوری ہے۔ ہر خالق کے جوہر کی حفاظت پردے میں ہے۔"[1]

- میں غیرت مند گناہگار ہوں۔ بغیر خدمت کے اُجرت قبول نہیں کرتا۔
- نگاہ نے دل پر جو بھی تصویر بنائی تھی، اُسے مٹا کے آرہا ہوں۔
- محشر میں شاعر سے مستانہ نغمہ کیا طلب کرتے ہیں![2]
- خوش آواز پرندہ اور شکاری شاہین دونوں آپ ہی سے ہیں۔
- دنیا اندھی ہے اور دل کے آئینے سے غافل ہو گئی ہے۔
- دنیا میں کوئی ایسا دوست نہ ملا کہ دلنوازی جانتا ہو۔
- تم جو علم سیکھ رہے ہو اُس میں دیکھنے کا شوق نہیں ہے۔
- نہ میرے تخیل میں ایمان اور کفر کا معرکہ ہے، نہ میں باغِ رضواں کی خواہش میں مرا جا رہا ہوں!
- عشق کی راہ پر اُٹھا ہوا ایک قدم ہزار پارسائی سے بہتر ہے
- میرے دل کی دنیا پر اُن کا حملہ آور ہونا دیکھو۔
- راہِ طلب میں ابھی تک میں دنیا کی دلدل میں پھنسا ہوا ہوں۔
- صبح کے سورج کی طرح نگاہ کو روشن کیا جا سکتا ہے۔
- تم نے غیروں کی صحبت میں پے در پے جام لنڈھائے۔
- عشق نے اپنے آپ میں جستجو کی اور آدم کو حاصل کیا۔
- سردیوں کا طویل موسم ختم ہوا۔

---

[1] یہ ٹکڑا زبورِ عجم میں شامل نہ کیا۔ جاوید نامہ اور ضربِ کلیم میں یہ خیالات موجود ہیں۔

[2] بیاض زبور عجم میں ۳ شعر پر مشتمل ہے۔ اس پر "پیشانی حصہ اول" درج ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ سرخی نظم کے ساتھ ہی لکھی گئی (یعنی بعد میں اضافہ نہ کی گئی)، جس کا مطلب ہے کہ اصلاً یہ نظم حصہ اول کی تمہید یا motto کے طور پر لکھی گئی تھی۔ زبورِ عجم میں حصہ اول کے نمبر ۲۷ کے طور پر شامل ہوا۔

- مجھے گھر اور منزل کی خواہش نہیں۔
- آپ نے سورج کی طرح روشن ہو کر میری شب کی سحر کر دی ہے۔
- میں چشمِ ساقی کی شراب میں مست ہوں۔

زبورِ جدید کا نام بدل کر زبورِ عجم کر دیا۔ یہ نام سب سے پہلے محمد اکبر منیر کے نام خط میں ملتا ہے۔ وطن واپس آ گئے تھے۔ گورنمنٹ کالج ملتان میں پروفیسر تھے۔ ماہِ نو مرتب کر رہے تھے۔ ان کے فارسی کلام کا مجموعہ تھا۔ ۱۷ مارچ کو علامہ نے ان کے خط کے جواب میں لکھا:

> زندگی کا راز یہی ہے کہ جہاں رہو، جس حالت میں رہو، خوش اور مطمئن رہو۔ دنیا میں بہت کم آدمی ہیں جو اپنی زندگی کے مختلف احوال و مقاصد سے آگاہ ہوتے ہیں۔ عام طور پر ہم اپنی زندگی کا محض ایک خارجی مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ اندرونی اسباب و علل و اسباب و نتائج ہماری نظر سے مخفی رہتے ہیں...ماہِ نَو ضرور مرتب کیجیے۔ اس سے بہت فائدہ ہو گا۔ زبورِ عجم کے لیے ایک مدت درکار ہو گی۔ بہت سے اور مشاغل ہیں جن کی طرف توجہ ضروری ہے۔ اگر اِسی کام میں سراپا محو ہو سکتا تو اب تک ختم ہو گیا ہوتا۔[1]

عبدالماجد دریابادی نے علامہ کے اجتہاد والے مضمون پر رائے بھیجی۔ "خاصی مخالفانہ" تھی۔[2] ۲۲ مارچ کو علامہ نے لکھا، "آپ کا نوٹ پڑھ کر مجھے بہت تعجب ہوا۔ معلوم ہوتا ہے عدیم الفرصتی کی وجہ سے آپ نے وہ مضمون بہت سرسری نظر سے دیکھا ہے۔ بہرحال میں آپ کا خط زیرِ نظر رکھوں گا۔ مضمون کا مسودہ ارسال فرمائیے۔"[3]

۲۵ مارچ کو جیمز کزنز (James H. Cousins) نے اپنی کتاب پیش کی:

Samadarsana (Synthetic Vision)—A Study of Indian Psychology

اگلے روز ترک ہلالِ احمر کا وفد لاہور پہنچا۔ ریلوے اسٹیشن پر علامہ اقبال، اختر علی خاں، سید حبیب، شیخ

---

[1] مکتوب محمد اکبر منیر ۱۷ مارچ ۱۹۲۵ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۸۲-۵۸۱

[2] عبدالماجد دریابادی (۱۹۷۹) اقبالیاتِ ماجد، ص ۶۱

[3] مکتوب بنام عبدالماجد دریابادی ۲۲ مارچ ۱۹۲۵ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۸۲

عبدالقادر اور خلافت کمیٹی کے بعض رضاکاروں نے استقبال کیا۔ وہاں سے یہ لوگ انہیں نیڈو ہوٹل (Nedou's Hotel) لے گئے۔

۲۷/ مارچ کو جمعہ تھا۔ نماز کے بعد وفد کے ارکان میں سے ایک نے جماعت کے سامنے تقریر کی۔ غالباً اسی موقع پر وہ مکالمہ ہوا جسے علامہ نے قریباً دس برس بعد نظم کیا۔ وفد کے ایک رکن نے علامہ سے پوچھا کہ ہندوستان میں امام نماز پڑھاتے ہوئے اتنا طویل سجدہ کیوں کرتے ہیں۔ علامہ نے جواب دیا کہ غلاموں کے پاس بہت فرصت ہوتی ہے۔[1] اگلے روز وفد نے گورنر سے ملاقات کی۔ لالہ لاجپت رائے نے ان کے اعزاز میں اپنے گھر پر دعوت دی جس میں کانگریس کے قریباً ایک سو ممبر شامل ہوئے۔ ۲۹/ مارچ کو وفد رات کی گاڑی سے بہاولپور روانہ ہو گیا۔[2]

9

گزشتہ برس یکم اپریل سے اس برس ۳۱/ مارچ تک علامہ کی تشخیص شدہ آمدنی ۱۳۷۰۲/ روپے ہوئی تھی۔ یونیورسٹیوں سے ۱۸۸۰، اور وکالت سے ۳۹۷۷ کی آمدنی شامل تھی۔ اس کے علاوہ بانگِ درا کی فروخت سے ساڑھے پانچ ہزار کی آمدنی ہوئی تھی۔ پانچ سو روپے رائلٹی بنی تھی۔ پچھلے برس علامہ نے موٹر خریدی تھی۔ کار، پٹرول اور ڈرائیور کا ذکر گوشوارے میں آیا۔ کُل ۶۴۲ روپے ٹیکس عائد ہوا۔[3]

اس برس علامہ پنجاب یونیورسٹی کے جو پرچے جانچ رہے تھے، یہ تھے: ایل ایل بی دوسرا پرچہ؛ بی اے آنرز فلسفہ پہلا پرچہ؛ ایم اے فلسفہ چوتھا پرچہ؛ ایم اے فارسی دوسرا پرچہ؛ ایم اے تاریخ آٹھواں پرچہ؛ ایم اے فلسفہ پہلا پرچہ [شریک ممتحن]۔[4]

---

[1] ضربِ کلیم کی نظم۔ محمد حسین عرشی نے علامہ سے واقعہ سن کر تلخیص کرتے ہوئے لکھا کہ وفد کا ایک رکن علامہ کے ساتھ نماز پڑھنے بادشاہی مسجد گیا تھا۔ بوڑھا آدمی تھا؛ محمد حسین عرشی، 'علامہ اقبال کی صحبت میں'، ص ۷۷۔ نظم ضربِ کلیم میں شامل ہے۔

[2] Nadeem Shafiq Malik (2015), p.158

[3] صفدر محمود (۱۹۷۳)، 'علامہ اقبال کا گوشوارۂ آمدنی'

[4] ڈاکٹر حسن اختر ملک، اقبال، ایک تحقیقی مطالعہ، ص ۱۳۲۔ ان کا ماخذ پنجاب گزٹ کے مختلف شمارے ہیں مگر پرچوں کی

10

۲/ اپریل کو لاہور ہائی کورٹ نے کسی فتح اور بعض دوسروں کی اپیل منظور کر لی۔ لالہ جگن ناتھ بھنڈاری پیروی کر رہے تھے۔ اپیل اللہ یار اور بعض دوسروں کے خلاف تھی۔ علامہ نے اُن کا دفاع کیا تھا۔ سماعت جسٹس لی روسگنال اور جسٹس ایف فورڈ نے کی تھی۔[1]

اکبر شاہ نجیب آبادی لاہور آنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ علامہ سے ملاقات بھی کرنا چاہتے تھے۔ خط لکھا۔ کسی مذہبی رسالے کفر توڑ کی عامیانہ روش سے بیزار تھے۔ خط میں کوئی ایسی رائے بھی ظاہر کی جس پر علامہ کو تعجب ہوا۔ ۱۲/ اپریل کو جواب دیتے ہوئے لکھا کہ جب چاہیں تشریف لائیں: ’’کفر توڑ وغیرہ کی اشاعت کا راز اِس بات میں ہے کہ عوام گالی گلوچ کو بہت پسند کرتے ہیں کہ یہ ان کی روز مرّہ زندگی کا جزوِ اعظم ہے۔ متین طرزِ تحریر صرف خواص کو پسند ہوتا ہے۔‘‘[2]

محمد حسین عرشی سے روایت ہے کہ ۱۴/ اپریل کو ایک ساتھی حکیم طالب علی کے ساتھ علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ علامہ کے پاس سروجنی نائیڈو اور میاں بشیر احمد بیٹھے تھے۔ علامہ انگریزی میں گفتگو کر رہے تھے۔ سروجنی کو رخصت کرنے اُٹھ کر برآمدے تک گئے۔ عرشی نے اس کے علاوہ کبھی علامہ کو کسی کو رخصت کرنے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھتے نہ دیکھا۔[3]

۲۰/ اپریل کو اکبر شاہ نجیب آبادی کا خط ملا۔ اُسی وقت جواب لکھا:

> آپ نے ٹھیک فرمایا ہے پیشہ ور مولویوں کا اثر سر سید احمد خان کی تحریک سے بہت کم ہو گیا تھا مگر خلافت کمیٹی نے اپنے پولیٹیکل فتووں کی خاطر ان کا اقتدار ہندی مسلمانوں میں پھر قائم کر دیا۔ یہ ایک بہت بڑی غلطی تھی، جس کا احساس ابھی تک غالباً کسی کو نہیں ہوا۔ مجھ کو حال ہی میں اس کا تجربہ ہوا ہے۔ کچھ مدت ہوئی میں نے اجتہاد پر ایک

فہرست ان کی کتاب میں جس طرح شائع ہوئی ہے اُس پر کتابت کی بعض غلطیوں کا شبہ ہوتا ہے۔

[1] ظفر علی راجا ایڈووکیٹ (۲۰۱۳) قانون دان اقبال، ص ۱۲۴

[2] مکتوب بنام اکبر شاہ نجیب آبادی ۱۲/ اپریل ۱۹۲۵ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۸۴-۵۸۲

[3] ظفر علی راجا ایڈووکیٹ (۲۰۱۳) قانون دان اقبال، ص ۲۱۲

> انگریزی مضمون لکھا تھا جو یہاں ایک جلسے میں پڑھا گیا تھا۔ اِنشاٗاللہ شائع بھی ہو گا۔ مگر بعض لوگوں نے مجھے کافر کہا... ہندوستان میں بالخصوص آج کل بہت سمجھ کر سوچ کر قدم اٹھانا ہو گا۔[1]

11

وسیمہ مبارک کا بیان ہے کہ جاوید کی پیدایش پر ددھیال اور ننھیال کی طرف سے طلائی کنگنوں کی ایک ایک جوڑی ملی تھی۔ وسیمہ نے اُسے چھ سات ماہ کے جاوید کے ہاتھوں اور پیروں میں پہنایا۔ گلے میں سونے کی زنجیر ڈالی جس میں پونڈ لگے ہوئے تھے۔ علامہ نے نرمی کے ساتھ سمجھایا، ''سیما بیٹی! یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ یہ سارے زیورات اُتار دو، جاوید کسی مہاجن کا لڑکا نہیں، ایک غریب کا بیٹا ہے۔''[2]

عبداللہ چغتائی کی والدہ فوت ہو گئیں۔ علامہ نے زمیندار میں خبر پڑھی۔ ۲۴/ اپریل کو اُن کے بڑے بھائی مصوّر عبدالرحمٰن چغتائی کے نام تعزیتی خط لکھا۔[3]

12

مئی کے آغاز تک علامہ نقرس کے درد میں مبتلا ہو چکے تھے۔[4]

بنگال کی صوبائی کانفرنس اس برس ۲/ مئی کو فرید پور میں منعقد ہوئی۔ دیش بندھو چِت رنجن داس نے صدارتی خطبہ دیا۔ ایک دفعہ پھر اپنا موقف دہرایا کہ ہندوستان ایک وفاق ہونا چاہیے جس میں ہر ریاست خود مختار ہو۔ مقصد پوری انسانیت کو متحد کرنا ہو۔[5]

۶/ مئی کو انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کا اجلاس ہوا۔ مولوی فضل الدین صدارت کر رہے تھے۔ علامہ پانچ ووٹوں کے ساتھ جنرل کونسل کے رکن منتخب کیے گئے۔ منشی سید محمد کاظم انجمن

---

[1] مکتوب بنام اکبر شاہ نجیب آبادی ۲۰/ اپریل ۱۹۲۵ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۸۶-۵۸۴

[2] خالد نظیر صوفی، اقبال درونِ خانہ، ص ۵۹۔ مصنف نے اپنی والدہ وسیمہ مبارک سے سن کر روایت کیا۔

[3] مکتوب بنام عبدالرحمٰن چغتائی ۲۴/ اپریل ۱۹۲۵ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۸۶

[4] مکتوب بنام نصیر الدین ہاشمی ۷/ مئی ۱۹۲۵ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۸۷

[5] Bakshi, pp.217-225

کے بانیوں میں سے تھے اور خان بہادر ہو چکے تھے۔ انہیں ستائیس ووٹ ملے جو سب سے زیادہ تھے۔[1]

نصیر الدین ہاشمی کی عمر تیس برس تھی۔ حیدر آباد سے تعلق تھا۔ وہاں تعلیم مکمل کرنے کے بعد مدراس سے منشی فاضل کیا تھا۔ محکمۂ عدلیہ میں کلرک تھے۔ اپنی کتاب علامہ کو بھیجی تھی۔ نقرس کے درد سے افاقہ ہوا تو ۷ مئی کو علامہ نے اپنی رائے بھیجی:

> دکن میں اُردو نہایت مفید کتاب ہے، خصوصاً اس کا پہلا حصہ جو میں نے نہایت غور سے پڑھا ہے۔ اُردو زبان اور لٹریچر کی تاریخ کے لیے جس قدر مسالا ممکن ہو جمع کرنا ضروری ہے۔ غالباً پنجاب میں بھی کچھ پرانا مسالا موجود ہے اگر اس کے جمع کرنے میں کسی کو کامیابی ہو گئی تو مؤرخ اُردو کے لیے نئے سوالات پیدا ہوں گے۔[2]

13

۸۶ے

کلیاتِ اقبال

یعنی

ترجمانِ حقیقت سر ڈکٹر محمد اقبال کے اُردو کلام کا مجموعہ

جس کے ساتھ ان کی (۱) زندگی کے حالات (۲) شاعری کی خصوصیات اور

(۳) تصانیف کی تصریحات میں دیباچہ (۱۳۶) صفحوں پر مشتمل ہے

مرتبہٗ

عالیجناب مولوی محمد عبدالرزاق صاحب ایچ سی ایس

اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ جنرل سلطنتِ آصفیہ

---

[1] انجمن کی قلمی روداد؛ محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶)، اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص۱۷۹

[2] مکتوب بنام نصیر الدین ہاشمی ۷ مئی ۱۹۲۵ء محولہ بالا

مطبوعہ

عماد پریس حیدرآباد دکن

کلیات کا حصہ اول اقبال، اُن کی شاعری اور تصانیف کے بارے میں تھا۔ مولانا عبداللہ العمادی کی تقریظ کے بعد مؤلف کی طرف سے ۱۴۰ر صفحات پر مبنی 'تقریب' اور ۱۳۶ر صفحات پر مبنی 'دیباچہ' تھا۔ حصہ دوم 'مئے دوآتشہ' میں غزلیات، حصہ سوم 'نکات' میں ظریفانہ اشعار، حصہ چہارم 'نقشِ قدرت' میں مناظرِ قدرت سے متعلق منظومات اور حصہ پنجم 'فانوسِ حیات' اور 'شمعِ طُور' میں حقائق و معارف پر مبنی منظومات تھیں۔ کل تین ہزار کے قریب اشعار تھے۔ عمادی نے تقریظ میں لکھا تھا:

> اقبال کا دل وحیِ الٰہی کا آئینہ دار ہے۔ کشفِ غطا نے اس کے سامنے سے زمین و آسمان کے پردے اٹھا دیے ہیں اور اس کو صاف نظر آرہا ہے کہ ۵۰ے ہجری میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نظامی (گنجوی) نے ''مخزنِ اسرار'' میں جو فریاد کی تھی اس چودھویں صدی میں وہ دعا مستجاب ہونے کو ہے۔ توحید کی عنقریب آنے والی عظمت کا نظارہ اس کے روبرو ہے اور وہ محوِ حیرت ہے کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی۔ ہر ایک اسلامی زبان کی شاعری میں یہ خصوصیت اقبال ہی کے لیے ودیعت تھی اور دنیا بھر میں یہی ایک حسان الہند ہے جو گوری شنکر (ایورسٹ) سے لے کر پیرنیز کی چوٹیوں تک اعلائے لوائے نبویؐ کے لیے قوم کو آمادہ کر رہا ہے۔

دیباچے میں عبدالرزاق نے لکھا تھا:

> لوگوں کو عام طور پر شاید یہ بات معلوم نہ ہو کہ ہندوستان کے ہر خطے میں چند اصحاب ایسے موجود ہیں جو یا تو حافظِ اقبال ہیں یا نہایت شوق سے اقبال کا کلام جمع کرتے ہیں۔ میں بھی مدت سے ایک بیاض میں ان کی نظمیں جمع کر رہا تھا۔ اس بیاض کو لوگ مجھ سے مانگ کر لے جاتے تھے اور ان کو فائدہ پہنچانے کی خاطر میں اس کے مستعار دینے میں کبھی تامل نہ کرتا تھا۔ لیکن یہ اتفاق سے کم ہو گئی۔ عجب نہیں جو کسی نے 'در کعبہ بہ دزد اگر بیابی' پر عمل کیا ہو۔ اس میں تقریباً دو سو نظموں کے علاوہ، جن میں غزلیں بھی

شامل تھیں، اور بہت سا بکار آمد مواد تھا۔ غرض یہ کہ جس بیاض میں یہ سارا مواد تھا اس کے کھو جانے اور کسی چھپے ہوئے مجموعے کے نہ ملنے کے باعث نظمیں دوبارہ جمع کرنے لگا مگر اس مرتبہ بہت سا کلام، جو مجھے ازبر تھا، اپنے حافظے سے لکھا۔ تھوڑی مدت میں پھر تقریباً ڈیڑھ سو نظمیں فراہم ہو گئیں۔ مداحانِ اقبال کی خواہش یہ تھی کہ یہی نظمیں ایک مجموعے کی شکل میں چھپ جائیں۔ مولانا عمادی، مولوی نصیر احمد ایم۔اے پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی اور بہت سے دوستوں کی خواہش واصرار میرے قیام والٹیر کے تاثرات اور چند ایسے احباب، جن کی تفصیل یہاں غیر ضروری ہے، خصوصیت کے ساتھ اس مجموعے کی طباعت کے محرک تھے۔[1]

عبدالرزاق نے علامہ سے اجازت طلب نہ کی تھی۔ ۱۱ر مئی کو مہاراجہ کشن پرشاد نے علامہ کو لکھا:

مولوی سید عبدالرزاق صاحب ایچ۔ سی۔ ایس۔ اسسٹنٹ اکاؤنٹنٹ جنرل اس ریاست کے عہدہ داروں میں ایک خاص پایہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے آپ کی اردو نظموں کو یکجا کر کے ان پر ایک دلچسپ مقدمہ لکھا ہے اور یہ مجموعہ خاص کر اہلِ دکن کے لیے مرتب کیا ہے۔ اس کو چھپے ہوئے آٹھ دس مہینے ہو چکے ہیں۔ دکن کے علمی حلقے میں اس کی اشاعت ضروری سمجھی گئی ہے۔ "بانگِ درا" کے ساتھ اس کے شائع ہونے کی خواہش ہے۔

مولوی صاحب نے مجموعہ چھپوانے سے پہلے اجازت کے لیے آپ کو خط لکھا تھا، لیکن وہ ڈاک میں نہیں ڈالا گیا تھا کہ مولوی صاحب علیل ہو گئے۔ اگر دیکھا جائے تو انہوں نے ایک مفید کام کیا ہے۔ آپ اپنے مصالح کے خلاف نہ سمجھیں تو کیا عجب ہے کہ ان کی تمنا پوری ہو۔ اجازت دیں۔ کتاب چھپ چکی ہے اور محتاجِ اشاعت ہے...[2]

---

[1] عبدالرزاق، کلیاتِ اقبال۔

[2] قریشی (۱۹۸۶) اقبال بنام شاد، ص ۳۸۶

اِس خط سے معلوم ہوتا ہے کہ کلیاتِ اقبال کی طباعت جولائی اور ستمبر ۱۹۲۴ء کے درمیان ہوئی۔ اشاعت مئی ۱۹۲۵ء تک بھی نہ ہوئی تھی۔ لاہور کے ایک قاری نے بعد میں لکھا کہ بانگِ درا سے پہلے کلیات کی اشاعت کی خبر پڑھی۔ ایک نسخہ بذریعہ وی پی منگوایا۔ اُس کے فوراً بعد بانگِ درا آئی۔[1] یہ بھی لکھا گیا ہے کہ بانگِ درا کی اشاعت سے "کچھ عرصہ پہلے" کلیات شائع ہوئی۔[2] بظاہر یہ درست نہیں لگتا۔[3] کشن پرشاد نے لکھا ہے کہ کتاب "شائع ہونے کی خواہش ہے" اور "محتاجِ اشاعت" ہے۔ بعید از قیاس ہے کہ کتاب آٹھ دس ماہ سے فروخت ہو رہی تھی مگر شاد بیخبر تھے۔ ایک خیال یہ ہے کہ علامہ "سوچ ہی رہے تھے" کہ شاد کو لکھیں جب عبدالرزاق نے شاد کو اپنے حق میں ہموار کر لیا۔[4] کاپی رائٹ کی خلاف ورزی پر علامہ کا آٹھ دس ماہ تک سوچتے رہنا اور کاروائی نہ کرنا قرینِ قیاس نہیں۔ شاد نے جو لکھا وہی درست معلوم ہوتا ہے۔ حیدرآباد دکن میں برطانوی ہند نے کاپی رائٹ کے قانون کا اطلاق نہیں ہوتا تھا۔ کلیات کی فروخت رکوانا علامہ کے لیے مشکل تھا۔ اجازت دینے میں قباحت تھی۔ مولوی ممتاز علی کے ساتھ بانگِ درا کے دو ہزار کے اڈیشن کی فروخت کا معاہدہ تھا۔ علامہ نے سر اکبر حیدری کو خطوط لکھے۔ وہ حیدرآباد دکن میں مالیات کے شعبے کے مدارالمہام تھے۔[5]

14

مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں اسلامیات (Islamic Studies) کا نصاب علامہ کے اُستاد سر ٹامس آرنلڈ

---

[1] شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۲۲۲ پر سیارہ ڈائجسٹ لاہور اپریل ۱۹۶۵ء سے سراج نظامی کا بیان۔ ممکن ہے نظامی کی یادداشت نے غلطی کی ہو۔ بانگِ درا کے بعد کلیات خریدی ہو۔ یا پھر دوسرے اڈیشن کی بانگِ درا خریدی ہو۔ نظامی نے لکھا کہ علامہ نے "'کلیاتِ اقبال' کے ناشروں کے خلاف دعویٰ دائر کر دیا۔" یہ درست نہیں۔

[2] بشیر احمد ڈار، انوارِ اقبال، ص ۳۱

[3] حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے ضروری ہو گا کہ معاصر اخبارات کا بغور مطالعہ کر کے تسلی کر لی جائے کہ ستمبر ۱۹۲۴ء میں بانگِ درا کی اشاعت سے پہلے کلیات کی اشاعت کی کوئی خبر شائع نہ ہوئی۔

[4] قریشی (۱۹۸۶) اقبال بنام شاد، ص ۳۹۰؛ مرتب نے کوئی حوالہ پیش نہیں کیا ہے۔

[5] جولائی تک بھیجے جا چکے تھے۔ مکتوب سر اکبر حیدری بنام اقبال ۱۰ / اگست ۱۹۲۵ء سے معلوم ہوتا ہے۔

سے تیار کروایا گیا تھا۔ منصوبہ یہ تھا کہ دارالعلوم دیوبند اور ندوۃ العلمأ لکھنؤ سے بہترین طلبہ لے کر اُنہیں یہ نصاب پڑھایا جائے۔ صاحبزادہ آفتاب احمد خاں نے قوم کے سامنے پیش کر کے تجاویز طلب کیں۔ علامہ سے درخواست کی کہ وہ لاہور میں پروفیسر محمد شفیع سے بھی مشورہ کریں۔ خود علامہ نے تیرہ برس قبل 'ملتِ بیضا پر عمرانی نظر' والے مقالے میں دینی مدرسوں کے ساتھ اشتراک کی تجویز پیش کی تھی۔ لیکن سوال یہ تھا کہ دینی مدرسوں کے طلبہ نئی تعلیم حاصل کرنے کے بعد کیا کریں گے؟

علامہ سمجھتے تھے کہ دورِ حاضر میں مسلمانوں کے زاویۂ نگاہ میں وسعت پیدا ہوئی ہے۔ اس کی وجہ انسانیہ (humanism) کی تحریک ہے۔ اس لحاظ سے قوم کی روحانی ضروریات بھی تبدیل ہوئی ہیں۔ دینیات کی نئی تشکیل کی ضرورت ہے۔ سر سید احمد خاں کی بصیرت حیرت انگیز تھی۔ انہوں نے اس کام کا آغاز کیا۔ وہ صرف اس لیے آگے نہ بڑھ سکا کہ قدیم فلسفے پر قائم تھا۔ یہ ظاہر تھا کہ اب علامہ جدید فلسفے میں مناسب اصول اخذ کر کے اسی کام کی تکمیل کر رہے تھے۔ گزشتہ دسمبر میں اجتہاد پر مقالہ اسی سلسلے کی کڑی تھا۔ دینیات کی نئی تشکیل سے مذہب کو خطرہ نہ تھا۔ روایت پر مبنی نقطۂ نگاہ سے پیچھا چھڑانے کی ضرورت تھی:

> But the spiritual needs of a community change with the expansion of that community's outlook on life. The change in the position of the individual, his intellectual liberation and infinite advance in natural sciences have entirely changed the substance of modern life so that the kind of scholasticism or theological thought which satisfied a Muslim in the Middle Ages would not satisfy him today. This does not mean an injury to the spirit of religion. But it certainly contradicts traditional view. If rejuvenation of Muslim life and the regaining of original depths are desirable then a rebuilding of theological thought is absolutely necessary. The vision of Sir Syed Ahmad Khan on this point, as on many others, was almost prophetic. As you know he himself undertook the task, which did not, and could not, prosper because it was mainly based on the philosophical thought of a bygone age.

آرنلڈ کا تجویز کردہ نصاب روایت پر قائم ہونے کی وجہ سے فرسودہ تھا۔ علامہ نے تجویز کیا کہ اسلامیات کی تدریس کا بنیاد مقصد چار طرح کے ماہرین تیار کرنا ہو:

۱ ایسے علمائے دین اور مولوی تیار جنہیں دورِ حاضر کے تقاضوں کا ادراک ہو

۲ اسلامی ادبیات اور فلسفہ کے ایسے ماہرین جو افکار کے جینیاتی مطالعے کے ذریعے دکھا سکیں کہ یورپ کا موجودہ علم اسلامی ثقافت کا تسلسل ہے ("to trace genetically the continuity of intellectual life between Muslim culture and modern knowledge")؛ جب تک یہ کام نہ ہو گا، مسلم معاشرہ جدید علوم کو جذب کرنے کے قابل نہ ہو سکے گا۔

۳ اسلامی تاریخ، فنون، عام ثقافت اور تہذیب کے ماہرین

۴ ایسے ماہرین جو اسلام کے فقہی ادب پر تحقیق کرنے کے قابل ہوں

اِن مقاصد کی تکمیل کے لیے ضروری تھا کہ اسلامیات تین بنیادی شعبوں میں تقسیم کی جائے: دینیات (theology)، فقہ (law) اور سائنس۔ اسلامیات کا طالب علم اِن میں سے انتخاب کرے۔ پھر اُسے جدید فلسفے اور سائنس کی اچھی خاصی تعلیم دی جائے۔ اُس کے بعد آرنلڈ کے نصاب کے صرف وہ حصے پڑھائے جائیں جو اُس کے شعبے کے لیے ضروری ہوں۔ جو طلبہ تینوں میں سے کسی شعبے کے قابل نہ ہوں، آرنلڈ کا مکمل نصاب پڑھیں۔ اس نصاب میں اسلامی فنون اور تعمیرات کا اضافہ بھی ضروری ہے۔ دینی مدرسوں کے طلبہ کے علاوہ علیگڑھ کے اپنے طلبہ بھی یہ نصاب پڑھ سکتے ہیں۔ نیز اسلامی فکر، ادبیات، فنون، تاریخ اور دینیات کا مطالعہ کرنے والے طلبہ کے لیے انگریزی ہی نہیں بلکہ جرمن اور فرانسیسی کی شدھ بدھ بھی ضروری ہے۔

کامیاب طلبہ یونیورسٹی کے فیلو بنا دیئے جائیں تاکہ وہ تحقیقی کام جاری رکھ سکیں۔ اسلامی دینیات، کلام اور تفسیر پر تازہ مواد لیکچرز کی صورت میں پیش کریں۔ البتہ فقہ کا شعبہ منتخب کرنے والے بعض طلبہ وکالت کا پیشہ بھی اختیار کر سکتے ہیں جس کے لیے انہیں تعلیم کے دوران وکالت کا امتحان بھی پاس کروایا جا سکتا ہے۔ ہندوستان میں اسلامی فقہ کی حالت خراب ہے اور صرف قانون ساز اداروں کے ذریعے سُدھر سکتی ہے۔ یہ آخری نکتہ علامہ کا سیاسی رجحان بھی واضح کرتا تھا:

> The present state of the administration of Muhammedan Law in this country is simply deplorable and there are difficulties which can be solved through legislative agencies only.

علامہ نے اپنی تجاویز ٹائپ کروائیں۔ پروفیسر محمد شفیع سے ملاقات ہوئی۔ اُنہوں نے دینیات کی تعلیم دینے کی حمایت نہ کی۔ اُن کے نزدیک صرف اسلامی فلسفہ وغیرہ کی تعلیم دینی چاہئیے تھی۔ اس کے لیے علیگڑھ کے گریجویٹوں کو عربی کی تعلیم دے کر تیار کیا جا سکتا تھا۔ دینی مدرسوں کے طلبہ عربی ضرور جانتے ہیں مگر اُن کی سوچ بہت محدود ہوتی ہے۔ علامہ اتفاق نہ کر سکے۔ ۴/ جون کو پروفیسر شفیع کی رائے بھی صاحبزادہ کے نام خط میں درج کر دی۔[1]

15

نغمہ زار

مجموعۂ سخن ابوالاثر حفیظ جالندھری

[طبع اول ۱۹۲۵ء]

ارشادِ گرامی

[اُستادِ مصنف مولانا شیخ غلام قادر گرامیؔ]

---

[1] مکتوب بنام آفتاب احمد خاں ۴/ جون ۱۹۲۵ء؛ برنی (۱۹۹۱) ص۵۹۶-۵۸۹۔ نیز اقبال میوزم لاہور میں ٹائپ شدہ خط کا عکس۔ ڈاکٹر محمد رفیع الدین، جو اقبال اکادمی پاکستان کے ابتدائی ناظمین میں سے تھے، علامہ کے فلسفۂ خودی کو "کائنات کا آخری فلسفہ" (حکمتِ اقبال، ص۵۸-۵۷) کہنے کے باوجود مُصر رہے کہ "اسلامی تحقیق" صرف قرآن و حدیث اور اُن کے متعلق مسلم مصنفین کی تصانیف تک محدود ہو۔ باقی سب خارج کر دیا جائے، بالخصوص طب، طبعیات، فلکیات، کیمیا، لسانیات، تاریخ، فنون اور ادبیات پر مسلمانوں کی تحریریں؛ دیکھیے Rafiuddin (2000), p.12۔ دینیات کے بارے میں جدت پسند نقطۂ نگاہ والے مسلم دانشوروں، مثلاً ڈاکٹر جاوید اقبال، ڈاکٹر فضل الرحمٰن، غلام احمد پرویز، جاوید غامدی وغیرہ نے بھی افکار کے "جینیاتی مطالعے" کے ذریعے اسلام اور جدید علوم کا تسلسل دکھانے پر توجہ نہ دی۔ نتیجتاً شکایت پیدا ہوئی کہ مسلم معاشرہ نے اُن کی جدت پسندی کی قدر نہ کی مگر علامہ نے پہلے ہی بتایا تھا کہ اُس جینیاتی مطالعے کے بغیر مسلم معاشرہ نئے علوم کو جذب نہ کر سکے گا۔ دوسری طرف سید حسین نصر اور ہمنوا اسلامی ثقافت اور جدید علوم کے درمیان اُس گہرے تعلق کی تکذیب میں سرگرم ہیں جسے علامہ اسلامیات کے مطالعے کی بنیاد بنانا چاہتے تھے۔

فصاحت مجسم، بلاغت مصوّر — کلامِ حفیظ است اللہ اکبر
معانی دلآویز الفاظ دلکش — کلامِ حفیظ است یا سلکِ گوہر
معانی در آغوشِ الفاظ پنہاں — بآب ست ماہی بآتش سمندر
معانی در الفاظ پنہاں و پیدا — بہم کردہ فکرش مگر شیر و شکّر
فصیح معظم بلیغ مکرّم — حفیظِ سخن گو، حفیظِ سخنور
بہ فہرستِ معینست نامش مقدم — بہ بزمِ گرامی کلامش موخر
بطرز آفرینی طبع بلندش — بود آسماں کارگاہِ محقر

گرامی سحر گفت سالک بگوشم
زبانِ حفیظ است یا موجِ کوثر

دیباچہ

[از پطرس۔ اقتباس]

جالندھر کے نغمہ پرور شہر نے حفیظ نامی ایک ساحر پیدا کیا ہے جو کچھ مدّت سے لاہور کے مشاعروں اور ہندوستان کے ادبی حلقوں کو مبہوت کر رہا ہے۔ جس کے قلم کی ایک بے پروا جنبش سے موسیقی کی روح کانپ کر بیدار ہو جاتی ہے۔ قدرت کی رنگینیاں تصویر بن بن کر آنکھوں کے سامنے آتی ہیں اور غائب ہو جاتی ہیں اور لطافت شاعری کا جھلملاتا ہوا لباس پہن کر رقص کرنے لگ جاتی ہے...

یہ اُس کے کلام کا مجموعہ ہے۔ چند ورق ہیں۔ خشک طبیعتوں کو جابجا اس میں ''فن'' کے نقائص اور بے عنانیاں نظر آئیں گی۔ اہلِ ذوق دیکھیں گے اور جانیں گے کہ ایک وارفتہ مزاج عشق کے اتھاہ سمندر میں خود بھی کس طرح ڈگمگاتا ہے اور دوسروں کو بھی کس طرح ہلاتا ہے۔ حفیظ ایک شاعر ہے جس کے قدم پامال رستے سے ادھر اُدھر جا پڑتے ہیں لیکن یہ ایک گم کردہ راہ کی آوارگی نہیں۔ ایک مست کی لغزشیں ہیں...

چاند کی سیر

عطربیز لالہ زار
نغمہ ریز جوئبار
حشر خیز آبشار
کیفِ موجِ بیقرار
چاندنی میں کوہسار
تھا بہار در بہار
میں یہ شانِ کردگار
دیکھتا چلا گیا

شہر اور بن خموش
دشت اور چمن خموش
تن خموش من خموش
سب جہازراں خموش
کشتیِ رواں خموش
بحرِ بیکراں خموش
اور میں بھی واں خموش
دیکھتا چلا گیا

دُور اور قریب چپ
ہر طرف عجیب چپ
خوشنما مہیب چپ
کائنات پر سکوت
سارا خشک و تر سکوت
شور کا اثر سکوت
کچھ نہیں مگر سکوت
دیکھتا چلا گیا

وہ کنارے آب کی
محفلیں شراب کی
مستیاں شباب کی
خواہشیں ثواب کی
کاہشیں عذاب کی
وہم اور خواب کی
زندگی حباب کی
دیکھتا چلا گیا

حسن شانِ ناز میں
غرق احتراز میں
عاشقی نیاز میں
اُس کی خودفروشیاں
اور سخت کوشیاں
اس طرف خموشیاں
صبر گرم جوشیاں

دیکھتا چلا گیا

پاکباز نازنیں وقف آہِ آتشیں مرگ و یاس در کمیں

اِک جوانِ خودپرست بادۂ خودی سے مست شوخ اور درازدست

میں یہ سب بلند و پست

دیکھتا چلا گیا

رنجشیں، کدورتیں برہمی کی صورتیں

ساری آشنائیاں ظاہری صفائیاں باطنی برائیاں

صلح اور لڑائیاں

دیکھتا چلا گیا

دوست کے فراق میں جوشِ اشتیاق میں پائے چست و چاق میں

گردشوں کو باندھ کر محوِ کلفتِ سفر ایک جوانِ بے جگر

دل بھر آیا مگر

دیکھتا چلا گیا

بادشاہ کا مزار جس سے عبرت آشکار بیکسی بھی سوگوار

اور گدا کی قبر پر جمع سیکڑوں بشر میں یہ فقر کا اثر

اور مآلِ مال و زر

دیکھتا چلا گیا

ابھی تو میں جوان ہوں

ہوا بھی خوشگوار ہے گلوں پہ بھی نکھار ہے ترنّمِ ہزار ہے بہار پُربہار ہے

کہاں چلا ہے ساقیا　اِدھر تو لوٹ اِدھر تو آ　ارے یہ دیکھتا ہے کیا　اٹھا سُبو، سُبو اٹھا
سبو اُٹھا، پیالہ بھر　پیالہ بھر کے دے اِدھر　چمن کی سمت کر نظر　سماں تو دیکھ بیخبر
وہ کالی کالی بدلیاں　اُفق پہ ہو گئیں عیاں　وہ اک ہجومِ میکشاں　ہے سوئے میکدہ رواں
یہ کیا گماں ہے بدگماں　سمجھ نہ مجھ کو ناتواں　خیالِ زُہد ابھی کہاں　ابھی تو میں جوان ہوں

عبادتوں کا ذکر ہے　نجات کی بھی فکر ہے　جنون ہے ثواب کا　خیال ہے عذاب کا
مگر سنو تو شیخ جی　عجیب شے ہیں آپ بھی　بھلا شباب و عاشقی　الگ ہوئے بھی ہیں کبھی
حسین جلوہ ریز ہوں　ادائیں فتنہ خیز ہوں　ہوائیں عطربیز ہوں　تو شوق کیوں نہ تیز ہوں
نگارہائے فتنہ گر　کوئی اِدھر کوئی اُدھر　ابھارتے ہوں عیش پر　تو کیا کرے کوئی بشر
چلو جی قصہ مختصر　تمہارا نقطۂ نظر　درست ہے تو ہو مگر　ابھی تو میں جوان ہوں

یہ گشت کوہسار کی　یہ سَیر جوئبار کی　یہ بلبلوں کے چہچہے　یہ گلرخوں کے قہقہے
کسی سے میل ہو گیا　تو رنج و فکر کھو گیا　کبھی جو بخت سو گیا　وہ ہنس گیا وہ رو گیا
یہ عشق کی کہانیاں　یہ رس بھری جوانیاں　اُدھر سے مہربانیاں　اِدھر سے لَن ترانیاں
یہ آسمان یہ زمیں　نظارہ ہائے دلنشیں　انہیں حیات آفریں　بھلا میں چھوڑ دوں یہیں
ہے موت اس قدر قریں　مجھے نہ آئے گا یقیں　نہیں نہیں ابھی نہیں　ابھی تو میں جوان ہوں

نہ غم کشود و بست کا　بلند کا نہ پست کا　نہ بود کا نہ ہست کا　نہ وعدۂ اَلَست کا
اُمید اور یاس گم　حواس گم، قیاس گم　نظر سے آس پاس گم　ہمہ بجز گلاس گم
نہ مے میں کچھ کمی رہے　قدح سے ہمدمی رہے　نشست یہ جمی رہے　یہی ہماہمی رہے
وہ راگ چھیڑ مُطربا　طرب فزا، الم رُبا　اثر صدائے ساز کا　جگر میں آگ دے لگا
ہر ایک لب پہ ہو صدا　نہ ہاتھ روک ساقیا　پلائے جا پلائے جا　ابھی تو میں جوان ہوں

کرشن کنّہیا

اے دیکھنے والو اِس حُسن کو دیکھو اِس راز کو سمجھو
یہ نقشِ خیالی
یہ فکرتِ عالی
یہ پیکرِ تنویر
یہ کرشن کی تصویر
معنی ہے کہ صورت
صنعت ہے کہ فطرت
ظاہر ہے کہ مستور نزدیک ہے یا دُور یہ نار ہے یا نُور
دنیا سے نرالا یہ بانسری والا گوکل کا گوالا
ہے سحر کہ اعجاز
کھلتا ہی نہیں راز
کیا شان ہے واللہ
کیا آن ہے واللہ
حیران ہوں کیا ہے
اِک شانِ خدا ہے
بتخانے کے اندر خود حُسن کا بُت گر بُت بن گیا آ کر
وہ طُرفہ نظارے یاد آ گئے سارے جمنا کے کنارے
سبزے کا لہکنا
پھولوں کا مہکنا

گھنگھور گھٹائیں
سرمست ہوائیں
معصوم اُمنگیں
اُلفت کی ترنگیں

وہ گوپیوں کے ساتھ ہاتھوں میں دیے ہاتھ رقصاں ہوا برج ناتھ
بنسی میں جو لَے ہے نشہ ہے نہ مے ہے کچھ اور ہی شے ہے

اِک روح ہے رقصاں
اِک کیف ہے لرزاں
اِک عقل ہے مے نوش
اِک ہوش ہے مدہوش
اِک خندہ ہے سیّال
اِک گریہ ہے خوشحال

اِک عشق ہے مغرور اِک حُسن ہے مجبور اِک سحر ہے مسحور
دربار میں تنہا لاچار ہے کرشنا آ شیام اِدھر آ

سب اہلِ خصومت
ہیں درپئے عزت
یہ راج دُلارے
بزدل ہوئے سارے
پردہ نہ ہو تاراج
بیکس کی رہے لاج

آ جا میرے کالے بھارت کے اُجالے دامن میں چھُپا لے
وہ ہو گئی اَن بن وہ گرم ہوا رَن غالب ہے دریودھن
وہ آگئے جگدِیش
وہ مٹ گئی تشویش
اَرجن کو بلایا
اُپدیش سنایا
عمزاد کا غم کیا
اُستاد کا غم کیا
لو ہو گئی تدبیر لو بن گئی تقدیر لو چل گئی شمشیر
سیرت ہے عدوسوز صورت نظرافروز دل کیفیت اندوز
غصے میں جو آ جائے
بجلی ہی گرا جائے
اور لطف پر آئے
تو گھر بھی لُٹائے
پریوں میں ہے گلفام
رادھا کے لیے شیام
بلرام کا بھیا متھرا کا بسیّا بندرا میں کنھیا
بَن ہو گئے ویراں برباد گلستاں سکھیاں ہیں پریشاں
جمنا کا کنارا
سنسان ہے سارا

طوفان ہیں خاموش
موجوں میں نہیں جوش
لَو تجھ سے لگی ہے
حسرت ہی یہی ہے
اے ہند کے راجا اِک بار پھر آ جا دُکھ درد مِٹا جا
ابر اور ہوا سے بلبل کی صدا سے پھولوں کی ضیا سے
جادو اثری گم!
شوریدہ سری گم!
ہاں تیری جدائی
متھرا کو نہ بھائی
تو آئے تو شان آئے
تو آئے تو جان آئے
آنا نہ اکیلے ہوں ساتھ وہ میلے سکھیوں کے جھمیلے[1]

حفیظ کا بیان ہے کہ علامہ نے کہا، "حفیظ جی، تمہارے شعروں میں جو سادگی اور صفائی پائی جاتی ہے، اُس پر یقیناً مولانا گرامی کی اُستادانہ توجہ کا اثر ہے۔ گرامی کا تم پر یہ بہت بڑا احسان ہے۔" لکھنؤ سے اودھ پنچ حفیظ کی نظم 'فرصت کی تلاش' پر تنقید کر رہا تھا۔ حفیظ نے "منہ توڑ جواب" دینے کا ارادہ کیا۔ علامہ نے کہا، "جواب نہیں دینا چاہیے۔ جب کوئی جینئس پیدا ہوتا ہے تو لوگ اُس سے یہی برتاؤ کرتے ہیں۔"[2]

---

[1] حفیظ جالندھری، نغمہ زار، ص ۵۴-۴۸

[2] پروفیسر محمد منور، میزانِ اقبال، ص ۱۶۸، ۱۵۹-۱۵۸

16

چت رنجن داس بیمار تھے۔ آرام کی غرض سے مغربی بنگال کے مشہور پر فضا مقام دارجیلنگ گئے۔ ۱۶/ جون کو وفات پا گئے۔ جوہرؔ نے ۱۸/ جون کے ہمدرد میں تعزیتی مضمون 'آہ! رخصت جہاں سے داس ہوا' میں لکھا:

> داس کی موت میرے نزدیک ہماری سب سے بڑی ابتلا ہے۔ داس نے جو سلوک مسلمانوں کے ساتھ کیا، اُسے کوئی شریف مسلمان نہیں بھول سکتا لیکن مرنے سے پہلے داس نے انگریزی قوم کو بھی صاف بتلا دیا کہ وہ کسی قوم و مذہب کے ساتھ ناانصافی کا روادار نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ داس مرنے سے پہلے سب کا قرضہ بے باق کر چکا۔ اب نہ اُس کے ذمہ کسی ہندو کی کوئی رقم آتی ہے نہ کسی مسلمان کی، نہ کسی ہندوستانی کی نہ کسی انگریز کی لیکن اُس کا قرضہ ہم سب کے ذمہ باقی ہے۔ خدا ہم سب کو توفیق دے کہ جس طرح وہ اپنے قرضہ سے سبکدوش ہوا ہم بھی اُس کے قرضہ سے سبکدوش ہوں۔ [1]

۲۹/ جون کو ترکی میں دریائے دجلہ کے کنارے دیار بکر میں مذہبی رہنما شیخ سعید اور چھیالیس ساتھیوں کو پھانسی دی گئی۔ چند ماہ پہلے مسلح بغاوت کی تھی۔ ترکی کے جنوب مشرق میں بعض شہروں پر حملے کیے تھے۔ مقدمے کے دوران شیخ نے کہا کہ اُن کا مقصد شریعت پر مبنی اسلامی نظام قائم کرنا تھا۔ تعجب کہ ایسی مقدس تحریک کی بنیاد نسل پرستی پر تھی۔ مددگار کمیونسٹ اور علیحدگی پسند تھے۔

شریعت، الحاد اور نسل پرستی کے گٹھ جوڑ نے ترک قیادت کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ غازی مصطفیٰ کمال پاشا نے ہمیشہ کہا تھا کہ اُن کی حکومت صرف مادیت کی طرف مائل ہے، الحاد کی طرف نہیں۔ مساجد کے منبروں سے اسلام کی فضیلت پر وعظ کیے تھے۔ لوگوں کو دعوت دی تھی کہ مساجد میں ملکی امور پر بھی گفتگو کیا کریں۔ ترکی میں مجسمے نصب کرتے ہوئے بھی کہا کہ اسلام نے مجسمہ سازی کی مذمت اس لیے کی کہ صدیوں سے بت پرستی کے عادی ذہن دوبارہ بتوں کو سجدہ نہ کرنے لگیں اور یہ اندیشہ اب اسلام کے صدیوں کے اثرات کی وجہ سے دُور ہو چکا ہے۔ مدرسوں کے نظام کو ختم کرتے

---

[1] سید محمد شاہ قادری (۱۹۹۸)، مولانا محمد علی جوہر: آپ بیتی اور فکری مقالات

ہوئے کہا کہ دنیا کے تیس کروڑ سے زیادہ مسلمان صرف اس لئے غیروں کے سامنے ذلیل ہو رہے ہیں کہ اُن کے پاس "قومی تعلیم" کے نظام نہیں ہیں۔

اب تازہ خانہ جنگی نے نئی حکمتِ عملی پر مجبور کیا۔ مشرقی صوبوں میں صوفیوں کے تکیے اور زاویے بند کر دیئے گئے۔ نئے قوانین کی ضرورت محسوس ہوئی جو قدامت پرستی کے رومان کو ختم کر کے تخیل کا رُخ مستقبل کی طرف موڑ دیں۔[1]

علامہ کی بیاض کے بعض اندراجات اس زمانے کے معلوم ہوتے ہیں۔ ابتدائی مصرعوں کے مفہوم یوں ہیں:

- آؤ کہ مشرق والوں نے ایک نیا بُت بنایا ہے۔
- مجھے عشق پر ناز ہے کہ اسے اپنے مٹ جانے کا غم نہیں ہے۔
- میرے دلِ بے تاب پر ساقی نے مئے ناب ڈال دی ہے۔
- اے ساقی! اِس میخانے میں مجھے کوئی محرمِ راز نہیں ملتا۔
- آپ بتایے کہ دردمندوں کے جہاں سے بھلا آپ کا کیا واسطہ ہے؟
- اگر نظارہ بیخود کر دیتا ہے تو حجاب ہی بہتر ہے۔
- میری روح زمانے کے دوش پر بہتی ہے۔
- تم دنیا کا مطالعہ کرتے ہو مگر خود اپنے آپ کو نہیں دیکھتے۔
- شریعت کی رسم وراہ کے بارے میں میں بجز اس کے اور کچھ دریافت نہیں کر پایا کہ صرف عشق کا منکر ہی کافر و زندیق ہوتا ہے۔
- یہ دل جو آپ نے مجھے عطا کیا ہے، یقیں سے لبریز ہو جائے!
- ہوس والوں سے عشق کی رمز بیان نہیں کی جا سکتی۔
- وہ بھی کیا دن تھے جب میں رُباب اور بنسی کے ساتھ شراب نوش کرتا تھا!

---

[1] Andrew Mango (2000). *Ataturk,* pp.412-413, 422-426, .

- میں اُن راتوں کے حادثات سے بالکل نہیں ڈرتا...
- دیارِ شوق کہ جس کی خاک ہماری درد آشنا ہے۔
- تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو؟
- ہماری روتی ہوئی آنکھ نے ہمارے سینے پر ستارے برسائے ہیں۔
- مشرق کہ جس کی کمندِ خیال میں آسمان بھی گرفتار ہے...
- پرانی شراب اور جوان محبوب کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔
- اِس دلِ بے قرار کو تڑپنے کی مہلت بھی نہ دیجیے۔
- میری روح زمانے کے دوش پر بہتی ہے۔
- شاید اس صحرا سے کوئی کارواں گزر رہا ہے۔
- ذرے کو چنگاری کی طرح اپنے آپ میں جلنا سکھا دیجیے۔
- سارے جہاں کی خواہشات کو محض ایک حرف میں بیان کیا جا سکتا ہے۔
- شاید اس صحرا سے کوئی کارواں گزر رہا ہے۔
- آپ کب تک اپنے چہرے پر صبح و شام کا پردہ ڈالے رکھیں گے؟
- خودی لوگوں سے میل ملاپ میں گرفتار ہے۔ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ ابھی نارسا ہے۔
- میں نے تمہاری آنکھ کی پتلی کو نظر بخشی ہے۔
- ہم اپنے زمانے کے پیچاک میں گرفتار ہیں اور سانسیں گن رہے ہیں۔
- میں نے فریاد کے لیے لب نہیں کھولے کہ نالہ بے اثر ہے۔
- میں نے فلسفی کو چھوڑ دیا کہ اُس کے پاس خبر کے سوا کچھ نہیں ہے۔[1]
- میری سانس کو بادِ بہار کی سی صفت عطا ہوئی ہے۔
- آپ نے میرے دل کو جو تسلی دی تھی اُس سے اِس کی تڑپ ختم نہیں ہوئی۔

---

[1] بیاض زبورِ عجم میں ۲ شعر پر مشتمل ہے۔ ''(حصہ اول ٹائٹل پیج)'' لکھا گیا۔ پھر پوری نظم قلمزد کر دی۔ متروک ہے۔

- میں دروازے کے باہر نہیں رہا بلکہ گھر کے اندر کی بات بتائی ہے۔
- تم سدرہ کے درخت کی شاخ ہو۔ چمن کا خاروخس مت بنو۔
- اُسے چھوڑ دو جس نے نظارہ نہیں کیا اور خبر کے سوا کچھ نہ دیا۔

17

نیرنگِ خیال کے سالنامے میں پیامِ مشرق پر نکلسن کے تبصرے کا اُردو ترجمہ شائع ہوا۔ عبداللہ چغتائی نے کیا تھا۔ حواشی علامہ اقبال کی رہنمائی میں لکھے گئے۔ اس کی تردید کی تھی کہ علامہ کی فکر پر نیٹشے کا اثر ہے: ''دو بڑے آدمی اپنے کسی جزویات میں ایک دوسرے سے اتفاقیہ متفق ہو جائیں جس کے نتیجے میں کلی اختلاف ہو، تو ان دونوں کو ایک دوسرے کا کلی طور پر خوشہ چیں یا متشابہ نہیں کہہ سکتے۔''[1]

آنجہانی جرمن فلسفی فریڈرک البرٹ لینگ (Frederick Albert Lange) کی مادیت پرستی کی تاریخ (*History of Materialism*) کا نیا ایڈیشن شائع ہوا۔ برٹرینڈ رسل کا مقالہ تعارف کے طور پر شامل تھا، 'مادیت، ماضی اور حال'۔ کائنات کے بارے میں مادیانہ رویے پر تنقید کی تھی:

> The theory of Relativity by merging time into spacetime has damaged the traditional notion of substance more than all the arguments of the philosophers. Matter, for common sense, is something which persists in time and moves in space. But for modern relativity-physics this view is no longer tenable. A piece of matter has become not a persistent thing with varying states, but a system of inter-related events. The old solidity is gone, and with it the characteristics that to the materialist made matter seem more real than fleeting thoughts.[2]

موسمِ گرما میں انگریز ریاضی دان اور فلسفی الفریڈ نارتھ وائٹ ہیڈ (Alfred North Whitehead) کی سائینس اور جدید دنیا (*Science and the Modern World*) شائع ہوئی۔ اُس کے مطابق مادہ ایک حیاتیاتی وجود (organism) تھا۔ عالمِ فطرت متحرک اور رواں تھا۔ انسانی سوچ اسے سمجھنے کے

---

[1] چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۱۶۱-۱۶۲، ۱۳۸

[2] یہ اقتباس تشکیلِ جدید کے دوسرے خطبے میں استعمال کیا گیا ہے؛ Iqbal (1934), *Reconstruction*

لیے غیر متحرک ٹکڑوں میں تقسیم کرتی تھی۔ زمان و مکان کے تصوّرات وجود میں آتے تھے۔ علامہ کے نزدیک یہ تصوّر مسلمانوں کے لیے آئن سٹائن کے نظریے سے زیادہ پرکشش ہو سکتا تھا۔[1]

آکسفورڈ یونیورسٹی کے سابق وائس چانسلر لیوس رچرڈ فارنل (Lewis Richard Farnell) نے اپنے گفورڈ لیکچرز (Gifford Lectures)، صفاتِ خداوندی (*The Attributes of God*) میں لکھا کہ مذاہبِ عالم نے خدا کو فرد کی بجائے کسی مبہم اور ہر جگہ موجود عنصر کے طور پر پیش کیا ہے، جیسے ایتھر یا روشنی۔ زرتشت نے کہا کہ یزداں کا جسم نور کی مانند ہے اور اُس کی روح سچائی کی مانند ہے اور قرآن میں ہے کہ خدا آسمانوں اور زمین کا نُور ہے۔[2] علامہ اتفاق نہ کر سکے۔ فارنل نے آیۂ نُور کے صرف ایک حصے کا ترجمہ کیا تھا۔ اسی سے متصل عبارت یوں تھی:

اللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ؕ مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ ؕ الْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ ؕ الزُّجَاجَةُ كَأَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ

اللہ آسمانوں اور زمین کا نور ہے۔ اُس کے نور کی مثال ایسی ہے جیسے طاق میں چراغ ہو، چراغ شیشے کی قندیل میں ہے، قندیل گویا کہ موتی کی طرح چمکتا ہوا ستارا ہے...[3]

یہاں نور کا استعارہ خدا کی انفرادیت کی نفی نہیں کرتا۔ عبارت میں نُور شعلے پر مرتکز ہے۔ شعلہ شیشے میں ہے۔ شیشہ ستارے کی مانند ہے، جو مخصوص اور متعین وجود کا حامل ہوتا ہے۔ اسلامی، مسیحی اور یہودی صحف میں جہاں خدا کے لیے نور کا لفظ استعمال کیا گیا، اب اُس کی تعبیریوں کرنی چاہیے کہ جدید سائنس کی رُو سے روشنی ہی وہ شے ہے جس کی رفتار میں اضافہ ممکن نہیں ہے۔ یہی بات اسے ذاتِ خداوندی کا استعارہ بناتی ہے۔ اس طرح یہ اشارہ خدا کے غیر متعین ہونے کی طرف نہیں بلکہ اُس کی ذات کے مطلق ہونے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔[4]

---

[1] Iqbal (1934), *Reconstruction*, Lectures II & V

[2] Farnell, *The Attributes of God,* p.56

[3] قرآن ۲۴:۳۵

[4] تشکیلِ جدید کا تیسرا خطبہ؛ Iqbal (1934), *Reconstruction*

Stray Thoughts

by Dr. Sir Muhammad Iqbal

- The weak lose themselves in God; the strong discover Him in themselves.
- For centuries Eastern heart and intellect have been absorbed in the question—Does God exist? I propose to raise a new question—new, that is to say, for the East—Does man exist?
- Islam is not a religion in the ancient sense of the word. It is an attitude - an attitude, that is to say, of Freedom and even of defiance to the Universe. It is really a protest against the entire outlook of the ancient world. Briefly, it is the discovery of Man.
- Nietzsche thinks that belief in God makes man feeble. The wisdom of Islam consists in exploiting the idea of God in the interest of Man, and transforming him into a source of power for the Tauhid of Islam means absolute freedom from fear and superstition in actual life. A mere intellectual belief in God does not count for much in Islam.
- Before you talk of self-sacrifice you must see whether you have got a self to sacrifice. The egotist alone is capable of self-sacrifice.
- One of the most interesting phenomena of modern history is the birth, or rather the rebirth of humanism in the world of Islam. This will no doubt sharpen our sense for matter which centuries of speculative Sufism had dulled; but we must not forget the distinction which the mediaeval thinkers of Europe made between "use" and "enjoyment". We "use" all that is a means to the acquisition of the ultimate good. The Eternal alone is enjoyable; all else is useable only. Europe forgot this distinction long ago and there is no knowing where her unrestrained humanism will carry her.
- Knowledge partly contributes to the structure of what we call objective reality; but the character of events that drop out of the womb of Fate is wholly determined by the heart of man. It is the weak man who endows Fate with its sting. The strong man exploits his misfortunes, in as much as he enhances the force of his soul by maintaining an attitude of total indifference to them.
- The idea of Mi'raj in Islam is face to face vision of Reality without the slightest displacement of your own ego. It is impossible to forget the words of the Muslim poet who said of the Prophet this much:

موسیٰ زہوش رفت بہ یک جلوۂ صفات
تو عینِ ذات می نگری در تبسمے

- ["Moses fainted away by a mere surface illumination of Reality: Thou seest the very substance of Rality with a smile!"]
- Most of our theologians thought the doctrine of human freedom could not be reconciled with the fore-knowledge of God. They looked upon belief in freedom as veiled atheism. So thought Mahmud Shabistri. But the author of Gulshan-i-Raz made the tacit assumption of an absolute and independent Time like Newton. He did not see that if his view of Time were true, then the freedom of God would also disappear. Shabistri's argument will not hold to-day; for God can be conceived as creating Time from moment to moment. If the Universe is an open one, there is no pre-existing future, and God does not know the future because there is nothing to know.
- People extol the past and deprecate the present, not understanding that the present is the whole of the past concentrated in one point.

The New Orient, Lahore, June-August 1925[1]

18

۱۵/جولائی کو غلام رسول مہر شام پانچ اور چھ کے درمیان ملنے آئے۔ علامہ نے دو غزلیں سنائیں۔ مغرب کے بعد دوسرے لوگ چلے گئے۔ افلاطون کے فلسفے، گاندھی کی تحریک، احمد رخصت سے ملاقات، پارسی خاتون سے مکالمے اور علامہ کے خاندانی حالات پر گفتگو ہوئی۔ علامہ نے کہا کہ افلاطون فلسفیانہ مشکلات کی وجہ سے برائی کے وجود کا منکر ہوا۔ علامہ نے احمد رخصت کو اسلام کے زوال کی وجہ پیرپرستی (saint worship) بتائی تھی۔ مہر رات سوا دس بجے کے قریب اُٹھے۔[2]

۱۹/جولائی کو عطر چند کپور اینڈ سنز کے ساتھ علامہ کے معاہدے میں ترمیم ہوئی۔ آئینۂ عجم کے بارے میں تھا۔ ۱۹/جون ۱۹۲۳ء کو دستخط ہوئے تھے۔ اُس وقت طے پایا تھا کہ دو ہزار روپے معاوضے کے علاوہ ہر برس ۴۶۰۰ سے ۵۰۰۰ کتابوں کی فروخت پر ۹۰۰ روپے رائلٹی مصنف کو ادا کی جائے گی۔ سال میں پانچ ہزار سے زیادہ کتابیں فروخت ہونے پر زائد کتابوں کی رائلٹی فی کتاب ۳/ آنہ کے حساب سے ملے گی۔ اب ترمیم ہوئی کہ رائلٹی کی رقم فروخت ہونے والی کتابوں کی کُل قیمت کا ۸/ ۲۲

---

[1] Afzal Haq Qarshi, 'A Rare Writing of Iqbal'

[2] امجد سلیم علوی (۱۹۸۸) اقبالیاتِ مہر، ص ۲۵۰-۲۴۹

فیصد ہو گی۔ رائلٹی کی ادائیگی ہر برس جولائی میں ہونے کی شرط برقرار رہی۔[1]

اس برس کتاب کا اُردو ترجمہ بھی شائع ہوا۔ آخر میں علامہ کے حالاتِ زندگی درج تھے:

اقبال۔ شیخ محمد اقبال نام۔ سیال کوٹی اقبال تخلص، ۱۸۷۰ء میں سیال کوٹ پنجاب میں پیدا ہوئے۔ ایام تعلیم میں عالم طفولیت سے شعر و سخن کی جانب میلان طبع بہت تھا۔ ابتدائی تعلیم میں خوش قسمتی سے سکول کے ماسٹر صاحب بھی قابل اور سخن فہم تھے۔ طبیعت چمکی اور مشق کرتے کرتے فارسی اردو زبانوں میں کامل سخن سنج ہوئے۔ انگریزی زبان میں بھی سکالر ہوئے۔ ۱۸۹۸ء میں میں نے گورنمنٹ کالج لاہور میں آپ کو دیکھا۔ جبکہ بی۔اے کلاس میں تعلیم پاتے تھے۔ نواب مرزا خاں داغ دہلوی سے اگرچہ تلمذ ہے۔ لیکن محاورات اور شعر گوئی میں مشکل پسندی ظاہر کرتی ہے کہ مرزا غالب مرحوم کے تتبع میں محو ہیں۔ تصنیفاتِ اُردو میں بانگِ درا اور فارسی اسرارِ خودی۔ رموزِ بیخودی مقبولِ عام ہیں۔ ممالکِ یورپ کی سیر بھی کی۔ اور انگلستان میں چند سال تعلیم علوم مغربی سے مستفید ہو کر قانونی امتحانات میں کامیاب ہوئے۔ کچھ عرصہ اسلامیہ کالج لاہور میں پروفیسر کے ممتاز عہدہ پر خدمت انجام دی۔ ان دنوں بیرسٹر ایٹ لاء لاہور میں ہیں۔ خداوند آپ کی عمر میں برکت دے۔ نازشِ پنجاب ہیں۔[2]

حیدرآباد دکن سے ۱۸؍جولائی کا لکھا ہوا امین جنگ نواب احمد حسین کا خط ملا۔ علامہ کے زبردست مداح تھے۔ لکھا تھا کہ مولوی عبدالرزاق نے بلا اجازت نظمیں شائع کر کے برطانوی ہند کے کاپی رائٹ کے قانون کی خلاف ورزی کی ("جو ریاست حیدرآباد میں لاگو نہیں") مگر "مجھے یقین ہے کہ آپ انہیں اس لیے معاف کر دیں گے کہ آپ آفاقی شاعر ہیں اور آپ کا کلام ساری اسلامی دنیا کا ورثہ ہے۔"[3]

۲۴؍جولائی کی شام غلام رسول مہر آئے۔ "خاص گفتگو کا موقع نہ آیا،" اُنہوں نے روزنامچے

---

[1] علامہ اقبال میوزیم لاہور میں موجود دستاویز میں علامہ نے قلم سے یہ ترمیم کی ہے۔

[2] ڈاکٹر حسن اختر ملک، اقبال، ایک تحقیقی مطالعہ، ص ۱۶۶-۱۶۵

[3] خط علامہ اقبال میوزیم لاہور میں موجود ہے۔

میں لکھا۔ اسی روزنامچے کے ایک اور صفحے پر ۲۴؍ جولائی ہی کی تاریخ ڈال کر ایک خاص بات لکھی گئی ہے۔ ممکن ہے یہ گفتگو چند روز بعد ہوئی ہو۔ تاریخ غلط پڑ گئی ہو:

> یہ ضروری اطلاع کہ میری زندگی میں ایک عظیم الشان تغیر پیدا ہو رہا ہے۔ پہلے ایک تغیر ہوا تھا، جس کی تاریخ ایم اے کے زمانے سے شروع ہوئی ہے۔ یہ دماغی دہریت تھی جو ولایت میں جا کر اوجِ کمال تک پہنچی۔ ولایت کے بعد اس میں ردِّ عمل۔ اب دوسرا تغیر قول سے عمل کی طرف آمد ہے۔ ڈاکٹر صاحب [علامہ اقبال] نے فرما دیا میری اِس بات کو یاد رکھو اگر میری زندگی میں یکایک کوئی عظیم الشان تغیر ہوا تو اُس پر متعجب نہ۔[1]

اس طرح علامہ کی ذہنی زندگی کے تین اَدوار متعین کیے جا سکتے تھے۔ پہلا ۱۹۰۶ء تک، جس کی ابتدا ۱۸۸۷ء میں ہوئی جب نو دس برس کی عمر میں علامہ کی تخلیقی اور فکری قوتوں کی بیداری کے اولین شواہد سامنے آئے۔ اُن ابتدائی رجحانات کے نتیجے میں وہ تغیر آیا جو ایم اے کے زمانے میں شروع ہو کر ۱۹۰۶ء میں ختم ہوا۔ دوسرا دَور ۱۹۰۷ء سے شروع ہوا۔ اب کسی بڑے تغیر پر ختم ہونے والا تھا۔ یہ تغیر بالآخر ۱۹۲۶ء میں علامہ کے میدانِ سیاست میں قدم رکھنے سے رونما ہوا۔ اس طرح ۱۹۲۷ء میں تیسرا دور شروع ہوا۔ وہ علامہ کی وفات کے بعد تک جاری رہا۔ ۱۹۴۶ء میں مکمل ہوا جب ہندوستان کے مسلمانوں نے خود مختار مسلم ریاست کے حق میں فیصلہ کیا۔[2]

19

۵؍ اگست کو مہر نے علامہ سے طویل گفتگو کا اندراج کیا۔ "طلاق کی حقیقت" بھی زیرِ بحث تھی۔[3]

---

[1] امجد سلیم علوی (۱۹۸۸) اقبالیاتِ مہر، ص ۲۵۱-۲۵۰

[2] جاویدنامہ کے پہلے تین ابواب انہی تین ادوار کی تمثیل معلوم ہوتے ہیں۔ اس طرح جاویدنامہ مصنف کی ذہنی زندگی کی علامتی داستان بن جاتا ہے۔ علامہ کی ذہنی زندگی کے تینوں ادوار قوم کی تاریخ کے ادوار سے بھی ہم آہنگ تھے اِس لیے جاویدنامہ اُن کی قوم کی علامتی تاریخ کے طور پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

[3] امجد سلیم علوی (۱۹۸۸) اقبالیاتِ مہر، ص ۲۵۱-۲۵۰

۷؍ اگست کو مولوی عبدلرزاق کی کلیاتِ اقبال کا اشتہار زمیندار میں آیا۔ ۱۳؍ اگست کو دوبارہ شائع کیا گیا۔[1]

کلّیاتِ اقبال

اربابِ نظر کی رائے ہے کہ آج تک کسی مشرقی شاعر کے کلام پر اتنا دلچسپ مقدمہ اس طریقے سے نہیں لکھا گیا جس طرح کہ ملک کے مایہ ناز مولوی عبدالرزاق صاحب ایچ سی ایس نے ڈاکٹر سر محمد اقبال کے اُردو مجموعہ کلام پر تحریر فرمایا ہے۔ دیباچہ کیا ہے؟ گویا اقبال کی زندگی کے مکمل واقعات، ان کی شاعری کی تمام خصوصیات اور ان کی تصانیف کی کامل تصریحات کا آئینہ ہے، شائع ہو چکا ہے۔ ضخامت ۴۰۰ صفحات، کاغذ نہایت نفیس، کتابت وطباعت نظر فریب، بایں ہمہ قیمت فی نسخہ: مجلّد ۶؍، غیر مجلّد ۵؍۔ فوراً طلب کیجیے، ورنہ دوسرے اڈیشن کا انتظار کرنا پڑے گا۔ خرچہٗ ڈاک بذمہٗ خریدار۔ ملنے کا پتا: دارالکتب رہبر: افضل گنج، حیدر آباد دکن۔

20

۹؍ اگست تھی۔ شاہجہانپور سے لکھنؤ جانے والی نمبر ۸ ڈاؤن کاکوری کے اسٹیشن کے قریب پہنچنے والی تھی۔ ایک مسافر نے زنجیر کھینچی۔ اس کے ساتھیوں نے گارڈ کو مغلوب کیا۔ پستول پاس تھے۔ گولی چلی جس نے ایک مسافر کی جان لے لی۔ مسلح افراد نے ٹرین پر موجود سرکاری خزانے کے تھیلوں پر قبضہ کیا جن میں کُل آٹھ ہزار روپے موجود تھے۔ پھر وہ فرار ہو گئے۔

یہ ہندوستان ری پبلکن ایسوسی ایشن کے رکن تھے جس کا مخفف ایچ آر اے (HRA) تھا۔ یہ تنظیم کانگریس کے بعض باغیوں نے شروع کی تھی جو گاندھی کے عدم تشدد سے بیزار ہو گئے تھے مگر سوراجیہ پارٹی کی انتخابی سیاست میں بھی یقین نہیں رکھتے تھے۔ یہ سمجھتے تھے کہ مسلح جدوجہد کے ذریعے ملک کو آزاد کروایا جا سکتا ہے۔ منشور میں لکھا کہ غیر ملکی حکومت نے دہشت پھیلا کر ملک کو

---

[1] اختر النسا (۲۰۱۰)، ص ۱۰۱

قبضے میں رکھا ہوا ہے اس لیے ضرورت پڑنے پر یہ بھی اُس کے مقابلے میں دہشت پسندی (terrorism) ہی کو ہتھیار بنانے کا حق رکھتے ہیں۔

یہ نظریہ گزشتہ پندرہ بیس برسوں میں بتدریج پروان چڑھا تھا۔ اس کا ماخذ اُنیسویں صدی کے یورپی حریت پسندوں مثلاً مزینی اور اشتراکی مصنفوں کارل مارکس اور لینن وغیرہ کے افکار تھے۔ عام زبان میں یہ نظریہ دہشت پسندی کہلاتا تھا اور تحریک سے وابستہ افراد بھی بعض اوقات اپنے لیے یہ لقب استعمال کرتے تھے۔[1] جذباتی طور پر دہشت پسند ۱۸۵۷ء کی بغاوت سے متاثر تھے۔ ان کے علاوہ گرو گوبند سنگھ، شیوا جی، جارج وشنگٹن، گیری بالڈی، لافایات، لینن، غازی مصطفٰی کمال پاشا اور رضا شاہ ان کے ہیرو تھے۔ کاکوری کی ٹرین ڈکیتی کے بعد حکومت کی مشینری حرکت میں آئی۔ ملک بھر میں گرفتاریاں شروع ہو گئیں۔

اِس دفعہ کی گرمیوں میں علامہ نے جو شعر لکھے اُن میں سے دو کا مفہوم تھا: ناداں، تمہیں فرنگ سے غم گساری کی امید ہے؟ شاہین کا دل اُس پرندے کے لیے نہیں دُکھتا جو اُس کے پنجے میں ہو؟ تم خودی کو پردہ کہتے ہو؟ کہہ لو۔ میں تم سے کہتا ہوں کہ اس پردے کو چاک مت کرنا کہ نگاہ کی سکت بہت کم ہے۔

ترا ناداں امیدِ غمگساری ہاز افرنگ است
دلِ شاہیں نسوزد بہرِ آں مرغے کہ در چنگ است
خودی را پردہ می گوئی؟ بگو! من با تُو ایں گویم
مزن ایں پردہ را چاکے کہ دامانِ نگہ تنگ است[2]

روایت ہے کہ نواب ذوالفقار کے پاس بیٹھے تھے۔ محکمہ کارِ خاص یعنی خفیہ پولیس کا نمائندہ آیا۔ سر

---

[1] مثال کے طور پر دیکھئے، اجئے گھوش، بھگت سنگھ اور اُن کے ساتھی

[2] اقبال نے مولانا گرامی کے نام ایک بلا تاریخ خط میں لکھا کہ یہ اشعار گزشتہ موسمِ سرما میں لکھے گئے۔ خط کی تاریخ کا تعین ۱۹۲۵ء کیا گیا ہے۔ زبورِ عجم حصہ دوم میں نمبر ۶۱ کے طور پر شامل کیے گئے۔

ذوالفقار نے اُس کے ساتھ جان بُوجھ کر "آقاؤں" کے متعلق خوشامدانہ باتیں کیں۔ وہ اُٹھا تو علامہ چند قدم ساتھ جا کر واپس آئے۔ سر ذوالفقار سے کہا، "آپ ایک بات بھول گئے تھے۔ وہ میں کہنے کے لیے گیا تھا۔ وہ بات یہ تھی کہ یہ سب باتیں اچھی طرح یاد کر لینا۔ ایسا نہ ہو کہ کوئی بات بھول جاؤ۔"[1]

ایک پارسی خاتون گاندھی کی تعلیمات کی شیدائی تھیں۔ علامہ نے پارسی مذہب کی رُو سے گاندھی کے فلسفے کو رَد کیا۔ پھر منطق کی رُو سے رَد کیا۔ ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال پیش کرنا برائی کے ساتھ تعاون ہے۔ عدم تعاون نہیں ہے۔ خاتون کو "عاجزانہ اعتراف" کرنا پڑا۔[2]

21

اس دفعہ گرمیوں کی تعطیل لاہور ہی میں گزری۔[3]

سر اکبر حیدری کا خط ملا۔ ۱۰/ اگست کو انگریزی میں لکھا گیا تھا۔ انہوں نے کلیاتِ اقبال کے موٗلف مولوی عبدالرزاق سے استفسار کیا تھا۔ ہوم سیکرٹری سے بھی پوچھا تھا کہ مصنف کے حقوق کی حفاظت کی بہترین صورت کیا ہو سکتی تھی۔ دونوں کے جوابات کا انتظار تھا۔[4]

۱۵/ اگست کو مہر نے علامہ کی گفتگو کے نکات میں لکھا، "کسی نے اپنے کام کا نتیجہ زندگی میں نہیں دیکھا۔ رسول اللہ کے کام کی شان۔ زندگی میں نتائج۔ الیوم اکملت لکم دینکم کی تفسیر۔"[5]

انگریزی رسالے انڈین ریویو میں علامہ پر کوئی مضمون شائع ہوا۔ نظر سے گزرا۔ بہت غلطیاں تھیں۔ تصویر طالب علمی کے زمانے کی تھی۔ عبداللہ چغتائی ان دنوں شملہ میں تھے۔ مضمون کا اردو میں ترجمہ کر کے علامہ سے مشورہ طلب کیا تھا۔ ۲۳/ اگست کو علامہ نے خط لکھ کر منع کر دیا۔[6]

---

[1] غلام رسول مہر کے روزنامچے میں علامہ کی زبانی روایت؛ امجد سلیم علوی (۱۹۸۸) اقبالیاتِ مہر، ص ۲۶۳

[2] ایضاً امجد سلیم علوی (۱۹۸۸) اقبالیاتِ مہر، ص ۲۴۹

[3] مکتوب بنام نیاز الدین خاں ۲۹/ ستمبر ۱۹۲۵ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۰۷

[4] خط علامہ اقبال میوزیم لاہور میں محفوظ ہے۔

[5] امجد سلیم علوی (۱۹۸۸) اقبالیاتِ مہر، ص ۲۵۱

[6] مکتوب بنام عبداللہ چغتائی ۲۳/ اگست ۱۹۲۵ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۹۷

۲۵/ اگست کو مہر رات ساڑھے دس بجے تک علامہ کے پاس بیٹھے۔ گفتگو رہی۔[1]

22

دو برس پہلے علامہ نے پیامِ مشرق کے دیباچے میں یورپ کے نئے ادبی رجحانات سے مایوسی کا اظہار کیا تھا۔ انگلستان میں جو مصنف نئے رجحانات کے خلاف سینہ سپر تھا اُس کا نام ہنری آتھر جونز تھا۔ اسی ڈرامہ نگار کا سلور کنگ اُردو میں نیک پروین کے نام سے قبولِ عام حاصل کر چکا تھا۔ ورجینیا یونیورسٹی امریکہ کے سہ ماہی مجلے کے شمارۂ خزاں میں انٹرویو شائع ہوا۔ یورپی تھیٹر کے جدید رجحانات میں سے "خیالات کے تھیٹر" (theatre of ideas) پر تنقید کی جس کی نمایندگی جارج برنارڈ شا کرتے تھے۔ حقیقت نگاری پر مبنی ڈرامے کو بھی معاشرے کے لیے نقصان دہ قرار دیا:

> Yes, the drama should teach, indeed it cannot avoid teaching—either good or evil. But the drama should teach, not openly and directly by preachments and proclamations and propaganda, but as Nature teaches-silently, indirectly, implicitly: by action, not by words; with potent but unseen influence and occult far-removed results. The drama should slyly, obliquely insinuate lessons in the science which most of all we are concerned to learn-the science of wise living.[2]

23

علامہ کے نوجوان ملاقاتی صوفی غلام مصطفیٰ تبسمؔ امرتسر میں تھے۔ چاہتے تھے کہ امرتسر کی جماعت اُمتِ مسلمہ کے بانی مولوی خواجہ احمد الدین کی علامہ سے ملاقات ہو جائے۔ "دونوں بزرگوں نے خود بھی بارہا اس کے لیے انتہائی اشتیاق کا اظہار فرمایا تھا،" تبسمؔ کا بیان ہے۔[3] مولوی صاحب نے کہا کہ علامہ

---

[1] امجد سلیم علوی (۱۹۸۸) اقبالیاتِ مہر، ص ۲۵۲

[2] Archibald Henderson, 'Henry Arthur Jones, Dramatist: Self-Revealed'

[3] یہ تبسم کے مضمون سے ہے جو علامہ کی وفات کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور کے میگزین راوی اور پھر بلاغ کے اگست ۱۹۳۸ء کے شمارے میں شائع ہوا اور عرشی امرتسری نے 'حیاتِ اقبال کا ایک گوشۂ پنہاں' (۱۹۷۴)؛ میں نقل کیا۔ عرشی نے لکھا ہے کہ تبسمؔ نے انہیں بتایا "کہ ملاقات کی تحریک علامہ کی طرف سے ہوئی تھی"۔ اس کے برعکس غلام

سے ملاقات اُن کے لیے بھی مفید ہو گی۔ جواب میں علامہ نے لکھا:

۱ اسلام کے بارے میں انگریزی میں کتاب لکھنے کا ارادہ ہے۔ مجوزہ عنوان 'اسلام میری نگاہ میں' (*Islam as I understand it*) ہے۔ اجتہاد والے مقالے سے ابتدا ہو چکی ہے۔ وہاں جن باتوں کی طرف صرف اشارہ کیا گیا، کتاب میں تفصیل سے بیان ہوں گی۔

۲ نقطۂ نگاہ فلسفیانہ ہے۔ اُردو کی بجائے انگریزی کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ملاقات کر کے مولوی صاحب کو فائدہ نہ ہو گا لیکن اپنے فائدے کے لیے علامہ اُن سے ضرور ملیں گے۔

۳ مولوی احمد الدین اور مولوی حشمت وغیرہ کا اصرار ہے کہ قرآن کے مکمل کتاب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تشریح کے لیے کسی اور ماخذ کی ضرورت نہیں ہے۔ اس نکتے پر محض بحث مت کریں۔ ایک مبسوط کتاب لکھیں جس میں "معاملات" کے متعلق صرف قرآن سے استدلال پیش کیا جائے۔ انسان کے عروج کے لیے جن قواعد کی ضرورت ہے، مدلل طور پر قرآن سے اخذ کیے جائیں۔ شاید ہندوستان میں قدر نہ ہو مگر مصر، ترکی اور دوسرے اسلامی ممالک میں اس قسم کے تقاضے ہو رہے ہیں۔

۴ یہ بھی دکھایا جائے کہ دنیا کی مختلف اقوام میں عبادات اور بالخصوص معاملات کے متعلق جو قواعد مروج ہیں اُن سے کچھ فائدہ نہیں۔ اسلام کا مجدد اور انسانیت کا سب سے بڑا خادم وہی ہو گا جو قرآن کی روشنی میں دورِ حاضر کے اصولِ قوانین (jurisprudence) کا تجزیہ کر کے قرآنی اصولوں کی ابدیت ظاہر کر سکے۔

رسول مہر کے روزنامچے میں ۱۵ر ستمبر ۱۹۲۵ء کے اندراج میں ہے کہ علامہ نے "مولوی احمد دین امرتسری کی خواہشِ ملاقات کا ذکر" کیا؛ دیکھیے امجد سلیم علوی (۱۹۸۸) اقبالیاتِ مہر، ص ۲۵۲

بنام صوفی غلام مصطفیٰ تبسم

پرائیویٹ

لاہور

۲؍ستمبر ۱۹۲۵ء

جنابِ من

السلام علیکم

آپ کا نوازش نامہ آج صبح مجھے ملا، جس کے لیے سراپا سپاس ہوں۔

میری مذہبی معلومات کا دائرہ نہایت محدود ہے۔ البتہ فرصت کے اوقات میں میں اس بات کی کوشش کیا کرتا ہوں کہ ان معلومات میں اضافہ ہو۔ یہ بات زیادہ تر ذاتی اطمینان کے لیے ہے، نہ تعلیم و تعلم کی غرض سے۔ کچھ مدت ہوئی، میں نے اجتہاد پر ایک مضمون لکھا تھا، مگر دورانِ تحریر میں اس کا احساس ہوا کہ یہ مضمون اس قدر آسان نہیں جیسا میں نے اُسے ابتدا میں تصور کیا تھا۔ اس پر تفصیل سے بحث کرنے کی ضرورت ہے۔ موجودہ صورت میں وہ مضمون اس قابل نہیں کہ لوگ اُس سے فائدہ اُٹھا سکیں۔ کیونکہ بہت سی باتیں جن کو مفصل لکھنے کی ضرورت ہے، اس مضمون میں نہایت مختصر طور پر محض اشارۃً بیان کی گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے اُسے آج تک شائع نہیں کیا۔ اب میں ان شاءاللہ اُسے ایک کتاب کی صورت میں منتقل کرنے کی کوشش کروں گا جس کا عنوان یہ ہو گا Islam as I understand it اس عنوان سے مقصود یہ ہے، کہ کتاب کا مضمون میری ذاتی رائے تصور کیا جائے، جو ممکن ہے، غلط ہو۔

اس کے علاوہ ایک بات [یہ] بھی ہے کہ میری عمر زیادہ تر مغربی فلسفے کے مطالعہ میں گذری ہے اور یہ نقطۂ نگاہ ایک حد تک طبیعت ثانیہ بن گیا ہے۔ دانستہ یا نادانستہ میں اسی نقطۂ نگاہ سے حقائقِ اسلام کا مطالعہ کرتا ہوں اور مجھ کو بارہا اس کا تجربہ ہوا ہے کہ اُردو میں گفتگو کرتے ہوئے میں اپنے مافی الضمیر کو اس زبان میں اچھی طرح ادا نہیں کر سکتا۔

مذکورہ بالا حالات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مجھے یقین ہے کہ مولوی صاحب موصوف کو میرے ساتھ تبادلہ خیالات کرنے سے کچھ فائدہ نہ ہو گا۔ ہاں مجھ کو ان سے فائدہ پہنچنا غالباً یقینی ہے۔ اس واسطے وہ اگر مجھ کو مستفیض کرنے کے ارادہ سے امر تسر سے لاہور آنے کی زحمت گوارا فرمائیں تو ان کی بہت مہربانی ہے، جس کے لیے میں اُن کا نہایت شکر گذار ہوں۔

مجھ کو اُن کے خیالات سے کسی حد تک پہلے بھی آگاہی ہے، کیا اچھا ہو کہ وہ شریعتِ محمدیہؐ پر ایک مبسوط کتاب مرتب فرمائیں جس میں عبادات و معاملات کے متعلق صرف قرآن سے استدلال کیا گیا ہو، ''معاملات'' کے متعلق خاص طور پر۔ اس قسم کی کتاب کی آج کل شدید ضرورت ہے۔ ہندوستان میں تو شاید اس کے مقبول ہونے کے لیے مدت درکار ہے، ہاں دوسرے اسلامی ممالک میں اس کی ضرورت کا احساس ہر روز بڑھ رہا ہے۔ شیخ علی رزاق اور دوسرے علمائے مصر کے مباحث سے مولوی صاحب آگاہ ہوں گے۔ علی ہذا القیاس ترکی میں بھی یہی مسائل زیرِ غور ہیں۔ اس پر ایک آدھ کتاب بھی تصنیف ہو چکی ہے۔ جس میں زیادہ تر زمانہ حال کے مغربی اُصولِ فقہ کو ملحوظ رکھ کر فقہ اسلامی پر بحث کی گئی ہے۔ ترکوں نے جو ''چرچ'' اور ''سٹیٹ'' میں امتیاز کر کے ان کو الگ کر دیا ہے، اس کے نتائج نہایت دُور رس ہیں اور کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ افتراق اقوامِ اسلامیہ کے لیے باعثِ برکت ہو گا یا شقاوت۔ غرض کہ مولوی صاحب موصوف یا اُن کے رفقا کو جو کلامِ الٰہی اور مسلمانوں کے دیگر مذہبی لٹریچر پر عبور رکھتے ہیں' اس طرف توجہ کرنی چاہیے۔ میں اور مجھ ایسے اور لوگ صرف ایک آنکھ رکھتے ہیں۔ بہت مدت سے ہم یہ سُن رہے ہیں کہ قرآن کامل کتاب ہے اور خود اپنے کمال کا مدعی ہے۔ رسالہ بلاغ امر تسر کے ہر نمبر میں اور مولوی حشمت علی صاحب کے رسالہ اشاعۃ القرآن کے ہر نمبر میں اسی پر بحث ہوتی ہے لیکن ضرورت اس امر کی ہے کہ اس کے کمال کو عملی طور پر ثابت کیا جائے کہ سیادتِ انسانی کے لیے تمام ضروری قواعد اس میں موجود ہیں اور فلاں فلاں آیات سے فلاں فلاں قواعد کا استخراج ہوتا ہے۔ نیز جو جو قواعد عبادات یا معاملات کے متعلق (بالخصوص موخر الذکر کے متعلق) دیگر اقوام میں اس وقت مروج ہیں، اُن پر قرآنی نقطۂ نگاہ سے تنقید کی جائے اور دکھایا جائے کہ وہ بالکل ناقص ہیں اور ان پر عمل کرنے سے نوعِ انسانی کبھی سعادت سے بہرہ اندوز

نہیں ہو سکتی۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانۂ حال کے "جورس پروڈنس" پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کر سکے گا، وہی اسلام کا مجدد ہو گا اور بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہو گا۔ قریباً تمام ممالک میں اس وقت مسلمان یا تو اپنی آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں یا قوانینِ اسلامیہ پر غور و فکر کر رہے ہیں (سوائے ایران و افغانستان کے) مگر ان ممالک میں بھی امروز و فردا یہ سوال پیدا ہونے والا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ زمانۂ حال کے اسلامی فقہا یا تو زمانہ کے میلانِ طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا ہیں۔ ایران میں مجتہدین شیعہ کی تنگ نظری اور قدامت پرستی نے بہاً اللہ کو پیدا کیا جو سرے سے احکامِ قرآنی ہی کا منکر ہے۔ ہندوستان میں عام حنفی اس بات کے قائل ہیں کہ اجتہاد کے تمام دروازے بند ہیں۔ میں نے ایک بہت بڑے عالم کو یہ کہتے ہوئے سنا کہ حضرت امام ابوحنیفہ کا نظیر ناممکن ہے۔ غرض کہ یہ وقت عملی کام کا ہے کیونکہ میری رائے ناقص میں مذہبِ اسلام اس وقت گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے اور شاید تاریخِ اسلام میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔

مخلص

محمد اقبال[1]

24

۵/ستمبر کو ملاقات کی ٹھہری۔ علامہ نے پوچھنے کی بعض باتیں نوٹ کر لیں۔ مولوی صاحب نہ آئے۔ اگلے روز علامہ نے تبسم کو خط لکھ کر دریافت کیا۔[2]

۷/ستمبر کو مولانا ظفر علی خاں غلام رسول مہر کے ساتھ آئے۔ حجاز کے سفر کے بارے میں قریباً ایک گھنٹہ گفتگو رہی۔[3]

---

[1] برنی، کلیات مکاتیب اقبال دوم، ص ۶۰۴-۵۹۷

[2] مکتوب بنام صوفی تبسم ۶/ستمبر ۱۹۲۵ء؛ برنی، کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۰۶-۶۰۴

[3] امجد سلیم علوی (۱۹۸۸) اقبالیاتِ مہر، ص ۲۵۲

۱۴/ستمبر کو علامہ نے سر اکبر حیدری کو خط لکھ کر حیدر آباد دکن میں بانگِ درا کے حقوق محفوظ کروانے کے بارے میں پوچھا۔[1] غلام رسول مہر کو بلا کر قاضی عزیزالدین کے کسی مضمون کے بارے میں ہدایات بھی دیں۔[2]

۱۵/ستمبر کو مولانا ظفر علی خاں، غلام رسول مہر کے ساتھ آئے۔ آٹھ بجے کے بعد مہر علامہ کے ساتھ تنہا رہ گئے۔ علامہ نے 'مشرق و مغرب' کی نظم سنانے کے لیے کتاب نکالی۔ بر آمدے کی بجلی کی روشنی میں کھڑے ہو کر تین نظمیں سنائیں۔ مولوی احمد الدین امر تسری کی خواہشِ ملاقات کا ذکر کر کے اپنا جواب بتایا، "مجھ سے استفادہ نہیں کر سکتے"۔ قرآن شریف کے بعض مسائل کا تذکرہ کیا جن کے بارے میں استفسار کی ضرورت ہے—مسئلۂ بقا، مسئلۂ نجات و تقدیرِ انسانی، مسئلۂ روح و امر، سورہ نون کی آیت جس میں دو دفعہ مارنے اور دو دفعہ زندہ کرنے کا ذکر ہے۔ غالباً یہ نکات مولوی صاحب سے گفتگو کے لیے نوٹ کیے تھے۔ مسئلۂ نجات پر مفصل بحث کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہی تھی جو ۱۹۰۹ء میں انگریزی مقالے 'اسلام بطور ایک اخلاقی اور سیاسی نصبُ العین' میں پیش کر چکے تھے—"بدھ مذہب کا اصول نروان۔ زرتشتیت کا اُصول ثنویت۔ یہودیت کا اصول۔ اسلام قرآن نے پرسنل سیلف پر خاص زور دیا ہے۔ نیو سائیکالوجی،" مہر نے روزنامچے میں لکھا۔ علامہ نے گورنمنٹ کالج کی رصد گاہ میں روشن ترین سیارہ ویگا دیکھنے کا ذکر بھی کیا۔ مہر دس بجے کے قریب واپس گئے۔[3]

۱۷/ستمبر کو علامہ نے منشی آدم علی بھائی کو خط لکھا۔ اُن کے ایک جاننے والے نے سوال پوچھا تھا۔ علامہ نے لکھا کہ یہ مضمون خطوط میں نہیں سما سکتا، "آپ اُن صاحب کو لاہور بھیج دیں۔"[4]

مولانا مرتضیٰ احمد خاں محمد زائی کا تخلص میکش تھا۔ زمیندار میں صحافی تھے۔ ۱۹/ستمبر کی صبح دس بجے غلام رسول مہر کے ساتھ علامہ کے پاس آئے۔ مہر نے کہا، "دماغ اگرچہ ایسی باتوں کو صحیح نہیں

---

[1] مکتوب بنام سر اکبر حیدری ۱۴/ستمبر ۱۹۲۵ء؛ اقبال میوزیم لاہور

[2] امجد سلیم علوی (۱۹۸۸) اقبالیاتِ مہر، ص ۲۵۲

[3] امجد سلیم علوی (۱۹۸۸) اقبالیاتِ مہر، ص ۲۵۳؛ مقالے میں یہودیت کی بجائے مسیحیت کے اصول کا ذکر ہے۔

[4] مکتوب بنام منشی آدم علی بھائی ۱۷/ستمبر ۱۹۲۵ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۰۶

سمجھتا لیکن دل کی یہ کیفیت ہے کہ عرب پہنچتے ہی وہاں کی خاکِ پاک کے ذرّے ذرّے کو چوموں اور بوسے دیتا رہوں تا آنکہ جان نکل جائے۔" محبتِ رسولؐ کے جوش میں علامہ کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ آنکھیں بھر آئیں۔ دنیائے اسلام کی سیاحت کا عزم ظاہر کیا۔ مہر اور چودھری محمد حسین کے ساتھ جانا چاہتے تھے۔ محمد حسین سفر نامہ لکھیں گے۔[1]

مولوی احمد الدین امرتسری آئے۔ گڑھی شاہو میں صوفی تبسمؔ کے دوست ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ امرتسری کے گھر ٹھہرے۔[2] ۲۱ر ستمبر کی شام علامہ نے علی بخش کو بھیجا کہ مہر کو بھی لے آئے۔ وہ گھر پر نہ ملے۔[3] غالباً رات نَو بجے مولانا، تبسمؔ اور ڈاکٹر عنایت کے ساتھ علامہ سے ملنے آئے۔ "مسلسل چار گھنٹے تک گفتگو کا سلسلہ جاری رہا،" تبسمؔ کا بیان ہے، "یہ بابرکت صحبت رات کے ایک بجے ختم ہوئی ... رخصت ہو کر چلے تو ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ ہم عالمِ بالا کی سیر کر رہے ہوں۔"[4]

۲۳ر ستمبر کی شام علامہ کے پاس ملاقاتی بیٹھے ہوئے تھے۔ علی بخش کو بھیج کر مہر کو بلوایا۔ مہر کے روزنامچے کے اندراج سے معلوم ہوتا ہے کہ علامہ نے اُن سے کہا کہ وفد کے ساتھ حجاز نہ جائیں۔ علامہ کے ساتھ چلیں۔ بعد میں ملاقاتی چلے گئے۔ مہر اور محمد حسین رہ گئے۔ سفر کی تفصیلات پر گفتگو ہوئی—کابل، غزنی، سمرقند، بخارا، مرو، شیراز، اصفہان اور متعلقات، بغداد، کربلا، انگورہ و متعلقات، قسطنطنیہ، قاہرہ، فلسطین، مدینہ، مکّہ۔ متفرق موضوعات پر ساڑھے دس بجے تک گفتگو رہی۔[5]

۲۵ر ستمبر کو سہ پہر چار بجے کے قریب علی بخش کو بھیجا کہ مہر کو بلا لائے۔ اُنہوں نے کہا کہ شام

---

[1] امجد سلیم علوی (۱۹۸۸) اقبالیاتِ مہر، ص ۲۵۳

[2] عرشی، 'علامہ اقبال کی صحبت میں'۔ عرشی نے صوفی تبسمؔ سے روایت کی ہے کہ تبسمؔ نے اطلاع دی تو علامہ نے کہا، "وہ تو میرے مہمان ہیں انہیں دوسری جگہ کیوں اُتارا گیا؟" تبسمؔ تانگے میں بٹھا کر ساتھ لائے۔ مولانا تخلیے پر مصر تھے اس لیے ڈاکٹر عنایت اُنہیں بتائے بغیر سائیکل پر پیچھے پیچھے آئے۔ کوٹھی میں اوٹ میں بیٹھے کہ مولانا کو دکھائی نہ دیں۔

[3] امجد سلیم علوی (۱۹۸۸) اقبالیاتِ مہر، ص ۲۵۳

[4] عرشی، 'علامہ اقبال کی صحبت میں'

[5] امجد سلیم علوی (۱۹۸۸) اقبالیاتِ مہر، ص ۲۵۵-۲۵۳

کے بعد حاضر ہوں گے۔ آٹھ بجے آئے۔ علامہ نے سفر کی ضروری معلومات کے بارے میں پوچھا۔ مہر نے کہا کہ پندرہ روز میں فراہم کر دیں گے۔ رات گیارہ بجے کے قریب مہر واپس گئے۔[1]

حیدرآباد دکن سے سر اکبر حیدری کا خط ملا۔ ریاست میں بانگِ درا کی رجسٹری کے بارے میں سیکرٹری محکمہ قانون نے کہا تھا کہ مصنف براہِ راست انہیں لکھے۔ سر اکبر کے نام عبدالرزاق کے دو خطوط ساتھ تھے۔ لکھا تھا کہ کلیاتِ اقبال کا دوسرا ایڈیشن شائع کرنے کا ارادہ نہیں رکھتے، "مجھے توقع ہے کہ آپ سر اقبال سے کہیں گے کہ وہ اس قضیے کو جلد ختم کر دیں۔"[2] علامہ نے لکھا کہ عبدالرزاق ایک ہزار روپیہ رائلٹی ۱۰ر جنوری تک ادا کریں۔ کتاب برطانوی ہند میں فروخت نہ ہو۔[3]

پیر سید رحمت اللہ شاہ ایک نوجوان تھے۔ شیخ عبدالقادر جیلانی کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے مریدوں میں غلام سرور مغل شامل تھے۔ سندھ کی ریاست خیرپور کے نائب وزیر خان بہادر رسول بخش کے صاحبزادے تھے۔ رئیسانہ بسر کرتے تھے۔ سندھی، اُردو اور فارسی میں شعر بھی کہتے تھے۔ سید رحمت نے انہیں ساتھ رکھنے کے بارے میں علامہ سے مشورہ کیا۔ علامہ نے منع کر دیا۔ غلام سرور نے دیوانِ طرزی کے عنوان سے فارسی دیوان شائع کروایا۔ علامہ کو خط لکھا۔ علامہ نے خط پڑھ کر گم کر دیا۔ جواب نہ دے سکے۔[4]

نواب سر ذوالفقار علی خاں شملہ میں تھے۔ بیمار ہوئے تھے لیکن اب طبیعت کچھ بہتر تھی۔ دہلی جانے والے تھے۔ ۲۹ر ستمبر کو نیازالدین خاں کا خط علامہ کو ملا۔ علامہ نے اُسی وقت جواب دیتے ہوئے نواب ذوالفقار کے بارے میں لکھا۔[5]

---

[1] امجد سلیم علوی (۱۹۸۸) اقبالیاتِ مہر، ص۲۵۷-۲۵۶

[2] انگریزی میں عبدالرزاق کے خطوط بنام سر اکبر ۶ر اور ۷ر ستمبر ۱۹۲۵؛ سر اکبر کا خط علامہ کے نام ۲۰ر ستمبر ۱۹۲۵ء

[3] امجد سلیم علوی (۱۹۸۸) اقبالیاتِ مہر، ص۲۵۸

[4] مکتوب بنام سید رحمت اللہ شاہ ۲۰ر اکتوبر ۱۹۲۵ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص۶۱۲-۶۱۱

[5] مکتوب بنام نیازالدین خاں ۲۹ر ستمبر ۱۹۲۵ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص۶۰۷

شیر خوار جاوید بیمار پڑے لیکن اکتوبر کے شروع میں تندرست ہو چکے تھے۔ [1]

25

اورینٹل کالج کے پروفیسر حافظ محمود شیرانی، علامہ کے پرانے دوستوں میں سے تھے۔ تحقیق میں ثانی نہ رکھتے تھے۔ عبداللہ چغتائی کا بیان ہے کہ علامہ کہتے تھے، ''یار شیرانی! اگر تم یہ ثابت کرنے کا تہیہ کر لو کہ اقبال نام کا کوئی شخص وجود ہی نہیں رکھتا تو اُمید ہے کہ تم یہ بھی کر کے دکھا دو گے۔''[2] محمود شیرانی کے لڑکے محمد داؤد خاں کی عمر بیس برس تھی۔ شاعری کرتے تھے۔ تخلص اخترؔ تھا۔ لوگ اخترؔ شیرانی کہتے۔ اکتوبر میں رسالہ انتخاب جاری کیا۔ علامہ کو بھجوایا۔ اُنہوں نے لکھا، ''رسالہ 'انتخاب' کے لیے سراپا سپاس ہوں۔ ہونہار معلوم ہوتا ہے۔ یقین ہے کہ ترقی کرے گا۔''[3]

غلام محی الدین صوفی، دہلی یونیورسٹی میں رجسٹرار تھے۔ الٰہ آباد یونیورسٹی سے ڈاکٹری کی ڈگری حاصل کرنے کے لیے کشمیری تہذیب و تمدن پر مقالہ لکھ رہے تھے۔ علامہ ممتحنوں میں تھے۔ ۴/ اکتوبر کو ملنے آئے۔ کسی دوست کو ہدایت کی تھی کہ خواجہ اعظم کی تاریخِ کشمیر کا قلمی نسخہ بھجوا دے۔ ''وہ شخص قلمی نسخہ تاریخ مذکور کا لایا،'' علامہ کا بیان ہے، ''میں اُس وقت فارغ بیٹھا تھا۔ یہی کتاب دیکھنی شروع کر دی۔ دو چار ورق ہی اُلٹے تھے کہ بابا صاحب کا تذکرہ مل گیا جس سے مجھ کو بڑی خوشی ہوئی۔'' مراد بابا لول حج تھے۔ علامہ کے اجداد میں سب سے پہلے اسلام قبول کیا۔ کتاب سے معلوم ہوا کہ ان کا اصل گاؤں موضع چکو پرگنہ آدون تھا۔ بیوی کے ساتھ تعلقات اچھے نہ تھے۔ ترک دنیا کر کے کشمیر سے نکل گئے۔ بارہ سال مختلف ممالک کی سیر کی۔ واپسی کے بعد غیبی اشارے پر بابا نصیر الدین کے مرید ہوئے۔ وہ نورالدین ولی کے مرید تھے۔ بقیہ عمر مرشد کی صحبت میں گزاری۔ اُنہی کے قریب دفن ہیں۔[4]

---

[1] مکتوب بنام شیخ عطا محمد ۵/ اکتوبر ۱۹۲۵ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۰۹-۶۰۷

[2] عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۵۱۹

[3] یہ رائے نومبر کے شمارے میں شائع ہوئی؛ شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۱۰۶

[4] مکتوب بنام شیخ عطا محمد ۵/ اکتوبر ۱۹۲۵ء محولہ بالا۔ علامہ نے غلام محی الدین صوفی کا نام نہیں لکھا۔ اس کے لیے میرا ماخذ

مہر نے روزنامچے میں اُس دن کے حوالے سے لکھا کہ علامہ نے میکش کی وساطت سے پیغام بھجوایا کہ اِس حدیث کی تحقیق کریں کہ قرآن کی کوئی ترتیب نہیں ہے۔ مہر شام چھ بجے گئے۔ گفتگو کے دوران اِس حوالے سے حدیث کی طرف اشارہ ہوا کہ

> انسانی فطرت succession [تسلسل] کی وساطت سے مطالعۂ اشیأ کی عادی ہے۔ جب انسان اس سطح سے بلند ہو کر heavenly bodies [اجرامِ فلکی] پر غور کرتا ہے تو succession سے کسی قدر آزاد ہو جاتا ہے۔ اِسی طرح اگر وہ eternal [ابدی] کو سمجھنا چاہے تو اُسے ان چیزوں سے آزاد ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ eternal, timeless ہے [وقت کی قید سے آزاد ہے]۔ خدا کا تھنکنگ [thinking] عام سلاسل و قیودِ ناموتی سے آزاد ہے۔ صاحبِ الہام بہ حالت وصولِ الہام eternal جیسا بن جاتا ہے۔

"قلمی کتابوں کا ذکر جو آزر لایا،" مہر نے روزنامچے میں لکھا ہے، "اسفر نگی کا کلام۔ عماد فقیہ کا دیوان۔ گلبدن بیگ وغیرہ کا کلام۔ تاریخ اعظمی [خواجہ اعظم کی تاریخِ کشمیر]۔ اشعار کا انتخاب نہایت عُمدہ۔" بابالول حج کا ذکر بھی تفصیل کے ساتھ ہوا۔ یوذاسف اور حکیم بلوہر کے قصے کا ذکر آیا۔ اس کا تعلق سری نگر کی حضرت بل خانقاہ کے ساتھ تھا۔ "قبوں کا مسئلہ" زیرِ بحث آیا۔ غالباً یہ جنت ُالبقیع کے مزارات کا ذکر تھا۔ خیال تھا کہ ابن سعود کی حکومت انہیں گرادے گی۔ اسے "تطہیر حجاز" اور "تطہیر یثرب" کہا جا رہا تھا۔ زمیندار اس کے حق میں تھا۔ مہر کے روزنامچے کے مطابق علامہ نے بھی کہا کہ علامتوں میں اُلجھنا انسانیت کے لیے مصیبت ہے ('Symbolization is the curse of humanity')۔ دنیا اِس سے آزاد ہو جائے تو نہیں معلوم کیا ہو۔ شاید شعور ہی بدل جائے ('intellect transform')۔ مسلمانوں پر بُدھ مذہب کے اثرات کا ذکر کیا۔ وسطی ایشیا والوں نے اسلام قبول کرتے ہی اپنی پرانی

ہے: Bamzai (1994) *Cultural and Political History of Kashmir. Volume 1,* p.39

علامہ نے خط میں لکھا ہے، "آج اپنے بزرگوں کا سراغ مل گیا ہے۔" خط کی بقیہ تفصیلات اور مہر کے روزنامچے کے ساتھ موازنے کے بعد لگتا ہے "آج" محاورۃً لکھا گیا۔ واقعہ ایک روز پہلے کا ہے۔

عبادت گاہوں کو مسلم اولیأ کے نام پر مستقل کر دیا۔

''لکھنؤ سے دو ملتانی پیروں کا آنا،'' مہر نے لکھا، ''حجاز کے معاملات کے متعلق تشفّی کی استدعا۔ باتیں۔ جاتے وقت اقرار کہ ہم اب سُلطان ابنِ سعود کو بُرا نہیں کہیں گے۔'' علامہ نے مہر سے کہا کہ حجاز کے سفر کے اخراجات کے لیے انتظام کی صورت ہے۔ تفصیل نہ بتائی کیونکہ ایک اور صاحب بیٹھے تھے۔ تعددِ ازدواج کو ''بحالتِ عدل بہترین آسائش'' قرار دیا۔ اپنا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ اتفاق سے ایک بیوی کا زیور ہلکا بن گیا تو اُسے اُتنا سونا تول کر دے دیا گیا— ''اس سے دونوں کے outlook میں تغیّر۔ باہمی محبت۔'' دونوں بیویوں نے فیصلہ کیا تھا کہ ایک دوسرے کی اولاد گود لیں گی۔ اس لیے ''جاوید اب مرحومہ کا بچہ سمجھا جاتا ہے۔'' مہر رات ساڑھے آٹھ بجے واپس گئے۔[1]

۵/اکتوبر کو جاوید کی پہلی سالگرہ تھی۔ سردار بیگم قربانی دینے میں مصروف تھیں۔ علامہ نے شیخ عطا محمد کو خط لکھا، ''آپ اور والد مکرم یہ سن کر خوش ہوں گے کہ مدت کی جستجو کے بعد آج اپنے بزرگوں کا سراغ مل گیا ہے۔'' تفصیل درج کرنے کے بعد لکھا، ''غالباً بابا نصیر الدین کی اولاد کشمیر میں ہو گی۔ ان سے مزید حالات معلوم ہونے کی توقع ہے اور کیا عجب کہ ان کے پاس اپنے مریدوں کا سلسلہ موجود ہو۔''[2]

۶/اکتوبر کو مہر ساڑھے نو بجے آئے اور بارہ بجے کے قریب واپس گئے۔ غالباً صبح کے نہیں بلکہ رات کے اوقات تھے۔ ''مراکش کے متعلق باتیں۔ دنیائے اسلام میں کاہن،'' مہر کے روزنامچے میں اُس روز کی گفتگو کے نکات میں درج ہے، ''لاہور میں بھی تیل کی کان ہے۔ ایک زمانہ آئے گا کہ شہر بالکل اُجڑ جائے گا۔ لوگ دوسری جگہ جا بسیں گے۔ یہ بات لکھ رکھو۔'' اپنے والد کی تیزیٔ حس کا ذکر کیا۔ ۱۹۰۵ء کے زلزلے کے متعلق ایک گھنٹہ پہلے کہہ دیا تھا۔ مہر کے مطابق علامہ نے حاکم کی مستدرک کی حدیث کی تحقیق کرنے کے لیے کا جس کا مفہوم تھا کہ آنحضورؐ کی اولاد میں حسین نام کا

---

[1] امجد سلیم علوی (۱۹۸۸) اقبالیاتِ مہر، ص ۲۵۹-۲۵۷

[2] مکتوب بنام شیخ عطا محمد ۵/اکتوبر ۱۹۲۵ء محولہ بالا

کوئی شخص سب کچھ تباہ کر دے گا۔[1]

26

پنجاب ہائی کورٹ میں ایک مسلمان جج کی اسامی خالی ہوئی۔ مسلم اخباروں نے اصرار کیا کہ عہدہ علامہ اقبال کو دیا جائے۔ ۹/اکتوبر کے زمیندار نے بھی لکھا۔ چیف جسٹس سر شادی لال نے سمجھا کہ علامہ مسلم اخبارات کے ساتھ مل کر اُن کے خلاف مظاہرہ کروانا چاہتے ہیں۔ یہ بات علامہ کے علم میں بھی آئی۔ اُنہوں نے سوچا کہ اب لاہور میں وکالت کرنا مشکل ہو جائے گا۔[2]

سر شادی لال کے ایک دوست کے بیٹے نے بعد میں اُن کے حوالے سے یہ روایت بیان کی کہ گورنر علامہ اقبال اور میاں شاہنواز میں سے کسی کو منتخب کرنا چاہتے تھے مگر اُنہوں نے دونوں کو علیحدہ مشورہ دیا کہ گورنر سے ملیں تو دوسرے کی کردار کُشی کریں۔ اس طرح دونوں گورنر کی نظر سے گر گئے۔[3] یہ قرین قیاس نہیں۔ مرزا جلال الدین کے ایک بیان سے بھی اس کی تردید ہوتی ہے:

> میں [مرزا جلال الدین] کراچی گیا ہوا تھا۔ شادی لال مجھ سے ملے اور کہنے لگے کہ میاں محمد شفیع اقبال کو بہت ناپسند کرتا ہے، کہتا ہے کہ وہ شرابی ہے، چال چلن بھی اچھا نہیں۔ یہ بات ڈاکٹر اقبال کے مستقبل کے لیے بہت بُری ہے۔ ڈاکٹر صاحب میرے ساتھ ہو جائیں تو بہت اچھا ہے۔ میں لاہور آیا تو ڈاکٹر صاحب سے ذکر کیا۔ وہ بولے: مرزا صاحب! شادی لال اپنا الو سیدھا کرنا چاہتا ہے۔ اس کا اپنا مطلب ہے ہمیں کیا مصیبت پڑی ہے کہ اس جھگڑے میں پڑیں۔ ہم اس کا ساتھ نہیں دے سکتے۔[4]

مشہور ہوا کہ سر شادی لال نے کہا، ''ہم اقبال کو شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں، قانون دان کی حیثیت سے نہیں۔'' اگر واقعی یہ بات کہی تو درست نہ تھی۔ علامہ نے اُنہی کی عدالت میں کئی مقدمات لڑے

---

[1] امجد سلیم علوی (۱۹۸۸) اقبالیاتِ مہر، ص ۲۶۲-۲۵۹

[2] مکتوب بنام تھامسن ۱۷/اکتوبر ۱۹۲۵ء، برنی (۱۹۹۱)، ص ۶۱۱-۶۰۹۔

[3] ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۴) زندہ رود، ص ۳۵۰-۳۴۹

[4] عبداللہ چغتائی (۱۹۸۹)، روایاتِ اقبال، ص ۱۳۵-۱۳۴

تھے۔ پندرہ کی تفصیل دستیاب ہے۔ دس میں علامہ کے حق میں فیصلہ ہوا۔ پانچ میں خلاف ہوا۔[1]

27

۹ر اکتوبر کو شام سات بجے علی بخش کو بھیجا کہ مہر کو بلا لائے۔ وہ ساڑھے نو بجے آئے۔ اُن کے مطابق علامہ نے کہا، ''ایسے شعر لکھے ہیں کہ بس مزا آ گیا ہے۔ لیکن جس بات کے لیے بلایا ہے اُس کے بعد سناؤں گا۔'' وہ بات غالباً کسی خاص شخصیت کے خلاف تھی، جس کی تفصیل دستیاب نہیں ہے۔ اشعار بھی سنائے۔ زمیندار میں تطہیرِ یثرب پر مضمون لکھا جا رہا تھا۔ علامہ نے اُس کے لیے یہ شعر دیا:

دریں صحرا گزر اُفتاد شاید کاروانے را　　　پس از مدّت شنیدم نالہائے ساربانے را

رات ساڑھے دس بجے کے قریب مہر واپس گئے۔[2]

سر اکبر حیدری کا خط ملا۔ ۵ر اکتوبر کو لکھا گیا تھا۔[3] عبدالرزاق کا خط بھی بھیجا۔ درخواست تھی کہ رقم کی ادائیگی کے لیے کوئی میعاد مقرر نہ کی جائے۔ کتاب کی فروخت کا دائرہ بہت محدود ہو گا۔ علامہ نے لکھا کہ ادائیگی کے لیے مزید مہلت پر تیار ہیں۔ افسوس کہ فروخت کو محدود رکھنے پر اصرار کرنا پڑا۔ جن لوگوں سے بانگِ درا کے لیے معاملہ ہونا ہے وہ اس کے بغیر نہ مانتے۔ اُن کے نقطۂ نگاہ سے بات معقول تھی۔ علامہ سمجھتے تھے کہ ہزار روپے کے لیے بھی وہ لوگ اُنہیں ذمہ دار ٹھہرائیں گے۔[4]

28

مسجد وزیر خاں کے خطیب مولوی دیدار علی کفر کا فتویٰ دینے میں تیز تھے۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو کے خلاف دے چکے تھے۔ پانچ برس پہلے جب تحریکِ خلافت کا وفد برطانوی وزیرِ اعظم سے ملاقات کے لیے لندن گیا اور پنڈت مالوی کی تائید بھی حاصل تھی، مولانا ظفر علی خاں نے لکھا تھا:

---

[1] ظفر علی راجا ایڈووکیٹ (۲۰۱۳) قانون دان اقبال، ص ۱۴۵-۱۴۶

[2] امجد سلیم علوی (۱۹۸۸) اقبالیاتِ مہر، ص ۲۶۳-۲۶۲

[3] سر اکبر حیدری کا خط علامہ اقبال کے نام ۵ر اکتوبر ۱۹۲۵ء (انگریزی)؛ علامہ اقبال میوزیم لاہور

[4] مکتوب بنام سر اکبر حیدری (انگریزی)۔ بلا تاریخ؛ علامہ اقبال میوزیم لاہور

یہ سچ ہے اُس پہ خدا کا چلا نہیں قابو　　مگر ہم اُس بتِ کافر کو رام کر لیں گے
بجائے کعبہ خدا آج کل ہے لندن میں　　وہیں پہنچ کے ہم اُس سے کلام کر لیں گے
جو مولوی نہ ملے گا تو مالوی ہی سہی　　خدا خدا نہ سہی، رام رام کر لیں گے

اِس برس کسی وقت مولوی دیدار نے اِن اشعار کی بنیاد پر کفر کا فتویٰ لگایا۔ کتابچے کی صورت میں شائع ہوا۔ جواب میں مولانا ظفر کی شاعری کا دامن وسیع ہو کر یہاں تک پہنچا:

پال کے آم کی چوسی ہوئی گٹھلی کا ہے صوف　　یا کہ ہے قبلہٗ دیدار علی کی داڑھی[1]

مولوی دیدار کو کسی ''پیر زادہ محمد صدیق سہارنپوری'' کی طرف سے استفتا موصول ہوا۔ کچھ اشعار درج تھے۔ شاعر کا نام نہیں لکھا گیا تھا۔ غالباً مولوی دیدار نے معلوم کرنے کی زحمت بھی نہ کی۔ فتویٰ لکھا اور پوچھنے والے کو بھیج دیا۔ اس طرح زمیندار کے پہلے صفحے پر بیحد سنسنی خیز خبر شائع ہو گئی۔

علامہ اقبال بھی کافر ہو گئے

ناوک نے تیرے صید نہ چھوڑا زمانے میں
تڑپے ہے مرغِ قبلہ نما آشیانے میں

مولوی دیدار علی اور اُن کے رفقائے تکفیر آج کل اِس شعر کے مصداق ہیں۔ کہ [ہمارے بزرگ بالوں کی سفیدی کی وجہ سے بزرگ بنے ہوئے ہیں ورنہ محلے کے لونڈوں کی دلچسپی کا سامان ہیں]

پیرہا پیر از بیاضِ مو شدند　　سخرہ بہرِ کودکانِ کُو شدند

اُن کے حد سے بڑھے ہوئے شوقِ تکفیر کو دیکھ کر ایک زندہ دل اور خوش طبع مسلمان نوجوان نے جو ''پیر زادہ محمد صدیق سہارنپوری'' کے نام سے موسوم ہونا پسند کرتے ہیں۔ مولوی دیدار علی صاحب کے پاس حسبِ ذیل استفتا بھیجا جس پر مولوی دیدار علی صاحب نے بے تکلف علامہ اقبال ایسے ترجمانِ حقیقت اور لسانِ اسلام کے کافر و فاسق ہونے کا فتویٰ دے دیا۔ اور اُن سے ملنے جُلنے والوں کو

---

[1] جعفر بلوچ (۱۹۹۵) علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں، ص ۳۶-۳۸

بھی ”سخت گنہگار“ قرار دے دیا ہے۔ ہمارے پاس اِس استفتا اور فتوے کا اصلی مسودہ محفوظ ہے۔ جس کو ہم قارئینِ کرام کی ضیافتِ طبع کے لئے ذیل میں نقل کرتے ہیں۔

اِستفتا

کیا فرماتے ہیں علمائے دین اور حامیانِ شرع مبین اس مسئلے میں کہ ایک شخص اشعار میں آفتاب کو خدائی صفات کے ساتھ متصف کرے اور اس سے مرادیں طلب کرے، آخرت پر یقین نہ رکھے، حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر سے استہزا کرے، علمائے کرام اور پیرانِ عظام پر آوازے کسے اور انہیں بُرے خطابات سے یاد کرے۔ ہندوؤں کے ایک بزرگ کو جسے وہ خدا کا اوتار مانتے ہیں، امام اور چراغِ ہدایت کے الفاظ سے یاد کرے اور اُس کی تعریف میں رطب ُللسان ہو۔ کیا ایسا آدمی اسلام پر ہے یا کفر پر؟ اس کے ساتھ لین دین، نشست و برخاست اور ہر طرح کا مقاطعہ کرنا جائز ہے یا ناجائز اور نہ کرنے والوں کے متعلق کیا حکم ہے؟ بینوا و توجروا۔ اشعار حسب ذیل ہیں۔

۱ آفتاب

اے آفتاب! ہم کو ضیائے شعور دے — چشمِ خرد کو اپنی تجلّی سے نور دے
ہے محفلِ وجود کا ساماں طراز تو — یزدانِ ساکنانِ نشیب و فراز تو
ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو — زائیدگانِ نور کا ہے تاجدار تو
نے ابتدا کوئی، نہ کوئی انتہا تری — آزادِ قید اوّل و آخر ضیا تری

(ترجمہ گایتری منتر)

۲ کہاں کا آنا، کہاں کا جانا، فریب ہے امتیازِ عقبیٰ
نمود ہر شے میں ہے ہماری، کوئی ہمارا وطن نہیں ہے

۳ خصوصیت نہیں کچھ اس میں، اے کلیم! تری — شجر حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں

۴ غضب ہیں یہ مرشدانِ خودبیں، خدا تری قوم کو بچائے
بگاڑ کر تیرے مسلموں کو، یہ اپنی عزت بنا رہے ہیں

رام کی تعریف میں فرماتے ہیں:

۵ اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت — مشہور جن کے دم سے ہے دنیا میں نامِ ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز — اہلِ نظر سمجھتے ہیں اس کو امامِ ہند
اعجاز، اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی — روشن تر از سحر ہے، زمانے میں شامِ ہند
تلوار کا دھنی تھا، شجاعت میں فرد تھا — پاکیزگی میں جوشِ محبت میں فرد تھا

المستفتی پیرزادہ محمد صدیق سہارنپوری

فتویٰ

بسم اللہ الرّحمن الرّحیم

اسم پروردگار اور یزداں عرفاً مخصوصِ ذاتِ جنابِ باری ہے اور اوتار ہنود کے نزدیک خدا کے جنم لینے کو کہتے ہیں۔ اندریں صورت یزداں اور پروردگار آفتاب کو کہنا صریح کفر ہے۔ علیٰ ہذا خدا کے جنم لینے کا عقیدہ بھی کفر اور توہینِ موسیٰ علیہ السلام بھی کفر اور توہینِ بزرگانِ دین فسق۔ لہٰذا جب تک ان کفریات سے قائلِ اشعارِ مذکورہ توبہ نہ کرے، اُس سے ملنا جلنا تمام مسلمان ترک کر دیں، ورنہ سخت گنہگار ہوں گے۔

ابو محمد دیدار علی، خطیب فی مسجد وزیر خان المرحوم [1]

29

علامہ کے خلاف صرف یہی فتویٰ دستیاب ہے۔ بعد میں مشہور ہوا کہ ۱۹۱۱ء میں 'شکوہ' لکھنے پر اُنہیں کافر قرار دیا گیا لیکن یہ درست معلوم نہیں ہوتا۔[2] ۱۹۱۵ء میں 'اسرارِ خودی' کی مخالفت ہوئی مگر کفر کا الزام نہ لگایا گیا۔ گزشتہ برس پڑھے جانے والے اجتہاد کے مقالے کے حوالے سے علامہ ایک خط میں

---

[1] زمیندار ۱۵/ اکتوبر ۱۹۲۵ء۔ اخبار کا عکس مجھے امجد سلیم علوی نے فراہم کیا۔

[2] دیکھیے خرم علی شفیق، اقبال: تشکیلی دور میں اپریل ۱۹۱۱ء کے واقعات

لکھ چکے تھے، "بعض لوگوں نے مجھے کافر کہا"۔[1] ہو سکتا ہے کہ ایسی بات زبانی کہی گئی ہو۔ فتویٰ صرف یہی ہے، جس کا تعلق اجتہاد والے مقالے سے نہیں ہے۔ یہ قیاس بھی درست معلوم نہیں ہوتا کہ اُس بیان کا نتیجہ تھا جو علامہ نے ابن سعود کے حق میں دیا۔[2] ابنِ سعود کے حق میں بیان قریباً ایک برس پہلے کی بات تھی۔ حقائق اِس مفروضے کی بھی نفی کرتے ہیں کہ "یہ علماٗ کے طبقے کا اس شخص سے انتقام تھا، جس نے مسلمانوں کو خودی کا احساس دلا کر ایک قوم یا ملّت کی صورت میں متحد کرنے کی جسارت کی تھی۔"[3] فتوے میں جن اشعار کا حوالہ دیا گیا وہ خودی سے متعلق نہ تھے۔ قریباً یقینی ہے کہ مولوی دیدار کو معلوم بھی نہ تھا کہ کس کے اشعار ہیں۔ اگر فتویٰ علامہ کی کسی بات کے خلاف ردِ عمل میں دیا جاتا تو مولوی دیدار کا حلقہ اس کی تشہیر بھی کرتا۔ وہ نہ کی گئی۔ زمیندار میں اشاعت نہ ہوتی تو کسی کو خبر نہ ہوتی۔ شاید مولوی دیدار بھی بیخبر ہی رہتے کہ کسے کافر قرار دے بیٹھے ہیں۔ یہی سمجھنا پڑتا ہے کہ اصل نشانہ علامہ نہ تھے۔ یہ مولوی دیدار کو نیچا دکھانے کی کوشش تھی۔ یہ بات زمیندار کے ادارتی نوٹ سے واضح ہے۔ چنانچہ اُس زمانے میں چودھری محمد حسین نے بھی یہی کہا:

> ہمارے "زندہ دل اور خوش طبع مسلمان نوجوان" ہیں کہ انہیں دل لگی سوائے پیرانہ سال مولویوں کے اور کسی سے نہیں سوجھتی۔ پیرزادہ محمد صدیق سہارنپوری خواہ فی الواقع کوئی صاحبِ وجود ہستی ہیں یا کسی خوش طبع کے طفیل صرف ان کے نام ہی کا وجود ۱۵/اکتوبر کے زمیندار میں صفحہ کاغذ پر وجود میں آیا...[4]

تیس برس بعد سالک نے علامہ کی سوانح میں اسفتا اور فتویٰ نقل کیے۔ نوٹ حذف کر دیا۔ "ایک زندہ دل اور خوش طبع مسلمان نوجوان" کی دل لگی اگلی نسل کی نظر میں "علماٗ کے طبقے کا انتقام" بن گئی۔

فتویٰ ۱۵/اکتوبر کے زمیندار میں چھپا۔ معمول کے مطابق یہ شمارہ ۱۳/اکتوبر کی شام کو نکلا ہو

---

[1] مکتوب بنام اکبر نجیب آبادی ۲۰/اپریل ۱۹۲۵ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۵۸۴

[2] یہ رائے ڈاکٹر جاوید اقبال نے زندہ رود میں ظاہر کی ہے؛ ص ۳۵۱

[3] ایضاً، ص ۳۵۳-۳۵۲

[4] 'علامہ اقبال اور دارُ التکفیر دیدار یہ'، زمیندار ۳۰/اکتوبر ۱۹۲۵ء۔ تفصیلات اُس تاریخ کے تحت درج کی جا رہی ہیں۔

گا۔ ۱۴/ اکتوبر کو رات نو بجے علامہ نے غلام رسول مہر کو بلایا۔ تعجب ہے کہ مہر کے روزنامچے میں اُس رات کی گفتگو میں فتوے کا ذکر نہیں ہے۔ "جے کے متعلق باتیں" کی مبہم عبارت ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ "جے" سے کیا مراد ہے۔ علامہ نے مولانا روم کی مثنوی کا شعر پڑھا کہ خدا قوموں کو صرف اُس وقت رُسوا کرتا ہے جب کسی صاحبِ دل کا دل دُکھائیں:

تا دلے صاحب دلے نالد بہ درد   ہیچ قومے را خُدا رُسوا نہ کرد

"اِس پر بے اختیار آنسو نکل پڑے،" مہر نے لکھا ہے۔ علامہ کا حجاز کے سفر کا ارادہ ملتوی ہو چکا تھا۔ پیغامِ مدینہ کے تین شعر نازل ہوئے تھے۔ کہنے لگے کہ اگر چھ سات ہو جائیں تو مہر کو دیں گے کہ وہاں جا کر پڑھ دیں۔ احمدیت پر کچھ اعتراض کیے۔ مہر نے یوں نوٹ کیا ہے، "منارہ قادیانی کی تحریک کے وقت یہ کہنا کہ اس کا ذکر قرآن میں ہے۔ سورہ ہل اتی [سورۃ الدھر] میں۔ ویعمرون المنار عریضاً۔ پھر پوری سورہ بنادی۔"

معلوم ہوتا ہے کہ اپنا اخبار نکالنے کا خیال مہر کے دل میں پیدا ہو چکا تھا۔ روزنامچے میں درج ہے، "اخبار کا خیال۔ چوہدری [محمد حسین] کی تجویز۔ میں نے [علامہ سے] کہا آپ ساتھ ہیں تو ٹھیک ہیں۔ ڈاکٹر صاحب [علامہ نے] کہا نہیں تم دو تو نہ نکال سکو گے۔ اگر میں بھی ساتھ ملوں تو البتہ نکل سکے۔ قہقہہ..." ساڑھے بارہ بجے کے قریب مہر واپس گئے۔[1]

۱۷/ اکتوبر کو علامہ نے حکومتِ ہند کے پولیٹیکل سیکرٹری جے پی تھامسن (J. P. Thompson) سے نجی اور خفیہ خط میں درخواست کی کہ کشمیر کی ریاستی مجلس میں ملازمت دلوانے میں مدد کریں۔ گورنر سے واقفیت ہے لیکن کہنا نہیں چاہتے۔ پالن پور کے نواب سے بھی دوستانہ مراسم ہیں اور وہ مہاراجہ کشمیر کے دوست ہیں۔ علامہ نے صاف لکھا کہ گردوپیش کے ماحول سے سخت بیزار ہیں۔ پہلے بھی اُن کے لیے مشکلات رہی ہیں لیکن اب چیف جسٹس کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ وہ اُس کے خلاف مظاہرہ کروانے کی کوشش کر رہے ہیں جبکہ حقیقت میں وہ ایسی سازش کرنے

---

[1] امجد سلیم علوی (۱۹۸۸) اقبالیاتِ مہر، ص ۲۶۴-۲۶۳

کے قابل ہی نہیں۔ اس لیے لاہور میں وکالت کرنا اُن کے لیے مشکل ہو جائے گا۔ دوسرے اسباب بھی ہیں ”جن کا ذکر اس خط میں کرنے سے قاصر ہوں“۔ تحریر میں غیر معمولی بددلی جھلکتی ہے:

> I am writing this letter to you in a matter which intimately concerns me in the hope that you will extend a helping hand to me at a time when I need it most … I am thoroughly disgusted with my surroundings and would like very much to run away from them. Now it is my conviction that one stroke of your pen can save me from all my worries, and for this reason, relying on your large hearted kindness, I come to seek your patronage … If you push me a little you will be doing me a great good indeed spiritually as well as materially, and I shall ever gratefully remember your generous kindness.[1]

پیر سید رحمت اللہ شاہ مریدوں کے اصرار پر لاہور سے جیکب آباد گئے ہوئے تھے۔ علامہ کو خط لکھا۔ ۲۰/ اکتوبر کو جواب دیتے ہوئے علامہ نے لکھا، ”دیوان طرزی، بڑی خوشی سے بھیج دیجیے گا۔“[2]

عبدالرحمٰن چغتیز لاہور ہائی کورٹ میں وکالت کرنے کے بعد دہلی چلے گئے۔ وہاں میونسپل کمیٹی کے وائس چیئرمین تھے۔ مسلمانوں میں فرقہ واریت کو ختم کرنے کے لیے سوسائٹی قائم کر کے علامہ سے صدارت کی درخواست کی۔ ۲۱/ اکتوبر کو علامہ نے معذرت کر لی۔[3]

مکتوب بنام عبدالرحمٰن چنگیز

Lahore
21st October, 1925
My Dear Changez,

Thanks for your letter which I received yesterday. I am afraid I cannot disclose yet what I feel or think about the subject of your letter. But I can tell you this much that I started a society of this kind some time ago, exactly on the lines you suggested. As a matter of fact I went much further than you in the matter to toleration. But for various reason, which

---

[1] اقبال میوزیم لاہور میں موجود خط کا عکس اقبال اکادمی پاکستان کے پاس موجود ہے۔ نیز برنی (۱۹۹۱)، ص ۶۰۹، ۸۲۸۔

[2] مکتوب بنام پیر سید رحمت اللہ ۲۰/ اکتوبر ۱۹۲۵ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۱۲-۶۱۱

[3] مکتوب بنام چنگیزی (انگریزی)، ۲۱/ اکتوبر ۱۹۲۵ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۱۳-۶۱۲

is not possible to be described in letter, the Society remained a kind of private institution only. It is, however, clear that in the deeper consciousness of Islam the demand for reunion of Muslim sects is shaping itself. It is my belief that a society of this kind may be able to do some spade work, but the reuniting of the sects is really the work of a great personality rather that of a society. The President of such society now has to be evolved, not to be elected. This is one of the reasons why our society remained a private institution only. At any rate, I soon discovered my own short-coming and lost enthusiasm that I originally had for it, The truth is that the wrangling of sects is mainly due to the Muslims' loss of touch with the living fountain of religious life. At present I do not feel I am a fit person to lead this movement. But it may be that this is the kind of work that I have eventually got to do. I have full sympathy with you but request you not to make me your President, at least for the present. I hope that your society is not the result of your personal friendship (Excuse a bit of cruel psychology), but has arisen out of a living experience of the soul.

I shall be always ready with my advice in case you need it.

Yours etc.
Muhammad Iqbal

30

۲۶/ اکتوبر کو مولانا ظفر علی خاں اور غلام رسول مہر خلافت کے وفد کے ساتھ حجاز روانہ ہوئے۔[1] زمیندار کی ادارت عبدالمجید سالک نے سنبھالی۔ ۳۰/ اکتوبر کا شمارہ قاعدے کے مطابق ۲۸/ کی شام کو چھپا ہو گا۔ اُس میں مولوی دیدار کے فتوے کے جواب میں مضمون 'علامہ اقبال اور دارُالتکفیر دیدار یہ' شائع ہوا۔ لکھنے والے کے نام کی جگہ "سب سے بڑا 'اقبالی' گناہگار" درج تھا۔ ادارتی نوٹ کے مطابق اسے "ہمارے فاضل مضمون نگار اور محترم بھائی نے، جو علامہ اقبال کے فیضِ صحبت سے سب

[1] مہر نے روزنامچے میں لکھا کہ ۲۶/ اکتوبر ۱۹۲۵ء کو حجاز کے لیے روانہ ہوئے اور ۱۲/ فروری ۱۹۲۶ء کو واپسی ہوئی؛ امجد سلیم علوی (۱۹۸۸) اقبالیاتِ مہر، ص ۲۶۵۔ علوی نے اپنے والد غلام رسول مہر کی روایت مجھے بتائی ہے کہ حجاز میں راغب سے مدینہ جاتے ہوئے ایک مقام پر پہاڑوں کے پاس سے گزرتے مولانا ظفر نے مہر سے کہا کہ ہمارے ڈاکٹر اقبال کہا کرتے ہیں کہ اس سر زمین میں قدرت نے قیمتی خزانے پوشیدہ کر رکھے ہیں۔ ابھی وہاں تیل دریافت نہ ہوا تھا۔

سے بڑھ کر مستفید ہیں"، تحریر کیا تھا۔[1] اِس سے ظاہر تھا کہ چودھری محمد حسین ہیں۔ تیس برس بعد سالک نے علامہ کی سوانح میں بھی اشارہ کیا۔[2] مضمون میں اُن اشعار کی تشریح کی گئی جنہیں فتوے میں استعمال کیا گیا تھا، مثلاً:

ہے محفلِ وجود کا ساماں طراز تو　　یزدانِ ساکنانِ نشیب و فراز تو

ہر چیز کی حیات کا پروردگار تو　　زائیدگانِ نور کا ہے تاجدار تو

محمد حسین نے لکھا کہ اشعار نظم 'آفتاب' سے ہیں جو ہندوؤں کے منتر گایتری کا ترجمہ ہے۔ ترجمہ کرنے سے کوئی مسلمان کافر نہیں ہوتا۔ اقبال نے مزید احتیاط کی کہ عربی زبان کے الفاظ استعمال نہ کیے جو قرآنی اصطلاحات ہیں۔ فارسی کے الفاظ استعمال کیے کہ وہ بھی سنسکرت کی طرح آریائی زبان ہے۔ منتر میں روح کو سورج سے تشبیہ دی گئی، اقبال نے سورج کے لیے آفتاب کا لفظ استعمال کیا۔ "پروردگار" کا لفظ فارسی میں صرف خدا سے مخصوص نہیں۔ ایرانی تو شراب کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ یزداں، اسلام سے پہلے خیر و برکت کی مالک ازلی ہستی کا نام تھا جس کے مقابلے پر بدی کی مالک ہستی اہرمن کو بھی ازلی سمجھا جاتا تھا۔ لفظ "خدا" بھی فارسی میں غیر اللہ کے لیے عام استعمال ہوتا تھا۔ مولوی دیدار کا یہ کہنا درست نہیں کہ پرودر گار اور یزداں کے الفاظ "عرفاً مخصوصِ ذاتِ جنابِ باری" ہیں۔ درحقیقت اللہ اور رحمٰن کے سوا اور کوئی لفظ ذاتِ باری کے لیے مخصوص نہیں۔

ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز　　اہلِ نظر سمجھتے ہیں اُس کو امامِ ہند

اعجاز، اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی　　روشن تر از سحر ہے، زمانے میں شامِ ہند

ہندو رام کو اوتار مانتے ہیں مگر اقبال نے صرف "امام" اور "چراغِ ہدایت" قرار دیا۔ اسلامی عقائد کے دائرے سے قدم باہر نہ نکالا۔ "مگر مولانا موصوف [دیدار علی] کو جب لطف آتا اور ان کے نزدیک اقبال جب 'مومن' ہوتا اگر وہ نظم میں 'رام' کو ایک دو بے نقط سناتا اور سب سے بڑی بات یہ کہ اُس پر

---

[1] اختر النسا (۲۰۱۰) اقبال اور زمیندار، ص ۱۲۲

[2] سالک، ذکرِ اقبال، ص ۱۳۰

'کفر' کا فتویٰ لگاتا،" مضمون نگار نے لکھا۔

خصوصیت نہیں کچھ اس میں، اے کلیم! تری　　　شجر حجر بھی خدا سے کلام کرتے ہیں

مولوی دیدار نے لکھا تھا کہ یہ ایک پیغمبر کی توہین اور کفر ہے۔ محمد حسین نے مولانا روم کی مثنوی کی مشہور حکایت درج کی جس میں خدا کی زبانی حضرت موسیٰ کو سرزنش کروائی گئی اور تمام قصہ فرضی تھا۔ مولانا روم نے ایک اور جگہ واضح کیا تھا کہ اشعار میں ایسی باتیں دیکھ کر ظاہر کی بجائے ان کے مقصد پر غور کرنا چاہئیے۔

غضب ہیں یہ مرشدانِ خودبیں، خدا تری قوم کو بچائے
بگاڑ کر تیرے مسلموں کو، یہ اپنی عزت بنا رہے ہیں

یہاں "مرشدانِ خودبیں" سے مراد بزرگانِ دین نہیں بلکہ مغرب پرست رہنما تھے جنہیں نظم میں "زائرینِ حریمِ مغرب" کہہ کر بات واضح کر دی گئی تھی۔

محمد حسین نے مولوی دیدار پر بھی چوٹ کی۔ یہ سوال بھی اُٹھایا کہ فتوے میں غلط اصول بیان کرنے کے بعد وہ خود کہاں تک ایمان پر قائم رہے۔ مفتیوں کی موجودہ روش پر بھی تنقید کی جو صرف استفتاء دیکھ کر فتویٰ دیتے تھے۔ موضوع پر ماہرانہ رائے حاصل نہ کرتے تھے۔[1]

31

قاضی عبدالمجید قرشی، علامہ کے ملاقاتیوں میں سے تھے۔ اُن کا بیان ہے کہ ۲۸/اکتوبر کو علامہ نے اُن سے کہا کہ ایک کتاب لکھیں۔ نومسلموں سے ملاقات کر کے ان کے قبولِ اسلام کی وجوہات معلوم کی جائیں۔ انہیں ایک کتاب میں جمع کر دیا جائے۔ وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ قبولِ اسلام کا تعلق دماغ سے زیادہ دل کے ساتھ ہے۔ اس کتاب کے لیے چار دلچسپ مثالیں فراہم کرتے ہوئے داؤد اپسن کا ذکر کیا۔ پلاؤ سے متاثر ہو کر مسلمان ہوئے تھے۔ لیڈی بارنس کا واقعہ بیان کیا۔ ۲۹/اکتوبر کو ہندو جج کی بیوہ کا واقعہ سنایا۔ چند برس پہلے شوہر کی وفات کے بعد مسلمان ہوئی تھی۔ کہتی تھی کہ

[1] اختر النسا (۲۰۱۰) اقبال اور زمیندار، ص ۱۳۰-۱۲۲

ہندوؤں کے جسم سے بدبو محسوس ہوتی ہے مگر "غریب سے غریب مسلمان عورتوں کے جسم میں بھی یہ بُو موجود نہ تھی۔" کچھ عرصہ پہلے فیروزپور سے ایک ہندو مولانا اصغر علی روحی کے پاس آیا۔ دولتمند، تعلیم یافتہ اور روشن خیال کاروباری تھا۔ خواب میں کئی مرتبہ پیغمبرِ اسلامؐ کی زیارت ہوئی تھی۔ مولانا کے ہاتھ پر مسلمان ہوا۔ کاروباری حالات کی وجہ سے ظاہر نہ کر سکتا تھا۔ خفیہ رکھنے کی درخواست کی۔ علامہ نے قریشی سے کہا کہ اگلے وقتوں کے مبلغ غیر مسلموں کے دلوں کو متاثر کرتے تھے۔ اپنی للٰہیت، بے نفسی، خوش خلقی اور احسان و مروت سے دوسروں کو اپنے رنگ میں رنگ لیتے تھے۔ جدید مبلغوں کا سارا زور دماغ کی تبدیلی پر ہوتا ہے۔ دلائل دیتے ہیں۔ ضد پیدا ہوتی ہے۔ ہدایت ختم ہو جاتی ہے۔ [1]

جیکب آباد سے سید رحمت اللہ نے اپنے رئیس زادے مرید غلام سرور مغل کا دیوانِ طرزی علامہ کو بھجوایا۔ غلام سرور کے حالات بھی بیان کیے۔ ۳/ نومبر کو علامہ نے جواب دیا:

> غلام سرور کے حالات معلوم کر کے مجھے افسوس ہوا، گو تعجب نہیں ہوا۔ اسی اندیشے کی وجہ سے میں نے آپ کو اسے لاہور رکھنے کی اجازت نہ دی تھی۔ آپ کو یاد ہو گا۔
>
> بہر حال اب دعا ہے اللہ تعالیٰ اس پر فضل و کرم کرے۔ میں انشاً اللہ اس کے لیے دعا کروں گا۔ اگرچہ میں کیا اور میری دعا کیا۔ تاہم چونکہ اس [میں] غرض کا شائبہ نہ ہو گا۔ اس واسطے ممکن ہے درگاہ رب العزت میں قبول ہو جائے۔ فی الحال آپ اسے میری طرف سے کہیے یا لکھیے گا کہ وہ اپنے موجودہ طرز زندگی کو ترک کر دے کہ اس کا انجام تباہی ہے۔ اگر انسان کو معلوم ہو جائے کہ اس کے خمیر میں لذت [و] سرور کے تمام سامان موجود ہیں تو کبھی بیرونی لذتوں کی تلاش میں سرگرداں نہ ہو۔ مگر آہ! جوانی میں انسان کی نظر خارجی دنیا کی چیزوں پر پڑتی ہے اور وقت گزر جاتا ہے اور اکثر انسانوں کو اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ وہ ایک گرانمایہ متاع کھو چکے ہیں۔ [2]

---

[1] عبداللہ قریشی (۱۹۸۶) 'اقبال کی باتیں اور ملاقاتیں' ص ۱۲۷-۱۱۴؛ لیڈی بارنس کے لیے اوئل ۱۹۲۷ء دیکھیے

[2] خط اور پس منظر جنگ کراچی کے اقبال اڈیشن ۱۹۷۳ء میں یوسف علی خاں کے مضمون کے حوالے سے شاہین (۱۹۷۶)

۸ر نومبر کے زمیندار میں حکیم احمد علی فیروز پوری کی طرف سے مولوی دیدار کے لیے یہ طنزیہ سوال شائع ہوا کہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے اپنی شہرۂ آفاق تصنیف مدارج النبوت میں ابرِ بہار کو سبزہ و گل کا ''پروردگار'' کہا تھا۔ کیا وہ بھی کافر ٹھہرے؟[1]

اُسی روز ملک لال دین قیصر کی طرف سے بانگِ درا کی بعض نظموں کا اشتہار شائع ہوا جو کتابچوں کی صورت میں علیحدہ علیحدہ شائع ہوئی تھیں۔[2]

خضرِ راہ

علامہ اقبال کے کلام باالہام کی تعریف میں کچھ لکھنا سورج کو آئینہ دکھانا ہے۔ سر اقبال موصوف نے اس نظم ''خضرراہ'' میں اپنی ذاتِ والا صفات کو شاعر کا خطاب دے کر ''خضرِ راہ'' کے تصور میں اپنے دل کا جواب اپنی زبان سے جو کچھ دیا ہے، اس کا لطف کچھ پڑھنے والے کو ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ قیمت ۴ر

''جواب شکوہ'': ۴، ''شکوہ'': ۲، ''تصویر درد'': ۴، ''شمع و شاعر'': ۴، (بانگ درا)

مالک لال دین قیصر تاجر کتب: کشمیری بازار، لاہور۔

زمیندار ۸ر نومبر ۱۹۲۵ء

32

رشید احمد صدیقی کی عمر تینتیس برس تھی۔ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں اُردو کے لیکچرار تھے۔ اُن لوگوں میں سے تھے جو بچپن ہی سے علامہ کی شاعری کے سحر میں گرفتار رہ کر بڑے ہوئے تھے۔ ''میں نے مدتوں اِس امر کا التزام رکھا کہ اقبال کی جو بات سمجھ میں نہ آئے وہ کسی سے پوچھی نہ جائے،'' اُن کا کہنا ہے۔ ''محض اِس خیال سے کہ میں نے جن بنیادوں پر اپنی جنت تعمیر کی ہے دوسرا اُسے مسمار نہ کر

اوراقِ گم گشتہ، ص ۱۵۰-۱۴۷

[1] زمیندار ۸ر نومبر ۱۹۲۵ء

[2] اختر النسا (۲۰۱۰)، ص ۱۰۲

دے۔ الفاظ اور فقرے سمجھ میں آتے تھے، اصلی مفہوم متیقن نہ ہوتا تو اپنی طرف سے مفہوم کی دنیا بناتا اور اُس میں خوب گھوم پھر کر اور لطف اٹھا کے باہر نکل آتا۔‘‘[1]

رشید لاہور آئے۔ صبح نو دس بجے علامہ کی کوٹھی پر پہنچے۔ علامہ کسی مقدمے کی پیروی کے لیے عدالت جانے والے تھے۔ بو باندھتے اور کالر درست کرتے ہوئے آئے۔ خوش دلی اور شفقت سے ہاتھ ملایا۔ کچھ دیر تک ہاتھ میں ہاتھ لیے رہے۔ بھاری بھر کم لہجے میں کہا، ’’آپ ہیں جی صدیقی صاحب۔‘‘ رشید کہتے ہیں کہ علامہ کی زبان سے ق کا غلط تلفظ سن کر متعجب ہوئے۔ علامہ نے علی بخش کو آواز دے کر پنجابی میں قلم لانے کو کہا۔ ایک دفعہ پھر ق کا تلفظ وہی تھا۔ رشید یہ سمجھ کر آئے تھے کہ عام پنجابیوں کے برعکس اُردو کے سب سے بڑے زندہ شاعر کا تلفظ بالکل درست ہو گا لیکن علامہ کے تلفظ میں اور ہاتھ ملانے میں کچھ ایسا خلوص تھا کہ یوں محسوس ہوا جیسے ’’اقبال ایسے نہ ہوتے تو کچھ نہ ہوتا۔‘‘ کچھ دیر کے لیے علامہ کمرے میں آ بیٹھے۔ علیگڑھ کا حال دریافت کرتے رہے۔

شام کو رشید دوبارہ آئے۔ اُن کا بیان ہے کہ کچھ اور لوگ بھی آئے۔ ایک نوجوان شاعر نے جدید ایرانی لہجے میں اپنا کلام سنایا۔ گفتگو میں اپنی بڑائی ظاہر کرنے کا انداز تھا۔ علامہ پہلے بیزار ہوئے۔ پھر اچانک اٹھے اور کوٹھی کے اندرونی کمروں کی طرف چلے گئے۔ نشست برخاست ہو گئی۔ صرف دو چار لوگ بیٹھے رہ گئے۔ کافی دیر بعد علامہ واپس آئے۔ کچھ دیر حقے کے کش لیتے رہے۔ پھر کہا، ’’نعمت کے مطابق انسان کو ظرف نصیب نہ ہو تو نعمت لعنت بن جاتی ہے۔‘‘ کچھ دیر بعد طبیعت بحال ہو گئی۔

رشید اگلے روز بھی آئے۔ علامہ کو کہیں نہ جانا تھا۔ تقریباً تمام دن گفتگو رہی۔ رشید نے ان کے فوق البشر یعنی مردِ مومن کے بارے میں سوالات پوچھے۔ علامہ نے بڑی خوبی سے وضاحت کی۔ پھر عورتوں کا درجہ، بعثتِ نبویؐ کا وقت اور مقام، فقہ اسلامی میں اجتہاد کے مسائل پر گفتگو ہوئی۔ علامہ اجتہاد والے مقالے پر علمائے کرام سے تبادلۂ خیالات کرنا چاہتے تھے۔ رشید نے ابوالکلام آزاد اور سید

---

[1] رشید احمد صدیقی (۱۹۷۶) اقبال شخصیت اور شاعری، ص ۲

سلیمان ندوی کے نام لیے۔ علامہ نے دونوں کے بارے میں اعتماد کا اظہار کیا۔[1] ممکن ہے یہی وہ ملاقات رہی ہو جس کے بارے میں رشید نے بعد میں ایک دلچسپ بات لکھی:

میں نے ایک دفعہ کسی قدر گستاخ ہو کر ۱۹۲۵ء میں اُن سے کہہ دیا تھا "ڈاکٹر صاحب! آپ نے دنیا کو دھوکہ دے رکھا ہے۔ اِس فریب کو دنیا نے کبھی پا لیا تو کیا ہو گا۔" یہ سن کر متحیر ہو گئے لیکن مسکرا کر پوچھا "کیوں کیا بات ہے؟" میں نے عرض کیا "ہم سب یہ سمجھتے ہیں کہ آپ نے بڑی محنت اور بڑے غور و فکر کے بعد اپنے خیالات اپنے اشعار میں قلمبند کر دیئے ہیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ آپ جو کچھ جانتے پہچانتے ہیں اُس کا عشرِ عشیر بھی آپ کے کلام میں نہیں ہے۔ یہ تو بڑا ستم ہے کہ ہم صرف اتنا ہی جان کر اِکتفا کر لیں اور آپ یہ غضب کر رہیں کہ شعر و شاعری سے آگے نہیں بڑھتے۔ آپ کی صحبتوں میں وہ باتیں معلوم ہوتی ہیں جن کی آپ کے اشعار میں کہیں کہیں دھوپ چھاؤں سے مل جاتی ہے۔ حالانکہ آپ بات بات میں وہ نکتے بتا جاتے ہیں جو مدتوں مطالعہ کے بعد شاید نہ معلوم ہوتے۔"

ڈاکٹر صاحب بڑے زور سے ہنسے۔ سر کرسی کے تکئے پر ڈال دیا۔ چھت کی طرف دیکھتے رہے۔ پھر حقے کا ایک گہرا کش لے کر بولے "دیکھو دنیا جس آفت میں مبتلا ہے اُس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ جو لوگ جانتے ہیں وہ پورے طور پر بتا نہیں سکتے اور جو لوگ نہیں جانتے وہ سب کچھ بتانے پر آمادہ رہتے ہیں اور بتاتے بھی رہتے ہیں۔" اُس کے بعد ایک عجیب انداز سے مسکرا کے کہنے لگے "تو پھر کیا چاہتے ہو" اُس کے بعد پھر ایسی بات بتائی جس کے بتانے کا یہ موقع نہیں۔![2]

[1] رشید احمد صدیقی (۱۹۷۶)، اقبال شخصیت اور شاعری، ص ۱۴-۱۰

[2] رشید احمد صدیقی (۱۹۷۶)، اقبال شخصیت اور شاعری، ص ۸-۷

33

مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن آف سدرن انڈیا (Muslim Educational Association of Southern India) ۱۹۰۲ء میں قائم ہوئی۔ دسمبر ۱۹۰۱ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس مدراس کا نتیجہ تھی۔ مقصد مسلمانوں کی تعلیم اور ترقی تھا۔ اس کے تحت تعلیمی ادارے قائم تھے۔[1]
اب توسیعی خطبات (extensive lectures) کا سلسلہ شروع کیا۔ اس کا نام مدراس لیکچرز آن اسلام (Madras Lectures on Islam) تھا۔ اکتوبر کے پہلے ہفتے سے نومبر کے آخری ہفتے تک سید سلیمان ندوی نے سیرتِ نبویؐ کے مختلف پہلوؤں پر آٹھ خطبات دیئے۔[2] اگلے برس محمد مارماڈیوک پکتھال اسلامی ثقافت پر لیکچرز دینے والے تھے۔[3]

علامہ کو بھی توسیعی خطبات پیش کرنے کی دعوت دی گئی۔ سفر کے اخراجات ایسوسی ایشن کے ذمے تھے۔ معاوضہ بھی ملتا۔ عبداللہ چغتائی سے روایت ہے کہ طویل سفر کی وجہ سے علامہ نے دعوت نامے کی طرف زیادہ توجہ نہ دی۔ احباب علامہ کو راضی کرنے لگے۔[4]

---

[1] بھارت کے شہر چنائی (سابقہ مدراس) میں اب بھی قایم ہے۔ اس کے تحت چلنے والے اداروں میں میسی کالج آف ایجوکیشن (MAESI College of Education) نمایاں ہے۔ معلومات یکم مئی ۲۰۰۷ء کو کالج کی ویب سائٹ سے لی گئیں: http://www.measiedu.org/measi_profile.php۔ علامہ نے خطبات کے دیباچے میں مختصر نام 'مسلم ایسوسی ایشن مدراس' لکھا ہے۔ عبداللہ چغتائی نے انقلاب کے ۱۱/ جنوری ۱۹۲۹ء کے پرچے میں لکھا کہ سیٹھ جمال محمد نے "اسلامی علوم وفنون پر سالانہ لیکچروں کا ادارہ قائم کر رکھا ہے"؛ افضل (۱۹۸۶) گفتار اقبال، ص۲۱۹۔ ممکن ہے کہ توسیعی لیکچرز کا سلسلہ جمال محمد نے شروع کروایا ہو۔ مگر ۱۹۷۷ء میں چغتائی نے 'علامہ اقبال کا جنوبی ہند کا سفر' میں لکھا کہ ایسوسی ایشن بھی جمال محمد نے "اپنی کوشش اور خرچ پر" قائم کی تھی۔ اقبال کی صحبت میں میں بھی یہی تاثر پیش کیا۔ یہ درست نہیں مگر دہرایا رہا ہے، مثلاً ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۴) زندہ رود، ص۴۱۱

[2] یہ خطبات ۱۹۲۶ء کے موسمِ گرما میں شائع ہوئے؛ سلیمان ندوی (۱۹۸۳) خطباتِ مدراس، ص۷-۵۔

[3] Marmaduke Pickthall (1907) *The Cultural Side of Islam*; inner title page

[4] چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۳۰۵-۳۰۴، نیز 'علامہ اقبال کا جنوبی ہند کا سفر'، ص۱۹-۱۸۔ ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۴)، زندہ رود، ص۴۱۱ پر درج ہے کہ اوائل ۱۹۲۵ء میں دعوت موصول ہوئی مگر حوالے میں درج

جرمن ماہرِ طبیعیات میکس پلانک (Max Planck) کے نظریۂ مقادیر (Quantum Theory) کے تحت کیے گئے تجربات کے بعد یہ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ جوہر (atom) مکان (space) میں اپنا راستہ تسلسل کے ساتھ طے کرتا ہے۔ وائٹ ہیڈ نے اپنی تازہ تصنیف سائنس اور دنیائے جدید (Science and the Modern World) میں اِس کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا کہ جوہر مکان میں مختلف مقامات پر ظاہر ہوتا ہے اور ہر مقام پر کچھ دیر قیام کرتا ہے۔ جیسے کوئی موٹر کار سڑک پر تیس میل فی گھنٹہ کی رفتار سے جاتے ہوئے سڑک پر مسلسل سفر نہ کرے بلکہ صرف ہر سنگِ میل پر دو دو منٹ کے لیے نمودار ہوتی جائے۔[1]

نوجوان خواجہ عبدالحمید تعلیم مکمل کرنے کے بعد اسلامیہ کالج سے وابستہ ہو گئے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ ۱۹۲۴ء سے ۱۹۲۷ء تک قریباً ہر ہفتے علامہ سے ملاقات کے لیے آتے رہے۔ ''میرے ذمے

ہے، ''متعلقاتِ خطبات اقبال مرتبہ ڈاکٹر سید عبداللہ، صفحات، ۱۷ تا ۲۰۔ متعلقات کے اُن صفحات پر چغتائی کا مضمون 'علامہ اقبال کا جنوبی ہند کا سفر' ہے، جہاں جنوری ۱۹۲۵ء کا کوئی ذکر نہیں۔ متذکرہ بالا مضمون میں چغتائی یہ بھی لکھتے ہیں: ''اِس سے پیشتر یہی انجمن علامہ سید سلیمان ندوی اور محمد مارماڈیوک پکتھال کو اِس ضمن میں مدعو کر چکی تھی اور اُن کے لیکچروں کے مجموعے بھی شائع کر چکی تھی''؛ ص۱۸۔ اقبال کی صحبت میں میں لکھتے ہیں کہ ایسوسی ایشن نے ''دعوت دی اور لکھا کہ ... اس سے پیشتر ہمارے ہاں علامہ سید سلیمان ندوی اور مسٹر مارماڈیوک پکتھال کے لیکچر بھی ہو چکے ہیں''؛ ص۳۰۷۔ چغتائی کی یادداشت نے غلطی کی ہے۔ ندوی نے اکتوبر-نومبر ۱۹۲۵ء میں خطبات دیئے اور وہ ۱۹۲۶ء کے موسمِ گرما میں شائع ہوئے (دیکھیے ندوی، خطباتِ مدراس، ص۷،۵)۔ پکتھال کے لیکچرز جنوری ۱۹۲۷ء میں دیئے گئے اور اُسی برس شائع ہوئے (دیکھیے Pickthall (1907) *The Cultural Side of Islam*، اندرونی سرورق)۔ ۲۴/جولائی ۱۹۲۶ء کے زمیندار میں آیا کہ ایسوسی ایشن ''ایک مدت سے'' علامہ کو خطبات پر آمادہ کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جب دعوت نامہ ملا، اُس وقت پکتھال کے لیکچرز نہیں ہوئے تھے اور ندوی کے خطبات کی اشاعت بھی نہ ہوئی تھی۔ یہ ممکن ہے کہ ندوی اپنے خطبات ایسوسی ایشن کے سامنے پیش کر چکے ہوں اور علامہ کے نام دعوت نامے میں انہی کا تذکرہ ہو۔ اس کا مطلب ہے کہ اواخر ۱۹۲۵ء یا اوائل ۱۹۲۶ء میں دعوت ملی۔

[1] یہ اقتباس تشکیلِ جدید کے تیسرے خطبے میں استعمال کیا؛ Iqbal (1934), *Reconstruction*

ایک فرض یہ تھا کہ فلسفہ اور جنرل سائنس کے متعلق جو اچھی اور تازہ چھپی ہوئی کتاب نظر سے گزرے اُسے اُن کی خدمت میں پیش کروں اور پیش کرنے سے پہلے پڑھ لوں، ''اُن کا بیان ہے، ''کتاب لیتے وقت وہ مجھ سے اس کے متعلق رائے پوچھتے ہوئے اچھاخاصہ امتحان لے لیا کرتے تھے۔''

اُن کے مطابق ۱۹۲۵ء میں ایک شام اسلامیہ کالج کے کچھ طلبہ علامہ کے پاس آئے۔ ایک مشاعرہ کرنے کا ارادہ تھا۔ علامہ سے صدارت کی درخواست کی۔ علامہ نے انکار کر دیا۔ انہیں ''شعر بازی'' سے باز رہنے کی تلقین کی۔ نثر نگاروں کی ضرورت ہے۔ محنت اور مطالعے کے بعد اُردو میں مختلف موضوعات پر لکھیں۔ اپنی قوم کو اور خود اپنے آپ کو بہتر بنائیں۔

عبدالحمید کے مطابق اُس برس ایک نامور بزرگ لاہور آئے۔ انگریزی پر عبور رکھتے تھے اور فنِ تقریر میں بہت کم لوگ اُن کے برابر تھے۔ عبدالحمید نے علامہ سے بہت تعریف کی۔ علامہ نے کہا کہ انبیا اور اولوالعزم قومی مصلحین کو چھوڑ کر جو لوگ زیادہ تقریریں کرتے ہیں اُن میں روحانیت کا فقدان ہوتا ہے۔[1]

عبدالحمید اسلامیہ کالج کے رسالے کریسنٹ (*Crescent*) کے مدیر تھے۔ اس برس رسالے میں علامہ کا انگریزی مضمون 'خودی، نظریۂ اضافیت کی روشنی میں' ('Self in the Light of Relativity') شائع ہوا۔ علامہ کا بیان ہے، ''میں نے یہ مضمون ان طلبہ کے لیے لکھا تھا جو اضافیت سے کسی قدر آشنا تھے، اس واسطے مختصر لکھا، مفصل لکھنے کے لیے نہ وقت تھا نہ ضرورت۔ غالباً ایسے ریڈر کو اس سے کچھ فائدہ نہ پہنچے گا جو فلسفہ کے بعض مسائل اور نظریہ اضافیہ سے آشنا نہیں ہے۔''[2]

بنیادی نکات یوں تھے:

۱ جدید سائنس نے ظاہر کیا ہے کہ کسی چیز کا علم حاصل کرنے میں جو عوامل کارفرما ہوتے ہیں وہ سب داخلی ہیں۔ مثلاً ستارے کو دیکھنے میں جو عوامل کارفرما ہوتے ہیں وہ سب دیکھنے

---

[1] عبدالحمید (۱۹۴۴) 'اقبال کے علمی جواہر ریزے'، ص۵۶، ۶۷-۶۶

[2] مکتوب بنام ندوی، ۷/ اپریل ۱۹۲۶ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۳۴

والے کے ذہن میں وجود رکھتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ پھر ستارہ باہر کیوں دکھائی دیتا ہے؟

۲ اِس کا جواب سمجھنے کے لیے سب سے پہلے سائنس کے مادیت پرستانہ رویے کو رَد کرنا پڑے گا جو کچھ عرصہ پہلے تک رائج تھا۔ یعنی چیزوں کا وجود جاننے والے کے وجود سے بے نیاز ہے۔ آئن اسٹائن کے نظریۂ اضافیت نے ظاہر کیا ہے کہ سائنس ہمیں چیزوں کے بارے میں جو علم فراہم کرتی ہے وہ جاننے والے کے وجود پر منحصر ہوتا ہے۔

۳ جس وجہ سے ہمیں چیزیں اپنے سے باہر دکھائی دیتی ہیں یا دوسرے لفظوں میں ہمارے لیے "غیر" (other) ہوتی ہیں، وہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ ایک اور وجود ہے جس کے لیے کوئی چیز غیر نہیں ہے۔ وہ "ذاتِ مطلق" (Absolute Self) ہے، جسے مذہبی زبان میں خدا کہتے ہیں۔ چیزیں ہمارے لیے اِس وجہ سے غیر ہیں کہ وہ اُس کے لیے غیر نہیں ہیں۔ کائنات خدا کے ذہن کا ایک عارضی مرحلہ اور اُس کی لامتناہی (infinite) زندگی کا ایک گزرتا ہوا لمحہ ہے (قرآن کے مطابق ہر روز خدا کی نئی شان ہے)۔

۴ کیا انسان بھی خدا کے ذہن کے ایک خیال سے زیادہ کچھ نہیں؟ ایسا نہیں ہے کیونکہ قرآن میں خدا اور کائنات کا رشتہ صرف تخلیق کے حوالے سے بیان ہوا جبکہ خدا اور انسان کے تعلق کے حوالے سے اَمر کا لفظ بھی استعمال کیا گیا۔ امر، تخلیق سے مختلف ہے۔ ایک ایسے تعلق کو بیان کرتا ہے جس میں انسان خدا سے الگ ہے مگر جدا نہیں ہے۔ بقول مولانا روم، انسان اور خدا کا تعلق ہمارے تخیل اور سوچ سے باہر ہے:

اتصالِ بے تخیل بے قیاس ہست رب الناس را با جان ناس

۵ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا انسان کے لیے بھی کائنات کو خدا کے نقطۂ نگاہ سے دیکھنا ممکن ہے جہاں کوئی شے غیر دکھائی نہ دے۔ اس کے دو طریقے سامنے آئے ہیں۔ ایشیائی تصوّف (Asiatic mysticism) کا تجویز کردہ طریقہ جو اِسلام سے پرانا ہے، اُن کیفیات سے فرار حاصل کرنے پر مبنی ہے جو عقل کو تحریک دیتی ہیں۔ اسے مراقبہ کہہ سکتے ہیں۔

اس کے فوائد اپنی جگہ لیکن یہ طریقہ زندگی کے بعض اہم ترین مفادات کے حق میں زہر بھی ہے۔ پیغمبرِ اسلامؐ نے دراصل اُسی کے خلاف آوازِ بغاوت بلند فرما کر دوسرا طریقہ تجویز کیا۔ وہ عقل کی قوّت کے ذریعے مادے پر فتح حاصل کرنے کا طریقہ ہے۔ یہ وہ بصیرت ہے جو ہمیں کائنات کے ہر لحظہ بدلتے ہوئے ظاہر کے پردے میں چھُپے ہوئے اُس کے حقیقی باطن کو دیکھنے کے قابل بناتی ہے۔

۶ قرآن شریف نے اِس کے لیے یہ راہ دکھائی کہ ہم محرکات (stimuli) کو اپنے بلند مقاصد کے حصول کا ذریعہ بنا کر خود کو قدرت کی ایک عظیم توانائی کے طور پر دریافت کریں۔

Self in the Light of Relativity
[Excerpt]

The impulse which drives me into the wide world is precisely the same 'as that which drives so many into monasteries—the desire for self-realization.' So says Count Keyserling in his Diary recently translated into English. The Count is quite right. The world of matter which confronts the self of man as its 'other' is an indispensable obstruction which forces our being into fresh formations. I am afraid, however, that the Count's view of self-realisation is one-sided. He tells us further. 'I want to let the climate of the Tropics, the Indian modes of consciousness, the Chinese code of life, and many other factors which I cannot envisage in advance, to work their spell on me, one after the other, and then watch what will become of me.' Now, such a process may bring about the realisation of our intellectual self. It may give us an acute thinker who can work out the spell of impressions into a coherent system of ideas, but it cannot shape our clay into an ideal human being. The intellectual self is only one aspect of the activity of our total self. The realisation of the total self comes not by merely permitting the wide world to throw its varied impressions on our mind, and then watching what becomes of us. It is not merely by receiving and intellectually shaping the impressions, but mainly by moulding the stimuli to ideal ends and purposes that the total self of man realizes itself as one of the greatest energies of nature. In great action alone the self of man becomes united with God without losing its own identity, and transcends the limits of space and time. Action is the highest form of contemplation.[1]

Razzaqi, *Discourses of Iqbal,* pp. 189-193 [1]

35

علامہ لاہور ہائی کورٹ میں جج نہ ہوئے۔ یوپی سے سید آغا حیدر کا تقرر عمل میں آیا۔[1]

وائسرائے کی امپیریل کونسل کی رکنیت کے لیے انتخاب میں شہری حلقے سے لاہور کے ملک برکت علی اور لدھیانہ کے میاں عبدالحئی ایڈوکیٹ اُمیدوار تھے۔ ملک صاحب دستبردار ہو گئے۔ عبدالحئی بلامقابلہ منتخب ہوئے۔[2] اُنہی دنوں گرامی کا خط ملا۔ رباعی بھیجی تھی۔ ''میں ایک مدّت سے محروم ہوں،'' علامہ نے جواب میں لکھا۔ موسمِ گرما میں کہے ہوئے اشعار بھیج دیے:

ترا ناداں اُمیدِ غم گساری ہا ز افرنگ است[3]

وصل بلگرامی لکھنؤ سے رسالہ نکالنا چاہتے تھے۔ مرقع نام تھا۔ سرورق کے لیے علامہ سے شعر کی درخواست کی۔ وہ دانت کے درد میں مبتلا تھے۔ ایک فارسی شعر بھیجا۔ بلگرامی نے خط کے ذریعے عیادت کی۔ دوسرے شعر کی فرمایش کی۔ علامہ نے افاقہ ہونے پر مزید اشعار بھیجے۔[4]

36

اس برس شائع ہونے والی ایک کتاب پانچ برس بعد مصنف نے ۱۶/ جولائی ۱۹۳۰ء کے دستخط کے ساتھ علامہ کو پیش کی:

Kamal-ud-Din. *The Sources of Christianity.* Basheer Muslim Library, Woking[5]

---

[1] عبدالمجید سالک (۱۹۸۳) ذکرِ اقبال، ص ۱۲۷

[2] مکتوب بنام گرامی بلا تاریخ۔ اندازاً ۱۹۲۵ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۱۸

[3] ایضاً

[4] مکاتیب بنام وصل بلگرامی بلا تاریخ؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۱۷-۶۱۵۔ اشعار مرقع کے جنوری ۱۹۲۶ء کے شمارے میں شائع ہوئے۔

[5] Muhammad Siddique, *Descriptive Catalogue*

اس برس شائع ہونے والی دُوسری کتابیں جو کبھی اقبال کے ذخیرۂ کتب میں شامل ہوئیں یہ ہیں:[1]

Burtt, Edwin Arthur. *The Metaphysical Foundations of Modern Physical Science—A Historical and Critical Essay.* Kegan Paul, London

Cousins, James H. *Samadarsana (Synthetic Vision)—A Study of Indian Psychology.* Ganesh, Madras

Crookshank, F. G.. *The Mongol in Our Midst: A Study of Man and His Three Faces.* Kegan Paul, London

D'Archy, Charles F. *Science and Creation: the Christian interpretation.* Longmans Green, New York

Farnell, Lewis Richard. *The Attributes of God—The Gifford Lectures delivered in the University of St. Andrews in the year 1924-25.* Oxford Clarendon Press, London

Mohammad, Barakutllah. *The Khilafet.* Luzac, London

Nordmann, Charles (translated from French by E. E. Founier D' Albe). *The Tyranny of Time: Einstein or Bergson?* T. Fisher Unwin

Trevelyan, R. C. *Thamyris, Or Is There a Future for Poetry?* Kegan Paul, London

37

علامہ کو ایک تعلیم یافتہ عرب سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ فرانسیسی خوب بولتا تھا مگر اسلام سے قطعاً بے خبر تھا۔ "اِس قسم کے واقعات مشاہدہ میں آتے ہیں تو سخت تکلیف ہوتی ہے،" علامہ کا بیان تھا۔ اسلام کے مستقبل کے بارے میں مطمئن تھے۔ پھر بھی یہ سوچ کر مضطرب ہو جاتے تھے کہ مسلمانوں کی موجودہ نسل گھبرا کر کوئی اور راہ اختیار نہ کر لے۔[2]

۱۵/دسمبر کو ایران میں رضا خاں نے شاہ کا لقب اختیار کرتے ہوئے دستور کے مطابق بادشاہت کا حلف اُٹھایا۔ قاجار خاندان کے آخری حکمراں کو کچھ روز پہلے مجلس یعنی اسمبلی کے ذریعے معزول کیا جا چکا تھا۔ ایک خیال یہ ہے کہ رضا شاہ بادشاہت کا خاتمہ چاہتے تھے مگر شیعہ علما کی مخالفت کی وجہ سے نہ کر سکے۔ بہرحال اب افغانستان، ایران اور ترکی میں آزاد مسلم ریاستیں قائم ہو چکی

---

[1] Muhammad Siddique۔ جیمز کزنز نے اپنی کتاب ۲۶ مارچ ۱۹۲۵ء کے دستخط کے ساتھ پیش کی تھی۔

[2] مکتوب بنام سلیمان ندوی ۲۴/اپریل ۱۹۲۶ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۳۷

تھیں۔ روشن خیال حکمرانوں کی حکومت تھی۔ ترقی کے راستے پر قدم بڑھائے جارہے تھے۔

چین میں کسان تنظیمیں قائم ہورہی تھیں۔ علامہ ہندوستان میں اِس قسم کی تنظیموں کے قیام کی افادیت محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے۔[1]

۲۰ / دسمبر کو مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں گولڈن جوبلی منائی گئی۔ پچاس برس پہلے ۱۸۷۵ء میں سر سید نے علیگڑھ کالج کی بنیاد رکھی تھی۔ اس ماہ کسی معترض کو جواب دیے ہوئے سید سلیمان ندوی نے معارف میں لکھا، ''معارف' کو ڈاکٹر اقبال کی خدمت میں ہمیشہ سے نیاز حاصل تھا اور ہے۔''[2] ندوی حال ہی میں مسلم ایسوسی ایشن آف سدرن انڈیا کی دعوت پر مدراس میں لیکچرز دے کر فارغ ہوئے تھے۔ اکتوبر کے پہلے ہفتے سے نومبر کے آخری ہفتے تک آٹھ لیکچرز دیئے تھے۔[3]

کانپور میں کانگریس کے سالانہ اجلاس کے لیے تلک نگر بسایا گیا۔ ۲۴ / سے ۲۸ / دسمبر تک یہاں خلافت کانفرنس کے اجلاس ہوئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے صدارت کی۔ استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین مولانا حسرت موہانی تھے۔ انہوں نے کہا کہ ترکی خلافت سے دستبردار ہو گیا ہے لیکن مسلمانوں کو خلیفہ کی ضرورت ہے۔ اس کا انتظام ہونا چاہیے۔ ابن سعود نے انگریزوں کے ساتھ سرحدی معاہدے کر لیے ہیں اس لیے وہ اسلام کا غدار ہے۔ حسرتؔ کے نکات خلافت کانفرنس کانفرنس کے موقف کے خلاف تھے۔ ان کی تقریر کانفرنس کی کاروائی سے حذف کرنی پڑی۔[4]

۲۶ / دسمبر ۱۹۲۵ء کو تلک نگر میں کمیونسٹ کانفرنس ہوئی۔ استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین حسرتؔ ہی تھے۔ کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا (Communist Party of India) کسی نہ کسی صورت میں موجود رہی تھی۔ اب باقاعدہ جماعت بن گئی۔ حسرتؔ کے مطابق اس کا مقصد یہ تھا کہ سوراج حاصل کرنے کے علاوہ یہ بات بھی یقینی بنائی جائے کہ آزاد ہندوستان میں وہی نظامِ حکومت رائج ہو گا جو کمیونسٹ

---

[1] خطبۂ صدارت آل انڈیا مسلم کانفرنس، لاہور، ۲۱ / مارچ ۱۹۳۲ء۔ (1977) Sherwani میں شامل ہے۔

[2] اختر راہی (۱۹۷۸) اقبال سید سلیمان ندوی کی نظر میں، ص ۲۷

[3] سلیمان ندوی (۱۹۸۳) خطباتِ مدراس، ص ٦

[4] Mitra: *Indian Quarterly Register July-Dec. 1925*, pp.345-346

رُوس میں ہے۔ نیز مزدوروں اور کسانوں کی حالت بہتر بنائی جائے۔ حسرتؔ نے کہا کہ ہندوستان میں کمیونزم کی مخالفت کرنے والے کمزور ذہنیت کے حامل، بدحواس اور شرپسند ہیں۔ کمیونزم ذاتی (personal) ملکیت کی نفی نہیں کرتا، جیسے گھڑی، چھتری، برتن، بستر، لباس وغیرہ۔ صرف نجی (private) ملکیت سے منع کرتا ہے، جیسے زمین اور کارخانے وغیرہ۔ کمیونسٹ مذہب کے خلاف بھی نہیں۔ اس معاملے میں دُوسروں سے زیادہ روادار ہیں کیونکہ نہ صرف تمام مذاہب کا وجود تسلیم کرتے ہیں بلکہ کوئی مذہب نہ رکھنے کو بھی ایک مذہبی عقیدے کا درجہ دیتے ہیں۔ کمیونزم کا اسلام کے ساتھ بھی اختلاف نہیں ہے بلکہ سرمایہ داری کی جتنی شدید مخالفت اسلام کرتا ہے، اُتنی کمیونزم بھی نہیں کرتا۔ زکوٰۃ کا مفہوم یہی ہے کہ جب تک ایک بھی شخص بھوکا ہے، سرمایہ داروں کو کاروبار کرنے کا حق نہیں ہے۔ اسلام نے سُود پر پابندی عائد کی ہے، جس کی صرف یہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ اسلامی اصول کے مطابق محنت کے بغیر منافع حاصل کرنا حرام ہے، جیسا کہ سودخور کرتا ہے۔ کمیونزم کا اصول بھی یہی ہے۔[1] حسرتؔ نے نام نہیں لیے مگر علامہ اقبال بھی اس زُمرے میں آتے تھے۔[2]

---

[1] *Ibid.* pp.367-368

[2] دیکھیے اس موضوع پر ۲۴ر جون ۱۹۲۳ء کے زمیندار میں علامہ کا طویل بیان۔ علامہ نے اسلام اور کمیونزم کے درمیان جو فرق بیان کیا تھا، اُس پر حسرتؔ نے بحث نہ کی اور بعد میں بھی کمیونسٹ مصنفف اسے عام طور پر نظر انداز کرتے رہے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ اِسی لیے یہ رجحان پیدا ہوا کہ کمیونزم کی روشنی میں علامہ کے بعض افکار قبول کر کے بقیہ کے لیے اُنہیں مطعون کرتے ہوئے دکھایا جائے کہ وہ بیک وقت ترقی پسندی اور رجعت پسندی کے متضاد رجحانات کے حامل تھے۔ اِس طرزِ فکر کی نمائندہ کتاب ہے: Smith, *Modern Islam in India*۔ نیز علامہ کے بعد جس نے بالکل انہی کے نقطۂ نگاہ سے عصری رجحانات کا تجزیہ کیا، اُسے نظر انداز ہونا پڑا کیونکہ اُسے علامہ نے جو فکری بنیاد فراہم کی تھی وہ قابلِ قبول نہ رہی تھی۔ یہ مصنف ابنِ صفی تھے: دیکھیے خرم علی شفیق (۲۰۱۱) سائیکو مینشن۔ حسرتؔ یہاں جس مکتبِ فکر کی ترجمانی کر بیٹھے ہیں، اُس کے بارے میں ابن صفی نے کہا:

قرآں میں ڈھونڈتے ہیں مساواتِ احمریں　　یارو نیا یہ فتنۂ اغیار دیکھنا
وردِ زباں ہیں خیر سے آیاتِ پاک بھی　　ہے اہرمن با خرقۂ پندار دیکھنا
لائی گئی ہے لال پری سبزہ زار میں　　ہوتے ہیں کتنے لوگ گنہگار دیکھنا

ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی پر علامہ کا تبصرہ یہ تھا کہ وسطی ایشیا سے مذہب بالخصوص اسلام کے خلاف پروپیگنڈا سرحد عبور کر کے ہندوستان میں داخل ہو گیا ہے۔ مبلغین میں ایسے افراد شامل ہیں جو پیدائشی اعتبار سے مسلمان ہیں۔[1]

تلک نگر میں ۲۶ر سے ۲۸ر دسمبر تک آل انڈیا نیشنل کانگریس کا چالیسواں اجلاس ہوا۔ سروجنی نائیڈو نے صدارت کی۔ خیر سگالی کے پیغامات بھیجنے والوں میں محمد علی جناح شامل تھے۔[2] کانگریس ہی کے پنڈال میں ۲۹ر دسمبر کو ہندو مہاسبھا کا اجلاس ہوا۔ نرسمہا چنتامن کیلکر نے صدارت کی۔ انہوں نے کہا کہ مسلمان، انگورہ [انقرہ] سے سہارنپور تک مسلم راج کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ ہندوستان میں جداگانہ نیابت کا اصول اسی مقصد کے لیے اختیار کیا ہے مگر کُھل کر نہیں بتاتے۔ اس کی بجائے یہ ہونا چاہیے کہ مسلمان اُن صوبوں میں حکومت کریں جہاں اُن کی اکثریت ہے اور ہندو اُن صوبوں میں جہاں اُن کی اکثریت ہے۔ ایک یکساں اصول کا اطلاق کیا جائے تاکہ مسلم صوبوں میں ہندوؤں کے ساتھ جو سلوک ہو وہی ہندو صوبوں میں مسلمانوں کے ساتھ ہو:

> The application of any one universal rule would result naturally in hostages being given by both communities in different provinces. In the Frontier Provinces, the Punjab, Bengal and Sindh the Mahomedans would be in a position of advantage. On the other hand the Hindus would be in a position of advantage in other Provinces. Does this not give a kind of automatic guarantee against the ill-treatment of any community by another in any Province, assuming that the Hindus and Mahomedan communities are both animated by fellow-feeling for co-religionists?[3]

لالہ لاجپت رائے نے گزشتہ برس ہندوستان کو مسلم اور ہندو میں تقسیم کرنے کی تجویز پیش کی تھی۔ وہ

---

[1] Iqbal (1934), *Reconstruction*
[2] INC, *Report of the Indian Natinal Cogress Thirty-Ninth Session*
[3] Mitra: *Indian Quarterly Register July-Dec. 1925*, pp.351-352

آبادی کے تبادلے کی بنیاد پر تھی۔[1] کیلکر کی تجویز میں آبادی کے تبادلے کی ضرورت نہ تھی۔[2]

۲۸ر سے ۳۰ر دسمبر تک کلکتہ کے ٹاؤن ہال میں نیشنل لبرل فیڈریشن ("لبرل پارٹی") کا آٹھواں اجلاس ہوا۔ سر موروپنت جوشی نے صدارت کی۔

۳۰ر دسمبر ۱۹۲۵ء سے یکم جنوری ۱۹۲۶ء تک علیگڑھ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سترہواں اجلاس ہوا۔ سر عبدالرحیم نے صدارت کی۔ ۳۱ر دسمبر کو سب سے اہم قرارداد پیش ہوئی۔ سر علی امام نے پیش کی۔ ایک ڈیڑھ برس میں آئینی اصلاحات ہونے والی تھیں۔ مسلمانوں کا موقف طے پایا:

۱ ملک کی تمام قانون ساز مجالس اور دیگر منتخب ادارے اِس واضح اصول کے تحت بنائے جائیں گے کہ ہر صوبے میں اقلیتوں کو مناسب اور موثر نمایندگی حاصل ہو لیکن صوبے میں کسی ملت کی اکثریت گھٹ کر برابری یا اقلیت نہ بننے پائے۔

۲ ملّتوں کی نمایندگی جداگانہ نیابت کے ذریعے ہوتی رہے گی جس طرح اس وقت ہو رہی ہے بشرطیکہ ہر ملت کو اختیار ہو کہ وہ کسی بھی وقت اپنی جداگانہ نیابت ترک کے کر مخلوط نیابت اختیار کر لے۔

۳ علاقائی سرحدوں میں کوئی بھی ترمیم جس کی کسی موقع پر ضرورت پیش آئے، وہ پنجاب، بنگال اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں مسلمانوں کی اکثریتی حیثیت کو متاثر نہ کرے گی۔

۴ ہر ملت کو عبادت، رسومات، تبلیغ، تنظیم سازی اور تعلیم کی مکمل مذہبی آزادی حاصل ہو گی۔

۵ کوئی بھی بل، قرارداد یا اس کا کوئی جزو کسی قانون ساز مجلس یا منتخب ادارے میں منظور نہ کیا جائے گا اگر اُس ادارے میں موجود کسی بھی ملت کے نمایندوں کی تین چوتھائی تعداد اِس کی مخالفت اس بنیاد پر کرے کہ وہ اُس ملّت کے مفادات کے منافی ہے۔ دوسری صورت میں اِس قسم کے معاملات کے حل کے لیے کوئی اور قابلِ عمل طریقہ اختیار کیا جائے گا۔

---

[1] دیکھیے نومبر-دسمبر ۱۹۲۴ء کے واقعات

[2] مسلم رہنماؤں نے کیلکر کی اِس تجویز کو قبول کرتے ہوئے "دہلی تجاویز" پیش کیں؛ دیکھیے مارچ ۱۹۲۷ء کے واقعات۔

قرارداد جوش و خروش کے ساتھ منظور کی گئی۔[1]

دوسرا حصہ

38

۱۹۲۶ء کا آغاز تھا۔ خان بہادر محمد حسن کے لڑکے ممتاز حسن اپنے دوست نیاز محمد خاں کے ساتھ علامہ اقبال سے ملاقات کے لیے پہنچے۔ علامہ برآمدے میں بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔ ممتاز نے اپنا اور دوست کا تعارف طالبِ علم کی حیثیت سے کروایا۔ انگریزی میں طویل سوال پوچھا۔ مطلب یہ تھا کہ آپ منطقی آدمی ہو کر بھی خدا کا تذکرہ یقین کے ساتھ کیسے کر سکتے ہیں۔ کانٹ تو اُس کا وجود ثابت نہ کر سکا۔ ممتاز کے مطابق علامہ نے تحمل سے سوال سنا۔ پھر بڑے آرام سے انگریزی ہی میں جواب دیا، "میں نے اُسے دیکھا ہے۔" ذرا ٹھہر کر کہا، "انسان کی زندگی میں ایسے لمحات آتے ہیں جب وہ خدا کو محسوس کر سکتا ہے۔ لیکن یہ لمحے کم نصیب ہوتے ہیں۔" ممتاز نے پوچھا کہ کیا ہر شخص یہ مشاہدہ کر سکتا ہے۔ علامہ نے کہا، "یہ دروازہ کسی پر بند نہیں ہے۔ لیکن جو شخص تجربے کا طالب ہو اُسے انتظار لازم ہے۔" گفتگو کا رُخ موت کی طرف مڑ گیا۔ ممتاز سے روایت ہے کہ علامہ نے کہا، "موت کا کوئی وجود نہیں۔ اصل حقیقت زندگی ہے، موت نہیں۔"

ممتاز باقاعدگی سے آنے لگے۔ ایک بات خاص طور پر محسوس کی۔ اگر کوئی انسانوں کی اکثریت کی برائی کرے تو علامہ ضرور احتجاج کرتے تھے۔ وہ کہتے، "خدا نے ہر انسان کو کوئی ایسی چیز دی ہے جو دوسرے انسان کو نہیں دی گئی۔ جو بھی انسان کی برائی کرتا ہے کم علمی کی وجہ سے کرتا ہے۔"[2]

اس برس کے شروع میں ایک شام خواجہ عبدالحمید نے کریسنٹ کے جنوری کے شمارے کے

---

[1] Mitra: *Indian Quarterly Register July-Dec. 1925*, pp.356-361

[2] Mumtaz Hasan (1982), *Tribute to Iqbal,* pp.19-23۔ وحید الدین (بلا تاریخ) روزگارِ فقیر، جلد دوم، ص۸۹-۹۱۔ ممتاز حسن کے مطابق یہ ملاقات اوائل ۱۹۲۶ء میں ہوئی۔

لیے علامہ سے پیغام کی فرمایش کی۔ علامہ نے اپنا فارسی شعر پیش کیا کہ اگر باپ کے خزانے سے لعل حاصل کرنے کی خواہش ہے تو شرم کرو۔ پتھر سے لعل بر آمد کرنے کا لطف ہی کچھ اور ہے:

پشیماں شو اگر لعلے ز میراثِ پدر خواہی　　کجا عیش برون آوردنِ لعلے کہ در سنگ است [1]

قدیم ہندوستان کی روح نے خدا کو دریافت کرنا چاہا اور دریافت کر لیا۔ جدید ہندوستان کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ اس رُوحانی سرمائے کی مدد سے اِنسان کو دریافت کرے—انسان بطور شخصیت جو زندگی کے کُل کا حصہ ہوتے ہوئے اپنی جگہ مکمل بھی ہے اور آزاد ہے۔ صرف یہی چیز ہندوستان کی نئی قومیت کے لیے پائیدار بنیاد بن سکتی ہے۔ زندگی کی باطنی ترکیب میں انسان کی وحدت دریافت کرنی ہے۔ سب سے بڑی رکاوٹ موجودہ تعلیمی نظام ہے۔ اِن خیالات کا اظہار علامہ نے ایک مختصر انگریزی تحریر میں کیا۔ جنوری ۱۹۲۶ء میں مدراس کے انگریزی ماہنامے انڈین ریویو (*Indian Review*) میں ’زندگی کی باطنی ترکیب‘ (‘The Inner Synthesis of Life’) کے عنوان سے شائع ہوئی:

> The spirt of Ancient India aimed at the discovery of God and found Him. Fortified by this valuable possession Modern India ought to focus on the discovery of man as a personality as an independent "whole" in all-embracing synthesis of life if she wants to secure a permanent foundation of her New Nationalism. But does our education today tend to awaken in us such a sense of inner wholeness? My answer is no. Our education does not recognise man as a problem, it impresses on us the visible fact of multiplicity without giving us an insight into the inner unity of life, and thus tends to make us more and more immersed in our physical environment. The soul of man is left untouched and the result is a superficial knowledge with a mere illusion of culture and freedom. Amidst this predominantly intellectual culture which must accentuate separate centres with the "whole" the duty of higher minds in India is to reveal the inner synthesis of life.[2]

---

[1] عبدالحمید (۱۹۴۴) ’اقبال کے علمی جواہر ریزے‘، ص ۶۸

[2] Sherwani- بحوالہ *The Indian Review*, Madras, Vol. XXVII, No.1 (January 1926), p.2

اس ماہ ہمایوں کا سالگرہ نمبر شائع ہوا۔ علامہ کے تین فارسی اشعار اُن کی عکسی تحریر میں شامل تھے۔[1]
اسی ماہ لکھنؤ سے وصل بلگرامی کا رسالہ مرقع جاری ہوا۔ سرورق پر علامہ کا شعر درج تھا جو نومبر یا دسمبر میں بھیجا تھا کہ میں نے فریاد کی تا کہ تم جاگ جاؤ ورنہ عشق نالہ و فریاد کے بغیر بھی کیا جاتا ہے:

تا تو بیدار شوی نالہ کشیدم ورنہ عشق کارے است کہ بے آہ و فغاں نیز کنند

(عطیہ علامہ سر اقبال)[2]

جنوری ہی میں ماہ علیگڑھ سے رشید احمد صدیقی کی ادارت میں سہیل جاری ہوا۔ علامہ کے سات فارسی اشعار عبدالرحمٰن چغتائی کی تصاویر سے مزین تھے۔ دونوں چیزیں عبداللہ چغتائی نے حاصل کر کے رسالہ بھی لاہور میں طبع کروایا تھا۔

پیامِ اقبال

[از رشید احمد صدیقی، حصہ اول۔ اقتباس]

اقبال کا مطالعہ کرنے سے قبل چند ابتدائی امور ذہن نشین کر لینے چاہئیں کیونکہ یہ ان کی تعلیم کے بنیادی اصول ہیں جن کا مختلف اوقات میں مختلف انداز سے اعادہ کیا گیا ہے۔

۱۔ اقبال کلیۃً اسلامی شاعر ہیں اور اُن کی تعلیم کی بنیاد تمامتر دینِ متین کے ارکانِ اساسی پر ہے۔

۲۔ اقبال کے نزدیک حیاتِ انسانی کی اولین کامیابی خودی یا انانیت پر ہے یعنی افراد کا اپنی اُس استعداد اور قوت کو محسوس اور مکمل کر لینا اور اُن پر بہمہ وجود قادر ہونا جس کا ارشاد قرآنِ پاک میں انی جاعل فی الارض خلیفہ کے الفاظ میں کیا گیا ہے۔ انسانِ مکمل یا ''سوپر مین'' کا

---

[1] شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۱۸۰؛ اشعار یہ ہیں:

گرچہ اندیشۂ ما رشتۂ خام است ولے مثلِ زُنّار باندامِ دو عالم بستند
ہر زماں تازہ ترے خوب ترے می جوئیند نقش خوبی کہ شکستند دگر کم بستند
عشق از لذّتِ نظارہ بدیوارِ جہاں رخنۂ کردو ز آب و گلِ آدم بستند

[2] اس کا عکس اقبال میوزیم لاہور کے توسط سے اقبال اکادمی پاکستان کے پاس موجود ہے۔

فلسفہ اِسی راز میں مضمر ہے۔

۳۔ ایسی مکمل اور جامع ہستیوں کا ایک نظامِ ملی۔

۴۔ اقبال کے نزدیک اِس آشوب گاہِ حیات میں اگر کوئی مذہب یا تعلیم یا عمل کامیاب رہ سکتا ہے تو وہ ملتِ اسلامیہ ہے جو مجموعہ یا نتیجہ ہے مکمل شخصیتوں اور مکمل نظامِ جمعیت کا۔

یہ ایک سرسری تلخیص ہے اقبال کے اُس پیغام کی جس کو اُنہوں نے نہایت شرح و بسط کے ساتھ اسرارِ خودی اور رموزِ بیخودی میں پیش کیا ہے۔

سہیل، جنوری ۱۹۲۶ء[1]

۸/ جنوری ۱۹۲۶ء کو علامہ نے مصوّر عبدالرحمٰن چغتائی کو لکھا، ''افسوس ہے کہ لدھیانے سے کوئی تصویر یا آئینہ نہیں ملا۔ اس واسطے آپ مہربانی کر کے اسی تصویر سے انلارج کریں۔'' معلوم ہوتا ہے مختار بیگم مرحومہ کی تصویر انلارج کروانا چاہتے تھے۔[2]

39

زبورِ عجم کے تیسرے حصے کا آغاز ترکیب بند سے کیا کہ یہ رنگ و بو کی دنیا ہمارے افکار کی بازی گاہ ہے، اس کی راتوں میں ہماری سوچ کا ستارہ زیادہ روشن ہو جاتا ہے، وغیرہ۔ پھر یہ سب قلمزد ہوئے۔ دس برس پہلے اُردو میں نظم لکھنا چاہتے تھے کہ غلام قومیں کیسا ادب تخلیق کرتی ہیں۔ اب فارسی میں مثنوی کی صورت میں لکھنا شروع کی۔ زبورِ جدید کا چوتھا اور آخری حصہ تھا، 'بندگی نامہ'۔ چونسٹھ اشعار لکھے گئے۔ ان میں سے چھتیس قلمزد ہوئے۔ ترمیم ہوئی۔ ترتیب بدلی گئی۔ تب دو بند نکلے۔

پہلے بند کا مفہوم یہ تھا کہ غلامی سے روح اور دل مردہ ہو جاتے ہیں، جوانی میں بڑھاپے کا ضعف آجاتا ہے اور قوم کی بزم پارہ پارہ ہو جاتی ہے۔ ہر فرد دوسرے سے اُلجھتا ہے۔ ایک سجدے میں ہے تو دوسرا قیام میں، جیسے بے امام کی نماز ہو۔ اس صورت میں ہر فرد کو ہر لمحے ایک نئی مشکل ہی در پیش

---

[1] چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۲۹۳۔ نیز صدیقی (۱۹۷۶)، اقبال شخصیت اور شاعری، ص ۴۳-۴۲

[2] مکتوب بنام عبدالرحمٰن چغتائی ۸/ جنوری ۱۹۲۶ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۲۳

رہتی ہے۔ دین کا نام لینے والوں میں بھی موت کے خوف کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا اور وہ باطنی طور پر کفر کے پرستار بن جاتے ہیں۔ غلام کا ہر دن دوسرے دن کے ماتم میں ہوتا ہے اور وقت کی رفتار سُست پڑ جاتی ہے۔

دُوسرے بند پر '(خاتمہ)' کی سرخی ڈالی۔ اِسے آخر میں رکھنا تھا۔ مفہوم یہ تھا کہ غلامی ایسی تباہ کن کیفیت ہے کہ اس میں ایک لمحہ گزارنا زیادہ مشکل ہے بہ نسبت سیکڑوں برس کسی ایسی جگہ گزارنے کے جہاں زمین بچھوؤں اور خوفناک چیونٹیوں سے بھری ہو، فضامیں شعلے لپک رہے ہوں اور ہوامیں خوفناک طوفان جیساشور ہو۔[1]

40

۲۲/ جنوری کو پنجاب یونیورسٹی سنڈیکیٹ نے اپنے اجلاس میں سفارش کی کہ آرٹس فیکلٹی سے ڈاکٹر سر محمد اقبال کا تعلق ختم کیا جائے۔ اورینٹل فیکلٹی کی فیلوشپ برقرار رہی۔[2]

پروفیسر ای جی براؤن ۵/ جنوری کو فوت ہوئے تھے۔ کیمبرج سے نکلسن کے ذریعے فرمایش آئی کہ علامہ تاریخِ وفات لکھیں۔

نازشِ کمال ای جی براؤن — فیضِ او در مغرب و مشرق عمیم
مغرب اندر ماتمِ اُو سینہ چاک — از فراقِ او دلِ مشرق دونیم
تا بہ فردوسِ بریں ماویٰ گرفت — گفت ہاتف ذالک الفوز العظیم

عبداللہ چغتائی کا بیان ہے کہ منشی اسد اللہ نے قدیم وصلیوں کی طرز پر کتابت کی۔ عبدالرحمٰن چغتائی نے نقاشی کے قدیم طریقے پر مطلیٰ و مذھب کیا۔ عبداللہ نے پیک کر کے نکلسن کے پتے پر بھیج دیا۔[3]

---

[1] بیاض۔ وہاں ایک اور بند بھی ہے جو یہاں سے حذف کر کے بعد میں جاوید نامہ میں شامل کر دیا: "خواجہ راازبندہ پیغامے بگو..."۔ یہ اشعار انقلاب میں 'مکافاتِ عمل' کے عنوان سے شائع بھی ہوئے۔

[2] ڈاکٹر حسن اختر ملک، اقبال، ایک تحقیقی مطالعہ،، ص ۹۳

[3] عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۲۰۱-۲۰۰

نواب سراج الدین خاں سائلؔ دہلوی کے کسی کام کے لیے علامہ کوشش کر رہے تھے۔ ان کی بیگم کا خط بھی موصول ہوا۔ تفصیل معلوم نہیں۔[1] گرامی نے ریوڑیاں اور رباعیاں بھجوائیں (جن میں سے رباعیاں "بہت شیریں" تھیں)۔ ۲۶/ جنوری کو علامہ نے شکریے کے ساتھ لکھا، "میں کوشش کروں گا کہ مرزا عبدالرب لاہور تبدیل ہو جائیں۔ اس طرح آپ کو لاہور آنے میں سہولت رہے گی۔"[2]

مولوی محرم علی چشتی "صوفی منش بزرگ" تھے۔[3] عام تاثر تھا کہ آریہ سماجیوں کی اسلام دشمنی پر خاموش رہتے ہیں۔ وہ ان کی حمایت کرتے ہیں۔ خبر مشہور ہوئی کہ بلدیہ لاہور کے مسلمان رُکن کے طور پر نامزد کیے جا رہے ہیں۔ زمیندار نے ۲۹/ جنوری کے شمارے میں احتجاج کیا۔ یہ مطالبہ بھی دہرایا کہ "عدالت عالیہ میں پنجاب کا کوئی قانون دان مسلمان جج کے عہدے پر فائز کیا جائے۔ مسلمانانِ پنجاب اس کے لیے ڈاکٹر سر محمد اقبال کا نام بار بار پیش کر چکے ہیں۔"[4]

41

سید میر حسن کے بڑے لڑکے ڈاکٹر علی نقی گورنر ہاؤس کے عملے کے معالج تھے۔ اس برس کسی وقت اپنی ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ گورنر سر میلکم ہیلی نے الوداعی دعوت دی۔ علامہ بھی شریک تھے۔ ڈاکٹر نقی کو ایک شعر لکھ کر دیا تھا۔ انہوں نے خوشخط لکھوا کر گورنر کو پیش کیا

پنجاب کی کشتی کو دیا اس نے سہارا تابندہ ہمیشہ رہے ہیلی کا ستارا[5]

42

نیرنگ رامپور کے فروری کے شمارے میں مولوی محمد ضیاءاللہ خان بہادر (افسر محکمۂ آڈٹ) کا مضمون

---

[1] مکتوب بنام گرامی ۲۶/ جنوری ۱۹۲۶ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۲۴-۶۲۳

[2] ایضاً

[3] سیارہ ڈائجسٹ اپریل ۱۹۶۵ء میں سراج نظامی کا مضمون؛ شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۲۲۲

[4] اختر النسا (۲۰۱۰) بحوالہ زمیندار ۲۹/ جنوری ۱۹۲۶ء

[5] فقیر سید وحید الدین (۱۹۸۸) روزگار فقیر، جلد اول، ص ۱۷۵-۱۷۳

'شرابِ مثلث' شائع ہوا۔ تین نظموں اور اُن کے نتائج پر مشتمل تھا۔ پہلی نظم شیخ سعدی کی حکایت تھی۔ ایک شاہین اپنی طاقتِ پرواز پر ناز کر رہا تھا۔ تیر کا شکار ہو گیا۔ خان بہادر نے لکھا، "شیخ علیہ الرحمۃ نے یہ نتیجہ نکالا کہ تکبّر باعثِ زوال ہے۔" دوسری نظم پیامِ مشرق سے تھی۔ ایک شاہین کے بچے نے مچھلی کے بچے سے کہا کہ صحرا ہو یا دریا ہو، سب میری پرواز کی زد میں ہے۔ مصنف نے لکھا، "ڈاکٹر صاحب قدمِ اشیا کے اور ترقی کے اور عدم تنزلِ اشیا کے قائل ہیں اور نفیِ تکبر نہیں کرتے۔"[1] تیسری نظم اس کے جواب میں تھی۔ شاعر نے نام ظاہر نہیں کیا تھا۔ علامہ کی بیان کی ہوئی حکایت کو مزید بڑھایا تھا کہ شاہین بچے کا غرور قدرت کو پسند نہ آیا۔ شاہین بچے کو سزا ملی۔ خان بہادر نے لکھا، "یہاں نتیجہ ہے کہ اشیا فانی ہیں اور ترقی و تنزل ہر چیز میں ہے سوائے ذاتِ باری تعالیٰ کے اور اسبابِ ترقی کا اختیار کرنا اچھا ہے مگر نتیجہ میں تنزل اور اصل سبب کو فراموش نہ کیا جائے۔"[2]

'خطاب بہ اقبال' باون اشعار کی فارسی نظم کا عنوان تھا۔ سید شوکت حسین نے لکھی تھی۔ علامہ سے درخواست کی تھی کہ صرف اپنے خیالات پیش نہ کریں۔ خود نمونہ بن جائیں۔ مولوی مسعود علی ندوی نے مطبع معارف اعظم گڑھ سے پمفلٹ کی صورت میں شائع کی۔ کئی لوگوں کو بھجوائی گئی۔ مولانا گرامی نے لکھا، "آپ کی ابتدا اوروں کی انتہا!" عزیز لکھنوی نے لکھا، "حضرتِ اقبال کی ذات سے آپ نے جو کچھ خطاب کیا ہے میں اس کا ہمنوا ہوں۔" کیمبرج سے پروفیسر نکلسن نے شکریہ ادا کر کے نظم کے اس نکتے سے اختلاف کیا کہ 'اسرارِ خودی' محض قوم کے لیے آنسو بہانے کا نسخہ ہے۔ علامہ نے نظم موصول ہونے کے بعد ۷ فروری کو شوکت کو خط لکھا، "اسرارِ خودی اقبال کا قال ہے۔ مگر ممکن ہے آپ کا حال ہو۔ اگر ایسا ہو تو میرے لیے بھی دعا فرمائیے۔"[3]

جنوبی ہندوستان میں علامہ کے مداحوں میں عبدالجمیل بنگلوری بھی تھے۔ خط لکھ کر تصویر کی

---

[1] متن میں "قدم اشیا کی اور ترقی کی" درج ہے جو غالباً سہوِ کتابت ہے۔

[2] شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۴۳۴-۴۳۱

[3] ہفت روزہ چٹان لاہور ۲۱ رجون ۱۹۷۱ء میں عابد نظامی کا مضمون 'علامہ اقبال کا ایک گمنام ممدوح'؛ شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۱۵۸-۱۵۱

فرمایش کی۔ ۷ار فروری کو علامہ نے انگریزی میں جواب لکھا، ''مجھے افسوس ہے کہ میرے پاس اس وقت کوئی تصویر نہیں ہے مگر جب میں تصویر کھنچواؤں گا تو آپ کو بخوشی بھیجوں گا۔''[1]

اُس روز ترکی میں نئے عائلی قونین رائج ہوئے۔ ان کی بنیاد سوئیس کوڈ تھی جو یورپ میں رائج تھا۔ طلاق کا حق عدالت کو منتقل ہو گیا۔ وراثت میں بیٹی کا حصہ بیٹے کے برابر قرار پایا۔ جن معاملات میں یورپی قوانین مرد کی برتری تسلیم کرتے تھے وہ برقرار رہی۔ عورت گھر کے سربراہ کی اجازت کے بغیر ملازمت نہیں کر سکتی تھی۔ اسلامی قانون کے مطابق عورت کو حق مہر ملتا تھا، وہ ختم ہو گیا۔

ڈھائی ماہ قبل نومبر میں اسمبلی نے ترکی ٹوپی پر پابندی لگا کر مردوں کے لیے یورپی طرز کے ہیٹ لازمی قرار دیئے تھے۔ عورتوں کے لیے برقعے کی بجائے صرف سر ڈھانپنے کی اجازت تھی۔ قدامت پسند طبقے کی طرف سے مخالفت ہوئی تو اُسے سختی کے ساتھ کچلا گیا۔

علامہ کی نظر میں غازی پاشا کے تین بڑے کارنامے خلافت کا خاتمہ، نام نہاد شرعی عدالتوں کا خاتمہ اور مادیت پسندانہ رویئے کا فروغ تھے۔ یہ اقدامات صرف ترکی ہی نہیں بلکہ اسلام کی بھی بہت بڑی خدمت تھے۔ لباس کے معاملے میں اصلاحات کے خلاف نہ تھے۔ اسلام کسی علاقے سے مخصوص نہیں تھا کہ ایک لباس اسلامی اور دوسرا غیر اسلامی قرار دیا جاتا۔ شریعت میں گنجایش تھی کہ جن چیزوں کی اجازت ہے، قومی مصلحت کے تحت ان میں سے کسی پر پابندی عائد کر دی جائے۔[2] ایک نتیجہ یہ نکلا کہ ترکی ٹوپی ہندوستان میں بھی فیشن سے خارج ہو گئی۔ علامہ پہنتے آئے تھے۔ ''ترکی ٹوپیاں ملنی مشکل ہو گئیں تو [علامہ نے] قرہ قلی نما سیاہ ٹوپی پسند فرمالی،'' مہر کا بیان ہے۔[3] ترکوں کے اِس نظریے سے متفق نہ تھے کہ مادری زبان کے سوا کسی اور زبان میں مذہبی افکار فرد کے رگ و پے میں سرایت نہیں کر سکتے۔ لیکن اذان اور نماز میں عربی کے بجائے ترکی کا استعمال اسلام کے خلاف نہ تھا۔

---

[1] مکتوب بنام عبدالجمیل بنگلوری ۷ار فروری ۱۹۲۶ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۲۶

[2] مقالہ 'اسلام اور احمدیت'

[3] خالد نظیر صوفی، اقبال درونِ خانہ، ۲۵

اسلامی اندلس کا حکمراں محمد ابن تومرت (۱۰۸۰-۱۱۳۰) عالمِ دین بھی تھا۔ اُس نے حکم نافذ کیا تھا کہ قرآن کی تلاوت اور اذان بربری زبان میں ہو۔[1]

علامہ سوئیس کوڈ کے حق میں نہ تھے کیونکہ اسلام کے قانونِ میراث کو بہتر سمجھتے تھے۔[2] انہی دنوں سنا کہ البانیا کے مسلمانوں نے وضو کرنا چھوڑ دیا ہے (بعد میں یہ اطلاع غلط نکلی)۔ ایران کو بابیت سے اندیشہ تھا۔ ذہن میں سوال اُبھرا، "اسمٰعیلی تحریک کہیں پھر زندہ تو نہیں ہو رہی؟" مراد پرانی باطنی تحریک سے تھی۔[3]

اسلامی فقہ کی مختصر سی تاریخ نظر سے گزری۔ مصر سے شائع ہوئی تھی۔ جن مسائل پر بحث کی ضرورت تھی وہی چھوڑ دیئے گئے تھے۔[4] فلسفے کے طالب علم ایم ایم شریف کا ۱۷ ر فروری کا لکھا ہوا خط ملا۔ سوالات پوچھے تھے۔ علامہ نے خط کی پشت پر لکھا کہ جواب دینے سے قاصر ہیں مگر خلافت کے خاتمے کی وجہ سے مصر میں بعض مفکرین دستوری مسئلے کا حل قرآن میں تلاش کر رہے ہیں۔ اسلام کی سیاسی ابتری ختم ہونے کے بعد شاید فلسفیانہ سوالات پر بھی توجہ دی جائے:

> The abolition of Khilafat has led some thinkers in Egypt to reflect on the Quran in reference to the problem of constitution. Philosophical questions are likely to arrive when the political unrest of Islam is over.[5]

۱۸ ر مارچ کو سید سلیمان ندوی کو لکھا:

> اس وقت سخت ضرورت اس بات کی ہے کہ فقہ اسلامی کی ایک مفصل تاریخ لکھی جائے... اگر مولانا شبلی زندہ ہوتے تو میں اُن سے ایسی کتاب لکھنے کی درخواست کرتا۔ موجودہ صورت میں سوائے آپ کے اس کام کو کون کرے گا! ... مسلمانوں پر اِس

---

[1] Iqbal, *Reconstruction*

[2] *Ibid*

[3] مکتوب بنام سید سلیمان ندوی ۱۸ ر مارچ ۱۹۲۶ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۳۱-۶۲۷

[4] ایضاً

[5] Dar, *Letters of Iqbal*

> وقت (دماغی اعتبار سے) وہی زمانہ آرہا ہے جس کی ابتدا یورپ کی تاریخ میں لوتھر کے عہد سے ہوئی۔ مگر چونکہ اسلامی تحریک کی کوئی خاص شخصیت راہنما نہیں ہے، اس واسطے اس تحریک کا مستقبل خطرات سے خالی نہیں...ایک قدیم اسلامی اصطلاح ہے "صوت الحی"، شاید اس کا مفہوم قبیلہ کی آواز ہے۔ کیونکہ اس وقت دُنیائے اسلام میں کوئی خاص مذہبی شخصیت نہیں جو طبائع کے اس انقلاب کو ٹھیک رستہ پر لگائے۔ غرضیکہ اس وقت مذہبی اعتبار سے دُنیائے اسلام کو راہنمائی کی سخت ضرورت ہے اور میرا یہ عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے بعض علما اس کام کو باحسن وجوہ انجام دے سکتے ہیں۔ سیاسی اعتبار سے گو ہم باقی اقوامِ اسلامیہ کو کوئی ایسی مدد نہیں دے سکتے، ہاں دماغی اعتبار سے اُن کے لیے بہت کچھ کیا جاسکتا ہے۔

علامہ نے لکھا کہ ہندوستان کی جمعیۃ العلماٗ کی توجہ ضروری ہے، "تاکہ اقوامِ اسلامیہ کو فقہِ اسلامی کی اصل حقیقت معلوم ہو۔" حافظ ابن قیم کی کتاب طریق الحکمیہ اور پھر المقابلات پر لکھنے کا ارادہ تھا۔ اُس سے پہلے اجتہاد والے مقالے پر نظرِ ثانی کرنا چاہتے تھے۔ ندوی سے پوچھا، "کیا آیۂ توریث میں حصص بھی ازلی ابدی ہیں یا قاعدۂ توریث میں جو اصول مضمر ہے 'صرف وہی ناقابلِ تبدیل ہے اور حصص میں حالات کے مطابق تبدیلی ہو سکتی ہے۔ آیۂ وصیت کے متعلق بھی یہی سوال ہے۔"[1]

اپنی فارسی شاعری کے حوالے سے علامہ نے وضاحت کی، "بعض خیالات زمانۂ حال کے فلسفیانہ نقطۂ نظر کا نتیجہ ہیں، ان کے ادا کرنے کے لیے قدیم فارسی اسلوبِ بیان سے مدد نہیں ملتی، بعض تاثرات کے اظہار کے لیے الفاظ ہاتھ نہیں آتے، اس واسطے مجبوراً ترکیب اختراع کرنی پڑتی ہے جو ضرور ہے کہ اہلِ زبان کو ناگوار ہو کہ دل و دماغ اس سے مانوس نہیں ہیں۔ بعض اشعار کے لکھنے میں تو مجھے اس قدر روحانی تکلیف ہوئی کہ الفاظ میں بیان نہیں ہو سکتی، تاہم اللہ تعالیٰ کا شکر ہے۔"[2]

---

[1] مکتوب بنام سلیمان ندوی ۲۴/ اپریل ۱۹۲۶ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۴۱-۶۳۵

[2] ایضاً

۲۷/ مارچ کو پنجاب یونیورسٹی کی سینٹ کا اجلاس ہوا۔ علامہ اقبال بھی اورینٹل فیکلٹی کے فیلو کے طور پر شریک ہوئے۔[1]

ہمایوں کے مارچ کے شمارے میں علامہ کی رائے چھپی کہ "ہر اعتبار سے اُردو کے بہترین رسالوں میں سے ہے۔"[2]

43

ہندو مسلم فسادات معمول بن چکے تھے۔ علامہ کا کہنا تھا، "پنجاب میں ہندوؤں اور مسلمانوں کی کشیدگی کے باعث جو شرمناک حالات پیدا ہو رہے ہیں اور صوبے کی فضا جیسی مکدر ہو رہی ہے، اسے کوئی مخلص انسان اچھی نظروں سے نہیں دیکھتا۔ میں دل سے چاہتا ہوں کہ ہندو اور مسلمان اپنے اختلافات کو دور کر کے ملک میں بھائیوں کی طرح سے رہیں۔ اور بات بات میں ایک دوسرے کا سر نہ پھوڑتے پھریں۔ میرے بعض احباب نے مجھ سے کہا کہ پنجاب کی مختلف اقوام کے تعلقات کو بہتر بنانے کے لیے ایک متحدہ کوشش ضروری ہے جس میں ہر جماعت کے افراد شامل ہوں گے۔ میں نے ان سے کہا کہ میرے پیشِ نظر فی الحال کوئی سیاسی مقصد نہیں ہے تاہم اخلاقی اعتبار سے اس میں شرکت کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں، چنانچہ میں ان کی اس کوشش میں شریک ہوا۔"

یہ نیشنل لبرل لیگ تھی۔ لبرل رہنما چنتامنی نے بنائی تھی۔ "تھوڑی ہی مدت کے بعد معلوم ہوا کہ گوہرِ مقصود یہاں بھی مفقود ہے اور ملک میں ابھی حصولِ مقصد کے امکانات بہت کم ہیں۔ اس بنا پر میں نے اس جماعت سے استعفیٰ دے دیا،" علامہ کا بیان ہے۔[3]

44

گزشتہ برس یکم اپریل سے اس برس ۳۱/ مارچ تک علامہ کی کُل آمدنی ۱۰۰۷/ روپے، آٹھ آنے اور

---

[1] ڈاکٹر حسن اختر ملک، اقبال، ایک تحقیقی مطالعہ، ص ۸۸

[2] بشیر احمد ڈار، انوارِ اقبال، ص ۳

[3] علامہ کا بیان زمیندار ۶/ اپریل ۱۹۲۶ء؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۱۴-۱۳

چھ پائی ہوئی تھی۔ اخراجات کا تخمینہ منشی طاہر الدین کے حساب سے ۳۴۹۴/ روپے اور چار آنے تھا۔ تشخیص شدہ آمدنی میں یونیورسٹیوں سے ۲۳۱۳/ روپے آٹھ آنے، وکالت سے ۴۰۱۶/ روپے اور کتابوں کی رائلٹی ۱۷۷/ روپے چھ پائی بنتی تھی۔ سال بھر کے پیشہ ورانہ اخراجات منشی کی تنخواہ ۶۰۰/ روپے، محصول ڈاک ۱۲/ روپے، دفتر کا کرایہ ۶۰۰/ روپے، خاکروب وغیرہ کی تنخواہ ۵۵/ روپے، بجلی کے ۵۵/ روپے، آمدورفت کے ۲۰۰/ روپے اور چپراسی کے ۲۴۰/ روپے تھے۔ تشخیص شدہ آمدنی ۵۳۳۸/ روپے آٹھ آنے اور چھ پائی بنی۔ ۱۶۶/ روپے ۱۳/ پائی ٹیکس عائد ہوا۔[1]

اس برس پنجاب یونیورسٹی کے جو پرچے جانچ رہے تھے، یہ تھے: ایل ایل بی تیسرا پرچہ؛ ایم اے فلسفہ پہلا پرچہ۔[2]

45

۳/ اپریل کو لارڈ اِرون ہندوستان کے وائسرائے بنے۔ اصل نام ایڈورڈ فریڈرک لِنڈلے ووڈ تھا۔ پیدائشی طور پر بائیں ہاتھ سے محروم تھے لیکن گھڑسواری کے شوقین تھے اور جنگِ عظیم میں فوجی خدمات بھی سرانجام دے چکے تھے۔ انگلستان کے ہیلی فیکس نوابوں کے خاندان سے تعلق تھا۔ کنزرویٹو پارٹی کے نمایاں رکن تھے۔ شاہِ برطانیہ جارج پنجم نے انہیں وائسرائے نامزد کر کے روانگی سے قبل لارڈ اِرون کا خطاب دیا تھا۔ تین روز قبل یکم اپریل کو بمبئی کے ساحل پر اُترے تھے۔

کلکتہ ہندو مسلم فسادات کی لپیٹ میں تھا۔ خاص طور پر عبادت گاہوں پر حملے کیے جا رہے تھے۔ یہ ایک نئی بات تھی۔ ۴۴/ افراد ہلاک ہوئے۔ ۵۸۴/ زخمی ہوئے۔ پولیس نے گولیاں چلائیں۔ تب ۵/ اپریل تک فساد ختم کیا جا سکا۔ اِس دوران چنتامنی کی طرف سے علامہ کو تار ملا۔ بمبئی میں نیشنلسٹ کانفرنس بلوانا چاہتے تھے۔ خواہش تھی کہ دعوت دینے والوں میں علامہ کا نام شامل ہو۔ کسی سیاسی جماعت کی تائید یا مخالفت کا ذکر نہ تھا۔ علامہ نے اجازت دے دی۔ اجلاس نہ ہوا۔ معلوم ہوا کہ اصل

---

[1] صفدر محمود (۱۹۷۳) 'علامہ اقبال کا گوشوارۂ آمدنی (انکم ٹیکس ریکارڈ کی روشنی میں)'، ص ۲۵-۲۳، ۱۷

[2] ڈاکٹر حسن اختر ملک، اقبال، ایک تحقیقی مطالعہ،، ص ۱۳۲۔ ان کا ماخذ پنجاب گزٹ کے شمارے ہیں۔

مقصد سوراج پارٹی کی مخالفت کرنا ہے، جس نے کانگریس کے کہنے پر کونسلوں سے واک آؤٹ کیا تھا۔ علامہ نے ۶ /اپریل کے زمیندار میں وضاحت پیش کی:

> میں اب تک تمام سیاسی جماعتوں سے علیحدہ رہا ہوں۔ البتہ میری خواہش یہ رہی ہے، اور ہے، کہ ہندوستان کی تمام جماعتوں کے تعلقات بہتر ہو جائیں کہ موجودہ فضا ملک کے لیے بالبداہت باعث ننگ ہے اور مختلف اقوام کی اخلاقی و معاشرتی زندگی کے لیے نہایت مضرت رساں ہے۔ کسی سیاسی جماعت سے میرا کوئی تعلق نہیں۔ ہاں اہل ہند کے باہمی تعلقات کی درستی میں ہر مخلص شخص کے ساتھ ہوں۔[1]

نواب سر ذوالفقار علی خاں مدت سے بیمار تھے۔ دہلی میں علاج کروا رہے تھے۔ تندرست ہو کر ۶ /اپریل کو لاہور واپس پہنچے۔ ریلوے اسٹیشن پر علامہ نے چودھری شہاب الدین، شیخ اصغر علی آئی سی ایس، نواب سر امیر الدین آف لوہارو اور نواب احمد نواز خان آف ڈیرا کے ساتھ استقبال کیا۔[2]

۱۰ /اپریل کو مولوی احمد دین نے اپنی کتاب اقبال کے نئے مسودے کی ابتدا کی۔[3] ممکن ہے کہ علامہ کی طرف سے تحریک ہوئی ہو۔[4]

علامہ کے گزشتہ برس کے مضمون 'Self in the Light of Relativity' کی شہرت ہو رہی تھی۔ احمدی جماعت نے ترجمہ شائع کیا۔ علامہ کے خیال میں ناقص تھا۔ غالباً جامعہ ملیہ نے بھی کیا۔ علامہ کی نظر سے نہ گذرا۔ ملتان سے اکرام الحق سلیم نے کر کے معارف کو بھیجا۔ سلیمان ندوی نے علامہ کو ارسال کیا۔ انہوں نے معارف کے قابل نہ سمجھا۔ کسی اور سے ترجمے کے لیے کہا۔[5]

ندوی نے اپنی خانگی دشواریوں کے ذکر کے ساتھ علامہ کے بعض سوالوں کا جواب دیا۔ علامہ

---

[1] علامہ کا بیان، زمیندار ۶ /اپریل ۱۹۲۶ء؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۱۴-۱۳

[2] اختر النساص ۲۶۴ بحوالہ زمیندار ۸ /اپریل ۱۹۲۶ء

[3] مشفق خواجہ (مرتب: ۲۰۰۶) اقبال از احمد دین، ص ۲۴

[4] مفصل بحث نومبر ۱۹۲۳ء کے واقعات میں پیش کی جا چکی ہے۔

[5] مکتوب بنام ندوی، ۷ /اپریل ۱۹۲۶ء محولہ بالا

نے محسوس کیا کہ 'امام' کی اصطلاح استعمال کرنے سے بعض مشکلات حل ہوتی ہیں بشرطیکہ امام کے اختیارات میں یہ شامل ہو کہ قرآن کی کسی مقرر کردہ حد کی جگہ کوئی اور حد مقرر کر سکے، جیسے حضرت عمرؓ نے ایک موقع پر چور کے لیے ہاتھ کاٹنے کی سزا موقوف کی اور طلاق پر شرائط عائد کیں۔ علامہ نے قرآن کی آیت کا حوالہ دریافت کرنا ضروری سمجھا۔ کیا علمائے کرام کی نظر میں ہر اسلامی ملک کا الگ امام بھی ہو سکتا ہے اور فردِ واحد کے بجائے جماعت کو بھی امام تسلیم کیا جا سکتا ہے؟

۱۷/ اپریل کو سوالات تحریر کرتے ہوئے اپنے اجتہاد والے مقالے کے حوالے سے لکھا، ''میرے نزدیک اقوام کی زندگی میں 'قدیم' ایک ایسا ہی ضروری عنصر ہے جیسا کہ 'جدید'، بلکہ میرا ذاتی میلان 'قدیم' کی طرف ہے۔'' ندوی نے مغرب کے ذہنی غلبے (''معنوی استیلا'') کا اندیشہ ظاہر کیا تھا۔ علامہ نے لکھا کہ اصل خطرہ مغربی افکار سے واقفیت حاصل ہونے میں نہیں بلکہ اسلامی علوم سے بیخبری کی وجہ سے ہے۔ یہ بیخبری اسلامی ممالک میں صرف عوام ہی نہیں بلکہ تعلیم یافتہ لوگوں میں بھی عام ہے۔ اِس معاملے میں ہندوستان کے مسلمان باقی دنیا کے مسلمانوں کی مدد کر سکتے ہیں، ''کیا عجب ہے کہ اسلامی ہند کی آیندہ نسلوں کی نگاہوں میں 'ندوہ'، علی گڑھ سے زیادہ کارآمد ثابت ہو۔''[1]

افغانستان کے لوئی جرگے کی روئیداد کتابی صورت میں شائع ہوئی۔ علامہ کا خیال تھا کہ اس میں اہم سیاسی مباحث پر بحث اُن لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی تھی جو صوبۂ سرحد میں سیاسی اصلاحات کی مخالفت میں کہتے تھے کہ وہاں کے باشندے اس کے اہل نہیں۔ علامہ سمجھتے تھے کہ صوبۂ سرحد کے باشندے اور افغان ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔ طبعاً جمہوریت پسند واقع ہوئے ہیں۔[2]

۲۰/ اپریل کے شمارے میں مولانا ظفر علی خاں نے زمیندار کے اداریے میں اطلاع دی، ''علامہ اقبال نے بھی بعض احباب کے اصرار سے مجلس وضع قوانین پنجاب کے آیندہ انتخابات میں امیدوار رکنیت بننا منظور فرما لیا ہے اور آپ شہر لاہور کی طرف سے کھڑے ہوں گے۔'' زمیندار نے

---

[1] ایضاً

[2] اختر النسا (۲۰۱۰)، ص ۳۸۔ بحوالہ زمیندار ۲/ مئی ۱۹۲۶ء جہاں علامہ کا بیان آبزور کے حوالے سے شائع ہوا ہے۔

اداریے میں لکھا:

> ہمیں یقین واثق ہے کہ اِس اعلان کے بعد باقی تمام امیدوار حضرات اپنے اسمائے گرامی واپس لے لیں گے اور علامہ اقبال بلامخالفت پنجاب کونسل کے رکن منتخب ہو جائیں گے لیکن اگر اس پر بھی کسی شخص کا ارادہ ڈٹے رہنے کا ہو تو ہم اُسے بتائے دیتے ہیں کہ اس کا کامیاب ہونا مشکل ہی نہیں محال ہے۔ اس لیے اُسے چاہیے کہ عاقبت اندیشی سے کام لے کر ابھی پیچھے ہٹ جائے اور اپنی نیک نامی اور ہر دلعزیزی کو اپنے ہاتھوں نقصان نہ پہنچائے۔
>
> واضح رہے کہ پنجاب کونسل کی رکنیت علامہ اقبال کے لیے کوئی ذریعہ عزت نہیں ہے بلکہ آپ کی شخصیت کا کونسل میں منتخب ہو کر آنا خود کونسل کے لیے باعثِ صد افتخار ہے۔ ایک بین الاقوامی شہرت رکھنے والے فاضل اجل اور عالمِ اسلام کے وحید العصر فلسفی کے لیے کسی صوبہ کی کونسل کا رُکن بن جانا کوئی وجہ ٔعزت نہیں بلکہ اس کی شخصیت اس کونسل کے لیے سرمایہ صد ہزار نازش ہے۔[1]

یہ معلوم نہیں کہ اخبار میں یہ اطلاع علامہ کے کہنے پر ہی شائع کی گئی۔ کونسل کے موجودہ رُکن میاں عبدالعزیز نے ابھی تک آیندہ انتخابات سے دستبرداری کا اعلان نہیں نہ کیا تھا۔ بلدیہ کے صدر ملک محمد حسین بھی الیکشن لڑنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ علامہ انتخابات میں اخلاقی اور مادی وسائل ضائع کرنے کے خلاف تھے۔ یہ تجویز بھی ان سے منسوب کی گئی ہے کہ جو لوگ انتخاب اور ووٹوں کے بارے میں گرم جوش ہوں، اُن کی کانفرنس بلائی جائے جس کے اراکین کی تعداد طاق ہو۔ اُمیدواروں کے کوائف اور رائے عامہ جاننے کے بعد کانفرنس اکثریتی فیصلے سے طے کرے کہ عوام زیادہ تر کس اُمیدوار کے حق میں ہیں اور متفقہ طور پر اُس کی مدد کرے۔[2] مجلسِ خلافت کے کارکن حکیم عبدالمجید

---

[1] زمیندار (لاہور)، ۲۰/اپریل ۱۹۲۶ء

[2] عبدالرشید طارق، 'مے شبانہ'، ص ۲۵۱

عتیقی کا کہنا ہے کہ ''زعمائے خلافت نے علامہ اقبال کو بہ اصرار آمادہ کیا''۔ خیال تھا کہ اس طرح ''علامہ موصوف کے اثرات کا امتحان ہو جائے گا اور قوم ایک بہترین شخصیت کے فکر و عمل سے مستفید ہو سکے گی۔''[1] علامہ نے 'خضرِ راہ' میں کونسل کی بحثوں کو ''سرمایہ داروں کی جنگِ زرگری'' کہا تھا۔ ظریفانہ کلام میں کونسل ہال کو سرمایہ داروں کا تکیہ قرار دیا تھا۔ خلیفہ عبدالحکیم کہتے ہیں کہ انہوں نے علامہ سے ازراہِ مذاق کہا کہ اب خود اِس میں کیسے شریک ہو گئے۔ علامہ نے جواب دیا، ''جو کہتا تھا، وہ ٹھیک تھا، میں اسی لیے شامل ہوا ہوں کہ اندر سے اس کی بیخ کنی کی جائے۔''[2]

مرزا جلال الدین کہتے ہیں کہ وہ شروع ہی سے اس تجویز کے خلاف تھے کہ علامہ کو منتخب کیا جائے۔ مرزا جلال کے مطابق کونسل کی رکنیت ''آیندہ ترقی کے لیے ایک زینہ'' تھی۔ علامہ بھی اسی لیے آمادہ ہوئے تھے۔ ورنہ رکنیت کے اہل نہ تھے۔ اُن کی طبیعت ''اِس قسم کی ہنگامہ خیزیوں سے مانوس نہیں ہو سکتی'' تھی۔ اُن میں صحیح رائے قائم کرنے کی صلاحیت بھی نہ تھی:

> اپنے ذاتی معاملات کے متعلق رائے قائم کرنے میں ڈاکٹر صاحب [علامہ اقبال] بالکل بے بس تھے اور اُن کا عجز صاف نظر آنے لگتا۔ چنانچہ وہ اِس ضمن میں معمولی سے معمولی لوگوں کی طرف رجوع کرتے اور اُن کی آرا کے عیب و صواب کو جانچے بغیر اُن پر عمل پیرا ہونے تک [میں] تامل نہ فرماتے۔ نتیجہ یہ کہ ڈاکٹر صاحب اپنے معاملات انہی پر چھوڑ دینے کے عادی سے ہو گئے۔ اُن کا یہ طرزِ عمل اُن کے دیرینہ دوستوں کو پسند نہ تھا۔ چنانچہ کچھ تو خود پیچھے ہٹ گئے اور بعض کے متعلق انہی حضرات کی مساعی سے ڈاکٹر صاحب کے دل میں غلط فہمیاں پیدا ہو گئیں جو آخر وقت تک رفع نہ ہو

---

[1] حکیم عبدالمجید عتیقی کا مضمون 'کچھ پھول کچھ کانٹے'، ہفت روزہ شہاب لاہور ۸/ مارچ ۱۹۶۴ء منقولہ شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۲۷۲-۲۷۱۔ خواجہ عبدالوحید کے مطابق ایک موقع پر علامہ نے ان سے کہا کہ ملکی سیاست میں محض اس لیے شامل ہوئے کہ ہندوستان کے آیندہ سیاسی نظام میں مسلمانوں کی حیثیت واضح کر دیں اور ظاہر کریں کہ ملک کے سیاسی ارتقا میں حصہ لیتے ہوئے دوسری اقوامِ ہند میں مدغم نہ ہو جانا چاہیے؛ عبدالوحید، 'یادِ ایّام' ص ۱۷۸

[2] خلیفہ عبدالحکیم (۱۹۴۴) 'اقبال کی زندگی'، ص ۲۷۔ سی آر داس کے پروگرام سے مماثلات قابلِ غور ہے۔

سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب ... مردم شناسی میں مشاق نہ تھے۔[1]

اس کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے کہ علامہ ذاتی ترقی کی خواہش پر سیاست میں داخل ہوئے۔ میدانِ سیاست میں انہوں نے جو بھی رائے ظاہر کی، وہ بعد میں سچ ہو کر رہی۔ اس لیے یہ بھی تسلیم نہیں کیا جا سکتا کہ بغیر سوچے سمجھے دوسروں کی رائے اپنا لیتے تھے۔

جاوید نے بڑے ہو کر جاننے کی کوشش کی کہ اُن کے والد کی کردار کشی کی مہم کا آغاز کب ہوا اور کس نے کیا۔ میاں ایم اسلم نے بتایا کہ ترکِ موالات کی تحریک سے پیشتر علامہ کے بارے میں کوئی بہتان نہیں سنا تھا۔ ۱۹۲۰ء کے بعد آغاز ہوا۔ میاں امیر الدین نے تائید کی۔ "یہ بات طے ہے کہ اقبال کی کردار کشی کی مہم کا آغاز کانگرسی ذہنیت رکھنے والے علما اور اُن کے حامیوں نے کیا،" جاوید کہتے ہیں، "بعد میں کم علم یا تنگ نظر مُلّا، عہدِ تنزل کی شاعری کے پرستار اہلِ سخن، احمدی، سوشلسٹ، ترقی پسند مصنفین، مروجہ صوفی سلاسل کے محافظ مشائخ، اقبال کے منافق اور احکام رس احباب، پنجاب کے بعض متعصب ہندو اور دیگر افراد بقدرِ ہمت اِس مہم میں شامل ہوتے چلے گئے۔"[2]

46

۲۱/ اپریل کو ابنِ سعود کی حکومت نے مدینہ کی جنت البقیع میں مزار توڑنا شروع کیے۔ عہدِ نبویؐ کی دوسری یادگاریں اور صحابہ سے منسوب کچھ مساجد بھی منہدم ہونے والی تھیں۔ جون جولائی میں حج کے زمانے میں اُس مؤتمر کا اجلاس ہونے والا تھا جس کا اعلان ڈیڑھ دو برس پہلے کیا گیا تھا۔ ہندوستان کی نمایندگی کے لیے خلافت کانفرنس اور جمعیت العلما کو دعوت دی گئی تھی۔ خلافت کانفرنس کے وفد میں جوہرؔ، مولانا شوکت علی، شعیب قریشی اور سید سلیمان ندوی شامل تھے۔ ندوی نے سفر کی تیاری کے دوران ہی علامہ کے خط کا جواب دیا۔ امامت کی وضاحت میں لکھا کہ نبی کریمؐ کی دو حیثیتیں تھیں، نبوت اور امامت۔ نبوت میں احکامِ قرآنی اور آیاتِ قرآنی سے حضور کا استنباط داخل تھے۔

---

[1] مرزا جلال الدین، 'میرا اقبال'، ص ۹۲-۹۱

[2] ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۴)، زندہ رود، ص ۲۰۶-۲۱۰

خط طویل تھا۔ علامہ نے کئی دفعہ پڑھا۔ ۲۳/ اپریل کی رات بعض احباب جمع تھے۔ چودھری غلام رسول مہر سے خط پڑھوا کر بھی سُنا۔[1] یہ سوالات پیدا ہوئے کہ آنحضورؐ نے اذان کے متعلق صحابہ سے جو مشورہ کیا وہ نبوت اور امامت میں سے کس کے تحت آئے گا؟ آنحضورؐ کا استنباط یا اجتہاد عقل، تجربے اور مشاہدے کی بنیاد پر تھا یا اُسے بھی وحی میں داخل سمجھا جائے۔ علامہ اسے بھی وحی میں داخل سمجھتے تھے لیکن ٹھوس دلیل حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اس قسم کی وحی "غیر متلو" کہلاتی تھی یعنی جس کی تلاوت نہیں کی گئی۔ دوسرے معانی میں وہ چیز جو خدا کی طرف سے رسول پر نازل ہوئی لیکن اُسے قرآن میں شامل کرنے کا حکم نہ ہوا۔ علامہ جاننا چاہتے تھے کہ نفسیاتی اعتبار سے اس کی تعریف کیا ہے۔ نیز وحی غیر متلو اور وحی متلو [یعنی قرآن شریف] کے درمیان فرق آنحضورؐ کے دَور میں بھی تھا یا یہ اصطلاحات بعد میں وضع کی گئیں۔

اسلامی فقہ میں خاوند طلاق دینے کا حق بیوی یا اُس کے کسی رشتہ دار کو تفویض کر سکتا تھا۔ علامہ جاننا چاہتے تھے کہ کیا اس کی بنیاد کسی آیت یا حدیث پر ہے۔

ایک اور بات بھی اہم تھی۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک طلاق یا خاوند کی موت کے دو سال بعد بھی اگر بچہ پیدا ہو تو اُسے ولد الحرام قرار نہیں دیا جا سکتا تھا۔ علامہ کے نزدیک یہ اہم تھا۔ اس سے ظاہر تھا کہ اسلام انسانی شخصیت کو اہمیت دیتا ہے۔ ولد الحرام کہلانے کی وجہ سے بچے کی شخصیت پر برا اثر پڑ سکتا ہے اس لیے اسلام چاہتا ہے کہ جہاں تک ہو سکے، اس تہمت کا دروازہ بند کیا جائے۔[2] برطانوی عہد میں مسلم پرسنل لائ قرار تھا لیکن یہ قانون موقوف کر دیا گیا تھا۔ اس لیے کہ اسے قانون نہیں بلکہ صرف گواہی کا طریقِ کار سمجھا گیا۔ اُس کی جگہ ایکٹ شہادت (Evidence Act) نافذ ہو چکا ہے۔ نتیجہ یہ تھا کہ بعض صورتوں میں جو بچہ اسلام کی رُو سے والدین کا جائز وارث ہے وہ مروجہ قانون کی رُو سے ناجائز قرار پاتا۔ علامہ جاننا چاہتے تھے کہ اس معاملے میں اسلامی اصول کی بنیاد کیا ہے اور وہ محض ایک قاعدۂ شہادت ہے یا قانون کا حصہ ہے۔

---

[1] مکتوب بنام سلیمان ندوی ۲۴/ اپریل ۱۹۲۶ء محولہ بالا

[2] Iqbal, 'Islam as a Moral and Political Ideal'; see Sherwani, p.105

"ایک شہادت میں اور بھی باتیں ہیں جن کا ذکر اس مضمون میں کرنے کا ارادہ ہے جو میں حافظ ابن قیم کے فلسفۂ شہادت پر لکھوں گا،" علامہ نے ۲۴/ اپریل کو سلیمان ندوی کو لکھا، "اگر میری نظر اس قدر وسیع ہوتی جس قدر آپ کی ہے تو مجھے یقین ہے کہ میں اسلام کی کچھ خدمت کر سکتا۔ فی الحال انشاٗاللہ آپ کی مدد سے کچھ نہ کچھ لکھوں گا... اگرچہ آپ اس وقت سفر حجاز کی تیاریوں میں مصروف ہوں گے، تاہم مجھے یقین ہے کہ آپ ازراہِ عنایت میرے سوالات پر کسی قدر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالیں گے۔"[1]

47

یکم مئی کے زمیندار میں اشتہار چھپا کہ بانگِ درا کا دوسرا ایڈیشن آرہا ہے۔ اشتہار اُس ماہ ۲، ۳، ۲۱ اور ۲۶ تاریخ، جون کی ۲، ۱۱، ۱۴، ۱۸ اور ۲۰ تاریخ اور جولائی کی ۴، ۷، ۱۰/ اور ۱۶/ تاریخ کو دہرایا گیا۔

نادر موقع خوشخبری نادر موقع

علامہ ڈاکٹر شیخ سر محمد اقبال صاحب کے ٹی بیرسٹر ایٹ لا کے اُردو کلام کا مجموعہ موسومہ

بانگِ درا کا دوسرا اڈیشن

نہایت آب و تاب سے عمدہ کاغذ پر طبع ہونے والا ہے۔ لکھائی چھپائی مثل سابق دیدہ زیب ہوگی، سرورق بھی نہایت خوبصورت ہوگا اور ہر ایک جلد ڈاکٹر صاحب موصوف کی تصویر سے مزّین ہوگی۔ باوجود ان تمام خوبیوں کے سابق قیمت مبلغ چار روپے کے بجائے دو روپے آٹھ آنے صرف ان اصحاب سے لیے جاویں گے جو ۱۵/ جون ۱۹۲۶ء تک اپنا آرڈر درج کرادیں گے۔ یک صد کتاب سے زائد کے خریدار کو کمیشن بھی دیا جائے گا۔ دس کتابوں کے خریدار کو محصول ڈاک معاف۔ نوٹ: مجلّد کتاب بھی ایک روپیا زائد خرچ کرنے پر مل سکتی ہے جس پر بانگ درا اور ڈاکٹر صاحب کا نام سنہرے

---

[1] ایضاً

حروف سے لکھا ہو گا۔ المشتہر: حکیم شیخ طاہر الدین: بازار انار کلی، لاہور۔ [1]

امیر کبیر سید علی ہمدانی میں علامہ کی دلچسپی بڑھ گئی۔ اگلے وقتوں میں کشمیر میں تعلیم و مذہب کے فروغ میں حصہ لیا تھا۔ کشمیر کو "چھوٹا ایران" (ایرانِ صغیر) بنانے والوں میں سے تھے۔ ان کی مشہور تصنیف ذخیرۃ الملوک تھی۔ علامہ دیکھنا چاہتے تھے۔ اتفاق سے محمد دین فوق کو بھی جستجو ہوئی۔ [2]

پرانے خیال کے نقادوں پر 'بیمارانِ لکھنؤ' کے عنوان سے اعتراض کیے گئے۔ جواب میں اودھ پنچ (لکھنؤ) نے مضمون شائع کیا۔ ۵/ مئی کو علامہ نے فوق کو لکھا، "اودھ پنچ کا مضمون 'بیمارانِ لکھنؤ' کے جواب میں ہے۔ مجھے پہلے سے خیال تھا کہ اس کا جواب لکھا جائے گا۔ بہر حال موجودہ لٹریری مذاق کی حالت قابلِ ماتم ہے۔"[3]

48

مولانا روم نے کہا تھا، "معنیٰ وہ ہے جو تمہیں اپنی گرفت میں لے کر صورت سے بے نیاز کر دے۔ معنیٰ وہ نہیں جو تمہیں اندھا بہرا کر کے صورت پر اور فریفتہ کر دے!"[4]

روایت ہے کہ علامہ اکثر کہتے تھے، "ہندوستانی موسیقی میں المیت [اداسی] کا عنصر بہت غالب ہے اور ذوقِ حیات اس سے پیدا ہو ہی نہیں سکتا۔"[5] یہ بھی روایت کی گئی ہے کہ انہوں نے کہا کہ بعض قسم کا آرٹ قوموں کو ہمیشہ کے لیے مردہ بنا دیتا ہے۔ چنانچہ ہندو قوم کی تباہی میں اُس کے فنِ موسیقی کا بہت حصہ رہا ہے۔ [6]

زبورِ عجم کے حصے 'بندگی نامہ' میں عنوان قائم کیا، 'غلاموں کے فنونِ لطیفہ کے بیان میں'۔

---

[1] اختر النسا (۲۰۱۰) اقبال اور زمیندار، ص ۱۰۴-۱۰۲

[2] علامہ کا مکتوب بنام فوق ۵/ مئی ۱۹۲۶ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۴۱

[3] علامہ کا مکتوب بنام فوق ۵/ مئی ۱۹۲۶ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۴۱

[4] علامہ نے زبورِ عجم کے 'بندگی نامہ' میں موسیقی کے ضمن میں اس کا حوالہ دیا ہے۔

[5] خواجہ عبدالحمید (۱۹۴۴) 'اقبال کے علمی جواہر ریزے' ص ۸۰

[6] عبدالوحید، 'یادِ ایّام' ص ۱۷۹

یہ دکھانا تھا کہ فنون پر غلامی کے کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ غلام کے دل میں آیندہ کا ذوق ہوتا ہے نہ آج کی لذت۔ یہی کیفیت اُس کی موسیقی میں ظاہر ہوتی ہے۔ ''ہمارے مطرب نے معنی کا جلوہ نہیں دیکھا۔ اُس نے صورت سے دل لگالیا اور معانی سے دُور جا پڑا،'' فارسی میں لکھا۔ غلام کی موسیقی میں زندگی کی حرارت نہیں ہوتی۔ سننے والے کو کمزور، مضمحل اور بیزار کر دیتی ہے۔ اُس کی آنکھیں آنسوؤں کے بغیر دیکھ ہی نہیں سکتیں۔ جہاں تک ہوسکے اُس کی موسیقی پر کان مت دھرو۔ وہ صرف موت کا نغمہ ہے۔ آواز کے پردے میں نحوست ہے۔

غم کی دو قسمیں ہیں۔ ایک انسان کو ختم کر دیتا ہے۔ دوسرا تمام غموں کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ غلامی کی موسیقی دوسری قسم سے محروم ہے۔ دردوسوز کی بجائے مایوسی پیدا کرتی ہے۔ دل سے روحانی سرشاری اور مستقبل میں جھانکنے کی صلاحیت چھین کر دل میں زہر بھر دیتی ہے۔ ایسی موسیقی سے صرف وہ دل بہلائے جس کے سامنے کوئی مستقبل نہ ہو۔ ورنہ اصل میں:

موسیقی کو بادل کی گرج، بجلی کی کڑک اور پانی کے ریلے کی طرح ہونا چاہیے کہ غموں کے پہاڑ اپنے ساتھ بہالے جائے۔

موسیقی جنون کی پرورش کرے، ایسی آگ ہو جو خونِ دل میں حل کی ہوئی ہو،

جس کے نم سے شعلے کو پروان چڑھایا جاسکے اور سکوت و حیرت کو اس کا حصہ بنایا جاسکے۔ [1]

علامہ واقعی سمجھتے تھے کہ دنیائے اسلام میں ایسی موسیقی نے آیندہ جنم لینا ہے۔[2] فنون میں اسلام کی حقیقی روح ابھی تک صرف تعمیرات ہی میں نمودار ہوئی تھی۔ 'آزاد لوگوں کی تعمیرات' کا ذیلی عنوان قائم کر کے لکھا کہ تصویر ہمیں مصوّر کے باطن کی خبر دیتی ہے۔

قطب الدین ایبک اور شیر شاہ سوری کی تعمیرات کی تعریف کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس سے اُن کی مراد دہلی کی مسجد قوۃ الاسلام اور جہلم کا قلعہ رُہتاس تھے۔ علامہ نے لکھا کہ ایبک اور سُوری نے اپنی تعمیرات میں اپنے باطن کو بے نقاب کیا۔ اس طرح اپنے آپ کو دیکھا۔ انہوں نے پتھر سے پتھر

[1] زبورِ عجم کے اشعار کا ترجمہ ہے۔

[2] Iqbal, 'Foreword—Muraqqa-i-Chughtai'; see Razzaqi, p.313

جوڑ کر گزرتے ہوئے وقت کو ایک لمحے میں روک دیا ہے۔ اس کا مشاہدہ بھی ہمیں قوّت بخشتا ہے۔ ہمیں کسی دوسرے جہان میں پہنچا دیتا ہے۔ مسجد قوت الاسلام کو دیکھ کر محسوس ہوتا ہے جیسے ہم وہاں سجدہ کرنے کے قابل نہ ہوں۔ تب اندازہ ہوتا ہے کہ ہمیں ہماری جڑوں سے اُکھاڑ کر ہمارے مقام سے کتنی دُور پھینک دیا گیا ہے۔ ''ذرا گزرے ہوؤں کی صحبت اختیار کرو،'' انہوں نے لکھا:

ایک نظر اُس سچے موتی کو بھی دیکھو، تاج محل کو چاندنی رات میں دیکھو!
اُس کا مرمر بہتے ہوئے پانی سے زیادہ رواں اور وہاں کا ایک لمحہ ابد سے زیادہ باقی رہنے والا ہے۔
جوانمردوں کے عشق نے اپنی داستان بیان کر دی ہے، پلکوں کی نوک سے پتھر تراشے ہیں!
جوانمردوں کا عشق جنت کی طرح پاک اور رنگیں ہے اور سنگ و خشت سے نغمے پیدا کرتا ہے۔
جوانمردوں کا عشق حسینوں کو پرکھنے کی کسوٹی ہے، حسن کا پردہ چاک بھی کرتا ہے اور حسن کا پردہ دار بھی ہے!
اُس کی ہمت آسمانوں سے پرے پہنچ کر اِس محدود جہان سے باہر نکل گئی۔
جو دیکھا وہ چونکہ بیان میں نہیں سما سکتا تھا اس لیے اپنے باطن ہی کو بے نقاب کر دیا۔[1]

'طبعِ غلامانہ' کے ذیلی عنوان میں بھی آٹھ اشعار لکھے۔ پھر کسی وقت قلمزد کر دیے۔[2]

49

ملتان والے شیخ اکرام الحق سلیم کا خط آیا۔ علامہ کے مضمون 'Self in the Light of Relativity' کے اُس ترجمے کے بارے میں استفسار تھا جو معارف کو بھیجا تھا اور وہاں سے علامہ کو بھجوایا گیا۔ ۱۱ر مئی کو علامہ نے لکھا، ''جہاں تک مجھے یاد ہے، میں نے آپ کا مسودہ علامہ موصوف [سید سلیمان ندوی] کی

[1] زبورِ عجم کے اشعار کا ترجمہ ہے۔
[2] بیاض زبور عجم

خدمت میں واپس بھیج دیا تھا، مگر ممکن ہے میرا حافظہ غلطی کرتا ہو۔ تلاش کروں گا...''[1]

قاہرہ میں ۱۳، ۱۵، ۱۸ر اور ۱۹ر مئی کو خلافت کے مسئلے پر کانفرنس ہوئی۔ دو برس پہلے کہا گیا تھا کہ خلیفہ کا انتخاب کیا جائے گا۔ شاہ فواد مصر کے دستوری بادشاہ تھے۔ چاہتے تھے کہ خلیفہ تسلیم کیے جائیں۔ مخالفت ہوئی۔ کانفرنس کا مقصد تبدیل کرنا پڑا کہ صرف خلافت کے مسئلے کی وضاحت کی جائے گی۔ اسلامی ممالک نے عموماً گریز کیا۔ ہندوستان سے عنایت اللہ مشرقی کے سوا کوئی نہ گیا۔ کانفرنس اِسی نتیجے پر پہنچ سکی کہ دورِ حاضر میں خلافت ممکن ہے مگر تشریح کی محتاج ہے۔[2] ۱۵ر مئی کو معزول عثمانی خلیفہ سلطان وحید الدین نے رُوم میں وفات پائی۔

۲۷ر مئی کو مراکش کی اسلامی ریاست ریف کے سربراہ غازی عبدالکریم نے فرانس اور اسپین کی فوجوں کے سامنے ہتھیار ڈالے۔ حملہ آوروں نے بیالوجیکل ہتھیاروں کا سہارا لیا تھا۔ دو برس پہلے جرمنی سے زہریلی گیسیں حاصل کیں۔ فرانسیسی اور اسپینی پریس میں لکھا گیا کہ مراکشی وحشیوں کو ختم کرنے کے لیے ایسے ہتھیار جائز ہیں۔ گیس بم گنجان آباد علاقوں پر گرائے گئے۔ عبدالکریم مجبور ہو گئے۔ ان کے ساتھ معاہدہ ہوا کہ بحرِ ہند کے ایک جزیرے میں آرام کے ساتھ رکھے جائیں گے۔

50

احمد دین ۲۲ر مئی کو اقبال کے نئے مسودے کی تکمیل کر چکے تھے۔[3] امکان ہے کہ فوراً ہی علامہ کی نظر سے گزرا ہو گا۔ اُسی برس کسی وقت شائع ہوا۔ اُردو میں علامہ اقبال پر شائع ہونے والی پہلی مکمل کتاب تھی۔[4] شاعر کے حالاتِ زندگی اور ماحول کی روشنی میں کلام کا تجزیہ اور کلام کی روشنی میں ذہنی ارتقاً کے مراحل پیش کیے گئے۔ اشعار کا انتخاب کفایت اور سلیقے کے ساتھ ہوا۔ متروک اشعار صرف وہاں

---

[1] مکتوب بنام شیخ اکرام الحق ۱۱ر مئی ۱۹۲۶ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۴۲

[2] Kramer, *Islam Assembled,* pp.86-105۔ علامہ نے لکھا کہ علمائے مصر نے ابھی تک رائے پیش نہیں کی کہ آیا خلافت کا منصب اسمبلی کو دیا جا سکتا ہے: Iqbal (1934), *Reconstruction*

[3] مشفق خواجہ (مرتب: ۲۰۰۶) اقبال از احمد دین، ص ۲۴

[4] مشفق خواجہ محولہ بالا، ص ۱۹

آئے جہاں شاعر کے فنی یا ذہنی ارتقا کی کسی منزل کو سمجھنے کے لیے ناگزیر تھے۔ تب بھی وضاحت کی گئی کہ بانگِ درا میں شامل نہیں ہیں۔ زبان سادہ اور مدلل تھی۔ بعد میں اس کتاب کو ''اُردو میں عملی تنقید کا پہلا نمونہ'' قرار دیتے ہوئے کہا گیا کہ ''اُردو تنقید میں سائنٹفک انداز'' سب سے پہلے احمد دین نے اختیار کیا۔[1]

باب اول؛ کلامِ اقبال—اقبال کے ذہنی ارتقا کو تین ادوار میں تقسیم کیا گیا۔ بانگِ درا کے مطابق تھے۔ منتخب اشعار، حالاتِ زندگی اور سماجی ماحول کی مدد سے ہر دور کی امتیازی خصوصیات نمایاں کی گئیں۔ خیالات کا بتدریج ارتقا بیان کرتے ہوئے احتیاط کے ساتھ وہی خیالات شاعر سے منسوب کیے گئے جنہیں اُس کے نظامِ فکر میں نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ مثلاً دورِ دوم کے حوالے سے لکھا گیا، ''وہ دیکھتا تھا کہ فرنگستان میں آزادی، مساوات اور اخوتِ فرانسویہ کے نام لیوا تو ضرور ہیں مگر تہذیبِ حاضرہ میں ان کا مفہوم کچھ نرالا ہی ہے۔ یہ اصطلاحات ہیں جو نادانوں کو پھسلانے کے لیے استعمال ہو رہی ہیں۔ قومیّت، نسل، مذہب اور رنگ، ان معنوں پر متصرف ہیں اور حسبِ حالاتِ مختلفہ، ان کے مختلف معانی پیدا کرنے کے ذمہ دار ہیں۔''[2] دورِ دوم کی نظموں میں کہیں بھی آزادی، مساوات اور اخوت یکجا نہیں تھے مگر بعد میں 'رموزِ بیخودی' میں انہی کی ترویج کو بعثتِ نبویؐ کا مقصد قرار دیا گیا۔ ظاہر تھا کہ مصنف نے وہاں سے شاعر کے نظامِ فکر کی اساس لے کر دورِ دوم کی بکھری ہوئی نظموں کو درست سیاق و سباق میں رکھ دیا۔ یورپ پر شاعر کی تنقید جس طرح بیان کی وہ بھی صرف اشعار سے اخذ نہیں کی جا سکتی تھی بلکہ معلوم ہوتا تھا کہ بعض تقاریر بھی ذہن میں رکھی گئی ہیں۔ احمد دین کے لیے یہ ممکن بھی تھا کیونکہ تقریباً آغاز ہی سے اقبال کو دیکھتے اور سنتے آرہے تھے۔ بعد میں آنے والوں کے

[1] مشفق خواجہ (مرتب: ۲۰۰۶) اقبال از احمد دین، ص ۴۹

[2] مشفق خواجہ محولہ بالا، ص ۱۵۱

لیے مشکل ہوتا۔ اُن کے لیے یہ پائیدار بنیاد فراہم ہو گئی۔

باب دوم؛ مضامینِ کلام — مولانا محمد حسین آزادؔ نے ۱۸۷۴ء میں لاہور میں ایک مشاعرے کا آغاز کیا جس میں مصرع طرح کی بجائے مضمون کا عنوان دیا جاتا تھا۔ یہ ہندوستان میں ایک نئی بات تھی۔ اِسی اصول پر پہلے مولانا حالیؔ اور پھر اکبرؔ الہ آبادی نے قومی مضامین سے اُردو کا دامن بھر دیا۔ اُن کے بعد اقبال آئے۔[1] اُن کے خاص مضامین ہیں: نورِ توحید کی جوت؛ دلنواز مستقبل؛ تلامیذ الرحمٰن [الہامی شاعری]؛ خودی، خودداری اور خودافزائی؛ دریوزۂ خلافت [غیر طاقتوں سے خلافت کی بھیک مانگنے کی مذمت]؛ پیغامِ عمل؛ مذہب؛ اخلاقیات؛ سیاسیات؛ تہذیبِ نَو؛ تصوّف؛ فلسفہ؛ وطنیت؛ عجمیت؛ پان اسلامزم یا اتحادِ سیاسیۂ ملیہ۔ موضوعات کے تنوّع میں بھی بنیادی نکات نمایاں رہے: ''اقبال کو یقین ہے، اُس نے عینُ الیقین سے دیکھا ہے کہ مسلم کا مستقبل شاندار ہے۔ اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اِس شاندار مستقبل کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ وہ [یعنی مسلم] محسوس کرے کہ اُس کی حیثیت کیا ہے، وہ کیا کُچھ ہے، کیا کر سکتا ہے، اور اُسے کیا کُچھ کرنا ہے۔''[2]

باب سوم؛ طرزِ بیان — اقبال کے طرزِ بیان کی نمایاں خصوصیات ہیں: حسن و عشق کی زبان؛ خیال بندی؛ غالبیّت [مرزا غالبؔ سے مماثلت]؛ شوکتِ بیان؛ سوز و گداز؛ تشبیہات اور استعارات؛ جوش؛ طرفگی بیان؛ موسیقیت؛ اُمید؛ ارضی مناظرِ قدرت سے استدلال، مثلاً جمعیت، تلقینِ گل، علوہمتی، خودداری، پابندیٔ آئین، سادہ زندگی اور ذوقِ عمل؛ سماوی مشاہدات سے سبق؛ واقعہ نگاری تمسخرانہ لہجے میں؛ مناظرِ قدرت کی تصویریں؛ جذبات کی تصویریں؛ جذبات کی تصویریں دوسرے رنگ میں؛ اُردو اور اہلِ پنجاب، نیز اقبال اور ابنائے وطن [اقبال کی یہ شکایت کہ ہمعصر مضامینِ کلام سے فائدہ نہیں اُٹھاتے اور اُس کی

---

[1] مشفق خواجہ محولہ بالا، ص۲۳۱-۲۲۸

[2] مشفق خواجہ محولہ بالا، ص۲۴۳

شاعری میں ظاہری محاسن کے پرستار ہیں]۔ یہاں بھی مصنف نے اصل نکات کی طرف سے قاری کی توجہ ہٹنے نہ دی: "فوری انقلابات میں وہ فلاحِ قومی نہیں دیکھتا۔ وہ نمو کا قائل ہے۔[1] وہ دماغ کی اعلیٰ ترین تحریکوں سے دل افضل ترین ولولے اُبھارتا ہے... لیکن اِس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اقبال کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے اسلوبِ بیان کے لیے موقع اور محل ملحوظ رکھتا ہے۔ اگر مضمون دقت طلب، اہم ہے، اور رہنمایانِ قوم ہی مخاطب ہیں تو اُس کی زبان مشکل اور دقیق نظر آئے گی۔ اگر وہ عوام کو کوئی بات سمجھانا چاہتا ہے تو اُس وقت اُس کا کلام عام فہم ہوتا ہے۔"[2]

اقبال

علامہ سر محمدؒ اقبال کی اُردو منظومات۔ اُن کے مقصدِ شاعری اور خیالات کے

نشوونما۔ مضامینِ کلام اور طرزِ بیان پر ایک نظر

احمد دین

[اقتباس]

ہم دیکھتے ہیں کہ حالیؔ اور اکبرؔ جو اُردو شاعری — قدیم شاعری — کے بت شکن کہے جا سکتے ہیں، بت اور ساتھ ہی اس بت کے سازوسامان، اُس کے متعلقات کے بھی مخالف ہیں۔ ہوس پرستی اور ہوس بازی کے جملہ لوازمات سے نفور ہیں۔ حسن کے نازو انداز، عشق کے راز و نیاز میں وہ کچھ لطف نہیں پاتے۔ اقبال ان کی طرح ہوس پرستی کے بت سے تو متنفر ضرور ہے لیکن اُس کی رواداری ماسوائے بت سے بیزار نہیں۔ اُس کی شاعری میں وہ بت، وہی پرانی ہوس پرستی کا بت مفقود ہے۔ مگر بت کا وہ ٹھاٹھ، وہ سازوسامان، وہی پرانی دلچسپی اور دلفریبی کے لوازمات موجود ہیں۔ حسن کی وہی شوخیاں ہیں، عشق کی

---

[1] لفظ "نمو" سے امکان ظاہر ہوتا ہے کہ عبارت علامہ کے مشورے سے لکھی گئی کیونکہ انہوں نے ۱۹ر فروری ۱۹۲۴ء کو چودھری محمد حسین سے کہا تھا کہ evolution کے لیے یہ لفظ بہتر ہے (دیکھیے اُس روز کے واقعات)۔

[2] مشفق خواجہ محولہ بالا، ص ۲۹۴

وہی گرمیاں ہیں۔ اقبال قدما کی رنگین بیانی کا شیدائی ہے اور اُن کی طرح گل و گلزار، رنگ و بو، ساقی و مینا، رقص و سرود، عشوہ و ناز کا فدائی۔ اُس کے کلام میں حالی اور اکبر کی سادگی نہیں۔ اُس کا اندازِ بیان قدیم حسن و عشق کی زبان میں ہے۔ اور اُس کے لیے یہی اندازِ بیان ضروری بھی تھا۔ ابولہوس قوم سو سال سے ہوس بازی میں مشغول اور کئی سو سال سے عیش پرستی اور غفلت و سکون کی زندگی کی مفتون ہو رہی تھی۔ مذاق بگڑے ہوئے تھے۔ قوم کے مایہ ناز چشمِ فتاں کے مجروح، خمِ ابرو کے شہید، بیکار نادار، مے پندار سے سرشار، غفلت کی شراب سے مخمور، دنیا و مافیہا سے بیخبر اور زمانہ کی چال سے ناآشنا بے اعتنائی کے سرور میں پڑے تھے۔ اور اُن کے حالات میں شنوائی اور کام کی بات کی شنوائی مشکل نظر آتی تھی۔ فلسفی دماغ نے سامعین کے مذاق کو ملحوظ رکھنے میں حکمِ تاثیر دیکھا۔ قوم کو اس خوابِ غفلت سے جگانا ضروری تھا۔ اُن کی اِن سرمستیوں سے اُنہیں ہوش میں لانا لازمی تھا۔ تقاضائے وقت سے وہی پرانی مجلسیں گرمادیں۔ وہی راگ، وہی رنگ، وہی ساقی، وہی مینا، وہی شکوے اور وہی شکایتیں ہونے لگیں۔ سونے والے جو پہلے ہی سے حالی کے نالوں اور اکبر کی چٹکیوں سے کچھ کچھ جاگ رہے تھے، اپنے پرانے مذاق کے موافق حسن و عشق کی سُریں سن کر اُٹھ بیٹھے ہیں۔ اور شاعر یقین کرتا ہے کہ یہ لوگ زبان کی چاشنی سے لذت پاکر نئے مذاق کی حقیقت سے آپ ہی آشنا ہو جائیں گے۔ میدانِ سعی میں نکل آئیں گے۔ اسلام کی روایات کو سامنے رکھ کر خلوص سے راستہ پر قدم بڑھائیں گے اور نورِ توحید جہان میں پھیلا کر کفر و استبداد کی ظلمت کا پردہ اُٹھا دیں گے اور محبت و اخوت کے نقش پہنائے عالم میں جما دیں گے۔ اقبال اعلیٰ قومی جذبات بیان کر رہا ہوتا ہے اور وہی ہوس بازی کی اصطلاحیں، وہی حسن و عشق کی زبان، وہی استعارے، وہی تشبیہیں، وہی رنگ، وہی راگ، وہی سُریں استعمال کرتا ہے۔

مسلمانوں کی بے بضاعتی کے تذکرے ہیں۔ اُن کی ناداری کی شکایتیں ہیں۔ اُن کی خواری، اُن کی رسوائی پر اَشک فشانیاں ہیں اور یہ سب کچھ کس ادا سے، کس انداز سے — عشق کی شیوہ بیانیوں کے لہجہ میں، حسن کے راز و نیاز کے پردہ میں — بیان ہو رہا ہے۔

شب کی آہیں بھی گئیں صبح کے نالے بھی گئے تیری محفل بھی گئی چاہنے والے بھی گئے

دل تجھے دے بھی گئے اپنا صلہ لے بھی گئے   آ کے بیٹھے بھی نہ تھے اور نکالے بھی گئے

آئے عشاق گئے وعدۂ فردا لے کر

اب اُنہیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر[1]

51

چودھری محمد حسین نے اس برس علامہ کے مشورے کے مطابق حکومت کی پریس برانچ میں ملازمت کر لی۔ پنجاب بھر کے اخبارات اور رسائل کا مطالعہ کرنے کی ذمہ داری ملی۔ یہ مواد پریس برانچ میں آتا تھا۔ محمد حسین خاص طور پر ہندو اخبارات کا بغور مطالعہ کرتے۔ جاوید نے بڑے ہو کر لکھا:

> ایک سو ساٹھ روپے ماہوار پر ملازم ہوئے۔ تب ڈاڑھی کچھ ترشوالی۔ دفتر میں آپ کی میز سے پرے کھونٹی پر ایک نکٹائی لٹکی رہتی تھی۔ جب افسروں کو ملنے جاتے تو شلوار قمیص، ہاف کوٹ اور رومی ٹوپی کے ساتھ اس نکٹائی کا اضافہ ہو جاتا۔ واپسی پر نکٹائی اُتار کر پھر کھونٹی پر لٹکا دی جاتی۔ آپ کی سر تا پا مشرقی شخصیت میں صرف یہ نکٹائی ہی مغرب کی موجودگی کے احساس کی دلیل تھی۔[2]

علامہ کے پاس روزانہ حاضر ہونے کا معمول جاری رہا۔ شام چار بجے کے قریب آتے تھے۔ ”آتے ہی بغیر کسی تمہید کے بیان کر دیتے تھے جو اخبارات نے لکھا ہوتا تھا،“ عبداللہ چغتائی کا بیان ہے، ”اس طرح [علامہ] مسلمانوں کے خلاف ہندو ذہنیت سے آگاہ رہتے تھے اور مناسب تدابیر پر غور و فکر فرماتے تھے۔“ بعض اوقات صرف شام کے کھانے کے لیے گھر والوں کے پاس جاتے۔ گھر قلعہ گجر سنگھ میں تھا۔ کھانے کے بعد واپس آ جاتے۔ آدھی رات تک ٹھہرتے۔ کسی روز ناغہ ہو جائے تو علامہ علی بخش کو اُن کے گھر بھیج کر خیریت معلوم کرواتے۔[3]

---

[1] مشفق خواجہ محولہ بالا، ص ۲۱۸-۲۱۶

[2] ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۳) مئے لالہ فام، ص ۳۱۵

[3] عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۵۲۲-۵۲۰

ملازمت کے بعد محمد حسین کو معلوم ہوا کہ علامہ کی شاعری کے بارے میں ابتدا ہی سے حکومت کی خفیہ رپورٹیں مرتب کی گئی تھیں۔ 'تصویرِ درد' اور 'شمع و شاعر' کے انگریزی ترجمے معائنے کی غرض سے پریس برانچ اور خفیہ پولیس پنجاب کی ہدایات کے تحت ہوئے تھے۔ "تھوڑے ہی عرصے بعد صوبے کی انگریزی حکومت نے ڈیوٹی سونپی کہ اقبال یا ان کے ملاقاتیوں کے ساتھ گفتگو کی خفیہ رپورٹ حکومت تک پہنچاتے رہیں،" جاوید نے بعد میں محمد حسین سے سُن کر لکھا، "چودھری صاحب [محمد حسین] نے نوکری چھوڑ دینے کا ارادہ کر لیا۔ علامہ کے استفسار پر ساری حقیقت بیان کر دی۔ علامہ نے ملازمت جاری رکھنے اور ڈیوٹی پوری کرنے پر مجبور کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خفیہ رپورٹ وہ اور علامہ دونوں ہی اکٹھے بیٹھ کر مرتب کیا کرتے۔"[1]

علامہ کی آئینۂ عجم کے کم سے کم تین ترجمے بازار میں آ چکے تھے۔ ایک کے مترجم کا نام معلوم نہیں ہے۔ دوسرا عبدالغفور ہیڈ اورینٹل ٹیچر خالصہ ہائی سکول لاہور نے کیا اور کپور پرنٹنگ ورکس نے شائع کیا۔ تیسرا لالہ گوبند رام و تلوار بھان نے مرکنٹائل پریس لاہور سے شائع کروایا۔[2]

اس برس لندن میں عبدالعزیز فلک پیما سے اُن کے استاد سر ٹامس آرنلڈ اور سر ڈینی سن راس نے اقبال کی شاعری پر لیکچر دلوایا۔ مشرقی علوم کے مدرسے (School of Oriental Studies) میں ہوا۔ اس سے پہلے ڈاکٹر نکلسن ان سے کیمبرج میں لیکچر دلوا چکے تھے۔[3]

52

منشی رام پرشاد بی اے، گورنمنٹ ہائی سکول گونڈہ میں ہیڈ ماسٹر تھے۔ اپنی کتاب علامہ سے رائے طلب کرنے کے لیے بھجوائی: ہندو تیوہاروں کی اصلیت اور ان کی جغرافیائی کیفیت۔ ۲۸/ جون کو

---

[1] ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۴)، زندہ رود، ص ۳۶۲-۳۶۱؛ انہیں محمد حسین نے خود بتایا۔

[2] ڈاکٹر حسن اختر ملک، اقبال، ایک تحقیقی مطالعہ، ص ۱۶۶۔ ان کا ماخذ ضمیمہ پنجاب گزٹ ۷ مئی ۱۹۲۶ء ہے۔ دونوں تراجم ناپید ہیں۔

[3] رسالہ ہمایوں اقبال نمبر

علامہ نے رائے دی، "آپ کی کتاب دلچسپ ہے اور بہت لوگوں کی معلومات میں اضافہ کرے گی۔"[1]

۲۹ر جون کو لاہور ہائی کورٹ نے کسی لکھو رام اور بعض دوسروں کی اپیل مسترد کر دی۔ ڈی ایچ بھلّہ پیروی کر رہے تھے۔ ولی نام کے ایک شخص کے خلاف تھی۔ علامہ اُس کا دفاع کر رہے تھے۔ سماعت جسٹس ہیری سن اور جسٹس دلیپ سنگھ نے کی تھی۔[2]

53

مؤتمر العالم الاسلامی (World Muslim Congress) مکہ میں منعقد ہوئی۔ جون میں حج سے پہلے آغاز ہوا۔ حج کے بعد جولائی میں کاروائی مکمل ہوئی۔ علامہ نے اُمید ظاہر کی تھی کہ ابن سعود فیصلے کا احترام کریں گے۔[3] وہ پرانی بات تھی۔ اب بادشاہ تسلیم کیے جا چکے تھے۔[4]

مؤتمر کی نگرانی ابن سعود کے مصری مشیر حافظ وہبہ کے سپرد تھی۔ مکہ کا نیم سرکاری اخبار اُم القریٰ رپورٹنگ کر رہا تھا۔ مصری صحافیوں میں المنار کے مدیر رشید رضا سب سے نمایاں تھے۔ وہ اور شیخ محمد ماضی ابوالعظائم مصر میں ابن سعود کی حمایت کرتے تھے۔ شیخ ماضی کو مصر کے سرکاری وفد کے مطالبے پر مؤتمر سے نکلنا پڑا۔ اُس کی قیادت شیخ محمد الاحمد الظواہری کر رہے تھے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے مرکزی خلافت کمیٹی کے وفد کی قیادت سید سلیمان ندوی کر رہے تھے۔ مولانا محمد علی [جوہرؔ]، مولانا شوکت علی اور شعیب قریشی بھی شامل تھے۔ جمعیت العلمأ کے وفد کی قیادت مفتی کفایت اللہ کر رہے تھے۔ علمائے اہلِ الحدیث کے وفد کے قائد مولوی ثنأاللہ تھے۔ جاوا کے وفد کی قیادت عمر سعید جوکرومنوٹو (Oemar Said Tjokroaminoto) کر رہے تھے۔ شام اور فلسطین کے وفود میں مفتی امین الحسینی نمایاں تھے۔ فلسطین ہی سے لبنانی دانشور عجاج نویھض آئے تھے۔ درزی (Druze) مذہب سے تھے۔ یمن، مصر، ترکی اور افغانستان کے نمایندے بھی آئے۔ سوویت

---

[1] مکتوب بنام منشی رام پرشاد ۲۸ر جون ۱۹۲۶ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۴۴

[2] ظفر علی راجا ایڈووکیٹ (۲۰۱۳) قانون دان اقبال، ص ۱۲۴–۱۲۵

[3] دیکھیے اکتوبر ۱۹۲۴ء کے واقعات

[4] حجاز پر ابنِ سعود کی بادشاہت کا اعلان ۸ر جنوری ۱۹۲۶ء کو ہوا۔

رُوس نے بھی مسلمان بھیجے۔ نجد، عصیر اور حجاز کے وفود مقامی حکومت کے اثر میں تھے۔ اُن میں بدّو شیوخ شامل تھے۔ دو سوڈانی بھی لائے گئے۔ انہوں نے بتایا کہ حج کرنے آئے ہیں۔ کسی نے بھیجا نہیں ہے۔ ہندوستانی نوابزادے اقبال علی شاہ آبزرور کے طور پر شریک ہوئے۔ نسلاً افغان تھے۔ درپردہ انگریزوں کے لیے سوویت مسلمانوں کی جاسوسی کر رہے تھے۔[1] عراق کے حکمراں فیصل کے خاندان سے حجاز کی بادشاہت چھینی گئی تھی۔ وہ نہ آئے۔ ایران نے وفد بھیجنے کی بجائے مطالبہ کیا کہ مقاماتِ مقدسہ دنیا کے مسلمانوں کی اجتماعی تحویل میں ہوں۔

ابنِ سعود صرف مؤتمر کے افتتاحی اجلاس میں آئے۔ اِکیس توپوں کی سلامی وصول کی۔ پھر کہا کہ مؤتمر کا مقصد صرف مقاماتِ مقدسہ کی خوشحالی اور صفائی، انہیں اسلامی تعلیم و تمدن کے مراکز بنانا اور یہاں اسلام کو فروغ دینا ہے۔ بین الاقوامی سیاست اور حکومتوں کے داخلی معاملات پر گفتگو سے گریز کیا جائے۔

ہندوستانی وفد نے کہا کہ یہ طے ہونا چاہیے کہ کون مؤتمر میں ووٹ ڈالنے کا حق رکھتا ہے۔ رشید رضا نے تجویز کیا کہ جنہیں ابن سعود نے دعوت دی وہ سب مؤتمر کے رکن ہیں۔ تجویز مسترد ہوئی۔ رکنیت کے تین اصول قرار پائے: کسی مسلم ریاست، کسی خطے کے مسلمانوں یا پھر مؤتمر کی کسی شاخ کی نمایندگی۔ ہر مسلم ریاست کا ایک ووٹ؛ آزاد ریاستوں اور رُوس کے دو دو ووٹ؛ حجاز اور چین کے تین تین ووٹ؛ جاوا اور سماٹرا کے ملا کر تین ووٹ؛ اور ہندوستانی مسلمانوں کے چار ووٹ مانے گئے۔ کسی نے اعتراض کیا۔ مولانا شوکت علی نے جواب دیا، ''ہم دنیا کے تیس کروڑ مسلمانوں میں سے سات کروڑ ہیں۔ چاہتے تو پوری مؤتمر کے چوتھائی ووٹوں کا مطالبہ کر سکتے تھے۔''

چھیاسٹھ شرکا تھے۔ عام اجلاس میں پچاس بھی نہیں آتے تھے۔ کمیٹیوں میں غیر حاضری بڑھ جاتی۔ رشید رضا کے بارے میں مشہور تھا کہ ابن سعود سے پیسے لے کر حمایت کرتے ہیں۔ جوہرؔ نے اُن سے مزاحاً کہا، ''آپ خاموش رہیں تو میں آپ کو پیسے دوں گا۔''

---

[1] یہ صوفی مصنف ادریس شاہ کے والد تھے۔

جوہرؔ اور رضا نے تجویز کیا کہ کعبے میں حلف اُٹھایا جائے کہ جزیرۃ العرب کو غیروں کے تسلط سے آزاد رکھنے کے لیے ہر ممکن کوشش کریں گے۔ یہ آنحضورؐ کا حکم تھا۔ ابنِ سعود کی طرف سے وہبہ نے جزیرۃ العرب کی حدود پوچھیں۔ جوہرؔ اور رضا نے وہی جواب دہرایا جو مسلمانوں کو ہمیشہ سے یاد تھا۔ جزیرہ نمائے عرب کے علاوہ عراق، شام، فلسطین، عقبہ اور معان بھی "جزیرۃ العرب" میں شامل ہیں۔ اب اُن علاقوں میں فرانس اور برطانیہ کا اثر رسوخ تھا۔ وہبہ نے کہا کہ حلف اُٹھانے سے اُن طاقتوں کے ساتھ تعلقات بگڑنے کا خطرہ ہے۔ ترکی، افغانستان، مصر اور یمن کے وفود نے بھی یہی کہا۔

جوہرؔ نے قرارداد پیش کی کہ مسلمان، مسلمانوں کا خون مت بہائیں۔ مقامی حکومت نے اِسے اپنے خلاف سمجھا۔ حجاز پر قبضہ کرتے ہوئے اُس کے سپاہی مسلمانوں کے ساتھ زیادتیاں کر بیٹھے تھے۔ دوسری مسلم حکومتوں نے فرانس سے تعلقات کا لحاظ کیا۔ فرانسیسی افواج مغربی افریقہ کے مسلمان سپاہیوں کی مدد سے شام کے مسلمانوں کی آزادی کچل رہی تھیں۔

رضا نے کہا کہ ایک معاہدہ کیا جائے۔ مسلم ریاستوں کے درمیان تنازعے موتمر کے ذریعے حل ہوا کریں گے۔ اس طرح ایک جمعیتِ اقوامِ اسلام قائم ہو سکتی تھی۔ مصری وفد نے کہا کہ غیر مسلم طاقتیں اسے سیاسی معاہدہ سمجھیں گی۔ مصری حکومت ساتھ نہیں دے سکتی۔

جوہرؔ یہ دیکھ کر سخت افسردہ ہوئے کہ آنحضورؐ کے عہدِ مبارک کی نشانیاں ختم کی جا رہی ہیں۔ مدینہ کی جنّت البقیع میں اہلِ بیت اور صحابہ کرامؓ کی قبروں کے نشان مٹا دیئے گئے تھے۔ صحابہؓ کی بنائی ہوئی مسجدیں شہید کی گئی تھیں۔ مکّہ میں بی بی خدیجہؓ کا گھر تھا۔ ہجرت سے پہلے آنحضورؐ کی اقامت گاہ تھا۔ وہیں آپؐ نے دین کی دعوت کا آغاز کیا۔ اُسے بیت الخلا بنا دیا گیا تھا۔ جس مکان میں آنحضورؐ پیدا ہوئے اُسے شہید کر دیا گیا تھا۔ جوہرؔ اپنی بیگم اور بہن کے ساتھ کھنڈر دیکھنے گئے۔ وہاں ایک آدمی خواتین کے سامنے ہی پاجامہ کھول کر رفعِ حاجت کے لیے بیٹھ گیا۔[1] شیخ الظواہری نے مسجد الحرام میں دیکھا کہ مقامی لوگ ایک مصری پر غصہ نکال رہے ہیں۔ دُعا میں "یا رسول اللہ" کہہ بیٹھا تھا۔

1

الظواہری بچ گئے کہ "یارسول اللہ" دل میں کہا تھا۔

خلافت کمیٹی کے وفد نے قرارداد پیش کی کہ حج کی رسومات کی ادائیگی کے دوران مقامی حکام کی طرف سے مداخلت نہ ہو۔ رُوسی مسلمانوں، مصر، یمن اور افغانستان کے وفود نے ساتھ دیا۔ ابنِ سعود کے نمایندوں نے "بدعت، بدعت" کے کہرام میں قرارداد کے خلاف ہاتھ اُٹھوا لیے۔ جوہرؔ نے خفیہ ووٹ کا مطالبہ کیا۔ افغانستان کے سرکاری نمایندے نے کہا کہ مسلمان ایسے حجاز کی طرفداری نہیں کریں گے جہاں مذہبی آزادی نہ ہو۔ معاملہ علمائے کرام کی کمیٹی کے سپرد کرنے کا فیصلہ ہوا۔

ابن سعود نے مغربی سرمایہ داروں سے معاہدے کیے تھے کہ مملکت میں تیل کے کنوئیں دریافت کریں۔ ابھی تک اُمید کی کرن دکھائی نہ دی تھی۔ حج ہی آمدنی کا سب سے اہم ذریعہ تھا۔ چاہتے تھے کہ مقدس مقامات کی دیکھ بھال اور صفائی کے لیے مسلمان مالی امداد فراہم کرنے پر راضی ہو جائیں۔ حاجیوں سے ٹیکس وصول کرنے کا اختیار بھی دیں۔ حساب کتاب کا مطالبہ نہ کریں۔ خلافت کمیٹی کے وفد نے کہا کہ حج کی مد میں وصول ہونے والی رقومات کا حساب مسلمانوں کے سامنے پیش ہوا کرے۔ مصری نمایندوں نے تجویز پیش کی کہ حجاز ریلوے کی تعمیر کے لیے مسلمانوں کی ایک تجارتی کمپنی قائم کی جائے۔ قاعدے کے مطابق نفع نقصان کے لیے حصہ داروں کے سامنے جواب دہ ہو۔

ابنِ سعود کی حکومت کے لیے یہ تجاویز قابلِ قبول نہ تھیں۔ کسی نہ کسی طرح قرارداد منظور کروائی کہ حاجیوں سے ٹیکس وصول کرنے کا اختیار ہے۔ رضا نے قراداد پیش کی کہ معان اور عقبہ کے علاقے بھی حجاز میں شامل کیے جائیں۔ یہ بھی منظور ہوئی۔ موٴتمر برخاست کر دی گئی۔ وعدہ ہوا کہ اگلے برس بھی بلوائی جائے گی۔ وہ صرف وعدہ ہی رہا۔

"چین و عرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا"۔ کبھی جوہرؔ نے علامہ اقبال کی اِس نظم کے گراموفون ریکارڈ بنوائے تھے۔ موٴتمر کے بعد کہا، "عرب انگریزوں کا ہے یا فرانسیسیوں کا یا نجدیوں کا اور یمینیوں کا، لیکن... ہمارا نہیں ہے۔"[1]

---

[1] موٴتمر کی روئیداد و تاثرات کے ماخذ ہیں: شاہجہانپوری (۱۹۹۳) علامہ اقبال اور مولانا محمد علی، ص۱۱۹-۱۱۸؛ Martin Kramer, *Islam Assembled,* pp.106-122, 186-191, 214-217; Imran N.

54

لاہور میں ایک بحث چل نکلی تھی کہ ۱۹۲۰ء میں انجمن حمایت اسلام نے کس وجہ سے عدم تعاون کی تحریک کا ساتھ نہیں دیا تھا۔ کسی نے کہا کہ وہ تحریک، علامہ کے مطابق اسلام کے خلاف تھی۔ زمیندار نے تردید کرتے ہوئے علامہ کے اُس طویل خط کی طرف توجہ دلائی جو ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا تھا۔ ۹/ جولائی کے شمارے میں لکھا، ”اگر ہندوستان کے مسلمانوں کا بہت بڑا حصّہ ۱۹۲۰ء میں ایک ہنگامہ خیز قومی تحریک شروع نہ کرتا تو نہ ترکی کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کی مہلت دی جاتی، نہ حجاز کی [غیر شرعی] حکومت کو مردود قرار دیا جاتا، نہ اُس خطۂ مبارکہ کی تطہیر کے سامان ہوتے اور نہ دوسری اسلامی حکومتوں کی آزادی و استقلال میں مداخلت سے احتراز کیا جاتا۔“[1]

میاں عبدالعزیز نے علامہ کے حق میں دستبردار ہونے کا فیصلہ کیا۔ علامہ کو آگاہ کیا۔ ۱۳/ جولائی کو زمیندار کے نام خط لکھا۔ ۱۵/ جولائی کے شمارے میں شائع ہو گیا:

۱ کونسل کی رکنیت کوئی جدّی وراثت نہیں کہ ہر دفعہ ایک ہی شخص اس کو اپنے قابو میں رکھے بلکہ مختلف صاحبان کو موقعہ ملنا چاہیئے۔

۲ ڈاکٹر صاحب نہ صرف میرے مہربان اور دوست ہیں بلکہ مسلّمہ طور پر صاحبِ لیاقت و قابلیت ہیں۔

۳ ڈاکٹر صاحب موصوف اور میرے مابین اس رکنیّت کے لیے مقابلہ ہونا نہایت نامناسب ہے۔

۴ سب سے اہم وجہ یہ ہے کہ ہم دونوں کا ایک دوسرے کے مقابلے میں کھڑے ہونا لاہور کے ہزاروں مسلمان صاحبان میں کشمکش، رنجش اور تفریق ڈالنے کا باعث ہو گا۔ کیونکہ ابھی تک ہم میں وہ خیالات پیدا نہیں ہوئے کہ انتخاب میں مقابلہ صرف عارضی شے ہوتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ ہمیشہ کے لیے

Hosein, *The Caliphate, the Hejaz and the Saudi-Wahhabi Nation-State,* pp.54-67

[1] اختر النسا (۲۰۱۰) اقبال اور زمیندار، ص ۲۱۷

فرقہ بندی یا عداوت و دشمنی پیدا کر لی جائے۔

آخر میں صرف یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ خدا کرے کہ مسلمان قومیّت، فرقہ بندی اور دیہاتی اور قصباتی کے سوالات کو نظرانداز کر کے آیندہ بہترین تعلیم یافتہ نمائندے جو ملک اور قوم کے حقوق کی حفاظت کرنے کے قابل ہوں، بھیجیں۔[1]

55

حکومتِ فرانس نے پیرس میں خوبصورت مسجد تعمیر کی۔ جنگِ عظیم میں قریباً ایک لاکھ مسلمان سپاہی فرانس کی طرف سے لڑتے ہوئے مارے گئے تھے۔ حکومت کی طرف سے اُن کا شکریہ تھی۔ جنگ کے بعد بھی شام کے مسلمانوں کی تحریکِ آزادی کچلنے کے لیے فرانس کی استعماری سلطنت شام کے مسلمانوں کی تحریکِ آزادی کچلنے میں مسلسل سرگرم رہی تھی۔ اُس میں بھی مغربی افریقہ کے مسلمان سپاہی فرانس کے کام آرہے تھے۔ علامہ اقبال کی نظر میں یہ مسجد ایک باطل حرم تھی۔ فرنگیوں نے اس میں بتخانے کی رُوح چھُپا دی تھی۔[2]

۱۵ر جولائی کو مسجد کا افتتاح ہوا۔ الجیریا کے صوفی شیخ احمد العلوی نے صدرِ فرانس کی موجودگی میں باجماعت نماز پڑھائی۔

56

اعلان عام

[علامہ اقبال کی طرف سے شائع ہوا]

میرے تمام احباب اور اکثر معززین و باشندگان شہر کو ایک مدت سے معلوم ہے کہ میں پنجاب کونسل کے آیندہ انتخابات میں حلقہ لاہور کی طرف سے بطور امیدوار کھڑے ہونے کا ارادہ کر رہا ہوں لیکن میں اب تک اس کے متعلق باقاعدہ اعلان کرنے سے محترز رہا اس لیے کہ میرے عزیز دوست میاں

---

[1] زمیندار، ۱۵ر جولائی ۱۹۲۶ء

[2] دیکھیے ضربِ کلیم کی نظم 'پیرس کی مسجد'

عبدالعزیز صاحب بیرسٹر ایٹ لا موجودہ کونسل میں اس حلقے کی طرف سے نمایندگی فرما رہے ہیں اور میں نہیں چاہتا تھا کہ میرا ارادہ امیدواری میرے کسی دوست کے ارادے سے متصادم ہو اور مسلمانوں پر تفریق و کش مکش کا دروازہ کھلے۔ میں میاں عبدالعزیز صاحب کا بے حد ممنون ہوں کہ وہ حلقہ لاہور کی طرف سے امیدوار بننے کا ارادہ میرے حق میں ترک فرما چکے ہیں اور اس کی نسبت زمیندار میں ان کا اعلان بھی شائع ہو گیا ہے۔ لہٰذا اُنہوں نے وعدہ فرمایا ہے کہ مجھے کامیاب بنانے کی پوری کوشش فرمائیں گے۔

اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنی امیدواری کا باقاعدہ اعلان کر دوں۔ مسلمانوں کو معلوم ہے کہ میں اب تک اس قسم کے مشاغل سے بالکل علیحدہ رہا۔ محض اس لیے کہ دوسرے لوگ یہ کام انجام دے رہے تھے اور میں نے اپنے لیے دوسرا دائرہ کار منتخب کر لیا تھا۔ لیکن اب قوم کی مصیبتیں مجبور کر رہی ہیں کہ میں اپنا حلقۂ عمل قدرے وسیع کروں۔ شاید میرا ناچیز وجود اس طرح اس ملت کے لیے زیادہ مفید ہو سکے جس کی خدمت میں میری زندگی کے تمام لیل و نہار گذرے ہیں۔ میرے خیالات و جذبات ہر مسلمان پر روز روشن کی طرح آشکارا ہیں اور مجھے کامل امید ہے کہ وہ کونسل میں اپنے حقوق کی حفاظت اور اپنے خیالات کی ترجمانی کے لیے میری ذات پر اعتماد کرنے میں ایک لحظہ کے لیے بھی متامل نہ ہوں گے۔ میں اپنے طول و طویل دعاوی کو شائستہ توجہ نہیں سمجھتا۔ عمل دلی جذبات کے ملفوظ اظہارات کا بہترین معیار ہے۔ خدا کرے کہ میں اس معیار پر پورا اتر سکوں۔

آخر میں میں پھر اپنے عزیز دوست میاں عبدالعزیز صاحب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ نیز ان اصحاب کا بھی دل سے شکر گزار ہوں جنہوں نے میاں عبدالعزیز صاحب کے اعلانِ دست برداری کے بعد بذریعہ زمیندار مجھ پر کامل اعتماد کا اظہار فرمایا۔ اللہ تعالیٰ مجھے ان کے اس اعتماد کو حق بجانب کرنے کی توفیق دے۔ آمین۔

زمیندار، ۲۰ / جولائی ۱۹۲۶ء[1]

[1] محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۱۶-۱۴

57

فلسفۂ اسلام پر علامہ سر اقبال کے خطبات
مسلم ایسوسی ایشن، مدراس کی سعی مشکور

مسلم ایسوسی ایشن، مدراس، ایک مدت سے علامہ اقبال مد ظلہ العالیٰ کو "فلسفۂ اسلام" پر ایک سلسلۂ خطبات تیار کرنے کے لیے آمادہ کر رہی تھی۔ آج ہم مسلمانوں تک یہ بشارتِ عظمیٰ پہنچانے کے قابل ہوئے ہیں کہ علامۂ ممدوح مذکورہ بالا ایسوسی ایشن کی سرپرستی میں فلسفۂ اسلام پر چھ خطبے (لیکچر) دینے کے لیے آمادہ ہو گئے ہیں۔ خطبات کی تفصیل یہ ہے:

۱ ختمِ نبوت؛ نفسیاتِ جدیدہ کی روشنی میں

۲ روحِ قرآن (دی سپرٹ آف قرآن)

۳ ذاتِ باری تعالیٰ کا اسلامی تخیل

۴ علومِ جدید اور مسئلۂ تکوین

۵ حقیقتِ خودی اور حیات مابعد الموت

۶ اسلامی تصوف

یہ خطبات نومبر ۱۹۲۷ء میں مدراس میں دیے جائیں گے۔ ان کی تیاری کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے۔ اندازہ یہ ہے کہ ہر خطبہ فل سکیپ سائز کے تقریباً تیس ٹائپ شدہ صفحات پر مشتمل ہو گا، گویا اس طرح تخمیناً دو سو صفحے کی کتاب تیار ہو جائے گی۔ علامہ ممدوح خطبات انگریزی میں لکھیں گے لیکن ساتھ ساتھ ان کا اُردو ترجمہ بھی تیار ہو جائے گا۔ مسلم ایسوسی ایشن مدراس تمام مسلمانوں کی طرف سے مبارکباد کی مستحق ہے کہ اُس کی سعی و کوشش کی بدولت علامہ اقبال ایسی جامعِ علومِ مشرق و مغرب شخصیت کے قلم سے فلسفۂ اسلام پر ایک عدیم النظیر کتاب کی ترتیب کا انتظام ہو گیا ہے۔

زمیندار، ۲۴ر جولائی ۱۹۲۶ء[1]

---

[1] اختر النسا (۲۰۱۰)، ص ۱۰۴

''سب سے پہلے آپ نے اسلام کی فلسفیانہ روایات کی تشکیلِ نو پر اپنی تحقیقات شروع کر دیں،'' چغتائی سے روایت ہے۔ ''میں اُن دنوں آپ کے یہاں صبح شام جاتا تھا اور ضروری ماخذ کے حصول اور بعض علما سے علامہ کی بالمشافہ مشاورت کا انتظام کرتا تھا... لیکچروں کی تیاری کے سلسلے میں علامہ اکثر علمائے دین سے مشورہ کرتے تھے۔ مولانا سید طلحہ مرحوم نے مشورہ دیا تھا کہ امام شاطبی کی کتاب الموافقات کا مطالعہ قیاس کے ضمن میں کیا جائے۔''

چغتائی کہتے ہیں کہ وہ مولانا اصغر علی روحی کو علامہ کی کوٹھی پر لے گئے۔ علامہ مشورہ کرنا چاہتے تھے۔ کوٹھی کے درمیانی حصے میں بیٹھے تھے۔ حقے کی نَے ہاتھ میں تھی۔ مولانا نے حقے کا رُخ اپنی طرف کیا۔ بجھا ہوا تھا۔ علامہ نے کہا، ''میں تو حقے سے محض باتیں کر رہا تھا۔'' علی بخش کو حقہ تازہ کر کے لانے کے لیے کہا۔ گفتگو شروع ہوئی۔ ''بعض حوالوں کے سلسلے میں مولانا نے کہا کہ وہ لوگ بکتے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ مترادفات سے ایک ہی طرح کے معنی مقصود ہیں،'' چغتائی کا بیان ہے۔ ''نہیں، ہر لفظ الگ الگ خاص معنی اور مفہوم رکھتا ہے۔''[1]

58

سردار بیگم سیالکوٹ میں تھیں۔ علامہ کا خط آیا تو اُن کے لیے ایک پہیلی درج تھی اور لکھا تھا کہ وہ نہ بوجھ سکیں تو سب کو مٹھائی کھلائیں:

وہ ایسی پارسا ہے ہر قدم سجدے میں رہتی ہے ۔۔۔ زباں خاموش رکھتی ہے مگر ہر بات کہتی ہے

سردار بیگم نہ بوجھ سکیں۔ سب نے مٹھائی کھائی۔ صحیح جواب قلم تھا۔[2]

جاوید کا نام گھر میں ''ببا'' پڑ گیا تھا۔ سردار بیگم کے ساتھ سیالکوٹ سے ریل پر لاہور آنے والے تھے۔ گاڑی کا وقت گیارہ بجے تھا۔ علی بخش نے ڈرائیور کے ساتھ ریلوے اسٹیشن جانا تھا۔ عبداللہ چغتائی صبح کے وقت پہنچے تو علامہ اپنے چھوٹے کمرے میں تھے۔ کچھ دیر بعد منشی طاہر الدین بھی آ

---

[1] عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۴۴

[2] خالد نظیر صوفی، اقبال درونِ خانہ، ص ۳۷

گئے۔ علامہ بے چین تھے۔ بار بار وقت پوچھتے۔ ڈرائیور دس بجے کے قریب آکر علی بخش کو ریلوے اسٹیشن لے گیا۔ گاڑی لیٹ تھی۔ ڈرائیور اور علی بخش واپس آئے۔ ساڑھے گیارہ بجے دوبارہ گئے۔ واپس آئے اور کہا کہ سیالکوٹ سے گاڑی آ گئی مگر ببا اور اُس کی والدہ نہیں آئے۔ ''یہ سنتے ہی علامہ کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا اور وہ بے چین ہو گئے،'' چغتائی کا بیان ہے۔ ''اُسی وقت پوسٹ مین نے آکر خطوط دیے۔ اُن میں حسنِ اتفاق سے ایک خط سیالکوٹ کا بھی تھا جس میں سیالکوٹ کے اعزہ نے علامہ کو لکھا تھا کہ ببا اور اُن کی والدہ کسی ضروری کام سے رُک گئے ہیں اور آج نہیں آ رہے، اب وہ کل آئیں گے۔'' علامہ کے چہرے کا سکون لوٹ آیا۔[1]

59

۲/ اگست کے زمیندار میں اپیل چھپی۔ علامہ کے خلاف انتخاب لڑنے والے دستبردار ہو جائیں۔ پانچ ''مقتدر اصحاب'' کی طرف سے تھی — منشی نور الٰہی کوچہ چابک سواراں، شیخ قمر الدین بزاز ہٹہ، شیخ محمد یعقوب کیپ مرچنٹ ڈبی بازار، نواب مظفر گوہر شاہ عالمی دروازہ، اظہر حسین بی اے موچی دروازہ۔[2]

علامہ، میاں عبدالعزیز سے ملنا چاہتے تھے۔ ۲/ اگست کی رات معلوم ہوا کہ کشمیر چلے گئے ہیں۔ اگلے روز علامہ نے خط میں تاکید کی کہ مہر اللہ دتا، میاں عمر دین، شیخ عطأاللہ اور دوسروں کو لکھیں۔ ''غالب امکان ہے کہ کوئی ہماری مخالفت کے لیے کھڑا نہیں ہو گا،'' علامہ نے لکھا، ''مگر ہمیں اپنی سی احتیاط لازم ہے۔''[3]

يَسْـَٔلُهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِىْ شَاْنٍ (۲۹) فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۳۰) سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ (۳۱) فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ (۳۲) يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ۭ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ (۳۳)

اُسی سے مانگتے ہیں جتنے آسمانوں اور زمینوں میں ہیں۔ ہر روز اُس کی نئی شان ہے۔

---

[1] عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص۱۶۸-۱۶۶

[2] زمیندار ۲/ اگست ۱۹۲۶ء میں ''مقتدر اصحاب کا اعلان''؛ شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص۳۲

[3] مکتوب بنام میاں عبدالعزیز ۳/ اگست ۱۹۲۶ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص۶۴۵-۶۴۴

پس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے!

جلد ہم سب کام نمٹا کر تمہارے حساب کا ارادہ کرتے ہیں، اے دونوں بھاری گروہو!

پس تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے!

اے جن و انسان کے گروہو! اگر تم سے ہو سکے کہ آسمانوں اور زمینوں کے کناروں سے نکل جاؤ تو نکل جاؤ۔ نہیں نکل سکتے سوائے سلطان کے ساتھ!

علامہ جاننا چاہتے تھے کہ سورۂ رحمٰن کی ان آیات میں "سلطان" اور "شان" کن معانی میں آئے ہیں۔ ۵/ اگست کو عبداللہ چغتائی کو لکھا کہ راغب اصفہانی کی مفردات ہو تو چند روز کے لیے دیں۔[1]

بانگِ درا کے دوسرے ایڈیشن کا اشتہار مئی میں دیا گیا تھا۔ اس حساب سے ایڈیشن ان دنوں شائع ہونا چاہیے تھا۔ کئی ماہ کے لیے موٴخر ہو گیا۔[2]

مولوی احمد علی شباب کی نظم اصلاح کے لیے موصول ہوئی۔ ۱۳/ اگست کو علامہ نے لکھا، "اس خدمت سے معاف فرمایئے کہ میں بہت عدیم الفرصت ہوں۔ اس کے علاوہ دوستانہ مشورہ یہ ہے کہ آپ اپنے فرصت کے اوقات کے لیے شاعری سے بہتر مصرف تلاش کریں۔ اگر اُردو کی خدمت کا شوق ہے تو اِس وقت نظم سے زیادہ نثر کی ضرورت ہے۔"[3]

کسی اشتہار سے یوں لگا جیسے حیدرآباد دکن میں مولوی عبدالرزاق کی کلیاتِ اقبال کا پہلا ایڈیشن فروخت ہو چکا۔ دوسرے کی تیاری ہے۔ ۱۵/ اگست کو علامہ نے اس کے متعلق سر اکبر حیدری کو لکھا۔[4] انہوں نے ۲۱/ اگست کو عبدالرزاق کو خط لکھا۔ اگلے روز جواب ملا کہ سر [محمد] اِقبال کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ سر اکبر نے اُسی روز وہ خط اپنے نوٹ کے ساتھ علامہ کو بھجوا دیا۔[5]

---

[1] مکتوب بنام عبداللہ چغتائی ۵/ اگست ۱۹۲۶ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۴۵

[2] یہ ایڈیشن جنوری یا فروری ۱۹۲۷ء میں شائع ہوا جبکہ مئی ۱۹۲۶ء میں اشتہار شائع ہو چکا تھا۔

[3] مکتوب بنام مولوی احمد علی شباب ۱۳/ اگست ۱۹۲۶ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۴۸-۶۴۷

[4] اس کا حوالہ مکتوب اکبر حیدری بنام علامہ اقبال ۲۲ اگست ۱۹۲۶ء میں ہے۔ علامہ اقبال میوزیم میں موجود ہے۔

[5] مکتوب سر اکبر حیدری بنام اقبال ۲۲/ اگست ۱۹۲۶ء؛ اقبال میوزیم لاہور

حکیم خواجہ شمس الدین لکھنؤ کے نامور طبیب تھے۔ ادب سے بھی دلچسپی تھی۔ رسالہ عربی طب شائع کیا۔ ۲۲؍ اگست کو علامہ نے لکھا:

> آپ کا رسالہ "عربی طب" نہایت دلچسپ ہے۔ اسلامی دنیا میں آج تک کسی نے اسلامی طب کی تاریخ کی طرف توجہ نہیں کی۔ یورپی زبانوں میں اس مضمون پر متعدد کتابیں موجود ہیں۔ انگریزی میں پروفیسر براؤن مرحوم کے چار لیکچر جو اُنہوں نے عربی طب پر دیے تھے اور جو اُن کی زندگی میں ہی شائع ہو گئے تھے بہت دلچسپ ہیں۔ میرے نزدیک تحقیق طلب بات یہ ہے کہ مسلمانوں نے طب اور دیگر علوم میں کہاں تک تجربہ اور مشاہدہ سے کام لیا۔[1]

میر فرزند حسین جلیل لکھنوی، میر انیس کے نواسے تھے۔ خود بھی مرثیہ کہتے تھے۔ عمر ساٹھ سے تجاوز کر چکی تھی۔ آواز بالکل نوجوانوں کی سی تھی۔ نواب محمد علی خاں قزلباش کی قیام گاہ—نواب پیلس میں مہمان تھے۔ نواب صاحب نے مجلس منعقد کی۔ عبداللہ چغتائی کا بیان ہے کہ علامہ کو دعوت دینے کے لیے نواب صاحب خود آئے۔ یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ لاہور کے اہلِ علم ضرور مجلس میں شرکت کریں۔ بعض احباب کو چھپے ہوئے دعوت نامے ارسال کیے۔ مجلس میں علامہ، پروفیسر محمد دین تاثیر اور بہت سے دوسرے احباب شریک ہوئے۔ "یہ نشست اسی طرح کی تھی جس طرح اہلِ تشیع کے ہاں محرم کی مجالس ہوتی ہیں،" عبداللہ چغتائی کا بیان ہے۔ "میر جلیل تین گھنٹے تک اپنا اور اپنے بزرگوں خاص کر میر انیس کا کلام پڑھتے رہے... تمام حضرات بہت متاثر ہوئے اور خاص کر علامہ اقبال تو کئی دفعہ اشکبار ہوئے۔"

میر جلیل کی ایک اور مجلس محلہ چہل بیبیاں میں نثار حویلی میں ہوئی۔ حویلی علامہ کے پرانے کشمیری دوست منشی سراج الدین کے مکان سے متصل تھی۔ عبداللہ چغتائی کے مطابق اس میں بھی علامہ شریک ہوئے۔ یہ بھی تین گھنٹے رہی۔ "ایسا رنگ جما کہ ایک ایک بند اور ایک ایک شعر پر

---

[1] مکتوب بنام حکیم خواجہ شمس الدین ۲۲؍ اگست ۱۹۲۶ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۴۷-۶۴۵

احسنت اور صلِ علیٰ کے پھول برسائے گئے،" چغتائی کا بیان ہے۔[1]

میاں نظام الدین کے صاحبزادے ایم اسلم کبھی علامہ کے شاگرد رہ چکے تھے۔ علامہ کے مشورے پر شاعری ترک کر کے نثر نگاری کی طرف متوجہ ہوئے تھے۔ بے اولاد تھے۔ انہوں نے اور اُن کی بیگم نے اُن کی بھانجی گود لے رکھی تھی۔ اُس کا نام اصغری تھا۔ ۲۸/ اگست کو فوت ہو گئی۔ اسلم کے لیے اس غم کی شدت بہت تھی۔ 'میرا بچہ' کے عنوان سے نظم لکھی۔ علامہ نے حیات و موت کے فلسفے پر چار پانچ شعر لکھ کر بھیجے۔ اس موضوع پر چند کتابیں لائبریری سے منگوا کر دیں۔[2]

60

۷/ ستمبر کے زمیندار میں لال دین قیصر کی طرف سے 'خضرِ راہ' کے ساتھ روایاتِ اسلامی کا اشتہار بھی شائع ہوا جسے احمد منصور نے تالیف کیا تھا۔ اس میں شبلی نعمانی، علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں کی وہ نظمیں جمع کی گئی تھیں "جن میں تاریخ اسلام کے واقعات نہایت خوش اُسلوبی کے ساتھ نظم کے سانچے میں ڈھالے گئے" تھے۔ ایک صفحے پر تینوں کی چھوٹی اور خوشنما عکسی تصویریں دی گئی تھیں۔[3]

محمد دین تاثیر نے تجویز پیش کی تھی کہ عبدالرحمٰن چغتائی، دیوانِ غالب کا مصوّر ایڈیشن تیار کریں۔ متن کی تحقیق کے لیے غلام رسول مہر اور پروفیسر محمود شیرانی وغیرہ کی خدمات حاصل کی جا رہی تھیں۔ عبداللہ چغتائی سے روایت ہے کہ علامہ نے تجویز پیش کی کہ غالب کے فارسی دیوان کو بھی مصور کیا جائے جس کی آج زیادہ ضرورت ہے۔ عبدالرحمٰن یہ تجویز قبول نہ کر سکے۔ البتہ عبداللہ اور تاثیر کے ساتھ علامہ سے درخواست کی کہ مصور دیوان کا دیباچہ لکھ دیں۔ طویل بحث کے بعد علامہ نے وعدہ کر لیا۔ ۷/ ستمبر کو عبداللہ کو خط لکھا:

اگر آپ کے پاس ہندوستانی مصوروں کی بنائی ہوئی تصویروں کا کوئی چھَپا ہوا مجموعہ ہو تو

---

[1] چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۲۴۳-۲۴۲۔ زمیندار ۲۶/ اگست ۱۹۲۶ء میں رپورٹ چھپی۔

[2] ایم اسلم کی زبانی روایت؛ شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۱۳۶

[3] اختر النسا (۲۰۱۰)، اقبال اور زمیندار، ص ۱۰۵

> ایک دو روز کے لیے مرحمت کیجیے۔ میں اُسے دیکھنا چاہتا ہوں۔ اگر ایسا کوئی مجموعہ نہ ہو تو چند مشہور تصویروں کے نام ہی سہی۔ ان کے ساتھ ان کا مضمون بھی ہونا ضروری ہے۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ ہندوستانی مصوّر بالعموم کیسے مضامین اپنے فن کی نمائش کے لیے انتخاب کرتے ہیں۔
>
> بنگال اسکول کی تصاویر کے نام خاص کر چاہیئے۔ اس کے علاوہ نقلوں کے آرٹ پر اگر کوئی کتاب ہو تو وہ بھی ساتھ لائیے۔

عبداللہ چند تصاویر، چٹر جی کے البم کے بنگال اسکول کی تصاویر والے حصوں اور ماڈرن ریویو میں شائع ہونے والی عبدالرحمٰن چغتائی کی تصاویر کے ساتھ علامہ کے پاس پہنچے۔ علامہ نے بعض تصریحات طلب کیں۔ عبداللہ نے وضاحت کر دی۔[1]

سر اکبر حیدری نے عبدالرزاق کا ایک اور خط بھجوایا۔ کلیاتِ اقبال کے پہلے ایڈیشن کی فروخت اور دوسرے کی طباعت کا اشتہار کسی غلط فہمی پر مبنی تھا۔[2]

لاہور چھاؤنی میں ایک انجمن اسلامیہ تھی۔ ۱۲/ ستمبر کو اُس کی مجلسِ شوریٰ نے قرارداد منظور کی کہ "یہ جلسہ مسلمانانِ چھاؤنی لاہور سے درخواست کرتا ہے کہ کونسل کی ممبری کے لیے اپنے ووٹ علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال، ایم اے پی ایچ ڈی بیرسٹر ایٹ لاٗ کے حق میں دے کر اُن کا اپنی سرپرستی و نمایندگی کا موقعہ دیں۔ امید ہے کہ برادرانِ اسلام اس موقعہ کو حقیقت سمجھ کر ایسے قابل اور ہمدرد سرپرست کو ہاتھ سے نہ جانے دیں گے۔"[3]

۲۴/ ستمبر کو علامہ کے انکم ٹیکس گوشوارے کے اندراجات کی پڑتال کے لیے منشی طاہر الدین انکم ٹیکس افسر کے سامنے پیش ہوئے۔ انکم ٹیکس افسر نے لکھا:

---

[1] مکتوب بنام چغتائی ۷/ ستمبر ۱۹۲۶ء؛ برنی (۱۹۹۱)، ص ۶۴۸۔ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۳۵۷-۳۵۶

[2] مکتوب سر اکبر حیدری بنام اقبال ۶/ ستمبر ۱۹۲۶ء؛ علامہ اقبال میوزیم لاہور

[3] زمیندار ۱۹/ ستمبر ۱۹۲۶ء میں 'انجمن اسلامیہ چھاؤنی کی اہم قرارداد'؛ شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۳۲

> The assessee is a Knight and … is renowned more as a poet and an author than as a member of the Legal Profession. His most important publication is a book entitled Bang-i-Dara. Assessee is amongst the most well known modern poets of India and enjoys world-wide reputation and respect.[1]

اُس روز علامہ نے سر اکبر کے نام ایک طویل خط لکھا۔ دستیاب نہیں ہے۔

معلوم ہوتا ہے کہ میاں عبدالعزیز کشمیر سے واپس آ چکے تھے۔ ۲۷ ستمبر کو علامہ نے ایک سطری رقعہ بھجوایا، "کیا آپ مجھ سے تھوڑی دیر کے لیے مل سکتے ہیں؟"[2]

اُس روز سر اکبر نے علامہ کو لکھا کہ اُن کے خیال میں تو عبدالرزاق کو کلیاتِ اقبال کے تمام نسخے مصنف کے حوالے کر دینے چاہییے تھے کہ وہ جس طرح چاہیں استعمال کریں۔ پیشگی اجازت نہ لے کر وہ اصولی غلطی کے مرتکب ہوئے تھے۔ عبدالرزاق سے بھی کہہ رہے ہیں کہ جلد از جلد معاہدے کی تعمیل کر دیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ عبدالرزاق نے تعمیل کر دی۔ پھر کوئی شکایت پیدا نہ ہوئی۔[3]

61

'بندگی نامہ' میں غلاموں کے فنونِ لطیفہ کے حوالے سے موسیقی کے بارے میں لکھ چکے تھے۔ اب 'مصوّری' کا عنوان بھی ڈالا۔ جرمن مفکر فیختے (Johann Gottlieb Fichte) نے کہا تھا کہ ایک فنکار کو ہر چیز چھوٹی، بدنما اور اندر سے خالی دکھائی دیتی ہے۔ دوسرے کو ہر چیز بڑی، نکھری ہوئی اور بھرپور دکھائی دیتی ہے۔ علامہ کے مطابق ان میں سے پہلی قسم کا فنکار غلامی یا انحطاط کی نمایندگی کرتا تھا۔

"میں نے غلاموں کی مصوری بھی دیکھی ہے،" فارسی میں لکھا۔ اس مصوری میں جن موضوعات پر توجہ دی جاتی ہے، اُن کی فہرست پیش کی: کوئی راہب ہوس میں گرفتار؛ کوئی حسینہ پنجرے میں ایک پرندہ لیے ہوئے؛ کوئی بادشاہ کسی خرقہ پوش فقیر کی خدمت میں؛ کوئی پہاڑی آدمی

---

[1] صفدر محمود (۱۹۷۳) 'علامہ اقبال کا گوشوارۂ آمدنی (انکم ٹیکس ریکارڈ کی روشنی میں)'، ص ۲۳-۲۵۔ مقالے میں درج پیشی کی تاریخ ۲۴ فروری واضح طور پر کتابت کی غلطی ہے۔

[2] مکتوب بنام میاں عبدالعزیز ۲۷ ستمبر ۱۹۲۶ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۵

[3] اکبر حیدری کا خط بنام اقبال ۲۷ ستمبر ۱۹۲۶ء؛ علامہ اقبال میوزیم لاہور

کاندھوں پر لکڑی کا گٹھا اُٹھائے ہوئے؛ کوئی نازک اندام نازنیں مندر کی طرف جاتی ہوئی؛ کوئی جوگی ایک ویرانے میں بیٹھا ہوا؛ کوئی شکستہ حال بوڑھا بڑھاپے کے امراض سے چُور اور اُس کے ہاتھوں میں ایک بجھا ہوا چراغ؛ کوئی گوّیا کسی پردیسی گانے میں مست جیسے روتے روتے بلبل کی سانس اُکھڑ گئی ہو؛ کسی کے تیرِ نگاہ سے گھائل نوجوان؛ ننھا بچہ بوڑھے باپ کی گردن پر سوار۔ غلام کے موئے قلم سے یہی مردہ مضامین وارد ہوتے ہیں۔ موت اُس کی کہانی بھی ہے۔ وہی اُس کا کرشمہ ہوتی ہے۔

مغربی اقوام سیاسی طور پر آزاد ہیں۔ مگر فنون کو غلامی کے اثرات سے آزاد کروانے کے لیے اب اُن کی طرف بھی نہیں دیکھا جا سکتا۔[1] وہاں جدید علوم نے یہ عادت ڈال دی ہے کہ صرف ظاہر کو تسلیم کیا جائے۔ دنیا جیسی دکھائی دیتی ہے، فنونِ لطیفہ میں بھی اُسے ویسا ہی دکھایا جائے۔ اس طرح مغربی اقوام فطرت کی غلام ہو گئی ہیں۔ انسان اُس چیز پر یقین کرنے کا حوصلہ ہار بیٹھا ہے جو ابھی ظاہر نہیں ہوئی لیکن جسے دنیا میں لانے کی خواہش دلوں میں موجود ہے۔ ”مصوّر اپنے آپ کو فطرت کے سپرد کر کے اُس کی نقالی کرنے لگتا ہے اور فن کو ضائع کر دیتا ہے،“ علامہ نے لکھا، ”اُس کی نگاہیں آسمان کے پرے نہیں دیکھتیں کیونکہ سینے میں بیباک دل نہیں ہوتا۔“

”جبرئیل بھی اگر غلام ہو جائے تو آسمان سے نیچے آ رہے گا،“ علامہ نے لکھا۔ فطرت کی غلامی، روایت کی غلامی اور سیاسی غلامی سبھی کے نتائج ایک جیسے ہیں۔ ”جسم رُوح سے خالی ہو جاتا ہے،“ علامہ لکھتے گئے، ”ایجاد کے ذریعے اپنی ذات کو ظاہر کرنے کا جذبہ ختم ہو جاتا ہے۔ تقلید اُس کی روایت بن جاتی ہے۔ ندرت اُس کے مذہب میں حرام ہو جاتی ہے۔ نئی اور جدید باتیں اُس کے وہم اور شک میں اضافہ کرتی ہیں، اس لیے بری لگتی ہیں۔ قدیم اور فرسودہ اچھے لگتے ہیں۔ نگاہ ماضی پر مرکوز اور مستقبل سے اندھی ہوتی ہے۔ مجاور کی طرح قبر کی مٹی میں رزق تلاش کرتا ہے۔ یہ ہنر ہے تو آرزو کی موت ہے۔ اس کا باطن برا اور ظاہر خوبصورت ہے!“

فنکارانہ صلاحیت کا اصل استعمال صرف آئیڈیل کی عکاسی کرنا ہے۔ حسن کو صرف اپنے وجود

---

[1] دیکھیے ۱۹۲۳ء کے واقعات میں پیامِ مشرق کا دیباچہ۔ یہاں اُس نکتے کی مزید تشریح ہو رہی ہے۔

میں ہی تلاش کیا جا سکتا ہے کیونکہ جو ہمیں مطلوب ہے وہ ابھی ظاہر نہیں ہوا۔ "زندگی معجزے کی قوت سے خالی نہیں ہے مگر ہر ایک اس راز سے واقف نہیں۔" سچا فنکار فطرت میں اضافہ کرتا ہے۔ فطرت کی خامی کو اپنی روح سے دور کر کے ہمارے سامنے ایک نئی دنیا پیش کرتا ہے۔ اس طرح وہ اپنے باطن کو بھی ظاہر کرتا ہے اور ہمارے دل کو نئی زندگی بھی عطا کرتا ہے۔ اُس کا سمندر ہمارا محتاج نہیں مگر ہمارے دریا سے اُسے خراج پہنچتا ہے۔ اُس کا ہنر ہر نگاہ کا اعتبار بن جاتا ہے۔ اُس کا ہنر اچھائی اور برائی کی حقیقت دکھاتی ہے اس لیے اُس کی فطرت ہی اچھے اور برے کا معیار ہے۔ اُس کی حُور جنت کی حُور سے زیادہ حسین ہوتی ہے۔ اُس کے بُتوں کا انکار کرنے والا کافر ہے!"[1]

62

سر سید احمد خاں نے عشق کو قوم اور فرد کے تعلق کی بنیاد قرار دیا تھا۔ علامہ نے 'بندگی نامہ' میں دکھایا کہ غلام سچے عشق کی جرأت سے محروم ہوتا ہے۔ اس لیے عشق کی بجائے دوسری چیزوں کو مذہب کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ 'مذہبِ غلاماں' کا عنوان ڈالا۔ فارسی میں لکھا، "غلامی میں عشق اور مذہب کے درمیان جدائی سے زندگی تلخ ہو جاتی ہے۔" غلام نماز پڑھتا ہے لیکن قبلہ حکمراں کی طاقت ہوتا ہے۔ اس لیے زندہ نظر آنے کے باوجود مردہ ہوتا ہے:

اے سمجھدار انسان، مرنا اور جینا بس اضافی امور ہیں،
مچھلیوں کے لیے پہاڑ اور صحرا وجود نہیں رکھتے اور پرندوں کے لیے دریا کی گہرائی موجود نہیں۔
سننے کی صلاحیت سے محروم شخص موسیقی کے سوز اور نغمہ وصدا کے لیے مردہ ہے،
نابینا موسیقی سے مست اور مسرور ہو جاتا ہے مگر رنگوں کے سامنے وہ زندہ در گور ہوتا ہے۔
روح ذاتِ حق کے ساتھ زندہ اور باقی رہتی ہے ورنہ یہ اِس کے لیے مردہ اور اُس کے لیے زندہ ہے۔

[1] بیاض زبور عجم کے اشعار کا ترجمہ۔ فارسی میں یہ بند زبور عجم میں 'بندگی نامہ' میں شامل کیے گئے۔

ذاتِ حق زندہ اور کبھی نہ مرنے والی ہے، بس اُسی کے ساتھ جینا اصل زندگی ہے۔ [1]

63

'بندگی نامہ' کے جو حصے لکھے جا چکے تھے اُن میں اضافے ہوئے۔ [2]تمہید میں لکھا کہ چاند نے خدا سے کہا کہ ایک ایسی زمین کا طواف کرتے ہوئے شرم آتی ہے جہاں رہنے والے غلام ہیں۔ چاند کو زمین کے طواف سے آزاد کیا جائے ورنہ زمین کی مٹی سے ایک نیا آدم بنایا جائے[3]!

'آزاد لوگوں کی تعمیرات' میں تاج محل کا تذکرہ کر چکے تھے۔ اُس کی وضاحت میں ایک بند کا اضافہ کیا۔ عشق اور فنِ تعمیر کا تعلق ظاہر کرتا تھا:

بلند جذبے محبت سے ہیں، اسی سے بے وقعت قدر و قیمت پاتا ہے!
محبت کے بغیر زندگی سراپا ماتم ہے، اُس کے تمام معاملات خراب اور ناپائیدار ہیں۔
عشق عقل و ہوش کو چمکاتا ہے۔ پتھر کو آئینے کی چمک عطا کرتا ہے۔
دل والوں کو طورِ سینا کا سینہ عطا کرتا ہے اور ہنرمندوں کو یدِ بیضا دیتا ہے۔
اُس کے سامنے ہر ممکن و موجود مردہ ہے کہ ساری دنیا کڑوی اور وہ مٹھاس ہے۔
ہمارے افکار کی گرمی اُس کی آگ سے ہے، پیدا کرنا اور روح پھونکنا اُس کا کام ہے!
عشق چیونٹی، پرندے اور انسان کے لیے کافی ہے، دونوں جہانوں کے لیے تنہا عشق کافی ہے!
قاہری کے بغیر حسن جادوگری ہے مگر قاہری کے ساتھ حسن پیغمبری ہے۔
عشق دونوں کو دنیا کے معاملات میں ملا دیتا ہے! دُنیا میں ایک نئی دُنیا پیدا کر دیتا ہے![4]

---

[1] بیاض زبور عجم کے اشعار کا ترجمہ۔ فارسی میں یہ بند زبور عجم میں 'بندگی نامہ' میں شامل کیے گئے۔

[2] بیاض زبور عجم

[3] نئے آدم کی تفصیل کے لیے دیکھیے ۱۹۲۳ء کے واقعات میں دیباچہ پیامِ مشرق

[4] بیاض زبور عجم کے اشعار کا ترجمہ۔ فارسی میں یہ بند زبور عجم میں 'بندگی نامہ' کی ابتدا میں رکھا گیا۔

64

پہلی دفعہ ۱۹۲۰ء میں انتخاب ہوئے تو عدم تعاون کی تحریک زوروں پر تھی۔ عوام نے انتخابات میں زیادہ دلچسپی نہ لی۔ دوسری دفعہ ۱۹۲۳ء میں ہوئے تو کانگریس نے حصہ لینے کی صرف اجازت ہی دی تھی، حوصلہ افزائی نہ کی تھی۔ اِس دفعہ حالات کچھ اور تھے۔

انتہاپسند ہندو رہنماؤں میں سے کچھ کانگریس چھوڑ کر ہندومہاسبھا جیسی تنظیموں کے ہو گئے تھے۔ کچھ کانگریس میں رہتے ہوئے بھی کانگریس کے حکم کے خلاف وزارتیں بنانے پر تُلے ہوئے تھے۔ سابق وزیرِ ہند لارڈ اولیوئیر نے اخبار ٹائمز میں مراسلے لکھے اور پھر دارُالاُمرا (House of Lords) میں کہا کہ ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات اس لیے ہیں کہ مسلمانوں کو جداگانہ نیابت دی گئی۔ حکومت مسلمانوں کی طرفداری کرتی ہے۔ ہندو نظرانداز ہوئے ہیں۔[1] یہ نکات انتہاپسند ہندوؤں کا سیاسی عقیدہ بن گئے۔

کانگریس نے انتخاب میں حصہ لینے کا اعلان کیا۔ سوراج پارٹی کو ضم کر لیا۔ اُس کے گزشتہ انتخاب کے منشور کو مناسب ترمیمات کے ساتھ اپنایا۔ واضح کیا کہ پنڈت مالوی نے کانگریس کے خلاف اعلانِ جنگ کیا ہے۔ عوام فیصلہ کریں کہ کس کے ساتھ ہیں۔[2]

یہ جنگ "عام" نشستوں پر تھی۔ مسلمانوں کی نشستیں الگ تھیں۔ آل انڈیا مسلم لیگ انتخاب میں حصہ نہیں لے رہی تھی۔ لیگی رہنما آزاد اُمیدوار تھے۔[3] مرکزی خلافت کمیٹی اپنے دستور میں تبدیلی کر کے جزیرۃ العرب کو غیروں کے تسلط سے آزاد رکھنے کے ساتھ ساتھ ہندوستان میں مسلمانوں کے تحفظ کا مقصد بھی اپنا چکی تھی۔ پنجاب میں اس کے نمایندے چاہتے تھے کہ پینتیس مسلمانوں کی مجلس، جس میں صرف پندرہ خلافت کمیٹی کے ہوں، منظم طریقے سے نمایندے کونسلوں میں بھیجے۔ یہ ہو سکا۔ آخر کمیٹی نے اپنا الیکشن بورڈ بنایا۔ اس کے کنوینر خواجہ عبدالرحمٰن غازی تھے۔ "کوئی آدمی اجتماعی طور پر کام کرنے کے لیے تیار نہیں ہے،" اُنہیں شکایت تھی۔ علامہ بھی آزاد

---

[1] Simon Report – League's Memorandum

[2] Mitra: *Indian Quarterly Register July-Dec. 1926,* pp.17-32

[3] Rafique Afzal, *A History of the All-India Muslim League,* pp.163-164

اُمید وار تھے۔ خلافت کمیٹی کی حمایت قبول کر کے اُصولوں پر دستخط کر دیئے:

۱ ہمیشہ قومی مفاد کو ذاتی اغراض اور حکومت کی خوشنودی پر ترجیح دینا۔

۲ مسلمانوں کے تمام حقوق کی حفاظت کے علاوہ ہندوستان کی مکمل آزادی کا نصب العین پیش نظر رکھنا اور خلافت کمیٹی جب تک اس نصیب العین کو سامنے رکھ کر کام کر رہی ہے، اس کی مخالفت کونسل کے اندر یا باہر نہ کرنا۔

۳ عام اسلامی مفاد کی حفاظت کے علاوہ جب تک ہندوستان کے حالات بدل نہ جائیں، اس وقت تک مسلمانوں کے لیے فرقہ وار نیابت کی جدوجہد جاری رکھنا۔

۴ کونسل کے اندر اس جماعت کی ہم نوائی کرنا جو مندرجہ بالا اصول پر کاربند ہو۔[1]

۲/ اکتوبر کو لاہور کے سرکردہ مسلمانوں پر مشتمل "مجلس انتخاب لاہور" نے فیصلہ کیا، "علامہ سر محمد اقبال کا بلا مقابلہ انتخاب علامہ موصوف کے لیے نہیں خود مسلمانانِ لاہور کے لیے انتہائی عزت کا موجب ہو گا۔" سیکرٹری نے خبر روانہ کرتے ہوئے اِکہتر (۷۱) نام درج کیے: نواب محمد علی خان قزلباش، میاں امیر الدین سینئر وایس پریذیڈنٹ میونسپل کمیٹی، مولوی سید ممتاز علی مالک دارُ الاشاعت، مولانا ظفر علی خان، مولانا عبدالمجید سالک بی اے، مولانا غلام رسول مہر بی اے، حکیم فقیر محمد چشتی نظامی، میاں فیروز الدین ممبر ڈسٹرکٹ بورڈ، شیخ گلاب دین ایڈووکیٹ، مولانا سید حبیب مالک اخبار سیاست، ڈاکٹر عبدالحق ایم بی بی ایس، خواجہ دل محمد ایم اے میونسپل کمشنر، میاں نظام الدین آنریری مجسٹریٹ، مولوی نورالحق مالک مسلم آؤٹ لک، مولانا داؤد اِپسن ایڈیٹر مسلم آؤٹ لک، ملک لال دین قیصر، ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ، مولوی احمد دین ایڈووکیٹ، ابوالاثر حفیظ جالندھری، مولوی محبوب عالم مالک پیسہ اخبار، میاں شاہنواز محلہ جوگیاں، حکیم محمد یوسف حسن نیرنگِ خیال، عبدالرحمٰن چغتائی، مرزا جلال الدین بیرسٹر ایٹ لا، سید افضال علی حسنی میونسپل کمشنر سب رجسٹرار، مولانا غلام مرشد بھاٹی دروازہ، خان بہادر شیخ امیر علی ریٹائرڈ سیشن جج، مولوی علی الدین بازار حکیماں،

---

[1] زمیندار ۳۱/ اکتوبر ۱۹۲۶ء؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۲۷۰

ابو عیسیٰ حشمت علی پریذیڈنٹ انجمن اہل قرآن، مہر جیوا نمبوار محلہ قصوریاں، مولانا سید سکندر رعنا سجادہ نشین درگاہ صابری، شیخ غلام محمد تاجر کتب کشمیری بازار، سید مراتب علی شاہ گیلانی آنریری مجسٹریٹ، میاں قمر الدین یکی دروازہ، سردار حبیب اللہ بیرسٹر ایٹ لأ میونسپل کمشنر، منشی کریم بخش آڑھتی بکر منڈی، شمس الدین حسن، چودھری دین محمد رئیس، مولوی محمد دین بی اے ہیڈ ماسٹر اسلامیہ ہائی سکول، میاں چراغ دین قصاب، چودھری فتح محمد ایم اے میونسپل کمشنر، مولوی نیاز محمد خاں ایڈووکیٹ ہائی کورٹ، میاں غلام محمد یکی دروازہ، ڈاکٹر غلام محمد ایم بی بی ایس، مولانا احمد علی شیر وانوالہ دروازہ، حکیم سید اکبر حسین محلہ ستھاں، حکیم سید ظفریاب علی، سید احمد شاہ بھاٹی دروازہ، میاں حسام الدین بیرسٹر ایٹ لأ، ڈاکٹر کرنل اللہ جوایا، ملک محمد طفیل بیرسٹر ایٹ لأ، خواجہ محمد لطیف ٹھٹھی ملاحاں، میاں عبد المجید، محمد شمس الدین شائق، ڈاکٹر طفیل حسین ایم بی بی ایس، مولوی فضل الدین ایڈووکیٹ، خان سعادت علی خاں جنرل سیکرٹری انجمن اسلامیہ، مفتی عبد الکریم مختار عدالت، بشیر احمد سعدی، خان صاحب شیخ محمد نقی آنریری مجسٹریٹ، شیخ نظام الدین پنشنر اکونٹنٹ، شیخ جان محمد میونسپل کمشنر، میاں معراجدین آڑھتی سبز منڈی، خواجہ عبد الرشید آسٹریلیا والا، سید محسن شاہ ایڈووکیٹ ہائیکورٹ، ملک نصیر الدین میونسپل کمشنر، میاں محمد سلطان محمود محلہ جوگیاں، مولوی نذیر احمد نور محلہ، خانصاحب نور محمد چوہٹہ مفتی باقر، میاں چنن الدین پہلوان، خانصاحب میاں احمد دین پنشنر اکونٹنٹ۔[1]

اُس رات نو بجے ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین بیرسٹر کے مکان پر بھی جلسہ ہوا۔ کئی محلوں کے نمایندے شریک ہوئے: کوچہ تیراں، ڈھل محلہ، پتھراں والی حویلی، کوچہ نقارچیاں، کوچہ لوہاراں، کوچہ قاضی خان، کوچہ کمان گراں، کٹرہ پوربیاں، گلی گاہندیاں اور گوجر گلی۔ متفقہ طور پر فیصلہ ہوا: "تمام ووٹ ڈاکٹر موصوف کے حق میں دیے جائیں اور مسلمانانِ لاہور سے اپیل کی جائے..." فضل الدین صاحب نے جلسے میں شامل چند سرکردہ اصحاب کے ناموں کے ساتھ خبر بھجوائی: ڈاکٹر خلیفہ

---

[1] زمیندار ۳/ اکتوبر ۱۹۲۶ء؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۳۵-۳۳

شجاع الدین بیرسٹر ایٹ لائ۔ منشی نور محمد پنشنر۔ بابو الٰہ بخش۔ میاں حسین بخش مالک قادر فونڈری۔ بابو فدا حسین۔ مہر معراج دین۔ مہر احمد دین۔ حکیم مظفر حسین اعوان۔ چودھری نظام دین۔ چودھری فتح محمد۔ چودھری محمد بخش رئیس اعظم۔ شیخ خدا بخش کلاک مرچنٹ۔ شیخ اقبال حسن لیدر مرچنٹ۔ شیخ کریم بخش۔ ڈاکٹر محمد اقبال صاحب ایل ایم ایم۔ مرزا اسلم بیگ۔ مرزا ارشد بیگ۔ ملک امیر بخش۔ حکیم چراغ الدین۔ ڈاکٹر محمد سراج الدین۔ میاں فضل الدین سوداگر۔ میاں محمد حسن سوداگر۔ شیخ سراج الدین جنرل مرچنٹ۔ میاں محمد خاں۔ قادر تشی۔ شیخ محمد عبداللہ۔ ملک معراج دین۔ میاں بشیر محمد سوداگر۔ شمس الدین حسن ایڈیٹر خاور۔ وغیرہ[1]

اُسی روز حکیم محمد شریف آئی ڈاکٹر کے مکان پر بھی علامہ کی حمایت میں جلسہ ہوا۔ ممدو کوچہ لکڑہارا، چوک نواب صاحب، کوچہ چہل بیبیاں، کوچہ شیعاں وغیرہ کے ووٹر موجود تھے۔[2]

65

بلدیہ لاہور کے صدر ملک محمد حسین نے انتخاب میں حصہ لینے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ وہ بھی "اپنی کامیابی کی پوری توقع کے باوجود محض اتحاد مسلمین کی خاطر" دستبردار ہو گئے، زمیندار نے ۳/ اکتوبر کے شمارے میں خبر دی۔[3] علامہ نے اُسی روز زمیندار کے نام خط لکھا:

> میں ملک صاحب کی اس عنایت فرمائی کا تہ دل سے شکر گذار ہوں اور ان کے اس جذبے کو بے انتہا قابل تعریف سمجھتا ہوں کہ وہ مسلمانوں میں برادریوں کے افتراق کو دیکھنا گوارا نہیں کرتے اور اتحاد المسلمین کے مقصد عزیز کے لیے انتہائی ایثار سے کام لے سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو اسی قسم کی دردمندی اور ایسے ہی ایثار کی توفیق بخشے۔[4]

۴/ اکتوبر کو حکیم مظفر حسین کے مکان پر علامہ کی حمایت میں جلسہ ہوا۔ پتھراں والی حویلی، قاضی

---

[1] زمیندار ۳/ اکتوبر ۱۹۲۶ء؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۳۳-۳۲

[2] زمیندار ۵/ اکتوبر ۱۹۲۶ء؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۲۶

[3] زمیندار ۳/ اکتوبر ۱۹۲۶ء؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل

[4] زمیندار کی ۴/ اکتوبر ۱۹۲۶ء؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتار اقبال، ص ۲۶۹

خانہ، گوجر گلی، نور گلی، مغل حویلی، لال کھوہ، کوچہ کشمیریاں، کڑی چراغ شاہ، کوچہ تارکیاں، چٹہ محل وغیرہ کے ووٹر موجود تھے۔ تکیہ سادھواں میں علامہ کی حمایت میں جلسہ ہوا۔ محلہ چابک سواراں، محلہ سادھواں، پیر گیلانیاں، چوہٹہ مفتی باقر، کوچہ چہل بیبیاں وغیرہ کے ووٹر موجود تھے۔ رات کو کوچہ تیر گراں میں ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین کے مکان پر جلسہ ہوا۔ علامہ کی حمایت میں ایک اعلان پر دستخط کیے گئے۔ نواں محلہ، ڈھل محلہ، پتھراں والی حویلی، قاضی خانہ، گوجر گلی، بازار سادہ کار، کوچہ ہوا گراں، کوچہ مائی چیلاں، موتی پاندہ وغیرہ کے ووٹر موجود تھے۔ الراعی برادری کے لوگ بھی موجود تھے۔ ایک اعلان پر دستخط کیے گئے۔ "اِسی طرح سے بھاٹی دروازہ، چونی منڈی، مزنگ، انارکلی، گڑھی شاہو، سلطان پورہ وغیرہ میں بھی جلسے ہو رہے ہیں اور ہر جگہ متحدہ طور پر یہ فیصلہ کیا جارہا ہے کہ مسلمانانِ لاہور کی عزت اِسی میں ہے کہ علامہ اقبال بلامقابلہ کونسل میں جائیں،" زمیندار نے ۵/ اکتوبر کے شمارے میں بتایا۔[1]

علامہ کے لکھے ہوئے اشارات سے معلوم ہوتا ہے کہ زرگراں، خوجہ، بوچڑ اور لوہار برادریوں نے اُن کے حق میں فیصلے کیے۔ سید علی حائری (شیعہ)، خواجگان نارووال، مرزا بشیر الدین محمود (قادیانی جماعت)، احمدیانِ لاہور اور انجمن حمایتِ اسلامیہ میاں میر نے بھی تائید میں اعلان کیے۔[2]

مولانا ظفر علی خاں کا بیان ہے، "ککے زئیوں نے بھی عملی حیثیت سے علامہ اقبال کی مدد کی۔"[3]

۶/ اکتوبر کو لاہور کے چھتیس شہریوں کی طرف سے علامہ کی حمایت میں بیان شائع ہوا: بیرون شرانوالہ گیٹ سے میاں ضیأالدین مالک کارخانہ صابن؛ شیرانوالہ سے مستری رحیم بخش چوب فروش، حکیم غلام بنی صاحب عرائض نویس نواں محلہ؛ اندرون شیرانوالہ گیٹ سے حاجی فضل الدین کلاتھ مرچنٹ، حکیم وڈاکٹر محمد دین؛ دہلی گیٹ سے سید محفوظ علی دواخانہ قادر الشفأ، میاں شمس الدین کلاتھ

---

[1] زمیندار ۵/ اکتوبر ۱۹۲۶ء؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۴۶

[2] علامہ کے ہاتھ کی تحریر علامہ اقبال میوزم لاہور

[3] زمیندار، ۵/ دسمبر ۱۹۲۶ء؛ محمد حنیف شاہد،، ص ۷۲-۷۴

مرچنٹ، ماسٹر نورالدین پروفیسر گلی چرخ گراں، میاں شہاب الدین زرگر گلی میاں سلطان، حکیم محمد دین گلی میاں سلطان، سید نوازش علی شاہ حویلی الف شاہ؛ کوچہ [یا گلی] گھنگروسازاں سے غلام نبی، شیخ احمد دین شیر فروش؛ کوچہ مائی تیلی [یا کوچہ تیلیاں] یکی گیٹ سے مہر خدابخش ٹھیکیدار، بابو میراں بخش، ملک حسین خان؛ کوچہ بوٹے شاہ یکی گیٹ سے شیخ فضل الٰہی، شیخ محمد بخش، حاجی فضل الدین قصاب؛ اندرون یکی گیٹ سے حکیم و ڈاکٹر ننھے خاں ایم بی ایم؛ نوگھرہ [یا گلی نوگھرہ] سے بابو غلام فرید، میاں فضل الدین زرگر؛ چوک وزیر خاں سے میاں مولا بخش؛ چوہٹہ وسطی بھگت سے حکیم غلام حسین، میاں کریم بخش ولد پیر بخش شیر فروش، بابو شمس الحق، میاں فیروزالدین؛ ان کے علاوہ بابو نور حسین محکمہ بجلی فورٹ لاہور، میاں عبدالکریم مالک الراعی مسلم ہوٹل، میاں غلام نبی، سید محمد شریف، مسٹر ایس اے دین، میاں عبدالعزیز خازن خدام الحرمین، میاں محمد اسلم برادر پروفیسر عبدالحمید ٹریننگ کالج لاہور، میاں محمد بشیر ممبر خدام الحرمین، ایم عبدالباری کلرک میاں محمد شفیع۔[1]

۸/اکتوبر کو زمیندار میں لاہور کے پندرہ ممتاز مسلمانوں کی طرف سے بیان شائع ہوا کہ ملک محمد حسین علامہ کے مقابلے سے دستبردار ہوئے اس لیے ''ہم اپنا قومی اور اِسلامی فرض سمجھتے ہیں کہ اِس ایثار کے لیے ملک صاحب کا دِلی شکریہ ادا کریں۔'' میاں نظام الدین رئیس آنریری مجسٹریٹ، مرزا جلال الدین بیرسٹر ایٹ لائ ایڈووکیٹ، میاں امیر الدین سینئر وائس پریذیڈنٹ میونسپل کمیٹی، خواجہ دل محمد ایم اے میونسپل کمشنر پروفیسر اسلامیہ کالج، شیخ گلاب دین ایڈووکیٹ، مولانا غلام رسول مہرؔ، خان بہادر شیخ انعام علی ریٹائرڈ سیشن جج، شیخ عظیم اللہ میونسپل کمشنر و ایڈووکیٹ، سید افضال علی حسنی سب رجسٹرار میونسپل کمشنر، میاں قمرالدین، چودھری دین محمد رئیس لاہور، میاں قادر بخش، چودھری فتح محمد ایم اے ایم او ایل میونسپل کمشنر، مولوی محمد دین ہیڈماسٹر اسلامیہ ہائی سکول شیر وانوالہ گیٹ، میاں حسام الدین بیرسٹر ایٹ لائ۔[2]

---

[1] زمیندار، ۶/اکتوبر ۱۹۲۶ء؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۳۸-۳۶

[2] محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۳۸

۹/ اکتوبر کی شام میاں عید محمد پنجاب تمباکو ہاؤس بازار اکبری منڈی کے مکان پر مختلف لوگ جمع ہوئے۔ علامہ کے حق میں ووٹ دینے کا فیصلہ کیا۔ "ان میں سے عید محمد صاحب اور ملک علی محمد خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں،" زمیندار نے بعد میں لکھا۔[1]

۱۰/ اکتوبر کو زمیندار کے صفحہ ۴ پر لاہور کے وارڈ نمبر ۸ (حلقہ نمبر ۸) کے مسلمانوں کا فیصلہ شائع ہوا۔ علامہ کی حمایت کی تھی۔ میاں عبدالعزیز اور ملک محمد دین کا شکریہ ادا کیا تھا۔ چھبیس شہریوں نے دستخط کیے تھے: اکبری منڈی سے معراجدین سبزی فروش، حکیم سید چراغ علی شاہ، خیر دین ٹھیکدار؛ کوچہ نقاشاں سے حکیم محمد دین؛ ان کے علاوہ خلیفہ معراجدین موٹر ڈرائیور، حاجی جمال محمد سوداگر، محمد شریف عزیزالدین سوداگر، میاں نھتو زرگر، نورالدین دری باف، شیخ محمد حیات، امیر محمد سنگ ساز، مستری میراں بخش ٹھیکیدار، میاں محمد دین کمپوزیٹر، محمد عظیم ولد کریم بخش، میاں لعل دین سوداگر، خواجہ محمد اقبال بی اے، دین محمد کلرک چیف آڈیٹر ریلوے، عطا محمد ٹھیکیدار، محمد یوسف ٹی ٹیکس افسر، محمد دین کلرک چیف آڈیٹر آفس ریلوے، غلام محمد ملک ٹی ٹی اے، خواجہ محمد عظیم پوسٹ ماسٹر، شیخ فرید بخش گورنمنٹ پنشنر، عزیز خان ملازم ریلوے پریس، محمد شفیع کلرک ہیڈ کوارٹر آفس، محمد شفیع ڈار۔[2]

قلعہ گوجر سنگھ کے باشندوں کی طرف سے چودہ مسلمانوں کے نام تھے: چودھری عبدالستار، عبدالرحیم، چودھری محمد اعظم، ایس غلام عباس، بدرالدین عطار، عبدالعلی بی اے، چودھری محمد شفیع، چودھری عبدالعزیز، جان محمد، چودھری عبداللطیف ٹھیکیدار، چودھری دین محمد، قادر بخش، چودھری علی بخش، چودھری عبدالکریم رکن بلدیہ۔[3]

قلعہ گوجر سنگھ ہی سے چودھری امین الدین کی طرف سے بھی تائید ہوئی تھی۔ اللہ دتا جمعدار

---

[1] زمیندار ۱۲/ اکتوبر ۱۹۲۶ء؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۵۰

[2] محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۳۹

[3] محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۴۰-۳۹

ریلوے یکی دروازہ نے بھی "اپنے تمام رفقا سمیت علامہ اقبال کی تائید کا وعدہ فرمایا"۔[1]

66

انتخاب میں حصہ لینے والے کانگریسی رہنماؤں میں پنڈت موتی لعل نہرو سب سے زیادہ ممتاز تھے۔ اُن کے سب سے بڑے مخالف ہندومہاسبھا کے رہنما پنڈت مدن موہن مالوی تھے۔ قومی مروّت کی وجہ سے ایک دوسرے کے خلاف اُمیدوار کھڑے نہ کیے۔ دونوں بلا مقابلہ منتخب ہو رہے تھے۔

علامہ کے حق میں دستبردار ہو کر میاں عبدالعزیز اور ملک محمد حسین نے علامہ کو یہی درجہ دیا تھا۔ یہ بات حیرت کے ساتھ سنی گئی کہ ایک تقریباً گمنام شخص اُن کے مقابلے میں کاغذاتِ نامزدگی جمع کروانے پہنچ گیا۔ کوئی بیرسٹر ملک محمد دین تھے۔ پیغمبرِ اسلامؐ کے خلاف توہین آمیز کتاب کی اشاعت پر راجپال کے خلاف مقدمہ ابھی چل رہا تھا۔ جو وکیل راجپال کی پیروی کر رہا تھا، وہ کاغذاتِ نامزدگی کی پڑتال کے وقت محمد دین کی طرف سے پیش ہوا۔[2]

مولوی محرم علی چشتی سے مسلمانوں کو عام شکایت تھی کہ انتہا پسند ہندوؤں کی خوشنودی حاصل کرنے میں لگے رہتے ہیں۔ وہ بھی محمد دین کی حمایت میں نکلے۔ مولانا سید حبیب جلالپوری، اخبار سیاست کے مالک تھے۔ راجپال کے مقدمے میں اُس کی طرف سے بطور گواہ پیش ہوئے تھے۔ قومیت "انڈین" لکھوائی۔ گواہی دیتے ہوئے کہا کہ انہیں اُس کتاب کے پڑھنے سے بہ حیثیت مسلمان کے کوئی رنج نہیں ہوا البتہ بہ حیثیت ہندوستانی دُکھ ضرور ہوا ہے کیونکہ اس سے دو قوموں میں افتراق پیدا ہوا ہے۔ ۲/ اکتوبر کو مجلس انتخاب لاہور میں سرکردہ مسلمانوں کے ساتھ انہوں نے بھی علامہ کی حمایت کے فیصلے پر دستخط کیے۔ اب ملک محمد دین کے حامی ہو گئے۔[3] ان کے اخبار میں علامہ کے لیے "کذاب"، "جھوٹا" اور "دشمنِ اسلام" کے لقب استعمال ہوئے۔ نوجوان شاعر منظور حسین،

---

[1] زمیندار ۱۲/ اکتوبر ۱۹۲۶ء؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۵۰

[2] شیخ عظیم اللہ کی تقریر ۱۸/ نومبر ۱۹۲۶ منقولہ زمیندار ۱۲ نومبر ۱۹۲۶ء؛ شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل

[3] شیخ عظیم اللہ کی تقریر متذکرہ بالا

جن کی نظمیں ماہرؔ القادری کے نام سے اس اخبار میں چھپتی تھیں، لکھتے ہیں کہ ”اِس اخبار کی اچھی خاصی شہرت اور مقبولیت تھی۔“[1] ایک اور اخبار نشتر میں علامہ کو وہابی اور نجدی قرار دیا گیا۔[2] مسلمانوں کے یہی اخبارات علامہ کے مخالف تھے۔ اتفاق سے کشمیریوں کے تھے۔ علامہ بھی کشمیری تھے۔[3]

مسلمانوں نے شبہ ظاہر کیا کہ غیروں کی سازش ہے۔ سراج نظامی رضاکاروں میں سے تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ سر شادی لعل نے محرم علی چشتی کے ذریعے ملک محمد دین کو آمادہ کیا۔ نظامی نے اس معلومات کا ماخذ نہیں بتایا مگر ظاہر ہے کہ یہ بات اُس وقت مشہور ہو رہی تھی۔[4] مجلسِ خلافت کے کارکن حکیم عبدالمجید عتیقی نے بھی لکھا ہے کہ محمد دین ”ڈرامہ میں... اداکار کی حیثیت سے شریک ہوئے تھے۔“[5] ایک زندہ دل ہندو کہہ اُٹھا کہ اگر آج حلقہ ہائے انتخاب مخلوط ہوتے اور کسی حلقے سے علامہ اقبال کھڑے ہو جاتے تو ہندو اُن کے مسلمان ہونے کے باوجود اُنہیں بلا مقابلہ کامیاب کروا دیتے لیکن مسلمان اِس قدر بے غیرت ہیں کہ اپنے قابل ترین بزرگ کی قدر کرنا بھی نہیں جانتے۔[6]

عتیقی نے لکھا ہے کہ لاہور کے مسلم حلقے کی انتخابی قوت کو تین بڑی ”قوموں“ میں تقسیم کیا جا سکتا تھا۔ یہ ارائیں برادری، کشمیری برادری اور خوجا برادری تھیں۔ وہ لکھتے ہیں، ”حقیقت میں انتخاب کا معیار نہ شخصی محاسن پر تھا، نہ قومی مفاد پر بلکہ ہر برادری، برادری کی اسپرٹ میں رائے دہی کا فیصلہ کرتی

---

[1] ماہرؔ القادری کا مضمون ’چند لمحے علامہ اقبال کے ساتھ‘ مطبوعہ ہفت روزہ شہاب لاہور ۲۴ اپریل ۱۹۶۰ء؛ شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۲۷۶-۲۷۵۔ ماہرؔ علامہ کے مداح تھے۔ لکھتے ہیں کہ شاگردی اختیار کرنے کے لیے خط لکھا۔ علامہ نے جواب دیا کہ شاعری کے لیے کسی تلمذ کی ضرورت نہیں ہے۔ زبان کی درستگی کی ضرورت پیش آتی ہے لیکن ماہرؔ خود یوپی کے رہنے والے ہیں۔ خط محفوظ نہیں ہے۔

[2] علامہ کے ہاتھ کی تحریر علامہ اقبال میوزم لاہور

[3] اداریہ زمیندار، ۵/دسمبر ۱۹۲۶ء

[4] سیارہ ڈائجسٹ لاہور اپریل ۱۹۶۵ء میں سراج نظامی کا مضمون؛ شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۲۲۲

[5] حکیم عبدالمجید عتیقی کا مضمون ’کچھ پھول کچھ کانٹے‘، ہفت روزہ شہاب لاہور ۸/مارچ ۱۹۶۴ء منقولہ شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۲۷۱

[6] اداریہ زمیندار، ۲۴/اکتوبر ۱۹۲۶ء

تھی۔" محمد دین کو میدان میں لانے والوں کا مقصد یہی معلوم ہوتا تھا کہ اس نسلی عصبیت کو زندہ رکھا جائے۔ الراعین برادری کی طرف سے میاں عبدالعزیز نے اربابِ خلافت کو یقین دلایا تھا کہ کوئی شخص علامہ کے مقابلے پر نہ آئے گا۔ وہ بھی محمد دین کو باز نہ رکھ سکے۔[1]

ملک محمد دین نے اخبارات میں اپنی فضیلت بیان کی۔ عراق اور شام میں مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کی تھی۔ اہل سنت والجماعت تھے۔ انتخابی مہم میں زور دیا کہ الراعی (ارائیں) برادری سے تعلق ہے۔ برادری انہیں ووٹ دے۔ "ملک محمد دین اور اُن کے حامیوں نے مقابلے میں جو تدابیر اختیار کیں وہ سب کی سب اسلامی اخلاق اور اسلامی اصول سے منزلوں دُور تھیں،" ظفر علی خاں کا بیان ہے، "بعض اصحاب نے مقامی حکام کے پاس جا کر مختلف النوع غلط بیانیاں کیں اور یہ کہہ دیا کہ علامہ اقبال اور ملک محمد دین کا مقابلہ دراصل الراعیوں اور کشمیریوں کا جھگڑا ہے۔ کبھی یہ کہہ دیا کہ اقبال کامیاب ہو گئے تو اُن کا جلوس نہیں نکلنا چاہیے۔"[2]

شہر کی دیواروں پر علامہ کے خلاف اشتہارات نمودار ہو گئے۔ "ان کا انداز و اسلوب اور سعی الزام تراشی اور بہتان طرازی کے سوا کچھ نہ تھا،" ظفر علی خاں کا بیان ہے۔[3] علامہ نے فہرست بنائی:

۱ آٹھ سوالات (ہر ایک اشتہار ایک سوال)

۲ ڈاکٹر اقبال کے اعمال و عقائد (معراجِ نبویؐ)

۳ ازالہ غلط فہمی (معراجِ نبویؐ)

۴ احمد دین کی طرف سے

علامہ نے اشتہارات کی کُل تعداد ۱۳ + ۱ = ۱۴ / نوٹ کی۔ معراجِ نبویؐ کے حوالے سے غالباً یہی الزام لگایا گیا کہ جسمانی کی بجائے روحانی معراج کے قائل ہیں۔ دوسرے الزامات اور سوالات کے بارے میں اب کچھ معلوم نہیں۔ ملک محمد دین اور اُن کے حامیوں نے زبانی طور پر بھی بہت کچھ کہا ہو گا۔

---

[1] حکیم عبدالمجید عتیقی کا مضمون 'کچھ پھول کچھ کانٹے'، محولہ بالا ص ۲۷۲

[2] زمیندار، ۵/ دسمبر ۱۹۲۶ء؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۴۷-۲۷

[3] ایضاً

ممکن ہے کہ یہیں سے بعض الزامات نے جنم لیا ہو جو دلیل اور سند کے بغیر سینہ بسینہ چلے آ رہے ہیں۔[1] معنی خیز بات ہے کہ جو لوگ پیغمبرِ اسلامؐ کی ذات پر رکیک حملوں میں ملوّث تھے، وہی علامہ کی کردار کُشی کر رہے تھے۔ جن کے منہ میں راجپال کی زبان تھی، اُن سے ایسی ہی باتوں کی توقع رکھی جا سکتی تھی۔ علامہ نے بھی سوچا ہو گا، "ایسی ذلت ہے مرے واسطے عزت سے سوا"۔[2] جنھوں نے آقاؐ پر تہمت لگائی، اُن سے اپنا دامن محفوظ رکھوا کر خوشی کی بجائے غم ہی محسوس کرتے۔

"ان اشتہارات کا کوئی جواب نہیں دیا گیا،" علامہ نے اپنے نوٹ میں درج کیا۔[3]

67

علامہ کا دفترِ انتخاب کشمیری بازار کے کوچہ کوٹھی داراں میں خواجہ محمد سلیم کے گھر قائم کیا گیا۔ محمد عاشق مہتمم تھے۔ محمد دین تاثیر مشیرِ اعلیٰ تھے۔ اسلامیہ کالج کی جے اے وی کلاس کے طلبہ نے آ کر تمام فہرستوں کو محلہ وار الگ الگ بنایا۔ عبداللہ چغتائی کے شاگرد تھے۔ چغتائی کہتے ہیں کہ اُن دنوں علامہ کی کوٹھی پر بھی "احباب کا مجمع ہر وقت رہتا تھا اور ایک خاص قسم کی ہنگامی فضا نظر آتی تھی... تمام احباب نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا... [علامہ] کے ہم زُلف خواجہ نورالدین بیرسٹر، حیات (گھی والا)، مولوی مسلم، ملک میراں بخش، شمس الدین (شم بھولی)، ڈاکٹر تاثیر اور ملک لال دین قیصر نے نہایت عمدہ کردار ادا کیا۔"[4]

چغتائی کے مطابق علامہ سب سے پہلے رنگ محل گئے۔ تکیہ سادھواں میں پرانے ملنے والے بابو عبداللہ رہتے تھے۔ گھر پر نہ تھے۔ کسی نے کہا قرآن کی تفسیر لکھ رہے ہیں۔ علامہ نے ساتھیوں سے کہا، "دیکھ لو، قرآن کریم بھی کس قدر مظلوم ہے کہ ہر شخص اس پر قابض ہو جاتا ہے۔"[5]

---

[1] الزامات پر مفصل بحث کے لیے دیکھیے محمد احمد خاں، اقبال کا سیاسی کارنامہ اور ڈاکٹر جاوید اقبال، زندہ رُود

[2] یہ علامہ کے ابتدائی دور کی ایک متروک غزل کا مصرع ہے۔

[3] علامہ کے ہاتھ کا لکھا ہوا نوٹ علامہ اقبال میوزیم میں موجود ہے۔

[4] عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۱۷۹-۱۷۸

[5] عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۱۷۸-۱۷۷

۱۱/اکتوبر رات ۹ بجے رنگ محل میں وارڈ نمبر ۹ کی طرف سے جلسہ ہوا۔ علامہ موجود تھے۔ شیخ غلام محمد گورنمنٹ پنشنر نے صدارت کی۔ تلاوت ہوئی۔ نعت پڑھی گئی۔ ملک لال دین قیصر نے مساواتِ اسلام پر غالباً پنجابی میں نظم سنائی۔ شیخ حسن دین وکیل نے اپنے رائے دہندگان کی طرف سے کہا کہ علامہ کی تائید قومی فریضہ سمجھتے ہیں۔ علامہ کے اوصاف بیان کیے۔ ماسٹر مولانا محمد بخش مسلمؔ نے ان اوصاف کی تائید میں تقریر کی۔ قرآن اور حدیث سے واضح کیا کہ اسلام ذات پات کے امتیازات کا رَوادار نہیں۔ خواجہ فیروزالدین بیرسٹر نے مزید تائید کی۔ علامہ کے کمالات کو مختصر الفاظ میں موثر طور پر بیان کیا۔ بڑے زور سے اپیل کی کہ کلمہ گو بھائیوں کو ذات پات کے غیر اسلامی بندھنوں کی قید سے ہمیشہ اجتناب کرنا چاہیے۔[1] علامہ نے بھی تقریر کی۔ پہلی انتخابی تقریر معلوم ہوتی ہے:

> میں انگریزی، اُردو، فارسی میں برنگ نثر بھی اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا تھا۔ لیکن یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ طبائع نثر کی نسبت شعر سے زیادہ متاثر ہوتی ہیں۔ لہٰذا میں نے مسلمانوں کو زندگی کے صحیح مفہوم سے آشنا کرنے، اسلاف کے نقش قدم پر چلانے اور ناامیدی، بزدلی اور کم ہمتی سے باز رکھنے کے لیے نظم کا ذریعہ استعمال کیا۔ میں نے پچیس سال تک اپنے بھائیوں کی مقدور بھر ذہنی خدمت کی۔ اب میں ان کی بطرز خاص عملی خدمت کے لیے اپنے آپ کو پیش کر رہا ہوں۔
>
> اسلامیانِ ہند پر عجب دور گذر رہا ہے۔ ۱۹۲۹ء میں ایک شاہی مجلس تحقیقات اصلاحات، جسے 'رائل کمیشن' کہتے ہیں، یہ تحقیق کرے گی کہ آیا ہندوستان مزید رعایات و اصلاحات کا مستحق ہے یا نہیں۔ ضرورت ہے مسلمان بھی اس باب میں پوری توجہ سے کام لیں اور اپنے حقوق کا تحفظ کریں۔ ممبر کا سب سے بڑا وصف یہ ہونا چاہیے کہ ذاتی اور قومی منفعت کی ٹکر کے وقت اپنے شخصی مفاد کو مقاصد قوم پر قربان کر دے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں کبھی بھی اپنے مفاد کو قوم کے مصالح کے

---

[1] محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۶۴-۶۳

> مقابلہ میں ترجیح نہیں دوں گا اور رب العزت سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اس امر کی توفیق بخشے کہ میں آپ کی خدمت کر سکوں۔ میں اغراض ملّی کے مقابلے میں ذاتی خواہشوں پر مر مٹنے کو موت سے بدتر خیال کرتا ہوں۔[1]

نوجوان کارکنوں کو نصیحت کی کہ کسی کی تنقیص نہیں کرنی چاہیے۔ اُن سے کہا، "اگر کوئی مجھے گالیاں بھی دے تو صبر و سکون سے کام لینا چاہیے۔" شیخ غلام مصطفیٰ آسؔ نے محلے والوں کی طرف سے حاضرین اور علامہ کا شکریہ ادا کیا۔ قصاب برادری نے فیصلہ کیا کہ علامہ کی مدد کریں گے۔ ماسٹر مسلم نے حاضرین کو آگاہ کیا۔[2]

عتیقی نے ایک جلسے کا ذکر کیا ہے جو "کشمیری بازار میں"، "سنہری مسجد کے چوک میں" ہوا۔ اُن کے مطابق میاں عبدالعزیز نے صدارت کی۔ ممکن ہے کہ عتیقی کی مراد اِسی جلسے سے رہی ہو۔ صرف صدر کی شخصیت کے بارے میں یادداشت نے غلطی کی ہو۔ بہر حال عتیقی نے لکھا ہے کہ خواجہ دل محمد 'اقبال اور قوم کا فرض' کے موضوع پر ترنم سے نظم پڑھ رہے تھے۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے اُٹھ کر علامہ سے پوچھا کہ آپ کا عقیدہ کیا ہے۔ مراد تھی کہ علامہ کا تعلق کس فرقے سے ہے۔ محمد بخش مسلمؔ نے "اپنے خاص انداز میں مثنوی [مولانا روم] کے اشعار پڑھتے ہوئے فرمایا کہ اربابِ عشق کا مذہب عوام کی خدمت کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔" علامہ تقریر کے لیے اُٹھے تو پھر کسی نے فرقہ پوچھا۔ علامہ نے کہا کہ اِن چیزوں کو کبھی اہمیت نہیں دی۔ 'جوابِ شکوہ' کا شعر پڑھا:

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں　　　کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں

اس کے بعد کہا، "تم مجھے ووٹ نہ دو۔ میں کونسل کی رکنیت کے لیے ناکام رہوں، یہ گوارا ہے، لیکن یہ گوارا نہیں کہ میں اسلام کو فرقہ بندیوں میں تقسیم کر کے خود کو کسی فرقے سے متعلق کر دوں۔ میں مسلمان ہوں اور مسلمان ہی کہلانا پسند کرتا ہوں۔" الفاظ اس طرح ادا کیے گئے کہ سننے والے بیحد

---

[1] زمیندار ۱۴/اکتوبر ۱۹۲۶ء؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۱۷-۱۶

[2] محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۶۴-۶۳

متاثر ہوئے۔ عتیقی کے مطابق دوسرے جلسوں میں بھی اسی قسم کے سوالات ہوئے۔ علامہ نے ہر جگہ یہی جواب دہرائے۔[1] عاشق بٹالوی نے علامہ کی زبانی روایت کی ہے کہ چوک وزیر خاں کے جلسے میں تقریر کر رہے تھے۔ ایک شخص نے کھڑے ہو کر پوچھا، ''یہ بتائیے کہ آپ انحضرتؐ کی جسمانی معراج کے قائل ہیں یا روحانی معراج کے؟'' علامہ نے کہا، ''اِس سوال کا یہاں کیا موقع ہے؟'' اُس نے جواب دیا، ''ہم نے سُنا ہے کہ آپ جسمانی معراج کے قائل نہیں ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو ہم آپ کو ووٹ نہیں دیں گے۔''[2]

۱۳/ اکتوبر کو بھی جلسہ ہوا۔ علامہ نے کہا کہ اگر قوم متفقہ طور پر دستبردار ہونے کا حکم دے تو تعمیل کے لیے تیار ہیں۔ ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنانا بد ترین گناہ سمجھتے ہیں۔ عنقریب نوجوانوں کا ایک جیش تیار کریں گے جو مسلمانوں کے درمیان فرقہ پرستی کی لعنت کو بیخ و بنیاد سے اُکھاڑ دے گا۔[3]

۱۵/ اکتوبر کی صبح ایک وفد علامہ کے پاس آیا۔ انجمن حمایت اسلام کے بانی حاجی شمس الدین ساتھ تھے۔ مہر صوبہ قیادت کر رہے تھے۔ علامہ سے کہا گیا کہ انہیں محمد دین کے حق میں دستبردار ہونا چاہیے۔ علامہ نے کہا کہ مسلمانوں کا نائب وہی ہو سکتا ہے جس پر مسلمانوں کا اجماع ہو جائے۔ حاجی شمس الدین نے فوراً قبول کر لیا۔ بڑھاپے کو پہنچ چکے تھے۔ پھر بھی جلوس کے ساتھ چل پڑے۔

پانچ بجے سہ پہر جلسہ ہوا۔ ملک محمد حسین صدر بلدیہ، جو علامہ کے حق میں دستبردار ہوئے تھے، صدارت کر رہے تھے۔ ''متعدد مقتدر رؤسا، ادبأ کے علاوہ مختلف محلہ جات کے قریباً دس ہزار مسلمان شریک تھے،'' زمیندار نے بعد میں لکھا۔ حافظ محمد عبداللہ خاں نے تلاوت کی۔ ماسٹر محمد بخش مسلم بی اے نے تقریر کی۔ حفیظ جالندھری نے نظم سنائی۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے تقریر کی۔[4]

---

[1] حکیم عبدالمجید صدیقی کا مضمون 'کچھ پھول کچھ کانٹے'، ہفت روزہ شہاب لاہور ۸/ مارچ ۱۹۶۴ء منقولہ شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۲۷۲-۲۷۳

[2] عاشق بٹالوی (۱۹۴۴) 'علامہ اقبال کی خدمت میں چند لمحے'، ص ۴۳-۴۲

[3] ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۴)، زندہ رود، ص ۳۶۸

[4] مرزا جلال الدین کا کہنا درست نہیں لگتا کہ کچلو، ملک دین محمد کے ساتھ تھے؛ مرزا جلال الدین، 'میرا اقبال'، ص ۹۳

انتخابی مہم کے دوران علامہ کے بارے میں غلط فہمیاں پھیلائی جا رہی تھیں:

حضرات! علامہ اقبال کی کشش مجھے اس جلسے میں کھینچ لائی ہے۔ علامہ ممدوح میرے محترم اور عزیز دوست ہیں۔ آپ کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ انہوں نے اپنے کلام سے مردہ قوم میں زندگی کی ایک نئی قوت پیدا کر دی ہے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ہم اپنے اِس محسنِ عظیم کی قدر کرنا نہیں جانتے۔ اگر آپ جناب ڈاکٹر صاحب کی قابلیت کا اندازہ لگانا چاہتے ہیں تو آپ میرے ساتھ یورپ چلیں۔ ممالکِ اسلامیہ کے چکر کاٹیں۔ آپ پر ڈاکٹر صاحب کے کمالات منکشف ہو جائیں گے۔ میں سپاہی ہوں، خوشامد میرا شیوہ نہیں۔ میں حلفیہ عرض کرتا ہوں کہ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب انتخابِ کونسل کے سلسلے میں اِدھر اُدھر گھوم رہے ہیں اور اِنتخاب کے جلسوں میں شرکت کی زحمت گوارا کر رہے ہیں۔ چاہیے تو یہ تھا کہ ہم ڈاکٹر صاحب سے درخواست پر دستخط کرواتے اور پھر بلامقابلہ آپ کو ہار پہنا کر کونسل ہال میں چھوڑ آتے۔ میں سخت رنج اور شرم کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ کیسی بدنصیب ہے وہ قوم جس کے بعض افراد اقبال جیسی شخصیت کے مقابلے میں کھڑے ہونے سے باز نہیں آتے۔ قوم کو چاہیے تھا کہ وہ ڈاکٹر صاحب سے التجا کرتی، ہاتھ جوڑتی، منت کرتی اور ان کو ان کے دولت کدے سے باہر نکال کر رہنمائی کی باگ ڈور اُن کے سپرد کرتی اور بڑے اطمینان سے آپ کو کونسل میں بھیجتی۔

دوستو! اِس وقت زمانہ نازک ہے۔ سخت ضرورت ہے کہ اس ہنگامِ بالا میں ڈاکٹر صاحب ایسے قابل اور فاضل بزرگ میدانِ عمل میں گامزن ہو جائیں۔

کیا غضب ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے مقابلے کے لیے الراعی اور غیر الراعی کا سوال پیدا کر دیا گیا ہے۔ جناب ملک محمد دین صاحب بھی ہمارے دوست ہیں۔ الراعی برادری کو کم عقلی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے۔ اگر وہ اِس شرمناک مقابلے سے باز نہ آئیں تو اُن کی معزز برادری کے ماتھے پر کلنک کا ایسا ٹیکا لگ جائے گا جس کا مٹنا مشکل ہو جائے

گا۔ چند بھائیوں کو چاہیے کہ وہ ملک صاحب کی خدمت میں حاضر ہوں۔ اُن سے عرض کریں کہ آپ کرم کیجیے، رحم کیجیے۔ کسی اور وقت بشرطیکہ آپ نے اچھا کام کیا آپ کو بھی موقع مل جائے گا۔ میں بھی الراعی برادری سے استدعا کرتا ہوں کہ آپ بیٹھ جائیں۔ ووٹوں کے حاصل کرنے کے مختلف ذرائع ہوا کرتے ہیں۔ نعوذ باللہ من ذالک کہا جاتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب شاعر ہیں۔ فلاسفر ہیں۔ آپ کو سیاسیات سے کیا تعلق ہے۔ خدا کو حاضر ناظر جان کر سچ کہتا ہوں کہ نہ صرف مسلمان رہبروں نے بلکہ ہندو لیڈروں نے بھی جب کبھی اُن کو ملک اور قوم کی ترقی و بہبودی کے لیے سیاسیات میں مشورہ طلب کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اُنہوں نے ڈاکٹر صاحب سے مشورہ کیا ہے اور آپ نے ان کو اپنے قابلِ قدر مشورے سے مستفید و مستفیض فرمایا ہے۔ مقامِ حیرت ہے کہ انگریزوں کی پارلیمنٹ میں جو جہاں بھر کی پارلیمنٹوں کی ماں ہے، یہ دستور ہے کہ کیمبرج اور آکسفورڈ یونیورسٹی کے پروفیسروں کو مدعو کر کے مشکل مسائل پر اُن سے لیکچر کرائے جاتے ہیں اور یہاں ایک بیمثال فاضل شخصیت کی نسبت ایسی بے بنیاد باتوں کا اظہار کیا جاتا ہے اور اُس کی قابلیت سے فائدہ نہیں اُٹھایا جاتا۔ میں نوجوانوں سے اپیل کرتا ہوں کہ اُن کو ایک زبردست جمعیت قائم کرنی چاہیے۔ ہر گلی اور ہر کوچہ میں پہنچ کر عامۃ الناس کو ووٹوں کی اہمیت سے آگاہ کرنا چاہیے۔

[پنجاب کے مسلمانوں کا] دعویٰ یہ ہے کہ ہماری اکثریت ہے، ہم کو زیادہ حقوق ملنے چاہئیں۔ دوستو! تحفظِ حقوق کا بہترین طریق یہ ہے کہ ہم بہترین نمایندے بھیجیں۔ اگر جمعیت العلمأ نے آج سے چھ ماہ پیشتر فتویٰ واپس لے لیا ہوتا تو میں خود بھی اسمبلی میں جاتا۔ مجھ کو ایک دوست سے ملنے کی غرض سے کونسل میں جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں یہ نظر آیا کہ ہندوؤں کے نمایندے تو ایک ایک لفظ پر محشر بپا کر دیتے ہیں اور مسلمان خوابِ خرگوش میں پڑے ہیں۔ کئی ایک ممبر ایسے ہیں جو انگریزی ہی نہیں جانتے تھے۔ بعض کو یہ بھی معلوم نہیں کہ کونسل کیا چیز ہے؟ جو شخص اِنسانی ہستی کو

نہیں سمجھتا وہ نیابت کیا کر سکتا ہے؟ افسوس ہے کہ جس نے اپنے علم، عقل و مذہبی واقفیت، فلسفہ اور شعر سے مسلمانوں کی بہترین خدمت کی ہے، آج اُس کی بھی مخالفت کی جارہی ہے۔ افسوس ہے کہ اِس قحط الرجال میں بھی یہ قوم اپنے قابلِ قدر آدمیوں کی قدر نہیں کرتی۔ میں ایمان سے کہتا ہوں کہ ڈاکٹر اقبال کی مخالفت ملک کی صحیح سیاست اور تہذیبِ اسلام کی مخالفت کے مترادف ہے۔

شیخ حسن دین وکیل میونسپل کمشنر نے صدرِ جلسہ ملک محمد حسین صدرِ بلدیہ کا شکریہ ادا کیا۔ ہزاروں افراد کا جلوس ترتیب دیا گیا۔ بھاٹی دروازے کے مسلمان رضاکاروں کا جیش سب سے آگے تھا۔ سید احمد شاہ اس کے قائد تھے۔ پھر دو اور جیوش تھے۔ پھر علامہ رؤسا کے حلقے میں چل رہے تھے۔ جلوس مسجد وزیر خاں پہنچا۔ مغرب کی نماز پڑھی گئی۔[1] دوبارہ روانگی باغ موچی دروازہ سے ہوئی۔ رضاکار علامہ کے شعر پڑھ رہے تھے:

یوں تو مرزا بھی ہو، سید بھی ہو، افغان بھی ہو   تم سبھی کچھ ہو بتاؤ تو مسلمان بھی ہو

تالاب ریڈنگ روم کے پاس پیر اصغر علی شاہ بودیاں والے ایک موٹر میں سوار تھے۔ دونوں ہاتھ پھیلا کر علامہ کے حق میں دعا مانگی۔ حکیماں والے بازار میں سیال شریف کے سجادہ نشین ضیأالدین تھے۔ ضیأالملت کہلاتے تھے۔ علامہ کے حق میں دُعا مانگی۔

چوک نواب صاحب، چوہٹہ مفتی باقر، بازار عقب مسجد وزیر خاں، چوک پرانی کوتوالی، کشمیری بازار، ڈبی بازار، بزاز ہٹہ، چوک سرجن سنگھ، ہیرا منڈی، بازار حکیماں اور بھاٹی دروازے سے گزر کر بھاٹی دروازے ہی میں جلوس ختم ہوا۔ علامہ نے معززین، رضاکاروں اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔ پھر خاص طور پر حاجی شمس الدین کا شکریہ ادا کیا۔ صبح کا واقعہ سب کو سنایا۔ لوگوں نے اِصرار کیا کہ حاجی صاحب کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ لاہور کے زندہ نوادرات میں سے تھے۔ اصرار پر حاضرین کے سامنے

---

[1] چغتائی کے مطابق ایک انتخابی جلوس جس میں علامہ بھی شامل تھے، نمازِ مغرب کے وقت رُکا اور ''قاضی عبدالرحمٰن طالب علم اسلامیہ کالج کی امامت میں نماز پڑھی گئی''؛ عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۱۷۹

آئے۔ پھر علامہ نے کہا، "اَب ہم کو پھر ابراہیمی کام کرنا ہے اور ذات پات کے بت کو پاش پاش کرنا ہے۔ میں نوجوانوں کے سامنے عنقریب ایک سوشل پروگرام پیش کرنے والا ہوں۔"

راجہ غضنفر علی شمالی حلقے سے پنجاب کونسل میں مسلمانوں کے نمایندے تھے۔ پرجوش تقریر کی، "ڈاکٹر صاحب میرے حلقے کی طرف سے ممبر کھڑا ہونا چاہیں تو میں اُن کے حق میں دستبردار ہونے کو تیار ہوں۔" خواجہ فیروزالدین بیرسٹر نے راجہ صاحب کا شکریہ اَدا کیا۔ دُعا پر جلسہ ختم ہوا۔[1]

اُسی روز سید اصغر علی شاہ صاحب گیلانی بودیاں والے نے اعلان کیا، "مسلمانانِ لاہور کی غیرتِ ملی کا اقتضا یہ ہے کہ آیندہ انتخابات میں علامہ اقبال بلامقابلہ رُکن بنیں۔"[2]

۱۷/ اکتوبر کو عشأ کی نماز کے بعد وارڈ نمبر ۷ کی طرف سے علامہ کی موجودگی میں جلسہ ہوا۔ خواجہ فیروزالدین بیرسٹر نے صدارت کی۔ وارڈ کے اکثر مقتدر لوگوں کی طرف سے حمایت کا اعلان ہوا۔ خواجہ فیروز الدین اور ماسٹر محمد بخش مسلم نے تقریریں کیں۔ شیخ غلام مصطفیٰ آس اور ملک لال دین قیصر نے نظمیں پڑھیں۔ علامہ نے 'جمہوریتِ اسلام اور پنجاب کونسل' کے موضوع پر لیکچر دیا۔[3]

۱۸/ اکتوبر کو متی کے چوک میں علامہ کی موجودگی میں جلسہ ہوا۔ خواجہ دل محمد ایم اے نے صدارت کی۔ ماسٹر مسلم، خواجہ فیروزالدین بیرسٹر اور علامہ نے تقریریں کیں۔ ملک لال دین قیصر نے شعر سنائے۔ چودھری وہاب الدین اور چودھری اللہ دتا نے "بڑے موثر انداز میں ارشاد فرمایا کہ وارڈ نمبر ۴ کے کُل کے کُل ووٹر ڈاکٹر صاحب کے معاون ہیں۔"[4]

ایک جلسے سے واپسی پر علامہ اندرون شہر کی گلیوں سے پیدل گزر رہے تھے۔ حفیظ جالندھری ساتھ تھے۔ اُن کا بیان ہے کہ راستے میں جو بھی ملتا، علامہ اُسے سلام کرتے۔ ایک شخص شاید ملک محمد

---

[1] زمیندار ۲۱/ اکتوبر ۱۹۲۶ء؛ شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۵۴–۵۰۔ زمیندار ۲۳/ اکتوبر ۱۹۲۶ء؛ افضل (۱۹۸۶)، ص ۱۸–۱۷

[2] محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل

[3] محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۵۴

[4] زمیندار ۲۲/ اکتوبر ۱۹۲۶ء؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۵۴

دین کا حمایتی تھا۔ سلام کے جواب میں اپنی دھوتی اُٹھا کر ننگا ہو گیا۔ علامہ نے موٹر میں بیٹھنے کے بعد بجھے ہوئے لہجے میں کہا، ''اِس قوم کے مصائب کے سبب میری راتوں کی نیند اچاٹ ہے لیکن اس کے افراد اخلاق اور مروّت کی دولت سے کیوں محروم ہیں؟'' حفیظ نے جواب دیا، ''ڈاکٹر صاحب! قوم کے پاس جو کچھ ہے، وہ اُس نے آپ کو دِکھلا دیا۔ اِس میں مغموم ہونے کی کیا بات ہے!'' علامہ کو ہنسی آ گئی۔[1]

68

زیب النسأ عرف ''جیبی'' ایک طوائف تھی۔ مشہور تھا کہ مولوی محرم علی چشتی کی منظورِ نظر ہے۔ مولوی صاحب کا ضلع اٹاری، لاہور کے انتخابی حلقے سے باہر تھا۔ پھر بھی محمد دین کے جلسوں میں پائے جاتے تھے۔ روایت ہے کہ چوہٹہ مفتی محمد باقر کے جلسے میں علامہ کی موجودگی میں ملک لال دین قیصر نے پنجابی اشعار میں جیبی کی رعایت سے مولوی صاحب کا تذکرہ ''جیبی پور'' کے پٹواری کے طور پر کیا۔ طنز کیا کہ کسی نے کہا کہ ساری خلقت علامہ کی حمایت میں اُٹھ کھڑی ہوئی ہے، آپ کی طاقت کہاں گئی؟ مولوی صاحب نے جواب دیا کہ ہمارا زور اَٹاری میں چلتا ہے:

جیبی پور اِک پنڈ سنی دا، اوتھوں دا پٹواری اے
جگہ کرائے تے گو نئیں لبدی، بندا اُنج اعتباری اے
کل جو کسے یار نیں جا کے اوسنوں بولی ماری اے
حضرت تہاڈی طاقت کتھے، اُوتھے خلقت ساری اے
کہن لگا او بیوقوفا، مت تیری گئی ماری اے
شہر لاہور اقبال دے ولّے، ساڈا زور اٹاری اے[2]

اُس زمانے کے ایک نوجوان سراج نظامی نے اس کے مصرعے یوں سنائے ہیں:

سر اقبال پیارے تائیں مندی دنیا ساری اے

---

[1] ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۴)، زندہ رود، ص۳۶۹۔ انہیں یہ واقعہ حفیظ نے خود سنایا۔

[2] محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل میں محمد شفیع فاروقی کی روایت۔

کی ہویا جے چنگڑ محلّے بیٹھا اک انکاری اے
جیہی پور اِک پنڈ سنی دا، اوتھوں دا پٹواری اے
اساں کسے نوں کجھ نئیں کہنا ساڈی محلے داری اے[1]

نظامی کا بیان ہے، ''میں نے محلّے کی ایک والنٹئیر کور بنائی جس کا نام اقبالی فوج رکھا۔ ہم رات کو جلوس کی شکل میں نکلتے اور یہ مصرعہ ترنم سے پڑھتے: تیری آ گئی فوج اقبالی... درمیان میں 'شکوہ اور جوابِ شکوہ' کے بند بھی پڑھتے جاتے۔''[2] چغتائی کہتے ہیں کہ اسلامیہ کالج کے طلبہ نے بھی جلوس نکالا۔ شہر کے قریباً تمام بازاروں میں 'ترانۂ ملّی' کے اشعار لہک لہک کر پڑھے: مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا۔ 'جوابِ شکوہ' کا فرقہ بندی والا بند بھی پڑھا۔[3]

حاجی احمد بخش کا تعلق الراعی برادری سے تھا۔ علامہ سے پرانے مراسم تھے۔ احمد بخش کے خاندان نے علامہ کی حمایت کی۔ ان کے پوتے عبدالرشید طارق کی عمر قریباً پندرہ برس تھی۔ محلے کی والنٹئیر کور میں شامل ہوئے۔ اُن کا بیان ہے:

> ارائیں [الراعی] ہو کر ڈاکٹر صاحب کی اعانت کرنے کی وجہ سے ہمارے خاندان کو بائیکاٹ کی دھمکیاں دی گئیں... ہم نے اپنے مکان کے در و دیوار ''اقبال'' لکھ لکھ کر سیاہ کر ڈالے تھے... [''پڑوس کے ایک صاحبِ ریش بزرگ''] برہم ہو گئے۔ کہنے لگے ''اقبال آخر ہے کیا، صرف شاعر اور بیت گو۔ حقہ لے کر تمام دن گڑ گڑاتا رہتا ہے۔ دو کش لگائے، دھواں چھوڑا اور ایک آدھ شعر لکھ دیا، اور کام ہی کیا ہے۔ مسلمانوں کی کیا خدمت کی ہے اس نے؟''...[میں] تُند ہو گیا۔ اِتنے میں دادا جان آ گئے اور میں پٹنے سے بچ گیا۔[4]

---

[1] سیارہ ڈائجسٹ لاہور اپریل ۱۹۶۵ء میں سراج نظامی کا مضمون؛ شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۲۲۳

[2] ایضاً

[3] عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۱۷۹

[4] عبدالرشید طارق، 'مے شبانہ'، ص ۲۴۰-۲۳۹

''مزنگ کی کمبوہ برادری کی اکثریت ڈاکٹر صاحب [علامہ اقبال] کی حامی تھی،'' حفیظ کا بیان ہے، ''میں مزنگ میں ڈاکٹر صاحب کو 'زندہ باد' کرتا پھر رہا تھا کہ ارائیوں نے پکڑ لیا اور مرمّت فرمانا شروع کر دی۔ کمبوہوں کے افراد موقع پر پہنچ گئے اور مجھے چھُڑالیا۔''[1]

مزنگ میں علامہ کا جلسہ بھی ہوا۔ ملک محمد دین کی حمایت میں ایک قدِ آدم اشتہار شہر میں لگ چکا تھا۔ لال دین قیصر نے چاہا کہ علامہ کے جلسے میں بھی اتنا بڑا اشتہار لگے۔ حاجی دین محمد کاتب جلی کتابت کے لیے مشہور تھے۔ اُن سے کہا۔ جلسے والے دن حاجی صاحب جلسہ گاہ میں خاموشی سے بیٹھے تھے۔ قیصر نے کہا، ''حاجی صاحب! آپ یہاں بیٹھے ہیں۔ اگر اشتہار نہ چھپا تو ہم کہیں کے نہ رہیں گے۔'' حاجی صاحب نے مسکرا کر اشارہ کیا، ''قیصر صاحب! وہ رہا آپ کا اشتہار!'' تھوڑے سے وقت میں حاجی صاحب نے کتابت کرنے، چھپوانے اور دیوار پر لگوانے کے مراحل مکمل کر لیے تھے۔ روایت ہے کہ علامہ نے کہا، ''حاجی صاحب! آپ تو کاتب کن فیکون ہیں۔ اشتہار سے کہا 'کُن' اور وہ اُسی وقت 'فیکون' ہو گیا۔''[2]

کہتے ہیں کہ ایک جلسے میں مولانا علم الدین سالک تقریر کرتے کرتے رونے لگے اور کہا، ''یہ کتنے ظلم اور ستم کی بات ہے کہ علامہ اقبال کا مقابلہ کیا جا رہا ہے۔''[3]

۲۲ / اکتوبر کے زمیندار میں انجمن حسینیہ خواجگانِ نارووال کا علامہ کے حق میں فیصلہ شائع ہوا۔ انجمن کے آنریری سیکرٹری شیخ محمد وارث زبدۃ الحکما محلہ چھل بیبیاں لاہور تھے۔[4] اُسی صفحے پر شام آٹھ بجے علامہ کی تائید میں حویلی کابلی مل (ڈبی بازار) کے مسلمانوں کے جلسے کا اعلان تھا۔ ''لاہور کے مشہور اہلِ علم اور شعرا شریک ہوں گے۔''[5]

---

[1] پروفیسر محمد منور، میزانِ اقبال، ص ۱۷۲

[2] سیارہ ڈائجسٹ، اگست ۱۹۶۲ء، ص ۵۹–۵۸؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۲۰–۱۹

[3] محمد شفیع فاروقی کی روایت؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۱۹–۱۸

[4] محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۴۱–۴۰

[5] محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۴۰

۲۳/ اکتوبر کو شام سات بجے باغ بیرون دہلی دروازہ میں مجلس خلافت پنجاب کے دفتر کے سامنے جلسہ ہوا۔ میاں معراج الدین نے صدارت کی۔ مجلس خلافت [خلافت کمیٹی] کے پنجاب الیکشن بورڈ کے کنوینر خواجہ عبدالرحمٰن غازی نے کہا، ''مغربی ممالک تک میں نہایت قابلِ نفرت طریقوں سے انتخابات عمل میں آیا کرتے ہیں اور اُن کی تقلید میں لاہور میں بھی سات آٹھ سو روپے کے عوض بعض اخبارات انتخابات کے معاملے میں امداد کے وعدے کرتے ہیں،'' مگر زمیندار نے محض اصول کی خاطر مجلس خلافت کے نمایندوں کی تائید کی۔ مولانا مظہر علی اظہر نے کہا:

> قبل اِس کے کہ مسلمان حجاز کے بادشاہ کی صلاحیت وعدم صلاحیت کے متعلق اپنا فیصلہ دیں اُن کا فرض ہے کہ وہ اپنی کونسلوں کے نمائندے منتخب کرتے وقت صحتِ فیصلہ کا ثبوت دیں۔ نمایندے منتخب کرتے وقت برادری یا دوستی کو نہیں بلکہ امیدوار کی خدمات کو معیار بنانا چاہیے۔ اور اُس کے ماضی، حال اور مستقبل کا امتحان کرنا چاہیے۔ شیخ محمد اقبال انفرادی طور پر بھی کونسل کی اُمیدواری کے لیے کھڑے ہو سکتے تھے اور دوسرے اُمیدواروں کی نسبت ان کو زیادہ اثر ورسوخ حاصل تھا لیکن ازبسکہ وہ اَسرارِ اجتماع کے معلم ہیں، اُنہوں نے اپنے آپ کو رشتۂ جماعت میں پرو کر اور پنجاب الیکشن بورڈ کی امداد قبول فرما کر مسلمانوں کے سامنے اپنی تعلیم کا عملی نمونہ پیش کیا ہے۔

جمعیۃ العلمأ کے ناظم مولانا محمد سعید نے کہا، ''جو صاحب کونسل کی رُکنیت کے لیے کھڑے ہوتے وقت جلی حروف کے اشتہاروں میں اپنے حنفی ہونے کا اعلان کرتے ہیں اُن سے یہ پوچھنا چاہیے کہ مزارات کی سیاحت اور حنفیت کونسل کی رکنیّت میں توجب موید ہوں گے کہ حکومتِ پنجاب حنفیوں کے گلے پر چھُری چلانے کا ارادہ رکھتی ہو یا وہ یہ قانون پاس کرنے کا ارادہ رکھے کہ جو شخص آمین بالجہر نہ کرے گا یا رفع یدین نہ کرے گا اُسے قیدِ بامشقت کی سزا دی جائے گی۔'' مولانا سید عطأاللہ شاہ بخاری اور مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی نے بھی علامہ کی تائید میں ''پرزور کلمات کہے۔''[1]

---

[1] محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص۵۷-۵۵

۲۴ر اکتوبر کے زمیندار میں ظفر علی خاں نے علامہ کی حمایت میں طویل اداریہ لکھا—علامہ اقبال اور ملک محمد دین کا مقابلہ، قابلیتوں کا تفاوت، ملک محمد دین اور حربِ عقائد، اہلیت کا سوال، اراعیوں کی برادری پر اعتماد، برادرانِ وطن [ہندوؤں] کی اولوالعزمی، اہلِ لاہور سے استدعا۔

اداریہ

[از مولانا ظفر علی خاں؛ اقتباس]

مسلمانوں میں قابل رہنماؤں اور مخلص قومی خادموں کے فقدان پر ماتم کرنا بھی آج کل فیشن میں داخل ہو چکا ہے۔ جہاں چار آدمی مل کر بیٹھتے ہیں یہی رونا رویا جاتا ہے کہ صاحب کیا کریں مسلمانوں میں لائق آدمیوں کا قحط ہے اور مخلص کارکن نہیں ملتے۔ اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں کی یہ شکایت بہت بڑی حد تک بجا ہے لیکن مصیبت تو یہ ہے کہ جب کبھی ایسے قابل بلند پایہ اور مخلص بزرگ میدانِ عمل میں آتے ہیں تو مسلمان اس وقت بھی تغافل سے کام لیتے ہیں اور ان بزرگوں کی بلندئ مرتبت کے مقتضیات کا کوئی خیال نہیں کرتے۔ علامہ اقبال ہی کے معاملے پر نظر ڈالیے... کیا یہ مسلمانوں کی انتہائی بدبختی اور نامرادی کی دلیل نہیں کہ انہوں نے ایسی محترم شخصیت کو بھی پنجاب کونسل کی ممبری جیسے حقیر منصب کے لیے بلا مقابلہ منتخب نہ ہونے دیا؟ جب مسلمانوں کی بے حسی اور بے غیرتی کی حالت یہ ہے تو پھر اُن کی یہ شکایت کہاں تک حق بجانب قرار دی جا سکتی ہے کہ مخلص خادمانِ قوم نہیں ملتے اور حقیقی رہنماؤں کا قحط پڑ رہا ہے...

علامہ اقبال کے مقابلے میں لاہور کے ایک غیر معروف بیرسٹر ملک محمد دین صاحب کھڑے ہوئے ہیں جن کے نام سے بھی عامتہ المسلمین اب تک ناواقف تھے ... اور مسلمان اِس قدر کمزور ہیں کہ اُس کو سمجھا بجھا کر یا اُس پر رائے عامہ کا اثر ڈال کر اُسے دستبرداری پر مجبور نہیں کر سکتے... ملک محمد دین کون ہیں۔ آپ نے قوم کا کیا کام کیا ہے؟...

ملک محمد دین نے اپنے انتخاب کے سلسلے میں جو اعلان شائع کیا ہے اُس میں جابجا اِس امر پر زور دیا ہے کہ میں اہلِ سنت والجماعت میں سے ہوں۔ میں نے بزرگوں کے مزاروں کی زیارت کی ہے اور

میں صرف اہلِ سنت کے ووٹ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ ہم یہ سوال کرنا چاہتے ہیں کہ کیا کونسل کی ممبری کے لیے آیندہ اہلِ سنت اور غیر اہل سنت کا معیار معتبر سمجھا جائے گا۔ اور تمام خدمتوں کو بالائے طاق رکھ کر کونسل کی ممبری کو بھی حربِ عقائد کا ذریعہ بنالیا جائے گا... ہمیں اچھی طرح معلوم ہے کہ ملک محمد دین کو اراعیوں کی برادری کے ووٹوں پر زیادہ تر اعتماد ہے... لیکن ہم اُن کو بتانا چاہتے ہیں کہ اراعی برادری کے تعلیم یافتہ اور روشن خیال افراد بھی اس قدر کور سواد اور عقل کے اندھے نہیں ہیں کہ علامہ اقبال اور ملک محمد دین میں تمیز نہ کر سکیں۔

یہ حالت تو ملک محمد دین کی ہے اور علامہ اقبال بارہا لاہور کے جلسوں میں بآواز بلند فرما چکے ہیں کہ جو شخص مجھے کشمیری ہونے کی وجہ سے ووٹ دینا چاہتا ہے وہ مجھے ایسے ووٹ سے معاف رکھے میں صرف اسلام کے نام پر اپیل کرتا ہوں اور مجھے صرف مسلمانوں کے ووٹ کی ضرورت ہے۔

ہم نہایت درد مندی کے ساتھ مسلمانانِ لاہور کی خدمت میں یہ گزارش کرتے ہیں کہ وہ عقل و ہوش سے کام لیں۔ اگر انہیں خود اپنا نفع نقصان سوچنے اور تقاضائے ملی کو سمجھنے کی توفیق نہیں ہے تو برادرانِ وطن [ہندوؤں] کی حالت سے عبرت اندوز ہوں۔ ایک لالہ لاجپت رائے جس حلقے سے چاہتا ہے ایک شخص کو نامزد کر کے بلا مقابلہ منتخب کرا دیتا ہے اور کسی دوسرے کو اس کے مقابلے میں کھڑے ہونے کی جرأت نہیں ہوتی۔ ہندوؤں نے شدید باہمی مخالفت کے باوجود پنڈت موتی لال نہرو اور پنڈت مالوی کو بلا مقابلہ منتخب کرانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ جس حلقے سے پنڈت مالوی کھڑے ہو رہے ہیں اُس میں لاکھوں کانگرسی موجود ہیں اور جس حلقے سے پنڈت موتی لال نہرو اُمیدوار ہیں اُس میں لاکھوں سنگھٹنی موجود ہیں لیکن قومی اتحاد کی یہ حالت ہے کہ ان اکابرِ مملکت کے مقابلے میں کوئی شخص کھڑا نہیں ہو سکتا۔ اور مسلمان ہیں جو علامہ اقبال کی جلیل القدر اور عظیم الشان شخصیت کے ساتھ عقیدت کا یہ منظر بھی پیش نہیں کر سکتے۔ حالانکہ مسلمانوں میں علامہ اقبال کا درجہ اتنا بلند ہے کہ ہندوؤں میں ہزار مالوی اور ہزار لاجپت رائے بھی اس کی برابری نہیں کر سکتے...

اے مسلمانانِ لاہور! اِس وقت تمہاری عزتِ نفس خطرے میں ہے... وفود مرتب کر کے ملک محمد دین کے پاس جاؤ اور ان کو کہہ دو کہ اُن کے ارادۂ اُمیدواری سے عامۃ المسلمین کو تکلیف پہنچی

ہے۔ وہ مسلمانوں پر احسان کریں اور دستبردار ہو جائیں۔

زمیندار (لاہور)، ۲۴/ اکتوبر ۱۹۲۶ء[1]

69

شیخ عبدالقادر مجلسِ اقوام کے ہندوستانی نمایندے کی حیثیت میں جنیوا بھیجے گئے تھے۔ ۲۵/ اکتوبر کو صبح سوا سات بجے بمبئی میل سے واپس لاہور پہنچے۔ "ہر قوم اور ہر طبقے کے معزز نمائندے اسٹیشن پر موجود تھے،" زمیندار کے نامہ نگار نے لکھا، "قابلِ ذکر اصحاب حسب ذیل ہیں: علامہ ڈاکٹر سر اقبال، علامہ عبداللہ یوسف علی پرنسپل اسلامیہ کالج، خان بہادر شیخ نورالٰہی آئی ای ایس، ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین بارایٹ لا، مرزا محمد سعید آئی ای ایس، مولوی غلام محی الدین وکیل، خاں صاحب شیخ عبدالعزیز بی اے، سردار اودھے سنگھ شائق وکیل فیروزپور، خواجہ دل محمد صاحب، مولانا توحید، ڈاکٹر محمود، پروفیسر دیوی دیال ایم اے۔"[2]

اکتوبر میں علامہ کے ملاقاتیوں میں ایک نوجوان کا اضافہ ہوا۔ نام حمید احمد خاں تھا۔ بی اے کی سند حیدر آباد دکن کی جامعۂ عثمانیہ سے لی تھی۔ ایم اے کے لیے لاہور کے گورنمنٹ کالج میں داخل ہونا چاہتے تھے۔ یہ پنجاب یونیورسٹی کے ماتحت تھا۔ وہ عثمانیہ یونیورسٹی کی ڈگریوں کو تسلیم نہیں کرتی تھی۔ حمید سر اکبر حیدری سے سفارش کے دو خط لائے تھے، سر محمد شفیع اور عبداللہ یوسف علی پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور کے نام۔ پھر علامہ کے پاس پہنچ گئے۔ "انہوں نے مجھے سمجھایا کہ جو طریق تم نے اختیار کیا ہے، وہ غلط ہے،" حمید کا بیان ہے، "میں نے اپنے حق میں بہت سی تاویلیں پیش کیں اور اصرار کیا کہ گورنمنٹ کالج کے کسی پروفیسر کے نام مجھے تعارف کا ایک خط دے دیجیے۔ یہ درخواست انہوں نے فوراً منظور فرمالی اور میرے رخصت ہونے سے پہلے اپنے ہاتھ سے مختصر سی چٹھی پروفیسر مرزا محمد سعید کے نام مجھے لکھ دی۔" مرزا چوبیس پچیس برس پہلے گورنمنٹ کالج میں علامہ کے شاگرد

---

[1] محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۴۶-۴۱

[2] زمیندار ۲۶/ اکتوبر ۱۹۲۶ء؛ اختر النسا (۲۰۱۰)، ص ۲۶۵

رہ چکے تھے۔ گورنمنٹ کالج میں پروفیسر تھے۔ مذہب اور باطنی تعلیم کے مصنف تھے۔

This is to introduce M. Hamid Ahmad Khan, B.A. of Osmania University. I hope you will do all that you can do for him.[1]

۶/نومبر کو انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کا اجلاس ہوا۔ انجمن کے نائب صدر خان بہادر شیخ انعام علی صدارت کر رہے تھے۔ علامہ کو کالج کمیٹی کا رُکن بنایا گیا۔[2]

70

پنجاب کے مسلمانو![3]

اگر اسلامی حقوق کی حفاظت چاہتے ہو تو اِن حضرات کے حق میں ووٹ دو۔

نام حلقہ	نام بہترین امیدوار	نام حلقہ	نام بہترین اُمیدوار
مغربی پنجاب قصباتی حلقہ	ڈاکٹر محمد عالم	ضلع ڈیرہ غازی خاں	سردار محمد اعظم جان مزاری
شہر لاہور چھاؤنی لاہور	ڈاکٹر محمد اقبال	ضلع امرتسر دیہاتی	میاں محمد شریف ٹھیکیدار
لدھیانہ ہوشیار پور دیہاتی	چودھری افضل حق	تحصیل پھالیہ ضلع گجرات	ملک لال خاں
مشرقی و مغربی قصباتی	مولوی مظہر علی اظہر	ضلع جہلم دیہاتی	میاں سراج الدین پراچہ
جنوبی و مشرقی قصباتی	رانا فیروز الدین	ضلع راولپنڈی دیہاتی	میاں محمد شریف وکیل
شہر امرتسر چھاؤنی امرتسر	شیخ محمد صادق		

زمیندار (لاہور)

۱۳، ۱۴، ۱۷، ۱۹، ۲۰، ۲۱/نومبر ۱۹۲۶ء

۱۶/نومبر کو الراعی برادری کی طرف سے علامہ کی حمایت میں جلسہ ہوا۔ باغ بیرون لوہاری دروازہ میں تھا۔ وارڈ نمبر ۴ کے میونسپل کمشنر سید افضال علی رجسٹرار نے ووٹروں کو نصیحت کی:

[1] حمید احمد خاں، اقبال کی شخصیت اور شاعری: ص ۲۸-۳۱

[2] انجمن کی قلمی روداد؛ محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶)، اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص ۱۷۹

[3] محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۴۶

۱ ہر ووٹر کو سمجھنا چاہیے کہ علامہ اقبال فقط اُسی کی پرچی سے کامیاب ہوں گے۔

۲ علامہ اقبال کا کوئی حامی خلافِ قانون حرکت نہ کرے۔ علامہ اقبال اِس کے سخت مخالف ہیں لٰہذا مُردہ اور غیر حاضر اشخاص کی پرچیاں پولنگ آفیسر سے کہہ کر کٹوا ڈالی جائیں۔[1]

روایت ہے کہ الراعی برادری کی طرف سے علامہ کو سفید ململ کی بڑی سی پگڑی پہنائی گئی۔ ''سردار چچی اور میں صحن میں بیٹھے تھے کہ چچا جان [اقبال] خاموشی سے ہمارے پیچھے آ کھڑے ہوئے،'' وسیمہ کا بیان ہے، ''چچی جان کی نظر اچانک پیچھے پڑی تو چچا جان کے سر پر سفید ململ کی بڑی سی پگڑی دیکھ کر ڈر گئیں۔ چچا جان ہنس پڑے اور فرمایا، 'او ہو ڈر گئیں!' چچی جان نے جواب دیا، 'اِس پگڑی نے ڈرا دیا۔ میں سمجھی خدا جانے کون پگڑی والا اندر آ گیا ہے۔ یہ آپ کو کہاں سے ملی؟'''[2]

۱۸ر نومبر کی رات اندرون شہر میں کڑہ ولی شاہ میں جلسہ ہوا۔ بازار دُور تک آراستہ تھا۔ کم از کم آٹھ ہزار لوگ جمع تھے۔ ساڑھے آٹھ بجے علامہ جلسہ گاہ میں آئے۔ انہیں پھولوں کے ہار پہنائے گئے۔ اللہ اکبر کے نعرے گونجے۔ اسلامیہ کالج کے پرنسپل ڈاکٹر نذیر احمد صدارت کر رہے تھے۔ شیخ عظیم اللہ نے تقریر میں کہا، ''کاغذاتِ نمائندگی کی پڑتال کے وقت ملک محمد دین کی طرف سے وہ وکیل پیش ہوا جو رنگیلا رسول کے مقدمے کی پیروی کر رہا ہے۔ ملک صاحب کے حامی اخبار سیاست کے مالک سید حبیب... رنگیلا رسول کے مقدمے میں بطور گواہ پیش ہوئے تو اُنہوں نے کہا کہ مجھے اِس کتاب کے پڑھنے سے بہ حیثیت مسلمان کے کوئی رنج نہیں ہوا البتہ بہ حیثیت ہندوستانی دُکھ ضرور ہوا ہے کیونکہ اِس سے دو قوموں میں افتراق پیدا ہوا ہے۔ نیز سید حبیب نے اپنی قومیت 'انڈین' لکھوائی۔'' یہ کہتے ہوئے عظیم اللہ بیتاب ہو گئے۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ حاضرین نے حبیب اللہ کے فعل پر نفرت کا اظہار کیا۔ شیخ غلام مصطفیٰ آسؔ نے کہا، ''سید حبیب کے بیان کی مصدقہ نقل ہمارے پاس موجود ہے۔ جس شخص کا جی چاہے دفترِ انتخاب میں آ کر دیکھ لے۔''

---

[1] محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۵۸-۵۷

[2] خالد نظیر صوفی، اقبال درونِ خانہ، ص ۴۴۔ مصنف نے اپنی والدہ وسیمہ مبارک سے روایت کیا ہے۔

خاور کے مدیر شمس الدین حسن، خواجہ فیروزالدین بیرسٹر ایٹ لاءاور مولانا محمد بخش مسلم نے بھی تقریریں کیں۔ ملک لال دین قیصر نے "ایک بیحد پر لطف پنجابی نظم" پڑھی۔ حاضرین سے زبردست داد پائی۔ آسؔ اور ثمرؔ نے بھی نظمیں پڑھیں۔ "لوگ جلسے کے بدستور جاری رکھنے پر مصر تھے،" زمیندار کا بیان ہے، "لیکن جب یہ بتایا گیا کہ صبح جلوس نکلے گا اس لیے جلسہ جلد ختم کر دینا چاہیے تو وہ خاموش ہو گئے۔"[1] علامہ نے کہا:

> مسلمانوں کی زندگی کا راز اِتحاد میں مضمر ہے۔ میں نے برسوں مطالعہ کیا، راتیں غور و فکر میں گذار دیں تاکہ وہ حقیقت معلوم کروں جس پر کاربند ہو کر عرب حضور سرور کائناتؐ کی صحبت میں تیس سال کے اندر اندر دنیا کے امام بن گئے۔ وہ حقیقت اتحاد و اتفاق میں ہے جو ہر شخص کے لبوں پر ہر وقت جاری رہتی ہے، کاش ہر مسلمان کے دل میں بیٹھ جائے۔ نسلی اور اعتقادی اختلافات میں تنگ نظری اور تعصب نے مسلمانوں کو تباہ کر دیا۔ اختلاف رائے ایک طبعی امر ہے اس لیے کہ طبائع مختلف ہوتی ہیں۔ ہر شخص کی نظر مختلف ہے، اسلوبِ فکر مختلف ہوتی ہے لیکن اس اختلاف کو اس طریقے پر رکھنا چاہیے جس طرح کہ ہمارے آباو اجداد نے اسے رکھا۔ اس صورت میں اختلاف رحمت ہے۔ جب لوگوں میں تنگ نظری آجاتی ہے تو یہ زحمت بن جاتا ہے۔ مسلمانو! میں تمہیں کہتا ہوں کہ اگر زندہ رہنا چاہتے ہو تو متحد ہو جاؤ۔ اختلاف بھی کرو تو اپنے آبا کی طرح۔ تنگ نظری چھوڑ دو۔ میں کہتا ہوں کہ تنگ نظری چھوڑنے سے سب اختلافات مٹ سکتے ہیں۔
>
> مسلمانان ہند کے لیے دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ وہ ہندوستان کی سیاسیات کے ساتھ گہری دل بستگی پیدا کریں۔ جو لوگ خود اخبار نہ پڑھ سکتے ہوں وہ دوسروں سے سنیں۔ اس وقت جو قوتیں دنیا میں کارفرما ہیں ان میں سے اکثر اسلام کے خلاف

---

[1] زمیندار ۱۲/ نومبر ۱۹۲۶ء؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل

کام کر رہی ہیں۔ لیکن 'لیظہرہ علی الدین کلہ' کے دعویٰ پر میرا ایمان ہے کہ انجام کار اسلام کی قوتیں کامیاب اور فائز ہوں گی: لاتہنوا ولاتحزنوا وانتم الاعلمون ان کنتم مومنین۔

میں کہتا ہوں کہ مخالف کو بھی نرمی سے سمجھاؤ، جا ولھم بالتی ھی احسن۔ قلب کی فطرت ہی ایسی ہے کہ وہ محبت سے رام ہو سکتا ہے۔ مخالفت اور عداوت سے رام نہیں ہو سکتا۔[1]

۱۹ر نومبر کے زمیندار میں جناب "م۔ا۔ح" کی طرف سے استفسارات شائع ہوئے۔ ملک محمد دین سے مقاماتِ مقدسہ کی زیارت کے بارے میں پوچھا تھا:

الف۔... حصولِ برکات کے اِس شوق اور سفر کی استطاعت کے باوجود آپ نے بیت اللہ شریف کا حج کیوں نہیں کیا؟ اور اُس روزۂ مطہرہ کی زیارت سے کیوں محروم رہے جس کے لیے ہر سچے مسلمان کا دل پارے کی طرح بیقرار رہتا ہے...؟

ب۔... آیا آپ کا یہ سفر مصطفیٰ صغیر اور عنایت اللہ مشرقی کے ممالکِ اسلامی کے سفر کی طرح یا اُن لوگوں کے سفر کی طرح نہ تھا جن کو دورانِ جنگِ عظیم میں ترکوں کے سینوں کو گولیوں سے چھلنی کرتے ہوئے عراق اور شام کے مقدس مقامات دیکھنے کا اتفاقاً شرف حاصل ہو گیا تھا۔

ج۔ سنا جاتا ہے کہ علامہ اقبال کے مقابلے میں کھڑے ہونے کے لیے آپ کو کسی خاص جماعت کی طرف سے زبردست شہ دی گئی ہے تاکہ یہ جلیل القدر شخصیت بلا مقابلہ منتخب نہ ہونے پائے۔ اُس جماعت کی طرف سے آپ کو یہ لالچ بھی دیا گیا ہے کہ اِس خدمت کے معاوضے میں آپ کو کوئی بہت بڑا عہدہ دلانے کی کوشش کی جائے گی۔ زبانِ خلق کی اِس افواہِ عام میں کس حد تک صداقت ہے...؟

س۔ آپ نے اپنے اعلانِ اُمیدواری میں بڑے فخر کے ساتھ اُن دردناک مصائب کا تذکرہ کیا ہے

---

[1] زمیندار ۲۱ر نومبر ۱۹۲۶ء؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۱۹-۱۸

جو آپ کو ناحق جیل میں برداشت کرنے پڑے اور... اپیل کرنے پر وائسرائے نے آپ کو بے گناہ قرار دیا۔ اور مبلغ پچاس ہزار روپیہ ہرجانہ دلایا۔ کیا آپ پبلک کو بتائیں گے کہ وہ الزامات کیا تھے جن کی بنا پر آپ کو جیل میں ڈالا گیا تھا اور وائسرائے نے کن اُمور سے متاثر ہو کر آپ کو پچاس ہزار روپیہ دلایا؟

ف۔ علامہ اقبال اہل سنت والجماعت بھی ہیں۔ حنفی بھی ہیں۔ اولیائے کرام کے ماننے والے بھی ہیں۔ انگریزی، فارسی، عربی، اُردو وغیرہ زبانوں میں آپ سے زیادہ مہارت بھی رکھتے ہیں۔ علومِ دینی اور دنیوی کے بھی مسلمہ عالم ہیں۔ مسلمانوں کے ہمدرد اور خیر خواہ بھی ہیں۔ قومی خدمت بھی انجام دیتے رہتے ہیں اور آپ نے اپنے جن اوصافِ گرامی کا اعلانِ اُمیدواری میں تذکرہ کیا ہے وہ سب اُن کی ذات میں بدرجۂ اُتم موجود ہیں۔ پھر آپ کی وہ کون سی خصوصیت ہے جس کی بنا پر آپ علامہ اقبال کے مقابلہ میں کھڑے ہوئے ہیں اور لاہور کے مسلمانوں سے اُمید رکھتے ہیں کہ وہ علامہ اقبال کے مقابلے میں آپ کے حق میں ووٹ دیں؟

۱۹ر نومبر کو صبح آٹھ بجے باغ بیرون موچی دروازہ میں مسلمانوں کا بہت بڑا ہجوم جمع ہونے لگا۔ پہلے سے اعلان ہوا تھا۔ مختلف محلوں کے رضاکاروں کے دستے علامہ کے اشعار گاتے ہوئے چلے آ رہے تھے: ”یوں تو مرزا بھی ہو...“ نو بجے تک پچیس تیس ہزار لوگ ہو گئے۔ جلوس روانہ ہوا۔ سبھی پیدل چل رہے تھے۔ ”مختلف وارڈوں کے رضاکاروں کی ٹولیاں انتخابی اعلانات کی جھنڈیاں بلند کیے اقبال کی تعریف میں اشعار پڑھتے ہوئے آگے آگے روانہ ہوئیں،“ زمیندار کا کہنا ہے۔ سراج نظامی کا بیان ہے کہ قیصر کی ”جیبی پور“ والی نظم کے مصرعے پڑھے جا رہے تھے۔ زمیندار کے مطابق:

> ہر ٹولی کا نشانِ امتیازی جداگانہ تھا۔ کسی جماعت کے سر پر کاسنی رنگ کی پگڑیاں تھیں کہیں ملگجی رنگ کی پگڑیاں نظر آتی تھیں۔ کہیں سرخ ٹوپیوں والے نوجوان تھے جن کی ترکی ٹوپیوں پر ”اقبال“ کا درخشندہ لفظ کھریا مٹی سے لکھا ہوا نظر آ رہا تھا۔ جھنڈیوں کے اعلانات جابجا ہجوم کے سروں کے اوپر لوگوں کو ۲۳ر نومبر کی تاریخ اور علامہ اقبال کی تائید یاد دلا رہے تھے اور رضاکار پنجابی اور اُردو کے اشعار گاتے اور جابجا

ٹھہرتے ہوئے چلے جا رہے تھے۔ ان ٹولیوں کے پیچھے معززین شہر کی جماعت تھی جس میں نواب، رؤسا، میونسپل کمشنر، پروفیسر اور دیگر اہلِ علم و فضل شامل تھے۔ اِس جماعت نے علامہ اقبال کو گھیرے میں لیا ہوا تھا اور سب لوگ خراماں خراماں جا رہے تھے۔ عامۃ المسلمین نے مختلف طریقوں سے اِس جلوس کے خیر مقدم کا اظہار کیا۔ علامہ موصوف، جلوس کے ہمراہ چند قدم چلنے نہ پائے تھے کہ پھولوں کے ہاروں سے لاد دیے گئے جن میں اکثر ہاروں میں چاندی کی تاریں، پہنانے والوں کی عقیدت کا ثبوت دے رہی تھیں۔ راستے میں ہر طرف سے پھولوں کی بارش ہو رہی تھی اور جلوس کا راستہ پھولوں کی پتیوں سے اِس طرح پٹا پڑا تھا کہ گویا جلوس پھولوں کے فرش پر جا رہا ہے... جلوس کوئی میل بھر پر پھیلا ہوا تھا جو لاہور کے بازاروں میں اُسی چہل پہل اور رونق کی یاد تازہ کرتا ہوا جو کسی زمانے میں تحریکِ خلافت کے دوران میں نظر آیا کرتی تھی، چوک وزیر خاں اور ڈبی بازار میں سے ہوتا ہوا بعد دوپہر شاہی مسجد میں پہنچا۔ شاہی مسجد میں مسلمانوں نے فریضۂ جمعہ ادا کیا اور مسجد میں عیدین کا مختصر سا نظارہ نظر آ گیا۔

نمازِ جمعہ سے فارغ ہونے کے بعد پھر جلوس مرتب کیا گیا اور پہلی شان و شوکت کے ساتھ بازارِ حکیماں میں سے ہوتا ہوا بھاٹی دروازہ پہنچا۔ باغ بیرون بھاٹی دروازہ میں جلوس نے قیام کیا جہاں پر علامہ موصوف نے مختصر سی تقریر فرمائی اور مسلمانوں کو اتحاد کا پیغام دیا۔ وہاں سے جلوس مرتب ہو کر موری دروازہ میں داخل ہوا اور چوک جھنڈا خاں میں سے ہوتا ہوا لوہاری دروازہ کے باہر آکر ختم ہو گیا۔[1]

رات پھر جلسہ ہوا۔ محلہ عقب مسجد وزیر خان میں تھا۔ آٹھ ہزار لوگ جمع تھے۔ مکانوں کی چھتوں اور

---

[1] زمیندار ۲۱ر نومبر ۱۹۲۶ء؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۵۹-۵۸، ۴۵-۴۳-۴۴۔ سراج نظامی کا بیان سیارہ ڈائجسٹ لاہور اپریل ۱۹۶۵ء؛ (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۲۲۳۔

گلیوں میں تل دھرنے کی جگہ نہ رہی۔

۲۰ نومبر کی رات مرحوم خانصاحب شیر محمد کے مکان پر اجلاس ہوا۔ حرفت پیشہ لوگوں کا اجلاس تھا۔ غازی عصمت اللہ نے صدارت کی۔ متفقہ طور پر قرار پایا کہ برادری کے تمام ووٹر علامہ کو ووٹ دیں۔ انتخاب کے دن خود چھٹی کا انتظام کریں خواہ کہیں کام کر رہے ہوں۔ علامہ کے کارکنوں کو ووٹروں کو مراکزِ انتخاب پر لے جانے کی زحمت برداشت نہ کرنی پڑے۔[1]

71

۲۳ نومبر کو لندن میں امپیریل کانفرنس اختتام کو پہنچی۔ ۱۹ اکتوبر کو شروع ہوئی تھی۔ سلطنتِ برطانیہ کے مستعمرات (Dominions) کے نمایندوں نے حصہ لیا تھا۔ برطانیہ کے سابق وزیر اعظم بالفور کی صدارت میں ایک کمیٹی نے فیصلہ کیا تھا کہ مستعمرات اپنے معاملات میں آزاد ہیں۔ اقوام دولتِ مشترکۂ برطانیہ (British Commonwealth of Nations) میں برابر کے شریک ہیں:

They are autonomous Communities within the British Empire, equal in status, in no way subordinate one to another in any aspect of their domestic or external affairs, though united by a common allegiance to the Crown, and freely associated as members of the British Commonwealth of Nations.[2]

72

حق کے اظہار میں ڈرنا نہیں مجھ کو آتا   مجھ سے ناراض رضائی بھی ہیں، مرزائی بھی

قافیہ تنگ حریفوں کا اگر کرنا ہو   سیکھ لو آکے مری قافیہ پیمائی بھی

آمد اکبرؔ کی تمام ان میرے اشعار میں ہے   ساتھ اقبالؔ کی ہے زمزمہ پیرائی بھی

ظفر علی خاں، زمیندار ۲۳ نومبر ۱۹۲۷ء[3]

---

[1] زمیندار ۲۱ نومبر؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۵۹

[2] Imperial Conference, *Summary of proceedings,* pp.3, 8

[3] اختر النسا (۲۰۱۰)، ص ۱۴۶

۲۳؍ نومبر کو لاہور میں شہر کے مسلم قصباتی حلقے کا انتخاب تھا۔ اگلے روز چھاؤنی کے مسلم حلقے کا انتخاب ہونا تھا۔ اُس کے بعد ہندو قصباتی حلقوں کے انتخابات الگ ہونے تھے۔ صبح سے پولنگ اسٹیشنوں پر ووٹر اور کارکن جمع ہونے لگے۔ عتیقی کا بیان ہے کہ موٹروں اور تانگوں کا بندوبست نہ کیا گیا تھا۔ تب بھی ''ایک ولولہ تھا جو لوگوں کو پولنگ اسٹیشن تک پہنچا رہا تھا۔''[1] لاہور کے حلقۂ انتخاب میں چونسٹھ پولنگ اسٹیشن تھے۔[2] علامہ کی کوٹھی کے قریب نیو ایرا تھیٹر (New Era Theatre) تھا۔ چغتائی کے مطابق تھیٹر کے باہر میدان میں پولنگ اسٹیشن بنا۔ چغتائی وہیں متعین تھے۔[3]

نو بجے پولنگ شروع ہوئی۔ چغتائی کہتے ہیں کہ علامہ نیو ایرا تھیٹر والے پولنگ اسٹیشن میں آئے۔ سب سے پہلے اپنا ووٹ ڈالا۔ ان کے بعد یوسف علی، شیخ اصغر علی اور دوسرے احباب نے ووٹ ڈالے۔[4] واٹر ورکس، ٹاؤن ہال، انارکلی، موچی دروازہ اور ٹکسالی دروازہ پر علامہ کے حامی زیادہ تھے۔ ''علامہ اقبال کو یاد رکھنا'' کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔[5] عتیقی کا بیان ہے، ''رائے دہندگان نے آزادیٔ ضمیر اور قوم کے اعلیٰ تقاضوں کے پیشِ نظر برادری کی قیود سے یکسر آزاد ہو کر ووٹ دیئے۔''[6] سراج نظامی کہتے ہیں کہ علامہ ٹکسالی دروازے کے پولنگ اسٹیشن پر آئے۔ وارڈ کے میونسپل کمشنر میاں گھسیٹا، سراج کو بازو سے پکڑ کر علامہ کے پاس لے گئے اور بتایا کہ وہ نوجوان ہے جس کا ذکر پہلے

---

[1] حکیم عبدالمجید صدیقی کا مضمون 'کچھ پھول کچھ کانٹے'، ہفت روزہ شہاب لاہور ۸؍ مارچ ۱۹۶۴ء منقولہ شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۲۷۳

[2] وحیدالدین (۱۹۸۸)، ص ۱۰۳؛ ماخذ ہے *Civil and Military Gazzette, Nov 30-Dec 8, 1926*

[3] عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۱۸۰

[4] عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۱۸۰

[5] یہ معلومات مختلف ماخذوں سے جمع کی گئی ہیں، بالخصوص محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل

[6] حکیم عبدالمجید صدیقی کا مضمون 'کچھ پھول کچھ کانٹے'، ہفت روزہ شہاب لاہور ۸؍ مارچ ۱۹۶۴ء؛ شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۲۷۲۔ اس طرح انتخابِ لاہور کا یہ معرکہ ۴۶-۱۹۴۵ کے انتخابات کا پیش خیمہ تھا جب پورے ہندوستان میں مسلمانوں نے ''قوم کے اعلیٰ تقاضوں کے پیشِ نظر'' ووٹ ڈالے۔

ہی علامہ سے کر چکے تھے۔ علامہ نے سراج کو سینے سے لگایا۔[1]

یکی دروازہ، اکبری دروازہ اور قلعہ گوجر سنگھ کے پولنگ اسٹیشنوں پر ملک محمد دین کے حامی زیادہ تھے۔ اکثر غیر تعلیم یافتہ تھے۔ "پچانوے فیصدی تعلیم یافتہ اشخاص نے علامہ اقبال کے حق میں رائے دی،" زمیندار نے بعد میں لکھا، "چنانچہ ملک محمد دین کے حامی اکثر لنگی پوش تھے اور شلوار پہننے والے بہت کم اُن کے حامی نکلے۔" اکبری دروازے کے پولنگ اسٹیشن پر معمولی چپقلش ہوئی۔ موچی دروازے کے پولنگ اسٹیشن پر چاقو چل گیا۔ "وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ بے عنوانی اور زیادتی کس فریق کے حامیوں کی تھی،" زمیندار نے بعد میں لکھا، "بعض لوگ کہتے ہیں کہ جس نے چاقو مارا وہ ملک محمد دین کا حامی تھا اور بعض کا خیال ہے کہ علامہ اقبال کا طرفدار تھا۔" نیو ایرا تھیٹر والے پولنگ اسٹیشن پر اِسلامیہ کالج کی جے اے وی کلاس کے تمام طلبہ چغتائی کی مدد کر رہے تھے۔ "ان طلبہ میں سے ایک لڑکے بشیر کو پولیس نے حراست میں لے لیا تھا مگر علامہ کی ذاتی مداخلت سے اُسے چھوڑ دیا گیا،" چغتائی کا بیان ہے۔[2]

پہلے تین گھنٹوں میں ووٹ ڈالنے کی رفتار تیز تھی۔ آخری تین گھنٹوں میں سست پڑ گئی۔ بعض الرائی معززین نے علامہ کے حق میں نشان لگانے کے بعد پرچی ہجوم کو دکھا کر ڈالی۔ نہیں چاہتے تھے کہ اُن کے بارے میں یہ سمجھا جائے کہ محض ذات برادری کی وجہ سے ملک محمد دین کے حق میں ووٹ ڈال دیا۔ بعض مراکز پر ملک محمد دین کے حامیوں نے جعلی ووٹ ڈالنے کی کوشش کی۔ بہت سے جعلی ووٹ مسترد ہوئے۔ بارہ ہزار ووٹ تھے۔ ۶۸ فیصد ڈالے گئے۔[3] زمیندار کے اندازے کے مطابق:

- واٹر ورکس کے پولنگ اسٹیشن پر قریباً پندرہ سو ووٹ ڈالے گئے۔ ان میں سے بمشکل

[1] سیارہ ڈائجسٹ لاہور اپریل ۱۹۶۵ء میں سراج نظامی کا مضمون؛ شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۲۲۲؛ سراج نے لکھا ہے کہ میاں گھسیٹا نے کہا، "اقبال یہ ہے وہ نوجوان جس کا میں نے تم سے ذکر کیا تھا۔" یہ فقرہ تعجب خیز ہے۔ بہت کم دوست علامہ کو یوں مخاطب کر سکتے تھے۔ عام طور پر "ڈاکٹر صاحب" کہہ کر مخاطب کیا جاتا تھا۔

[2] عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۱۸۰

[3] وحید الدین (۱۹۸۸)، ص ۱۰۳؛ ماخذ ہے، *Civil and Military Gazzette, Nov 30-Dec 8, 1926*

دو ڈھائی سو ملک محمد دین کو ملے۔

- ٹاؤن ہال، لوہاری دروازہ، ٹکسالی دروازہ، قلعہ گوجر سنگھ اور موچی دروازہ کے پولنگ اسٹیشنوں پر ساٹھ فیصد سے زیادہ ووٹ علامہ کو ملے۔
- یکی دروازہ، اکبری دروازہ اور بھاٹی دروازہ میں علامہ اور ملک محمد دین کا زور برابر رہا۔
- اندازہ تھا کہ حلقے کے ووٹروں کی تعداد تیرہ ہزار سے اوپر ہے۔ ساٹھ ستر فیصد کے قریب ووٹ ڈالے گئے۔ پچھتر فیصد علامہ کے حق میں رہے ہوں گے۔

۲۴؍ نومبر کو لاہور چھاؤنی میں انتخاب ہوا۔ فہرست میں ایک سو چوبیس ووٹر تھے۔ ملک محمد دین کے ایک آدمی نے کسی اور کے نام سے ووٹ ڈالنا چاہا۔ گرفتار ہوا کیونکہ جس کے نام سے ووٹ ڈالنے کی کوشش کی تھی وہ علامہ کی طرف سے ووٹروں کی شناخت پر مامور تھا۔ ایک اور جعلی ووٹ ڈالنے والے کو دولت علی ٹمٹم والے نے شناخت کر لیا۔ ملزم گرفتار ہوا۔ دولت علی کی ٹمٹم غائب ہو گئی۔ مزید دو آدمی ملک صاحب کے حق میں جعلی ووٹ ڈالنے کے الزام میں گرفتار ہوئے۔ ان میں ملک صاحب کے چھوٹے بھائی نذیر احمد بھی تھے۔

چھاؤنی کے ۱۲۴؍ ووٹوں میں سے ۲۳؍ ملک محمد دین کے حق میں بر آمد ہوئے۔ ان میں سے بارہ جعلی تھے۔ علامہ کو ۱۲؍ ٹنڈر ووٹ مل گئے۔ ۸۳؍ ووٹ ہوئے۔ ہجوم نے علامہ کو گھیر لیا۔ جلوس بن گیا۔ پبلک کے اصرار پر علامہ ساتھ ہو گئے۔ جلوس ''اللہ اکبر'' اور ''زندہ باد ڈاکٹر اقبال'' کے نعرے لگاتا ہوا کشمیری بازار اور ڈبی بازار سے گزرا۔

ملک محمد دین کے بھائی نذیر احمد ضمانت پر رہا کر دیے گئے۔ دولت علی کی ٹمٹم ملک صاحب کے چار آدمیوں کے قبضے سے بر آمد ہو گئی۔ دو گرفتار ہوئے۔ دو بھاگ گئے۔ ''اِس معاملے کی تحقیقات کے لیے چودھری علی گوہر صاحب حوالدار پولیس تھانہ لاہور چھاؤنی متعین کیے گئے،'' زمیندار نے بعد میں لکھا۔ ''وہ بڑی سرگرمی کے ساتھ تفتیش میں مصروف تھے۔''[1]

---

[1] یہ معلومات مختلف ماخذوں سے جمع کی گئی ہیں، بالخصوص محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل

ہلاکو خاں کے ہاتھوں بغداد کی تباہی کے بعد مسلم معاشرہ دوبارہ سنبھلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ ایران کے شمال میں ایک شہر شبستر تھا۔ ۱۳۱۱ء میں وہاں ہرات سے ایک صوفی وارد ہوئے۔ اشعار کی صورت میں کچھ سوال شہر والوں کے سامنے پیش کیے:

۱ سوچ کیا چیز ہے؟

۲ کون سی سوچ ہمارے لیے ضروری ہے، اور کیوں یہ کبھی نیکی اور کبھی گناہ ہے؟

۳ ''میں'' کیا ہوں؟ اپنے آپ میں سفر کرنے کا مطلب کیا ہے؟

۴ وہ مسافر کون ہے جو راستے پر چل رہا ہے اور کس کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ وہ انسانِ کامل ہے؟

۵ کون ہے جو وحدت کے راز سے بالآخر واقف ہوا اور کیا بات اُسے معلوم ہوئی؟

۶ جسے پہچانا جارہا ہے اور جو پہچان رہی ہے وہ اگر خدا کی ذات ہی ہے تو پھر اِنسان کے دماغ میں کیا سودا سمایا ہے؟

۷ اَناالحق کس نکتے کا بیان ہے؟

۸ مخلوق کس طرح وحدت میں فنا ہوتی ہے، سفر اور حضر کیسے کرتی ہے؟

۹ جس کا ہونا محض امکان ہے اُس کا وصال اُس کے ساتھ کیسے جس کا وجود کسی کا محتاج نہیں، اور یہ نزدیکی، دُوری، کم اور زیادہ کا معاملہ کیا ہے؟

۱۰ کون سا سمندر ہے جس کا کنارہ گفتگو ہے اور اس کی گہرائی میں کون سا موتی ملتا ہے؟

۱۱ وہ حصہ کون سا ہے جو پورے سے زیادہ ہے اور اُسے پانے کا طریقہ کیا ہے؟

۱۲ جو ہمیشہ سے ہے اور جسے بنایا گیا وہ ایک دوسرے سے جدا کیسے ہوئے کہ ایک دُنیا ٹھہرا اور دوسرا خدا؟

۱۳ اہلِ معنی اپنے احوال و مقامات میں خدا کی بات کرتے ہوئے آنکھ، لب، زلف اور خط و خال سے کیا مطلب لیتے ہیں؟

۱۴ شراب، شمع اور محبوب سے کیا مراد ہے؟

۱۵ اس کوچے میں بت، زنار اور کلیسا اگر کفر نہیں تو پھر کیا ہیں؟

شہر میں ایک بزرگ سعد الدین محمود شبستری تھے۔ ہر سوال کے جواب میں ایک شعر لکھ کر پوچھنے والے کو بھجوا دیا۔ بعد میں ہر جواب کی تشریح کر کے مثنوی لکھ دی۔ نام گلشنِ راز تھا۔ اُس وقت تک مسلمان اپنی اجتماعی فکر میں جن نتائج پر پہنچے تھے، شبستری نے قریباً ہزار اشعار میں اُس کی تلخیص پیش کر دی۔ عالموں نے شرحیں لکھیں۔ یورپ بھی پہنچی۔ فان ہیمر نے جرمن میں ترجمہ کیا۔ انگریزوں نے فارسی ادب کی تاریخ میں اونچا درجہ دیا۔[1]

علامہ سمجھتے تھے کہ ماضی قریب میں اسلامی دنیا پر یورپ کا حملہ بھی منگولوں کے حملے جیسا چیلنج تھا۔ ایک اور گلشنِ راز کی ضرورت تھی۔ 'گلشنِ راز جدید' عنوان رکھا۔ زبورِ عجم کا حصہ تھی۔[2]

74

مہاراجہ کشن پرشاد دوبارہ حیدرآباد دکن کے وزیرِ اعظم بنے۔ علامہ نے مبارکباد کا تار بھیجا۔[3]

دو ماہ سے خواجہ حسن نظامی اور جوہرؔ کے درمیان معرکہ چھڑا ہوا تھا۔ ۲/ دسمبر ۱۹۲۶ء کو ہمدرد میں قوم کے غداروں کی لائی ہوئی مصیبت اور مکاروں پر اعتماد کے نتائج بیان کرتے ہوئے 'اسرارِ خودی' سے پیروں، واعظوں اور صوفیوں کے متعلق بابائے صحرائی کے افکار پیش کیے گئے۔[4]

---

[1] دیکھیے شبلی نعمانی (۱۹۹۱) شعر العجم حصہ پنجم، ص ۱۱۷-۱۱۶؛ Edward G. Browne (1920) *Literary History of Persia, Vol.3,* pp.146-150; Whinfield (1988) *Gulshan-i-Raz*

[2] قیاس کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۲۶ء کے اواخر میں اس پر کام شروع ہوا۔ مہر کے روزنامچے میں اس کا تذکرہ یکم جنوری ۱۹۲۷ء کے اندراج میں ہے۔ مولانا گرامی کے نام خطوط میں پہلی دفعہ علامہ نے ۱۳ جنوری ۱۹۲۷ء کے خط میں تذکرہ کیا۔ جنوری ۱۹۲۷ء کے اواخر تک زبورِ عجم مکمل ہو گئی جس میں یہ مثنوی شامل تھی۔ شبستری کے عہد سے اپنے دور کا تقابل علامہ نے مثنوی کے آغاز میں کیا ہے؛ زبورِ عجم

[3] مکتوب بنام شاد ۲۸/ دسمبر؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۵۴-۶۵۳

[4] ابو سلمان شاہجہانپوری (۱۹۹۳) علامہ اقبال اور مولانا محمد علی، ص ۲۳ اور ۴۷

مولانا ظفر علی خاں انتخاب کے بارے میں اداریہ لکھنا چاہتے تھے۔ بظاہر اِسی موقع پر علامہ نے انتخابی مہم کے بارے میں کچھ نکات کاغذ پر درج کیے—اخبارات نشتر اور سیاست میں اپنے خلاف استعمال ہونے والے الفاظ، اپنے خلاف اشتہارات کی تعداد، اپنی حمایت میں ہونے والے متفقہ فیصلے اور جلسے۔ "ہماری طرف سے قریباً ۲۰/ جلسے کیے گئے اور کسی جلسے میں کسی کے خلاف کچھ نہیں کہا گیا اور اگر کسی نے جوش میں آ کر کچھ کہا تو اُسے روک دیا گیا،" علامہ نے لکھا، "بعض جلسوں میں اراعیوں کی تعریف کی گئی۔"[1] علامہ اگر تقریباً ۲۰/ انتخابی جلسوں میں شریک ہوئے تو صرف ۹/ کی تفصیلات موجود ہیں—۱۱/ اکتوبر رنگ محل؛ ۱۳/ اکتوبر؛ ۱۵/ اکتوبر دو جلسے جن میں سے ایک بھاٹی دروازے پر ہوا؛ ۱۷/ اکتوبر وارڈ ۷ کی طرف سے؛ ۱۸/ اکتوبر متی چوک؛ ۲۳/ اکتوبر باغ بیرون دہلی دروازہ؛ ۱۶/ نومبر باغ بیرون لوہاری دروازہ منجانب الراعی برادری؛ ۱۸/ نومبر کڑہ ولی شاہ؛ ۱۹/ نومبر باغ بیرون بھاٹی دروازہ۔ ان ۹/ جلسوں کے علاوہ زمیندار میں ۲۲/ اکتوبر حویلی کابلی مل (ڈبی بازار) اور ۱۹/ نومبر عقب مسجد وزیر خاں جلسوں کا تذکرہ ہے مگر وضاحت نہیں ہے کہ علامہ بھی شریک ہوئے۔ بعد میں بیان کی ہوئی روایات میں چوہٹہ مفتی محمد باقر اور مزنگ میں ایک ایک جلسے کا ذکر بھی ملتا ہے۔[2] دستیاب تفصیلات سے عام تاثر یہی ملتا ہے کہ "کسی جلسے میں کسی کے خلاف کچھ نہیں کہا گیا"۔ ۱۸/ نومبر کڑہ ولی شاہ کے جلسے میں شیخ عظیم اللہ نے محمد دین کے حامی حبیب اللہ کی عدالتی گواہی پر تنقید کی مگر ذاتیات کے حوالے سے نہ تھی بلکہ اس حوالے سے کہ محمد دین کے گروہ کو مسلمانوں کی رائے عامہ کا خیال نہیں ہے۔ زبانی روایت میں لال دین قیصرؔ کی "جیبی پور" والی نظم "کسی کے خلاف" کچھ کہنے کے مترادف سمجھی جا سکتی ہے لیکن ادبی لطافت کی حدود سے تجاوز نہیں کرتی۔[3]

۵/ دسمبر کے زمیندار کے اداریئے میں ظفر علی خاں نے لکھا، "انتخاباتِ کونسل کے نتائج

---

[1] علامہ کے ہاتھ کی دستاویز علامہ اقبال میوزیم میں ہے۔ اداریہ زمیندار ۵/ دسمبر ۱۹۲۶ء میں یہ نکات استعمال کیے گئے۔

[2] ان تمام جلسوں کا تذکرہ گزشتہ صفحات میں اپنی اپنی جگہ پر آ چکا ہے۔

[3] انتخابی مہم کی جو تفصیلات دستیاب ہیں، تقریباً سب زمیندار سے لی گئی ہیں جو علامہ کی حمایت کر رہا تھا۔ مخالف اخبارات سیاست اور نشتر کے فائل دستیاب نہیں ہو سکے۔

ابھی تک شائع نہیں ہوئے لیکن ہم یہ ضروری سمجھتے ہیں کہ اِن انتخابات کے بعض تلخ اور افسوسناک تجربات بیان کر دیں۔" یہ افسوسناک تجربات تین تھے۔ اول، محمد دین کے حامیوں نے ذات برادری کا سوال اٹھایا۔ دوم، حنفی وہابی کا جھگڑا کھڑا کر دیا۔ سوم، علامہ کے خلاف پے در پے اشتہارات شائع کیے جن میں الزامات اور بہتان کے سوا کچھ نہ تھا۔ ظفر نے لکھا:

> یہ حقیقت ہر صاحبِ بصیرت پر آشکارا ہے کہ نہ محض کونسل بلکہ ہر نیابتی نشست کے لیے بہمہ وجوہ بہترین شخصیت کا انتخاب عمل میں آنا چاہیے اور اِس بارے میں ذات پات، برادری، ہم نسلی اور ہم قومی یا دوستانہ تعلقات و روابط کے مسائل بالکل ہیچ اور ناقابلِ اعتنا ہیں۔ اور جو شخص اصل مقصود سے کنارہ کش ہو کر ان ناقابلِ اعتنا رِشتوں اور رابطوں کو کوئی اہمیت دیتا ہے وہ قومیت کے ضابطۂ اخلاق کی بنا پر شدید مجرم ہے اور ہر قوم پرست کا فرض ہے کہ وہ ایسے شخص یا اشخاص و جماعت کے اِن باطل اور لایعنی محرکاتِ عمل کی پوری قوت کے ساتھ مخالفت کرے ... علامہ ممدوح ایسی نادرُالوجود شخصیتیں صدیوں کے بعد پیدا ہوا کرتی ہیں۔ موجودہ مسلمانانِ ہند میں شاید علامہ ممدوح ہی وہ ممتاز ترین ہستی ہیں جن کے علم و فضل کے رُوبرو یورپ و امریکہ کی کلاہِ افتخار کو بھی مضطرانہ جھکنا پڑا ہے۔[1]

75

۶/دسمبر کو ضلع کچہری میں انتخابی نتائج کا اعلان ہوا۔ لاہور قصباتی حلقے کے بارہ ہزار ووٹوں میں سے ارسٹھ فیصد ڈالے گئے تھے۔ علامہ نے ۵۶۷۵/ حاصل کیے۔ ملک محمد دین کو ۲۴۹۸/ ووٹ ملے۔ نتائج سن کر علامہ کے حامی میونسپل کمیٹی کے چوک میں پہنچے۔ وہاں علامہ مل گئے۔ لوگوں نے جھرمٹ میں لے لیا۔ جلوس بن گیا۔ تقریباً تین بجے روانہ ہوا۔[2] انارکلی اور لوہاری دروازے سے

---

[1] زمیندار ۵/دسمبر ۱۹۲۶ء؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۷۲-۷۴

[2] زمیندار ۸/دسمبر ۱۹۲۶ء؛ شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۷۵۔ وسیمہ مبارک سے روایت ہے کہ کامیابی کی خبر سن

گزرا۔ سرِ شام بھاٹی دروازے پر پہنچا۔ عبدالرشید طارق کہتے ہیں، ''جب جلوس بھاٹی دروازہ میں اونچی مسجد کے پاس آکر رُکا تو ہم سب پھولوں کے ہار لے کر آگے بڑھے اور اُن کے گلے میں ڈال دیے۔''[1] اُونچی مسجد میں مغرب کی نماز پڑھی گئی۔ پھر جلوس ہیرا منڈی اور سید مٹھا بازار سے ہوتا ہوا چوک جھنڈا پہنچا۔ وہاں کسی نے خواجہ فیروزالدین بیرسٹر اور علامہ کے سروں پر پگڑیاں باندھیں۔ موری دروازے پر علامہ فٹن میں سوار کیے گئے۔ پانی والے تالاب اور ڈبی بازار سے گزر کر جلوس کشمیری بازار پہنچا۔ ملکوں کی دکان پر علامہ کی خدمت میں مشہدی لُنگی پیش کی گئی۔

''سنہری مسجد اور کشمیری بازار میں اس جلوس کا بہت زور تھا،'' چغتائی کہتے ہیں، ''سنہری مسجد کے میدان میں جو بھنگڑا ڈالا گیا وہ دیکھنے کے قابل تھا... تاثیر اور دیگر رفقاً نے علامہ کو بھی اس بھنگڑے میں شامل کر لیا۔''[2] سراج نظامی کہتے ہیں، ''دیکھنے والوں نے ایک موقعے پر ڈاکٹر صاحب [علامہ اقبال] کو بھی دونوں ہاتھ سر سے اوپر اُٹھا کر بھنگڑا ڈالتے دیکھا۔''[3] جلوس پرانی کوتوالی سے ہو کر کچھ دیر چوہٹہ مفتی باقر میں ٹھہرا۔ استاد گام نے پنجابی نظم پڑھی۔ ماسٹر مسلم نے غالباً اُردو میں نظمیں پڑھیں۔ جلوس میں شریک ہونے والوں کا شکریہ ادا کیا۔ علامہ اقبال نے بھی شکریہ ادا کیا۔ یہیں سے رات ساڑھے دس بجے کے قریب جلوس منتشر ہوا۔[4]

مبارک باد کے خطوط اور تار ملنے لگے۔[5] زمیندار نے ۸/دسمبر کے اداریے میں لکھا، ''جن اراعیں بھائیوں نے ایک فوری تاثر کے تحت علامہ اقبال کے خلاف پرچیاں ڈالی تھیں انہیں بھی چاہیے کہ اب علامہ کے خلاف کسی قسم کا میل اپنے دل میں نہ رکھیں کیونکہ علامہ اقبال کی ذات برادریوں اور

کر لوگ علامہ کے گھر آئے مگر علامہ نے جلوس میں شرکت سے انکار کر دیا؛ صوفی، اقبال درونِ خانہ، ص ۴۳-۴۲۔

[1] عبدالرشید طارق، 'مے شبانہ'، ص ۳۴۱

[2] عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۱۸۰

[3] سیارہ ڈائجسٹ لاہور اپریل ۱۹۶۵ء میں سراج نظامی کا مضمون؛ شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۲۲۳

[4] زمیندار ۸/دسمبر ۱۹۲۶ء؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۷۵

[5] زمیندار ۸/دسمبر ۱۹۲۶ء؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۲۰

فرقوں سے اعلیٰ وارفع ہے، اور وہ اراعیوں کی اِس حرکت کے باوجود بھی اُن کی خدمت و نیابت کے لیے دل و جان سے موجود ہیں۔ لاہور کی دوسری برادریوں سے بھی ہماری دلی استدعا ہے کہ وہ خدا کے لیے اراعیوں کی طرف سے اپنے دلوں کو بالکل صاف کر لیں ... "[1] رنگ محل کے علاقے میں ظہورالدین ایم ٹی ایس رہتے تھے۔ ملک محمد دین کے دوست تھے۔ علامہ کو ووٹ دیا تھا۔ برادری نے طوفان اُٹھا دیا۔ ۹/ دسمبر کے زمیندار میں ظہور کا خط شائع ہوا: "...ملک محمد دین کی خدمت میں مودبانہ التماس کرتا ہوں کہ آیندہ بزرگانِ قوم کے ساتھ مل کر کام کیا کریں۔ ذاتی مفاد کو قوم کے مفاد پر قربان کرنے کی حکمتِ عملی اختیار کریں اور فرقہ بندی کے سوال کو ہمیشہ کے لیے مٹا دیں۔ اور ڈاکٹر اقبال کا ساتھ دیں اور پھر دیکھیں کہ آیندہ موقع پڑنے پر دوسری برادریاں آپ کو کس نگاہ سے دیکھتی ہیں۔"[2]

۱۰/ دسمبر کو مجلسِ خلافت جہلم کا اجلاس ہوا۔ مستری عبدالرحمٰن رُکن بلدیہ جہلم نے صدارت کی۔ عبدالقادر بیرسٹر نے قرارداد پیش کی۔ ڈاکٹر نذیر احمد نے تائید کی، "مسلمانانِ جہلم کا یہ اجلاس علامہ سر محمد اقبال کی شاندار کامیابی پر ہدیۂ مبارکباد پیش کرتا ہے اور مسلمانانِ لاہور کی اُس جماعت کی کوتاہ اندیشی پر افسوس کرتا ہے جس نے ڈاکٹر صاحب کے مقابلے کی تکلیف کی۔" مغربی پنجاب قصباتی حلقے سے منتخب ہونے پر ڈاکٹر شیخ محمد عالم کے حق میں بھی مبارکباد کی قرارداد اِس توقع کے ساتھ منظور ہوئی، "حالات سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے کبھی کبھی اپنے حلقۂ انتخاب کا دورہ بھی فرمایا کریں گے۔"[3]

چغتائی کہتے ہیں کہ اسلامیہ کالج کے اسٹاف روم میں علامہ کے اعزاز میں دعوت کا اہتمام کیا گیا۔ پروفیسر سراج الدین آزر نے بطورِ خاص حصہ لیا۔ فلسفہ کے پروفیسر خواجہ عبدالحمید بھی تھے۔[4]

عبدالمجید سالک کے مطابق فیروزپور کے معززین نے اے ڈی سی ڈاکٹر تصدق حسین خالد کے

---

[1] محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۷۶-۷۷

[2] ایضاً، ص ۷۷-۷۸

[3] زمیندار ۱۵/ دسمبر ۱۹۲۶ء؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۷۸

[4] عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۱۸۰

کہنے پر جلوس، مشاعرے اور گارڈن پارٹی کا ارادہ کیا۔ علامہ نے جلوس سے منع کیا۔ گارڈن پارٹی میں گئے، "حاضرین کے بیحد اِصرار پر تقریر کی لیکن انگریزی میں۔ جب کلام سنانے کی فرمایش ہوئی تو انکار کر دیا اور کہا شعر سننے سنانے کی چیز نہیں، تنہائی میں بیٹھ کر پڑھنے کی چیز ہے۔ "مشکل سے فارسی کے دو شعر سنائے، "دریں صحرا گزار اُفتاد شاید کاروانے را..." مشاعرے میں شرکت سے صاف انکار کر دیا۔ اپنی جگہ سالک کو صدارت کے لیے پیش کیا۔[1]

حفیظ جالندھری کے مطابق فیروزپور میں فتح کا جشن علامہ کے دوست دولت رام نے منایا تھا۔ سالک کے علاوہ حفیظ، ہری چند اختر اور دوسرے احباب کو ساتھ لے کر علامہ فیروزپور گئے۔ مشاعرے میں حفیظ نے 'ابھی تو میں جوان ہوں'، 'پیے چلا جا' اور دوسری نظمیں پیش کیں۔ واپسی پر علامہ نے اپنے ساتھ کار میں بٹھایا۔ بتایا کہ مشاعرے کے دوران کھانے پینے کی قناتوں کے پیچھے بیٹھ کر سب کچھ سن رہے تھے۔ حفیظ سے پوچھا، "حفیظ جی! کبھی پی ہے؟" حفیظ نے کہا، "پی تو نہیں۔" علامہ نے پوچھا، "تو پیے چلا جا، کی قسم کی نظمیں کیونکر کہہ ڈالیں؟" حفیظ نے جواب دیا کہ علامہ ہی کہتے ہیں کہ شاعر کا تخیل آسمانوں کے پرے چلا جاتا ہے۔ علامہ نے کہا، "ہاں—مگر پیتے اور پھر چھوڑ دیتے۔"[2]

۱۲ر دسمبر کو حاجی دین محمد خوشنویس نے علامہ کے اعزاز میں پرتکلف دعوت دی۔ ان کی دعوت کے پلاؤ مشہور تھے۔ عبداللہ چغتائی سے روایت ہے کہ وہ علامہ کے ساتھ کوٹھی سے نکل رہے تھے جب کسی نے آکر پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو۔ علامہ نے کہا، "مت پوچھو۔ آج پلاؤ کی شہادت کا دن ہے۔" دعوت میں قریباً ایک سو لوگ شریک تھے۔[3]

76

اگلے دو برسوں ۱۹۲۷ء اور ۱۹۲۸ء کے لیے بھی پنجاب یونیورسٹی کی سینٹ کی اکیڈمک کونسل کا رُکن

---

[1] عبدالمجید سالک (۱۹۸۳) ذکرِ اقبال، ص ۱۳۵-۱۳۴

[2] پروفیسر محمد منور، میزانِ اقبال، ص ۱۷۴-۱۷۳

[3] زمیندار ۱۵ر دسمبر ۱۹۲۶ء؛ شاہد (۱۹۷۷)، ص ۷۹-۷۸۔ عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۴۷

نامزد کیا گیا تھا۔ ۱۷ دسمبر کو پنجاب گزٹ میں شائع ہوا۔[1]

77

روبرٹ ایلن ہیوم عیسائی مشنری تھے۔ غدر سے دس برس پہلے بمبئی میں پیدا ہوئے تھے۔ بین الاقوامی شہرت رکھتے تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کی دعوت پر توسیعی لیکچرز دیئے۔ خلاصہ اخبارات میں شائع ہوا۔ علامہ کی نظر سے بھی گزرا۔

ایک رات خوب سردی پڑ رہی تھی۔ بارش ہو رہی تھی۔ علامہ کے چھوٹے کمرے میں انگیٹھی گرم تھی۔ وہ دھسہ اوڑھے پلنگ میں لیٹے ہوئے تھے۔ عبداللہ چغتائی اور صحافی شفاعت اللہ خاں بھی بیٹھے تھے۔ علی بخش ڈاکٹر ہیوم کا تعارفی کارڈ لایا۔ علامہ نے اجازت دی تو علی بخش نے ایک کی بجائے دو کرسیاں لا کر رکھ دیں۔ معلوم ہوا کہ ہیوم اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ آئے تھے جو وائی ایم سی اے کے سیکرٹری تھے۔ دونوں کرسیوں پر بیٹھے گئے۔ علامہ پلنگ ہی پر لیٹے رہے۔ چغتائی سے روایت ہے کہ علامہ نے خود ہی گفتگو شروع کی۔ پوچھا کہ کیا ڈاکٹر ہیوم کے خیال میں عیسائی مذہب تبلیغی مذہب ہے؟ خود ہی جواب دیا کہ آج صرف اسلام ہی تبلیغی مذہب ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے۔ عیسائیت بلکہ بدھ مت بھی تبلیغی مذاہب کے طور پر مردہ ہو چکے ہیں۔ ڈاکٹر ہیوم نے تبصرہ نہیں کیا۔ "ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ یہاں آ کر پھنس گیا ہے،" چغتائی کا خیال ہے، "اُس نے مختصر سی گفتگو کے بعد فوراً اجازت طلب کر لی۔" اُس کے جانے کے بعد عبداللہ اور شفاعت نے کچھ تبصرہ کرنا چاہا۔ علامہ نے موضوع بدل دیا۔ "وہ کسی کے پیٹھ پیچھے اُس پر تنقید کرنا نہایت معیوب خیال کرتے تھے،" چغتائی نے لکھا۔[2]

دسمبر میں پنجاب یونیورسٹی کا کانووکیشن ہوا۔ گورنر سر مالکم ہیلی نے پچاس برس بعد کے پنجاب کا تصور پیش کیا۔ ۱۹۷۶ء کا پنجاب ایک آزاد ہندوستان کا حصہ ہو گا۔ صوبے سے ناخواندگی ختم ہو چکی ہو گی۔ اس لیے قوموں کی بنیاد بھی مذہب پر نہیں ہو گی۔

---

[1] ڈاکٹر حسن اختر ملک، اقبال، ایک تحقیقی مطالعہ، ص ۱۲۵

[2] عبدالعبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۲۴۱-۲۳۹

سر اکبر حیدری بھی طلبہ سے خطاب کرنے آئے تھے۔ ہائی کورٹ کے قریب میاں سر محمد شفیع کی اقبال منزل میں ٹھہرے۔ عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں کہ ایک صبح علامہ نے ان سے کہا کہ اگلے روز سر اکبر حیدری سے ملنا ہے۔ وہ اپنے مصور بھائی عبدالرحمٰن کے ساتھ آئے۔ علامہ دونوں کو ساتھ لے کر میاں محمد شفیع کی کوٹھی پر گئے۔ عبدالرحمٰن نے دیوانِ غالب کے مصوّر ایڈیشن کا تذکرہ کیا۔ سر اکبر حیدری نے تجویز پسند کی۔ کہا کہ وہ ہر طرح کی مدد کرنے کو تیار ہیں۔

فیروز پور روڈ پر بخشی ٹیک چند کی کوٹھی کے بالمقابل ذرا اندر کی طرف ایک مکان میں پارسی میاں بیوی مسٹر اور مسز وسوگر رہتے تھے۔ مسز وسوگر آکسفورڈ یونیورسٹی کی گریجوئٹ تھیں۔ ڈی اے وی کالج میں انگریزی کی اعزازی پروفیسر تھیں۔ میاں بیوی علامہ کے عقیدتمند تھے۔ عبداللہ چغتائی کا بیان ہے کہ علامہ ان کے ہاں اکثر جاتے تھے۔ اُس روز وہاں اٹلی کے اسکالر ڈاکٹر اسکارپا آئے ہوئے تھے۔ افغانستان میں اطالوی سفیر کے مددگار تھے۔ علامہ کے فلسفے پر گہری نظر رکھتے تھے۔ 'اسرارِ خودی' پر بعض شبہات تھے۔ اسی لیے علامہ سے ملاقات طے ہوئی تھی۔ علامہ دونوں چغتائیوں کے ساتھ پہنچے۔ ڈاکٹر اسکارپا کے شبہات رفع کر دیے۔

مسز وسوگر نے "آکسفورڈ یونیورسٹی کے ماسٹر آف دی کالج ڈاکٹر لنڈسے کا ذکر کیا،" عبداللہ چغتائی کا بیان ہے۔ وہ بھی کلامِ اقبال سے واقف تھے۔ ہندوستان آنے والے تھے۔[1]

78

محمود شبستری نے جن سوالات کا جواب دیا تھا، علامہ نے اُنہی میں سے بعض منتخب کیے۔ کچھ سوالات یکجا بھی کر دیئے۔ بیاض میں قطع برید ہوئی۔ غور کرنے سے تخلیقی عمل کے مراحل کے بارے میں دلچسپ اندازے لگائے جاسکتے ہیں۔ اِس سوال کے جواب میں کہ "جسے پہچانا جارہا ہے اور جو پہچان رہی ہے وہ اگر خدا کی ذات ہی ہے تو پھر یہ انسان کے دماغ میں کیا سودا سمایا ہے"، سات اشعار لکھنے کے بعد محسوس کیا کہ شعر نمبر ۲، ۳، ۴ اور ۵ / اُٹھا کر ساتویں شعر کے بعد رکھنے سے مطلب زیادہ واضح ہو جائے

---

[1] ایضاً، ص ۲۴۱-۲۳۹

گا۔ یہی کیا۔ بارہ اشعار لکھنے کے بعد پھر رُک گئے۔ ایک علیحدہ بند لکھا کہ خودی کی زندگی غیر کی تخلیق کرنے میں ہے۔ یہ گلشنِ راز کے ایک اور سوال کا جواب تھا کہ جس کا ہونا محض امکان ہو اُس کا وصال اُس کے ساتھ کیسا جس کا وجود کسی کا محتاج نہیں اور یہ نزدیکی، دُوری، کم اور زیادہ کا معاملہ کیا ہے؟

اگلے صفحے پر سوال درج کیا۔ جواب میں تین بند لکھے۔ حاشیے میں ان پر اضافے ہوئے۔ صفحہ سیدھے اور آڑے لکھے ہوئے اشعار سے بھر گیا۔ ۶۲/ اشعار تھے۔ ان میں سے ۲۲/ کاٹے گئے۔ یہ سب اُس بند کی تمہید تھی جو پچھلے صفحے پر غیر ارادی طور پر رونما ہو گیا تھا۔ نشان لگا کر واضح کیا کہ وہ بند لا کر یہاں رکھا جائے گا۔[1]

گلشنِ راز کے تین سوالات اکٹھے کر کے ایک سوال بنایا: ''''میں' کیا ہوں، مجھے میری خبر دیجیے اور یہ اپنے آپ میں سفر کرنے کا مطلب کیا ہے؟ جسے پہچانا جا رہا ہے اور جو پہچان رہی ہے وہ اگر خدا کی ذات ہی ہے تو پھر اِنسان کے دماغ میں کیا سودا سمایا ہے؟ جو ہمیشہ سے ہے اور جسے بنایا گیا وہ ایک دوسرے سے جدا کیسے ہوئے کہ ایک دُنیا ٹھہرا اور دوسرا خدا؟'' اِن میں وہ سوال شامل تھا جس کا جواب لکھنا سب سے پہلے شروع کیا تھا۔ وہ اشعار یہاں لا کر رکھے اور وہاں کاٹ دیئے۔ پھر یہاں نئے اشعار لکھے۔ پچاس ہوئے۔ پھر تین سوالوں کے مرکب میں سے دو سوال کاٹ کر صرف ایک رہنے دیا: ''''میں' کیا ہوں، مجھے میری خبر دیجیے اور یہ اپنے آپ میں سفر کرنے کا مطلب کیا ہے؟''

صرف اِسی سوال کا جواب یہاں رہنے دیا۔ باقی دونوں سوالوں کے جواب یہاں سے کٹ گئے۔ وہ سوال اپنے جوابات سمیت اگلے صفحے پر درج ہوئے۔ پھر کسی وقت سوالوں پر نمبر درج کر کے اُن کی ترتیب اُلٹ دی۔ اب مرکب سوال کی صورت یوں ہو گئی: ''جو ہمیشہ سے ہے اور جسے بنایا گیا وہ ایک دوسرے سے جدا کیسے ہوئے کہ ایک دُنیا ٹھہرا اور دوسرا خدا ہوا؟ جسے پہچانا جا رہا ہے اور جو پہچان رہی ہے وہ اگر خدا کی ذات ہی ہے تو پھر یہ انسان کے دماغ میں کیا سودا سمایا ہے؟'' اِس مرکب سوال میں وہ سوال شامل تھا جس کا جواب دینا سب سے پہلے شروع کیا تھا۔ اس کے جواب پر مشتمل اشعار جو سب

[1] بیاضِ زبورِ عجم

سے پہلے لکھے تھے، دو دفعہ کٹنے کے بعد یہاں آسودہ ہوئے۔ جواب کا آغاز انہی اشعار سے ہو رہا تھا۔ اِس سے ظاہر ہے کہ اِس مرحلے پر یہی نکتہ ذہن پر سب سے زیادہ چھایا ہوا تھا۔ سب سے پہلے یہی قلم سے ٹپکا۔ اِسی کی وضاحت میں دوسرے سوال و جواب آئے۔ اِن اشعار کا مرکزی خیال یہ تھا کہ خودی کی زندگی غیر کی تخلیق کرنے میں ہے۔ اِس طرح ہم خالق سے جدا ہوئے۔ یہ جدائی ہمیں تربیت کے مواقع فراہم کرتی ہے:

خودی را زندگی ایجادِ غیر است　　　فراقِ عارف و معروف خیر است[1]

"وہ مسافر کون ہے جو راستے پر چل رہا ہے اور کس کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ وہ انسانِ کامل ہے؟" اس کے جواب میں لکھا کہ جس نے دیدار حاصل کر لیا وہ دُنیا کا امام ہے۔ ہم اور تم ناتمام ہیں، وہ کامل ہے۔ مغرب نے جمہوری نظام کی بنیاد رکھ کر دیو کی گردن کھول دی ہے۔ مغربی جمہوریت میں دھڑے بندی ہوتی ہے۔ ایک گروہ ہمیشہ دوسرے کا مخالف رہتا ہے۔ رضا شاہ پہلوی اور امیرِ افغانستان امان اللہ یہ بھید جانتے ہیں۔ اُنہوں نے مغرب کو دل نہیں دیے۔[2] کچھ سوچ کر رضا شاہ اور امان اللہ کا تذکرہ خارج کر دیا۔

"وہ حصہ کون سا ہے جو پورے سے زیادہ ہے اور اُسے پانے کا طریقہ کیا ہے؟" اِس کا جواب تین حصوں میں بٹ گیا۔ ایک ہی صفحے پر علیحدہ علیحدہ بند لکھے۔ پھر ترتیب دی۔ قطع برید ہوئی۔[3]

"کون سا سمندر ہے جس کا کنارہ گفتگو ہے اور اس کی گہرائی میں کون سا موتی ملتا ہے؟" گفتگو کی بجائے علم کا لفظ استعمال کیا اور جواب میں لکھا کہ زندگی بہتا ہوا سمندر ہے۔ شعور و آگہی اس کا کنارہ ہے۔ ہمارا شعور دنیا کا جو نقش قائم کرتا ہے، اُس کے ٹوٹنے ہی سے خودی محکم ہوتی ہے۔ اس کی وضاحت میں بارہ اشعار لکھے۔ پچھلے بند سے دو شعر یہاں لائے۔ پانچ شعر علیحدہ کر کے ان کے ساتھ

---

[1] بیاض زبورِ عجم

[2] منسوخ شعر: امان و پہلوی مردانِ راز اند / بتر سازاد گاں دل اُو نباز ند

[3] بیاض زبورِ عجم

مزید پانچ شعر لکھے۔ وہ پہلا بند ہو گیا۔[1]

''اَناالحق کس نکتے کا بیان ہے اور کیا آپ کے خیال میں یہ مبہم بات بالکل فضول تھی؟'' اِس سوال کے ساتھ ایک اور سوال یکجا کر دیا، ''کون ہے جو وحدت کے راز سے بالآخر واقف ہوا اور وہ بات کیا ہے جو عارف کو معلوم ہوتی ہے؟'' جواب میں چھ بند لکھے۔ باون اشعار ہوئے۔ بعض اشعار کاٹے گئے۔ دوسرے صفحے پر سوال درج کیا، ''سب سے پہلے میں اپنی سوچ کے بارے میں حیران ہوں کہ وہ کیا چیز ہے جسے سوچنا کہتے ہیں۔'' جواب لکھا جس میں ترمیم کی گنجایش تھی۔ ایک اور صفحے پر سوال لکھا، ''کون سی سوچ ہمارے لیے سفر کی شرط ہے اور کیوں یہ کبھی نیکی اور کبھی گناہ ہے؟'' خیال آیا کہ یہ سوال پچھلے کے ساتھ یکجا ہونا چاہیے۔ قلمزد کر دیا۔ پچھلے صفحے پر دونوں سوال اکٹھے لکھے۔ اُنیس اشعار کے بند میں جواب لکھا۔ لکیر کھینچ کر نشان لگایا کہ یہ بند پچھلے دونوں سے پہلے رکھا جائے۔

منصور حلاج نے کہا تھا، ''اناالحق''۔ کئی معنی نکلتے تھے: خودی سچائی ہے، خودی خدا ہے، میں خدا ہوں۔[2] سمجھا گیا کہ خدائی کا دعویٰ کیا ہے۔ سولی پر چڑھا دیا گیا۔ نوجوانی میں علامہ نے لکھا تھا:

منصور کو ہوا لبِ گویا پیامِ موت ۔۔۔ اب کیا کسی سے عشق کا دعویٰ کرے کوئی

دس برس پہلے منصور سے بدظن بھی ہوئے۔ لیکن اب اِس نتیجے پر پہنچے تھے کہ صدیوں سے مشرق سویا ہوا تھا۔ منصور نے اُسے جگا دیا۔

خیال آیا کہ اَناالحق والے سوال کو علیحدہ رکھنا بہتر ہے۔ دوسرے سوال پر ''صفحہ دیگر'' لکھا۔ یہاں سے کاٹ کر ایک اور صفحے پر ڈالا۔ اُس کا جواب بھی یہاں سے نقل کر کے وہاں لکھا۔ یہاں کاٹ دیا۔ پھر ترمیم ہوئی۔ ایک غزل بھی شامل کر دی: ''فنا را بادۂ ہر جام کردند''۔[3]

''میں نے بات کو نئے انداز میں پیش کیا یعنی محمود شبستری کے رِسالے کا جواب دیا،'' تمہید میں

---

[1] بیاض زبورِ عجم

[2] ڈاکٹر سعید اللہ نے ۲۱ نومبر ۱۹۳۷ء کے حوالے سے لکھا ہے کہ علامہ نے کہا، ''اناالحق کے معنے یہ نہیں کہ میں خدا ہوں بلکہ اس کو یوں سمجھنا چاہیے کہ 'انا' ہی اصلی چیز ہے۔'' سعید اللہ، 'اقبال کے ہاں ایک شام'، ص ۱۳۹

[3] بیاض زبورِ عجم

لکھا، "شیخ کے عہد سے لے کر اب تک کسی نے ہماری روح میں ایسی چنگاری نہیں جلائی۔" اگلے اشعار میں شبستری کو "دانائے تبریز" کہا۔ اپنے مقاصد کا ذکر کیا، "اُس کم ظرف سے تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا جس نے مجھ پر شعر و شاعری کی تہمت باندھی ہو۔" اپنی مثنوی کے بارے میں لکھا:

اگر جبریل یہ رسالہ پڑھے تو اپنا خالص نور گرد کی طرح جسم سے جھاڑنا شروع کر دے،

اپنے مقام و مرتبہ پر فریاد کرے اور یزداں سے اپنے دل کا درد کہہ ڈالے:

"میں آپ کی تجلّی کو اتنا بے حجاب نہیں دیکھنا چاہتا، میں بس دردِ پنہاں چاہتا ہوں اور کچھ نہیں!

میں اِس دائمی وصال سے باز آیا کہ میں نے آہ و فغاں کی لذّت چکھ لی ہے،

مجھے انسان کا ناز و نیاز عطا فرمائیے اور میری جان میں اُس کا سوز و گداز پیدا کر دیجیے!"[1]

79

مولانا عبداللہ منہاس کی اہلیہ سعادت سلطان نے اس برس کتاب دخترانِ شمشیر شائع کی۔ بہادر خواتین کے بارے میں تھی۔ صفحات ۱۰۳-۱۰۴ پر علامہ کی نظم 'فاطمہ بنت عبداللہ' شامل تھی۔ بانگِ درا کی بجائے پرانا متن استعمال کیا گیا۔[2]

ایک جرمن شاعر نے پیامِ مشرق کی پندرہ نظموں کا ترجمہ جرمن میں اپنے ہاتھ سے چرمی کاغذ پر لکھ کر علامہ کو بھیجا۔ اخبار میں شاعر کا نام "ہانس مانکے" بتایا گیا۔[3]

ایچ جی ویلز کی کتاب دی آؤٹ لائن آف ہسٹری (*The Outline of History*) سات برس پہلے شائع ہوئی تھی۔ اسے جو شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی، جس طرح اِس نے ذہنوں پر تسلط جما کر دوسرے مصنفین کو تقلید پر آمادہ کیا، اُس کی ایک وجہ اِس کی سادگی تھی۔ بازار میں ایسی کتابوں کا سیلاب آیا ہوا تھا جن میں کسی نہ کسی مضمون کا خلاصہ بڑی سادگی کے ساتھ پیش کرنے کی کوشش کی

---

[1] بیاض زبورِ عجم۔ تمہید میں خاصی قطع برید ہوئی۔ چونسٹھ اشعار میں سے ستائیس قلمزد ہوئے۔

[2] شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۳۲-۳۰

[3] اختر النسا (۲۰۱۰) اقبال اور زمیندار، ص ۱۰۵

جاتی۔[1] امریکی مصنف وِل ڈیوراں (Will Durant) نے اِس صنف میں خاص کمال دکھایا۔ اُن کی داستانِ فلسفہ (*The Story of Philosophy*) اس برس شائع ہوئی۔ کبھی نہ کبھی یہ کتاب علامہ کی نظر سے گزری۔ یہودی فلسفی اسپنوزا کو اُس کے شہر کی یہودی برادری نے دائرۂ مذہب سے خارج (excommunicate) کیا تھا۔ وِل ڈیوراں نے لکھا کہ یہودی برادری شاید زیادہ رواداری کا مظاہرہ کرتی اگر اُس کے پاس اپنی ریاست، دیوانی قوانین اور حکومتی ادارے ہوتے۔ لیکن اپنی صفوں میں اتحاد قائم رکھنے اور دوسری اقوام کی نظر میں عزت حاصل کرنے کے لیے اُن کے پاس یہ ذرائع نہ تھے۔ لے دے کر مذہب تھا—دینی عقیدہ اُن کے لیے حُبُ الوطنی کا نعم البدل، عبادت گاہ مذہبی رسومات کے ساتھ ساتھ معاشرتی زندگی کا مرکز اور بائبل مقدس صحیفے کے علاوہ ایک ایسا وطن بھی تھی جسے وہ جہاں چاہتے اپنے ساتھ لے جاسکتے تھے۔

علامہ سمجھتے تھے کہ یہی بات ہندوستان میں مسلمانوں کے بارے میں کہی جاسکتی تھی۔ ڈیوراں نے لکھا تھا کہ ان حالات میں جب اسپنوزا کے نظریات سے بائبل پر زد پڑی تو یہودیوں نے اُسے بالکل ویسے ہی سمجھا جس طرح کوئی اپنے وطن سے غداری کرے۔ اُسے معاف کرنے کا مطلب رواداری نہیں بلکہ خودکشی تھا۔ بعد میں علامہ نے لکھا کہ احمدیوں کی طرف سے ختمِ نبوت کے انکار پر ہندوستانی مسلمان بھی یہی محسوس کرتے ہیں۔[2]

اس برس شائع ہونے والی کتابیں جو کبھی علامہ کے ذخیرۂ کتب میں شامل ہوئیں یہ ہیں:[3]

P. D. Ouspensky (translated from Russian by Nicholas Bessaraboff and Claude Bragdon). Tertium Organum: The Third Canon of Thought - A Key to the Enigmas of the World. Kegan Paul, London

William Brown. Mind and Personality - An Essay in Psychology and Philosophy. University of London Press, London

W. B. Maxwell. Life, A Study of Self. Thornton Butterworth, London

---

[1] Durant (n.d.) *The Story of Philosophy (New Revised Edition),* pp.v-ix

[2] علامہ اقبال نے یہ اقتباس اپنے مضمون 'Islam and Ahmadism' میں پیش کیا جو جنوری ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا۔

[3] Muhammad Siddique, *Descriptive Catalogue*

R. H. Tawney. Religion and the Rise of Capitalism ("A Historical Study" Holland Memorial Lectures, 1922). John Murray, London
Bertrand Russel. Icarus, or the Future of Science. Kegan Paul, London
Montmorency. From Kant to Einstein. W. Haffer, Cambridge
William Ralph Inge. England. Ernest Benn, London

80

مولانا علم الدین سالکؔ سے روایت ہے کہ ''یہ تاثر عام تھا کہ علامہ وزیرِ تعلیم بن جائیں گے۔'' ممکن ہے کہ بعض حلقوں میں یہ تاثر رہا ہو۔ لیکن مولانا نے اس حوالے سے جو روایات بیان کی ہیں وہ اعتبار کے قابل نہیں معلوم ہوتیں۔ اُن کے مطابق گورنر پنجاب سر میلکم ہیلی کی خواہش تھی کہ علامہ کو وزارت میں لیا جائے۔ ''عیار سیاست دانوں'' نے علامہ کو خط لکھا، ''اسمبلی کے ممبر منتخب ہونے کے بعد آپ ایک آزمایش سے دوچار ہو گئے ہیں، کہیں وزارت قبول نہ کر لینا۔'' علامہ سازش سے بیخبر تھے۔ جواب لکھا، ''میں قومی خدمت پر وزارت کو ترجیح دیتا ہوں۔'' گورنر نے علامہ کو وزیر بنانے پر اصرار کیا تو پہلے سر حیات نے کہا کہ یہ علامہ کے مرتبے سے کم ہے، انہیں اسپیکر بنایا جائے گا۔ گورنر نے تب بھی اصرار کیا تو علامہ کا خط دکھایا گیا۔ اُس کے بعد علامہ کے ایک ''عزیز دوست'' کے ذریعے علامہ سے چودھری شہاب الدین کا نام اسپیکر کے لیے تجویز کروایا۔ اس طرح علامہ دونوں عہدوں سے محروم رہ گئے۔ مولانا نے یہ نہیں بتایا کہ انہیں یہ معلومات کہاں سے حاصل ہوئیں۔ اُن کی روایت میں داخلی تضادات بھی ہیں، مثلاً کہتے ہیں کہ گورنر پنجاب علامہ کا اتنا مداح تھا کہ ''ہر چوتھے پانچویں روز اُن سے ملاقات کیا کرتا تھا'' (جو حقیقت میں درست نہیں ہے)۔ اتنے قریبی تعلق کے باوجود اُس نے علامہ کے مبینہ خط کے متعلق اُن سے کچھ دریافت نہ کیا۔ مولانا کے مطابق ''انگریز کے مقرر کردہ چند لوگوں'' نے علامہ کے گرد حصار باندھ لیا تھا۔ یہ بعد میں ''اقبال کے مصاحب'' ہونے کا دعویٰ کرنے لگے۔ انہی کے ذریعے علامہ کے خلاف مبینہ سازش پر عمل کیا گیا۔ مولانا کی بیان کی ہوئی روایت میں ''مصاحبوں'' سے زیادہ علامہ کی اپنی شخصیت مسخ ہو جاتی ہے۔ اس قسم کی روایات میں اُن کے لیے ''درویش منش، قانع اور حق گوئی میں بیباک'' جیسے نیک القابات استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ

اُنہیں سیاسی سمجھ بوجھ سے یکسر محروم بھی دکھایا جاتا ہے۔[1] حقیقت اس کے برعکس ہے۔

سپاس تبریک

جن بے شمار احباب نے پنجاب کونسل کی ممبری میں میری کامیابی پر مبارکباد کے تار اور خطوط ارسال فرمائے ہیں، ان کا فرداً فرداً جواب دینا میرے لیے بے انتہا مشکل ہے۔ اِس لیے زمیندار کی وساطت سے اُن سب کا دِلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔

محمد اقبال، لاہور

زمیندار (لاہور)، ۲۲ر دسمبر ۱۹۲۶ء ص۱۹[2]

۲۳ر دسمبر کو دہلی کے نئے بازار میں سوامی شرَدھانند قتل ہو گئے۔ بتایا گیا کہ ایک ملاقاتی درشن لینے آیا۔ اصل میں مسلمان تھا۔ عبدالرشید نام تھا۔ اُس نے قتل کیا۔

لاہور میں مسجد شاہ غوث کے برابر خالی زمین میں بہت سی قبریں تھیں۔ کرسمس کی صبح مسجد کے نائب متولی میاں غلام نبی نے کچھ لوگوں کی مدد سے زمین کھودنے کا کام شروع کیا۔ ستائیس ہڈیاں نکلیں۔ لوگ جمع ہو گئے۔ وہ کہتے تھے کہ مسجد کے متولیوں نے پیسے لے کر ان کے عزیزوں کی قبروں کے لیے وہاں جگہ دی تھی۔ میاں غلام نبی نے کہا کہ وہاں دکانیں بنانا چاہتے ہیں۔ نقشہ منظور کروا چکے ہیں۔ اینٹیں منگوالی ہیں۔ مار پیٹ ہو جاتی مگر سید لعل شاہ اور حاجی شمس الدین نے بیچ بچاؤ کروا دیا۔ پولیس نے رپورٹ لکھی۔ ہڈیاں بابو قادر بخش کے پاس رکھوائیں۔ رات بھر خالی زمین پر پہرہ دیا۔

۲۶ر دسمبر کو علامہ اقبال، چودھری شہاب الدین، خواجہ دل محمد، خواجہ فیروزالدین، ملک محمد حسین، شیخ عظیم اللہ اور چودھری فتح محمد معاینے کے لیے گئے۔ صدر بلدیہ ملک محمد حسین نے کہا کہ دکانیں بنانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔ جو نقشہ منظور ہوا تھا، منسوخ کر دیا جائے گا۔[3]

---

[1] شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص۳۵۳-۳۵۱ پر مولانا علم الدین سالکؔ سے مؤلف کی گفتگو۔

[2] زمیندار ۲۲ر دسمبر ۱۹۲۶؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص۱۹

[3] اختر النسا (۲۰۱۰)، اقبال اور زمیندار، ص۱۱۷۔ بحوالہ زمیندار ۲۸ دسمبر ۱۹۲۶ء

اُس روز ککے زئی برادری نے علامہ کے اعزاز میں دعوتِ طعام دی۔ ملک برکت علی نے مسلمانوں کا شکریہ ادا کیا۔ علامہ نے اپنی تقریر میں کونسل کے مسلم ارکان سے استدعا کی کہ دیہاتی اور غیر دیہاتی کے امتیازوں سے کنارہ کش ہو کر متحدہ طور پر اسلام اور وطن کی خدمت انجام دیں۔[1] لاہور کے ککے زئی "ملک" کہلاتے تھے۔ علامہ نے "حضراتِ ملائکہ" کہہ کر مخاطب کیا اور بتایا کہ اگرچہ ملک کی جمع ملوک ہے لیکن وہ انہیں اس لیے ملائکہ کہہ رہے ہیں کیونکہ قرآن مجید میں آیا ہے کہ مومنوں کی مدد کے لیے ملائکہ نازل ہوتے ہیں اور ککے زئیوں نے انتخاب میں علامہ کی مدد کی ہے۔ "حضرت علامہ غالباً یہ بھول گئے کہ ان کے مدمقابل بھی 'ملک' ہی کہلاتے ہیں (گو وہ ککے زئی نہیں ہیں)،" عبدالمجید سالک نے اپنے کالم 'افکار و حوادث' میں لکھا۔ "اس کے علاوہ دو چار 'ککے زئی ملک' بھی ایسے موجود ہیں جنھوں نے علامہ کے خلاف رائے دی تھی۔ غالباً علامہ اس کا یہی جواب دیں گے کہ فرشتوں کی دو قسمیں ہیں: بعض رحمت کے فرشتے ہوتے ہیں اور بعض عذاب کے۔"[2]

حکومت کی رپورٹ کے مطابق انتخاب کے دوران دو رُجحانات ظاہر ہوئے تھے۔ اول یہ ظاہر ہوا کہ عوام عدم تعاون کی غیر آئینی سیاست سے بیزار ہو کر آئینی سیاست کی طرف بڑھنا چاہتے ہیں۔ دوسرا رجحان ہندو مسلم تصادم کا تھا۔[3] انتخاب سے پہلے کانگریس نے کہا تھا کہ کونسلوں میں منتخب ہونے کے بعد حکومت کی مخالفت کی جائے۔ اس اصول نے کانگریس کو تین گروہوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ ایک گروہ اب بھی انتخاب کے خلاف تھا۔ اس کے سرغنہ گاندھی تھے۔ انتخاب ان کی سیاسی موت ثابت ہوا۔ دوسرا گروہ سوراج پارٹی تھی۔ کانگریس کے اصول پر قائم تھے۔ نتائج خلاف نکلے:

ا مرکزی اسمبلی کی ہندو نشستوں میں سے یہ بہت کم حاصل کر سکے۔ اُن میں سے بیشتر نشستیں مدراس اور بنگال سے تھیں۔ یوپی سے ایک نشست ملی۔ وہ پنڈت موتی لعل نہرو کی تھی۔ مہاسبھا کی مہربانی سے بلامقابلہ منتخب ہوئے۔ سی پی سے بھی ایک اور بمبئی سندھ

---

[1] زمیندار ۲۸/دسمبر ۱۹۲۶ء؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۲۰

[2] اختر النسا (۲۰۱۰)، اقبال اور زمیندار، ص ۲۸۲۔ سالک کا کالم ۲۹/دسمبر ۱۹۲۶ء کے زمیندار میں چھپا۔

[3] Coatman, *India in 1926-27,* p.47

سے دو نشستیں ملیں۔ پنجاب سے کوئی نشست نہ ملی۔

۲ صرف مدراس اور بنگال کی صوبائی کونسلوں میں سوراجیوں کی حالت اچھی تھی۔ پنجاب کی صوبائی کونسل میں صرف دو نشستیں ملیں۔ صوبائی کانگریس کمیٹی کے صدر اور سیکرٹری بھی انتخاب ہار گئے۔ ان میں سے ایک ضمانت ضبط کروا بیٹھا۔ یوپی کی صوبائی کونسل میں پچھلی دفعہ سوراج پارٹی نے اکتیس نشستیں حاصل کی تھیں۔ اب اُنیس رہ گئیں۔ سی پی میں چوالیس سے پندرہ رہ گئیں۔ بمبئی سندھ میں گیارہ رہ گئیں۔

کانگریس میں تیسرا گروہ باغیوں پر مشتمل تھا۔ یہ منتخب ہو کر وزارتیں قبول کرنے کے حق میں تھے۔ رِسپانسوسٹ (responsivist) کہلاتے تھے۔ عدم تعاون کے اصول اور کانگریس کی حکمتِ عملی کے کھلے منکر تھے۔ بہار اور اڑیسہ میں کامیابی حاصل کی۔ پنجاب میں کانگریس کے سکھ نمایندوں نے کانگریس کے معاہدے پر دستخط کرنے سے پہلے پنجاب سکھ لیگ کی اطاعت کے معاہدے پر دستخط کیے۔ عملاً کانگریس کے بجائے سکھ لیگ کے وفادار تھے۔[1]

ہندو نشستوں پر حقیقی کامیابی انتہاپسند ہندوؤں نے حاصل کی۔ بعض مقامات پر کانگریس کے باغی ارکان کے ساتھ مل کر "آزاد کانگریس پارٹی" قائم کی۔ دوسری جگہوں پر ہندو مہاسبھا کا نام لیا، جس کی قیادت پنڈت مدن موہن مالوی اور لالہ لاجپت رائے کر رہے تھے۔[2] اگلے برس جوہرؔ نے کہا کہ ہندوستان بظاہر "اب... لالہ لاجپت رائے کا ہے۔"[3]

مسلم نشستوں پر کامیاب ہونے والے اِن جماعتوں سے الگ رہے۔ زیادہ تر آزاد اُمیدوار تھے۔ ان میں سے اکثر نے مسلم لیگ، خلافت کمیٹی یا جمعیت العلمائ میں سے کسی نہ کسی کی حمایت حاصل کی۔[4] خلافت کمیٹی اور جمعیتُ العلمائ کی قیادت رسمی طور پر کانگریس کے ساتھ بھی وابستہ تھی۔

---

[1] Mitra: *Indian Quarterly Register July-Dec. 1926*, p.74

[2] Coatman, *India 1926-27,* p.51-52

[3] ابو سلمان شاہجہانپوری (۱۹۹۳) علامہ اقبال اور مولانا محمد علی، ص ۱۱۹

[4] ۹-۱۹۲۸ء کی آل انڈیا مسلم کانفرنس میں مسلمانوں کی یہی تنظیمیں شریک ہوئیں؛ دیکھیے ۳۱/ دسمبر ۱۹۲۸ء

"کانگریس اب صرف اپنی پچھلی ساکھ کے سہارے زندہ ہے،" سرکاری رپورٹ میں لکھا گیا۔ اکتالیسواں اجلاس آسام کے شہر گوہٹی میں ۲۶/ سے ۲۸/ دسمبر تک ہوا۔ شری نواس آئینگر نے صدارت کی۔ جداگانہ نیابت کی مخالفت کی۔ مذہب اور سیاست کی علیحدگی پر زور دیا۔ گاندھی نے سوامی شردھانند کے قتل کی مذمت میں قرارداد پیش کی۔ جوہرؔ نے قرارداد کی حمایت کی۔ سین گپتا نے قرارداد پیش کی کہ کانگریس کے اصول کو دہراتے ہوئے قرارداد پیش کی کہ کانگریس وزارتیں قبول نہ کرے۔ پنڈت مالوی، جنہیں انتخاب کے زمانے میں کانگریس نے دشمن قرار دیا تھا، اجلاس میں بڑی گرمجوشی کے ساتھ دوبارہ قبول کیے جا چکے تھے۔ انہوں نے کہا کہ مدراس کے سوا کہیں بھی کانگریس اکثریت میں نہیں ہے کہ اُسے وزارت پیش کی جائے۔ مدراس کے کانگریسی پہلے ہی وزارت ٹھکرا چکے ہیں۔ قرارداد کو عملی سیاست سے سروکار نہیں ہے۔ پھر بھی قرارداد منظور ہو گئی۔[1] "۱۹۲۶ء کے اجلاس کی ساری کاروائی پر عدمِ حقیقت (unreality) کی فضا چھائی ہوئی ہے،" حکومت کی رپورٹ میں لکھا گیا۔

نیشنل لبرل فیڈریشن (نیشنل پارٹی) کا نواں اجلاس ۲۷/ سے ۲۹/ دسمبر تک اکولا میں ہوا۔ سر پی ایس شیو سوامی آئر نے خطبۂ صدارت میں ہندو مسلم فسادات کی ایک اہم وجہ قانون شکنی کے اُس رویے کو بتایا جو عدم تعاون کی تحریک نے پیدا کیا تھا۔[2]

۲۸/ دسمبر کے زمیندار میں جامعہ ملیہ اسلامیہ (نیشنل مسلم یونیورسٹی) دہلی کے لیے چندے کی اپیل شائع ہوئی: "اگر ملک کے لاکھوں مستطیع اشخاص میں سے سو اہلِ خیر ایسے نکل آئیں جو پچاس روپے ماہوار اس عظیم کام کے لیے فراہم کر سکیں تو یہ کام آسان ہو سکتا ہے۔" علامہ اقبال کے ساتھ نواب سر ذوالفقار علی خاں، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، مولانا ابوالکلام آزاد، حکیم اجمل خاں اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری کے دستخط تھے۔[3]

---

[1] INC, *Report of the Indian Natinal Cogress Fortieth Session*

[2] NLF, *Report of the Ninth Liberal Federation of India*

[3] زمیندار: ۲۸/ دسمبر ۱۹۲۶ء؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۲۷۲-۲۷۰

بنام مہاراجہ کشن پرشاد

لاہور، ۲۸ر دسمبر ۲۶ء

سرکار والا تبار!

خوبصورت کرسمس کارڈ [کے لیے] جس سے سرکار کی ملاقات بھی ہر سال ہو جاتی ہے، اقبال سراپا سپاس ہے۔ مبارک باد کا تار تو بھیجا تھا مگر مفصل عریضہ لکھنے کی نوبت نہ آئی۔ اس کی وجہ یہ کہ اب کے میں خود بھی اہل لاہور کے اصرار سے پنجاب کونسل کے الیکشن میں گرفتار تھا۔ الحمدللہ کہ تین ہزار کی مجارٹی سے کامیاب ہوا اور فرصت پا کر یہ عریضہ سرکارِ والا کی خدمت میں لکھ رہا ہوں۔ مجھے یقین ہے سرکار والا کا تقرر حیدرآباد کے لیے بے انتہا برکات کا باعث ہو گا۔ بلکہ میں تو اس بات کا امیدوار ہوں کہ سرکار کا وجود باوجود ان تمام مشکلات کے ازالے کا باعث ہو گا جو اس وقت ہندوستانی رؤسا کو درپیش ہیں۔ اگر سرکار کے اثر و رسوخ کی وجہ سے چیمبر آف پرنسس ہندوستانی رؤسا اور سرکار انگریزی کے تعلقات کے مسئلے کو اپنا سوال بنا لے تو حیرت انگیز نتائج پیدا ہونے کی توقع ہے۔ رائل کمیشن ہندوستان میں عنقریب آنے والی ہے۔ اس مسئلے کی چھان بین کے لیے بین الاقوامی قانون جاننے والوں کی ایک جماعت تیار کرنی چاہیے جو کمیشن کے سامنے شہادت دینے والوں کو اس مسئلے کے مالہٗ وماعلیہ میں پورے طور پر تیار کرے۔ اگر اس مسئلے میں اقبال کی ضرورت ہو تو وہ بھی اپنی بساط کے مطابق حاضر ہے۔ انشاءاللہ سرکارِ والا اُسے خدمت میں قاصر نہ پائیں گے۔ مگر یہ مسئلہ نہایت ضروری ہے۔ اس کی طرف فوری توجہ ہونی چاہیے۔ اس کے حل کا طریق بھی یہی ہے جو میں نے اوپر عرض کیا۔ برار کے متعلق جو طریق اختیار کیا گیا تھا میری رائے ناقص میں صحیح نہ تھا۔ انشاءاللہ ملاقات ہو گی تو مفصل عرض کروں گا۔ امید کہ حضورِ والا مع متعلقین و متوسلین مع الخیر ہوں گے۔

نیاز مند دیرینہ اقبال[1]

کرشن پرشاد کے نام علامہ کے دستیاب خطوط میں سے یہ آخری ہے۔ اِسے لکھنے کے بعد غالباً اُسی شام

---

[1] قریشی (۱۹۸۶) اقبال بنام شاد، ص ۲۸۳-۲۸۲

دہلی روانہ ہوئے ہوں گے۔ اگلے روز وہاں آل انڈیا مسلم لیگ کا اٹھارہواں اجلاس شروع ہوا۔ کانگریس جیسی شان و شوکت نہ تھی۔ پھر بھی لیگ کے عام جلسوں سے بڑھ کر تھی۔ اجمیری دروازے کے باہر پنڈال نصب کیا گیا۔ اسّی کے قریب مندوبین جمع ہوئے۔ ناظرین ملا کر کل تعداد پانچ سو کے قریب پہنچی۔ استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین خان بہادر پیرزادہ محمد حسین تھے۔ سر عبدالرحیم، سر محمد عبداللہ اور سر رحیم بخش بھی موجود تھے۔[1]

محمد علی جناح بھی آئے۔ یہ پہلا موقع ہے جب اُن کے اور علامہ کے اکٹھے ہونے کی شہادت ملتی ہے۔ البتہ ۱۹۴۰ء میں جناح نے کہا، ''ڈاکٹر اقبال آج سے بیس سال پہلے میرے دوست تھے جب کہ میں آل انڈیا مسلم لیگ کا جنرل سیکرٹری تھا۔''[2] اِس حساب سے دوستی چھ برس پہلے شروع ہو چکی تھی۔

پیرزادہ محمد حسین نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا۔ صوبوں کی تقسیم دوبارہ ہونی چاہیے۔ جہاں تک ہو سکے، ہر صوبہ مشترکہ مفادات اور مذہبی، لسانی اور ثقافتی اشتراک کی بنیاد پر بنایا جائے۔ اپنے معاملات خود طے کرے۔ مرکزی حکومت سے تعاون ضرور کرے۔ اقلیتیوں کو تحفظ دیا جائے۔[3] جناح نے شیخ عبدالقادر کو صدارت کی دعوت دی۔ متعدد شعبوں میں اُن کی خدمات کا حوالہ دیا۔ عبدالقادر نے خطبۂ صدارت میں یاد دلایا کہ لیگ ۱۹۰۶ء میں ایک واضح حکمتِ عملی کے ساتھ قائم ہوئی۔ مسلمانوں کے دین، تاریخ اور ادبیات میں بہت سی چیزیں ہیں جن پر مسلمان بجا طور پر فخر کر کے اپنے عظیم ورثے کو ہر قیمت پر باقی رکھنا چاہتے ہیں۔ لیگ کی حکمتِ عملی یہ تھی ملک کی ایک اہم ترین ملت کے طور پر مسلمانوں کے وجود کو تحفظ دینے کے ساتھ ملک کی سیاسی ترقی میں بھی مدد کی جائے۔ یہ حکمتِ عملی ملّت کے بعض بہترین مفکروں نے ترتیب دی۔ اُن میں سے بعض اب گزر چکے ہیں۔ خوش قسمتی سے آغا خاں ابھی حیات ہیں۔ اب ملک سے باہر رہتے تھے اس لیے لیگ ان کی رہنمائی سے محروم ہے۔ یہ

---

[1] Pirzada, *Foundations of Pakistan*, pp.75-106

[2] ۲۴ر مارچ ۱۹۴۰ء کو یونیورسٹی ہال لاہور میں یومِ اقبال کے جلسے سے جناح کا خطاب؛ ہفت روزہ حمایتِ اسلام ۴ر اپریل ۱۹۴۰ء سے؛ شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۳۷۱

[3] یہ نکتہ علامہ نے خطبۂ الہ آباد میں بھی دہرایا۔

بات اہم ہے کہ لیگ اور کانگریس نے جب کبھی متفقہ طور پر مطالبہ پیش کیا وہ ضرور منظور ہوا۔ ۱۹۱۶ء کا میثاقِ لکھنؤ ایک مثال ہے۔ ۱۹۱۹ء میں حکومت نے نئی آئینی اصلاحات نافذ کیں۔ بعض لوگوں نے انہیں ناکافی سمجھا۔ عدم تعاون کی تحریک شروع کی۔ نتیجہ برعکس نکلا۔ آئینی اصلاحات کا عمل تیز ہونے کی بجائے زیادہ سست ہو گیا۔ ۱۹۲۰ء میں منتخب کونسلوں کا آغاز ہوا۔ عدم تعاون کے حامیوں نے انتخاب کا بائیکاٹ کیا۔ ۱۹۲۳ء میں دوسری دفعہ انتخاب ہوا۔ عدم تعاون کے حامیوں میں سے بعض نے حصہ لیا۔ مقصد کونسلوں کو داخلی طور پر تباہ کرنا تھا۔ یہ مقصد حاصل نہ ہو سکا۔ اب تیسری دفعہ انتخاب ہوئے ہیں۔ کتنے ہی لوگ جو پہلے عدم تعاون کے حق میں تھے اب تعاون پر مائل ہو چکے ہیں۔ عدم تعاون کی تحریک کا نتیجہ یہی ہے کہ خود کانگریس اور ہندو قیادت تین حصوں میں بٹ کر رہ گئی ہے۔ مسلمانوں میں دو نئی سیاسی جماعتیں وجود میں آچکی ہیں، خلافت کمیٹی اور جمعیت العلمائ، کیونکہ کانگریس نے لیگ کی بجائے نئی جماعتوں کو ساتھ ملانا بہتر سمجھا تھا۔ ہندو رہنماؤں نے یہ سمجھ کر تحفظِ خلافت کے مطالبے کی حمایت اس لیے کی تھی کہ مسلمان یہ بازی پہلے ہی ہار چکے ہیں اور ترکی بہرحال ختم ہونے والا ہے۔ خلافِ توقع جب ترکی فتح حاصل کر کے اور پہلے سے زیادہ طاقتور ہو کر نکلا تو ہندوستان میں مسلمانوں کی طرف ہندوؤں کا رویہ پھر جارحانہ ہو گیا۔ گاندھی کے دل میں مسلمانوں کے لیے سچی ہمدردی رہی ہو گی مگر سیاست سے ریٹائر ہو چکے ہیں۔ عالی ظرف رہنما سی آر داس کو موت کے بے رحم ہاتھ نے چھین لیا ہے۔ اب ہندوؤں کی قیادت پنڈت مالوی اور لاجپت رائے جیسوں کے ہاتھ میں ہے۔ مہاسبھا کی پالیسی رجعت پسندی پر مبنی ہے۔

۳۰ر دسمبر کو لیگ کے اجلاس کے دوسرے دن سات قراردادیں منظور ہوئیں۔ ایک سوامی شردھانند کے قتل کی مذمت میں بھی تھی۔

۳۱ر دسمبر کی صبح تیسرا اجلاس ہوا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد چوتھا اور آخری اجلاس ہوا۔ اہم ترین قرارداد جناح نے پیش کی۔ گزشتہ برس علیگڑھ کے اجلاس میں مسلمانوں کے بنیادی مطالبات طے کیے گئے تھے۔ اُنہیں دہرایا گیا۔ ایک کمیٹی ترتیب دی گئی۔ ایک اسکیم مرتب کرے۔ جہاں تک ہو سکے دوسری سیاسی جماعتوں کے ساتھ مشاورت کرے۔ یہ اسکیم اُس کمیشن کو پیش کی جائے جو

حکومت کی طرف سے آیندہ آئینی اصلاحات کے لیے مقرر ہونے والا تھا۔ غالباً اِسی حوالے سے جناح نے بعد میں کہا، "۱۹۲۶ء تک آل انڈیا مسلم لیگ ایک تعلیمی سیاسی جماعت تھی۔ بعد ازاں فیصلہ کیا گیا کہ اسے اسلامی ہند کی صحیح نمایندہ سیاسی جماعت بنا دیا جائے۔ جب یہ تجویز ڈاکٹر اقبال کے سامنے رکھی گئی تو اُنہوں نے فوراً لبیک کہا اور اِس کام کے لیے حلف اُٹھایا۔"[1] اس سے لگتا ہے کہ علامہ نے اِس معاملے میں خاص دلچسپی کا اظہار کیا۔ وہ پنجاب کی صوبائی کمیٹی میں شامل تھے۔ اُن کے علاوہ سر محمد شفیع، خان بہادر شیخ عبدالقادر، شیخ محمد صادق، سید محسن شاہ، شیخ دین محمد، پیر تاج الدین، ملک برکت علی، خواجہ گل محمد، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، سید غلام بھیک نیرنگ اور مولوی محبوب عالم تھے۔ مرکزی کمیٹی کے لیے جناح، سر عبدالرحیم، عبدالعزیز، سر محمد شفیع، شیخ عبدالقادر، مولوی محمد یعقوب، سر علی امام، محمد حسین اور سر عبدالقیوم کے نام تجویز کیے گئے۔

قرارداد کی وضاحت کرتے ہوئے جناح نے طویل تقریر کی۔ مسلمان عدم تعاون کے حق میں نہیں ہیں۔ وہ اسمبلیوں کو داخلی طور پر برباد کرنے کے حق میں بھی نہیں ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ۱۹۱۹ء کی آئینی اصلاحات جیسی بھی ہیں، اُنہیں آزمایا جائے۔ اس برس ہونے والے انتخابات نے مسلمانوں کا موقف واضح کر دیا ہے۔[2]

81

علامہ یقیناً ادراک رکھتے ہوں گے کہ اپنی زندگی میں ایک بڑے تغیر کے متعلق اُن کی پیش گوئی پوری ہوئی ہے۔ وہ اپنی ذہنی زندگی کے تین ادوار متعین کرتے تھے:

۱۸۸۷ء–۱۹۰۶ء ــــ جستجو: نو برس کی عمر میں شعر و شاعری اور تصوّف سے دلچسپی کا آغاز ہوا۔ ایم اے کے زمانے میں اِس نے ایک طرح کے "ذہنی الحاد" کو جنم دیا۔ اُس سے مراد مسلمانوں کی مابعدُالطبیعیاتی فکر کو منظم کرنے کی کوشش تھی۔ پی ایچ ڈی کا مقالہ

---

[1] ۲۴ر مارچ ۱۹۴۰ء کو یونیورسٹی ہال لاہور میں یومِ اقبال کے جلسے سے جناح کا خطاب؛ ہفت روزہ حمایتِ اسلام ۴ر اپریل ۱۹۴۰ء سے؛ شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۳۷۱

[2] Pirzada, *Foundations of Pakistan,* pp.75-106

اس کا نقطۂ عروج تھا۔ ۱۹۰۶ء میں اُس کی تکمیل پر اِس رُجحان سے پیچھا چھوٹ گیا۔ بچپن کا دوسرا رجحان یعنی شاعری کا شوق بھی اُسی زمانے میں یکلخت ختم ہو گیا۔

۱۹۲۶ء-۱۹۰۷ء—انکشاف: علامہ نے ملت کی اجتماعی خودی کو بے حجاب دیکھا۔ اسے دُوسروں کو دکھانے کی کوشش میں گوشہ نشیں ہو کر خلافتِ اسلامیہ، اسلام بطور اخلاقی و سیاسی نصب العین اور ملتِ بیضا پر عمرانی نظر جیسے مقالات اور اَسرار و رموز، پیامِ مشرق اور بانگِ درا جیسی شعری تخلیقات پیش کی گئیں۔

۱۹۴۶ء-۱۹۲۷ء—ماورائیت: اب جو دَور شروع ہو رہا تھا اُس میں علامہ برِ صغیر میں ایک مسلم ریاست کو ''مسلمانوں کی اٹل تقدیر'' قرار دینے جا رہے تھے۔ بقیہ زندگی اِسی میں صرف ہونے والی تھیں۔ اُن کی وفات کے بعد ۴۶-۱۹۴۵ء کے انتخاب میں ہندوستان کی ملّتِ اسلامیہ اِس کے حق میں ووٹ دے کر اِس کی تکمیل کرنے والی تھی۔[1]

علامہ کے نزدیک فرد کی زندگی اس حد تک ملّت کے ساتھ مربوط تھی کہ فرد کی زندگی کی مدّت بھی ملّت کی اجتماعی ضروریات ہی سے متعین ہوتی تھی۔[2] آیندہ نسل کی ذہنی تربیت کچھ ایسے انداز میں ہو رہی تھی کہ یہ اصول تسلیم کرنا اُس کے لیے بتدریج مشکل ہو رہا تھا۔[3] ملّت اور فرد کے اس تعلق سے انکار کرنے کے لیے مذہب، فلسفہ، ادب، سیاسیات اور دوسرے علوم سے دلائل آنے والے تھے۔ اُن سب سے قطعِ نظر کر کے اگر ملّت اور فرد کا باہمی تعلق اُس طرح تسلیم کیا جاتا جس طرح علامہ بیان کرتے تھے تو پھر لازماً یہ بھی تسلیم کرنا پڑتا کہ علامہ کی ذہنی زندگی کا ہر دَور ملّت کی کسی نہ کسی اجتماعی ضرورت کے تابع تھا۔ دوسرے لفظوں میں علامہ کی ذہنی زندگی کا ہر دَور اُسی وقت شروع ہوا جب ملّت کی تاریخ بھی ایک نئے دَور میں داخل ہوئی۔ اِس لحاظ سے یہ بات معنی خیز تھی کہ ملّت کے نمایندہ رہنماؤں نے واقعی ملّی تاریخ کے یہی تین ادوار متعین کیے:

---

[1] دیکھیے ۲۴ جولائی ۱۹۲۵ء کے واقعات میں غلام رسول مہر کی ڈائری کا اقتباس

[2] Iqbal, 'The Muslim Community'; see Sherwani, p.119

[3] دیکھیے ۲؍ فروری ۱۹۲۴ء کے واقعات میں مکتوب بنام ہادی حسین

۱۸۸۷ء-۱۹۰۶ء ــ جستجو: محمڈن ایجو کیشنل کانفرنس ہندوستانی مسلمانوں کی طرف سے اتفاقِ رائے کی بنیاد پر ملّت کی تنظیم کرنے کی پہلی اجتماعی کوشش تھی۔ یہ کانفرنس ۱۸۸۶ء کے آخری دنوں میں قائم ہوئی اس لیے صحیح معنوں میں سرگرمی کا آغاز ۱۸۸۷ء میں ہوا۔ اگلے بیس برس تعلیم اور ترقی کے شعبوں پر توجہ مرکوز کر کے اُس شے کی جستجو رہی جو عملاً ایک قوم بنا دے۔ وہ شے دسمبر ۱۹۰۶ء میں کانفرنس ہی کے پلیٹ فارم سے آل انڈیا مسلم لیگ کی صورت میں تخلیق ہوئی۔ لیگ کے بانی نواب سلیم اللہ خاں نے افتتاحی تقریر میں یاد دلایا کہ بیس برس پہلے جو راستہ اختیار کیا گیا تھا، یہ اُسی پر ایک "نیا موڑ" ہے۔

۱۹۰۷ء-۱۹۲۶ء ــ انکشاف: لیگ کا مقصد مسلمانوں کے لیے جداگانہ نیابت کا حق حاصل کرنا تھا۔ اگلے بیس برس مسلمان اس اصول پر مستقل قائم رہے۔ ۱۹۱۶ء میں یہی اصول ہندو مسلم اتحاد کا ذریعہ سمجھا گیا۔ ۱۹۲۰ء میں اسی کی بدولت ہندوؤں کے ساتھ مل کر جدوجہدِ آزادی بھی حصہ بھی لیا گیا۔ جداگانہ نیابت نے مسلمانوں کو موقع فراہم کیا کہ اقلیت میں ہوتے ہوئے اپنی سیاسی زندگی کی تشکیل ایک علیحدہ ملّت کے طور پر کر کے اپنی اجتماعی خودی کا انکشاف کر سکیں۔ ۱۹۲۶ء اس دَور کا اختتام قرار دیا جا سکتا تھا۔ اس برس مسلمانوں نے پہلی دفعہ عام انتخابات میں جداگانہ نیابت کا اصول بھرپور طریقے سے استعمال کیا (پچھلے دونوں انتخابات میں عوام کی شمولیت برائے نام رہی تھی)۔ دوسری طرف اب ہندوؤں کی طرف سے جداگانہ نیابت کی شدید مخالفت ہو رہی تھی۔ مسلمانوں سے کہا جا رہا تھا کہ اس کی بجائے وہ اپنے اکثریتی صوبوں میں خوداختیاری حاصل کرنے پر توجہ دیں۔ عین اِس مرحلے پر علامہ اپنی گوشہ نشینی سے نکل کر عملی سیاست میں داخل ہوئے تھے۔

۱۹۲۷ء-۱۹۴۶ء ــ ماورائیت: اگلے ہی برس مسلم رہنماؤں کی طرف سے یہ اقرار ہونے والا تھا کہ اُن کے اکثریتی صوبوں میں اُن کی حکومت یقینی ہو جائے تو وہ جداگانہ نیابت سے

دستبردار ہونے پر تیار ہوں گے۔ اگلے بیس برس میں علامہ کے پیغام کی اہمیت بتدریج بڑھنے والی تھی۔ یہاں تک کہ اپریل ۱۹۴۶ء میں ہندوستانی مسلمانوں کے منتخب نمایندے علیحدہ ریاست کے قیام کی قرارداد منظور کرتے۔[1]

تیسرا حصہ

82

یکم جنوری ۱۹۲۷ء کو عبدالمجید سالک اور غلام رسول مہر، نارمن کیری (Norman Kerry) اور گریٹا نِسّن (Greta Nissen) کی فلم دی لَو تھیف (*The Love Thief*) دیکھنے گئے۔ ممکن ہے رتن سنیما میں لگی ہو جو علامہ کی کوٹھی کے برابر ہی میں تھا۔ سنیما کے دروازے پر علی بخش سے ملاقات ہو گئی۔ شام کا وقت تھا۔ سالک اور مہر علامہ کے پاس چلے آئے۔ علامہ نے محمود شبستری کی گلشنِ راز کے جواب کا ذکر کیا۔ لکھ رہے تھے یا لکھ چکے تھے:

دیکھنے والے اور نظر آنے والے کی بات ایک راز ہے کہ ہر ذرّے کے دل میں یہ درخواست ہے،
"اے دیکھنے والے مجھے نظر آنے والا سمجھ لو اور ایک نظر کی برکت سے مجھے موجود بنا دو!"
کسی چیز کی ہستی کا کمال اُس کا موجود ہونا یعنی کسی دیکھنے والے کو نظر آنا ہے
اور اُس کا زوال ہمارے سامنے نہ ہونا یعنی ہمارے شعور سے روشن نہ ہونا ہے۔
دنیا ہماری تجلّی کے سوا کچھ اور نہیں ہے اِس لیے کہ روشنی اور آواز کا جلوہ ہمارے بغیر ممکن نہیں۔

رات دس بجے واپسی ہوئی۔ مہر نے علامہ سے سُنا ہوا شعر روزنامچے میں درج کر لیا:

تُو اے شاہد مرا مشہود گرداں   زفیضِ یک نظر موجود گرداں[2]

۲؍ جنوری ۱۹۲۷ء کو علامہ کا کوئی آدمی مہر کے پاس آیا۔ دوپہر ایک بجے وہ علامہ کے پاس پہنچے۔ "کام

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے: Khurram Ali Shafique, *Iqbal: His Life and Our Times*

[2] امجد سلیم علوی (۱۹۸۸) اقبالیاتِ مہر، ص ۲۶۶

اور تگ و دَو" کی نسبت مشورے درکار تھے۔ محمد دین تاثیر کو بھی شامل کیا جا رہا تھا۔

انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کا اجلاس اُس روز میاں سر محمد شفیع کی صدارت میں ہوا۔ چودہ رکنی سب کمیٹی بنی کہ قرآن مجید کی صحیح طباعت کا انتظام کرے۔ ٹیکنیکل تعلیم کی ترویج و ترقی کے لیے اٹھارہ رکنی سب کمیٹی بنی۔ علامہ دونوں کے رکن بنائے گئے۔[1]

شام کو مہر دوبارہ علامہ کے پاس آئے۔ رات دس بجے تک گفتگو رہی۔

83

۳؍ جنوری کو سہ پہر کے وقت نئی مجلس وضعِ قوانین پنجاب (Punjab Legislative Assembly) کے ارکان کونسل چیمبر لاہور میں حاضر ہوئے۔ علامہ اقبال بھی شامل تھے۔ سر آنبا شا سنگھ سکرٹری تھے۔ گورنر سر مالکم ہیلی کا پیغام پڑھ کر سنایا۔ صدارت مسٹر کنگ نے کی۔ عارضی فنانشل کمشنر تھے۔ ارکان نے حلف اٹھایا۔[2] ان میں علامہ اقبال بھی شامل تھے۔

۴؍ جنوری کو بھی اجلاس ہوا۔ علامہ کے پرانے دوست خان بہادر چودھری شہاب الدین مجلس کے صدر منتخب ہوئے۔ سردار بُوٹا سنگھ نائب صدر ہوئے۔[3] مجلس کے اراکین چار گروہوں میں تقسیم تھے۔ ہندوؤں کا گروہ اپنے آپ کو نیشنل ریفارم پارٹی (National Reform Party) کہتا تھا۔ دوسرا گروہ سکھوں کا تھا۔ عملاً دونوں متحد ہو کر کونسل پر چھائے ہوئے تھے۔ تیسرا گروہ نیشنل یونینسٹ (National Unionist Party) تھا۔ دیہی جماعت (Rural Party) بھی کہلاتا تھا۔ اس میں مسلمانوں کے ساتھ ہندو بھی شامل تھے۔ بانی سر فضلِ حسین تھے۔ چوتھا گروہ کانگریس، خلافت کمیٹی اور اکالی سکھوں کے نمایندوں پر مشتمل تھا۔ یہ اپنے آپ کو نیشنلسٹ پارٹی (Nationalist Party) کہتے تھے۔[4] علامہ کسی گروہ میں شامل نہ ہوئے۔

---

[1] انجمن کی قلمی روداد؛ محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶)، اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص ۱۷۹

[2] Mitra *Register Jan.-June 1927,* p.163۔ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل

[3] Mitra *Register Jan.-June 1927,* p.163

[4] Indian Statutory Commission, *Report, Vol 16,* p.88

اُس روز مہاراجہ کشن پرشاد نے علامہ کو انتخاب میں کامیابی پر مبارک باد دیتے ہوئے اپنی وزارتِ عظمیٰ کے حوالے سے لکھا:

میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ حیدرآباد کے معاملات اس مرکز سے بہت آگے گزر گئے جہاں پر ان کو فقیر نے ایک دن پیچھے چھوڑا تھا۔ نہ وہ عہدہ دار ہیں نہ معاملات کے انفصال کا طریقہ۔ مگر میری نگاہ موجودہ تغیرات سے غیر مانوس نہیں ہے۔ جس خدائے بزرگ نے باوجود ہر قسم کی مخالفتوں اور رکاوٹوں کے اعوان و اقران میں کامیاب کیا وہی ہر حال میں کفیل و معین ہو گا... میں نے بھی سنا ہے کہ رایل کمیشن ہندوستان میں آنے والا ہے جو والیانِ ہند و سرکار انگلش کے مسئلے پر غور کرے گا۔ ضرورت اور شدید ضرورت ہے کہ قانون دانوں کی ایک جماعت شہادت کے لیے تیار رہے۔ بے شک آپ کا مشورہ مفید ثابت ہو گا۔[1]

"صبح پیرومرشد نے بلا لیا،" مہر نے ۴؍ جنوری کے روزنامچے میں لکھا، "وہاں صدارت کے متعلق باتیں۔" پیرومرشد سے مراد علامہ تھے۔[2] دسمبر میں شردھانند کے قتل کے بعد پرتاب، ملاپ، ہندو اور دوسرے آریہ سماجی اخبارات میں مسلمانوں اور اسلام کے خلاف نئی لہر اُٹھی تھی۔ لاہور کے مسلمان اِس مسئلے پر جلسہ کرنا چاہتے تھے۔ امکان ہے کہ اُسی کی صدارت کا ذکر تھا۔[3]

84

'گلشنِ راز جدید' مکمل ہوئی۔ نَو سوال بنے۔ اُنہیں ایک مخصوص ترتیب میں رکھ دیا۔

ا سب سے پہلے میں اپنی سوچ کے بارے میں حیران ہوں کہ وہ کیا چیز ہے جسے سوچنا کہتے ہیں، کون سی سوچ ہمارے لیے سفر کی شرط ہے اور کیوں یہ کبھی نیکی اور کبھی گناہ ہے؟ شبستری

---

[1] قریشی (۱۹۸۶) اقبال بنام شاد، ص۴۰۸-۴۰۶

[2] امجد سلیم علوی (۱۹۸۸) اقبالیاتِ مہر، ص۲۶۶

[3] اس قسم کا جلسہ ۳۰؍ جنوری ۱۹۲۷ء کو علامہ کی صدارت میں ہوا۔ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص۲۰ پر ۲۲؍ جنوری کے جلسے کا ذکر بھی ہے مگر حوالہ نہیں دیا گیا۔ تفصیلات متعلقہ تواریخ کے ضمن میں دیکھیے۔

نے کہا کہ سوچنے کا مطلب باطل سے حق کی طرف بڑھنا اور جزو میں کُل کا مشاہدہ کرنا ہے۔ خدا کی رحمتوں پر غور کرنا ضروری مگر خدا کی ذات کے بارے میں سوچنا گناہ ہے۔[1] علامہ نے سوچ اور وجدان کی وحدت پر زور دیتے ہوئے لکھا کہ آدم کے سینے میں ایک نُور ہے۔ اُس کی آگ دلیل و برہان یعنی سائنس اور فلسفہ بن جاتی ہے۔ اُس کی روشنی جبرئیل کے دم سے ہے۔ مذہب اور فنونِ لطیفہ کو جنم دیتی ہے۔ سوچ اور وجدان اُس نور کی آنکھیں ہیں۔ ایک آنکھ اپنی جلوت اور دوسری اپنی خلوت کو دیکھنے کے لیے ہے۔ دونوں آنکھوں سے دیکھنا ضروری ہے۔ ایک آنکھ بند کر لینا گناہ ہے۔ دونوں کی وحدت سے وہ سلطنت پیدا ہوتی ہے جو دین کی جڑواں بہن ہے۔[2]

۲ کون سا سمندر ہے جس کا کنارہ علم ہے اور اُس کی گہرائی میں کون سا موتی ملتا ہے؟ شبستری نے لکھا تھا کہ زندگی ایک سمندر ہے۔ گفتگو ساحل ہے۔ الفاظ سیپ ہیں۔ دل کی دانش وہ موتی ہے جو لفظوں میں بند ہے۔ اسے گفتگو کے ذریعے زندگی کی تہ میں اُتر کر حاصل کرتے ہیں۔ علامہ نے نظریۂ اضافیت کی روشنی میں تشریح کی۔ دنیا ہمیں جیسی دکھائی دیتی ہے، وہ ہمارے دیکھنے پر منحصر ہے۔ اس لیے شعور و آگہی زندگی کے سمندر کا کنارہ تھے۔ گہرائی میں جو موتی ملتا ہے وہ خودی ہے۔[3]

۳ جس کا ہونا محض امکان ہو اُس کا وصال اُس کے ساتھ کیسا جس کا وجود کسی کا محتاج نہیں، اور یہ نزدیکی، دُوری، کم اور زیادہ کا معاملہ کیا ہے؟ شبستری کا جواب تھا کہ جب زندگی اپنے آپ کو عدم میں ظاہر کرتی ہے تو فاصلے جنم لیتے ہیں۔ نزدیکی تمھیں اپنے آپ سے دُور لے جاتی ہے۔ روح و بدن ایک ہیں۔ علامہ نے لکھا کہ دورِ حاضر میں مادے اور روح میں ثنویت تلاش

---

[1] شبستری کی کتاب اور ترجمے کے لیے دیکھیے، E. H. Whinfield, *Gulshan-i-Raz*

[2] اقبال (۱۹۲۷) زبورِ عجم، ص ۲۱۰-۲۰۷

[3] اقبال (۱۹۲۷) زبورِ عجم، ص ۲۱۴-۲۱۱

کی جا رہی ہے۔ یہ خرابی یورپ نے پیدا کی ہے۔ اسی لیے تُرک بھی مُلک اور دین میں ربط نہیں دیکھ پا رہے۔ دُنیا صرف مٹّی نہیں ہے۔ خدا کی سوانحِ حیات کا گزرتا ہوا لمحہ ہے۔ [1]

۴ جو ہمیشہ سے ہے اور جسے بنایا گیا وہ ایک دوسرے سے جدا کیسے ہوئے کہ ایک دُنیا ٹھہرا اور دوسرا خدا ہوا؟ جسے پہچانا جا رہا ہے اور جو پہچان رہی ہے وہ اگر خدا کی ذات ہی ہے تو پھر یہ انسان کے دماغ میں کیا سودا سمایا ہے؟ شبستری کے مطابق قدیم یعنی جو ہمیشہ سے ہے اور محدَّث یعنی جسے بنایا گیا، ایک دوسرے سے جدا نہیں تھے۔ ہم خدا کو اُس کے نُور سے پہچانتے ہیں۔ علامہ نے لکھا کہ غیر کو تخلیق کرنے میں خودی کی زندگی ہے۔ اس لیے معروف یعنی جسے پہچانا جا رہا ہے اور عارف یعنی جو پہچان رہا ہے، ان کے درمیان جدائی ہی بہتر ہے۔ در حقیقت اِس جدائی کے باوجود وصال قائم ہے۔ ہمارے قدیم اور محدَّث بھی ہمارے اندازے ہیں۔ ایک خودی دوسری میں نہیں سما سکتی۔ اپنا عین ہونا اس کا کمال ہے۔

۵ میں کون ہوں، مجھے میری خبر دیجیے اور یہ اپنے آپ میں سفر کرنے کا مطلب کیا ہے؟ شبستری کے مطابق ''مَیں'' کا اشارہ ہستیٔ مطلق یعنی خدا کے لیے تھا۔ ہم اپنے آپ کو ''مَیں'' اور دوسرے کو ''تُم'' (یا ''تُو'') کہتے ہیں۔ در حقیقت ہستیٔ مطلق کی اُس جھلک کی طرف اشارہ کر رہے ہوتے ہیں جو فرد میں متعین ہو گئی ہے۔ اپنے آپ میں سفر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ زمان و مکان سے بلند ہو کر دُنیا سے نکل جاؤ۔ اپنے آپ میں ایک دنیا بن جاؤ۔ علامہ نے لکھا کہ خودی کا پہلا عکس زندگی ہے۔ زندگی بیدار ہوئی تو اُس کے باطن کی وحدت نے بیشمار وجود پیدا کیے۔ ان میں سے ہر ایک اپنی جگہ ایک خودی ہے۔ اپنے آپ میں سفر کرنا در حقیقت دوبارہ پیدا ہونے کی طرح ہے۔ یہ پیدایش ماں باپ کے بغیر ہوتی ہے۔ اس میں انسان آسمان کے سب سے اونچے ستارے پر کمند ڈالتا، ایک لمحے میں ابد کو سمیٹ لیتا اور

---

[1] اقبال (۱۹۲۷) زبورِ عجم، ص ۲۱۸-۲۱۵

سورج کی روشنی کے بغیر دیکھتا ہے۔[1]

۶ وہ حصہ کون سا ہے جو پورے سے زیادہ ہے اور اُسے پانے کا طریقہ کیا ہے؟ شبستری کے نزدیک وجودِ مطلق پوری کائنات سے زیادہ تھا کہ اُسی وحدت سے کائنات کی کثرت ظاہر ہوئی۔ وحدت کائنات کے ظاہر میں نہیں بلکہ باطن میں ہے۔ اُسے وہیں پا سکتے ہیں۔ علامہ نے وجودِ مطلق کے لیے خودی کی اصطلاح استعمال کی۔ پچھلے جواب میں وضاحت کر چکے تھے۔ وہی خودی دنیا کی تقدیر بھی ہے۔ اُسے پہچان کر ہم اُسے حاصل کرتے ہیں۔ تب اندازہ ہوتا ہے کہ ہم آزاد ہیں۔ بظاہر مجبور دکھائی دیتے ہیں۔ آنحضورؐ نے بھی فرمایا کہ ایمان، جبر اور قدر کے درمیان ہے۔[2]

۷ وہ مسافر کون ہے جو راستے پر چل رہا ہے اور کس کے بارے میں کہہ سکتے ہیں کہ وہ انسانِ کامل ہے؟ شبستری کا جواب تھا، ''وہ جو اپنی اصل سے آگاہ ہو گیا۔'' علامہ نے لکھا کہ ذاتِ حق کا دیدار کرنا زندگی کا کمال ہے۔ وہ تمہیں دیکھتا ہے اور تم اُسے دیکھتے ہو۔ اُس نُور کے سمندر میں گم نہ ہو۔ اُس کے ذریعے اپنے آپ کو مزید مستحکم کر لو۔ ایسا کرنے والا دنیا کی امامت کرتا ہے۔ ہم تم ادھورے ہیں۔ وہ پورا ہے۔[3]

۸ اَنا الحق کس نکتے کا بیان ہے اور کیا آپ کے خیال میں یہ مبہم بات بالکل فضول تھی؟ شبستری کے لحاظ سے انا الحق ''اَسرارِ مطلق''یعنی سب سے گہرے راز کا انکشاف تھا۔ صرف حق ہی انا الحق کہہ سکتا ہے۔ علامہ نے لکھا کہ عجم اُس قدیم نظریے کا اسیر ہو گیا کہ خدا سو رہا ہے اور ہمارا وجود اُس کا خواب ہے۔ اِس لیے ''مَیں'' کا تصوّر زندگی نے فریب کھا کر پیش کیا ہے۔ اس کے جواب میں انا الحق کہنا در حقیقت خودی کی تحقیق کے لیے اپنے آپ میں گم ہونا

[1] اقبال (۱۹۲۷) زبورِ عجم، ص ۲۲۶-۲۲۳

[2] اقبال (۱۹۲۷) زبورِ عجم، ص ۲۳۰-۲۲۷

[3] اقبال (۱۹۲۷) زبورِ عجم، ص ۲۳۴-۲۳۱

ہے۔ یہ "صدّیقِ خودی" کے درجے پر فائز ہونا ہے۔ علامہ نے اس سلسلے میں منصور حلاج کے ساتھ ہندو فلسفی شنکر کا ذکر بھی کیا۔[1]

۹ کون ہے جو وحدت کے راز سے بالآخر واقف ہوا اور وہ بات کیا ہے جو عارف کو معلوم ہوتی ہے؟ شبستری کا جواب تھا کہ وحدت کے راز سے وہی واقف ہو سکا جس نے راستے کے کسی مقام کو منزل نہ بنایا۔ عارف کا دل، وجود سے شناسا ہوتا ہے۔ وجودِ مطلق کا مشاہدہ کرلیتا ہے۔ علامہ نے لکھا کہ دنیا میں ہر چیز کے لیے فنا ہے۔ ہم ہمیشہ کی زندگی چاہتے ہیں۔ ہماری یہ طلب پوری بھی ہو سکتی ہے۔ خودی کو لازوال کیا جا سکتا ہے۔[2]

آخر میں لکھا:

تم تلوار ہو، اپنی چھپی ہوئی صلاحیتوں سے باہر آؤ۔ نکلو اور نیام سے باہر آؤ!
اپنے ممکنات سے نقاب اٹھاؤ۔ چاند، سورج اور ستاروں کو اپنی آغوش میں لے لو۔
اپنی رات کو یقین کے نور سے روشن کرو، اپنی آستین سے یدِ بیضا باہر نکالو۔
جس نے اپنے دل پر آنکھیں کھولیں اُس نے ایک چنگاری بوئی اور پروین کی فصل کاٹی!
میرے باطن سے اُچٹی ہوئی چنگاری لے لو کہ میں رومی کی طرح گرم خون ہوں
ورنہ نئی تہذیب سے آگ لے لو، اپنا ظاہر روشن کرو اور اندر سے مر جاؤ![3]

علامہ نے سوالات جس ترتیب میں رکھے، اُس کی وجہ سے ایک خاص تسلسل پیدا ہوا۔ مدراس کی مسلم ایسوسی ایشن کے لیے چھ خطبات کی حامی بھری تھی۔ اُن میں سے ہر خطبہ اسی ترتیب میں ایک ایک سوال کا مفصل جواب بنتا گیا۔ بعد میں ساتواں خطبہ دیا۔ وہ ساتویں سوال کا جواب ثابت ہوا۔ اگلی شعری تصنیف، جاویدنامہ، میں آسمانی سفر بیان کیا۔ سات منزلوں سے گزرے۔ ہر منزل بالترتیب

---

[1] اقبال (۱۹۲۷) زبورِ عجم، ص ۲۳۸-۲۳۵

[2] اقبال (۱۹۲۷) زبورِ عجم، ص ۲۴۲-۲۳۹

[3] بیاض زبورِ عجم؛ نیز اقبال (۱۹۲۷) زبورِ عجم، ص ۲۴۳

پہلے سات سوالوں میں سے ایک ایک کے جواب کی تمثیل تھی۔[1] معلوم نہیں یہ مضمرات علامہ کے ذہن میں تھے یا نہیں۔ بعد میں اِتنا ضرور کہا:

اگر ہو ذوق تو خلوت میں پڑھ زبورِ عجم
فغانِ نیم شبی بے نوائے راز نہیں[2]

85

علامہ یورپین نومسلموں کی کانفرنس چاہتے تھے۔ ہندوستان میں موجود یورپین مسلمانوں کی فہرست تیار کی جاتی۔ یورپ اور امریکہ سے کم از کم آٹھ دس افراد بلوائے جاتے۔ سو یورپین مسلمان جمع ہو جاتے تو خوب ہوتا۔ اجلاسوں کے لیے ٹکٹ لگائے جاسکتے تھے۔

علامہ سمجھتے تھے کہ قبولِ اسلام کا تعلق دماغ سے زیادہ دل سے ہے۔ نومسلموں سے معلوم کرنا چاہیے کہ اسلام کی کون سی بیساختہ ادا اُن کے دل کو بھا گئی۔ روایت ہے کہ ایک نومسلم انگریز جوڑا کسی مقدمے میں ملوث ہو کر علامہ کے پاس آیا۔ بری ہو گیا۔ خاتون کا نام لیڈی بارنس بتایا گیا ہے۔ اُس نے علامہ کو اپنے قبولِ اسلام کا واقعہ سنایا۔ وہ ایک ہوٹل کی مالکہ تھی۔ ایک ستّر سالہ بوڑھا مسلمان ملازم تھا۔ اُس کا نوجوان بیٹا فوت ہو گیا۔ لیڈی بارنس نے تعزیت کی۔ بوڑھے نے آسمان کی طرف انگلی اُٹھا کر کہا کہ خدا نے اپنی چیز واپس لے لی۔ کچھ عرصے بعد بہو اور پھر پوتا بھی فوت ہو گئے۔ بوڑھے نے ہر موقع پر صبر و شکر کا اظہار کیا۔ قبرستان میں بھی اطمینان سے عزیزوں کی قبریں درست کر کے دعا کی۔ ''اب میرے دل پر ایک نشتر چلا اور مجھے محسوس ہوا کہ یہ بڈھے کی نہیں بلکہ یہ اُس دینِ حق کی خوبی ہے جس کا یہ بڈھا پیرو ہے،'' لیڈی بارنس کا کہنا تھا، ''دنیا بھر میں کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس کا

---

[1] ڈاکٹر سید عبداللہ نے بھی متعلقات خطباتِ اقبال میں 'گلشنِ راز جدید'، خطبات اور جاویدنامہ کے درمیان فکری ربط کا تذکرہ کیا ہے۔

[2] اقبال (۱۹۳۶) بالِ جبریل

مسلمانوں کی طرح ایمان پختہ ہو۔"[1]

ممکن ہے اِسی جوڑے کے حوالے سے وسیمہ مبارک نے کہا ہو کہ علامہ نے کسی نو مسلم انگریز ادیب اور اُن کی بیگم کو کھانے پر بلایا۔ بیگم بھی انگریز تھیں مگر اُردو بول سکتی تھیں۔ زنانے حصے میں سردار بیگم سے ملنے گئیں۔ وسیمہ کو علامہ کی بیٹی سمجھیں۔ بہت تعریف کی۔ بعد میں علامہ نے وسیمہ سے کہا، "سیما! تم نے ان محترمہ پر کیا جادُو کر دیا تھا..."[2]

انگریز نو مسلم محمد مارماڈیوک پکتھال (Marmaduke Pickthal) ان دنوں مسلم ایسوسی ایشن مدراس کے تحت لیکچر دے رہے تھے۔ حیدرآباد دکن میں رہتے تھے۔ جنوری ۱۹۲۹ء میں وہاں سے سہ ماہی جریدہ اسلامک کلچر بھی شروع ہوا۔ اس کی ادارت پکتھال ہی کر رہے تھے۔ علامہ نے انہیں بھی نو مسلم یورپینوں کی کانفرنس کے سلسلے میں خط لکھا۔ اُنہوں نے دلچسپی کا اظہار نہ کیا۔[3]

اسلامک کلچر کے پہلے شمارے میں ترکی کے شہید وزیرِ اعظم پرنس سعید حلیم پاشا کا مضمون 'اسلامی معاشرے کی اصلاح' ('The Reform of Muslim Society') شائع ہوا۔ ۱۹۲۱ء میں ان کی شہادت سے کچھ عرصہ پہلے فرانسیسی زبان میں منظرِ عام پر آیا تھا۔ یہ ترجمہ تھا۔ لاہور میں جمعیۃ دعوت و تبلیغ اسے کتابچے کی صورت میں بھی شائع کر رہی تھی۔[4] سعید ترکی میں اُس جماعت کے قائد رہے تھے جسے حزبِ اصلاحِ مذہبی کہا جاتا تھا۔ علامہ نے ان کا موقف یوں سمجھا کہ اسلام نے حریت، مساوات اور اخوت کو ایک وحدت میں سمویا ہے۔ جس طرح انگریزی ریاضیات اور فرانسیسی کیمیا نہیں ہوتی، اُسی طرح ترکی اسلام، عربی اسلام، ایرانی اور ہندی اسلام وغیرہ نہیں ہو سکتے۔ بدقسمتی سے اسلام کی سچائی پر قبل از اسلام کے عربی، عجمی اور ترکی توہمات کا غلاف چڑھ گیا ہے۔ اسے اتارنے کی

[1] قاضی عبدالمجید قرشی کی روایت؛ عبداللہ قریشی (۱۹۸۶) 'اقبال کی باتیں اور ملاقاتیں' ص ۱۲۱-۱۱۷

[2] خالد نظیر صوفی اقبال درونِ خانہ، ص ۷۱۔ مصنف نے اپنی والدہ وسیمہ مبارک کے حوالے سے روایت کیا۔ واقعے کے وقت وسیمہ مبارک کی عمر گیارہ بارہ برس تھی۔

[3] مکتوب بنام میر غلام بھیک نیرنگ ۲۴/ جنوری ۱۹۲۷ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۶۱

[4] Pasha, 'The Reform of Muslim Society'

ضرورت ہے۔

علامہ ترکی فکر کے دوسرے دھارے کے ساتھ اس کا موازنہ کیے بغیر نہ رہ سکے جو حزبِ وطنی کہلاتا تھا۔ اُس جماعت کے نزدیک قومی زندگی کا بنیادی جزو ریاست تھی۔ مذہب کا کوئی علیحدہ وظیفہ (function) نہ تھا۔ اس لیے ریاست اور کلیسا کو علیحدہ کر دینا چاہیے۔ علامہ کے نزدیک یہ بات معنی خیز تھی کہ اس بنیادی اختلاف کے باوجود دونوں دھارے ایک ہی نتیجے پر پہنچے تھے"۔ یعنی اجتہاد کی مکمل آزادی، اور جدید افکار اور تجربات کی روشنی میں قانونِ شریعت کی از سر نو تشکیل"!

علامہ کی نظر میں سعید نے بہت بلند مقام حاصل کیا۔ اس کے باوجود اُن کی تمام باتوں سے متفق نہ ہو سکے۔ سعید انتخاب کے قائل ضرور تھے مگر ضروری سمجھتے تھے کہ ریاست کا اقتدار فردِ واحد کے پاس ہو۔ ترک جمہوریہ نے، جو سعید کی شہادت کے بعد وجود میں آئی، اجتہاد کیا تھا کہ خلیفہ کا منصب فردِ واحد کے بجائے منتخب اسمبلی کو تفویض کیا جا سکتا ہے۔ علامہ کے نزدیک بالکل درست تھا۔ علامہ کے نزدیک اسلام میں ریاست اور کلیسا کی علیحدگی کی اجازت بھی دیتا تھا۔ شیعہ سیاسی نظریے میں یہ اصول شروع سے موجود تھا۔ لیکن ریاست اور کلیسا کی علیحدگی ایک فرسودہ نظریہ تھی۔ اسلام سے پہلے کے ایک غلط نظریے پر قائم تھی یعنی روح اور مادے کی ثنویت (duality of spirit and matter)۔ اسلام ایک نئی منزل کی طرف اشارہ کرتا تھا جہاں روح اور مادہ، ریاست اور کلیسا ایک وحدت ہیں۔ علامہ، کلسیا اور ریاست کی علیحدگی کو جدّت نہیں بلکہ قدامت قرار دے کر اُس کی مخالفت کر رہے تھے۔[1]

86

میر حسن الدین احمد کی عمر قریباً چوبیس برس تھی۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے بی اے کیا تھا۔ خاص مضمون فلسفہ تھا۔ ایل ایل بی کر کے وکیل ہوئے تھے۔ علامہ کے پی ایچ ڈی کے مقالے کا اُردو ترجمہ شائع کرنا چاہتے تھے۔ اجازت مانگی۔ علامہ نے ۱۱؍ جنوری کو جواب دیا:

---

[1] Iqbal, *Reconstruction*

مجھے کوئی تامل نہیں، آپ بلا تکلف اس کا ترجمہ شائع فرما سکتے ہیں۔ مگر میرے نزدیک اس کا ترجمہ کچھ مفید نہ ہو گا۔ یہ کتاب اب سے اٹھارہ سال پہلے لکھی گئی تھی۔ اس وقت سے بہت سے نئے امور کا انکشاف ہوا ہے اور خود میرے خیالات میں بھی بہت سا انقلاب آ چکا ہے۔ جرمن زبان میں غزالی، طوسی وغیرہ پر علیحدہ علیحدہ کتابیں لکھی گئی ہیں جو میری تحریر کے وقت موجود نہ تھیں۔ میرے خیال میں اب اس کتاب کا تھوڑا سا حصہ باقی ہے جو تنقید کی زد سے بچ سکے۔ آیندہ آپ کو اختیار ہے۔ میری رائے میں ترجمہ کرنے سے بہتر یہ بات ہے کہ آپ خود ایسی تاریخ لکھیں۔[1]

مولانا گرامی کا دستی خط ملا۔ بیمار تھے۔ ۱۳/ جنوری کو علامہ نے لکھا کہ لاہور ضرور تشریف لائیں۔ ڈاکٹر محمد حسین سے مشورہ کیا جائے گا۔ ''اس کے علاوہ گلشن راز جدید بھی سناؤں گا،'' علامہ نے لکھا، ''محمود شبستری نے جن سوالات کا جواب گلشنِ راز میں دیا ہے، انہی سوالات پر میں نے زمانۂ حال کے مشاہدات و تجربات کے لحاظ سے نظر ڈالی ہے۔''[2]

اقبالی کیلنڈر

یہ نہایت خوشنما، رنگین کیلنڈر شیخ غلام مصطفی صاحب نے ہمارے پاس بغرضِ اظہارِ رائے ارسال فرمایا ہے۔ اس پر ترجمانِ حقیقت علامہ اقبال کی ایک بہت واضح اور خوبصورت تصویر دی گئی ہے اور اس کے نیچے کیلنڈر کے اوراق منسلک ہیں جن میں ہر ورق پر پورے مہینے کی تاریخیں مندرج ہیں۔ تعطیلات کے خانے سیاہ بنائے گئے ہیں۔

اس کیلنڈر کی لطیف خصوصیت یہ ہے کہ ہر مہینے کے ورق پر علامہ کا ایک ایسا شعر درج کیا گیا ہے جس سے کنایتہ اس مہینے یا موسم کا کوئی تعلق ہے۔ مثلاً جنوری کے ورق پر یہ شعر لکھا گیا ہے:

---

[1] مکتوب بنام میر حسن الدین، ۱۱/ جنوری ۱۹۲۷ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۵۶-۶۵۵

[2] مکتوب بنام گرامی، ۱۳/ جنوری ۱۹۲۷ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۵۹-۶۵۷

آفتاب تازہ پیدا بطنِ گیتی سے ہوا
آسماں ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم کب تلک

ہمیں یقین ہے کہ اس کیلنڈر کو مسلمان ہاتھوں ہاتھ خریدیں گے۔ قیمت فی کیلنڈر پانچ ہے، دو آنے کی ٹکٹ آنے پر روانہ کیا جاسکتا ہے۔ تاجروں کو کافی کمیشن دیا جاتا ہے۔ ہمارے نزدیک حضرت علامہ کی تصویر اس قیمت میں بالکل مفت ہے۔ ملنے کا پتا: شیخ غلام مصطفی تاجر کتب: رنگ محل، لاہور۔

یہ اشتہار زمیندار کے ۱۴/ اور ۲۵/ جنوری ۱۹۲۷ء کے شماروں میں آیا۔[1] ۱۴/ جنوری کے زمیندار میں لکھا گیا کہ پنجاب کونسل کے کئی ذی اثر رُکن یعنی آزاد اُمیدواروں کی پارٹی بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہندو، سکھ اور مسلمان سب شامل ہوں گے۔ یہ جماعت صوبے کے طبقات کے ''جائز و واجبی حقوق'' کا تحفظ کرے گی۔ ہو سکتا ہے کہ علامہ اقبال ہی اس کے رہنما بن جائیں۔[2]

اُس روز علامہ پنجاب کونسل کی دو اسٹینڈنگ کمیٹیوں کے رُکن بنے۔ سالِ رواں یعنی ۱۹۲۷ء کے لیے بنائی گئی تھیں۔ فنانس کمیٹی میں تیرہ ارکان تھے۔ فنانس ممبر (وزیر) بھی رکن تھے۔ کونسل کے نامزد اراکین میں سے خان بہادر میاں فضل حسین، سردار جوگندر سنگھ اور منوہر لال شامل ہوئے۔ منتخب اراکین میں علامہ کے علاوہ سردار اُجل سنگھ، سردار حبیب اللہ، لالہ موہن لال، ڈاکٹر گوکل چند نارنگ، خان بہادر ملک محمد امین خاں، رائے صاحب چودھری چھوٹو رام اور سید محمد حسین شامل تھے۔ تعلیمی کی کمیٹی میں دس اراکین تھے۔ وزیر تعلیم کے علاوہ نامزد ارکان میں سے سر جارج اینڈرسن سی آئی ای شامل تھے۔ منتخب اراکین میں علامہ کے علاوہ سردار نرائن سنگھ، بخشی ٹیک چند، ڈاکٹر شیخ محمد عالم، خان بہادر شیخ عبد القادر، چودھری بلدیو سنگھ، دین محمد اور چودھری دُلی چند تھے۔[3]

---

[1] اختر النسا (۲۰۱۰)، اقبال اور زمیندار۔

[2] حنیف شاہد (۱۹۷۶)، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۷۹

[3] پنجاب لیجسلیٹو کونسل سٹینڈنگ آرڈر ۴، پنجاب گزٹ ۱۴/ جنوری ۱۹۲۷ء حصہ پنجم، ص ۱۰۲؛ شاہد (۱۹۷۷)، ص ۸۰

آقائے دوجہاں ؐ کو گالیاں دینے والے کا حشر

مقدمہ رنگیلا رسول کا فیصلہ

لاہور ۱۸/ جنوری۔ مسٹر فیلبوس مجسٹریٹ درجہ اول کی عدالت میں "رنگیلے رسول" کا مقدمہ جو ایک مدت سے چل رہا تھا۔ آج اُس کا فیصلہ سنا دیا گیا ہے۔ کتاب کے مصنف راجپال کو ڈیڑھ سال قیدِ سخت اور ایک ہزار روپیہ جرمانہ کی سزا دی گئی ہے۔ فیصلہ سنانے کے بعد ملزم جیل بھیجدیا گیا۔

بعد کی خبر

سنگھٹنیوں کی ایک جماعت یہ کوشش کر رہی ہے۔ کہ ملزم کو ضمانت پر رہا کرایا جائے۔ اور اس تگ و دو میں وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی ہے۔

یہ خبریں ۲۰/ جنوری کے زمیندار میں تھیں۔ اگلے روز لکھا گیا کہ سزا ہونے پر راجپال کو ہتھکڑی لگا کر جیل بھیجا گیا۔ کوٹھڑی میں بند کر کے چکی پیسنے کے لیے دی گئی۔ ۱۹/ جنوری کو فیصلے کے خلاف سیشن کورٹ میں اپیل ہوئی۔ سیشن جج مسٹر نکولس نے ایک ایک ہزار کی دو ضمانتیں طلب کیں۔ پرتاب کے مہاشہ کرشن مدیر پرتاب اور سردار کرم سنگھ نے ایک ایک ہزار کے دو مچلکے دیئے۔ راجپال ضمانت پر رہا ہوا۔ مقدمہ کی آیندہ تاریخ ۳۱/ جنوری مقرر ہوئی۔ [1]

یورپین مسلمانوں کی کانفرنس کے لیے تین آدمیوں نے چندہ دینے کی حامی بھری۔ آٹھ ہزار کا وعدہ ہو گیا۔ علامہ کا خیال تھا کہ باقی روپیہ عام مسلمان دینے پر تیار ہو جائیں گے۔ رقم کا ایک بڑا حصہ لاہور ہی سے جمع ہو جاتا۔ کچھ کمی رہ جاتی تو والیٔ بھوپال سے درخواست کرنے کا ارادہ تھا۔ انگلستان میں بھی کسی سے خط کتابت کر رہے تھے۔ مطلوبہ رقم کے وعدے تک اعلان نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ۲۰/ جنوری کو میر غلام بھیک نیرنگ کو خط لکھا۔ دریافت کیا کہ اُن کی جمعیت کیا مدد کر سکتی ہے۔ [2]

---

[1] زمیندار ۲۰/ اور ۲۱/ جنوری ۱۹۲۷۔ تراشے امجد سلیم علوی کے فائل سے حاصل کیے گئے ہیں۔

[2] مکتوب بنام غلام بھیک نیرنگ ۲۰/ جنوری ۱۹۲۷ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۲۶۰

۲۲/ جنوری کو لاہور میں باغ بیرون موچی دروازہ میں مسلمانوں نے احتجاجی جلسہ کیا۔ علامہ نے صدارت کی۔ افتتاحی خطبہ دیا۔[1]

۲۴/ جنوری کو صبح سویرے علی بخش کو بھیج کر مہر کو بلوایا۔ مہر کے روزنامچے میں کونسل اور ارکان کے حوالے سے "کالیا وغیرہ" اور "کالیے" کی غلط بیانی کے متعلق استفسار کا تذکرہ ملتا ہے۔ اس کے ساتھ درج ہے، "مالی کمیٹی کا معاملہ۔ پہلے مخالفت کا تہیّہ۔ پھر اصل واقعات۔ رائے بدل گئی۔ زمین کا معاملہ۔" یہ معلوم نہیں کہ کالیے سے کون مراد تھا۔ سوامی شردھانند کے قتل کے ملزم عبدالرشید کے بارے میں کچھ قانونی مشورے بھی ہوئے۔ زبورِ عجم کی اشاعت کے انتظام کی اطلاع دی۔ دوپہر ایک بجے مہر رخصت ہوئے۔[2]

اُس روز علامہ کو غلام بھیک نیرنگ کا خط ملا۔ نومسلم یورپینوں کی کانفرنس بلوانے میں اُن کے کوئی دوست مدد کرنے پر تیار تھے۔ علامہ نے اُسی وقت جواب دیتے ہوئے لکھا، "جو مسلمان یورپین ہندوستان میں موجود ہیں، اُن کی فہرست تیار کی جائے گی۔ آپ فی الحال اس فہرست کی تیاری میں مدد دیں اور اپنے احباب کو خطوط لکھ کر اُن کے مفصل پتے دریافت کریں... اپنے دوست سے کہیں کہ فی الحال یہ خیال کانفیڈنشل ہے۔"[3]

علامہ اقبال کی تازہ تصنیف ــــ زبورِ عجم

نہایت مسرت کے ساتھ قارئین کرام کو یہ مژدہ سنایا جاتا ہے کہ علامہ اقبال کی تازہ تصنیف زبور عجم بالکل مکمل ہوگئی ہے اور سنا جاتا ہے کہ دوچار روز میں اس کی کتابت شروع ہوجائے گی۔ زبور عجم میں علامہ موصوف کی حیات افروز فارسی غزلوں اور نظموں کے علاوہ دو مثنویاں بھی شامل ہیں ایک "بندگی نامہ" اور دوسری محمود شبستری

---

[1] رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتار اقبال، ص ۲۰

[2] امجد سلیم علوی (۱۹۸۸) اقبالیاتِ مہر، ص ۲۶۶

[3] مکتوب بنام غلام بھیک نیرنگ ۲۴/ جنوری ۱۹۲۷ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۶۱-۶۶۰

کی گلشن راز کا جواب۔

زمیندار ۲۶/ جنوری ۱۹۲۷[1]

۲۷/ جنوری کو مہر نے کتاب کے پہلے حصے کے لیے نام تجویز کیے: یزدان نامہ، شاہد و مشہور، ناز و نیاز، بزمِ شہود، عبد و معبود۔ علامہ کو 'یزدان نامہ' پسند آیا۔

۲۹/ جنوری کو مشہور شاعر اصغر گونڈوی آئے۔ علامہ نے ان کی ایک فارسی غزل بہت پسند کی۔ اس کی ضمین میں دو شعر کہے۔ اصغر نے اجازت لی کہ تبرکاً اپنے مجموعہ کلام میں علامہ کے نام کے ساتھ شامل کریں۔[2] مہر آئے تو اصغر کے علاوہ پروفیسر شیرانی اور دوسرے لوگ بیٹھے تھے۔ علامہ نے مہر سے کہا کہ زبورِ عجم کے دوسرے حصے کا نام بھی تجویز کریں۔ اصغر گئے۔ شیخ عظیم اللہ اور وطن اخبار والے مولوی انشأاللہ آئے۔

انشأ ہندوؤں کی کتابیں پڑھ رہے تھے۔ سوالات پوچھے۔ علامہ نے جواب دیا کہ اسلام دنیا کے لیے بالکل نیا آؤٹ لُک (outlook) ہے۔ مسلمانوں نے یونانی فلسفے سے ایک پرانا آؤٹ لُک لے لیا۔ اُسی کی روشنی میں قرآن کو بھی دیکھنے لگے۔ اعداد کے متعلق یونانیوں کا تصوّر تعینِ حدود (demarcation) کا تھا۔ اس کا رَد سورۂ کہف کی ایک بیحد مشہور آیت میں ہے۔ اصحابِ کہف کے حوالے سے "بعض لوگ کہیں گے کہ وہ تین ہیں، چوتھا اُن کا کُتّا؛ اور بعض کہیں گے کہ پانچ ہیں، چھٹا اُن کا کُتّا؛ اور بعض کہیں گے کہ وہ سات تھے اور آٹھواں اُن کا کُتّا تھا۔ کہہ دو کہ میرا پروردگار ہی اُن کے شمار سے خوب واقف ہے..."۔ اعداد کے بارے میں موجودہ تصوّر بھی تعلق (relation) کا ہے۔ ممکن ہے کہ گفتگو میں علامہ نے ڈیمارکیشن اور ریلیشن کے الفاظ ہی استعمال کیے ہوں۔ جرمن مفکر اشپینگلر نے ڈیمارکیشن کے بجائے میگنی چیوڈ (magnitude) لکھا تھا۔ تعلق کا تصوّر بالآخر اعداد کے بارے میں فنکشن (function) کے تصوّر پر منتج ہوتا تھا۔ اشپینگلر کا دعویٰ تھا کہ جدید مغربی تہذیب

---

[1] اختر النسأ (۲۰۱۰) اقبال اور زمیندار، ص ۱۰۶

[2] اصغر گونڈوی، سرودِ زندگی، ص ۱۲۴

سے پہلے کسی تہذیب نے یہ تصوّر پیش نہ کیا تھا۔ علامہ کے خیال میں البیرونی کے یہاں بھی یہ تصوّر موجود تھا۔ کسی وقت علیگڑھ کے ڈاکٹر ضیأالدین سے بھی خط کتابت کی۔ انہوں نے تصدیق کی۔

مہر نے اُس روز کی گفتگو کے حوالے سے لکھا ہے کہ بدھ مت کا فلسفہ جزائے اعمال تک محدود تھا۔ قرآن میں روح کی حقیقت بیان ہوئی۔ علامہ اسے یوں سمجھے تھے کہ تناسخ یعنی دوسرے جنم کے عقیدے کے برعکس روح ہر جسم کے ساتھ بنتی ہے۔ قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام روحوں سے اپنی ربوبیت پر گواہی لی، الست بربکم۔ اُس کی حقیقت یہ ہے کہ الست بربکم اب بھی ہوتا ہے۔ علامہ نے کہا کہ قرآن میں جنت، دوزخ اور حشر و نشر سے جگہیں مراد نہیں ہیں۔ یہ حالتیں ہیں، جیسے زندگی ایک حالت ہے۔ موت ایک حالت ہے۔[1]

اُس روز باغ بیرون موچی دروازہ میں ہندو اخبارات کے مسئلے پر مسلمانوں کا دوسرا جلسہ تھا۔ صدارت کے لیے علامہ کو بلایا گیا۔ تذبذب میں تھے۔ اصرار ہوا۔ تب تیاری شروع کی۔ مہر سے کہا کہ ساتھ چلیں۔ انہوں نے عذر پیش کیا۔ علامہ نے کہا کہ کل ضرور آئیں۔[2]

اُس روز سردی زیادہ تھی۔ جلسے کا وقت غروبِ آفتاب کے بعد ساڑھے چھ بجے تھا۔ زمیندار کے مطابق دس بارہ ہزار کے قریب لوگ جمع ہوئے۔ فرقوں اور جماعتوں کی تفریق نہ تھی۔ علامہ نہ

---

[1] امجد سلیم علوی (۱۹۸۸) اقبالیاتِ مہر، ص۲۶۹؛ یہاں جن نکات کا ذکر ہے ان میں سے اکثر خطبات (*Reconstruction*) میں آئے۔ فنکشن کے تصوّر اور ڈاکٹر ضیأالدین کے ساتھ خط کتابت کا تذکرہ علامہ نے پانچویں اورینٹل کانفرنس کے خطبۂ صدارت نومبر ۱۹۲۸ء میں کیا؛ Sherwani, pp.170-171

[2] امجد سلیم علوی (۱۹۸۸) اقبالیاتِ مہر، ص۲۶۸؛ مہر کے روزنامچے میں ہے، ”جلسہ کی صدارت کے لیے بلایا جانا۔ تذبذب۔ اصرار پر تیاری۔ مجھے حکم۔ عذر۔ کہنے لگے کل ضرور آنا۔“ ۔ رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص۲۰ پر جلسے کی تاریخ ۳۰/ جنوری لکھی ہے۔ ۲/ فروری کے زمیندار کا حوالہ دیا گیا ہے جو درست ہے مگر تاریخ غلط ہے۔ زمیندار کی خبر شروع ہوتی ہے، ”لاہور ۳۰/ جنوری۔ کل شام کے ساڑھے بجے...“ مطلب یہ کہ جلسہ ۲۹/ جنوری کو ہوا۔ ویسے بھی پچھلا جلسہ ۲۲/ جنوری کو ہوا جو سنیچر کا دن تھا۔ ۲۹/ جنوری کو بھی سنیچر تھا۔ آدھی رات تک جاری رہنے والے جلسے کے لیے یہ دن موزوں تھا۔ ۳۰/ جنوری کو اتوار تھی جب آدھی رات تک جلسہ ہونا کچھ عجیب ہوتا کہ اگلی صبح لوگوں کو کام پر جانا تھا؛ زمیندار کا عکس امجد سلیم علوی کے فائل سے حاصل کیا گیا۔

پہنچے تو احمدی جماعت کے ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ نے تحریک پیش کی کہ ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین عارضی صدر بنیں۔ کسی نے تائید کی۔ قرآنی آیات کی تلاوت ہوئی۔ 'جوابِ شکوہ' کے چند بند پڑھے گئے۔ ایک اور نظم پڑھی گئی۔ خلیفہ شجاع نے جلسے کے مقاصد بیان کیے:

> سوامی شردھانند کے قتل پر مسلمانوں کے زعما اور اُن کی انجمنوں کی طرف سے اظہارِ افسوس کیے جانے کے باوجود ہندو عام مسلمانوں اور اسلام کو محض اس لئے بدنام کر رہے ہیں کہ سوامی جی کا بیان کردہ قاتل اتفاقیہ طور پر مسلمان واقع ہوا ہے... ہم سب کا فرض ہے کہ اِس قسم کے حادثات کے مضر نتائج کو مٹانے کی سعی کریں۔ اور اِسی بات پر غور کرنے کے لیے ہم سب اِس مقام پر جمع ہوئے ہیں۔

محمد علی امیر جماعت احمدیہ لاہور نے کہا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ انہیں یہاں مل کر رہنا ہے۔ اس دوران علامہ آ گئے۔ اللہ اکبر کے نعرے گونجے۔ علامہ کرسیٔ صدارت پر بیٹھے۔ ایک عقید تمند نے اُن کے، خلیفہ شجاع کے اور محمد علی کے گلے میں سنگتروں کے ہار ڈالے۔ مولانا غلام مرشد نے "پرجوش وعظ" کیا۔ انہوں نے کہا کہ قریشِ مکہ نے آنحضورؐ کے خلاف گستاخی اور جارحیت کا یہی طریقہ اپنایا تھا۔ اسلام کے شاعر حسان بن ثابتؓ نے جوابی اشعار میں الزامات دُور کئے۔ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ معاہد یعنی مسلمانوں کے ہم وطن کفار کے بُتوں کے حق میں بھی برا بھلا مت کہو۔ محض اُن الزامات کو دُور کرتے رہو جو مسلمانوں پر لگائے جاتے ہیں۔ شیخ عظیم اللہ نے سیرتِ طیبہ پر آریہ سماجیوں کی طرف سے کئے گئے کچھ الزامات کے جواب دیئے۔

رات بہت گزر چکی تھی۔ حاضرین کے اصرار پر علامہ نے خطاب کیا۔ زمیندار کے نمایندۂ خصوصی کے مطابق انہوں نے کہا، "آپ نے عمل کرنے کے لائق ایسی باتیں سنی ہیں کہ مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کو صبح تک یاد بھی رہیں گی یا نہیں۔" سچائی کو ایسا ہیرا قرار دیا جس کے ہر پہلو سے مختلف رنگ کی شعائیں نکل رہی ہیں۔ اسلام اسے دیکھنے کا مطلق نقطۂ نگاہ ہے اس لیے "کسی کو یہ نہ کہا جائے کہ تم باطل پر ہو۔" انسان اپنی طبیعت اور تربیت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

صداقت کے ہیرے سے اپنی پسند کے رنگ کی شعاع قبول کرتے ہیں۔" اس اختلاف کا نتیجہ یہ نہ ہونا چاہیے کہ آپس میں سر پھٹول ہو۔ قرآن میں حکم دیا گیا ہے کہ اے لوگو! اگر تم فروعی امور میں متحد نہیں ہو سکتے تو اسی ایک بات پر اتحاد کر لو جو تم سب میں متفق ہے۔" اسلام اور زمانہ قدیم کے بعض رشیوں کی تعلیم میں مماثلت ہے۔ مثال کے طور پر سنسکرت کا ایک اشلوک پڑھا۔ مفہوم قرآن کی آیت کے مطابق تھا، کل شئ ھالک الا وجہ اللہ نحن اقرب الیہ من حبل الورید۔ پھر کہا:

> میں تم سے صداقت کے نام سے اپیل کرتا ہوں کہ خدا کے لیے حقائق کی طرف دیکھو اور آپس میں نہ لڑو۔ ہندوستان میں بعض ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنی اغراض کے لیے تمہارے درمیان پھوٹ ڈالنے کی مساعی میں رہتے ہیں۔ اگر تم آپس میں لڑو گے تو ملک میں بدامنی ہو گی۔ سب کو تکلیف اٹھانی پڑے گی۔ ہندو پرانے قصے تازہ کر رہے ہیں لیکن گڑے مُردوں کو اُکھاڑنے سے کیا فائدہ ہے:
>
> قفس میں اے ہم صفیر اگلی شکایتوں کی حکایتیں کیا
> خزاں کا دورہ ہے گلستان میں نہ تو رہے گا نہ ہم رہیں گے[1]
>
> اگر تمہارے دل میں اس امر کا سچا جذبہ موجود ہے کہ ہم عزت و آبرو کی زندگی بسر کریں تو متحد ہونے کی صورت پیدا کرو۔ کاش یہ لوگ دوسرے ممالک کی سیر کرتے اور دیکھتے کہ غلامی کی زندگی کے باعث ہندوستان کی کیا قدر ہے۔ فروعی مذہبی جھگڑوں میں اشتعال دلانے سے نقصان ہو گا۔ ہمارے لیے متحدہ قومیت کا تصور اچھا ہے اگرچہ اس اعلیٰ مقصد کے حصول میں دقتیں ہوں گی۔ لیکن جب ہم اس مقصد بلند پر پہنچ جائیں گے تو بڑی لذت حاصل کریں گے اور کہیں گے کہ وقت ضائع نہ ہو۔ پس اے ہندوؤ اور مسلمانو! تم ایسے تعلقات پیدا کرو کہ ہم اختلاف برداشت کر لیا کریں۔[2]

---

[1] علامہ کا متروک شعر ہے۔ ۱۹۱۳ء میں کشن پرشاد نے بھی لاہور میں تقریر کرتے ہوئے پڑھا۔

[2] زمیندار ۲/ فروری ۱۹۲۷ء؛ بشکریہ امجد سلیم علوی

۳۰؍ جنوری کی شام علامہ کے مکان پر چودھری محمد حسین، مہر، حاجی دین محمد کاتب، ملک لال دین قیصر اور آسؔ اکٹھے تھے۔ زبورِ عجم کی بیاض میں سے نظمیں چھانٹنے کا کام حسبِ معمول محمد حسین کر رہے تھے۔ علامہ اور محمد حسین کی گفتگو کے حوالے سے مہر نے نوٹ کیا ہے، "صدائے فقیر کے ایک بند کی ترتیب"۔ معلوم نہیں اس سے کون سی نظم مراد ہے۔ مغرب کی نماز کے وقت علامہ اندر چلے گئے۔ نماز کے بعد بندگی نامہ اور گلشنِ راز جدید کے آغاز پڑھ کر سنائے۔ شیخ اصغر علی آئے۔ مسلمانوں کے متعلق حکومت کی روش پر باتیں ہوئیں۔ مضمون لکھنے کا فیصلہ ہوا۔ ساڑھے آٹھ بجے شیخ اصغر گئے۔ علامہ نے پھر مثنویاں سنائیں۔ ناموں پر بحث ہوئی۔ رات دس بجے مہر واپس گئے۔ [1]

87

عبدالرشید طارق کہتے ہیں کہ اس برس کسی وقت اُن کے دادا حاجی احمد بخش انہیں اور اُن کے بھائیوں حمید اور مجید کو ساتھ لے کر علامہ سے ملنے گئے۔ گرامی کا ذکر آیا۔ علامہ نے کہا کہ گرامی نے اپنا بہت کم کلام قلمبند کیا ہے۔ کسی کو چاہیے کہ اُن کے ساتھ رہ کر لکھتا جائے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ مر جائیں اور ساتھ ہی لے جائیں۔ [2]

۳۱؍ جنوری کو گرامی کو خط لکھا۔ علامہ کی طرف سے گرامی کے نام آخری خط ثابت ہوا۔ [3]

بنام گرامی

لاہور، ۳۱؍ جنوری ۲۷

ڈیر مولانا گرامی، السلام علیکم!

کئی دن ہوئے آپ کے خط کے جواب میں خط لکھا تھا۔ نہ آپ خود تشریف لائے نہ آپ کا خط پہنچا۔

---

[1] امجد سلیم علوی (۱۹۸۸) اقبالیاتِ مہر، ص ۲۶۸-۲۶۷

[2] عبدالرشید طارق، 'مے شبانہ'، ص ۲۴۳۔ طارق نے لکھا ہے کہ اس ملاقات کے دوران علامہ نے اُن کے دادا سے کہا، "حاجی صاحب نوجوانوں کی آیندہ نسلیں میری مٹھی میں ہیں۔"

[3] مکتوب بنام گرامی، ۳۱؍ جنوری ۱۹۲۷؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۶۳-۶۶۱

ڈاکٹر محمد حسین صاحب سے آپ کی علالت کا ذکر میں نے کیا۔ وہ آپ کے علاج کے لیے تیار ہیں۔ ضرورت ہوئی تو کسی اور ڈاکٹر سے بھی مشورہ کیا جائے گا، آپ ضرور تشریف لائیے۔ بہت سے لوگ آپ کی زیارت کے مشتاق ہیں۔ ایک صاحب لال دین قیصر نام، جو پنجابی کے شاعر اور آپ کے ہم قوم ہیں اور جو اس وقت یہاں میرے پاس بیٹھے ہیں ہر روز پوچھتے تھے کہ آپ کو یہاں لاہور آئے ہوئے بہت مدت گذر گئی ہے، لہٰذا امید ہے کہ اپنے علاج کی خاطر اور نیز مشتاقانِ زیارت کے خیال سے ضرور لاہور آئیں گے۔ زندگی کا کوئی اعتبار نہیں، دیرینہ ہم خیالوں کی صحبت میں جو دم گذر جائے غنیمت ہے۔ اس کے علاوہ یہ عرض ہے کہ میری کتاب زبور عجم ختم ہو گئی ہے۔ ایک دو روز تک کاتب کے ہاتھ میں جائے گی اور پندرہ دن کے اندر شائع ہو جائے گی۔ اس کے چار حصے ہیں، پہلے حصے میں انسان کا راز و نیاز خدا کے ساتھ، دوسرے حصے میں آدم کے خیالات آدم کے متعلق۔ طرز دونوں کی غزلیات کے موافق یعنی الگ الگ غزل نما ٹکڑے ہیں۔ تیسرے حصے میں مثنوی گلشن راز (محمود شبستری) کے سوالوں کے جواب ہیں۔ اس کا نام میں نے مثنوی گلشن راز جدید تجویز کیا ہے۔ چوتھے حصے میں ایک مثنوی ہے، جس کا نام میں نے بندگی نامہ تجویز کیا ہے۔ مثنوی کا مضمون یہ ہے کہ غلامی کا اثر فنون لطیفہ مثلاً موسیقی و مصوری وغیرہ پر کیا ہوتا ہے۔ کل مجموعے کا نام زبور عجم ہے۔ آپ ہر حصے کا کوئی موزوں اور مناسب نام تجویز کریں تو عین نوازش ہو۔ میں نے مختصراً ہر حصے کا مضمون لکھ دیا ہے جس سے آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ مقصود کیا ہے۔ خط کا جواب جلد آئے۔ باقی خدا کے فضل و کرم سے خیریت ہے۔ امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔ یہ مطلع کیسا ہے:

تو نہ دانی کہ نگاہے رعاہے چہ کند   در حضور تو دعا گفتہ برہ آمدہ ایم

والسلام   مخلص محمد اقبال

88

زبورِ عجم کی بیاض کاتب کے حوالے کی گئی۔ کتابت شروع ہوئی۔ ایک شعر میں علامہ نے مزید ترمیم

کی۔ غالباً پروف کی کاپیوں پر ترمیم ہوئی کیونکہ مسودے میں درج نہ کی گئی۔[1]

سگمنڈ فرائیڈ (Sigmund Freud) نے فن پر تبصرہ کیا تھا۔ اسے ناآسودہ جنسی خواہشات کا نتیجہ قرار دیا تھا۔ اُن کا ماخذ بہرحال بچپن کے بالکل ابتدائی تجربات میں تھا۔ علامہ نے محسوس کیا کہ یہ ماں کے پیٹ میں گزارے ہوئے ایام کو تمام فنون کا سرچشمہ قرار دینے والی بات ہے۔ مولانا روم کا شعر یاد آیا کہ جو بھی اپنی اصل سے دُور ہو جائے، وہ دوبارہ وصل کے زمانے کی جستجو کرتا ہے۔ لیکن فرائیڈ کی نفسیات اس اصل کو صرف مادی وجود تک محدود کرتی تھی۔ اسلام انسان کو دوسری طرف لے جاتا تھا۔ اسلامی ثقافت اُن لوگوں کا رَد تھی جو ماں کے پیٹ کی طرف رغبت کو ثقافت کی بنیاد بناتے تھے۔ ۷ر فروری کو مہر آئے تو یہی گفتگو ہوئی۔ آنحضورؐ کی سیرت پر بھی بات ہوئی۔ علامہ نے کہا کہ حج پر چلیں۔ مہر نے جواب دیا کہ آپ تیار ہو جائیں، ہمارا کیا ہے۔[2]

بانگِ درا کے دوسرے اڈیشن کا اشتہار زمیندار میں ۱۰ر فروری ۱۹۲۷ء کو شائع ہوا۔ اس ماہ کی ۱۶ر اور ۲۴ر تاریخ، مارچ کی ۱۷، اپریل کی ۱۹ر اور مئی کی ۳۱ر تاریخ کو بھی اشتہار دوبارہ شائع ہوا۔

نادر موقع خوشخبری نادر موقع

علامہ ڈاکٹر شیخ سر محمدؒ اقبال صاحب کے ٹی بیرسٹر ایٹ لاَ کے اُردو کلام کا مجموعہ موسومہ بانگِ درا کا دوسرا اڈیشن نہایت آب و تاب سے بہت عمدہ کاغذ پر طبع ہو گیا ہے، لکھائی اور چھپائی مثل سابق دیدہ زیب ہے، سرورق بھی اب کے نہایت خوبصورت ہے اور ہر ایک جلد ڈاکٹر صاحب موصوف کی تصویر سے مزّین ہے۔ باوجود ان تمام خوبیوں کے سابق قیمت مبلغ چار روپے کے بجاے دو روپے آٹھ آنے علاوہ محصول ڈاک صرف ان

---

[1] بیاض زبورِ عجم میں 'مصوری' والے حصے میں ۱۹۴۴ء میں چودھری محمد حسین کے دو حاشیے درج ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے: ''ڈاکٹر صاحب نے چھپنے سے پہلے اس مصرع میں ترمیم کر دی۔ جو اِس مسودہ میں درج نہیں ہے۔''

[2] امجد سلیم علوی (۱۹۸۸) اقبالیاتِ مہر، ص۲۶۹؛ علامہ نے خطبات (*Reconstruction*) میں بھی فرائیڈ کے نظریہ لاشعور پر تنقید کی ہے۔ سیرتِ طیبہؐ اور ثقافتِ اسلامی کی روح کا ذکر وہاں بھی ساتھ ساتھ ہوا ہے۔

اصحاب سے لیے جاویں گے جو ۲۱/ مارچ ۱۹۲۷ء تک اپنا آرڈر بھیج دیں گے۔ یک صد کتاب سے زائد کے خریدار کو کمیشن بھی دیا جائے گا۔ دس کتاب کے خریدار کو محصول ڈاک معاف۔ (نوٹ) مجلّد کتاب بھی ایک روپیا زائد خرچ کرنے پر مل سکتی ہے۔ جلد پر بانگ درا اور ڈاکٹر صاحب کا نام سنہرے حروف سے لکھا ہے۔ المشتہر: حکیم شیخ طاہر الدین: بازار انار کلی لاہور۔[1]

۱۳/ فروری کو علامہ نے پنجاب کونسل کے آیندہ اجلاس میں دو تحریکیں پیش کرنے کا نوٹس دیا:

۱ تعلیم یافتہ طبقے میں بیروزگاری کے پیشِ نظر حکومت کو چاہیے کہ بیروزگار تعلیم یافتہ اشخاص کو قطعاتِ اراضی عطا کرے تاکہ وہ اُس میں زراعت کر سکیں۔

۲ حکومتِ ہند نے حکومتِ پنجاب کو سالانہ ٹیکس معاف کر دیا ہے اِس لیے ٹیکسوں میں تخفیف کرنے کے لیے ایک مجلسِ تحقیقات مقرر کر دی جائے تاکہ تخفیف سب محصول گزاروں پر مساوی طور پر تقسیم ہو سکے۔[2]

عبدالرحمٰن چغتائی کی کسی تصویر پر علامہ اور عبداللہ چغتائی نے دیر تک بحث کی۔ عبداللہ کے جانے کے بعد بھی علامہ اس پر غور کرتے رہے۔ ۲۴/ فروری کو عبداللہ کو لکھا، ''میری رائے میں شاید اس تصویر میں یورپ کی تصویر انٹروڈیوس کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ عبدالرحمٰن پھر آئیں گے تو اُن سے مفصل گفتگو ہو گی۔''[3]

۲۸/ فروری کو پنجاب کی صوبائی قانون ساز کونسل کی نشست ہوئی۔ گورنر نے خطاب کیا۔ پچھلی دونوں کونسلوں میں صرف دو وزرا تھے۔ اس دفعہ گورنر نے تین نامزد کیے: سردار جوگندر سنگھ زراعت، ایکسائز اور پبلک ورکس کے؛ منوہر لال تعلیم اور صنعت کے؛ اور ملک فیروز خاں نون لوکل

---

[1] اختر النسا (۲۰۱۰) اقبال اور زمیندار، ص ۱۰۷

[2] زمیندار ۱۵/ فروری ۱۹۲۷ء؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۸۱

[3] مکتوب بنام عبداللہ چغتائی ۲۴/ فروری ۱۹۲۷ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۶۲-۶۶۳

سیلف گورنمنٹ، طب اور صفائی کے وزیر ہوئے۔ سکھ، ہندو اور مسلمان تینوں کی نمایندگی ہو گئی۔

نیشنلسٹ پارٹی کے ڈاکٹر محمد عالم نے فوراًہی وزراُ کے خلاف عدم اعتماد کی قرارداد پیش کرنے کی اجازت چاہی۔ قاعدے کے مطابق تیس اراکین کی تائید ضروری تھی۔ حاصل نہ ہوئی۔[1]

وزیرِ مالیات سر جیوفرے ڈی مونٹمورنسی (Sir Geoffrey De Monmorency) نے آیندہ مالی سال کا بجٹ پیش کیا۔ فنانس سکرٹری ایچ ڈبلیو ایمرسن نے یادداشت پیش کی۔ گزشتہ برس صوبے نے آمدنی سے ۲۳ لاکھ زیادہ خرچ کیا تھا۔ آیندہ برس آمدنی سے ٦۰ لاکھ زیادہ خرچ کرنے کا منصوبہ تھا۔ علامہ خاموش نہ رہنا چاہتے تھے۔[2]

89

اس برس کسی وقت علامہ اقبال اور حکیم احمد شجاع نے اپنےاُردو کورس میں پانچویں جماعت کی کتاب کا اضافہ کیا۔ ۳۰۸صفحات تھے۔ گلاب چند کپور اینڈ سنز لاہور نے تین ہزار کی تعداد میں شائع کی۔ پہلا اڈیشن اب دستیاب نہیں ہے۔ بعد کے اڈیشنوں میں صفحات کی تعداد کم ہو گئی۔[3] اُن میں ۵۳/ اسباق ملتے ہیں۔ ان میں سے ۲۲/ منظومات تھیں: مولانا حالی کی 'خدا کی قدرت'، 'گرمی'، 'گھڑیاں اور گھنٹے'؛ اسمٰعیل میرٹھی کی 'پن چکی' اور 'صبح کی آمد'؛ تلوک چند محرومؔ کی 'تندرستی'، 'اچھا آدمی'، 'کام'، 'بچے کا پہلا احساسِ غم'، 'اندھا لڑکا'، 'مور' اور 'حُبِ وطن (سر والٹر سکاٹ کی شہرۂ آفاق نظم کا ترجمہ)'؛ مولوی حامد حسن قادری کی 'وقت'، 'سچی دوستی' اور 'پھول اور کانٹا'؛ افسرؔ میرٹھی کی 'لوری' اور 'سنجوگتا'؛ مولوی سید احمد کبیر کی 'بہشت بریں' اور 'سرودِ زندگی'؛ کوثرؔ کی 'چاندبی بی کی بہادری'؛ نظیرؔ اکبر آبادی کی 'کرجُگ'؛ اکبرؔ الٰہ آبادی کی 'آنکھ کا نُور'؛ اور دیوانہؔ کی 'ہمت والوں کی صدا'۔

۲۹/ اسباق نثر کے تھے: 'ادب' اور 'تندرستی' (نذیر احمد دہلوی)؛ 'چتّور پن' (مولوی سید احمد

---

[1] Mitra *The Indian Quarterly Register Jan.-June 1927,* p.364

[2] یہ تفصیلات علامہ اقبال کی تقریر سے اخذ کی گئی ہیں جو انہوں نے ۵ مارچ کو کونسل میں کی۔

[3] ڈاکٹر حسن اختر ملک، اقبال، ایک تحقیقی مطالعہ، ص ۱۷۰۔ پہلے ایڈیشن کے مشمولات کا صحیح اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔

دہلوی)؛ 'وقت خود دولت ہے'(نواب محسن الملک)؛ 'نمک کی کان'(رسالہ مخزن)؛ 'ہاتھی'(مولانا سیماب)؛ "شاہجہان کا دربار'(عبدالرحمٰن شوق)؛ 'قول کا پورا صادق'اور 'اصلی اور نقلی پھولوں کی پہچان'(عبداللہ خاں)؛ 'اصلی شرافت'(حمید عالم چشتی)؛ 'تارگھر'(اعظم کریوی)؛ 'روضۂ تاج محل'(سر عبدالقادر)؛ 'ہاتھوں کی نمائش'(سیفی سہواروی)، 'شہنشاہ اکبر کا بچپن'(محمد حسین آزاد)؛ 'قطب صاحب کی لاٹھ' اور 'ملکہ معظمہ وکٹوریا'(سر سید احمد خاں)؛ 'انگریزی سلطنت کی برکتیں'(مولانا حالیؔ)؛ 'قسطنطنیہ'(پنڈت رتن ناتھ سرشار)؛ 'زمین کی کشش'(عابد حسن فریدی)؛ 'مٹی کا تیل'اور 'دیاسلائی' (خواجہ حسن نظامی)؛ 'والمیک' (سدرشن)؛ 'حواسِ خمسہ' (محمد حسین محوی)؛ 'مکتوباتِ آزاد'(محمد حسین آزاد)؛ 'اندھی گونگی اور بہری عورت' اور 'بہارستان کا آسیب'(حکیم احمد شجاع)؛ 'نمک کا داروغہ'(منشی پریم چند) اور مصنفین کے ناموں کے بغیر 'وفادار غلام'، 'شیر شاہ سوری'اور 'بنارس'۔[1]

اردو کورس

پانچویں جماعت کے لیے

دیباچہ

اس سے پہلے چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعت کے لیے اُردو کورس تیار کئے گئے تھے۔ جن کو پنجاب، صوبجاتِ متحدہ اور مدراس کی ٹیکسٹ بک بورڈ کمیٹیوں نے منظور فرمایا۔ اور مدارس کے معلمین اور طلباً نے بہ نظرِ پسندیدگی دیکھا۔ اِس وقت یہ کورس عام طور پر ہندوستانی مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ کورس جن اُصولوں کے تحت مرتب کئے گئے تھے۔ قابلِ حوصلہ افزائی ثابت ہوئے۔ اب پانچویں جماعت کا اُردو کورس ہدیۂ ناظرین ہے۔ اس میں بھی اس بات کا خاص طور پر لحاظ رکھا گیا ہے۔ کہ علم ادب کے مضامین اس طرح جمع کئے جائیں۔ کہ طلباً کو نئی معلومات حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ اُردو زبان سے دلبستگی پیدا ہو۔ اور وہ ایسے اندازِ تحریر سے واقف ہو جائیں۔ جو اِظہارِ

---

[1] اُردو کورس پانچویں جماعت کے لیے

مطالب پر حاوی ہو۔ مضامین کے انتخاب میں زمانۂ حاضرہ کی تمام ضروریات کا خیال رکھا گیا ہے۔ اور کوشش کی گئی ہے۔ کہ مضامین ایسے دلکش اور پر اثر ہوں کہ بچوں کی طبیعت خود بخود راغب ہو۔ یہ مضامین بچوں کے دل میں مادرِ وطن کی محبت۔ اخلاقی جرأت اور ادبی ذوق پیدا کرنے کے لئے اہل ہیں۔ اُمید ہے۔ کہ معلمین ان کو پڑھاتے وقت اُن تمام جذباتِ عالیہ کو طلباء کے دل و دماغ پر نقش کرنے کی کوشش کرینگے۔ جو مضامین کی تہ میں موجزن ہیں۔ بچوں کی تعلیمی مشکلات کو کم کرنے کے لئے ایک فرہنگ کا اضافہ کر دیا گیا ہے۔ اور قواعدِ اُردو کے اصولوں کو ان اسباق کے ذریعے آسان طریقے پر ذہن نشین کرنے کے لئے ہر سبق کے اختتام پر مشقی سوالات لکھ دیئے گئے ہیں۔ خدا کرے یہ کورس بھی پہلی کتابوں کی طرح طلباء کے دل میں علم ادب کا ذوق پیدا کرنے میں کامیاب ہو۔ اور وہ اس قابل ہو جائیں۔ کہ اپنے خیالات کا اظہار صاف اور سلیس اُردو میں کر سکیں۔ کہ حقیقت میں یہی تمام درسی کتب کا منشا ہے

ہم جناب قبلہ سید اولاد حسین شاداں بلگرامی پروفیسر پروفیسر اورینٹل کالج لاہور کے ممنونِ احسان ہیں۔ کہ اُنہوں نے اس نصاب کی زبان پر نظرِ ثانی فرمائی۔ حضرت ممدوح اہلِ زبان ہیں۔ اور ان کا علم و فضل کسی مزید تعارف کا محتاج نہیں

مؤلفین

اُردو کورس کی ساتویں جماعت کی کتاب کی شرح مقبولِ عام ڈپو وزیر آباد نے شائع کی۔ ممکن ہے اور شرحیں بھی شائع ہوئی ہوں۔[1]

۳؍مارچ کو اسکول سب کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین صدارت کر رہے تھے۔ ایم محمد دین کنوینر تھے۔ پروفیسر دیوی دیال رکن تھے۔ علامہ کی مرتبہ آئینۂ عجم میں سے سب کمیٹی کی ہدایت کے مطابق ابتدائی ۱۱۳؍صفحات نکال کر نیا ایڈیشن عطرچند کپور پبلشرز نے پیش کر دیا تھا۔

[1] ڈاکٹر حسن اختر ملک، اقبال، ایک تحقیقی مطالعہ، ص ۱۸۱-۱۸۰

۱۶۴/ صفحات تھے۔ قیمت دس آنے۔ سب کمیٹی نے منظوری دے دی۔[1] ترمیم شدہ کتاب 'ملّت و دولتِ ایران' سے شروع ہوتی تھی۔ اس سے پہلے کے تمام اسباق حصہ نثر میں سے نکال دیئے گئے۔ اکثر پرانی نثر کے نمونے تھے۔ حصہ نظم میں سے کوئی سبق خارج نہ کیا گیا۔[2]

۴/ مارچ ۱۹۲۷ء کو اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں مذہب اور سائنس کے موضوع پر قادیانی جماعت کے سربراہ مرزا بشیر الدین محمود نے تقریر کی۔ علامہ اقبال نے صدارت کی۔ خطبہ صدارت میں کہا کہ مذہب اور سائنس کے تصادم کا تصور مغربی ہے۔ اِسلام کے مطابق مذہب، فلسفہ، طبیعات اور دیگر علوم و فنون راستے ہیں۔ ایک ہی منزلِ مقصود پر ختم ہوتے ہیں۔ قرآن شریف نے نظریات اور قیاسات کی بجائے مشاہدے کی تعلیم دی۔ منطق کا استقرائی طریقہ سکھایا۔ اس طرح مسلمانوں نے سائنس یعنی علومِ جدیدہ اور فنونِ حاضرہ کا باب کھولا۔ مسلمانوں کی علمی ترقی کا اثر یورپ پر ہوا۔ رومن کیتھولک مذہب والے اِس علمی انقلاب سے متصادم ہوئے۔ ڈاکٹر ولیم جان ڈریپر کی مشہور و معروف کتاب معرکۂ مذہب و سائنس، جس کا ترجمہ ظفر علی خاں کر چکے تھے، مذہب اور سائنس کی نہیں بلکہ عیسائیت اور سائنس کے تصادم کی تاریخ ہے۔ ورنہ "قرآن پاک توصاف الفاظ میں انسان کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ اگر وہ قوائے فطرت پر غلبہ حاصل کر لیں گے تو ستاروں سے بھی پرے پہنچنے کے قابل ہو جائیں گے،" علامہ نے کہا۔ یہ غالباً سورۂ رحمٰن کی سلطان والی آیت کے حوالے سے تھا جس کا تذکرہ عبداللہ چغتائی سے ۵/ اگست ۱۹۲۶ء کے خط میں ہوا تھا۔ خطبے میں علامہ نے کہا، "مسلمانوں میں فرقہ معتزلہ اور دیگر فرقوں کے درمیان جو تنازعہ پیدا ہوا تھا وہ اس قسم کا نہ تھا جو یورپ کے روشن دماغ علما اور تاریک خیال پادریوں کے درمیان پیدا ہوا بلکہ وہ تو ایک علمی بحث تھی جس کا موضوع محض یہ تھا کہ آیا ہمیں الہامی کلامِ ربانی کو عقلِ انسانی کے معیار پر پرکھنے کا حق حاصل ہے یا نہیں؟"[3]

---

[1] ڈاکٹر حسن اختر ملک، اقبال، ایک تحقیقی مطالعہ، ص ۱۳۲۔ ان کا ماخذ پنجاب گزٹ حصہ سوم الف ۲۹/ اپریل ۱۹۲۷ء ہے۔

[2] اقبال (۱۹۲۷) آئینۂ عجم

[3] زمیندار ۶/ مارچ ۱۹۲۷ء؛ محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶)، اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص ۱۱۰-۱۰۹

۵؍ مارچ کو علامہ اقبال نے پنجاب کی صوبائی قانون ساز اسمبلی میں پہلی بار تقریر کی۔ آیندہ مالی سال کا بجٹ زیرِ بحث تھا۔ فروری میں بجٹ پیش ہونے کے بعد سے نئی پیش رفت یہ ہوئی تھی کہ مرکزی حکومت نے اعلان کیا تھا کہ پنجاب کے بقایاجات میں سے چھیاسی لاکھ روپے معاف کرنے پر غور کیا جائے گا۔ یہ ہو جاتا تو بجٹ کے گزشتہ اور آیندہ برس کے خسارے پورے ہو جاتے۔

علامہ کے نزدیک اس طرح حاصل ہونے والی رقم کے دو مصارف ہونے چاہییں تھے:

۱ خواتین کے لیے طبی سہولتوں کی فراہمی

۲ چھوٹے کاشتکاروں کی خوشحالی

علامہ نے کہا کہ ناانصافی ہے کہ بڑے اور چھوٹے جاگیرداروں سے ایک ہی شرح کے مطابق ٹیکس لیا جاتا ہے۔ یہ نظریہ کہ زمین تاجِ برطانیہ کی ملکیت ہے، ہندوستان کی تاریخ کے منافی ہے:

> ... My submission is that money should be spent towards the reduction of taxes, that is to say, towards the removal of the anomaly which exists in our system of taxation. The anomaly I mean is this: that we do not apply the principle of progression in the case of land revenue whereas we apply that principle in the case of income-tax.
>
> The reason why this principle is not applied to land revenue is sometimes found in the barbarous theory that all land belongs to the Crown. Neither in ancient India nor even in the days of the Mughals the Sovereign ever claimed universal ownership. This is the historical aspect of the matter. The Taxation Enquiry Committee also has accepted this position, though half the members of that Committee were of the opinion that land revenue could not be described as a tax, the other half being of the opinion that it is in the nature of a tax. But the fact remains that in this country the Sovereign never claimed any such rights. We are told that the Mughals claimed such rights; but the people of the Punjab owned and possessed the land of this country long before the race of Babar entered into history—the unmistakable lesson of which is that Crowns come and go; the people alone are immortal.[1]

Latif Ahmad Sherwani (1944/1977), *Speeches, Writings and Statements of Iqbal*[1]

۶ / مارچ کو بھی نشست ہوئی۔

نیاز الدین خاں نے غالباً جدید فارسی ادب کے حوالے سے خط لکھا۔ ۸ / مارچ کو علامہ نے لکھا، ''زمانۂ حال کے ایران کی نثر پڑھنے کے قابل ہے۔ نظم میں کچھ نہیں۔ زیادہ تر پولیٹیکل مضامین پر وہ لوگ لکھتے ہیں۔'' ملک الشعرا بہار قزوینی یا مشہدی کے دیوان، ایک مجموعہ اُردی بہشت اور ای جی براؤن کی کتاب *Prose and Poetry of Persia* میں کلام کے نمونوں کا ذکر کیا۔ ''حال کے فارسی شعرا کی کتب مشکل سے دستیاب ہوتی ہیں اور قیمتیں بہت گراں،'' اُنہوں نے لکھا، ''بھنڈی بازار بمبئی میں ملک التجار ایرانی کی مشہور دکان ہے۔ وہاں سے شاید دستیاب ہو جائیں۔''[1]

۹، ۱۰ / اور ۱۱ / مارچ کو کونسل کی نشستیں ہوئیں۔[2] پنڈت نانک چند اور چوہدری افضل حق نے تعلیم کے مسئلے پر تقریریں کیں تو علامہ نے محسوس کیا جیسے کونسل ''مایا'' ہے جسے حقیقت کی دنیا سے واسطہ نہیں۔ ایک سرگرم ہندو تھا اور دوسرا جوشیلا مسلمان مگر دونوں ہی اسکولوں میں پڑھائے ہوئے سبق دہرا رہے تھے: تعلیم سب سے بڑی دولت ہے جس کے ساتھ ہندو، مسلمان، سکھ، سرمایہ دار اور محنت کش سبھی کے مفاد وابستہ ہیں۔ ۱۰ / مارچ کو علامہ نے کہا کہ ایسا نہیں ہے۔ غیر ملکی حکومت مخلص ہو ہی نہیں سکتی۔ انگریز ہندوستان کے عوام کو تعلیم سے دُور رکھنا چاہتے ہیں۔ یہی انگریز کے مفاد میں ہے۔ عوام کا مفاد تعلیم حاصل کرنے میں ہے۔ وزارتِ تعلیم کی رپورٹ کی طرف توجہ دلائی جس کے صفحہ ۲ پر درج تھا کہ تعلیم کو لازمی قرار دینے کی ضرورت ہے۔ میہیو صاحب (Mr. Mayhew) کے بیان کا تذکرہ کیا۔ اُنہیں علامہ ذاتی طور پر بھی جانتے تھے۔ اُنہوں نے کہا تھا کہ تعلیم کی صورت حال غیر تسلی بخش ہے۔ علامہ نے کہا کہ ۴۲ بلدیوں اور ۴۰۰ دیہی علاقوں میں پرائمری تعلیم لازمی قرار دی گئی مگر یہ نہیں بتایا جاتا کہ وہاں کیا ہوتا ہے؟ اسکولوں کی حالت کیسی ہے؟ اساتذہ دستیاب ہیں؟ تعلیم کے نام پر رقم ضائع ہو رہی ہے کیونکہ تعلیم ناقص ہے۔ پرائمری تعلیم لازمی کی جائے:

---

[1] مکتوب بنام نیاز الدین خاں، ۸ / مارچ ۱۹۲۷ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۲۶۶

[2] Mitra *The Indian Quarterly Register Jan.-June 1927,* pp.365-366 نیز Sherwani

A disinterested foreign government is a contradiction in terms. The foreign government in this country wants to keep the people ignorant. A foreign government is a kind of Roman Catholic Church trying to suppress all the agencies but tend to enlighten the laity... Can anybody deny in this House or outside this House that mass education is absolutely essential in the interest of the people? Primary education, secondary education, professional or vocational education are all various aspects of the same problem of mass education ... A very large number of boys join the first class but the money spent upon them is wasted as most of them fail to reach the higher classes. If you are spending a very large amount of money on them, then it is your duty to see that they reach the higher classes. Make them reach the higher classes by compulsion. Therefore my submission is that in so far as primary education is concerned, it is absolutely necessary in the interest of this province to adopt the principle of compulsion at once.[1]

90

بنگال کے ضلع باریسال میں کولکئی کی ایک مسجد کے احاطے میں ان پڑھ کسان مسجد کے سامنے باجا بجانے کے خلاف احتجاج کرنے جمع ہو رہے تھے۔ مجسٹریٹ بلینڈی صاحب کے حکم پر گورکھا سپاہیوں نے گولی چلا دی۔ سترہ مسلمان شہید ہوئے۔ غالباً بنگال ہی سے کسی حمایت الدین ہاشم علی نے تار کے ذریعے علامہ کو واقعے کی تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے لکھا:

ہر حق پرست انسان کا فرض ہے کہ وہ اس طرح کے بے نظیر اور ظالمانہ قتل عام کی طرف خاص طور پر توجہ کرے جو محض ایک شخص کی مطلق العنان اور عاقبت نااندیشانہ لاپروائی کے باعث رونما ہوا۔ بے کس و ستم زدہ خاندانوں کی امداد کے لیے سرمایہ کا افتتاح کر دیا گیا۔ آپ کی ٹھوس امداد، عملی ہمدردی اور رہنمائی کی ضرورت ہے۔

علامہ نے تار زمیندار کو بھجوایا۔ ۱۰ مارچ کے شمارے میں شائع ہوا۔[2]

کرپان یعنی چھوٹی تلوار ہمیشہ ساتھ رکھنا سکھ مذہب کا حکم تھا۔ حکومت نے انہیں اجازت دے

---

[1] Latif Ahmad Sherwani (1944/1977)

[2] اختر النسا (۲۰۱۰) اقبال اور زمیندار، ص ۱۴۰

رکھی تھی۔ باقی مذاہب کو لائسنس کے بغیر تلوار کی اجازت نہ تھی۔ لائسنس ہر شخص کو نہیں ملتا تھا۔ فرقہ وارانہ کشیدگی بڑھنے پر مسلمانوں کے لیے مشکل پیدا ہوئی تھی۔ چودھری افضل حق نے تلوار کی آزادی کے لیے مطالبہ کر رکھا تھا۔ مارچ میں پانچ طبقوں کو بغیر لائسنس تلوار رکھنے کی اجازت ملی: کم سے کم پچاس ہزار سالانہ کی جاگیر رکھنے والے؛ کم سے کم پچاس ہزار روپیہ سالانہ مالیہ ادا کرنے والے؛ جنہیں حکومت کی طرف سے خطاب ملا ہو؛ جمعدار یا اس سے اونچے عہدے سے سبکدوش ہونے والے سابقہ فوجی؛ انکم ٹیکس ادا کرنے والے۔ زمیندار نے لکھا کہ تمسخر ہے۔ صرف انہی کی حمایت و حفاظت کا بندوبست کیا گیا ہے جو پہلے ہی محفوظ ہیں یا ہر قسم کا حفاظتی بندوبست کرنے کی استطاعت رکھتے ہیں۔ صوبائی کونسل کے ''مخلص ارکان'' نے کوشش جاری رکھی۔ علامہ اقبال بھی شامل تھے۔[1]

۱۳/مارچ کے زمیندار میں زبورِ عجم کی ایک نظم 'یا چناں کن یا چنیں' کے عنوان سے شائع ہوئی۔ ساتھ ہی اطلاع تھی کہ ''کتاب مطبع تک پہنچ چکی ہے... دو مہینے کے اندر شائقین کے ہاتھوں تک پہنچ جائے گی۔''[2]

۱۴، ۱۵، ۱۶/ اور ۱۷/مارچ کو صوبائی کونسل کی نشستیں ہوئیں۔[3]

۱۹/مارچ کو علامہ نے حافظ محمود شیرانی کے لیے انگریزی میں تعارفی نوٹ تحریر کیا۔[4]

91

۲۰/ مارچ کو دہلی کے ویسٹرن ہوٹل میں قریباً تیس مسلمان رہنما اکٹھے ہوئے۔ محمد علی جناح نے دعوت دی تھی۔ وہی صدارت کر رہے تھے۔ زیادہ تر منتخب نمایندے تھے۔ بعض دوسرے سرکردہ رہنما بھی آئے تھے۔ ان میں مولانا محمد علی [جوہرؔ]، نواب سر ذوالفقار علی خاں، میاں سر محمد شفیع، ڈاکٹر انصاری، مہاراجہ محمود آباد، نواب محمد اسماعیل، محمد یعقوب، سہروردی، سر عبدالقیوم، میاں شاہنواز،

---

[1] محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۱۳۱

[2] اختر النسا (۲۰۱۰) اقبال اور زمیندار، ص ۱۰۸

[3] Mitra *The Indian Quarterly Register Jan.-June 1927,* pp.367-369

[4] علامہ اقبال میوزیم لاہور میں موجود ہے۔

راجہ غضنفر علی خاں، محمد شفیع داؤدی، سید احمد شاہ امام جامع مسجد دہلی، سید آلِ نبی، لیفٹننٹ سردار محمد نواز خاں، فاروقی، عبدالرحمٰن، شاہ محمد زبیر، مولوی سید مرتضیٰ، عبدالعزیز، عبدالمتین چودھری، مرزا عبدالقادر، سید عبالجبار، احتشام الدین، سید عبدالرحیم، انوار العظیم، ڈاکٹر حیدر، عارف اور اعجازالحسن شامل تھے۔

کانگریس کے ہندو ارکان اور مرکزی اسمبلی کی نیشنلسٹ پارٹی کی طرف سے مخلوط انتخابات پر زور دیا گیا تھا۔ میٹنگ کا مقصد کوئی متبادل تلاش کرنا تھا۔ طے پایا کہ مسلمان چار شرائط پر مخلوط انتخاب قبول کر لیں گے:

۱ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کر کے صوبے کا درجہ دیا جائے۔
۲ شمال مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان میں بھی دوسرے صوبوں کی طرح سیاسی اصلاحات نافذ کی جائیں۔
۳ ان دونوں تجاویز پر عمل ہو تو مسلمان تمام صوبوں میں مخلوط انتخاب قبول کر لیں گے۔ نیز سندھ، بلوچستان اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں غیر مسلم اقلیتوں کو وہی حقوق دیں گے جو غیر مسلم اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کو حاصل ہوں۔
۴ پنجاب اور بنگال میں نمایندگی آبادی کے تناسب سے ہو۔ مرکزی مقننہ میں مسلمانوں کی نمایندگی ایک تہائی سے کم نہ ہو مگر مخلوط انتخاب کے ذریعے ہو۔

ہندوؤں کی طرف سے ان تجاویز کی منظوری درکار تھی۔ اُس کے بعد مسلمانوں کی نمایندہ جماعتوں سے باقاعدہ منظوری لی جاتی۔ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا تناسب اور دوسرے سوالات بعد میں طے کیے جاسکتے تھے۔[1]

۲۱/ مارچ کو مولانا غلام رسول مہر اور مولانا عبدالمجید سالک زمیندار سے مستعفی ہو گئے۔ اپنا اخبار نکالنا چاہتے تھے۔ اس کا نام انقلاب تجویز ہوا تھا۔ تین روز بعد عدالت میں ڈیکلریشن دے دیا۔

---

[1] Dr. Riaz Ahmad (2006), pp.247-249; and Mitra *Register Jan.-June 1927,* p.33

اعلان ہوا کہ پہلا پرچہ ۲/اپریل کو منظرِ عام پر آئے گا۔[1]

۲۱، ۲۲/ اور ۲۳/ مارچ کو بھی صوبائی کونسل کی نشستیں ہوئیں۔ اجلاس مکمل ہو گیا۔ غیر معینہ طور پر برخاست کر دیا گیا۔[2] اگلا اجلاس معمول کے مطابق موسمِ گرما میں ہونے والا تھا۔

۲۱/ مارچ کو دہلی میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے مسلم رہنماؤں کی تجاویز تسلی بخش قرار دیں۔ ۲۳/ مارچ کو مرکزی کونسل کی ہندو پارٹی کے نمایندے پنڈت مالوی کی صدارت میں جمع ہوئے۔ مخلوط انتخاب، قانون ساز مجلسوں میں آبادی کے تناسب سے نمایندگی اور اقلیتوں کے مذہبی و نیم مذہبی حقوق تسلیم کر کے باقی تجاویز مسترد کر دیں۔ اُسی روز پنجاب ہندو سبھا نے قرارداد منظور کی کہ ہندوؤں کی طرف سے بات کرنے کا حق صرف ہندو مہاسبھا کو ہے۔ کانگریس کو نہیں ہے۔ ہندوستان ٹائمز (*Hindustan Times*) پنڈت مالوی اور لاجپت رائے جیسے ہندو رہنماؤں کا اخبار تھا۔ تجاویز کو مسلم رہنماؤں کی کم ظرفی کا ثبوت قرار دیا:

> In what way is the establishment of joint electorates connected with the separation of Sind and the introduction of reforms in Baluchistan or N.W. Frontier? Muslims feel that in conceding to Hindus the principle of joint electorate they are entitled to expect as a price of this concession more power in Sindh, Baluchistan and N.W.F. Province where they constitute an immense majority. We, however, desire to make it clear once for all that Hindu Nationalist leaders are not asking for joint electorates because thereby there is any likelihood of any increase in the power of Hindus in India, but because joint electorates, while fully protecting the legitimate interests of all minority communities, will help in the growth of a spirit of nationalism, in eliminating rather than emphasising the differences prevailing between the different sections of the population in the country … We cannot but condemn the spirit of petty bartering that has inspired the resolution and feel amazed that such leaders as Dr. Ansari, Maulana Mahomed Ali [Jauhar] and Mr. Jinnah should have appended their signatures to it.

---

[1] زمیندار ۳۱/ مارچ ۱۹۲۷ء۔ بشکریہ امجد سلیم علوی

[2] Mitra *The Indian Quarterly Register Jan.-June 1927,* pp.369-371

مرکزی سکھ لیگ کے جنرل سیکرٹری سردار منگل سنگھ نے ۲۵/مارچ کو کانگریس کے صدر کے نام خط لکھا۔ اگلے روز پریس میں بیان دیا۔ تجاویز کو ناقص قرار دیا۔ ۲۹/مارچ کو جناح نے وضاحت جاری کی کہ تجاویز اکٹھی منظور یا مسترد کی جائیں۔ ۲۸/ اور ۳۰/ مارچ کو مدراس کی صوبائی کونسل کے دس مسلمان ارکان نے میٹنگ کی اور تجاویز مسترد کر دیں۔ جداگانہ نیابت کے حق میں تھے۔[1]

اِیسٹرَسنڈے آرہا تھا۔ لاہور میں ۳۰/ مارچ کو انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کا اجلاس ہوا۔ نائب صدر خان بہادر شیخ انعام علی نے صدارت کی۔ سالانہ جلسے کے انتظامات کے لیے سولہ رکنی سب کمیٹی بنائی گئی۔ علامہ اقبال بھی رکن مقرر ہوئے۔[2]

92

گزشتہ برس یکم اپریل سے اس برس ۳۱/مارچ تک علامہ کی تشخیص شدہ آمدنی ۱۲۰۶۲/روپے تھی۔ اس میں یونیورسٹیوں سے ۲۱۴۶ روپے، وکالت سے ۷۷۳۳روپے، کتابوں کی فروخت سے ۶۴۲۰ روپے اور کتابوں کی رائلٹی سے ۱۸۸۴روپے کی آمدنی شامل تھی۔ ۵۶۵روپے ٹیکس لگا۔[3]

اس برس علامہ پنجاب یونیورسٹی کے جو پرچے جانچ رہے تھے وہ یہ تھے: بی اے آنرز فلسفہ پہلا پرچہ؛ ایم اے فارسی دوسرا پرچہ۔[4]

93

عبداللہ نے فن اور لاشعور پر کتاب بھیجنے کا وعدہ کیا: *Art and the Unconscious*۔ بھول گئے۔ ۷/اپریل کو علامہ نے یاددہانی کا خط لکھا۔[5]

---

[1] Mitra *The Indian Quarterly Register Jan.-June 1927,* pp.34-38

[2] انجمن کی قلمی روداد؛ محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶)، اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص۱۷۹

[3] صفدر محمود (۱۹۷۳) 'علامہ اقبال کا گوشوارۂ آمدنی (انکم ٹیکس ریکارڈ کی روشنی میں)'، ص۱۸، ۱۷

[4] ڈاکٹر حسن اختر ملک، اقبال، ایک تحقیقی مطالعہ، ص ۱۳۲۔ ان کا ماخذ پنجاب گزٹ کے شمارے ہیں۔

[5] مکتوب بنام چغتائی ۷/اپریل ۱۹۲۷ء؛ برنی (۱۹۹۱)، ص۶۶۷

غلام رسول مہر اور عبد المجید سالک کا روزنامہ انقلاب ۷/ اپریل کی تاریخ سے شروع ہوا۔[1] اُس ماہ انجمن حمایتِ اسلام کے اخبار حمایتِ اسلام میں 'نوائے تہذیبِ حاضر' کے عنوان سے علامہ کے چار شعر شائع ہوئے۔ فارسی میں تھے۔ انقلاب نے بھی ۱۳/ اپریل کو شائع کیے۔

94

دانتے الیغیری (Dante Alighieri) ۱۲۶۵ء کے قریب فلورنس میں پیدا ہوا۔ اب یہ شہر اٹلی میں تھا۔ ۱۳۰۰ء میں اُس نے اطالوی زبان میں اپنا آسمانی سفر نامہ لکھا۔ قدیم رومن عہد کے شاعر ورجل (Virgil) کی رُوح اُسے دوزخ اور برزخ کی سیر کرواتی ہے۔ مثالی محبوبہ بیاترچے (Beatrice) جنت کی سیر کرواتی ہے۔ آخر میں خدا کا دیدار نصیب ہوتا ہے جو باپ، بیٹا اور رُوح القدس ہے۔ طویل نظم کا نام طربیہ (*Comedia*) یعنی کامیڈی رکھا۔ ۱۳۲۱ء میں فوت ہو گیا۔ ۱۵۱۲ء سے اُس کے مداح اُسے "ڈیوائن" (*Divina*) یعنی پاک، الٰہیہ یا آسمانی کہہ کر یاد کرنے لگے۔ ۱۵۵۵ء سے کتاب بھی ڈیوائن کامیڈی (*Comedia Divina*) یعنی آسمانی طربیہ کہلانے لگی۔

علامہ چاہتے تھے کہ 'گلشنِ راز جدید' کی طرح 'معراج نامہ جدید' بھی لکھیں۔ جدید علوم کی روشنی میں معراج کی شرح ہو۔ سمجھتے تھے کہ اسلام کی اور باتوں کی طرح مسلمانوں نے حقیقتِ معراج پر بھی کم غور کیا ہے۔ پروفیسر بیون (Bevan) نے معراج پر تاریخی حوالے سے بحث کی تھی۔ مؤرخ دلائل پیش کر سکتا تھا کہ معراج کے بارے میں مسلمانوں کا مروجہ عقیدہ قرآن سے حتمی طور پر ثابت نہیں ہوتا۔ علامہ کے لیے زیادہ اہم بات، کم سے کم ثقافتی نقطۂ نگاہ سے، یہ تھی کہ ایک عام مسلمان نے ہمیشہ اِس قصّے میں بے پناہ دلچسپی محسوس کی۔ اسلامی تخیل اور فکر نے اس واقعے کا اثر قبول کیا۔ قرآن نے مسلمانوں کو جو زاویۂ نگاہ بخشا اُس کا تقاضا تھا کہ کائنات کے اسلامی تصوّر کی تشکیل میں یہ قصہ ایک اہم عنصر ہو۔ چودھری محمد حسین کہتے ہیں، "اٹلی کے مشہور شاعر ڈینٹے کی کتاب ڈیوائن کامیڈی پر

---

[1] امجد سلیم علوی کے مطابق اُردو اخبارات عام طور پر شام کو نکلتے تھے اور دو روز بعد کی تاریخ ڈالی جاتی تھی۔ ۷/ اپریل کا انقلاب ۵/ اپریل کی شام کو نکلا ہو گا۔

بعض نئی اور اہم تنقیدات یورپ میں شائع ہو چکی تھیں جن میں اِس حقیقت کو پایہ ثبوت تک پہنچایا گیا کہ ڈیوائن کامیڈی کے آسمانی ڈرامے کا تمام پلاٹ بلکہ اس کے بیشتر تفصیلی مناظر اُن مقامات پر مبنی ہیں اور اُن کی نقل ہیں جو اِسلام میں معراجِ محمدیہؐ کے متعلق بعض احادیث و روایات میں مذکور ہوئے یا بعد میں بعض مشہور متصوّفین و ادبا کی کتابوں میں درج ہوئے جن میں اُنہوں نے مختلف نقطہائے خیال سے خود اپنے معراجوں کا ذکر کیا یا معراجِ نبوی کی شرح لکھی۔" سب سے پہلے اسپین کی میڈرڈ یونیورسٹی کے پروفیسر مگوئیل آسین (Miguel Ausin) نے معراج کی احادیث کے علاوہ ابن عربی کی فتوحاتِ مکیہ، ابوالعلا معرّی کے رسالۃ الغفران اور دوسری اسلامی تصانیف کو دانتے کے ماخذوں میں دکھایا۔ پروفیسر آسین کی کتاب ۱۹۱۹ء میں اسپینی زبان میں شائع ہوئی۔ ۱۹۲۶ء میں انگریزی ترجمہ اسلام اینڈ ڈیوائن کامیڈی (*Islam and Divine Comedy*) کے نام سے آیا۔ محمد حسین کے مطابق، "ایک حد تک اِس واقعہ نے اِس امر کی طرف توجہ دلائی کہ بجائے عام تشریحی انداز میں 'معراج نامہ' لکھنے کے جو وُسعتِ مضامین کے لحاظ سے یقیناً حقائقِ معراج کے مباحث ہی تک محدود رہتا، ڈینٹے کے انداز میں ادبی (عرفانی نہیں) نقطہ خیال سے 'معراجِ اقبال' لکھا جائے۔"[1]

"ڈانٹے کی ڈوائن کامیڈی (*Divine Comedy*) کالج لائبریری سے لے کر ایک دو روز کے لیے بھجوایئے،" علامہ نے عبداللہ چغتائی کو لکھا، "Purgatory اور Hell کی ضرورت نہیں ہے۔"[2]

بیاض میں اپنے معراج نامے کی منزلیں درج کیں: 1. Moon قمر؛ 2. Mercury عطارد؛ 3. Venus زہرہ؛ 4. Neptune؛ نیپچون کو قلمزد کر دیا۔ 4. Mars مریخ؛ 5. Jupiter مشتری؛ 6. Saturn زحل؛ 7. Fixed Star فلک ثابت؛ 8. Divine Presence عرش معلیٰ۔

علیحدہ صفحے پر شخصیات اور موضوعات درج کیے۔ بعض کے نیچے کسی وقت خط کھینچا:

1. Prince Said Halim Pasha; 2. Mustafa Kamal Pasha; 3. Reza Shah; 4. Amanullah Khan (Abdul Rahman); 5. Jamaluddin

---

[1] شاہد (مرتب)، اقبال چودھری محمد حسین کی نظر میں؛ Sherwani, pp.168-169

[2] مکتوب بنام عبداللہ چغتائی، بلا تاریخ؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۸۷-۶۸۶

Afghani; 6. Anwar Pasha; 7. Nadir Shah (Shia & Sunni); 8. Ahmad Shah Abdali; 9. Mirza Muhammad Ali Bab (Qadian); 10. Mehdi of Sudan; 11. Lord Kitchener; 12. Mussolini; 13. Gandhi

گاندھی کا نام فہرست میں سے کاٹ دیا۔ پھر لکھا اور کاٹا۔ پھر لکھا۔ پھر کاٹا۔

14. Karl Marx & Lenin; 15. Syyid Ahmad Khan; 16. Tippu; 17. Yakub Beg; 18. Shamil

یعقوب بیگ اور شامل کے سامنے "China & Russia?" لکھا۔

19. President Wilson; 20. Lloyd George

ان دونوں کے سامنے "America & England" لکھا۔

21. Abdul Karim of Riff; 22. England Message to League of Nations; 23. Kashmir; 24. Germany—Geothe; Dante; 25. Ghazalli & Rumi & the [Muslims?] (Luther); 26. رابعہ بصری, Noor Jehan, etc.

اس کے سامنے صفحے کے دوسرے حصے پر کچھ نام علیحدہ کر کے فہرست بنائی:

1. Tippu (Napoleon); 2. Jamaluddin Afghani; 3. Nadir Shah; 4. Aurangzeb; 5. Shah Waliullah; 6. Mujaddid Sarhandi; 7. Karim Khan (Zand); 8. Abdul Rahman Afghanistan[1]

شعرا کے مکالمے پیامِ مشرق میں بھی لکھے تھے۔ اب تین شعرا کے درمیان مکالمے کا خاکہ درج ہوا۔ یہ شعرا ناصر خسرو علوی، زندہ رود اور بھرتری ہری تھے۔ زندہ رود کا لقب اپنے لیے تھا۔ ناصر خسرو کی آٹھ اشعار کی غزل درج کی۔ زندہ رُود کے لیے آٹھ اشعار کی ایک غزل لکھی۔ ان میں سے ایک شعر کاٹ دیا۔ جب انسان تک نہ پہنچے تو خدا تک کیسے پہنچنا چاہتے ہو:

بآدمے نرسیدی خدا چہ می جوئی

بھرتری ہری کی بعض تعلیمات کو فارسی غزل کی صورت میں ڈھالا۔ پانچ اشعار ہوئے۔ مفہوم یہ تھا کہ لکڑی اور پتھر کے دیوتاؤں سے وہ خدا بہتر ہے جو عبادت گاہوں سے دُور ہے:

---

[1] بیاض جاوید نامہ

این خدایانِ تنک مایہ زسنگ اند و زخشت　　　برترے ہست کہ دُور است زدَیر و کنشت

تینوں غزلوں میں خدا کی تلاش کو دنیائے عمل میں جدوجہد کے ساتھ مشروط کرنے کا تصور تھا۔[1]

جاوید نامہ۔ معراج نامے کا عنوان رکھا۔ بیاض کے صفحے پر لکھا کہ تیشہ پتھر سے ٹکرائے تو آواز کچھ اور ہوتی ہے مگر یہ آواز تیشے کے جگر پر چلنے کی ہے:

Motto of Javid Nama

’صدائے تیشہ کہ بر سنگ می خورد دگر است　　　خبر بگیر کہ آوازِ تیشہ و جگر است‘

نامعلوم

صفحہ دیگر

’خیالِ من بتماشائے آسمان بوداست　　　بدوشِ ماہ و بآغوشِ کہکشاں بود است

گماں مبر کہ ہمیں خاکداں نشیمنِ ماست　　　کہ ہر ستارہ جہان است یا جہاں بود است‘

آخری دونوں اشعار زبورِ عجم سے تھے۔ چھ اشعار کی غزل بھی لکھی: یہ لالہ و گل جنہیں تم کہتے ہو کہ ٹھہرے ہوئے ہیں، سب صبح کی ہوا کے جھونکے کی طرح سفر میں ہیں؛ وہ تازہ حقیقت جسے ڈھونڈتے ہیں اور نہیں پاتے، کہاں ہے؟ مسجد، مدرسہ اور میخانہ سب بانجھ ہیں۔

این گل و لالہ تو گوئی کہ مقیم اند ہمہ　　　راہ پیما صفتِ موجِ نسیم اند ہمہ

معنی تازہ کہ جوئیم و نیابیم کجاست　　　مسجد و مکتب و میخانہ عقیم اند ہمہ

95

۱۵ / سے ۱۷ / اپریل تک انجمن حمایت اسلام کا سالانہ جلسہ ہوا۔ سید سلیمان ندوی پہلی دفعہ شریک ہوئے۔ مولانا ظفر علی خاں کے مہمان ہوئے۔ ۱۵ / اپریل کی صبح نو دس بجے علامہ اقبال، عبداللہ چغتائی کو ساتھ لے کر ملاقات کے لیے آئے۔ ظفر خود کسی کام میں مصروف تھے۔ اُن کے لڑکے اختر علی خاں نے بتایا کہ ندوی صاحب عمارت کی بالائی منزل پر علیحدہ کمرے میں ٹھہرائے گئے ہیں۔

---

[1] بیاض جاوید نامہ

علامہ اور ندوی کی پہلی بالمشافہ ملاقات تھی۔ "علامہ اور سید صاحب نہایت اخلاق اور تپاک کے ساتھ ملے،" چغتائی کا بیان ہے۔ "راقم کا بھی علامہ نے تعارف کرایا۔ ہم قریباً ایک گھنٹے تک وہاں رہے اور تمام وقت علمِ دین اور فلسفۂ اسلام کے بارے میں گفتگو ہوتی رہی۔ اُن کی زیادہ توجہ امام رازی کی کتاب مباحثِ مشرقیہ پر مرکوز تھی کیونکہ اُن دنوں علامہ اقبال کا موضوع بطورِ خاص مکان و زمان کی بحث تھی۔" علامہ نے ندوی اور اُن کے میزبان ظفر علی خاں کو طعام کی دعوت دی۔ اُسی شام مغرب کے بعد کا وقت طے پایا۔ ندوی اور چغتائی کو موٹر میں بٹھا کر جلسہ گاہ پہنچانے کے بعد علامہ نے رخصت لی۔ ندوی نے عہدِ رسالت میں اشاعتِ اسلام کے موضوع پر تقریر کی۔[1]

انقلاب کے مطابق اُس روز پنجاب طبی کانفرنس کا اجلاس بھی ہوا۔ جسٹس سر شیخ عبدالقادر نے صدارت کی۔ علامہ بھی شریک ہوئے۔[2]

اگر یہ درست ہے تو ممکن ہے کہ چغتائی نے جس دعوت کا ذکر کیا ہے وہ علامہ نے اُس روز نہیں بلکہ اگلے روز دی ہو۔ چغتائی کے مطابق شام کو ندوی اور ظفر علی خاں علامہ کے گھر پہنچے۔ چودھری محمد حسین، محمد دین تاثیر، خواجہ سلیم، غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک اور عبداللہ چغتائی بھی دعوت میں شریک تھے۔ دعوت بہت ہی پر تکلف تھی۔ زمان و مکان، رازی کی کتاب اور شعر و شاعری کے موضوعات پر گفتگو بھی ہوئی۔ عنایت اللہ مشرقی کی تذکرہ پھر زیرِ بحث آئی۔ محمد حسین اور ندوی تین برس قبل اس پر تنقید کر چکے تھے۔ خواجہ سلیم نے ندوی کو اپنے مکان پر دعوت دی۔ ۱۷/ اپریل کی تاریخ طے پائی۔ آخر میں علامہ کی موٹر میں ندوی اور ظفر کو اُن کے مکان پر واپس بھجوایا گیا۔[3]

اگلے روز ۱۶/ اپریل کی شام مغرب کے بعد کلکتہ کے بیرسٹر صلاح الدین خدابخش ایم اے، بی سی ایل نے جلسے کے چوتھے اجلاس کی صدارت کی۔ علامہ نے 'مسلم ثقافت کی روح' (The Spirit

---

[1] عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۲۱۰-۲۰۷

[2] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸)، ص ۱۶۳ بحوالہ انقلاب ۲۱/ مئی ۱۹۲۷ء

[3] عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۲۱۰

(of Muslim Culture کے عنوان سے انگریزی میں لیکچر دیا۔[1] ایک اور موقع پر کہا، "کچھ عرصہ پہلے میرے ذہن میں مختلف سوالات پیدا ہوئے جن کا تعلق اِس بات سے تھا کہ اسلامی ثقافت دنیا کے بارے میں ایک قوم کے محسوسات کے اظہار کا نام ہے۔"[2] معلوم ہوتا ہے ان سوالات کا اولین نتیجہ یہ لیکچر تھا۔

کوشش کی کہ سب کی سمجھ میں آ سکے۔ ڈیڑھ گھنٹے میں صرف ابتدائی حصہ ختم ہو سکا۔ حاضرین کے اصرار پر اُردو میں خلاصہ پیش کیا۔ انجمن کی روداد میں یوں درج ہوا:

> ہر انسان کے دل میں مشاہدۂ حقیقت کی ہوس ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ اسے نظامِ عالم سے آگاہی حاصل ہو۔ زمان و مکان کی کنہ سمجھ میں آ جائے۔ جو حقیقت کائنات کے اندر پوشیدہ ہے اُس کے مشاہدہ اور نظارہ کا موقع مل جائے۔ ساری قومیں اِس مشاہدہ کے لیے ہمیشہ بیتابی کا اظہار کرتی رہی ہیں۔ یہودیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ "لن نؤمن لک حتّیٰ نری اللہ جہرۃً" (ہم اس وقت تک ایمان نہیں لائیں گے جب تک اللہ تعالیٰ کو ظاہر اور کھلے طور پر نہ دیکھ لیں) خود حضرت موسیٰؑ "رب ارنی" فرماتے رہے۔ میں نے لکھا ہے:
>
> خرد گفت او بچشم اندر نگنجد　　نگاہِ شوق در اُمید و بیم است
>
> نمے گردد کہن افسانۂ طُور　　کہ در ہر دل تمنائے کلیم است
>
> مشاہدۂ حقیقت کے حصول کے دو طریق ہیں: (۱) سمع و بصر اور (۲) قلوب یا بہ اصطلاحِ قرآنِ حکیم افئدہ۔
>
> یہ ضروری ہے کہ ان دو طریقوں سے بقدرِ ضرورت کام لیا جائے۔ یورپ نے اپنی ساری کوششیں صرف "سمع و بصر" تک محدود کر دیں اور "افئدہ" کو ترک کر دیا۔

[1] انجمن کے سالانہ جلسے کی قلمی روداد؛ م محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶)، اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص ۱۱۰

[2] دیکھیے ۱۴ نومبر ۱۹۲۸ء کے واقعات میں علامہ کا اورینٹل کانفرنس کا خطبۂ صدارت

مسلمانوں نے اپنی توجہات ''افئدہ'' پر مرتکز کر دیں اور سمع وبصر سے پورا کام نہ لیا بلکہ ایشیائی تہذیب کا خاصہ یہی ہے کہ اس میں ''افئدہ'' پر بہت زور دیا گیا ہے اور ''سمع و بصر'' کی بالکل پروا نہیں کی گئی۔ حالانکہ ضرورت دونوں طریقوں سے کام لینے کی ہے۔

نظامِ عالم کی آفرینش کو یوں سمجھ کر حقیقت نے اپنی نمو یا اپنے آپ کو واضح کرنے کے لیے ایک نقطۂ خاص سے سفر کیا یا بہ اصطلاحِ صوفیہ کرام حسن نے نظارے کے شوق میں اپنے آپ کو آشکارا کر دیا۔ اِس خطِ سفر کا آخری نقطہ عالمِ ظاہر ہے۔ اب حقیقت تک پہنچنے کا راستہ یہ ہے کہ اِس نقطہ سے اُلٹا سفر کیا جائے۔

مشاہدے کا مقصد یہ نہیں ہونا چاہیے کہ انسان اس میں اپنے آپ کو فنا کر دے۔ اسلام جس مشاہدے کا معلم ہے وہ اپنے آپ کو قائم رکھنے کی تعلیم دیتا ہے یعنی اسلام کا مشاہدہ مردانگی پر مبنی ہے۔ ایک شاعر نے حضور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی نعت میں یہ نکتہ بڑے اچھے طریق پر واضح کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ نعت میں اِس سے بہتر شعر نہیں لکھا گیا

موسیٰ زہوش رفت بہ یک جلوۂ صفات　　　تو عینِ ذات می نگری در تبسمے

یہ اسلامی آئیڈیل ہے۔ اسلامی نقطۂ خیال سے معراج یہی ہے کہ مشاہدۂ ذات کے بعد بھی عبودیت قائم رہے لیکن سرکشی اور تمرد کے لیے نہیں بلکہ خدمت وعبدیت کے لیے۔ مسلم کو کسی چیز میں فنا نہ ہونا چاہیئے۔ گو یہ فنا فی اللہ ہی کیوں نہ ہو۔

ا　آنحضرتؐ ختم الرسل ہیں۔ نبی اِس لیے بھیجے گئے کہ وہ لوگوں کو جن کی سمجھ ابتدائی حالت میں تھی سمجھائیں۔ عین اس وقت دنیا میں غور وفکر کا شور شروع ہوا اور لوگ تقلید سے نہیں بلکہ اپنے فہم واِدراک کی مدد سے نتائج اخذ کرنے لگے گویا تقلیدِ جامد کی جگہ افقِ عالم پر علم واِدراک کا آفتاب طلوع ہوا تو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے آخری حجت کو اَرسال کر دیا اور کہہ دیا کہ اب کوئی ایسا

شخص نہیں آ سکتا جس کی باتوں کو تم تنقید کے بغیر تسلیم کرو۔ شہنشاہیت اور نبوّت کا بھی خاتمہ ہو گیا اور دماغی غلامی پر موت چھا گئی۔ عقل کے عروج کی ابتدا وہ روزِ سعید ہے جب ختم الرسل ؐ مبعوث ہوئے۔ اب اگر کوئی شخص نبوّت کا مدعی ہو تو ہم اُس کی دماغی حالت کا اُسی طرح مطالعہ کریں گے جس طرح علم الحیات کا ماہر کسی مینڈک کے اجزا کا مطالعہ کرتا ہے اور کیکڑے کے وجود پر غور و فکر کی نگاہ ڈالتا ہے۔

۲ یورپ کی ترقی اِس سے شروع ہوئی کہ اہلِ مغرب نے فلاسفۂ یونان کے فلسفے کے خلاف جو تقویمِ پارینہ ہو چکا تھا علَمِ جہاد بلند کیا۔ بیکن نے استقرائی منطق پر زور دیا۔ موشگافی کے بجائے مشاہدات و تجربات حصولِ علم کا ذریعہ قرار دیے گئے لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ استقرائی منطق کا موجد اور مدونِ اوّل یعقوب کندی ہے، بیکن نہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ بیکن نے جو عربی پڑھا ہوا تھا اندلس کے عرب منطقیوں کی تصنیفات سے حظ و استفادہ کیا اور اُن کے خیالات کا ترجمہ کیا۔

۳ ہندی حکما اور یونانی طلبا کے نزدیک یہ دنیا ایک مکمل نظام کی شان رکھتی ہے۔ مگر امام غزالی اور امام ابن تیمیہ جیسے اکابرِ اسلام نے اِس واہمہ کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دیں۔ اُنہوں نے قرآن کریم کی آیاتِ بیّنات سے متاثر ہو کر دُنیا کی عدم تکمیل کا دعویٰ کیا اور ثابت کیا کہ دنیا ابھی منازلِ ارتقا طے کر رہی ہے۔

۴ فلسفۂ یونان کے خلاف جہاد کرنے کا ڈھنگ یورپ کے اربابِ فکر نے مسلمان حکمأ سے سیکھا۔ امام غزالی نے فلسفۂ یونان کے پرخچے اُڑا دیے۔ ابنِ رُشد نے فلسفے کی قبائے دریدہ کو رَفو کرنا چاہا مگر وہ اِس مقصد میں ناکام رہا۔

۵ ذوالنون مصریؒ بہت بڑے صوفی ہی نہیں تھے بلکہ اعلیٰ درجے کے کیمیادان بھی تھے۔ چنانچہ وہ حکیم جس نے سب سے پہلے یہ دریافت کیا کہ پانی جوہرِ بسیط

نہیں بلکہ ایک مرکب شے ہے آپ ہی ہیں۔

۶ اٹلی کے مشہور شاعر "دانتے" نے اپنی شہرۂ آفاق نظم میں بہشتِ بریں کا جو نقشہ کھینچا ہے وہ تمام و کمال محی الدین ابن عربی کی "فتوحاتِ مکیہ" سے ماخوذ ہے۔ اس لیے ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے یورپ کے فلسفہ پر ہی نہیں بلکہ ادب پر بھی زبردست اثر ڈالا۔[1]

علامہ کی تقریر جاری تھی جب رات ساڑھے گیارہ بجے اسلامیہ کالج اور اسکول کے طلبہ کے درمیان جھگڑا ہو گیا۔ انقلاب کے مطابق "افسوسناک نتائج بر آمد ہوئے۔" مگر تقریر کے بعد ایک مسیحی نوجوان نے سلیمان ندوی کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔[2]

۱۷/ اپریل کے انقلاب میں بانگِ درا کے دوسرے ایڈیشن کا اشتہار شائع ہوا۔ ویسا ہی تھا جیسا ۱۰/ فروری سے زمیندار میں شائع ہو رہا تھا۔ سو سے زیادہ کتب کی بجائے اب صرف دس سے زیادہ کتب پر بھی کمیشن ملتا۔ رعایتی قیمت پر کتاب منگوانے کی تاریخ بڑھا کر ۳۱/ جولائی کر دی گئی۔ "یہ آخری رعایتی اعلان ہے،" منشی طاہر الدین نے لکھا تھا۔[3]

اُس روز خواجہ سلیم کے گھر ندوی کی دعوت تھی۔ علامہ شریک ہوئے۔ مکان پرانی کوتوالی کے قریب کشمیری بازار میں کوچہ کوٹھی داراں میں واقع تھا۔ چودھری محمد حسین، عبداللہ چغتائی، ظفر علی خاں، ملک لال دین قیصر، غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، پرفیسر حافظ محمود شیرانی، پروفیسر شیخ محمد اقبال، پروفیسر سید طلحہ، خواجہ عبدالوحید، ملک عنایت اللہ، ملک محمد امین ایڈووکیٹ، ملک لطیف اسٹیشن ماسٹر لاہور، ڈاکٹر سید عبداللہ، ابوالخیر عبداللہ، بھٹی بوٹ ہاؤس ڈبی بازار کے مالک بشیر بھٹی، بابو عبدالمجید، شیخ عبدالرشید اور سید واجد علی شاہ بھی شریک تھے۔ فضل الدین عرف "پھجو" مشہور

---

[1] انجمن کے سالانہ جلسے کی قلمی روداد؛ محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶)، ص ۱۱۰-۱۱۳

[2] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸)، ص ۱۴۸ بحوالہ انقلاب ۱۷/ اپریل ۱۹۲۷ء

[3] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸) حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۳۰۳

باورچی تھا۔ دعوت میں کھانا اُسی نے خواجہ سلیم، بشیر بھٹی اور شیخ رشید کے زیرِ ہدایت تیار کیا تھا۔ ''بہت ہی پر تکلف، لذیذ اور انواع و اقسام کا تھا،'' عبداللہ چغتائی کا بیان ہے۔ ظفر علی خان کو زمیندار کے طنزیہ کالم کے لیے عنوان کی ضرورت تھی۔ ندوی نے 'فکاہات' تجویز کیا۔ احادیث کے ضعیف راویوں پر گفتگو ہوئی۔ علامہ نے کہا، ''ہمارا راوی بھی اب بہت ضعیف ہو گیا ہے۔'' اشارہ دریائے راوی کی طرف تھا۔ لطیفہ و لطائف کے ضمن میں سید عبداللہ ملا علی بن حسین واعظ کاشفی کی عربی تصنیف لطائف الطوائف کا تذکرہ چھڑا۔ علامہ نے کہا، ''ملا کاشفی کو کیا خبر کہ الطوائف کیا شے ہے۔'' آخر میں خواجہ سلیم نے لوہے کا ٹرنک کھولا۔ نایاب مخطوطے تھے۔ ندوی دیر تک دیکھتے رہے۔ اُن کا کہنا تھا:

> اصحابِ علم اور اربابِ علم کی جمعیت کے لحاظ سے بھی [لاہور] آج کل ہندوستان کی سب سے بہتر مجلس ہے۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال، شیخ عبدالقادر، پرنسپل عبداللہ یوسف علی، پرفیسر حافظ محمود شیرانی، پرفیسر اقبال، پروفیسر محمد شفیع، پروفیسر سراج الدین آذر، مولوی محمد علی ایم اے، خواجہ کمال الدین، پروفیسر سید عبدالقادر، مولوی ظفر علی خاں اور متعدد ایسے باکمال اصحاب کی سکونت کا اس کو فخر حاصل ہے جن کے یکجا مرقع کی مثال کسی اور شہر میں نظر نہیں آتی۔ پرانے لوگوں میں سید ممتاز علی صاحب، منشی محبوب عالم صاحب اور مولوی انشاٗاللہ خاں اپنی بہار گزار چکے ہیں تاہم اُن کی خزاں بھی بہار کی یادگار ہے۔
>
> انشا پردازوں، ادیبوں اور شاعروں کی محفل بھی وہاں کچھ کم رونق پر نہیں ہے۔ سالک و مہر، تاجور، ابوالاثر حفیظ جالندھری، غلام ربانی، ڈاکٹر تاثیر، حکیم یوسف حسن (نیرنگِ خیال)، مولانا عبداللہ چغتائی، سید امتیاز علی تاج، اختر شیرانی (بہارستان) اور کئی دوسرے اہلِ قلم آگے بڑھنے کے لیے مصروف ہیں اور مستقبل اُن کی کامیابی کا منتظر اور اُن کے خیر مقدم کو تیار ہے۔ اور اُن میں سے بعض تو آگے بڑھ کر پہلی صف کے قریب پہنچ چکے ہیں۔
>
> ...ڈاکٹر اقبال ان تمام صحبتوں میں شمعِ محفل تھے۔ انہوں نے 'شمع اور شاعر'

> لکھا ہے لیکن میں تو لاہور میں خود شاعر کو شمع دیکھا اور قدر شناسوں کو اُس کا پروانہ پایا۔ اُن کی صحبت لاہور کے نوجوانوں کی دماغی سطح کو بہت بلند کر رہی ہے۔ اُن کے فلسفیانہ نکات، عالمانہ افکار اور شاعرانہ خیالات اُن کی آس پاس کی دنیا کو ہمیشہ متاثر رکھتے ہیں۔ اُن کی ''زمزمہ پردازیوں'' کا نیا مجموعہ زبورِ عجم کے نام سے عنقریب سامعہ نواز ہونے والا ہے۔ میں نے کہا کہ فلسفۂ عجم کے دشمن کو مناسب بھی یہی تھا کہ عجم کے ہاتھ میں زبور دے کر اُن کے خیالی فلسفے کو مزامیرِ داؤد کی دعاؤں سے بدل سے اور اُن کے کانوں کو زبور کا پردہ رکھ کر قرآن کی نغمہ سنجیوں سے مانوس کر دے۔[1]

96

علامہ کو مدراس والے لیکچرز (خطبات) کی تیاری کے لیے اسٹینو کی ضرورت پڑی۔ عبداللہ چغتائی نے محمد یعقوب سے ملاقات کروائی۔ چغتائی کے پرانے واقف تھے۔ لدھیانہ کی کشمیری برادری سے تعلق رکھتے تھے۔ لاہور میں کوآپریٹو سوسائٹی کے رجسٹرار سر ڈارلنگ کے اسٹینو تھے۔ علامہ کی مرحومہ بیوی مختار بیگم کے رشتہ دار تھے۔ کبھی مرحومہ سے منسوب رہ چکے تھے اگرچہ علامہ کو معلوم نہ تھا۔ طے پایا کہ یعقوب، فرصت میں علامہ کے پاس آ کر اِملا لیا کریں۔ ٹائپ کر کے علامہ کو دکھایا کریں۔

علامہ کو قرونِ وسطیٰ کی سائنس پر ایک کتاب درکار تھی۔ چغتائی نے یونیورسٹی کی لائبریری سے نکلوانے کا وعدہ کیا۔ ۲۹/ اپریل کو علامہ نے یاددہانی کا خط لکھا۔ خلافِ معمول انگریزی میں تھا۔ اگلی صبح شاید چغتائی خود ہی کتاب کے ساتھ آئے۔ بتایا کہ یعقوب ۷/ مئی کو شملہ جانے والے ہیں۔ ایک ہفتہ باقی تھا۔ غور کرنے کے بعد علامہ نے اُسی روز چغتائی کو لکھا:

> کیا آپ ایسا کر سکتے ہیں کہ مسٹر محمد یعقوب ہر روز کسی ایسے وقت جو اُن کے لیے اور میرے لیے موزوں ہو یہاں آیا کریں... بلکہ بہتر ہو کہ اُن کو ساتھ لے آیئے تاکہ زبانی گفتگو ہو جائے۔ شاید چار بجے کے بعد وہ آ سکتے ہوں گے۔ میں اُن سے پہلا لیکچر جو

[1] چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۲۱۰-۲۱۴؛ ندوی کا اقتباس اُن کے شذرے سے ہے۔

دیباچے کے طور پر ہوگا لکھوانا شروع کر دوں گا... اُن کے جانے کے بعد کسی اور شارٹ ہینڈ رائٹر کو بلالیا جائے گا۔

چغتائی لکھتے ہیں کہ یعقوب نے یہ خدمت کسی معاوضے کے بغیر ہی انجام دی۔[1]

سمجھنا چاہیے کہ اپریل کے اواخر یا مئی کے شروع میں باقاعدہ کام کا آغاز ہوا۔ عنوانات کی پہلی فہرست جولائی ۱۹۲۶ء میں زمیندار میں شائع ہوئی تھی۔ سمجھا جا سکتا ہے کہ اب وہ ایک نئی ترتیب میں ضم ہو چکے تھے۔ نئے عنوانات یوں تھے:

۱ علم بالحواس اور علم بالوحی (Knowledge and Religious Experience)— فہرست کے پہلے موضوع "ختمِ نبوت: نفسیاتِ جدیدہ کی روشنی میں" سے ختمِ نبوت کا پہلو چھوڑ کر جدید نفسیات، فلسفے اور سائنس کی روشنی میں نبوت پر بحث ہوئی۔ فہرست کا چوتھا موضوع "علومِ جدید اور مسئلۂ تکوین" بھی متعارف ہوا۔ دوسرے، تیسرے اور چوتھے خطبے میں جاری رہا۔

۲ علم بالوحی کا علمی امتحان (The Intellectual Test of the Revelations of Religious Experience)— پہلے خطبے کی توسیع تھا۔ فہرست کے پہلے اور چوتھے موضوعات جزوی طور پر شامل رہے۔

۳ خدا کا تصور اور عبادت کے معانی (The Conception of God and the Meaning of Prayer)— یہ فہرست کے تیسرے موضوع میں عبادت کے موضوع کا اضافہ تھا۔ فہرست کے چوتھے موضوع تکوینِ کائنات پر بحث بھی یہاں جاری رہی۔

۴ خودی—اُس کی آزادی اور دوام (Human Ego—His Freedom and Immortality)— یہ فہرست کا پانچواں موضوع "حقیقتِ خودی اور حیات مابعد الموت" تھا۔

---

[1] عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۳۰۶-۳۰۵

۵ مسلم ثقافت کی روح(The Spirit of Muslim Culture)— یہ فہرست کا دوسرا موضوع ''روحِ قرآن'' تھا۔ اس میں پہلے موضوع سے ختمِ نبوت کے نفسیاتی پہلو کا اضافہ ہو گیا۔

۶ اسلام میں اجتہاد(The Principle of Movement in Islam)— اُس خطبے کی ارتقا یافتہ صورت تھی جو دسمبر ۱۹۲۴ء میں لاہور میں دیا گیا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ فہرست کے دوسرے موضوع ''روحِ قرآن (دی سپرٹ آف قرآن)'' سے شروع میں علامہ کے ذہن میں یہی خطبہ تھا۔ پھر وہ موضوع پانچویں خطبے کی صورت میں پھیل گیا اور خطبۂ اجتہاد نے علیحدہ حیثیت اختیار کر لی۔ اگر یہ بات درست ہے تو پھر ممکن ہے کہ دسمبر ۱۹۲۴ء والے خطبے میں، جس کا کوئی نسخہ اب موجود نہیں ہے، پانچویں خطبے کے بعض مباحث بھی شامل رہے ہوں، مثلاً نبوت اور ختمِ نبوت کی نفسیاتی اور سائینسی توجیہہ۔

۷ کیا مذہب ممکن ہے؟(Is Religion Possible?)— فہرست کا آخری موضوع ''اسلامی تصوف'' چھ خطبات میں مستقل موضوع نہیں بنا۔ دیباچے اور پہلے خطبے میں اس کی طرف اہم اشارے کیے گئے۔ چھ خطبات کی اشاعت کے بعد لندن میں اس پر مکمل لیکچر دیا گیا۔ کتاب کے دوسرے ایڈیشن میں یہ ساتواں خطبہ بن گیا۔

97

یکم مئی کو میاں محمد شفیع نے لاہور کے برکت علی اسلامیہ ہال میں پنجاب پراونشل مسلم لیگ کا جلسہ منعقد کیا۔ تقریر میں ہندو رہنماؤں کی تقریروں کے اقتباسات پیش کیے۔ پھر علامہ نے قرارداد پیش کی کہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب ہی سے مرکزی اور صوبائی مجالس باشندگانِ ہند کی حقیقی نمایندہ مجالس بن سکتی ہیں، باشندوں کے جائز حقوق و فوائد محفوظ رہ سکتے ہیں اور فرقہ وارانہ کشمکش دُور ہو سکتی ہے۔ مخلوط انتخاب کشمکش کو فروغ دیں گے:

> اس لیے لیگ کی یہ قطعی رائے ہے کہ جب تک اقلیتوں کے حقوق کی موثر حفاظت کا

انتظام نہ ہو، اس وقت تک مسلمان فرقہ وار حلقہ ہائے انتخاب کو دستورِ ہند کے ایک اساسی جزو کی حیثیت سے قائم رکھنے پر لازماً مصر رہیں۔

قرارداد کی حمایت میں تقریر کرتے ہوئے علامہ نے کہا، "مجھے یہ کہنے کا حق پہنچتا ہے کہ میں سب سے پہلا ہندوستانی ہوں جس نے اتحاد ہندو مسلم کی اہمیت و ضرورت کا احساس کیا اور میری ہمیشہ سے آرزو ہے کہ اتحاد مستقل حیثیت اختیار کر لے۔" اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوؤں کی افسوسناک ذہنیت کے پیشِ نظر "حلقہ ہائے انتخاب کا اشتراک کسی حالت میں بھی گوارا نہیں کیا جاسکتا۔ حیرت ظاہر کی، "مسلمانوں کے خلاف اِس قسم کی ذہنیت اختیار کرنے کی ہندوؤں کو کیوں ضرورت پڑی۔ مسلمان تعداد میں کم ہیں، اقتصادی حیثیت سے پیچھے ہیں، تعلیم میں پسماندہ ہیں۔ ویسے بڑے بھولے بھالے ہیں۔ حکومت انہیں آسانی سے چکنی چپڑی باتیں کر کے پھسلا لیتی ہے، ہندو انہیں پھسلا لیتے ہیں۔" آخر میں کہا، "ایک طرف ہندوؤں کی کوششیں اُن کے خلاف ہو رہی ہیں، دوسری طرف حکومت کے موجودہ نظام کی سرگرمیاں مسلمانوں کے خلاف جاری ہیں۔ ان مصیبتوں میں بچاؤ کی صورت محض یہ ہے کہ مسلمان اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں اور مردانہ وار ہر مصیبت کا مقابلہ کریں۔"

قرارداد منظور ہوئی۔ علامہ نے میاں محمد شفیع کا شکریہ ادا کیا اور درخواست کی کہ بڑے بڑے شہروں کا دورہ کر کے مسلمانوں کو موجودہ خطرات سے آگاہ کریں۔ اپنی خدمات بھی پیش کیں۔[1]

انجمن خدام الدین کا سالانہ جلسہ بھی ہو رہا تھا۔ مولانا حسین احمد مدنی پہلی دفعہ لاہور آئے۔ ۲/ مئی کو صبح دس بجے انقلاب کے دفتر گئے۔ مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی اور مولانا محمد نعیم ساتھ تھے۔ شام کو علامہ نے حسین احمد کے اعزاز میں اپنے گھر کھانے کی دعوت دی۔ رات ساڑھے آٹھ بجے باغ بیرون موچی دروازہ میں مسلمانوں کا جلسۂ عام تھا۔ علامہ نے صدارت کی۔ حسین احمد نے قریباً ڈھائی گھنٹے تقریر کر کے "وقت کے تمام ضروری مسائل پر تبصرہ کیا۔" علامہ نے مختصراً شکریہ ادا کیا۔ مسلمانوں سے اپیل کی کہ اس تقریر پر خلوص اور سرگرمی کے ساتھ عمل کریں۔ مولانا ظفر علی خاں

---

[1] انقلاب ۳/ مئی ۱۹۲۷ء؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۲۸-۲۶

نے مسلمانوں کے خصائص پر بات کی۔ رات ساڑھے گیارہ بجے کے قریب جلسہ برخاست ہوا۔[1]

۳ر مئی کی صبح حسین احمد روانہ ہو گئے۔ بٹالہ اور گورداسپور جا رہے تھے۔ شام تک لاہور میں موسم خراب ہو گیا۔ شدید آندھی اور بارش تھی۔ ڈبی بازار میں باؤلی صاحب پر ہندوؤں اور سکھوں کی بڑی تعداد جمع ہوئی۔ خبر تھی کہ کسی مسلمان نے ایک سکھ لڑکی پر مجرمانہ حملہ کیا ہے۔ ہجوم نے تقریریں سنیں۔ پھر حویلی کابلی مل میں داخل ہوا۔ مسلمانوں پر کرپانوں اور لاٹھیوں سے حملہ کر دیا۔ دو مسلمان موقع ہی پر ہلاک ہو گئے۔ چار زخمی ہوئے۔ اُن میں سے ایک کے بچنے کی اُمید نہ تھی۔

علامہ اطلاع ملتے ہی موقعِ واردات پر پہنچ گئے۔ رات کے ساڑھے بارہ بجے تھے۔ مسلمانوں نے دو سِکھوں کو گرفتار کر کے پولیس کے حوالے کیا تھا۔ ایک حملہ آور کے ہاتھ سے کرپان چھینی تھی۔ ایک علامہ کی موجودگی میں پکڑا گیا۔ کرپان چھیننے والے نے بیانات قلم بند کروائے۔ غالباً یہ کاروائی محمد امین اندرابی کے مکان پر ہو رہی تھی۔ ''میرے خیال میں اس وقت نہایت بے دلی سے تفتیشِ حالات کی جا رہی تھی،'' علامہ کا بیان ہے۔

۴ر مئی صبح پانچ بجے کے قریب تفتیش ختم ہوئی۔ علامہ واپس آ گئے۔ سات آٹھ بجے میاں عبدالعزیز بیرسٹر ایٹ لأ کے گھر گئے کہ سب مل کر ''مسلمانوں کو امن و امان قائم رکھنے کی ترغیب دیں اور صبر و تحمل کی تلقین کریں۔''[2]

اُس روز لاہور ہائی کورٹ میں دیسی عیسائی جج کنور دلیپ سنگھ نے متنازعہ کتاب کے ناشر راجپال کی اپیل کا فیصلہ سنایا۔ مقدمہ تعزیراتِ ہند کی دفعہ ۱۵۳-الف کے تحت چلا تھا۔ دلیپ سنگھ نے لکھا کہ کتاب کی عبارت ناخوشگوار ہے لیکن اُس قانون کی خلاف ورزی نہیں کرتی۔ نچلی عدالتوں کا فیصلہ غلط ہے۔ راجپال بری ہو گیا۔[3]

---

[1] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸)، حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۲۶۷-۲۶۹ بحوالہ انقلاب ۳ر اور ۴ر مئی ۱۹۲۷ء

[2] انقلاب ۱۲ر مئی ۱۹۲۷ء؛ افضل (۱۹۸۶)، ص ۳۳-۲۸۔ انقلاب ۷ار مئی ۱۹۲۷ء؛ فاروقی (۱۹۸۸)، ص ۲۶۹

[3] ظفر اقبال نگینہ، غازی علم الدین شہید، ص ۳۵

پچھلی رات کے فساد کی وجہ سے شہر میں کشید گی تھی۔ دلی دروازہ، چوک وزیر خاں، ڈبی بازار، کسیرہ بازار، بزاز ہٹہ، لوہاری منڈی اور چوک جھنڈا میں دکانیں بند تھیں۔ علامہ کا بیان ہے، "مسلمان دکانیں کھولنے پر رضامند تھے لیکن ہندوؤں نے انکار کر دیا اور کہا کہ اُنہیں لوٹے جانے کا خطرہ ہے۔" مسلمان گروہ بنا کر شہر میں گھوم رہے تھے۔ پرجوش تھے۔

دن کے گیارہ بجے علامہ اقبال، میاں عبدالعزیز اور اُن کے ساتھی پرانے شہر گئے۔ کئی مقامات پر لوگوں کو صبر و تحمل اور ضبط و امن کی نصیحت کی۔ دو گھنٹے بعد علامہ نے زمیندار میں پڑھا کہ شام پانچ بجے جلسۂ عام منعقد ہو گا۔ مسلم آؤٹ لک کے دفتر سے مولانا ظفر علی خان کو ٹیلی فون کیا کہ جلسہ نہ ہو۔ وہ مان گئے۔

علامہ گھر واپس آئے۔ پنڈت سنتانم اور سردار سردول سنگھ کویشر ملنے آئے ہوئے تھے۔ بحث ہوئی۔ اسی دوران ساڑھے تین بجے کے قریب شیخ عبدالقادر آئے۔ ڈھائی گھنٹے پہلے تین مسلمانوں کی میتیں میو ہسپتال سے ورثا کے حوالے کی گئی تھیں۔ رات شہید ہوئے تھے۔ حویلی کابلی مل سے جنازے نکلنے تھے۔ جلوس تیار تھا۔ "مقتدر اور بااثر مسلمانوں کو ماتمی جلوس میں ضرور شامل ہونا چاہیے تاکہ مجمع کو قابو میں رکھ سکیں،" شیخ عبدالقادر کا خیال تھا۔ علامہ اُن کے ساتھ موچی دروازہ کے قریب جلوس میں شامل ہوئے۔ ڈبی بازار میں تقریر کی۔ کسی نے کہا کہ سکھوں کے پاس کرپانیں ہیں، مسلمانوں کے پاس کچھ بھی نہیں۔ اپنی حفاظت کیسے کریں۔ علامہ کا خیال تھا، "مسلمانوں کے رہنماؤں کو اِس طرف متوجہ ہونا چاہیے... اگر اپنی حفاظت اور اغیار کے حملوں کی مدافعت کے لیے مسلمانوں کو ہتھیار رکھنے کی اجازت نہ ملے تو کونسل کے تمام مسلمان علی العموم اور میں علی الخصوص اس کے لیے سعی بلیغ کریں گے۔" ستر اسی ہزار کا جلوس تھا۔ ظفر علی خاں جنازوں کو کندھا دے رہے تھے۔ علامہ اور شیخ عبدالقادر کے علاوہ میاں سر محمد شفیع، میاں عبدالعزیز اور مولوی غلام محی الدین قصوری وغیرہ بھی تھے۔ ستیلا مندر کے قریب سے گزرے۔ برابر والے مکان سے اینٹیں پھینکی گئیں۔ اشتعال پیدا ہوا۔ مولانا ظفر نے فرو کیا۔ راستے میں کئی دفعہ اینٹیں پھینکی گئیں۔ میاں عبدالعزیز اور علامہ نے ایک ہندو کو گرفتار کروایا جو فساد پیدا کر رہا تھا۔ سرکلر روڈ انارکلی سے گزر کر جلوس یونیورسٹی گراؤنڈ پہنچا۔

مولانا غلام مرشد نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ تینوں شہیدوں کی نمازیں الگ الگ پڑھی گئیں۔ علامہ اور میاں سر محمد شفیع نے مسلمانوں کو صبر کی تلقین کی۔ امن و امان قائم رکھنے پر مبارکباد دی۔[1]

رات پھر فساد ہوا۔ ۵/ مئی تک آٹھ ہندو، چھ مسلمان اور چار سِکھ ہلاک ہو چکے تھے۔ ۹۵/ ہندو، ۱۴۱/ مسلمان، ۱۴/ سِکھ اور ایک عیسائی زخمی تھے۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ اوگلوی (Ogilvie) چھُٹی پر تھے۔ بلوائے گئے۔[2] "بڑی مستعدی سے کام لیا،" علامہ کا بیان ہے، "جونہی اُنہوں نے چارج لیا، صورت حال کو بہتر بنا دیا۔"[3]

"فسادات میں مسلمان اکابر اپنی جانیں ہتھیلی پر لیے پھرتے تھے،" سالک کا کہنا ہے، "بارہا دیکھا گیا ہے کہ علامہ اقبال، ملک محمد حسین، میاں عبدالعزیز، مولانا ظفر علی خاں اور بعض دوسرے حضرات نہایت بے تکلفی سے ہندوؤں کے محلوں اور بازاروں میں چکر کاٹتے پھرتے تھے۔ اگرچہ بعض ہندو غنڈے اُن کو کڑی نگاہوں سے دیکھتے تھے، لیکن حملہ کرنے کی جرأت نہ پڑتی تھی۔"[4] علامہ کی ڈبی بازار والی تقریر مسخ ہو کر یوں مشہور ہوئی کہ مسلمانوں کو ہندوؤں کا مقابلہ کرنے کے لیے جتھے بنانے چاہئیں۔ آریہ سماجی اخبار بندے ماترم نے سرخی لگائی کہ فسادات حسین احمد مدنی کی تقریر کا نتیجہ ہیں۔[5] "فسادات کا اصلی سبب آریہ سماج کی جنگجویانہ اور مصاف آرایانہ روش ہے،" زمیندار نے لکھا، "دھرم کا گھونگھٹ منہ پر ڈال کر اس نے اپنا جال ملک کے کونہ کونہ میں بچھا رکھا ہے۔"[6] جامع مسجد دہلی میں جمعے کا وعظ عام طور پر جوہرؔ دیتے تھے۔ ۶/ مئی کے وعظ میں کہا کہ لاہور ہائی کورٹ کے راجپال والے فیصلے کے سنگین نتائج برآمد ہوں گے۔[7]

---

[1] محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۳۳–۲۸۔ زمیندار ۶/ مئی ۱۹۲۷؛ بلوچ (۱۹۹۵)، ص ۴۲–۴۳

[2] Mitra: *Indian Quarterly Register Jan.-June 1927*, pp.86-89

[3] انقلاب ۲۶/ مئی ۱۹۲۷ء؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۳۶

[4] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸)، حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے ص ۳۹۶ بحوالہ کالم 'افکار و حوادث' انقلاب ۳۱/ مئی ۱۹۲۷ء

[5] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸)، حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۲۶۸–۲۶۹ بحوالہ انقلاب ۱۷/ مئی ۱۹۲۷ء

[6] زمیندار ۶/ مئی ۱۹۲۷؛ جعفر بلوچ (۱۹۹۵) علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں، ص ۴۳–۴۴

[7] Mitra: *Indian Quarterly Register Jan.-June 1927*, pp.92-93

۸ر مئی کو ہندوؤں اور مسلمانوں کے وفد لاہور کے ڈپٹی کمشنر سے ملے۔ ایک دوسرے کی شکایت کی۔ مسلمانوں کے وفد میں علامہ اقبال بھی تھے۔ ڈپٹی کمشنر نے کہا، ''اصلاحات کی اسکیم کے نفاذ سے پہلے پولیس میں ۱۲۰ر برطانوی افسر تھے اور اب صرف ۶۸ ہیں۔ ہمارے برطانوی آفیسروں کی یہ تعداد کافی نہیں اور دونوں فرقے یورپین آفیسر چاہتے ہیں!'' علامہ نے لاٹھی چارج کی شکایت کی۔ دو پولیس افسروں نے کہا کہ انگلستان میں بھی ہوتا ہے۔ علامہ نے کہا کہ مولوی عرفان ایک جلسے سے واپس آرہے تھے۔ پولیس کے سپاہیوں نے لاٹھی سے پیٹا۔ ڈپٹی کمشنر نے جواب دیا کہ ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا۔ علامہ نے کہا کہ باہمی اعتماد کی بحالی کے لیے دِلوں کا بدلنا ضروری ہے۔ اس کے لیے مختلف قوموں کے افراد کو مؤثر تدابیر کرنی چاہییں۔ کچھ نہ کچھ وقت ضرور لگے گا مگر مختلف قوموں کے اصحاب تہِ دل سے یہ مقصد حاصل کرنے کے خواہاں ہیں اور ہر ممکن کوشش عمل میں لائیں گے۔ طے پایا، ''ممتاز شہریوں پر مشتمل مصالحتی کمیٹیاں قائم کی جائیں گی۔ یہ کمیٹیاں ایسی تدابیر تجویز کریں جن سے آیندہ ایسے ناخوشگوار واقعات رونما نہ ہونے پائیں۔'' بعد میں علامہ نے مولوی عرفان سے ملاقات کی۔ اُن کے جسم پر پولیس کی لاٹھیوں کے نشان تھے۔[1]

نواب سر ذوالفقار علی خاں دہلی میں علاج کروارہے تھے۔ خود لاہور نہ آسکتے تھے۔ دو سو روپے علامہ کو بھجوا کر تجویز پیش کی کہ متاثرین کے لیے فنڈ کھول دیا جائے۔ خط میں لکھا، ''میں نہیں جانتا کہ ہمیں تاریخ عالم میں کوئی ایسی مثال مل سکتی ہو جس میں ملک کے باشندوں نے انسانی جذبات کی پروانہ کرتے ہوئے اتنی بیدردی سے خود اپنی تباہی اور ہلاکت کے لیے ایسی وحشیانہ خانہ جنگی کی ہو۔ یہ ہلاکت آفریں واقعات ایک معنوں میں ہماری قومی امنگوں کے لیے موت کا پیغام ہیں۔''

حاجی عبداللہ ہارون مجلسِ ہند کے مسلمان رُکن تھے۔ ۹ر مئی کو کراچی سے علامہ کے نام خط لکھا، ''آپ میری دلی ہمدردی کا پیغام مسلمانوں کے مظلوم اور مصیبت زدہ خاندانوں اور دوسری

[1] اِن معلومات کے ماخذ ہیں: علامہ کی تقریر پنجاب اسمبلی کے اجلاس ۱۸ جولائی ۱۹۲۷ء میں بحوالہ Sherwani؛ انقلاب ۱۲ر مئی ۱۹۲۷ء میں علامہ کا انٹرویو؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۳۳-۲۸

قوموں کے بے گناہ اشخاص تک پہنچا دیں جو مصیبت کا شکار ہوئے۔ میں آپ کو اور آپ کے رفقا کو مبارکباد دیتا ہوں کہ آپ نے مسلمانوں کو نہایت صبر آزما لمحوں کے اندر قابو میں رکھا۔ امید ہے کہ دوسری قوموں کے جرائد اور رہنما بھی بحالی امن کی مساعی میں آپ کے مددگار ہوں گے۔"

۱۰ مئی کو لاہور ہائی کورٹ نے کسی عباس خاں اور بعض دوسروں کی اپیل جزوی منظور کر لی۔ علامہ اور سی ایل گلاٹی پیروی کر رہے تھے۔ اپیل رام دان اور محمد وغیرہ کے خلاف تھی۔ اُن کا دفاع ایم ایس بھگت اور جی ڈی بھگت کر رہے تھے۔ سماعت جسٹس ٹیک چند اور جسٹس آغا حیدر نے کی تھی۔[1]

طے ہوا کہ ۱۳ مئی کو رائے بہادر موتی لال ساگر کے دولت کدے پر میٹنگ ہو۔ تمام مکاتیبِ فکر کے لوگوں کی کمیٹی بنے۔ ۱۱ مئی کو رام سرن داس، رائے بہادر، میاں سر محمد شفیع، علامہ اقبال اور مہتاب سنگھ کی طرف سے معززین کو خطوط لکھے گئے۔ ان میں میاں عبدالعزیز شامل تھے۔ ۱۳ مئی کو علامہ بھی میٹنگ میں گئے۔ تجویز پیش کی کہ باتیں بنانے کی بجائے بڑی تعداد میں سب کمیٹیاں بنائی جائیں۔ وہ شہر کے مختلف حصوں میں جا کر لوگوں کو سمجھائیں کہ فرقہ وارانہ جھگڑے سے فائدہ نہ ہو گا۔ "یہ اِس جوائنٹ کمیٹی کی پہلی اور آخری میٹنگ تھی،" علامہ کا بیان ہے، "میری تجویز کا وہی حشر ہوا جو عام طور پر اِس قسم کی تجاویز کا ہوتا ہے۔"[2]

مزنگ کے مسلمانوں نے مسلم ریلیف کمیٹی کو پانچ سو روپیہ چندہ بھیجا تھا۔ ۱۵ مئی کو علامہ کو اُن کی طرف سے مزید سات سو روپے موصول ہوئے۔ خان بہادر میاں چراغ دین اور ساتھیوں کی کوشش کا نتیجہ تھا۔ علامہ نے انقلاب کے ذریعے لاہور کے مسلمانوں کی طرف سے شکریہ ادا کیا۔[3]

ذہین فاروقی جے پوری ایک ملاقاتی تھے۔ ملاقات کے دوران علامہ نے جو خیالات ظاہر کیے، جے پوری نے 'نقوشِ زریں' کے عنوان سے نظم کیے:

---

[1] ظفر علی راجا ایڈووکیٹ (۲۰۱۳) قانون دان اقبال، ص ۱۲۵

[2] علامہ اقبال کی تقریر صوبائی قانون ساز مجلس میں ۱۸ جولائی؛ ماخذ Sherwani (1977/1944)۔ نیز مکتوب بنام میاں عبدالعزیز ۱۱ مئی ۱۹۲۷ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۷۰

[3] محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۳۴

فرقہ وارانہ نزاعات مسلماں چھوڑیں　　خانہ جنگی کا کبھی بھول کے لائیں نہ خیال
اجنبیت کا کچھ احساس دلوں میں نہ رہے　　یوں مساوات کو حاصل رہے معراجِ کمال
حنفی مالکی و حنبلی و شافعی اب　　نہ فروعات میں آپس میں کریں جنگ وجدال[1]

98

خان نیاز الدین خاں نے مسلم آؤٹ لُک میں مضمون لکھا۔ قرآن شریف کا مقدمہ لکھنے کی ضرورت ہے۔ اس کام کے لیے علامہ سے بہتر کوئی نہیں۔ علامہ خود بھی مائل ہیں۔ جن کتابوں کی ضرورت ہے وہ صرف یورپ کی لائبریریوں میں دستیاب ہیں۔ جب زبورِ عجم شائع ہو تو علامہ اُسے ایک جلسے میں قوم کے سامنے پیش کریں۔ داخلہ بذریعہ ٹکٹ ہو۔ کتاب کی قیمت پانچ روپے ہو۔ پانچ ہزار نسخے شائع کیے جائیں۔ اجتماعی کوشش کر کے پانچ سو خریدار مہیا کیے جائیں۔ اس طرح اتنا سرمایہ جمع ہو سکتا ہے کہ علامہ کو چند برس کے لیے یورپ بھیجا جا سکے۔ ۲۱ر مئی کے شمارے میں انقلاب نے تجویز کی تائید کی۔ معلوم نہیں علامہ نے کیا کہا۔ جون ۱۹۲۳ء میں اسی قسم کی ایک تجویز مسترد کر چکے تھے۔[2]

۲۲ر مئی کے زمیندار میں شیخوپورہ کے مولوی اصغر حسین نظیر لدھیانوی کی فارسی نظم 'مقصودِ رسالتؐ' شائع ہوئی۔ علامہ کے بعض افکار کی تشریح تھی۔[3]

99

اس ماہ امرتسر سے نکلنے والے ہندو رسالے ورتمان میں مضمون 'سیر دوزخ' شائع ہوا۔ آنحضورؐ کی شان میں گستاخی کی گئی۔[4] مسلمانوں اور ہندوؤں کے بعض رہنماؤں نے کہا کہ اخبارات کی بیجا آزادی کو روکا جائے۔ ۲۳ر مئی کو مسلم آؤٹ لُک کا نمایندہ علامہ سے ملا۔ انہوں نے تجویز کی حمایت کی:

---

[1] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸) حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۳۲۹-۳۳۰ بحوالہ انقلاب ۱۸ر مئی ۱۹۲۷ء

[2] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸) حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۱۰۲-۱۰۳ بحوالہ انقلاب ۲۱ر مئی ۱۹۲۷ء

[3] اختر النسا (۲۰۱۰)، اقبال اور زمیندار، ص ۱۴۷-۱۴۸

[4] جعفر بلوچ (۱۹۹۵) علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں، ص ۴۶

آزادئ تحریر قوم کی ترقی کا ایک نہایت اہم جزو ہے... بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں آزادی کا حامی ہوں لیکن میں دلائل سے متاثر نہیں ہوسکتا، اور آزادی اور لائیسنس (License) کو یکساں نہیں سمجھ سکتا۔ حقیقی آزادی اخلاقی ضبط نفس کا نتیجہ ہوا کرتی ہے۔

اگر دیسی اخبارات سنسنی پھیلانے والے عنوان لکھنا چھوڑ دیں، تقریروں وغیرہ کی رپورٹ کرنے کے لیے بہتر آدمی رکھیں، ایسے چھوٹے چھوٹے واقعات کو، جو کسی اور طریقہ کی معاشرت میں جاذبِ توجہ نہیں ہوسکتے، فرقہ وارانہ رنگ دینے سے احتراز کرنے لگیں تو دیسی زبانوں کے اخبارات کی تعلیمی قدر و قیمت بہت بڑھ سکتی ہے۔ ایسے ملک میں، جہاں عام اشخاص نقاد نہیں اور سطحی عقل رکھنے والے ہیں، ایسی احتیاط نہایت ضروری ہے۔ بہر حال اس اعلان کا مقصد اخبارات کے لب و لہجہ کی اصلاح کے سوا اور کچھ نہیں۔ یہ ان کی آزادی کو سلب نہیں کرتا۔

نمایندے نے پوچھا کہ اب کیا پروگرام ہونا چاہیے۔ علامہ نے جواب دیا:

ہمیں لاہور کے فسادات سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ صرف یہ حقیقت کہ ہمیں ایک دوسرے کے خلاف اپنی حفاظت کے لیے برطانوی تحفظ کی ضرورت ہے، یہ ظاہر کر رہا ہے کہ ہم کس منزل پر ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اس حقیقت نے مجھے اپنے سیاسی خیالات اور سیاسی عقائد پر از سر نو غور کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ پنجاب کے مسلمانوں، خاص طور پر دیہاتی مسلمانوں میں، جو ہماری قوم کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی مانند ہیں، جہالت عام ہے اور کسی قسم کی سیاسی یا اقتصادی بیداری پیدا نہیں ہوئی۔ قوم کی قوتوں کو فرقہ بندی اور ذاتوں کی تقسیم نے علیحدہ منتشر کر رکھا ہے... اب میں اس امر کا قائل ہو گیا ہوں کہ اس صوبہ کے مسلمانوں کا اولین فرض یہ ہے کہ وہ اپنی داخلی تنظیم اور اصلاح کی طرف متوجہ ہوں۔ اس امر کے لیے قوم کے رہنماؤں کو مسلسل کوشش کرنی پڑے گی اور حکومت سے سوالات کرنے کی بھی ضرورت ہو گی۔ تنازعہ للبقا کے اس عالم گیر دور میں دوسری قوموں سے امداد کی توقع رکھنا فضول ہے... جب سب قومیں

فی الواقع مضبوط ہو جائیں گی تو باہمی مفاہمت ہونا یقینی امر ہے۔[1]

100

ہوشیارپور میں عبدالقادر گرامی بیمار پڑے تھے۔ اَسّی برس سے زیادہ عمر ہو چکی تھی۔ شدید بخار تھا۔ ۲۴؍ مئی کو حفیظ جالندھری آئے۔ شاگردوں میں سب سے زیادہ مشہور ہو چکے تھے۔ اُن کا بیان ہے:

میرے اُستاد بھائی مولانا عزیز الدین احمد عظامی ہوشیارپوری مردانے میں موجود تھے۔ اُن سے معلوم ہوا کہ حالت نازک ہے۔ زنان خانے میں صاحبِ فراش ہیں۔ اندر اطلاع کرائی تو فرمایا ہمیں مردانے میں لے چلو۔ دو آدمیوں کا سہارا لیے ہوئے مردانے میں آئے۔ اس قدر کمزور تھے کہ صورت پہچانی نہ جاتی تھی۔ ضعف اتنا بڑھ گیا کہ وہاں تک آتے آتے نڈھال ہو کر پلنگ پر لیٹ گئے۔ میں نے پرنم آنکھیں ان کے سر اور ہاتھوں پر ملیں۔ تھوڑی دیر میں آپ نے میری طرف دیکھا اور پہچان لیا۔ دیرینہ شفقت مرجھائے ہوئے چہرے پر مسکرائی۔ ہاتھ بڑھا کر اپنے فرزندِ معنوی کا سر اپنے سینے پر رکھ لیا اور دھیمی آواز میں فرمایا، حفیظ آ گیا۔ ہمیں یقین تھا حفیظ گرامی کو دیکھنے ضرور آئے گا۔ شکوہ کے طور پر کہا: ڈاکٹر اقبال نہیں آئے۔ تین تار بھیجے گئے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ لاہور میں فسادات کی وجہ سے بیحد مصروف ہوں گے۔ پھر جالندھر اور پنجاب کی تعریف میں شعر پڑھتے رہے۔ جالندھر، ڈاکٹر اقبال اور حکیم اجمل خاں کو بار بار یاد کرتے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ فرمائیں تو لاہور جا کر انہیں لے آؤں۔ منع کیا اور کہا رہنے دو، اُن کے معمولات میں ہرج واقع ہو گا۔ تندرست ہو کر گرامی خود اُن سے ملنے چلا جائے گا۔[2]

حفیظ نے کہا، ''گرامی نے جالندھر کو زندۂ جاوید کر دیا ہے۔'' گرامی مسکرائے اور جواب دیا، ''حفیظ،

---

[1] انقلاب ۲۶؍ مئی ۱۹۲۷ء؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۳۷-۳۴

[2] گرامی (۱۹۷۶)، کلیاتِ گرامی، ص ۵۶-۵۵

گرامی کو زندۂ جاوید کرے گا۔" حفیظ کے آنسو نکل آئے۔[1]

۲۷ر مئی کو گرامی فوت ہو گئے۔ نوجوان شاعر حفیظ ہوشیارپوری نے فارسی میں لکھا کہ اے بادِ صبا، اقبال سے جا کر کہو کہ گرامی چل بسے اور آپ ابھی تک خاموش ہیں:

صبا بہ حضرتِ اقبال ایں پیامم دہ برفت جان گرامی و تو ہنوز خموش[2]

علامہ نے پانچ اشعار کا قطعہ لکھ کر انقلاب کے حوالے کر دیا:

آہ مولانا گرامی از جہاں بربست رخت[3]

101

صدر بلدیہ ملک محمد حسین کو خان بہادر کا خطاب ملا تھا۔ ککے زئی برادری نے اُن کی دعوت کرنے کے لیے ایک ہزار روپیہ جمع کیا تھا۔ مسلم ریلیف فنڈ کمیٹی کو دے دیا۔ ملک محمد حسین کے وارڈ میں الگ چندہ ہو رہا تھا۔ وہ بھی کمیٹی کو دینے کا وعدہ ہوا۔ انقلاب میں علامہ اقبال اور کمیٹی کے خازن شیخ عظیم اللہ نے محمد حسین اور اُن کی برادری کو "بلند ہمتی پر" مبارک باد پیش کی۔[4]

۳۱ر مئی کو سردار بیگم کو بخار ہوا۔ حرارت ۱۰۶ درجے سے زیادہ ہو گئی۔ اگلی شام ڈاکٹر کی آمد ٹھہری۔ اُس روز علامہ انجمنِ طبیہ کے زیرِ اہتمام مذاکرے کی صدارت کرنے والے تھے۔ اب معذرت کرنے کی ضرورت پیش آئی۔ سیکرٹری کا نام پتہ معلوم نہ تھا۔ عبداللہ چغتائی کے نام خط لکھا کہ اطلاع پہنچائیں۔[5]

---

[1] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸)، حیات اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۲۳۷

[2] گرامی (۱۹۷۶)، کلیاتِ گرامی، ص ۵۷-۵۶

[3] عبدالمجید سالک (۱۹۸۳) ذکرِ اقبال، ص ۱۳۸

[4] انقلاب ۳۱ر مئی ۱۹۲۷

[5] مکتوب بنام عبداللہ چغتائی ۳۱ر مئی ۱۹۲۷ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۷۱-۶۷۰

102

خواجہ عبدالحمید نے اسلامیہ کالج چھوڑا۔ الوداعی تقریب میں علامہ بھی مدعو کیے گئے۔ منتظم نے شکریہ ادا کیا تو کہنے لگے کہ دوست کے ملازمتی جنازے میں شرکت ضروری تھی:

> The Professor is my friend. I had to find time for his official funeral.

قہقہہ پڑا۔ علامہ نے کہا کہ الوداعی تقاریب کے لیے انہوں نے یہ اصطلاح وضع کی ہے۔[1]

سید نذیر نیازی جامعہ ملیہ دہلی میں استاد ہو گئے تھے۔ گرمیوں کی تعطیلات میں بعض دوستوں کے ساتھ کشمیر کے لیے نکلے۔ ڈاکٹر سید عابد حسین نے برلن سے پی ایچ ڈی کی تھی۔ جامعہ میں فلسفہ پڑھاتے تھے۔ گوئٹے کے فاؤسٹ کا اُردو ترجمہ کر رہے تھے۔ علامہ سے ملنے کا شوق تھا۔ لاہور سے گزرتے ہوئے نذیر انہیں اور دوسرے دوستوں کو لے کر تیسرے پہر علامہ کی کوٹھی پر آئے۔ جامعہ، کشمیر، جرمن قوم اور گوئٹے پر گفتگو ہوئی۔ ڈاکٹر عابد کلام سننا چاہتے تھے۔ ''علامہ سے کلام کی فرمائش کرنا کوئی آسان بات نہیں تھی،'' نذیر کا بیان ہے، ''معلوم نہیں کیسے حضرت علامہ ان کا مطلب سمجھ گئے۔'' زیرِ طبع زبورِ عجم کے بعض اشعار سنائے اور کہا کہ یہ کتاب اہلِ مشرق کے لیے ہے۔ نذیر اِس کا مطلب یہ سمجھے کہ پیامِ مشرق ایک طرح سے اہلِ مغرب کے لیے تھی۔ ڈاکٹر عابد نے پوچھا، ''اُس کے بعد؟'' علامہ نے جواب دیا کہ ڈانٹے کی ڈیوائن کامیڈی کی طرح ایک ''اسلامی کامیڈی''۔ ڈاکٹر عابد نے کہا، ''مگر اس کے لیے تو کسی بیٹرس [Beatrice] کی ضرورت ہو گی۔'' نذیر کا بیان ہے، ''حضرت علامہ مسکرائے اور فرمایا اب میری عمر بیٹرس کی نہیں۔ ہاں جاوید کو اللہ تعالیٰ زندگی دے، میں اس کا نام جاوید کے نام پر رکھوں گا۔ پھر پاس ہی رکھی ہوئی تپائی کی طرف ہاتھ بڑھایا اور اپنی بیاضِ اشعار اُٹھا کر بعض مطالب کی تشریح میں چند ایک قطعات سنائے جو آگے چل کر بہ حک و اضافہ 'جاویدنامہ' کا جزو بنے۔''

علامہ وضاحت کرنے لگے کہ ٹریجڈی یونانی ادب کی خاص چیز ہے۔ اس میں یونانیوں نے اپنی

---

[1] خواجہ عبدالحمید (۱۹۴۴)'اقبال کے علمی جواہر ریزے'ص ۷۱

وارداتِ زندگی کا اظہار کیا۔ ناکامی اور نامرادی کی زندگی تھی۔ دنیا سے ناسازگاری کی۔ دانتے نے مسیحیت کے زیرِ اثر دنیا کو چھوڑ کر عالمِ بالا کا رُخ کیا۔ ابنِ عربی اور بعض صوفیوں نے بھی کیا۔ تب بھی ابنِ عربی کے مقاصد، خیالات اور تصورات کی دنیا دانتے سے مختلف تھی۔ ''میں بھی عالمِ بالا کا رُخ کر رہا ہوں،'' علامہ نے کہا، ''مولانا روم میری رہنمائی کریں گے اور آپ دیکھیں گے کہ لفظ 'کامیڈی' میں ایک نئے معنی پیدا ہو گئے ہیں جو ڈانٹے پیدا نہیں کر سکا—یونانی تصوّر کے بر عکس۔''[1]

103

عید الاضحی آئی۔ ۱۰ر جون کو انقلاب کا عید نمبر نکلا۔ 'دینِ ابراہیم علیہ السلام' کے عنوان سے علامہ کے چار اَشعار شامل تھے۔ فارسی میں تھے۔ ''مژدہ'' بھی تھا کہ زبورِ عجم چھپ گئی ہے۔ دو روز میں بازار میں پہنچ جائے گی۔ پھر تاخیر ہوئی۔[2]

۱۱ر جون کو مسلمانوں کے وفد نے گورنر پنجاب سر میلکم ہیلی سے ملاقات کی۔ گورنر نے کہا کہ وہ بھی لاہور ہائی کورٹ پر حیران ہیں۔ قانونی مشیروں نے مشورہ دیا ہے کہ راجپال کے مقدمے میں دخل نہ دیں۔ اُس کی بجائے رسالہ ورتمان کے مقدمے کو نچلی عدالتوں کی بجائے براہِ راست ہائی کورٹ میں چلانے کا حکم دے رہے ہیں۔ عدالت کا پورا بنچ فیصلہ کرے گا۔ واضح ہو جائے گا کہ موجودہ قانون میں ایسی تحریروں کے سدِباب کی گنجایش ہے یا نہیں۔ ضرورت ہوئی تو قانون بدلوایا جائے گا۔ یہ معلوم نہیں کہ علامہ وفد میں شامل تھے یا نہیں۔ گورنر کا بیان تسلی بخش محسوس ہوا۔[3]

۱۲ر جون کو سر فضل حسین کا خط ملا۔ غالباً علامہ کے ۲۳ر مئی والے اخباری بیان کے حوالے سے کچھ روز پہلے لکھا گیا تھا جب علامہ لاہور سے باہر تھے۔ سر فضل کو بھیجنے کے لیے انقلاب، زمیندار اور مسلم آؤٹ لُک اخبارات کے ۱۷، ۱۸ر اور ۱۹ر مئی کے تراشے اکٹھے کرنے لگے۔ سہ پہر کے وقت

[1] نذیر نیازی (۱۹۵۷)، مکتوباتِ اقبال

[2] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸)، ص ۴۸۔ اشعار کسی مجموعے میں شامل نہیں۔ زبورِ عجم کا اشتہار، ایضاً، ص ۳۰۳-۳۰۴

[3] Mitra: *Register, Jan.-June 1927, p.7*؛ ۱۰ر جولائی کو علامہ کی تقریر: افضل (۱۹۸۶)، ص ۴۵

تین مسلمان آئے۔ تین گواہوں کی موجودگی میں علامہ سے بیان کیا کہ ایک مسلمان گوالمنڈی سے گزر رہا تھا جب ایک مکان کی چھت سے اینٹ پھینکی گئی۔ زخمی ہو گیا۔ پولیس دباؤ ڈال رہی تھی کہ وہ کسی اور مکان کی نشاندہی کرے۔

شام کو ڈپٹی کمشنر خود پر پہنچے۔ اُمید ہوئی کہ صحیح بیان ریکارڈ ہو جائے۔ ۱۳/ جون کو علامہ نے سر فضل کو انگریزی میں جواب لکھا کہ ہندوؤں کا منصوبہ یہ ہے کہ ملک میں خانہ جنگی کروائیں۔ اس کے لیے مسلمانوں کو طاقت کے زور پر خوفزدہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں:

> It is now perfectly clear that it is part of the Hindu programme to overawe Muslims by physical force, and thus to bring about a state of civil war in the country. It is a very serious situation; I hope the Government realises it fully.[1]

104

سراج نظامی نے خط لکھ کر فاؤسٹ کے اُردو ترجمے کے متعلق پوچھا۔ علامہ نے ۱۵/ جون کو جواب دیا، "فوسٹ کا اردو ترجمہ جہاں تک مجھے معلوم ہے، نہیں ہوا۔ البتہ ایک اور ڈرامہ 'شیطان کا غلام' کے نام سے مشہور ہے جو اسی روایت پر غالباً مبنی ہے... فوسٹ کا اردو ترجمہ آسان کام نہیں ہے ... عام پبلک کچھ حظ نہ اٹھا سکے گی۔"[2]

۱۹/ جون کو انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کا اجلاس ہوا۔ میاں محمد شفیع صدارت کر رہے تھے۔ علامہ اقبال کالج کمیٹی کے رکن مقرر ہوئے۔[3]

مسلم آؤٹ لُک نے مطالبہ کیا تھا کہ کنور دلیپ سنگھ ہائی کورٹ کی ججی سے استعفیٰ دے دیں۔ انہوں نے راجپال کے مقدمے کا غلط فیصلہ کیا ہے۔ ۲۱/ جون کو لاہور ہائی کورٹ نے اخبار کے مدیر اور پبلشر پرنٹر کو توہینِ عدالت کے جرم میں سزا سنائی۔[4]

---

[1] مکتوب بنام سر فضل حسین ۱۳/ جون ۱۹۲۷ء (انگریزی)؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۷۵-۶۷۳

[2] مکتوب بنام سراج نظامی ۱۵/ جون ۱۹۲۷ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۷۶-۶۷۵

[3] انجمن کی قلمی روداد؛ محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶)، اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص ۱۷۹

[4] Mitra: *Indian Quarterly Register Jan.-June 1927,* p.8

زبورِ عجم

ڈاکٹر شیخ سر محمد اقبال صاحب بیرسٹر ایٹ لا کی تازہ تصنیف چھپ کر تیار ہو گئی ہے۔ لکھائی چھپائی دیدہ زیب ہے۔ کاغذ بھی اعلیٰ درجے کا ہے۔ مجلد کتاب ایک روپیہ زائد خرچ کرنے پر مل سکتی ہے۔ جِلد نہایت خوبصورت اور پائیدار ہے۔ جِلد پر ڈاکٹر صاحب اور کتاب کا نام سنہری حروف سے لکھا ہوا ہے۔ قیمت کتاب، تین روپیہ، علاوہ محصول ڈاک۔ قیمت کتاب مجلد چار روپیہ، علاوہ محصول ڈاک۔

المشتہر۔ شیخ طاہر الدین۔ بازار انار کلی۔ لاہور۔

باب ۶

قصرِ حکومت

جون ۱۹۲۷ء سے دسمبر ۱۹۲۸ء تک

کاپی رائٹ

محمد صدیق خوشنویس لاہور

زبورِ عجم

اقبال

کتاب کے شروع میں 'بخوانندۂ کتابِ زبور' کے عنوان سے چار اشعار تھے۔ اُس کے بعد کتاب چار حصوں میں منقسم تھی:

- زبورِ عجم حصۂ اوّل: شروع میں ایک شعر تھا۔ اُس کے بعد سات اشعار کی 'دُعا'۔ پھر نمبر وار غزل نما ٹکڑے تھے۔ ۱/ عشقِ شور انگیز راہر جادہ در کوے تو برد؛ ۲/ درونِ سینۂ ما سوزِ آرزو زکجاست؟؛ ۳/ غزال سراے ونواہاے رفتہ باز آور؛ ۴/ اے کہ زمن فزودہ گرمیٔ آہ ونالہ را؛ ۵/ از مُشتِ غبارِ ما صد نالہ بر انگیزی؛ ۶/ من اگر چہ تیرہ خاکم دلکے است برگ وسازم؛ ۷/ بصداے دردمندے بنواے دلپذیرے؛ ۸/ بر سرِ کفر و دیں فشاں رحمتِ عامِ خویش را؛ ۹/ نواے من ازاں پر سوز و بیباک و غم انگیز است؛ ۱۰/ دل و دیدۂ کہ دارم ہمہ لذّتِ نظارہ؛ ۱۱/

گرچہ شاہینِ خرد بر سرِ پروازے ہست؛ ۱۲/ ایں جہاں چیست؟ صنم خانۂ پندارِ من است! ۱۳/ فصلِ بہار ایں چنیں بانگ ہزار ایں چنیں؛ ۱۴/ بروں کشید ز پیچاکِ ہست و بُود مرا؛ ۱۵/ خیز و بخاکِ تشنۂ بادۂ زندگی فشاں؛ ۱۶/ تو بایں گماں کہ شاید سرِ آستانہ دارم؛ ۱۷/ نظر بہ راہ نشیناں سوارہ می گذرد؛ ۱۸/ بر عقلِ فلک پیما ترکانہ شبیخوں بہ؛ ۱۹/ یا چناں کن یا چنیں! ۲۰/ عقل ہم عشق است و از ذوقِ نگہ بیگانہ نیست؛ ۲۱/ سوز و گدازِ زندگی لذتِ جستجوے تو؛ ۲۲/ دریں محفل کہ کارِ زو گذشت از بادہ و ساقی؛ ۲۳/ ساقیا بر جگرم شعلۂ نمناک انداز؛[1] ۲۴/ ازاں آبے کہ در من لالہ کارد ساتگینے دہ؛ ۲۵/ ز ہر نقشے کہ دل از دیدہ گیرد پاک می آیم؛ ۲۶/ دلِ بے قیدِ من بانورِ ایماں کافری کردہ؛ ۲۷/ ز شاعر نالۂ مستانہ در محشر چہ می خواہی؛ ۲۸/ نہ در اندیشۂ من کارزارِ کفر و ایمانے؛ ۲۹/ مرغِ خوش لہجہ و شاہینِ شکاری از تست؛ ۳۰/ خوشتر ز ہزار پارسائی؛ ۳۱/ بر جہانِ دلِ من تاختنش را نگرید؛ ۳۲/ مرا براہِ طلب بار در گل است ہنوز؛ ۳۳/ زمستاں را سر آمد روز گاراں؛ ۳۴/ ہواے خانہ و منزل ندارم؛ ۳۵/ از چشمِ ساقی مستِ شرابم؛ ۳۶/ شب من سحر نمودی کہ بہ طلعت آفتابی؛ ۳۷/ دریں میخانہ اے ساقی ندارم محرمے دیگر؛ ۳۸/ بہ جہانِ درد منداں توبگو چہ کار داری؟؛ ۳۹/ اگر نظارہ از خود رفتگی آرد حجاز اولے؛ ۴۰/ نورِ تو وانمود سپید و سیاہ را؛ ۴۱/ بدہ آں دل کہ مستی ہاے او ز بادۂ خویش است؛ ۴۲/ کفِ خاک برگ و سازم برہے فشانم اورا؛ ۴۳/ ایں دل کہ مرا دادی لبریزِ یقیں بادا؛ ۴۴/ رمزِ عشقِ تو بہ اربابِ ہوس نتواں گفت؛ ۴۵/ یادِ ایامیکہ خورم بادہ ہا با چنگ و نے؛ ۴۶/ انجم بگریباں ریختہ ایں دیدۂ تر مارا؛ ۴۷/ خاور کہ آسماں بہ کمندِ خیالِ اوست؛ ۴۸/ فرصتِ کشمکش مدہ ایں دلِ بے قرار را؛ ۴۹/ جانم در آویخت باروز گاراں؛ ۵۰/ بہ تسلّیٔ کہ دادی نگذاشت کارِ خود را؛ ۵۱/ بحرفے می تواں گفتن تمنّاے جہانے را؛ ۵۲/ چند بروے خود کشی پردۂ صبح و شام را؛ ۵۳/ نفس شمار بہ پیچاکِ روز گارِ خودیم؛ ۵۴/ بہ فغاں نہ

[1] پہلے اڈیشن میں کاتب نے غلطی سے ۳۳ لکھا اور ۵۶ تک غلط نمبر ڈالے۔ بعد کے اڈیشنوں میں درست ہوئے۔

لب کشودم کہ فغاں اثر ندارد؛ ۵۵/ ما کہ افتندہ تر از پرتوِ مہ آمدہ ایم؛ ۵۶/ اے خدائے مہ و مہر خاکِ پریشانے نگر!

- زبورِ عجم حصہ دوم: شروع میں ایک شعر تھا۔ اُس کے بعد چار اشعار کی نظم۔ پھر نمبر وار غزل نما ٹکڑے تھے۔ ۱/ بر خیز کہ آدم راہنگامِ نمود آمد؛ ۲/ مہ و ستارہ کہ در راہِ شوق ہم سفر اند؛ ۳/ درونِ لالہ گذر چوں صبا توانی کرد؛ ۴/ اگر بہ بحرِ محبت کرانہ می خواہی؛ ۵/ زمانہ قاصدِ طیّارِ آں دلآرام است؛ ۶/ دگر ز سادہ دلیہائے یار نتواں گفت؛ ۷/ خرد از ذوقِ نظر گرمِ تماشا بوداست؛ ۸/ غلامِ زندہ دلانم کہ عاشقِ سرہ اند؛ ۹/ لالۂ ایں چمن آلودۂ رنگ است ہنوز؛ ۱۰/ تکیہ بر حُجّت و اندازِ بیاں نیز کنند؛ ۱۱/ چو موج مستِ خودی باش و سر بطوفاں کش؛ ۱۲/ خضرِ وقت از خلوتِ دشتِ حجاز آید بروں؛ ۱۳/ ز سلطاں کنم آرزوے نگاہے!؛ ۱۴/ بانشۂ درویشی در ساز و دمادم زن؛ ۱۵/ ہوس ہنوز تماشا گرِ جہانداری است؛[1] ۱۶/ فرشتہ گرچہ بروں از طلسمِ افلاک است؛ ۱۷/ عرب کہ باز دہد محفلِ شبانہ کجاست؟؛ ۱۸/ مانندِ صبا خیز و وزیدن دگر آموز؛ ۱۹/ از خوابِ گراں، خوابِ گراں، خوابِ گراں خیز؛ ۲۰/ جہانِ ماہمہ خاک است و پے سپر گردد؛ ۲۱/ باز بر رفتہ و آیندہ نظر باید کرد؛ ۲۲/ خیالِ من کہ تماشائے آسماں بوداست؛ ۲۳/ از نوا بر من قیامت رفت و کس آگاہ نیست؛ ۲۴/ شرابِ میکدۂ من نہ یادگارِ جم است؛ ۲۵/ لالۂ صحرا ایم از طرفِ خیابانم برید؛ ۲۶/ سخنِ تازہ زدم کس بہ سخن وانرسید؛ ۲۷/ عاشق آں نیست کہ لب گرمِ فغانے دارد؛ ۲۸/ دریں چمن دلِ مرغاں زماں زماں دگر است؛ ۲۹/ ما از خدائے گم شدہ ایم او بجستجو ست؛ ۳۰/ انقلاب! انقلاب! اے انقلاب!؛ ۳۱/ گرچہ می دانم کہ روزے بے نقاب آید بروں؛ ۳۲/ کشادہ روز خوش و ناخوشِ زمانہ گذر؛ ۳۳/ زندگی در صدفِ خویش گہر ساختن است؛ ۳۴/ بروں زیں گنبدِ دربستہ پیدا کردہ ام راہے؛ ۳۵/ گنہگارِ غیورم مزدِ بے خدمت نمی گیرم؛ ۳۶/ جہاں کوراست و از

[1] پہلے اڈیشن میں کاتب نے غلطی سے اس پر ۱۳ لکھا۔ بعد کے اڈیشنوں میں درست ہوا۔

آئینۂ دل غافل افتاد است؛ ۳۷ر نہ یابی در جہاں یارے کہ داند دلنوازی را؛ ۳۸ر علمے کہ تو آموزی مشتاقِ نگاہے نیست؛ ۳۹ر چہ خورشیدِ سحر پیدا نگاہے می تواں کردن؛ ۴۰ر کشیدی بادہ ہا در صحبتِ بیگانہ پے در پے؛ ۴۱ر عشق اندر جستجو افتاد و آدم حاصل است؛ ۴۲ر بیا کہ خاوراں نقشِ تازۂ بستند؛ ۴۳ر عشق را نازم کہ بودش را غمِ نابودنے؛ ۴۴ر بر دلِ بیتابِ من ساقیٔ مۓ نابے زند؛ ۴۵ر فروغِ خاکیاں از نوریاں افزوں شود روزے؛ ۴۶ر ز رسم و راہِ شریعت نکردہ ام تحقیق؛ ۴۷ر از ہمہ کس کنارہ گیر صحبتِ آشنا طلب؛ ۴۸ر بینی جہاں را خود را نہ بینی؛ ۴۹ر من ہیچ نمی ترسم از حادثۂ شب ہا؛ ۵۰ر تو کیستی؟ ز کجائی؟ کہ آسمانِ کبود؛ ۵۱ر دیارِ شوق کہ درد آشناست خاک آنجا؛ ۵۲ر مۓ دیرینہ و معشوقِ جواں چیزے نیست؛ ۵۳ر قلندراں کہ بہ تسخیرِ آب و گِل کوشند؛ ۵۴ر دو دستہ تیغم و گردوں برہنہ ساخت مرا؛ ۵۵ر مثلِ شرر ذرّہ را تن بہ تپیدن دہم؛ ۵۶ر خودی را مردم آمیزی دلیلِ نارسائی ہا؛ ۵۷ر چوں چراغِ لالہ سوزم در خیابانِ شما؛ ۵۸ر دمِ مرا صفتِ بادِ فرودیں کردند؛ ۵۹ر گذر ازانکہ ندیدست و جز خبر ندہد؛ ۶۰ر دریں صحرا گذار افتاد شاید کاروانے را؛ ۶۱ر ترا ناداں اُمیدِ غم گساری ہا ز افرنگ است؟؛ ۶۲ر بگذر از خاور و افسونیٔ افرنگ مشو؛ ۶۳ر جہانِ رنگ و بو پیدا تو می گوئی کہ راز است ایں؛ ۶۴ر از داغِ فراقِ او در دل چمنے دارم؛ ۶۵ر بہ نگاہِ آشنائے چو درونِ لالہ دیدم؛ ۶۶ر ایں ہم جہانے آں ہم جہانے؛ ۶۷ر بہار آمد نگہ می غلطد اندر آتشِ لالہ؛ ۶۸ر صورت گرے کہ پیکرِ روز و شب آفرید؛ ۶۹ر باز ایں عالمِ دیرینہ جواں می بائست؛ ۷۰ر لالۂ ایں گلستاں داغِ تمنّائے نداشت؛ ۷۱ر ہنگامہ را کہ بست دریں دیرِ دیر پائے؟ ۷۲ر اے لالہ اے چراغِ کہستان و باغ و راغ؛ ۷۳ر من بندۂ آزادم عشق است امامِ من؛ ۷۴ر کم سخن غنچہ کہ در پردۂ دل رازے داشت؛ ۷۵ر خود را کنم سجودے، دیر و حرم نماندہ

- گلشنِ راز، جدید: شروع میں دو اشعار تھے۔ اُس کے بعد مثنوی تھی۔ 'تمہید'، نو سوالات اور اُن کے جوابات، اور 'خاتمہ' پر مشتمل تھی۔
- بندگی نامہ۔ مثنوی تھی۔ بلا عنوان تمہید کے بعد 'در بیانِ فنونِ لطیفۂ غلاماں' کے تحت

'موسیقی'، 'مصوّری' اور 'مذہبِ غلاماں' تھے۔ اُس کے بعد 'در فنِ تعمیرِ مردانِ آزاد' تھا۔[1]

1

زبورِ عجم کے بارے میں علامہ نے کہا کہ کاش گوئٹے یہ کتاب پڑھتا:

"I wish Goethe had read this book."[2]

میاں بشیر احمد نے کہا کہ افسوس ہے قوم نے آپ کی پوری قدر نہ کی ورنہ بانگ درا یا دوسری کتابیں لاکھوں کی تعداد میں ضرور بک جاتیں! بشیر کا بیان ہے، "دوسرے فقرے کو اُنہوں نے پسند نہ کیا، کہا کہ قوم غریب ہے اور ناقدری کا جواب یہ دیا کہ جب کوئی غریب آدمی شہر سے آکر میری مٹھی چاپی کرتا ہے تو میں سمجھتا ہوں کہ ساری دنیا میری قدر کر رہی ہے۔"[3]

۲۹/جون کو علامہ نے زبورِ عجم کا ایک نسخہ میاں نظام الدین کو پیش کیا۔[4]

2

شاہنامۂ اسلام

ابوالاثر حفیظ جالندھری

جلد اوّل

[اقتباس]

خلافتِ انسانی اور کائنات کے اندیشے

خدا نے حضرتِ آدم کو اِنسانی خلافت دی　　جہاں میں اپنا نائب کر کے بھیجا یہ سعادت دی

یہی مخلوق تھی فردوس سے جس کو نکالا تھا　　اسی نے دانۂ گندم پہ سب کچھ بیچ ڈالا تھا

---

[1] اقبال، زبورِ عجم

[2] انقلاب کے زبورِ عجم نمبر میں مضمون جو غالباً مہر نے لکھا۔

[3] میاں بشیر احمد، 'اقبال کی یاد میں'، ص ۵۴

[4] رفیع الدین ہاشمی، تصانیفِ اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ، ص ۱۴۷

بظاہر اِس تقرر سے نئے فتنوں کے ساماں تھے　زمین و آسماں جنّ و ملائک سخت حیراں تھے
لگے سرگوشیاں کرنے کہ انساں ہے بہت سادہ　اُدھر شیطان کا لشکر شرارت پر ہے آمادہ
یہ بیچارہ دوبارہ دامِ شیطاں میں نہ آ جائے　کہ دانہ کھا چکا ہے پھر کہیں دھوکا نہ کھا جائے

صدائے رُوح الامیں

دلِ مخلوق میں یوں راہ اندیشے نے جب پائی　تسلّی کے لیے فوراً ندا جبریل کی آئی
کہ اے طاعت گزارو ذاتِ باری کے پرستارو　بنامِ حضرتِ حق امن و راحت کے طلبگارو
نگاہِ غور سے دیکھو ذرا آدم کی پیشانی　نظر آتی نہیں کیا ایک خاص الخاص تابانی
یہی جلوہ ہے تخلیقِ جہاں کی علّتِ غائی　اِسی کی روشنی ہے دیدۂ ہستی کی بینائی
یہی جلوہ ہے پہلے جس کو سجدہ کر چکے ہو تم　اِسی جلوے سے دامانِ بصیرت بھر چکے ہو تم
ہوا ابلیس اِسی کے سامنے جھکنے سے انکاری　یہی تھا امتیاز آدم کا جس سے جل گیا ناری
اِسی سے دشمنی رکھنے کی کھائی ہے قسم اُس نے　عبودیّت کی چادر سے نکالا ہے قدم اُس نے
اِسی کی ضد پہ اُس باغی کو ہیں ارمان شاہی کے　گیا ہے لے کے دنیا میں وہ منصوبے تباہی کے
مشیّت ہے کہ اب طاقت کا وہ امتحاں کر لے　مشیّت کے مقابل خبثِ باطن کو عیاں کر لے
یہ ظاہر ہے کہ شیطاں اب بڑی طاقت دکھائے گا　زمانے میں قیامت ڈھائے گا فتنے اُٹھائے گا
یہ سچ ہے مدّتوں اولادِ آدم راہ بھولے گی　وہاں ابلیس کی کھیتی پھلے گی اور پھولے گی
وہ دن بھی آئے گا جب آخری اِک سامنا ہو گا　حق و باطل میں گویا فیصلہ کن معرکہ ہو گا
مشیّت ہے کہ آدم ہی کرے گا اس کو پست آخر　یہی اقبالِ پیشانی اُسے دے گا شکست آخر
یہی وہ نور ہے جس سے زمانہ جگمگائے گا　یہی آدم کا رُتبہ عرشِ اعظم تک اُٹھائے گا
ملے ابلیس سے کتنی ہی قوّت اہلِ ظلمت کو　بجھا سکتا ہے کوئی مشعلِ نورِ ہدایت کو
یہ جلوہ پے بہ پے دنیا کو راہِ حق دکھائے گا　یہی رہبر ہر اِک گمراہ کو منزل پہ لائے گا

مسلسل منتقل ہوتا رہے گا نیک بندوں میں خدا کے مرسلوں، پیغمبروں میں حق پسندوں میں
نشان اسلام کا اللہ نے عالم میں رکھا ہے کہ نُورِ احمدیؐ پیشانیٔ آدم میں رکھا ہے
یہی تابندگی ہے خاکیوں کے ناز کا باعث اِسی کا عکس ہے مٹی میں ہر اعجاز کا باعث
مقدّر ہے اسی کو آخری پیغامِ دیں ہونا مقدّر ہے اسی کو رحمۃ للعٰلمیں ہونا
دو عالم ہو گئے شاداں ندا جبریل کی سن کر زمین و آسماں جنّ و ملائک نے جھکائے سر
ترانے حمدِ باری کے ہوئے جاری زبانوں پر درود و نعت نغمہ بن کے گونجے آسمانوں پر
فرشتے شانِ آدم دیکھنے کو صبر کھو بیٹھے زمیں پر جھک پڑے تارے ہمہ تن چشم ہو بیٹھے

مطبوعہ ۱۹۲۷ء[1]

حفیظ کہتے ہیں کہ علامہ نے شاہنامۂ اسلام لکھنے کی حوصلہ افزائی نہ کی۔ حفیظ کے مطابق، ''ڈاکٹر صاحب [علامہ] نے فرمایا تھا کہ کوئی بھرپور تاریخ اگر شعر میں بیان کی گئی تو وہ ایک ثقیل سی شے بن جائے گی۔ عوام کے کسی کام نہ آئے گی، محض کتب خانہ کی زینت ہو گی۔ لہٰذا انہوں نے تجویز پیش کی تھی کہ میں ایک مسلسل و مربوط تاریخ قلمبند کرنے کے بجائے علامہ شبلی کی طرح چھوٹی چھوٹی اسلامی نظمیں لکھوں ـــ یہ زیادہ مفید کام ہو گا ـــ مگر... جب پہلی جلد چھَپ گئی اور ڈاکٹر صاحب کی نظر سے گزری تو اُنہوں نے پسند فرمائی... میں حج پر جانے لگا اور ڈاکٹر صاحب کے حضور وداعی ملاقات کے لیے پہنچا تو اُنہوں نے آبدیدہ ہو کر فرمایا تھا، 'حفیظ جی! شاہنامہ ساتھ لے جاؤ۔ اگر ہو سکے تو سرکارِ دوعالمؐ کی خدمت میں پیش کرنا۔'''[2]

3

یکم جولائی کو غالباً انجمن حمایت اسلام کی کچھ قراردادیں علامہ نے میاں عبدالعزیز کو روانہ کیں کہ فوراً

[1] حفیظ جالندھری، شاہنامۂ اسلام جلد اول

[2] پروفیسر محمد منور، میزانِ اقبال، ص۱۷۶-۱۷۵

ٹائپ کروادیں۔ ڈاک میں بھیجنی تھیں۔[1]

پنجاب کونسل میں سالِ رواں کی اسٹینڈنگ کمیٹیوں کی معیاد ۳۰ر جون کو پوری ہو چکی تھی۔ یکم جولائی کو ۱۹۲۷-۲۸ء کے لیے اسٹینڈنگ کمیٹیاں بنائی گئیں۔ تعلیم کی اسٹیڈنگ کمیٹی میں دس ارکان تھے۔ وزیر تعلیم شریک رہے۔ نامزد رُکن سر جارج اینڈرسن سی آئی ای رہے۔ منتخب ارکان میں سے سردار نرائن سنگھ، علامہ اقبال اور چودھری چند باقی رہے۔ نئے ارکان سردار ہر بخش سنگھ، مسٹر لابھ سنگھ، پنڈت نانک چند، چودھری یٰسین خان اور خان بہادر چودھری فضل علی تھے۔[2]

۳ر جولائی کو انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کا اجلاس ہوا۔ نائب صدر خان بہادر شیخ انعام علی نے صدارت کی۔ علامہ کو دوبارہ کالج کمیٹی کا رُکن بنایا گیا۔[3]

بلدیہ لاہور میں اکتالیس نشستیں تھیں۔ میاں سر فضل حسین نے ان میں سے اکیس مسلمانوں کو دیں تو ہندوؤں نے بلدیہ سے استعفیٰ دے دیا۔ حکومت نے مسلمانوں کی نشستیں بیس کر دیں اور کہا کہ ہندوؤں کی عدم موجودگی میں وہ اکثریت ہی میں رہیں گے۔ ہندو واپس آئے۔ حکومت نے بلدیہ میں چار نئی نشستوں کا اضافہ کیا۔ دو مسلمانوں اور دو ہندوؤں کو دیں۔ اب کُل پینتالیس نشستیں تھیں۔ اُن میں سے بائیس مسلمانوں اور تیئیس غیر مسلموں کی تھیں۔ علامہ نے پنجاب کونسل کے آیندہ اجلاس میں تحریکیں پیش کرنے کا نوٹس دیا:

- ☆ حکومتِ پنجاب اپنے حالیہ حکم کو واپس لے جس میں اعلان ہے کہ پنجاب میونسپل ایکٹ کی دفعہ ۱۳ بلدیہ لاہور پر عائد نہیں ہوتی۔
- ☆ اصلاحات کے اصول کے پیشِ نظر اور وزارتِ تعلیم کے اِس فیصلے کے پیشِ نظر کہ جس قوم کو بلدیہ میں اکثریتِ نمایندگی کا حق ہو گا اُسے اقلیت میں نہ لایا جائے گا:

---

[1] مکتوب بنام میاں عبد العزیز یکم جولائی ۱۹۲۷ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۷۶

[2] پنجاب گزٹ یکم جولائی ۱۹۲۷ء حصہ پنجم ص ۲۲؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۸۶

[3] انجمن کی قلمی روداد؛ محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶)، اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص ۱۷۹

۱ مسلمانانِ لاہور کو یا تو اکتالیس نشستوں (منتخب شدہ و نامزدہ) میں سے اکیس نشستیں دی جائیں؛

۲ ورنہ کُل پینتالیس نشستوں (منتخب و نامزدہ) میں سے تیئس نشستیں دی جائیں۔

☆ مربعوں کی تقسیم کے بارے میں سوالات کا جواب دیا جائے:

الف- نیلی بار کے اُن آبادکاروں میں جنہیں فوجی خدمات کے معاوضہ میں قطعاتِ زمین عطا کیے گئے، مسلمانوں کے حصے میں کتنے قطعات آئے؟

ب- اُسی جگہ غیر مسلموں کو کس قدر قطعات دیے گئے؟

ج- اُن پنجابی مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کی تعداد علی الترتیب بتائی جائے جنہوں نے دورانِ جنگ میں خدمات کیں۔[1]

4

راجپال کیس میں جسٹس دلیپ سنگھ کے فیصلہ کے بعد ہندوؤں کی طرف سے رسولِ اکرمؐ کی شان میں گستاخی کی مزید مثالیں سامنے آئیں۔ پرتاب لاہور نے قابلِ اعتراض مضمون لکھا۔ دہلی کے ایک آریہ نے "سورہ مثل القرآن" لکھ کر شائع کی۔ علامہ کے نزدیک یہ ظاہر تھا کہ اسلام کے مخالفین اسی قسم کا اور مصالحہ بھی تیار کر رہے ہیں۔ لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے سے شہ ملی ہے۔[2] ایک دوست نے ان سے کہا کہ دو ہندوؤں کو آپس میں بات کرتے سنا۔ کہہ رہے تھے کہ اب ہماری حکمتِ عملی یہ ہونی چاہیے کہ زبان سے قومیت کا دم بھریں۔ ویسے صرف اپنی ملّت کے مفاد پر نظر رکھیں۔[3] علامہ کو ہندوؤں کی زبان سے قومیت کا لفظ عجیب لگتا۔ کہتے تھے کہ ہندوؤں کی پوری تاریخ لفظ "انجذاب" میں مذکور

---

[1] انقلاب ۵؍جولائی ۱۹۲۷؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۸۷-۸۶

[2] محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۴۲-۴۱

[3] پنجاب کونسل میں علامہ کی تقریر ۱۹؍جولائی ۱۹۲۷؛ Sherwani

ہے۔[1]

یونیورسٹیوں نے امتحانی کاپیوں پر فرضی رول نمبر لگانے کا طریقہ رائج کیا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ ممتحن کو اُمیدوار کی ذات یا مذہب کا علم نہ ہو سکے۔ علامہ نے ایل ایل بی کے پرچے جانچتے ہوئے دیکھا کہ کسی نے "۸۶۷" لکھا تھا۔ کسی نے "اوم" لکھا۔ مقصد ممتحن پر اپنا مذہب ظاہر کرنا تھا۔[2]

مجلسِ خلافت پنجاب کے نمایندہ اخبار مسلم آؤٹ لُک نے لکھا کہ کہ مسلمان حکومتی اداروں سے استعفیٰ دے دیں۔ اخبار کے ناشر اور مدیر گرفتار کر لیے گئے۔ مجلس نے احتجاجی جلسے کا اعلان کیا۔ حکومت نے شہر میں دفعہ ۱۴۴ لگائی۔ جلسہ گاہ پر پہرہ بٹھا دیا۔

۴/ جولائی رات ۹ بجے جلسہ گاہ کے قریب مجلس خلافت کے رضاکار جمع ہو گئے۔ خلافتی رہنماؤں نے سول نافرمانی کا اعلان کیا۔ چوہدری افضل حق نے کہا کہ عدالت کے فیصلے نے قانون کو مذہب سے ٹکرایا ہے۔ سیاست اور مذہب کو متصادم کیا ہے۔ مولانا سید عطاءاللہ شاہ بخاری نے کہا:

> آج مولانا حسین احمد مدنی، حضرت حسن [میکش]، مولانا احمد سعید دہلوی اور مفتی کفایت اللہ یہاں تشریف لائے ہوئے ہیں۔ ان کے دروازے پر حضرت خدیجۃ الکبریٰؓ اور حضرت عائشہ صدیقہؓ ڈیپوٹیشن لے کر گئیں اور فرمایا۔ ہم امہات المومنین ہیں۔ تمہاری اور سب مسلمانوں کی مائیں ہیں۔ آج ہمیں بازاروں میں گالیاں دی جاتی ہیں۔ کیا تمہاری غیرت جوش میں نہیں آتی؟ مسلمانو! تمہارے دروازے پر بی بی عائشہؓ دستک دے رہی ہیں۔ اُٹھو گناہ بخشوانے کا وقت آج ہی ہے۔ آج بڑے بڑے بیرسٹر کام نہیں آسکتے۔ آج نامی گرامی لیڈر کام نہیں آسکتے۔ آج یہی ڈاڑھی منڈھے کام آئیں گے جو یہاں بیٹھے ہیں۔ آپ دوستوں کی محبت میں کٹ مرتے ہیں۔ آج سبز گنبد کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ واسلم تڑپ رہے ہیں۔ اُن کی ازواجِ مطرات یعنی ہماری

---

[1] مکتوب بنام محمد علی [جوہرؔ] ۳۱/ اکتوبر ۱۹۲۷ (انگریزی)؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۸۴

[2] پنجاب کونسل میں علامہ کی تقریر ۱۹/ جولائی ۱۹۲۷؛ Sherwani

ماؤں کی بے حرمتی ہو رہی ہے۔ کیا ہمارا ایمان اِس قدر کمزور ہے کہ بازاری عورتوں اور معشوقوں کے لیے تو مر مٹیں مگر عائشہؓ اور خدیجہؓ کی عزت پر حملہ ہو تو ہم یوں خاموش بیٹھے رہیں۔ اگر ہم اُن کی عزت کی حفاظت نہیں کر سکتے تو اس سے بہتر ہے کہ ہم پلیگ، ہیضہ یا کسی وبا کا شکار ہو جائیں۔ [1]

مولانا نے ہدایت دی کہ بیس بیس کی ٹولیوں میں مسلمان جلسہ گاہ میں جائیں۔ سول نافرمانی کی تحریک شروع ہو گئی۔ خواجہ عبدالرحمان غازی اور دیگر رضاکاروں نے گرفتاریاں پیش کیں۔ [2]

۵/ جولائی کے انقلاب میں خبر آئی کہ کونسل کے آیندہ اجلاس میں علامہ اقبال، ڈاکٹر شیخ محمد عالم اور رانا فیروزالدین خاں ایسے قانون کی تجویز پیش کریں گے جس کے تحت بانیانِ مذاہب کی توہین جرم ہو۔ سکھوں کو کرپان رکھنے کی آزادی تھی کہ اُن کے مذہب کا حصہ تھی، اس لیے دوسرے مذاہب کو بھی لائسنس کے بغیر تلوار رکھنے کی اجازت ہونے کی قرارداد پیش کی جائے گی۔ مسلم آوٹ لک کے مدیر و ناشر کی رہائی کی قرارداد بھی پیش کی جائے گی۔

مولانا حسین احمد مہاجر مدنی لاہور میں تھے۔ انقلاب نے دعوت دی۔ ۵/ جولائی کو شام پانچ بجے علمائے کرام تشریف لائے۔ علامہ اقبال اور حسین احمد مدنی کے علاوہ مولانا سید عطأاللہ شاہ بخاری، مفتیٔ اعظم صدر العلمأ مولانا محمد کفایت اللہ، مولانا احمد سعید ناظم جمعیت العلمائے ہند، مولانا عبدالحلیم صدیقی، مولانا ابوالمعارف محمد عرفان، مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی، مولانا احمد علی، مولانا محمد عبد ناظم جمعیۃ دعوت و تبلیغ، ملک لال خان اور بعض دوسرے شامل تھے۔ ''ڈیڑھ دو گھنٹے تک دفتر انقلاب کو ان حضرات کے قدومِ میمنت لزوم سے مفتخر و ممتاز ہونے کا موقع ملا،'' انقلاب نے بعد میں لکھا، ''جس بزرگانہ محبت اور شفقت کا اظہار فرماتے ہوئے ہمارے بزرگ ہم سے رخصت ہوئے وہ

---

[1] ظفر اقبال نگینہ (۱۹۸۸)، غازی علم الدین شہید

[2] ظفر اقبال نگینہ (۱۹۸۸)، غازی علم الدین شہید

ہمارے دلوں پر ہمیشہ نقش رہے گا۔"[1]

آریہ سماجیوں نے کہنا شروع کیا کہ مسلمانوں کی بڑی تعداد ناموسِ رسالت کو اہمیت نہیں دیتی۔ اسی لیے سول نافرمانی کی مخالف ہے۔ پرتاب نے 'ڈاکٹر اقبال کا اعلان' کی سرخی کے ساتھ لکھا کہ ڈاکٹر صاحب کو راجپال کے خلاف احتجاجی مظاہروں سے دلچسپی نہیں ہے۔ علامہ نے اسے "افترا پردازی" قرار دیا۔ اُن کی وضاحت انقلاب میں شائع ہوئی۔[2] اُن کا موقف یہ تھا کہ مسلمانوں کا اصل مطالبہ ناموسِ رسالت کا تحفظ ہے تو دفعہ ۱۴۴ کے خلاف تحریک چلانا اصل مطالبے کو بھول جانا ہے۔[3]

۶ / جولائی کو شام چار بجے کے قریب ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ پولیس نور حسین شاہ ایک اور افسر کے ساتھ مجلسِ خلافت پنجاب کے دفتر آئے۔ مولانا عطأاللہ شاہ بخاری اور خواجہ غازی عبدالرحمٰن سے کہا کہ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے بلایا ہے۔ وہ دونوں مجلس خلافت کے ارکان کے ساتھ کوتوالی پہنچے۔ دونوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ باقی لوگوں سے واپس جانے کے لیے کہا گیا۔ ۸ / جولائی کے انقلاب میں اس خبر کی سرخی تھی، 'مجاہدینِ ملّت گرفتار کر لئے گئے... مسلمانانِ پنجاب پر استبدادی قوتوں کا ہجوم'۔[4] عبداللہ چغتائی کی روایت درست نہیں ہو سکتی کہ عطااللہ شاہ بخاری، علامہ کی کوٹھی پر بیٹھے تھے۔ نور حسین نے آ کر علامہ کے کان میں کہا کہ بخاری کو گرفتار کرنا ہے۔ علامہ نے درخواست کی کہ اُن کی کوٹھی سے باہر گرفتار کیا جائے۔ بخاری نے سڑک پر نکل کر گرفتاری پیش کی۔[5]

مجلسِ خلافت نے اعلان کیا کہ ۹ / جولائی کو بادشاہی مسجد میں جلسہ ہو گا۔ خطرہ پیدا ہوا کہ کہیں خدا کے گھر میں مسلمان آپس میں دست و گریبان نہ ہو جائیں۔ بڑی تعداد سول نافرمانی کے خلاف تھی۔ برکت علی اسلامیہ ہال میں تین انجمنوں کا مشترکہ اجلاس ہوا۔ شیخ عبدالقادر صدارت کر رہے

[1] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸)، حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۲۵۲، ۲۶۲ بحوالہ انقلاب ۷ / جولائی ۱۹۲۷ء

[2] انقلاب ۷ / جولائی ۱۹۲۷ء؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۳۸

[3] یہ نکتہ علامہ کی ۱۰ / جولائی ۱۹۲۷ء کی تقریر سے اخذ کیا ہے؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۴۴

[4] انقلاب ۸ / جولائی ۱۹۲۷ء؛ بشکریہ امجد سلیم علوی

[5] عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۱۷۶-۱۷۵

تھے۔ علامہ نے اس تجویز کی حمایت کی کہ سول نافرمانی ملتوی کر دی جائے۔ ناموسِ رسالت کے مسئلے پر بکھرے ہوئے مسلمان متفق ہو گئے ہیں۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ایسی راہ اختیار کرنی چاہیے "جس پر سب متفق ہو کر عمل کر سکیں۔" بخاری وغیرہ سے اختلافِ رائے کا ذکر کر کے کہا، "عقل اور انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ان کی خوبیوں کا بھی اعتراف کیا جائے۔ وہ قومی کاموں میں بہت حصہ لیتے ہیں اور ضرورت کے وقت بڑا ایثار دکھاتے ہیں۔"[1] اتفاقِ رائے کے ساتھ سول نافرمانی کی تحریک ملتوی ہوئی۔ بادشاہی مسجد کا ۹ر جولائی والا جلسہ منسوخ ہوا۔

۱۰ر جولائی کو مجلسِ خلافت لاہور کا جلسہ بادشاہی مسجد میں ہوا۔ شیخ حسام الدین نے تحریک پیش کی کہ مولانا عبداللہ قصوری ناظم جمعیۃ دعوت تبلیغ اسلام جلسے کی صدارت کریں۔ علامہ حسین میر نے تائید کی۔ علامہ اقبال نے کہا کہ ملک میں واقعات حیرت انگیز رفتار کے ساتھ حرکت کر رہے ہیں۔ حدیث میں ہے، 'الزموا مساجدکم'۔ دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ اس ارشاد کی تعمیل کے لیے بہانہ بن گیا۔ آج خانۂ خدا میں اکٹھے ہوئے ہیں۔ موجودہ حالات کے بارے میں خیالات ظاہر کیے۔ اس کے علاوہ کہا:

> دنیا کی تاریخ گواہ ہے کہ کوئی قوم، قوم نہیں بن سکتی جب تک کہ وہ ابتلاؤں میں گرفتار نہ ہو۔ ہمیں خوش ہونا چاہیے کہ ہمارے امتحان کا موقع پیدا ہو گیا۔ اس پر کوئی ہمیں کچھ ہی کیوں نہ کہے ہمیں بہر صورت خوش ہونا چاہیے ع
>
> وہ کہہ رہے ہیں عشق میں میں خاک ہو گیا
> میں شاد ہوں کہ ہوں تو کسی کی نگاہ میں
>
> بہت ممکن ہے کہ جو فتنہ اس وقت درپیش ہے یہ اس کی آخری منزل ہو۔ ایک مسلمان کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی ابتلا نہیں ہو سکتی جو اس وقت درپیش ہے... [لیکن] اس ابتلا کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ وہ یہ کہ مسلمانوں کے وہ فرقے جو آپس میں ایک

---

[1] انقلاب ۱۰ر جولائی ۱۹۲۷ء؛ افضل (۱۹۸۶)، ص ۴۱-۳۹۔ افضل نے مجوزہ جلسے کی تاریخ ۸ر جولائی لکھی ہے۔ علامہ کی ۱۰ر جولائی کی تقریر سے لگتا ہے کہ ۹ر جولائی کو ہونا تھا۔ اس کے التوا کے اگلے روز برکت علی ہال میں اجلاس ہوا۔

دوسرے کے ساتھ دست و گریباں رہا کرتے تھے اس ابتلا کے دوران ایک ہو گئے۔ یہ وہ مبارک نتیجہ ہے جو ہمیں صرف اس فتنے کی بدولت ملا ہے... اصل مقصد توہین رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا علاج ہے۔ امید ہے کہ آپ... سب سے پہلے صرف اسی کے لیے جدوجہد کریں گے... ڈپٹی کمشنر کا حکم اور دفعہ ۱۴۴ کا نفاذ بے شک ناجائز ہے لیکن ایک بڑے حق کو حاصل کرتے وقت ضرورت آپڑی ہے کہ ہم اس چھوٹے حق کو چھوڑ دیں۔ اس وقت سب سے بڑا سوال اسلام کی عزت کا تحفظ اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے ناموس کا تحفظ ہے۔ اسے حل کرتے ہوئے اگر کوئی چھوٹا سا سوال پیدا بھی ہو جائے تو بہتر ہے کہ اسے نظر انداز کر دیا جائے۔

... مقدمہ 'ورتمان' کو ہائی کورٹ میں منتقل کرنے میں جو کارروائی کی گئی ہے شاید وہ تاریخ میں پہلی مثال ہے۔ غالباً دو اڑھائی ماہ تک اس کا فیصلہ ہو جائے گا۔ اگر یہ فیصلہ ہمارے حق میں ہو گیا تو کسی مزید فیصلے کی ضرورت نہیں۔ اس لیے میری استدعا ہے کہ جب تک یہ فیصلہ صادر نہ ہو جائے کوئی دوسرا طریق کار اختیار نہ کیا جائے۔

ایک طرف سے شور بلند ہوا، "جو کرا رہی ہے گورنمنٹ کرا رہی ہے۔ جو کچھ ہو رہا ہے گورنمنٹ کے ایما پر ہو رہا ہے۔" علامہ نے کہا، "میرا مقصد یہ نہیں کہ آپ خاموش ہو بیٹھیں بلکہ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس قسم کا کوئی طریق کار اختیار نہ کیا جائے جس سے ہمارے اصل مقصد کو نقصان پہنچے۔ میں آپ کو مشورہ دے رہا ہوں جو میرے خیال میں درست ہے۔ اگر آپ اسے پسند نہیں کرتے تو اس پر عمل نہ کریں۔" شور پھر بلند ہوا، "ہرگز نہیں! ہرگز نہیں! پہلے رہنماؤں کو چھڑاؤ، پہلے رضاکاروں کو چھڑاؤ۔" علامہ نے کہا، "میں اس سچے جوش کی قدر کرتا ہوں"۔ تقریر ختم کر دی۔[1]

مجلس خلافت کے چودھری افضل حق نے کہا، "میں یہ کہوں کہ سر محمد اقبال مجھ سے کم مسلمان ہیں... تو اس کے معنی یہ ہوں گے ہمارا مطالبہ مذہبی اور اسلامی نہیں بلکہ کوئی اور ہے... اگر کوئی سیاسی

[1] انقلاب ۱۳/ جولائی ۱۹۲۷ء؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۴۶-۴۱

معاملہ ہوتا تو ہم ان سے کوئی مشورہ ہر گز نہ لیتے۔ ۱۹۲۱ء کی سول نافرمانی کے دوران ہم کبھی ان کے مکان پر نہیں گئے۔ سر اقبال کی شخصیت نہ صرف ہندوستان میں مسلمہ ہے بلکہ کرہ ارض کے تمام حصے ان کی اصابتِ رائے کا اعتراف کرتے ہیں۔ اس لیے اگر ہم سر اقبال کا مشورہ قبول نہ کرتے تو اس کا مطلب خلافت کمیٹی کی عزت کو نہ صرف ہندوستان میں نقصان پہنچنے کا خطرہ ہے بلکہ ہندوستان سے باہر بھی!"

ظفر علی خاں نے کہا، "کیا میں آپ سے یہ عرض نہ کروں کہ آپ نے ڈاکٹر اقبال کے حضور میں گستاخی کی ہے۔ یعنی ان کی تقریر کے دوران اعتراض کیا۔ اقبال پکا مسلمان اور سچا عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ وہ روتا ہے رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے عشق میں، وہ روتا ہے اسلام کی محبت میں..."

مجمع سے آوازیں بلند ہوئیں، "ہم ڈاکٹر صاحب سے معذرت چاہتے ہیں۔ یہ گستاخی سی آئی ڈی نے کی تھی۔ کسی مسلمان نے نہیں کی۔"[1]

5

رسالہ زبان منگرول سے نکلتا تھا۔ جولائی-اگست کے شمارے میں محی الدین قادری زورؔ کا مضمون 'اُردو کے پیغام گو شاعر' شائع ہوا۔ زورؔ نے لکھا تھا کہ مولانا حالی نے مسلمانوں کو اُن کی زبوں حالی کا احساس دلایا۔ اکبر نے مغربی تہذیب کی مخالفت کی:

> اقبال نے ایک بات حالی سے لی اور ایک اکبر سے۔ وہ بھی تہذیبِ نو کے مخالف ہیں۔ وہ دنیا کو یہ پیغام دیتے ہیں کہ وطنیت کا خیال جو یورپ میں جڑ پکڑ گیا ہے کائنات کے لیے سخت مضر ہے۔ اس کے بر خلاف حبِ انسان دراصل اعلیٰ معراجِ ترقی ہے۔ اگرچہ یورپ والوں نے بھی اس کو اپنا معیارِ ترقی اور اصولِ زندگی قرار دیا ہے لیکن وہ اس پر صحیح طور پر عمل پیرا نہیں ہیں اور نہ بحالتِ موجودہ ہو سکتے ہیں۔ اس کے بر خلاف اسلام میں حبِ انسانی کا جو تخیل پیش کیا گیا ہے وہ بہت زیادہ مکمل اور پختہ ہونے کے علاوہ اس قابل ہے کہ اُس پر آسانی سے عمل کیا جا سکے۔

---

[1] محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۴۷-۴۶

> اقبال نے یہ خیال کس لیے قائم کیا اور اِس قسم کا پیغام کیوں پہنچایا، اس پر ایک نظر ڈالنا اُردو کے پیغام گو شاعروں کے پیغاموں کے متقابل مطالعہ کا ایک لازمی عنصر ہے۔[1]

۱۷ر جولائی کا انقلاب 'زبورِ عجم نمبر' تھا۔ کتاب سے اقتباسات پیش کیے گئے۔ تہذیبِ نسواں کے سالگرہ نمبر میں ز۔خ۔ش صاحبہ نے 'نالۂ شوریدہ' کے عنوان سے علامہ کے اشعار پر تضمین کی تھی۔ فوت ہو چکی تھیں۔ اُن کے اشعار بھی انقلاب نے دوبارہ چھاپے۔ اداریے سمیت تین مضامین شائع کیے گئے: 'زبورِ عجم۔ ایک مذہب۔ ایک فلسفہ اور تنقید فنونِ لطیفہ کا ایک بہترین اصول'؛ 'زبورِ عجم۔ پیامِ اقبال کے بعض تمہیدی خصائص۔ اقبال اور اُس کے ''خلیل'' و ''کلیم''''؛ اور 'زبورِ عجم۔ کتاب کے مباحث کا مرقع۔ خدا و انسان یا عشق و دعوت۔' لکھنے والے کا نام درج نہ تھا۔ اس سے ظاہر تھا کہ غلام رسول مہرؔ نے لکھے:[2]

> اقبال اور اقبال کی تصانیف کے متعلق دو متضاد رائیں ابھی تک درست ہیں اور شاید ایک طویل زمانہ تک درست رہیں یعنی یہ کہ وہ کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ اور یہ کہ وہ تعارف کی بیحد محتاج ہیں۔ سکولوں کے بچے اقبال کو جانتے ہیں۔ اس کی نظمیں گاتے ہیں۔ کالجوں کے نصابوں میں اقبال داخل ہے۔ کالجوں کے طلبا کو امتحانوں میں اقبال اور اُس کے کلام کے متعلق سوال پوچھے جاتے ہیں۔ وہ ''شکوہ'' جس سے علما چیں بجبیں تھے اور فتویٰ تکفیر صادر کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ اب ادب شناس تعلیم یافتہ واعظوں کو زبانی یاد ہے... لاہور کی بعض طوائف بھی اعلیٰ طبقہ کی مجلسوں میں اب شکوہ ہی سناتی ہیں۔ گویا کوشش ہو رہی ہے کہ ''حقیقتِ منتظر'' ''لباسِ مجاز'' میں نظر آنے لگ جائے۔ تعلیم یافتہ طبقوں کے لوگ اقبال کو کس قدر و عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

---

[1] ڈاکٹر تحسین فراقی (۱۹۹۲)، نقدِ اقبال حیاتِ اقبال میں، ص۱۱۶-۱۱۶

[2] محمد حنیف شاہد، اقبال چودھری محمد حسین کی نظر میں، ص۱۲۰-۱۴۵ پر مضمون محمد حسین سے منسوب کیا گیا ہے۔

ہندوستان، ایشیا اور تمام اسلامی دنیا میں اقبال کے نام کا کیسا چرچا ہے۔ مغرب والوں کی آنکھ اب اس پر کس طرح اُٹھ رہی ہے... یہ تو پہلی رائے کی تھوڑی سی تشریح ہے، اب تصویر کا دوسرا رخ لیجیے یعنی... افسوسناک امر یہ ہے کہ اس ضمن میں جو جماعت اقبال شناسی سے محروم ہے وہی اقبال کو جاننے کی مدعی ہے۔

"'زبور' حضرت داؤد کا آسمانی صحیفہ تھا،" مصنف نے لکھا، "'زبور' کے لغوی معنی 'ٹکڑوں' کے ہیں۔ قرآن حکیم میں 'زبر الاولین' کا ذکر ہے۔ اقبال کے نغمے، غزل کے 'ٹکڑوں' کی صورت میں حروف و الفاظ کی قید میں آئے۔" مقصد "بندے اور خدا کے غیر مرئی تعلقات کے اظہار" کے علاوہ مشرق کے بندوں کی اصلاح بھی تھا۔ اس لیے "زبور" کے ساتھ "عجم" کا لفظ "خودبخود" دل پر نازل ہو گیا۔ زبورِ عجم کے پہلے حصے کا موضوع بتایا گیا، "صحیح انسانی تخیل 'خدا' کو کس شان میں دیکھنے کا متمنی ہے"۔ دوسرے کا موضوع "صحیح انسانی تخیل میں 'انسان' کیا ہستی ہے۔"[1]

6

پنجاب کی قانون ساز کونسل کا موسمِ گرما کا اجلاس مون سون اجلاس (monsoon session) بھی کہلاتا تھا۔ ۱۸، ۱۹، ۲۱ اور ۲۲ جولائی کو شملہ میں بارنس کورٹ (Barnes Court) میں ہوا۔[2] گرمیوں میں حکومتِ ہند دہلی سے شملہ منتقل ہو جاتی تھی۔

۱۸ جولائی کو حکومت کی طرف سے اضافی امداد کے مطالبے پر بحث ہو رہی تھی۔ علامہ نے کہا کہ زیرِ بحث مسئلے پر تو کچھ نہیں کہنا سوائے اِس کے کہ وہ حکومت کے مطالبے کی تائید کرتے ہیں۔ البتہ لاٹھی چارج والے واقعے میں ڈپٹی کمشنر سے جو غلط بیانی سرزد ہوئی تھی اُسے بیان کر دیا۔ کونسل کے اجلاس کی تقاریر میں اِس بات کا ریکارڈ پر آنا ڈپٹی کمشنر کے لیے شرمندگی ہی نہیں بلکہ خاصی پریشانی کا سبب بن سکتا تھا۔ شاید علامہ کا مقصد یہی رہا ہو۔

---

[1] مضمون میں غلطی سے دونوں حصوں کی ترتیب اُلٹ گئی ہے؛ انقلاب ۱۷ جولائی ۱۹۲۷ء؛ بشکریہ امجد سلیم علوی

[2] Mitra *The Indian Quarterly Register July-Dec.1927,* pp.293-294

لاہور کے فسادات پر تحریکِ التوا پیش ہوئی۔ چودھری ظفراللہ خاں نے تجویز پیش کی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی گول میز کانفرنس بلائی جائے۔ وہ فرقہ وارانہ مسئلے کو حل کرے۔ پنڈت نانک چند نے انسان دوستی کے حوالے دیے۔ علامہ نے کہا کہ پنڈت اپنی نیت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ رائے بہادر موتی ساگر والی جوائنٹ کمیٹی کی ناکامی کا حوالہ دے کر کہا:

> I wonder if the members have realised the fact that we are actually living in a state of civil war. If stringent measures are not taken to put this down, the atmosphere of the whole province will be poisoned … If this communal hatred permeates the rest of the country and the people living in villages also come to loggerheads, God alone knows where eventually it will land us.

شملہ کی نمایندگی کرنے والے رُکن لالہ موہن لال نے کچھ عرصہ پہلے ایک قریبی رشتہ دار کو برادری سے خارج کیا تھا۔ اُس نے اپنی بیٹی کی شادی کمتر ذات کے برہمن سے کی تھی۔[1] آج کونسل میں اچھوتوں کے حق میں پرجوش تقریر کر رہے تھے۔

سکھ رُکن اُجل سنگھ نے قرارداد پیش کی کہ آیندہ تمام محکموں میں سرکاری ملازمتیں مقابلے کے امتحان سے پُر کی جائیں۔ جہاں یہ نہ ہو سکے وہاں صرف اہلیت کی بنیاد پر فیصلہ ہو۔ انگریز وزیرِ مالیات سر جیوفرے نے مخالفت کی۔ مقابلے اور اہلیت کی بنیاد پر ملازمتوں کے ساتھ ساتھ نامزدگی کو بھی برقرار رکھنے پر زور دیا۔

۱۹/ جولائی کو علامہ نے تقریر کی۔ سر جیوفرے کی تجویز سے متفق تھے۔ اُن کے نزدیک موہن لال، اجل سنگھ اور نانک چند جیسے رکن قومیت کی ایک خیالی تصویر پیش کر رہے تھے۔ اُسے حقیقت سے واسطہ نہ تھا۔ حقیقت میں یورپین افسروں کی تعداد بڑھانے کی ضرورت ہے۔ مقابلے کے امتحان اور اہلیت کے علاوہ یہ دیکھنے کی ضرورت بھی ہے کہ مسلمانوں کی بھی مناسب نمایندگی ہو۔ حاضرین نے ”نو، نو“ کی آوازیں بلند کیں۔ علامہ نے کہا کہ صرف جھوٹی اور کھوکھلی قوم پرستی ایسی آوازیں نکالتی ہے۔ جنوبی ہند میں برہمن شُودر سے گفتگو کرتے ہوئے کسی دیوار یا درخت کو مخاطب کرتا ہے۔

---

[1] پنجاب کونسل میں علامہ کی تقریر ۱۹/ جولائی ۱۹۲۷؛ Sherwani

شُودر بھی اُسی دیوار یا درخت کو جواب دیتا ہے۔ دونوں براہِ راست گفتگو کریں تو برہمن کا اِیمان ہوتا ہے۔ لاہور کے حالیہ فسادات میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے وفود نے انگریز افسران کے سامنے ایک دوسرے کی شکایات پیش کیں۔ ہندوستانی قومیت وجود نہیں رکھتی اور یہ بھی قابلِ بحث ہے کہ اسے وجود میں آنا چاہیے یا نہیں۔ مذہبی قومیتیں (communities) وجود رکھتی ہیں۔ فی الحال ایک دوسرے پر بھروسہ کرنے کو تیار نہیں ہیں:

> I cannot but admire the innocent idealism of Sardar Ujjal Singh, which idealism, like all idealisms, sees everything except realities … [The] talk of a united nationalism is futile and will perhaps remain so for a long time to come. The word has existed on the lips of the people of this country for the last fifty years and like a hen it has cackled a great deal without laying a single egg … In this country one community is always aiming at the destruction of the other community. Therefore the power in whose hands lies the destiny of this country must adopt a line of action which is calculated equally to elevate all communities that form the population of this country. It has been argued that the present system tends to retard the progress of what my friend called nationality. Well, I do not know whether it is desirable to become a nation. It is a proposition which can be controverted but, assuming that it is so, I would suggest that it is first desirable to develop mutual trust in the communities of this country.[1]

اسمبلی کی روداد کے بارے میں طویل رپورٹ لندن کے اخبار ٹائمز کے نامہ نگار نے تار کے ذریعے شملہ سے بھیجی۔ اُس کی رائے میں ہندوستان جمہوریت کے قابل نہ تھا۔[2]

اجلاس میں علامہ کی یہ قرارداد بھی پیش ہوئی کہ بلدیہ لاہور میں مسلمانوں کی اکثریت بحال کی جائے۔ تمام مسلمان اراکین نے تائید کی۔ سرکاری اراکین نے ساتھ دیا۔[3]

---

[1] Latif Ahmad Sherwani (1944/1977), *Speeches, Writings and Statements of Iqbal*

[2] 'میرا استاد اقبال' ہمدرد ۱۴/ اگست اور 'طبیب حاذق سر محمد اقبال کا نیا نسخہ' ۱۶/ اگست ۱۹۲۷ء؛ شاہجہانپوری (۱۹۹۳)، ص ۹۷-۸۳

[3] محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۹۶

7

روایت ہے کہ ایک دفعہ علامہ نے شملہ سے واپس آتے ہوئے امرتسر کے اسٹیشن کے پلیٹ فارم پر کچھ ترکوں کو دیکھا۔ ریل سے اتر کر گفتگو کی۔ حج پر نکلے تھے۔ ایران، افغانستان اور ہندوستان کی سیر بھی کرنا چاہتے تھے۔ تھرڈ کلاس میں سفر کر رہے تھے۔ علامہ کو یہ بات اچھی لگی کہ کسی سے مدد کی درخواست کرنے کی بجائے تجارت سے سفر کا خرچ نکال رہے تھے۔ جہاں جاتے وہاں کی کوئی چیز خرید کر دوسری جگہ بیچ دیتے۔[1]

8

مصوّر عبدالرحمٰن چغتائی نے ارادہ کیا کہ زبورِ عجم کا مصوّر ایڈیشن شائع کریں۔ چند تصاویر بنائیں۔ منصوبہ مکمل نہ ہو سکا۔[2]

علامہ اقبال اور بیرونی ممالک کے اربابِ علم

کلامِ اقبال کے تراجم اور اُس پر تنقید و تبصرہ از پروفیسر محمد عبداللہ چغتائی

بیرونی ممالک کے اربابِ علم نے علامہ اقبال کے کلام سے جس جس صورت میں اعتنا کیا ہے اُس کا ایک مکمل خاکہ مرتب کرنا نہایت ضروری ہے۔ بلکہ ان تمام تنقیدوں اور تبصروں کو مکمل طور پر اُردو زبان میں منتقل کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جو علامہ موصوف کی شخصیت و شاعری یا تعلیمات اور فلسفے کے متعلق مختلف زبانوں میں لکھے گئے ہیں اور جن میں سے اکثر کی نسبت خبر دارانِ ہند کو علم بھی نہیں۔ ہمارے عزیز دوست پروفیسر محمد عبداللہ چغتائی نے غیر ملکی تنقید و تبصرہ کے متعلق مختصر سی معلومات ذیل میں ترتیب کے ساتھ جمع کر دی ہیں۔ ہماری رائے میں علامہ اقبال کے کلام کے سلسلے میں اپنی نوعیت کی یہ پہلی خدمت ہے۔ اِس سے پیشتر یہ معلومات یکجا نہیں ہوئی تھیں۔ اُمید واثق ہے کہ شائقینِ کلامِ اقبال اس کے مطالعے سے محظوظ ہوں گے۔ (ادارہ انقلاب)

---

[1] سعادت علی خاں، 'بزمِ اقبال'، ص۲۳۸

[2] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸) حیات اقبال کے چند مخفی گوشے ص۳۰۴ بحوالہ انقلاب ۲۴/ جولائی ۱۹۲۷ء

۱ حسین دانش ترکی فاضل نے ترکی زبان میں علامہ اقبال کی بہت سی نظموں کا ترجمہ کیا ہے اور ''پیامِ مشرق'' پر تبصرہ بھی لکھا ہے۔ ہمیں یہ معلومات ڈاکٹر توفیق بے رکن وفد ہلالِ احمر سے ملیں۔ ڈاکٹر توفیق بے نے یہ بھی فرمایا کہ اقبال کے نظریات کو شاید ہی کسی نے اس وضاحت کے ساتھ لکھا ہو جس وضاحت سے حسین دانش نے لکھا۔ ایک روز ڈاکٹر توفیق بے نے دورانِ گفتگو فرمایا کہ اقبال کبھی قسطنطنیہ تشریف لائیں تو اُن کا شاہانہ استقبال کیا جائے۔

۲ ''امان افغان'' کابل میں جناب آغا ہادی حسن صاحب وزیرِ تجارت نے جو پہلے انگلستان میں افغانستان کی طرف سے سفیر تھا، ایک سلسلۂ مضامین پیامِ مشرق پر بطور تبصرہ لکھا تھا جو کئی نمبروں میں شائع ہوا۔

۳ مصر کے مشہور و معروف سیاح جناب احمد رفعت جنہوں نے پچھلے دنوں میں ممالکِ اسلام کی سیاحت ختم کی اپنی سیاحت کے دوران شملہ اور لاہور میں بھی رونق افروز ہوئے۔ جناب احمد رفعت نے علامہ کی بہت سی نظموں کا عربی زبان میں ترجمہ کیا اور یہ تمام تراجم مصر کے مشہور جریدے ''الاحرام'' میں شائع ہوئے۔

۴ مولوی عبدالحق صاحب حقی بغدادی مرحوم سابق پروفیسر علیگڑھ مسلم یونیورسٹی نے علامہ کی مشہور نظم ''ترانہ'' کا ترجمہ عربی زبان میں کیا تھا۔ یہ ترجمہ بھی مصر وغیرہ کے عربی اخبارات میں چھپ چکا ہے۔

۵ ڈاکٹر نکلسن پروفیسر کیمبرج یونیورسٹی نے 'اسرارِ خودی' کو انگریزی لباس پہنایا۔ پھر پیامِ مشرق پر رسالہ اسلامیکا (جرمنی) میں تبصرہ لکھا۔ اس تبصرے کا اُردو ترجمہ نیرنگِ خیال کے عید نمبر میں ۱۹۲۵ء میں شائع ہو چکا ہے۔ سنا جاتا ہے کہ آج کل ڈاکٹر موصوف پیامِ مشرق کے انگریزی ترجمے میں مصروف ہیں۔

۶ ڈاکٹر براؤن آنجہانی نے 'اسرارِ خودی' کے انگریزی ترجمے پر رائل ایشیاٹک سوسائٹی کے مجلہ ۱۹۲۱ء میں تبصرہ لکھا۔ نیز اپنی تازہ ترین تصنیف تاریخ ادبیاتِ فارسی کی آخری جلد یعنی جلد چہارم میں بھی شہاب الدین سہروردی کے سلسلے میں ذکر کیا ہے۔

۷ ڈاکٹر شوروسو نے پیامِ مشرق کے مقدمے کو جرمن زبان کا لباس پہنا کر پیامِ مشرق کی غرض و غایت کو واضح کر دیا۔

۸ ڈاکٹر فشر پروفیسر لبزگ یونیورسٹی ایڈیٹر اسلامیکا نے جرمن زبان میں پیامِ مشرق پر تبصرہ لکھا اور ڈاکٹر نکلسن سے بھی زیادہ بہتر طریق پر علامہ اقبال کا گوئٹے سے مقابلہ کیا۔

۹ جرمنی کے مستشرق ڈاکٹر ہانسی ملنکے نے جو وہاں کا ایک مشہور فلسفی شاعر ہے، نہایت حسنِ عقیدت اور فرطِ محبت سے پیامِ مشرق کا استقبال کیا۔ یعنی اس کے ایک خاص حصے کا ترجمہ جرمن زبان میں کیا۔ پھر اُسے چمڑے کے کاغذ پر جس پر عموماً انجیل وغیرہ مقدس کتابیں لکھی جاتی ہیں اپنے ہاتھ سے خوشخط لکھا اور مشرقی انداز میں نقش و نگار بنا کر علامہ اقبال کی خدمت میں بطور تہدیہ ارسال کیا۔ احقر کو بھی اس ہدیۂ نادرہ کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ واقعی ایسی نایاب چیز کبھی قدیم زمانے میں تیار کی جاتی تھی۔

۱۰ خان بہادر عبدالعزیز ڈپٹی کمشنر بندوبست جب انگلستان تشریف لے گئے تو وہاں آپ نے لندن یونیورسٹی اور کیمبرج یونیورسٹی میں اقبال کی شاعری کے نصب العین پر لیکچر دیئے جو بعض یورپی رسائل میں بھی شائع ہوئے۔

۱۱ جرمنی میں ڈاکٹر اقبال کے نام پر ایک سوسائٹی قائم ہوئی ہے جس کا مقصد یہ ہے کہ علامہ موصوف کی تعلیمات اور آپ کے کلام کی اشاعت کرے۔

۱۲ ڈاکٹر اسکارپا اٹلی کے مشہور فاضل ہیں جو پچھلے دنوں افغانستان میں بھی تشریف لے گئے تھے۔ آپ نے اٹلی کے ایک ادبی مجلہ میں اقبال کے متعلق ایک نہایت محققانہ مضمون لکھا ہے۔

۱۳ حال ہی میں جرمنی میں ایک بیاض ہندوستانی علم و ادب سے متعلق شائع ہوئی ہے جس میں مختلف شعرائے کرام کے کلام کا انتخاب بصورتِ تراجم جمع ہے۔ اس مجموعے میں علامہ اقبال کی پانچ نظمیں ہیں اور ٹیگور کی محض ایک نظم ہے۔

۱۴ ایک روسی نے جو ہندوستان کا سفر کر چکا ہے اور لاہور محض علامہ سے ملنے کی غرض سے آیا تھا 'اسرارِ خودی' کے نظریات کو روسی زبان میں قلمبند کیا ہے۔

۱۵ ڈاکٹر کزن نے جو مدراس کی تھیوسوفیکل سوسائٹی کے روح رواں ہیں اپنی تازہ کتاب سامادراسن میں تبصرہ لکھا ہے اور ٹیگور اور اقبال کا موازنہ کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اقبال اُس کا برادرِ کلاں ہے۔

۱۶ آنجہانی ڈاکٹر سپونر نے نظم 'شکوہ' کا ترجمہ انگریزی زبان میں کیا ہے جو انڈین ریویو میں شائع ہو چکا ہے۔ آپ پیامِ مشرق کا ترجمہ بھی انگریزی میں کرنا چاہتے تھے۔

۱۷ رسالہ اینتم ۱۹۲۱ء میں مسٹر فارسٹر نے 'اسرارِ خودی' کے انگریزی ترجمے پر تبصرہ لکھا ہے اور علامہ اقبال کے کلام پر ایک مصلحِ قوم کی تعلیمات کی حیثیت سے نظر ڈالی ہے۔ اس تبصرے کلا ترجمہ بھی غالباً معارف میں شائع ہو چکا ہے۔

۱۸ مسٹر اپسن سابق مدیر مسلم آؤٹ لُک نے بارہا ٹیگور اور اقبال کا موازنہ کیا ہے اور اقبال کو ٹیگور سے بہمہ وجوہ بہتر ثابت کیا ہے۔

۱۹ کتاب ہندوستان کی بیداری مصنفہ مکنزی میں ایک باب 'جدید علم و ادب کا طلوع' کے نام سے بھی ہے جس پر سردار جوگندر سنگھ کی تحریر کی رُو سے اقبال کا ذکر بھی نہایت وضاحت سے کیا گیا ہے (ص ۱۵۹)۔ یہ کتاب امریکہ میں ۱۹۱۷ء میں چھپی تھی۔ اس کا مصنف تمام امریکہ کا نمایندہ بن کر ہندوستان آیا تھا۔

۲۰ ۱۹۲۵ء کے انڈین ریویو میں ایک مضمون 'پیامِ مشرق' کے عنوان سے مسٹر مینن کے قلم سے شائع ہوا۔ مصنف نے اس میں اسرارِ خودی کو اخوتِ اسلامی کے موضوع پر ایک الہامی کتاب قرار دیا ہے۔

۲۱ علامہ اقبال جب کونسل کے انتخابات میں مصروف تھے تو ایک جلسے میں ایک مقرر نے علامہ اقبال ممدوح کی تعریف کرتے ہوئے مارننگ پوسٹ کی ایک تحریر کا بھی حوالہ دیا تھا جس میں لکھا تھا کہ اقبال ایک بہت بڑی طاقت ہے۔

انقلاب، ۲۴/جولائی ۱۹۲۷ء[1]

9

اتوار ۲۴/جولائی کی صبح رئیسِ اعظم لاہور میاں نظام الدین کے آموں کے باغ میں کچھ دوستوں کی آم خوری کی دعوت تھی۔ اُن کے رشتہ داروں میں سے خاں صاحب میاں امیر الدین، میاں محمد اسلم، پروفیسر تاثیر اور میاں امین الدین میزبان تھے۔ مہمانوں میں علامہ اقبال، چودھری محمد حسین، خان بہادر سردار حبیب اللہ خاں، چودھری عبدالکریم اور عبدالمجید سالک شامل تھے۔ سالک کا کہنا تھا کہ علامہ "زمانۂ حاضر میں انبہ پسندی کے امام تسلیم کیے گئے ہیں۔" عبداللہ چغتائی بھی آم کھانے میں مشہور تھے مگر نہ آسکے۔ سالک نے ۲۸/جولائی کے انقلاب میں 'افکار و حوادث' کے کالم میں لکھا:

> ہمارا خیال ہے کہ جس طرح قربانی کے گوشت اور خون اللہ تعالیٰ نہیں پہنچتے بلکہ تقویٰ پہنچتا ہے اُسی طرح اس صحبت میں ہم لوگوں کی انبہ خوری سے اگرچہ آم کا رس تو پرفیسر عبداللہ صاحب کے کام و دہن تک نہ پہنچا ہو مگر اُن ہزارہا آموں کا تقویٰ ضرور اُن کے معدہ معلیٰ تک پہنچ گیا ہو گا۔ کیونکہ یہ فقرہ بار بار حاضرین کی زبان پر آجاتا تھا کہ الٰہی ان آموں کا ثواب مولوی عبداللہ صاحب کی روح کو پہنچائیو۔ یہاں تک علامہ اقبال کا تخیلِ عالی بھی اس فضا سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور آپ نے ارتجالاً ارشاد فرمایا:
>
> انبہ را کہ دریں باغ ندارند نگاہ — جائے او باد بہ نارِ شکمِ عبداللہ[2]

تلوار کی آزادی کے لیے قرارداد پنجاب کونسل کے اجلاسِ شملہ میں پیش ہونی تھی۔ ڈاکٹر محمد عالم نے پیش کرنی تھی۔ کسی ضرورت سے لاہور چلے گئے۔ قرارداد پیش نہ ہو سکی۔ ۲۶/جولائی کو علامہ اقبال نے چیف سیکرٹری کو خط لکھا کہ تلوار کو لائسنس کے قانون سے مستثنیٰ قرار دیا جائے۔[3]

---

[1] عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۱۸۶-۱۸۱

[2] سالک کے کالم کا اقتباس؛ عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۲۳۴-۲۳۱

[3] حنیف شاہد (اقبال اور پنجاب کونسل)، ص ۱۳۱۔ حوالہ انقلاب ۱۳ دسمبر ۱۹۲۸ء

پنجاب کونسل کے ستائیس اراکین نے وزیرِ بلدیات ملک فیروز خاں نون کے زیرِ قیادت ایک اعلان پر دستخط کیے: ”ہندوؤں کے تعصبات، ہندومت کی تجدید، جس کی وجہ سے تمدنی اختلافات زیادہ ہو گئے ہیں، اقتصادی اختلافات کی ترقی اور دیگر وجوہ کے پیشِ نظر ہندوستان کی آئندہ ترقی کے لیے یہ امر مضرت رساں ہے کہ جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کو ترک کر دیا جائے۔ علاوہ اِس کی وجہ سے مسلمان زیادہ جاہل اور غریب ہو جائیں گے۔“ دستخط کرنے والوں میں علامہ اقبال، سر رحیم بخش، نواب مہدی خاں اور کپتان سکندر حیات خاں شامل تھے۔[1]

۳۰ر جولائی کو علامہ کو چیف سیکرٹری ایچ ڈی کریک کی طرف سے جواب موصول ہوا۔ حکومت تلوار کی آزادی کے لیے ۱۹ر جولائی کو حکم جاری کر چکی ہے۔ اس ہفتے گزٹ میں شائع ہونے والا ہے۔ پنجاب کے نو ضلعوں میں تلوار قانونِ اسلحہ سے مستثنٰی ہوئی ہے۔ لائسنس کے بغیر رکھی جا سکتی ہے: مشرقی اضلاع میں میانوالی، ڈیرہ غازی خاں، مظفر گڑھ اور جھنگ؛ مغربی اضلاع میں گڑ گانوہ، حصار، انبالہ، شملہ اور کانگڑہ۔[2]

10

مولانا عبد القادر قصوری کے اعزاز میں انقلاب نے دعوت دی۔ علامہ اقبال، مولانا ظفر علی خاں، حکیم فقیر محمد چشتی، چودھری افضل حق، ڈاکٹر محمد عالم، عبد اللہ چغتائی، مولانا محی الدین احمد قصوری، شیخ حسام الدین، شیخ علی الدین (منٹگمری)، مولانا ظفر اقبال، مولوی عبد الرحمان چشتی، میاں احمد دین اور بعض دوسرے لوگ بھی شامل ہوئے۔ شام چھ بجے آغاز ہوا۔ مولانا نے اپنے سفر حج کے مختصر حالات سنائے۔ رات ۸ر بجے تقریب ختم ہوئی۔[3]

۱۴ر اگست کے ہمدرد میں جوہرؔ نے ’اقبال میر اُستاد‘ کے عنوان سے مضمون شائع کیا۔ کونسل

---

[1] انقلاب (لاہور)، ۲۸ر جولائی ۱۹۲۷ء؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۹۷

[2] انقلاب ۱۱ر اگست ء؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۹۷

[3] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸)، حیات اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۲۵۲-۲۵۳ بحوالہ انقلاب ۱۲ر اگست ۱۹۲۷ء

میں ۱۹ر جولائی کو علامہ کی تقریر نے سخت صدمہ پہنچایا تھا:

> ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب... جن سے ہم نے اسلام سیکھا تھا (نہ کہ کسی مولوی سے) اُس وقت نظر بند نہیں ہوئے جب کہ جنگِ عمومی میں بہت سے نظر بند کر دیے گئے تھے، وہ اس جنگ کے بعد بھی مارشل لا کے زمانے میں قید نہیں ہوئے حالانکہ خود پنجاب میں بعض بڑے سے بڑے ہندو اور مسلمان قید کر دیے گئے اور عوام میں سے تو سیکڑوں ہی جیل خانوں میں بھر دیے گئے... اِس وقت بھی میں جو کچھ اپنے استاد (شاعری کے نہیں مذہب اسلام کے اُستاد) 'اقبال مرحوم' کے متعلق لکھ رہا ہوں میرا دل اُن کی محبت کے باعث تڑپ رہا ہے... آج بھی سید عطأاللہ شاہ بخاری اور عبدالرحمٰن غازی جیل میں سڑ رہے ہیں مگر جو آزاد ہیں وہ آزاد ہیں اور اقبال کی دعا قبول ہو کر اُن کو جو 'ہمدمِ دیرینہ' اور ان کے 'عشقِ عالم سوز' کا 'آئینہ' ان کا 'یارِ ہمدم' اور ان کے 'رموزِ فطرت' کا محرم... ملا ہے وہ محمد امین صاحب بیرسٹر (سابق ساگر چند) ہیں... اور دونوں مل کر اِس ہائے وہو میں مصروف ہیں کہ سب عہدے خالی کرو اور سب کے سب انگریزوں کو دے دو۔[1]

۱۶ر اگست کو مضمون کی دوسری قسط 'طبیبِ حاذق ڈاکٹر اقبال کا نیا نسخہ' شائع کی۔ ۲۱ر اگست کو آخری قسط شائع ہوئی۔

شمع و شاعر کے مصنف سے ایک سوال

[از مولانا محمد علی (جوہرؔ)]

[اقتباس]

صحیح تنظیم سنگھٹن کی نقل نہیں ہے نہ جذبۂ انتقام سے اُسے کوئی واسطہ۔ اگر ہندو بجائے تمہارے دشمن ہونے کے تمہارے سب سے زیادہ چہیتے دوست بھی ہوں اور سنگھٹن کا نام تک نہ لیں تب بھی تمہیں اپنی تنظیم تو کرنا ہی ہے اور اُس کے لیے سنتِ مالویہ پر چلنے کی مطلق ضرورت نہیں، سنتِ محمدیہؐ

[1] جوہرؔ کا مضمون 'میرا استاد اقبال' ہمدرد ۱۴ر اگست ۱۹۲۷ء؛ ابو سلمان شاہجہانپوری (۱۹۹۳)، ص ۹۲-۸۳

موجود ہے۔ اُسی پر چل کر مسلمان منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں گے۔ جب تم میں اور کسی دشمن میں لڑائی ہو تو کیا ضرورت ہے کہ وہی ہتھیار استعمال کیا جائے جو اُس کے پاس ہے؟ جادلہم بالتی ھی احسن، ہی کے ہتھیار سے بھی جو ہتھیار بہتر ہو وہ کیوں نہ استعمال کیا جائے۔ آج اگر مسلمان اقامت الصلوٰۃ ہی کے رکنِ دین پر عامل ہونے لگیں تو فتح اُنہیں کی ہے مگر یہاں تو ساری دینداری مسجدوں کے سامنے باجانہ بجنے دینے میں ختم ہو گئی ہے۔ مسجدوں میں جا کر نماز سو میں سے بہ مشکل پانچ پڑھتے ہیں اور جو پڑھتے ہیں ان میں سے کتنے ہی ایسے ہیں جن کو اس کا زیادہ خیال ہے کہ ٹخنے سے ٹخنا اور گھٹنے سے گھٹنا مل جائے چاہے دل سے دل ملے یا نہ ملے اور فکر ہے تو اِس کی کہ میاں تم ہاتھ کہاں باندھتے ہو، آمین بالجہر کہتے ہو یا نہیں یا رفع یدین کرتے ہو یا نہیں کرتے، تمہارا پاجامہ گھٹنوں تک آتا ہے یا ٹخنوں سے نیچا ہے۔ اس کی کتنوں کو فکر ہے کہ میرے پاس نماز پڑھنے والے کے کپڑے تو اس قدر بوسیدہ ہیں کہ سترِ عورت تک مشکل ہے اور میں اس چکن پٹ میں ہوں کہ چاوڑی بازار اور ٹبی کی "زیادہ خرچ بالا نشین" عورتوں کو مات ہے۔ اگر اقامت الصلوٰۃ صحیح طریقے پر کی جائے تو مسلمانوں سے زیادہ منظم تو جرمن کی فوج بھی نہ ہو اور جرمن کی فوج پر تو لارڈ نارتھ کلف کے پروپیگنڈے کا جادو چل گیا تھا، اس فوج پر جو خدائی فوجداروں کی فوج ہے بھلا کس کا جادو چل سکتا ہے۔ پوری حریت اور پوری آزادی اور پوری جمہوریت سے اس کا امام چنا جائے، اور ووٹ یورپ اور امریکہ کی طرح اپنی ذاتی خواہشوں کی پیروی میں نہ دیے جائیں بلکہ اسلام کے مقرر کردہ اصولوں کے مطابق۔ لیکن جب اس طرح امام چن لیا جائے اور نسلاً بعد نسلٍ اور بطناً بعد بطنٍ نہ رہے تو پھر تو اُس وقت تک جب تک کہ وہ حکمِ الٰہی اور سنتِ نبوی کی پیروی کرتا ہے اُس کا اتباع اِس طرح کیا جائے کہ کسی فوج کے جنرل کا بھی کبھی نہ ہوا ہو اور سمعنا و اطعنا کا منظر ایک عالم کو پھر دکھلا دیا جائے...[لیکن] پہلا رکنِ دین تو وہ ایمان ہے کہ ولاتھنوا و لاتحزنو وانتم الاعلون ان کنتم مومنین۔ فان سمعیکم قرح فقدمس القوم قرح مثلہ وتلک الایام نداولھا بین الناس۔ ولیعلم اللہ الذین آمنو ویتخد منکم شھدأ واللہ لایحب الظٰلمین۔ ولمیحص اللہ الذین آمنوا ویمحق الکٰفرین۔ (اگر مصیبت آپڑی ہے تو سست نہ ہو نہ غم کھاؤ اور تم ہی غالب رہو گے بشرطیکہ تم اللہ پر اعتماد رکھتے ہو۔ اگر تم کو زخم پہنچا ہے تو تمہارے دشمنوں کو بھی ایسا ہی زخم پہنچ چکا ہے اور یہ دن

باری باری ہم لوگوں میں بدلتے رہتے ہیں، اور اس کی غرض یہ ہے کہ اللہ امتحان کرے کہ کون اس پر اعتماد رکھتے ہیں اور یہ کہ تم میں سے شہیدوں کو چن لے۔ کہیں یہ نہ سمجھنا کہ یہ اس لیے ہوتا ہے کہ اللہ ظلم کرنے والے سے کچھ محبت کرتا ہے۔ ہر گز نہیں، اس کو ظلم کرنے والوں سے بالکل محبت نہیں اور ایک غرض یہ بھی ہے کہ اللہ ایمان والوں کو نکھار کے صاف کر دے اور کافروں کو مٹادے)۔

یہ سبق ہم نے قرآن کریم سے حاصل کیا ہے لیکن اس کی تفسیر ہمارے لیے کسی مولوی نے نہیں کی تھی بلکہ زیادہ تر خود اقبال نے کی تھی۔ میں اُن سے پوچھتا ہوں کہ کیا اُنہیں نے ہمیں نہیں سکھایا تھا کہ

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

لیکن آج وہ ایمانِ براہیمی کا نسخہ ہمارے لیے تجویز نہیں کرتے بلکہ خود نمرود کا خیر مقدم کرتے ہیں اور ہم کو بھی یہ حکم دیتے ہیں کہ اُس کو بھی سجدہ کرو گو وہ سورج کو مشرق کی بجائے مغرب سے نہیں نکال سکتا مگر یکی ویمیت اس کی شان بھی ہے... میں تو آج بھی اقبال اپنے محبوب اقبال سے کہتا ہوں کہ ساقیا تو آتش بجام آکر تو دیکھ شعلہ آشام اب بھی باقی ہیں... تعجب ہے کہ آج تو بھی لالہ جی کے خوف سے اوگلوی صاحب کی گود میں گھسا جاتا ہے... تو نڈر ہو کر مسلمانوں کو پھر بیدار کر، اور مسلمانوں ہی کو نہیں بلکہ ہندوؤں کو بھی، جو ہم سے بھی زیادہ خوفزدہ ہیں۔ فقط مسلم لیگ ہی کو نہ جگا بلکہ کانگریس کو بھی ہوشیار کرع

پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے

ہمدرد (دہلی)، ۲۱/اگست ۱۹۲۷ء[1]

11

۲۲/اگست کو یوپی کی چیف کورٹ نے ۱۹۲۵ء میں ہونے والی کاکوری ٹرین ڈکیتی پر ماتحت عدالت کے فیصلے کو معمولی تبدیلیوں کے ساتھ برقرار رکھنے کا حکم سنایا۔

---

[1] ابو سلمان شاہجہانپوری (۱۹۹۳)، ص ۱۳۱-۱۲۰

ہندوستان ری پبلکن ایسوسی ایشن کے پنڈت رام پرشاد بسمل، ٹھاکر روشن سنگھ، راجندر ناتھ لہری اور اشفاق اللہ خاں کے لیے پھانسی کی سزا برقرار رکھی گئی۔ تنظیم کے دوسرے کئی ارکان کو مختلف سزائیں ہوئی تھیں جو کالے پانی کی عمر قید سے لے کر چار برس کی قید تک محیط تھیں۔

۲۴ر اگست کو شملہ میں مرکزی قانون ساز اسمبلی میں ہوم ممبر جیمز کریرار (James Crerar) نے مذاہب کی توہین کے خلاف قانون کا مسودہ اسمبلی میں پیش کیا:

> Whoever, with deliberate and malicious intention of outraging the religious feelings of any class of His Majesty's subjects, by words, either spoken or written, or by visible representations insults the religion or the religious beliefs of that class, shall be punished with imprisonment of either description for a term which may extend to ten years, or with fine, or with both.

تجویز تھی کہ اسے تعزیراتِ ہند کی دفعہ ۲۹۵-الف (295-A) بنایا جائے۔

۲۷ر اگست کو مصر کے قومی ہیرو سعد زغلول پاشا کا انتقال ہو گیا۔ تین برس پہلے وزارتِ عظمیٰ سے مستعفی ہونے کے بعد پچھلے برس وہ پارلیمنٹ کے صدر کے طور پر حکومت میں واپس آئے تھے۔

12

علامہ نے کہیں سے پلاؤ پکانے کی یہ ترکیب سنی کہ ٹماٹروں کا پانی ڈال کر پکایا جائے۔ سردار بیگم نے اگلے ہی روز یہ ترکیب آزمائی۔ "یہ تو واقعی بہت لذیذ ہے،" اقبال نے کہا۔ "اب جب بھی پلاؤ پکائیں تو یہی طریقہ استعمال کیا کریں۔"[1]

13

۴ر ستمبر کو لاہور میں نمازِ عشأ کے بعد کشمیری بازار کے متصل کوچہ کوٹھی داراں میں دس ہزار کے قریب مسلمان جمع ہوئے۔ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لیے انجمن قائم ہو رہی تھی۔ علامہ نے جلسے کی صدارت کی۔ مولانا غلام مرشد نے عورتوں کو پردے میں رکھنے کی تلقین کی۔ علامہ نے اہلِ محلہ کو

[1] خالد نظیر صوفی، اقبال درونِ خانہ، ص ۲۸۔ وسیمہ مبارک کی روایت ہے۔

مبارکباد دی۔ کہا کہ قرآن شریف کی آیت و کذالک جعلنا کم امۃ وسطاً کی روشنی میں مسلمانوں کو میانہ روی اختیار کرنی چاہیے۔ فضول مصارف ترک کر دیں۔ حدیث شریف الکاسب حبیب اللہ کے مطابق ہر مسلمان کو کچھ نہ کچھ کمانا چاہیے۔ آپس میں اعتماد کی فضا قائم کرنی چاہیے۔ مسلمان دکانداروں کی مدد کرنی چاہیے۔ باہمی اشتراک سے چلنے والی کمپنیاں کھولنی چاہئیں۔ شیخ سعدی کی حکایت سنائی کہ کوئی نانبائی روٹی مہنگی بیچتا تھا۔ ایک عورت نے شوہر سے کہا کہ بازار سے گندم لا کر خود روٹی تیار کرے گی۔ شوہر نے جواب دیا کہ نانبائی محلے والوں ہی کے بھروسے پر بیٹھا ہے، قطع تعلق نہ کرنا چاہیے۔ یہ حکایت شیخ سعدی نے بیان کی تھی۔ علامہ نے اپنی تقریر میں پیش کی۔[1]

اسی موقع پر یا کسی ایسے ہی جلسے میں ایک مقرر حاضر نہ ہو سکا۔ علامہ نے گاما پہلوان کو دعوت دی۔ عبداللہ چغتائی کے مطابق گاما اس کے لیے تیار نہ تھے، ''خود پر قابو پا کر اپنی سیدھی سادی پہلوانی زبان میں پہلے لوگوں کو ورزش اور کسرت کرنے کی تلقین کی اور پھر نہایت مختصر الفاظ میں اپیل کی کہ بھائیو سودا سلف مسلمان دکانداروں سے لیا کرو۔'' علامہ نے صدارتی خطبے میں کہا کہ انہیں جلسے میں سب سے زیادہ گاما پہلوان کی تقریر پسند آئی ہے۔ وہ ایک سچے مسلمان کے الفاظ ہیں۔[2]

۴؍ ستمبر ہی کی رات جب علامہ کوچہ کوٹھی داراں میں صدارت کر رہے تھے، وچھو والی میں ہندوؤں کا بہت بڑا جلسہ ہو رہا تھا۔ اُنہیں شکایت تھی کہ احمدی اخبار لائٹ مسلمانوں کو ہندوؤں کے خلاف مسلح جدوجہد کی ترغیب دینے لگا ہے۔ ''اِن دو جلسوں کے باعث لاہور کے حکام اور پولیس کو رات کے بارہ بجے تک مستعد رہنا پڑا،'' انقلاب نے لکھا۔[3]

۵؍ ستمبر کو شملہ میں مرکزی قانون ساز اسمبلی کے اجلاس میں مذاہب کی توہین کے خلاف قانون کا مسودہ سیلکٹ کمیٹی کے سپرد ہوا۔ کمیٹی میں جیمز کریرار، جناح، سر محمد شفیع، لاجپت

---

[1] انقلاب: ۷؍ ستمبر ۱۹۲۷ء؛ افضل (۱۹۸۶)، ص ۴۹-۴۸۔ انقلاب ۶؍ ستمبر ۱۹۲۷ء؛ فاروقی (۱۹۸۸)، ص ۲۷۵

[2] چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۱۹۵-۱۹۴۔ چغتائی نے جلسے کا مقام بیرون موچی دروازہ بتایا ہے۔

[3] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸)، ص ۲۷۵، ۲۸۳ بحوالہ انقلاب ۶؍ ستمبر ۱۹۲۷ء اور ۲؍ فروری ۱۹۲۸ء

رائے، شری نواس آینگر، رنگ سوامی آینگر، نواب اسماعیل خاں، نرمل چندر، عبدالحئ، آرتھر مور، غزنوی، کیلکر، جیکر، کوٹ مین، کے سی رائے، سر عبدالقیوم اور سر ڈینس برے شامل تھے۔ جناح نے کہا کہ مذاہب کے بارے میں سنجیدہ اور علمی تحقیق اور تنقید کا دروازہ بند نہیں ہونا چاہئیے:

> ...the fundamental principle that those who are engaged in historical works, those who are engaged in the ascertainment of truth and those who are engaged in bona fide and honest criticisms of a religion shall be protected.[1]

۶ر ستمبر کے انقلاب میں انجمن حمایت اسلام کی طرف سے "مشترکہ جلسہ ٔمیلاد" کا اعلان ملتا ہے۔ اسلامیہ کالج کے میدان میں ۹ر ستمبر کو ہونا تھا۔ علامہ نے صدارت کرنی تھی۔ مختلف جماعتوں کے علمأ تقریر کرنے والے تھے۔ مستورات کے لیے پردے کا علیحدہ انتظام تھا۔ یہ معلوم نہیں ہے کہ اعلان کے مطابق میلاد ہوا یا نہیں۔[2]

گرامی مرحوم کا کلام تیار ہو چکا تھا۔ بیوہ نے جن کا نام اقبال تھا اور ترک تخلص کرتی تھیں، علامہ کو خط لکھ کر دیباچے کی درخواست کی تھی۔ ۱۳ر ستمبر کو علامہ نے جواب لکھا:

> افسوس ہے کہ مجھے دیباچہ لکھنے کی مطلق فرصت نہیں، البتہ میں چودھری محمد حسین صاحب کے سپرد یہ کام کر دوں گا اور ان کو اس کام کے متعلق ضروری ہدایات دے دوں گا۔ وہ میرے مشورے سے لکھتے جائیں گے۔ اس کے علاوہ مجھے پورا کلام بھی سنا دیں گے۔ ترتیب کے متعلق میرا خیال یہ ہے کہ پہلے ان کی رباعیات اچھے اہتمام سے شائع کی جائیں، بعد میں غزلیات، بعد میں مثنوی و قطعات وغیرہ۔ قصائد اگر کوئی ہوں تو وہ سب سے پیچھے۔ کیونکہ اس زمانے میں قصائد کا مذاق نہیں رہا۔ رُباعیات کی اشاعت پر زیادہ خرچ بھی نہ ہو گا اور پڑھنے والی پبلک کی نبض شناسی بھی ہو جائے گی۔

---

[1] Mitra: *Indian Quarterly Register Jul-Dec 1927,* p.237; and other sources

[2] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸)، ص ۱۴۸ بحوالہ انقلاب ۶ر ستمبر ۱۹۲۷ء

علامہ اُس شام ڈیرہ دون جا رہے تھے۔ وہاں سے شملہ جانے کا ارادہ تھا۔[1] ۱۶/ ستمبر کو آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس نے آیندہ اجلاس میں تعلیمِ نسواں کے شعبے کی صدارت کے لیے علامہ کو منتخب کیا۔[2] معلوم ہوتا ہے کہ قبول نہ کر سکے۔

14

۱۹/ ستمبر کو شملہ میں مرکزی قانون ساز اسمبلی نے مذاہب کی توہین کے خلاف قانون کا مسودہ منظور کیا۔ اس کے حق میں ۶۱/ اور مخالفت میں ۲۶/ ووٹ تھے۔[3] خیال رکھا گیا کہ اطلاق صرف اُس صورت میں ہو جب کسی گروہ کے مذہبی جذبات کو مشتعل کرنے کے ارادے سے اُس کے مذہب یا مذہبی عقائد کی توہین کی جائے۔ ''جان بوجھ کر اور بری نیت'' کی شرط تھی۔ اصلاح کی غرض سے مذہبی عقائد پر تنقید کی جائے تو وہ اس زمرے میں نہ آتے۔

۲۴/ ستمبر کو صبح ساڑھے آٹھ بجے لاہور کے انار کلی بازار میں ہسپتال روڈ پر مہاشے راجپال اپنی کتابوں کی دکان کے باہر کسی دوست سے گفتگو کر رہا تھا۔ پچیس تیس برس کے ایک مسلمان نوجوان نے چاقو سے حملہ کیا۔ راجپال کے دوست اور ملازم نے بچا لیا۔ حملہ آور پولیس کے حوالے ہوا۔ اُس کا نام خدا بخش اکو جہا تھا۔ اندرون یکی گیٹ کے ایک محنت کش کشمیری گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ والد دودھ بیچتے اور جلد سازی کا کام کرتے تھے۔ عدالت نے ایک دو روز میں کاروائی مکمل کر لی۔ اکو جہا کو سات سال قیدِ سخت کی سزا ہوئی۔ تین ماہ کی قیدِ تنہائی شامل تھی۔ اُس کے بعد پانچ پانچ ہزار روپے کی تین ضمانتیں حفظِ امن کے لیے داخل کرنی تھیں ورنہ ایک سال مزید قید۔[4]

---

[1] مکتوب بنام بیگم گرامی ۱۳/ ستمبر ۱۹۲۷ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۷۸–۶۷۷

[2] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸) حیات اقبال کے چند مخفی گوشے ص ۲۸۵ بحوالہ انقلاب ۲۲/ ستمبر ۱۹۲۷ء

[3] Mitra: *Indian Quarterly Register Jul-Dec 1927,* p.264

[4] ظفر اقبال نگینہ (۱۹۸۸)، ص ۴۱؛ نگینہ کے مطابق راجپال نے ہائی کورٹ سے بری ہونے پر کہا تھا کہ آیندہ رنگیلا رسول شائع نہ کرے گا۔ بنارس سے تازہ ایڈیشن شائع ہوا۔ خیال تھا کہ اسی کا ہاتھ ہے۔ انجمن خدام الدین لاہور نے کہا کہ ایسے شخص کا قتل واجب ہے۔

۲۸/ ستمبر کو سالک نے انقلاب میں اپنے کالم میں علامہ کا خط نقل کیا۔ چار روز پہلے اصغر حسین نظیر لدھیانوی کی فارسی نظم 'نذرِ اقبال' اخبار میں شائع ہوئی تھی۔ سالک نے ایک غلطی کی نشاندہی کی تھی۔ علامہ نے خط میں لکھا، "اصغر حسین صاحب کے شعر میں کوئی غلطی نہیں۔"[1]

15

اِندور کے مسلمانوں کے لیے ریلیف کمیٹی بنی تھی۔ ملک میں اور ملک سے باہر اپیلیں کی جارہی تھیں۔ ایران کے شہر آبادان میں بسنے والے ہندی مسلمانوں نے کچھ رقم جمع کر کے علامہ کو بھجوائی۔ انہوں نے رجسٹری کے ذریعے کمیٹی کو بھجوادی۔ تین سو روپے تھے۔ ۴/ اکتوبر کو پہنچے۔[2]

۹/ اکتوبر کی شام لاہور کے انار کلی بازار میں راجپال کسی دوست سے گفتگو میں مصروف تھا۔ اِس دفعہ حملہ کرنے والے نے اُس دوست کو راجپال سمجھا۔ وہ چاقو کے وار سے زخمی ہو گیا۔ پولیس نے حملہ آور کو گرفتار کر لیا۔ افغان تھا۔ نام عبدالعزیز تھا۔ دو تین روز میں عدالت نے اُسے سات سات سال کی قیدِ سخت کی دو سزائیں سنائیں۔ تین تین ماہ کی قیدِ تنہائی شامل تھی۔ اُس کے بعد پانچ پانچ ہزار روپے کی تین ضمانتیں ورنہ مزید تین سال کی قید۔[3]

آبادان (ایران) کے ہندی مسلمانوں کی طرف سے اِندور کے مسلمانوں کی مدد کے لیے مزید ڈھائی سو روپے علامہ کو موصول ہوئے۔ اِندور ریلیف کمیٹی کو بھجوادیے۔[4]

16

۲۰/ اکتوبر کو انقرہ میں غازی مصطفی کمال پاشا نے اپنی طویل تقریر کا اختتام کیا۔ پندرہ تاریخ کو اُن کی

---

[1] مکتوب بنام سالک بلا تاریخ؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص۶۷۹-۶۷۸۔ نیز حمزہ فاروقی (۱۹۸۸) حیات اقبال کے چند مخفی گوشے، ص۳۹۷ بحوالہ کالم 'افکار و حوادث' انقلاب ۲۸/ ستمبر ۱۹۲۷ء

[2] مکتوب بنام مدیر زمیندار ۲/۷ اکتوبر ۱۹۲۷ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۸۲-۶۸۰

[3] ظفر اقبال نگینہ (۱۹۸۸)، ص ۴۱

[4] مکتوب بنام مدیر زمیندار ۲/۷ اکتوبر ۱۹۲۷ء محولہ بالا

سیاسی جماعت ری پبلکن پیپلز پارٹی کے کنونشن کے آغاز پر تقریر شروع ہوئی تھی۔ چھ اجلاسوں میں جاری رہی تھی۔ آج اختتام کرتے ہوئے غازی پاشا نے نئی نسل کو مخاطب کیا:

اے ترک نوجوانو!

تمہارا پہلا فریضہ یہ ہے کہ ہمیشہ ترکی کی آزادی اور ترک جمہوریہ کو قائم رکھو اور اس کی حفاظت کرو۔ تمہارے وجود اور تمہارے مستقبل کی یہ واحد بنیاد ہے۔ یہ بنیاد تمہارا سب سے قیمتی خزانہ ہے۔

مستقبل میں بھی ملک میں اور ملک سے باہر ایسے بدنیت لوگ ہوں گے جو تمہیں اس خزانے سے محروم کرنا چاہیں گے۔ اگر کسی دن تمہیں اپنی آزادی اور اپنی جمہوریہ کی حفاظت کرنی پڑے تو تم اپنا فرض ادا کرنے سے پہلے حالات پر غور کرنے کا عذر پیش کر کے تاخیر نہیں کرو گے۔ یہ امکانات اور حالات بڑے مشکل ہو سکتے ہیں۔ تمہاری آزادی اور تمہاری جمہوریہ کے خلاف سازش کرنے والے دشمن تاریخ کے سب سے بڑے فاتح ہو سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ طاقت یا عیاری سے تمہارے محبوب وطن کے تمام قلعے مغلوب ہو چکے ہوں، اس کے تمام بحری اڈے چھن چکے ہوں، اس کی تمام فوجیں منتشر ہو چکی ہوں اور ملک کا ہر گوشہ حملہ آوروں کی زد میں ہو۔ ان سب سے بڑھ کر دکھ دینے اور تشویش پیدا کرنے والی بات یہ ہو سکتی ہے کہ ملک میں برسرِ اقتدار لوگ اندھے اور گمراہ ہوں۔ وہ غدار بھی ہو سکتے ہیں۔ ملک کے حکمراں حملہ آوروں کے سیاسی منصوبوں میں اپنے ذاتی مفادات کے حصول کا ذریعہ تلاش کر سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ملک بدحال اور تباہ و برباد ہو چکا ہو جس میں کوئی سکت باقی نہ رہ گئی ہو۔

اے مستقبل کے ترک بچے، ایسے حالات میں بھی تمہارا فرض ہے کہ ترکی کی آزادی اور ترک جمہوریہ کی حفاظت کرو۔

اس کے لیے تمہیں جس قوت کی ضرورت ہو گی، اُسے تم اپنی رگوں میں

دوڑنے والے شریف لہو میں موجود پاؤ گے۔

اُس شام آٹھ بجے لاہور میں اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں مباحثہ تھا۔ ذوالفقار ڈیبیٹنگ یونین نے اہتمام کیا تھا۔ موضوع تھا، "آیا ہندوستان کی معاشرتی اور سیاسی ترقی کے لیے مشترکہ انتخاب مفید ہو سکتا ہے۔ بہ ایں طور کہ قلیل التعداد اقوام کے لیے نشستیں مخصوص کر دی جائیں۔" اعلان ہوا تھا کہ علامہ اقبال بھی مباحثے میں حصہ لیں گے۔ شریک نہ ہو سکے۔[1]

عبداللہ چغتائی کے پاس ابن عربی کی فصوص الحکم کا قلمی نسخہ تھا۔ ۲۲/ اکتوبر کو علامہ نے ایک دن کے لیے مستعار لینے کے لیے انہیں کارڈ لکھا۔[2]

اندور ریلیف کمیٹی کی طرف سے خط موصول ہوا۔ علامہ نے اسے ۴/ اور ۲۰/ اکتوبر آبادان (ایران) کے ہندی مسلمانوں کی طرف سے رقومات بھجوائی تھیں۔ کمیٹی نے شکریہ ادا کیا، "جس شے نے دل کو قوی کیا وہ یہ تھی کہ اب بھی مسلمانوں میں اسلامی حمیّت باقی ہے کہ کوسوں دُور بیٹھے ہوئے اپنے مظلوم بھائیوں کی حالتِ زار کو فراموش نہیں کرتے۔ خداوند کریم ہمارے آبادان کے بھائیوں کو ہمیشہ شاد رکھے اور انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔" ۲۷/ اکتوبر کو علامہ نے یہ خط اپنے نوٹ کے ساتھ ظفر علی خاں کو بھجوا دیا۔ زمیندار کے سنڈے ایڈیشن میں شائع کروانا چاہتے تھے۔[3]

اُس روز فنانشل کمشنر کی عدالت میں کسی رسالدار نور خاں کے خلاف اپیل کا فیصلہ ہوا۔ علامہ اس کی پیروی کر رہے تھے۔ اپیل کسی کیپٹن کابل سنگھ کی طرف سے تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ ضلع کے کلکٹر نے مسلم اکثریت کے کسی علاقے میں مسلمان ذیلدار مقرر کیا تھا۔ سکھ کیپٹن نے اپیل کی تھی کہ سینئیر فوجی افسر کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ سکھ ہے۔ فنانشل کمشنر نے فیصلہ دیا کہ علاقے کے زیادہ تر مرد فوج میں خدمت انجام دے چکے ہیں۔ اس لیے آبادی کے مذہبی تناسب کو نظر انداز

---

[1] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸)، حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، ص۲۷۵-۲۷۶ بحوالہ انقلاب ۲۱/ اکتوبر ۱۹۲۷ء

[2] مکتوب بنام عبداللہ چغتائی، ۲۲/ اکتوبر ۱۹۲۷ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، دوم، ص۶۸۱-۶۸۰

[3] مکتوب بنام مدیر زمیندار محولہ بالا

کی جاسکتا ہے۔ سینیارٹی کی بنیاد پر تقرر ہونا چاہیئے۔[1]

۲۷ر سے ۲۹ر اکتوبر تک کلکتہ میں اتحاد کانفرنس ہوئی۔ مذہب کی تبدیلی، گائے ذبح کرنے اور مساجد کے قریب باجہ بجانے کے بارے میں قراردادیں منظور کی گئیں۔ روایت ہے کہ علامہ نے ان کے بارے میں بیان جاری کیا۔ قراردادوں کو حلقۂ اثر کے اعتبار سے تسلی بخش کہا۔ لیکن اصل مسئلے کو مذہبی نہیں بلکہ سیاسی اور اقتصادی قرار دیا۔ سیاسی مفاہمت کے سوا کوئی حل نہ تھا۔ منفی پروپیگنڈا اور "مذہبی نوعیت کے غیر حقیقی مسائل" اس طرف سے توجہ ہٹادیتے ہیں۔ "اگر یہی صورت حال رہی تو مجھے ڈر ہے کہ کہیں ہندوؤں اور مسلمانوں کے بہترین دماغ عوام کو اپنے حال پر چھوڑ کر بالکل علیحدہ نہ ہو جائیں،" انہوں نے کہا۔[2]

17

شروع ہی سے ہندو رہنماؤں کی پالیسی رہی تھی کہ امریکہ میں ہندومت اور ہندوستان کی تحریکِ آزادی کے حق میں پروپیگنڈا کریں۔ کچھ عرصہ پہلے ساٹھ سالہ امریکی مصنفہ کیتھرائن میو (Katherine Mayo) کو خواہش ہوئی کہ اس پروپیگنڈا کی حقیقت دریافت کریں۔ ہندوستان آئیں۔ ممکن ہے کہ علامہ سے بھی ملاقات ہوئی ہو۔[3] اُن کی تصنیف مدر انڈیا (*Mother India*) مئی میں نیو یارک سے اور جولائی میں لندن سے شائع ہوئی۔ اکتوبر تک امریکی اڈیشن سات مرتبہ اور برطانوی اڈیشن چھ مرتبہ شائع ہو چکا تھا۔[4] مصنفہ نے دکھایا تھا کہ ہندوستان کی پسماندگی کی اصل وجہ برطانوی تسلط نہیں ہے۔ اس کی اصل وجہ ہندو دھرم اور ذات پات کا نظام ہے۔ خالص نظریاتی بحث سے گریز کی تھی۔ حفظانِ صحت سے متعلق ٹھوس حقائق اور مشاہدات پیش کیے، مثلاً فرسودہ توہمات کی وجہ سے

---

[1] ظفر علی راجا ایڈووکیٹ (۲۰۱۳) قانون دان اقبال، ص ۱۳۰

[2] بشیر احمد ڈار، انوارِ اقبال، ص ۲۸۲-۲۸۱؛ ماخذ کا حوالہ نہیں دیا گیا۔

[3] میو کی ۱۹۳۵ء میں شائع ہونے والی تصنیف *The Face of Mother India* میں تصویر ۳۹ میں ایک گارڈن پارٹی کی ہے جہاں علامہ بھی موجود ہیں۔ میو نے لکھا ہے کہ وہ فارسی اور اُردو کے سب سے بڑے زندہ شاعر ہیں۔

[4] دیکھیے مارچ ۱۹۳۱ء کی امریکی اشاعت جو ۳۳ویں اشاعت ہے؛ دسمبر ۱۹۲۷ء کی برطانوی اشاعت جو ۸ویں ہے۔

غلاظت کو قبول کرنا اور بیماریوں سے بچاؤ کی تدابیر کو دھرم پر حملہ تصور کرنا۔ دھرم کے احکام اور ہندو معاشرے کے رسوم و رواج کی وجہ سے بعض اوقات شیر خوار بچیوں کی شادی کر دی جاتی تھی۔ بہرحال بلوغت کی عمر تک پہنچنے سے پہلے یا اس کے فوراً بعد لڑکیوں کی رخصتی ضرور ہو جاتی۔ بارہ تیرہ برس کی عمر تک وہ ماں بن جاتیں۔ کمسن بچیوں کی شادی بوڑھے مردوں کے ساتھ بھی ہوتی تھی۔ نچلی ذات کے ہندوؤں سے لے کر مہاراجوں تک اس رواج کی گھناؤنی مثالیں موجود تھیں۔

ہندوؤں کی طرف سے کتاب کے خلاف احتجاج ہوا۔[1] رائے صاحب ہربلاس شاردا مرکزی کونسل کے رُکن تھے۔ ہندو نسل کی برتری (*The Superiority of the Hindu Race*) جیسی کتاب کے مصنف تھے۔ ہندوؤں میں بچپن کی شادیوں کی ممانعت کے قانون کا مسودہ پہلے ہی اسمبلی میں پیش کر چکے تھے۔ حکومت مخالف تھی کیونکہ ایسے قانون کو نافذ کرنا مشکل تھا۔ ہندوؤں کی بڑی تعداد بھی اس کے خلاف تھی۔ ملکہ وکٹوریہ نے بھی ۱۸۵۸ء میں ہندوستانیوں سے وعدہ کیا تھا کہ مذہبی معاملات میں دخل نہ دیا جائے گا۔ شخصی قانون مذہبی معاملہ سمجھا گیا تھا۔ مدر انڈیا کی اشاعت کے بعد رائے بہادر کا تجویز کیا ہوا قانون سیاسی مسئلہ بن گیا۔ "شاردا بل" کہلانے لگا۔ بعض ہندو رہنماؤں کی خواہش تھی کہ فوراً نافذ کر کے مدر انڈیا کے الزام کی تردید کر دیں۔ قدامت پسند ہندو مخالفت کرنے لگے۔ وائسرائے نے رائے عامہ معلوم کرنے کا حکم دیا۔ قانون کے دائرے میں ہندوؤں کے علاوہ مسلمانوں کو بھی شامل کر لیا۔

جوہرؔ نے وائسرائے کے نام خط لکھا۔ غالباً یہ کھلا خط تھا۔ علامہ نے اسے پسند کیا۔ ۳۰/ اکتوبر کی شام جوہرؔ کی طرف سے تار موصول ہوا۔ ۹/ نومبر کی صبح وائسرائے سے ملاقات کر رہے تھے۔ علامہ کو بھی بلایا۔ وہ ۷/ نومبر کو بہاولپور جا رہے تھے۔ ۱۲/ کو واپسی تھی۔ اگلی صبح اخبار میں دیکھا کہ وائسرائے سے ملاقات کی تاریخ ۱۱/ نومبر ہو گئی ہے۔ جوہرؔ کو خط لکھا کہ نواب بہاولپور سے درخواست

[1] تفصیلات کے لیے دیکھیے Harry H. Field (1929) *After Mother India*

کر کے ۹ر کی شام روانہ ہو سکتے ہیں۔ ۱۱ر کی صبح دہلی پہنچ جائیں گے۔[1]

علامہ کے نزدیک اصل مسئلہ یہ تھا کہ مجوزہ قانون کی رُو سے چھوٹی عمر کا نکاح کالعدم نہ ہوتا۔ پھر بھی قانوناً جرم بن جاتا۔ دوسری طرف مروجہ شخصی قانون کی رُو سے جائز رہتا۔ یہ تاجِ برطانیہ کے وعدے کی خلاف ورزی ہوتی۔ بہتر حل یہ تھا کہ صرف چھوٹی عمر میں رخصتی کو جرم قرار دیا جاتا۔ اُن کے نزدیک اسلام نابالغ لڑکی کی شادی کی اجازت دیتا تھا۔ بلوغت سے پہلے لڑکی کی رخصتی کی ممانعت کرتا تھا۔ بعض دیہاتوں میں مسلمان والدین غربت کی وجہ سے کم سنی ہی میں لڑکیوں کا نکاح کر دیتے تھے، مثلاً بڑی لڑکی کی شادی ہو تو ساتھ ہی چھوٹی کی بھی کر دیں کیونکہ بعد میں اُس کی شادی کے علیحدہ اخراجات برداشت نہ کر سکیں گے۔ والدین بوڑھے ہوں تو چاہتے تھے کہ بیٹی کا نکاح کر جائیں تاکہ بعد میں بے سہارا نہ رہ جائے۔ ان حالات میں بھی رخصتی لڑکی کے بالغ ہونے کے بعد ہی ہوتی جیسا کہ شریعت کا حکم تھا۔ صرف بنگال کے مسلمانوں میں نابالغ لڑکیوں کی رخصتی کا رواج بھی تھا۔ اُس کی روک تھام کے لیے شرعی حکم کا نفاذ ہی کافی ہوتا۔[2]

"اب وقت آ گیا ہے کہ ہم اس ملک میں محمڈن لا کے مسئلے کو سنجیدگی سے اٹھائیں،" علامہ نے جوہرؔ کو لکھا، "برطانوی عدالتوں نے بشمولہ ہائی کورٹ اور پریوی کونسل بتدریج اور غیر محسوس طور پر اسلام کے قانون کو الٹی چھری سے ذبح کر کے رکھ دیا ہے۔ یہ کسی حد تک مسلمان وکلأ کی نااہلی کے سبب ہوا ہے جنہوں نے کبھی اس نظامِ قانون کے اصول کا گہرائی سے مطالعہ نہیں کیا اور اس کو قرونِ وسطیٰ کے تصورات پر مبنی سمجھتے ہیں۔ اس سے زیادہ کوئی بات بعید از حقیقت نہیں ہو سکتی۔" جمیعت العلمأ کی از سرِ نو تنظیم کرنے کی ضرورت تھی۔[3]

---

[1] مکتوب بنام مولانا محمد علی [جوہرؔ] 0 (انگریزی سے ترجمہ)، ۳۱ر اکتوبر ۱۹۲۷ء؛ برنی (۱۹۹۱)، ص ۶۸۴–۶۸۲

[2] علامہ اقبال کا اخباری انٹرویو ۲۹ر ستمبر ۱۹۲۹ء۔ انقلاب یکم اکتوبر ۱۹۲۹ء؛ افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۹۷–۹۴

[3] مکتوب بنام مولانا محمد علی [جوہرؔ]، ۳۱ر اکتوبر ۱۹۲۷ء محولہ بالا

18

۸؍ نومبر کو حکومت نے آیندہ آئین کے لیے تجاویز پیش کرنے والے کمیشن کا اعلان کیا۔ سر جان ایلزبروک سائمن قیادت کر رہے تھے۔ اُن کے علاوہ کمیشن میں چھ ارکان تھے: وسکاؤنٹ برنہام، بیرن اسٹر اتھکونا، لارڈ کیڈوگن، اسٹیفن والش، جارج رچرڈ لین فوکس اور میجر رچرڈ ایٹلی۔ کوئی ہندوستانی نہ تھا۔ البتہ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی کے ارکان میں سے ایک کمیٹی بنائی جانی تھی۔ وہ کمیشن کی مدد کرتی۔

اگلے روز علامہ نے پنجاب پراونشل مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت میں بیان جاری کیا۔ کمیشن میں کسی ہندوستانی کا نہ ہونا ہندوستان کے وقار پر حملہ ہے۔ انگریزی مفادات کے لحاظ سے بھی ایک غلطی ہے۔ تاہم اس کی وجہ ہندوستان کی مختلف اقوام کا ایک دوسرے پر اعتماد نہ کرنا ہے:

> اگر کمیشن میں ہندوستانی ممبروں کو لیا جاتا تو مسلمانوں کے سرکردہ آدمیوں میں سے غالباً مسٹر جناح یا سر علی امام پر نظر انتخاب پڑتی۔ یہ دونوں مخلوط انتخاب کے حامی ہیں اور یہ امر پنجابی نقطہ خیال سے موجب اطمینان نہ تھا... اتحاد کانفرنسوں کی ناکامی اور دیگر رنج دہ حالات نے مسلمانوں کو اس پر مجبور کر دیا ہے کہ وہ بحیثیت اقلیت اپنی پوزیشن اور اپنے مفاد کا خاص خیال رکھیں لیکن ابھی وقت ہاتھ سے نہیں گیا۔ اگر ہندوستان کی مختلف قوموں کے نمایندے مل کر پھر ایک دفعہ تمام قوموں کو ایک مرکز پر جمع کرنے کی کوشش کریں تو عجب نہیں کہ کوئی قابل عمل نتیجہ پیدا ہو جائے مگر شرط یہ ہے کہ اس مرتبہ محض سیاسی اختلافات کو دور کرنے اور ان کے متعلق سمجھوتہ پر پہنچنے کی کوشش کی جائے۔ مذہبی امور زیر بحث لانا، جیسا کہ پہلے ہوتا رہا ہے بالکل بے سود ہو گا۔ اور نہ تنہا مذہبی معاملات کے متعلق اتفاق تمام اختلافات کو مٹا سکتا ہے۔

کمیشن کے مقاطعہ یعنی بائیکاٹ کے بارے میں رائے محفوظ رکھی۔ مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کو غور و فکر کے بعد فیصلہ کرنا چاہئیے۔[1]

---

[1] انقلاب ۱۲؍ نومبر ۱۹۲۷ء؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۵۱-۴۹

۱۳ر نومبر کو صوبائی مسلم لیگ کا اجلاس میاں سر محمد شفیع کے مکان پر ہوا۔ انہی نے صدارت کی۔ قرارداد پیش کی کہ موجودہ حالات میں کمیشن سے تعاون نہ کرنا ملک کے لیے بالعموم اور مسلمانوں کے لیے بالخصوص نقصان دہ ہے۔ ملک برکت علی کی ایک ترمیم مسترد ہوئی۔ قرارداد منظور ہوئی۔ علامہ نے قرارداد کو پنجاب کے مسلمانوں کے احساسات کا آئینہ قرار دیا۔ دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کو مشورہ دیا کہ وہ بھی صاف گوئی سے کام لیں۔ ملک میں اُن کی قسمتوں کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ ''اپنی اپنی تہذیبوں کے مطابق نشوو ارتقا'' کا مقصد حاصل ہونا چاہیے ''خواہ مغرب کے دستوری اصول سے حاصل ہو یا کسی دوسرے ایسے ذریعہ سے جو وقت کے مطابق ہو اور لوگوں کی ضروریات پوری کرے۔''[1]

۱۴ر نومبر کو دہلی میں عبدالرشید کو پھانسی دے دی گئی۔ سوامی شردھانند کے قتل کا الزام تھا۔ مسلمان بڑی تعداد میں جنازے میں شامل ہوئے۔ پینتالیس ہندو زخمی ہوئے۔[2]

اُس روز یوسف سلیم چشتی علامہ کے پاس آئے۔ بازار سے زبورِ عجم لائے تھے۔ درخواست کی کہ علامہ اپنے قلم سے اس پر کوئی شعر لکھ دیں جو اُن کی پوری زندگی اور تیس سالہ شاعری پر حاوی ہو۔ علامہ نے لکھا کہ وصل سے شوق مر جاتا ہے۔ اَدھ جلے رہنا ہی ہمیشہ کی زندگی ہے:

تُو ندانی ہنوز شوق بمیرد زوصل   چیست حیاتِ دوام؟ سوختنِ ناتمام[3]

۲۰ر نومبر کو آل انڈیا مسلم لیگ کونسل نے فیصلہ کیا کہ سالانہ اجلاس لاہور میں ہو۔ میاں سر محمد شفیع صدارت کریں۔ انہوں نے قبول کر لیا۔ لیگ کے سکرٹری ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے احتجاج کیا۔ زبانی استعفیٰ دے دیا۔ علامہ اقبال اور ملک فیروز خاں نون نے درخواست کی کہ مزید غور کریں۔[4]

پنجاب کی صوبائی کونسل کے موسمِ سرما کے اجلاس کی نشستیں لاہور میں ۲۱، ۲۳، ۲۴ اور ۲۵

---

[1] انقلاب ۱۸ر نومبر ۱۹۲۷ء؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۵۱-۴۹

[2] Mitra *The Indian Quarterly Register July-Dec.1927,* p.14

[3] فقیر سید وحید الدین (۱۹۸۸) روزگارِ فقیر اول، ص ۱۸۵

[4] علامہ اقبال کا بیان ۱۴ دسمبر؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۶۰-۵۷

نومبر کو ہوئیں۔[1]

۲۴/ نومبر کو لاہور ہائی کورٹ نے کسی نور الٰہی اور مقبول الٰہی کی اپیل خارج کر دی۔ علامہ پیروی کر رہے تھے۔ اپیل آر جے وڈ اینڈ کمپنی کے خلاف تھی۔ اُن کا دفاع راج نارائن اور مہر چند کر رہے تھے۔ سماعت جسٹس براڈوے اور جسٹس جے لال نے کی تھی۔[2]

19

میاں شفیع سے بعض لوگوں نے کہا کہ لیگ کے آیندہ اجلاس کی صدارت کے لیے اُن کی بجائے سر آغا خاں زیادہ موزوں رہیں گے۔ میاں شفیع مان گئے مگر اِس شرط کے ساتھ کہ سر آغا خاں جداگانہ انتخاب کی حمایت کریں۔[3] پھر ڈاکٹر سیف الدین کچلو کی طرف سے اطلاع موصول ہوئی کہ کونسل کا ایک اور اجلاس ۱۱/ دسمبر کو دہلی میں منعقد کیا جا رہا ہے۔ سالانہ جلسے کی صدارت پر دوبارہ غور کیا جائے گا۔ مدراس کے تین حضرات اور بنگال کے دو حضرات نے تجویز پیش کی تھی۔ ڈاکٹر کچلو سے ان حضرات کے خطوط مانگے گئے۔ امرتسر میں رہ گئے تھے۔ ڈاکٹر کچلو نے کہا کہ بعض لوگ جناح کے پاس بھی گئے تھے۔ یہ معلوم نہ ہوا کہ کون تھے اور کتنے تھے۔

علامہ کے نزدیک سب سے تکلیف دہ بات یہ تھی کہ اجتماع کے اصول کی نفی ہو رہی تھی۔ لیگ کے آئین کے مطابق سکرٹری کونسل کا اجلاس بلوا سکتا تھا مگر کبھی کسی سکرٹری نے یہ نہیں کیا تھا کہ کونسل کے فیصلے سے ذاتی اختلاف ہو تو دوسرا اجلاس بلوا لے۔[4]

20

۲۷/ نومبر کو لندن کے دارُ الاُمرا (House of Lords) میں لارڈ برکن نے کہا کہ ہندوستان میں

---

[1] Mitra *The Indian Quarterly Register July-Dec.1927,* pp.295

[2] ظفر علی راجا ایڈووکیٹ (۲۰۱۳) قانون دان اقبال، ص ۱۲۶

[3] علامہ اقبال کا بیان ۱۴ دسمبر؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۶۰-۵۷

[4] علامہ اقبال کا بیان ۱۴ دسمبر؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۶۰-۵۷

فرقوں کے اختلاف کی وجہ سے رائل کمیشن میں ہندوستانی شامل نہ کیا جاسکا۔ اگر ہندوستانی چاہیں تو کوئی آئین بنا کر پیش کر سکتے ہیں۔ ٹائمز لندن میں سید امیر علی کا اِسی قسم کا مضمون بھی شائع ہوا۔[1]

جوہؔر نے میاں شفیع اور علامہ کو چیلنج کیا۔ پنجاب میں کہیں بھی اُن کے مقابلے پر تقریر کر کے دیکھ لیں۔ ظاہر ہو جائے گا کہ مسلمانوں کی رائے عامہ کمیشن کے خلاف ہے۔ سالک نے 'افکار و حوادث' میں لکھا کہ کل مولانا کے بھائی شوکت علی چیلنج دیں گے، "اگر سر محمد شفیع اور سر محمد اقبال کو اپنی طاقت پر غرہ ہو تو آئیں اور مجھ سے کُشتی لڑیں۔ اگر وہ چاروں شانے چت گریں تو کمیشن کا بائیکاٹ کیا جائے اور اگر میں لیٹ جاؤں تو مسلمانوں کو اختیار ہے کہ کمیشن سے تعاون کریں۔"[2]

امرتسر میں ندوۃ العلما کا اجلاس ہوا۔ ندوہ کے ناظم صفی الدولہ حسام الملک شمس العلما نواب سید علی حسن خان بہادر تھے۔ انقلاب کی طرف سے انہیں لاہور تشریف لانے کی دعوت دی گئی۔ ۲۸ر نومبر کو پہنچے۔ علامہ اقبال کے مہمان ہوئے۔ ان کے ساتھ معارف کے مہتمم مولانا مسعود علی ندوی اور بعض دوسرے احباب بھی تھے۔ وہ اور جگہوں پر ٹھہرے۔[3]

۲۹ر نومبر کو انقلاب کے دفتر میں کھانے کی دعوت تھی۔ علامہ اقبال اور اُن کے مہمان نواب صاحب وہاں پہنچے۔ مسعود علی ندوی، رسالہ تہذیب نسواں کے مہتمم سید حمید علی اور رجسٹرار حیدرآباد دکن مولوی عبدالحئی بھی شامل ہوئے۔ ساڑھے تین بجے سب کو مولوی ممتاز علی نے چائے کی دعوت دی۔ نواب صاحب اور ساتھی شام ساڑھے پانچ بجے کلکتہ میل سے لکھنؤ جا رہے تھے۔[4]

مئی میں لاہور میں جو فسادات ہوئے تھے، اُن میں ایک ہندو بھگتو پانڈی بھی قتل ہوا تھا۔ اُس کے قتل کا الزام دو مسلمانوں محمد حسین اور فقیر محمد پر تھا۔ سیشن جج مسٹر ٹیپ نے دونوں کو پھانسی کی سزا دی تھی۔ ۳۰ر نومبر کو ہائی کورٹ میں سزا کے خلاف اپیل کی سماعت ہوئی۔ مسٹر جسٹس

---

[1] محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۵۶-۵۳

[2] انقلاب ۲۹ر نومبر ۱۹۲۷ء؛ حمزہ فاروقی (۱۹۸۸) حیات اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۳۹۸

[3] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸) حیات اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۲۵۳، ۲۶۳ بحوالہ انقلاب یکم دسمبر ۱۹۲۷ء

[4] ایضاً، ص ۲۵۳، ۲۶۳ بحوالہ انقلاب یکم دسمبر ۱۹۲۷ء

کولڈ اسٹریم اور مسٹر جسٹس ایڈیسن نے سماعت کی۔ ملزموں کی طرف سے میاں سر محمد شفیع اور علامہ اقبال پیش ہوئے۔ استغاثہ کی پیروی لالہ سندر داس نے کی۔[1]

غریبوں کا دنیا میں اللہ والی

از حضرت علامہ اقبال مد ظلہ العالی

یہ مکتب یہ اسکول یہ پاٹھ شالے ‏ ‏ ‏ یہ تکیے یہ مندر یہ گرجے شوالے
یہ پنڈت یہ بنئے یہ مُلّا یہ لالے ‏ ‏ ‏ یہ سب پیٹ ہیں اور ہم تر نوالے
غریبوں کا دنیا میں اللہ والی

وطن کیا ہے اِک نوعِ سرمایہ داری ‏ ‏ ‏ بڑے سیٹھ ہیں قوم کے یہ بھکاری
وہ دیکھو چلی آ رہی ہے سواری ‏ ‏ ‏ نئے جال لائے پرانے شکاری
غریبوں کا دنیا میں اللہ والی[2]

نیرنگِ خیال کے دسمبر کے شمارے سالنامے ہوتے تھے۔ اس دفعہ والے کو علامہ نے "غالباً... اُردو رسائل میں سب سے اچھا" قرار دیا۔ "نیرنگِ خیال کے خاص نمبروں نے تمام اُردو رسائل کو اپنا معیار بلند کرنے پر مجبور کیا ہے،" انہوں نے لکھا، "بالخصوص اُن کے ظاہری محاسن میں اضافہ ہو رہا ہے۔ ملک کو حکیم [یوسف حسن] کی اِس مستعدی، بے دریغ زر افشانی اور ذوقِ سلیم کی قدر کرنی چاہئے۔"[3]

لارڈ برکن ہیڈ کے بیان کو ہندوستان کے اکثر رہنماؤں نے ایک چیلنج سمجھا۔ جوابی بیان شائع

---

[1] ایضاً، ص ۲۸۲ بحوالہ انقلاب ۲/ دسمبر ۱۹۲۷ء

[2] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸) حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۵۵، ۶۳؛ حاشیے میں درج ہے، "یہ نظم انقلاب سے قبل ماہنامہ نیرنگِ خیال لاہور میں شائع ہوئی۔" شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۵۲-۵۳ پر نقوش کے افسانہ نمبر (۱۹۶۸) میں محمد طفیل کے مضمون 'حکیم صاحب' سے حکیم یوسف کا بیان منقول ہے کہ علامہ نے نظم اُن کی فرمائش پر فی البدیہہ کہی۔ فٹ نوٹ میں ہے کہ نیرنگِ خیال میں ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی۔ انوارِ اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار ص ۳۱۰ کے مطابق نظم کشمیری میگزین بابت ۲۱ دسمبر ۱۹۲۷ء میں شائع ہوئی۔

[3] یہ رائے نیرنگِ خیال میں جنوری ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئی؛ شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۵۱

کروایا۔ ان میں محمد علی جناح بھی شامل تھے۔[1] کلکتہ کے سر عبدالرحیم کے خیال میں شاہی کمیشن کا مقاطعہ کافی نہ تھا۔ ہندوستان کی تمام جماعتیں آپس میں مل کر متبادل دستور بنائیں۔ اسے برطانوی پارلیمنٹ کے سامنے پیش کر دیں۔ اس مقصد کے لیے ہندوستانی جماعتوں کی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس تجویز کی۔ ہندو مہاسبھا کی طرف سے لاجپت رائے نے تائید کی مگر کہا کہ اختلافی مسائل اور فرقوں کے درمیان تصفیے کو حکومت پر چھوڑا جائے۔ باقی معاملات کے بارے میں اسکیم تیار کی جائے۔ پنڈت مالوی متفق تھے۔[2]

علامہ سمجھتے تھے کہ یہ "تخیل آرائی ناکام" ہو گی۔ لیگ، مہاسبھا اور کانگریس مشترکہ اعلان نہیں کر سکی ہیں۔ مختلف تجاویز ملک کے سامنے رکھی ہیں۔ ۸/ دسمبر کو نواب ذوالفقار، نواب سر عبدالقیوم خاں (صوبہ سرحد)، میاں عبدالحئی، سید راجن شاہ اور مولوی محمد علی (جماعتِ احمدیہ لاہور) کے ساتھ مشترکہ بیان شائع کروایا۔ موقف یہ تھا:

- لارڈ برکن ہیڈ کے بیان نے آنکھیں کھول دی ہیں۔ امیر علی نے بھی درست نقشہ کھینچا ہے۔
- جناح اور اُن کے ساتھیوں کا بیان حالات سے بے حسی ظاہر کرتا ہے۔ تائید کرنے والے بعض رہنما ایسے صوبوں سے تعلق رکھتے ہیں جہاں مسلمانوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر بھی نہیں۔ ان کا موقف عام مسلمانوں کا موقف قرار نہیں دیا جا سکتا۔
- جناح اور بعض دوسرے کہتے ہیں کہ خودداری رائل کمیشن کی تائید کی اجازت نہیں دیتی۔ عقل اور دلیل کے مطابق فرقہ وار جنگ اور خودداری یکجا قائم نہیں رکھی جا سکتیں۔
- ہندوؤں اور اقلیتوں کے درمیان مشترکہ لائحہ عمل کے لیے لازم ہے کہ پہلے فرقہ وارانہ اختلاف کا "فیاضانہ اور منصفانہ تصفیہ" ہو۔ لاجپت رائے اور مہاسبھا کی تجاویز مسلمانوں کا وقت برباد کرنے اور اُنہیں حقوق سے محروم رکھنے کے لیے ہیں۔ مسلمان کافی نقصان کے

---

[1] علامہ اقبال کا بیان ۸/ دسمبر ۱۹۲۷؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۵۶-۵۳

[2] ایضاً، ص ۵۳-۵۶

بعد ان چالوں سے واقف ہو گئے ہیں۔ اب صرف ہندوؤں کے اعمال ہی قائل کر سکتے ہیں۔ بلند بانگ دعوے کافی نہیں ہیں۔[1]

۱۱ر دسمبر کو دہلی میں حکیم اجمل خاں کے مکان پر لیگ کونسل کا اجلاس ہوا۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے ۲۰ر نومبر والے فیصلے کے خلاف بلوایا تھا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین (علی گڑھ)، مسٹر عبداللہ اور حسرتؔ موہانی کونسل کے عہدہ داروں کے رویے کو لیگ کے آئین کے خلاف قرار دے کر احتجاجاً نکل گئے۔ اُن کے بعد فیصلہ ہوا کہ لیگ کا سالانہ جلسہ کلکتہ میں ہو۔ مولوی محمد یعقوب صدارت کریں۔[2]

۱۴ر دسمبر کو علامہ اقبال نے ملک فیروز خاں نون کے ساتھ بیان جاری کیا۔ سالانہ جلسہ لاہور ہی میں ہو۔ جنوری کے آخری ہفتے میں یا ایسٹر کی تعطیلات میں ہو سکتا تھا:

> اب یہ دیکھنا جمہور کا کام ہے کہ آیا [ڈاکٹر کچلو] ایک فیصلہ کہ جسے وہ پسند نہیں کرتے تھے مسترد کرانے کے لیے دوسرے جلسہ کو مدعو کرنے میں حق بجانب تھے یا نہیں...
> کلکتہ میں اجلاس منعقد کرنے کے وجوہ... وہ نہیں جو ہمیں یا پبلک کو بتائے جا رہے ہیں۔
> اصل وجہ یہ ہے کہ کلکتہ میں مشترکہ حلقہ ہائے انتخاب کے متعلق ۲۰ر مارچ کی منظور کردہ تجاویز دہلی کو مسلمان قوم کے سر منڈھنے کا موقع لاہور کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے۔ کیونکہ مسلمانانِ پنجاب متفقہ طور پر جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کے حامی ہیں۔[3]

جناح کی طرف سے سخت جواب شائع ہوا۔ ۱۹ر دسمبر کو علامہ اقبال اور نواب سر ذوالفقار علی خاں نے جواب الجواب جاری کیا:

> مسٹر جناح اپنے جوابی اعلان میں بعض نامعلوم وجوہ سے اُلٹا الزام دینے پر اُتر آئے ہیں۔ اور یہ کاروائی اُنہوں نے غالباً اِس لیے کی ہے کہ جس موجودہ سیاسی حالت پر ہم

---

[1] انقلاب ۸ر دسمبر ۱۹۲۷ء؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۵۶-۵۳

[2] علامہ اقبال کا بیان ۸ر دسمبر ۱۹۲۷ محولہ بالا

[3] انقلاب ۱۶ر دسمبر ۱۹۲۷ء؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۶۰-۵۷

نے زور دیا تھا اُس حقیقت پر پردہ ڈالنے کی کوشش کریں۔

موجودہ نازک وقت کا اہم مقصد تمام خیر خواہانِ ملک کے لیے ایک ہے، جو بڑی بے چینی سے محسوس کرتے ہیں کہ اُن کے ملک کی قسمت زندگی اور موت سے وابستہ ہے، لیکن بد قسمتی سے اِس ابتلا کے زمانہ میں ایسے آدمی ہندوؤں میں نہیں آئے جو پردہ اُٹھا کر اپنے ملک کے حقوق کا صحیح فیصلہ دیوتاؤں سے کرائیں۔ ہندوستان کی بد قسمتی سے بمبئی اور کلکتہ کے سرمایہ داروں کو انگلیوں پر نچانے کا موقع مل گیا ہے۔

ہم نے پہلے بھی وضاحت کر دی ہے کہ مختلف اقوام باہمی خونریزی کے ہولناک مظاہروں میں مصروف ہیں جس سے ہندوستان کی خودداری خاک میں مل گئی ہے۔ مسٹر جناح اور اُن کے رفقا نے بد قسمتی سے قومی زندگی کی ایسی حالت کا تصور کر رکھا ہے جو حقیقت میں مفقود ہے۔ ہاں ہم اِن حضرات سے پوچھتے ہیں کہ اِس قومی تضحیک کا اصلی ذمہ دار کون ہے؟ اِس میں کوئی شک نہیں کہ ابتدا مسلمانوں نے ہرگز نہیں کی۔ وہ ہندوؤں سے بمنت درخواست کرتے رہے ہیں کہ اقلیتوں کے جائز حقوق کے متعلق وہ اپنے غیر متبدل رویہ کو ترک کر دیں۔ مسٹر جناح کو بخوبی معلوم ہے کہ تقرر کمیشن کا اعلان ہونے سے بہت پہلے مسلمانوں نے متعدد مرتبہ اکثریت سے درخواست کی کہ باہمی اختلافات کا تصفیہ کرائیں۔ پھر مؤتمر اتحاد شملہ میں مسلمانوں نے ایک مرتبہ پھر اپنے شکوے کی آواز بلند کی۔ اور اب اس موقع پر پھر مسلمان ان کو صلح کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس تماشے میں مسٹر جناح چیف ایکٹر رہے ہیں۔ کیا وہ ہم کو بتلا سکتے ہیں کہ ان کو کبھی ہندوؤں کی جانب سے سوائے سخت ہٹ دھرمی کے اور کوئی جواب ملا؟ ہم اس بات کے قائل ہیں کہ مسلمان اور ہندو صرف اتفاق اور اتحاد سے ہندوستان میں مستحکم سیاسی سلسلہ قائم کر سکتے ہیں لیکن اکثریت کا خیال ہے کہ ہمارے اتحادِ عمل کے بغیر بھی وہ سوراج کی منزلِ مقصود پر پہنچ سکتے ہیں۔ اس خیال کی مزید تائید اس راز کے افشا ہونے سے ہو گئی ہے کہ ہندو رہنما برطانوی حزب العمال کے ساتھ خفیہ

سازشوں میں مصروف ہیں۔

... ہم اس بات کو نظر انداز نہیں کرسکتے کہ دولت، رسوخ، سیاسی قوت اور تعداد کے لحاظ سے ہم ہندوؤں کا مقابلہ نہیں کرسکتے۔ اس لیے جب تک ہم ہندوؤں اور انگریزی حکومت دونوں سے اپنے حقوق کا مطالبہ مستعدی اور سرگرمی سے نہ کریں، ہماری سیاسی موت مسلمہ امر ہے، جیسا کہ بعض مسلمان ہم سے کہتے ہیں کہ ہم اکثریت کی ہوائی فیاضی پر اعتماد نہیں کرسکتے۔

اب قیاسات اور جذبات کی گنجایش نہیں۔ ہمیں ٹھوس دلائل کی ضرورت ہے۔ مسٹر جناح اور ان کے دوست ہم کو اپنے مفاد کے لیے بھی مورد طعن و تشنیع بنائیں، ہم اس بات کو زمانۂ مستقبل پر چھوڑتے ہیں جو ہمارے اس استقلال کا انصاف کرے گا، جو ہم نے فرقہ وار مفاد کو مستحکم بنیاد پر رکھنے میں دکھلایا ہے۔[1]

حکیم محمد حسن قرشی دو تین مرتبہ علامہ سے مل چکے تھے۔ وسط دسمبر میں اپنے دوست حکیم جلال الدین کے ساتھ شام کے وقت آئے۔ اُن کا کہنا ہے کہ علامہ نے کہا کہ ہندو کسی سمجھوتے پر رضامند نہ ہوں گے۔ اگر مسلم رہنما اُن کے تمام مطالبات تسلیم کرلیں تب بھی ہندو انحراف کی کوئی صورت نکال لیں گے۔ ہندو انگریز کو ہندوستان سے نکالنا نہیں چاہتے۔ صرف داخلی آزادی حاصل کر کے مسلمانوں اور دوسری اقوام پر حکومت کرنا چاہتے ہیں۔ جگہ جگہ فسادات ہوا دے رہے ہیں۔ مقصد یہی ہے کہ جو بزدلی اور احساسِ کمتری ہندوؤں میں پایا جاتا ہے، اُسے دُور کیا جائے۔[2]

---

[1] انقلاب ۲۱/ دسمبر ۱۹۲۷ء؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۶۴-۶۱

[2] ایشیا ۲۴/ اپریل ۱۹۶۱ء میں قرشی کا مضمون؛ شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۱۰۳-۹۹۔ قرشی کی تحریر میں کچھ غلطیاں اور ابہام ہیں، مثلاً مسلم رہنماؤں کی مارچ ۱۹۲۷ء والی تجاویزِ دہلی کو جناح کے چودہ نکات لکھا ہے (چودہ نکات بعد میں مارچ ۱۹۲۹ء میں پیش کیے گئے)۔ مسلم لیگ کا شفیع گروپ جو دسمبر ۱۹۲۷ء میں وجود میں آیا، اُسے قرشی "انگریزوں کے بعض وفاکیش اصحاب" کی تخلیق قرار دیتے ہیں اور مقصد بیان کرتے ہیں کہ "چہل سالہ شرابِ اطاعت جامِ وفاداری میں بھر کر قوم کو پلائیں اور سائمن کمیشن کے استقبال کے لیے مسلمانوں کے دیدہ و دل کو فرشِ راہ بنائیں۔" اِس کا ذکر

معلوم ہوتا ہے کہ کسی رسالے فردوس میں علامہ کے کچھ اشعار شائع ہوئے۔ ۲۰/ دسمبر کے انقلاب میں 'پیامِ سروش' کے عنوان سے دوبارہ شائع کیے۔

تمدن، تصوّف، شریعت، کلام بتانِ عجم کے پجاری تمام
طلسمِ معانی، بیانِ خطیب مگر لذّتِ شوق سے بے نصیب
حقیقت روایات میں کھو گئی یہ اُمت خرافات میں کھو گئی
بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

بعد میں کبھی دوسرے اور تیسرے اشعار میں ترمیم ہوئی:

لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب مگر لذّتِ شوق سے بے نصیب
حقیقت خرافات میں کھو گئی یہ اُمت روایات میں کھو گئی[1]

21

۱۹/ دسمبر کو گورکھپور جیل میں رام پرشاد بسمل کو پھانسی دی گئی۔ ڈکیتی کیس کے دوسرے مجرموں میں سے اشفاق اللہ خاں کو فیض آباد جیل میں اور روشن سنگھ کو نینی الہ آباد جیل میں پھانسی ہوئی۔ لہری کو دو روز قبل گونڈا جیل میں پھانسی دی جاچکی تھی۔

22

رام بابو سکسینہ انڈین سول سروس سے تعلق رکھتے تھے۔ اس برس انگریزی میں اُن کی تاریخ ادبِ اردو (*History of Urdu Literature*) شائع ہوئی۔ سر تیج بہادر سپرو نے پیش لفظ لکھا۔ مصنف نے تمہید میں کہا کہ کتاب کا مقصد قدیم زمانے سے آج تک اُردو ادب کی ترقی کا خاکہ فراہم کرنا اور مشہور

نہیں کرتے کہ اس گروپ کی تخلیق اور سائمن کمیشن سے تعاون کی تحریک میں علامہ اقبال پیش پیش تھے، جنہیں وہ خود ہی ایسی ذہنیت سے بالکل آزاد دکھاتے ہیں۔

[1] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸) حیات اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۵۵

مصنفین کا تذکرہ کرنا ہے۔ "جدید شعرا" شامل نہیں کیے گئے۔ اُن کے بارے میں مصنف کی علیحدہ تصنیف شائع ہو رہی تھی۔ صرف تینجگہ اقبال کا نام آیا اور وہ بھی دوسرے شعرا کے ساتھ برسبیلِ تذکرہ۔ سکسینہ نے لکھا کہ بعض مصنفین شدت سے قدامت پسند ہیں اور بعض مغرب کی اندھی تقلید پر مصر ہیں۔ مستقبل کا انحصار اُن پر ہے جو قدیم اور جدید کو ساتھ لے کر چلتے ہیں۔ ان میں آزاد، حالی، سرور، اقبال، اثر اور افسر، حسرت اور اکبر، سرشار اور شرر شامل ہیں۔[1]

اس برس شائع ہونے والی کتابیں جو کبھی اقبال کے ذخیرۂ کتب میں شامل ہوئیں یہ ہیں:

Burnett Hillman Streeter. Reality - A New Co-Relation of Science to Religion. Macmillan, London

Joseph Marechal (translated by Algar Thorold). Studies in the Psyhology of the Mystics. Burns Oates, London

Paul Carus (edited by C. Cooh). The Point of View: an Anthology of Religion and Philosophy Selected from the Works of Paul Carus. Open Court Publishing Co., Chicago

Mohammad Marmaduke Pickthall. The Cultural Side of Islam - a lecture delivered at Madras in January 1927. Hoe & Co., Madras

H. Douglas Authony. Relativity and Religion. University of London, London

سیل جوزیف (مترجم سید نذیر نیازی)۔ عربوں کا تمدن۔ جامعہ اسلامیہ، دہلی[2]

23

۲۶، ۲۷/ اور ۲۸/ دسمبر کو مدراس میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کا بیالیسویں اجلاس ہوا۔ ڈاکٹر انصاری صدارت کر رہے تھے۔ حکومت نے برما کو ہندوستان سے علیحدہ کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ اُس کے خلاف قرارداد منظور کی گئی۔ پنڈت موتی لال نہرو کے فرزند جواہر لال نہرو نے سوراج کے حق میں قرارداد پیش کی۔ متفقہ طور پر منظور ہوئی۔ درجۂ استعمرات (Dominion Status) کی بجائے کامل آزادی یعنی "سوراج" ہندوستان کا نصب العین قرار پایا۔ رائل کمیشن کے بائیکاٹ کا فیصلہ ہوا۔

مسلم رہنماؤں کی "دہلی تجاویز" کی بنیاد پر سروجنی نائیڈو نے "قراردادِ اتحاد" (Unity

---

1 *Saksena (1940)* A History of Urdu Literature, pp.i-iv, 19, 190, 210

2 Muhammad Siddique, *Descriptive Catalogue*

(Resolution)پیش کی۔ دہلی تجاویز شامل تھیں۔ مذہبی رواداری کے لیے دو نکات کا اضافہ کیا۔

The Unity Resolution

Part A. Political Rights

This Congress resolves:

1. That in any future scheme of constitution, so far as representation in the various legislatures is concerned, joint electorates in all the provinces and in the Central Legislature be constituted;
2. That, with a view to give full assurances to the two great communities that their legitimate interests will be safe-guarded in the Legislatures such representation of the communities should be secured for the present, and if desired, by the reservation of seats in joint electorates on the basis of population in every province and in the Central Legislature.

   Provided that reciprocal concessions in favour of minorities may be made by mutual agreement so as to give them representation in excess of the proportion of the number of seats to which they would be entitled on the population basis in any province or provinces shall be maintained in the representation of the two communities in the Central Legislature from the provinces.

   In the decision of the reservation of seats for the Punjab, the question of the representation of Sikhs as an important minority will be given full consideration;
3. (a) That the proposals made by the Muslim leaders that reforms should be introduced in the N. W. F. Province and British Baluchistan on the same footing as in other provinces is, in the opinion of the Congress a fair and resonable one, and should be given effect to, care being taken that simultaneously with other measures of administrative reform an adequate system of judicial administration shall be introduced in the said provinces;

   (b) (i) That with regard to the proposal that Sind should be constituted into a separate province, this Congress is of the opinion that the time has come for the redistribution of provinces on a linguistic basis - a principles that has been adopted in the constitution of the Congress;

   (ii) This Congress is also of opinion that such readjustment of provinces which demands such reconstitution on linguistic basis be dealt with accordingly;

   (iii) This Congress is further of opinion that a beginning may be made by constituting Andhra, Utkal, Sindh and Karnatak into separate provinces;

4. That, in the future Constitution, liberty of conscience shall be guaranteed and no legislature, Central or Provincial, shall have power to make any laws interfering with liberty of conscience;

   "Liberty of Conscience" means liberty of belief and worship, freedom of religious observances and association and freedom to carry on religious education and propaganda with due regard to the feelings of others and without interfering with similar rights of others;
5. That no bill, resolution, motion or amendment regarding intercommunal matters shall be moved, discussed or passed in any legislature, Central of Provincial, if a three-fourths majority of the members of either community affected thereby in that legislature oppose the introduction, discussion or passing of such bill, resolution, motion or amendment.

   "Inter-communal matters" means matters agreed upon as such by a Joint Standing Committee of both communities - of the Hindu and Moslem members of the legisl;ature concerned appointed at the commencement of every session of the legislature.

Part A. Political Rights

This Congress resolves that:

1. Without prejudice to the rights that Hindus and Mussalmans claim, the one to play music and conduct processions wherever they please and the other to slaughter cows for sacrifice or food wherever they please, the Mussalmans appeal to the Mussalmans to spare Hindu feelings as much as possible in the matter of the cow and the Hindus appeal to the Hindus to spare Mussalman feelings as much as possible in the matter of music before mosques.
2. This Congress further resolves that every individual or group is at liberty to convert or reconvert another by argument or persuasion but no individual or group shall attempt to do so, or prevent its being done by force, fraud or other unfair means such as the offering of material inducement. Persons under eighteen years of age should not be converted unless it be along with their parents or guardians. If any person under eighteen years of age is found stranded without his parents or guardian by parents of another faith he should be promptly handed over to persons of his own faith. There must be no secrecy as to the person, place, time and manner about any conversion or re-conversion, nor should there be any demonstration of jubilation in support of any conversion or re-conversion.

   Whenever any complaint is made in respect of any conversion or re-conversion, that it was effected in secrecy or by force, fraud or other unfair means, or whenever any person under

> eighteen years of age is converted, the matter shall be enquired into and decided by arbitrators who shall be appointed by the Working Committee either by name or under general regulations.

سروجنی نے قرارداد کی وضاحت کی۔ دہلی مسلم تجاویز کو سراہا۔ ابوالکلام آزادؔ نے تائید کی اور کہا کہ گاندھی جی بھی حامی ہیں۔ یو پی سے گووِند بلبھ پنت نے کہا کہ جئیکار اور کیلکر بھی منظور کر چکے ہیں۔ دونوں ہندو مہاسبھا کے سابق صدر ہیں۔ پنجاب سے سردار سردل سنگھ کویشر، بنگال سے جی ایم سین گپتا اور سندھ سے مسٹر سدھوا نے حمایت کی۔ کانگریس کے سابقہ صدور پنڈت مدن موہن مالوی، سری نواس آینگر اور جوہرؔ نے حمایت کی۔ آینگر نے کہا کہ یہ قرارداد ہی وہ بنیاد ہے جس پر سوراج کی عمارت تعمیر ہو سکتی ہے۔ اِس کے بغیر سوراج کی بات بھی نہیں کی جا سکتی۔ لارڈ برکن ہیڈ کے چیلنج کا اصل جواب سائمن کمیشن کا بائیکاٹ نہیں۔ سوراج کی قراداد بھی نہیں۔ قراردادِ اتحاد کا متفقہ منظور ہونا ہے۔ ''آج برطانوی ہند کا وجود ختم ہو گیا،'' آینگر نے کہا، ''آج سے ہمیں صرف دولت ہائے متحدہ ہندوستان اور وفاقی ہندوستان کے بارے میں سوچنا ہے۔''

گوری شنکر مسرا نے ترمیم پیش کی مگر واپس لے لی۔ بہار سے بابو جگت نرائن لال اور یو پی سے مسٹر پانڈے نے قرارداد کی شدید مخالفت کی۔ ووٹ لیے گئے تو قرارداد متفقہ طور پر منظور ہوئی۔ پنڈال اللہ اکبر، بندے ماترم اور گاندھی جی کی جے کے نعروں سے گونجنے لگا۔ صدرِ جلسہ ڈاکٹر انصاری نے کہا، ''آج آپ نے آزاد ہندوستان کی صرف بنیاد ہی نہیں رکھی۔ بلکہ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ آپ اسے حاصل کر رہے ہیں۔''[1]

اگلے روز ۲۹ ر دسمبر کو بمبئی میں نیشنل لبرل فیڈریشن (''لبرل پارٹی'') نے تجاویزِ دہلی کے حق میں قرارداد منظور کی۔ تائید کرنے والوں میں ہندو سبھا کے صدر آر ایچ کیلکر شامل تھے۔ اسے سب سے اہم قرارداد (resolution of the resolutions) قرار دیا۔ مسلم رہنماؤں کی تعریف کی جنہوں نے یہ تجاویز پیش کی تھیں۔ اگر ملک یہ قرارداد منظور کر لے تو حکومتِ خوداختیاری حاصل

---

[1] *Report of the Forty-Second Indian National Congress held at Madras 1927.* Published by the Reception Committeee the Forty-Second Indian Natiopnal Congress, Madras

کرنے میں زیادہ وقت نہ لگے گا۔ کمیشن کے مقاطعہ کی قرارداد بھی منظور ہوئی۔[1]

اُس روز لاہور میں موچی دروازے کے باہر باغ میں جلسہ ہوا۔ مولوی فضل دین نے صدارت کی۔ علامہ نے بھی تقریر کی۔ اکثریتی فرقے کے طرزِ عمل نے مسلمانوں کو سوراج کی طرف سے بددل کر دیا ہے۔ اب صرف اپنے ملّی حقوق کے لیے فکر مند ہیں جن پر اُن کی ترقی کا انحصار ہے۔[2]

۳۰ دسمبر کی شام کلکتہ کے ٹاؤن ہال میں آل انڈیا مسلم لیگ کا اُنیسواں اجلاس شروع ہوا۔ استقبالیہ کمیٹی کے چیرمین مجیب الرحمٰن تھے۔ محمد علی جناح، علی برادران، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، ڈاکٹر انصاری وغیرہ موجود تھے۔ پنجاب سے بھی رہنما آئے تھے۔ ان میں ملک برکت علی اور مولانا ظفر علی خاں نمایاں تھے۔ غیر مسلم مہمانوں میں سروجنی نائیڈو اور اینی بیسنٹ شامل تھیں۔۔ مولوی محمد یعقوب صدارت کر رہے تھے۔ خطبۂ صدارت تیار کر کے نہیں لائے تھے۔ اُردو میں فی البدیہہ تقریر کی۔

۳۱ دسمبر کی صبح دوسری نشست ہوئی۔ حکیم اجمل خاں اور سید آلِ نبی کے انتقال پر تعزیتی قراردادیں پیش کی گئیں۔ سر علی امام نے سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کی قرارداد پیش کی:

> The All-India Muslim emphatically declares that the Statutory Commission and the procedure, as announced, are unacceptable to the people of India. It therefore resolves that the Musalmans throughout the country should have nothing to do with the Commission at any stage or in any form.

یعقوب حسن، جوہرؔ، ملک برکت علی، چھاگلہ، شمس الدین احمد اور مولانا ظفر علی خاں نے تائید میں تقریریں کیں۔ تمیز الدین خاں نے مخالفت کی۔ اینی بیسنٹ نے تائید میں تقریر کی۔ صرف دو ووٹ قرارداد کے خلاف نکلے۔ بھاری اکثریت کے ساتھ منظور ہوئی۔

ملک برکت علی نے قرارداد پیش کی۔ دہلی مسلم تجاویز پر مشتمل تھی۔ لیگ کی سب کمیٹی تشکیل

---

[1] Report of the Tenth Annual Session of the National Liberal Federation 1927

[2] انقلاب یکم جنوری ۱۹۲۸ء محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۶۴

دی جائے۔ نیشنل کنونشن میں حصہ لے جسے کانگریس مارچ میں منعقد کر رہی ہے۔ لیگ کی سب کمیٹی کی بنیاد دہلی تجاویز ہوں۔ مولانا شوکت علی، واحد حسین، نور الحق، اکرم خاں، مولانا ابوالکلام آزاد اور جناح نے حمایت میں تقاریر کیں۔ اینی بیسنٹ، سروجنی نائیڈو اور برطانوی لیبر پارٹی کے نمایندے میجر گراہم پول نے بھی مہمانوں کے طور پر حمایت کی۔ مولانا ظفر علی خاں نے ترمیم پیش کی کہ انتخاب بالغ رائے دہی کی بنیاد پر ہوں۔ عزیز الحق نے کہا کہ گفتگو ایک ماہ کے لیے موخر کر دی جائے۔ آخر دونوں نے ترامیم واپس لے لیں۔ قرارداد پر ووٹ لیے گئے۔ اتفاقِ رائے کے ساتھ منظور ہوئی۔

اُسی صبح ۱۱ بجکر ۲۵ منٹ پر لاہور میں اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں بھی آل انڈیا مسلم لیگ کے اُنیسویں اجلاس کا آغاز ہوا۔ اس کی صدارت سر محمد شفیع کر رہے تھے۔ استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین نواب سر ذوالفقار علی خاں تھے۔ علامہ اقبال بھی موجود تھے۔ شفیع نے خطبۂ صدارت میں کہا کہ لیگ کونسل کے ۲۰ نومبر اور ۱۱ دسمبر کے اجلاسوں میں دونوں دفعہ انہی کو صدر منتخب کیا گیا تھا۔ لیگ کے صدر کی حیثیت میں وہ لیگ کے اُس اجلاس کو غیر قانونی قرار دیتے ہیں جو کلکتہ میں مولوی محمد یعقوب کی صدارت میں ہو رہا ہے۔

سہ پہر ساڑھے تین بجے اجلاس کی دوسری نشست کا آغاز ہوا۔ اب خلافت کمیٹی کے نمایندے خاصی تعداد میں موجود تھے۔ چودھری افضل حق اور ڈاکٹر محمد عالم کے ہمراہ تھے۔ غزنوی نے پہلی قرارداد پیش کی۔ غیر مسلم ملتوں کے رہنماؤں کو دعوت دی جا رہی تھی کہ مسلمانوں کے ساتھ کسی سمجھوتے پر پہنچ جائیں۔ اس کے بعد متفقہ مطالبات رائل کمیشن کے سامنے پیش کیے جائیں۔

قرارداد کی وضاحت میں تقریر کرتے ہوئے غزنوی نے کہا کہ کمیشن کا بائیکاٹ نہیں کرنا چاہیے۔ افضل حق اور راجہ غضنفر علی نے اعتراض اٹھایا کہ یہ تقریر قرارداد سے متعلق نہیں ہے۔ سر محمد شفیع نے غزنوی کو تقریر جاری رکھنے کی اجازت دے دی۔ کچھ دیر بعد اورنگزیب خاں نے سوال اٹھایا کہ تقریر کون سے قرارداد کے بارے کی جا رہی ہے۔ مولانا اختر علی خاں نے بھی صدر سے پوچھا کہ کیا تقریر کے لیے کوئی دورانیہ بھی مقرر ہے۔

حسرت موہانی نے قرارداد کی تائید میں تقریر کی۔ چودھری افضل حق تقریر کے لیے اٹھے۔

اُن کے حامیوں نے اللہ اکبر کے نعرے لگائے۔ افضل نے کہا کہ دوسری ملتوں کے ساتھ تعاون کرنا ہے تو کمیشن کا تذکرہ قرارداد میں لانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس پر خلافتیوں نے فلک شگاف نعرے لگائے۔ نشست قابو سے باہر ہو گئی۔ خلافت کمیٹی کے ڈاکٹر محمد عالم اور ملک لکشن ڈائس پر آئے۔ حاضرین سے اپیل کی۔ اس کے بعد افضل کمیشن سے تعاون کے خلاف تقریر کرتے رہے۔ قرارداد میں ترمیم پیش کرنا چاہی۔ مقررہ دورانیے سے زیادہ تقریر کر چکے تھے۔ صدر نے اجازت نہ دی۔

مسعود الحسن نے قرارداد کے حق میں تقریر کی۔ ڈاکٹر محمد عالم نے ترمیم پیش کی۔ قرارداد میں سے کمیشن کے ساتھ تعاون کرنے کا تذکرہ نکال دیا جائے۔ میاں شاہنواز نے قرارداد کی تائید کی۔ راجہ غضنفر علی نے ترمیم کی حمایت کی۔ اورنگزیب خاں، انیس احمد اور علی بہادر خاں نے کمیشن سے تعاون کرنے کو مسلمانوں کے حق میں بہتر قرار دیا۔ مظہر علی اظہر نے ترمیم کی حمایت کی۔ ظفر اللہ خاں نے کمیشن سے تعاون کرنے کو بہتر بتایا۔ شیخ حسام الدین نے ترمیم کی حمایت کی۔

ڈاکٹر عالم نے بحث کے خاتمے کا اعلان چاہا۔ میاں شفیع نے قبول کیا۔ خود بھی کچھ کہنا شروع کیا۔ کمیشن سے دُور رہنے کا فیصلہ در حقیقت مسلمانوں کا اپنے خلاف فیصلہ ہو گا۔ چودھری افضل حق نے سوال اٹھایا کہ کیا صدر بھی قرارداد پر بات کرنے کا مجاز ہے۔ ڈاکٹر عالم نے بھی اعتراض کیا۔ میاں شفیع نے کہا کہ وہ مجاز ہیں۔

ڈاکٹر عالم نے اپنی ترمیم پر ووٹ لیے۔ زیادہ تر لوگ اس کے خلاف معلوم ہوئے۔ صدر نے اعلان کیا کہ ترمیم مسترد ہو گئی ہے۔ ڈاکٹر عالم نے باقاعدہ گنتی کا مطالبہ کیا۔ بنگال، یوپی، بمبئی، دہلی اور صوبہ سرحد کے نمایندے ترمیم کے مخالف نکلے۔ پنجابی نمایندوں میں سے ۶۳ ترمیم کے حق میں تھے۔ ۱۰۱ مخالف تھے۔ ڈاکٹر عالم نے کہا کہ پنجاب کے ووٹ غلط گنے گئے ہیں۔ میاں شفیع نے دوبارہ گنتی سے انکار کر دیا۔ اعلان کیا کہ ترمیم مسترد ہو گئی ہے۔ قرارداد منظور ہو گئی ہے۔ حاضرین نے خوشی کا اظہار کیا۔ خلافتی ناراض ہو گئے۔ ڈاکٹر عالم کی قیادت میں وہ میاں شفیع اور منتظمین کے خلاف "شرم! شرم!" کے نعرے لگاتے ہوئے ہال سے نکل گئے۔

یامین خاں نے قرارداد پیش کی کہ دہلی مسلم تجاویز اور کانگریس کے مدراس کے اجلاس کی

قراردادِ اتحاد میں سے کوئی بھی مسلمانوں کو قبول نہیں ہے۔ متفقہ طور پر منظور ہوئی۔

میاں شفیع نے تین قراردادیں پیش کیں۔ صوبہ سرحد اور بلوچستان میں آئینی اصلاحات نافذ کی جائیں۔ سندھ کو بمبئی سے الگ کیا جائے۔ ستائس ارکان کی کمیٹی بنائی جائے۔ وہ دوسری جماعتوں کے ساتھ مشاورت کے بعد ہندوستان کے لیے آئین تجویز کرے۔ اس کی بنیاد وہ اصول ہوں جو اِس اجلاس میں طے پا رہے ہیں۔ باری باری تینوں قراردادیں متفقہ طور پر منظور ہوئیں۔

علامہ نے قرارداد پیش کی کہ موجودہ انتظام میں بنگال و پنجاب کے مسلمانوں کو مجلس وضع قوانین میں اکثریت سے محروم رکھا گیا ہے۔ یہ جمہوری اصول کے خلاف ہے۔ حکومت نے ۱۹۲۱ء میں مسلمانوں کے ساتھ جو بے انصافی کی تھی اسے دور کیا جائے۔ قرارداد متفقہ طور پر منظور ہوئی۔[1]

دوسرا حصہ

24

۱۹۲۸ء کا پہلا دن تھا۔ لاہور میں ساڑھے بارہ بجے اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی تیسری نشست کا آغاز ہوا۔ لیگ کے لیے نیا آئین وضع کرنے کی قراردادیں منظور ہوئیں۔ شیخ عبداللہ نے قرارداد پیش کی کہ میاں سر محمد شفیع کو لیگ کا صدر منتخب کیا جاتا ہے۔ علامہ اقبال جنرل سیکرٹری اور مولانا حسرت موہانی جوائنٹ سیکرٹری ہیں۔ غزنوی اور فتح محمد نے تائید کی۔ راجہ غضنفر علی نے مخالفت کی۔ کہا کہ محمد علی جناح لیگ کے صدر ہیں۔ میاں شفیع نے کرسیٔ صدارت سے جواب دیا کہ یہ درست نہیں۔ جناح کی صدارت کی میعاد جون ۱۹۲۷ء میں ختم ہو گئی تھی۔ شیخ محمد صادق نے قرارداد کی مخالفت کی۔ اس کے بعد ہال سے چلے گئے۔ نواب سر ذوالفقار علی خاں نے قرارداد کے اُس حصے پر ووٹ لیے جس کا تعلق میاں شفیع کی صدارت سے تھا۔ منظور ہوا۔ حاضرین نے خوشی کا اظہار کیا۔

---

[1] انقلاب ۳/ جنوری ۱۹۲۸ء؛ محمد رفیق افضل، ص ۶۵۔ نیز Pirzada, pp.107-.138

اُسی سہ پہر کلکتہ میں بھی لیگ کے اجلاس کی تیسری نشست ہوئی۔ مولوی یعقوب کی صدارت میں مولوی عبدالکریم نے قرارداد پیش کی کہ محمد علی جناح آیندہ تین برس کے لیے لیگ کے صدر منتخب کیے جاتے ہیں۔ مولوی سید ظہور احمد نے تائید کی۔ منظور ہوئی۔ لیگ کے آئین پر نظرِ ثانی کے لیے بھی قرارداد منظور ہوئی۔

عزیز الحق نے میاں شفیع اور اُن کے ساتھیوں کی مذمت میں قرارداد پیش کی۔ لیگ سے بغاوت کرنے اور ملّت کے اتحاد میں رخنہ ڈالنے کا قصوروار ٹھہرایا۔ مولوی غلام محی الدین نے تائید کی۔ قرارداد منظور ہوئی۔ ظفر علی خاں نے بھی قرارداد پیش کی۔ میاں شفیع کے گروپ کو پنجاب کی صوبائی لیگ کی حیثیت میں مرکزی قیادت کی نافرمانی کرنے پر خارج کر دیا جائے۔ پنجاب کے مسلمان لیگ کی نئی صوبائی شاخ قائم کریں۔ جوہرؔ نے تائید کی۔ قرارداد منظور ہوئی۔

پنڈت مدن موہن مالوی نے بھی خطاب کیا۔ جنگِ پلاسی کی یاد دلائی۔ ہندو مسلم اتحاد کا درس دیا۔ ہم ہندوستانی پہلے ہیں۔ اُس کے بعد ہندو یا مسلم ہیں۔ جناح نے کہا کہ یہ انگریز حکومت کے خلاف ایک آئینی جنگ کا اعلان ہے۔ پنڈت مالوی کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ کانگریس اور ہندو مہاسبھا نے جو دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے، اُسے قبول کرتے ہیں۔[1]

اب دو جماعتیں مسلم لیگ ہونے کی دعویدار تھیں۔ ایک دوسرے کو خلافِ آئین قرار دے رہی تھیں۔ عوام نے ایک جماعت کو کلکتہ گروپ یا جناح گروپ کہا۔ دوسری لاہور گروپ یا شفیع گروپ کہلانے لگی۔ جس جماعت نے اکیس برس پہلے سنی، شیعہ، اسماعیلی فرقوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کر کے اسلامی تاریخ کا حیرت انگیز معجزہ سرانجام دیا تھا، اب اُس کا اپنا اتحاد پارہ پارہ ہو چکا تھا۔

25

یکم جنوری ۱۹۲۸ء کے انقلاب میں نیاز فتحپوری کی کتاب صحابیات کا اشتہار چھپا۔ "یہ کتاب عہدِ حاضرہ کے ندرت طراز اور جذبات نگار انشا پرداز مولانا نیاز محمد خان نیاز فتحپوری کی تصنیف ہے،" اشتہار میں

---

[1] Pirzada, *Foundations of Pakistan*, pp.107-.138

لکھا تھا۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب ایم اے بیرسٹر ایٹ لا کی رائے بھی درج تھی، ''کتابِ صحابیات مصنفہ جناب نیاز فتحپوری نہایت عمدہ معلوم ہوتی ہے۔ مسلمان عورتیں بہت مستفید ہوں گی۔''[1]

انڈین پوسٹ آفس ایکٹ کی دفعہ ۶۴ کے تحت کسی کی طرف سے اجازت حاصل کیے بغیر وی پی پارسل بھیجنا جرم تھا۔ دارُ الفلاح دہلی کے مینجر سید طاہر حسین پر ماتحت عدالت میں اسی دفعہ کے تحت تین مقدمات قائم ہوئے۔ ہر مقدمے میں دو دو سو روپے جرمانہ کی سزا ہوئی۔ سزا کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل ہوئی۔ ۸؍ جنوری کو سماعت ہوئی۔ جسٹس ہنریس سماعت کر رہے تھے۔ علامہ اقبال ملزم کی پیروی کر رہے تھے۔ اپیل مسترد کر دی گئی۔[2]

جوہرؔ لاہور آئے۔ عبدالمجید سالک سے روایت ہے، ''مولانا عبدالقادر قصوری کی وساطت سے علامہ پر ڈورے ڈالنے شروع کیے۔ مقصود صرف یہ تھا کہ علامہ بھی سائمن کمیشن کے بائیکاٹ کے حامی بن جائیں۔ علامہ نے فرمایا کہ اگر کانگریس اور ہندو لیڈر مسلمانوں کے مطالبات کو تسلیم کر کے اُن سے سمجھوتا کر لیں تو میں کمیشن سے تعاون نہیں کروں گا بلکہ سر محمد شفیع کو بھی مقاطعے پر رضامند کر لوں گا۔''[3] اس میں کچھ اشکال ہے۔ جوہرؔ کے علامہ کے ساتھ اتنے قریبی تعلقات تھے کہ مولانا قصوری کی ''وساطت'' غیر ضروری محسوس ہوتی ہے۔ ''مجھے خواب کی طرح یاد ہے کہ ہمارے یہاں ایک مرتبہ ایک مہمان آکر ٹھہرے تھے،'' جاوید کا بیان ہے:

> میں نے اپنی زندگی میں پہلی بار اُنہیں ابا جان کو اقبال کہہ کر پکارتے سنا۔ یہ متناسب جسم، میانہ قد، باریش بزرگ نہایت خوش پوش، خوش باش اور خوش خور تھے۔ بمبئی سے آئے تھے اور مجھے چاکلیٹ کا ڈبہ تحفہ کے طور پر دیا تھا۔ آپ کے قہقہے سارے گھر میں گونجتے رہتے اور آپ کے لیے اماں جان روز طرح طرح کے کھانے پکاتیں۔ آپ کا

---

[1] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸) حیات اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۳۸۴ بحوالہ انقلاب ۲۹؍ فروری ۱۹۲۸ء

[2] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸)، حیات اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۲۷۸ بحوالہ انقلاب ۸؍ جنوری ۱۹۲۸ء

[3] عبدالمجید سالک، ذکرِ اقبال، ص ۱۳۹

نام مولانا محمد علی [جوہرؔ] تھا۔ یہ وہی محمد علی تھے جن کے متعلق اُس زمانے میں مجھے
ایک شعر حفظ ہو گیا تھا:

بولیں اماں محمد علی کی جان، بیٹا! خلافت پہ دے دو[1]

امر تسر سے رسالہ نور جہاں نکلتا تھا۔ بیگم عنایت اللہ خاں مدیر تھیں۔ علامہ اقبال کو موصول ہوا۔ رائے دینے کی فرمایش کی گئی تھی۔ ۲۰ / جنوری کو لکھا، "میں نے رسالہ نور جہاں کا نمبر جو آپ نے ارسال کیا تھا ابھی دیکھا ہے۔ آپ کی ایڈیٹر صاحبہ کی نظمیں میں نے دیکھی ہیں، بہت خوب ہیں۔ شعر و سخن کا ملکہ خداداد ہے۔"[2]

Emotion as the Basis of Civilization

John Hopkins Denison
[Excerpt]

The vast difficulty of creating any sense of unity or solidarity in such a group [i.e. composed of different nations with different traditions and outlooks] is apparent. All historians declare that the amazing success of Islam in dominating the world is the astounding coherence or sense of unity in the group, but they do not explain how this miracle was worked. There can be little doubt that the most effective means was prayer. The five daily prayers, when all the faithful, wherever they were, alone in the grim solitude of the desert or in the vast assemblies in a crowded city, knelt and prostrated themselves towards Mecca, uttering the same words of adoration for the one true God and of loyalty to His Prophet, produced an overwhelming effect even on the spectator and the psychological effect of thus fusing the minds of the worshippers in a common adoration and expression of loyalty is certainly stupendous. Muhammad was the first one to see the tremendous power of public prayer as a unification culture and there can be little doubt that the power of Islam is due in a large measure to the obedience of the faithful to this inviolable rule of the five prayers.

The giving of alms to the poor was also a means of developing the sense of brotherhood. So, likewise, was the pilgrimage to Mecca; the pilgrimage proved in the end a great aid in unification, for the men of

---

[1] جاوید اقبال (۱۹۹۶) مئے لالہ فام، ص ۳۳۰-۳۳۱

[2] مکتوب بنام بیگم عنایت اللہ خاں ۲۰ / جنوری ۱۹۲۸ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۹۰

every tribe and race met at Mecca with a common purpose and in a common worship and a feeling of brotherhood would not but be engendered in the process.[1]

26

تعزیراتِ ہند کی دفعہ ۱۵۳/ الف کے تحت مذہبی گروہوں کے درمیان تشدد کی ترغیب دینا جرم تھا۔ احمدی اخبار لائٹ میں گزشتہ برس ستمبر میں کچھ مضامین شائع ہوئے۔ ہندوؤں نے ان کے خلاف جلسہ کیا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ نے اخبار کے مدیر محمد یعقوب، ناشر چودھری رحمت خاں اور طابع میاں معراج دین کو قید کی سزا سنائی۔ ۶/ فروری کو سیشن جج مسٹر ٹیپ کی عدالت میں ملزموں کی طرف سے مرافعہ پیش ہوا۔ ان کی پیروی علامہ اقبال اور سر شیخ عبدالقادر کر رہے تھے۔ ''سر عبدالقادر نے اپنے دلائل پیش کرتے ہوئے کہا کہ مولوی محمد یعقوب مدیر نے کوئی جرم نہیں کیا،'' انقلاب نے لکھا۔ ''اُنہوں نے اپنے اخبار میں صرف ایسے مضمون لکھے جن سے وہ اہلِ اسلام کو یہ بتائیں کہ وہ اپنی جسمانی طاقت کو ترقی دیں اور جس طرح ہندو لیڈر ہندوؤں کو یہ سبق دیتے ہیں کہ تم اپنی طاقت بڑھاؤ اور لاٹھی اور گتکا چلانا سیکھو، اُسی طرح مولوی صاحب نے اپنی قوم کو تعلیم دی ہے۔''[2]

۸/ فروری کو علامہ نے پنجاب کونسل کے آیندہ اجلاس میں قرارداد پیش کرنے کا نوٹس دیا کہ پچھلے برس لاہور کے فسادات کے بلوؤں میں جن اشخاص کو سزائیں دی گئی ہیں اُنہیں رہا کر دیا جائے۔[3]

۲۰/ فروری کو لاہور میں پنجاب کونسل کے بجٹ اجلاس کا آغاز ہوا۔ دوسری نشست ۲۲/ فروری کو دوپہر دو بجے شروع ہوئی۔[4] تماشائیوں کی گیلریاں طبیبوں اور وید معالجوں سے بھری ہوئی تھیں۔ ملک فیروز خاں نون وزیر صیغۂ طب نے تقریر کی۔ ایک روایت ہے، ''دورانِ تقریر میں کہا کہ

---

[1] یہ اقتباس علامہ اقبال نے اپنے مضمون 'Corporeal Resurrection' مطبوعہ ستمبر ۱۹۳۲ء میں پیش کیا، دیکھیے Sherwani۔ نیز *Reconstruction* میں کتاب کا حوالہ دیا۔

[2] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸)، حیات اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۲۸۳ بحوالہ انقلاب ۹/ فروری ۱۹۲۸ء

[3] نقلاب ۹/ فروری ۱۹۲۸ء؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۱۰۳

[4] Mitra *The Indian Quarterly Register Jan.-June 1928,* p.328

کچھ مدت پیشتر مسٹر بیزلے سیکرٹری صیغہ ہائے متعلقہ (حکومت پنجاب) کے ہاتھ پر ایک پھوڑا نکل آیا تھا جس کے علاج سے ڈاکٹر لوگ عاجز آ گئے تھے۔ آخر کونسل کے صدر محترم چودھری شہاب الدین نے انارکلی کے ایک جراح سے مسٹر بیزلے کا تعارف کرایا جس کی دوا سے موصوف تندرست ہو گئے۔ علامہ اقبال نے اس موقع پر بتایا کہ وہ 'جراح' نہیں بلکہ میرے منشی طاہر الدین صاحب ہیں جن کی دوا دلروز ہر قسم کے پھوڑوں کے لیے مفید ہے۔"[1] نون نے کہا کہ حکومت نے مقامی اسلامیہ کالج، طبیہ کالج اور ڈی اے وی کالج کو نو ہزار روپے کی امداد دینے کا فیصلہ کیا ہے۔ اِس سے زیادہ امداد فضول خرچی ہو گی۔ چودھری افضل حق نے دیسی طب کے حق میں تقریر کی۔ حکیم اجمل خاں کی خدمات کا اعتراف کیا۔ لالہ سیوک رام نے تائید کی۔ سر عبدالقادر نے نون سے اختلاف کیا۔ دہلی کے طبیہ کالج کا تذکرہ کیا جس نے ترقی کی تھی۔ اگر حکومتِ پنجاب واقعی دیسی طریقِ علاج کو فروغ دینا چاہتی تھی تو زیادہ بڑی رقم کی منظوری لازمی تھی۔[2] علامہ نے افضل حق کی تائید میں مختصر تقریر کی:

۱ یہ تاثر عام ہو رہا ہے کہ چونکہ مغربی دواؤں کے ساتھ انگریزوں کے تجارتی مفادات وابستہ ہیں اِس لیے حکومت دانستہ طور پر طبِ یونانی (اسلامی طب) اور آیورویدک طریقِ علاج کو نقصان پہنچانے کی پالیسی پر عمل کر رہی ہے۔

۲ طبِ یونانی کو حقیر سمجھنا غلط ہے۔ بعض معاملات میں مغربی طب سے آگے ہے۔ مغربی طب ابھی اِس سے بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔

۳ طبِ یونانی اور آیورویدک طریقے سستے ہیں۔ ہندوستانی عوام کے مزاج کے مطابق ہیں۔

۴ بعض معاملات میں وقت کے تقاضوں سے پیچھے رہ گئے ہیں، مثلاً دوا کی تیاری کے لیے فرسودہ طریقے استعمال کرتے ہیں۔ ان معاملات میں ترقی دے کر حوصلہ افزائی کرنی چاہیے۔[3]

---

[1] انقلاب ۶/ فروری ۱۹۳۰ء میں یہ واقعہ کسی اور سلسلے میں شائع ہوا؛ محمد حنیف شاہد (۱۹۷۷)، ص ۱۴۷

[2] انقلاب ۲۴/ فروری ۱۹۲۸ء؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۱۰۴

[3] Latif Ahmad Sherwani (1944/1977), *Speeches, Writings and Statements of Iqbal*
حکیم محمد حسن قرشی، 'حکیمِ مشرق' ص ۲۸۰-۲۷۹ کے مطابق غالباً ۱۹۲۸ء میں علامہ نے پنجاب طبی کانفرنس کے ایک

چودھری چھوٹورام، سید محمد حسین اور رائے بہادر تن چند نے بھی افضل حق کی تائید کی۔[1]

27

برطانوی حکومت نے کہہ رکھا تھا کہ ہندوستان میں زمین ہمیشہ سے بادشاہ کی ملکیت ہوا کرتی تھی۔ اس لیے ایسٹ انڈیا کمپنی اور پھر تاجِ برطانیہ کی ملکیت سمجھی گئی۔ علامہ سمجھتے تھے کہ تاریخی طور پر یہ درست نہ تھا۔ غلط مفروضے کا نتیجہ بھی برا تھا۔ کوئی غریب زمیندار کسی زمین کے چھوٹے سے ٹکڑے پر فصل اُگائے جسے بیچ کر گھر والوں کا پیٹ مشکل سے بھر سکے تب بھی حکومت کو ٹیکس دے۔ یہ اس لیے کہ جس زمین سے فصل حاصل کی وہ اُس کی نہیں بلکہ حکومت کی ہے۔ اِس کے برعکس شہر میں ایک شخص کام کر کے روپیہ کمائے تو وہ اُسے اپنی محنت سے ملا۔ اگر دو ہزار سالانہ سے کم ہے تو انکم ٹیکس نہ دے۔ زیادہ کمائے تو زیادہ ٹیکس دے۔ لیکن وہ جاگیر دار جو زمین کے اِتنے بڑے حصے پر قبضہ کیے بیٹھا تھا کہ کئی غریب وہاں کام کرنے پر مجبور تھے، اُس کے لیے انگریز کا انصاف کہتا تھا کہ صرف اُسی شرح سے زمین کا لگان ادا کرے جس شرح سے ایک غریب زمیندار دیتا تھا۔

شہری اور دیہی معاشرہ تقسیم ہو کر رہ گیا تھا۔ دیہی علاقوں میں جاگیر داروں نے عملاً دیہاتیوں کو غلام بنالیا تھا۔ چھوٹے زمیندار کو ہندو ساہوکاروں سے سُود پر قرض لینا پڑتا تھا۔ کئی نسلیں مل کر بھی نہیں اُتار سکتی تھیں۔ علامہ سمجھتے تھے کہ زمین خدا کی ملکیت ہے۔ ہندوستان کے شاہی قبرستانوں میں بادشاہوں اور شہزادوں کی قبریں دیکھی ہوئی تھیں جن کے کتبوں پر تحریر تھا: الملک للہ۔

یورپ کے دیہات جنت کا نمونہ سمجھے جاتے تھے۔ ہندوستان کے گاؤں شیطان سے بدتر جاگیر داروں کی بدولت جہنم تھے۔ انگریزوں کی کارستانی تھی مگر ہندوستان پر ذمہ داری ڈالتے تھے کہ یہاں زمین ہمیشہ بادشاہ کی ملکیت سمجھی گئی۔ پچیس چھبیس برس پہلے وائسرائے لارڈ کرزن کے زمانے میں مالیات کے موجودہ قوانین وضع کرتے ہوئے اِس مفروضے کو زیادہ رواج دیا گیا۔ ۱۷۷۷ء میں

جلسے کی صدارت بھی کی۔

[1] انقلاب ۲۴ / فروری ۱۹۲۸ء؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۱۰۴

ایک فرانسیسی مصنف پیرون (Perron) بھی تردید کر چکا تھا۔ ۱۸۳۰ء میں ایک اور یورپی مصنف برگز (Briggs) نے تحقیق کر کے ہندوؤں کے مَنو شاستر، مسلمانوں کی شریعت اور ہندوستان کے مختلف علاقوں مثلاً بنگال، مالوہ اور پنجاب وغیرہ میں رائج طور طریقوں سے شواہد پیش کیے کہ ہندوستان کی تاریخ کے کسی دَور میں ریاست نے یہ دعویٰ نہ کیا کہ زمین اُس کی ملکیت ہے۔

کچھ عرصہ پہلے ٹیکسیشن کمیٹی (Taxation Committee) کو بھی رپورٹ میں اعتراف کرنا پڑا کہ زمین کے ریاست کی ملکیت ہونے کا نظریہ ہندوستانی تاریخ میں رائج نہ تھا۔ تب بھی ٹیکس کے نظام کی دھاندلی دُور نہ کی گئی۔ علامہ کے نزدیک وجہ یہ تھی کہ انگریزوں کے علاوہ ہندو ساہوکاروں کا مفاد بھی اِس ناانصافی سے وابستہ تھا۔ اسی لیے ہندوستان بالخصوص پنجاب میں عملاً خانہ جنگی شروع ہو چکی تھی۔ مسلمان اور ہندو ایک دوسرے کے مقابلے میں صفیں باندھ رہے تھے۔ صرف اَن پڑھ اور جاہل ہی ملوث نہ تھے۔[1]

۲۳ فروری کو دوپہر دو بجے پنجاب کونسل کی نشست شروع ہوئی۔ خان بہادر چودھری شہاب الدین صدارت کر رہے تھے۔ قرارداد پیش کی گئی کہ انکم ٹیکس کا اصول زمین کے لگان پر بھی عائد کیا جائے۔ وزیرِ مال (فنانس منسٹر) میاں فضلِ حسین نے مخالفت کی۔ سید محمد حسین، لالہ موہن لال، چودھری دُلی چند، مسٹر دین محمد، چودھری رام سنگھ، سر جیوفرے مونٹ مورنسی، چودھری افضل حق اور پنڈت نانک چند نے بھی تقاریر کیں۔[2] پھر علامہ نے کہا کہ چھوٹے کاشتکاروں کو مراعات ملنی چاہئیں جیسے شہر میں کم آمدنی والے افراد کے لیے انکم ٹیکس کی شرح بھی کم ہوتی ہے۔ بڑے جاگیرداروں پر زیادہ شرح سے ٹیکس لگنا چاہیے جس طرح شہر میں زیادہ آمدنی والے افراد کے لیے انکم ٹیکس کی شرح بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اور کچھ نہیں تو پانچ بیگھے تک بارانی زمین پر لگان معاف کیا جائے۔ میاں فضل حسین کہہ چکے تھے کہ لگان میں کمی نہیں کی جاسکتی۔ ترقیاتی منصوبوں کے لیے روپے کی

[1] یہ نکات علامہ کی تقاریر سے ماخوذ ہیں جو انہوں نے پنجاب کونسل میں کیں۔ دیکھیے Sherwani (1944/1977)

[2] محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۱۰۶-۱۰۵

ضرورت ہے۔ حکومت کیمیاگر نہیں کہ جادو سے سونا بنالے۔ اس کا حوالہ دیتے ہوئے علامہ نے کہا کہ حکومت کو کیمیاگری کی کیا ضرورت ہے جب مٹی کو سونا بنانے والے کسان اس نے اپنی جیبوں میں بھرے ہوئے ہیں۔ اس قسم کے دلائل تو بڑے سے بڑے ظلم کے حق میں دیئے جاسکتے ہیں:

> The arguments that the learned Member for Revenue put forward are, in the main, two. In the first place, he argues that we are constantly in need of money: the province needs money for its development, and that the Government does not practice alchemy. I think the Government need not practise alchemy so long as they have in their pocket all the tillers of the soil whose hard work turns dust into gold. But this kind of argument can be applied in defence of any kind of evil practice which brings the required amount of money.[1]

اُس روز علامہ نے کسی کے لیے زبورِ عجم کے حصہ دوم کی نظم ۲۶ اپنے ہاتھ سے لکھی۔[2]

۲۵، اور ۲۹ فروری اور یکم، ۲، مارچ اور ۳ مارچ کو بھی کونسل کی نشستیں ہوئیں۔[3]

28

مولانا ظفر علی خاں آل انڈیا مسلم لیگ کے قیام کے وقت سے اس کے ساتھ تھے۔ اب سائمن کمیشن کے مخالف تھے۔ جناح گروپ میں تھے۔ انقلاب شفیع گروپ کی حمایت کر رہا تھا۔ کمیشن سے تعاون کے حق میں تھا۔ ظفر کی مہر اور سالک کے ساتھ ٹھن گئی۔ سالک کا بیان ہے کہ پہلے ظفر نے انقلاب کے خلاف ایک نظم لکھی۔ یہاں سے جواب میں دو تین لکھی گئیں۔ انہوں نے انقلاب کو چھوڑ کر تمام غصہ علامہ پر نکالنا شروع کر دیا:[4]

زوال اسلامیوں کا اس سے بڑھ کے اور کیا ہو گا

---

[1] Latif Ahmad Sherwani (1944/1977), *Speeches, Writings and Statements of Iqbal*

[2] کسی رسالے میں شائع شدہ عکس علامہ اقبال میوزیم لاہور کے توسط سے اقبال اکادمی پاکستان کے پاس موجود ہے۔

[3] Mitra *The Indian Quarterly Register Jan.-June 1928,* pp.329-332

[4] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸) حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۴۰۹-۴۱۰ بحوالہ کالم 'افکار و حوادث' انقلاب ۶/ مارچ ۱۹۲۸ء

کہ جو اُن کا تھا وہ انگریز کا اقبال ہو جائے[1]

پوری پوری نظموں میں غصہ نکلا۔ ایک نظم کا مطلع تھا:

سرفروشوں کے ہیں ہم سر، آپ سر سرکار کے آپ کا منصب ہے سرکاری ہمارا خانگی[2]

ایک نظم یوں تھی:

مانگ کر احباب سے رجعت پسندی کی کدال قبر آزادی کی کھودی کس نے سر اقبال نے

دشمنانِ ہند کو خوش کرنے کی خاطر شکست آپ اپنی فوج کو دی کس نے سر اقبال نے

کاٹ لی پنجاب کی ناک آپ اپنے ہاتھ سے آبرو ملت کی کھو دی کس نے سر اقبال نے

تھی ضرورت جس کو مرہم کی اُس آلے زخم میں سوئی اور اُلٹی چبھو دی کس نے سر اقبال نے

ہند کے ناموس کی تذلیل سے لاہور میں بھر دی انگلستاں کی گودی کس نے سر اقبال نے

کہہ رہے تھے ڈاکٹر عالم یہ افضل حق سے آج قوم کی لٹیا ڈبو دی کس نے سر اقبال نے[3]

زمیندار کے کالموں میں علامہ کا مشہور شعر، ''یوں تو مرزا بھی ہو، سید بھی ہو، افغان بھی ہو...'' اکبرؔ الٰہ آبادی سے منسوب کیا۔ علامہ کی ایک متروک نظم کا شعر مولانا حالی کے حساب میں لکھا۔ اس پر سالک نے انقلاب میں پوچھا، ''کیا اہلِ فن بتائیں گے کہ یہ 'سرقہ' کی کون سے قسم ہے؟''[4]

'اقبال کی شاعری' کے عنوان سے مضمون زمیندار میں شائع ہوا۔ علامہ کی شاعری کے تین ادوار قائم کیے۔ پہلا دور گنگا جمنی تھا۔ مثال ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا'' تھی۔ دوسرا ''مکی مدنی دور'' تھا۔ مثال ''مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا'' تھی۔ تیسرے دور کو لندنی دور کہا۔ ثبوت میں یہ شعر نقل کیا:

---

[1] جعفر بلوچ (۱۹۹۵)، ص ۱۱۱۔ اُن کے مطابق نظم ۲۳/ جنوری ۱۹۲۸ء کو لکھی گئی

[2] جعفر بلوچ (۱۹۹۵)، ص ۱۸۶۔ اُن کے مطابق نظم ۲۹/ دسمبر ۱۹۲۷ء کو لکھی گئی

[3] جعفر بلوچ (۱۹۹۵)، ص ۱۱۱۔ اُن کے خیال میں نظم ۴/ فروری کو لکھی گئی۔

[4] کالم 'افکار و حوادث' انقلاب ۳/ دسمبر ۱۹۲۷ء اور ۳/ جنوری ۱۹۲۸ء؛ حمزہ فاروقی (۱۹۸۸)، ص ۳۹۹-۴۰۱

قیصر کی مونچھ شرم کی قینچی سے چھانٹ دو   اور اُس کا بال بال شیاطیں میں بانٹ دو

یہ شعر علامہ کا نہیں تھا۔ "جہاں تک ہمیں یاد ہے، اس شعر کے لکھنے والے خان احمد حسین خاں صاحب ہیں،" سالک نے جواب میں لکھا۔ "دیانت و شرافت کا تقاضا یہ ہے کہ صاف الفاظ میں معذرت شائع کی جائے اور علامہ سے اس افسوسناک ناانصافی کی معافی مانگی جائے۔"[1] زمیندار میں علامہ کی شان میں اگلا مضمون جلی قلم کے ساتھ شائع ہوا۔ آغاز میں فردوسی سے منسوب شعر درج تھا کہ میری وجہ سے سیستاں کالونڈا رُستمِ داستاں بنا ہے:

منش کردہ ام رُستمِ داستاں   وگرنہ یلے بود در سیستاں

مطلب یہ کہ اقبال سب کچھ ظفر علی خاں کی مہربانی سے بنے۔ یہی حال مہر، سالک، علامہ عمادی اور مولانا سلیم وغیرہ کا ہے۔ جواباً سالک نے ظفر کی شان میں یہ شعر نقل کیا:

خدا کی شان تو دیکھو کہ کلچڑی گنجی   حضورِ بلبلِ بستاں کرے نواسنجی

ظفر کے صاحبزادے مولانا اختر علی خاں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تعجب کیا کہ اُستادِ جہاں "اپنے فرزندِ ارجمند کو ۳۴سال کی صحبت و تربیت میں اُردو کی چار صحیح سطریں لکھنا بھی نہ سکھا سکا۔ خدا جانے بیج ہی ناقص ہے یا زمین ہی شوردار ہے۔"[2]

پشاور سے کسی نے سوال بھیجا کہ کمیشن سے تعاون کرنے والے مسلمان اور بھی ہیں۔ ظفر صرف علامہ کے پیچھے کیوں پڑے ہیں۔ سالک نے لکھا، "انتہائی مخالفت کو وقار آمیز خاموشی سے برداشت کرنا اقبال کی عادت ہے اور وہ کبھی آج تک کسی کے حملوں سے اس قدر متاثر نہیں [ہوئے] کہ اپنی عادت کو چھوڑ دینے پر مجبور ہو جائیں۔ چونکہ وہ جواب نہیں دیتے، اس لیے بعض لوگوں کی

---

[1] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸) حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، ص۴۰۳-۴۰۴ بحوالہ کالم 'افکار و حوادث' انقلاب ۲۹/ جنوری ۱۹۲۸ء

[2] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸)، ص۴۰۷-۴۰۸ بحوالہ کالم 'افکار و حوادث' انقلاب ۴/ مارچ ۱۹۲۸ء

’شرافت‘ تقاضا کرتی ہے کہ اُن کے خلاف بدزبانیاں کریں۔“[1]

بعد میں ظفر نے کہا، ”میں نے جب بھی علامہ مرحوم سے شاعرانہ نوک جھونک کی۔ تو اُس کا پس منظر دوستانہ ہی ہوتا تھا۔ یہ ٹھیک ہے کہ کبھی کبھار عمل کے بعض گوشوں میں اُن کی علیحدگی سے بہ نظرِ ظاہر جو خلا سا محسوس ہوتا تھا۔ اُس سے میرے قلم کی زبان پر اُن کے متعلق کہیں کہیں طعن آ گیا...وہ طنزیں یا ہجویں نظم کے سانچے میں ڈھل گئیں جن کے جواب میں علامہ مرحوم ہمیشہ طرح دے گئے۔ البتہ ملتے تو کہا کرتے۔ وہ نظم آپ نے خوب کہی ہے۔ میں پوچھتا کون سی نظم۔ فرماتے بھئی وہی...:

قوم کی لٹیا ڈبو دی کس نے سر اقبال نے   قبر آزادی کی کھودی کس نے سر اقبال نے“[2]

29

۴/ مارچ ۱۹۲۸ء کو انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کا اجلاس ہوا۔ شیخ امیر علی صدارت کر رہے تھے۔ مسلمانوں کی تعلیمی ضروریات اور شکایات کا جائزہ لینے کے لیے سب کمیٹی بنائی گئی۔ سترہ ارکان تھے۔ علامہ اقبال شامل تھے۔[3]

۵/ اور ۷/ مارچ کو بھی پنجاب کی صوبائی کونسل کا اجلاس ہوا۔[4]

30

پانچویں انڈین اورینٹل کانفرنس نومبر میں لاہور میں ہونے والی تھی۔ علامہ نے عربی، فارسی اور ژند کے شعبے کی صدارت کرنا تھی۔ بہت ممکن ہے کہ مارچ کے اوئل تک دعوت قبول کر چکے ہوں۔[5] ۷/ مارچ کو سلیمان ندوی کو لکھا، ”میں ایک مضمون لکھ رہا ہوں جس کا عنوان یہ ہے۔ ’زمان و مکان کی

---

[1] ایضاً، ص ۴۱۰ بحوالہ کالم ’افکار و حوادث‘ انقلاب ۶/ مارچ ۱۹۲۸ء

[2] جعفر بلوچ (۱۹۹۵) علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں، ص ۲۳۱-۲۳۲

[3] انجمن کی قلمی روداد؛ محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶)، اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص ۱۸۰

[4] Mitra *The Indian Quarterly Register Jan.-June 1928,* pp.332-333

[5] ۱۴/ مئی ۱۹۲۸ء کو کانفرنس کی استقبالیہ کمیٹی کی میٹنگ میں بتایا گیا کہ شعبے کی صدارت کے لیے سر محمد اقبال کو منتخب کیا جا چکا ہے؛ Anonymous (1930) *Proceedings..., Volume 1,* pp.31, 47-48-

حقیقت فلسفۂ اسلام کی تاریخ میں""[1] یہ اورینٹل کانفرنس کا خطبۂ صدارت ہی ہو سکتا تھا۔ ندوی کے نام خط میں کچھ سوالات لکھے۔ ان میں اِس قول کا حوالہ موجود تھا کہ زمان خدا ہے۔ ملا محمود جونپوری کی شمس بازغہ میں تھا۔ صدرالدین شیرازی یعنی ملا صدرا کی کسی تصنیف میں بھی تھا۔ بخاری میں حدیث بھی تھی جسے علامہ نے اسرار و رموز میں استعمال کیا تھا: لاتسبو الدھر... اب جاننا چاہتے تھے کہ کیا مسلمان فلسفیوں میں سے کسی نے یہ نقطۂ نظر اپنایا۔ قرونِ وسطیٰ کے یہودی فلسفی موسیٰ بن میمون نے، جو قرطبہ میں پیدا اور قاہرہ میں فوت ہوا، لکھا تھا کہ خدا کے لیے کوئی مستقبل نہیں۔ زمان کو لحظہ بلحظہ پیدا کرتا ہے۔ "اُس نے مسلمانوں کی یونیورسٹیوں میں تعلیم پائی اور تمام عمر مسلمانوں ہی کی ملازمت کرتا رہا،" علامہ نے میمون کے بارے میں لکھا، "متکلمین کے خیالات پر اُس نے جرح قدح بھی خوب کی ہے۔ میرا گمان ہے کہ میمون کا مذکورہ بالا مذہب بھی ضرور کسی نہ کسی مسلمان حکیم کی خوشہ چینی ہے۔"[2]

علامہ کا بیان ہے کہ "دہر" کے موضوع پر مولانا انور شاہ کشمیری کے ساتھ بھی خط کتابت ہوئی۔ مولانا نے فخر الدین عراقی کے رسالے غایۃ الامکان فی درایۃ المکان کا ذکر کیا۔ پڑھنے کے لیے بھی دیا۔ ایک رائے تھی کہ کسی غیر معروف شیخ محمود کی تصنیف ہے۔ علامہ کو عراقی ہی کی معلوم ہوئی۔[3] چغتائی کے نام ایک بلا تاریخ خط میں بھی ہے، "اگر برون کی لٹریری ہسٹری آف پرشیا کالج لائبریری میں ہو تو لیتے آیئے۔ اُس جِلد کی ضرورت ہے جس میں عراقیؔ کا تذکرہ ہے..."[4] مصنف کے نزدیک مکان (space) کی تین قسمیں تھیں:

ا۔ مادی (material) اجسام کا مکان۔ اس کی مزید تین قسمیں تھیں۔ اول، کثیف (gross)

---

[1] مکتوب بنام سلیمان ندوی ۷ / مارچ ۱۹۲۸ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۹۲-۶۹۰

[2] مکتوب بنام سلیمان ندوی ۷ / مارچ ۱۹۲۸ء محولہ بالا

[3] Sherwani, p.171۔ مکتوب بنام پیر مہر علی شاہ ۸ / اگست ۱۹۳۳ء میں فی درایۃ الزمان لکھا ہے؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۳۶۹

[4] مکتوب بنام عبد اللہ چغتائی، بلا تاریخ؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۸۵

چیزیں جو جگہ گھیرتی ہیں۔ انہیں حرکت کرنے میں وقت لگتا ہے۔ ایک دوسرے میں نہیں سما سکتیں، جیسے ایک پتھر نے جتنی جگہ گھیری ہے، اُس میں دوسرا پتھر نہیں سما سکتا۔ دوسری قسم لطیف (subtle) اجسام کی ہے، جیسے ہوا اور آواز۔ یہ بھی جگہ گھیرتی ہیں، مثلاً ایک نلکی میں ہوا بھری ہو تو دوسری گیس داخل نہیں ہو سکتی جب تک پہلی ہوا خارج نہ ہو۔ ان کی رفتار بھی ناپی جا سکتی ہے مگر کثیف اجسام کے مقابلے میں بہت تیز ہوتی ہے۔ تیسری قسم نُور (light) یا روشنی کی ہے۔ سورج کی روشنی فوراً ہی زمین کے ہر کونے تک پہنچ سکتی ہے۔ شمع کی روشنی پورے کمرے میں بھر جاتی ہے مگر کمرے میں موجود ہوا کو خارج کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔

۲ غیر مادی (immaterial) وجود، مثلاً فرشتے پتھر کی دیوار سے بھی گزر سکتے ہیں۔ یہ کسی بھی قسم کے مادی وجود کے لیے ممکن نہیں ہے۔ روشنی بھی دیوار سے نہیں گزر سکتی۔ مگر فرشتوں کو حرکت کی ضرورت بہر حال پڑتی ہے۔

۳ الوہی (Divine) مکان ان تمام قیود سے آزاد ہے۔ ابعاد (dimensions) سے پاک ہے۔ لامتناہیت (infinity) کے تمام سلسلے یہاں ملتے ہیں۔

مصنف کے نزدیک مادی سے الوہی تک زمان (time) یا وقت کی ان گنت قسمیں تھیں:

۱ مادی دنیا میں وقت کا انحصار آسمان کی گردش پر ہے (مصنف کے زمانے میں زمین کی گردش کا تصوّر نہ تھا)۔ اس میں ماضی، حال اور مستقبل ہوتے ہیں۔ جب تک ایک دن گزر نہ جائے، دوسرا شروع نہیں ہو سکتا۔

۲ غیر مادی موجودات، مثلاً فرشتوں، کے لیے بھی وقت لمحہ بہ لمحہ ہی گزرتا ہے۔ مگر اُن کا ایک دن ہمارے پورے سال کے برابر بھی ہو سکتا ہے۔

۳ خدا کا وقت "گزرنے" کی خصوصیت سے بے نیاز ہے۔ تقسیم ہوتا ہے نہ بدلتا ہے۔ اس میں ماضی، حال، مستقبل نہیں۔ اس کا آغاز ہے نہ انجام ہے۔ اِسی کو قرآن میں اُمّ الکتاب کہا گیا۔ اس میں پوری تاریخ ماضی، حال اور مستقبل کی تفریق سے آزاد ہو کر ایک ایسے لمحے میں

موجود ہے جو ابدیت سے بھی اوپر ہے۔

علامہ سمجھتے تھے کہ عراقی کے نظریات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ریاضی اور طبیعیات کے جدید نظریات سامنے آنے سے بہت پہلے ایک مسلم صوفی نے زمان و مکان کے بارے میں اپنے روحانی واردات کی تشریح کس طرح کی۔ اُس کی سوچ نے صحیح سمت اختیار کی۔ ارسطو کے اثر کی وجہ سے اور نفسیاتی تجزیے کی کمی کے باعث اِس نتیجے پر پہنچی کہ خدا کے وقت میں تبدیلی کا کوئی پہلو نہیں ہے۔ وہ خدا کے وقت اور گزرتے ہوئے وقت کے درمیان تعلق دریافت نہ کر سکا۔ اس لیے وہ مسلسل تخلیق (continuous creation) کے خالص اسلامی تصوّر تک نہ پہنچ سکا:

> 'Iraqi conceives God's relation to the Universe on the analogy of the relation of the human soul to the body; but, instead of philosophically reaching this position through a criticism of the spatial and temporal aspects of experience, he simply postulates it on the basis of his spiritual experience. It is not sufficient merely to reduce space and time to a vanishing point-instant. The philosophical path that leads to God as an Omni-psyche of the universe lies through the discovery of Living Thought as the ultimate principle of space-time. 'Iraqi's mind, no doubt, moved in the right direction; but his Aristotelian prejudice coupled with a lack of psychological analyses blocked his progress. With his view that Divine Time is utterly devoid of change—a view based on an inadequate analysis of conscious experience—it was not possible for him to discover the relation between Divine Time and serial time and to reach, through this discovery, the essentially Islamic idea of continuous creation which means a growing universe.[1]

۷ مارچ کو لاہور میں صوبائی کونسل کا اجلاس تھا۔ ۸ مارچ کو بھی ہوا۔[2] اُس روز علامہ نے اپنی مالگزاری والی تقریر مہر کو بھیجی کہ ترجمہ کر کے اخبار میں شائع کریں: "اس کے متعلق پنجاب کے زمینداروں کے نام ایک کھلی چٹھی چھاپنے کا ارادہ ہے جس کے لیے آپ سے مشورہ کروں گا۔" معلوم ہوا تھا کہ

---

[1] Sherwani, pp.171-178

[2] Mitra *The Indian Quarterly Register Jan.-June 1928,* pp.333-334

ابن تیمیہ کی کتاب التقدیر کا اُردو ترجمہ چھپا ہے۔ اُس کے بارے میں بھی پوچھا۔[1]

۹، ۱۲، ۱۳، ۱۴/ اور ۱۵/ مارچ کو بھی کونسل کے اجلاس ہوئے۔ اس کے بعد غیر معینہ طور پر برخاست کر دی گئی۔[2]

علامہ کی شان میں نظمیں انقلاب کا مقبول موضوع بن چکی تھیں۔ اصغر حسین خاں صاحب نظیر لدھیانوی سب سے زیادہ مستعد تھے۔ اُن کے علاوہ ذہین فاروقی جے پوری، نظامی قدوسی، "لاہور کی ایک مسلمان خاتون"، اکبر جالندھری اور سید بشیر احمد اخگر جالندھری تھے۔

رُوحِ غالب دردِ میر اقبال! تیرے دل میں ہے　　حسنِ لیلائے سخن پنہاں اِسی محمل میں ہے

سید بشیر احمد اخگر جالندھری

انقلاب، ۱۳/ مارچ ۱۹۲۸ء

سائمن کمیشن کے ارکان لاہور آئے۔ ایمپریس روڈ پر نارتھ ویسٹرن ریلوے کے دفتر میں ٹھہرے۔ نواب سر ذوالفقار علی خاں نے چائے کی دعوت دی۔ رمضان کا مہینہ تھا۔ مسلمان مہمانوں سے درخواست کی گئی کہ روزے سے ہوں تو بیشک افطار کے بعد چائے پئیں۔ دعوت میں ضرور شریک ہوں۔ علامہ بھی گئے۔[3]

"اگرچہ اس دعوت میں بعض دوسرے مسلمان اکابر بھی موجود تھے،" سالک کا بیان ہے، "لیکن علامہ اقبال کے بعض مخالفین نے خاص طور پر آپ کے خلاف پے درپے لکھنا شروع کر دیا کہ آپ نے ماہِ رمضان کی بے حرمتی کی اور اِس وقعے کو اِس قدر رنگ آمیزیوں سے بیان کیا کہ خود 'جھوٹ' بھی شرمانے لگا... مخالفین کا مقصد حرمتِ رمضان کا قیام نہ تھا بلکہ ... محض یہ تھا کہ اپنے مخالف کو مسلمانوں کی نظروں میں ذلیل کر دیں۔"[4]

---

[1] مکتوب بنام غلام رسول مہر ۸/ مارچ ۱۹۲۸ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۹۴-۶۹۲

[2] Mitra *The Indian Quarterly Register Jan.-June 1928,* pp.334-336, 339

[3] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸)، حیات اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۴۸۵ بحوالہ انقلاب ۱۵/ مارچ ۱۹۲۸ء

[4] ایضاً، ص ۴۲۲ بحوالہ کالم 'افکار و حوادث' انقلاب ۲۴/ فروری ۱۹۲۹ء

> ہمارے رفقاء دو گروہوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ایک وہ جو یونانی فلسفے کے محض مقلد ہیں اور کسی کو ان کے افکار پر بحث کی اجازت نہیں دیتے نیز اس بات پر فخر کرتے ہیں کہ ان فلاسفہ کے ارشادات کی تفہیم پر قادر ہیں۔ دوسرا گروہ ان لوگوں پر مشتمل ہے جو بلا استثنا ان فلاسفہ کے تمام افکار کو رد کرتے ہیں۔ یہ دونوں گروہ غلطی پر ہیں۔ ہم نے اگلے فلسفیوں کی تحریروں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے اور صحیح کی توثیق اور غلط کی تردید کی ہے۔ ہم نے اس فلسفے میں بعض نئے اصولوں اور افکار کا اضافہ کیا ہے۔

یہ بات امام فخر الدین رازی نے اپنی کتاب مباحثِ مشرقیہ کے دیباچے میں لکھی۔ کتاب لاہور میں دستیاب نہ تھی۔ سلیمان ندوی کا خط آیا۔ ۱۸/ مارچ کو علامہ نے جواب دیتے ہوئے فرمایش کی کہ زمان کے متعلق امام رازی کے خیالات کا خلاصہ لکھ کر بھیجیں۔ ترجمہ نہیں چاہتے تھے۔ اس خط کی روشنی میں عبداللہ چغتائی کی روایت درست نہیں ہو سکتی کہ کتاب لاہور میں تلاش کی گئی مگر مشکل تھی اس لیے علامہ نے ندوی سے خلاصے کی فرمایش کی۔ وہ سفر میں تھے۔ ۲۵/ مارچ کو چغتائی کو لکھا کہ علامہ سے کہیں کہ خلاصہ یکم اپریل کے بعد تیار ہو گا۔ چغتائی نے مولوی سید احمد اکبر آبادی سے کتاب کے ضروری حصے کا لفظی ترجمہ کروایا۔ علامہ نے استفادہ کیا۔[1] علامہ نے خط میں صاف لکھا ہے کہ کتاب ''لاہور میں دستیاب نہیں ہو سکتی''۔ یہ بھی لکھا ہے، ''میں اس کا ترجمہ نہیں چاہتا۔''

خلافت کمیٹی میں کانگریس کے عمل دخل کے حوالے سے علامہ نے ندوی کو لکھا، ''بزمِ اغیار کی رونق ضروری تھی۔ اسلام کا ہندوؤں کے ہاتھ بک جانا گوارا نہیں ہو سکتا۔ افسوس اہل خلافت اپنی اصلی راہ سے بہت دُور جا پڑے۔ وہ ہم کو ایک ایسی قومیت کی راہ دِکھا رہے ہیں جس کو کوئی مخلص مسلمان ایک منٹ کے لیے بھی قبول نہیں کر سکتا۔''[2]

۲۴/ مارچ کو عید تھی۔ عید کی نماز علامہ نے عالمگیری مسجد (بادشاہی مسجد) میں ادا کی۔ ساٹھ

---

[1] عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں

[2] مکتوب بنام سلیمان ندوی ۱۸/ مارچ ۱۹۲۸ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۹۶-۶۹۴

ہزار سے ایک لاکھ نمازیوں کی گنجایش تھی۔ علامہ کا بیان ہے، ''لاہور کی تاریخ میں غالباً یہ پہلا موقع تھا کہ عالمگیری مسجد تمام و کمال نمازیوں سے لب ریز ہوئی۔ بہت سے لوگوں نے مسجد کے باہر نماز ادا کی۔ ایسا ہجوم اس سے پہلے دیکھنے میں نہیں آیا۔''[1] اُسی صبح بہاولپور سے مولوی غلام حسین کا عید مبارک کا تار موصول ہوا۔ پہلے کسی معاملے میں ایک خط بھی ملا تھا۔ اگلے روز علامہ نے جواب لکھا، ''ان شاٗاللہ اپریل کے پہلے ہفتے میں حسب الارشاد عریضہ لکھوں گا۔''[2]

اِیسٹر سنڈے ۸/ اپریل کو آ رہا تھا۔ علامہ نے انجمن حمایت اسلام کے جلسے میں 'فلسفۂ اسلام' کے عنوان سے لیکچر دینے کی حامی بھری۔ ۲۹/ مارچ کو اخبار حمایت اسلام میں پروگرام چھپا۔ علامہ کا نام دو جگہ درج تھا۔ مولوی غلام محی الدین سیکرٹری انجمن سے تصحیح کی درخواست کی۔ جواب نہ ملا۔[3]

۳۰/ مارچ کو علامہ اقبال نے نیازالدین خاں کے نام خط لکھا، ''انگلستان میں پراپیگنڈا کا وقت اس سال نہیں، آیندہ سال آئے گا۔ افسوس کہ مسلمان پورے طور پر بیدار نہیں اور یوں بھی مفلس ہیں۔ اُمرا اور خیالات میں غرق ہیں۔ علما مذہبی جھگڑوں میں مصروف ہیں۔ بعض خود غرض لوگ محض اپنی گرم بازاری کے لیے مسلمانوں میں اختلاف پیدا کرتے رہتے ہیں۔''[4]

31

گزشتہ برس یکم اپریل سے اس برس ۳۱مارچ تک علامہ کی تشخیص شدہ آمدنی ۹۳۶۲روپے تھی۔ اس میں یونیورسٹیوں سے ۲۹۷۲روپے، وکالت سے ۲۲۸۶روپے، زبورِ عجم کی فروخت سے ۴۶۲۹روپے اور اس کی رائلٹی سے ۱۴۰۹روپے کی آمدنی شامل تھی۔ سال بھر کے پیشہ ورانہ اخراجات میں دفتر کا کرایہ ۶۰۰روپے جو کوٹھی کے کُل کرایے ۲۰۴۰روپے میں شامل تھا، منشی کی تنخواہ ۶۰۰روپے،

---

[1] مکتوب بنام مولوی غلام حسین ۲۵/ مارچ ۱۹۲۸ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۹۷-۶۹۶

[2] ایضاً

[3] مکتوب بنام مدیر انقلاب مطبوعہ ۴/ اپریل ۱۹۲۸ء

[4] مکتوب بنام نیازالدین خاں ۳۰/ مارچ ۱۹۲۸ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۹۸

چپڑاسی کی تنخواہ ۲۶۴روپے، بجلی کے ۱۲۸روپے، ڈرائیور کی تنخواہ ۴۲۰روپے اور پٹرول کے ۳۴۵روپے شامل تھے۔ بعد میں محکمہ انکم ٹیکس نے اعتراض کرکے صرف اس رقم کا نصف انکم ٹیکس سے مستثنیٰ قرار دیا۔ خاکروب کی تنخواہ ۴۸روپے اور بار روم کی فیس ۴۸روپے ذاتی اخراجات قرار دے کر اُن پر ٹیکس لگایا۔ کُل ۲۹۲روپے ۹آنے ٹیکس عائد ہوا۔[1]

اس برس پنجاب یونیورسٹی کے جو پرچے جانچ رہے تھے، یہ تھے: ایم او ایل فارسی (دوسرا پرچہ)، ایم اے فارسی (دوسرا پرچہ)، ایم اے فلسفہ (چوتھا پرچہ؛ بطور خارجی ممتحن؛ داخلی ممتحن سی جی چیٹر جی تھے)، ایم اے فلسفہ (چھٹا پرچہ)۔[2]

32

انقلاب کے ۴/اپریل کے پرچے میں علامہ کی طرف سے اعلان شائع ہوا۔ انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے میں انگریزی میں تقریر کا وعدہ کیا تھا۔ ۲۸/مارچ کو جلسے کے پروگرام میں دو جگہ نام درج ہوا۔ مولوی مولوی غلام محی الدین نے علامہ کی طرف سے تصحیح کی درخواست کا جواب نہیں دیا۔ ''مجھے بڑے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اندریں حالات میں کسی وعدہ کا پابند نہیں،'' علامہ نے لکھا تھا۔[3]

معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بعد تصفیہ ہو گیا۔ ۸/اپریل کو رات ساڑھے آٹھ بجے جلسے کی آخری نشست شروع ہوئی۔ صدارت کلکتہ کے بیرسٹر عبدالرحیم کو کرنی تھی۔ نہیں آسکے۔ جسٹس سر شیخ عبدالقادر نے صدارت کی۔ تلاوت اور نعت خوانی کے بعد اسلامیہ کالج کے طلبہ کی نظم ونثر کا مظاہرہ ہوا۔ پھر علامہ نے لیکچر دیا۔ اخبار حمایتِ اسلام کے مطابق عنوان 'علم اور مذہب کا تجربہ' تھا۔ مدراس کی انجمن کے لیے خطبات تیار کیے جارہے تھے۔ اُن میں سے پہلا تھا۔ ''آپ نے ثابت کر دیا کہ فلسفہ کے دوسرے مسلکوں کے خلاف اسلام کا فلسفہ، نظریہ اور عمل دونوں پر حاوی ہے اور وہ اِس

---

[1] صفدر محمود (۱۹۷۳) 'علامہ اقبال کا گوشوارۂ آمدنی (انکم ٹیکس ریکارڈ کی روشنی میں)'، ص۲۹-۲۶، ۱۸، ۱۷

[2] ڈاکٹر حسن اختر ملک، اقبال، ایک تحقیقی مطالعہ، ص ۱۳۲۔ ان کا ماخذ پنجاب گزٹ کے مختلف شمارے ہیں۔

[3] مکتوب بنام مدیر انقلاب مطبوعہ ۴/اپریل ۱۹۲۸ء

خصوصیت سے تمام دنیا کے نظامِ فلسفہ سے مدارجِ فوقیت رکھتا ہے۔"[1] اِس میں انقلاب نے یوں اضافہ کیا، "امام غزالی و رازی نے اپنے وقت کے لحاظ سے جو خدمت فلسفۂ اسلام کی کی، اُسی نوع کی خدمت موجودہ زمانے کے اعتبار سے وہ بھی انجام دینے کا ارادہ رکھتے ہیں۔"[2] شیخ عبدالقادر نے لیکچر کے بعد غالباً اُردو میں خلاصہ پیش کیا۔ پھر کہا، "افسوس ہے کہ مسلمانوں میں ایسے مسائل پر بحث کرنے والے تو الگ رہے، سمجھنے والے بھی کم ہیں اور یہ قحط الرجال ہمارے لیے سخت افسوسناک ہے۔"[3]

"مسلمانوں کو حضرت علامہ سے جو محبت ہے، اُس کا ایک ادنیٰ کرشمہ یہ تھا کہ رات کے گیارہ بجے تک وہ سارا مجمع چُپ چاپ علامہ کے ارشادات سنتا رہا،" سالک کا بیان ہے:

> چند حضرات سے جو انگریزی نہ جانتے تھے، ہم نے دریافت کیا کہ آپ کو اِس اجلاس میں تین گھنٹے بیٹھے رہنے سے کیا حاصل ہوا۔ اُس کے جواب میں ان مخلص مسلمانوں نے کہا کہ ہمارے لیے اتنا ہی کافی تھا کہ حضرت علامہ اقبال سامنے موجود ہیں اور عقائدِ دینِ اسلام کی حمایت میں اپنے علم و فضل کے پورے زور سے تقریر فرما رہے ہیں، اس سے زیادہ ہمیں اور کیا چاہیے۔[4]

میاں محمد بخش شہر کی ایک ممتاز شخصیت تھے۔ آسٹریلیا سے واپس آئے۔ ۱۰/اپریل کو موچی دروازہ لاہور کے سید احمد شاہ نے ان کے اعزاز میں چائے کی دعوت دی۔ مال روڈ کے لورینگ ہوٹل میں تھی۔ علامہ اقبال، نواب سر ذوالفقار علی خاں اور اُن کے صاحبزادے نواب خورشید علی خاں، جسٹس سر شیخ عبدالقادر، ابوالاثر حفیظ جالندھری، مولوی ممتاز علی اور اُن کے صاحبزادے امتیاز علی تاج، سید حیدر علی، ملک برکت علی، خان بہادر سید مقبول شاہ، سید افضال علی شاہ، میاں محمد رشید، سید محسن شاہ،

---

[1] محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶)، اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص ۱۱۴–۱۱۵

[2] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸)، حیات اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۱۴۹–۱۵۰ بحوالہ انقلاب ۱۴/اپریل ۱۹۲۸ء

[3] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸)، حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۱۴۹–۱۵۰ بحوالہ انقلاب ۱۴/اپریل ۱۹۲۸ء

[4] ح ایضاً، ص ۱۴۹–۱۵۰ بحوالہ کالم 'افکار و حوادث' انقلاب ۱۳/اپریل ۱۹۲۸ء

میاں محمد امیر خاں اور احمد دین بھی شامل تھے۔ حفیظؔ نے اپنی نظم 'درّۂ خیبر' سنائی۔ [1]

۱۴/ اپریل کو لاہور ہائی کورٹ نے کسی محمد دین وغیرہ کی اپیل خارج کر دی۔ علامہ پیروی کر رہے تھے۔ اپیل کسی نور احمد اور بعض دوسروں کے خلاف تھی۔ اُن کا دفاع سید محسن شاہ اور محمد شریف کر رہے تھے۔ سماعت جسٹس بھائیڈ نے کی تھی۔ [2]

قصور سے مولوی عبد القادر تشریف لانے والے تھے۔ علامہ نے غلام رسول مہر کو خط لکھ کر دریافت کیا۔ فرمایش کی کہ الطرق الحکمیہ فی سیاستہ الشرعیہ (حافظ ابنِ قیّم) اور اعلام الموقعین بھجوا دیں۔ شام کو خود بھی آئیں۔ [3]

33

بکری کا ایک بچہ جاوید کے ہاتھ آ گیا تھا۔ وہ اُسے دن بھر لیے لیے پھرتے۔ روایت ہے کہ ایک دن اقبال باہر سے آ کر جاوید کے قریب ہی بیٹھ گئے۔ اُن سے باتیں کرنے لگے۔ جاوید بکری کے بچے کے ساتھ کھیل رہے تھے۔ سردار بیگم نے کہا، "آپ نے بیشمار شعر کہے ہیں لیکن جاوید پر کبھی کچھ نہیں لکھا۔" علامہ مسکرائے اور پنجابی میں کچھ اشعار کہے:

اِک سا بِبّا بکری والا ہتھ وِچ رکھدا ڈَنڈا
نانی جو اُہنوں پھڑن لگی نسیا مار بچھنڈا
بھابی بِبا بکری والا
نالے کھاندا توس تے اَنڈا نالے کھاندا حلوا منڈا
بھابی بِبا بکری والا [4]

---

[1] ایضاً، ص ۲۵۴ بحوالہ انقلاب ۱۲/ اپریل ۱۹۲۸ء

[2] ظفر علی راجا ایڈووکیٹ (۲۰۱۳) قانون دان اقبال، ص ۱۲۵

[3] مکتوب بنام غلام رسول مہر بلا تاریخ؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۸۹

[4]

34

پنجاب کی مجلس وضعِ قوانین کا موسمِ گرما کا اجلاس لاہور میں ۴/ مئی کو شروع ہوا۔ بعض ارکان ہی کی طرف سے کہا گیا تھا کہ گرمیوں کے اجلاس شملہ کی بجائے لاہور ہی میں منعقد ہوں۔ اضافی اخراجات بچیں گے۔ اس لیے اجلاس مئی میں ہو رہا تھا۔ ۵، ۷، ۸، ۹/ اور ۱۰/ مئی کو بھی اجلاس ہوئے۔ [1]

سائمن کمیشن کی معاونت کے لیے پنجاب کونسل کی کمیٹی بن رہی تھی۔ سات ارکان ہونے تھے۔ پندرہ اُمیدوار ہوئے: منوہر لال وزیرِ تعلیم، سر محمد اقبال، سردار مہندر سنگھ، سردار جوگندر سنگھ وزیرِ زراعت، اوول رابرٹس، ڈاکٹر گوکل چند نارنگ، ملک فیروز خان نون وزیر لوکل سیلف گورنمنٹ، پیر سید محمد حسین، کپتان سکندر حیات خان، رائے بہادر چودھری چھوٹو رام، راجہ نریندر ناتھ، ای مہیاداس، نواب طالب مہدی خاں، سردار اُجل سنگھ، چودھری ظفر اللہ خاں۔ [2] پنجاب کونسل کا ۹/ مئی والا اجلاس صبح ۹ بجے شروع ہوا۔ بارہ بجے ملک فیروز خاں نون کے کمرے میں یونینسٹ پارٹی کی میٹنگ ہوئی۔ نون نے بتایا کہ پارٹی کو سکندر حیات اور پیر حسین میں سے کسی کا انتخاب کرنا ہے۔

روایت ہے کہ اگلی صبح اجلاس شروع ہونے سے ایک گھنٹہ پہلے آٹھ بجے یونینسٹ پارٹی کی میٹنگ ہوئی۔ غالباً نون کے کمرے میں تھی۔ علامہ بھی شریک تھے۔ تجویز پیش ہوئی کہ سکندر حیات اور پیر حسین کے بجائے علامہ کو رُکن نامزد کیا جائے۔ نصف گھنٹہ بحث ہوئی۔ طے پایا کہ رکنیت سے علامہ کی سرگرمیاں محدود ہو جائیں گی۔ کمیٹی سے باہر رہ کر سائمن کمیشن کے سامنے شہادت میں پیش ہونے کے لیے اور دوسری شہادتیں پیش کرنے کے لیے اسلامی نقطۂ نگاہ سے زیادہ مفید ہوں گے۔ [3]

۱۰/ مئی کو کونسل کے اسپیکر چودھری شہاب الدین نے کمیٹی کے ناموں کا اعلان کیا: ڈاکٹر گوکل چند نارنگ، چودھری ظفر اللہ خاں، سردار اُجل سنگھ، رائے بہادر چودھری چھوٹو رام، کپتان

---

[1] Mitra *The Indian Quarterly Register July-Dec. 1928,* pp.244-246

[2] انقلاب ۱۰/ مئی ۱۹۲۸ء؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۱۱۱

[3] نواب احمد یار خاں دولتانہ کا خط انقلاب ۵/ جون ۱۹۲۸ء؛ محمد حنیف شاہد (۱۹۷۷)، ص ۱۲۴-۱۲۶

سکندر حیات خان، راجہ نریندر ناتھ، اوول رابرٹس۔[1]

۱۱؍مئی کو بھی اجلاس ہوا۔ اس کے اختتام پر کونسل غیر معینہ طور پر برخاست کر دی گئی۔[2]

35

لیگ کی طرف سے سائمن کمیشن کو پیش کرنے کے لیے یادداشت (memorandum) زیرِ غور تھی۔ کمیشن نے مختلف موضوعات قائم کیے تھے۔ ملک بھر کی نمایندہ تنظیموں سے کہا گیا کہ ان پر اپنی اپنی تجاویز کمیشن کو بھجوائیں۔ آخری تاریخ یکم جون تھی۔ خصوصی حالات میں تاخیر کی جا سکتی تھی۔ کمیشن کو مطلع کرنا ضروری تھا۔[3] معلوم ہوتا ہے کہ لیگ کی یادداشت تاخیر کے ساتھ بھیجی جانی تھی۔

اجلاس میاں محمد شفیع کے گھر پر ہوا۔ علامہ جنرل سکرٹری کی حیثیت میں شریک تھے۔ یادداشت کے نکات پیش کیے گئے۔ علامہ اتفاق نہ کر سکے۔ ان کے خیال میں صوبائی خود مختاری کے مطالبے پر زور دینے کی ضرورت تھی۔ مرکز میں جمہوری حکومت رائج کرنے کے لیے ضروری تھا کہ پہلے صوبوں میں جمہوری حکومتیں قائم کی جائیں۔ اپنے اپنے طور پر خود مختار ہوں۔ اپنی اپنی بنیادیں مضبوط کرنے اور مناسب تجربہ حاصل کرنے کے بعد وفاق تشکیل دیں۔[4]

غالباً اسی سلسلے میں شیخ دین محمد سے مشورہ کرنا تھا۔ ۱۴؍مئی کو خط لکھ کر پوچھا کہ لاہور کب آ رہے ہیں۔ خود ۱۷؍کو لاہور سے باہر جانے والے تھے۔ ممکن تھا کہ ۱۸؍تاریخ بھی باہر گزرتی۔[5] ایسا نہ ہو سکا۔ ۱۶؍مئی کو گردے کے درد میں مبتلا ہو گئے۔ شروع میں درد تیز نہ تھا۔ رات تک بہت بڑھ گیا۔ اگلے روز ۱۷؍مئی کو بھی سخت تکلیف رہی۔ شام تک عطا محمد سیالکوٹ سے پہنچ گئے۔ انجکشن لگوایا گیا۔

---

[1] انقلاب ۱۰؍مئی ۱۹۲۸ء؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۱۱۱

[2] Mitra *The Indian Quarterly Register July-Dec.1928,* pp.247-248

[3] Mitra *The Indian Quarterly Register July-Dec.1928,*, pp..67-69

[4] یہ معلومات علامہ اقبال کے استعفیٰ مطبوعہ ۲۴ جون ۱۹۲۸ء سے ماخوذ ہے۔ دیکھئیے Latif Ahmad Sherwani (1944/1977), *Speeches, Writings and Statements of Iqbal*

[5] مکتوب بنام دین محمد ۱۴؍مئی ۱۹۲۸ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۶۹۹

ڈاکٹر نہال چند علاج کر رہے تھے۔[1]

رات قدرے آرام سے گزری۔ صبح ۱۸/ مئی کو دانوں میں تکلیف شروع ہو گئی۔ درد کے مقام پر نمودار ہوئے تھے۔ انہیں "ہرلی" کہتے تھے۔ شام کو پھر انجکشن دیا گیا۔ مہر کا بیان ہے کہ خواب گاہ کے پیچھے والے کمرے میں گرمی کی تپش کم پہنچتی تھی۔ علامہ فرش پر خوب پانی ڈلوا کر وہاں آرام کرنے لگے۔ دفتر جاتے ہوئے مہر مزاج پرسی کے لیے آئے۔ علامہ نے پوچھا، "مہر صاحب! تکلیف انسان پر اُس کے نفس کی طرف سے آتی ہے یا اللہ کی طرف سے؟" ایک اور صاحب جو مہر کے بعد آئے تھے، بول اُٹھے، "ڈاکٹر صاحب! سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔" مہر کہتے ہیں کہ پہلے علامہ کہ منہ سے ایک چیخ نکلی۔ پھر روتے جاتے اور کہتے جاتے تھے، "اگر یہ تکلیف اللہ کی طرف سے ہے تو میری توبہ، میری توبہ، میری توبہ، میں نے کیوں شکوہ کیا؟" طبیعت معمول پر آنے پر پانچ سات منٹ صرف ہو گئے۔"[2] وسیمہ مبارک سے روایت ہے کہ گردے کے درد میں ڈاکٹروں نے کھانے کے بعد برانڈی کا ایک پیگ تجویز کیا۔ علامہ نے انکار کرتے ہوئے کہا کہ قیامِ یورپ کے دوران بھی جس چیز کو کبھی منہ نہیں لگایا، اب کیسے استعمال کر سکتے ہیں۔[3] حفیظ جالندھری کہتے ہیں کہ تکلیف کے عالم میں میں انہیں بلوایا اور شاہنامۂ اسلام کے مختلف حصے سنے، "خصوصاً وہ حصے جن میں حضورِ اکرمؐ کا ذکرِ جمیل تھا۔"[4]

36

۱۹/ مئی کو بمبئی میں آل پارٹیز کانفرنس نے سب کمیٹی تشکیل دی۔ ہندوستان کے لیے آئین تیار کرے۔ اس کی بنیاد کانگریس کے مدراس کے اجلاس میں منظور ہونے والی قراردادِ اتحاد ہو۔ یکم جولائی

---

[1] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸)، حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، ص۳۷۶ بحوالہ انقلاب ۲۰/ مئی ۱۹۲۸ء

[2] خالد نظیر صوفی، اقبال درونِ خانہ، ص۲۷-۲۸

[3] ایضاً، ص۱۲۵

[4] پروفیسر محمد منور، میزانِ اقبال، ص۱۷۶

تک رپورٹ پیش کر دے۔ پنڈت موتی لال نہرو سربراہ تھے۔ مختلف نقطہ ہائے نگاہ کی ترجمانی کے لیے سر علی امام اور شعیب قریشی (مسلمان)؛ ایم ایس اینی اور جیکر (ہندو مہاسبھا)؛ جی آر پردھان (غیر برہمن)؛ سردار منگل سنگھ (سکھ)؛ سر تیج بہادر سپرو (لبرل) اور این ایم جوشی (لیبر) کمیٹی کے ارکان تھے۔ مسلم لیگ کا شفیع گروپ لاتعلق رہا تھا۔ جناح گروپ نے شرط رکھی کہ اس کے گزشتہ اجلاس میں منظور ہونے والی قرارداد کو اہمیت دی جائے۔ مہاسبھا کو منظور نہ ہوا۔[1]

اُس شام نواب ذوالفقار، اخبار سیاست کے مالک سید حبیب، عبدالرحمٰن چغتائی، عبداللہ چغتائی اور دوسرے علامہ کی مزاج پرسی کے لیے آئے۔ روز کی طرح چودھری محمد حسین بھی آئے۔[2]

۲۱ مئی کو منشی طاہر الدین انکم ٹیکس افسر کے سامنے پیش ہوئے۔ علامہ کے حسابات کی پڑتال کروائی۔[3]

ڈاکٹر نہال چند کے علاج سے علامہ کی تکلیف ختم نہ ہوئی۔ ڈاکٹر سید محمد حسین شاہ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ چھ سات روز بعد بھی درد میں کمی نہ ہوئی۔ ڈاکٹر شاہ کو پتھری کا شبہ ہوا۔ ایکس رے کروایا۔ کافی بڑی پتھری ظاہر ہوئی۔ دوبارہ میو ہسپتال سے ایکس رے ہوا۔ نتیجہ وہی تھا۔ ڈاکٹروں نے جراحی کا مشورہ دیا۔ احباب کا مشورہ برعکس تھا۔ غالباً علامہ خود بھی آپریشن سے بچنا چاہتے تھے۔[4] بیماری کی خبر مشہور ہو چکی تھی۔ دہلی میں خواجہ حسن نظامی نے حکیم حافظ عبدالوہاب انصاری عرف نابینا حکیم سے مشورہ لیا۔ کانگریس کے صدر ڈاکٹر انصاری کے بھائی تھے۔ گیارہ برس پہلے بھی علامہ کا علاج کیا تھا۔ کہا کہ پتھری جراحی کے بغیر نکل سکتی ہے۔ علامہ کو دہلی بلایا۔

عبداللہ چغتائی کا بیان ہے کہ ایک روز مولوی احمد دین وکیل کے صاحبزادے بشیر احمد مزاج پرسی کے لیے آئے۔ علامہ گھر کے اندرونی حصے میں تھے۔ سکون حاصل کرنے کے لیے بیدل کی

---

[1] Mitra *The Indian Quarterly Register July-Dec.1928,*, pp.10-13

[2] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸)، حیات اقبال کے چند مخفی گوشے، ص۳۷۶ بحوالہ انقلاب ۲۰ مئی ۱۹۲۸ء

[3] صفدر محمود (۱۹۷۳) 'علامہ اقبال کا گوشوارۂ آمدنی (انکم ٹیکس ریکارڈ کی روشنی میں)'، ص ۲۶

[4] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸)، حیات اقبال کے چند مخفی گوشے، ص۳۷۷ بحوالہ انقلاب ۱۵ جون ۱۹۲۸ء

غزل بلند آواز میں پڑھ رہے تھے۔ یہ مصرع بار بار دہراتے ہوئے باہر نکلے:

حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسبابِ جہاں

منشی طاہر الدین نے خیریت دریافت کی۔ جواب اسی مصرع سے دیا۔ چغتائی کا بیان ہے، ''بشیر مرحوم سے اس طرح ملے جیسے ان کا اپنا لڑکا آ گیا ہو مگر اُس کو جسم دبانے کی زحمت نہ دی۔''[1]

''اس دوران میں مدتِ دراز کے بعد اُردو میں بھی ایک شعر لکھا،'' انقلاب کا بیان ہے:

عجیب ہیں مغفرت کی راہیں کہ اُس نے روزِ حساب مجھ سے
سوال ایسا کوئی نہ پوچھا کہ جو مجھے لاجواب کر دے[2]

فارسی میں ایک دعا بھی لکھی۔ خدمتِ اسلام کی مزید مہلت مانگی تھی۔ انقلاب کے مطابق بعض دوسرے کاموں کے علاوہ اُن چھ لیکچروں کی تکمیل پیشِ نظر تھی جو مدراس میں دیے جانے تھے۔ تین تقریباً مکمل ہو چکے تھے۔ ایک کتاب *Introduction to the study of the Quran* بھی لکھنا چاہتے تھے۔ منظومات میں مثنویوں کا تیسرا حصہ اور ''معراج نامہ'' قابلِ ذکر تھے۔[3]

دعا چار اشعار پر مشتمل تھی کہ دنیا میں بندۂ بیدار کوئی اور نہیں ہے۔ میر و مرزا سیاست کی بازی میں اپنا دل اور دین ہار چکے ہیں۔ علامہ برہمن زادہ ہیں۔ پھر بھی اُن کے سوا کوئی اور محرمِ اسرار نہیں۔ عصرِ حاضر کے ''لا'' کے مقابل ''اِلّا'' کہہ رہے ہیں۔ جو باتیں کہی نہیں جا رہی ہیں انہیں کہنے کے لیے خدا سے کچھ سانسیں چاہتے ہیں ورنہ اُس کی دنیا سے اِنہیں کیا سروکار ہو سکتا ہے! اشعار بعد میں اپنی کسی تصنیف میں شامل نہ کیے:[4]

دہ مرا فرصتِ ہو حق دو سہ روزے دگر کہ دریں دیرِ کہن بندۂ بیدار کجاست

---

[1] عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۴۵

[2] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸)، حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۳۸۰ بحوالہ انقلاب ۲۰/ جون ۱۹۲۸ء

[3] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸)، حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۲۸۰-۲۸۱ بحوالہ انقلاب ۲۴/ جون ۱۹۲۸ء

[4] ایضاً، ص ۲۸۰-۲۸۱ بحوالہ انقلاب ۲۴/ جون ۱۹۲۸ء

شکریہ

...مجھے ضرورت محسوس ہوئی ہے کہ اس بات کا اظہار کر دوں کہ علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب مد ظلہ العالی اس کمیٹی [پنجاب کونسل کی سائمن کمیشن والی کمیٹی] کی ممبری کے لیے خاص طور پر خواہشمند نہ تھے اور نہ ہی اس کے لیے انہوں نے کوئی خاص کوشش فرمائی تھی...

نواب احمد یار خاں دولتانہ (یونینسٹ پارٹی)،

انقلاب (لاہور)، ۵/جون ۱۹۲۸ء ص ۲[1]

37

اُردو کورس کی پانچویں جماعت کی کتاب کے دو ایڈیشن نکل چکے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ زبان پر اعتراضات ہوئے۔ اورینٹل کالج لاہور کے پروفیسر سید اولاد حسین شاداں بلگرامی سے زبان کی درستگی کروا کے اُن کی تحریر 'گذارش' کے عنوان سے شامل کی گئی۔[2]

اُردو کورس

پانچویں جماعت کے لیے

دیباچہ

اس سے پہلے چھٹی، ساتویں اور آٹھویں جماعت کے لیے اردو کورس تیار کیے گئے تھے۔ جن کو پنجاب صوبجات متحدہ اور مدراس کی ٹیکسٹ بُک کمیٹیوں نے منظور فرمایا اور مدارس کے معلمین اور طلبأ نے بہ نظر پسندیدگی دیکھا۔ اس وقت یہ کورس عام طور پر ہندوستانی مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ کورس جن اصولوں کے ماتحت مرتب کیے گئے تھے وہ قابل حوصلہ افزائی ثابت ہوئے۔ اب پانچویں جماعت کا اردو کورس ہدیۂ ناظرین ہے۔ اس میں بھی اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا گیا

---

[1] محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۱۲۷

[2] ڈاکٹر حسن اختر ملک، اقبال، ایک تحقیقی مطالعہ، ص ۱۶۹-۱۷۲

ہے کہ پرانے اور نئے زمانے کے اساتذۂ علم و ادب کے مضامین اس طرح جمع کیے جائیں کہ طلبأ کو نئی معلومات حاصل ہونے کے ساتھ ساتھ اُردو زبان سے دلبستگی پیدا ہو اور وہ ایسے انداز تحریر سے واقف ہو جائیں جو اظہار مطالب پر حاوی ہو۔ مضامین کے انتخاب میں زمانۂ حاضرہ کی تمام ضروریات کا خیال رکھا گیا ہے اور کوشش کی گئی ہے کہ مضامین ایسے دلکش اور پُر اثر ہوں کہ بچوں کی طبیعت ان کی طرف خود بخود راغب ہو۔ یہ مضامین بچوں کے دل میں مادرِ وطن کی محبت، اخلاقی جرأت اور ادبی ذوق پیدا کرنے کے اہل ہیں۔ امید ہے کہ معلمین ان کو پڑھاتے وقت ان تمام جذبات عالیہ کو طلباء کے دل ودماغ پر نقش کرنے کی کوشش کریں گے جو اِن مضامین کی تہ میں موجزن ہیں۔ بچوں کی تعلیمی مشکلات کو کم کرنے کے لیے ایک فرہنگ کا اضافہ کر دیا گیا ہے اور قواعد اردو کے اصولوں کو ان اسباق کے ذریعے آسان طریقے پر ذہن نشین کرنے کے لیے ہر سبق کے اختتام پر مشقی سوالات لکھ دیے گئے ہیں۔ خدا کرے یہ کورس بھی پہلی کتابوں کی طرح طلبأ کے دل میں علم ادب کا ذوق پیدا کرنے میں کامیاب ہو اور وہ اس قابل ہو جائیں کہ اپنے خیالات کا اظہار صاف اور سلیس اردو میں کر سکیں کہ حقیقت میں یہی ہر درسی کتاب کا منشا ہے۔

ہم جناب قبلہ سید اولاد حسین شاداں بلگرامی پروفیسر اورینٹل کالج لاہور کے ممنون احسان ہیں کہ انہوں نے اس نصاب کی زبان پر نظر ثانی فرمائی۔ حضرت ممدوح اہل زبان ہیں اور ان کا علم و فضل کسی مزید تعارف کا محتاج نہیں۔

مؤلفین

گذارش

[از سید اولاد حسین شاداں بلگرامی، پروفیسر اوئینٹل کالج لاہور]

مؤلفین کتاب ہذا کی خواہش تھی کہ میں اس نصاب کی زبان پر بحیثیت صحت و سقم نظر ثانی کروں۔ چنانچہ تعمیل ارشاد کے لیے جہاں کہیں مجھے اپنے خیالات کے موافق سُقم معلوم ہوا، میں نے بلا امتیاز ترمیم کر دی یا نوٹ لکھ دیا۔ میں اس کتاب کے ہر مضمون کے موئلف کو قابلِ فخر ہستی سمجھتا ہوں۔

بعض مصنفین کی قابلیت تو مسلّمِ ہندوستان ہے۔ ساتھ ہی اس کے میں یا کوئی خطائے بشری سے خالی نہیں۔ ۹ جون ۱۹۲۸ء

38

اُن دنوں عدالت میں انارکلی کے مسلم حلقۂ انتخاب کے بارے میں ایک مقدمہ چل رہا تھا۔ میاں شفیع نے تجویز پیش کی تھی کہ مسلمان انتخابی سرگرمیوں میں پیسہ ضائع نہ کریں۔ حلقے میں ایک سے زیادہ اُمیدوار ہوں تو سمجھوتہ کر لیں۔ ورنہ ثالث مقرر کریں۔ جہاں تک ہو سکے ایک حلقے سے ایک ہی امیدوار کھڑا ہو۔ علامہ بھی موجود تھے۔ کسی نے تجویز دی کہ روپیہ انتخاب پر ضائع کرنے کے بجائے کامیاب اُمیدوار قوم کی امداد کے لیے کچھ رقم عطا کر سکتے ہیں۔

انارکلی کے حلقے میں تین اُمیدوار تھے۔ اُن میں سے جان محمد نے ملک مبارک علی کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا۔ اُن کا کہنا تھا کہ مبارک علی نے پانچ ہزار روپیہ دے کر حمایت حاصل کی ہے۔ روپیہ میاں شفیع کو پیش کیا ہے یا انجمن حمایت اسلام کو دینے کا وعدہ کیا ہے۔ ۱۲؍ جون کو شیخ سر عبدالقادر نے عدالت میں گواہی دی۔ جان محمد کے بیان کی تردید کی۔ میاں شفیع کی اصل تجویز کی وضاحت کی۔ اگلی پیشی میں علامہ کو گواہی دینی تھی۔ یہ معلوم نہیں ہے کہ نوبت آئی یا نہیں۔ [1]

39

گردے کے درد میں کمی تھی۔ حکیم عبدالوہاب کے پاس دہلی جانے کا ارادہ کر چکے تھے۔ ملیریا کا شدید حملہ ہوا۔ دو تین روز اُس کی وجہ سے تکلیف میں رہے۔ قریباً ایک ماہ کی علالت اور پھر بخار نے بیحد کمزور کر دیا۔ اسی دوران اخبار پرتاب نے کسی مسلم ایسوسی ایشن کا ذکر کیا۔ لکھا کہ چند روز قبل شملہ میں منعقد ہوئی تھی۔ ”جس دن یہ اجلاس ہو رہا تھا، اقبال صاحب اُس سے چند دن پہلے کسی ذاتی کام کے لیے شملہ گئے تھے،“ پرتاب میں لکھا گیا، ”لیکن اجلاس سے ایک دن پہلے لاہور واپس آ گئے۔ ذاتی کام کے لیے تو شملہ چلے گئے لیکن ’اسلامی کام‘ کے لیے ایک دن اور وہاں نہ ٹھہر سکے۔“

---

[1] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸) حیات اقبال کے چند مخفی گوشے ص ۲۸۴–۲۸۵ بحوالہ انقلاب ۱۴؍ جون ۱۹۲۸ء

''جھوٹوں کے منہ میں۔ آگے کیا کہوں۔ استغفر اللہ۔ استغفر اللہ،'' سالک نے انقلاب کے کالم 'افکار و حوادث' میں اپنے مخصوص انداز میں پرتاب کی خبر پر تبصرہ کیا۔ ''ڈاکٹر اقبال بیچارے ایک مہینے سے سخت بیمار ہیں، یہاں تک کہ بستر سے اٹھ بھی نہیں سکتے، چہ جائیکہ باہر نکلتے یا شملہ جاتے۔''[1]

۱۵/جون کی شام علاج کے لیے دہلی روانگی کی ٹھہری۔ جانے سے پہلے نیازالدین خاں کو خط لکھا۔ پرانے دوست کے نام آخری خط ثابت ہوا۔[2]

بنام نیازالدین خاں

مخدومی! السلام علیکم

والا نامہ مل گیا ہے۔ مجھے دردِ گردہ کی شکایت رہی، جس کا سلسلہ ایک ماہ سے اُوپر جاری رہا۔ جدید طبی آلات کے ذریعے گردے کا معائنہ کرایا گیا تو معلوم ہوا کہ گردے میں پتھر ہے اور کہ عملِ جراحی کے بغیر چارۂ کار نہیں ہے مگر تمام اعزّا اور دوست عملِ جراحی کرانے کے خلاف ہیں۔ درد فی الحال رُک گیا ہے اور مَیں حکیم نابینا صاحب سے علاج کرانے کی خاطر آج شام دہلی جا رہا ہوں۔ وہاں چند روز قیام رہے گا۔ اس کے بعد تبدیلیِ ہوا کے لیے چند روز کے لیے شملہ میں قیام کروں گا۔

اُمید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔ اس طویل علالت نے مجھے کمزور کر دیا ہے البتہ درد کا افاقہ ہے، سو خدا تعالیٰ کا شکر ہے۔ والسلام

آپ کی ہمدردی کا تہِ دل سے مشکور ہوں۔

مخلص

۱۵/جون ۲۸ء — محمدؐ اقبال،

لاہور

---

[1] ایضاً، ص ۴۱۳-۴۱۴ بحوالہ کالم 'افکار و حوادث' انقلاب ۱۲/جون ۱۹۲۸ء

[2] مکتوب بنام نیاز الدین خاں ۱۵/جون ۱۹۲۸ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۷۰۰-۶۹۹۔ نیازالدین خاں ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے۔ اُن کی عمر اُناسی برس تھی۔

40

۱۵/ جون کی رات موسم خراب تھا۔ علامہ ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ نقاہت کی وجہ سے تنہا سفر مناسب نہ تھا۔ چودھری محمد حسین ساتھ تھے۔ جمعہ تھا۔ محمد حسین اتوار کی شام واپس ہو کر پیر کی صبح دفتر جاسکتے تھے۔ سفر کی خبر مشہور نہ کی گئی۔ تب بھی خراب موسم کے باوجود کئی نیاز مند اسٹیشن پر موجود تھے۔[1]

دہلی پہنچ کر اسٹیشن سے قیام گاہ پر گئے۔ خواجہ حسن نظامی حکیم عبدالوہاب کے پاس لے گئے۔ حکیم نے پوری تشخیص کی۔ فیصلہ کیا کہ بیماری کی شروعات جگر سے ہوئی ہیں۔ یقین دلایا کہ اگر پتھری ہے تو ضرور تحلیل ہو کر نکل جائے گی۔ تین دن کے لیے تین دوائیں تجویز کیں۔

۱۶/ جون کی شام علامہ نقرس کی تکلیف میں مبتلا ہو گئے۔ فاسد مادہ گردے میں تکلیف کا باعث تھا۔ اب جگہ سے ہل کر نقرس کی وجہ بن رہا تھا۔ حکیم نے ایک لیپ تجویز کیا۔ گھنٹہ بھر میں آرام آ گیا۔ اگلے روز ۱۷/ جون کو طبیعت اچھی رہی۔ ۱۸/ جون کی صبح محمد حسین واپس لاہور آ گئے۔

دہلی میں حکیم کے بھائی اور کانگریس کے صدر ڈاکٹر انصاری تقریباً ہر روز علامہ کی مزاج پرسی کے لیے آرہے تھے۔ کسی روز ناغہ ہوتا تو ٹیلی فون پر خیریت دریافت کر لیتے۔ انہوں نے کہا کہ یونانی علاج کے ذریعے بغیر جراحی کے پتھری نکل جانے کی مثالیں موجود ہیں۔ ڈاکٹر جنید نے بتایا کہ حکیم اجمل خاں مرحوم بھی یہ کام کر چکے تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ نقرس کے علاج کے لیے حکیم کے علاوہ ڈاکٹر محمد عمر کی خدمات بھی حاصل کی گئیں۔[2]

۲۱/ جون کی صبح علامہ واپس لاہور پہنچ گئے۔ حکیم کی دوا ساتھ تھی۔ حکیم نے یقین دلایا تھا کہ پتھری آہستہ آہستہ تحلیل ہو کر نکل جائے گی۔[3]

41

اس بیماری کے علامہ پر گہرا اثر چھوڑا۔ ''زندگی کی اُمید منقطع ہو گئی تھی لیکن خدا تعالیٰ نے اپنے فضل و

---

[1] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸) حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۲۷۸ بحوالہ انقلاب ۱۷/ جون ۱۹۲۸ء

[2] ایضاً، ص ۲۸۱–۲۸۲ بحوالہ انقلاب ۲۴/ جون ۱۹۲۸ء

[3] ایضاً، ص ۲۸۱–۲۸۲ بحوالہ انقلاب ۲۴/ جون ۱۹۲۸ء۔ نیز علامہ کا استعفیٰ مطبوعہ ۲۴/ جون مشمولہ Sherwani

کرم سے مجھے صحت عطا کی،" علامہ کا بیان ہے، "اس بیماری کے بعد میرے خیالات میں بڑا تغیر ہوا اور چند روزہ زندگی کی حقیقت مجھ پر واضح ہو گئی۔"

پنجاب نیشنل بینک لاہور میں جاوید کے نام دس ہزار روپیہ جمع کرایا۔ پھر کسی وقت سینٹرل کوآپریٹو بینک لاہور میں سردار بیگم کے نام بھی دس ہزار روپیہ جمع کروایا۔ سردار بیگم کے کچھ زیورات بیچ کر ڈیڑھ ہزار روپیہ حاصل ہوا۔ وہ بھی اس اکاؤنٹ میں ڈالا گیا۔ اکاؤنٹ پر سہولت کی غرض سے علامہ کا نام بھی تھا۔ حقیقت میں وہ اس رقم کو سردار بیگم کی ملکیت سمجھتے تھے، "مجھے اس سے کوئی تعلق نہیں۔" سینٹرل کوآپریٹو بینک ہی میں اپنا علیحدہ اکاؤنٹ تھا۔ اُس میں چند ہزار روپے رہتے تھے۔ [1]

42

سائمن کمیشن کو پیش کرنے کے لیے مسلم لیگ (شفیع گروپ) کی یادداشت اخبارات میں شائع ہوئی۔ صوبائی خودمختاری پر زور نہیں دیا گیا تھا۔ ۲۴/جون کو جنرل سکرٹری کے عہدے سے علامہ کا استعفیٰ اخبارات میں آ گیا۔[2] اُس روز اخبار سیاست میں اعتراضاً خبر شائع ہوئی کہ سائمن کمیٹی کے انتخاب والے دن ڈاکٹر اقبال کونسل میں حاضر نہیں تھے۔ خبر غلط تھی۔ [3]

۲۵/جون کو علامہ شملہ پہنچ گئے۔ چودھری محمد حسین کو لکھا کہ دو روز بعد نواب ذوالفقار آ رہے ہیں۔ ہو سکے تو ساتھ آ جائیں۔ [4]

انمول موتی

(علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال کے نادر مقولے)

۱ انسان کے لیے زندہ رہو اور خدا کے لیے مرو۔

---

[1] مکتوب بنام سردار بیگم ۲۶/اگست ۱۹۳۱ء؛ برنی، کلیات مکاتیب اقبال سوم، ص ۲۳۳-۲۳۲

[2] دیکھیے اقبال کا استعفیٰ مطبوعہ ۲۴/جون مشمولہ Sherwani

[3] مکتوب بنام مدیر انقلاب ۱۱/جولائی ۱۹۲۸ء؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۶۶-۶۵

[4] مکتوب بنام محمد حسین ۲۵/جون ۱۹۲۸ء؛ ثاقب نفیس (۲۰۰۴) مکتوباتِ اقبال، ص ۳۰

۲ دنیا پر، خیال نہیں، بلکہ الہام حکومت کرتا ہے۔
۳ دماغ واقعہ پر اثرانداز ہوتا ہے نہ کہ واقعہ دماغ پر۔
۴ اقوام کی نشوونما شعرا وانبیاؑ کے ہاتھوں اور تباہی مدبرین کے ہاتھوں ہوتی ہے۔
۵ جمہوریت ایک پردہ ہے، جس کے پیچھے بڑے بڑے انسان اپنے کو پوشیدہ کرتے ہیں۔
۶ دنیا انسان کے لیے ہے نہ کہ انسان دنیا کے لیے۔
۷ سائنس نے مادیت کی ابتدا کی اور آج فلسفہ کی مدد کے بغیر اُسے تباہ کر دیا۔
۸ حقیقی عشق کے لیے مادی حسن محض ایک سیڑھی کا حکم رکھتا ہے۔
۹ فلسفہ خیال کو، علوم جذبات کو اور مذہب تمام انسانوں کے لیے مرغوب ہے۔
۱۰ یورپ کی تقلید سے ایشیا کسی منزل پر نہیں پہنچ سکتا، اسے لازم ہے کہ اپنی دنیا علیحدہ پیدا کرے۔
۱۱ علوم صرف حقائق اشیا کی جھلک دیکھتا ہے اور عشق ان کی جستجو کرتا ہے اور ان تک پہنچ جاتا ہے۔
۱۲ سائنس، فلسفہ، علوم اور مذہب کے تجارب وہ مختلف طریقے ہیں، جن کے ذریعے انسان اپنی حقیقت کو پہچانتا ہے۔

(مسلم آؤٹ لُک)

انقلاب، ۲۹/ جون ۱۹۲۸ء[1]

43

میاں سر محمد شفیع نے علامہ کا استعفیٰ قبول نہ کیا۔ یادداشت میں مکمل صوبائی خودمختاری کا مطالبہ شامل کر دیا۔ علامہ نے یادداشت پر دستخط کر دیئے۔[2]

یادداشت پیش کرنے کی حتمی تاریخ یکم جون کب کی گزر چکی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ سائمن کمیشن کو خصوصی طور پر مطلع کر کے یادداشت تاخیر کے ساتھ بھیجی گئی ہو گی۔ نیو یونین پریس لاہور

---

[1] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸) حیات اقبال کے چند مخفی گوشے

[2] ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۴)، زندہ رود، ص ۳۸۸

سے کتابچے کی صورت میں بھی طبع ہو گئی۔[1] خلاصہ یوں کیا جاسکتا تھا:

۱ اس یادداشت کی منظوری در حقیقت ہندوستانی مسلمانوں کی بھاری اکثریت نے دی ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کی کل تعداد سات کروڑ سے زیادہ ہے۔ لیگ اُن کے سیاسی، اقتصادی، معاشی، سماجی، مذہبی اور عمومی مفادات کی نگراں ہے۔ یہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کی مجموعی حیثیت میں اُن کی آراٗ اور محسوسات ہیں۔ صوبائی ادارے اور مسلمانوں کی دیگر تنظیمیں ان کی توسیع کر سکتی ہیں۔ ہر صوبہ اپنے مخصوص حالات کا بہتر جائزہ لے سکتا ہے۔ لیگ اس اصول (decentralization) کو تسلیم کرتی ہے۔

۲ سب سے زیادہ اس خطرے کی نشاندہی مقصود ہے کہ نئے آئین کے ذریعے جمہوریت کی بجائے ایک محدود طبقے کی حکومت (oligarchy) رائج نہ ہو جائے۔ اس وقت بڑی خرابی یہ ہے کہ مسلمانوں اور عیسائیوں کے سوا ہر مذہب کے لوگ ''ہندو'' شمار کر لیے جاتے ہیں۔ اس بارے میں مناسب قاعدہ رائج کیا جائے۔ مسلمانوں کی نمایندگی زیادہ منصفانہ بنیادوں پر ہو۔ اس ردو بدل کے وقت برطانوی ہند (British India) اور ریاستوں (Indian States) میں ہم آہنگی کا مقصد بھی پیشِ نظر رہے۔

۳ حقِ رائے دہی کو وسیع کیا جائے۔ صوبائی مقننہ کے انتخاب میں ہر بالغ کو ووٹ ڈالنے کا حق ہو۔ اُمیدوار کے لیے کسی اہلیت کا تعین کیا جائے۔

۴ جداگانہ نیابت برقرار رکھی جائے۔ یہ آج بھی اُسی طرح آئین کا بنیادی اصول ہے جس طرح اُس وقت تھی جب ۱۹۰۹ء میں منٹو مارلے اصلاحات کے ذریعے اسے متعارف کروایا گیا تھا یا جب ۱۹۱۹ء میں مونٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات میں اس کی اہمیت پر زور دیا گیا تھا۔ پنجاب اور بنگال میں اس کے اثرات ہر لحاظ سے اتنے خوشگوار تھے کہ یوپی کی مقننہ نے بھی جہاں ہندوؤں کی اکثریت تھی اسے مقامی اداروں پر لاگو کرنے پر رضامندی ظاہر کی۔ موڈی مین

[1] محمد احمد خاں، اقبال کا سیاسی کارنامہ ص ۱۸۲ پر کتابچے کا ذکر ہے۔

کمیٹی کے سامنے شہادت پیش کرتے ہوئے یوپی کے سابقہ وزیر سی وائی چنتامنی نے کہا کہ مسلمانوں کی جداگانہ نیابت نے اُن کے اور ہندوؤں کے درمیان آویزش کم کر دی ہے۔

۵ مرکزی اور صوبائی مقننہ کی نشستوں میں اضافہ کیا جائے۔ انتخابی حلقے چھوٹے کر کے اُنہیں زیادہ قابلِ عمل بنایا جائے۔

۶ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت بحال کی جائے۔ اسے اقلیت یا مساوات میں تبدیل نہ کیا جائے۔

۷ صوبہ سرحد میں آئینی اصلاحات نافذ کی جائیں۔ عام تاثر ہے کہ وہاں کی ہندو آبادی اقلیت میں ہونے کی وجہ سے وہاں جمہوری حکومت کے قیام کی مخالف ہے۔ حال ہی میں مرکزی مقننہ کے ایک وفد نے صوبے کا دورہ کیا جس سے ظاہر ہوا ہے کہ وہاں کے ہندوؤں میں سے صرف ایک تھوڑی سی تعداد اصلاحات کی مخالف ہے۔ یہ وہ مکتبِ فکر ہے جو کسی ایسے صوبے کی ترقی نہیں چاہتا جہاں ہندوؤں کی اکثریت نہ ہو۔ برطانوی بلوچستان میں اصلاحات کا نفاذ بھی بیحد ضروری ہے۔

۸ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کیا جائے۔

۹ مندرجہ بالا تجاویز پر عمل درآمد کے بعد گیارہ صوبوں میں سے پانچ ایسے ہوں گے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہو گی۔ مگر بقیہ صوبوں میں وہ پھر بھی ایک اقلیت ہی رہیں گے۔ وہاں اُنہیں آئین کے ذریعے تحفظ دیا جائے، بالخصوص مذہبی آزادی، گائے کی قربانی کی اجازت اور مساجد کے سامنے باجا بجائے جانے کی ممانعت۔ تمام منتخب اداروں میں جداگانہ نیابت کے ذریعے مناسب نمایندگی۔ مرکزی اور صوبائی کابینہ نیز سرکاری ملازمتوں اور تعلیمی اداروں میں مناسب نمایندگی۔ تمام سرکاری اداروں یا سرکار سے مدد پانے والے اداروں میں اُردو زبان کا استعمال۔ تعلیمی اور دوسرے رفاحی مقاصد کے لیے امداد۔

۱۰ اختیاراتِ مابقی صوبوں کے پاس ہوں۔

۱۱ برطانوی حکومت میں وزیرِ ہند کے اختیارات محدود کیے جائیں۔ اس کے ساتھ ہی انڈین

کونسل کے بھاری عملے میں بھی تخفیف ہو سکے گی۔

۱۲ مرکزی حکومت کو مزید جمہوری بنایا جائے۔ دوسرے مہذب ممالک کی طرح یہاں بھی فوج کے کمانڈر ان چیف کی ایگزیکٹو کونسل یا مرکزی مقننہ کی رکنیت ختم کی جائے۔ کابینہ اور مقننہ میں ایک سویلین رکن کے ذریعے فوج کی نمایندگی کی جائے جیسا کہ برطانیہ میں ہوتا ہے۔ وائسرائے کی کابینہ کے ارکان کی تعداد بڑھائی جائے۔ اُس میں مسلمانوں کی مناسب نمایندگی ہو۔ نیز مقننہ کو بجٹ پر زیادہ اختیار دیا جائے۔

۱۳ دوعملی (diarchy) کا نظام ختم کیا جائے۔ وزرا گورنر کی بجائے عوام کے منتخب نمایندوں کے سامنے جواب دہ ہوں۔ صوبوں کو خود مختاری دی جائے۔ انکم ٹیکس کا اختیار مرکز کی بجائے صوبوں کے پاس ہو۔ مرکز صرف صوبوں سے ایک مقرر حصہ وصول کر سکتا ہے۔ کسی منتخب ادارے میں کوئی مسودۂ قانون جس کا تعلق کسی مذہب سے ہو، منظور نہ کیا جائے اگر متعلقہ مذہب کے تین چوتھائی اراکین اس کے خلاف رائے دیں۔ آیا کوئی مسودۂ قانون کسی مذہب کے حقوق متاثر کر رہا ہے یا نہیں، اس کا تعین بھی اُس مذہب کے افراد ہی کریں گے۔

۱۴ تمام سرکاری ملازمتوں اور انتظامی مشینری میں مسلمانوں کو مناسب حصہ دیا جائے۔

۱۵ عدلیہ اور انتظامیہ کو علیحدہ کیا جائے۔[1]

Memorandum submitted by the All-India Muslim League

[Excerpt]

Before dealing with the questions connected with the Executive and Legislative machinery, the League considers it necessary to invite attention to a question of vital importance in relation to the constitution as a whole. India, as has already been pointed out, being in reality a vast sub-continent divided intio presidencies and provinces inhabited by peoples speaking different languages, possessing diverse characteristics of their own, influenced in their activities and aspirations by territorial patriotism and for at least three-quarters of a century, and in sosme cases even for over a century, living under their own respective provincial

---

Indian Statutory Commission, *Report, Vol 16,* pp.108-111[1]

governments, it seems to the League to be inevitable that the constitution of the country must develop on the lines of a Federal government, each territorial unit forming a state in itself and all being governed, in matters of common concern, by a central federal authority. In other word, the constitutional reforms in this country should at this stage aim at the ultimate creation of a United States of India within the British Commonwealth. For such a constitutional goal, the first important question for consideration naturally is in whom should what are called "Residuary Powers" be vested. This, in the opinion of the League, is a constitutional problem of the first magnitude, upon the right solution of which depends the future stability and welfare of the State itself. In view of the varying conditions obtaining in the difference provinces of India, it seems to the League to be essential that the future Federal constitution of India should, among other things, provide the Central Government with only such powers as may be expressly vested in it by the constitution and all "Residuary Powers" be left to the individual states. A Federal government, constituted on this basis, would not only give provincial autonomy to the various states constituting federation, but would also prevent the coming into existence in India of an oligarchy which would be disastrous to the vital interests of the minority communities in this country and would be entirely inconsistent with true democratic principles.[1]

44

یکم جولائی تھی۔ پنجاب کونسل کی اسٹینڈنگ کمیٹی برائے تعلیم کی میعاد گزشتہ روز ختم ہو چکی تھی۔ آیندہ مالی سال ۱۹۲۹-۱۹۲۸ کے لیے جو کمیٹی بنی اُس میں منتخب نمایندے کے طور پر علامہ اقبال بدستور شامل رہے۔ وزیرِ تعلیم بھی شریک رہے۔ نامزد رکن آر سانڈرسن آئی ای ایس تھے۔ منتخب اراکین میں سے علامہ اقبال، سردار ہربخش سنگھ، مسٹر لابھ سنگھ، پنڈت نانک چند، چودھری یٰسین خان، چودھری دُلی چند اور خان بہادر چودھری فضل علیبدستور شامل رہے۔ صرف مسٹر لابھ سنگھ کی بجائے خان بہادر سر عبد القادر نئے رُکن ہوئے۔[2]

---

[1] Indian Statutory Commission, *Report, Vol 16,* p.110

[2] پنجاب گزٹ ۱۳/ اپریل ۱۹۲۸ء حصہ پنجم ص ۱۴؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۱۱۰-۱۱۱

45

۲/ جولائی کو انگلستان میں پانچواں اصلاحی ایکٹ (Fifth Reform Act) رائج ہوا۔ اب اکیس برس یا زیادہ عمر کی تمام خواتین بھی ووٹ ڈال سکتی تھیں۔

46

نواب احمد یار خاں نے علامہ اقبال کو بذریعہ تار اطلاع دی کہ ۲۴/ جون والی اخبار سیاست کی خبر کی تردید کر چکے ہیں۔ ۶/ جولائی کو اُن کی بھیجی ہوئی کٹنگ بھی علامہ کو مل گئی۔ بیمار تھے۔ دو روز تک بیان جاری نہ کر سکے۔[1] اگلے روز تمکین کاظمی کے نام خط میں میر ولی اللہ خوشنویس کا تعارف کروایا، ''ائمہ جامع مسجد دہلی کے خاندان سے ہیں... میرے نزدیک اس خاندان کے افراد قدر کے مستحق ہیں۔''[2]
۸/ جولائی کو مدیر انقلاب کے نام سیاست کی خبر کی تردید کا خط لکھا۔[3]

پٹنہ کے بیرسٹر ہمایوں مرزا اپنی بیگم صغرا ہمایوں کے ساتھ کشمیر جارہے تھے۔ لاہور میں علامہ کے گھر کے قریب ہوٹل میں ٹھہرے۔ ہمایوں علامہ سے ملنے آئے۔ علامہ نے انہیں بیگم کے ساتھ چائے پر بلایا۔ صغرا زنانے میں رہیں۔ ''پردے کی سختی کی وجہ سے میں [علامہ سے] ملاقات نہ کر سکی،'' اُن کا بیان ہے، ''حالانکہ میرے شوہر... میرے ساتھ تھے۔'' صغرا نے ریل میں ملکہ نور جہاں پر نظم لکھی تھی۔ علامہ نے اصلاح کر کے ۱۲/ جولائی کو ہوٹل میں بھجوائی، ''آپ کے اشعار صاف ہیں۔ افسوس کہ میں فن اصلاح سے نابلد ہوں۔ محض آپ کے تعمیل ارشاد کے خیال سے بعض جگہ کچھ الفاظ بدل دیے گئے۔ رسالہ نور جہاں امرتسر [کو] بھیج دیجیے۔ میری بیوی سلام عرض کرتی ہیں۔''[4]

پروفیسر محمد شفیع اسلامیہ کالج پشاور میں تاریخ کے پروفیسر تھے۔ غالباً ان دنوں ایبٹ آباد میں

---

[1] مکتوب بنام مدیر انقلاب ۸/ جولائی ۱۹۲۸ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۲۰۲-۲۰۱
[2] مکتوب بنام تمکین کاظمی ۷/ جولائی ۱۹۲۸ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۲۰۰
[3] مکتوب بنام مدیر انقلاب ۸/ جولائی ۱۹۲۸ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۲۰۲-۲۰۱
[4] مکتوب بنام صغریٰ بیگم ۱۲/ جولائی ۱۹۲۸ء؛ برنی (۱۹۹۱)، ص ۲۰۷۔ نیز عبداللہ قریشی، 'اقبال کی باتیں اور ملاقاتیں' ص ۱۱۳-۱۱۲

تھے۔ کسی کام سے علامہ کو خط لکھا۔ ۱۴ر جولائی کو علامہ نے جواب دیا۔[1] علامہ نے جریدے اسلامک کلچر (*Islamic Culture*) کو پشتو شاعر خوشحال خاں خٹک پر مختصر مضمون بھیجا تھا۔ ۲۱ر جولائی کو رسالے کو لکھا کہ اشاعت پر ایبٹ آباد میں دو احباب کو کاپی بھیجی جائے۔ ایک پروفیسر شفیع تھے۔ دوسرے کوئی خان بہادر تھے۔ اسی روز پروفیسر شفیع کو بھی خط لکھ کر اطلاع دے دی۔[2]

عبدالرحمٰن چغتائی دیوانِ غالب کا مصوّر ایڈیشن تیار کر چکے تھے۔ مرقع چغتائی نام تھا۔ آئرلینڈ کے مصور اور نقاد ڈاکٹر جیمز کزنز (Dr. James Cousins) ڈبلیو بی ییٹس (W. B. Yeats) سے جھگڑنے کے بعد ہندوستان میں گھوم رہے تھے۔ انہوں نے دیباچہ لکھا۔ ۲۱ر جولائی کو علامہ نے مقدمہ تحریر کیا۔ اب تک چاروں شعری تصانیف میں اُصولِ فن کے موضوع پر جو کچھ لکھا تھا اُس کی تلخیص انگریزی میں ہو گئی۔

Muraqqa-i-Chughtai

Foreword
by Muhammad Iqbal

I welcome 'Murraqa-i-Chughtai' - Ghalib's illustrated Edition by Mr. M.A. Rahman Chughtai - a unique enterprise in modern Indian painting and printing. Unfortunately I am not competent enough to judge the technical side of painting, and refer the reader to Dr. Cousin's admirable introduction in which he has analysed some of the more important forces that are shaping Chughtai's artistic ideal. All that I can say is that I look upon Art as subservient to life and personality. I expressed this view as far back as 1914 in my Asrar-i-Khudi, and twelve years later in the last poem of the Zubur-i-Ajam, wherein I have tried to picture the soul-movement of the ideal artist in whom Love reveals itself as a unity of Beauty and Power.

دلبری بے قاہری جادو گری است　　　　دلبری با قاہری پیغمبری است

From this point of view some of the more recent paintings of Mr. Chughtai are indeed remarkable. The spiritual health of a people largely depends on the kind of inspiration, which their poets and artists receive.

---

[1] مکتوب بنام پروفیسر محمد شفیع ۱۴ر جولائی ۱۹۲۸ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۲۰۳-۲۰۲

[2] مکتوب بنام پروفیسر شفیع ۳۱ر جولائی ۱۹۲۸ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۲۰۳

But inspiration is not a matter of choice. It is a gift, the character of which cannot be critically judged by the recipient before accepting it. It comes to the individual unsolicited, and only to socialise itself. For this reason the personality that receives and the life-quality of that which is received are matters of the utmost importance for mankind. The inspiration of a single decadent, if his art can lure his fellows to his song or picture, may prove more ruinous to a people than whole battalions of an Attila or a Changez. As the Prophet of Islam said of Imra'ul Qais-the greatest Poet of Pre-Islamic Arabia.

اشعرالشعرأ وقائدھم الی النار

To permit the visible, to shape the invisible, to seek what is scientifically called adjustment with Nature is to recognise her mastery over the spirit of man. Power comes from resisting her stimuli, and not from exposing ourselves to their action. Resistance of what is with a view to create what ought to be, is health and life. All else is decay and death. Both God and man live by perpetual creation.

حسن را از خود بروں جستن خطاست　　　آنچہ می بایست پیش ما کجاست

The artist who is a blessing to mankind defies life. He is an associate of God and feels the contact of Time and Eternity in his soul. In the words of Fichte, he "sees all Nature full, large and abundant as opposed to him who sees all things thinner, smaller and emptier than they actually are." The modern age seeks inspiration from Nature. But Nature simply 'is' and her function is mainly to obstruct our search for 'ought', which the artist must discover within the deeps of his own being.

And in so far as the cultural history of Islam is concerned, it is my belief, that, with the single exception of Architecture, the art of Islam (Music, Painting and even Poetry) is yet to be born - the art, that is to say, which aims at the human assimilation of Divine attributes, (تخلقوا باخلاق اللہ) gives man infinite aspiration, (اجر غیر ممنون) and finally wins for him the status of God’s Representative on earth.

There are, however, indications to show that the young artist of the Punjab is already on the way to feel his responsibility as an artist. He is only twenty-nine yet. What his art will become when he reaches the maturer age of forty, the future alone will disclose. Meanwhile all those who are interested in his work will keenly watch his forward movement.

Lahore　　　Muhammad Iqbal　　　21st July, 1928[1]

---

[1] Razzaqi, *Discourses of Iqbal*, pp.312-314

47

اس برس چوتھی جماعت کے لیے اُردو کے زائد کورس رفیقِ طلبا کا دُوسرا ایڈیشن دی پنجاب سکول سپلائی ڈپو لاہور سے شائع ہوا۔ 'ہماری چار نامور ہستیاں' کے عنوان سے ایک سبق میں ڈاکٹر اقبال، مسز سروجنی نائیڈو، ڈاکٹر ٹیگور اور سر جگدیش چندر بوس کے حالات پیش کیے گئے تھے۔

ا۔ ڈاکٹر اقبال

ڈاکٹر سر محمد اقبال اس وقت ہندوستان کے اُن شاعروں میں سے ہیں۔ جن کی شہرت ساری دنیا میں ہو رہی ہے۔ آپ سیال کوٹ میں پیدا ہوئے تھے۔ ہندوستان میں ایم۔اے تک تعلیم پا کر ولایت چلے گئے۔ اور وہاں خوب پڑھا لکھا۔ اور بیرسٹری کا امتحان پاس کیا۔

پھر ہندوستان میں آ کر آپ نے ایسی اچھی نظمیں کہنی شروع کیں کہ ہر طرف آپ ہی کا نام لیا جانے لگا۔ پہلے آپ اُردو میں نظمیں کہتے تھے۔ اب فارسی میں کہتے ہیں۔ پچھلے دنوں آپ کی فارسی نظموں کی ایک کتاب کا ترجمہ انگریزی میں ہوا ہے۔ آپ کی نظموں ہی کی خوبیوں کی وجہ سے آپ کو "سر" کا خطاب ملا ہے۔[1]

48

چھوٹا سا جزیرہ تھا جہاں جوہرؔ لندن کے راستے میں اُترے۔ جزیرہ جتنا چھوٹا تھا اُتنا ہی مشہور بھی تھا۔ جوہرؔ نے لکھا:

> مالٹا تقریباً ویران سا اور غیر آباد جزیرہ ہے۔ لیکن اربوں بلکہ کھربوں روپیہ اس پر صرف کیا جا چکا ہے اور ایک ایک جہاز کروڑوں کی لاگت کا وہاں لنگر انداز ہے۔ توپیں بھی ہیں اور فوج بھی اور طیارے بھی۔ پانی میں سرنگیں بھی ضرور لگی ہوں گی۔ زرہ بکتر سے بھی قلعہ محفوظ ہو گا۔ مال و زر، محنت، دماغی قابلیت اور ہر طرح کی قربانیاں—

---

[1] ڈاکٹر حسن اختر ملک، اقبال، ایک تحقیقی مطالعہ، ص ۱۶۳-۱۶۴

کون سی چیز ہے جو اس ویران جزیرہ پر قربان نہیں کی جاچکی لیکن کس لیے؟ نہ اس لیے کہ انسانوں کو زندہ رکھا جائے یا ان کی مادی یا روحانی اصلاح کی جائے بلکہ صرف اس لیے کہ انسانوں کو انسان زیادہ تیزی کے ساتھ ہلاک کر سکے۔ سائنس کے تازہ سے تازہ انکشافات اِسی ایک مہلک مقصد کی نذر ہوتے رہتے ہیں اور اسی کا نام تہذیب اور امن ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس کا میرے دل پر کتنا اثر ہوا، اور نہ صرف دو گھنٹے جو ہم نے مالٹا کے ساحل پر گزارے بلکہ وہ سارا دن اور دراصل کم سے کم مارسیلز پہنچنے تک سارا وقت اسی غور و فکر میں گزارا کہ کیا اسی کا نام ارتقا ہے اور کیا ساری دنیا کو ایسی تہذیب کی تقلید کرنی ہو گی؟ اس کے بعد بارہا اقبال کے وہ شعر یاد آتے تھے:

اے سوارِ اشہبِ دوراں بیا[1]

امریکی رسالے دی مسلم ورلڈ *(The Muslim World)* میں ہارٹ فورڈ سیمنری کے عیسائی عالم پروفیسر ڈنکن بلیک میکڈونلڈ کا مقالہ ‘Continuous Re-Creation and Atomic Time in Moslem Scholastic Theology’ شائع ہوا۔ پچھلے برس یونیورسٹی آف شکاگو کے علمی جریدے آئسس (*Isis*) میں بھی شائع ہو چکا تھا۔ ارسطو نے کہا تھا کہ کائنات ایک ساکن وجود ہے۔ اس نظریے کے خلاف مسلمانوں کی ذہنی بغاوت کا پہلا مظہر نظریۂ جواہر (atomism) تھا۔ بصرہ کے ابوہاشم (متوفی ۹۳۳ء) اور بغداد کے ابوبکر باقلانی (متوفی ۱۰۱۲ء) نے اصول مرتب کیے۔ اسلامی عہد کے اندلس میں غیر مسلموں تک پہنچے۔ تیرہویں صدی کے آغاز میں اندلس کی اسلامی درس گاہوں سے تعلیم پانے والے یہودی عالم موسیٰ بن میمون (Moses Maimonides) نے اپنی کتاب دلیل الحائر میں نظریے کی باقاعدہ تشکیل کی۔ ۱۸۶۶ء میں سالمن منک (Salomon Munk) نے فرانسیسی میں ترجمہ کیا۔ میک ڈونلڈ کا مضمون اِسی کتاب کی وضاحت میں تھا۔ بدقسمتی سے علمی زاویے کے بجائے کالے علوم کی روشنی میں اسلامی تہذیب کا مطالعہ کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔ نفسیاتی عوامل کا

---

[1] ابوسلمان شاہجہانپوری (۱۹۹۳) علامہ اقبال اور مولانا محمد علی، ص ۷۸

اندازہ لگانے کی کوشش نہ کی جو اسلامی علمِ کلام میں نظریہ ٔجواہر کی نشو و نما کا باعث ہوئے تھے۔ علامہ سمجھتے تھے کہ میک ڈونلڈ نہیں چاہتے کہ مسلم فلسفیوں کی ندرتِ فکر کا اقرار کریں۔ اس لیے چھلانگ لگا کر اِس نتیجے پر پہنچ جاتے ہیں کہ مسلمانوں کے یہاں اِس فکر کی نشو و نما بدھ مت کے زیرِ اثر ہوئی:

> Professor Macdonald, however, has made no attempt to discover the psychological forces that determined the growth of atomistic kalam in Islam. He admits that there is nothing like the atomism of Islam in Greek thought, but, unwilling as he is to give any credit for original thought to Muslim thinkers, and finding a surface resemblance between the Islamic theory and the views of a certain sect of Buddhism, he jumps to the conclusion that the origin of the theory is due to Buddhistic influences on the thought of Islam.[1]

جرمن ماہرِ نفسیات کارل گستاو یونگ(Carl Gustav Jung)، نئی نفسیات کے بانیوں میں سے تھے۔ سولہ برس پہلے نظریہ پیش کیا کہ مذہب ایک مخلصانہ حیلہ ہے تا کہ جماعت پر کچھ اخلاقی بندشیں عائد کی جا سکیں۔ جماعت کے تانے بانے کو فرد کی اُن جبلتوں سے محفوظ رکھا جا سکے جنہیں ویسے نہیں روکا جا سکتا۔ دلیل یہ دی تھی کہ مذہب میں خودی کا تعلق کسی ایسی حقیقت سے قائم نہیں ہوتا جو ذات سے باہر واقع ہو (مثلاً خدا، وحی، فرشتہ)۔ اِس برس ان کے مقالات کا مجموعہ (*Contributions to Analytical Psychology*) آیا۔ لکھا تھا کہ شاعری کے مطالعے میں تحلیلی نفسیات (analytical psychology) اُس پہلو تک محدود رہتی ہے جو ظاہر ہو جائے۔ اصل اور ماخذ تک نہیں پہنچتی۔ ''کچھ ویسا ہی امتیاز ہمیں مذہب کے باب میں بھی قائم کرنا پڑے گا،'' یونگ کہہ رہے تھے، ''نفسیاتی لحاظ سے صرف مذہب کے جذباتی پہلو، یا رموز و کنایات سے بحث کی جا سکتی ہے۔ ان باتوں سے مذہب کی حقیقی ماہیت کا انکشاف ہوتا ہے نہ ہو سکتا ہے۔'' اس کے باوجود پرانے خیال پر بھی قائم تھے۔ علامہ کے نزدیک اُن کے نئے نظریے سے اُن کے پرانے خیال کی تردید ہوتی تھی۔[2]

---

[1] *Reconstruction*, Lecture III

[2] *Reconstruction*, Lecture VII

49

حکیم عبدالکریم ثمرؔ اُردو اور پنجابی کے شاعر تھے۔ اُن سے روایت ہے کہ علامہ نے اس برس سیالکوٹ کی انجمن اسلامیہ کی صدارت کی۔[1]

50

اگست میں علامہ کا کافی وقت شملہ میں گزرا۔ عبداللہ چغتائی کا بیان ہے کہ علامہ انہیں ساتھ لے کر کالکا ریلوے اسٹیشن سے موٹر میں بیٹھ کر شملہ گئے۔ راستے میں میر غلام بھیک نیرنگ ان سے ملے۔ پھر فلسفے کے پروفیسر دیوان چند بھی پہنچ گئے۔ انقلاب نے علامہ کا پروگرام اس طرح بیان کیا تھا کہ ''شملہ میں ایک دو روز کے لیے اپنے رشتہ دار جناب سعید الرحمان صاحب کے ہاں قیام فرمائیں گے، پھر نواب ذوالفقار کی کوٹھی 'نوبہار' میں نواب صاحب کے پاس چلے جائیں گے۔'' سعید الرحمان شاید علامہ کی مرحوم بیوی مختار بیگم کے وہی رشتہ دار ہوں جن کے متعلق چغتائی کا بیان ہے کہ شملہ ہی میں علامہ کی دعوت کی۔ نواب سر ذوالفقار علی خاں، سر فیروز خاں نون اور پروفیسر تاثیر بھی آئے۔ کباب عمدہ تھے۔ چغتائی کھاتے کھاتے تھک گئے۔ علامہ نے ان کی طرف دیکھا اور کہا، ''ماسٹر خورد و مُرد'' [ماسٹر کھا کر مر گیا]۔ انداز تاریخِ وفات کے مصرع جیسا تھا۔[2]

51

آل پارٹیز کانفرنس کی رپورٹ اگست میں شائع ہوئی۔ کمیٹی ۱۹/ مئی کو قائم ہوئی تھی۔ صدر پنڈت موتی لال نہرو تھے۔ عوام نے کمیٹی کی پیشکش کو ''نہرو رپورٹ'' کا نام دیا۔ کچھ حصے اخبارات میں علامہ

---

[1] پاک ڈائجسٹ ستمبر ۱۹۷۰ء کے حوالے سے شاہین (۱۹۷۶) اور اوراقِ گم گشتہ، ص ۱۴۲؛ اس روایت کے مطابق ''ایک خوش الحان نعت گو نے مولانا احمد رضا خان بریلویؒ کی نعت 'رضائے خدا ہے رضائے محمدؐ' پڑھی۔ علامہ اس سے بیحد متاثر ہوئے اور ارتجالاً دو شعر کہے:

تماشا تو دیکھو کہ فردوسِ اعلیٰ   بنائے خدا اور بسائے محمدؐ

تعجب تو یہ ہے کہ دوزخ کی آتش   لگائے خدا اور بجھائے محمدؐ''

[2] انقلاب ۲۰/ جون ۱۹۲۸ء؛ فاروقی، ص ۷۹-۳۷۔ چغتائی، اقبال کی صحبت، ص ۲۲۶-۲۲۵، ۴۷

کی نظر سے گزرے۔ یہ معلوم نہیں ہے کہ کون سے حصے تھے۔ پوری رپورٹ کے مطالعے کے بعد جن حصوں پر خصوصیت کے ساتھ بحث کی، مندرجہ ذیل ہیں۔

All Parties Conference 1928
REPORT OF THE COMMITTEE APPOINTED BY THE CONFERENCE
to determine the principles of the Constitution for India
[NEHRU REPORT]

Published by the General Secretary, All India Congress Committee

[Excerpts]

It was suggested that the N.W.F.P. Province be amalgamated with the Punjab and that there should then be no reservation of seats in this province. We have no objection to this proposal but we do not know how far this will meet the different view points of the parties concerned. If it does meet with their approval, we would gladly recommend it. There is no special principle involved in it. Its acceptance or otherwise depends entirely on whether it is approved or not. Our colleague Sardar Mangal Sindh does not approve of the proposal and we understand that some other people also are of his opinion. We therefore make no recommendation in regard to it.

A similar but more far reaching proposal was made to us, recommending that the Punjab, the NWFP province, Baluchistan and Sind should all be amalgamated together, and that there should be no reservation of seats, unless the minority desires it, in the area. We were unable to entertain this proposal. It would mean the creation of an unwieldy province sprawling all over the north and north-west.

*

Every one knows that the present distribution of provinces in India has no rational basis. It is merely due to accident and the circumstances attending the growth of the British power in India. As a whole it has little to do with geographical or historical or economic or linguistic reasons. Even from the purely administrative point of view it is not a success. It is clear that there must be a redistribution of provinces…

What principles should govern this redistribution? Partly geographical and partly economic and financial, but the main considerations must necessarily be the wishes of the people and the linguistic unity of the area concerned. It is well recognised that rapid progress in education as well as in general cuture and in most

departments of life depends on language … If a province has to educate itself and do its daily work through the medium of its own language, it must necessarily be a linguistic area. If it happens to be a polyglot area difficulties will continually arise and the media of instruction and work will be two or even more languages. Hence it becomes most desirable for provinces to be regrouped on a linguistic basis. Language as a rule corresponds with a special variety of culture, of traditions and literature. In a linguistic area all these factors will help in the general progress of the province.

*

We believe that the representation of the army in the legislature by a responsible minister, who will, in actual administration, no doubt be guided by expert advice, is bound to lead to the establishment of more intimate relations between the army and the legislature, and thus secure a continuous supply of funds for the army … As a matter of further precaution, we have provided for the establishment of a Committee of Defense, based more of less on well known models…

75 (a) The Governor-General in Council shall appoint a Committee of Defence consisting of (1) the Prime Minister, (2) the Minister of Defence, (3) the Minister of Foreign Affairs, (4) the Commander-in-Chief, (5) the Commander of the Air Forces, (6) the Commander of the Naval Forces, (7) the Chief of the General Staff, and two other experts.

(b) The Prime Minister shall be the chairman of the committee; and there shall be a permanent staff including a secretary attached to this committee.

(c) The functions of this committee shall be to advise the government and the various departments concerned with questions of defence and upon general questions of policy.

(d) As soon as the committee is appointed the Governor-General in Council may take the advice of the Committee of Defence as to the practicability and means of effecting a retrenchment in the expentidury on defence compaitibly with the safety of India. The estimates shall be framed according to the recommendations of the committee.

76 The proposals of the Governor-General in Council for the appropriation of revenues or monies classified as ‘Defence’, shall be submitted to the vote of the House of Representatives.

77 Notwithstanding anything to the contrary in the foregoing provisions, the Governor-General in Council may, in the event of any foreign aggression on India by land, air or sea, or upon his being satisfied that there is a reasonable apprehension of such aggression, authorise such expenditure as may be necessary for the safety of British India or any part thereof. Such action taken by the Governor-General shall be reported by him immediately to the legislature, if in session, or if the legislature is not in session, to a special session to be summoned as soon as possible thereafter.

78 No measure affecting the discipline or maintenance of any part of the military, naval and air forces of the Commonwealth shall be introduced in Parliament except on the recommendation of the Committee of Defence appointed under this constitution.[1]

اخبارات میں نہرو رپورٹ کے کچھ حصے دیکھ کر علامہ نے ۲۰ اگست کو ایسوسی ایٹڈ پریس کو بیان دیا:

> رپورٹ صحیح الدماغی کا ایک نمونہ ہے اور اس سے ملک کے اہم آئینی مشکلات کے حل کرنے کی حقیقی خواہش کا اظہار ہوتا ہے۔ ہر ایک ہندوستانی ان ممتاز ہندوستانی قانون دانوں کی مرتب کردہ رپورٹ کو فخر و مباہات کے جذبات کے بغیر مطالعہ نہیں کرے گا ... اِس ملک کی جماعتیں اس رپورٹ کی طرف پوری توجہ دیں اور بجائے فرقہ وار تنازعات میں اپنا وقت ضائع کرنے کے دستورِ اساسی کے متعلق کسی مستحسن باہمی سمجھوتے پر پہنچیں۔ اسی پر ملک کی موجودہ نجات اور آیندہ عظمت کا انحصار ہے۔

رپورٹ کی تجاویز سے اختلافات بھی ظاہر کیے:

ا رپورٹ نے حکومت مستعمرات (Dominion Status) کا مطالبہ کیا تھا۔ علامہ متفق تھے۔ مگر اِس طرح "لالہ لاجپت رائے اور بعض اسلامی جرائد کے ان منافقانہ دلائل کا بخوبی انکشاف ہو جاتا ہے جو وہ اس امر کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں کہ ہندوستان کی آزادی دنیائے اسلام کی آزادی کے مترادف ہے۔"

---

[1] All Parties Conference 1928 (a) *Report of the Committee,* pp.32, 37-38, 120-121-

اِن اقتباسات کا علامہ کے خطبۂ اِلہ آباد میں حوالہ دیا گیا۔

۲ رپورٹ نے جداگانہ نیابت کا اُصول ترک کر دیا۔ علامہ کے نزدیک یہ مناسب نہ تھا۔ بالخصوص پنجاب اور بنگال کے مسلمانوں کے ساتھ زیادتی تھی۔

۳ رپورٹ نے تمام بالغوں یعنی ۲۰ برس یا زیادہ عمر والے مردوں اور عورتوں کے لیے ووٹ کا مطالبہ کیا۔ مخلوط نیابت کی صورت میں مسلمانوں کے لیے اضافی دقتیں پیدا کر سکتی تھی:

ا پنجاب میں ۲۰ سال کے مسلمان بالغوں کی تعداد تمام بالغ مردوں کے مقابلہ میں ۵۴ فیصد تھی جبکہ کل آبادی کے لحاظ سے مسلمانوں کا تناسب ۵۶ فیصد تھا۔ اس دو فیصد خسارے سے ہندوؤں اور سکھوں کے تناسب آبادی میں دو فیصد کا اضافہ ہوتا۔ انہیں ۴۶ فیصد نیابت ملتی جبکہ کل آبادی میں تناسب ۴۴ فیصد تھا۔

ب پنجاب کی بالغہ خواتین میں سے مسلمان خواتین ۵۵ فیصد تھیں۔ نسبتاً زیادہ قدامت پسند تھیں۔ مستقبل قریب میں پولنگ اسٹیشن پر جانا مشکل تھا۔ غیر مسلم خواتین مقابلتاً ترقی یافتہ تھیں۔ زیادہ تعداد میں پولنگ اسٹیشن پر جاتیں۔ مسلمانوں کی نشستوں کی تعداد مقرر نہ کی گئی تھی۔ اس طرح یہ تعداد مزید کم ہونے کا امکان تھا۔

ج رپورٹ میں کہا گیا کہ ایک لاکھ آبادی کی طرف سے ایک نمایندہ ہو۔ پنجاب میں حلقہ جات کی از سرِ نو تقسیم کرنی پڑتی۔ مسلمانوں کی اکثریت اقلیت میں بدل جاتی۔

۴ سندھ کی علیحدگی بعض تجاویز کے ساتھ مشروط کی گئی۔ اسے غیر مشروط ہونا چاہیے۔

۵ حقوق شہریت کے تحت کچھ تجاویز پیش کی گئیں۔ علامہ سمجھتے تھے کہ قابلیت کا معیار مقرر ہونا چاہیے تاکہ ہر قوم انتظامِ ملک میں کافی حصہ دار ہو۔ فرقہ وارانہ رقابت کا موقع نہ ملے۔ تمام اقوام کی درسگاہوں کو بلا لحاظِ مذہب و ملت گرانٹ دینے کی تجویز کے ساتھ کہا گیا کہ تب ہو جب حکام انتظام کر دیں۔ علامہ کے خیال میں تجویز مبہم تھی۔ اُمید تھی کہ مطلب یہ رہا ہو گا کہ اچھوتوں وغیرہ کے لیے ایک ہی اسکول میں جداگانہ تعلیم کا انتظام ہو جائے۔

پوری رپورٹ کے مطالعے یا مزید گفت و شنید اور غور و فکر کے بعد علامہ اس نتیجے پر پہنچنے والے تھے کہ رپورٹ ''ہندوستانی پنڈتوں'' کی خواہش کی آئینہ دار ہے۔ چاہتے ہیں کہ ہندوستان میں حکومتی ڈھانچہ

قریباً ویسا ہی رہے جیسا انگریزوں نے تخلیق کیا۔ صرف انگریزوں کے ہاتھ سے نکل کر ہندوستانی پنڈتوں کے ہاتھ میں چلا جائے۔ اِس لیے رپورٹ نے اگرچہ وفاقی (federal) طرزِ حکومت کا نام لے کر عملاً وحدانی (unitary) آئین پیش کر دیا۔ مابقی اختیارات (residuary powers) صوبوں کو تفویض نہ کیے۔ صوبائی خود اختیاری کا بندوبست نہ کیا۔ علامہ اس کے مخالف تھے۔

کمیونلزم (communalism) کی اصطلاح چند برسوں میں زیادہ استعمال ہونے لگی تھی۔ اُردو میں فرقہ واریت، فرقہ پرستی اور فرقہ داری کہا جاتا۔ جوہر "ملّیت" کہتے تھے۔ مطلب تھا اپنے فرقے یا ملّت، مثلاً ہندومت یا اسلام، کے حوالے سے چیزوں کو دیکھنا۔ علامہ نے نوٹ کیا کہ نہرو رپورٹ نے کمیونلزم کی مذمت کرتے ہوئے بھی تسلیم کیا تھا کہ ہر سطح پر مذمت نہیں کی جا سکتی۔ قوم (nation)، مثلاً ہندوستان کے نقطۂ نظر سے کمیونلزم کی مکمل نفی کرنا ایسا ہی ہو گا جیسے بین الاقوامیت کے نقطۂ نظر سے ملک و قوم کو تسلیم کرنے سے انکار کیا جائے۔

رپورٹ کی ایک تجویز سے علامہ متفق تھے۔ فوجی معاملات اس وقت منتخب اداروں کی دسترس سے باہر تھے۔ رپورٹ نے تجویز کیا کہ دوسرے جمہوری ممالک کا طریقِ کار اپنایا جائے۔ کمیٹی آف ڈیفنس تشکیل دی جائے۔ وزیر اعظم کے ماتحت ہو۔ وزیرِ دفاع، وزیرِ خارجہ، فوج کے مختلف شعبوں کے سربراہان اور ماہرین اس کے رکن ہوں۔[1]

52

تمکین کاظمی 'اسرارِ خودی' کا ترجمہ غالباً اُردو میں کرنا چاہتے تھے۔ ۲۲/ اگست کو اُن کا خط ملا۔ علامہ نے اُسی وقت جواب لکھا:

> مَیں ذاتی طور پر ترجموں کا قائل نہیں ہوں۔ تاہم آپ چند اشعار ترجمہ کر کے بھیجیے تو میں رائے دینے کے قابل ہو سکوں گا۔ اس سے پہلے جو نمونے تراجم کے وصول ہوئے

---

[1] ۲۰/ اگست کے بیان کے لیے دیکھیے محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص بحوالہ انقلاب ۲۱/ اگست ۱۹۲۸ء۔ بقیہ نکات کے لیے خطبۂ الٰہ آباد، جسے ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کے واقعات کے تحت دیکھا جا سکتا ہے۔

> بہت ناقص تھے۔ میں نے خود اسرارِ خودی پہلے اُردو میں لکھنی شروع کی تھی مگر مطالب ادا کرنے سے قاصر رہا۔ جو حصہ لکھا گیا تھا اس کو تلف کر دیا گیا۔ کئی سال بعد پھر یہی کوشش میں نے کی۔ قریباً ڈیڑھ سو اَشعار لکھے مگر میں ان سے مطمئن نہیں ہوں۔[1]

'اسرارِ خودی' کا جو حصہ پہلے اُردو میں لکھا گیا وہ شاید 'قربانیٔ خلیل' والی نظموں کا سلسلہ رہا ہو گا۔ اس صورت میں ''تلف کر دینے'' سے یہ مراد لی جا سکتی ہے کہ اشاعت نہ کی۔ بیاض میں رہنے دیا۔ ورنہ ممکن ہے کوئی دوسرے اشعار ہوں۔ مکمل طور پر ضائع کر دیے۔ ''کئی سال بعد پھر یہی کوشش'' جو علامہ نے کی اُس کے بارے میں تجسس پیدا ہوتا ہے۔ خط کی عبارت سے لگتا ہے جیسے وہ ''قریباً ڈیڑھ سو اَشعار'' اُس وقت تک محفوظ تھے۔ اسی لیے لکھا، ''میں اُن سے مطمئن نہیں ہوں۔'' اگر بعد میں کبھی ان کی اصلاح کر کے کوئی نظم بر آمد کی تو 'ساقی نامہ' کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی۔ ننانوے اشعار کی کامیاب اُردو مثنوی ہے۔ اس کے کچھ اشعار ۲۰ / دسمبر ۱۹۲۷ء کو اخبار میں شائع بھی ہو چکے تھے۔ پوری نظم بالِ جبریل میں شامل ہو کر ۱۹۳۵ء میں سامنے آئی۔

۲۹ / اگست کو لاہور میں باغ بیرون موچی دروازہ میں میلاد النبیؐ کا جلسۂ عام تھا۔ احمدیہ انجمن اشاعتِ اسلام نے اہتمام کیا۔ تمام اسلامی جماعتوں کو شرکت کی دعوت دی۔ اعلان ہوا کہ علامہ اقبال صدارت کریں گے۔[2] اگر جلسہ پروگرام کے مطابق ہوا تو پھر علامہ کا خطبۂ صدارت یا اُس کا ترجمہ ہی رہا ہو گا جسے احمدی اخبار لائٹ نے اگلے روز شائع کیا۔

Divine Right to Rule

[Excerpt]

...On one occasion a party of Muslims, including the Prophet, was out on a journey and when at meal times everyone took some part in the

---

[1] مکتوب بنام تمکین کاظمی ۲۲ / اگست ۱۹۲۸ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۷۰۴

[2] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸)، حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۲۷۶ بحوالہ انقلاب ۲۶ / اگست ۱۹۲۸ء

cooking, the Prophet began to collect fuel as his part of the work. When his followers implored that he need not trouble himself, he simply replied that he must do his own work.

Such was this most mighty monarch the world has ever seen-the monarch who ruled not only the bodies, but also the hearts of his people, the monarch without an army, without a palace, without a treasury, without any of the numerous instruments with which earthly monarchs keep their people in due subjection ... History knows but one monarch whose rule over men may justly he called a rule by divine right and that one man was the Prophet of Islam. And yet, though the ruler of men by right divine, he never claimed to be a ruler! 'I am but a man like unto you,' was the grand message of this greatest of kings to an adoring humanity.

Light, Lahore, 30 August 1928[1]

53

۲۸ر سے ۳۱ر اگست تک لکھنؤ میں آل پارٹیز کانفرنس کا اجلاس ہوا۔ مقصد نہرو رپورٹ کی منظوری تھا۔ کانگریس، ہندو مہاسبھا، مرکزی خلافت کمیٹی، جمعیت العلمأ اور بعض دوسری جماعتیں شریک ہوئیں۔ مسلم لیگ کے دونوں گروپوں میں سے کسی نے شرکت نہ کی۔ راجہ محمود آباد، ظفر علی خاں اور بعض دوسرے لیگی رہنما اپنے طور پر آئے۔ نہرو رپورٹ اصولی طور پر منظور ہوئی۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے اس لیے مخالفت کی کہ رپورٹ میں درجۂ استعمرات کا مطالبہ تھا۔ جواہر کامل آزادی چاہتے تھے۔ پنجاب کے مسلمان، ہندو اور سِکھ نمایندوں نے ایک علیحدہ میثاق کیا۔ ملتوں کی نمایندگی کے بارے میں نہرو رپورٹ کی اسکیم قبول کی گئی۔ کونسل میں کسی ملت کے لیے نشستیں مخصوص نہ ہوں اور مخلوط انتخاب ہوں بشر طیکہ ہر بالغ شخص کو ووٹ ڈالنے کا حق ہو۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو، مولانا ظفر علی خاں، ڈاکٹر محمد عالم، عبدالرحمٰن غزنوی، داؤد غزنوی، چودھری افضل حق، سراج الدین پراچہ، عبدالقادر، حسام الدین، سردار سردول سنگھ کویشر، لالہ لاجپت رائے، لالہ دونی چند، پنڈت ہردتّا شرما، ڈاکٹر ستیاپال اور لالہ گردھاری لال نے دستخط کیے۔ ماسٹر تارا سنگھ اور گیانی شیر سنگھ نے کچھ تحفظات کے ساتھ دستخط کیے۔ مولانا شوکت علی نے زبردست احتجاج کیا۔ انہوں نے کہا کہ مرکزی خلافت

Sherwani, pp.166-167[1]

کمیٹی کا موقف کچھ اور ہے۔ میثاق پر دستخط کرنے والوں میں پنجاب کے خلافتی رہنما شامل تھے۔ اُن کی طرف سے ڈاکٹر عالم اور عبدالقادر نے جواب دیا کہ مولانا شوکت اعتراض کرنے کا حق نہیں رکھتے۔

یہ خلافت کمیٹی میں اُس اختلاف کا آغاز تھا جس کے نتیجے میں کمیٹی کے نیشنلسٹ ارکان مجلسِ احرار کے نام سے علیحدہ جماعت بنانے والے تھے۔ کانفرنس کے فوراً بعد مولانا شوکت کی طرف سے تلخ بیانات اخبارات میں آئے۔[1]

54

۲ر ستمبر کو نواب بہاولپور صدیق محمد عباسی نے علامہ کے تقررنامے پر دستخط کیے۔ دربار کے قانونی مشیر مقرر ہوئے تھے۔ تنخواہ ایک ہزار روپیہ ماہوار تھی۔ لاہور سے باہر سفر کی صورت میں سفر کا الاؤنس بھی ملنا تھا۔ اس کی شرح وہی ہوتی جو ریاست کے وزیروں کے لیے تھی۔ ریاست میں اُن کا رتبہ ہمیشہ ریاست کے مہمان کا رہتا۔ علامہ ان شرائط پر ملازمت قبول کر چکے تھے:

> My dear Sir Iqbal,
>
> As you have now agreed to the terms governing your appointment as legal advisor to Bahawalpur Durbar, I write to inform you that your appointment takes effect from 1st August 1928. This appointment will be for one year in the first instance. It will carry a salary of Rs.1000/- per mensum, travelling allowance will be chargeable, when out of Lahore, at the rate portioned for ministers in the state. At Bahawalpur you will always be treated as guest of the state.
>
> Sadiq Muhammad Abbasi[2]

نواب بہاولپور کا خط علامہ کے نوادرات میں محفوظ ہے۔ مزید تفصیلات دستیاب نہیں ہیں۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ملازمت کب تک برقرار رہی۔ کیا خدمات انجام دی گئیں۔

اِس دستاویز کی روشنی میں حکیم محمد یوسف حسن کی روایت درست معلوم نہیں ہوتی کہ وہ علامہ کے پاس بیٹھے تھے جب چودھری محمد حسین نے علامہ کے نام نواب بہاولپور کا تار موصول کیا۔ نواب

---

[1] Mitra *The Indian Quarterly Register July-Dec.1927,* pp.62-91

[2] ظفر علی راجا ایڈووکیٹ (۲۰۱۳) قانون دان اقبال، ص ۵۳۴

نے شکریہ ادا کر کے لکھا تھا کہ ملاقات کے لیے بہاولپور آئیں۔ علامہ نے جواب دیا، ”نواب صاحب نے مجھے اپنا ملازم سمجھ لیا ہے۔۔۔ لکھ دیجیے مجھے فرصت نہیں۔“ حکیم یوسف کے مطابق ”وہ موقع ایسا تھا کہ اگر ڈاکٹر صاحب [علامہ اقبال] نواب صاحب کے پاس پہنچ جاتے تو وہ اُنہیں دس پندرہ ہزار روپیہ ضرور دے دیتے مگر اس مردِ خودآگاہ کو کون خرید سکتا تھا۔“ اِس تار کے پس منظر کے بارے میں حکیم یوسف کہتے ہیں کہ ایک اور موقع پر محمد حسین نے انہیں بتایا کہ نواب اپنا وزیر اعظم تبدیل کرنا چاہتے تھے۔ وائسرائے نے بات نہ سنی۔ نواب نے سوچا، ”میری اِس مشکل کو اگر کوئی حل کرا سکتا ہے تو وہ صرف ڈاکٹر اقبال ہیں۔“ علامہ نے چار ہزار روپیہ فیس پر حامی بھری۔ دہلی پہنچے۔ ملاقات کا وقت لیے بغیر وائسرائے کے پاس گئے۔ اُس کے سیکرٹری کے ذریعے وزیٹنگ کارڈ بھجوایا۔ وائسرائے نے بلوایا۔ علامہ نے کہا کہ بہاولپور کے وزیر اعظم کو تبدیل کر دیا جائے۔ وائسرائے نے عذر پیش کیا۔ علامہ نے اس کے خلاف دلیل دی۔ وائسرائے کو ”انکار کرتے نہ بنی“۔ پھر کہا، ”اب آپ پرسوں میرے ساتھ کھانا کھائیں۔“ علامہ نے جواب دیا، ”میں تو آج ہی واپس جا رہا ہوں۔“ وائسرائے نے کہا، ”اچھا تو کل سہی۔“ علامہ نے کہا، ”میں تو آج ہی واپس جاؤں گا۔ کل تک نہیں ٹھہر سکتا۔“ وائسرائے نے کہا، ”میری خواہش تھی کہ آپ کے ساتھ کھانا کھانے کی بھی خوشی حاصل کرتا۔“ علامہ نے کہا، ”یہ خواہش ہے تو آج ہی کھانا کھلا دیجیے۔“[1]

55

تمکین کاظمی نے 'اسرارِ خودی' کے کسی حصے یا پوری مثنوی کا (غالباً اُردو میں) ترجمہ بھیجا تھا۔ ۴؍ ستمبر کو علامہ نے لکھا، ” افسوس کہ ناقص اور بعض بعض جگہ غلط ہے۔ میری رائے میں اس ترجمے سے اُردو لٹریچر کو کچھ فائدہ نہ ہو گا۔ محض لفظی ترجمہ ادبی اعتبار سے بے سود بلکہ شاید مضر ہے۔ میری دوستانہ رائے یہ ہے کہ آپ اپنے اوقات کے لیے کوئی بہتر مصرف تلاش کریں۔ امید ہے کہ اس بے

[1] شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص۵۸-۵۶ پر نقوش کے افسانہ نمبر (۱۹۶۸) سے محمد طفیل کے مضمون 'حکیم صاحب' سے حکیم یوسف کا بیان۔

لاگ رائے سے آپ ناخوش نہ ہوں گے۔"[1]

اُس روز فری پریس کے نمایندے نے ملاقات کی۔ علامہ نے لکھنو کانفرنس میں سر علی امام کے موقف پر تنقید کی۔ پھر کہا:

> ہندوستان کا مسلمان اب اُس جذبہ کو از سرِ نو سمجھنے اور اُس کی قدر و قیمت مقرر کرنے پر مجبور ہو جائے گا، جسے 'ہندی قومیت' کے جذبہ سے موسوم کیا جاتا ہے۔ جونہی وہ اس امر پر غور کرے گا وہ اپنے آپ کو مولانا شوکت علی کی طرح پائے گا جن کی آنکھیں اب کھل چکی ہیں... تمام باتیں مسلمانوں کے احساس عدم اعتماد کو مستحکم و مضبوط کرنے کا موجب ہوں گی... پنجاب کے مسلمانوں کو اگر قانون ساز مجالس اور ملازمتوں میں ان کا مناسب حصہ دے دیا جائے تو وہ پوری طرح مطمئن اور قانع ہو جائیں گے۔ انہیں اقتدار و تفوّق قائم کرنے کی ہرگز خواہش نہیں... ان صوبجات میں جہاں ان کی اکثریت ہے، اکثریت کے حقوق کے متعلق ہندوؤں کا مطالبہ میری رائے میں نہایت منصفانہ ہے۔ اگرچہ اس کی زد صوبجاتِ متحدہ اور مدراس کی مسلمان اقلیتوں کے بڑھتے ہوئے حقوق پر پڑتی ہے۔ میں ان صوبجات سے جن میں مسلمانوں کی اقلیت ہے، درخواست کرتا ہوں کہ وہ اس معاملہ پر وسیع ہندوستان گیر اسلامیہ زاویۂ نگاہ سے غور کریں۔[2]

ستمبر زیادہ تر شملہ ہی میں گزرا۔ لکھنا پڑھنا ان دنوں کم کر دیا۔ ارادہ تھا کہ لاہور واپسی پر فرصت کے اوقات میں مدراس والے خطبات لکھیں۔[3]

ہندو اخبار بھیشم نے خبر چھاپی کہ علامہ ریاستِ بہاولپور کے چیف منسٹر ہو گئے ہیں۔ انقلاب نے ۶/ اور ۷/ ستمبر کے شماروں میں تردید کی۔ بعض حلقوں میں غلط فہمی باقی رہی۔ علامہ کے روزگار پر

---

[1] مکتوب بنام تمکین کاظمی ۴/ ستمبر ۱۹۲۸ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۷۰۴

[2] انقلاب ۶/ ستمبر ۱۹۲۸ء؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۷۲-۶۹

[3] مکتوب بنام تمکین کاظمی، ۱۸/ ستمبر ۱۹۲۸ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۷۰۸-۷۰۷

بر ااثر پڑ سکتا تھا۔ لاہور میں جن لوگوں سے مقدمات مل سکتے تھے انہیں تردد ہوتا کہ علامہ شہر سے جا رہے ہیں۔ ۱۴/ستمبر کے شمارے میں نقلاب نے پھر لکھا کہ خبر غلط ہے۔[1]

پچھلے برس ۱۹/دسمبر کو نواب ذوالفقار کے ساتھ جناح کے خلاف مشترکہ بیان دیا تھا۔ اُس میں کہا تھا، ''ہم اس بات کو زمانۂ مستقبل پر چھوڑتے ہیں جو ہمارے اِس استقلال کا انصاف کرے گا۔'' اب محسوس کیا ہو گا کہ وقت نے اُن کے حق میں فیصلہ دے دیا ہے۔ مسلم رہنماؤں کی اکثریت نہرو رپورٹ کو موجودہ شکل میں قبول نہ کر سکتی تھی۔ خود جناح قبول نہ کرتے۔ جمعیت العلماٗ اور مرکزی مجلسِ خلافت ہمیشہ کانگریس کی ہمنوا رہی تھیں۔ اب مخالفت کر رہی تھیں۔

کم ہی مسلم رہنما کانگریس کے ساتھ رہ گئے۔ مسلمان عوام اُن کی بات سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ ۱۵/ستمبر کو لاہور میں انہوں نے جلسہ کرنے کی کوشش کی۔ مولانا عطأاللہ شاہ بخاری صدارت کر رہے تھے۔ مقررین میں چودھری افضل حق، مولانا ظفر علی خاں، مولانا حبیب الرحمان لدھیانوی اور ڈاکٹر محمد عالم شامل تھے۔ لوگوں نے سننے سے انکار کر دیا۔ اینٹیں پھینکیں۔ مولانا ظفر کا سر اور عطأاللہ شاہ بخاری کی پیشانی زخمی ہو گئی۔[2]

شملہ میں قانون ساز اسمبلی کے موسمِ خزاں کے اجلاس میں کانگریس کے ایک ہندو رُکن نے نہرو رپورٹ کے حق میں قرارداد پیش کرنے کی اجازت چاہی۔ مسلمان اراکین نے اندیشہ محسوس کیا۔ ۱۰/ستمبر کو نواب ذوالفقار کے ساتھ مل کر بیان جاری کیا۔ مسلمانوں کی تمام جماعتوں کی کانفرنس بلا کر رپورٹ کے بارے میں متفقہ رائے قائم کی جائے گی۔ اسمبلی میں نہرو رپورٹ کے حق میں قرارداد پر

---

[1] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸) حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے ص ۳۷۳

[2] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸)۔ جعفر بلوچ (۱۹۵۵)، ص ۱۲۰-۱۲۱ پر اشرف عطا کی کتاب کچھ شکستہ داستانیں، کچھ پریشاں تذکرے ص ۶۲-۶۳ کے حوالے سے لکھا ہے کہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کے ایک جلسے میں علامہ کی تقریر کو چودھری افضل حق نے یہ کہہ کر برہم کرنے کی کوشش کی کہ ''دوزخ کو بھر دیں گے شاعر ہمارے''۔ پھر ''اُس جلسے کا جواب دینے کے لیے'' یہ جلسہ ہوا جس میں عطااللہ بخاری اور ظفر زخمی ہوئے۔ مگر یہ جلسہ ۱۵/ستمبر ۱۹۲۸ء کو ہوا جبکہ مسلم کانفرنس کا پہلا اجلاس دسمبر کے آخر میں دہلی میں تھا۔ یہ مسلم کانفرنس کے کسی جلسے کا جواب کیسے ہو سکتا تھا۔

بحث کی تاریخ ۱۸ر ستمبر تھی۔ جس کانگریسی رکن نے قرارداد پیش کرنا تھی وہ نہ آئے۔ ریکارڈ میں لکھا گیا کہ نہرو رپورٹ کے حق میں قرارداد پیش ہونی تھی مگر نہ ہو سکی۔ مسلمان اراکین نے اسے موتی لال نہرو کی ہوشیاری سمجھا۔ قرارداد پیش ہوتی تو مسلمانوں کی مخالفت اسمبلی کے ریکارڈ میں آ جاتی۔ اب صرف یہ بات ریکارڈ میں آئی کہ نہرو رپورٹ اسمبلی میں بحث کے قابل ہے۔[1]

اُس روز علامہ کو تمکین کاظمی کا خط ملا۔ زبورِ عجم پر مضمون لکھنے کی اجازت طلب کی تھی۔ علامہ نے جواب دیا، "شوق سے مضمون لکھیے۔ میری طرف سے اجازت ہے..."[2]

56

حیدرآباد دکن کے جریدے اسلامک کلچر کے اکتوبر کے شمارے میں علامہ کا مضمون 'خوشحال خاں خٹک' ('Kushhal Khan Khattak') شائع ہوا۔[3]

علامہ نے لکھا تھا کہ افغان نسل کے متحد ہونے کا عمل وسط ایشیا کی تاریخ کے دلچسپ ترین ابواب میں سے ہے۔ اس تحریک کی سب سے نمایاں شخصیات ہندوستان میں بہلول لودھی اور شیر شاہ سوری، سرحدی قبائل میں خوشحال خاں خٹک اور پیر روشن، اور خاص افغانستان میں امیر عبدالرحمٰن مرحوم اور اُن کے پوتے شاہ امان اللہ خاں ہیں۔ جدید افغانستان کی حکومت کی اولین ذمہ داری یہ ہونی چاہیے کہ خوشحال خاں خٹک (۱۶۸۹-۱۶۱۳) کا تنقیدی مطالعہ اور اُس کے کلام کا مکمل مجموعہ تاریخی حوالہ جات کے ساتھ تیار کروائے۔ خوشحال نے ہندوستان کی مغل حکومت کے خلاف مسلح جدوجہد کی۔ شاعری، فلسفہ، اخلاقیات اور طب کے موضوعات پر قلم اُٹھایا۔ خودنوشت سوانح بھی لکھی۔ بدقسمتی سے ضائع ہو چکی ہے۔ ان کی شاعری میں قدیم عرب شاعری کی روح جھلکتی ہے، مثلاً سادہ اور دوٹوک طرزِ بیان، آزادی اور جنگ سے رغبت، اور زندگی پر تنقید۔ خوشحال نے اورنگزیب پر سخت تنقید کی ہے۔ یہ نہ بھولنا چاہیے کہ یہ ایک دشمن کی رائے ہے۔ اس نے اورنگزیب کے ہاتھوں طویل

---

[1] Hafizur Rahman, *Report of the All-India Muslim Conference*

[2] مکتوب بنام تمکین کاظمی، ۱۸ر ستمبر ۱۹۲۸ء محولہ بالا

[3] مضمون کئی ماہ پہلے لکھ کر بھیجا گیا: دیکھیے ۲۱ر جولائی ۱۹۲۸ء کے واقعات

عرصہ تک قید کی صعوبت اٹھائی، وہ بھی ہندوستان میں جبکہ اُسے وہ ملک سخت ناپسند تھا۔ گزشتہ صدی میں کیپٹن راورٹی نے خوشحال کی شاعری کا لفظی انگریزی ترجمہ کیا۔ ۱۸۶۲ء میں شائع ہوا تھا۔ علامہ نے اُس میں سے اُنیس اقتباسات پیش کیے۔

Kushhal Khan Khattak

[Excerpt]

The unification of the Afghan race—a process which is still going on before our eyes—forms one of the most interesting chapters in the history of Central Asia. Bahlol Lodhi and Sher Shah Suri in India, the Khattak poet Khushhal Khan and Pir Roshan among the frontier tribes, the late Amir Abdur Rahman Khan and his grandson King Aman Ullah Khan in Afghanistan proper, are the most outstanding figures in the history of this interesting movement. The day is not far off when some Afghan historian will tell us the story of the unity of his race much in the same way as Bolton King has told the story of the unity of Italy.

I want to place before the readers of 'Islamic Culture' some specimens of Khushhal Khan's poetry, the value and importance of which is yet to be realised by the Afghans. He was born in 1613, and rose to the chieftainship of his tribe at the age of 27. He served the Emperor Shah Jahan loyally, but fell under the suspicion of Aurangzeb who imprisoned him in the fortress of Gwaliar. He was released after seven years, but on his return to his native land openly revolted against the Emperor and founded the great Afghan confederacy against the Mughals. He personally went from tribe to tribe, and by negotiations as well as his charming poetry tried to infuse something of his own burning soul into his countrymen. The diplomacy and gold of Aurangzeb, however, were too powerful for him and he was finally compelled to retire in the Afridi country where he died at the age of 78. He was a versatile mind and wrote on various subjects, such as Poetry, Philosophy, Ethics, Medicine and his own autobiography which is unfortunately lost. Throughout his poetry, the major portion of which was written in India and during his struggles with the Mughals, breathes the spirit of early Arabian poetry. We find in it the same simplicity and directness of expression, the same love of freedom and war, the same criticism of life. I hope the Education Minister of Afghanistan will appoint some Afghan scholar to make a criticial study of this great warrior-poet of the Pushto language and to bring out a complete edition of his works with the

necessary historical notes. This must be the first literary undertaking of modern Afghanistan.

The following specimens of Khushhal Khan's poetry are taken from Captain Raverty's literal English translation which was published in 1862. The selection is sure to give the reader some idea of the poet's passionate patriotism, his aspirations, and the keenness of his observation of men. The poet has no doubt said some bitter things against Aurangzeb, but we must not forget that these are the judgements of an enemy who had passed seven long years as the Emperor's prisoner in a country of which he himself says:

> "Defend us from Hind, tho' it should teem with all the world's luxuries besides."

*

Though the king may cast him into prison, he will not grieve;
For the liberty of the free is from the beginning of time.

*

A good name will remain behind—naught else soever will survive:
The wicked for evil are remembered—the good, for their virtues, in the memory live.
Shouldst thou hear of Hajaj thou wilt also hear the name of Noshirwan,
For justice, the unbeliever is venerated—for tyranny, the believer is cursed.

*

If the damsels of Kashmir are famed for their beauty,
Or those of Chin, or Ma-chin, or Tartary, noted likewise;
Yet the sweet Afghan maidens that mine eyes have beheld
Put all the others to shame, by their conduct and ways.
As to their comeliness, this, once for all, is the fact of the matter.
That they are, in lineage, of the tribe and posterity of Yakub.
Of the fragrance of musk, or of rosewater, they have not need—
They are as the attar of the perfumer, by prayer five times a day.
Whether jewels for forehead or for neck, or any other trinkets,
All these are contemptible, with their dark locks compared.
Whether veils of gold brocade, or whether silken mantles,
All are a sacrifice unto the snow-white kerchief of theirs.
The beauty of their minds excelleth their personal privacy:
Not seen in the markets, with germents open and persons exposed.
They cannot look one full in the face, through modesty.
They are unused to abuse, and the discipline of the shoe.

Khushhal hath mentioned, more or less, somewhat of the matter;
But much remaineth that may be suitable, or unsuitable to the case.

*

If the Afghan people are of the human race,
In disposition and ways they are very Hindus.
They are possessed of neither skill, nor intellect;
But are happy in ignorance, and in strife.
Neither do they obey words of their fathers;
Nor do they unto the teachers' instructions give ear.
When there may be one worthy man amongst them
They are the destroyers of his head and life.
They ever lie in wait, one to injure the other;
Hence they are always by calamity remembered.
They neither possess worth, nor do others esteem them,
Though they are more numerous than locusts or than ants.
First, I, then others, as many as there may be—
We all of us require aid, and a helping hand.
Whether it is valour, or whether liberality,
They have cast, through dissension, them both away.
But still, O Khushhal, thank God for this,
That they are not slaves, but free-born men.

*

Doth the gnat ever attain unto the high rank of the falcon,
Even though he is furnished, both with feathers and with wings?

*

However tortuously the snake moveth about,
It proceedeth straight enough unto its hole.

*

The Mughals whom I now set eyes upon, are not such as were wont to be:
The day of their swords is past and gone, and but the pen remaineth unto them:
They gain over the Afghans by gold; and by fraud and deception entangle them.
Upon me these things have no effect, for the favour of God is still upon me.
I am neither a fly nor a crow, that I should hover over rottenness and filth.

The hawk or the falcon am I, that must my hearth, with my own quarry, delight;
Were there but others like unto me in this affair, I should rejoice indeed;
But since there are none like me, with distress and grief I am o'erwhelm'd.

Islamic Culture, Hyderabad-Deccan, October, 1928[1]

57

لفٹیننٹ سکندر حیات خاں ریاست بہاولپور کے چیف منسٹر مقرر ہوئے تھے۔ اعلیٰ حضرت نواب بہاولپور سے اختلاف ہو گیا۔ وائسرائے لارڈ اِروِن نے فیصلہ کیا کہ سکندر حیات کو برطرف کر دیا جائے۔ ۱۰/ اکتوبر کے شمارے میں انقلاب نے لکھا، "بیان کیا جاتا ہے کہ لارڈ اِروِن نواب سر ذوالفقار علی خاں کو بہاولپور کا وزیر اعظم مقرر کرنے پر رضامند ہو گئے ہیں اور سر محمد اقبال جو لاہور شہر کی طرف سے پنجاب کونسل کے ممبر ہیں، ریاست کے قانونی مشیر ہوں گے۔"[2]

58

کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ بعد میں وہ کتنا پراسرار ہو جائے گا۔ الگزانڈر ولسن (Alexander Wilson) تین سال پہلے اسلامیہ کالج میں انگریزی ادب کا پروفیسر مقرر ہوا۔ اس برس یوسف علی نے پرنسپل کے عہدے سے استعفیٰ دیا۔ ولسن پرنسپل ہو گیا۔ جاسوسی ناول لکھنے شروع کیے۔ ہیرو کا تعلق برطانوی سیکرٹ سروس سے تھا۔ پہلا ناول اسی برس شائع ہوا۔ دوسرا ۱۱/ اکتوبر کو شائع ہوا۔ اس کا نام دی ڈیولز کاک ٹیل (*The Devil's Cocktail*) تھا۔ برطانوی سیکرٹ سروس کا جاسوس لاہور میں مسلمانوں کے ایک تعلیمی ادارے میں انگریزی کا استاد مقرر ہو جاتا ہے۔ درپردہ سرکار کے لیے جاسوسی کرتا رہتا ہے۔ ادارے کے پرنسل کا کردار یوسف علی جیسا تھا۔ کیا جاسوس کا کردار وِلسن کی اپنی تصویر تھا؟ ساٹھ ستر برس بعد شائع ہونے والی اُس کی سوانح میں یہی خیال ظاہر کیا گیا۔

اسلامیہ کالج کے پرنسپل کی حیثیت میں وِلسن کی علامہ کے ساتھ ضرور ملاقات ہوئی ہو گی۔

---

[1] Razzaqi, *Discourses of Iqbal,* pp.121-131

[2] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸) ح حیات اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۳۷۴

شواہد موجود نہیں ہیں۔ وِلسن کی دلچسپی کے موضوعات ادب، بین الاقوامی سیاست اور وہ اضطراب تھے جو دنیا کے ضمیر میں محسوس کیے جاسکتے۔ تازہ ترین ناول میں لاہور کی تصویر یوں کھینچی تھی:

'India is a strange country,' he said, 'and there are things going on there which this country [Great Britain] knows nothing about. The time has come, however, when Great Britain must be cognisant of all that occurs, in order not only to safeguard herself, but also to ensure the safety of the Indian Empire. As you are aware, my colleague and I practically succeeded last year in routing out the Bolshevik element in India, but from information received, I believe that representatives of the Russian Soviet have recommenced their activities. Apart from that there is an undercurrent of unrest and distrust and various latent disorders which must be inquired into. Lahore appears to be the centre of the trouble, and it is to Lahore that I wish you to go.'[1]

59

کہہ دو یہ اُس سے تم کو "خودی" کا جو درس دے
رکھا ہی کیا ہے تیری فعولن فعول میں

مولانا ظفر علی خاں، ۱۲؍ اکتوبر ۱۹۲۸ء زمیندار[2]

60

۱۸؍ اکتوبر کو وسکاؤنٹ پیل (Viscount Peel) دوبارہ وزیرِ ہند بنے۔ اس سے پہلے ۱۹۲۲ سے ۱۹۲۴ تک اس عہدے پر رہ چکے تھے۔

۳۰؍ اکتوبر کو سر جان سائمن کا رائل کمیشن لاہور آ رہا تھا۔ ریلوے اسٹیشن سجایا گیا تھا۔ اس طرف آنے والے راستے خاردار باڑھ لگا کر بند کر دیئے گئے تھے۔ چھ سو سے ایک ہزار کے قریب لوگ احتجاجی جلوس میں شریک ہوئے۔ سیاہ جھنڈے اُٹھائے ہوئے تھے۔ ان پر انگریزی میں

---

[1] Alexander Wilson (2015) and Tim Crook (2010)

[2] جعفر بلوچ (۱۹۹۵) علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں، ص ۱۸۹

"سائمن واپس جاؤ" (Simon Go Back) لکھا تھا۔ قیادت کرنے والوں میں لالہ لاجپت رائے، مولانا ظفر علی خاں، ڈاکٹر ستیہ پال، عطاءاللہ شاہ بخاری، ڈاکٹر گوپی چند بھارگو، میاں سراج الدین پراچہ، مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی، سردار سردول سنگھ کویشر پاندہ اور سنت رام شامل تھے۔

انتظامیہ نے جلوس کا راستہ مقرر کر رکھا تھا۔ دن کے ایک بجے باغ بیرون موچی دروازہ سے روانہ ہوا۔ بریڈ تھ روڈ سے گزرا۔ لنڈا بازار کے راستے سرکلر روڈ سے ہو کر مولچند ٹمپل روڈ پر پہنچا۔ آگے خاردار باڑھ سے راستہ بند کر دیا گیا تھا۔ ریلوے اسٹیشن قریباً دو سو گز دُور تھا۔ جلوس باڑھ سے لگ کر کھڑا ہو گیا۔ رہنما اگلی قطار میں تھے۔ کسی بات پر پولیس نے لاٹھیاں گھما دیں۔

سر جان سائمن اور کمیشن کے دوسرے افراد اسٹیشن پر اُترے۔ حکومت کی طرف سے اُن کا استقبال ہوا۔ اُس کے بعد جلوس بھی روانہ ہوا۔ شام سات بجے کے قریب لاہوری دروازے پر منتشر ہو گیا۔ رات کے وقت موری دروازے کے باہر باغ میں جلسہ ہوا۔ ایک بیان کے مطابق پندرہ ہزار لوگ تھے۔ لاجپت رائے نے کہا کہ جلوس بالکل پر امن تھا۔ بلاوجہ لاٹھی چلائی گئی۔ یک انگریز پولیس افسر نے اُنہیں دو دفعہ لاٹھی ماری۔ دو کانسٹیبلوں نے بھی ایک ایک دفعہ اُن پر لاٹھی چلائی۔ اُنہوں نے چلّا کر افسر سے نام پوچھا۔ اُس نے جواب نہ دیا۔ بعد میں کسی نے کہا کہ سپرنٹنڈنٹ اسکاٹ تھا۔ لاٹھی سے اُن کے سینے پر خاصی لمبی اور گہری خراش آئی ہے۔ رائے زادہ ہنس راج کے ہاتھ پر چوٹ لگی تھی جس سے خون رسنے لگا تھا۔ ڈاکٹر گوپی چند کے سر پر چوٹ کا نشان ظاہر ہوا تھا۔ ڈاکٹر عالم اور ڈاکٹر ستیہ پال کے بازو ابھی تک درد کر رہے تھے۔

سرکاری بیان کے مطابق خاردار باڑھ نے سڑک پر چار پانچ فٹ کا راستہ خالی چھوڑ رکھا تھا۔ جلوس نے وہاں سے نکل کر آگے بڑھنے کی کوشش کی۔ پولیس پر کچھ اینٹیں بھی پھینکی گئیں۔ اس لیے لاٹھی چلائی گئی۔ لاجپت رائے نے ایک چھتری اُٹھائی ہوئی تھی۔ وہ ٹوٹ گئی۔ انہیں اور باڑھ کے قریب کھڑے بعض دوسرے لوگوں کو لاٹھیوں کی ضربیں لگیں۔ لیکن اُن میں سے کوئی زخمی نہیں ہوا۔ لاجپت رائے نے اس بیان کی تردید کی۔[1]

---

[1] Mitra, *Register,* 1928-2, pp.99-101

61

یکم نومبر تھی۔ ترک اسمبلی نے قانون منظور کیا جس کے مطابق یکم جنوری ۱۹۲۹ء کے بعد ترکی زبان صرف لاطینی رسم الخط میں لکھی جا سکتی تھی۔ بڑی تیاری کی گئی تھی۔ ملکی اور غیر ملکی ماہرین کی مدد حاصل کی۔ پہلا سبق خود غازی پاشا نے اُس محل میں دیا جو کبھی عثمانی سلاطین کی قیام گاہ تھا۔ انہوں نے اور حکومت کی بعض دوسری بڑی ہستیوں نے ملک بھر کے دورے کر کے جگہ جگہ کلاسیں لیں۔ آبادی زیادہ تر ناخواندہ تھی۔ خواندگی عام کرنے کا اہتمام کیا گیا۔ ترکوں کی اکثریت پہلی دفعہ اپنی زبان لکھنا اور پڑھنا لاطینی رسم الخط ہی میں سیکھنے والی تھی۔[1]

62

۵ نومبر تھی۔ علامہ اقبال سائمن کمیشن کے سامنے جانے کے لیے تیار ہوئے۔ کمیشن کے سامنے پیش ہونے کا مقصد پہلے سے پیش کی ہوئی یادداشت کے حق میں شہادت پیش کرنا ہوتا تھا۔ اس کے متعلق سوالات پوچھے جاتے تھے۔ وفد کا قائد جواب دیتا۔ پریس کے نمایندے بھی موجود ہوتے تھے۔

کمیشن کے سات انگریزوں میں سے کرنل لین فوکس اُس روز موجود نہ تھے۔ کمیشن کی معاونت کے لیے مرکزی مقننہ کے اراکین میں سے منتخب کی ہوئی کمیٹی میں سے سر شنکرن نائر (چیئرمین)، سر آرتھر فرُوم، راجہ نواب علی خاں، سردار بہادر سکھ دیو سنگھ اوبرائے، سر ہری سنگھ گور، نواب سر ذوالفقار علی خاں، ڈاکٹر عبداللہ سہروردی اور راؤ بہادر ایم سی راجہ موجود تھے۔ کیکابھائی پریم چند اُس روز موجود نہ تھے۔

معاونت کے لیے صوبے کی مقننہ کی منتخب کردہ کمیٹی بھی موجود ہوتی۔ پنجاب کونسل کی کمیٹی ۱۰ مئی کو منتخب ہوئی تھی۔ علامہ کا نام بھی تجویز ہوا تھا۔ علامہ نے واپس لے لیا تھا۔ سمجھتے تھے کہ کمیٹی سے باہر رہ کر مسلمانوں کا موقف بہتر طور پر پیش کر سکیں گے۔ کمیٹی سات اراکین پر مشتمل تھی: خان بہادر کپتان سردار سکندر حیات خاں (چیئرمین)، دیوان بہادر راجہ نریندر ناتھ، رائے صاحب چودھری چھوٹو رام، ڈاکٹر گوکل چند نارنگ، اوون رابرٹس، سردار اُجل سنگھ اور چودھری سر ظفراللہ

---

[1] Andrew Mango (2000). *Ataturk,* pp.464-467

خاں۔ سماعت کے دوران پریس کے نمایندے بھی موجود ہوتے تھے۔

دن کے پہلے حصے میں ہندو وفد کی سماعت ہوئی۔ وفد میں دس گیارہ اراکین تھے۔ صوبائی کونسل کی ریفارم پارٹی، صوبائی ہندو سبھا اور نیشنل ڈیموکریٹک لیگ کے نمایندے تھے۔ پنڈت نانک چند قیادت کر رہے تھے۔ پنڈت نے سولہ ابواب پر مشتمل طویل یادداشت پیش کر رکھی تھی۔ سب سے زیادہ زور تھا کہ جداگانہ نیابت مکمل طور پر ختم کر دینی چاہئیے۔ سماعت کے آغاز میں ہی کہہ دیا کہ اگر ہندوستان کے کسی بھی حصے میں کسی بھی صورت میں جداگانہ نیابت برقرار رکھنی ہے تو بہتر ہے کہ نئی اصلاحات نافذ ہی نہ کی جائیں۔

لنچ کے بعد مسلم وفد کی باری تھی۔ میاں سر محمد شفیع قیادت کر رہے تھے۔ شیخ سر عبدالقادر، علامہ اقبال، اے ایچ غزنوی، شیخ محمد عبداللہ ایل ایل بی، میجر نواب احمد نواز خاں، خان بہادر نواب محمد علی خاں قزلباش، خان سعادت علی خاں، سید محسن شاہ، نواب سر عمر حیات خاں، سردار حبیب اللہ خاں، مولوی غلام محی الدین، شیخ عظیم اللہ، ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین، شیخ دین محمد، خان بہادر سیٹھ آدمجی مامونجی، شیخ حفیظ اللہ، چودھری عبدالغنی اور مولوی محبوب عالم ساتھ تھے۔ جماعتِ احمدیہ نے علیحدہ یادداشت پیش کی تھی۔ اُس کے نمایندے بھی ساتھ ہی بلائے گئے تھے: مولوی محمد علی (لاہوری)، ڈاکٹر مرزا یعقوب بیگ، اے آر درد، مرزا بشیر احمد اور مفتی محمد صادق۔ گفتگو کے دوران سر جان سائمن نے انہیں ایک علیحدہ وفد کہہ کر مخاطب کیا۔

سوالات کا آغاز سر ظفر اللہ نے کیا۔ انہوں نے واضح کیا کہ انتخاب کے حوالے سے ایک اہم اختلاف جداگانہ اور مخلوط نیابت کے سوال پر ہے۔ جوابات دیتے ہوئے میاں شفیع نے کہا کہ ہندوستان میں انتخابات پہلی دفعہ منٹو مارلے اصلاحات کے تحت ۱۹۰۹ء میں ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی جداگانہ نیابت کا اصول رائج ہو گیا تھا۔ عام طور پر دیکھا گیا کہ اس کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات میں بہتری آئی۔ پنجاب میں یہ اصول اُس وقت نافذ نہ ہوا۔ میثاقِ لکھنؤ میں طے ہوا کہ اسے پنجاب میں بھی نافذ کیا جائے۔ گوپال کرشن گوکھلے نے بھی احمایت کی۔ وہ اُس وقت کانگریس کے صدر تھے۔ اُس کے بعد پنجاب میں یہ اصول نافذ کیا گیا۔ ۱۹۲۲ء میں پنڈت مدن

موہن مالوی نے ہندومہاسبھا شروع کی۔ اُس برس ۳۰ دسمبر کو مہاسبھا کے پہلے سالانہ اجلاس میں شدھی اور سنگھٹن کا پرچار کیا۔ پھر ۱۹ اگست ۱۹۲۳ء کو بنارس میں خصوصی اجلاس ہوا۔ وہاں بھی شدھی اور سنگھٹن کا پرچار کیا گیا۔ اگلے برس وزیرِ ہند لارڈ اولیوئیر کا خط ٹائم اخبار میں شائع ہوا جس میں اُنہوں نے جداگانہ نیابت کی مخالفت کی تھی۔ اسی زمانے میں لالہ لاجپت رائے انگلستان سے واپس تشریف لائے اور جداگانہ نیابت کی مخالفت شروع کی۔ پھر ۲۷ دسمبر ۱۹۲۴ء کو بیلگام میں ہندومہاسبھا کا اجلاس پنڈت مالوی کی صدارت میں ہوا۔ وہاں جداگانہ نیابت کے خلاف قراردادیں منظور کی گئیں۔ اُنہی کے تحت جنوری ۱۹۲۵ء سے جداگانہ نیابت کے خلاف باقاعدہ احتجاج کا آغاز ہوا۔

سر ظفراللہ نے پوچھا کہ وفد کے خیال میں اس مخالفت کی کیا وجہ ہے۔ میاں شفیع نے جواب دیا، ''ہم سمجھتے ہیں کہ شدھی اور سنگھٹن تحریکیں، اور جداگانہ نیابت کے خلاف احتجاج ایک ہی پروگرام اور پالیسی کے حصے ہیں۔ اس کا مقصد ہندوستان میں ایک حقیقی نمایندہ حکومت کی بجائے چند لوگوں کی حکومت (oligarchy) قائم کرنا ہے۔''

راجہ نریندر ناتھ نے سخت جرح کی۔ یادداشت میں لکھا گیا تھا کہ اچھوتوں کو ہندوؤں سے علیحدہ برادری تسلیم کیا جائے۔ ہندو آریا حملہ آوروں کی اولاد ہیں جبکہ اچھوت یہاں کے قدیم باشندوں کی نسل سے ہیں جنہیں آریا حملہ آوروں نے کبھی اپنے سماج کا حصہ تسلیم نہیں کیا۔ نریندر نے پوچھا کہ اُس قدیم نسل کے جو لوگ مسلمان ہوئے، کیا انہیں بھی مسلمانوں سے علیحدہ برادری سمجھا جائے؟ میاں شفیع نے جواب دیا کہ قدم نسل کے اچھوتوں میں سے کوئی بھی فرد یا گروہ اگر خود کہے کہ وہ ہندو سماج کا حصہ ہے تو ضرور ہندوؤں میں شمار کیا جائے۔ ورنہ نہیں۔

نریندر نے جرح کا رُخ جداگانہ نیابت کی طرف موڑا۔ سوال اٹھایا کہ پنجاب میں مسلمان اکثریت میں ہیں۔ یہاں ہندو ایک اقلیت ہیں۔ دنیا بھر میں صرف تین چار دساتیر میں جداگانہ نیابت کا تصور موجود ہے۔ کیا اُن میں سے کسی میں بھی جداگانہ نیابت اقلیت کی بجائے اکثریت کی مرضی سے نافذ کی گئی ہے۔ میاں شفیع نے جواب دیا، ''میں دنیا کے کسی ایسے ملک کے بارے میں نہیں جانتا جہاں جدید پارلیمانی نظام متعارف کروائے گئے ہوں اور وہاں کے سیاسی اور سماجی حالات ایسے اُلجھے ہوئے

ہوں جیسا کہ ہندوستان میں ہیں۔ اور میرے خیال میں سوال یہ نہیں ہے کہ فلاں ملک کی مثال سامنے رکھی جائے یا فلاں کی۔ یہ اِس ملک کے بارے میں یہاں موجود حقیقی صورت حال کے مطابق فیصلہ کرنے کا سوال ہے۔"

نریندر نے کہا کہ جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں وہاں مقننہ میں اضافی نشستیں مانگتے ہیں۔ اگر پنجاب میں سکھوں کو بھی یہی مراعات دی جائیں تو پھر مسلمانوں کی اکثریت نہ رہے گی۔ میاں شفیع نے کہا کہ عملاً سکھ اور ہندو ایک ہی برادری سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے درمیان فرق ویسا ہی ہے جیسے مسلمانوں میں شیعہ سنی کا فرق ہے۔ سکھوں اور ہندوؤں کے درمیان تفریق حال ہی میں محض سیاسی اغراض کے تحت کی گئی ہے۔ سکھ اضافی نشستیں چاہتے ہیں تو وہ ہندوؤں کے حصے میں سے دی جائیں۔ مسلمانوں کے حصے میں سے نہیں۔

ڈاکٹر نارنگ نے سوال اٹھایا کہ یادداشت میں لکھا گیا ہے کہ لیگ ہندوستان کے مسلمانوں کی رائے اور محسوسات کی مجموعی طور پر نمایندگی کرتی ہے۔ کیا یہ درست نہیں ہے کہ ملک میں ایک اور لیگ بھی موجود ہے؟ میاں شفیع نے جواب دیا کہ یہ سب کو معلوم ہے کہ لیگ صرف کمیشن سے تعاون کرنے کے مسئلے پر دو حصوں میں تقسیم ہوئی ہے۔ یہ تقسیم شاید صرف اتنے دن ہی رہے جب تک کمیشن یہاں موجود ہے۔ اس مسئلے کے سوا لیگ کی پالیسی میں کوئی اختلاف موجود نہیں ہے اور دونوں لیگیں جلد ہی دوبارہ ایک ہو جائیں گی۔

نارنگ نے کہا کہ یادداشت میں جمہوریت پر زور دیا گیا ہے۔ کیا جمہوریت میں جداگانہ نیابت کے مطالبے کی گنجایش موجود ہے؟ میاں شفیع نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا، "جمہوریت کے بنیادی اصول دو ہیں: کہ ملکی حکومت مقننہ کے سامنے جواب دہ ہو۔ اور یہ کہ مقننہ صحیح معنوں میں عوام کی نمایندہ ہو۔"

نارنگ نے پوچھا کہ مابقی اختیارات صوبوں کو تفویض کرنے کی تجویز پیش کرتے ہوئے کیا آپ کے سامنے امریکی نمونہ ہے؟ میاں شفیع نے اثبات میں جواب دیا۔ نارنگ نے پوچھا کہ کیا امریکہ میں وفاقی نظام رائج ہونے سے پہلے ہر ریاست ایک آزاد خود مختار وجود نہیں رکھتی تھی؟ میاں شفیع نے

جواب دیا، ''اِسی لیے ہم چاہتے ہیں کہ پہلے صوبائی خودمختاری دی جائے۔ مرکزی حکومت کی اصلاح اُس کے بعد ہو۔ تاکہ مرکزی وفاق کے وجود میں آنے سے پہلے ہر صوبہ ایک ریاست بن چکا ہو۔''

''آپ چاہتے ہیں کہ قوم کو ٹکڑوں میں تقسیم کر دیں اور پھر دوبارہ جوڑیں؟'' نارنگ نے کہا۔ میاں شفیع نے جواب دیا کہ ہرگز نہیں۔ ہندوستان ایک ملک نہیں ہے۔ یہ ایک براعظم ہے۔ اگر یورپ میں سے روس کو خارج کر دیا جائے تو ہندوستان اُس جتنا بڑا براعظم ہے اور آبادی میں اُس سے زیادہ ہے۔ ایسے ملک میں صرف وفاق ہو سکتا ہے۔ اور کچھ نہیں۔

علامہ صرف تین دفعہ بولے۔ ایک موقع پر سردار اُجل سنگھ نے وضاحت طلب کی کہ بالغ رائے دہی کیا وفد کے تمام اراکین کی رائے ہے۔ علامہ نے کہا کہ ہے ("It is")۔

دوسرے موقع پر نواب ذوالفقار نے مخاطب کر کے پوچھا کہ کیا مسلمانوں میں بھی اچھوت (untouchables) ہیں۔ علامہ نے کہا کہ ایک طبقہ 'مصلّی'' کہلاتا ہے مگر بلاروک ٹوک مساجد میں جا سکتا ہے۔ اُس کے چھونے سے کھانا ناپاک نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کے لیے نہ وہ طبقہ اچھوت ہے نہ اُس کے ووٹ۔ جبکہ ہندوؤں کے لیے کچھ لوگ اچھوت ہیں لیکن اُن کے ووٹ اچھوت نہیں ہیں:

> There is a class of people amongst the Muslims who are known as Musallis, but they have free access to mosques and everybody accepts food from their hands. To the Mahomedans both they and their votes are touchable, unlike the Hindus, to whom their votes are touchable, but themselves untouchable.

ذوالفقار نے پوچھا کہ کیا اُن کے خیال میں صوبوں میں مسلم عائلی قوانین (Muslim family laws) کے نفاذ کے لیے قاضی مقرر کیے جانے چاہئیں۔ علامہ نے جواب دیا کہ لیگ نے اپنی یادداشت میں اس کا کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے لیکن جہاں تک انہیں علم ہے پنجاب کے مسلمان قاضیوں کا تقرر چاہتے ہیں جو مسلم عائلی قوانین سے متعلق مقدمات کا فیصلہ کیا کریں۔

آخر میں میاں شفیع نے افسوس ظاہر کیا کہ صبح والے وفد نے کہا کہ اگر جداگانہ نیابت ختم نہیں کی جاتی تو وہ پنجاب میں کوئی اصلاحات نہیں چاہیں گے۔ علامہ نے تصحیح کی، ''پورے ہندوستان میں'' (In the whole of India)۔

سر جان سائمن نے جماعت احمدیہ کی یادداشت کے حوالے سے مولوی محمد علی (لاہوری) سے دریافت کیا کہ کیا اُن کا وفد بقیہ وفد کی بات میں کوئی اضافہ یا اس کی کسی بات سے اختلاف کرنا چاہتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ آیندہ دستور میں مذہبی آزادی کے علاوہ مذہب اختیار کرنے کی آزادی بھی ضرور ہو۔ سر ظفر اللہ نے پوچھا کہ اس سے کیا مراد ہے تو وضاحت کی کہ ہر شخص اس بات کے اظہار کے لیے آزاد ہو کہ وہ کس مذہب سے تعلق رکھتا ہے۔ سائمن نے مرزا بشیر احمد سے پوچھا کہ وہ کسی بات کا اضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ڈومینین اسٹیٹس کے حق میں ہیں بشرطیکہ مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے۔[1]

63

پنجاب کونسل کے آیندہ اجلاس کے لیے علامہ نے تین قراردادیں پیش کرنے کا نوٹس دیا:

۱ گورنر صوبے کے مختلف مدارس کو گرانٹ دینے کا کام ایک ایسے بورڈ کے سپرد کرے جس کے صدر ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم ہوں۔ ممبروں کو گورنر پنجاب کونسل اور مقامی مجالس کے منتخب اراکین میں سے نامزد کریں۔

۲ گورنر صاحب پنجاب کے مغربی اضلاع، صوبہ سرحد اور بلوچستان کے لیے علیحدہ یونیورسٹی قائم کریں۔

۳ پنجاب کے مختلف اضلاع میں جن زمینداروں کی زمینیں دریاؤں یا نالوں کی وجہ سے برباد ہو گئی ہیں، گورنر اُنہیں نیلی بار میں مناسب اراضی دیں۔[2]

۶ر نومبر کو انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کا اجلاس ہوا۔ میاں محمد شفیع صدارت کر رہے تھے۔ علامہ کو پھر کالج کمیٹی کا رُکن بنایا گیا۔[3]

---

[1] Indian Statutory Commission, *Report Vol. 16,* pp.121-134

[2] محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص۱۲۸-۱۲۹

[3] انجمن کی قلمی روداد؛ محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶)، اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص۱۷۹

حضرت علامہ اقبال کے فاضلانہ خطبے

(الٰہیاتِ اسلامیہ اور فلسفہ جدید)

حضرت علامہ اقبال مدراس میں جو فاضلانہ خطبے دینے کا وعدہ فرما چکے ہیں اُن کی نسبت "انقلاب" میں بارہا ذکر آ چکا ہے۔ حضرت علامہ ۱۵/ دسمبر کو لاہور سے روانہ ہو کر ۱۹/ دسمبر کو مدراس پہنچیں گے اور بڑے دنوں کی تعطیلات سے پہلے پہلے اپنے خطبے ختم کر دیں گے۔ خطبات کا عنوان "الٰہیات اسلامیہ اور فلسفۂ جدید" ہے۔ اس عنوان کے تحت چھ خطبے تیار کرنے کا فیصلہ ہوا تھا جن کے موضوع یہ ہیں:

۱ علم اور وحی والہام۔

۲ اُن تصدیقات (Judgements) کا فلسفیانہ معیار جن کی بنا وحی والہام ہے۔

۳ ذاتِ باری کا اسلامی تصوّر اور دعا کا مفہوم۔

۴ انسانی "انا" (خودی) یعنی مسئلۂ جبر و اختیار اور حیات بعد الموت۔

۵ اسلامی تہذیب و تمدن کا حقیقی مفہوم علم النفس کی رُو سے۔

۶ مذہبِ اسلام کی تشکیل بہ حیثیت ایک جماعت کے۔

پہلے تین خطبے مکمل ہو چکے ہیں۔ اگر حضرت علامہ موصوف کی شدید علالت کے باعث دو ماہ تک کام رکا نہ رہتا تو سارے خطبے مکمل ہو جاتے۔ اب یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ پہلے تین خطبے امسال دے دیئے جائیں اور بقیہ تین خطبے دسمبر ۱۹۲۹ء میں دیئے جائیں۔[1]

لاہور سے مدراس کے سفر میں تین چار دن لگتے تھے۔ ارادہ تھا کہ ۱۴/ دسمبر کو روانہ ہو کر ۱۸/ دسمبر کو پہنچیں۔ جنوبی ہند کے متعدد مقامات سے تنظیموں کی طرف سے دعوت نامے موصول ہونے لگے تھے۔ مالی گاؤں (ناسک)، بنگلور، پونا، حیدرآباد اور دوسرے مقامات شامل تھے۔ سرنگاپٹم میں سلطان ٹیپو شہید کے مزار کی زیارت کرنا چاہتے تھے۔ حیدرآباد بھی جانا تھا۔ ۳۰/ دسمبر تک دہلی پہنچنا تھا۔

---

[1] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸) حیات اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۶-۷

وہاں آل انڈیا مسلم کانفرنس ہو رہی تھی۔ طے کیا کہ تمام دعوت نامے مسلم ایسوسی ایشن مدراس کے سیکرٹری حمید حسن کو بھجوا دیں۔ وہی پروگرام ترتیب دیں۔ جنوبی ہند کے اور شہروں کے لوگ دعوت دینا چاہیں تو حمید حسن کے پتے نمبر ۲ دینا اسٹریٹ، مدراس، پر براہِ راست رابطہ کریں۔[1]

سفر کے لیے نیا سوٹ سلوایا۔ مال روڈ پر کمرشل بلڈنگ میں عبدالرحمٰن اینڈ سن کی دکان تھی۔ عبداللہ چغتائی سے روایت ہے کہ وہاں علامہ کے لباس کی پیمائش موجود تھی۔ خود جانے کی زحمت نہیں کرتے تھے۔ منشی طاہر الدین اور علی بخش ہی لباس کا انتظام کر دیتے۔ اس دفعہ جو سُوٹ آیا وہ پرانی پیمائش کے مطابق ہونے کی وجہ سے بہت ڈھیلا تھا۔ علامہ نے کوئی خیال نہ کیا۔[2]

پروفیسر محمد اکبر منیر نے بھائی کے ہاتھ اپنا مجموعۂ کلام ماہِ نَو بھجوایا۔ ۹/ نومبر کو علامہ نے انگریزی میں لکھا، ''آپ کا قیام ایران یقیناً آپ کے لیے نہایت سود مند ثابت ہوا ہے۔ اس کی بدولت آپ کے کلام میں ایک سادگی، قوت اور جِلا آگئی ہے۔''[3]

ہز ہائی نس مہترِ چترال لاہور آئے۔ نقیب صاحب بغداد کے خلیفۂ مجاز ابوالنصر ابوالفتح حمداللہ کمال الدین ساتھ تھے۔ لالہ ہر کشن لال صاحب نے چائے کی دعوت دی۔ ۱۳/ نومبر کی شام کو ہوئی۔ علامہ اقبال، ڈاکٹر محمد عالم، سر میاں محمد شفیع، کیپٹن سکندر حیات خاں، شاہزادہ حسام الملک، شاہزادہ غازی الدین خاں، کرنل شیخ احمد حسن، خان بہادر شیخ امیر علی ریٹائرڈ سیشن جج، خان بہادر انعام علی ریٹائرڈ سیشن جج، راجہ سر دیا کشن، راجہ نریندر ناتھ، رائے بہادر لالہ نرنجن داس اور دوسرے لوگ شامل تھے۔ ''خصوصیت سے راجہ نریندر ناتھ صاحب کی فارسی دانی اور علامہ اقبال کی [کذا: کے] حقائق و معارف نے ہز ہائی نس سے خراجِ تحسین وصول کیا،'' انقلاب میں لکھا گیا۔[4]

۱۷/ نومبر کو لالہ لاجپت رائے وفات پا گئے۔ دل کا دورہ پڑا تھا۔ عقیدتمندوں کی طرف سے کہا

---

[1] ایضاً، ص ۲۱۵-۲۱۶۔ بحوالہ انقلاب ۱۸/ نومبر ۱۹۲۸ء

[2] عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۴۶۳-۴۶۲

[3] مکتوب بنام اکبر منیر ۹/ نومبر ۱۹۲۸ء (انگریزی)؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۷۰۹-۷۰۷

[4] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸)، ص ۲۵۵ بحوالہ انقلاب ۱۵/ نومبر ۱۹۲۸ء

گیا کہ اس کی وجہ اُٹھارہ روز پہلے پولیس کمشنر کی لاٹھی سے زخمی ہونے کا صدمہ تھا۔

64

انڈین اورینٹل کانفرنس کی بنیاد پونا کے بھنڈرکر اورینٹل ریسرچ انسٹیٹیوٹ (Bhandarkar Oriental Research Institute) نے رکھی تھی۔ ہر دوسرے برس ہوتی تھی۔ پونا (۱۹۱۹)، کلکتہ (۱۹۲۲)، مدراس (۱۹۲۴) اور الٰہ آباد (۱۹۲۶) میں ہو چکی تھی۔ پانچویں کانفرنس لاہور میں ہو رہی تھی۔ گورنر پنجاب سرپرست تھے۔ مہاراجہ کپور تھلہ اور نواب بہاولپور نائب سرپرست تھے۔ پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر اے سی وولنر استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین تھے۔ ڈاکٹر ہرپرشاد شاستری صدر تھے۔ گیارہ شعبوں میں سے عربی، فارسی اور ژند کے شعبے کے صدر علامہ اقبال تھے۔

کانفرنس کی مطبوعہ رپورٹ سے معلوم نہیں ہوتا کہ چہار روزہ تقاریب میں سے کس کس میں علامہ شریک ہوئے۔ ۱۹؍نومبر کو شام چار بجے ٹاؤن ہال کے میدان میں گارڈن پارٹی دی گئی۔ قریباً ایک ہزار مہمان تھے۔ شام چھ بجے یونیورسٹی ہال میں افتتاحی اجلاس ہوا۔ مندوبین کے لیے اکیڈمک ڈریس (academic dress) تجویز کیا گیا تھا۔ پروگرام کے مطابق شعبوں کے صدور، غیر ملکی یونیورسٹیوں کے نمایندوں کے ساتھ ڈائس پر بٹھائے گئے ہوں گے۔ گورنر نے افتتاحی تقریب میں صوبے کے ادبی ورثے کا ذکر کیا اور کہا کہ پنجاب کو فخر ہے کہ اس کے پاس حالیؔ رہا ہے اور اقبالؔ ہے:

> This literary connection is not a thing of the dead past: it is still a living force, and the Panjab [Punjab] justly takes pride in the fact that within the memory of the present generation it has had a Hali, and that it has an Iqbal.

۲۰؍نومبر کو شعبوں کے صدور نے صدارتی خطبے پڑھنے تھے۔ پروگرام کے مطابق علامہ کا خطبہ مینارڈ ہال میں دن کے گیارہ سے ساڑھے گیارہ بجے تک تھا۔ یہ معلوم نہیں کہ پروگرام کے مطابق ہی ہوا۔ یہ طے تھا کہ جو خطبہ کسی وجہ سے مقررہ وقت پر نہ دیا جا سکے، اگلے روز متعلقہ شعبے میں دیا جائے گا۔[1]

---

[1] Anonymous (1930) *Proceedings and Transactions of the Fifth Indian Oriental Conference, Volume 1,* pp.2, 25-28, 54, 60

علامہ کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ اسلامی ثقافت مسلمانوں کی روحانی زندگی کا مظہر ہے۔ ثقافت صرف ادب اور فلسفے تک محدود نہیں ہے۔ سائنسی نظریات بھی اس میں داخل ہیں۔ اس لحاظ سے اسلامی ثقافت کے مطالعے کا حق ابھی تک ادا نہیں ہوا ہے۔ ورنہ اشپینگلر کے اس نظریے کی تردید ہو جاتی کہ ہر ثقافت ایک علیحدہ نامیاتی وجود (organism) کی طرح دوسری ثقافت سے جدا ہے۔ اسلامی ثقافت کے مطالعے سے جدید ثقافت کے بارے میں بھی ہمارے نقطۂ نگاہ کی اصلاح ہو گی، مثلاً تجرباتی طریقہ (experimental method) یورپ نے عربوں سے لیا؛ ڈیکارٹس اور فرانسس بیکن کے طریقوں کے ماخذ ابن تیمیہ، غزالی، رازی اور شہاب الدین سہروردی مقتول جیسے مفکرین میں تلاش کیے جاسکتے ہیں؛ البیرونی نے عدد کے بارے میں فنکشن کا تصوّر متعارف کروایا جسے اشپینگلر جدید مغربی تہذیب کی سب سے اہم علامت قرار دیتا ہے؛ نصیر الدین طوسی نے اقلیدس کے نظریات میں اصلاح کر کے مکان کے ایک نئے تصوّر کی بنیاد فراہم کی؛ فخر الدین عراقی نے زمان و مکان کا ایسا تصوّر پیش کیا جو طُوسی سے بھی کئی صدیاں آگے کی چیز اور دورِ حاضر سے بہت قریب محسوس ہوتا ہے۔

Presidential Address
Arabic, Persian and Zand Section

[Excerpt]

Sometime ago various questions arose in my mind regarding the culture of Islam as embodying the world-feeling of a specific group of mankind. Is Modern Science purely Western in origin? Why did the Muslims devote themselves to architecture as a mode of self-expression; and why did they comparatively ignore music and painting? What light, if any, do their mathematics and their decorative art throw on their intellectual and emotional attitude towards the concepts of space and time? Are there any psychological conditions which determined the rise and final acceptance, as an orthodox religious dogma, of a boldly conceived Atomic theory wholly unlike the Greek theory? What is the psychological meaning of mi'raj in the cultural history of Islam? Professor Macdonald has recently tried to prove the existence of Buddhistic influence on the rise and growth of Atomism in Islam. But the cultural problem which I have ventured to raise is far more important than the purely historical question answered by Professor Macdonald. Similarly Professor Bevan has given us valuable historical discussion of the story of the mi'raj. To my mind,

however, what is, culturally speaking, more important is the intense appeal that the story has always made to the average Muslim, and the manner in which Muslim thought and imagination have worked on it. It must be something more than a mere religious dogma, for it appealed to the great mind of Dante, and, through Muhyiuddin ibn-ul-Arabi, furnished a model for the sublimest part of the Divine Comedy which symbolises the culture of mediaeval Europe. The historian may rest satisfied with the conclusion that the Muslim belief in the Prophet's Ascension finds no justification in the Quran; yet the psychologist who aims at a deeper view of Islamic culture caflnot ignore the fact that the outlook given by the Quran to its followers does demand the story as a formative element in the world-picture of Islam. The truth is that it is absolutely necessary to answer all such questions, and mutually to adjust their answers into a systematic whole of thought and emotion. Without this it is impossible to discover the ruling concepts of a given culture, and to appreciate the spirit that permeates it. However, a comprehensive view of the culture of Islam, as an expression of the spiritual life of its followers, is easy of achievement.

The culture of Islam is the youngest of all Asiatic cultures. For us moderns it is far more easy to grasp the spirit of this culture than to imagine the world-picture of those ancient cultures whose intellectual and emotional attitude is extremely difficult to express in a modern language. The difficulty of the historian of Muslim culture is mainly due to the almost total lack of Arabic scholars trained in special sciences. European scholars have done good work in the domain of Muslim history, philology, religion and literature. Muslim philosophy too has had share of their attention; but I am afraid the work done in philosophy is, on the whole, of a superficial kind, and often betrays ignorance of both Muslim and European thought. It is in Art as well as in the concepts of special sciences and philosophy that the true spirit of a culture is revealed. But, for the reason mentioned above, the student of Muslim culture is yet very far from understanding the spirit of that culture.[1]

۲۰ر نومبر کو ایک سے دو بجے دوپہر لنچ کا وقفہ تھا۔ شام ساڑھے چار بجے شاہدرہ میں گارڈن پارٹی تھی۔

---

[1] Razzaqi؛ کانفرنس کی مطبوعہ رپورٹ ۱۹۳۰ء میں دو جلدوں میں شائع ہوئی جس میں علامہ کا خطبۂ صدارت شامل نہیں ہے۔ رپورٹ میں وجہ نہیں لکھی گئی مگر ممکن ہے یہ اس لیے ہو کہ خطبہ اپریل ۱۹۲۹ء میں اسلامک کلچر میں شائع ہو گیا۔ بشیر احمد ڈار نے توجہ دلائی ہے کہ یہ خطبہ اور خطباتِ مدراس ایک ہی زمانے میں لکھے گئے۔ خطباتِ مدراس میں سے تیسرے خطبے کے ساتھ بالخصوص ربط محسوس کیا جا سکتا ہے؛ انوارِ اقبال، ص ۲۴۷

پونے چھ بجے واپسی تھی۔ رات ساڑھے نو بجے سے بارہ بجے تک مہابیر تھیٹر بیرون موری گیٹ میں سنسکرت ڈرامہ اسٹیج کیا گیا۔

۲۱/ اور ۲۲/ نومبر کو لا کالج اور اورینٹل کالج کی عمارتوں میں مختلف شعبوں کی نشستیں تھیں۔ ایک سے دو بجے دوپہر تک ریفریشمنٹ کا وقفہ تھا۔ عربی، فارسی اور ژند کے شعبے کی نشست لا کالج میں گراؤنڈ فلور پر تھی۔ علامہ نے صدارت کی۔ ان کے ہمنام، اورینٹل کالج کے پروفیسر ڈاکٹر محمد اقبال، شعبے کے سیکرٹری تھے۔[1] مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے عربی کے استاد پروفیسر ٹریٹن نے دجال کے موضوع پر مقالہ پڑھا۔ علامہ نے یاجوج وماجوج الفاظ کی اصلیت دریافت کی۔ پروفیسر نے لاعلمی کا اظہار کیا۔[2] روایت ہے کہ ایک اور موقع پر علامہ نے کہا کہ یہ عربی زبان کے الفاظ نہیں ہیں۔ بابلی زبان کے الفاظ گاگ اور میگاگ کا معرب ہیں۔ بابل میں دو طبقے آباد تھے۔ ایک طبقے کے پاس زمین تھی۔ دوسرا محروم تھا۔[3]

کانفرنس میں نمایش کا انتظام بھی کیا گیا تھا۔ مخطوطوں اور مسودات کے علاوہ موہنجوڈارو، ہڑپہ اور ٹیکسلا کے نوادرات بھی شامل تھے۔ پروگرام کے مطابق ۲۱/ نومبر کی رات اُردو، ہندی اور پنجابی کے مشاعرے تھے۔ کانفرنس کے بعد ٹیکسلا کی سیر کا انتظام کیا گیا تھا۔ ۲۲/ نومبر رات دس بجے روانگی تھی۔ اس کا امکان بہت کم ہے کہ علامہ نے مشاعرے یا ٹیکسلا کے سفر میں شرکت کی ہو۔[4]

65

بھوپال سے عورتوں کا رسالہ ظلِ سبحان نکلتا تھا۔ غالباً نومبر میں صفحہ ۷ا پر نظم 'شمعِ زندگی' شائع ہوئی۔ علامہ کی تصنیف بتائی گئی۔ یہ درست نہ تھا۔ عبدالمجید سالک نے انقلاب میں اعتراض کیا۔ رسالے کے

---

[1] Anonymous (1930) *Proceedings and Transactions, Volume 1,* pp.27-28, 150

[2] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸)، حیات اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۱۲۰ بحوالہ انقلاب ۲۸ نومبر ۱۹۲۸ء

[3] یوسف سلیم چشتی کے مطابق ۱۹/ مارچ ۱۹۳۰ء کو علامہ نے ان سے کہا؛ ہاشمی و دیگر، اقبالیات کے سو سال، ص ۸۰

[4] Anonymous (1930) *Proceedings and Transactions, Volume 1,* pp.28, 50-53

مدیر محمود الحسن صدیقی نے معذرت کا خط لکھا اور بتایا کہ ایک عرصہ پہلے اخبار قوم (دہلی) میں علامہ کے نام سے شائع ہوئی تھی۔ ۲۳ نومبر کے شمارے میں سالک نے تعجب کیا کہ قوم کے مدیر قاری عباس حسین نے کیونکر اقبال سے منسوب کی۔ پھر لکھا، "ہمیں اُمید ہے کہ مدیرانِ جرائد آئندہ اِس قسم کی غلطیوں سے اجتناب فرمائیں گے، کیونکہ اس سے حضرت علامہ کو خواہ مخواہ تکلیف ہوتی ہے۔"[1]

انگریز ہیئت داں آرتھر اسٹینلے ایڈنگٹن کی آٹھ برس پہلے شائع ہونے والی تصنیف کا اقتباس علامہ اپنے تیسرے خطبے میں استعمال کر رہے تھے۔ ان کی نئی تصنیف اس برس شائع ہوئی۔ پچھلے برس دیے ہوئے گفورڈ لیکچروں پر مشتمل تھی۔

The Nature of the Physical World

by A. S. Eddington M.A., LL.D., D.SC, F.R.S.
Plumian Professor of Astronomy in the University of Cambridge
[Excerpt]

Defence of Mysticism. A defence of the mystic might run something like this. We have acknowledged that the entities of physics can from their very nature form only a partial aspect of the reality. How are we to deal with the other part? It cannot be said that that other part concerns us less than the physical entities. Feelings, purpose, values, make up our consciousness as much as sense-impressions. We follow up the sense-impressions and find that they lead into an external world discussed by science; we follow up the other elements of our being and find that they lead — not into a world of space and time, but surely somewhere. If you take the view that the whole of consciousness is reflected in the dance of electrons in the brain, so that each emotion is a separate figure of the dance, then all features of consciousness alike lead into the external world of physics. But I assume that you have followed me in rejecting this view, and that you agree that consciousness as a whole is greater than those quasi-metrical aspects of it which are abstracted to compose the physical brain. We have then to deal with those parts of our being unamenable to metrical specification, that do not make contact — jut out, as it were — into space and time. By dealing with them I do not mean make scientific inquiry into them. The first step is to give acknowledged status to the crude conceptions in which the mind invests them, similar

---

[1] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸)، حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۴۱۸ بحوالہ 'افکار و حوادث' انقلاب ۲۳ نومبر ۱۹۲۸ء

to the status of those crude conceptions which constitute the familiar material world.[1]

66

۲۶/ نومبر کو پنجاب کی مجلس وضع قوانین کا موسم سرما کا اجلاس لاہور میں شروع ہوا۔ پنجاب کے نئے گورنر سر جافری مونٹ مورنسی دوپہر دو بجے پہنچے۔ مجلس سے خطاب کیا۔[2] انہوں نے بتایا کہ صوبے میں مزید نو ضلعوں میں تلوار کو لائسنس سے مستثنیٰ قرار دینے کی تجویز حکومتِ ہند سے کی گئی ہے: رہتک، جالندھر، گورداسپور، جہلم، لدھیانہ، گوجرانوالہ، گجرات اور اٹک۔ جن ضلعوں میں پابندی برقرار رہنی تھی اُن میں سے بعض بڑے اہم تھے: لاہور، امرتسر، لائلپور، منٹگمری، راولپنڈی، کرنال، فیروزپور، ہوشیارپور، شیخوپورہ، شاہ پور اور ملتان۔[3]

حیدرآباد دکن میں اُس روز جامعہ عثمانیہ کی مجلسِ اعلیٰ کا اجلاس سر اکبر حیدری کی صدارت میں ہوا۔ خبر پہنچ چکی تھی کہ علامہ اقبال مدراس میں توسیعی لیکچر دینے والے ہیں۔ قرارداد منظور ہوئی:

> ڈاکٹر سر محمد اقبال کو لکھا جائے کہ مدراس جاتے ہوئے حیدرآباد میں ٹھہر کر تین لیکچر بہ معاوضہ ایک ہزار روپیہ کلدار دیں۔ لیکچروں کے مضامین کا انتخاب ان کی صوابدید پر چھوڑ دیا جائے البتہ اتنا تحریر کر دیا جائے کہ بہتر ہو گا کہ انگریزی میں "تصوّف" پر دو لیکچر اور اُردو میں "نظمِ اُردو" پر ایک لیکچر ہو۔[4]

معلوم ہوتا ہے کہ شہزادۂ چترال غازی الدین کے ساتھ علامہ کی خط کتابت ہوئی۔ ۲۷/ نومبر کو علامہ نے کتاب لطیفیات کے بارے میں انگریزی میں رائے دی۔ اس کے مصنف لطیفی تھے۔ علامہ کی رائے تھی کہ ہونہار معلوم ہوتے ہیں ("The author seems to be promising")۔[5]

---

[1] اقتباس کا ایک حصہ تشکیلِ جدید کے ساتویں خطبے میں استعمال کیا؛ Iqbal (1934), *Reconstruction*

[2] Mitra *The Indian Quarterly Register July-Dec.1928,* p.248

[3] انقلاب ۱۳/ دسمبر ۱۹۲۸ء؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۱۳۲

[4] سید شکیل احمد (۱۹۸۴)، 'اقبال حیدرآباد آرکائیوز میں'۔ اقبال ریویو (دکن)، ص ۷-۸

[5] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸) حیات اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۳۸۵۔ بحوالہ انقلاب ۱۶/ جون ۱۹۲۹ء جس میں کتاب کا

۲۸/ نومبر کو پنجاب کونسل کا اجلاس ہوا۔ شام ساڑھے چار بجے ختم ہوا۔ اس کے بعد کونسل کے مسلم ارکان نے وزیرِ تعلیم منوہر لال سے ملاقات کی۔ خان بہادر کپتان سردار سکندر حیات خاں وفد کی قیادت کر رہے تھے۔ علامہ اقبال، سر عبدالقادر، سر مولوی حاجی رحیم بخش خاں، سردار حبیب اللہ خاں ڈپٹی پریذیڈنٹ پنجاب کونسل، چودھری ظفراللہ خاں اور دوسرے شامل تھے۔ سکندر حیات نے کہا کہ ۲۳/ اکتوبر کو مولوی فیروزالدین اینڈ سنز نے (جسے فیروز سنز بھی کہتے تھے) ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم کے نام درخواست بھیجی تھی۔ قریباً پچاس برس سے پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کمیٹی کی کتابوں کے ٹھیکے ہر دفعہ ایک ہی فرم کو دے دیے جاتے ہیں۔ منوہر لال نے جواب دیا کہ آخری دفعہ ٹھیکہ دینے سے پہلے سر جان اینڈرسن نے چھاپہ خانوں کے معائنے سے معلوم کیا کہ وہی فرم اس کام کو سنبھالنے کی اہلیت رکھتی ہے۔ سکندر حیات نے کہا کہ اب اچھے پریس موجود ہیں۔ وفد کے بعض لوگوں نے تائید کی۔ اس کے بعد سکندر حیات نے کہا، "سب سے پہلے رائلٹی کا سوال سامنے آتا ہے جس کے باعث کتابوں کی قیمتیں بڑھ رہی ہیں۔ تعجب ہے کہ جہاں محکمہ ترقیٔ تعلیم میں اِس قدر سرگرم ہے وہاں اُس کی یہ خواہش بھی ہے کہ کتابوں کے متعلق اُس کا تجارتی حق بھی اُسے برابر پہنچتا رہے۔ حالانکہ دوسرے صوبوں میں کہیں یہ قاعدہ نہیں ہے۔" علامہ نے بھی کہا، "اِس معاملے کو غور و خوض کے بعد ضرور طے کرنا چاہیے۔" سکندر حیات نے ٹینڈر فارموں کے بارے میں کہا کہ زرِ ضمانت دوسرے صوبوں سے زیادہ ہے۔ وزیر نے کہا کہ رقم پر سُود ملنا چاہیے۔ سکندر حیات نے کہا کہ یہ اور بھی بے قاعدگی ہو گی۔ رقم گھٹائی جائے۔ مسلمان طالب علموں، ناشروں اور کتابوں کے تاجروں کے حوالے سے کہا، "مسلمانوں کے یہ مطالبات نہایت مدلل اور ضروری ہیں جن پر پوری توجہ کرنی چاہیے۔" منوہر لال نے جواب دیا کہ وہ میموریل مسل کے ساتھ شامل ہے۔ چودھری ظفراللہ نے کہا، "ہماری شکایات یہیں ختم نہیں ہو جاتیں... مسلمان انسپکٹروں کو اسکول ماسٹر بنایا جا رہا ہے۔ چنانچہ

اشتہار شائع ہوا۔ علامہ کی رائے انگریزی میں درج کر کے اُس کے ساتھ "اقتباس از مکتوب بنام شہزادۂ چترال غازی الدین صاحب مرقومہ ۲۷/ نومبر ۱۹۲۸ء" لکھا گیا۔

اِس وقت پنجاب میں کوئی مسلمان انسپکٹر نہیں۔ مسلمانوں کے اضلاع میں ڈسٹرکٹ انسپکٹر ہندو ہیں، جن سے مسلمانوں کو نقصان پہنچ رہا ہے۔"

علامہ نے اپنے اُس سوال کا ذکر کیا جو ہندو، سکھ، عیسائی اور مسلم اسکولوں کو سرکاری امداد دینے کے متعلق تھا۔ اُس میں مسلمان سخت خسارے میں رکھے گئے تھے۔ منوہر لال نے سر شیخ عبدالقادر کی طرف اشارہ کر کے کہا، "یہ باتیں تو اِن سے کہنی چاہئیں۔" عبدالقادر نے جواب دیا، "اِن اُمور سے میرا کیا تعلق ہے!"

سکندر حیات نے مولوی فیروزالدین اینڈ سنز کی درخواست پیش کی کہ معقول وقت دیے بغیر منظور شدہ کتابوں کو فہرست سے خارج کر دینا ناشروں کے لیے سخت نقصان دہ ہے۔ اسٹاک نکالنے کی مہلت دینی چاہیے ورنہ کمیٹی کو وہ اسٹاک خرید لینا چاہیے۔ منوہر لال نے جواب دیا، "جب اخراجِ کتب کی سب کمیٹی مقرر ہوئی تھی تو غالباً ڈاکٹر اقبال بھی اُس کے ایک رکن تھے۔" علامہ نے اثبات میں جواب دیتے ہوئے کہا، "آخر موقع و محل اور کتابوں کو دیکھنا بھی تو ضروری ہے۔" منوہر لال نے اِن امور کے متعلق نوٹ لکھ کر کہا کہ وہ ڈائرکٹر سر رشتۂ تعلیم سے مشورہ کریں گے۔[1]

۲۹ر اور ۳۰ر نومبر کو بھی پنجاب کونسل کے اجلاس ہوئے۔[2]

67

ڈاکٹر سیموئیل ایم زویمر دی مسلم ورلڈ رسالے کے مدیر تھے۔ لاہور آئے۔ روایت ہے کہ وائی ایم سی

[1] شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص۱۲۹-۱۳۱ خواجہ عبدالحمید (۱۹۴۴) 'اقبال کے علمی جواہر ریزے' ص۶۹ پر علامہ سے روایت کی گئی ہے کہ مسلمان ارکانِ کونسل کا مختصر وفد ڈائرکٹر تعلیم سر جارج اینڈرسن سے بھی ملا۔ ڈائرکٹر نے کہا کہ غور کریں گے اور جہاں جہاں مسلمانوں کی حق تلفی ہوئی ہے، تلافی کی جائے گی۔ علامہ نے "ظرافتِ سقراط سے کام لیا اور سر جارج سے فرمانے لگے، اجی صاحب آپ اتنی کاوش مت کیجیے گا، ہم لوگ تو مسلمان ہیں، آپ کے اِس وعدے ہی سے خوش ہو گئے ہیں، اب کچھ کرنے کرانے کی ضرورت نہیں۔"

[2] Mitra *The Indian Quarterly Register July-Dec.1928,* p.250

اے میں لیکچر دیا۔ علامہ نے صدارت کی۔ [1]

68

یکم دسمبر کو لاہور ہائی کورٹ نے کسی میراں بخش کی اپیل خارج کر دی۔ علامہ پیروی کر رہے تھے۔ کسی اللہ وسایا اور بعض دوسروں کے خلاف تھی۔ اُن کا دفاع چمن لال کر رہے تھے۔ سماعت جسٹس جان سٹون نے کی تھی۔ [2]

۳/ دسمبر کو پنجاب کونسل کا اجلاس ہوا۔ اختتام پر کونسل غیر معینہ طور پر برخاست ہوئی۔ [3]

بنام میر غلام بھیک نیرنگ

لاہور

۵/ دسمبر ۱۹۲۸ء

ڈیئر میر صاحب

السلام علیکم

میرے نزدیک تبلیغ اسلام کا کام اس وقت تمام کاموں پر مقدم ہے۔ اگر ہندوستان میں مسلمانوں کا مقصد سیاسیات سے محض آزادی اور اقتصادی بہبودی ہے اور حفاظتِ اسلام اس مقصد کا عنصر نہیں ہے، جیسا کہ آج کل کے 'قوم پرستوں' کے رویہ سے معلوم ہوتا ہے، تو مسلمان اپنے مقاصد میں کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ یہ بات میں علیٰ وجہ البصیرت کہتا ہوں اور سیاسیاتِ حاضرہ کے تھوڑے سے تجربہ کے بعد۔ ہندوستان کی سیاسیات کی روش جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، خود مذہبِ اسلام کے لیے ایک خطرۂ عظیم ہے۔ میرے خیال میں شدھی کا خطرہ اس خطرے کے مقابلے میں کچھ وقعت نہیں رکھتا یا کم از کم یہ بھی شدھی ہی کی ایک غیر محسوس صورت ہے۔ بہر حال جس جانفشانی سے آپ

---

[1] عبد اللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص۴۵۹-۴۵۶

[2] ظفر علی راجا ایڈووکیٹ (۲۰۱۳) قانون دان اقبال، ص۱۲۶

[3] Mitra *The Indian Quarterly Register July-Dec.1928,* pp.252-253

نے تبلیغ کا کام کیا ہے' اس کا اجر حضور سرورِ کائناتؐ ہی دے سکتے ہیں۔ میں ان شأاللہ جہاں جہاں موقع ہو گا آپ کے ایجنٹ کے طور پر کہنے سننے کو حاضر ہوں مگر آپ اور مولوی عبد الماجد بدایونی جنوبی ہندوستان کے دورے کے لیے تیار رہیں۔

باقی رہا لیکچروں کے ترجمے کا کام، سو یہ کام ناممکن نہیں تو مشکل اور از بس مشکل ضرور ہے۔ ان لیکچروں کے مخاطب زیادہ تر وہ مسلمان ہیں جو مغربی فلسفے سے متاثر ہیں اور اس بات کے خواہش مند ہیں کہ فلسفۂ اسلام کو فلسفۂ جدید کے الفاظ میں بیان کیا جائے، اور اگر پرانے تخیلات میں خامیاں ہیں تو ان کو رفع کیا جائے۔ میرا کام زیادہ تر تعمیری ہے اور اس تعمیر میں میں نے فلسفۂ اسلام کی بہترین روایات کو ملحوظِ خاطر رکھا ہے۔ مگر میں خیال کرتا ہوں کہ اُردو خواں دُنیا کو شاید ان سے فائدہ نہ پہنچے کیونکہ بہت سی باتوں کا علم میں نے فرض کر لیا ہے کہ پڑھنے والے یا سننے (والے) کو پہلے سے حاصل ہے۔ اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔ تین لیکچر امسال لکھے گئے ہیں، تین آیندہ سال لکھوں گا اور مدراس ہی میں دسمبر ۲۹ء یا جنوری ۳۰ء میں دوں گا۔ حیدرآباد دکن بھی ٹھیروں گا کیونکہ عثمانیہ یونیورسٹی کا تار آیا ہے کہ لیکچر وہاں بھی دیے جائیں۔ آیندہ دسمبر تک یہ تمام لیکچر تیار ہو کر چھپ جائیں گے، اُس وقت میں آپ کی خدمت میں ایک کاپی بھیج سکوں گا۔

امید کہ آپ کا مزاج بخیر ہو گا۔

مخلص

محمد اقبال[1]

69

"علامہ اُس وقت بھی علیحدہ مسلم مملکت کے قیام ہی کو ہندو مسلم مسئلے کا حل سمجھتے تھے،" عبد المجید سالک سے روایت ہے، "لیکن مسلم لیگ سے وابستگی کی بنا پر وہ اس پوزیشن میں نہیں تھے کہ اِس قسم کی تجویز پبلک طور پر خود پیش کرتے۔ اگر کرتے تو باقی مسلم قیادت سے اُن کا رابطہ ٹوٹ جاتا۔ چونکہ ہم مدیرانِ

---

[1] مکتوب بنام میر غلام بھیک نیرنگ ۵/ دسمبر ۱۹۲۸ء؛ برنی (۱۹۹۱) کلیات مکاتیبِ اقبال، دوم، ص ۷۱۰-۷۰۹

انقلاب [سالک اور مہر] علامہ اقبال کی رہنمائی میں مسلمانوں کے حقوق کی جنگ لڑ رہے تھے اس لیے ہم بھی اِس پوزیشن میں نہیں تھے کہ اِس قسم کی انقلابی تجویز کو پیش کرتے۔ پس باہمی مشورے سے فیصلہ ہوا کہ ہندوؤں کا ردِ عمل معلوم کرنے کے لیے یہ تجویز مولانا مرتضیٰ احمد خاں کی وساطت سے پیش کرائی جائے جو 'انقلاب' میں نیوز ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کرتے تھے اور پالیسی کے ذمہ دار نہیں تھے۔ علامہ نے مولانا موصوف کی مفصل رہنمائی (briefing) کی اور نتیجے میں یہ مقالات چھاپے گئے۔"[1]

مولانا کا مکمل نام مرتضیٰ احمد خاں محمد زائی تھا۔ جن مقالات کا ذکر ہے، وہ ایک طویل مضمون کی تین اقساط تھیں۔ پہلی قسط ۷/ دسمبر کے انقلاب میں 'مسلمانانِ ہند کی اجتماعی سیاسی زندگی — فکر و عمل کے انتشار کا دردناک مظاہرہ' کے عنوان سے آئی۔ بنیادی نکات یوں تھے:

۱ ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے کوئی نصب العین نہیں ہے۔ یہ بات ہلاکت کا سبب بن سکتی ہے۔ نصبُ العین نہ ہونے کی وجہ سے یکجہتی اور یکرنگی پیدا نہیں ہو سکتی۔ ہر سیاسی مسئلہ نزاع کا سبب بن جاتا ہے (پندرہ برس پہلے انگریزی اخبار آبزرور میں ایک مضمون نگار نے شکایت کی تھی کہ مسلمان ہر بات میں متفق ہو جاتے ہیں اور دھڑے بندی نہیں ہو پاتی)۔

۲ مسلمانوں میں یہ رجحان عام ہے کہ اپنی رائے کو درست اور باقی سب کو غلط سمجھا جائے، اور دوسروں کی تذلیل و تحقیر کی جائے۔ پہلی وجہ نصب العین نہ ہونا اور دوسری وجہ اعتمادِ نفس کا فقدان ہے۔ دوسری وجہ بھی تب ہی دور ہو گی جب کوئی نصبُ العین متعین ہو جائے۔

۳ مسلمانوں کو طے کر لینا چاہیے کہ ملک کی مکمل آزادی کی صورت میں اُن کی حیثیت کیا ہو گی اور اس مقصد کے حصول تک انہیں کن مدارج سے گزرنا ہے۔

۸/ دسمبر کے شمارے میں 'مسلمانانِ ہند کا سیاسی نصب العین۔ برادرانِ وطن کی روش کا موازنہ' آیا۔ یہ دکھانا تھا کہ ہمسایہ قوم ہندو بھی اسی ماحول میں پرورش پا رہی ہے مگر نصبُ العین موجود ہونے کی وجہ سے وہاں وہ انتشار نظر نہیں آتا جو مسلمانوں میں ہے:

---

[1] عبدالسلام خورشید، سرگذشتِ اقبال، ص ۲۹۱-۲۹۲

۱ ہندوؤں کا نصب ُالعین یہ ہے کہ وہ ہندوستان پر حکومت کریں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان میں یہ اہلیت پیدا ہو چکی ہے، صرف ملکی دفاع کی صلاحیت ابھی تک ان میں نہیں ہے۔ اس لیے فی الحال درجہ ٔمستمرات پر راضی ہیں۔ مکمل آزادی ان کے سفر کی اگلی منزل ہو گی۔ اس طرح ہندو قوم اپنے مستقبل کو دیکھ رہی ہے اور جانتی ہے کہ منزل تک پہنچنے کے لیے کن راہوں سے گزرنا ہو گا۔ اس لیے اختلافِ رائے اتحادِ عمل میں رکاوٹ نہیں بنتا۔

۲ ہندوؤں کا نصب ُالعین نہرو رپورٹ سے واضح ہوتا ہے جس میں مضبوط مرکزی حکومت کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ نہ صرف کسی غیر ملکی بلکہ خود ہندوستان کے غیر ہندو باشندوں میں سے کسی کو حکومت میں برابر کا شریک بنانے پر بھی ہندو تیار نہیں ہیں۔ چونکہ وہ ملک میں اکثریت رکھتے ہیں اس لیے یہ قدرتی بات ہے۔

۳ اس کے برعکس مسلمانوں کی تمام قوتیں ایک دوسرے کے خلاف استعمال ہو رہی ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ نصب ُالعین کی عدم موجودگی میں دو ہی راستے دکھائی دیتے ہیں۔ اول، انگریز کی غلامی۔ دوسرے، انگریز سے نجات پا کر ہندو کی غلامی۔

۴ اگر مسلمان دونوں صورتوں کو مسترد کر دیں تو گزشتہ سال ڈیڑھ سال سے مسلم رہنماؤں کی تمام تجاویز جس سمت میں اشارہ کرتی ہوئی محسوس ہو رہی ہیں وہ یہ ہے کہ مسلمان شمالی ہند کو اپنا "وطن" قرار دے لیں جو پنجاب، سرحد، بلوچستان اور سندھ پر مشتمل ہے۔ اس "وطن" کی آزادی کا نصب العین ان کی قوتوں کو مجتمع کر دے گا۔ مسلم کانفرنس وقتی مسائل کا تصفیہ کرنے سے پہلے سیلف ڈیٹرمی نیشن کے اصول پر کاربند ہو کر سیاسی نصب ُالعین متعین کرنے کی کوشش کرے۔ اگلی قسط میں اس کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ پیش کیا گیا۔

مسلمِ ہندی کے لئے "وطن" کی ضرورت

ہندوستان کی سیاسی اُلجھنوں کا واحد علاج

آقائے مرتضیٰ احمد خان محمد زائی کے قلم سے

[اقتباس]

"وطنیت" کوئی بہت بلند اصول نہیں ہے۔ تاہم جب اُس کے تاثرات و عملیات پر نگاہ کی جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ وطنیت کے خیال نے اقوامِ عالم کو کس طرح آتش زیرِ پا کر رکھا ہے اور اُس کی قوتِ عمل کس قدر حاوی اور سریع الاثر ہے... نوعِ انسان کو ایک جماعت تصور کرنے اور اولادِ آدم کو اخوت و انسانیت کے ایک ہی رشتہ میں منسلک کر کے رکھ دینے کا خیال خواہ کتنا ہی بلند کیوں نہ ہو لیکن اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ یہ منزلِ مقصود ابھی بہت دور ہے اور ابھی انسان کو اس کی طرف سفر کرتے ہوئے وطنیت و قومیت کے مقامات سے لازماً گزرنا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ کئی قومیں اور جماعتیں ایسے ایسے عظیم الشان مقاصد لے کر اُٹھی ہیں اور اصول و مقاصد نے اُن کے دلوں میں بھی عمل کا وہی جوش پیدا کر دیا تھا جو آج ہم وطنیت کے جذبہ سے متاثر ہونے والی اقوام میں دیکھتے ہیں۔ خود اسلام کی شاندار تاریخ اس دعویٰ پر شاہد و دال ہے لیکن زمانۂ حاضرہ کی سیاسی وضع ہی کچھ اس طرح ڈھل چکی ہے کہ کوئی قوم "وطنیت" کے بت کی پرستش کیے بغیر کسی اعلیٰ اصول یا بلند مقصد کی طرف قدم تک نہیں اٹھا سکتی۔ وطنیت کا جذبہ عامۃ الناس کے دلوں کو کچھ اس وجہ سے بہت جلد موہ لیتا ہے کہ یہی اس کی معاشرتی، تمدنی اور اقتصادی امنگوں کی تکمیل کا ایک ذریعہ رہ گیا ہے...

دیکھنا یہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمان وطنیت کے اس جذبہ سے کس حد تک متاثر ہیں، یا ہو سکتے ہیں... مسلمانوں کو انگریزوں کے ساتھ کوئی خاص اُنس نہیں بلکہ اُن کے دلوں میں اس اجنبی قوم کے لیے تلخ جذبات پائے جاتے ہیں کیونکہ وہ غیر ملکی حکمران ہونے کے علاوہ اسلامی دُوَل سے نبرد آزما رہتے ہیں اور اُن کی استعماری حکمتِ عملی مسلمانوں کے دیگر ممالک کو بھی غصب کرنے کی تاک میں لگی بیٹھی ہے... اس لیے وہ ہمسایہ قوم کی ہر اُس تحریک میں دل و جان سے شریک ہونے کا خواہاں

رہتا ہے جو انگریزوں کے اقتدار کو کم کرنے یا کلیتہً محو کرنے کے لیے جاری کی جائے۔ لیکن اُس کے اِس جذبہ کا محرک وطنیت کے خیال کو سمجھنا شدید غلطی ہو گی کیونکہ ایک قوم سے بیزاری کا جذبہ بالکل دوسری شے ہے اور وطن خواہی کا احساس بالکل جداگانہ چیز ہے۔ میں بیان کر چکا ہوں کہ جونہی اُسے کسی وطنی تحریک کا سامنا ہوتا ہے اُس کے دل میں کئی طرح کے خیالات موجزن ہونے لگتے ہیں۔ انگریزوں سے بیگانگی کا جذبہ اُسے مجبور کرتا ہے کہ تحریک کا ساتھ دیا جائے۔ لیکن ہمسایہ قوم کی اکثریت اور اُس کے غلبہ کا خیال اُس کے دل میں اپنے مستقبل کے تحفظ کا خیال پیدا کر دیتا ہے اور وہ قدرے متامل ہو جاتا ہے۔ خیالات کی یہ کشمکش مسلمانانِ ہند کی اجتماعی زندگی میں انتشار پیدا کرنے کا موجب بن جاتی ہے اور اُس کی سیاسی قوتیں مختلف اطراف میں منتشر ہو کر رہ جاتی ہیں۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مسلمانانِ ہند کو وطنیت کے اِس جذبہ سے متاثر کرنا ممکن ہے یا نہیں جو دنیا کی دیگر اقوام میں بڑی شدت کے ساتھ پایا جاتا ہے۔ اس کی ایک صورت تو یہ ہے کہ ہمسایہ قوم اپنے رویہ سے یہاں کے مسلمانوں کو تحفظِ مستقبل کی طرف سے بے فکر کرائے لیکن یہ ایک ایسی بات ہے جس کا حصول بہ ظاہر محال نظر آتا ہے... اِن حالات کے اندر یہ اشد ضروری ہے کہ مسلمانانِ ہند کے لیے بھی ایک ایسا وطن پیدا کیا جائے جسے وہ اپنا گھر سمجھیں اور جہاں رہ کر وہ اپنی تہذیب، اپنے افکار اور اپنے تمدن و معاشرت کا اپنی منشا اور خواہش کے مطابق ترقی دے سکیں۔

اس طرح کا وطن پیدا کرنا کوئی نئی نظیر نہیں۔ بلکہ سیاسیاتِ عالم کے دورِ حاضر میں اِس قسم کی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں۔ جنگِ عظیم نے ہر قوم کے لیے ایک وطن پیدا کر دیا ہے۔ پول پولینڈ میں، زیک زیکوسلاقیہ میں، عرب اپنے ممالک اور یہودی فلسطین میں اپنے لیے "وطن" تعمیر کر رہے ہیں۔ اتحاد جماہیر شورائیہ روس [USSR] نے بھی اپنی مملکت کی تقسیم اسی طرح کی ہے کہ ہر قوم کو جو جداگانہ تمدن و معاشرت رکھتی تھی یا نسل و تاریخ کے اعتبار سے دوسروں سے ممتاز تھی ایک وطن دے دیا ہے۔ چنانچہ ازبکستان، ترکمانستان اور قفقاز کی مختلف ریاستوں، آذربائیجان، ارمنستان اور گرجستان کی تحدید و تقسیم اسی اصول کی مرہونِ احسان ہے۔

پھر کیا وجہ ہے کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو بھی اسی سرزمین میں ایک جداگانہ وطن نہ دیا جائے

تاکہ وہ بھی وطنیت کے صحیح جذبہ سے متاثر ہو سکیں۔ اور اِس طرح اقوامِ عالم کی صف میں شمار ہو کر تمدنِ انسانی کے مدد و معاون بن سکیں۔ ان کے افراد بھی اِن تصورات کو اپنے دل میں نشو و نما دے سکیں کہ ہمارے وطن کی آزادی و ترقی ہماری آنے والی نسلوں کے تحفظ و بقا کی کفیل ہو گی۔ اور اِس وطن کی تعمیر کے لیے ہم آج جتنی قربانیاں کریں گے وہ کل ہمارے اور ہماری اولاد کے کام آئیں گی۔ ہماری مخصوص تہذیب ترقی کرے گی۔ ہمارا تمدن پھلے پھولے گا اور ہماری معاشرت نشو و نما پائے گی۔ اگر ہندوستان کے مسلمان دنیا میں ممتاز قوم کی حیثیت سے زندہ رہنے کے خواہاں ہیں تو اُنہیں اپنا نصبُ العین ہندوستان کے اندر ایک وطن کی تعمیر قرار دینا چاہیئے۔ تاکہ تحفظِ حقوق کے آئے دن کے جھگڑوں کا بالکل خاتمہ ہو جائے اور اُن کے سیاسی اقدام کے لیے ایک نئی شاہراہ نکل آئے۔

مسلمانانِ ہند کے لیے وطن پیدا کرنے کے واسطے کوئی بہت بڑی جستجو کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف صوبہ پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کو یکجا تصور کر کے مسلمانانِ ہند کو ایک بنا بنایا وطن مل سکتا ہے۔ اس وطن کی تعمیر، اس کی آزادی، اس کی ترقی و اصلاح مسلمانوں کی سیاسی زندگی کی روح و رواں ہو سکتی ہیں اور اس سے ان کے خیالات و افکار میں یکسانی و وحدانیت، اُن کے قلوب میں اطمینان و تسکین اور اُن کی روحوں کے اندر جوشِ عمل و جذبۂ فداکاری پیدا کیا جا سکتا ہے۔ پھر اس کی برکت سے ہندوستان کی سیاست کے پیچیدہ مسائل بھی، جو ہر قدم پر وطنی تحریک کی راہ میں روڑے اٹکانے کا موجب بن جاتے ہیں، آنِ واحد میں حل ہو جائیں گے۔ اور اس ملک کی دونوں محکوم قومیں یعنی ہندو اور مسلمان اپنی اپنی جگہ وطنیت کے جذبہ سے سرشار ہو کر ملک کو اجنبی اقتدار کے پنجہ سے نجات دلانے کی کوشش کرنے لگیں گی اور اُن کے دل میں ایک دوسرے کے ارادوں کے متعلق شکوک و شبہات پیدا ہونے کا احتمال بہت کم رہ جائے گا۔

بہ فرضِ محال اگر ہندو اور انگریز فی الحال مسلمانوں کے اِس نصبُ العین کی مخالفت بھی کریں گے تو چنداں نقصان نہ ہو گا کیونکہ مسلمانوں کے سامنے ایک مقصد ہو گا۔ اور اِس مقصد کے حصول کی جدوجہد اُن کا وظیفہ بن جائے گا۔ پھر کیا مسلمان شمالی ہند میں اپنا خاص وطن تعمیر کرنے اور اُسے آزاد کرانے کو اپنا سیاسی نصبُ العین قرار دے کر خیالات و افکار کی اُس فوضویت کا خاتمہ کریں گے جو اُن

کی قوتوں کو منتشر اور اُن کی جماعتوں کو متصادم کیے ہوئے ہے؟

انقلاب، ۱۰/ دسمبر ۱۹۲۸ء[1]

70

جنوبی ہند کے سفر کے پروگرام میں کچھ تبدیلی ہوئی۔ ۱۳/ دسمبر سے جامعہ عثمانیہ میں تعطیلات ہونے والی تھیں۔ مدراس کے طلبہ کے لیے بھی وہ دن موزوں نہ تھے۔ طے پایا کہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کے بعد جنوری کے اوائل میں جنوبی ہند جائیں۔[2] ۹/ دسمبر کو جامعہ عثمانیہ کی درخواست کے جواب میں انگریزی میں لکھا کہ ۱۵/ جنوری کو پہنچیں گے۔ ۱۵، ۱۶ اور ۱۷/ جنوری کو خطبات رکھے جائیں۔ اس بات کا خیال رکھا جائے کہ ۱۷/ ہی کو واپسی کا ارادہ ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ خط جامعہ کے رجسٹرار حمید احمد انصاری کے نام تھا۔[3]

اُس روز انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کا اجلاس ہوا۔ شیخ امیر علی صدارت کر رہے تھے۔ علامہ پھر کالج کمیٹی کے رکن مقرر کیے گئے۔[4]

انقلاب اور زمیندار کی قلمی جنگ کافی زور پکڑ چکی تھی۔ سالک اپنے کالموں میں ظفر علی خاں کے لیے ظفر ہندوزوئی اور آقا باجی جیسے القاب استعمال کر لیتے تھے۔ زمیندار کا غصہ علامہ پر نکلتا تھا۔ ۸/ دسمبر کے شمارے میں لکھا گیا کہ پانچ چھ برس قبل ضلع گجرات کے دو نوجوان سرکاری ملازمت کی تلاش میں لاہور آئے۔ علامہ سے شعر سنانے کی فرمایش کی تو علامہ نے برہم ہو کر دھمکی دی کہ نوکروں سے اُٹھوا کر باہر پھنکوا دیں گے۔ غصہ ٹھنڈا ہوا تو دونوں کو فارسی کا ایک ایک شعر سنایا۔ ایک کا مفہوم تھا کہ افرنگ کے جادو میں گرفتار مت ہو۔ دوسرا بھی آزادی اور خودداری کے متعلق تھا۔

---

[1] بشکریہ امجد سلیم علوی

[2] حمزہ فاروقی، حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۲۱۶-۲۱۷ بحوالہ انقلاب ۸/ دسمبر ۱۹۲۸ء

[3] مکتوب ۹/ دسمبر ۱۹۲۸ء؛ سید شکیل احمد (۱۹۸۴)، 'اقبال حیدر آباد آرکائیوز میں'۔ اقبال ریویو (دکن)، ص ۸

[4] انجمن کی قلمی روداد؛ محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶) اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص ۱۸۰

نوجوانوں نے سرکاری ملازمت کا ارادہ ترک کر دیا۔ زمیندار نے افسوس کیا کہ خود علامہ اس کے برخلاف انگریزوں کا ساتھ دے رہے ہیں۔ یہ واقعہ پڑھ کر سالک نے علامہ سے دریافت کیا۔ اُن کے مطابق علامہ نے جواب دیا، "یہ کہانی سر تا پا بے بنیاد ہے۔ پچھلے پانچ چھ سال تو درکنار مجھے عمر بھر میں کوئی ایسا واقعہ پیش نہیں آیا۔" ۱۱/ دسمبر کو سالک نے انقلاب میں 'افکار و حوادث' میں یہ وضاحت پیش کر کے لکھا کہ زمیندار میں فارسی کے اشعار زبورِ عجم کے ہیں، "حالانکہ آج سے پانچ چھ برس پہلے 'زبورِ عجم' کا کہیں نام ونشان تک نہ تھا۔ سب کو معلوم ہے کہ یہ کتاب پچھلے سال شائع ہوئی ہے اور اس کی ترتیب صرف دو تین سال پہلے شروع ہوئی تھی۔"[1]

منشی تلوک چند محروم نے زبورِ عجم کے ایک شعر پر فارسی ہی میں کچھ اشعار کی تضمین لکھی۔ ۱۶/ دسمبر کو انقلاب میں شائع ہوئی۔[2]

دو چار روز بعد سالک علامہ کے پاس آئے۔ کئی دنوں سے آنے کا موقع نہ ملا تھا۔ زمیندار میں کسی بشیر احمد کا خط شائع ہوا تھا کہ علامہ نے اُن سے کہا کہ انقلاب کو ریاست بھوپال کی طرف سے سات سو روپے ملے ہیں۔ سالک کا بیان ہے کہ علامہ نے بشیر احمد کے نام سے ناواقفیت ظاہر کی۔ اس بات کی تردید بھی کی کہ ایسی کوئی بات کہی ہے۔[3]

تہذیبِ نسواں کی کسی پڑھنے والی نے علامہ کو خط لکھ کر کوئی سوال پوچھا کہ 'محفلِ تہذیب' میں جواب دیں۔ غالباً رسالے کا کوئی کالم تھا۔ روایت ہے کہ علامہ نے بعد میں کہا، "میں یہ بھی کرتا مگر مجبوری یہ تھی کہ ان کے سوال کی نوعیت کچھ ایسی تھی جس کا جواب میں نہ جانتا تھا۔"[4]

---

[1] حمزہ فاروقی، حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۴۱۸–۴۲۰ بحوالہ کالم 'افکار و حوادث'، انقلاب ۱۱/ دسمبر ۱۹۲۸ء

[2] حمزہ فاروقی، ایضاً، ص ۳۳۴

[3] ایضاً، ص ۴۲۱۔ بحوالہ کالم 'افکار و حوادث' انقلاب ۲۲/ دسمبر ۱۹۲۸ء

[4] خالد نظیر صوفی، اقبال درونِ خانہ، ص ۱۹۳۔ حجاب اسماعیل (بیگم امتیاز علی تاج) کی یادداشت

71

۱۹/ دسمبر کو لاہور میں ڈسٹرکٹ پولیس ہیڈ کوارٹر سے ڈپٹی پولیس کمشنر جان پی سانڈرز باہر نکلے اور دو نوجوانوں کی گولیوں کا شکار ہو گئے۔ ہیڈ کانسٹیبل چنن سنگھ فرار ہوتے ہوئے حملہ آوروں کے پیچھے لپکا تو وہ بھی گولی کا شکار ہو گیا۔ اگلے روز شہر کی دیواروں پر پوسٹر تھے۔ ہندوستان ری پبلکن ایسوسی ایشن کا نام اب ہندوستان سوشلسٹ ری پبلکن آرمی (ایچ ایس آر اے) تھا۔ قتل کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے اسے لالہ لاجپت رائے کی موت کا بدلہ قرار دیا تھا۔ بعد میں تنظیم کے ایک رُکن نے لکھا:

> ہمارا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان میں اشتراکی راج قائم کیا جائے... ہم سمجھتے تھے کہ جیسے ہی ہم مناسب موقع پر اور مناسب مقامات پر کاروائی کریں گے اور ایسے سرکاری افسروں پر حملہ کر کے قتل کریں گے جن سے عوام کو سخت نفرت ہے تو... عوامی تحریک کی ایک لہر سارے ملک میں اُٹھ کھڑی ہو گی۔ ہم اپنے کو اِس تحریک سے وابستہ کر لیں گے۔ ہم گویا اس کے ایک ہتھیار بند دستہ کا کام دیں گے اور اس تحریک کی اشتراکی نظام کی طرف رہبری کریں گے۔ اس تحریک میں ہمارے حصہ لینے کا یہ نتیجہ ہو گا کہ آزاد ہندوستان لازمی طور پر اِشتراکی ہندوستان ہو گا۔[1]

72

۲۱/ دسمبر کو علامہ اقبال نے عثمانیہ یونیورسٹی کو تینوں لیکچروں کے عنوانات لکھ بھیجے۔ لکھا کہ یہی لیکچرز مدراس میں بھی دیئے جائیں گے:

1. Knowledge and Religious Experience
2. The Philosophical Test of the Revelations of Religious Experience
3. Conception of God and the Meaning of Prayer[2]

میسور کے ہندو راجہ کے پرائیویٹ سیکرٹری کی طرف سے علامہ کو دعوت مل چکی تھی کہ میسور میں

---

[1] اجئے گھوش، بھگت سنگھ اور اُن کے ساتھی، ص۱۸-۱۹

[2] مکتوب ۲۱/ دسمبر ۱۹۲۸ء؛ سید شکیل احمد (۱۹۸۴)، 'اقبال حیدر آباد آرکائیوز میں'۔ اقبال ریویو (دکن)، ص۹

راجہ کے مہمان بنیں۔[1]

73

اس برس علیگڑھ یونیورسٹی کے پروفیسر ہادی حسین کی تصنیف ہسٹری آف پرشین نیوی گیشن (A History of Persian Navigation) شائع ہوئی۔ علامہ نے پیش لفظ میں لکھا کہ اسے بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھ کر مستفید ہوئے ہیں۔[2]

تین برس پہلے نصیر الدین ہاشمی کی کتاب دکن میں اُردو پر رائے دیتے ہوئے علامہ نے لکھا تھا کہ پنجاب میں اُردو زبان وادب کی تاریخ کے لیے کچھ پرانا مواد موجود ہے جس کے جمع ہونے پر اُردو کے مورخ کے لیے نئے سوالات پیدا ہوں گے۔ اس برس کسی وقت حافظ محمود شیرانی کی کتاب پنجاب میں اُردو اس قسم کا بہت سا مواد جمع ہو کر سامنے آ گیا۔ زبان کے مورخوں نے توجہ نہ دی۔

اُس برس شائع ہونے والی ایک کتاب مصنف نے اگلے برس مئی ۱۹۲۹ء کے دستخط کے ساتھ علامہ کو پیش کی:

Syed Zafarul Hassan. Realism: *An Attempt to Trace Its Origin and Development in Its Chief Representatives.* Cambridge University Press, London

اِس برس شائع ہونے والی دوسری کتابیں جو کبھی اقبال کے ذخیرۂ کتب میں شامل ہوئیں یہ ہیں:

Carl, Rahn. *Science and the Religious Life—A Psycho-Physiological Approach.* Hale University Press, New Haven

Sigmund Freud (translated by W.D. Robson-Scott). *The Future of an Illusion.* Leonard, London

William Hocking Ernest. *The Self—Its Body and Freedom.* Yale University Press, New Haven

Henry A. Atkinson (editor). *The World's Religions Against War—the proceedings of the preliminary conference held at Geneva, Sept. 1928 to make arrangements for a universal peace conference.* Church Peace Union, Paris

---

[1] حمزہ فاروقی، حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۲۱۸–۲۱۹ بحوالہ انقلاب ۲۲/دسمبر ۱۹۲۸ء

[2] Shahid Hussain Razzaqi(1979/2003), *Discourses of Iqbal*, pp.311

Edwyn Bevan. *Sibyls and Seers—A survey of some ancient theories of revelation and inspiration.* George Allen & Unwin, London
E. S. D. Barucha. *A Brief Sketch of the Zoroastrian Religion and Customs—An Essay Written for the Rahnumai Mazdayasnan Sabha.* D. B. Taraporevala, Bombay
An Indian Mahmedan. *The Indian Moslems.* Ardenne Publishers, London
J. W. N. Sullivan. *Galileo or the Tyranny of Science.* Kegan Paul, London
J. W. N. Sullivan. *The Bases of Modern Science.* Ernest Bew, London
Maurice Maeterlinck (translated by Bernard Miall). *The Life of Space.* George Allen Unwin, London
Oswald Spengler (translated by Charles Francis Atkinson). *The Decline of the West - Volume I: Form and Actuality.* George Allen & Unwin, London
Oswald Spengler (translated by Charles Francis Atkinson). *The Decline of the West—Volume II: Perspectives of World History.* George Allen & Unwin, London[1]

74

دیش بندھو نگر کے نام سے عارضی شہر کانگریس کے اجلاس کے لیے کلکتہ میں بسایا گیا۔ یہیں آل پارٹیز کنونشن بھی ہو رہا تھا۔ تمام جماعتوں سے نہرو رپورٹ کی منظوری حاصل کرنا تھی۔ ۲۲ / دسمبر سے یکم جنوری تک وقفے وقفے سے اجلاس تھے۔ ڈاکٹر انصاری صدارت کر رہے تھے۔

۲۳ / دسمبر کو درجۂ استعمرات (ڈومینین اسٹیٹس) پر بحث شروع ہوئی۔ نہرو رپورٹ نے درجۂ استعمرات کا مطالبہ کیا تھا۔ وائسرائے کے پاس ویٹو کا حق محفوظ رہتا۔ بعض لوگ اس کے بجائے کامل آزادی چاہتے تھے۔ انہی میں جوہرؔ تھے۔ محسوس کیا کہ محفل کا رنگ بدل چکا ہے۔ وطن سے محبت کا ذکر چھیڑا۔ کسی نے طعنہ دیا کہ پھر مسلم ملّت کی بات کیوں کرتے ہیں۔ قاعدے کے مطابق کوئی اعتراض کرنا چاہا۔ شور مچ گیا کہ بیٹھ جاؤ، بیٹھ جاؤ۔ انہوں نے کہا کہ غندہ گردی جاری رہی تو چلے جائیں گے۔ جواب آیا کہ آپ بھی غنڈے ہیں۔[2]

خلافت کانفرنس کی مرکزی اور صوبائی کمیٹیوں کے درمیان بھی انتشار پیدا ہو چکا تھا۔ نہرو

---

[1] Muhammad Siddique, *Descriptive Catalogue*
[2] Anonymous, *The Proceedings of the All Parties National Convention,* p.43, 53

رپورٹ کے حامی خلافت کانفرنس پر چھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ پنجاب خلافت کمیٹی پیش پیش تھی۔ ۲۱؍ دسمبر کو بزرگوں کے درمیان ہاتھاپائی ہوئی۔ ۲۵؍ دسمبر کو کلکتہ میں آل انڈیا خلافت کانفرنس کے تین روزہ اجلاس کا آغاز ہوا۔ ہیلی ڈے پارک میں پنڈال لگایا گیا تھا۔ جوہر صدر تھے۔ کھل کر کہا کہ کنونشن میں اُن کے ساتھ بدسلوکی ہوئی۔ جمہوریت کے نام پر ہندو مسلمانوں کو غلام بنانے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ خلافت کانفرنس نے قرارداد منظور کرنے کا فیصلہ کیا ہے کہ برصغیر کے مسلمانوں کا مطالبہ ہندوستان کی کامل آزادی ہے۔ یہ قرآن کا حکم ہے۔ انسان پر صرف خدا کی حکومت ہو سکتی ہے۔ کسی دوسرے انسان کی حکومت نہیں ہو سکتی۔ [1]

اگلی صبح ۲۶؍ دسمبر کو کلکتہ ہی میں البرٹ ہال میں آل انڈیا مسلم لیگ کے بیسویں اجلاس کا آغاز ہوا۔ یہ جناح گروپ کا اجلاس تھا۔ صرف مندوبین اور چند مہمان موجود تھے۔ استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین مولوی عبدالکریم تھے۔ صدارت مہاراجہ محمود آباد کر رہے تھے۔ ان کے علاوہ جو لوگ آئے تھے اُن میں محمد علی جناح، مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، ڈاکٹر محمد عالم، سیٹھ عبداللہ ہارون، یعقوب حسن، مولانا فضل الحق، ملک برکت علی، سر علی امام، مولانا ظفر علی خاں، مولوی مجیب الرحمٰن اور تمیزالدین خاں نمایاں تھے۔ بعد میں حسین شہید سہروردی بھی شریک ہو گئے۔ سر عبدالرحیم اور علی برادران شریک نہ ہوئے تھے۔ البتہ دنیائے سیاست کا ایک نووارد اِس دفعہ کافی نمایاں تھا۔ یہ کرنال کے رئیس نوابزادہ لیاقت علی خاں تھے۔ طے پایا کہ سہ پہر کو سبجکٹس کمیٹی وفد کے ارکان کا انتخاب کرے گی جو کنونشن میں جا کر مسلمانوں کی نمایندگی کریں۔

۲۷؍ دسمبر کو اجلاس کی دوسری نشست ہوئی۔ جسٹس امیر علی کی تعزیت میں قرارداد منظور کی گئی۔ اُن کے اعلیٰ ترین علمی مرتبے کا اعتراف کیا گیا۔ لاجپت رائے کی تعزیت میں بھی قرارداد منظور ہوئی۔ اعتراف کیا گیا کہ ایک عظیم اور بے لوث محبِ وطن تھے۔ عوام انہیں شیر پنجاب کہتے تھے۔

کنونشن میں شرکت کے لیے وفد بنایا گیا۔ لیگ کے موقف کا پابند رہے۔ ۲۸؍ یا ۲۹؍ دسمبر تک واپس آکر رپورٹ دے۔ تیئیس اراکین تھے: مہاراجہ محمود آباد، محمد علی جناح، ڈاکٹر سیف الدین

[1] Mitra, *Register July-Dec 1928,* pp.402-407

کچلو، ایم سی چھاگلہ، ملک برکت علی، مولوی عبد الحامد، مولوی مجیب الرحمٰن، ڈاکٹر محمود، مولوی حسام الدین، مولوی محمد اکرم خاں، مولانا ظفر علی خاں، سیٹھ یعقوب حسن، غازی عبد الرحمٰن، عبد اللہ بریلوی، تصدق احمد خاں شیر وانی، چودھری خلیق الزماں، نوابزادہ لیاقت علی خاں، مولوی مظہر علی، شاہ محمد زبیر، مولوی عبد الکریم، مولوی محمد اسلم، مولوی عزیز الحق اور مولوی فیض نور علی۔[1]

دوسری طرف کنونشن کا چوتھا دن تھا۔ پنڈت موتی لال نہرو نے اعلان کیا کہ مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی کے نمایندے پہلی دفعہ کنونشن میں آرہے ہیں۔ اُن کے ساتھ مذاکرات کے لیے سب کمیٹی بنائی گئی۔ سینتیس اراکین تھے: مہاتما گاندھی، سر تیج بہادر سپرو، پنڈت مدن موہن مالویہ، ڈاکٹر انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد، پنڈت موتی لال نہرو، ڈاکٹر مونجے، ایم آر جیکار، جے رام داس دولت رام، سردار سورل سنگھ کویشر، ڈاکٹر ستیاپال، لالہ دونی چند، ایم ایس اینی، ماسٹر تارا سنگھ، بابو راجندر پرشاد سنہا، سی وائی چنتامنی، کنور گنگادھر سنہا، جے ایم سین گپتا، شری نواس آینگر، بابو برج کشور، رلیارام، سر علی امام، ڈاکٹر اینی بیسنٹ، ہربیلاس سردا، پروفیسر گلشن رائے، رام دیو، سی وجیار گھواچریار، جے آر بینرجی، ہریندر ناتھ دت، جمشید مہتا، سردار گردیال سنگھ، دیوان بہادر رامچندر اؤ، سردار تارا سنگھ، سردار ہیرا سنگھ، سردار گورودت سنگھ اور پروفیسر جتندر لال بینرجی۔

خلافت کمیٹی کا وفد اُس گروپ سے تھا جس نے خلافت کانفرنس اور علی برادران کے خلاف بغاوت کی تھی۔ "نیشنلسٹ" مسلمانوں پر مشتمل تھا۔ نہرو رپورٹ کا حامی تھا۔ پینتالیس افراد تھے: شاہ محمد زبیر، ڈاکٹر انصاری، مولانا ابوالکلام آزاد، سیٹھ یعقوب حسن، ڈاکٹر سید محمود، ڈاکٹر سیف الدین کچلو، چودھری خلیق الزماں، مولانا عبد القادر قصوری، ڈاکٹر محمد عالم، ٹی اے کے شیر وانی، مولانا مظفر علی خاں، مولانا مسعود علی ندوی، مولانا حبیب الرحمٰن، عبد الرحمٰن غزنوی، میاں سراج الدین، مولانا محمد داؤد غزنوی، سید حسام الدین، عبد الحامد خاں، شفیع محمد، ماسٹر تاج الدین، چودھری محمد یعقوب، حافظ عبد العزیز، شیخ عمر الدین، ملک لبھو، میاں علم الدین، خان عبد الرحیم، چودھری عبد الحمید، امیر عالم

---

[1] Mitra, *Register July-Dec 1928,* pp.397-399; AIML, *Resolutions,* pp.43-44

اعوان، مظہر علی اظہر، حکیم محمد سکندر، حکیم احمد حسین، شیخ بشیر احمد رضوانی، خواجہ غلام محمد، ظفر الملک، احد حسین کدوائی، محمد عثمان، حکیم عبدالستار، یعقوب علی خاں، لطیف الدین احمد اور امام عبدالقادر باوزیر۔

غالباً پنڈت موتی لال نہرو کے شامیانے میں تینوں وفد اکٹھے ہوئے: کنونشن کی سب کمیٹی، مسلم لیگی وفد اور متنازعہ خلافت کمیٹی کا وفد۔ مسلمانوں کی طرف سے نہرو رپورٹ میں ترامیم پیش کی گئیں:

۱ مرکزی مجلس قانون ساز کے دونوں ایوانوں میں مسلمانوں کی نشستیں ایک تہائی ہوں۔

۲ پنجاب اور بنگال میں اگر بالغ رائے دہی رائج نہ ہو تو مسلمانوں کے لیے اُن کی آبادی کے تناسب سے نشستیں مخصوص کی جائیں۔ انتخابات میں وہ اس سے زیادہ نشستیں حاصل کرنے کی کوشش نہیں کریں گے۔ دس برس بعد نظرِ ثانی کیا جاسکتا ہے۔

۳ مابقی اختیارات (residuary powers) مرکز کی بجائے صوبوں کے پاس ہوں۔ اس حوالے سے نہرو کمیٹی کی سپلمنٹری رپورٹ کی شق ۱۳-الف حذف کر دی جائے۔ شیڈول نمبر ۱ اور ۲ کے موضوعات پر نظرِ ثانی ہو۔

۴ یہ ترمیم متفقہ طور پر منظور ہوئی کہ دستور میں کوئی تبدیلی نہ ہو جب تک پارلیمنٹ کے دونوں ایوانوں میں الگ الگ اسی فیصد کی اکثریت اور دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس میں بھی اسی فیصد کی اکثریت اسے منظور نہ کرے۔

۵ سندھ کی علیحدگی اور صوبہ سرحد میں آئینی اصلاحات کے لیے یہ شرط ہٹا دی جائے کہ اس سے پہلے نہرو رپورٹ کا پوری طرح اطلاق ہونا ضروری ہے۔

متنازعہ خلافت کمیٹی نے "میثاقِ پنجاب" کو قبول کرنے کی تجویز پیش کی جسے نیشنلسٹ مسلمانوں نے لکھنؤ میں طے کیا تھا۔ بنگال ہندو سبھا نے تجویز کیا کہ بنگال میں ہندوؤں کی نشستیں بھی ان کی آبادی کے تناسب سے ۴۸ فیصد مقرر کر دی جائیں۔

لیگ کی پانچوں ترامیم میں سے صرف چوتھی ترمیم متفقہ طور پر قبول کی گئی۔ بقیہ تمام ترامیم مسترد کر دی گئیں۔ متنازعہ خلافتی نمایندوں کی ترمیم قبول کرنے پر سب کمیٹی تیار تھی۔ سکھ نمایندوں

نے مسترد کر دیا۔ بنگال ہندو سبھا کی ترمیم کو سب کمیٹی نے قبول نہ کیا۔

اُسی روز کانگریس کمیٹی نے نہرو رپورٹ کے حق میں قرارداد تیار کر لی۔ کنونشن کو بھجوا دی۔ اس بات کا کوئی تذکرہ نہ تھا کہ نہرو رپورٹ کانگریس ہی کے گزشتہ برس کے اجلاس کی سب سے اہم قرارداد کے منافی تھی۔ قرار پایا تھا کہ حکومت نے ایک برس میں پوری رپورٹ قبول نہ کی تو عدم تعاون کی تحریک شروع کی جائے گی۔ رپورٹ کی منظوری پر بھی ڈومینین اسٹیٹس کی بجائے کامل آزادی حاصل کرنے کی کوشش جاری رہے گی۔[1]

اگلے روز ۲۸؍دسمبر تھی۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس کلکتہ ہی میں ہو رہا تھا۔ علی برادران آئے۔ جوہرؔ نے کہا کہ ابتدأ میں درحقیقت کانفرنس مسلمانوں کی بیداری کا باعث ہوئی۔ مسلمانوں کو سیاست میں قبل از وقت اور غلط طریقے سے داخل ہونے سے باز رکھا۔ ''ہندوستان میں جو بیداری اور آزادی کی روح پیدا ہو رہی ہے اُس کے بانی درحقیقت سر سید تھے،'' اُنہوں نے کہا۔ ''میں اِس وقت کانگریس کے اجلاس [کانگریس کمیٹی کے اجلاس] سے آ رہا ہوں جہاں ابھی آزادی کا رزولیوشن پاس ہوا ہے،'' اُنہوں نے کہا۔ ''لیکن یہ درحقیقت نتیجہ ہے سر سید کی ابتدائی کوششوں کا۔'' سر سید کی روح کو مخاطب کرتے ہوئے اپنا شعر پڑھا:

سکھایا تھا تمہیں نے قوم کو یہ شور و شر سارا　　جو اِس کی انتہا ہم ہیں تو اِس کی ابتدا تم ہو[2]

اُس روز لیگ کا اجلاس نہ رکھا گیا۔ لیگی وفد نے کنونشن میں شریک ہونا تھا۔ طے کیا کہ اس کی طرف سے صرف جناح تقریر کریں گے۔ سہ پہر ساڑھے چار بجے کنونشن کے پانچویں دن کا عام اجلاس شروع ہوا۔ صدر ڈاکٹر انصاری نے کانگریس کی قرارداد پڑھ کر سنائی۔ پھر مسلمانوں کی چھ تجاویز اور سب کمیٹی کے فیصلے سے کنونشن کو آگاہ کیا۔ ڈاکٹر محمد عالم نے متنازعہ خلافت کمیٹی کی طرف سے ایک بیان پڑھ کر سنایا۔ مولانا شوکت علی کی طرف سے اس کا جواب بھی پڑھ کر سنایا۔

جناح نے ڈاکٹر انصاری کی دعوت پر لیگ کی طرف سے کنونشن کے سامنے ترامیم پیش کیں۔

---

[1] Anonymous, *The Proceedings of the All Parties National Convention,* pp.75-76

[2] ثناءُالحق صدیقی (۱۹۹۰) مولانا محمد علی جوہر، حیات اور تعلیمی نظریات، ص ۳۰۷-۳۱۰

وہی ترامیم تھیں جنہیں گزشتہ روز سب کمیٹی مسترد کر چکی تھی۔ جناح نے ان کی وضاحت میں تقریر کی۔ حاضرین کو یاد دلایا کہ مارچ ۱۹۲۷ء میں کم و بیش یہی تجاویز دہلی مسلم تجاویز کے نام سے پیش کی گئی تھیں۔ کانگریس کمیٹی نے بھی انہیں منظور کر لیا تھا۔ کانگریس نے مدراس کے اجلاس میں ان کے حق میں قرارداد منظور کی تھی۔ مسلم لیگ نے گزشتہ برس کلکتہ کے اجلاس میں ان کی توثیق کی تھی۔

ڈاکٹر محمد عالم نے رسمی طور پر جناح کی تائید کی۔ ڈاکٹر سر تیج بہادر سپرو نے اُسی روز الٰہ آباد روانہ ہونا تھا۔ وہاں دو روز بعد نیشنل لبرل فیڈریشن کا گیارہواں سالانہ اجلاس سر چمن لال ستیلواڈ کی صدارت میں ہو رہا تھا۔ سپرو نے نہرو رپورٹ کا دفاع کیا۔ اس کی بنیاد متحدہ ہندوستانی قومیت کے اصول پر ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مرکزی اسمبلی میں مسلمانوں کی نشستیں پورے ہندوستان میں ان کی تعداد کے تناسب سے رکھی گئی ہیں۔ یہ ۲۷ فیصد بنتا ہے۔ جناح اگرچہ چھ فیصد زیادہ مانگ رہے ہیں تو کیوں نہ ان کی بات مان لی جائے اگر یوں اتحاد قائم ہو سکتا ہے؟

پنڈال میں شور مچ گیا، ''نہیں! نہیں!''۔ سپرو نے کہا کہ جناح کو ''ایک بگڑا بچہ، ایک شرارتی بچہ'' ہی سمجھ کر بات مان لی جائے۔ پنجاب اور بنگال میں نشستوں کے تناسب، سپلمنٹری رپورٹ کی شق اور شیڈولوں پر نظرِ ثانی کے بارے میں کنونشن کی مرضی ہے وہ جو بھی فیصلہ کرے۔ البتہ مابقی اختیارات مرکز کے پاس ہی ہونے چاہئیں۔ انہیں صوبوں کے سپرد نہیں کیا جا سکتا۔

لبرل فیڈریشن کی طرف سے چنتامنی نے کہا کہ ان کی پارٹی کا فیصلہ ہے کہ مابقی اختیارات ضرور مرکز کے پاس ہی رہیں۔ آل انڈین کرسچین کانفرنس کی طرف سے مسلمانوں کے مطالبات کی مخالفت کی۔ ریورنڈ بینرجی نے بھی یہی موقف پیش کیا۔ پھر سردار بہادر مہتاب سنگھ نے تقریر کی۔

ہندو مہاسبھا کی طرف سے جیکر نے کہا کہ جناح کو بگڑا بچہ سمجھ کر اُن کی بات مان لینے کا موقع نہیں بلکہ سوال یہ ہے کہ اُن کے مطالبات کس حد تک جائز ہیں۔ سچ یہ ہے کہ وہ تمام مسلمانوں کی نمایندگی نہیں کرتے۔ ابوالکلام جیسے نیشنلسٹ مسلمان ان سے اختلاف رکھتے ہیں۔ میاں شفیع اختلاف رکھتے ہیں۔ آغا خاں جیسے سرکردہ مسلمان کی رہنمائی میں دہلی میں مسلم کانفرنس ہونے والی ہے۔ وہ ان کے ساتھ نہیں ہے۔ جناح مسلمانوں میں سے صرف ایک چھوٹی سی جماعت کی نمایندگی کر رہے ہیں۔

سوال یہ بھی ہے کہ یہ مطالبات ہندوستان کے اتحاد پر کیا اثر ڈالیں گے۔ نہرو رپورٹ کی بنیاد چار اُصولوں پر ہے:

۱ مسلمانوں کے سوا کسی دوسری ملت کے لیے نشستیں مخصوص نہیں کی جائیں گی۔
۲ مسلمانوں کے لیے نشستوں کی تخصیص کی بنیاد صرف آبادی کے اصول پر ہو گی۔
۳ کسی اکثریتی ملت کے لیے تحفظات فراہم نہیں کیے جائیں گے۔
۴ واحد ملت جسے خصوصی نمایندگی دی جائے گی وہ مسلمان ہوں گے نہ کہ ہندو۔

جیکر نے کہا کہ جناح کے مطالبات چاروں اصولوں کے خلاف جاتے ہیں۔ پوری نہرو رپورٹ اُدھڑ جائے گی۔ ہندوؤں میں بھی بعض لوگوں کے بڑے جارحانہ عزائم ہیں۔ اُنہیں مشکل سے نہرو رپورٹ قبول کرنے پر آمادہ کیا ہے۔ انہیں روکنا مشکل ہو جائے گا۔ جناح اتنے محبِ وطن ہیں کہ یہاں جو بھی فیصلہ ہو، جناح آپ سے الگ نہ ہوں گے اور کوشش کریں گے کہ مسلم لیگ کو بھی لے آئیں۔

جناح کہہ اُٹھے، ''مگر کیا لیگ میرے ساتھ آئے گی؟'' جیکر نے مزید چند جملے کہہ کر تقریر ختم کر دی۔ جناح نے جوابی تقریر میں کہا کہ مسلم لیگ یہاں کوئی تنازعہ کھڑا کرنے نہیں آئی۔ اس کے مطالبات کی بنیاد تسلیم شدہ امر پر ہے کہ ملک میں ملتوں کا فرق (communalism) موجود ہے۔ جو سخت باتیں آج کہی گئیں، اُن کی ضرورت نہ تھی۔ جیکر نے جو کچھ کہا، مختصر طور پر دھمکی ہے۔ ہندو مہاسبھا کی طرف سے یہ دھمکی شروع ہی میں دی گئی تھی کہ رپورٹ میں ہندو مسلم مسئلے کے بارے میں ایک لفظ بھی تبدیل کیا گیا تو رپورٹ کی حمایت ترک کر دی جائے گی۔ جس ملک میں بھی آزادی اور جمہوری نظامِ حکومت قائم کرنے کی جدوجہد ہوئی، وہاں اقلیتوں کا مسئلہ حل کرنا پڑا۔ یہ مسئلہ آج حل نہ ہوا تو کل کرنا پڑے گا لیکن اس دوران قومی مفادات کو نقصان پہنچ چکا ہو گا۔ اگر ہم متفق نہیں ہو سکتے تو متفق نہ ہونے پر ہی اتفاق کر لیں مگر دوستوں کی طرح جدا ہوں۔

جناح کی پانچ ترامیم باری باری پیش کی گئیں۔ متنازعہ خلافت کمیٹی اور لیگ کے نمایندوں نے ووٹنگ میں حصہ نہ لیا۔ چوتھی ترمیم جسے سب کمیٹی نے بھی منظور کیا تھا ایک دفعہ پھر متفقہ طور پر منظور ہوئی۔ باقی ترامیم بھاری اکثریت کے ساتھ مسترد ہوتی گئیں۔ احمدیہ جماعت نے البتہ تائید کی۔ متنازعہ

خلافتی کمیٹی کی میثاقِ پنجاب کے حق میں ترمیم قبول کر لی گئی۔ سکھ نمایندوں کا اعتراض نوٹ کیا گیا۔[1]

۲۹ر دسمبر کو لیگ کا اجلاس ہنگامہ خیز ثابت ہوا۔ ایم سی چھاگلہ نے قرارداد پیش کی۔ دہلی میں جو مسلم کانفرنس منعقد ہونے والی ہے، اُس میں لیگ کے نمایندے نہ بھیجے جائیں۔ اگر ہر بحران پر لیگ کی حریف تنظیمیں تشکیل دی جانے لگیں تو ملّی مفادات کو نقصان پہنچے گا:

> The League regrets that it cannot accept the invitation of the General Secretary of the All-Parties Muslim Conference to send representatives to it as the League is strongly of opinion that it would be disastrous to Muslim interests if rival and 'ad hoc' organizations of the nature of the Conference were set up at every cricis in the history of the community. The League feels that it was the duty of the patriotic Muslims to rally round the League at this important juncture to decide what attitude the Mussalmans should take about the impending constitutional reforms. The League is further of opinion that the constitutional procedure of the Conference as outline in the letter of the Secretary of the Conference is not likely to enable the Conference to serve any useful purpose or assist the Muslim community in arriving at a definite conclusion.

صادق نے ایک مخالف قرارداد پیش کی۔ مسلم کانفرنس میں شریک ہونے کی حمایت کی۔ مولانا فضل الحق نے تائید کی۔ مہاراجہ محمود آباد نے اپنی صدارت جناح کو تفویض کر کے خود بحث میں حصہ لیا۔ کانفرنس میں شرکت کی مخالفت کی۔ شرکت کے خلاف قرارداد بھاری اکثریت کے ساتھ منظور ہوئی۔ تار کے ذریعہ یہ قرارداد مسلم کانفرنس کا انتظام کرنے والوں کو بھیج دی گئی۔ جناح نے الگ تار بھجوایا کہ وہ بھی لیگ کے فیصلے کے پابند ہیں۔[2]

---

[1] Anonymous, *The Proceedings of the All Parties National Convention,* p.78-96

[2] Mitra, *Register July-Dec 1928*, pp.399-401; Hafizur Rahman (1929) *Report of the All-India Muslim Conference* , pp.17; AIML, *Resolutions,* pp.44

ان تمام دستاویزات سے قطعِ نظر کرتے ہوئے اسٹینلے والپورٹ نے قائدِاعظم کی مشہور سوانح میں نہ صرف یہ لکھا کہ جناح دہلی کی آل انڈیا مسلم کانفرنس میں شریک ہوئے بلکہ فرضی منظرنامہ بھی پیش کیا کہ تاخیر کے ساتھ پہنچے، پنڈال میں جا کر بیٹھے اور کیا کیا افکار ذہن میں گردش کر رہے تھے: Wolpert, *Jinnah of Pakistan,* pp.103-104

باب ۷

شہید کی قبر

دسمبر ۱۹۲۸ء سے جنوری ۱۹۲۹ء تک

1

۳۰ر دسمبر کو رات پونے نو بجے ہز ہائی نس سر آغا خاں ریل گاڑی سے دہلی پہنچے۔ ہجوم جمع تھا۔ خصوصی راستہ سجا تھا۔ "اللہ اکبر" کے فلک شگاف نعرے بلند ہوئے۔ آغا خاں تلوار بردار رضاکاروں کے پیچھے چلتے ہوئے، گلدستہ ہاتھ میں اُٹھائے، اسٹیشن سے نکلے۔ پھولوں سے سجی گاڑی میں بیٹھے۔ ریاست نوانگر کے حکمراں جام صاحب کی دہلی کی قیام گاہ جام نگر پہنچایا گیا۔ یہاں ٹھہرنا تھا۔ آل انڈیا مسلم کانفرنس کی صدارت کے لیے آئے تھے۔ کل اور پرسوں ہو رہی تھی۔ [1]

۳۰-۳۱ر دسمبر کو الہ آباد کے میوہال میں نیشنل لبرل فیڈریشن ("لبرل پارٹی") کا گیارہواں اجلاس ہوا۔ سر چمن لال سیتلواڈ نے صدارت کی۔ درجۂ استعمرات (dominion status) کی حمایت کی۔ کامل آزادی کی مخالفت کی اور کہا کہ دونوں بالکل مختلف ہیں۔ [2]

انقلاب کے مطابق علامہ اقبال ۳۱ر دسمبر کی صبح کو لاہور سے دہلی پہنچے۔ [3] عبداللہ چغتائی اور

---

[1] Hafizur Rahman (1929) *Report of the All-India Muslim Conference*

[2] *Report of the 11th Annual Session of the National Liberation Federation held at Allahabad 1928*

[3] انقلاب ۴ر جنوری ۱۹۲۹ء؛ حمزہ فاروقی (۱۹۸۸)، ص ۲۱۹۔ عبداللہ چغتائی نے اقبال کی صحبت میں، ص ۳۰۹ پر لکھا، "۳۰ر دسمبر کو... صبح صبح" روانگی ہوئی قریباً... آٹھ بجے شام ہم لوگ دہلی پہنچ گئے۔" اگلے صفحے پر ہے، "ہم لوگ... ۳۰ر دسمبر کو مدراس کے لیے لاہور سے روانہ ہوئے۔"

چودھری محمد حسین ساتھ تھے۔ چغتائی کہتے ہیں کہ مسلم کانفرنس کے دوسرے شرکأ بھی اسی گاڑی میں سفر کر رہے تھے۔ ان میں سر فیروز خاں نون شامل تھے۔ اُنہوں نے علامہ، چغتائی اور محمد حسین کے لیے ریلوے اسٹیشن پر دو اقامتی کمروں کا انتظام کروایا تھا۔ سالک اور مہر بھی ساتھ گئے۔[1]

.دہلی

2

جامع مسجد دہلی کے سامنے میدان میں ٹین کی چھت ڈال کر پنڈال بنایا گیا تھا۔ خوب سجا ہوا تھا۔ قریباً پانچ ہزار لوگوں کی جگہ تھی۔ انتظامی کمیٹی کے سربراہ حکیم محمد جمیل خاں تھے۔ مرحوم حکیم اجمل خاں کے فرزند تھے۔

آل انڈیا مسلم کانفرنس کا افتتاح ۳۱/ اگست کو دوپہر ۲ بجکر ۲۵ منٹ پر ہوا۔ اسٹیج پر آغا خان کے لیے ایک سنہری کرسی تھی۔ پیچھے سرکردہ رہنماؤں کی کرسیاں تھیں۔ پھر پردہ نصب تھا۔ دوسری طرف خواتین تھیں۔ بیگم حسرت موہانی پردے کے بغیر شوہر کے ساتھ اسٹیج پر تھیں۔ جوہرؔ کی بیگم اور بیٹی اسٹیج پر نقاب پوش تھیں۔

کانفرنس میں شرکت کے لیے چھ سو دعوت نامے بھیجے گئے تھے۔ مرکزی اور صوبائی اسمبلیوں کے تمام منتخب مسلمان اراکین کو دعوت دی گئی۔ آل انڈیا مسلم لیگ کے کلکتہ گروپ (جناح گروپ) اور لاہور گروپ (شفیع گروپ)، آل انڈیا خلافت کانفرنس اور جمعیت علمائے ہند سے بیس بیس نمایندے بھیجنے کی درخواست کی گئی۔ ہر صوبے سے مسلمانوں کے بیس بیس نمایندے مدعو ہوئے۔ نیشلنسٹ مسلمانوں کو بھی دعوت تھی۔ وہ نہیں آئے۔ علی برادران کلکتہ سے آ رہے تھے۔ بروقت ریل کے ٹکٹ نہ ملنے کی وجہ سے اگلے دن پہنچ رہے تھے۔

قریباً چار سو مندوبین موجود تھے۔ علامہ اقبال، میاں سر محمد شفیع، سر ابراہیم رحمت اللہ، سر

---

[1] عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۳۱۱-۳۰۹

عبدالقیوم، مولانا مفتی کفایت اللہ، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا مظہر الدین، ڈاکٹر ضیاؑالدین احمد، نواب محمد اسماعیل خاں، خان بہادر مولوی محمد یعقوب، ملک فیروز خاں نون، غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، مولوی محبوب عالم، مولانا سید حبیب، ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین، میاں محمد شاہنواز، نواب سر ذوالفقار علی خاں، نواب احمد جان دولتانہ، خان بہادر نواب محمد ابراہیم علی خاں، سیٹھ حاجی عبداللہ ہارون، مولانا محمد شفیع داؤدی، میر غلام بھیک نیرنگ، چودھری دین محمد اور حسین شہید سہروردی شامل تھے۔ احمدیوں کی طرف سے چودھری ظفر اللہ خاں، مفتی محمد صادق، حکیم ابوطاہر محمد احمد اور بابو اعجاز حسین آئے۔

عام حاضرین کو ملا کر تعداد قریباً پانچ ہزار تھی۔ پنڈال بھرا ہوا تھا۔ لاؤڈ اسپیکرز تھے۔ جامع مسجد دہلی کے امام شمس العلمأعید احمد نے تلاوت کی۔ سورۂ بقرہ کی آخری تین آیات پڑھیں:

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ط وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ط فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ط وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۸۴﴾ اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ط كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ﴿۲۸۵﴾ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ط لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ط رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ وَاعْفُ عَنَّا وَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا اَنْتَ مَوْلٰىنَا فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ

غالباً ترجمہ پیش نہیں کیا۔ آیات مشہور تھیں۔ سبھی ان کے مفہوم سے واقف تھے:

جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب خدا ہی کا ہے۔ تم اپنے دلوں کی بات کو ظاہر کرو گے یا چھپاؤ گے، خدا تم سے اس کا حساب لے گا۔ پھر وہ جسے چاہے مغفرت کرے اور جسے چاہے عذاب دے۔ اور خدا ہر چیز پر قادر ہے۔

رسول اُس کتاب پر جو اُن کے پروردگار کی طرف سے اُن پر نازل ہوئی ایمان رکھتے ہیں اور مومن بھی۔ سب خدا پر اور اس کے فرشتوں پر اور اس کی کتابوں پر اور اس کے پیغمبروں پر ایمان رکھتے ہیں: "ہم اُس کے پیغمبروں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے۔" اور کہتے ہیں کہ

ہم نے سنا اور قبول کیا۔ اے پروردگار ہم تیری بخشش مانگتے ہیں اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے۔

خدا کسی شخص کو اُس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ اچھے کام کرے گا تو اس کو ان کا فائدہ ملے گا۔ برے کرے گا تو اسے ان کا نقصان پہنچے گا۔ اے پروردگار اگر ہم سے بھول یا چوک ہو گئی ہو تو ہم سے موٴاخذہ نہ کیجیو۔ اے پروردگار ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈالیو جیسا تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر ڈالا تھا۔ اے پروردگار جتنا بوجھ اٹھانے کی ہم میں طاقت نہیں اتنا ہم پر مت ڈالنا۔ اور ہمارے گناہوں سے در گزر کر اور ہمیں بخش دے۔ اور ہم پر رحم فرما۔ تو ہی ہمارا مالک ہے اور ہم کو کافروں پر غالب فرما!

منشی عبدالخالق خلیقؔ نے اُردو اور فارسی میں آغا خاں کی مدح میں قصیدے سنائے۔ مطلعے تھے:

در بدن روحِ رواں آید ہے   در وطن سر آغا خاں آید ہے

*

پھر اتحادِ قوم کا نقشہ وطن میں ہے   سر آغا خاں کی آج صدارت ہے اے خلیق

حکیم جمیل خاں نے استقبالیہ کمیٹی کی طرف سے خطاب کیا۔ پمفلٹ کی صورت میں تقسیم ہوا۔ بد قسمتی سے ملک میں کوئی تنظیم نہیں جو تمام مسلمانوں کی نمایندگی کرتی ہو۔ ایسا فیصلہ کرے جو سب مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول ہو۔ ایسی تنظیم مسلمانوں کی موجودہ نسل کے لیے اور ملک میں مسلمانوں کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ آغا خاں مسلم لیگ کے دونوں دھڑوں کو دوبارہ متحد کر دیں۔ کانگریس نے آل پارٹیز کانفرنس بلائی اگرچہ خود پورے ہندوستان کی نمایندگی کا دعویٰ رکھتی ہے۔ لیگ تمام مسلمانوں کی نمایندہ جماعت ہے لیکن مسلم کانفرنس کی ضرورت بھی پڑی ہے۔

فضل ابراہیم رحمت اللہ کانفرنس کے سیکرٹری تھے۔ استقبالیہ تقریر میں کانفرنس کے طریقِ کار پر روشنی ڈالی۔ کوئی تجویز پہلے سے مرتب نہیں کی گئی تھی جو کانفرنس میں پیش کی جاتی۔ مقصد یہ تھا کہ ہر مکتبِ فکر کے مسلمان آزادانہ تبادلۂ خیال کے ذریعے معلوم کر سکیں کہ ملت کی متفقہ رائے کیا ہے۔ بہت سے مندوبین نہیں آ سکے تھے مگر تار کے ذریعے پیغامات بھیجے تھے۔ وہ پڑھ کر سنائے گئے۔ زیادہ

تر پیغامات تائید و حمایت کے تھے۔ مسلم لیگ (کلکتہ گروپ) کے صدر سر مہاراجہ محمود آباد محمد علی محمد نے لیگ کی مخالفانہ قرارداد بھیجی تھی کہ اگر قوم کی تاریخ کے ہر نازک مرحلے پر لیگ کی حریف تنظیمیں تشکیل دی جانے لگیں تو قومی مفادات کو نقصان پہنچے گا۔ جناح نے اسی کو حوالہ بنا کر شرکت سے انکار کا پیغام بھیجا تھا۔

مرکزی مجلس خلافت کے سابقہ صدر مولانا محمد شفیع داؤدی نے رسمی طور پر تجویز پیش کی کہ کرسیٔ صدارت ہز ہائی نس سر آغا خاں کو پیش کی جائے۔ اُنہوں نے کہا کہ نیشنلسٹ مسلمان نہرو رپورٹ کی حمایت کے جوش میں کانفرنس کے متعلق غلط افواہیں پھیلا رہے ہیں۔ ہندو اخبارات میں لکھا گیا کہ یہ کانفرنس حکومت کے اشارے پر بلائی گئی ہے۔ مولانا داؤدی کی تردید شائع کرنے سے انکار کر دیا۔ مسلمانوں کے لیے قرآن شریف کا حکم ہے کہ جب کسی مسئلے کا تعلق تمام مسلمانوں سے ہو تو متحد ہو جائیں۔

خان بہادر مولوی محمد یعقوب مرکزی قانون ساز مجلس کے ڈپٹی پریذیڈنٹ تھے اور پچھلے برس لیگ (کلکتہ گروپ) کی صدارت کر چکے تھے۔ مولانا داؤدی کی تائید میں تقریر کی۔ اُنہوں نے کہا کہ یہ الزام مضحکہ خیز ہے کہ کانفرنس حکومت کے اشارے پر بلائی گئی۔ بلانے والوں میں مولانا شفیع داؤدی پیش پیش ہیں۔ عدم تعاون کے سرگرم حامی رہے۔ پانچ برس موتی لال نہرو کے معاون تھے۔ مسلمانوں کی سیاسی تحریک کا آغاز ۱۹۰۶ء میں ہوا۔ آغا خاں نے اس کا بیج بویا تھا۔ وائسرائے کے سامنے مسلمانوں کے وفد کی قیادت کی تھی۔ جداگانہ انتخابات کا مطالبہ پیش کیا۔ آج مسلمان اپنے حقوق کی تجدید کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ اب جبکہ جداگانہ انتخابات کے سوال پر نظر ثانی کیا جا رہا ہے، خوش قسمتی سے اُسی باغباں کی خدمات دوبارہ میسر آ رہی ہیں جس نے پہلے پہل بیج بویا تھا۔

اِس بات پر حاضرین نے خوب تالیاں بجائیں۔ نواب ذوالفقار، محمود سہروردی اور سیٹھ عبداللہ ہارون نے بھی آغا خاں کی صدارت کی تائید کی۔ حاضرین نے تالیوں کے ساتھ منظور کیا۔ حکیم جمیل خاں صدارت کی سنہری کرسی سے اُترے۔ آغا خاں بیٹھے۔ پھولوں کے ہار پہنائے گئے۔

آغا خاں نے خطبۂ صدارت پڑھا۔ چھپی ہوئی کاپیاں حاضرین میں تقسیم کی گئیں۔ انہوں نے کہا

کہ دورِ جدید کی تاریخ کا سب سے اہم سبق یہ ہے کہ صرف وہی قومیں کامیاب ہوتی ہیں اور صرف وہی پالیسیاں قوموں کی عظمت کا باعث بنتی ہیں جن کی بنیاد چند رہنماؤں یا مفکروں کے افکار و تصورات پر نہ ہو بلکہ اجماع اور عوام کی آرا پر ہو۔ وقت آ گیا ہے کہ ہمارے عوام آپ اپنی رہنمائی کریں۔ رہنما اپنے کان زمین سے لگا کر عوام کی آرا اور خواہشات جاننے کی کوشش کریں۔ آپ اپنی ترجیحات کے بجائے عوام کی حقیقی خواہشات کی ترجمانی کیجیے۔ ہندوستان کے مسلمان صرف ایک برادری ("کمیونٹی") نہیں ہیں۔ وہ ایک مخصوص معانی میں قوم ("نیشن") ہیں جو کئی برادریوں پر مشتمل ہے۔ اس کی مجموعی تعداد جنگِ عظیم سے پہلے کی جرمن سلطنت کی آبادی سے زیادہ ہے۔

Presidential Address to the All-India Muslim Conference held at Delhi

Delivered by His Highness Aga Khan III
[Excerpt]

The great lesson of modern history, to my mind, is that only those nations succeed and only those policies lead to national greatness, which are based not on ideas or ideals of a few leaders, however eminent, or of a few thinkers, but on the general consensus of views and opinions of the people ... When in my manifesto last year, I appealed to the Moslems of India to replace the old self-constituted political bodies that had served their day and purpose by an organization of all Muslim members in touch with their electorates, I wished to place the guidance of our people in their own hands. The time has come when the leaders should keep their ears to the ground and ascertain the views and wishes of the masses. Gentlemen, make no mistake. The changes that must come over India profoundly affecting our future … will not come as in Russia like a thief in the night … [The] attitude of the overwhelming mass of the Indian public during the [Great] War showed to the world that they were not in favour of such a hurried solution. Whatever our wishes may be, this Conference is but the first of many more that will have to evolve a truly representative body to look after and further the desires of Moslems of India. The greatest service you can render to your people would be to organise all the Moslem members of each and every Council into a body where exchange of views and ideas and communication of the same to the electors, as well as the reception of the general desires of the masses, would remain the main purpose and object. In politically successful countries, from the Premier of the President to the humblest voter, it is

but one succession of nerve lines of communication ... From now onwards we must ever remember, even in this Conference, not what are our own individual political preferences but what are the aspirations of the Moslem masses in this country ...

Another point to be kept before us is that our desires must not be mere ideas and ideals. You are part of them [i.e. the masses]. It is your duty to interpret as far as you can their wishes, their aspirations and their ideals, till such time as our political organization is sufficiently advanced to let the people carry out their own wishes.

Another point to be kept in view is that our wishes or ideals are not necessarily realities. You must avoid forcing your own preferences when they clash with what we believe to be the real wishes of the masses of the people … What are the desires of the Indian Moslems? I can safely say that the over-whelming majority of the Moslems are determined to maintain their cultural unity [*hear, hear*] and remain culturally interrelated with the Moslems of the world. How that can best be accomplished, it is for you to think out.

But that does not mean that the general welfare of the whole commonwealth is to be ignored by us … The Moslem members should consider it their duty to look after the interests of India as a whole or of a Province as a whole and advocate the promotion of general interests at every opportunity ... Now, whether in education or politics, … build on a solid foundation. Do not be carried away by catchwords; nor hanker after ideals that may not be within your grasp, but [rather] concentrate your minds on what is practicable and useful under pressing economic and political needs of the country, and strive after actualities to promote the higher happiness of mankind.

In recent times, no question seems to have aroused as much controversy as the question of separate electorates for the protection of the right of minorities. The merits and demerits of separate or so-called communal electorates have been discussed so often that it is unnecessary to re-examine them in detail.

In regard to the implications of the term ‘communal’, I may remark in passing that the Muslims of India are not a community, but in a restricted, special sense a nation composed of many communities, and population totally outnumbering the total even of the pre-war German Empire.[1]

Hafizur Rahman (1929) *Report of the All-India Muslim Conference* [1]

دوسرا حصہ

3

مسلم کانفرنس میں پنڈال کے قریب ایک شامیانہ نصب تھا۔ یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو صبح دس بجے یہاں رہنماؤں کی غیر رسمی ملاقات ہوئی۔ جو گزشتہ روز نہ پہنچ سکے اب موجود تھے۔ انہی میں علی برادران تھے۔ میاں شفیع نے اُنہیں اُس قرارداد سے آگاہ کیا جس پر گفتگو ہونے والی تھی۔ گزشتہ شام جام نگر ہاؤس میں بعض رہنماؤں کا اجلاس ہوا تھا۔ آغا خاں نے صدارت کی تھی۔ وہیں میاں شفیع نے یہ قرارداد پیش کی تھی۔ اب غیر رسمی ملاقات میں جوہرؔ نے اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔ مولانا مفتی کفایت اللہ نے بھی خیالات کا اظہار کیا۔ سرگرم بحث کے بعد بنیادی اصولوں پر اتفاق ہو گیا۔

گیارہ بجے پنڈال میں سبجکٹ کمیٹی کا اجلاس شروع ہوا۔ چار سو مندوبین میں سے قریباً سبھی نے شرکت کی۔ پبلک اور پریس کو شامل ہونے کی اجازت نہ تھی۔ میاں شفیع اور اُن کے ساتھیوں کا موقف تھا کہ جداگانہ حقِ نیابت ہر صورت میں برقرار رکھا جائے۔ علامہ اقبال کا موقف بھی یہی تھا۔ اجلاس میں بھی شریک ہوئے ہوں گے۔ مولانا داؤدی اور علی برادران وغیرہ سمجھتے تھے کہ اگر ہندو بعض شرائط تسلیم کر لیں تو مسلمانوں کو مخلوط انتخابات قبول کر لینے چاہئیں۔ ان شرائط کی نمایاں مثال تجاویزِ دہلی تھیں جو مارچ ۱۹۲۷ء میں پیش کی گئیں۔ دسمبر ۱۹۲۷ء میں کانگریس کی قراردادِ اتحاد کا حصہ بنیں۔ آغا خاں نے بعض دوسرے نمایندوں کو بھی دعوت دی کہ اپنے خیالات ظاہر کریں۔ اجلاس کے بعد پنڈال کے باہر کانفرنس کے مندوبین کا گروپ فوٹو کھینچا گیا۔

عام اجلاس پانچ بجے شروع ہوا۔ قرآنی آیات کی تلاوت کی گئی۔ فضل ابراہیم رحمت اللہ نے اعلان کیا کہ آغا خاں نے دہلی کے غریب مسلمانوں کی امداد کے لیے دو ہزار روپے پیش کیے ہیں۔ سید امیر علی اور حکیم اجمل خاں کی وفات پر تعزیتی قراردادیں پیش کی گئیں۔ فاتحہ خوانی ہوئی۔

میاں شفیع نے قرارداد پیش کرنے سے پہلے اس بات کی تردید کی کہ کانفرنس اُن کے ایما پر

بلوائی گئی ہے۔ وہ اُس وقت انگلستان میں تھے۔ واپسی پر پورٹ سعید پر ہندوستانی اخبارات کی فائل دیکھتے ہوئے کانفرنس کے بارے میں معلوم ہوا۔ اس کی اہمیت کے پیشِ نظر مسلم لیگ (لاہور گروپ) کا اجلاس ملتوی کر دیا۔ چاہتے ہیں کہ جناح بھی تعاون کریں۔ لیگ دوبارہ ایک ہو جائے۔ اس اجتماع میں تمام مسلمان متحد ہیں۔ سر شفیع اور اُن جیسے دوسرے مسلمان جو حکومت کے خلاف عدم تعاون کی تحریک میں شامل نہیں، وہ بھی اسلام کے خادم ہیں۔ اسلام کی حفاظت کے لیے اُن مسلمان بھائیوں کے ساتھ ہیں جو عدم تعاون کی تحریک سے وابستہ ہیں۔ شکر ہے کہ عدم تعاون کرنے والے مسلمانوں کا عدم تعاون بھی صرف حکومت کے خلاف ہے، مسلمان بھائیوں کے خلاف نہیں! کانفرنس کی آواز بڑی اہم ہے۔ مسلمانوں کی طرف سے سب کو بتایا جا رہا ہے کہ اگر اُن کے حقوق نظر انداز کیے گئے تو نتائج سنگین ہوں گے۔

اس کے بعد میاں شفیع نے قرارداد پیش کی۔ جوہرؔ اور مولانا داؤدی وغیرہ کی تجاویز کی روشنی میں مناسب ترمیم کی جا چکی تھی۔ بنیاد وہی نکات تھے جو ''تجاویزِ دہلی'' کہلاتے تھے اور کانگریس کی ''قراردادِ اتحاد'' میں شامل تھے۔ بعض نئے نکات کا اضافہ تھا، مثلاً اب مسلمانوں کا جداگانہ حقِ نیابت ملکی قانون کا حصہ بن چکا ہے۔ مسلمانوں کی رضامندی کے بغیر ختم نہیں کیا جا سکتا۔ کاروائی میں اس قرارداد کا عنوان ''پہلی قرارداد'' درج ہوا۔ کانفرنس کی خاص قرارداد یہی تھی۔

Resolution No.1

Whereas, in view of India's vast extent and its ethnological, linguistic, administrative and geographical or territorial divisions, the only form of government suitable to Indian conditions is a federal system with complete autonomy and residuary powers vested in the constituent states, the Central Government having control only of such matters of common interest as may be specifically entrusted to it by the constitution;

And whereas it is essential that no bill, resolution, motion or amendment regarding inter-communal matters be moved, discussed or passes by any legislature, central or provincial, if a three-fourth majority of the members of either the Hindu or the Muslim community affected thereby in that legislature oppose the introduction, discussion or passing of such bill, resolution, motion or amendment;

And whereas the right of Muslims to elect their respresentatives on the various Indian Legislatures through separate electorates is now the law of the land and Muslims cannot be deprived of that right without their consent;

And whereas in the conditions existing at present in India and so long as those conditions continue to exist, representation in various Legislatures and other statutory self-government bodies of Muslims through their own separate electorates is essential in order to bring into existence a really representative democratic government;

And whereas as long as Musalmans are not satisfied that their rights and interests are adequately safeguarded in the constitution, they will in no way consent to the establishment of joint electorates, whether with or without conditions;

And whereas, for the purposes aforesaid, it is essential that Musalmans should have their due share in the central and provincial cabinets;

And whereas it is essential that representation of Musalmans in the various legislatures and other statutory self-governing bodies should be based on a plan whereby the Muslim majority in those provinces where Musalmans constitute a majority of population shall in no way be affected and in the provinces in which Musalmans constitute a minority they shall have a representation in no case less than that enjoyed by them under the existing law;

And whereas representative Muslim gatherings in all provinces in India have unanimously resolved that with a view to provide adequate safeguards for the protection of Muslim interests in India as a whole, Musalmans should have the right of 33 per cent representation in the Central Legislature and this Conference entirely endorses that demand;

And whereas on ethnological, linguistic, geographical and administrative grounds the province of Sindh has no affinity whatever with the rest of the Bombay Presidency and its unconditional constitution inbto a separate province, possessing its own separate legislative and administrative machinery on the same lines as in other provinces of India, is essential in the interests of its people, the Hindu majority in Sind being given adequate and effective representation in excess of their proportion in the population, as may be given to Musalmans in the provinces in which they constitute a minority of population;

And whereas the introduction of constitutional reforms in the N.W.F. Province and Baluchistan along such lines as may be adopted in other provinces of India is essentialy not only in the interests of those provinces but also of the constitutional advance of India as a whole, the Hindu minorities in those provinces being given adequate and effective

representation in excess of their proportion in population, as is given in which it constitutes a minority of the population;

And whereas it is essential in the interests of Indian administration that provision should be made in the constitution giving Muslims their adequate share along with other Indians in all services of the State and on all statutory self-governing bodies, having due regard to the requirements of efficiency;

And whereas, having regard to the political conditions obtaining in India, it is essential that the Indian constitution should embody adequate safeguards for protection and promotion of Muslim education, languages, religion, personal law and Muslim charitable institutions, and for their due share in grand-in-aid;

And whereas it is essential that the constitution should provide that no change in the Indian constitution shall, after its inauguration, be made by the Central Legislature except with the concurrence of all the states constituting the Indian federation;

This Conference emphatically declares that no constitution, by whomsoever proposed or devised, will be acceptable to Indian Musalmans unless it conforms with the principles embodied in this resolution.

جوہر نے تائید کی اور کہا کہ آخر میں تقریر کریں گے۔ مولانا داؤدی نے کہا کہ قرارداد ایک فرد، تنظیم یا انجمن کی طرف سے نہیں بلکہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں کی طرف سے پیش کی گئی ہے۔[1]

اُن کے بعد علامہ نے تقریر کی۔ خلاصہ انگریزی اور اُردو میں دستیاب ہے۔ یہ معلوم نہیں کہ اصل تقریر کس زبان میں تھی:

حضرات! گذشتہ تین چار سال سے ہم کو جو مشاہدات و تجربات حاصل ہو رہے ہیں وہ نہایت مفید اور نتیجہ خیز ہیں۔ ہم کو جو باتیں اپنے برادران وطن کے متعلق قیاسی طور پر معلوم تھیں اب وہ یقینی طور پر ہمارے علم میں آ گئیں۔

میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ آج سے نصف صدی قبل سر سید احمد خان مرحوم نے مسلمانوں کے لیے جو راہ عمل قائم کی تھی، وہ صحیح تھی اور تلخ تجربوں

[1] Hafizur Rahman (1929) *Report of the All-India Muslim Conference*

کے بعد ہمیں اس راہ عمل کی اہمیت محسوس ہو رہی ہے۔

حضرات! آج میں نہایت صاف لفظوں میں کہنا چاہتا ہوں کہ اگر مسلمانوں کو ہندوستان میں بحیثیت مسلمان ہونے کے زندہ رہنا ہے تو ان کو جلد از جلد اپنی اصلاح و ترقی کے لیے سعی و کوشش کرنی چاہیے۔ اور جلد از جلد ایک علیحدہ پولیٹیکل پروگرام بنانا چاہیے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان میں بعض حصے ایسے ہیں، جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور بعض حصے ایسے ہیں، جن میں وہ قلیل تعداد میں ہیں۔ ان حالات میں ہم کو علیحدہ طور پر ایک پولیٹیکل پروگرام بنانے کی ضرورت ہے۔ آج ہر قوم اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے سعی و کوشش کر رہی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمان اپنے حقوق کے لیے سعی و کوشش نہ کریں۔ آج اس کانفرنس میں متفقہ طور پر جو ریزولیوشن پیش ہوا ہے، وہ نہایت صحیح ہے اور اس کی صحت کے لیے میرے پاس ایک مذہبی دلیل ہے اور وہ یہ کہ ہمارے آقائے نامدار حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ میری امت کا اجتماع کبھی گمراہی پر نہ ہو گا۔

''اللہ اکبر'' کے نعرے بلند ہوئے۔ دیر تک تالیاں بجتی رہیں۔ پھر نمازِ مغرب کا وقفہ ہوا۔ ساڑھے چھ بجے اجلاس پھر شروع ہوا۔ آغا خاں نے کہا کہ پردے کے پیچھے سے خواتین نے رقعہ بھیجا ہے۔ بیگم رضا اللہ نے لکھا تھا۔ منشی ذکاءاللہ مرحوم کی بہو تھیں:

عالی جناب صدر

ہم خواتین سختی سے نہرو رپورٹ کی مخالفت کرتی ہیں۔ نیز مخلوط انتخاب کو بھی مسلمان قوم کی تباہی کا باعث خیال کرتی ہیں۔ کسی بڑی سے بڑی اُمید کے لیے بھی مخلوط انتخاب کے ہم حامی نہیں ہیں۔ سات کروڑ مسلمانانِ ہندوستان کی وقعت کو قائم کر کے ہر ایک قانونِ اساسی میں اپنا حق لینا چاہتی ہیں۔ جداگانہ انتخاب کے ہم دل سے حامی ہیں۔

بیگم رضا اللہ

سی پی سے شرف الدین نے حمایت کی۔ خان بہادر حافظ ہدایت حسین نے حمایت کی۔ مولوی یعقوب

نے کہا کہ اگر نہرو رپورٹ میں قرارداد کے مطابق ترمیم کر دی جائے تو مسلمان قبول کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر شفاعت احمد خاں نے کہا کہ مسلمان رعایت طلب نہیں کر رہے۔ اپنے جائز حقوق مانگ رہے ہیں جو دنیا کے دوسرے حصوں میں اقلیتوں کو دیئے جاتے ہیں۔ پشاور سے بیرسٹر عبدالعزیز نے اور بمبئی سے داؤد صالح بھائی طیب جی نے حمایت کی۔ کراچی سے عبداللہ ہارون نے کہا کہ گزشتہ آٹھ برس وہ ہندوؤں کے ساتھ تعاون کرتے رہے۔ پچھلے چار برسوں سے ہندوؤں کی ذہنیت میں نمایاں تبدیلی آ رہی ہے۔ اب کوئی خوددار مسلمان ہندوؤں کے ساتھ تعاون نہیں کر سکتا۔ ہندو رہنماؤں میں سے جو سمجھ بوجھ رکھتے ہیں انہیں اس طرف توجہ دینی چاہیے۔ مولانا عبدالماجد بدایونی نے کہا کہ جو مسلمان مادی مفاد کے پیشِ نظر یا ہندوؤں سے سستی تعریف وصول کرنے کے لیے نہرو رپورٹ کی حمایت کر رہے ہیں، اسلامی نقطۂ نگاہ سے گناہ کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ جمعیت العلماءٔ کے صدر مولوی مفتی کفایت اللہ نے کہا کہ آج کے بعد کسی کو کہنے کا حق نہیں کہ مسلمانوں نے نہرو رپورٹ قبول کی ہے۔ لکھنؤ کے شیعہ عالم نواب مہدی حسن نے شیعہ فرقے کی طرف سے قرارداد کی حمایت کی اور مسلمانوں کے باہمی اتحاد پر زور دیا۔

کانپور کے مولانا آزاد سوبھانی کمیونسٹ تھے۔ "تحریکِ روحانیت" کی سربراہی کرتے تھے۔ انہوں نے کہا کہ وہ نہرو رپورٹ کے شدید مخالف ہیں۔ بنیادی وجہ یہ ہے کہ رپورٹ میں درجۂ استعمرات یعنی ڈومینین اسٹیٹس پر رضامندی ظاہر کی گئی۔ یہ غلامی ہے۔

امرتسر کے شیخ محمد صادق، جناح کی لیگ کے اہم رکن تھے۔ قرارداد پر کچھ تنقید کی۔ ان کے خیال میں یہ ہندوؤں کے ساتھ مزید مفاہمت کی گنجایش نہیں چھوڑتی۔ لچک پیدا کرنی چاہیے۔

آخر میں جوہر اُٹھے۔ کہا کہ اصل بات یہ نہیں ہے کہ نہرو رپورٹ اچھی ہے یا بری۔ اصل سوال یہ ہے کہ مسلمانوں کے سیاسی مرض کی دوا کیا ہے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زمانے میں کہاوت مشہور تھی، "خلق خدا کی۔ ملک بادشاہ کا۔ حکم کمپنی بہادر کا۔" نہرو رپورٹ کا موقف ہے، "خلق خدا کی۔ ملک وائسرائے کا۔ حکم ہندو مہاسبھا بہادر کا۔" ہندو مسلمانوں کو وہ مکھی بنانا چاہتے ہیں جو کھانے پر بیٹھ کر اُسے ناپاک کر دیتی ہے لیکن پر بھیگنے کی وجہ سے خود بھی مر جاتی ہے۔ یہ مسلمانوں کو قبول

نہیں۔ وہ شہد کی مکھی بننا چاہتے ہیں۔ ہندوؤں کو شہد فراہم کرے مگر ڈنگ بھی رکھتی ہو۔

جوہرؔ نے کہا کہ اسلام کا پیغام ہے کہ تمام انسان اصل میں ایک قوم تھے۔ اسلام پوری دنیا کو متحد کرنے اور رُوئے زمین سے جنگ کو ختم کرنے کے لیے آیا ہے۔ سخت ناانصافی کی بات ہے کہ اس مذہب کے پیروکاروں کو "ملّیت" (communalism) کا طعنہ اُن لوگوں کی طرف سے ملے جن میں سے ایک بقیہ دو کے ساتھ بیٹھ کر کھا نہیں سکتا۔ جو ایک برتن سے پانی نہیں پی سکتے۔ ہندوؤں کو ضرورت ہے کہ اپنی ذہنیت درست کریں۔ بہر حال اُن کے ساتھ مفاہمت کا دروازہ کھلا ہے۔ قرارداد میں یہ نہیں کہا گیا کہ مسلمان کبھی جداگانہ حقِ نیابت سے دستبردار نہ ہوں گے۔ مخلوط انتخاب بھی قبول کیا جا سکتا ہے۔ شرط ہے کہ پہلے مسلمانوں کو یقین دلایا جائے کہ ہر دستور میں اُن کے حقوق اور مفادات محفوظ رہیں گے۔

آغا خاں نے قرارداد پر ووٹ طلب کیے۔ متفقہ رائے سامنے آئی۔ حاضرین کی بڑی تعداد فرطِ جذبات میں نشستوں سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ منظوری کے نعرے لگائے۔ پانچ ہزار کے مجمع میں ایک بھی نہ تھا جو کہتا کہ قرارداد کا مخالف ہے۔[1]

4

"مسلمانوں کی یہ کانفرنس ہندوستان کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت کی حامل ہے،" عبداللہ چغتائی نے بعد میں لکھا، "اُس کے بعد آج تک ایسا عظیم الشان اجتماع نہیں دیکھا گیا حتیٰ کہ پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے بعد بھی اِس پیمانے کی نمائندہ کانفرنس پھر دیکھنے میں نہیں آئی۔"[2] ایک طرح کی پارلیمنٹ ثابت ہوئی۔ مسلمانوں کے نمائندے جو باقاعدہ الیکشن کے ذریعے منتخب ہوئے، ایک جگہ جمع تھے۔ علمائے کرام بھی موجود تھے۔ سب نے مل کر فیصلہ کیا۔

قرارداد کے بارے میں علامہ ہمیشہ حساس رہے۔ کسی موقع پر گاندھی نے اُن کے سامنے کہا کہ

---

[1] Hafizur Rahman (1929) *Report of the All-India Muslim Conference*

[2] عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۳۱۳

یہ مسلمانوں کا متفقہ مطالبہ نہیں۔ علامہ کا جواب کافی سخت تھا: "ہندوؤں کا ایک طبقہ جداگانہ انتخاب مانگتا ہے، دوسرا مخلوط انتخاب کا حامی ہے اور تیسرا 'سوشل ڈیموکریسی' چاہتا ہے۔ جب ہندوؤں میں اس قدر اختلاف ہے تو مسلمانوں کے معمولی اختلاف پر ایک بہانہ بنالینا اگر منافقت نہیں تو کیا ہے؟"[1]

حفظ الرحمٰن بی اے، علیگڑھ میل کے مالک و مدیر تھے۔ صحافی کے طور پر کانفرنس میں شامل ہوئے۔ سیکرٹری کی فرمایش پر رپورٹ انگریزی اور اُردو میں تیار کر کے شائع کی۔ آغا خاں نے پیش لفظ میں لکھا کہ ساری دنیا میں اسلام کے مستقبل کا انحصار بڑی حد تک برصغیر کے مسلمانوں پر ہے:

> The ·future of Islam throughout the world will depend a great deal on whether the Moslems of India remain a strong, healthy, progressive body. But in the world of to-day, health and strength can only come to those nations that take a constant and direct interest in their future. Great nations think not of their past but of their future. Dying ones think of the past and leave the future to others. If the Moslems are to survive in India as guardians of a special culture and a virile civilization, they must themselves be wide awake to their future interests. For this work, we have now in the electorates an organised body that can and must get to know its own mind and will.[2]

5

۲/ جنوری تھی۔ صبح ساڑھے آٹھ بجے دہلی کے ریلوے اسٹیشن پر علامہ اقبال فرنٹئیر میل میں سوار ہوئے۔ محمد حسین اور چغتائی ساتھ تھے۔ کچھ لوگ اسٹیشن پر چھوڑنے آئے۔ مہر کے علاوہ کوئی جان محمد بھی تھے جنہوں نے بڑی مدد کی۔ ریل چلی تو چغتائی کو خیال آیا کہ ریلوے اسٹیشن پر کلرک نے اُن کا قلم لیا تھا۔ اُن کی ٹکٹوں پر کوئی اندراج کرنا تھا۔ اُسی کے پاس رہ گیا۔ چغتائی کا بیان ہے کہ علامہ نے سنا تو کہا، "ماسٹر گویا تمہاری تو بیوی دہلی میں رہ گئی ہے۔" پھر زوردار قہقہہ لگایا۔[3]

---

[1] علامہ کی تقریر ۲/ مئی ۱۹۳۱ء؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۱۱۷-۱۱۶

[2] Hafizur Rahman (1929) *Report of the All-India Muslim Conference*

[3] مکتوب عبداللہ چغتائی ۵/ جنوری ۱۹۲۹ء مطبوعہ انقلاب ۱۱/ جنوری ۱۹۲۹؛ افضل (۱۹۸۶)، ص ۲۱۵۔ چغتائی، اقبال کی

بمبئی

۳؍ جنوری کو دوپہر بارہ بجے کے قریب ریل گاڑی بمبئی میں کولابا اسٹیشن پہنچی۔ سیٹھ اے ایس اسماعیل کے صاحبزادے سیٹھ ہاشم اسماعیل استقبال کے لیے موجود تھے۔ "ڈاکٹر صاحب قبلہ کو دعوت دے رکھی تھی کہ جتنا وقت آپ بمبئی ٹھہریں میرے مہمان رہیں،" چغتائی کا بیان ہے۔ دوپہر کا کھانا انہی کے مکان پر ہوا۔ اُن کی اہلیہ مشہور سوداگر حاجی یوسف سبحانی کی صاحبزادی تھیں۔ سینئر کیمبرج کرنے کے بعد جرمنی میں دو سال علم طب کی تحصیل کی تھی۔ کھانے کے بعد زنانے میں سے گوئٹے کے فاؤسٹ کا جرمن نسخہ بھجوایا۔ علامہ کوئی شعر لکھ دیں۔ علامہ نے فارسی میں لکھا کہ کلام و فلسفہ اپنے دل کی تختی سے مٹاڈالے ہیں۔ تحقیق کے نشتر سے اپنے باطن کو کھولا ہے:

کلام و فلسفہ از لوح دل فرو شستم ضمیر خویش کشادم بہ نشتر تحقیق

اسے لکھتے ہوئے کہا، "یہ وہ نتیجہ ہے جس پر فوسٹ کو پہنچنا چاہیے تھا مگر وہ نہ پہنچا۔"[1]

شام پانچ بجے تاج ہوٹل سے متصل گرینز ہوٹل میں سیٹھ ہاشم اسماعیل کی طرف سے چائے کی دعوت تھی۔ افغانستان کے قونصل جنرل سردار غلام احمد خاں، سر چمن لال سیتلواڈ، مرزا محمد علی سولسٹر کے علاوہ بھی کچھ بڑے لوگ موجود تھے۔ جناح مدعو تھے مگر نہ آسکے۔

رات کے کھانے کی دعوت مسلم فیڈریشن بمبئی کی طرف سے آٹھ بجے شام تھی۔ لوکل سیلف گورنمنٹ کے وزیر مسٹر ہدایت حسین کے علاوہ بھی دس گیارہ بڑے لوگ موجود تھے۔

قریباً دس بجے رات علامہ، چغتائی اور محمد حسین مدراس میل میں سوار ہوئے۔ ۳؍ جنوری تھی۔ وہ رات، اگلا دن اور اگلی رات ریل ہی میں گزری۔ "عجیب سفر ہے اور جس حصہ ملک میں یہ سفر کیا وہ بھی کم عجیب نہیں،" چغتائی نے محسوس کیا۔[2]

صحبت میں، ص ۳۱۹

[1] مکتوب عبداللہ چغتائی ۵؍ جنوری ۱۹۲۹ء محولہ بالا

[2] علامہ کے قیامِ بمبئی کی تمام تفصیلات کا ماخذ ہے مکتوب عبداللہ چغتائی محولہ بالا

بیسن برج

حجاب اسماعیل مدراس کے سینٹ تھامس کانونٹ میں پڑھتی تھیں۔ نظام حیدرآباد کے فرسٹ سیکرٹری سید محمد اسماعیل کی لڑکی تھیں۔ "ہندوستاں ہمارا" اور "سارا جہاں ہمارا" کی آوازیں بچپن ہی سے ذہن میں خوابناک فضا بناتی رہی تھیں۔ علامہ کو خط بھی لکھا تھا۔ حال ہی میں ان کی والدہ عباسی بیگم فوت ہوئی تھیں۔ حجاب سوگ میں تھیں۔ لیکن علامہ سے ملاقات کا موقع پھر کہاں ملتا۔[1]

۵؍ جنوری کی صبح حجاب اپنے والد اور اُن کے چند دوستوں کے ساتھ تھیں۔ مدراس سے ذرا پہلے بیسن برج جنکشن (Basin Bridge Junction) پر پھولوں کے ہار وغیرہ لیے کھڑے تھے۔ حجاب نے انگریزی لباس پہن رکھا تھا۔ گاڑی آ کر رُکی۔ فرسٹ کلاس میں علامہ کو تلاش کیا گیا۔ سیکنڈ کلاس میں پائے گئے۔ حجاب نے آہستہ سے والد سے کہا کہ کوئی انجمن اُنہیں سیکنڈ کلاس کا ٹکٹ دیتی یا وہ علامہ اقبال ہوتیں تو اِنکار کر دیتیں۔ والد نے جواب دیا کہ بڑے لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں کو خاطر میں نہیں لاتے۔ کمپارٹمنٹ میں علامہ کھڑے ہو کر سب لوگوں سے ہاتھ ملا رہے تھے۔ "پنجابی شلوار پہن رکھی تھی، اور کرتے پر واسکوٹ اور پاؤں میں دیسی جوتی (گرگابی یا پمپ شو) جیسی کہانیوں کی کتابوں میں میں نے جادوگروں کو پہنے ہوئے دیکھا تھا،" حجاب نے بعد میں لکھا، "میرے تصورات کی جنت پارہ پارہ ہو گئی... انگلیوں میں موٹے مصری سگار کی بجائے سامنے حقہ اور اُس پر چلم رکھی تھی۔" حجاب کے والد نے اُن کا تعارف کروایا۔ علامہ نے شفقت سے اپنے ساتھ بٹھایا۔ سگریٹ کا ڈبہ کھول کر سگریٹ پیش کیا۔ والد ہنسنے لگے۔ اُن کے ایک دوست نے کہا، "سگریٹ؟ ابھی تو یہ سینٹ تھامس کانونٹ میں پڑھتی ہیں۔" حجاب کا بیان ہے کہ علامہ نے مسکرا کر پوچھا، "بتائیے کانونٹ میں عیسائیت کا آپ نے اب تک کتنا اثر قبول کیا ہے؟" اُنہوں نے کہا، "بہت تھوڑا سا۔" علامہ ہنس دیئے۔ ریل چل پڑی۔ حجاب نے سوالات شروع کیے۔ وہ "مسلم ہیں ہم..." جیسے دلنشیں ترانے کیسے لکھ لیتے ہیں؟ علامہ نے کہا، "اب میں مان گیا کہ عیسائیوں کے کانونٹ کا آپ نے ذرا بھی اثر قبول نہیں کیا۔ جبھی تو آپ کا

---

[1] والدہ کے انتقال اور سوگ کا ذکر حجاب کی قلمی عرضداشت میں ہے جو علامہ اقبال میوزیم میں محفوظ ہے۔

'مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا' پر ایمان ہے۔ آپ کے عقائد، آپ کے طرزِ اَدا اور آپ کی باتوں کو سن کر میں ایک تجویز یہ پیش کرتا ہوں کہ آپ کا نام شیریں ہونا چاہیے تھا۔" حجاب کے والد کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور کہا، "کیوں سید صاحب! آپ کو اِس پر کوئی اعتراض ہے؟"[1]

مدراس

"صبح سات بج کر پینتیس منٹ پر جب ہماری گاڑی مدراس سٹیشن پر پہنچی تو استقبال کرنے والے حضرات کا ایک ہجوم سٹیشن پر موجود تھا،" چغتائی کا بیان ہے، "بیشتر مسلمان تھے اور ترکی ٹوپیاں پہنے ہوئے تھے۔ مدراس کے اکثر علما و فضلا اور زعما و رؤسا موجود تھے۔ حضرت علامہ کو گاڑی سے اُترنا مشکل ہو گیا۔ ہر ایک کی یہ خواہش تھی کہ پہلے میں دیکھوں اور مصافحہ کروں۔" حمید حسن، سیٹھ جمال محمد کے لڑکے کے ساتھ ڈبے کے اندر آئے۔ علامہ کو پھولوں کے ہار پہنائے۔ بلند آوز میں لوگوں کو یقین دلایا، "سب کو ڈاکٹر صاحب سے ملنے کا موقع ملے گا۔" کسی طرح علامہ کو اُتارنے میں کامیاب ہوئے۔

پلیٹ فارم پر مدراس کے معززین تھے۔ اُن میں مولوی سید ابو ظفر داؤدی، افضل العلما عبدالحق ایم اے، جمال محمد، خان بہادر عبدالعزیز بادشاہ، عبدالعزیز حسن، عبدالحکیم، حاجی جلال عبدالکریم، حکیم مخدوم اشرف، جمال محی الدین، سید یوسف اور ڈاکٹر جمال الدین شامل تھے۔ خان بہادر محمد حسین بھی تھے۔ اُنہوں نے علامہ سے لوگوں کا تعارف کروایا۔[2] علامہ کو پھولوں سے بری طرح لاد دیا گیا تھا۔ حجاب کہتی ہیں کہ اُنہوں نے بہت سے ہار حجاب کے گلے میں ڈال دیے۔ حجاب نے پوچھا کہ دوبارہ کب ملیں۔ علامہ نے مسکرا کر کہا کہ جس وقت آپ کا دل چاہے۔ حجاب کے والد قریب

---

[1] حجاب اسماعیل ۱۹۳۴ء میں سید امتیاز علی تاج کے ساتھ شادی کے بعد حجاب امتیاز علی تاج کے نام سے مشہور ہوئیں۔ خالد نظیر صوفی، اقبال درونِ خانہ، ص ۱۹۳ پر اُن کی تحریری یادداشت شامل ہے۔ علامہ کے انتظار میں لاہور ہی میں خط لکھنے کا تذکرہ عبداللہ چغتائی نے اپنے مکتوب ۵/ جنوری ۱۹۲۹ء محولہ بالا میں کیا ہے۔

[2] مکتوب عبداللہ چغتائی ۵/ جنوری ۱۹۲۹ء محولہ بالا

آئے اور کہا کہ سوا ایک بجے بساٹو ہوٹل میں استقبالیہ لنچ ہے۔ وہ حجاب کے ساتھ موجود ہوں گے۔ حجاب کیا بیان ہے، ''اب مجھے شاعرِ مشرق کا لباس اور دیسی جوتیاں بری نہ لگتی تھیں کیونکہ اُن کی گفتگو بہت شائستہ اور دلچسپ تھی۔''[1]

علامہ سیٹھ جمال محمد کے ساتھ موٹر میں بساٹو ہوٹل پہنچے۔ سیٹھ جمال کی ملکیت تھا۔ چند منٹ بعد چغتائی اور محمد حسین بھی پہنچ گئے۔ چغتائی نے ایسی شان و شوکت والا ہوٹل لاہور میں نہ دیکھا تھا۔ یہاں علامہ اور اُن کے دونوں ہمراہیوں کے ٹھہرنے کا بندوبست تھا۔ ''کمرے میں بیٹھے ابھی پندرہ منٹ نہ ہوئے ہوں گے کہ مدراس پریس بیورو کے فوٹوگرافر نے پھر کیمرہ سامنے لا کھڑا کیا اور جب تک تصویریں نہ لے چکا خلاصی نہ کی،'' چغتائی کا بیان ہے۔ علامہ اور دونوں ساتھیوں نے سیٹھ جمال محمد، اُن کے بیٹے اور بھتیجے کے ساتھ چائے پی۔ سیٹھ جمال اپنی بعض قومی فیاضیوں کی وجہ سے مسلمانوں کے 'برلا' مشہور ہو رہے تھے۔ اعلیٰ درجے کے علم و فضل کے مالک تھے۔ چاہتے تھے کہ پرانی مذہبی تعلیم اور عہد حاضر کے علوم و فنون کی تعلیم کی آمیزش کی جائے۔ تعلیم یافتہ مولوی تیار کیے جائیں۔ چغتائی کے مطابق علامہ نے ان کے بارے میں (غالباً اُن کے جانے کے بعد) کہا، ''اللہ اللہ! یہ انسان ایک کروڑ سالانہ کی تجارت کرتا ہے، تہبند کرتا پہنتا ہے اور حقیقت، مادہ اور روح جیسے علمی مسائل پر انگریزی اور اُردو میں گفتگو کرتا ہے اور اس کو فکر دامن گیر ہے کہ مسلمانوں کی قدیم اور نئی تعلیم کا حقیقی اتصال ہو اور اسلام اپنی اصلی شان میں دنیا پر ظاہر ہو۔ مسلمانوں میں ایسے افراد پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ جب تک یہ 'ٹائپ' نہ پیدا ہوگا نصب العین تک رسائی محال ہے۔''[2] چغتائی نے ''ہم سفر'' کے قلمی نام سے مہر کے نام خط لکھا۔ انقلاب میں اشاعت کے لیے تھا۔[3]

لنچ کے لیے علامہ نے کھلا نیلگوں مائل خاکستری رنگ کا سُوٹ اور سیاہ ٹوپی پہنی۔ حجاب کہتی ہیں

[1] خالد نظیر صوفی، اقبال درونِ خانہ، ص ۱۹۲-۱۹۰، حجاب امتیاز علی کی یادداشت

[2] مکتوب عبداللہ چغتائی ۵/ جنوری ۱۹۲۹ء محولہ بالا

[3] مکتوب عبداللہ چغتائی ۵/ جنوری ۱۹۲۹ء محولہ بالا

کہ سوا ایک بجے والد کے ساتھ بساٹو ہوٹل پہنچیں تو علامہ نے دُور سے ہاتھ ہلا کر سلام کیا۔ ڈائننگ ہال میں لمبی لمبی میزیں تھیں۔ شراب کے گلاسوں کے پاس مہمانوں کی نشستوں کے لیے نام لکھے تھے۔ علامہ نے اپنے سیدھے ہاتھ کی کرسی کھینچتے ہوئے کہا، "کیا مضائقہ ہے اگر آپ یہاں تشریف رکھیں؟" سیٹھ حمید حسن نے قریب آ کر کہا، "چلیے چلیے علامہ صاحب آپ کو بلا رہے ہیں۔" حجاب کا بیان ہے:

> علامہ صاحب میزبانوں اور دوسرے مہمانوں سے مصروفِ گفتگو تھے۔ اِدھر موقع دیکھ کر میں بھی ان سے باتیں کر رہی تھی۔ جب میرے اور علامہ صاحب کے آگے رکھی ہوئی گلاسوں میں مختلف قسم کی شراب بیروں نے ڈالنی شروع کی تو ایک بیرے سے میں نے آہستہ سے کہا: "میرے لیے لیمونیڈ لے آؤ۔" تھوڑی دیر علامہ صاحب چپ رہے، پھر بولے: "آپ صرف لیمونیڈ پئیں گی؟" میں نے کہا، "ہاں میں شراب نہیں پیتی۔ آپ پی لیتے ہیں؟" ہنس کر کہنے لگے، "بالکل نہیں۔ آپ کو شاید معلوم نہیں، میں نے اپنے قیامِ انگلستان کے دوران بھی کبھی شراب کا ایک قطرہ نہیں چکھا۔" یہ فقرہ سن کر آس پاس جو لوگ بیٹھے ہوئے تھے، اُنہوں نے خوشی سے تالیاں بجائیں۔[1]

شام کو سیٹھ جمال نے جمالیہ ہوسٹل کے احاطے میں علامہ کو "ایٹ ہوم" دی۔ ہاسٹل میں رہنے والے شریک ہوئے۔ علامہ نے 'یتیم اور اسلام' کے موضوع پر تقریر کی۔ تفصیل دستیاب نہیں ہے۔[2] ممکن ہے یہی "جلسۂ انجمن حمایت اسلام مدراس" ہو جس کے ہاتھ سے لکھے ہوئے پروگرام کا خاکہ دستیاب ہے۔ اُردو میں لکھے ہوئے ایک صفحے سے ظاہر ہوتا ہے کہ سیٹھ جمال کے علاوہ خان بہادر محمد عبدالعزیز، سید یوسف، عبدالحمید، مولوی سید ابو ظفر ندوی، مولوی الحاج محمد فضل اللہ اور عبدالحمید حسن شامل تھے۔ کاغذ کے دوسری طرف انگریزی میں پروگرام درج ہے۔ ایم اے جبار کی تقریر اور علامہ کی طرف سے اُس کے جواب کا تذکرہ ہے۔ دونوں خلاصوں میں مولوی عبدالحق صاحب ایم

---

[1] خالد نظیر صوفی، اقبال درونِ خانہ، ص ۱۹۲–۱۹۰، حجاب امتیاز علی کی یادداشت

[2] مکتوب عبداللہ چغتائی ۵/ جنوری ۱۹۲۹ء محولہ بالا

اے افضل العلماؑ کی طرف سے کسی قرارداد کا ذکر ہے۔[1] چغتائی کے مطابق مدراس میں انجمن ترقی اُردو مدراس اور ہندی پرچار سبھا کی طرف سے علامہ کی خدمت میں سپاسنامے پیش کیے گئے۔[2]

شام سوا چھ بجے آرمینین اسٹریٹ پر گوکھلے ہال میں پہلا لیکچر تھا۔ ہال بھرا ہوا تھا۔ ہندو بھی بڑی تعداد میں موجود تھے۔[3] ڈی سی ورمن مدراسی نوٹ لے رہے تھے۔[4] دو روز قبل انجمن کی طرف سے جاری ہونے والے دعوت نامے میں غیر مسلموں کو بھی متوجہ کیا گیا تھا:

> These lectures are meant mainly for University students, undergraduates, graduates and post-graduates and those, interested in the philosophical aspect of religion, are sure to derive immense profit and become acquainted with the history of religious thought in general and Muslim religious thought in particular. It is hoped that the Non-Muslim gentlemen will not miss these lectures.[5]

مدراس کے چیف منسٹر ڈاکٹر پی سبرائن (Dr. P. Subbarayan) صدارت کر رہے تھے۔[6] تلاوت سے جلسے کا آغاز ہوا۔ سوسائٹی کے سکرٹری عبدالحمید حسن نے مختصر تقریر میں 'مدراس لیکچرز آن اسلام' (Madras Lectures on Islam) کے مقاصد بیان کیے۔ ہندوستانی اقوام کے لیے ایک دوسرے کی تہذیب و مذہب سے واقف ہونے کی ضرورت بیان کرنے کے بعد کہا، "اقبال کا نام بطور شاعرِ مشرق تو آپ کو معلوم ہی تھا۔ ان کی شاعری نے ہندوستان اور بالخصوص اسلامی ہندوستان میں صحیح زندگی کی جو لہر دوڑائی ہے، اس سے آپ لوگ بھی ملک کے اس دور دراز گوشے میں متاثر ہوئے بغیر نہیں رہے۔ مگر آج وہ شاعر کی حیثیت سے آپ کے شہر میں نہیں آئے بلکہ اسلامی مذہب و فلسفہ،

---

[1] شذرہ علامہ اقبال میوزیم لاہور میں اور عکس اقبال اکادمی پاکستان میں موجود ہے۔

[2] مکتوب عبداللہ چغتائی ۵/ جنوری ۱۹۲۹ء محولہ بالا

[3] مکتوب عبداللہ چغتائی ۵/ جنوری ۱۹۲۹ء محولہ بالا

[4] کلب علی خاں فائق (۱۹۸۶) 'علم اور احساسِ مذہب'، ص ۲۴۶

[5] دعوت نامہ علامہ اقبال میوزیم لاہور میں اور عکس اقبال اکادمی پاکستان کے پاس موجود ہے۔

[6] خالد نظیر صوفی، اقبال درونِ خانہ، ص ۱۹۳۔ مکتوب عبداللہ چغتائی ۵/ جنوری ۱۹۲۹ء محولہ بالا

اسلامی دینیات و فقہیات اور اسلامی تہذیب و تمدن کے پیغام بر بن کر آئے ہیں۔" ڈاکٹر اقبال اور ایسوسی ایشن کا شکریہ ادا کیا۔ گورنر مدراس لارڈ گوشن کے پرائیویٹ سکرٹری کی طرف سے خط پڑھ کر سنایا۔ گورنر کو افسوس تھا کہ پہلی مصروفیتوں کی وجہ سے جلسے میں شریک نہیں ہو سکتے۔ سر محمد اقبال کے نام سے واقف تھے اور لیکچر سن کر خوش ہوتے۔ ڈاکٹر سبرائن نے کہا، "اس سرزمین میں ہندو اور مسلمان دونوں آباد ہیں۔ اگر وہ خود اختیاری حکومت حاصل کرنا اور اسے قائم رکھنا چاہتے ہیں تو ان میں اتحاد ضروری ہے۔ میں بارہا کہہ چکا ہوں کہ یہ ہندوؤں کا فرض ہے کہ مسلم اقلیت کو اطمینان دلائیں کہ وہ اس سرزمین میں بھائیوں کی طرح زندگیاں بسر کریں گے۔" حاضرین نے چیئرز کے نعرے لگائے۔ پھر ڈاکٹر سبرائن نے کہا:

> میرے لیے باعثِ عزت ہے کہ میں اگرچہ ہندو ہوں لیکن اسلامی فلسفہ پر لیکچر کی صدارت کے لیے منتخب کیا گیا ہوں۔ میں خوش ہوں کہ اس صوبے کے مسلمانوں کا زاویۂ نگاہ صحیح ہے۔ اسلام نے مشرق کو بلکہ ساری دنیا کو اخوت کا سبق دیا ہے۔ ہم ہندو ذات پات اور قومی امتیازات میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ہمیں ابھی اسلامی تہذیب اور اسلامی کلچر سے اخوت کا سبق سیکھنا ہے۔ میں یہاں غیر برہمن کی حیثیت میں تقریر نہیں کر رہا اور نہ اس نقطہ خیال سے ذات پات کے خلاف کہہ رہا ہوں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کو یکجا کرنے اور تمام ہندوستانی اقوام میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے ہمیں اسلامی اخوت کو دلیل راہ بنانا ہے۔

"اس کے بعد علامہ اقبال نے خطبہ ارشاد فرمایا،" چغتائی کا بیان ہے۔[1] جدید نفسیات ایک طرح سے ولیم جیمز سے شروع ہوتی تھی۔ نئے آنے والوں میں سے فرائیڈ اور یونگ کے ساتھ علامہ بعض بنیادی اختلافات رکھتے تھے۔ گسٹالٹ کو پسند کرتے تھے۔ خطبے میں کسی خاص ماہرِ نفسیات کی پیروی نہ کی۔

---

[1] مکتوب عبداللہ چغتائی ۵/جنوری ۱۹۲۹ء محولہ بالا؛ چغتائی نے لیکچر کا عنوان 'دینیات اسلامیہ اور افکار حاضرہ' (Muslim Theology and Modern Thought) بتایا ہے۔

نفسیات کے بعض مسلمہ اصول لے کر نئی بحث قائم کرنے کی کوشش کی۔ جب حواسِ خمسہ کے ذریعے ادراک حاصل کر کے عقل و فہم سے اُس کی وضاحت کی جائے تو اُسے علم کہتے ہیں۔ وحی، الہام اور کشف کی تمام قسمیں اُس زمرے میں آتی ہیں جسے ولیم جیمز نے "مذہبی تجربہ" (religious experience) کا نام دیا۔ یہ احساس کی کیفیت ہوتی ہے جس میں تعقل کا عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔ علامہ نے فرائیڈ کے تصوّرِ لاشعور کو بڑی حد تک مسترد کر دیا۔ یہ مفروضہ بھی رد کیا کہ مذہبی تجربے کو جنسی جبلت کے کھاتے میں ڈالا جا سکتا ہے۔ مذہبی تجربے کی پانچ خصوصیات گنوائیں: ۱۔ حضوریت (immediacy)؛ ۲۔ ناقابل تجزیہ کلیت (unanalyzable wholeness)؛ ۳۔ معروضیت (objectivity)؛ ۴۔ جوں کا توں دوسرے تک پہنچانے کا امکان نہ ہونا (incommunicability)؛ ۵۔ عام انسانی تجربے سے کسی نہ کسی طرح کا تعلق ہونا (in some way related to common experience)۔ نبی اور غیر نبی کے تجربات کے درمیان فرق اُن کے نتائج کے اعتبار سے بھی ہوتا ہے۔[1] اس طرح ایک بات ظاہر ہے۔ یہ تجربہ علم کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ یہ علیحدہ بحث ہے کہ اُس علم کو کیسے جانچا جائے۔

Knowledge and Religious Experience

[Excerpt]

During the last five hundred years religious thought in Islam has been practically stationary. There was a time when European thought received inspiration from the world of Islam. The most remarkable phenomenon of modern history, however, is the enormous rapidity with which the world of Islam is spiritually moving towards the West. There is nothing wrong in this movement, for European culture, on its intellectual side, is only a further development of some of the most important phases of the culture of Islam. Our only fear is that the dazzling exterior of European culture may arrest our movement and we may fail to reach the true

[1] عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، کی یہ روایت درست معلوم ہوتی ہے کہ دسمبر ۱۹۲۴ء میں پہلی دفعہ اجتہاد پر خطبہ دیتے ہوئے علامہ نے جماعتِ احمدیہ کے امیر سے کہا، "نبی عام طور پر نئی شریعت لاتا ہے اور ما قبل کی شریعت میں ردو بدل کرتا ہے مگر آپ کی طرف سے ابھی تک کوئی ثبوت نہیں دیا گیا۔"

inwardness of that culture. During all the centuries of our intellectual stupor Europe has been seriously thinking on the great problems in which the philosophers and scientists of Islam were so keenly interested. Since the Middle Ages, when the schools of Muslim theology were completed, infinite advance has taken place in the domain of human thought and experience. The extension of man's power over Nature has given him a new faith and a fresh sense of superiority over the forces that constitute his environment. New points of view have been suggested, old problems have been re-stated in the light of fresh experience, and new problems have arisen. It seems as if the intellect of man is outgrowing its own most fundamental categories- time, space, and causality. With the advance of scientific thought even our concept of intelligibility is undergoing a change. The theory of Einstein has brought a new vision of the universe and suggests new ways of looking at the problems common to both religion and philosophy. No wonder then that the younger generation of Islam in Asia and Africa demand a fresh orientation of their faith. With the reawakening of Islam, therefore, it is necessary to examine, in an independent spirit, what Europe has thought and how far the conclusions reached by her can help us in the revision and, if necessary, reconstruction, of theological thought in Islam. Besides this it is not possible to ignore the generally anti-religious and especially anti-Islamic propaganda in Central Asia which has already crossed the Indian frontier. Some of the apostles of this movement are born Muslims, and one of them, Tawfik Fikrat, the Turkish poet, who died only a short time ago, has gone to the extent of using our great poet-thinker, Mirza Abdul Qadir Bedil of Akbarabad, for the purposes of this movement. Surely, it is high time to look to the essentials of Islam. In these lectures I propose to undertake a philosophical discussion of some of the basic of ideas of Islam, in the hope that this may, at least, be helpful towards a proper understanding of the meaning of Islam as a message to humanity. Also with a view to give a kind of ground-outline for further discussion, I propose, in this preliminary lecture, to consider the character of knowledge and religious experience.[1]

6

"جلسے کے اختتام پر اخباروں کے نمایندوں نے ڈاکٹر صاحب کے گرد جھرمٹ ڈال دیا،" چغتائی کا بیان ہے، "تقاضا کیا کہ لیکچر ہمیں دیں اور ہم یہیں بیٹھ کر دو گھنٹے میں اس کو نقل کر لیں گے۔ چونکہ لیکچر کی

[1] Iqbal (1934), *Reconstruction*

ایک ہی کاپی تھی اس لیے ڈاکٹر صاحب دے نہ سکے البتہ جو خلاصہ تیار کیا گیا تھا، اس کی کاپیاں پہلے سے موجود تھیں، وہ ہر ایک کو دے دی گئیں۔ پریس والے اس خلاصے سے ہرگز مطمئن نہ تھے مگر ایک ہندو عالم جو سٹیج پر تشریف رکھتے تھے اور جنہوں نے تمام لیکچر نہایت غور سے سنا تھا، اُٹھ کر فوراً ڈاکٹر صاحب کے پاس آئے اور کہا کہ صاحب ان کے تقاضوں کا کچھ خیال نہ کیجیے گا۔ ان رپورٹروں کے ہاتھ آپ کا لیکچر پڑ گیا تو عجیب و غریب صورت میں مختلف اخباروں میں اس کے بعض حصے چھپ جائیں گے اور پھر آپ پچھتائیں گے۔"[1]

رات آٹھ بجے میزبان انجمن کے پتے ۲-کوچۂ وانیار (2-Vaniar Street)، جارج ٹاؤن میں علامہ کے اعزاز میں دعوتِ طعام تھی۔ اُسی رات چغتائی نے خط کی دوسری قسط مہر کو بھیجی۔[2] اُس کے بعد فرصت نصیب نہ ہوئی۔ "سیٹھ حمید حسن صاحب نے جس طرح فراخ دلی سے ایڈریسوں اور دعوتوں کو مختلف افراد اور انجمنوں کی طرف سے قبول کر لیا تھا اسی طرح سختی سے ہمیں اوقات کی پابندی پر مجبور رکھا،" اُن کا بیان ہے، "پھر بھی اُنہیں یہ شکایت رہی کہ کئی افراد اور کئی انجمنیں مجھ سے خفا ہیں کہ میں نے اُن کی دعوتوں کو آپ کے لیے قبول نہ کیا۔"[3]

7

۶ر جنوری شام سوا چھ بجے گوکھلے ہال میں دوسرا لیکچر ہوا۔ چغتائی کے مطابق اس روز بھی مسلمانوں اور ہندوؤں کا عظیم الشان اجتماع تھا۔

پچھلے خطبے میں تجویز کیا تھا کہ "مذہبی تجربہ" بھی علم کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ اب یہ بحث کی کہ اس ذریعے سے حاصل کیے ہوئے علم کے درست ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ آئن اسٹائن اور برگساں کے افکار کا حوالہ دیا۔ آئن اسٹائن نے ریاضی کے ذریعے ثابت کیا تھا کہ ہمارے زمان و

---

[1] مکتوب عبداللہ چغتائی ۵ر جنوری ۱۹۲۹ء محولہ بالا

[2] مکتوب عبداللہ چغتائی ۵ر جنوری ۱۹۲۹ء محولہ بالا

[3] مکتوب چغتائی ۱۵ر جنوری ۱۹۲۹ء مطبوعہ انقلاب ۲۲ر جنوری ۱۹۲۹ء؛ افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۲۳۱-۲۲۳

مکان صرف حوادث ہیں۔ اصلی نہیں ہیں بلکہ ایک زیادہ اصلی حقیقت کے آثار ہیں۔ اِس بنیاد پر علامہ نے تجویز کیا کہ حواسِ خمسہ چونکہ انہی زمان و مکان کا پتہ دیتے ہیں، اس لیے اصل حقیقت کے بجائے اُس کے آثار کا پتہ دیتے ہیں۔ اصل حقیقت کچھ اور ہے۔

فرائیڈ کے لاشعور کے نظریے سے انحراف کرتے ہوئے نفس کی دو جہتیں متعین کیں۔ داخلی جہت کو "قدر آشنا نفس" (appreciative self) کہا۔ یہ اُس اصلی حقیقت سے قریب تر ہوتی ہے جس کے صرف آثار زمان و مکان میں ظاہر ہوتے ہیں۔ خارجی دنیا سے نبرد آزما ہونے کے لیے نفس کی بیرونی جہت ہے جسے فعال نفس (efficient self) کہا جاسکتا ہے۔ روزمرہ زندگی اسی سے عبارت ہے۔ صرف گہرے استغراق اور وجدان میں ہم اپنے نفس کی قدر آشنا جہت سے روشناس ہوتے ہیں۔

The Philosophical Test of the Revelations of Religious Experience

[Excerpt]

A keener insight into the nature of conscious experience, however, reveals that the self in its inner life moves from the centre outwards. It has, so to speak, two sides which may be described as appreciative and efficient. On its efficient side it enters into relation with what we call the world of space. The efficient self is the subject of associationist psychology - the practical self of daily life in its dealing with the external order of things which determine our passing states of consciousness and stamp on these states their own spatial feature of mutual isolation. The self here lives outside itself as it were, and, while retaining its unity as a totality, discloses itself as nothing more than a series of specific and consequently numberable states. The time in which the efficient self lives is, therefore, the time of which we predicate long and short. It is hardly distinguishable from space. We can conceive it only as a straight line composed of spatial points which are external to one another like so many stages in a journey. But time thus regarded is not true time, according to Bergson. Existence in spacialized time is spurious existence. A deeper analysis of conscious experience reveals to us what I have called the appreciative side of the self. With our absorption in the external order of things, necessitated by our present situation, it is extremely difficult to catch a glimpse of the appreciative self. In our constant pursuit after external things we weave a kind of veil round the appreciative self which thus becomes completely alien to us. It is only in

the moments of profound meditation, when the efficient self is in abeyance, that we sink into our deeper self and reach the inner centre of experience. In the life-process of this deeper ego the states of consciousness melt into each other. The unity of the appreciative ego is like the unity of the germ in which the experiences of its individual ancestors exist, not as a plurality, but as a unity in which every experience permeates the whole. There is no numerical distinctness of states in the totality of the ego, the multiplicity of whose elements is, unlike that of the efficient self, wholly qualitative. There is change and movement, but change and movement are indivisible; their elements interpenetrate and are wholly non-serial in character. It appears that the time of the appreciative self is a single 'now' which the efficient self, in its traffic with the world of space, pulverizes into a series of 'nows' like pearl beads in a thread. Here is, then, pure duration unadulterated by space. The Quran with its characteristic simplicity alludes to the serial and non-serial aspects of duration in the following verses:

> And put thou thy trust in Him that liveth and dieth not, and celebrate His praise Who in six days created the Heavens and the earth, and what is between them, then mounted His Throne; the God of mercy (25: 58-59).
>
> All things We have created with a fixed destiny: Our command was but one, swift as the twinkling of an eye (54: 49-50).

If we look at the movement embodied in creation from the outside, that is to say, if we apprehend it intellectually, it is a process lasting through thousands of years; for one Divine day, in the terminology of the Qur'an, as of the Old Testament, is equal to one thousand years. From another point of view, the process of creation, lasting through thousands of years, is a single indivisible act, 'swift as the twinkling of an eye'. It is, however, impossible to express this inner experience of pure duration in words, for language is shaped on the serial time of our daily efficient self.[1]

8

۷؍ جنوری کو مدراس کی انجمن خواتین نے ٹاکرس گارڈن میں تقریب منعقد کی۔ حجاب اسماعیل کے ہاتھ کی لکھی ہوئی چار صفحوں کی تقریر موجود ہے۔ علامہ کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے:

---

[1] Iqbal (1934), *Reconstruction*

> بد قسمتی سے ہماری قوم نے عورت کو اپنی قومیت سے باہر کر دیا ہے کیونکہ ہم دیکھتی ہیں کہ جو کمیٹیاں بنتی ہیں، جو مدرسے کھولے جاتے ہیں، جو یونیورسٹیاں قائم کی جاتی ہیں وہ سب مردوں کے لئے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مردوں نے قوم سے عورتوں کو مٹا دینے کی ٹھانی ہے اور اُن کو ایک عضوِ معطل سمجھ کر گھروں کی چار دیواری میں مقید کر دیا ہے... ہم کو غیر مسلموں کی آزادیوں کی تمنا نہیں ہے۔ بلکہ ہماری التجا یہی ہے کہ ہم کو وہ حقوق واپس کر دیئے جائیں، جو قرآن پاک نے تحفتہً ہم کو دیئے تھے!

حجاب نے مصطفیٰ کمال پاشا کا حوالہ دیا۔[1] انجمن خواتین نے علامہ کو سپاس نامہ پیش کیا۔ اپنے لیے ''اسیر انِ قفس'' کے الفاظ استعمال کیے۔ چغتائی کے مطابق علامہ نے کہا کہ ان الفاظ سے ''مغربی عورتوں کی اُس تحریک کا خیال ہوا جسے ترکی میں یا اور جگہ یورپ میں امینسی پیشن (emancipation) کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ جن باتوں کو لفظی قیود سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ اپنی اصل میں قیود ہیں یا نہیں۔'' چغتائی نے خلاصہ انقلاب کو بھیجا۔[2] اہم نکات یوں تھے:

۱ مسلمان عورتوں کے لیے بہترین اسوہ حضرت فاطمہ الزہراؓ ہیں۔ کامل عورت بننا ہو تو اُن کے نقشِ قدم پر چلنے کی کوشش کرنی چاہیے ('رموزِ بیخودی' میں یہ بات لکھ چکے تھے)۔ کسی قوم کی بہترین روایات کا تحفظ بہت حد تک اُس قوم کی عورتیں ہی کر سکتی ہیں ('رموزِ بیخودی' میں اس پر پورا باب لکھا تھا)۔ مسلمان عورتیں یہ فرض پورا کرتی رہی ہیں۔ اگر علامہ کی تحریروں نے خواتین کے دلوں میں اسلامی روایات کا احترام پیدا کیا ہے تو وہ سمجھتے ہیں کہ اپنی مراد کو پہنچ گئے۔

۲ انحطاط کے دَور میں عورت کے حقوق سے بے پروائی ہوئی۔ پانچ چھ سو برس سے اجتہاد پر توجہ نہیں ہوئی ہے۔ اُس سے پہلے لکھی ہوئی فقہ کی کتابیں چلی آ رہی ہیں۔ آج کے حالات

---

[1] یہ عرضداشت علامہ اقبال میوزیم لاہور میں محفوظ ہے۔ اقبال اکادمی پاکستان کے پاس عکس موجود ہے۔

[2] انقلاب ۱۹/ فروری ۱۹۲۹ء؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۸۴-۷۵

کے مطابق نہیں ہیں۔ ترکوں نے کوشش کی ہے۔ وہ ایک فوجی قوم ہیں۔ اپنے ملک کی حفاظت میں کامیاب رہے۔ مسائل کی موشگافی اُن کا کام نہیں ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کا ہے۔ اُسی وقت ہو سکتا ہے جب یہاں اسلامی عدالتیں قائم ہوں۔

۳ اسلام کی روش میانہ روی ہے۔ اس میں ایک طرف عورت اور مرد میں مکمل برابری ہے۔ دوسری طرف ذمہ داریوں میں کچھ فرق ہے۔ اُس کی وجوہات تمدنی ضروریات اور فطری تقاضوں پر ہے۔ بعض علماٗ کہتے ہیں کہ عورت مرد سے کمتر ہے۔ وہ قرآن کی ایک آیت سے استدلال کرتے ہیں: الرجال قوامون علی النساء۔ استدلال غلط ہے۔ عربی محاورے کی رُو سے یہاں فوقیت نہیں بلکہ محافظت کا پہلو ہے۔ قرآن میں عورتوں اور مردوں کو ایک دوسرے کا لباس بھی کہا گیا ہے۔ لباس بھی محافظت کے لیے ہی ہوتا ہے۔

۴ اسلام کے ابتدائی زمانے میں عورتیں مردوں کے دوش بدوش دکھائی دیتی ہیں۔ بعد میں بھی اگر خلیفہ کے انتخاب میں ہر شخص کو رائے دینے کا حق تھا تو عورتیں بھی انتخاب میں اپنی آواز رکھتی تھیں۔ اسلامی قانون میں ماں بچوں کی وراثت میں حقدار ہے۔ سب سے پہلے اسلام ہی نے عورت کو علیحدہ جائیداد کی ملکیت کا حق دیا۔ کئی یورپی ممالک میں کچھ عرصہ پہلے تک عورت کو یہ حق حاصل نہ تھا۔ اُس کی جائیداد نکاح کے وقت خاوند کی جائیداد میں جذب ہو جاتی تھی۔ وہاں اولاد کی جائیداد میں ماں کا حصہ آج بھی نہیں ہے۔ یورپ میں طلاق حاصل کرنا مشکل تھا۔ اسلام نے صرف مرد ہی کو طلاق کا حق نہیں دیا۔ عورت کو بھی حق دیا ہے۔ وہ چاہے تو نکاح کے لیے یہ شرط رکھ سکتی ہے کہ اُسے طلاق کا وہی حق تفویض کیا جائے جو اسلام نے مرد کو دیا ہے یا اُس کے کسی رشتہ دار کو دے دیا جائے۔

۵ اسلام نے عورتوں اور مردوں کی ذمہ داریوں میں جو فرق رکھا ہے اُس کی بنیاد شریعت کے اِس اصول پر ہے کہ دین میں آسانی ہو: الدین یسر۔ مرد کے لیے ایک سے زیادہ بیوی کرنے کا حکم نہیں ہے۔ صرف اجازت ہے۔ بعض اوقات جنگ کے نتیجے میں مردوں کی تعداد کم ہو جاتی ہے۔ تب ملک کی آیندہ حفاظت کے لیے اس کی ضرورت پڑتی ہے۔ جرمنی میں تیس

سالہ جنگ کے بعد یہ ضرورت پیش آئی۔ ۱۶۵۰ء میں بیس برس کے لیے مردوں کو دو دو بیویاں رکھنے کی اجازت دی گئی۔ اسلام نے جہاں عورت اور مرد کے حقوق و فرائض میں اس قسم کی کسی مصلحت کے تحت کچھ فرق رکھا ہے وہاں ضرورت ہے کہ اس فرق سے ناجائز فائدہ اُٹھانے کا سدِّباب کیا جائے۔ عورت نکاح کے لیے یہ شرط بھی رکھ سکتی ہے کہ شوہر اُس کے ہوتے ہوئے دوسری شادی نہیں کرے گا۔ بیوی شوہر سے اپنے بچوں کو دُودھ پلانے کی اُجرت بھی طلب کر سکتی ہے۔ کھانا پکانے کی اجرت بھی طلب کر سکتی ہے۔ مسلمانوں میں اس قسم کی رائے عامہ پیدا کرنی چاہیے کہ جب تک یہ طے نہ پا چکے کہ آیندہ زندگی میں عورت کے کون کون سے حقوق ہوں گے اس وقت تک نکاح نہ پڑھا جائے۔ یہ تحریک بہت زور سے شروع ہونی چاہیے۔

٦ 'مادر پدر آزادی' کی شریعت نے اجازت نہیں دی۔ کوئی ہوشمند انسان اس کی خواہش بھی نہیں کرتا۔ بعض معاشروں میں اس قسم کی قیود اُٹھائی گئی ہیں۔ تجربے نے پھر کسی نہ کسی قسم کی قید لگانے پر مجبور کیا ہے۔ کچھ روز پہلے خبر شائع ہوئی کہ ترکی میں عورتوں کی خودکشی کے واقعات بڑھ رہے ہیں۔ علمائے کرام سے کہا گیا کہ عورتوں کو وعظ کریں کہ خودکشی گناہ ہے۔ بیجا آزادی سے ترکی میں یورپین قسم کا ناچ شروع ہوا۔ آخر مصطفی کمال ہی اُسے بند کرنے پر مجبور ہوئے۔

علامہ سمجھتے تھے کہ چغتائی اپنے خلاصے میں بعض اہم نکات چھوڑ گئے ہیں۔ [1]

اُسی روز انگریزی اخبار سوراجیہ کے خصوصی نمایندے نے ملاقات کی۔ علامہ کے انٹرویو کے خاص نکات یوں تھے:

۱ یورپ میں تعلیم کے خالص دنیوی طریقے نے تباہ کن نتائج پیدا کیے ہیں۔ ایشیا اور افریقہ کے سامنے اصل مسئلہ یہ ہے کہ روحانی اور مادی اُمور کس طرح یکجا کیے جائیں۔ تُرک یہ

[1] مکتوب بنام مدیر انقلاب بلا تاریخ؛ برنی (۱۹۹۳)، کلیات مکاتیب اقبال، سوم، ص ۵۶-۵۵

کام نہیں کر سکے۔ تاتاری نسل اُس تیز فہم و ادراک اور اس عمق ضمیر سے محروم ہے جو اس مسئلے کے حل کرنے کے لیے ضروری تھی۔ پھر تعلیم یافتہ ترکوں نے فرانس سے تعلیم حاصل کی ہے جبکہ اس کام کے لیے انگریزی تمدن زیادہ مفید ہے۔ فی الحال ایران، افغانستان اور عرب کی آیندہ روش کے بارے میں بھی کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ علامہ کا عقیدہ ہے کہ ہندوستان کے باشندے ہی یہ کام انجام دیں گے۔ اُن کی مذہبی روایات، اور اُن کے ادراک کی تیزی اور جذبات کی شدت انہیں اس کا اہل بناتی ہیں۔ پھر اُنہوں نے انگریز سے تعلیم بھی حاصل کی ہے۔ صرف ہندوستان کے باشندے ہی "پرانی دنیا کے کھنڈروں پر بنی آدم کے لیے نئی دنیا تعمیر کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔" اس کے لیے ضروری ہے کہ یہاں کی درسگاہوں میں مذہبی تعلیم بھی ہو۔

۲ پوری انسانیت کی بھلائی اِسی میں ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان مفاہمت ہو۔ علامہ بھی اسی کی کوشش کرتے ہیں۔ البتہ وہ اس بات سے متفق نہیں ہیں کہ سیاست کی خاطر مذہب کو چھوڑ دیا جائے۔ یہ محض یورپ کی غلامانہ تقلید ہے "جس کی مادہ پرستی یورپ کی روحانیت اور دوسری اقوام کی مادیت کے لیے پیامِ موت ثابت ہو چکی ہے۔"۔ ایک ہندوستانی کی حیثیت میں وہ مذہب کو سوراج سے زیادہ اہم جانتے ہیں۔

۳ اندیشہ ہے کہ آگسٹس کومتے کے خیالات سے سطحی طور پر متاثر ہونے کی وجہ سے مصطفیٰ کمال کے معاشرتی تجربات مثبت نتائج پیدا نہیں کر سکیں گے۔ ان کے نتیجے میں زبردست رجعت پسندی کی تحریک جنم لے گی۔ ایشیا اور افریقہ کے مسلمانوں کو زندہ رہنے کی خاطر عہدِ حاضر میں آنا پڑے گا "لیکن اس داخلے کے وقت صرف وہی لوگ محفوظ رہیں گے جو زمانہ حاضرہ میں انسان کے معاملات کو بنانے اور بگاڑنے والی قوتوں سے باخبر ہوں گے۔"

پردے کی تنسیخ کے بارے میں تحقیقی طور پر کچھ کہنے سے انکار کر دیا۔ "میں نے فقہ اسلامی کے اس مسئلے کی تفتیش نہیں کی،" اُنہوں نے کہا، "مجھے قانونِ قدرت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ زندگی کے ذرائع کو پوشیدہ رکھنے کا عادی ہے۔" پین اسلامزم کے بارے میں کہا:

> ''پین اسلامزم'' کے لفظ کے متعلق یورپ اور ایشیا میں بڑی غلط فہمیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ جہاں تک مجھے علم ہے یہ لفظ پہلے پہل ایک فرانسیسی اخبار نویس نے گھڑا تھا جس کا مقصد یورپ کو مسلمان اقوام کے اتحاد کے خیالی اندیشہ سے متنبہ کرنا تھا۔ یہ لفظ بھی ''زرد خطرہ'' کی طرح کا ہے جو ایسے ہی مقصد کے لیے وضع کیا گیا ہے۔ جہاں تک معانی کا تعلق ہے ''پین اسلامزم'' کی کوئی تحریک نہیں۔ کیمبرج کے ایک پروفیسر براؤن بھی اس خیال کو بے بنیاد ثابت کر چکے ہیں۔ اگر اس لفظ کے کوئی معنی ہیں تو یہی کہ اخوت انسانی کا دوسرا نام ''پین اسلامزم'' ہے۔ لفظ ''پین'' اسلامی لغت میں نظر نہیں آتا کیونکہ اسلام اس تجربے کا نام ہے جو قوم، نسل اور ملک سے بالا ہو کر انسان کو یکجا کرنے کے لیے کیا گیا۔ اخوتِ انسانی کے حصول کی جدوجہد میں اسلام، بدھ مت اور عیسائیت کی بہ نسبت زیادہ کامیاب ثابت ہوا ہے حالانکہ اس کی عمر صرف تیرہ سو سال ہے۔ [1]

اُس روز انجمن ترقیٔ اُردو مدراس نے مقامِ انجمن لالی ہال میں ''دعوتِ اقبال'' منعقد کی۔ دعوت نامے کے مطابق ''اول طعام بعدہٗ کلام'' تھا۔ ''نظامِ طعام'' میں درج تھا: شربتِ کیوڑا، تلی ہوئی مچھلی، تاج کباب، سید الطعام (حلیم)، سیخ کباب و شکم پور، مرغ پلاؤ، حلوۂ گازر، حَب کے لوز، زعفرانی پیوسی، فواکہات، برفی۔ ''ترتیبِ کلام'' میں سید ابو ظفر ندوی، عبدالحمید حسن، علامہ سر محمد اقبال، عبداللہ چغتائی، حکیم سید مخدوم اشرف اور حکیم محمد سعید چودھری کے نام شامل تھے۔ ''صدر'' کا اندراج بھی تھا۔ ممکن ہے یہ سیٹھ جمال کی طرف اشارہ ہو۔ [2]

غالباً یہی تقریب ہے جسے چغتائی نے ''مدراس کی انجمن ہلالِ احمر'' کی طرف سے ''ایٹ ہوم'' کے طور پر بیان کیا ہے۔ اُن کے مطابق خان بہادر تمیز الدین قادری، خان بہادر لودھی خاں، خان بہادر مظہر الدین، راؤ بہادر آر کرشنا راؤ بھونسلے، حمید حسن اور سر بیندر رناتھ آرپا بھی موجود تھے۔ نصف گھنٹے

---

[1] انقلاب ۱۹/ جنوری ۱۹۲۹ء؛ افضل (۱۹۸۶)، ص ۲۲۶-۲۲۴۔ محمد دین فوق کی مشاہیر کشمیر (۲۹/ جولائی ۱۹۳۰ء) میں بھی اس کا خلاصہ شائع ہوا جو بشیر احمد ڈار، انوارِ اقبال ص ۴۲-۴۱ پر نقل ہوا ہے۔

[2] دعوت نامہ جس میں یہ تفصیل درج ہے، علامہ اقبال میوزیم میں محفوظ ہے۔

تبادلہ خیال کے بعد طعام پیش کیا گیا۔ اُس کے بعد انجمن ہلالِ احمر کے سیکرٹری ایس ایم فاضل نے علامہ کا خیر مقدم کیا۔ علامہ نے مختصر سی تقریر کی کہ ایشیائی ممالک ہندوستان، افغانستان، شام، حجاز اور چین اپنے مسائل کے جو حل تلاش کر رہے ہیں اُن میں یکسانیت ہے۔ ایشیا کو پھر عروج حاصل ہو گا مگر ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے کے مسائل پر دونوں پہلوؤں سے غور کر کے مصالحانہ نتیجے پر پہنچنا چاہیے۔ "مجھے یقین کامل ہے کہ پرانی دنیا جس کا پیرو یورپ بنا ہوا ہے خاتمہ پر پہنچ رہی ہے،" اُنہوں نے کہا، "اب نئی دنیا معرضِ ظہور میں آنے والی ہے۔ میں اُمید کرتا ہوں کہ وہ ہندوستان ہی ہے جو مادہ پرستوں کی مغربی دنیا کو یہ عظیم القدر پیغام پہنچانے کے قابل ہو گا۔"[1]

9

"جتنے دنوں ان کی تقاریر ہوتی رہیں، میں بھی باقاعدگی سے ان میں جاتی رہی،" حجاب کا بیان ہے۔[2]

گوکھلے ہال میں تیسرا لیکچر ۸ر جنوری شام چھ بجے ہوا۔[3] عقلی نقطۂ نظر سے اسلامی تصوّرِ خدا کے پانچ اجزا گنوائے: ۱۔ انائے لامتناہی (infinite ego)؛ ۲۔ خالقیت (creativity)؛ ۳۔ علم (knowledge)؛ ۴۔ قدرتِ کاملہ (omnipotence)؛ ۵۔ دوام (being eternal)۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ خدا اور بزمِ فطرت کے درمیان ایک خاص رشتہ ہے۔ عام طور پر جب ہم کوئی چیز بناتے ہیں تو پہلے سے موجود مادے کو بروئے لا کر تخلیق کرتے ہیں۔ وہ تخلیق ہم سے علیحدہ وجود رکھتی ہے۔ ہمارے بغیر بھی قایم رہ سکتی ہے۔ خدا صرف اُس چیز کا خالق نہیں ہے جسے وہ تخلیق کرتا ہے۔ اُس کے اسباب کا خالق بھی ہے۔ یوں اُس کی تخلیقات اُس طرح اُس کے مقابل ایک غیر کی صورت میں نہیں کھڑی ہیں جیسے ایک انسان کی تخلیق اُس انسان کے سامنے ہوتی ہے۔

---

[1] انقلاب ۱۷ر جنوری ۱۹۲۹ء؛ افضل (۱۹۸۶)، ص ۷۴۔ وہاں ایٹ ہوم کی تاریخ ۷ر جنوری ہے۔ اُسی روز کے انقلاب میں مدراس میل ۷ر جنوری کے حوالے سے ہے کہ یہ تقریب "کل شام" ہوئی؛ فاروقی (۱۹۸۸)، ح ص ۲۲۱۔

[2] خالد نظیر صوفی، اقبال درونِ خانہ، ص ۱۹۳

[3] انجمن مدراس کی طرف سے جاری ہونے والا دعوت نامہ۔ علامہ اقبال میوزیم میں موجود ہے۔

The Conception of God and the Meaning of Prayer

[Excerpt]

In order to emphasize the individuality of the Ultimate Ego the Quran gives Him the proper name of Allah, and further defines Him as follows:

Say: Allah is One:
All things depend on Him;
He begetteth not, and He is not begotten;
And there is none like unto Him (112: 1-4)

But it is hard to understand what exactly is an individual. As Bergson has taught us in his Creative Evolution, individuality is a matter of degrees and is not fully realized even in the case of the apparently closed off unity of the human being. 'In particular, it may be said of individuality', says Bergson:

> that while the tendency to individuate is everywhere present in the organized world, it is everywhere opposed by the tendency towards reproduction. For the individuality to be perfect, it would be necessary that no detached part of the organism could live separately. But then reproduction would be impossible. For what is reproduction but the building up of a new organism with a detached fragment of the old? Individuality, therefore, harbours its own enemy at home.

In the light of this passage it is clear that the perfect individual, closed off as an ego, peerless and unique, cannot be conceived as harbouring its own enemy at home. It must be conceived as superior to the antagonistic tendency of reproduction. This characteristic of the perfect ego is one of the most essential elements in the Quranic conception of God; and the Quran mentions it over and over again, not so much with a view to attack the current Christian conception as to accentuate its own view of a perfect individual. It may, however, be said that the history of religious thought discloses various ways of escape from an individualistic conception of the Ultimate Reality which is conceived as some vague, vast, and pervasive cosmic element, such as light. This is the view that Farnell has taken in his Gifford Lectures on the Attributes of God. I agree that the history of religion reveals modes of thought that tend towards pantheism; but I venture to think that in so far as the Quranic identification of God with light is concerned Farnell's view is incorrect. The full text of the verse of which he quotes a portion only is as follows:

> God is the light of the Heavens and of the earth. His light is like a niche in which is a lamp—the the lamp encased in a glass—the glass, as it were, a star (24: 35).

No doubt, the opening sentence of the verse gives the impression of an escape from an individualistic conception of God. But when we follow the metaphor of light in the rest of the verse, it gives just the opposite impression. The development of the metaphor is meant rather to exclude the suggestion of a formless cosmic element by centralizing the light in a flame which is further individualized by its encasement in a glass likened unto a well-defined star. Personally, I think the description of God as light, in the revealed literature of Judaism, Christianity, and Islam, must now be interpreted differently. The teaching of modern physics is that the velocity of light cannot be exceeded and is the same for all observers whatever their own system of movement. Thus, in the world of change, light is the nearest approach to the Absolute. The metaphor of light as applied to God, therefore, must, in view of modern knowledge, be taken to suggest the Absoluteness of God and not His Omnipresence which easily lends itself to a pantheistic interpretation.

There is, however, one question which will be raised in this connexion. Does not individuality imply finitude? If God is an ego and as such an individual, how can we conceive Him as infinite? The answer to this question is that God cannot be conceived as infinite in the sense of spatial infinity. In matters of spiritual valuation mere immensity counts for nothing. Moreover, as we have seen before, temporal and spatial infinities are not absolute. Modern science regards Nature not as something static, situated in an infinite void, but a structure of interrelated events out of whose mutual relations arise the concepts of space and time. And this is only another way of saying that space and time are interpretations which thought puts upon the creative activity of the Ultimate Ego. Space and time are possibilities of the Ego, only partially realized in the shape of our mathematical space and time. Beyond Him and apart from His creative activity, there is neither time nor space to close Him off in reference to other egos. The Ultimate Ego is, therefore, neither infinite in the sense of spatial infinity nor finite in the sense of the space-bound human ego whose body closes him off in reference to other egos. The infinity of the Ultimate Ego consists in the infinite inner possibilities of His creative activity of which the universe, as known to us, is only a partial expression. In one word God's infinity is intensive, not extensive. It involves an infinite series, but is not that series.[1]

---

[1] Iqbal (1934), *Reconstruction*

ہوٹل کے کمرے میں ملاقاتیوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ حجاب بھی والد کے ساتھ آئیں۔ "[علامہ] نے میرے پوچھنے پر اپنے کچھ حالات سنائے جن کی تفصیل مجھے یاد نہیں،" اُن کا کہنا ہے، "شمس العلمأ مولوی ممتاز علی مرحوم، تہذیب نسواں اور پھول کا بھی اُنہوں نے ذکر کیا۔" حجاب رخصت ہونے لگیں تو کہا، "مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ آپ ایک جوشیلی اور پرخلوص مسلمان بچی ہیں۔"[1]

مدراس کے ساحل پر ماہی خانہ بھی تھا۔ چغتائی خاص طور پر متاثر ہوئے۔ "خدا کی بحری مخلوق اپنے حقیقی حسن و نیرنگی میں کبھی آج تک نہ دیکھی تھی،" اُنہوں نے لکھا، "تعجب ہے اگر ساحل بحر کے انسان بھی خدائے پاک کی ہستی کے منکر رہیں۔ یہاں تو کوئی کافر کبھی پیدا ہی نہیں ہونا چاہیے۔ سیٹھ جمال کے لیے ان مچھلیوں کا وجود خالقِ ارض و سما کی ہستی کا بین ثبوت ہے۔"[2]

۸ر جنوری کی شام بنگلور جانے کی تیاری میں تھے۔ چغتائی کہتے ہیں کہ سیٹھ جمال ہوٹل آئے۔ بیٹی ساتھ تھیں۔ سیٹھ جمال نے علامہ کو چیک اور اُونی دُھسہ پیش کیا۔ چغتائی اور محمد حسین کو پشمینے کی چادریں دیں۔ رات مدراس چھاؤنی ریلوے اسٹیشن پہنچے تو وہاں بھی الوداع کہنے والا کا ہجوم تھا۔[3]

بنگلور

سلطان ٹیپو کی ریاست میسور پر اَب مہاراجہ کرشن راج ودیار چہارم کی حکومت تھی۔ دنیا کی امیر ترین ہستیوں میں سے تھے۔ مغرب میں فلسفی حکمراں کی شہرت رکھتے تھے۔ گاندھی انہیں راجہ رِشی کہتے تھے۔ علامہ کو دعوت دے چکے تھے۔ راستے میں بنگلور تھا۔

۹ر جنوری صبح سوا چھ بجے معسکر بنگلور (Bangalore Cantonement) پہنچے۔ مسلم لائبریری نے چار روز پہلے سرکلر کے ذریعے تشہیر کی تھی۔ "مسلمانانِ بنگلور ہزاروں کی تعداد میں

---

[1] خالد نظیر صوفی، اقبال درونِ خانہ، ص ۱۹۳

[2] مکتوب عبداللہ چغتائی ۱۵ر جنوری ۱۹۲۹ء محولہ بالا

[3] عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۳۳۲-۳۳۱

سٹیشن پر ڈاکٹر صاحب کے استقبال کو جمع تھے،" چغتائی کا بیان ہے، "پھولوں کے ہار اس جگہ خاص طرز کے بنتے ہیں۔ یہاں معلوم ہوا کہ ہار بنانے میں بھی 'آرٹ' کی ضرورت ہے۔ بڑے بڑے قیمتی ہار تیار ہوتے ہیں۔ پانچ دس روپے عام اچھے ہار کی قیمت ہے۔" چغتائی نے نمونہ رکھ لیا۔ مہر کو دکھانا تھا۔

اسٹیشن پر خان بہادر فخر التجار حاجی سر اسماعیل سیٹھ موجود تھے۔ چغتائی کے خیال میں اَسّی برس سے اوپر تھے۔ جوانوں سے زیادہ سرگرم تھے۔ ذرا اونچا سنتے تھے۔ ساتھ حاجی عبدالغفور تھے۔ الکلام رسالے کا عملہ 'اقبال نمبر' لیے کھڑا تھا۔ علامہ، محمد حسین اور چغتائی، حاجی صاحبان کے ساتھ روانہ ہوئے۔ لوگ ساتھ دوڑنے لگے۔ قریباً نصف میل تک موٹر کو بہت آہستہ لے جانا پڑا۔ ایسکس لاج (Essex Lodge) حاجی سر اسماعیل کی کوٹھی تھی۔ علامہ کے قیام کا بندوبست یہیں تھا۔ ناشتہ کیا۔[1]

برگیڈ روڈ پر گلوب آپرا ہاؤس تھا۔ دن کے دس بجے تقریب ہوئی۔ مسلم لائبریری اور انجمن ترقیٔ اُردو معسکرِ بنگلور کی طرف سے تھی۔[2] میسور کے چیف منسٹر امین الملک دیوان مرزا اسماعیل صدارت کر رہے تھے۔ علامہ کو سپاسنامہ پیش کیا گیا۔ الکلام والوں نے کاروائی نوٹ کی۔ علامہ نے لائبریری کے بارے میں تاثرات لکھے۔ تاریخِ میسور کی قلمی کتابوں کی طرف توجہ دلوائی۔[3]

ایک بجے دوپہر ینگ مینز مسلم فیڈریشن (Young Men's Muslim Federation Civil and Military Station, Bangalore) کے سیکرٹری ایم اے بخاری اور صدر محمد عبیداللہ نے انگریزی میں خطبۂ استقبالیہ پیش کیا۔ کہا کہ علامہ نے قرآن و حدیث کی طرف رجوع کا پیغام دے کر مسلمانوں میں ایک روح بیدار کر دی ہے۔ ہندوستان جیسے فسادات کی لپیٹ میں آئے ہوئے ملک میں امن اور انسانی بھائی چارے کا ایک نیا دَور شروع کرنے کے لیے اس کی بڑی ضرورت ہے۔[4] علامہ

---

[1] مکتوب چغتائی ۱۵ر جنوری ۱۹۲۹ء محولہ بالا۔ فاروقی (۱۹۸۸)، ص ۲۲۲-۲۲۱ بحوالہ انقلاب ۱۷ر جنوری ۱۹۲۹ء

[2] مسلم لائبریری بنگلور کا مطبوعہ سرکلر۔ علامہ اقبال میوزیم کے توسط سے عکس اقبال اکادمی پاکستان کے پاس ہے۔

[3] شذرے کا عکس علامہ اقبال میوزیم لاہور کے توسط سے اقبال اکادمی پاکستان کے پاس موجود ہے۔ متن اور پس منظر شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۴۴۸-۴۴۷ پر بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

[4] انگریزی میں ٹائپ کیا ہوا خطبہ علامہ اقبال میوزیم لاہور میں محفوظ ہے۔ اقبال اکادمی پاکستان کے پاس عکس ہے۔

نے پیغام دیا کہ اقوامِ عالم نے تنگ نظری اختیار کی ہے۔ عالمی بھائی چارے کا علم بلند کرنا اب نوجوان مسلمانوں کا کام ہے۔[1]

معسکر سے باہر شہر میں گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج تھا۔ شام چھ بجے صحن میں جلسۂ عام ہوا۔ محمود شریف نے علامہ کے مدراس والے لیکچرز میں سے تیسرے لیکچر کا اہتمام کیا تھا۔ میسور کے محکمۂ تعلیم کے ڈائریکٹر این ایس سباراوٗ ایم اے بار ایٹ لا (N. S. Subba Rao) صدارت کر رہے تھے۔[2] ''بنگلور کے ہزاروں تعلیم یافتہ لوگ مسلمان اور غیر مسلمان سب جمع ہوئے،'' چغتائی کا بیان ہے۔ الکلام کے علاوہ بنگلور ٹائمز وغیرہ کے نمایندے بھی موجود تھے۔[3]

رات ایک رئیس ججمان محمد علی کے گھر کھانے کی دعوت تھی۔ چغتائی کو ظریف الطبع معلوم ہوئے۔ بہت مہمان تھے۔ کھانا پر تکلف تھا۔ فرش پر بیٹھ کر کھایا گیا۔[4]

بنگلور میں ایک کتب فروش سے چغتائی کو عروسُ المجالس ملی۔ غلام قاسم مہریؔ نے لکھ کر ۱۲۰۹ھ میں سلطان ٹیپو کو پیش کی تھی۔ اُردو نظم میں آنحضورؐ کی سیرت پیش کی گئی تھی۔ قریباً تین سو صفحے کی کتاب تھی۔ علامہ نے بھی مطالعہ کیا۔[5]

11

۱۰ر جنوری صبح گیارہ بجے کے قریب ایک بڑی موٹر پہنچ گئی۔ مہاراجہ میسور نے بھجوائی تھی۔ افسر بھی تھا۔ الکلام کے مدیر سید غوث بھی ساتھ جا رہے تھے۔ بہت لوگوں نے الوداع کہا۔ چغتائی کا بیان ہے:

> دریائے کاویری کے پُل سے گزر کر جب ہم سڑک کا موڑ مڑنے لگے تو چند اشخاص نے ہماری موٹر کو روک لیا۔ اُن کے ہمراہ ایک بوڑھا سا شخص بھی تھا جس کی بینائی بہت

---

[1] مطبوعہ کاپی کا عکس علامہ اقبال میوزیم کے توسط سے اقبال اکادمی پاکستان کے پاس موجود ہے۔

[2] مسلم لائبریری بنگلور کا مطبوعہ سرکلر۔ علامہ اقبال میوزیم کے توسط سے عکس اقبال اکادمی پاکستان کے پاس ہے۔

[3] ایضاً

[4] عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۳۳۳

[5] عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۳۵۵

کمزور تھی۔ اُن کے پاس ایک میلی سی چائے دانی اور چند معمولی سے پیالے تھے۔ چنانچہ اُنہوں نے نہایت عقیدت سے حضرتِ علامہ سے ملاقات کی اور آپ کی خدمت میں چائے پیش کی۔ بوڑھے شخص نے علامہ سے کہا کہ ''میں نے انجمن حمایتِ اسلام لاہور کے جلسے میں آپ کی نظم 'نالۂ یتیم' سنی تھی۔ آج اِتنے برسوں کے بعد بھی وہ منظر میری آنکھوں کے سامنے ہے۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آج میں آپ سے ملاقات کر رہا ہوں۔ ہم لوگ ایک دُور اُفتادہ گاؤں میں رہتے ہیں اور آپ سے ملاقات کے لیے صبح سے یہاں آئے ہوئے ہیں۔[1]

میسُور

میسور شہر میں پوسٹر لگے تھے۔ عنوان تھا، 'آنریبل ڈاکٹر، سر، شیخ محمد اقبال مدظلہ' ایم، اے، پی، ایچ، ڈی، بارسٹر اٹلا، آنریری پروفیسر انجمن حمایت اسلام کالج لاہور، ایم، یل، سی کا ورودِ مسعود در شہر میسور'۔ مسلمان ریلوے اسٹیشن پر علامہ کا استقبال کریں۔ ان کی شاعری ''تصوفانہ اسرارِ بیخودی کو قومی خودداری کے سانچے میں ڈھال رہی ہے۔'' ۱۱/ جنوری کو ٹاؤن ہال میں سپاسنامہ پیش ہو رہا تھا۔ تفصیل درج تھی۔ اشتہار محمد سیٹھ کی طرف سے تھا۔ علامہ ۱۰/ جنوری صبح چھ بجے ریل گاڑی پر بنگلور سے میسور پہنچنے والے تھے۔[2] پروگرام تبدیل ہو گیا تھا۔[3] موٹر سے آئے۔ سہ پہر چار بجے گورنمنٹ ہاؤس پہنچے۔ ''عجیب پر فضا مقام ہے،'' چغتائی محسوس کر رہے تھے، ''سڑکوں کی صفائی اور بجلی کے انتظام کے بھی کیا کہنے۔ بہت کم شہر ہندوستان میں اتنے صاف ستھرے اور پر فضا ہوں گے۔''

شام چھ بجے لیکچر ہوا۔ میسور یونیورسٹی کے تحت تھا۔ وائس چانسلر چاندی نے صدارت کی۔

---

[1] عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۳۳۴

[2] اشتہار علامہ اقبال میوزیم لاہور میں محفوظ ہے۔ اقبال اکادمی پاکستان کے پاس عکس دستیاب ہے۔

[3] چغتائی کے مطابق ۹/ کو بنگلور میں خبر ملی کہ اگلی دوپہر مہاراجہ میسور کی خاص موٹر آئے گی؛ اقبال کی صحبت، ص ۳۳۴

''اکثر برہمن اور غیر برہمن فضلا بھی جلسے میں شریک ہوئے،'' چغتائی کا بیان ہے، ''تمام ٹاؤن ہال حاضرین سے بھرا ہوا تھا۔'' علامہ نے تشکیلِ جدید کا پہلا لیکچر پھر پڑھا۔[1]

12

۱۱/جنوری کو صبح نو بجے علامہ، مہاراجہ میسور سے ملاقات کرنے گئے۔ سپرنٹنڈنٹ مہمان خانہ کے علاوہ مہاراجہ کے مشیر خاص صدیق الملک صادق زین العابدین شاہ مہمانداری کے فرائض انجام دے رہے تھے۔[2]

علامہ موٹر پر سلطان ٹیپو کے مزار کی زیارت کے لیے روانہ ہوئے۔ محمد حسین اور چغتائی ساتھ تھے۔ دوسری موٹر پر کچھ اور لوگ تھے۔ سیٹھ محمد بھی تھے۔ چغتائی نے ''سیٹھ محمد ابا(عباس)'' لکھا۔ ماہرِ موسیقی غلام محمد ''علی جان'' بھی تھے۔ مصاحبت کے لیے بھیجے گئے تھے۔

چودہ کلومیٹر کے فاصلے پر دریائے کاویری کے بیچ میں جزیرہ تھا۔ چغتائی نےسری رنگھٹم لکھا۔ انگریز سرنگاپٹم کہتے تھے۔ چغتائی کہتے ہیں کہ گاڑی سے اُتر کر پہلے محلہ گنجام کی طرف سے لال باغ کی مشرقی روش پر بڑھے۔ مقبرے کے شمالی دروازے پر نوبت بجی۔ مہاراجہ کے حکم سے مقبرے پر باقاعدہ بجتی تھی۔ سامنے چبوترے پر مقبرہ تھا۔ ٹیپو نے اپنے والد سلطان حیدر علی اور والدہ فاطمہ کے لیے بنوایا تھا۔ شہادت کے بعد انگریزوں نے پورے فوجی اعزاز کے ساتھ انہیں بھی دفن کیا۔ شمالی دروازے پر پہنچ کر ''السلام علیکم یا اھل القبور'' کہا۔ علامہ جنوبی دروازے کی طرف مڑے۔ سب اُن کے پیچھے چلے۔ علامہ نے داخل ہو کر قرآن کی آیت پڑھی، ولا تقولوا لمن یقتل فی سبیل اللہ امواتا بل احیأ ولا کن لا یشعرون۔ جو اللہ کی راہ میں مارے گئے، اُنہیں مردہ مت کہو۔ زندہ ہیں مگر تم شعور نہیں رکھتے۔ سامنے تین قبریں تھیں۔ ایک پر سُرخ غلاف تھا۔ ''ہم نے خاموش، مودٔب اور ڈبڈبائی

---

[1] مکتوب چغتائی ۱۵/جنوری ۱۹۲۹ء محولہ بالا؛ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۳۳۵

[2] مکتوب چغتائی ۱۵/جنوری ۱۹۲۹ء محولہ بالا؛ افضل (۱۹۸۶)، ص۲۲۹۔ چغتائی نے بعد میں اقبال کی صحبت میں، ص۳۳۵ پر لکھا کہ ۱۰/جنوری کو چار بجے سہ پہر میسور پہنچتے ہی مہاراجہ سے ملاقات ہوئی کہ یہی وقت طے تھا۔

ہوئی آنکھوں سے فاتحہ کے لیے ہاتھ اُٹھائے، ''عبداللہ کہتے ہیں، ''میں اُس کیفیت کو بیان کرنے سے قاصر ہوں۔'' قریب ہی مسجد تھی۔ صحن میں آ بیٹھے۔ علی جان نے اشعار گائے۔ علامہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ جسم پر لرزہ تھا۔ مغربی دروازے سے قبر پر واپس گئے۔ الوداعی فاتحہ پڑھی۔ باہر مسجد کے صحن میں چھوٹی چھوٹی اور قبریں تھیں۔ سلطان کے ساتھ شہید ہوئے تھے۔[1] سیٹھ محمد سے کہا کہ قبر سے پیغام ملا ہے۔ اگر بہادری کے ساتھ جی نہ سکو تو پھر بہادری کے ساتھ مرنا زندگی ہے:

در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست ہمچو مرداں جاں سپردن زندگیست[2]

مزار پر کسی کے پاس سلطان ٹیپو کی تاریخ کا قلمی نسخہ تھا۔ سیٹھ محمد نے علامہ سے کہا کہ حاصل کر کے بھجوائیں گے۔[3] بعد میں علیگڑھ کے میجر سعید محمد خاں نے فوجی اسکول قائم کر کے علامہ کے نام سے منسوب کرنے کا ارادہ کیا تو علامہ نے لکھا کہ فوجی اسکول کا نام ایک شاعر کے بجائے سلطان ٹیپو کے نام پر رکھیے۔ اُن کی قبر ہم میں سے کچھ لوگوں سے زیادہ زندہ دکھائی دیتی ہے:

> To name a military school after a mere versifier does not seem proper. I suggest that you name your school after Sultan Tipu. The grave of this brave soldier, as I saw in South India, looked more alive than many of us who live or pretend to live.[4]

ایک بجے کے قریب دریا دولت پہنچے۔ سلطان شہید کا محل اور باغ تھا۔ ریاست کی طرف سے علامہ اور ساتھیوں کے کھانے کا انتظام کیا گیا تھا۔ ٹیپو کے زمانے کے بہت سے درخت موجود تھے۔ ''لوگ ان کی طرف اشارہ کر کے عہدِ سلطان کے واقعات سناتے تھے،'' چغتائی نے لکھا ہے، ''کہتے ہیں کہ سلطان کو اس عمارت اور اس باغ سے خاص لگاؤ تھا۔'' قریب ہی قلعہ تھا۔ مؤرخ محمود منگلوری ساتھ تھے۔ مندر دیکھا۔ سلطان حیدر علی نے مرمت کروا کے ہندوؤں کے حوالے کیا تھا۔ مسجدِ اعلیٰ دیکھی۔ ٹیپو نے

[1] مکتوب چغتائی ۱۵/ جنوری ۱۹۲۹ء محولہ بالا؛ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۳۵۲-۳۴۵، ۳۳۷-۳۳۵

[2] علامہ اقبال کی داستانِ دکن از میر محمود حسن، ص ۵-۳؛ ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۴) زندہ رُود، ص ۴۳۰-۴۲۹

[3] مکتوب بنام عبدالجمیل بنگلوری ۱۸/ فروری ۱۹۲۹ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۵۴-۵۳

[4] مکتوب بنام میجر سعید محمد خاں بلا تاریخ؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۵۲-۵۱

بنوائی تھی۔ بوڑھا امام اُس خاندان سے تھا جو ٹیپو کے عہد میں امامت کرتا تھا۔ جہاں ٹیپو شہید ہوئے تھے، انگریزوں نے کتبہ لگا رکھا تھا۔ ایک قبر کے بارے میں کہتے تھے کہ میر صادق کی ہے۔ اُس کی غداری کی وجہ سے ٹیپو کو شکست ہوئی تھی۔ ایک دیوار پر سپہ سالار سید غفار کی تصویر تھی۔ ٹیپو کے ساتھ شہید ہوئے تھے۔ کسی نے کہا کہ الکلام کے مدیر سید غوث ان کے پڑپوتے ہیں۔ علامہ نے گلے سے لگالیا۔ واپسی پر راستے میں سدِّ کاویری دیکھا۔ ڈیم تھا۔ ٹیپو نے ابتدا کی تھی۔ اب وسعت دی جارہی تھی۔ مہاراجہ میسور نے ٹیپو کے زمانے کا ایک فارسی کتبہ لگوادیا تھا۔ شام چھ بجے سے پہلے گیسٹ ہاؤس واپس پہنچ گئے۔[1]

شام چھ بجے ٹاؤن ہال میں میسور کے مسلمانوں اور یتیم خانہ اسلامیہ کی طرف سے علامہ کے اعزاز میں تقریب تھی۔ ڈائس پر نشست کی ٹکٹ پانچ روپے، مخصوص کرسیوں کی ایک روپیہ اور داخلہ مفت تھا۔ رقم یتیم خانے کے سپرد ہوتی۔ چغتائی نے اس سے پہلے علامہ کے اعزاز میں اتنا شاندار جلسہ نہ دیکھا تھا۔ نواب غلام احمد کلامی نے صدارت کی۔ قاری مولانا ابوالمظفر نے تلاوت کی۔ علی جان نے آرکسٹرا کے ساتھ علامہ کی تین نظمیں رقت آمیز سُروں میں سنائیں۔ سیٹھ محمد نے سپاسنامہ پیش کیا۔ مہاراجہ میسور کی اسلام نوازی کی تعریف کی۔ اسلامی تہذیب اور زبان اُردو سلامت تھی۔ اب علاقائی زبانوں تامل، تیلگو وغیرہ کو لازمی بنانے اور علمی زبانوں کا درجہ دینے کی تحریک چلی تھی۔ اورنگزیب کے زمانے سے میسور کے مسلمان اُردو کے ذریعے ہندوستانی اسلامی دنیا کے ساتھ وابستہ رہے تھے لیکن:

ہمارا قدیم تعلق ایک یا دو نسل کے بعد ٹوٹتا نظر آتا ہے۔ سب سے دلخراش یہ امر ہے کہ

---

[1] مکتوب چغتائی ۱۵/ جنوری ۱۹۲۹ء محولہ بالا۔ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۳۳۷-۳۳۸۔ علامہ اقبال کی داستانِ دکن از میر محمود حسن، ص ۵-۳؛ ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۴) زندہ رُود، ص ۴۳۰-۴۲۹۔ محمود منگلوری نے لکھا ہے، ''گنتکل میں کھانے کے وقت، جب میں اپنا برتن (جنوبی ہند کے رواج کے مطابق) الگ لے بیٹھا تو آپ نے اس کو کھینچ کر علیحدہ کر دیا اور آپ کے روبرو جو برتن تھا اُس میں نہ صرف کھانے کو کہا بلکہ اپنے ہاتھ سے نوالے تک بنا کر میرے منہ میں دیئے۔''؛ صحیفہ ٹیپو سلطان از محمود منگلوری ص ۱۶-۱۵؛ شاہین (۱۹۷۶)، ص ۶۹-۶۸

ٹمل، ٹیلگو، کنٹری میں اسلامی لٹریچر بالکل نہیں۔ اس لیے اسلامیت و قومیت کا صفحہ ہستی سے محو ہو جانا قرینِ قیاس ہے۔ جس قدر اسلامی لٹریچر آج اُردو میں موجود ہے، اُس کو کنٹری نے چھوا بھی نہیں۔ اسلام کو جو کچھ فائدے اُردو سے ہو رہے ہیں وہ تحریر سے باہر ہیں۔ اس کا مادری زبان ہونا ہماری قومیت کو ظاہر کرتا ہے۔ اُردو ہی میں مذہب اسلام کا پورا ذخیرہ قرآن مجید کا ترجمہ تفسیر احادیث فقہ صرف و نحو منطق فلسفہ علم ادب سب کچھ موجود ہے۔ جب اردو زبان چھین لی گئی تو اس میں کیا شک ہے کہ ہم بے زبان رہ جاتے ہیں۔

اُردو کے ارتقا میں ولی دکنی، مرزا غالب، محمد حسین آزاد اور مولانا حالی کا کردار بیان کرنے کے بعد علامہ اقبال کو خراجِ عقیدت پیش کیا گیا۔ علامہ نے جوابی تقریر کی۔ چغتائی کے مطابق اہم تھی۔ دستیاب نہیں ہے۔ میسور یونیورسٹی کے فلسفے کے پروفیسر واڈیا نے پہلے دن کے لیکچر کے بارے میں کہا، "اس مضمون پر آج تک کسی نے اس قدر محققانہ نظر نہ ڈالی ہو گی۔ ڈاکٹر صاحب کو مسلمان ہزار 'اپنا' کہیں مگر وہ سب کے ہیں کسی ایک مذہب یا جماعت کی ملکیت نہیں۔ اگر مسلمانوں کو یہ ناز ہے کہ اقبال ان کا ہم مذہب ہے تو ہم ہندوستانیوں کو یہ فخر کم نہیں کہ اقبال ہندوستانی ہے۔"[1]

13

۱۲ر جنوری کی صبح پرانے محلات دیکھے۔ ٹیپو کی یاد میں شیر کا مجسمہ نصب تھا۔ بجلی گھر دیکھا۔ بجلی کی ٹرالی میں بیٹھے۔ پرانے مزار پر گئے۔ ٹیپو بھی جاتے تھے۔ چڑیا گھر دیکھا۔ "شیر بالکل آزاد پھرتے تھے،" چغتائی نے لکھا ہے، "بعد میں معلوم ہوا کہ درمیان میں ایک خندق حائل ہے جو نظر نہیں آتی۔"[2] میسور یونیورسٹی میں عملی نفسیات کا شعبہ دیکھا۔ ڈاکٹر گوپال سوامی صدرِ شعبہ تھے۔ علامہ کے ہاتھ پر

---

[1] محمد سیٹھ کا اشتہار محولہ بالا۔ سپاسنامہ جس کا عکس علامہ اقبال میوزیم میں موجود ہے۔ مکتوب چغتائی ۱۵ر جنوری ۱۹۲۹ء محولہ بالا۔ عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص۳۳۹-۳۳۸۔ علامہ اقبال کی داستانِ دکن از میر محمود حسن، ص-۵-۳؛ ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۴) زندہ رُود، ص۴۳۱

[2] عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص۳۳۹

آلے کا تار باندھ کر کہا کہ ایک سے دس تک کوئی عدد سوچ لیں۔ گنتی کرنے لگے۔ چھ پر پہنچے تو آلے کا کانٹا زور سے حرکت کرنے لگا۔ علامہ نے یہی عدد سوچا تھا۔ علامہ کو مثنوی مولانا روم کی پہلی حکایت یاد آ گئی۔ کنیز عشق کا بھید چھپاتی تھی۔ حکیم نے نبض پر ہاتھ رکھ کر شہروں کے نام لیے۔ ایک نام پر نبض تیز ہوئی۔ اس سے پہلے بو علی سینا نے قابوس بن وشمگیر کے مرض کی تشخیص کی تھی۔[1]

دوپہر کے کھانے کے بعد موٹر میں بنگلور روانہ ہوئے۔ دو تین مقامات پر گاؤں کے باشندے پھولوں کے ہار لیے کھڑے تھے۔ علامہ نے ہر دفعہ موٹر رُکوائی۔ ٹیپو کے مقبرے کے قریب بھی رکوائی۔ اُتر کر فاتحہ پڑھی۔ چاند پٹم میں حیدر علی اور ٹیپو کے پیروں کے مزاروں پر رُکے۔ فاتحہ پڑھی۔ شام پانچ بجے کے قریب بنگلور پہنچے۔ دیوان مرزا اسماعیل کے ساتھ چائے پی۔ پروفیسر شوستری اور اُن کے گھر کے لوگ بھی تھے۔ چغتائی کے مطابق سارا ماحول ایرانی تھا۔ بازار سے ہوتے ہوئے ایسکس لاج پہنچے۔ آرام کیا۔[2]

14

۱۳/ جنوری کو صبح ساڑھے آٹھ بجے ساتھیوں کے ہمراہ بنگلور سے ریل کے ذریعے حیدرآباد دکن روانہ ہوئے۔ الکلام کے مدیر سید غوث ساتھ تھے۔ چغتائی کا خیال تھا:

> جنوبی ہند کے برہمن علما اب تک مذہب و فلسفہ کے مسائل میں خاص دل چسپی رکھتے ہیں۔ مدراس، بنگلور، میسور، ہر جگہ یہ بات مشاہدے میں آئی۔ تینوں لیکچروں کے اقتباسات تمام مشہور انگریزی اخبارات یعنی ہندو، سوراجیہ، مدراس میل، جسٹس، ڈیلی ایکسپریس وغیرہ میں شائع ہوئے۔ قریباً ہر اخبار نے ڈاکٹر صاحب کا فوٹو شائع کیا۔ مدراس کے ایک ہندو پروفیسر فلسفہ کی ایک چٹھی ہندو میں چھپی ... سوراجیہ میں ترکی کے متعلق جو انٹرویو نکلا... اس انٹرویو کے مضمون پر سوراجیہ نے ایک مقالہ افتتاحیہ

---

[1] علامہ اقبال کی داستانِ دکن از میر محمود حسن، ص ۱۴-۱۳؛ ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۴) زندہ رُود، ص ۴۳۱

[2] مکتوب چغتائی ۱۵/ جنوری ۱۹۲۹ء محولہ بالا؛ عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۳۴۰

'مذہب، سیاسیات اور تعلیم' کے عنوان سے لکھا۔
انجمن ترقی اُردو مدراس اور ہندی پر چار سبھا کی طرف سے بھی علامہ کو سپاسنامے پیش کیے گئے تھے۔ علامہ کی طرف سے دونوں جوابات مدراس اور بنگلور کے بعض اخبارات میں شائع ہو چکے تھے۔ ایک تقریر کا ترجمہ جسٹس میں شائع ہوا۔[1]

حیدرآباد دکن

حیدرآباد دکن میں چار سرکاری دارالاضیاف یعنی گیسٹ ہاؤس تھے۔ تین میں مہمان تھے۔ چوتھے کا نام بلاوسٹہ (Bella Vista) تھا۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے مسجل (رجسٹرار) حمید احمد انصاری نے درخواست کی کہ علامہ کو وہاں ٹھہرایا جائے۔ عہدیداروں نے اعتراض کیا۔ حضور نظام کلکتہ گئے تھے۔ مہاراجہ سر کشن پرشاد صدرِ اعظم تھے۔ حکم جاری کیا۔ علامہ کے استعمال کے لیے ایک پیج (Paige) موٹر کار مختص کی۔ لیکچرز کے لیے ٹاؤن ہال کی اجازت حضور نظام سے ٹیلی فون پر لی گئی۔[2]

۱۴ر جنوری کی صبح فلک نما کے ریلوے اسٹیشن سے گزر کر گاڑی حیدرآباد ریلوے اسٹیشن پر پہنچی۔ مسلمان بچے قطاروں میں کھڑے "چین و عرب ہمارا" گا رہے تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے رجسٹرار حمید احمد انصاری، سید ہاشمی فرید آبادی، سید مطلبی، خلیل الرحمان اور دوسرے لوگ استقبال کے لیے اسٹیشن پر موجود تھے۔ "گاڑی ہی میں چائے لے آئے،" چغتائی کا بیان ہے۔

علامہ اور ساتھی سکندر آباد ریلوے اسٹیشن پر اُترے۔ سر اکبر علی حیدری، مولانا عبداللہ العمادی، خلیفہ عبدالحکیم، سید ابراہیم ندوی اور عثمانیہ یونیورسٹی کے دوسرے اسکالر موجود تھے۔ ہار پہنانے کی رسم ہوئی۔ علامہ، سر اکبر حیدری کے ہمراہ ہوئے۔ چغتائی اور محمد حسین، خلیفہ عبدالحکیم

---

[1] مکتوب عبداللہ چغتائی ۱۵ر جنوری ۱۹۲۹ء محولہ بالا، ص ۲۲۶-۲۲۳

[2] سید شکیل احمد (۱۹۸۴) 'اقبال حیدرآباد آرکائیوز میں'، ص ۱۴-۱۰

کے ساتھ گیسٹ ہاؤس پہنچے۔[1] علامہ نے محل کی کتابِ حضوری میں نام بھی لکھوایا۔[2]

مہاراجہ کشن پرشاد سے بھی ملاقات ہوئی۔ سولہ برس پہلے لاہور میں ملے تھے۔ یہ دوسری ملاقات تھی۔ اس دفعہ ریاست کے صدرِ اعظم تھے۔ شام کو حیدرآباد کے بعض علم دوست حضرات دیر تک علامہ کے پاس بیٹھے رہے۔ جوش ملیح آبادی، مولانا عمادی، ڈاکٹر عبدالحق، سید ابراہیم ندوی اور ڈاکٹر مظفر الدین شامل تھے۔ رات نو بجے کے قریب امین جنگ بہادر کا رُقعہ آیا۔ اعلیٰحضرت شہریارِ دکن (یعنی حضور نظام) نے ۱۸ر جنوری صبح گیارہ بجے ملاقات کے لیے یاد فرمایا ہے۔[3]

15

۱۵ر جنوری کو عبداللہ چغتائی نے انقلاب کے لیے سفرنامے کی دوسری قسط لکھی۔ شام کو ٹاؤن ہال میں پہلا لیکچر تھا۔[4] مہاراجہ کشن پرشاد نے صدارت کی۔ خطبے میں کہا، "ڈاکٹر اقبال جس مقصدِ حیات کو اپنے علم و عمل سے پورا کر رہے ہیں، وہ انسانی ترقی کو دُنیا کے لیے سُودمند بنانے اور روحانیت کے اعلیٰ مدارج کو حاصل کرنے کا راستہ بتاتے ہیں۔"[5]

16

عثمانیہ یونیورسٹی نے لیکچرز کے لیے ٹاؤن ہال کو ۱۵، ۱۶ر اور ۱۷ر جنوری کو استعمال کرنے کی اجازت مانگی تھی۔[6] ۱۶ر جنوری کے کسی لیکچر کا تذکرہ نہیں ملا ہے۔ چغتائی ایک روز محمد حسین کے ساتھ

---

[1] مکتوب چغتائی ۱۵ر جنوری ۱۹۲۹ محولہ بالا، ص ۲۳۰۔ بعد میں چغتائی نے حیدرآباد اور سکندرآباد کے اسٹیشنوں کے واقعات یکجا کر دیئے؛ اقبال کی صحبت میں، ص ۳۴۰-۳۴۱۔

[2] ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۴) زندہ رود، ص ۴۳۲؛ فرمانِ نظام، عبدالرؤف عروج

[3] مکتوب چغتائی ۱۵ر جنوری ۱۹۲۹ محولہ بالا، ص ۲۳۱

[4] مکتوب چغتائی ۱۵ر جنوری ۱۹۲۹ محولہ بالا، ص ۲۳۰، ۲۲۳۔ مکتوب میں ہے، "آج شام پہلا لیکچر ہو گا۔" ۔ اقبال کی صحبت میں، ص ۳۴۱ پر واقعات کو جو ترتیب دی اُس کا مطلب نکلتا ہے کہ پہلا لیکچر ۱۴ر جنوری کو ہوا۔

[5] عبداللہ قریشی (۱۹۸۶) اقبال بنام شاد، ص ۵۰

[6] سید شکیل احمد (۱۹۸۴)، 'اقبال حیدرآباد آرکائیوز میں'، ص ۱۳

گولکنڈہ کے مقبرے دیکھنے گئے۔ بیس برس پہلے علامہ نے انہی پر نظم 'گورستانِ شاہی' لکھی تھی۔ علامہ ساتھ نہ گئے "کیونکہ... مہمان خانہ میں ہر وقت ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔" یہ واقعہ ۱۶؍جنوری کا ہو سکتا ہے۔[1]

مولانا ابو محمد مصلح نے تحریکِ قرآن شروع کر رکھی تھی۔ نواب نذیر جنگ بہادر کے ساتھ آ کر ملے۔ "تعلیم یافتہ نوجوانوں کا اچھا خاصا مجمع تھا،" مصلح نے دیکھا۔[2] اُن کے نام علامہ کا ایک بلا تاریخ خط موجود ہے، "اِس زمانہ میں قرآن کا علم ہندوستان سے مفقود ہوتا جاتا ہے... کیا عجب کہ آپ کی تحریک بارآور ہو اور مسلمانوں میں قوتِ عمل پھر عود کر آئے۔"[3]

۱۶؍جنوری کی رات مہاراجہ کشن پرشاد کی طرف سے ڈنر کی تفصیلات سرکاری ریکارڈ میں ہیں۔[4] چغتائی کہتے ہیں، "تمام مدعوین نے ریاست کے سرکاری لباس میں شرکت کی" اِس لیے وہ اور محمد حسین نہ گئے۔ سرکاری لباس آصف شاہی دستار اور بگلس تھا۔ اِس بیان سے لگتا ہے کہ علامہ بھی وہی لگا کر گئے، "اگرچہ... اعلان کر دیا تھا کہ وہ کوئی شعر یا نظم اِس دعوت میں نہیں پڑھیں گے۔"[5]
ریکارڈ کے مطابق ڈنر میں قریباً ساٹھ مہمان بلائے جا رہے تھے۔ چادر گھاٹ کی انڈین کوآپریٹو سوسائٹی سے اگالدان، حقہ اور ڈبیہ خریدے گئے۔ چار کمان کے جوہری بدری پرشاد نانک رام سے انگوٹھی اور بٹن وغیرہ آئے۔ ڈیوڑھی نواب سالار جنگ بہادر میں رام نارائن بہادر مل کی دکان سے کپڑا آیا۔ جامہ دار کے دو ٹکڑے شامل رہے ہوں گے جن کے بارے میں روایت ہے کہ کشن پرشاد نے علامہ کو

---

[1] مکتوب عبداللہ چغتائی ۱۵؍جنوری ۱۹۲۹ء محولہ بالا، ص ۲۳۱

[2] نظر حیدرآبادی (۱۹۸۱) اقبال اور حیدرآباد، ص ۶۰

[3] رفیع الدین ہاشمی (۱۹۸۶) 'اقبال کے پانچ غیر مدون خطوط'، ص ۳۸۸-۳۸۷

[4] سید شکیل احمد (۱۹۸۴)، ص ۱۴۔ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۳۴۱، اور عبدالرؤف عروج (۱۹۷۸) اقبال اور بزمِ اقبال حیدرآباد دکن، ص ۳۴ کے مطابق ڈنر ۱۵؍دسمبر کو ہوا۔

[5] چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۳۴۱

دیئے۔[1] سکندرآباد کے راجہ دین دیال اینڈ سنز آرٹ فوٹوگرافک سیلون کی خدمات حاصل کی گئیں۔ "داروغہ اربابِ نشاط" نے بعد میں "مبلغ ۸۴ سکہ عثمانیہ بابتہ معمولِ طوائف بر ڈنر ڈاکٹر سر اقبال بہ ڈیوڑھی سرکار" وصول کیے۔[2] "ضیافت و عطائے تحائف" کے تمام اخراجات ایک ہزار چار سو اڑتالیس روپے تھے۔ ان میں سے خاص ڈنر کا خرچ ایک سو پانچ روپے پانچ آنے چھ پائی تھا۔ بعد میں محکمۂ سیاست نے کوشش کی کہ یہ اخراجات یونیورسٹی سے وصول کیے جائیں۔[3]

ڈنر کے ساتھ مشاعرہ بھی ہوا۔ ایک روایت ہے کہ انتظام جوش ملیح آبادی کے "حُسنِ انتظام" سے ہوا۔[4] شریک ہونے والوں میں حیدر یار جنگ طباطبائی، نواب ضیأیار جنگ بہادر، نواب عزیزیار جنگ بہادر، مولوی مسعود علی محوی، جوش ملیح آبادی، باغ اور لبیب کے نام لیے جاتے ہیں۔[5] عثمانیہ یونیورسٹی کے شعبۂ کیمیا کے پروفیسر ڈاکٹر مظفر الدین قریشی بھی تھے۔ یہ امکان پیش کیا گیا ہے کہ نواب بہادر یار جنگ بھی آکر علامہ سے ملے ہوں، "ایک خوش پوش اور سخن سنج حیدرآبادی نواب کی

---

[1] وحید الدین (۱۹۸۸)، ص۲۲۱ کے مطابق ایک کی اچکن علامہ نے خود بنوائی اور دوسرا شیخ اعجاز احمد کو دیا۔

[2] وسیمہ مبارک سے روایت ہے کہ علامہ نے لاہور میں اپنے دوستوں سے کشن پرشاد کی رات کے کھانے کی دعوت، ناچ گانے کی محفل اور شراب کے جام کا ذکر کرتے ہوئے کہا، "میں محفل سے اُٹھ گیا کیونکہ سب جانتے ہیں کہ میں نے کبھی شراب نہیں پی۔" وسیمہ کا بیان ہے کہ انہوں نے یہ گفتگو ڈرائنگ روم سے ملحق کمرے کے بند دروازے کے پیچھے سے سنی: خالد نظیر صوفی، اقبال درونِ خانہ، ص۱۲۴-۱۲۵

[3] سید شکیل احمد (۱۹۸۴)، ص۱۸-۱۴۔ تحائف پروٹوکول کا حصہ تھا کیونکہ علامہ ریاست کے مہمان تھے۔ شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص۴۴۹ پر حکیم محمد یوسف حسن کی روایت ذرا عجیب ہے کہ کشن پرشاد علامہ کو چھوڑنے اسٹیشن آئے۔ تحائف دینا چاہتے تھے لیکن ہچکچا رہے تھے "کہ کہیں علامہ کی طبعِ غیور پر بار نہ گزرے۔" گاڑی روانہ ہونے لگی تو "یکایک" علامہ کے ڈبے میں تحائف رکھنے اور رکھوانے شروع کر دیئے۔ علامہ انکار کر رہے تھے۔ مہاراجہ نے سلام کرتے ہوئے کہا کہ تحائف قبول کیجیے۔ علامہ کے جواب دینے سے پیشتر گاڑی اسٹیشن سے باہر نکل رہی تھی۔

[4] عبدالرؤف عروج (۱۹۷۸) اقبال اور بزمِ اقبال حیدرآباد دکن، ص۳۵

[5] عبداللہ قریشی (۱۹۸۶) اقبال بنام شاد، ص۵۳-۵۲

حیثیت سے۔"[1] ایک روایت ہے کہ علامہ خاموشی سے سنتے رہے۔ اس لیے مہاراجہ بھی داد نہ دے سکے۔ ایک فارسی شعر پر علامہ نے کہا، "پھر فرمایئے۔" داد کا سلسلہ شروع ہو سکا۔[2] علامہ سے بیحد اصرار کیا گیا۔ فارسی کے چند اشعار سنائے۔[3]

17

۱۷ر جنوری کی صبح علامہ کا لیکچر ہوا۔ صدارت نواب اعظم جاہ ولیعہد نے کی۔[4] سمجھا گیا ہے کہ یہ حیدر آباد میں علامہ کا دُوسرا لیکچر تھا۔ دونوں لیکچر وہی تھے جو مدراس میں بھی دیئے گئے تھے۔ حیدر آباد میں علامہ کے تیسرے لیکچر کی شہادت نہیں ملی ہے۔[5]

سمجھا گیا ہے کہ اُس دوپہر سر اکبر حیدری کے گھر کھانے کی دعوت ہوئی۔ علامہ کے ساتھ محمد حسین اور چغتائی گئے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے اساتذہ، محکمۂ مالیات کے عہدیدار اور دوسرے ممتاز شہری آئے تھے۔ کلیاتِ اقبال کے مرتب عبدالرزاق بھی ملے۔[6] چغتائی کہتے ہیں کہ علامہ لاہور میں ادارۂ معارفِ اسلامیہ قائم کرنے کا ارادہ کر چکے تھے۔ سر اکبر سے مشورہ کیا۔ اغراض و مقاصد کا کتابچہ دکھایا۔ ادارے کے لیے ریاست کی امداد چاہتے تھے۔[7]

حضور نظام کے پرائیویٹ سیکرٹری نواب امین جنگ نے اُس رات علامہ کے اعزاز میں عشائیہ دیا۔ بتایا گیا ہے کہ ریاست کے جاگیرداروں اور رؤسا نے شرکت کی۔ اگلی صبح حضور نظام سے ملاقات

---

[1] نظر حیدر آبادی (۱۹۸۱) اقبال اور حیدر آباد، ص ۲۲۷-۲۲۶

[2] عبداللہ قریشی (۱۹۸۶) اقبال بنام شاد، ص ۵۳-۵۲۔ عروج (۱۹۷۸)، ص ۳۵-۳۴

[3] عبدالرؤف عروج (۱۹۷۸)، ص ۳۶-۳۵۔ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۳۴۱

[4] ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۴) زندہ رود، ص ۴۳۳-۴۳۲

[5] عبدالرؤف عروج (۱۹۷۸) اقبال اور بزمِ اقبال حیدر آباد دکن، ص ۳۲۔ ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۴) زندہ رُود، ص ۴۳۳

[6] عروج (۱۹۷۸) اقبال اور بزمِ اقبال حیدر آباد دکن، ص ۳۷-۳۶۔ قریشی (۱۹۸۶) اقبال بنام شاد، ص ۴۰۱

[7] چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۴۰۰۔

ہو رہی تھی۔ علامہ کو مبارکباد پیش کی، ''پہلے کسی شاعر کو حضور نظام نے اِتنا بڑا اعزاز نہیں دیا ہے۔''[1]

اُس روز افغانستان میں حبیب اللہ کلکانی کی حکومت قائم ہو گئی۔ نسلاً تاجک تھا۔ اُس کا باپ گھروں میں پانی بھرتا تھا۔ اس لیے حبیب اللہ ''بچہ ٔسقا'' کہلاتا۔ مشہور تھا کہ پہلے فوج میں بھرتی ہوا۔ رائفل لے کر پشاور بھاگ گیا۔ چوری کرتے ہوئے گرفتار ہوا۔ پاراچنار جیل میں قید کاٹی۔ افغانستان واپس جا کر ڈکیتیاں شروع کر دیں۔ ۱۹۲۸ء میں امان اللہ اور ملکہ ثریا نے یورپ کا دورہ کیا۔ برطانوی ذرائع نے ان کے دورۂ یورپ کی تصاویر ملک میں پھیلا کر بتایا کہ بے دین ہو گئے ہیں۔ بچہ ٔسقا نے قدامت پرست طبقے کی حمایت حاصل کر کے نومبر میں بغاوت کی۔ کابل پر قبضہ کیا۔ ۱۵/ جنوری کو امان اللہ خاں دستبردار ہوئے۔ اقتدار بھائی کے حوالے کیا۔ اُس نے ۱۷/ جنوری کو ہتھیار ڈال دیئے۔ بچہ ٔسقا کا ارادہ تھا کہ لڑکیوں کے اسکول بند کر دے۔ خواتین کو دوبارہ پردے پر مجبور کرے۔ امان اللہ نے روائتی قوانین اسلام کی روح کے منافی قرار دے کر منسوخ کیے تھے۔ بچہ ٔسقا نے شریعت کے نام پر دوبارہ نافذ کرنے کا وعدہ کیا۔ اپنے لیے ''امیر حبیب اللہ خادمِ دینِ رسول اللہ'' کا لقب پسند کیا۔

18

۱۸/ جنوری کو صبح گیارہ بجے حضور نظام سے ملاقات ہوئی۔[2] علامہ کا بیان ہے:

> مجھے حیدر آباد دکن جانے پر حضور نظام کے حضور باریابی کا شرف حاصل ہوا۔ بالمشافہ گفت و شنید میں میں نے عرض کیا کہ مسلمانانِ پنجاب جناب کی تشریف آوری کے متمنی ہیں اور عرصہ سے چشم براہ ہیں کہ اُن کی یہ اُمید بر آئے۔[3]

بعد میں حضور نظام نے سرکاری کاغذات میں اعتراض کیا کہ علامہ بلاوسطہ میں کیوں ٹھہرائے گئے۔

---

[1] عبدالرؤف عروج (۱۹۷۸) اقبال اور بزمِ اقبال حیدر آباد دکن، ص ۳۸-۳۷

[2] محمد الدین فوق، 'ڈاکٹر شیخ سر محمد اقبال'، ص ۳۹؛ عروج (۱۹۷۸) اقبال اور بزمِ اقبال حیدر آباد دکن، ص ۳۹

[3] انجمن حمایت اسلام کی قلمی روداد میں درج ہے کہ علامہ اقبال نے یہ بات ۲۳/ جون ۱۹۲۹ء کے جنرل کونسل کے اجلاس میں بتائی؛ محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶) اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص ۱۱۷

"بجز معزز اشخاص کے بلاسٹہ میں کسی کو نہ ٹھیرایا جائے،" اُنہوں نے لکھا، "رہا معمولی حیثیت کے اشخاص وہ [دوسرے] گیسٹ ہاؤس میں ٹھیرائے جاسکتے ہیں۔"[1] سولہ سترہ برس بعد علامہ سے ملاقات کے حوالے سے فارسی میں بیان دیا کہ ہمیں بس اتنا یاد ہے کہ ایک دفعہ آیا تھا۔ معلوم نہیں کیوں آیا تھا۔ کتابِ حاضری میں نام لکھا اس لیے ہم نے ملاقات کی اجازت عطا فرمائی۔ گفتگو سے معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے معزز طبقے سے ہے، قوم وملّت کی خدمت کا جذبہ رکھتا ہے، انگریزی خوب جانتا ہے اور یورپ کا سفر کر چکا ہے۔ بہرحال ہماری ریاست سے باہر کے مشاہیر میں سے ہے۔ اس سے زیادہ ہم نہیں جانتے:

> مارا ایں قدر یاد ہست کہ تخمیناً عرصہ ربع صدی گذشتہ کہ ایکبار ایں جا آمدہ بودہ مگر معلوم نیست کہ آیا او از خود بغرضِ سیاحت آمدہ بود یا بر دعوتِ کسے یا برائے کارِ خاص آمدہ و ہم او چونکہ بر ما کال [call] کردہ بُود یعنے نامِ خویش در کتاب نوشتہ بود حسبِ عادت مطابق ایٹیکیٹِ ما او را انٹرویو دادہ بودیم و نتیجہ کہ ماز گفتگوئے او اخذ کردیم آں ایں بود کہ او در نظرِ ما از معزز طبقۂ اہلِ اسلام آمد و ایں ہم از طرزِ کلامِ او بر ما ہویدا شد کہ او جذبۂ خدمتِ قوم وملّتِ خویش در دل می داشت و ایں ہم ظاہر شد کہ او زبانِ انگریزی را خُوب می دانست و سفر یورپ ہم کردہ بود۔ بہرحال شمارِ او را در میانِ مشاہیر بیرونِ ملک بود۔ زیادہ از احوالِ او ما نابلد ہستیم۔[2]

اس ملاقات کے بارے میں کہی جانے والی کسی اور بات کا ثبوت فراہم نہیں کیا جاسکتا۔ حضور نظام کے دربار میں حاضری کے لیے آصف شاہی دستار اور بگلس کی شرط تھی۔ دکن کے ایک نامور شاعر نے لکھا، "ہم نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ یہ 'پابندی' اقبال پر سے ہٹالی گئی تھی۔" علامہ نے موقع کے

---

[1] سید شکیل احمد (۱۹۸۳)، ص ۱۲

[2] نظام گزٹ ۴ر مئی ۱۹۴۴ء روز پنجشنبہ؛ عبدالرؤف عروج (۱۹۷۸) اقبال اور بزمِ اقبال حیدرآباد دکن، ص ۳۹

لیے اشعار لکھ کر نظام کے حضور پڑھے۔ ’رموزِ بیخودی‘ کا نسخہ پیش کیا۔[1] وہ اشعار ’رموزِ بیخودی‘ کے ہیں۔ مدتوں سے اسرار و رموز (یکجا) کے طور پر شائع ہو رہی تھی۔ علیحدہ نسخہ پیش کرنا بھی قرینِ قیاس نہیں۔ قاضی عبدالحمید کہتے ہیں کہ علامہ نے بتایا کہ حکیم اجمل خاں سے نظام کے کسی خاص ہیرے کے بارے میں سنا تھا۔ دیکھنے کی خواہش کی۔ نظام نے فوراً دکھایا۔[2] وسیمہ مبارک کے بیٹے نے اُن سے روایت کی کہ واپس آ کر اکثر اُس کی چمک کا تذکرہ کرتے تھے۔[3] جاوید تردید کرتے ہیں۔[4] الکلام کے مدیر سید غوث سے روایت کی گئی کہ نظام نے کہا، ”آپ قبول فرمائیں تو ہم آپ کو اسٹیٹ کا وزیرِ قانون بنا دیں۔“ علامہ نے جواب دیا، ”آپ اقبال کو آزاد ہی رکھیں تو بہتر ہو گا۔“[5] جاوید کے مطابق یہ روایت بھی درست نہیں ہے۔[6]

19

سکندرآباد سے ۱۹ر جنوری کو روانہ ہوئے۔ بمبئی کے راستے ۲۲ر جنوری کی صبح بھٹنڈہ میل سے لاہور پہنچنے کا ارادہ تھا۔[7]

---

[1] نظر حیدرآبادی (۱۹۸۱) اقبال اور حیدرآباد، ص ۱۵-۱۴

[2] قاضی عبدالحمید (۱۹۳۸)، ص ۱۹۴

[3] خالد نظیر صوفی، اقبال درونِ خانہ، ص ۴۵

[4] ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۴) زندہ رود، ص ۴۳۳۔ محمد حسین عرشی کہتے ہیں کہ علامہ نے اُن سے کہا کہ کسی نے انگریزی میں معدنیات پر اپنی کتاب انہیں تبصرے کے لیے بھجوائی۔ اُسے پڑھ کر دلچسپی پیدا ہوئی اور ”تھوڑے عرصے میں میں نے جواہر کے پرکھنے کی مہارت حاصل کر لی“؛ عرشی، ’علامہ اقبال کی صحبت میں‘، ص ۹۷

[5] نظر حیدرآبادی (۱۹۸۱) اقبال اور حیدرآباد، ص ۴۰

[6] ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۴) زندہ رُود، ص ۴۳۳

[7] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸)، حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۲۲۲ بحوالہ انقلاب ۲۲ر جنوری ۱۹۲۹ء۔

باب ۸

شیطانی طلسم

جنوری ۱۹۲۹ء سے مئی ۱۹۳۰ء تک

1

افغانستان کے بارے میں خبروں کو علامہ اقبال اعتبار کے قابل نہ سمجھ رہے تھے۔ کہہ نہیں سکتے تھے کہ افغانستان کس حد تک امان اللہ کے اقتدار میں ہے۔ کہا جا رہا تھا کہ حضرت صاحب شور بازار بغاوت کے سرغنہ ہیں۔ لیکن اُنہوں نے اصلاحات کے اعلان ''نظام نامہ'' پر دستخط کیے تھے۔ لگتا تھا کہ امان اللہ نے اصلاحات نافذ کرنے میں تیزی دکھائی۔ فوجی قوت کی طرف کم توجہ دی۔ وسطِ ایشیا کے سیاسی انحطاط کا ہندوستان اور چین پر برا اثر پڑتا۔ وسطِ ایشیا کے حکمراں اپنی نگاہ کو وُسعت دیں۔[1]

علامہ نے اسلام اور مسلمانوں کی بہتری کے لیے ایران، ترکی اور مصر جانا چاہا۔ مالی وسائل نہ تھے۔[2]

فارسی میں تین نظمیں لکھیں، 'افغان و امان'، 'خطاب بہ علمائے حق' اور 'خطاب بہ اقوامِ شرق'۔ انقلاب نے لکھا، ''ان میں مذہب و ملت کے وہ اساسی اصول واضح کیے گئے ہیں جو دائمی، اٹل اور غیر مبتدل ہیں اور جنہیں مدِ نظر رکھ کر کوئی مسلمان دینی، مذہبی اور جماعتی معاملات میں غلطی نہیں کر سکتا۔''[3]

---

[1] انقلاب یکم مارچ ۱۹۲۹ء؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتار اقبال، ص ۸۶-۸۴۔ عبداللہ چغتائی کے مطابق ملّا شور بازار کے قیامِ لاہور کے دوران علامہ، منشی طاہر الدین، چغتائی اور مہر کو ساتھ لے کر اُن سے ملنے گئے۔ وہ فلیمنگ روڈ پر میوہ منڈی کے سامنے کے کمرہ نمبر ۱ر میں ٹھہرے تھے؛ اقبال کی صحبت میں، ص ۱۹۳-۱۹۱

[2] مکتوبات بنام عبدالجمیل منگلوری، ۱۸ر فروری اور ۲۱ر مئی ۱۹۲۹ء؛ برنی (۱۹۹۳)، ص ۶۳، ۵۲

[3] حمزہ فاروقی، حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۵۷-۵۹ بحوالہ انقلاب ۲، ۳، ۹، ۱۰، ۱۶ر اور ۱۷ر فروری ۱۹۲۹ء

پہلی نظم 'افغان و امان' انقلاب کے ۳؍ فروری کے شمارے میں آئی۔ ملّتِ افغانیہ سے کہا کہ فریب سے ہوشیار رہو۔ امان اللہ خاں کی پیشانی پر تمہاری تقدیر کی لکیر ہے۔ تم سراپا فریاد ہو، وہ جواب ہے۔ اُس نے تمہارے قبائل سے ایک قوم پیدا کی۔ اب کابل میں فتنہ کھڑا ہوا ہے، اٹھو! مومن کے علم و حکمت کا کمال وحدت سے ہے۔ بکھرنے میں اُس کا زوال ہے۔ امان اللہ سے خطاب کر کے مولانا روم کا شعر پڑھا کہ جو بھی اُمت ہلاک ہوئی، اُس نے چیزوں کو پہچاننے میں غلطی کی تھی:

ہر ہلاکِ امتّے پیشیں کہ بود　　　زانکہ بر جندل گماں بردند عود

اس کے بعد کہا کہ مصطفیٰ کمال پاشا نے جدّت کی راہ اختیار کی۔ اُصولی طور پر درست ہے۔ زندگی کا تقاضا تخلیق ہے۔ مگر جس طرح مشرقی روایت کی تقلید سے اس کی نفی ہوتی ہے، اُسی طرح مغرب کی نقالی سے بھی ہوتی ہے۔ ترکوں کے بارے میں یہی رائے ۷؍ جنوری کو مدراس میں خواتین کی انجمن کے سامنے بھی پیش کر چکے تھے۔ بعد میں یہ اشعار بیحد معمولی ردوبدل کے ساتھ مستقل تصنیف کا حصہ بنے۔ اگلی نسل نے غلط تشریح کر کے یہ سمجھا کہ علامہ نے مصطفیٰ کمال کی جدّت پسندی کے مقابلے پر قدامت پرستی کی حمایت کی۔ یہ غلط فہمی دُور ہو جاتی ہے اگر معلوم ہو کہ اشعار کا محرک یہ خیال تھا کہ قدامت پسند باغیوں کے خلاف روشن خیال مسلمان حکمرانوں کے ہاتھ مضبوط کیے جائیں۔ حتمی صورت میں اشعار کا مفہوم یوں ہے:

مصطفیٰ کمال جس نے تجدّد کا راگ الاپا۔ اُس نے کہا کہ پرانے نقش کو دھو ڈالنا چاہیے۔
ترکوں کے ساز میں کوئی نئی آواز نہیں ہے۔ ان کا نیا یورپ کے پرانے کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔
اُس کے سینے میں نئی سانس نہ تھی۔ اُس کے باطن میں نئی دنیا نہ تھی۔
ناچار پہلے سے موجود دنیا ہی کے سانچے میں ڈھل گیا۔ اس کی آنچ سے موم کی طرح پگھل گیا۔
کائنات کی بنیاد ہی تنوع پر ہے۔ زندگی کا خمیر نقّالی سے نہیں اُٹھا۔
جو زندہ دل ہے، نئے زمانوں اور دنیاؤں کا خالق ہے۔ تقلید سے اُس کی رُوح بے حضور ہو جاتی ہے!
اے امان اللہ! اگر تم حوصلہ رکھتے ہو تو اپنے باطن میں اور قران میں جھانک کر دیکھو۔

اُس کی آیات میں سیکڑوں نئی دنیائیں چھپی ہوئی ہیں۔ اُس کے لمحات میں زمانے لپٹے ہوئے ہیں۔
عصرِ حاضر کے لیے اُس کی ایک ہی دنیا کافی ہے۔ اُسے ڈھونڈ نکالو اگر تمہارے سینے میں حقیقت تک پہنچنے والا دل ہے۔
بندۂ مومن خدا کی آیات میں سے ہے۔ ہر دنیا اُس کے جسم پر لباس کی طرح ہے۔
جونہی ایک دنیا اُس کے جسم پر پرانی ہو جاتی ہے، قرآن اُسے ایک نئی دنیا عطا کر دیتا ہے۔[1]

۱۰ر فروری کے انقلاب میں 'خطاب بہ علمائے حق' پیش کی گئی۔ قدامت پسند باغیوں کے خلاف کھل کر اظہارِ خیال ہوا۔ علمائے حق سے ان کی شکایت کی:

دینِ حق، کفر سے زیادہ بدنام ہو گیا ہے۔ یہ اس لیے کہ ہمارا مُلّا ایسا مومن ہے جو کافر بناتا ہے۔
ہماری نگاہ میں اپنی شبنم سمندر ہے۔ اُس کی نگاہ سے ہمارا سمندر بھی شبنم ہو جاتا ہے۔
اس قرآن فروش کی چالبازیوں پر میں نے جبریلِ امیں کو فریاد کرتے دیکھا ہے۔
اُس کا دل آسمان کے اُس طرف سے بیگانہ ہے۔ اُس کے نزدیک قرآن ایک افسانہ ہے۔
وہ دینِ نبیؐ کی حکمت سے محروم رہا ہے۔ اُس کا اندھیرا آسمان ستاروں محروم ہے۔
نگاہ سے محروم، ذوق سے عاری، اِدھر اُدھر گھوم کر واہی تباہی بکنے والا! اُس کے مناظروں سے ملّت انتشار میں گرفتار!
امان اللہ پر کفر کا الزام لگا کر وہ اپنے ہی آشیانے کے لیے چنگاری بن گیا ہے۔
قوم جب عزت سے محروم ہو جائے تو اقتدار بھی کھو بیٹھتی ہے۔
فتنہ ہم سے نہیں، ہمارے ملّا سے ہے۔ یہ دیوانگی ہمارے دیوانگی پیدا کرنے والے سے ہے!

علمائے حق فیصلہ کریں، کیا امان اللہ کے خلاف خروج جائز ہے؟ آپ قرآن کے محافظ ہیں، سچائی کو ظاہر کیجیے۔ آپ کی فطرت نورِ مصطفیٰؐ سے روشن ہے، ہمیں ہمارے مقام سے آگاہ کیجیے۔ دنیا میں ہر کوئی منزل کی جانب رواں دواں ہے، سوائے مسلمانوں کے۔ دوسرے عیش کر رہے ہیں، ہم درد میں

[1] یہ ترجمہ ۳ر فروری کے انقلاب کے مطابق ہے۔ بعد میں اشعار معمولی ردوبدل کے ساتھ جاویدنامہ باب ۲ میں آئے۔

مبتلا ہیں۔ دوسروں کے شہر اور دیہات جنت کا نمونہ ہیں، ہمارے بدحال ہیں۔ وہ اخوّت کا سامان کر رہے ہیں اور ہمارے یہاں بھائی، بھائی سے لڑ رہا ہے۔ ہم قرآن رکھتے ہوئے بھی بے ذوق ہیں، اس سے زیادہ تعجب کا مقام اور کیا ہو گا![1]

فرقہ وارانہ فسادات سے متاثر ہونے والوں کے لیے جو چندہ جمع ہوا تھا، لاہور ریلیف کمیٹی کی تحویل میں تھا۔ ۱۰ر فروری کو علامہ کے گھر میٹنگ بلانے کی تجویز ہوئی۔ میاں عبدالعزیز سے شرکت کی درخواست کرتے ہوئے علامہ نے انہیں ۷ر اور ۹ر فروری کو دو خطوط لکھے۔[2]

۱۱ر فروری کو روم میں پوپ پائیس یازدہم (Pious XI) کے محل میں پوپ اور مسولینی کے درمیان معاہدہ ہوا۔ شہر میں ویٹی کین (Vatican) کا ایک سو دس ایکڑ علاقہ خود مختار ریاست ٹھہرا۔ پوپ کے تابع تھی۔ اٹلی کا قانون لاگو نہ ہوتا۔ اٹلی میں ریاست اور کلیسا کے درمیان پرانے جھگڑے کا فیصلہ ہو گیا۔ پوپ نے کہا کہ مسولینی کو تقدیر نے بھیجا ہے۔

۱۷ر فروری کے انقلاب نے افغانستان پر علامہ کی تیسری نظم 'خطاب بہ اقوامِ شرق' پیش کی۔ علامہ نے مشرق کی اقوام کے سامنے چار نکات پیش کیے تھے:

۱ ساری تب و تاب دل ہی کی بدولت ہے۔ دل تندرست ہو تو جسم بھی تندرست رہتا ہے۔ دل کی بیماری پورے بدن کو متاثر کرتی ہے۔

۲ ایشیا بھی ایک جسم ہے۔ شہر کابل اُس میں دل ہے۔ اُس کی خرابی سارے ایشیا کی خرابی ہے۔ اُس کی صحت سارے ایشیا کی صحت ہے۔ اگر کابل غلام ہو جائے تو ایشیا آزاد نہیں رہ سکتا— جسم صرف اُس وقت تک آزاد ہے جب تک دل آزاد ہے۔

۳ ''امان اللہ'' کا دامن تھام لو۔ وہ جوانمرد ہے، راستے سے باخبر ہے۔ اُس کی روشنی مشرق کے سورج ہی سے آئی ہے۔ اُس کا رنگ و آب مشرق سے ہے۔ مشرق کو متحد ہونے کی ضرورت

---

[1] یہ ترجمہ اور تلخیص ۳ر فروری کے انقلاب کے مطابق ہے۔

[2] مکاتیبِ اقبال بنام میاں عبدالعزیز ۷ر اور ۹ر فروری ۱۹۲۹ء؛ برنی (۱۹۹۳)، ص ۵۳-۵۲

ہے۔ مشرق کی روح اقوامِ مشرق میں اتفاق نہ ہونے کی وجہ سے مر گئی ہے۔ قوموں کے درمیان جدائی آدمیّت کا زوال ہے۔ قوموں کا وصال آدمیّت کا عروج ہے۔ زبورِ عجم میں کہا تھا، "انقلاب، انقلاب، اے انقلاب!" یہاں لکھا، "اتفاق، اے اتفاق، اے اتفاق!"

۴ مغرب کے پاس عقل ہے اور مشرق کے پاس عشق ہے۔ عشق اور عقل کے امتزاج سے ایک نئی دنیا تخلیق کی جاسکتی ہے، لیکن مغرب کے شعلے پر پانی پڑ چکا ہے۔ اُن کے آسمان تلے کوئی نئی دنیا نہیں رہی۔ اب زندگی تمہاری ہی آگ کے سوز و ساز سے ہے۔ ایک نئی دنیا تخلیق کرنا اب تمہارا کام ہے۔ تم اب تک خدا کو دیکھتے رہے ہو، ذرا اپنے آپ کو بھی دیکھو! قطرے میں سمندر کو دیکھنا سیکھو![1]

جنوبی ہند کے عبدالجمیل منگلوری نے تصویری کارڈ بھیجے۔ ۱۸/ فروری کو علامہ نے شکریے کا خط لکھا۔[2]

۱۹/ فروری کے انقلاب میں عبداللہ چغتائی کی نوٹ کی ہوئی علامہ کی تقریر چھپی۔ ۷/ جنوری کو مدراس میں انجمن خواتین کے سپاسنامے کے جواب میں دی گئی تھی۔ علامہ اشاعت سے پہلے نہ دیکھ سکے ہوں گے۔ "افسوس ہے کہ جن صاحب نے تقریر مذکور کے نوٹ لیے اُن سے بعض ضروری باتیں چھوٹ گئیں،" مدیر انقلاب کے نام خط میں لکھا۔ دو غلطیوں کی تصحیح کی۔[3]

۲۰/ فروری کو لاہور میں نومسلم انگریز ڈیوڈ اِپسن انتقال کر گئے۔[4]

۲۴/ فروری کو برکت علی مسلم ہال میں اجتماع ہوا۔ علامہ اقبال، میاں سر محمد شفیع، شیخ صادق حسین امرتسری، ڈاکٹر مرزا یعقوب اور دوسرے اکابر موجود تھے۔ افغانستان کی مدد کرنے کے لیے کمیٹی بنائی جانا تھی۔ گزشتہ روز زمیندار اور مسلم آؤٹ لُک کی طرف سے بھی ایسی ہی ایک کمیٹی کا

---

[1] انقلاب ۱۷/ فروری ۱۹۲۹ء۔ پہلے دونوں بند جاویدنامہ میں ابدالی کے مکالمے میں آئے مگر "شہرِ کابل" کے بجائے "ملّتِ افغانیہ" کر دیا۔

[2] مکتوب بنام عبدالجمیل بنگلوری ۱۸/ فروری ۱۹۲۹ء محولہ بالا

[3] انقلاب ۲۰/ فروری ۱۹۲۹ء؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتار اقبال، ص

[4] عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۴۴۱

اعلان ہو چکا تھا۔ ''آج ایک نئی کمیٹی کا اعلان کر دیا جائے تو اندیشہ ہے کہ تفرقہ پیدا ہو جائے گا،'' میاں شفیع نے کہا۔ طے پایا کہ جو کمیٹی بن چکی ہے اس کے ساتھ صلاح مشورہ کیا جائے۔ اس کے لیے کمیٹی بنائی گئی۔ میاں شفیع، علامہ اقبال، ڈاکٹر مرزا یعقوب، شیخ محمد صادق حسن، سید حبیب شاہ، حاجی میر شمس الدین اور مولانا غلام مرشد شامل تھے۔[1]

۲۵؍ فروری کو لاہور میں پنجاب کونسل کے بجٹ سیشن کا آغاز ہوا۔ فنانس ممبر اے ایم اسٹو (A. M. Stow) نے بجٹ پیش کیا۔[2] عام بحث کا آغاز نہ ہوا۔ گھنٹے بھر میں اجلاس ختم ہو گیا۔ انقلاب کے مطابق بجٹ کے اہم نکات یوں تھے:

- تخمینہ آمدنی: گیارہ کروڑ پچاس لاکھ روپے؛ تخمینہ خرچ: گیارہ کروڑ اُنیس لاکھ روپے؛ تخمینہ بچت: اکتیس لاکھ روپے
- جدید مصارف کے لیے اکسٹھ لاکھ روپے کی رقم رکھی گئی۔ بعض اہم دفعات: تعلیم بارہ لاکھ؛ زراعت پانچ لاکھ؛ صنعت و حرفت ایک لاکھ؛ تعمیرات اور سڑکیں نو لاکھ۔
- رفاہِ عامہ کے بعض کاموں کی کیفیت یوں تھی کہ تعلیمات: ۲۷-۱۹۲۶ء میں خرچ ایک کروڑ ۳۷ لاکھ؛ ۳۰-۱۹۲۹ء میں مجوزہ ایک کروڑ ۶۷ لاکھ۔ طبابت: ۲۷-۱۹۲۶ء میں خرچ ۳۶ لاکھ؛ ۳۰-۱۹۲۹ء میں مجوزہ ۵۴ لاکھ۔ ایک سو ساٹھ نئے ہسپتال کھولے گئے؛ صحتِ عامہ کے ۱۹ فیصدی خرچ کی ترقی ہوئی؛ بعض شہروں میں آب رسانی کی اسکیمیں بنیں؛ بعض شہروں میں نکاسئ آب کی اسکیمیں بنیں۔ زراعت کے خرچ میں ۳۴ فیصدی ترقی ہوئی؛ دیہاتی بنک ۱۹۲۶ء میں ۱۴۵۷۷ تھے اور ۳۰-۱۹۲۹ء میں ۱۸۵۵۸
- تجویز تھی کہ حکومتِ ہند سے ایک کروڑ چالیس لاکھ روپے قرض لیا جائے۔[3]

---

[1] حمزہ فاروقی، اقبال کا سیاسی سفر، ص ۷۶-۱۷۴

[2] Mitra *The Indian Quarterly Register Jan.-June 1929,* p.316

[3] انقلاب ۲۸؍ فروری ۱۹۲۹ء؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۳۶-۱۳۵

۲۶، ۲۷/ اور ۲۸/ فروری کو بھی پنجاب کونسل کا اجلاس ہوا۔[1] ۲۶/ فروری کو ٹریبیون کے نمایندے نے ملاقات کی۔ علامہ نے افغانستان کے حالات پر تبصرہ کرنے کے بعد (غالباً انگریزی میں) کہا:

> اس امر کے یقینی ہونے میں کوئی شبہ نہیں کہ عالم اسلام میں قدامت پسندانہ جذبات اور لبرل خیالات میں جنگ شروع ہو گئی ہے۔ اغلب ہے کہ قدامت پرست اسلام بغیر جدوجہد کے سرِ تسلیم خم نہیں کرے گا۔ اس لیے ہر ایک ملک کے مسلم مصلحین کو چاہیے کہ نہ صرف اسلام کی حقیقی روایات کو غور کی نگاہ سے دیکھیں، بلکہ جدید تہذیب کی صحیح اندرونی تصویر کا بھی احتیاط سے مطالعہ کریں، جو بے شمار حالتوں میں اسلامی تہذیب کی مزید ترقی کا درجہ رکھتی ہے۔ جو چیزیں غیر ضروری ہیں ان کو ملتوی کر دینا چاہیے۔ کیونکہ صرف ضروری چیزیں فی الحقیقت قابل لحاظ ہیں۔ یہ امر صحیح نہیں ہے کہ مجلسی معاملات میں قدامت پسندانہ طاقتوں کو بالکل نظر انداز کر دیا جائے، کیونکہ انسانی زندگی اپنی اصلی روایات کا بوجھ کندھوں پر اٹھا کر منزل ارتقا طے کرتی ہے۔ انسان نے اپنی معاشرتی تہذیب کو تشکیل دینے کا سبق حال ہی میں سیکھا ہے، اس لیے جائز حدود سے تجاوز نہیں کرنا چاہیے۔[2]

2

لاہور کی اَندھیری رات میں سردی عروج پر تھی جب زلزلہ آیا۔ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی کے کھڑکیاں دروازے زور سے بج اُٹھے۔ چھت سے مٹی گرنے لگی۔ سردار بیگم سوئے ہوئے جاوید کو اُٹھا کر صحن کی طرف دوڑیں۔ وسیمہ بھی پیچھے پیچھے گئیں۔ بوڑھی ملازمہ شور مچاتی رہی، ''بیگم صاحبہ، بیٹھ جایئے! بھاگیے نہیں!'' وسیمہ کا بیان ہے کہ صحن میں پہنچ کر سردار بیگم بیہوش ہو گئیں۔ دُوسرے کمرے سے وسیمہ کے چھوٹے بھائی مختار آ چکے تھے۔ چچی کو سنبھالا۔ وسیمہ نے جاوید کو اُن کی آغوش سے نکالا۔

---

[1] Mitra *The Indian Quarterly Register Jan.-June 1929,* pp.316-317

[2] انقلاب یکم مارچ ۱۹۲۹ء؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتار اقبال، ص ۸۶-۸۴

علامہ بھی شور سن کر وہیں آ گئے تھے۔ سردار بیگم بیہوشی کی حالت میں اندر لے جائی گئیں۔ ڈاکٹر بلوایا گیا۔ کافی دیر بعد ہوش آیا۔ علامہ نے مختار سے کہا کہ صبح سیالکوٹ تار دے دیا جائے تو پھر گھبرا گئیں۔ علامہ نے تسلی دی کہ سیالکوٹ والوں کی خیریت معلوم کرنی ہے۔ وسیمہ کہتی ہیں کہ اس کے بعد علامہ نے سردار بیگم کے دل کو تقویت پہنچانے کے خیال سے یا حیّ یا قیوم کا وِرد شروع کر دیا۔ آواز بلند تھی، سارا کمرہ گونجنے لگا۔ وہ گھبرا گئیں اور آہستہ سے وسیمہ سے کہا، ''میرے دل کو کچھ ہو رہا ہے، اِن کو خاموش کراؤ۔'' علامہ کو خود ہی احساس ہوا۔ ہنس کر کہا، ''اوہو پھر ڈر گئی ہو، میں تو تمہارے دِل کو تقویت پہنچانے کے لیے ذکرِ الٰہی کر رہا تھا۔'' کچھ دیر خاموش رہ کر دل بہلانے کے لیے دوسری باتیں شروع کیں۔ افغانستان کے تازہ حالات سناتے رہے۔[1]

''کبھی کبھار اقبال کی بہنوں زینت بی یا کریم بی میں سے کوئی ایک بھی آ جاتیں اور یہیں ٹھہرتیں،'' جاوید نے بڑے ہو کر بچپن کے مشاہدات بیان کیے، ''اس دور میں راقم نے اقبال کے ہاں رشتے داروں کے علاوہ صرف دو مہمان مختار احمد والے مہمان خانے میں ٹھہرتے ہوئے دیکھے۔''

ان میں سے ایک ''جنوبی ہند کے کوئی سر اور ڈاڑھی منڈے سوامی جی تھے جو کبھی کبھار لاہور آتے اور یہیں ٹھہرتے۔ وہ ہمیشہ ننگے پاؤں رہتے اور ہلکے کیسری رنگ کا کھدر کا چولا پہنتے جس کے اندر چمڑے کی ایک پیٹی میں اپنی رقم محفوظ رکھتے تھے۔''[2] وسیمہ مبارک سے روایت ہے کہ علامہ نے لنگوٹی باندھ کر قیمتی دھسا اوڑھے رکھتے۔ کبھی کبھی گیروے رنگ کے کپڑے پہنتے۔ علامہ کی خاص ہدایت تھی کہ جو شخص گوشت والی ہنڈیا پکا رہا، سوامی کے برتنوں کو ہاتھ نہ لگائے۔ وسیمہ کی بڑی بہن عنایت سوامی جی کے کھانے میں گوشت کے سالن والا چمچ چلا کر کہتیں، ''بڑا آیا گوشت سے پرہیز کرنے والا۔ اب تو کھائے گا ناں! رہنا مسلمانوں کے ہاں اور کرنا گوشت سے پرہیز—ہونہہ!''[3]

---

[1] خالد نظیر صوفی، اقبال درونِ خانہ، ص ۷۵-۷۳۔ مصنف نے اپنی والدہ وسیمہ مبارک سے روایت کیا۔

[2] ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۴)، زندہ رود، ص ۳۶۳

[3] خالد نظیر صوفی، اقبال درونِ خانہ، ص ۷۲

ممتاز حسن کہتے ہیں کہ ایک روز سوامی کچھ دیر کے لیے اُٹھے تو ممتاز نے اُن کے بارے میں علامہ سے دریافت کیا۔ علامہ نے کہا کہ پرانے دوست ہیں، ہر سال ملنے آتے ہیں۔ بڑے بڑے مہاراجے ان کے چیلے ہیں۔ ممتاز نے نام پوچھا تو کہا، "نام تو مجھے یاد نہیں۔" سوامی نے واپس آکر فلسفیانہ گفتگو چھیڑی اور پوچھا، "کوی جی! کیا روشنی اور اندھیرا اکٹھے ہو سکتے ہیں؟" علامہ نے جواب دیا "ہاں۔" سوامی نے حیرت سے پوچھا کہ کیسے۔ علامہ نے انگریزی میں کہا، "وقت میں۔"[1]

دوسرے مہمان کے بارے میں جاوید کہتے ہیں:

> ایک جرمن تھا جو جغرافیائی نقشہ جات بنانے میں ماہر تھا اور جس نے ۱۹۲۹ء میں اقبال کی فرمائش پر انہیں برصغیر کی اس وقت کی مردم شماری کی رپورٹ کے مطابق، ہندو مسلم آبادی کے تناسب سے، ہندوستان اور اس کے مختلف صوبوں کے نقشے تیار کر کے دیئے۔ راقم نے اپنے بچپن میں یہ نقشے گھر میں بکھرے ہوئے دیکھے ہیں، لیکن بعد میں ضائع ہو گئے۔ راقم کی یاد داشت کے مطابق ان نقشوں میں آبادی نقطوں کی صورت میں ظاہر کی گئی تھی۔ ہندو اور مسلم آبادی کی شناخت کے لیے یہ نقطے کیسری اور سبز رنگوں کی روشنائی سے بنائے گئے تھے۔[2]

3

"آغاز مارچ ۲۹ء"۔ جاویدنامہ کی بیاض کے ایک صفحے پر یہ الفاظ ملتے ہیں۔ وہاں ترکی کے شہید وزیراعظم سعید حلیم پاشا کی زبانی تہذیبِ قرآنی کے چار اُصول بیان کروائے گئے ہیں: خلافتِ آدم، الحکم للہ، الارض للہ، ومن یوت الحکمہ فقد اوتی خیرا کثیرا۔ ہر اُصول کی تشریح کی جا رہی ہے۔ ایک صفحے پر جمال الدین افغانی بھی اسی موضوع پر خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ وہ سعید حلیم پاشا کے مرشد تھے۔ یوں لگتا ہے کہ اسی دوران اچانک ابلیس آ گیا۔ افغانی والے صفحے کے دوسرے حصے پر ابلیس کے

---

[1] فقیر سید وحید الدین (بلا تاریخ) روزگارِ فقیر، جلد دوم، ص ۱۰۴

[2] ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۴)، زندہ رود، ص ۴۰۲، ۳۶۳

بارے میں ایک طویل بیان ہے، "بوڑھا، نہایت سنجیدہ، کم بولنے والا۔ اُس کی آنکھ بدن میں روح کو دیکھ لینے والی۔ رِند بھی، ملاّ بھی، فلسفی بھی اور صوفی بھی۔ عمل میں مجاہدے کرنے والے عبادت گزاروں جیسا۔" ان سے مخاطب ہو کر کہتا ہے:

میں نے اپنے شر کو فاش کر دیا اور تمہیں یہ ذوق دے دیا کہ تم اسے چھوڑ دو یا اپنا لو۔
تم مجھے میری آگ سے رہائی دلواؤ۔ اے انسان! میری مشکل آسان کر دو۔
اے کہ تم میرے پھندے میں گرفتار ہو۔ تم نے شیطان کو گناہ کی چھوٹ دے رکھی ہے۔
دنیا میں جواں ہمتی کے ساتھ جیو۔ میرے غمگسار! مجھ سے منہ پھیر کر زندگی گزارو۔
میرے زہر اور شہد سے بے نیاز ہو کر عمر کاٹ دو تاکہ میرا نامۂ اعمال مزید سیاہ نہ ہو۔
دنیا میں شکار ہیں تو شکاری ہے۔ جب تک تم شکار ہونے پر راضی ہو، میرا ترکش تیروں سے بھرا ہے۔
اُڑنے والا گرتا نہیں۔ اگر شکار سمجھدار ہو جائے تو شکاری نہ رہے۔[1]

زشتیٔ خود را نمودم آشکار	با تو دارم ذوقِ ترک و اختیار
در کنارِ خویش پروردم ترا	آشنا از حریت کردم ترا
تو نجاتے دہ مرا از نارِ من	وا کن اے آدم گرہ از کارِ من
اے کہ اندر بندِ من افتادۂ	رخصتِ عصیاں بشیطاں دادۂ
در جہاں با ہمتِ مردانہ زی	غمگسارِ من! زمن بیگانہ زی
بے نیاز از نیش و نوشِ من گذر	تا نہ گردد نامہ ام تاریک تر
در جہاں صیاد با نخچیر ہاست	تا تو نخچیری بکشیم تیرہاست
صاحبِ پرواز را افتاد نیست	صید اگر زیرک شود صیاد نیست

[1] بیاض جاوید نامہ۔ ان اشعار کے کنارے پر مزید شعر لکھے گئے ہیں جو بالآخر مسودے میں شامل ہوئے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ ذرا بعد میں لکھے گئے۔ ترجمہ از احمد جاوید۔ کسی قدر ترمیم کے ساتھ۔

یہ ظاہر ہے کہ ابلیس کو کسی آیندہ باب کے لیے علیحدہ رکھ لیا گیا۔ افغانی کی زبانی مسلمانوں سے خطاب کروایا کہ خدا کا دین، کفر سے زیادہ بدنام ہو گیا ہے۔ یہاں بہت سے ایسے اشعار نقل ہوئے جو انقلاب ۱۰/ فروری میں 'خطاب بہ علمائے حق' میں شائع ہوئے تھے۔ اس شعر کا اضافہ ہوا کہ کافر کا دین جہاد کی فکر و تدبیر ہے اور مومن نے خدا کے نام پر فساد کرنے کو دین بنالیا ہے:

دینِ کافر فکر و تدبیرِ جہاد　　　دینِ مومن فی سبیل اللہ فساد

بعد میں کبھی آخری مصرعہ بدل کر یوں ہونے والا تھا کہ ملّا نے خدا کے نام پر فساد کو دین بنالیا ہے:

دینِ ملّا فی سبیل للہ فساد

ان کے بعد سعید حلیم پاشا کی طرف سے ایک بیان لکھا گیا ہے۔ انقلاب کی ۳/ فروری والی 'افغان و اَمان' اور ۱۷/ فروری والی 'خطاب بہ اقوامِ شرق' کے بہت سے اشعار یہاں نقل ہوئے۔ جہاں لکھا تھا کہ ایک نئی دنیا تخلیق کرنا اب تمہارا کام ہے، وہاں لکیر کھینچ کر صفحے کے خالی حصے کی طرف اشارہ کیا۔ اُس حصے میں وہ اشعار لکھ دیے جو پہلے کبھی کہے تھے:

ایک دنیا جو ابھی ہمارے سینے میں گم ہے۔ ایک دنیا جو ابھی قُم کے انتظار میں ہے۔
ایک دنیا جہاں رنگ و نسل کی تفریق نہیں! اُس کی شام فرنگ کی صبح سے زیادہ روشن!
ایک دُنیا بادشاہوں اور غلاموں سے پاک! مومن کے دل کی طرح بیکراں!
ایک حسین دنیا کہ ایک نگاہ کے فیض نے اُس کا بیج حضرت عمر فاروقؓ کی روح میں بویا تھا!
میں نے اُسے ستاروں کی طرح چمکتے دیکھا۔ میں نے اُسے لامکاں کے باطن سے جھانکتے دیکھا۔

عالمے در سینۂ من گم ہنوز　　　عالمے در انتظارِ قُم ہنوز
عالمے بے امتیازِ خون و رنگ　　　شامِ او روشن تر از صبحِ فرنگ
عالمے پاک از سلاطین و عبید　　　چوں دلِ مومن کرانش ناپدید
عالمے رعنا کہ فیضِ یک نظر　　　تخمِ او افگند در جانِ عمرؓ
صورتِ انجم درخشاں دیدمش　　　از ضمیرِ لامکاں دزدیدمش

یہ اشعار پرانی بیاض سے یہاں آئے تھے۔ وہاں 'مثنوی حصہ سویم' کی 'تمہید' میں لکھے گئے تھے، جس کا موضوع یہ تھا کہ ملّتِ اسلامیہ "کیا کیا واقعات و حوادث آیندہ صدیوں میں دیکھنے والی ہے اور بالآخر ان سب واقعات کا مقصود و غایت کیا ہے۔"[1]

4

بیرسٹر محمد وسیم علامہ کے کیمبرج کے زمانے کے دوست تھے۔ لکھنؤ میں رہتے تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی شیخ محمد مجیب آکسفورڈ سے بی اے کر کے جرمنی گئے۔ ادب، سیاست، فلسفہ اور جرمن، فرانسیسی اور روسی زبانوں کے علاوہ طباعت کا فن سیکھا۔ دو برس پہلے واپس آ کر جامعہ ملیہ دہلی میں اُستاد ہوئے تھے۔ جامعہ کے مطبع کا انتظام ان کے سپرد ہوا۔ خواہش تھی کہ مطبع ویسی ہی خدمات انجام دے جیسی مغربی یونیورسٹیوں سے منسلک مطابع انجام دیتے ہیں۔ ان میں آکسفورڈ یونیورسٹی پریس خاص شہرت رکھتا ہے۔ انہی دنوں پیامِ مشرق کی تلاش ہوئی۔ بازار میں ختم ہو چکا تھا۔ سید نذیر نیازی سے معلوم ہوا کہ علامہ اُس کے تیسرے ایڈیشن کی تیاری کر رہے ہیں۔ مجیب نے تجویز پیش کی کہ علامہ کی تصنیفات کیوں نہ مطبع جامعہ میں طبع ہوں۔ نذیر نے خط لکھ کر علامہ سے ملاقات کی اجازت چاہی۔ انہوں نے دونوں کو لاہور آنے کی دعوت دی۔[2]

مارچ کے آغاز میں سید نذیر نیازی اور مجیب لاہور پہنچے۔ نذیر کے مطابق صبح سے دوپہر اور سہ پہر سے شام تک مختلف مباحث پر گفتگو ہوئی۔ پیامِ مشرق کے نئے ایڈیشن کے متعلق علامہ نے کہا، "کاپیاں لکھی جارہی ہیں۔ چند دنوں تک بھیج دی جائیں گی۔ مطبع جامعہ کی طرف سے البتہ باضابطہ تحریر آجانی چاہیے۔" نذیر اور مجیب اُسی شام دہلی روانہ ہو گئے۔[3] مجیب کے بیان میں اُسی شام دہلی واپس جانے کا ذکر نہیں ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اگلے دو تین روز میں کئی دفعہ علامہ کے پاس آئے۔ محسوس کیا کہ

---

[1] دیکھیے ۱۷ر سے ۲۷ر ستمبر ۱۹۲۳ء کے واقعات

[2] سید نذیر نیازی (۱۹۵۷) مکتوباتِ اقبال بنام سید نذیر نیازی

[3] سید نذیر نیازی (۱۹۵۷) مکتوباتِ اقبال بنام سید نذیر نیازی

علامہ "تخیل اور ہمت کی اس پستی سے بیزار تھے جو تعلیم یافتہ مسلمانوں کو صنعت اور کاروبار، سائنس اور تجارت کے میدانوں میں قدم رکھنے سے روکتی ہے، اور اُنہیں تاریخ اور ادب کی کتابیں چاٹنے کے سوااور کسی لائق نہیں چھوڑتی۔" یہ بات پسند آئی کہ مجیب نے جرمنی جاکر پریس کا کام سیکھا تھا۔[1]

5

نیرنگ رامپور کا مارچ کا شمارہ، جلد ۵، شمارہ ۳، خاص نمبر تھا۔ ڈی سی ورمن مدراسی نے علامہ کے پہلے خطبے کے دوران جو نوٹ لیے تھے، 'علم اور احساسِ مذہب' کے عنوان سے شائع ہوئے۔[2]

۴؍مارچ کو لاہور میں پنجاب کونسل میں بجٹ پر عام بحث ہوئی۔ علامہ نے تقریر کی:

۱ پانچ برس کی لگاتار خوشحالی کے بعد پہلی دفعہ خسارے کا بجٹ پیش کیا جارہا تھا۔ اِس دفعہ مرکزی حکومت نے مدد نہیں دی تھی۔

۲ فائدہ صرف ایکسائز اور اسٹامپ کی مد میں کچھ اضافہ ہوا ہے۔ یہ تشفی کی نہیں بلکہ تشویش کی بات ہونی چاہیے کیونکہ ایکسائز ڈیوٹی زیادہ تر شراب کی فروخت سے حاصل ہوتی تھی۔ اسٹامپ کی آمدنی مقدمے بازی کی فیس پر مشتمل تھی!

۳ اضافی اخراجات صرف آب پاشی اور جیل خانے کی مد میں ہوئے تھے۔ آب پاشی کے اخراجات سیلاب کی وجہ سے بڑھے تھے۔ وہ قدرتی آفات میں سے تھے۔ مگر جرائم کی روک تھام انسان کے بس میں ہے۔ جیلوں کے اخراجات بڑھنا ظاہر کرتا تھا کہ قیدیوں کی تعداد میں اضافہ ہوا ہے اور خوراک کی قیمتوں میں بھی (جو ظاہر ہے کہ قیدیوں کو حکومت کی طرف سے فراہم کی جاتی تھی)۔ موجودہ قوانین ناقص تھے۔ ان کے تحت دس روپے کے مویشی چرانے پر دو برس کی قید ہو جاتی تھی۔

۴ تعلیم کی مد میں حکومت نے جو اِمداد فراہم کی تھی اُس کا بہت ہی کم حصہ مسلمانوں کے

---

[1] محمد مجیب (۱۹۴۴) 'ڈاکٹر اقبال'ص ۹۴-۹۱؛ غلطی سے ملاقات کا وقت مارچ ۱۹۲۹ء کے بجائے مارچ ۱۹۲۸ء لکھا ہے۔
[2] کلب علی خاں فائق (۱۹۸۶) 'علم اور احساسِ مذہب'، ص ۲۴۶

اداروں کو ملا تھا جبکہ یہی حکومت کی امداد کے زیادہ مستحق تھے۔

۵ صوبہ مقروض ہو چکا ہے۔ اب مرکزی حکومت سے مزید قرضہ لینے کی تجویز پیش ہوئی ہے۔ اس طرح صوبہ مستقل طور پر مقروض ہو جائے گا۔ مزید قرض سے بچنے کی تدابیر اختیار کرنی چاہئیں: مرکزی حکومت سے درخواست کی جائے کہ اِنکم ٹیکس صوبے کے سپرد کر دیا جائے۔ ورثے پر ٹیکس لگایا جائے جیسا کہ انگلستان میں ہوتا ہے؛ کسی کو بڑی جائیداد (مثلاً بیس ہزار، تیس ہزار یا اِس سے زیادہ کی) ملے تو وہ ٹیکس ادا کرے۔ بھاری تنخواہوں میں کمی کی جائے۔ مشینری سستی مارکیٹوں سے خریدی جائے۔[1]

۶، ۷، ۸، ۱۸، ۱۹، ۲۱/ اور ۲۲/ مارچ کو بھی اجلاس ہوئے۔

۲۷/ مارچ کے انقلاب میں اٹھارہ مسلمانوں کی طرف سے اپیل شائع ہوئی، "اِس وقت ہمارا ملک اور مذہب جن مشکلات سے گزر رہا ہے اُن کا بہترین حل یہ ہے کہ ہم اُن اخلاق و اعمال کی اشاعت کریں ن کا نمونہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات سے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔" ۱۲/ ربیع الاول کے جلسوں کو وسعت دینے اور منظم کرنے کی تجویز پیش کی گئی۔ ایک تقریر تیار کی جائے جس میں آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے بہت ضروری اور منتخب واقعات ہوں۔ ہندوستان کی مختلف زبانوں میں ترجمہ ہو۔ تمام اسلامی مجالس اور اخبارات اسے ۱۲/ ربیع الاول کو ملک کے گوشے گوشے میں پہنچا دیں۔ سیرت کمیٹیوں کے قیام کی اطلاع قاضی عبدالمجید قرشی دفتر اخبار ایمان لاہور بھیجی جائے۔ اُردو، ہندی اور انگریزی میں تقریر تیار تھی۔ قاضی عبدالمجید کو پیشگی قیمت بھیج کر منگوائی جا سکتی تھی: ایک روپیہ کی تیس یا تیس روپے کی ہزار۔ اپیل پر دستخط کرنے والوں میں علامہ اقبال کے ساتھ آغا مرزا محمد خلیل شیرازی قونصل ایران، مولانا شوکت علی، سیٹھ عبدالمجید حسن، حاجی عبدالرزاق، مولانا محمد عرفان، سر ابراہیم ہارون جعفر، خان بہادر محمد عبدالعزیز بادشاہ، ڈاکٹر ذاکر حسین، محمد شفیع داؤدی، حاجی عبدالکریم، مولانا غلام رسول مہر، نواب حسام الملک محمد علی

---

[1] Latif Ahmad Sherwani (1977), *Speeches, Writings and Statements of Iqbal*

حسن خاں، حاجی عبدالحکیم، حاجی ایم جمال محمد، حاجی سیٹھ عبداللہ ہارون، مولانا مظہر الحق اور مولانا سید حبیب شامل تھے۔[1]

۲۷/ اور ۲۸/ مارچ کو پنجاب کونسل کے اجلاس ہوئے۔ پھر غیر معینہ طور پر برخاست ہوئی۔[2]

6

محمد علی جناح تیار تھے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے دونوں گروپ متحد ہو جائیں۔ مسلم کانفرنس کی قرارداد کو چودہ نکات میں ڈھالا۔ پیش کرنے کے لیے مارچ میں لیگ کا مشترکہ اجلاس دہلی میں بلوایا۔ علامہ اقبال، ملک فیروز خاں نون اور شیخ عبدالقادر نے کھلا خط لکھا کہ اجلاس ملتوی کر دیں۔ نہ ہوا۔ شفیع پارٹی کے نمایندے بھی دہلی پہنچے۔ علامہ، نون اور عبدالقادر شامل تھے۔

ڈاکٹر سیف الدین کچلو نے اجلاسِ دہلی میں اپنی پسند کے ارکان بھر لیے۔ شفیع پارٹی نے اپنے ارکان کے نام پیش کیے تو صاف انکار کر دیا۔ لائل پور کی شاخ کے صدر ملک فضل حسین اور اُن کے ساتھی حکیم نورالدین خاص دعوت پر آئے تھے۔ مسترد ہوئے۔ کچلو نے تجویز پیش کی کہ شفیع پارٹی کے کچھ ارکان کے نام ابھی تک جناح پارٹی کی فہرست میں موجود ہیں۔ انہیں اجلاس میں شامل ہونے کی اجازت دی جائے۔ ایسے لوگوں کی تعداد کم تھی۔ انہیں بھی کہا گیا کہ صرف اُتنے ہی لوگ آسکتے ہیں جتنی نشستیں خالی رہ گئی ہوں۔

علامہ اور اُن کے ساتھیوں نے سمجھا کہ یہ حربے اس لیے ہیں کہ نہرو رپورٹ کی تائید میں قرارداد منظور کروائی جائے۔ شفیع پارٹی کی موجودگی رکاوٹ بنتی۔ اجلاس میں نہ گئے کہ تصادم نہ ہو۔ اجازت دے دی کہ جس کا نام جناح پارٹی کی فہرست میں باقی ہو، انفرادی حیثیت میں وہاں جائے۔[3]

۲۸/ مارچ کو جلسہ شروع ہوا۔ باسٹھ ارکان اُٹھ کر چلے گئے۔ مولانا شفیع داؤدی، مولانا محمد علی

---

[1] نقوش اقبال نمبر جلد ا، ۱۹۷۷ء

[2] Mitra *The Indian Quarterly Register Jan.-June 1929,* p.322

[3] انقلاب ۱۰/ اپریل ۱۹۲۹ء؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتار اقبال، ص ۹۱-۸۷

[جوہر]، مولانا شوکت علی، مولوی یعقوب اور نواب اسماعیل خان شامل تھے۔ واپس نہ بلائے گئے۔

۲۹ مارچ کو ڈاکٹر کچلو کے ساتھیوں نے کھلا اجلاس لیگ کے مستقل صدر یعنی جناح کا انتظار کیے بغیر شروع کر دیا۔ جناح اُس وقت روٹھے ہوئے ارکان سے گفت و شنید کر رہے تھے۔ جلسے میں ڈاکٹر عالم کو عارضی طور پر صدر بنایا گیا۔ پھر جو کچھ ہوا وہ کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔

- بعض لوگوں نے کہا کہ ڈاکٹر عالم کی صدارت کی تجویز پر اتنا شور مچا کہ نہرو رپورٹ کی تائید والی قرارداد پر بحث نہ ہو سکی۔
- ڈاکٹر عالم کا بیان تھا کہ قرارداد پیش ہوئی۔ تائید کی گئی۔ بغیر تقریروں کے اُس کی منظوری کا اعلان کیا گیا۔
- محمد صادق ممبر لیجلسیٹو اسمبلی کا کہنا تھا کہ انہوں نے بے قاعدگی کی طرف صدر کی توجہ دلوائی۔ قرارداد میں ترمیم کی اجازت لی۔ پیش نہ کر پائے تھے کہ اجلاس ملتوی ہو گیا۔
- جناح کا کہنا تھا کہ اجلاس میں پہنچ کر خود ڈاکٹر کچلو سے سنا کہ قرارداد منظور نہیں ہوئی۔ اُس وقت ڈاکٹر عالم نے بھی اِس بات کو تسلیم کرنے سے انکار نہ کیا۔

علامہ، نون یا عبدالقادر موجود نہ تھے۔ پھر بھی متفق تھے کہ جناح غلط بیانی نہیں کر سکتے۔ اُنہی کے بیان کو حقیقت پر مبنی سمجھا جائے۔[1] اُس روز جناح چودہ نکات پیش نہ کر سکے۔ جلد ہی شائع کر دیئے:

1. The form of the future constitution should be federal with the residuary powers vested in the provinces.
2. A uniform measure of autonomy shall be granted to all provinces.
3. All legislatures in the country and other elected bodies shall be constituted on the definite principle of adequate and effective representation of minorities in every province without reducing the majority in any province to a minority or even equality.
4. In the Central Legislature, Muslim representation shall not be less than one third.

[1] انقلاب ۱۰/ اپریل ۱۹۲۹ء محولہ بالا

5. Representation of communal groups shall continue to be by means of separate electorate as at present, provided it shall be open to any community at any time to abandon its separate electorate in favor of a joint electorate.
6. Any territorial distribution that might at any time be necessary shall not in any way affect the Muslim majority in the Punjab, Bengal and the North West Frontier Province.
7. Full religious liberty, i.e. liberty of belief, worship and observance, propaganda, association and education, shall be guaranteed to all communities.
8. No bill or any resolution or any part thereof shall be passed in any legislature or any other elected body if three-fourth of the members of any community in that particular body oppose such a bill resolution or part thereof on the ground that it would be injurious to the interests of that community or in the alternative, such other method is devised as may be found feasible and practicable to deal with such cases.
9. Sindh should be separated from the Bombay Presidency.
10. Reforms should be introduced in the North West Frontier Province (NWFP) and Baluchistan on the same footing as in the other provinces.
11. Provision should be made in the constitution giving Muslims an adequate share, along with the other Indians, in all the services of the state and in local self-governing bodies having due regard to the requirements of efficiency.
12. The constitution should embody adequate safeguards for the protection of Muslim culture and for the protection and promotion of Muslim education, language, religion, personal laws and Muslim charitable institution and for their due share in the grants-in-aid given by the state and by local self-governing bodies.
13. No cabinet, either central or provincial, should be formed without there being a proportion of at least one-third Muslim ministers.
14. No change shall be made in the constitution by the Central Legislature except with the concurrence of the State's contribution of the Indian Federation.

7
گزشتہ برس یکم اپریل سے اس برس ۳۱/ مارچ تک علامہ کی تشخیص شدہ آمدنی ۱۵۶۷۹/ روپے تھی۔

اس میں یونیورسٹیوں سے ۹۶۹ روپے، وکالت سے ۱۱۶۵۱/روپے، چھ خطباتِ مدراس سے ۲۱۰۰/روپے، کتابوں سے ۱۶۰۳/روپے اور رائلٹی سے ۱۲۳۸/روپے کی آمدنی شامل تھی۔ ۳۴۷/روپے ٹیکس لگا۔[1]

اس برس پنجاب یونیورسٹی کے جو پرچے جانچ رہے تھے، یہ تھے: ایم او ایل فارسی پہلا پرچہ؛ ایم او ایل فارسی تیسرا پرچہ؛ ایم اے فلسفہ چوتھا پرچہ؛ ایم اے فلسفہ چھٹا پرچہ۔[2]

اس برس علامہ اقبال اور حکیم احمد شجاع کے مرتب کیے ہوئے اُردو کورس کی پانچویں جماعت والی کتاب کا تیسرا ایڈیشن بھی شائع ہوا۔ پھر کسی وقت محکمۂ تعلیم کی منظوری کے لیے پیش کیا گیا۔

8

حیدرآباد کے جریدے اسلامک کلچر (*Islamic Culture*) کے اپریل کے شمارے میں صفحات ۲۰۹-۲۰۱ پر پچھلے نومبر کو لاہور میں پانچویں انڈین اورینٹل کانفرنس کے شعبۂ عربی، فارسی و ژند میں دیا ہوا علامہ اقبال کا خطبۂ صدارت شائع ہوا:

A Plea for a Deeper Study of the Muslim Scientists[3]

ان دنوں علامہ کی محفلوں میں سب سے بڑا موضوع نہرو رپورٹ تھا۔ بار بار سن کر جاوید کو بھی نام یاد ہو گیا۔ "نہرو دی پوٹ" کہتے تھے۔ علامہ سے پوچھا کہ کیا ہوتی ہے۔ عبدالمجید سالک کا بیان ہے کہ جاوید کی عمر کے لحاظ سے یوں جواب دیا گیا کہ ہندوؤں نے مل کر ایک کتاب بنائی ہے جس سے مسلمانوں کو بہت نقصان پہنچتا ہے۔

کئی روز بعد علامہ سے کہانی سنانے کی فرمایش کی۔ علامہ نے کہا کہ دن کے وقت کہانی سنانے سے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں۔ جاوید نے پہیلی کا تقاضا کیا۔ علامہ نے کچھ دیر سوچ کر پنجابی میں پوچھی کہ ایک جانور ایسا ہے جس کی چونچ پر پیسہ ہے، اُس کی ہڈیاں حلال اور شوربا حرام ہے:

---

[1] صفدر محمود (۱۹۷۳) 'علامہ اقبال کا گوشوارۂ آمدنی (انکم ٹیکس ریکارڈ کی روشنی میں)'، ص۱۸،۱۷

[2] ڈاکٹر حسن اختر ملک، اقبال، ایک تحقیقی مطالعہ، ص ۱۳۲۔ ان کا ماخذ پنجاب گزٹ کے مختلف شمارے ہیں۔

[3] Razzaqi, *Discourses of Iqbal*

اِک جناور ایسا جدہی چُنج اُتے پیسہ اوہدیاں ہڈیاں حلال اوہدا شوربا حرام

جاوید نے کچھ دیر سوچا۔ پھر یکدم بولے، ''نہرو دی پوٹ!'' سالک کا بیان ہے:

سننے والے ہنستے ہنستے لوٹ گئے اور اِس پہیلی اور اس کے جواب پر خیال آرائیاں ہونے لگیں۔ مثلاً 'نہرو رپورٹ' ایک ایسا جانور ہے، جس کی چونچ پر پیسہ ہے۔ یعنی جس کی ناک پر پیسہ رکھ دیا جاتا ہے، وہی اس کی حمایت میں پروپیگنڈا کرنے لگتا ہے۔ اس کی ہڈیاں یعنی اس کے بنیادی اصول (حریتِ ہند اور ضرورتِ آئین) تو حلال ہیں لیکن اس کا شوربا (یعنی تفصیلاتِ دستور اور اقلیت کے حقوق اور نظامِ نیابت) حرام ہے۔[1]

9

ہسپتال روڈ لاہور پر راجپال کی دکان سے دو سو فٹ آگے ٹال تھی۔ جلانے کی لکڑی اور تیل وغیرہ ملتا تھا۔ دکان کے مالک سیتارام فوت ہو چکے تھے۔ اُن کا لڑکا وِدیا رتن چلاتا تھا۔ عمر ۲۳ برس تھی۔

سنیچر ۶/ اپریل کو دوپہر دو بجے کے بعد وِدیا رتن کی دکان پر ہندوؤں کا ہجوم دکھائی دیا۔ انہوں نے ایک مسلمان نوجوان کو پکڑ رکھا تھا۔ شور مچا رہے تھے کہ راجپال اپنی دکان پر قتل ہو گیا۔ یہ اُسے قتل کر کے بھاگا ہے۔ نوجوان کی مونچھیں چھوٹی چھوٹی اور ڈاڑھی منڈھی ہوئی تھی۔ سر پر گلابی پگڑی تھی۔ دھاری دار قمیص کی داہنی آستین پر خون کے دو دھبے تھے۔

پکڑنے والے اُسے گھسیٹ کر کتابوں کی دکان تک لائے۔ اندر راجپال آخری سانسیں گن رہا تھا۔ سات آٹھ زخم تھے۔ سینے میں دل کے مقام پر گہرا گھاؤ تھا۔

واقعہ سنگین تھا۔ بازار بھر دکان پر جمع ہو گیا۔ پولیس نے بھاری تعداد میں پہنچ کر لوگوں کو پیچھے ہٹایا۔ دکان کا محاصرہ کیا۔ بازار کی ناکہ بندی ہوئی۔ پولیس کے بڑے افسر اور ضلع کے حکام پہنچے۔ لاش کی تصویر اُتاری گئی۔ محمد عثمان ڈرافٹس مین نے چند ماہ پہلے ڈپٹی پولیس انسپکٹر سانڈرس کے قتل پر جائے

[1] 'افکار و حوادث' انقلاب ۱۱/ اپریل ۱۹۲۹ء؛ حمزہ فاروقی (۱۹۸۸)، ص ۴۲۶۔ صوفی (۱۹۸۳)، ص ۷۶-۷۷

واردات کا نقشہ بنایا تھا۔ یہاں کا نقشہ اُتارنے لگا۔ لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوایا گیا۔[1]

شام چھ بجے نوجوان بھارت سبھا کے جلسے میں احسان الٰہی اور خواجہ غلام محمد کی تائید سے قتل اور قاتل کی مذمت اور راجپال کے پسماندگان سے ہمدردی کی قرارداد منظور کی گئی۔ رات ۹/ بجے شہر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ ہوئی۔ جلسے جلوس پر پابندی لگی۔ پولیس کی ٹولیاں گشت کر رہی تھیں۔ چھاؤنی سے گورا فوج آ کر کوتوالی میں بیٹھ گئی تھی۔ ایمبولینس گاڑیاں بھی کھڑی تھیں۔[2]

نوجوان پولیس کی حراست میں تھا۔ اپنا نام علم دین بتاتا تھا، جو علم الدّین کا پنجابی تلفظ تھا۔ لاہور کے ایک بڑھئی طالع مند کا لڑکا تھا۔ آٹھ روز پہلے منگنی ہوئی تھی۔ ایک بھائی محمد دین مجلسِ خلافت کا رضاکار تھا۔ باپ نے تحمل سے خبر سن کر کہا، "اگر میرے بیٹے نے یہ فعل نہیں کیا۔ اور ناحق گرفتار ہوا ہے۔ تو مجھے دُکھ ہے۔"[3]

اگلے روز اتوار تھی۔ صبح کے وقت ہزاروں ہندو ہسپتال کے باہر جمع ہوئے۔ راجپال کی اَرتھی کو جلوس کی شکل میں لے جانا چاہتے تھے۔ پولیس نے اجازت نہ دی۔ ہندوؤں نے احتجاجاً لاش ہسپتال میں چھوڑ دی اور خالی ارتھی اُٹھالی۔ اُسے بھی پولیس نے چھین لیا۔[4]

اُس روز علامہ اقبال، ملک فیروز خاں نون اور شیخ عبدالقادر نے مسلم لیگ کے حوالے سے بیان جاری کیا کہ اجلاس کے التوا میں "ہماری فتح مضمر ہے... یہ تو ظاہر ہو گیا ہے کہ مسلمانوں کی عام رائے نہرو رپورٹ کے مخالف ہے۔"[5]

۸/ اپریل کو نئی دہلی میں سنٹرل لجسلیٹو اسمبلی کی مہمانوں کی گیلری میں دو ہندوستانی نوجوان عمدہ انگریزی لباس پہنے بیٹھے تھے۔ اپنے محبوب رہنماؤں کو دیکھ رہے تھے جو آج کے اجلاس میں

[1] انقلاب ۹/ اپریل ۱۹۲۹ء بشکریہ امجد سلیم علوی

[2] انقلاب ۹/ اپریل ۱۹۲۹ء بشکریہ امجد سلیم علوی

[3] انقلاب ۹/ اپریل ۱۹۲۹ء بشکریہ امجد سلیم علوی

[4] انقلاب ۱۰/ اپریل ۱۹۲۹ء بشکریہ امجد سلیم علوی

[5] انقلاب ۱۰/ اپریل ۱۹۲۹ء؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتار اقبال، ص ۹۱-۸۷

موجود تھے: پنڈت موتی لال نہرو، محمد علی جناح، این سی کیلکر، ایم آر جیکار اور دُوسرے۔

دونوں نوجوان ایچ ایس آر اے کے ارکان تھے۔ ایک کا نام بھگت سنگھ تھا۔ اُس کی عمر بائیس برس کے قریب تھی۔ پنجاب میں لائلپور کے ایک قریبی گاؤں سے تعلق تھا۔ کالج میں تعلیم کے دوران بعض مغربی مصنفین کی انقلابی تحریروں سے گہرا اثر قبول کیا۔ ان میں اطالوی قوم پرست مزینی کے علاوہ کارل مارکس، لینن اور ٹراٹسکی شامل تھے۔ قریباً دو برس پہلے پولیس نے ایک بم دھماکے کے الزام میں کچھ روز حراست میں رکھا تھا مگر ثبوت فراہم نہ کر سکی۔ دُوسرے نوجوان کا نام پی کے دَت تھا۔

ایک نوجوان نے اسمبلی میں خالی جگہ دیکھ کر وہاں بم پھینکا۔ دھماکے کے ساتھ ہی دھوئیں کا بادل بلند ہوا۔ چیخ پکار اور بھگدڑ سنائی دی۔ دُوسرے نے بھی بم پھینکا۔ اسمبلی کے ارکان اپنی اپنی جان بچانے کے لیے منتشر ہوئے۔ دونوں نوجوانوں نے انقلابی پرچے ہال میں پھینکنا شروع کیے۔ اُن پر ”ایچ ایس آر اے“ کی طرف سے پیغام درج تھا کہ جس طرح ایک فرانسیسی انارکسٹ نے اپنی بات سنوانے کے لیے فرانسیسی اسمبلی میں دھماکہ کیا تھا، اُسی طرح یہ بھی بہرے کانوں تک اپنی آواز پہنچانے کے لیے اسی بات پر مجبور ہوئے ہیں۔

پولیس دونوں نوجوانوں کی طرف بڑھی جو نعرے لگا رہے تھے، ”انقلاب زندہ باد“ اور ”پرولتاریت زندہ باد“۔ پولیس کو دیکھ کر بھگت سنگھ نے اپنا پستول پولیس کے حوالے کر دیا۔

بم کی وجہ سے چند لوگ معمولی زخمی ہوئے۔ کسی ایک شخص کو شاید ذرا گہرا زخم آیا تھا۔ ایچ ایس آر اے کا منصوبہ یہ تھا کہ آج کسی کی جان لینے کی بجائے صرف دھماکہ کر کے گرفتاری پیش کی جائے۔ جب مقدمہ چلے تو اُس کے ذریعے اپنے نظریات لوگوں تک پہنچانے میں کامیابی ہو۔ [1]

۹/اپریل کو لاہور میں ہسپتال سے راجپال کی ارتھی اُٹھائی گئی۔ ہزاروں ہندوؤں کا مجمع تھا۔ حکام نے جلوس کی خصوصی اجازت دی تھی بشرطیکہ مخصوص راستے سے گزرے۔ ہسپتال روڈ سے انار کلی بازار اور راجپال کی دکان سے ہوتا ہوا استیلا مندر جائے اور وہاں سے سرکلر روڈ کے راستے شمشان بھومی

---

[1] Kuldip Nayar, *The Martyr*

جو ٹکسالی دروازہ کے باہر تھی۔ جلوس نے اس راستے سے ہٹ کر بعض ہندو محلوں سے گزرنے کی کوشش کی تو پولیس کی طرف سے لاٹھی چارج ہو گیا۔

واقعۂ قتل پر مختلف قسم کے بیانات سامنے آ رہے تھے۔ کوٹلی میں ایک جلسے میں منشی فضل الٰہی نے کہا، "نبی کریمؐ کی شان میں گستاخی کرنے والے کا انجام یہی ہونا تھا اور اب اگر کسی نے جرأت کی تو مسلمانانِ ہند اُسے کسی صورت میں معاف نہیں کریں گے۔"[1] آریہ سماجیوں نے راجپال کو شہید قرار دے کر لکھا، "یقیناً اسلام کی خوفناک تعلیم اِس قتل کی ذمہ دار ہے۔ [مسلمان] ہزار کہتے پھریں کہ ایسی باتوں کی تعلیم اسلام نہیں دیتا لیکن آخر اسلام اِن خدابخشوں، عبدالعزیزوں اور علم دینوں کو کہاں چھپائے گا... جب تک مسلمانوں کی یہ ذہنیت ختم نہیں ہو جاتی آریہ سماج لیکھرام، شردھانند اور راجپال پیدا کرتا جائے گا۔"[2]

کانگریسی رہنما بخشی بشن داس نے جہلم میں ہندوؤں سے خطاب کرتے ہوئے کہا، "میں نے قرآن شریف پڑھا ہے۔ اُس میں لکھا ہے کہ تم کسی بُت کو گالی بھی نہ دو۔ اس میں تمام مسلمان قوم کا قصور نہیں ہے بلکہ ایک برا فعل کرنے والا اپنے فعل کا خود ذمہ دار ہے... مہاشے رام چند کو جموں میں ہندوؤں ہی نے لاٹھیاں مار مار کر مار دیا۔ اس میں قصور صرف اُن ہندوؤں ہی کا تھا نہ کہ تمام ہندوستان کے ہندوؤں کا۔"[3]

سردار سروول سنگھ کویشر نے کہا، "اگر راجپال جی کی شہادت سے ہمارے ہندوستانی بھائی ایسی تحریروں اور تقریروں سے آیندہ کے لیے توبہ کر لیں تو میرے خیال میں جہاں ہمیں راجپال جی کی شہادت سے افسوس ہوتا ہے وہاں ہم ان کی شہادت سے ایک نیک پھل بھی حاصل کر سکتے ہیں۔"[4]

مولانا عبدالقادر قصوری کا بیان اخبارات میں شائع ہوا۔ نئے قانون ۲۹۵ر الف کے بعد متنازعہ

---

[1] ظفر اقبال نگینہ، غازی علم الدین شہید

[2] انقلاب ۱۲ اپریل ۱۹۲۹ء بشکریہ امجد سلیم علوی

[3] ظفر اقبال نگینہ، غازی علم الدین شہید

[4] انقلاب ۱۲ اپریل ۱۹۲۹ء بشکریہ امجد سلیم علوی

کتاب کا مسئلہ حل ہو چکا تھا۔ اس لیے "مہاشہ راجپال کا قتل ایک ایسا افسوس ناک واقعہ ہے جس پر ملک کے ہر بہی خواہ مسلمان کو تاسف کرنا چاہیے۔ یقیناً یہ واقعہ یا تو محض انفرادی از خود رفتگی کا نتیجہ ہے یا کسی دشمن ملک کی انگیخت کا۔"[1]

مولانا ظفر علی خاں نے بھی یہی رائے ظاہر کی۔ اُن ہندوؤں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا جنہیں راجپال کی اَرتھی کے جلوس میں پولیس کی لاٹھیاں سہنی پڑی تھیں۔ اپیل کی، "دونوں جماعتوں کے رہنماؤں اور خصوصاً اخبارات کا یہ فرض ہے کہ وہ بدقسمت ہندوستان کے جہادِ آزادی کے اِس نازک دور میں ایسی فضا پیدا کرنے کی کوشش کریں کہ عوام اِس سانحہ کو اس کے اصل رنگ میں دیکھیں۔ قاتل کا یہ فعل ایک ایسے شخص کا انفرادی فعل متصور ہونا چاہیے جس کا جوش اُس کے ذہنی توازن پر غالب آگیا ہے اور کسی صورت میں بھی اسے ہندو مسلم سوال نہیں بنانا چاہیے۔"[2]

انقلاب میں غالباً غلام رسول مہر نے لکھا:

> مسٹر سانڈرس اور سردار چانن سنگھ قتل ہوئے حالانکہ انہوں نے قاتل یا قاتلوں یا اُن کے رفیقوں کا قطعاً کوئی گناہ نہیں کیا تھا۔ کسی ہندو اخبار نے ان واقعات کو اس رنگ اور اس انداز میں نہیں لیا، جس میں مہاشے راجپال کے واقعہ کو لیا جارہا ہے۔ اصل واقعہ کتنا ہی افسوسناک کیوں نہ ہو، لیکن جب تک قاتل کا جرم ثابت نہ ہو جائے اور محرکاتِ جرم قطعی طور پر سامنے نہ آجائیں اس وقت تک کسی شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ عام مسلمانوں کو یا اُن کی کسی جماعت کو ناشائستہ مطاعن کا ہدف بنائے یا ان کے دین پاک کو بدنام کرنے کی سعی کرے ... ایک نہایت ہی افسوس ناک اور رنجدہ تہمت یہ ہے کہ مسلم علمائیا مسلم اکابر راجپال ایجی ٹیشن کے زمانے میں مہاشے راجپال کو واجب القتل قرار دیتے رہے۔ اس میں بال برابر بھی سچائی نہیں۔ البتہ یہ صحیح ہے کہ شریعت اسلام

---

[1] انقلاب ۱۹ اپریل ۱۹۲۹ء بشکریہ امجد سلیم علوی

[2] ظفر اقبال نگینہ، غازی علم الدین شہید

> میں حضور سرورِ دوجہاں صلی اللہ علیہ وسلم کی (خاک بہ دہنم) ہتک کرنے والے کی سزا قتل ہے۔ جن مسلم علمانے اس سزا کو پبلک میں پیش کیا اُنھوں نے محض اس لیے پیش کیا کہ اسلام میں یہ جرم بہت ہی اہم ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ حکومتِ وقت مسلمانوں کے مذہبی احکام کی عزت ملحوظ رکھتے ہوئے اس قسم کے جرائم کے انسداد کا خاص اور موقر بندوبست کرے۔ عوام کو کسی شاتمِ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کر ڈالنے کی تلقین نہ کی جاسکتی تھی اور نہ شریعت اس بات کی اجازت دیتی ہے کہ قانون و آئین کی باگ عوام کے ہاتھ میں دے دی جائے۔[1]

۱۰/ اپریل کو صبح ساڑھے دس بجے لاہور ضلع کچہری میں ایڈیشنل مجسٹریٹ مسٹر لوئیس کی عدالت میں علم دین کے خلاف زیرِ دفعہ ۳۰۲ سماعت کا آغاز ہوا۔ کورٹ ڈی ایس پی ایشورداس استغاثہ کی طرف سے وکیل تھے۔ علم دین کی طرف سے کوئی وکیل نہیں تھا۔

استغاثہ کے مطابق ۶/ اپریل کو دن کے دو بجے ملزم راجپال کی دکان میں داخل ہوا۔ راجپال گدی پر بیٹھا کچھ لکھا رہا تھا۔ ملزم نے چاقو کے وار کیے۔ راجپال کے دو ملازم دکان کے دوسرے حصے میں موجود تھے۔ اُن کے نام کیدار ناتھ اور بھگت رام تھے۔ ان میں سے ایک نے ملزم کو چاقو راجپال کے جسم سے نکالتے دیکھا۔ اُن کی آمد پر ملزم چاقو وہیں پھینک کر بھاگا۔ اُنھوں نے پیچھے سے کتابیں اُس پر پھینکیں۔ کچھ تعاقب کے بعد ٹال سے پکڑ لیا جس پر ملزم نے اپنے فعل کا اعتراف کیا۔ تفتیش کے دوران بتایا کہ چاقو اُس نے آتمارام کباڑی سے خریدا تھا۔ آتمارام نے چاقو پہچان لیا۔ شناخت پریڈ میں ملزم کو بھی پہچان لیا کہ اُسی نے چاقو خریدا تھا۔

استغاثے کی طرف سے گواہوں کی پیشی کا سلسلہ جاری تھا۔ لاہور کے مشہور بیرسٹر فرخ حسین کمرۂ عدالت میں داخل ہوئے۔ انھوں نے کہا کہ علم دین کی وکالت کریں گے۔ سماعت

---

[1] انقلاب ۱۲ اپریل ۱۹۲۹ء بشکریہ امجد سلیم علوی

۱۶/ اپریل تک ملتوی کروائی۔[1]

10

ایسٹر سنڈے ۱۴/ اپریل کو تھا۔ ہفت روزہ حمایتِ اسلام میں اعلان شائع ہوا:

سب سے اوّل ہم آپ کو بتانا چاہتے ہیں کہ جلسۂ مذکورہ میں اسلامی ہند کے بہترین دل و دماغ اپنے خیالات وافکار سے مسلمانوں کو محظوظ و مستفیض فرمائیں گے۔ علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال اس اجتماع میں ایک ایسے موضوع پر اپنے محققانہ اور فلسفیانہ خیالات ظاہر فرمائیں گے جس کی طرف سے افسوس ہے کہ مسلمان غافل ہو چکے ہیں اور وہ مضمون "قرآن کا مطالعہ" ہے۔ ہر سوچنے، سمجھنے والے مسلمان کو اِس بات کا یقین ہے کہ فہم و عملِ قرآن سے مسلمانوں کی بے رغبتی ہی حقیقت میں دنیائے اسلام کے تنزل کا باعث ہوئی ہے اور یہی وہ چیز ہے جو آئندہ دنیا میں فرزندانِ اسلام کو اُبھار سکتی ہے۔ اِس نظریہ کی تشریح علامہ اقبال جیسے یگانۂ روز گار محقق کی زبان سے سننا آپ تسلیم کریں گے کہ ایک نہایت مفید چیز ہو گی۔ قرآن کے مطالعہ کی اہمیت کا صحیح احساس اسوقت ہو سکتا ہے جب ہم قرآن پاک کی اصل قدر و قیمت سے آگاہ ہو جائیں۔

خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہ جلسہ منعقد نہ ہو سکا۔[2]

عباس علی خاں لمعہ کی عمر اٹھارہ برس تھی۔ شاعری کا شوق تھا۔ بعض مصرعے وزن سے گر جاتے تھے۔ علامہ کے بارے میں کوئی نظم لکھ کر بھیجی۔ ۱۵/ اپریل کو علامہ نے لکھا، "مجھے اس اطلاح

---

[1] ظفر اقبال نگینہ، غازی علم الدین شہید

[2] اعلان ہفت روزہ حمایت اسلام، ۱۴/ اپریل ۱۹۲۹ء میں شائع ہوا؛ محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶) اقبال اور انجمن حمایت اسلام۔ حنیف شاہد نے لکھا ہے کہ جلسہ ہوا اور تیسرے دن میاں شفیع کی صدارت میں علامہ نے 'قرآن کا مطالعہ' پر لیکچر دیا۔ یہ بات جلسے سے پہلے کی رپورٹ میں درج پروگرام کے حوالے سے لکھی گئی ہے۔ قیاس کے زمرے میں آتی ہے۔ حمزہ فاروقی (۱۹۸۸) نے لکھا ہے کہ جلسہ "چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر ملتوی ہو گیا تھا۔"

سے مسرت ہوئی کہ میرے اشعار کے مطالعہ سے آپ کو فائدہ پہنچا۔"[1]

11

۱۶/ اپریل کو علم دین کے مقدمے کی ایڈیشنل مجسٹریٹ کی عدالت میں دوسری سماعت ہوئی۔ خواجہ فیروزالدین بیرسٹر نے پیروی کی۔ استغاثے کے گواہ پیش ہوتے رہے۔ اس مرحلے پر کوئی جرح نہیں کی گئی۔ سماعت ۲۴/ اپریل تک ملتوی ہوئی۔

منشی فضل دین لاہور ہائی کورٹ میں کلرک تھے۔ چاہتے تھے کہ شیخ دین محمد انہیں اپنا کلرک بنا لیں۔ ۱۹/ اپریل کو علامہ نے سفارشی چٹھی لکھ دی۔[2]

لاہور سے رسالہ ادبی دنیا شائع ہونے والا تھا۔ شیخ عبدالقادر ڈائرکٹر تھے۔ تاجور نجیب آبادی مدیرِ اعلیٰ تھے۔ اخبار مدینہ نے اڈیٹوریل میں غلطی سے لکھ دیا کہ علامہ اقبال مدیرِ اعلیٰ ہوں گے۔ ۲۳/ اپریل کو تاجور نجیب آبادی نے انقلاب میں وضاحت شائع کروائی۔[3]

۲۴/ اپریل کو لاہور میں ایڈیشنل ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں علم دین کو پیش کیا گیا۔ ساڑھے آٹھ انچ کے پھل والا چاقو جس کی نوک ٹوٹی ہوئی تھی، آلۂ قتل کے طور پر رکھا گیا۔ ایک قمیص جس کی آستین پر خون تھا اور ایک شلوار جس کے بعض حصے خون آلود تھے اُس لباس کے طور پر پیش کیے گئے جو گرفتاری کے وقت علم دین کے جسم پر موجود تھا۔

علم دین سے وہ بیان لیا گیا جسے "بیان ملزم بلا حلف" کہتے تھے۔ پوچھا گیا، "کیا تم نے مورخہ ۶/ اپریل ۱۹۲۹ء کو بوقت دوپہر مقتول راجپال پر قتل کرنے کی نیت سے عدالت میں موجود چاقو سے حملہ کیا تھا اور کیا تم نے مقتول کی چھاتی میں ایک گہرا زخم لگایا تھا جو اُس کی موت کا سبب بنا؟"

"نہیں،" علم دین کا جواب تھا۔

---

[1] مکتوب بنام عباس علی خاں لمعہ ۱۵/ اپریل ۱۹۲۹ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۵۷-۵۶

[2] مکتوب بنام شیخ دین محمد (انگریزی) ۱۹/ اپریل ۱۹۲۹ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۵۷

[3] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸) حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۲۸۶ بحوالہ انقلاب ۲۳/ اپریل ۱۹۲۹ء

''کیا تمہارا جائے وقوع سے فرار کے بعد تعاقب کیا گیا تھا اور تم کو واردات کے فوراً بعد وِدیا رتن کے ٹال سے گرفتار کیا گیا تھا؟''

''میں سبزی منڈی کی طرف سے آ رہا تھا اور لکڑی کے ٹال کے نزدیک مجھے بغیر وجہ کے پکڑا گیا۔''

''کیا تم نے گرفتار کرنے والوں سے یہ نہیں کہا تھا کہ تم کوئی چور نہیں ہو اور تم نے راجپال کو اِس لیے قتل کیا تھا کہ اُس نے تمہارے رسولؐ کے بارے میں کچھ کہا تھا؟''

''نہیں۔ میں نے صرف یہ کہا تھا کہ میں چور نہیں۔''

''کیا یہ شلوار اور قمیص جو قتل کے بعد تمہارے جسم سے اُتروائی گئی تمہاری نہیں ہے؟''

''یہ قمیص میری ہے اور میرے جسم سے اُتروائی گئی تھی لیکن یہ شلوار میری نہیں ہے اور نہ ہی مجھ سے لی گئی۔''

''کیا تم نے قتل والے دن یہ چاقو آتمارام کی دکان سے خریدا تھا؟''

''نہیں۔''

''تمہارے خلاف مقدمہ کیوں درج کیا گیا؟''

''میں بے گناہ ہوں اور میں نہیں سمجھ سکتا کہ مجھے اِس جرم کے تحت کیوں گرفتار کیا گیا ہے۔''

''کیا تم نے کچھ اور کہنا ہے؟''

''کچھ نہیں۔''

ایڈیشنل مجسٹریٹ نے علم دین کو فردِ قراردادِ جرم سنائی:

تم اُس جرم کے کے مرتکب ہوئے جس کی سزا مجموعہ تعزیراتِ ہند کی دفعہ ۳۰۲ میں مقرر ہے اور جو عدالت سیشن کی سماعت کے لائق ہے اور میں اِس تحریر کے ذریعہ حکم دیتا ہوں کہ تمہاری تجویز بر بنائے الزام مذکور عدالت موصوف کے روبرو عمل میں آئے۔[1]

---

[1] ظفر اقبال نگینہ، غازی علم الدین شہید، ص ۷۵-۷۶،

12

۲۴/اپریل کو پیامِ مشرق کے تیسرے ایڈیشن کی کتابت ختم ہوئی۔ اغلاط درست کرنے کا کام باقی تھا۔ دو روز میں ختم ہونے والا تھا۔ چند سوالات نذیر نیازی کو بھیجے تھے۔ جواب نہ ملا تھا۔ تاکیدی خط لکھا۔ [1]

سلیمان ندوی کا خط آیا۔ غالباً مدراس والے لیکچروں کے ترجمے کی فرمایش کی تھی۔ کسی نیک کام کے لیے میاں سر محمد شفیع اور نواب سر ذوالفقار علی خاں سے چندہ دلوانے کے لیے بھی کہا تھا۔ علامہ کے علم میں تھا کہ اگلے ماہ نواب ذوالفقار ولایت جا رہے ہیں مگر مالی حالت حوصلہ افزا نہ تھی۔ ۲۵/اپریل کو جواب دیتے ہوئے علامہ نے لکھا کہ ان کے بجائے سر عبدالقادر سے چندہ طلب کرنا بہتر ہو گا۔ لیکچروں کے اُردو ترجمے کے بارے میں لکھا، ''لیکچروں کا اُردو ترجمہ انشاً اللہ کیا جائے گا۔ اصطلاحات کے متعلق آپ سے بھی مشورہ طلب کروں گا۔''[2]

مطبع جامعہ دہلی سے مجیب نے استفسارات کا جواب دے دیا۔ علامہ نے پیامِ مشرق کے تیسرے ایڈیشن کی کاپیاں طباعت کے لیے انہیں بھجوا دیں۔ [3]

محمد دین فوق کی بیگم فوت ہو گئیں۔ علامہ کو انقلاب میں خبر پڑھ کر معلوم ہوا۔ ۳۰/اپریل کو فوق کے نام تعزیتی خط لکھا، ''خدا تعالیٰ مرحومہ کو جنت عطا فرمائے اور آپ کو صبر جمیل۔ تقدیرِ الٰہی سے کوئی چارہ نہیں۔ مسلمان کے لیے تسلیم کے سوا کوئی راہ نہیں اور یہی راہ انسب و اولیٰ ہے۔''[4]

13

آیندہ مالی سال ۱۹۲۹-۳۰ء کے لیے پنجاب کونسل کی کمیٹی برائے لوکل سیلف گورنمنٹ میں علامہ اقبال شامل کیے گئے۔ وزیر برائے لوکل سیلف گورنمنٹ کے علاوہ نامزد اراکین میں سے ایلن مچل سی آئی ایس اور جے ڈی پینی شامل تھے۔ منتخب اراکین میں علامہ کے علاوہ چودھری دُلی چند، سردار فتح

---

[1] مکتوب بنام نذیر نیازی ۲۴/اپریل ۱۹۲۹ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۵۹-۵۸

[2] مکتوب بنام سلیمان ندوی ۲۵/اپریل ۱۹۲۹ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۶۱-۵۸

[3] نذیر نیازی (۱۹۵۷) مکتوباتِ اقبال بنام سید نذیر نیازی

[4] مکتوب بنام محمد دین فوق ۳۰/اپریل ۱۹۲۹ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۶۲-۶۱

سنگھ، لالہ کیشور رام سیکھری، شیخ محمد صادق اور خان بہادر ملک محمد امین خاں شامل تھے۔[1]

تعلیم کے لیے دس رکنی اسٹینڈنگ کمیٹی میں وزیرِ تعلیم کے علاوہ نامزد رکن بدستور آر سانڈرسن رہے۔ منتخب اراکین میں سے علامہ اقبال اس دفعہ بھی شریک رہے۔ اُن کے علاوہ پرانے منتخب اراکین میں سے پنڈت نانک چند، سردار نرائن سنگھ، خان بہادر شیخ سر عبدالقادر اور چودھری یٰسین خان بدستور شامل رہے۔ نئے اراکین پنڈت مہرچند، لالہ بودھ راج اور پیر اکبر علی تھے۔[2]

14

چودھویں کا چاند کے عنوان سے کتاب شائع ہوئی۔ پیغمبرِ اسلامؐ کی ذات پر قابلِ اعتراض حملے تھے۔ حکومت نے ضبط کر لی۔

عباس علی خاں لمعہ نے درخواست کی کہ علامہ ان کے اشعار کی اصلاح کر دیں۔ ۷؍ مئی کو علامہ نے معذرت کرتے ہوئے لکھا، "فرصت بالکل نہیں۔"[3]

اس برس کسی وقت ثاقب کانپوری نے مجموعۂ کلام علامہ بھیجا۔ علامہ نے لکھا، "آپ کے کلام میں جو تناسب ہے وہ نوجوان شعرا کے یہاں بہت کم ملتا ہے۔ آپ کے ایک شعر نے مجھے تڑپا دیا۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے۔

جان دیتا ہوں قفس میں دونوں پَر کھولے ہوئے
حسرتِ پرواز میں بھی شان ہے پرواز کی"[4]

۷، ۸؍ اور ۹؍ مئی کو موچی دروازے کے باہر کھلے میدان میں مسلمانوں کے جلسے ہوئے۔ "ہر خیال کے مسلمانوں کا عظیم الشان اجتماع ہوا،" انقلاب نے لکھا۔ آخری جلسے کی صدارت علامہ نے کی۔

---

[1] پنجاب گزٹ ۲۶؍ اپریل ۱۹۲۹ء ص ۷۱؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۱۴۰

[2] پنجاب گزٹ ۲۶؍ اپریل ۱۹۲۹ء ص ۱۸؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۱۴۱-۱۴۰

[3] مکتوب بنام عباس علی لمعہ ۷؍ مئی ۱۹۲۹ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۶۴-۶۳۔

[4] برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیب اقبال، سوم، ص ۱۴۴

عصمت اللہ مشنری، ووکنگ برطانیہ اور برلن جرمنی کی مساجد کے سابق امام صدرالدین اور مرزا مظفر بیگ نے تقریریں کیں۔ اِس بات پر زور دیا کہ اسلام ایک امن پسند مذہب ہے۔ دوسرے مذاہب کے ماننے والوں سے درخواست کی کہ امن پسندی کے اصول کی قدر کریں۔ بانیٔ اسلام اور بزرگانِ دین کے خلاف قابلِ اعتراض الفاظ استعمال کرنے سے گریز کریں۔ چودھویں کا چاند ضبط کرنے پر حکومت کے شکریے کی قرارداد منظور کی گئی۔[1]

15

جب پنجاب ہائی کورٹ میں ججی کی جگہ خالی ہوئی تو اس پر ڈاکٹر سر محمد اقبال کے تقرر کی تحریک بعض حلقوں سے پیش کی گئی۔ اب سر محمد حبیب اللہ کے ریٹائر ہونے پر وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کی ممبری کے لیے ڈاکٹر صاحب کا نام پیش کیا جا رہا ہے۔ ایک معاصر نے حال میں یہ تجویز پیش کی ہے کہ مسلمانانِ کشمیر کی تعلیمی پستی کے رفع کرنے کی غرض سے محکمہ تعلیم کشمیر کی زمام ڈاکٹر صاحب کے قابل ہاتھوں میں دے دی جائے۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال کی سی قابلیت، علمیت، استعداد اور عالمگیر شہرت کے انسان کے متعلق اس قسم کی تجاویز کا پیش ہونا اور ان کا تشنۂ تکمیل رہ جاتا ایک اچنبہ ہے۔ حکومت کی نگاہِ نکتہ رس کو تو ایسی زبردست شخصیت کو مدتوں پہلے نظامِ حکومت کی کل کا ایک اہم پرزہ بنالینا چاہیے تھا۔ اگر حکومتِ کشمیر نے جناب ممدوح کی خدمات حاصل کر لیں تو اس میں خود اسی حکومت کا فائدہ ہے جو ان کی خدمات حاصل کرے گی۔

ہفت روزہ حمایت اسلام، ۹؍ مئی ۱۹۲۹ء[2]

۱۰؍ مئی کو علامہ اقبال نے انجمن حمایت اسلام کی طرف سے حضور نظام کو لکھا کہ پنجاب کے مسلمان اُن کے لیے چشم براہ ہیں۔ جواباً حضور نظام کا تار غالباً انگریزی میں آیا: ”آئندہ موسمِ سرما میں میری

---

[1] حمزہ فاروقی، حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۲۸۶–۲۸۷ بحوالہ انقلاب ۱۱؍ مئی ۱۹۲۹ء

[2] محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶) اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص ۵۷

آمد کے متعلق میرے ہم مذہب باشندگانِ لاہور نے جن دوستانہ اور وفادارانہ جذبات کا اظہار کیا ہے میرے دل میں ان کی بہت قدر ہے۔ میں اپنے ارادہ سے بروقت آپ کو اطلاع دوں گا۔"[1]

16

۱۴ر مئی کو لاہور سیشن کورٹ میں علم دین کے مقدمے کی سماعت شروع ہوئی۔ استغاثے کے گواہ پیش ہوئے۔ یہ سلسلہ اگلے روز بھی جاری رہا۔ ۱۶ر مئی کو علم دین کو اُن کا بیان پڑھ کر سنایا گیا جو مجسٹریٹ کے روبرو قلم بند کیا گیا تھا۔ پھر پوچھا گیا، "کیا تمہیں مزید کچھ اور کہنا ہے؟"

علم دین کا جواب تھا:

جب مجھے پکڑا گیا اُس وقت مجھے بہت مارا پیٹا گیا اور جب پولیس لائن پہنچایا گیا تو وہاں مجھ پر سخت تشدد کیا گیا۔ کسی بھی شخص نے میری بات کو نہیں سنا۔ مجھے شناخت پریڈ سے پہلے پگڑی اور جُوتے کا جوڑا دیا گیا۔ میں نے اُن کو پہن لیا۔ لیکن انسپکٹر جواہر لال نے مجھے انہیں [جوتوں کو] اتارنے کو کہا۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ جب مجسٹریٹ آیا تو مجھے دوسرے افراد کے ساتھ پریڈ میں شامل کیا گیا۔ پریڈ میں شامل میرا نمبر دوسرا تھا اور میرے ساتھ ایک بوڑھا آدمی تھا۔ گواہ آیا اور اُس نے اپنا ہاتھ میرے اوپر رکھ دیا۔

اُسی روز صبح ۹ بجے جب میں حوالات میں کھانا کھا رہا تھا تو انسپکٹر جواہر لال گواہ آتمارام کے ساتھ وہاں آیا تھا۔ انسپکٹر نے مجھے پینے کے لیے سگریٹ پیش کیا جو میں نے پی لیا۔ شناخت کے وقت فقط میں نے پگڑی پہنی ہوئی تھی جبکہ پریڈ میں شامل دوسرے افراد نے پگڑیاں نہیں پہنی ہوئی تھیں۔ دوسروں نے جوتے پہنے ہوئے تھے جبکہ میں ننگے پاؤں تھا۔ جب پولیس لائن میں ڈاکٹر میرا معائنہ کر رہا تھا تو اُس وقت انسپکٹر جواہر لال نے مجھے کہا تھا کہ میں اپنی دائیں کہنی اور بائیں گھٹنے پر جو زخم ہیں ڈاکٹر کو نہ دکھاؤں۔ مجھے یہ دھمکی دی گئی تھی کہ اگر میں نے یہ زخم ڈاکٹر کو دکھائے تو بعد میں سخت تشدد کیا

[1] محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶) اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص ۱۱۹

جائے گا۔ جب مجھے پکڑا گیا تو ہندوؤں نے بہت مارا تھا اور مجھے ایک ترازو کے کنڈے کی طرف دھکیلا گیا جس کی نوک سے میری کہنی اور گھٹنے میں کیل لگنے سے زخم آ گئے تھے۔ پولیس نے بھی مجھ پر تشدد کیا اور بری طرح پیش آئی۔ اس کے علاوہ مجھے کچھ اور نہیں کہنا ہے۔

سوال پوچھا گیا، ''تمہاری کہنی اور گھٹنے پر جو زخم آئے تھے کیا اُس میں سے خون بہا تھا؟''

''جی ہاں!'' علم دین کا جواب تھا۔

''جب تم کو ہندوؤں نے پکڑا تو کیا تم نے قمیص شلوار پہن رکھی تھی؟''

''میں نے قمیص پہن رکھی تھی۔ شلوار نہیں پہنی ہوئی تھی۔ میں نے دوسری پتلون پہنی ہوئی تھی جو پھٹ گئی تھی۔''

''کیا تم نے اپنے دفاع میں کوئی گواہ عدالت میں پیش کرنا ہے؟''

''نہیں۔''

یہ بیان تحریر ہونے کے بعد سنایا گیا تو علم دین نے اضافہ کیا، ''جب مجسٹریٹ شناخت پریڈ کے لیے آیا تو میں نے اُس سے بہت شکایت کی لیکن کسی نے بھی میری بات کو نہیں سنا۔''[1]

وکیلِ صفائی بیرسٹر فرخ حسین نے یہ موقف پیش کیا کہ قاتل بڑے اطمینان سے راجپال کو قتل کر کے چلا گیا۔ ملازموں نے آ کر راجپال کو مقتول پایا۔ چلاتے ہوئے دوڑے۔ جو مسلمان انہیں دکھائی دیا اُسے ہی پکڑ کر قاتل قرار دے دیا۔ وہ علم دین تھا۔ وکیلِ صفائی نے کہا:

۱ اگر قتل کے وقت ملازم دکان میں موجود تھے تو قتل کے وقت ہی کیوں نہ شور مچایا کہ قاتل دکان ہی میں پکڑا جاتا؟

۲ چاقو جو عدالت میں پیش کیا گیا اُس کی نوک ٹوٹی ہوئی ہے جو ڈاکٹر کو تلاش کے باوجود مقتول کے جسم سے نہیں مل سکی۔ اس سے قتل نہیں کیا جا سکتا۔

---

[1] ظفر اقبال نگینہ، غازی علم الدین شہید، ص ۸۴

۳ آتمارام جس نے یہ چاقو علم دین کے ہاتھ بیچنے کی گواہی دی ہے، اُس کی نظر کمزور ہے۔[1] اسیسرز میں سے فیروز دین نے رائے دی، ''جرم ثابت نہیں ہوتا۔'' محمد سلیم نے اتفاق کیا۔ بھلا مل نے کہا، ''میرے خیال میں ملزم پر جرم ثابت ہو گیا ہے۔'' جہامت سنگھ نے اتفاق کیا۔ اب فیصلہ جج صاحب کو کرنا تھا۔ وہ انگریز تھے۔[2]

۱۶ر مئی کو لاہور ہائی کورٹ نے کسی محمد علی کی اپیل خارج کر دی۔ علامہ اور ایچ سی کمار پیروی کر رہے تھے۔ اپیل کسی مسماۃ فاطمہ بیگم کے خلاف تھی۔ اُن کا دفاع برکت علی اور محسن شاہ کر رہے تھے۔ سماعت شیف جسٹس سر شادی لال اور جسٹس ہلٹن نے کی تھی۔[3]

گورداسپور کے اصغر حسین خاں صاحب نظیر لدھیانوی کی نظم 'عید و محرم' ۱۹ر مئی کے انقلاب میں شائع ہوئی۔ 'اسرارِ خودی' کا ایک نکتہ علامہ کے حوالے سے یوں بیان کیا:

جہانِ عید و محرم میں امتیاز نہ کر   اگر یہ عشق کا اجمال ہے تو وہ تفصیل[4]

یہی خیال کئی برس بعد علامہ کے اپنے اُردو کلام الفاظ کے ذریعے یوں شہرت پانے والا تھا:

غریب و سادہ و رنگیں ہے داستانِ حرم   نہایت اس کی حسین ابتدا ہے اسماعیل

عبدالجمیل بنگلوری کی طرف سے عید کارڈ موصول ہوا۔ ۲۱ر مئی کو جواب دیتے ہوئے علامہ نے لکھا کہ کم سے کم ترکی اور مصر جانے کا ارادہ مصمم ہے اگرچہ مالی مشکلات رکاوٹ بن رہی ہیں:

As you know, it is a question of money and rich Muslims in India do not realize the importance of spending their money in the interests of Islam. The present is an extermely critical [period] in the history of Islam. If proper methods are adopted Islam can still conquer whole nations.[5]

---

[1] ظفر اقبال نگینہ، غازی علم الدین شہید، ص ۵۱

[2] ظفر اقبال نگینہ، غازی علم الدین شہید، ص ۸۵

[3] ظفر علی راجا ایڈووکیٹ (۲۰۱۳) قانون دان اقبال، ص ۱۲۷

[4] حمزہ فاروقی، حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۳۳۶

[5] Dar, *Letters of Iqbal*

۲۲/ مئی کو لاہور سیشن کورٹ کے باہر ہزار کے قریب مسلمان جمع تھے۔ سخت پہرے میں علم دین کو لایا گیا۔ اللہ اکبر کے نعرے سنائی دیئے۔ خاصا جوش دکھائی دے رہا تھا۔ سیشن جج مسٹر ٹیپ نے فیصلہ سنایا۔ اس کا ترجمہ یوں کیا جا سکتا تھا:

> کوئی بھی شخص اس گمراہ نوجوان پر افسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا جس نے تعصبانہ جذبہ کے تحت اس قدر بزدلانہ اور ظالمانہ فعل سرزد کیا۔ اس کا مقصد خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو یہ قتل ہے اور اس کے بدلہ میں اُسے سخت سزا ملنی چاہیے۔
>
> لہٰذا میں ملزم علم الدین کو دفعہ ۳۰۲ تعزیراتِ ہند کے تحت ملزم گردانتے ہوئے سزائے موت تجویز کرتا ہوں۔ اسے پھانسی پر لٹکایا جائے حتیٰ کہ اُس کا دم نکل جائے۔[1]

انقلاب نے تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

> اگرچہ بعض اونچے حلقوں میں مقدمے کے ابتدائی ایام ہی سے یہ خیال ظاہر کیا جا رہا تھا کہ علم الدین کو غالباً سزائے موت دی جائے گی۔ لیکن مقدمہ اس قدر کمزور تھا اور مسٹر سلیم کی فاضلانہ جرح نے استغاثہ کی دھجیاں کچھ اس انداز سے بکھیری تھیں کہ عامۃ الناس میں سے اکثر اشخاص کو یہ حسنِ ظن ہو گیا تھا کہ شاید علم الدین موت کی سزا سے بچ جائے... استغاثہ صرف ایک ہی حقیقت پر مبنی ہے۔ کہ ملزم موقعِ واردات سے ذرا دُور گرفتار کر لیا گیا تھا۔ اور یہ ایک ہی مسلمان تھا جو اُس قت سڑک پر سے گذرتا ہوا دکھائی دیا۔ چونکہ اُس وقت راجپال مر چکا تھا۔ اور لوگوں کے ہجوم کو یہ خیال تھا کہ اُس کو کسی مسلمان ہی نے ہلاک کیا ہے اس لیے جو پہلا مسلمان انہیں ملا اُسی کو پکڑ لیا۔ اگر علم الدین کی جگہ کوئی دوسرا مسلمان سڑک پر سے گذر رہا ہوتا تو ممکن تھا کہ ہجوم اُسی کو گرفتار کرا دیتا... ان تمام حالات کے باوجود علم الدین کو شبہ کا فائدہ بھی نہیں دیا گیا۔[2]

---

[1] انقلاب ۲۴/ مئی ۱۹۲۹ء

[2] انقلاب ۲۵/ مئی ۱۹۲۹ء

۲۹ر مئی کو علم دین کے والد طالع مند کی طرف سے لاہور ہائی کورٹ میں سیشن کورٹ کے فیصلے کے خلاف اپیل دائر کی گئی۔ وجوہاتِ اپیل پانچ تھیں:

۱ یہ کہ جن دو گواہان کی شہادت چشم دید بیان کی جاتی ہے وہ جھوٹی ہے اور ڈاکٹری شہادت متضاد ثابت ہوتی ہے۔

۲ یہ کہ ملزم کے اقبالِ جرم کے متعلق شہادت ناممکن اور ناقابلِ اعتبار ہے۔

۳ یہ کہ شہادت اس امر کے متعلق کہ ملزم نے آتمارام دکاندار کا پتہ دیا قابلِ پذیرائی نہیں ہے۔

۴ خون کے خفیف دھبوں کا قتل کے ساتھ کوئی تعلق ثابت نہیں ہوتا۔

۵ ملزم کی عمر اور مقدمہ کے دیگر واقعات کو مدِ نظر رکھتے ہوئے سزا بہت ہی سخت ہے۔[1]

فقیر سید وحید الدین کا بیان ہے کہ طالع مند کی نگاہِ انتخاب سر تیج بہادر سپرو پر پڑی۔ لکھتے ہیں:

> میں ڈاکٹر [اقبال] صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا۔ "علم الدین کے مقدمے کی پیروی کے لیے مسلمانوں کی نظریں سر تیج بہادر سپرو پر کیوں پڑ رہی ہیں؟" ڈاکٹر صاحب نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا۔ "تمہیں شاید علم نہیں کہ سر تیج بہادر سپرو عربی کے سکالر ہیں۔ تمہاری قوم میں کتنے وکلائیں جو اِس علم اور اعزاز سے آراستہ ہیں؟"[2]

محمد علی جناح کی خدمات حاصل کی گئیں۔

17

انگلستان میں برسوں بعد کسی حکومت کو میعاد پوری کرنا نصیب ہوا تھا۔ ۳۰ر مئی کو عام انتخابات ہوئے۔ کل نشستوں کی تعداد ۶۱۵ تھی اس لیے اکثریت حاصل کرنے کے لیے ۳۰۸ نشستیں درکار

---

[1] ظفر اقبال نگینہ، غازی علم الدین شہید، ص ۸۱

[2] فقیر سید وحید الدین (۱۹۸۸) روزگارِ فقیر اول، ص ۱۱۲

تھیں۔ تینوں سیاسی جماعتیں اس میں ناکام رہیں۔ لیبر پارٹی نے ۲۸۷، کنزرویٹو نے ۲۶۰ر اور لبرل نے ۵۹ نشستیں حاصل کیں۔ لیبر پارٹی کی نشستیں سب سے زیادہ تھیں لیکن ووٹ کنزرویٹو پارٹی سے کم تھے۔ مشکل تھا کہ یہ حکومت اپنی مدت پوری کر سکتی۔

18

مطبع جامعہ سے دو دفعہ پیام مشرق کے تیسرے ایڈیشن کے پروف آئے۔ علامہ نے دیکھ کر واپس بھیجے۔

۲ر جون کو انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کا اجلاس ہوا۔ خان بہادر شیخ امیر علی صدارت کر رہے تھے۔ علامہ کو پھر کالج کمیٹی کا رکن مقرر کیا گیا۔[1]

نذیر نیازی کو بمبئی کے تاجروں کے قائم کیے ہوئے ایک وقف سے بیرونِ ملک تعلیم کے لیے قرض ملنے کی امید ہوئی۔ انگلستان اور جرمنی جا کر اِسلامی تصوّف کے مطالعے کا خیال تھا۔ علامہ سے انگلستان اور جرمنی کے بعض اہلِ علم کے نام تعارف نامے طلب کیے۔ ۴ر جون کو علامہ نے جواب دیا کہ لکھ کر اور ٹائپ کر کے بھیج دیں۔ علامہ دستخط کر دیں گے۔ ساتھ ہی لکھا، "تصوف لکھنے پڑھنے کی چیز نہیں، کرنے کی چیز ہے۔ کتابوں کے مطالعے اور تاریخی تحقیقات سے کیا ہوتا ہے۔ کسی کو کوئی حقیقی فائدہ ان سے نہیں پہنچتا۔ نہ کتابوں کے مصنف کو نہ اس کے پڑھنے والوں کو... بہتر ہو کہ آپ کسی اچھے ہنر کی تلاش میں ولایت جائیں۔"[2] پیام مشرق کے باقی پروف مجیب خود ہی دیکھ لیں۔

۵ر جون کو لیبر پارٹی کے ریمزے میکڈونلڈ برطانیہ کے وزیر اعظم بنے۔ اُن کی جماعت کے ولیم ویج ووڈ بین (William Wedgwood Benn) وزیرِ ہند ہوئے۔

۱۰ر جون ۱۹۲۹ء کو خان محمد نیاز الدین خاں فوت ہو گئے۔[3]

---

[1] انجمن کی قلمی روداد؛ محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶) اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص ۱۸۰

[2] مکتوب بنام سید نذیر نیازی ۴ر جون ۱۹۲۹ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۶۶-۶۵

[3] برنی (۱۹۸۹) کلیات مکاتیبِ اقبال، اول، ص ۸۹۰

نذیر نیازی نے خط میں پوچھا کہ اعلیٰ تعلیم کے لیے تصوّف کی بجائے فلسفۂ تاریخ کیسا رہے گا۔ ۱۸/ جون کو علامہ نے تائید کرتے ہوئے تشویش ظاہر کی کہ پیام مشرق کے تیسرے ایڈیشن کی طباعت میں تاخیر ہو رہی ہے۔[1]

۲۲/ جون کو انجمن حمایت اسلام کے بعض ارکان کی طرف سے حضور نظام کے استقبال کے لیے تجاویز پیش ہوئیں۔ ۲۳/ جون کو جنرل کونسل کا اجلاس خان بہادر شیخ امیر علی کی صدارت میں ہوا۔ علامہ کے الفاظ روداد میں درج ہوئے، ''اعلیٰ حضرت نظام سے مسلمانانِ پنجاب کو بحیثیت مسلمان فرمانروا ہونے کے دلی عقیدتمندی ہے۔ اعلیٰ حضرت، حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ کی اولاد سے ہیں۔ چنیوٹ (پنجاب) کے نواب سعد اللہ خاں، وزیر اعظم شاہجہاں سے بھی اعلیٰ حضرت کو نَسبی تعلق ہے۔'' مولوی غلام محی الدین، سید حبیب، ملک برکت علی، خان بہادر چودھری سلطان محمد خاں، ڈاکٹر امان اللہ خاں، سید محسن شاہ، مولوی فضل الدین، شیخ نیاز مند، خانصاحب شیخ عبدالعزیز، ملک قادر بخش، ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین اور سید بڑھے شاہ نے بحث میں حصہ لیا۔[2]

عبدالرشید طارق کا بیان ہے کہ جون ۱۹۲۹ء میں اُن کے دادا حاجی احمد بخش انہیں اور اُن کے بھائی مجید کو ساتھ لے کر علامہ سے ملنے گئے۔ حیدرآباد (دکن) کا ایک نوجوان آیا۔ چند کتابیں ساتھ تھیں۔ اُن میں سے پیام مشرق علامہ کے پاس لے جا کر کہا کہ اس پر اپنے ہاتھ سے کوئی شعر لکھ دیں۔ علامہ نے کہا، ''بھئی اس میں جو کچھ لکھا ہے، سب میرا ہی تو ہے پھر اور کیا لکھوں!'' اُس نے اصرار کیا۔ علامہ نے اوراق الٹ پلٹ کر کتاب ہی کا ایک شعر سرورق پر لکھ دیا۔[3]

19

۷/ جولائی کی صبح رئیسِ اعظم لاہور میاں نظام الدین نے احباب کو آموں کی دعوت دی تھی۔

---

[1] مکتوب بنام نذیر نیازی ۱۸/ جون ۱۹۲۹ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۶۷

[2] محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶)، اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص ۱۱۸-۱۱۶

[3] عبدالرشید طارق، 'مے شبانہ'، ص ۲۴۷-۲۴۶

عبدالمجید سالک کے مطابق:

جونہی ہم باغ میں داخل ہوئے، کیا دیکھتے ہیں کہ سامنے رہٹ کے حوض میں پانی جمع ہو رہاہے۔ اُس کے پاس ہی مونج کی کُھری چارپائی پر حضرت علامہ اقبال تشریف رکھتے ہیں۔ چودھری محمد حسین پاس ہی بیٹھے ہوئے نہایت فلسفیانہ انداز سے ببّے (عزیزی جاوید اقبال سلمہ) کی طرف تک رہے ہیں۔ ایک طرف علی بخش (خادمِ اقبال) سب کی نظر بچا کر آموں پر ''دست درازی'' بلکہ ''زبان درازی'' کر رہاہے، حالانکہ ابھی تک کافی آم بھی نہیں آ چکے اور [نہ ہی] آغازِ دعوت کی اِذن ملی ہے لیکن علی بخش ان رسمیات سے بالاتر ہے اور بیان کیا جاتا ہے کہ آم کی صورت دیکھ کر وہ صبر ہی نہیں کر سکتا، لہٰذا اُسے معذور رکھنا چاہئے۔[1]

میاں ایم اسلم نے مختلف قسم کے آم رہٹ کے حوض میں ڈلوا دیے۔ جاوید کے کپڑے اُتار کر انہیں حوض میں اُتار دیا گیا۔ میاں اسلم، چودھری محمد حسین اور پروفیسر تاثیر حوض میں پاؤں لٹکا کر بیٹھ گئے۔ سالک نے کوٹ اُتار کر آستینیں چڑھالیں۔ یہ سب بڑی تیزی سے آم کھاتے رہے۔ سالک کا بیان ہے کہ علامہ چارپائی پر بیٹھے رہے۔ صرف تبرکاً ہر قسم میں سے دو دو تین تین کھائے، ''لیکن واضح رہے کہ آموں کی قسمیں تقریباً چالیس ہوں گی۔'' ایک آم میٹھا ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سرخ تھا۔ علامہ نے کہا کہ اس آم کا نام آج سے ''ٹیپو سلطان'' رکھا جائے۔ تجویز بہت پسند کی گئی۔ اودھ میں بعض آموں کے نام بادشاہوں کے ناموں پر رکھے گئے تھے۔[2]

اسمبلی میں بم پھینکنے والے بھگت سنگھ اور بی کے دت کو 'کالے پانی'' یعنی جزائر انڈیمان میں عمر قید کی سزا سنائی گئی تھی۔ لیکن پھر پولیس نے کہا کہ پچھلے برس ۱۹ر دسمبر کو لاہور میں پولیس ڈپٹی کمشنر سانڈرز کا قتل بھی بھگت سنگھ، سُکھ دیو اور راج گرو نے کیا تھا۔ پچیس دوسرے افراد بھی ہندوستان

---

[1] حمزہ فاروقی حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے ص۴۲۹، بحوالہ کالم 'افکار و حوادث' انقلاب ۱۰ر جولائی ۱۹۲۹ء

[2] حمزہ فاروقی حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے ص۴۲۹، بحوالہ کالم 'افکار و حوادث' انقلاب ۱۰ر جولائی ۱۹۲۹ء

میں برطانوی راج کو ختم کرنے کی سازش میں ملوّث تھے۔ ۱۰ر جولائی کو لاہور جیل میں مقدمے کی سماعت شروع ہوئی۔ لارنس گارڈن تک راستے بند تھے۔ پولیس کے سپاہی موٹر سائیکلوں پر گشت کر رہے تھے۔ نوجوان "انقلاب زندہ باد" کے نعرے لگا رہے تھے۔

۱۱ر جولائی کو لیے میاں نظام الدین نے آموں کی ایک اور دعوت دی کیونکہ پچھلی دعوت میں غلام رسول مہر شریک نہ ہو سکے تھے۔ علامہ، جاوید، محمد حسین، سالک، مہر، عبداللہ چغتائی اور مسلم آؤٹ لُک کے مدیر مجید ملک شامل تھے۔ علی بخش نہیں تھا۔ علامہ کا ڈرائیور فیروز موجود تھا۔ میاں ایم اسلم اور پروفیسر تاثیر میزبانوں میں شامل تھے۔ سالک کے مطابق چغتائی "آموں کے ہلاکو خاں" تھے۔ صرف ایک منٹ بعد اُن کے ہاتھ میں آم یوں دکھائی دیتا کہ قاشیں گٹھلی کے گرد ترتیب سے لگی ہوتیں، جیسے سورج مکھی کا پھول۔ علامہ نے کہا کہ جب درزی درویشوں کی چوگوشہ ٹوپی کو سینے سے پہلے قطع کرتا ہے تو اُس کی صورت ہوبہو ماسٹر عبداللہ کے چُوسے ہوئے آم جیسی ہوتی ہے۔[1]

۱۴ر جولائی کو انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کا اجلاس ہوا۔ مولوی فضل الدین صدارت کر رہے تھے۔ لوکل سیلف گورنمنٹ سے مل کر یتیم خانے کے لیے گرانٹ حاصل کرنے کے لیے گیارہ ارکان پر مبنی وفد مقرر کیا گیا۔ علامہ کا نام شامل تھا۔[2]

20

۱۵ر جولائی کو لاہور ہائی کورٹ کے باہر زبردست ہجوم تھا۔ علم دین کی سزائے موت کے خلاف اپیل کی سماعت تھی۔ پیروی کرنے محمد علی جناح لاہور آئے تھے۔ فلیٹیز ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ ان کی معاونت فرخ حسین کر رہے تھے۔ استغاثے کی طرف سے دیوان رام اور جے ایل کپور تھے۔ جسٹس براڈوے اور جسٹس جانسٹن سماعت کر رہے تھے۔

"٦ر اپریل کو راجپال کو قتل کیا گیا،" جناح نے کہا، "لیکن سوال یہ ہے کہ جس نے قتل کیا وہ

---

[1] حمزہ فاروقی حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے ص۴۲۹-۴۳۰، بحوالہ کالم 'افکار و حوادث' انقلاب ۱۴ر جولائی ۱۹۲۹ء

[2] انجمن کی قلمی روداد؛ محمد حنیف شاہد (۱۹۷٦)، اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص ۱۸۰

کون تھا؟" استغاثہ نے صرف دو عینی گواہ پیش کیے تھے۔ دونوں مقتول کے ملازم تھے۔ گواہی غیر جانبدار قرار نہیں دی جاسکتی تھی۔ جناح نے اُن کی کہانی کو فرضی قرار دیا:

۱ ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق مقتول کے جسم میں آٹھ زخم تھے۔ کیدارناتھ کا کہنا ہے کہ جب یہ زخم لگائے گئے اُس وقت وہ اور بھگت رام بھی مقتول کے ساتھ دکان میں موجود تھے۔ یہ تسلیم کرنا مشکل ہے کہ اٹھارہ انیس سال کے ایک لڑکے نے تین مردوں کے درمیان گھس کر اُن میں سے ایک کے جسم میں آٹھ دفعہ چھری گھونپی اور وہ کچھ بھی نہ کر سکے۔

۲ کیدارناتھ کے بیان کے مطابق یہ واقعہ جتنی تیزی کے ساتھ پیش آیا میڈیکل رپورٹ اُس کی تردید کرتی ہے۔ میڈیکل رپورٹ سے ظاہر ہوتا ہے کہ کیدارناتھ کے بیان کیے ہوئے دورانیے سے کم از کم دوگنا وقت اس واردات میں صرف ہوا۔

۳ کیدارناتھ نے اپنے ابتدائی بیان میں بھگت رام کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ بعد کے بیانات میں کہا گیا کہ بھگت رام بھی اُس کے ساتھ دکان ہی میں تھا اور ملزم کے تعاقب میں بھی شریک تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ اضافہ بعد میں کیا گیا۔ تاکہ بھگت رام کی صورت میں ایک گواہ کا اضافہ کیا جاسکے۔ کیدارناتھ سچا ہوتا تو وہ ابتدائی بیان میں بھگت رام کا تذکرہ کرنا کیسے بھول سکتا تھا۔

۴ کیدارناتھ نے ابتدائی بیان میں وزیر چند کا تذکرہ بھی نہیں کیا۔ بعد میں وزیر چند کو بھی یہ کہہ کر گواہ بنادیا گیا کہ اُس نے ملزم کو دکان سے برآمد ہوتے بھی دیکھا اور تعاقب میں بھی شامل ہوا۔

۵ کیدارناتھ نے ابتدائی بیان میں ایسی کوئی بات نہیں کہی کہ ملزم نے پکڑے جانے پر اعترافِ جرم کیا۔ اس ٹکڑے کا اضافہ بھی بعد میں کیا گیا ہے۔ اول تو یہی بات غیر فطری ہے کہ ایک شخص جائے واردات سے بھاگے بھی اور جونہی اُسے پکڑا جائے وہ فوراً ہی اپنے فعل کا اعتراف بھی کرلے۔ دوم، ہر گواہ نے الگ الگ الفاظ ملزم سے منسوب کیے ہیں۔

کسی نے کہا کہ ملزم کہہ رہا تھا، ''میں نے رسول کا بدلہ لے لیا۔'' کسی نے بتایا کہ وہ کہہ رہا تھا، ''ہتھکڑیاں سونے کے کڑے ہیں۔'' بعض گواہوں نے کہا کہ جب ملزم کو دکان پر لائے، اُس کے بعد بھی اقرارِ جرم کرتا رہا۔ ظاہر ہے کہ یہ درست نہیں کیونکہ دکان پر پولیس بھی موجود تھی۔ اُس نے ملزم کی زبان سے ایسی کوئی بات نہیں سنی۔

۶ ڈاکٹر کی رپورٹ کے مطابق مقتول کے زخموں سے خون فوارے کی طرح نہیں اُچھلا۔ ظاہر ہے کہ پھر مقتول کا خون ملزم کے کپڑوں پر نہیں لگ سکتا تھا۔ ڈاکٹر نے خود ہی توجیہہ پیش کر دی کہ چاقو سے لپک کر کپڑوں پر لگ گیا ہو گا۔ ڈاکٹر کے بیان کا یہ حصہ لغو ہے۔ یہ رائے دینا اُس کا کام نہیں تھا۔ دعوے کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ ملزم کے لباس پر موجود خون اُس کا اپنا ہے۔ یہ اُس وقت نکلا جب اُسے پکڑے جانے کے بعد پیٹا گیا۔

۷ آتمارام بالکل واضح طور پر سکھایا ہوا گواہ تھا۔ اُس کی ساری گواہی ناقابلِ یقین تھی۔ پولیس کے بیان کے مطابق جب اُسے چاقو دکھایا گیا تو اُس نے فوراً چاقو خریدنے والے کا مکمل حلیہ بیان کر دیا۔ یہ بات ویسے ہی بڑی عجیب ہے کہ ایک دکاندار ہر گاہک کا حلیہ اتنی تفصیل کے ساتھ یاد رکھے۔ اس پر نہ صرف آتمارام کی نظر کمزور ہے بلکہ کمرۂ عدالت میں وہ اُسی چاقو کو پہچاننے میں بھی ناکام رہا!

جناح نے سیشن جج کے فیصلے پر بھی تنقید کی:

۱ جج نے لکھا تھا کہ اُس نے مسلمان اسیسروں کی رائے مسترد کر دی ہے کہ ملزم کے ہم مذہب ہونے کی وجہ سے اُس کے ساتھ ہمدردی کا امکان تھا۔ پھر یہی بات سکھ اور ہندو اسیسروں کی رائے کے بارے میں کیوں نہیں کہی جا سکتی کہ اُس میں بھی تعصب کا دخل ہو گا؟

۲ اگر کسی وجہ سے یہ تسلیم بھی کیا جائے کہ قتل ملزم ہی نے کیا تھا تب بھی اُسے پھانسی نہیں بلکہ عمر قید کی سزا ہونی چاہیئے۔ اُس کی عمر اٹھارہ اُنیس برس ہے۔ مقتول کی چھاپی ہوئی کتاب کے بارے میں ہائی کورٹ کی شہادت موجود ہے کہ وہ جذبات کو مشتعل کر

سکتی ہے۔ ملزم سے بھی جو فعل منسوب کیا جا رہا ہے وہ اشتعال انگیزی کے جذبے سے مغلوب ہو کر قتل کرنا ہے۔ اس کی سزا پھانسی نہیں بلکہ قید ہوتی ہے۔ کسی لغو اور ذلیل خواہش کے تحت جرم کرنے کا فعل منسوب نہیں کیا جا رہا۔ ایک کتاب سے غیرت کھا کر ایسا کرنے کا الزام لگایا جا رہا ہے۔

لنچ کے بعد عدالت نے حاضرین کو باہر نکال دیا۔ استغاثہ کا جواب سننے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ چار بجے کے قریب اپیل خارج کر دی۔ علم دین کی پھانسی کی سزا بحال رکھی۔[1]

21

حضور نظام کا خط علامہ کو ملا:

مجھے سرِ دست اِس بات کا یقین نہیں ہے کہ حسبِ توقع نومبر یا دسمبر میں وہاں آ سکوں گا۔ اس لیے کہ میں اس سال کے خاتمہ پر اپنے جواں عمر شہزادوں کی شادی پر غور کر رہا ہوں۔ علاوہ ازیں ہز ایکسی لینسی وائسرائے بھی دسمبر میں تشریف لا رہے ہیں... ستمبر یا اکتوبر میں قطعی طور پر اِس معاملہ میں اطلاع دے سکوں گا۔

۱۸/ جولائی کے شمارے میں انجمن حمایت اسلام کے اخبار نے لکھا کہ اعلیٰ حضرت، دکن کے پہلے فرمانروا ہیں جو ''سرزمینِ پنجاب کو اپنے قدوم میمنت لزوم سے متفخر فرمانے والے ہیں... نزول اجلال کی ایک اور بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کا سببِ حقیقی علامہ ڈاکٹر شیخ سر محمد اقبال ہیں جن کی عالمگیر شہرت و قابلیت پر ادبی دنیا کو ناز ہے اور جن کی فلسفیانہ شاعری تمام ممالکِ عالم سے خراجِ تحسین وصول کر چکی ہے۔ اِس سے پیشتر کبھی کوئی والیٔ ریاست کسی فلسفی و شاعر و ادیب کی دعوت پر پنجاب میں نہیں آیا۔''[2]

حکیم محمد سعید مدراس کے مشہور طبیبوں میں سے تھے۔ ان کی کلیاتِ طبِ جدید حاجی سیٹھ

---

[1] انقلاب ۱۷/ جولائی ۱۹۲۹ء

[2] محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶)، اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص ۱۱۸-۱۱۹

جمال محمد کے نام معنون تھی۔ علامہ نے بھی تقریظ لکھی تھی، "ایک عام آدمی کی حیثیت سے جو طبیب نہ ہو، میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ مصنف نے اس ملک کے طبی ادب میں بہترین اضافہ کیا ہے۔"[1]

22

پنجاب کونسل کا گرمیوں کا اجلاس شملہ میں ہوا۔ علامہ بھی گئے۔ ۲۶، ۲۷، ۲۹، ۳۰/ جولائی اور یکم اگست کو بارنز کورٹ(Barne's Court) میں اجلاس ہوئے۔ پھر کونسل غیر معینہ طور پر برخاست کر دی گئی۔[2]

کچھ عرصہ پہلے ایک پمفلٹ میں پنجاب کے حوالے سے کچھ تجاویز شائع ہوئی تھیں۔ علامہ انہیں مسلمانوں کے لیے مضر سمجھتے تھے۔[3] اب معلوم ہوتا تھا کہ پنجاب سائمن کمیٹی کی سفارشات انہی کے مطابق ہوں گی۔ نواب احمد یاد دولتانہ نے لکھا کہ پمفلٹ کی تجاویز پر صوبائی کونسل کے مسلم ارکان نے دستخط کیے تھے۔ علامہ نے سردار حبیب اللہ، دین محمد، سید محمد حسین شاہ، مولوی سر رحیم بخش، پیر اکبر علی، ملک محمد امین شمس آبادی اور غلام یٰسین سے دریافت کیا۔ سب نے تردید کی۔ علامہ نے نواب دولتانہ سے پوچھا۔ وہ اپنے بیان پر قائم رہے۔

۲۸/ جولائی کو علامہ نے انقلاب کے نام خط میں تفصیلات درج کرنے کے بعد لکھا، "ممکن ہے نواب صاحب کے پاس اُن حضرات کے دستخط محفوظ ہوں۔ جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے... میں کسی ایسی میٹنگ میں شریک نہیں ہوا اور نہ کسی پمفلٹ کی تجاویز پر میں نے دستخط کیے ہیں۔"[4]

23

مجیب بیمار ہو گئے تھے۔ مطبع جامعہ کا کام سست پڑ گیا۔ پیام مشرق کے تیسرے ایڈیشن کی اشاعت جولائی

---

[1] حمزہ فاروقی حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۳۸۶ بحوالہ انقلاب ۲۷/ جولائی ۱۹۲۹ء

[2] Mitra *The Indian Quarterly Register July-Dec. 1929,* pp.193-196

[3] خطبۂ الٰہ آباد میں انہیں میثاقِ لکھنؤ کے بعد مسلمانوں کی دوسری غلطی قرار دیا۔ دیکھیے ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کے واقعات

[4] مکتوب بنام مدیر انقلاب ۲۸/ جولائی ۱۹۲۹ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۶۷-۶۸

کے آخر میں مکمل ہوئی۔ مہتمم حامد علی خاں نے ۲۴۸ کتب علامہ یا ان کے ناشر شیخ مبارک علی کو لاہور بھجوائیں۔ ۲؍ اگست کو علامہ نے نذیر نیازی کو لکھا کہ باقی بھی جلد بھجوائی جائیں۔ بانگِ درا کا نیا ایڈیشن بھی تقریباً تیار تھا۔ اطلاع دی جائے کہ کیا مطبع جامعہ اسے چھاپ سکے گا۔[1]

اسلامی ممالک کے سفر کا ارادہ کمزور پڑ چکا تھا۔ مالی وسائل دستیاب نہ ہو سکے تھے۔ تشکیلِ جدید کے بقیہ لیکچرز لکھ رہے تھے۔ اُمید تھی کہ اکتوبر کے آخر تک مکمل ہو جائیں۔[2]

۴؍ اگست کے انقلاب میں میلادالنبیؐ کو منظم طور پر منانے کی اپیل دوبارہ شائع ہوئی۔ ذرا مختلف الفاظ میں ۲۷؍ مارچ کو بھی آ چکی تھی۔ اس دفعہ دستخط کرنے والوں میں علامہ کے ساتھ ہندوستانی کونسلوں کے بارہ ارکان شامل تھے۔[3] ۴؍ اگست کو تحریک کے بانی، غالباً قاضی عبدالمجید قرشی، علامہ کے پاس آئے۔ علامہ نے وضاحت کے ساتھ بتایا کہ کس طرح یہ تحریک ہندوستان میں اسلامی مقاصد کے لیے استعمال کی جا سکتی ہے۔[4] اُسی روز جمیل منگلوری کا خط ملا۔ لکھا تھا کہ جنوبی ہند میں میلادالنبیؐ کے لیے کافی جوش و خروش دیکھا جا رہا ہے۔ سلطان ٹیپو پر علامہ کی نظم کے بارے میں پوچھا۔ چودھری محمد حسین نے غالباً جنوبی ہند کا سفر نامہ لکھنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا۔ اُس کے بارے میں دریافت کیا۔ علامہ نے جمیل کا خط محمد حسین کو دے دیا کہ براہِ راست جواب لکھیں۔ خود لکھا کہ سلطان ٹیپو والی نظم ایک بڑے منصوبے کا حصہ ہے۔ زندگی کا حاصل ہو گا ("my life work")۔ بظاہر جاویدنامہ مراد تھی۔ میلاد کے حوالے سے لکھا کہ آنحضورؐ کی شخصیت واحد قوت ہے جو ہندوستان میں اسلام کی بکھری ہوئی قوتوں کو مجتمع کر سکتی ہے۔ مستقبل قریب میں جو ہونے والا ہے، اُس کے لیے مسلمانوں کو منظم کرنے کی اشد ضرورت ہے:

---

[1] مکتوب بنام نذیر نیازی ۲؍ اگست ۱۹۲۹ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۷۴-۷۲

[2] مکتوب بنام جمیل منگلوری ۴؍ اگست ۱۹۲۹ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۷۵-۷۴

[3] نقوش اقبال نمبر جلد ا۔ ۱۹۷۷ء

[4] مکتوب بنام جمیل منگلوری ۴؍ اگست ۱۹۲۹ء محولہ بالا

> I believe the personality of the Prophet is the only force which can bring together the scattered forces of Islam in the country. The organization of Muslims is badly needed in view of what is coming in the near future.[1]

24

۵ر ستمبر کی رات آٹھ بجے علامہ نے کسی بہت ضروری مشورے کے لیے احباب کو گھر بلایا۔ مولانا غلام مرشد، مولانا احمد علی، مولانا ظفر علی خاں، سید حبیب، مولوی نور الحق، سید عبدالقادر اور مولانا غلام رسول مہر کو دعوت دی گئی۔[2] ۷ر ستمبر کو شہر میں دہلی دروازے کے باہر فلسطین میں برطانوی حکمت عملی کے خلاف مسلمانوں کا احتجاجی جلسہ ہوا۔ ہر طبقے اور جماعت کے لوگ شامل ہوئے۔ علامہ نے صدارت کی۔ انقلاب کے مطابق افتتاحی تقریر میں کہا ''مسلمان، ان کی عورتیں اور بچے بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کیے جا رہے ہیں۔ فلسطین کے عربوں کی مجلس اعلیٰ نے اعلان کیا ہے کہ حکمدار حکومت نے یہودیوں کو مسلح کر دیا ہے جس کی وجہ سے اس قدر خونریزی ہو رہی ہے۔'' اِس ہولناک سفاکی کا مرکز یروشلم ہے، جہاں مسجد اقصیٰ واقع ہے۔ یہودی مسجد پر قبضہ چاہتے ہیں:

> اس مسجد کا تعلق حضرت خواجہ دو جہاں صلی اللہ علیہ وسلم کے معراج مبارک سے ہے اور معراج ایک دینی حقیقت ہے، جس کا تعلق مسلمانوں کے گہرے جذبات کے ساتھ ہے۔ صدیاں گذر گئیں کہ ایک معبد تعمیر ہوا تھا، جسے 'ہیکل سلیمانی' کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ یہ معبد مسلمانوں کے یروشلم فتح کرنے سے بہت پہلے برباد ہو گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے معراج کا ذکر حضرت عمر فاروقؓ سے فرمایا تو انہیں ہیکل یا مسجد اقصیٰ کے صحیح موقع و محل سے بھی مطلع کر دیا۔ فتح یروشلم کے بعد حضرت عمرؓ بنفس نفیس یروشلم تشریف لے گئے تو انہوں نے مسمار شدہ 'ہیکل سلیمانی' کا محل وقوع دریافت فرمایا اور وہ جگہ ڈھونڈ لی۔ اس وقت اس جگہ گھوڑوں کی لید جمع تھی، جسے

---

[1] ایضاً

[2] ان سب کے نام اجتماعی چٹھی ۵ر ستمبر ۱۹۲۹؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۷۷-۷۵

انھوں نے اپنے ہاتھ سے صاف کیا۔ مسلمانوں نے جب اپنے خلیفہ کو ایسا کرتے دیکھا تو انھوں نے بھی جگہ صاف کرنی شروع کر دی اور یہ میدان پاک ہو گیا۔ عین اسی جگہ مسلمانوں نے ایک عظیم الشان مسجد تعمیر کی، جس کا نام مسجد اقصیٰ ہے۔

علامہ نے کہا کہ یہودیوں اور عیسائیوں کی تاریخ میں یہ نہیں لکھا کہ موجودہ مسجدِ اقصیٰ اُس جگہ پر واقع ہے جہاں ہیکلِ سلیمانی تھا۔ یہودیوں نے یہاں اُس وقت آنا شروع کیا جب مسلمانوں نے نشاندہی کی۔ ترکوں نے اپنی حکومت کے زمانے میں انہیں دیوارِ براق کے ساتھ کھڑے ہو کر گریہ و بکا کرنے کی اجازت دے دی۔ اس لیے وہ دیوارِ گریہ کہلانے لگی۔ شریعت کی رُو سے مسجدِ اقصیٰ کا سارا احاطہ ''وقف'' ہے۔ جنگِ عظیم کے دوران انگریز مدبروں نے تجویز کیا کہ یہودیوں کو ایک جگہ اکٹھا کریں۔ یہودیوں کے لیے فلسطین میں کشش نہ تھی کیونکہ اُن کا کاروبار سود پر چلتا تھا۔ فلسطین میں سُود دینے والے کم تھے۔ چونکہ یہودیوں کو فلسطین میں آباد کرنا انگریزوں کے سیاسی مفاد میں تھا، انگریزوں نے ''صیہونی تحریک کو فروغ دیا اور اپنی غرض کی تکمیل کے لیے جو ذرائع استعمال کیے گئے ان میں سے ایک کا نتیجہ آج ہمارے سامنے ہے۔'' ماضی میں یہودیوں کو یورپ میں نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ مسلمان انہیں پناہ دیتے تھے۔ مسلمانوں کی حکومت میں یہودیوں نے عربی زبان میں کمال حاصل کیا اور مسلمان حکمرانوں کے درباروں میں ہمیشہ ممتاز حیثیت حاصل کی۔ آج انگریزوں کی پروردہ صیہونی تحریک کی وجہ سے یہودی مسجدِ اقصیٰ پر قبضے کا دعویٰ کر رہے ہیں، جس کا ''قانونی اور تاریخی اعتبار سے'' اُنہیں حق نہیں پہنچتا۔ تقریر کے دوران مجمع نے یہودیوں کے مظالم پر ''شیم شیم'' کی آوازیں بلند کیں۔ آخر میں علامہ نے کہا:

صیہونی تحریک مسلمانوں کے لیے کوئی خوشگوار نتائج پیدا نہیں کرے گی بلکہ اس سے غیر معمولی فتنوں کے ظہور پذیر ہونے کا خطرہ ہے۔ اب حکومتِ برطانیہ نے فلسطین میں تحقیقات حالات کے لیے ایک کمیشن بھیجنا منظور کیا ہے، مگر میں اعلان کر دینا چاہتا

ہوں کہ مسلمانوں کو اس پر کوئی اعتماد نہیں۔[1]

لاہور کے کسی معزز گھرانے سے تعلق رکھنے والے عبدالمجید بی۔اے نے سیکریٹریٹ میں جونیر کلرک کی اسامی کے لیے درخواست دی۔ علامہ انہیں عرصے سے جانتے تھے۔ ۸/ ستمبر کو جی سی بیزلی حکومت پنجاب کے چیف سکرٹری کے نام تعارفی رقعہ لکھ کر دیا۔[2]

25

پنجاب کونسل کا موسمِ خزاں کا اجلاس ہونے والا تھا۔ اوائل ستمبر میں علامہ نے دو موضوعات پر سوالات کے نوٹس دیئے۔ پہلا موضوع سیالکوٹ کے نواح میں ڈیک دریا سے متاثرہ زمینیں تھیں۔ ریونیو ممبر سے بعض اقدامات کے بارے میں پوچھنا تھا۔[3] دوسرا موضوع قادیان کا مذبح تھا۔

قادیان میں ذبیحہ کا انتظام نہ تھا۔ گیارہ میل دُور بٹالہ سے گوشت لانا پڑتا تھا۔ سمال ٹاؤن کمیٹی نے مذبح کھول دیا۔ گائے بھی ذبح ہو سکتی تھی۔ ہندوؤں کو شکایت ہوئی۔ سکھوں نے حملہ کر کے مذبح تباہ کر دیا۔ قادیان میں سکھوں کی تعداد بہت کم تھی۔ پھر بھی جھٹکا کی اجازت حاصل کر لی۔ عام تاثر تھا کہ اس موقع پر قادیان والوں سے وعدہ کیا تھا کہ مذبح کی مخالفت نہیں کریں گے۔ اب کر رہے تھے۔ علامہ کے سوالات تھے:

ا آنریبل ممبر فنانس بتائیں: (الف) الف۔ قادیاں میں ہندوؤں، سکھوں اور مسلمانوں کی آبادی کیا ہے؟ (ب) وہاں جھٹکے کی فروخت کے لیے دکانیں ہیں یا نہیں اور اگر ہیں تو کہاں واقع ہیں؟ (ج) قادیاں کے مسلمانوں کو قادیاں میں ایک مذبح تعمیر کرنے کی اجازت دی گئی تھی یا نہیں؟ (د) اگر دی گئی تھی تو بتایا جائے کہ کب دی گئی تھی اور جس مقام پر مذبح کی تعمیر کی اجازت دی گئی اُس کے ارد گرد آبادی کس قدر ہے؟

---

[1] انقلاب ۱۰/ ستمبر ۱۹۲۹ء؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتار اقبال، ص ۹۴-۹۱

[2] برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۷۸-۷۷

[3] محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل

۲ آنریبل ممبر فنانس بتائیں: (الف) آیا قادیاں میں مسلمانوں کو مذبح کی اجازت دینے پر نظرِ ثانی کے لیے کوئی درخواست کمشنر کے پاس پیش ہوئی تھی یا نہیں؟ (ب) اگر پیش ہوئی تھی تو اُس شخص یا ان اشخاص کے نام بتائے جائیں جنہوں نے یہ درخواست پیش کی نیز یہ بتایا جائے کہ درخواست پر کیا حکم صادر ہوا؟

۳ آنریبل ممبر فنانس بتائیں: (الف) پنجاب کے مختلف قصبوں میں جھٹکا فروشی کی دکانیں کھولنے اور ذبح گاؤ کے مذابح بنانے کی اجازت دینے کے لیے کوئی اصول مقرر ہیں؟ (ب) اگر اِس قسم کے اصول موجود ہیں تو بتایا جائے کہ قادیان میں مسلمانوں کو مذبح کی اجازت دیتے وقت ان اصولوں کو ملحوظ رکھا گیا یا نہیں؟

۴ آنریبل ممبر فنانس بتائیں: (الف) کیا حکومت اِس امر سے آگاہ ہے کہ قادیان میں گائیوں کا واحد مذبح منہدم کر دیا گیا؟ (ب) اگر منہدم کر دیا گیا تھا تو اُس شخص یا اُن اشخاص کے نام بتائے جائیں جنہوں نے یہ مذبح منہدم کیا۔ نیز یہ بتایا جائے کہ وہ کس قوم سے تعلق رکھتے ہیں؟ (ج) کیا پولیس نے مذبح ڈھانے والوں کو اِس فعلِ انہدام سے باز رکھنے کی تدابیر اختیار کیں؟ (د) کیا حکومت نے اِس کی بحالی کا کوئی بندوبست کیا ہے؟ (د) اگر اَب بندوبست نہیں کیا تو بتایا جائے کہ کیا بندوبست کرنے کا ارادہ ہے؟[1]

مطبع جامعہ کی طرف سے جواب نہ آیا تھا۔ علامہ نے نذیر نیازی کو پھر لکھا کہ جلد آگاہ کیا جائے کہ بانگِ درا کے نئے اڈیشن وغیرہ کی طباعت وہاں ہو سکے گی یا لاہور میں انتظام کیا جائے۔[2]

26

بھگت سنگھ اور ساتھیوں نے بھوک ہڑتال کر رکھی تھی۔ مطالبہ تھا کہ سیاسی قیدی ہیں۔ وہ سہولتیں دی جائیں جو جیل کے قوانین کے تحت یورپی قیدیوں کو ملتی ہیں۔

---

[1] انقلاب ۱۰/ ستمبر ۱۹۲۹ء؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۱۴۲-۱۴۱

[2] مکتوب بنام نذیر نیازی ۱۳/ ستمبر ۱۹۲۹ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۸۰-۷۸

کرمنل پروسیجر کوڈ کی رُو سے مجسٹریٹ پر لازم تھا کہ ہر ثبوت اور گواہ کے بارے میں ملزم کی رائے دریافت کرے۔ سیشن کورٹ میں ملزم سے دوبارہ رائے لی جاتی تھی۔ بھوک ہڑتال کی وجہ سے بھگت سنگھ اور ساتھی عدالت میں پیش ہونے کے قابل نہ رہے۔ حکومت نے دہلی میں مرکزی مجلسِ قانون ساز کے سامنے بل پیش کیا کہ کرمنل پروسیجر کوڈ میں ترمیم کر دی جائے۔ اگر کوئی ملزم اپنے آپ کو عدالت میں پیش ہونے کی صلاحیت سے محروم کر لے تو اُس کی یا اُس کے وکیل کی عدم موجودگی میں بھی مقدمہ چلا کر سزا دینے کی اجازت ہو۔

بل کی مخالفت کرنے والوں میں جناح شامل تھے۔ ۱۲ر ستمبر کے اجلاس میں کہا کہ ہندوستان کے اُن بہت سے لوگوں کی نمایندگی کر رہے ہیں جنہیں بھگت سنگھ اور اُن کے ساتھیوں سے اس لیے ہمدردی ہے کہ وہ ایک غیر منصفانہ نظام کے شکار ہیں۔ قتل کا اقدام ضرور مذمت کے قابل ہے لیکن الزام ثابت ہونا ضروری ہے۔ جیل میں بھگت سنگھ اور اُن کے ساتھیوں نے جائز مطالبہ کیا ہے۔ حکومت کے دعوے کے برعکس یہ لوگ یقیناً سیاسی قیدی ہیں۔ قانونی موشگافیوں کے بجائے حکومت کو سمجھنا چاہیے کہ اصل مسئلہ کیا ہے۔ یہ لوگ سیاسی قیدی ہیں مگر حکومت ان کے ساتھ مناسب برتاؤ نہیں کرنا چاہتی۔ اگر حکومت اس بات کا اعتراف کر لیتی تو مسئلہ جلد حل ہو جاتا۔ اس کے بجائے قانون میں تبدیلی کر کے انصاف کے بنیادی تقاضے مسخ کیے جا رہے ہیں۔ یہ ساری زحمت کس لیے؟ صرف اس لیے کہ لاہور سازش کیس کے بھوک ہڑتال کرنے والے ملزموں کی ہمت توڑی جا سکے! جب ایک شخص بھوک ہڑتال کر کے موت کا مقابلہ کرنے پر تیار ہو جائے تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ اُس شخص کی رُوح زندہ ہے اور وہ اپنے مقصد کی سچائی میں ایمان رکھتا ہے۔ اُسے ایک ایسا مجرم سمجھنا غلط ہو گا جس نے سرد مہری کے ساتھ کسی گھناؤنے جرم کا ارتکاب کیا ہے۔ بھگت سنگھ کے اقدامات کی تائید نہیں کی جا سکتی لیکن ان اقدامات کو صرف مجرمانہ فعل سمجھنے کی بجائے یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ایک شیطانی نظامِ حکومت کے خلاف ردِ عمل نوجوانوں کو کچھ کرنے پر مائل کر رہا ہے:

> Mind you, Sir, I do not approve of the action of Bhagat Singh, and I say this on the floor of this House. I regret that, rightly or wrongly, youth today in India is stirred up, and you cannot, when

you have three hundred and odd millions of people, you cannot prevent such crimes being committed, however much you may deplore them and however much you may say that they are misguided. It is the system, this damnable system of Government, which is resented by the people. You may be a cold-blooded logician: I am a patient cool-headed man and can calmly go on making speeches here, persuading and influencing the Treasury Bench. But, remember, there are thousands of young men outside. This is not the only country where these actions are resorted to. It has happened in other countries. Not youth, but greyheaded men have committed serious offences, moved by patriotic impulses.

۱۳ر ستمبر کو لاہور میں بھگت سنگھ کے ساتھی جتندر ناتھ داس نے جیل میں چونسٹھ دن کی بھوک ہڑتال کے بعد دم توڑ دیا۔ "اس کا نقش اہلِ وطن کے قلوب سے کبھی محو نہیں ہو سکتا،" انقلاب نے لکھا:

> کوئی سنگدل سے سنگدل انسان بھی اِس عظیم الشان قربانی کی عظمت و اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جن لوگوں کو بھارت نوجوان سبھا سے، کانگرس سے اور انقلاب انگیز تحریکار سے شدید اختلاف بھی تھا، وہ بھی اس کے انتقال پر اندوہگیں ہوئے، اور اس کی جانفروشی و جانسپاری کی تعریف کیے بغیر نہ رہ سکے۔[1]

۱۴ر ستمبر صبح ۶ بجکر ۴۰ منٹ پر لاہور ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر ۲ سے ہوڑہ ایکسپریس لاش کا صندوق لے کر روانہ ہوئی۔ ایک ہجوم پھولوں کے ساتھ رخصت کرنے آیا۔ کلکتہ تک ہر پلیٹ فارم پر لوگ استقبال کے لیے موجود تھے۔ معلوم ہوتا ہے کہ ماتمی فضا کے باعث لاہور میں ایک جلسہ منسوخ ہوا جو ۱۴ر ستمبر کو رات آٹھ بجے باغ بیرون دہلی دروازہ میں علامہ اقبال کی صدارت میں ہونا تھا۔ دو روز قبل مسلم اخبارات میں چھپنے والے اعلان کے مطابق جلسے کا مقصد قادیان کے مذبح کے انہدام اور کمشنر لاہور کے رویے پر احتجاج، اور گائے ذبح کرنے کے "مذہبی اور ملکی حق کو" "ہمیشہ کے لیے" محفوظ کرنا تھا۔ اعلان میں کہا گیا تھا، "تمام مسلمانوں سے خواہ وہ کسی فرقہ اور کسی گروہ سے تعلق رکھتے ہوں التماس ہے کہ وہ اِس جلسہ میں شریک ہو کر اپنے اِس حق کو محفوظ کرانے میں مُمد ہوں اور

---

[1] انقلاب ۱۷ر ستمبر ۱۹۲۹ء؛ بشکریہ امجد سلیم علوی

وحدت اور حمیتِ اسلامی کا ثبوت دیں۔" دعوت دینے والوں میں انقلاب کے غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالک؛ مسلم آؤٹ لُک کے عبدالمجید اور مولوی نُورُالحق؛ سیلست کے سید حبیب شاہ اور سید عنایت شاہ؛ زمیندار کے مولوی اختر علی؛ بیرسٹر فرخ حسین؛ مسجد دروازہ شیر انوالہ کے امام مولوی احمد علی؛ جماعت احمدیہ لاہور کے سید دلاور شاہ؛ اور احمدیہ انجمن اشاعتِ اسلام کے محمد دین جان اور سینتیس دوسرے شامل تھے۔[1]

۱۴ر ستمبر کو دہلی میں مرکزی مجلسِ قانون ساز میں جناح نے اپنی تقریر مکمل کی۔ برطانوی تاریخ میں وحشیانہ قوانین کے زمانے میں بھی یہ اصول کسی نہ کسی طور پر تسلیم کیا گیا کہ کوئی ملزم اُس وقت تک سزا نہ پائے جب تک اُسے اپنا موقف پیش کرنے کا موقع نہیں مل جاتا۔ مجوزہ ترمیم کے ذریعے اس اصول کی نفی کر کے حکومت اپنی قانون سازی کی پوری تاریخ سے انحراف کر رہی تھی۔ حکومت نے دلیل دی تھی کہ لاہور سازش کیس ایک غیر معمولی مقدمہ ہے کیونکہ چھ سو گواہ پیش کیے جا رہے ہیں۔ جناح نے کہا کہ گواہوں کی اتنی بڑی تعداد سے مقدمے کی اہمیت نہیں بلکہ اس کی خرابی ظاہر ہوتی ہے۔ ایک فارسی حکایت ہے کہ کسی نے طبیب سے کہا کہ باسی روٹی کھانے سے پیٹ میں درد ہو گیا ہے تو طبیب نے اُس کی آنکھوں میں دوا ڈالنے کی تیاری شروع کر دی۔ مریض نے کہا کہ درد پیٹ میں ہے تو طبیب نے کہا کہ اگر تمہاری آنکھیں ٹھیک ہوتیں تو پیٹ میں درد بھی نہ ہوتا کیونکہ تب تم دیکھ لیتے کہ روٹی باسی ہے۔ حکومت کو بھی اپنی آنکھوں کا علاج کروانے کی ضرورت ہے کیونکہ اسے یہ دکھائی نہیں دے رہا کہ وہ دنیا کی واحد حکومت ہے جسے دن رات اپنے شہریوں کو گرفتار کرنے کے سوا کچھ اور کرنے کی فرصت نہیں مل رہی ہے۔ گزشتہ سات آٹھ ماہ سے اخبارات بنگال، مدراس، پنجاب اور ملک بھر میں ہونے والی گرفتاریوں اور مقدموں سے بھرے پڑے ہیں۔ حکومت کو چاہیے کہ مجوزہ بل کے بجائے قیدیوں کا مطالبہ تسلیم کرے:

> Now, let me tell you that your course is to open your eyes, have more imagination, do not be guilty of bankruptcy of statesmanship, do not merely sit there as if the wheels of the Secretariat must not be clogged at any cost, but try and understand

[1] انقلاب ۱۴ر ستمبر ۱۹۲۹ء؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۱۴۳-۱۴۴

> the root cause and deal with the situation as politicians, as statesmen and not as bureacrats, who can see no other way but to come forward before this House and ask for more statutory powers the moment any difficulty arises ... Give these men decent treatment, and I think you will get over your difficulty. At least I hope so, if you do not, you will, at any rate, be exonerated in the eyes of the public and at the Bar of public opinion. Behave as a humane and decent Government, and that is enough for you ... And the last words I wish to address the Government are, try and concentrate your mind on the root cause and the more you concentrate on the root cause the less difficulties and inconveniences there will be for you to face, and thank Heaven the money of the taxpayer will not be wasted in prosecuting men, nay citizens, who are fighting and struggling for the freedom of their country.

کونسل آف اسٹیٹ کا انتخاب دوبارہ ہونے والا تھا۔ علامہ صوبائی مقننہ کے رکن اور پنجاب یونیورسٹی کے فیلو ہونے کی وجہ سے ووٹ دینے کے اہل تھے۔ ۱۶ ستمبر کو گزٹ نمبر ۳۳۰۹ کے ذریعے انتخابی فہرست جاری کی گئی۔ علامہ کا نام ۳۲۴ویں نمبر پر تھا۔[1]

پنجاب کونسل کا اجلاس ۱۸، ۱۹ اور ۲۰ ستمبر کو لاہور میں ہوا۔ پھر کونسل غیر معینہ طور پر برخاست کر دی گئی۔[2]

27

جنرل نادر شاہ اصلاح کے نام سے اخبار نکالتے تھے۔ اس میں ہندوستان کے مسلمانوں کے نام اپیل شائع ہوئی۔ مالی امداد کی درخواست تھی۔ صدر بازار ہردوئی سے حافظ عبدالجبار محمد صابر نے سولہ روپیہ بارہ آنے علامہ کو بھجوائے۔ الٰہ آباد سے کسی نے دو روپے انقلاب کو بھجوائے۔[3] بٹی ضلع لاہور کے عبدالمجید قرشی نے تنظیمِ مساجد کے لیے چندہ اکٹھا کر رکھا تھا۔ قریباً دس ہزار روپیہ امرتسر میں مسلم بینک اور دلی سنٹرل بینک میں جمع ہوا تھا۔ تجویز پیش ہوئی کہ یہ روپیہ نادر شاہ کو بھیج دیا جائے۔

---

[1] ڈاکٹر حسن اختر ملک، اقبال، ایک تحقیقی مطالعہ، ص ۲۴۷

[2] Mitra *The Indian Quarterly Register July-Dec. 1929,* pp.196-198

[3] انقلاب ۱۹ ستمبر ۱۹۲۹ء؛ حمزہ فاروقی، اقبال کا سیاسی سفر، ص ۱۷۶

"حضرت علامہ اقبال نے سب سے پہلے مقامی اسلامی اخبارات سے اس معاملے کے متعلق استصواب کی ضرورت محسوس کی،" انقلاب کا بیان ہے۔ زمیندار، سیاست، مسلم آؤٹ لُک اور انقلاب سے ظفر علی خاں، سید حبیب شاہ، ملک عبدالمجید اور غلام رسول مہر کو اپنے گھر بلایا۔ عبدالمجید قرشی، مولانا احمد علی اور ملک لال دین قیصر بھی موجود تھے۔ پروفیسر سید عبدالقادر اور مولانا غلام مرشد کو بھی بلایا گیا لیکن وہ لاہور سے باہر گئے ہوئے تھے۔ سب نے تجویز کو پسند کیا۔

چند روز بعد برکت علی محمڈن ہال میں اکابرین کا جلسہ ہوا۔ طے پایا کہ اخبارات میں اپیل شائع کی جائے کہ جن لوگوں نے چندہ دیا وہ اسے افغانستان کے "جہادِ امن و استقلال" میں صرف کرنے کی اجازت دیں۔[1] اپیل میں لکھا گیا، "تنظیمِ مساجد کا کام بلاشبہ ضروری ہے لیکن اس کے مقابلے میں ایک ترقی پذیر اسلامی سلطنت کی حفاظت بہت زیادہ ضروری اور اہم و اقدم ہے۔" جن لوگوں نے تنظیمِ مساجد کے لیے چندہ دیا، اُن میں سے

> اگر خدانخواستہ کسی صاحب کو ہماری محولہ بالا تجویز سے اختلاف ہو (جس کے وجود کا ہمیں ایک لمحہ کے لیے بھی خیال نہیں آسکتا، اِس لیے کہ افغانستان کے امن و استقلال کی حفاظت کا مسئلہ ہر حال میں تنظیمِ مساجد سے بدرجہا اہم ہے) تو براہِ کرم اس کی صراحت فرمادیں۔ آٹھ روز تک اگر کسی صاحب کی طرف سے کسی اختلاف کا اظہار نہ ہوا تو سمجھا جائے گا کہ سب کو اس سے اتفاق ہے۔

اس کے نیچے برکت علی محمڈن ہال کے جلسے میں شریک ہونے والے اکابرین کے نام تھے۔ علامہ کے علاوہ مولانا عبدالمجید قرشی، مولانا نورُالحق (مسلم آؤٹ لک)، غلام رسول مہر (انقلاب)، سید حبیب (سیاست)، سید عنایت اللہ (سیاست)، حاجی میر شمس الدین، سید عبدالقادر شاہ، مولوی غلام محی الدین، شیخ عظیم اللہ، سید محسن شاہ، محمد دین ہیڈماسٹر، میاں فیروزالدین، شیخ گلاب دین، چودھری معراج دین، میاں فضل دین، ڈاکٹر سلطان احمد، مولوی فضل دین اور آقائے مرتضٰی احمد خاں (مدیر

---

[1] انقلاب ۲۵ر ستمبر ۱۹۲۹؛ حمزہ فاروقی، اقبال کا سیاسی سفر، ص ۱۹۶، ۱۷۸-۱۷۷

افغانستان) شامل تھے۔[1]

الکلام کے صفحہ ۱۱۳-۱۱۴ پر شبلی نعمانی نے حجۃ اللہ البالغہ کے صفحہ ۱۲۳ کا ایک فقرہ عربی میں نقل کیا۔ مفہوم کا خلاصہ اپنے الفاظ میں بھی دیا۔ عربی فقرے کے آخری حصے کا ترجمہ علامہ کے نزدیک یوں ہو سکتا تھا:

> اِس بنا پر اِس سے بہتر اور آسان طریقہ کوئی نہیں کہ شعار تعزیرات اور انتظامات [میں] خاص اُس قوم کے عادات کا لحاظ کیا جائے جن میں یہ امام پیدا ہوا ہے۔ اس کے ساتھ آنے والی نسلوں پر اُن احکام کے متعلق چنداں سخت گیری نہ کی جائے۔[2]

۲۲/ستمبر کو سلیمان ندوی کے نام خط میں یہ ترجمہ درج کر کے پوچھا، "مندرجہ بالا فقرہ میں لفظ شعار سے کیا مراد ہے اور اس کے تحت میں کون کون سے مراسم یا دستور آتے ہیں۔ اس لفظ کی مفصل تشریح مطلوب ہے۔"

۲۵/ستمبر کو سیالکوٹ میں ابھی فجر کا وقت نہ ہوا تھا۔ پچھلی رات مولوی سید میر حسن نے تہجد کی نماز ادا کی تھی۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد انتقال فرما گئے۔ پچھلے برس آنکھوں کی بینائی زائل ہوئی تھی۔ مرے کالج سیالکوٹ سے سبکدوش ہوئے۔ پنشن مقرر ہوئی۔ دن بدن صحت گرتی گئی۔ گھر پر قرآن شریف، عربی اور فارسی کے درس دیتے رہے۔ قریباً دو ہفتے پہلے یہ سلسلہ موقوف ہوا۔ وفات کے وقت عمر پچاسی برس سے اوپر تھی۔[3]

علامہ لاہور میں تھے۔ صبح کے وقت تار کے ذریعے خبر ملی۔ "خبر سنتے ہی ریلوے اسٹیشن کی طرف چل پڑے،" فقیر سید وحید الدین کا بیان ہے، "وہاں پہنچ کر پتہ چلا کہ سیالکوٹ اس وقت کوئی گاڑی نہیں جاتی۔ اتفاق کی بات کہ اُس وقت ایک مال گاڑی وزیر آباد جا رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اُس

---

[1] انقلاب ۲۶/ستمبر ۱۹۲۹؛ حمزہ فاروقی، اقبال کا سیاسی سفر، ص ۱۸۰-۱۷۸

[2] مکتوب بنام سلیمان ندوی ۲۲/ستمبر ۱۹۲۹ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۸۱-۸۰

[3] ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین (۱۹۸۱)، شمس العلماٗ سید میر حسن حیات و افکار، ص ۱۶۳-۱۶۴

میں بیٹھ گئے اور وزیر آباد پہنچ کر وہاں سے سیالکوٹ جانے کا کوئی بندوبست کیا۔"[1]

سیالکوٹ میں تعلیمی، سرکاری، نیم سرکاری اور نجی ادارے سب سوگ میں بند تھے۔ مسلمان، ہندو، سکھ، عیسائی، احمدی وغیرہ ہر مذہب کے لوگ آخری دیدار کے لیے پہنچ گئے۔ سب نے مل کر جنازہ اُٹھایا۔ قبرستان پہنچایا۔ جنازے کے دونوں طرف دو لمبے لمبے بانس لگائے گئے تھے۔[2] نمازِ جنازہ کا وقت تین بجے سہ پہر تھا۔ شہر کے باہر سے آنے والوں کے انتظار میں موخر کیا گیا۔ علامہ چار بجے پہنچے۔ فقیر وحید الدین کا بیان ہے کہ میر حسن کے خاندان کی خواتین نے کہا، "ساڈا اقبال تے آ گیا" (ہمارا اقبال تو آ گیا)۔ میر حسن کی وصیت کے مطابق میر حسن کے شاگرد مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی نے نمازِ جنازہ پڑھائی۔ عصر اور مغرب کے درمیان میت کی تدفین ہوئی۔[3]

روزناموں نے خبر شائع کی۔ ۲۷ ستمبر کے انقلاب نے لکھا، "علمی و ادبی اعتبار سے آپ سر سید کے نورتنوں میں سے تھے ... یوں کہیے کہ آپ سر سید کے سلسلے کی آخری کڑی تھے۔"[4] بعد میں مَرے کالج میگزین کے میر حسن نمبر میں میر حسن کے شاگرد شیخ ظہور الٰہی مرادن اس پہلو پر روشنی ڈالی۔ اُن کے مضمون کا عنوان تھا، 'زندہ دلانِ پنجاب کا اپنا سر سید۔'[5]

معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کا ذہن شاہ ولی اللہ کے ارتفاقات ہی میں اُلجھا ہوا تھا۔ شبلی نے اس لفظ کا ترجمہ ایک جگہ انتظامات اور دوسری جگہ مسلمات کیا تھا۔ ۲۷ ستمبر کو سیالکوٹ میں حجۃ اللہ البالغہ مطالعہ سے گزری۔ ارتفاقات کی تفصیل سامنے آئی۔[6] سیالکوٹ سے واپسی اُسی دن یا اگلے روز ہوئی۔[7]

---

[1] فقیر سید وحید الدین (۱۹۸۸) روزگارِ فقیر اول، ص ۲۰۸

[2] ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین (۱۹۸۱)، ص ۱۶۳-۱۶۴

[3] ایضاً، ص ۱۶۳-۱۶۴۔ وحید الدین (۱۹۸۸)، ص ۲۰۸

[4] انقلاب ۲۷ ستمبر ۱۹۲۹ء؛ ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین (۱۹۸۱)، ص ۱۶۸

[5] ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین (۱۹۸۱)، ص ۱۶۹؛ مرے کالج میگزین کا میر حسن نمبر جنوری ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا۔

[6] مکتوب بنام سلیمان ندوی ۲۸ ستمبر ۱۹۲۹ء۔ خط پر مقام لاہور درج ہے؛ برنی (۱۹۹۳)، ص ۸۵

[7] مکتوب محولہ بالا پر مقام لاہور درج ہے اور لکھا ہے، "کل سیالکوٹ میں حجۃ البالغہ نظر سے گزری۔"

ندوی کا خط ملا۔ لفظ شعار کی تشریح کی تھی۔ علامہ کا اطمینان نہ ہوا۔ ۲۸ر ستمبر کو دریافت کیا:

کیا کسی جگہ حضرت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں شعائر کی یہ تشریح کی ہے جو آپ نے کی ہے؟ دیگر عرض یہ ہے کہ شاہ صاحب نے اسی فقرہ میں لفظ ارتفاقات استعمال کیا ہے، مولانا شبلی نے ایک جگہ اس کا ترجمہ انتظامات اور دوسری جگہ مسلمات کیا ہے، اُردو ترجمہ سے یہ نہیں کھلتا کہ اصل مقصود کیا ہے۔ کل سیالکوٹ میں حجۃ اللہ البالغہ مطالعہ سے گذری، اس سے معلوم ہوا کہ شاہ صاحب نے ارتفاقات کی چار قسمیں لکھی ہیں۔ ان چار قسموں میں تمدنی اُمور مثلاً نکاح، طلاق وغیرہ کے مسائل بھی آجاتے ہیں۔ کیا شاہ صاحب کے خیال میں ان معاملات میں بھی سخت گیری نہیں کی جاتی؟ میرا مقصد محض شاہ صاحب کا مطلب سمجھنا ہے، مہربانی کر کے اسے واضح فرمایئے۔ سنت پر آپ کا مضمون ضرور دیکھوں گا اور اس سے اپنی تحریر میں فائدہ بھی اٹھاؤں گا۔ اس خط کا جواب جلد ارسال فرمایئے۔[1]

مہر کو خط لکھا جس پر تاریخ درج نہ تھی، ”رسالہ معارف بابت ماہ اگست ۱۹۲۹ء اگر آپ کے پاس ہو تو بھجوایئے، اس میں ایک مضمون سنّت پر ہے۔ اسے دیکھنا مطلوب ہے۔“[2]

میر حسن کی لوحِ مزار کے لیے مصرعِ تاریخ کی جستجو تھی۔ علامہ نے قرآن شریف کی کسی آیت کی جستجو کی۔ وہ آیت برآمد ہوئی جس کے مطابق آنحضورؐ تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے: وماارسلنٰک الا رحمۃ للعٰلمین۔ میر حسن کے بیٹے ڈاکٹر علی نقی کو بھجوا دی۔[3]

28

شاردا بل اسمبلی میں منظور ہو گیا تھا۔ ۲۹ر ستمبر کو لاہور نیوز ایجنسی کا نمایندہ علامہ کی کوٹھی پر آیا۔ علامہ

---

[1] برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۸۵

[2] مکتوب بنام غلام رسول مہر بلا تاریخ؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۸۶

[3] حمزہ فاروقی، حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے ص ۲۴۲ بحوالہ انقلاب ۹ر اکتوبر ۱۹۲۹ء

نے رائے دینے میں زیادہ جوش کا مظاہرہ نہ کیا۔ ابھی تک بل کی پاس شدہ دفعات کا مطالعہ نہ کر سکے تھے۔ یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ لاہور میں مسلمان اس سلسلے میں کیا اقدامات کرنا چاہتے ہیں۔ اپنا خیال یوں ظاہر کیا، ”حکیم نے مرض تو شناخت کر لیا ہے، مگر نسخہ تجویز کرنے میں غلطی کی ہے۔“ اگر مسلمان ایجی ٹیشن کرتے تو بِل مسترد ہو سکتا تھا۔ اگر مسلمانوں نے ایکٹ کے حوالے سے کوئی جلسہ کیا تو علامہ ضرور شرکت کریں گے۔[1]

29

یکم اکتوبر تک چھ لیکچرز لکھے جا چکے تھے۔ ۳/ اکتوبر کے انقلاب میں، جو یکم اکتوبر کو چھپا ہو گا، خبر درج ہے۔ خطبات کا عنوان 'مذہب اسلام اور خیالاتِ حاضرہ' لکھا گیا ہے۔[2]

شاہ ولی اللہ دہلوی کے نزدیک شخصی اور انفرادی حیات سے شروع کر کے خاندانی، قومی و ملکی نظام تک، پھر ملکی نظام سے بین الاقوامی نظام تک تمدنی ارتقا صرف چار ”ارتفاقات“ کے تحت بیان ہو سکتا تھا۔ ارتفاقات سے ان کی مراد وہ نفع بخش انتظامات تھے جو اِنسانی زندگی کے لوازمات میں سے تھے۔ جس باب سے مولانا شبلی نے ایک فقرہ شعائر وارتفاقات کے متعلق نقل کیا، اسی باب میں ایک اور فقرہ نظر سے گذرا جو پہلے نہ دیکھا تھا: ''وشعائر الدین امر ظاہر یختص بہ ویمتاز صاحبہ بہ من سائر الادیان کالختان وتعظیم المساجد والاذان والجمعة والجماعات''، یعنی ”شعائرِ دین ایسی ظاہر خصوصیت ہے جس کے سبب وہ یعنی شعائر کا اختیار کرنے والا دوسرے جملہ ادیان سے ممتاز ہو جاتا ہے جیسے ختنہ، مساجد کی تعظیم، اذان، جمعہ کی نماز اور دیگر جماعتیں۔“ علامہ نے سوچا:

> ارتفاقات میں شاہ صاحب کی تشریح کے مطابق تمام تدابیر جو سوشل اعتبار سے نافع ہوں، داخل ہیں مثلاً نکاح و طلاق کے احکام وغیرہ۔ اگر شاہ صاحب کی عبارت کی یہ تشریح صحیح ہے تو حیرت انگیز ہے۔ اگر ان معاملات میں تھوڑی سی ڈھیل بھی دی

---

[1] انقلاب یکم اکتوبر ۱۹۲۹ء؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتار اقبال، ص ۹۷-۹۴

[2] حمزہ فاروقی، حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۲۲۲-۲۲۳

جائے تو سوسائٹی کا کوئی نظام نہ رہے گا، ہر ایک ملک کے مسلمان اپنے اپنے دستور و مراسم کی پابندی کریں گے۔[1]

ندوی کو خط لکھ کر پوچھا، "یہ شاہ صاحب کی اپنی تشریح ہے، جناب کا ارشاد اس بارے میں کیا ہے؟" معلوم ہوتا ہے کہ خط ۲/اکتوبر کو لکھا گیا۔ غلطی سے ۲/ستمبر لکھ گئے۔[2]

هُوَ الله

تحریر روز ۹/ربیع الثانی ۱۳۴۸ھ مقام علی خیل

جناب فاضل محترم ایم اے، پی ایچ ڈی، بیرسٹر ایٹ لا سر محمد اقبال!

آپ نے اپنے ان عالی جذبات ہمدردانہ سے، جو آپ افغانستان کی موجودہ تباہ حالی کے متعلق رکھتے ہیں، مجھے اور افغانستان کے عام بہی خواہوں اور فداکاروں کو ممنون و متشکر بنا دیا ہے۔ افغانستان تباہی کے نزدیک ہے۔ اس کی بے چارہ ملت کو بہت بڑے تہلکہ کا سامنا ہے۔ افغانستان اپنے ہندی بھائیوں کی ہر قسم کی امداد و اعانت کا محتاج ہے۔ آپ ایسے وقت میں جو خیر خواہانہ قدم اٹھا رہے ہیں، وہ ہمارے لیے ڈھارس کا موجب ہے، خصوصاً مالی امداد کا مسئلہ جس کے متعلق اخبار اصلاح کے ذریعہ سے اپنے ہندی بھائیوں کے لیے شائع کر چکا ہوں، بہت حوصلہ افزا ہے۔ امید ہے کہ جناب فاضل محترم جو روحاً افغانستان کی موجودہ مصیبت میں شریک ہیں، اس موقع پر اپنی مساعی سے کام لے کر افغانستان کی رنج زدہ قوم کو ہمیشہ کے لیے ممنون و مشکور فرمائیں گے۔

بااحترامات لائقہ

محمد نادر خان[3]

جنرل محمد نادر خاں، افغانستان کے معزول حکمران امان اللہ کے قریبی رشتہ دار تھے۔ والدہ لاہور میں

---

[1] برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۸۲

[2] ایضاً

[3] انقلاب ۲/اکتوبر ۱۹۲۹ء؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتار اقبال، ص ۱۰۰-۹۸

پیدا ہوئی اور یہیں پلی بڑھی تھیں۔ علامہ نے بعد میں انہیں ''آدھا پنجابی'' کہا۔[1] کچھ عرصہ پہلے امان اللہ خاں سے اختلافات کی وجہ سے ملک چھوڑ گئے تھے۔ اب پہلے ہندوستان آئے۔ پھر بچۂ سقّا کو شکست دینے افغانستان کی طرف روانہ ہوئے۔ کچھ عرصہ علی خیل میں قیام کیا۔ ۱۳؍ستمبر ۱۹۲۹ء کو علامہ کے نام لکھا ہوا یہ خط ۲؍اکتوبر کے انقلاب میں آیا۔ ممکن ہے کہ اصل خط فارسی میں ہو۔ ایک روایت کہ افغانستان جاتے ہوئے لاہور سے گزرے تو علامہ نے بھی اسٹیشن پر ملاقات کی۔[2]

۳؍اکتوبر کو خان سعادت علی خاں رئیسِ اعظم لاہور کے گھر مسلم اکابرین کا جلسہ ہوا۔ علامہ نے صدارت کی۔ جنرل نادر خاں کی مالی امداد پر غور کیا گیا۔ نادر خان ہلالِ احمر فنڈ کھولنے کا فیصلہ ہوا۔ مجلسِ عاملہ بنی۔ علامہ صدر منتخب ہوئے۔ مولانا عبدالمجید قرشی سکریٹری، خان سعادت علی خاں فنانشل سکریٹری اور مسلم بنک آف انڈیا خازن قرار پائے۔ ارکان مولوی غلام محی الدین، سید محسن شاہ، مولانا غلام مرشد، ملک میراں بخش خاں، مولوی محمد دین، حافظ حسین بخش اور مولوی صدرالدین تھے۔[3] میر غلام بھیک نیرنگ کی طرف سے اخبارات کے نام ایک خط آیا کہ تنظیمِ مساجد کی رقم افغانستان کی امداد کے لیے دینے سے پہلے چندہ دینے والوں کو صرف آٹھ روز کی مہلت کافی نہیں ہے۔ زیادہ ہونی چاہیے۔ علامہ کے نام خط میں زیادہ تفصیل سے بھی لکھا۔ اصولی طور پر متفق تھے۔[4]

حکومت نے بھگت سنگھ کے مطالبات تسلیم کرنے کا اعلان کیا۔ کانگریس نے بھگت سنگھ سے سفارش کی کہ بھوک ہڑتال ختم کر دیں۔ ۴؍اکتوبر کو اُنہوں نے ختم کر دی۔ ۱۵؍جون کو شروع ہوئی

---

[1] مکتوب بنام عبدالجمیل منگلوری ۴؍مارچ ۱۹۳۰ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۱۰۴

[2] وحیدالدین (۱۹۸۸)، ص۸۹ کے مطابق علامہ نے رقم پیش کی۔ ان کی جمع پونجی تھی۔ اللہ بخش یوسفی کہتے ہیں کہ علی خیل سے نادر خاں کے خطوط ایم اے حکیم کے پاس پہنچائے جاتے اور وہاں سے اللہ بخش لے کر سالک کی مدد سے علامہ تک لے جاتے؛ شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص۱۰۸ بحوالہ سرحد اور جدوجہدِ آزادی از اللہ بخش یوسفی، ص۱۰۸

[3] انقلاب ۵؍اکتوبر ۱۹۲۹ء؛ حمزہ فاروقی، اقبال کا سیاسی سفر، ص ۱۸۳-۱۸۲

[4] انقلاب ۱۶؍اکتوبر ۱۹۲۹ء؛ حمزہ فاروقی، اقبال کا سیاسی سفر، ص ۱۸۵-۱۸۴

تھی۔ درمیان میں صرف دو دن کے لیے معطل ہوئی۔ دنیا کی طویل ترین بھوک ہڑتال تھی۔

نقرس کے درد نے علامہ کو پھر نڈھال کر دیا۔ پاؤں میں سخت تکلیف تھی۔ خبر ملی کہ مولوی احمد دین فوت ہو گئے۔ پاؤں کے درد کی وجہ سے علامہ جنازے میں شریک نہ ہو سکے۔ "مجھے یہ افسوس تازیست رہے گا کہ مرحوم کے لیے آخری دعا جو کی گئی، مَیں اس میں شریک ہونے سے محروم رہا،" اُن کا بیان تھا۔ اگلے روز دانت کے درد کا اضافہ ہو گیا۔ علامہ نے خواجہ فیروز الدین کے ہاتھ مولوی احمد دین کے لڑکے خواجہ بشیر احمد کو معذرت کا پیغام بھجوایا۔

۱۰ اکتوبر کو انجمن حمایت اسلام کی میٹنگ تھی۔ اُس کے بعد تعزیت کے لیے جانے کا ارادہ تھا مگر جلسے میں خاصی دیر ہو گئی۔ اگلے روز خواجہ بشیر احمد کے نام تعزیتی خط لکھا اور معذرت پیش کی۔ جلد ملاقات کا ارادہ ظاہر کیا۔[1]

حضور نظام نے اطلاع دی تھی کہ انجمن کے سالانہ جلسے کے لیے نہیں آ سکتے۔ روایت ہے کہ علامہ نے نواب صادق علی خان، والیٔ ریاست بہاولپور کو دعوت دی۔ اُنہوں نے قبول کر لی۔[2]

نادر خان ہلالِ احمر فنڈ

[علامہ اقبال کی طرف سے اپیل]

برادران ملت و جوانان اسلام!

افغانستان کے حالات آپ کو معلوم ہیں۔ اس وقت اسلام کی ہزارہا مربع میل سرزمین اور لاکھوں فرزندان اسلام کی زندگی اور ہستی خطرے میں ہے اور ایک درد مند اور غیور ہمسایہ ہونے کی حیثیت سے مسلمانان ہند پر ہی یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ افغانستان کو بادِ فنا کے آخری طمانچے سے بچانے کے لیے جس قدر دلیرانہ کوشش بھی ممکن ہو کر گذریں۔

لاہور میں جنرل نادر خان اور افغانستان کے زخمی سپاہیوں، بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کی امداد و

[1] مکتوب بنام خواجہ بشیر احمد؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۸۸-۸۶

[2] محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶)، اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص ۱۲۱

اعانت کے لیے 'نادر خان ہلال احمر سوسائٹی' قائم ہو چکی ہے، جس کا دفتر بالعموم صبح چھ بجے سے لے کر دس بجے رات تک برکت علی اسلامیہ ہال میں کھلا رہتا ہے۔

حالات کی نزاکت کو مد نظر رکھتے ہوئے انجمن نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ وہ کم سے کم وقت میں لاہور اور ہندوستان سے زیادہ سے زیادہ روپیہ جمع کرنے کے لیے اپنی قوت و کوشش صرف کر دے۔ اس غرض کے لیے ایسے ایثار پیشہ کارکنوں کی ضرورت ہے جو رضاکارانہ حیثیت سے مقررہ وقت پر اور منظم طریق سے لاہور میں کام کریں۔

اس کے علاوہ دفتر کو تمام ملک سے خط و کتابت کرنا ہے، ہزاروں اپیلیں بھیجنی ہیں، سیکڑوں اخبارات اور ہر ایک شہر کے رؤسا، امرا اور اسلامی انجمنوں کو خطوط لکھنے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس قدر وسیع کام، جو لاہور کے ہر ایک گلی کوچہ پر مسلط ہو اور دوسری طرف تمام ملکی اخبارات اور تمام اسلامی انجمنوں اور بستیوں پر محیط ہو، مستقل مزاج، سنجیدہ، دردمند، ذی عزم اور بااحساس کارکنوں کی امداد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

جنرل نادر خان کی امداد کو اس کی حقیقی اہمیت کے مطابق وسعت دینے کے لیے ایسے جوا‌ں ہمت کارکنوں کی ضرورت ہے جو مقامی طور پر وارڈوار پبلک جلسوں کے انعقاد اور ملکی اخباروں، انجمنوں، قومی کارکنوں اور تمام فیاض اور ذی استطاعت صاحب سے خط و کتابت کرنے میں انجمن کو امداد دیں۔

میں اپنے ان تمام سنجیدہ اور مخلص عزیزوں سے، جن کے دل میں اسلام کا درد ہے جو آزاد اور متحدہ افغانستان کی اہمیت کو سمجھتے ہیں اور ان تمام مقامی انجمنوں کے اراکین سے جو 'نادر خان ہلال احمر سوسائٹی' سے تعاون و اشتراک عمل کے لیے آمادہ ہوں، بڑے زور سے اپیل کرتا ہوں کہ وہ برکت علی اسلامیہ ہال میں قریشی صاحب سے ملیں اور اپنے وقت کا کچھ حصہ معمولی تفریح یا کم ضروری مشاغل سے بچا کر 'انجمن ہلال احمر' کے کام میں صرف کریں اور یقین کریں کہ یہاں لاہور میں آپ کا

ایسا کرنا خود افغانستان میں پہنچ کر جنرل نادر خان صاحب کی امداد کرنے کے مترادف ہو گا۔

محمد اقبال

۱۱؍اکتوبر ۱۹۲۹ء[1]

۱۶؍اکتوبر کو بچۂ سقا کی فوجیں شکست کھا چکی تھیں۔ محمد نادر شاہ غازی اب افغانستان کے نئے حکمراں تھے۔ ہندوستان میں بالخصوص مسلمانوں میں ان کی فتح پر مبارک باد کے جلسے منعقد ہونے لگے۔ علامہ اقبال، میاں شفیع، سید محسن شاہ، ملک محمد حسین، ملک برکت علی، سعادت علی خاں، خواجہ فیروزالدین احمد بیرسٹر ایٹ لائ، ڈاکٹر غلام محمد اور مولوی غلام محی الدین نے انقلاب کے مجوزہ اعلان پر دستخط کیے:

> ہمیں نادر خاں غازی کی ذات پر کامل اعتماد ہے اور ہم تمام مسلمانوں کی خدمت میں استدعا کرتے ہیں کہ وہ بھی اس غیور محبِ وطن پر پورا اعتماد رکھیں۔ اِس وقت اس کے کسی فعل پر ایک لمحہ کے لیے بھی عدم اعتماد کا اظہار خطرناک ہو گا اور خدانخواستہ از سرِ نو خانہ جنگی میں اُلجھا دے گا۔ ہمیں یقین ہے کہ تمام مسلمان اس موقع پر بے حد حزم و احتیاط سے کام لیں گے۔

نادر خاں ہلالِ احمر سوسائٹی کے صدر اور سکریٹری کی حیثیت میں علامہ اقبال اور خان سعادت علی خاں نے حکومتِ برطانیہ سے درخواست کی ''کہ وہ جنرل نادر خاں کو فی الفور افغانستان کا بادشاہ تسلیم کرلے تاکہ ہمسایہ ملک میں مزید بدامنی کا خاتمہ ہو جائے۔''[2]

30

خواجہ غلام السیدین تہران گئے ہوئے تھے۔ وہاں سے ان کا خط موصول ہوا۔ علامہ کو مشورہ دیا تھا کہ اپنی تین کتابیں کسی آغا سید مدنی کو بھجوادیں۔ علامہ نے بھجوادیں۔[3]

---

[1] انقلاب ۱۱؍اکتوبر ۱۹۲۹ء؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتار اقبال، ص ۱۰۰-۹۸

[2] انقلاب ۲۰؍اکتوبر ۱۹۲۹؛ حمزہ فاروقی، اقبال کا سیاسی سفر، ص ۱۸۶-۱۸۵

[3] مکتوب بنام خواجہ غلام السیدین ۲۵؍اکتوبر ۱۹۲۹ء میں تذکرہ ہے؛ برنی (۱۹۹۳)، ص ۹۳-۹۲

ہندو اخبار ملاپ نے لکھا کہ ڈاکٹر محمد عالم نے جیتندر داس کی موت پر احتجاج میں کونسل کی رکنیت سے استعفیٰ دیا۔ ڈاکٹر اقبال کو چاہیے کہ شاردا ایکٹ کے خلاف احتجاج میں مستعفی ہو جائیں۔ اس قانون سے اسلامی شریعت میں مداخلت ہوتی ہے۔ ۲۰/ اکتوبر کے انقلاب میں سالک نے اپنے کالم 'افکار و حوادث' میں لکھا، ''کونسل سے مستعفی ہو جانا، احتجاج کا لازمی طریقہ کیونکر بن گیا... اگر ڈاکٹر اقبال کی جماعت آج یہ فیصلہ کرلے کہ ساردا ایکٹ کے خلاف احتجاج کے طور پر کونسل سے مستعفی ہونا ضروری ہے تو ڈاکٹر صاحب پہلے شخص ہوں گے جو کونسل چھوڑ دیں گے۔''[1]

۲۰/ اکتوبر کو علامہ، حاجی شمس الدین، خان بہادر شیخ امیر علی اور بعض دوسرے لوگوں نے طے کیا کہ نادر شاہ ہلالِ احمر فنڈ کی طرف سے ہر روز شہر کا دورہ کریں گے۔ سب سے پہلے میاں عبدالعزیز کے پاس گئے۔ انہوں نے سو روپے ملے۔ فیروز پرنٹنگ پریس کے مالک مولوی فیروزالدین نے پچاس دیئے۔ میاں نظام الدین نے پانچ سو کا وعدہ کیا۔[2]

۲۳/ اکتوبر کے انقلاب میں ''اکابرِ پنجاب'' کی طرف سے حکومتِ برطانیہ کو یاددہانی ہوئی، ''اعلیٰ حضرت نادر خاں کو بادشاہ تسلیم کرنے میں تاخیر نہ کرو۔'' دستخط کرنے والوں میں علامہ شامل تھے۔[3]

عبدالرحمٰن چغتائی کا مرقع چغتائی شائع ہوا۔ خصوصی ایڈیشن کا ایک نسخہ عبداللہ چغتائی کے ذریعے علامہ اقبال کو بھجوایا۔ ۲۴/ اکتوبر کو علامہ نے عبداللہ کو لکھا، '''مرقع چغتائی' کی ایک کاپی، جو عبدالرحمن صاحب نے بھیجی ہے، مجھے مل گئی ہے۔ مگر یہ کتاب بیش قیمت ہے۔ آپ اس کی جگہ دوسری ایڈیشن کی کاپی ہدیۃً مجھے دے دیں اور اِس کو اپنے مصرف میں لائیں۔ کیا آپ نے میری تصویر کا بلاک حاصل کرلیا؟''[4]

اُس رات علامہ نے راس مسعود کی تقریر کی روداد پڑھی۔ چند روز پہلے علیگڑھ میں دی گئی تھی۔

---

[1] حمزہ فاروقی، حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے ص ۴۳۰-۴۳۱ بحوالہ کالم 'افکار و حوادث' انقلاب ۲۰/ اکتوبر ۱۹۲۹ء

[2] انقلاب ۲۲/ اکتوبر ۱۹۲۹ء؛ حمزہ فاروقی، اقبال کا سیاسی سفر، ص ۱۸۷-۱۸۶

[3] حمزہ فاروقی، اقبال کا سیاسی سفر، ص ۱۸۹-۱۸۷

[4] برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۸۸

بہت خوشی محسوس کی۔ اگلے روز خواجہ غلام السیدین کا خط موصول ہوا تو جواب دیتے ہوئے لکھا:

> علیگڑھ تحریک اسلامِ جدید کی ترقی میں بڑا رول ادا کر سکتی ہے بشرطیکہ یونیورسٹی کے اربابِ حل و عقد ان تمام واقعات کا وسیع النظری سے مطالعہ کریں جو آج کی دنیائے اسلام میں رونما ہو رہے ہیں اور ذہانت کے ساتھ ان کو [انہی] حالات میں مقامی رنگ دیں جن میں علیگڑھ کالج کا بانی تھا جو بنیادی طور پر سلفی مسلمان تھا مگر جس کی تحفظ پسندی کبھی اس کی روح کی آزادہ روی میں مانع نہیں ہوئی۔[1]

ڈاکٹر عالم کے استعفے کے بعد اُن کے حلقے، شہری شمال مغربی پنجاب (راولپنڈی اور ملتان ڈویژن)، میں نومبر کے آغاز میں انتخاب ہونے والا تھا۔ علامہ نے سرگودھا کے شیخ عبدالغنی ایڈووکیٹ کو مناسب اُمیدوار سمجھا کیونکہ وہ "مسلم آل پارٹیز کانفرنس کے مقاصد سے متفق ہیں" اور "نہرو رپورٹ کے حامی نہیں"۔ اُن کے حق میں علامہ، ملک فیروز خاں نون، چودھری ظفراللہ خاں بیرسٹر اور نواب میاں احمد یار خاں دولتانہ نے اخبارات میں التماس شائع کروایا۔ چنیوٹ، بھیرا، سرگودھا، جھنگ، گھیانہ، میانوالی، مظفر گڑھ، ملتان، منٹگمری، جہلم اور راولپنڈی کے نمایندوں کے دستخط بھی تھے، "ہمیں اعتماد ہے کہ ہماری خواہش رائیگاں نہ جائے گی اور کوئی اور صاحب خود کو بطور امیر [اُمیدوار] پیش نہ کریں گے۔"[2]

۲۸/ اکتوبر کو علامہ، سعادت علی خاں، میاں عبدالعزیز اور حاجی شمس الدین لاہور کے چمڑے کے سوداگروں خضر حیات اور میاں فضل الٰہی سے ملے۔ نادر خاں فنڈ کے لیے چندہ حاصل کرنا تھا۔[3]

شاکر صدیقی نے خط میں پوچھا کہ کیا شعر میں "اشکِ ندامت" کو کورہٴ نور سے تشبیہ دینا درست ہے؟ ۲۹/ اکتوبر کو علامہ نے لکھا، "میرے خیال میں یہ استعارہ درست نہیں۔"[4]

---

[1] مکتوب بنام خواجہ غلام السیدین ۲۵/ اکتوبر ۱۹۲۹ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۹۰

[2] انقلاب ۲۵/ اکتوبر ۱۹۲۹ء؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۱۴۵-۱۴۶

[3] انقلاب ۳۰/ اکتوبر ۱۹۲۹ء؛ حمزہ فاروقی، اقبال کا سیاسی سفر، ص ۱۹۶، ۱۸۹

[4] برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۹۱

31

علم دین کو لاہور جیل سے احتیاطاً میانوالی جیل منتقل کیا جا چکا تھا۔[1] ۱۵/ تاریخ کو لندن میں پریوی کونسل نے علم دین کے والد طالعمند کی رحم کی اپیل مسترد کی تھی۔ ۳۰/ اکتوبر شام چھ بجنے میں دس منٹ پر علامہ کے منشی طاہر الدین کو میانوالی سے طالعمند کا تار ملا۔ کل پھانسی دی جا رہی ہے۔ ڈپٹی کمشنر نے کہا ہے کہ میت کو لاہور لانے کی اجازت نہ ہو گی۔ انقلاب کے مطابق:

> منادوں اور ڈھینڈوچیوں نے ڈھول اور نقاروں کی صداؤں کے ساتھ خود بخود شہر میں اعلان کرنا شروع کر دیا اور لوگ مختلف جلوسوں کی شکل میں مرتب ہو کر شہر کا گشت کرنے لگے۔ ہر طرف سے اللہ اکبر اور غازی علم دین زندہ باد کے نعروں کی گونج سنائی دینے لگی۔ مسلمان عام طور پر اِس خبر پر بہت مشتعل ہو رہے ہیں کیونکہ حکومت نے مسٹر جتیندر ناتھ داس کی نعش کو ہندوؤں کی ایجی ٹیشن سے ڈر کر کلکتہ لے جانے کی اجازت دے دی تھی اور میاں علم دین کی میت کو لاہور لانے سے روکنے میں حکومت نے مسلمان قوم کی سخت توہین کی ہے۔

۳۱/ اکتوبر کو صبح سات بجے میانوالی جیل میں علم الدین کو پھانسی دے دی گئی۔ آٹھ بجے لاش پھانسی سے اُتاری گئی۔ جیل کے باہر مسلمانوں کا ہجوم تھا۔ پولیس کے پہرے میں میت کچھ دیر کے لیے باہر لائی گئی۔ پھر لاوارثوں کے قبرستان میں دفن کر دی گئی۔ پولیس پر پتھراؤ ہوا۔ پولیس نے لاٹھی چارج کیا۔

لاہور میں مسلم اکابرین علامہ کی کوٹھی پر جمع ہوئے۔ لال دین قیصر نے اکٹھا کیا تھا۔ شہر میں مسلمانوں کی دکانیں بند تھیں۔ پولیس کی بھاری نفری مشین گنوں کے ساتھ گشت کر رہی تھی۔ ٹیلیگرام پر عارضی پابندی تھی۔[2] علم الدین کے بارے میں مسلمانوں میں دو طرح کی آرأ موجود تھیں۔ دونوں طرح سے وہ شہید تھا:

۱ جن لوگوں کے خیال میں راجپال کا قتل علم دین ہی نے کیا تھا وہ سمجھتے تھے کہ اُس نے چالیس

---

[1] ۳/ اکتوبر کو منتقل کیا گیا تھا۔

[2] انقلاب ۳/ نومبر ۱۹۲۹ء

کروڑ مسلمانوں کے مقدس و محبوب آقا کی عزت و حرمت کی حفاظت میں جان قربان کر کے ایک غریب اور مجبور قوم کی بے حرمتی پر غیرت کھائی۔ اُس کا ہاتھ کسی کمزور پر نہیں بلکہ اپنے سے زیادہ طاقتور دشمن پر اُٹھا اور دوسرے کے مذہب پر اعتراض کرنے کی بجائے صرف اپنے رسول کی توہین کرنے والے سے انتقام لے کر وہ اِس بات کی علامت بنا کہ کسی بھی مذہب کے بانی کی توہین نہیں ہونی چاہئیے۔ ''ہم کہتے ہیں کہ ہر مذہب دوست انسان اور مقدس بانیانِ مذاہب و اَدیان کو اعزاز و احترامِ حقیقی کا مستحق سمجھنے والا ہر اِنسان ایسے اولوالعزم شہید کے پاؤں چومے گا،'' مہر نے اس موقف کی وضاحت میں لکھا۔

۲ دوسری رائے یہ تھی کہ راجپال کا قتل کسی اور نے کیا جسے پکڑا نہیں جا سکا اور علم الدین پر جھوٹا مقدمہ بن گیا۔ بے گناہ نوجوان نے صرف اِس بات کی سزا پائی کہ وہ مسلمان تھا۔ اُس کا بیگناہ خون اُس عشق کی قیمت بن گیا جو صحابہؓ کرام کے زمانے سے لے کر میدانِ حشر میں جمع ہونے والے تمام مسلمانوں تک ہر مسلمان کے دل میں ہے اور رہے گا۔ ''اِس لحاظ سے یہ مقدس ہستی بڑے سے بڑے اعزاز اور بڑے سے بڑے اجلال کی مستحق ہے، اور کوئی انسانیت دوست انسان اس کے سامنے گردنِ نیاز خم کیے بغیر نہیں رہ سکتا،'' مہر نے لکھا۔[1]

میت نہ ملنے کی اطلاع نے مسلمانوں میں غیر معمولی اثر پیدا کیا۔ ''اُس لاش کو جس کے وارث دنیا کے بیالیس کروڑ مسلمان ہیں جابر اور ظالم حکومت نے لاوارثوں کے قبرستان میں سپردِ خاک کر دیا!''[2] یہ احساس ہزاروں کو لاہور کی سڑکوں پر کھینچ لایا۔ ننگے سر تھے۔ ''غازی علم الدین زندہ باد''، ''ڈپٹی کمشنر مردہ باد'' اور ''استبداد کا بیڑہ غرق'' کے نعرے سنائی دے رہے تھے۔ ''اِس سے قبل لاہور میں اتنا عظیم الشان جلوس نہ نکلا تھا،'' مہر کا خیال تھا، ''اِس جلوس کا انتظام کسی جماعت کے ہاتھ میں نہ تھا لیکن جلوس بڑا کامیاب رہا۔''

---

[1] انقلاب ۳/ نومبر ۱۹۲۹ء

[2] ایضاً

دوپہر کے بعد علامہ اقبال نے برکت علی محمڈن ہال میں جلسے کی صدارت کی۔ پھر جلسے کی رائے کے مطابق فنانس ممبر اور چیف سکرٹری کے پاس جا کر میت کو لاہور لانے کا مطالبہ کیا۔ معلوم ہوا کہ گورنر کی اجازت چاہیے۔ چھ بجے واپس ہال پہنچے۔ پھر جلسے کی رائے سے میاں امیر الدین اور میاں عبدالعزیز کے ساتھ گورنر سے ملاقات کا وقت لینے روانہ ہوئے۔[1]

اُسی روز وائسرائے ہند لارڈ اِرون کی طرف سے اعلان ہوا تھا کہ ہندوستان کے آئینی مسئلے کے حل کے لیے لندن میں گول میز کانفرنس بلوائی جائے گی۔ ہندوستان کے رہنماؤں کے علاوہ دیسی ریاستوں کے نمایندے بھی مدعو کیے جائیں گے۔ برطانوی پالیسی کا اصول یہ ہے کہ ہندوستان کو مستعمرات (ڈومینین) کے پیمانے کی حکومت دی جائے۔

32

یکم نومبر کی صبح پھر علامہ کے گھر پر علم الدین کی میت حاصل کرنے کے صلاح مشورہ ہوا۔ علامہ کی طرف سے بیان جاری کیا گیا: ''اگر حکومت کو میاں علم الدین کی نعش کے جلوس سے نقصِ امن کا خطرہ ہے تو ڈاکٹر سر محمد اقبال ہر قسم کی ضمانت دینے اور ذمہ داری اُٹھانے کو تیار ہیں۔''[2]

مجوزہ گول میز کانفرنس کے بارے میں علامہ، سر میاں محمد شفیع، مولانا غلام محی الدین، خلیفہ شجاع الدین، شیخ نیاز مند، میاں عبدالعزیز، میاں شاہنواز اور سید محسن شاہ نے مشترکہ بیان جاری کیا۔ وائسرائے کے ۳۱/اکتوبر کے بیان کو ''ملک معظم کی حکومت اور وائسرائے کی طرف سے ہندوستان کے پیچیدہ مسئلے کے اطمینان بخش حل کی نہایت سچی خواہش کا نتیجہ'' قرار دیا جو ''ہندوستان کے سیاسی مسئلے کا اطمینان بخش حل پیش کرتا ہے''۔ کانفرنس کی کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ ہندو مسلم اختلافات کانفرنس سے پہلے طے ہو جائیں۔ اس کے علاوہ ''جو نمایندے اس کانفرنس میں جائیں وہ تمام قوموں کے حقیقی نمایندے ہونے چاہییں... اگر مختلف مفادات کے حقیقی نمایندوں کے انتخاب کا

---

[1] انقلاب ۳/نومبر ۱۹۲۹ء بشکریہ امجد سلیم علوی

[2] ایضاً

خیال نہ رکھا گیا اور زیادہ شور مچانے والے طبقے کو مطمئن رکھنے کے اضطراب کو دستورِ عمل بنالیا گیا تو کانفرنس یقیناناکام رہے گی۔"[1]

یکم نومبر کو افغانستان میں بچۂ سقا اور اُس کے ساتھیوں کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ نادر خاں اپنی حکومت مستحکم کر رہے تھے۔

۳/ نومبر کو صوبائی مسلم لیگ کی طرف سے قرارداد منظور ہوئی کہ شہید علم الدین کی لاش کا مسلمانوں کو نہ دینا حکومت کی سخت غلطی ہے۔[2]

علامہ نے جنوبی ہند کے کسی عبدالغفور صاحب، رسالہ الکلام کے مدیر اور سیٹھ اسماعیل وغیرہ کو نجی خطوط لکھے کہ افغانستان کی سالمیت نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں بلکہ پورے وسطی ایشیا کے لیے اہم ہے۔ نادر خاں کے ہلالِ احمر فنڈ میں چندہ دیں۔ عبدالجمیل منگلوری نے دس روپے کا چندہ بھیجا۔ ۴/ نومبر کو علامہ نے جوابی خط میں شکریہ ادا کیا۔ سلطان شہید یعنی ٹیپو سلطان کے قلمی روزنامچے کے لیے یاددہانی کروائی۔[3]

مہاراجہ الور کی طرف سے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کو دینی درس کے لیے چھ ہزار روپیہ سالانہ کا عطیہ منظور ہوا تھا۔ استعمال نہ ہوا تھا۔[4] ممکن ہے کہ اسی مد میں علامہ کو تشکیلِ جدید کے لیکچرز علیگڑھ میں دینے کی دعوت بھیجی گئی ہو۔ اسی ماہ علیگڑھ میں دیے جانے تھے۔ حیدرآباد دکن کی عثمانیہ یونیورسٹی سے جنوری کے لیے دعوت آئی۔ مدراس سے بھی دعوت آچکی تھی۔ علامہ کا خیال تھا کہ دوبارہ اتنی دُور نہ جاسکیں گے۔[5]

---

[1] انقلاب ۳/ نومبر ۱۹۲۹ء

[2] انقلاب ۵/ نومبر ۱۹۲۹ء

[3] مکتوب بنام عبدالجمیل بنگلوری ۴/ نومبر ۱۹۲۹ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۹۲-۹۱

[4] نیز حمزہ فاروقی، حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے ص ۲۰ بحوالہ انقلاب ۱۴/ جولائی ۱۹۲۹ء

[5] مکتوب بنام عبدالجمیل بنگلوری ۴/ نومبر ۱۹۲۹ء محولہ بالا

33

خواجہ خورشید انور کی عمر سترہ برس تھی۔ اُن کی والدہ علامہ اقبال کی پہلی بیوی کریم بی بی کی چھوٹی بہن تھیں جن کی شادی علامہ کی سفارش پر علامہ کے شاگرد بیرسٹر خواجہ فیروز الدین سے ہوئی تھی، جنہوں نے علم الدین کے مقدمے میں بیرسٹر فرخ حسین کی مدد بھی کی تھی۔

اب میت حاصل کرنے کے لیے ملک لال دین قیصر نے علم الدین کمیٹی بنائی تھی۔ اس کا دفتر کوچہ چابک سواراں میں تھا۔ کمیٹی "فدا کار" بھرتی کر رہی تھی جو میت حاصل کرنے کے لیے عدم تشدد کے طریقے سے جان دینے پر تیار ہوں۔ ظفر علی خاں ان کے "امیر" تھے۔ یہ لوگ علم الدین کی تصویر اُٹھائے شہر بھی میں گاتے پھرتے تھے:

غازی کی لاش لینے ہم گھر سے جا رہے ہیں　　　ناموسِ مصطفیٰؐ پر جانیں لُٹا رہے ہیں

چند روز پہلے یہ علم الدین کے گھر بھی گئے تھے جہاں شہید کی ماں نے ان کے سامنے ایک بات کہی جو فوراً مشہور ہو گئی۔ اُنہوں نے کہا، "اگر میرے سات لڑکے ہوتے اور وہ اِسی طرح تحفظِ ناموسِ رسولؐ کے لیے قربان ہو جاتے تو میں زیادہ خوش ہوتی۔ میرا لڑکا خدا کا مال تھا۔ الحمدللہ کہ خدا کے کام آیا۔"

خورشید انور نے بھی فدا کاروں میں اپنا نام لکھوایا۔ انتظار نہیں کرنا چاہتے تھے۔ پہلے جتھے کے لیے سترہ افراد منتخب کیے جا چکے تھے۔ اب خورشید انور اور پانچ دوسرے فدا کاروں کو بھی اُس میں شامل کر لیا گیا۔

۶ر نومبر کو شام پانچ بجے یہ لوگ کوچہ چابک سواراں میں علم الدین کمیٹی کے دفتر سے جلوس کے ساتھ نکلے۔ تین گھنٹے بعد باغ بیرون دہلی دروازہ میں جلسہ ہونے والا تھا۔ توقع تھی کہ آج سرفروشی کا اعلان ہو جائے گا۔

اُس وقت میکلوڈ روڈ پر علامہ کی کوٹھی میں شہر کے مسلم عمائدین جمع تھے۔ دن میں علامہ، میاں سر محمد شفیع اور ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین نے گورنر سے طویل ملاقات کی تھی۔ گورنر نے کچھ شرائط پیش کی تھیں۔ اب علامہ کی کوٹھی میں بند کمرے میں ان پر غور کیا جا رہا تھا۔ فی الحال شرائط خفیہ رکھی گئیں۔ پریس کو صرف اتنی خبر دی گئی کہ اُمید بندھ گئی ہے۔

گورنر سے ملاقات کے دوران حکومت کا موقف یہ سامنے آیا تھا کہ میت لاہور لانے میں خطرہ تھا کہ ہندو مسلم فساد نہ ہو جائے۔ شروع شروع میں ہندو پریس نے علم الدین کے ہیرو بنائے جانے پر اعتراض کیا تھا۔ جواب میں مسلم اخباروں نے بھگت سنگھ وغیرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اگر وطن کے نام پر ڈاکے ڈالنے، قتل کرنے اور دہشت پھیلانے والوں کو ہیرو قرار دیا جا سکتا ہے تو مسلمانوں پر کیوں اعتراض کیا جا رہا ہے۔ راجپال کی ارتھی اور جتندر ناتھ داس کی میت کے جلوس یاد دلائے تھے جن پر مسلمانوں نے کوئی اعتراض نہ کیا تھا۔ دوسری طرف ظفر علی خاں نے فداکاروں کے جتھے بھرتی کرنے کے ساتھ یہ اعلان بھی کر دیا کہ ہماری جنگ ہندوؤں سے نہیں، حکومت سے ہے۔ پنجاب مسلم لیگ، مجلسِ خلافت، جمعیۃ العلمائے اسلام اور دوسری مسلمان تنظیموں نے قراردادیں منظور کیں۔ کانگریس کی تاریخ کا اہم ترین اجلاس آیندہ ماہ لاہور میں ہونے والا تھا۔ کانگریس چاہتی تھی کہ اس موقع پر ہندو مسلمان متحد ہوں۔ بعض ہندو تنظیموں کی طرف سے تائید ہونے لگی۔ ان میں بھگت سنگھ کی نوجوان بھارت سبھا شامل تھی۔

یہ اندیشہ دُور ہو چکا تھا کہ علم الدین کی میت پر ہندو مسلم کشیدگی پیدا ہو گی اس لیے اب گورنر کو صرف اس بات کا یقین دلانا تھا کہ جنازے کے موقع پر مسلمان بے قابو ہو کر حکومت پر نہیں چڑھ دوڑیں گے۔ گورنر کی تمام شرائط نظم و ضبط قائم رکھنے سے متعلق تھیں۔ انہی پر علامہ کی کوٹھی میں بند دروازے کے پیچھے غور کیا جا رہا تھا۔

رات آٹھ بجے دہلی دروازے کے جلسے میں ظفر نے، جو خود بھی فداکاروں میں نام لکھوا چکے تھے، پہلے جتھے کے فداکار متعارف کروائے۔ تعداد بائیس ہو چکی تھی۔ خورشید انور بھی شامل تھے۔ سب نے ایک قطار میں کھڑے ہو کر نظم گائی:

اے علم دین تُو نے مسلم کی لاج رکھ لی

یہ گائیکی اُس سفر کا آغاز تھی جو خورشید انور کو خطے کے سب سے بڑے موسیقاروں کی صف میں پہنچانے والا تھا۔ نظم کے بعد تقریریں شروع ہوئیں۔ ظفر کچھ دیر کے لیے غائب ہو گئے۔ شاید علامہ

وغیرہ سے ملنے گئے کیونکہ واپس آکر خوشخبری سنائی کہ تھوڑے دنوں میں شہید کی نعش لاکر یہیں جنازہ پڑھا جائے گا۔ اُنہوں نے کہا، ''اِس واقعہ نے ہندو مسلم اتحاد کرا دیا۔ میں صرف اِتنا کہتا ہوں کہ آپ گھروں کو جائیں مگر اطمینان اور سکون سے۔ ہم ابھی محبت کی ایک نئی دنیا بسائیں گے۔''

۷/ نومبر کو کابل سے مجلس امدادِ ملّی کے سکریٹری مولانا خواجہ غلام محمد عزیز ہندی کی طرف سے علامہ کو تار موصول ہوا۔ یہ تنظیم نوجوان افغانوں نے قائم کی تھی۔ ہندوستان میں جو لوگ افغانستان کے ہمدرد تھے، اُن کے ساتھ رابطہ قائم کرنا چاہتی تھی۔[1]

۸/ نومبر کو چیف سیکرٹری کی طرف سے اعلان ہو گیا کہ اسی ماہ علم الدین کی میت مسلمانوں کے نمایندوں کے حوالے کر دی جائے گی جنہوں نے مسلمانوں کی طرف سے امن و امان برقرار رہنے کی ضمانت دی ہے۔ شرائط بھی بتادی گئیں جن کا مقصد امن قائم رکھنا تھا۔ علامہ کی سرکردگی میں مسلم نمایندوں کی کمیٹی بنائی گئی۔ کمشنر کے ساتھ براہِ راست تعلق رکھے۔ ضروری انتظامات کی تکمیل میں مقامی حکام کی مدد کرے۔[2]

محمد محمود فلسفہ کے ایک طالب علم تھے۔ فقیر سید وحید الدین کے دوست تھے۔ وحید الدین کا بیان ہے کہ محمود نے علامہ سے پوچھا کہ علم الدین کی موت شہادت ہے یا نہیں:

> ڈاکٹر صاحب نے اس کے جواب میں ارشاد فرمایا، اس کا انحصار نیت پر ہے۔ اُس کے بعد سلسلۂ گفتگو جاری رکھتے ہوئے توضیح کی کہ اگر یہ حقیقت ذہن میں ہو کہ حملہ آور [یعنی گستاخی کرنے والے] کا اصل مقصد پیغمبر کے ذاتی وقار کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اُس کے لائے ہوئے پیغام کو مجروح اور اُس ایمانِ محکم کو متزلزل کرنا ہے جو اُس پیغامِ رُشد و ہدایت پر قائم و اُستوار ہے، تو یہ حملہ صرف انسانی یا پیغمبرانہ وقار کا قتل نہیں رہتا بلکہ اُس ایمان اور عقیدہ کا قتل بن جاتا ہے۔ اس کوشش یا اقدام کے خلاف

---

[1] انقلاب ۹/ نومبر ۱۹۲۹ء؛ حمزہ فاروقی، اقبال کا سیاسی سفر، ص ۱۹۰

[2] انقلاب ۳، ۵، ۶، ۷، ۸، ۱۰/ نومبر ۱۹۲۹ء بشکریہ امجد سلیم علوی

> ہر مدافعت یقیناً صرف اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے ہوتی ہے اور وہی اُس کا ٹھیک ٹھیک اجر دینے والا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ کہہ نہایت رقت انگیز لہجے میں فرمایا: میں تو یہ بھی برداشت نہیں کر سکتا کہ کوئی شخص میرے پاس آ کر یہ کہے کہ تمہارے پیغمبر نے ایک دن میلے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔[1]

یوسف سلیم چشتی سے روایت ہے کہ بعد میں علامہ نے اُن سے کہا، ”علم الدین شہید کا جذبہ اُس کی مکمل شخصیت کی گہرائی سے اُبھرا تھا اور اُس میں شعور اور ارادہ بھی شامل تھا۔“[2] وحید الدین کا بیان ہے یوسف سلیم چشتی نے علامہ کے جو ملفوظات محفوظ کیے اُن میں ایک ایسا فقرہ بھی تھا، ”جسے غازی علم الدین شہید کی شہادت کے زمانے میں علامہ کی زبان سے بار بار سنا گیا: ’اَسی گلاں کردے رہے تے تر کھاناں دا مُنڈا بازی لے گیا۔‘ (ہم باتیں ہی بناتے رہے اور نجّار کا لڑکا بازی لے گیا)۔“[3]

34

سر راس مسعود کی شادی کا دعوت نامہ موصول ہوا۔ ۱۱/ نومبر کو علامہ نے جواب دیتے ہوئے لکھا کہ اس ماہ علیگڑھ آ سکیں گے۔ کتابیں جو خواجہ غلام السیدین کے مشورے پر تہران بھجوائی تھیں وہاں سے واپس آ گئی تھیں۔ ۱۱/ نومبر ہی کو علامہ نے خواجہ غلام السیدین کو خط میں اطلاع دی، ”میرا گمان ہے کہ اُن کا ڈاک کا انتظام اطمینان بخش نہیں۔“[4]

35

۱۳/ نومبر تھی۔ میانوالی ریلوے اسٹیشن پر مختصر سی ریل گاڑی کھڑی تھی۔ اس میں ایک ڈبہ فرسٹ کلاس، ایک سیکنڈ کلاس اور دو بوگیاں لگائی گئی تھیں۔ یہ لکڑی کے اُس دبیز صندوق کی منتظر تھی جسے دو

---

[1] فقیر سید وحید الدین (۱۹۸۸) روزگارِ فقیر اول، ص ۱۱۳

[2] ہاشمی و دیگر، اقبالیات کے سو سال، ص ۸۱؛ چشتی کے مطابق یہ گفتگو ۳/ یا ۴/ اکتوبر ۱۹۳۰ء کو ہوئی۔

[3] فقیر سید وحید الدین (بلا تاریخ) روزگارِ فقیر، جلد دوم، ص ۳۰

[4] مکتوب بنام خواجہ غلام السیدین ۱۱/ نومبر ۱۹۲۹ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۹۳-۹۲

مسلمان میونسپل کمشنر اور ایک مسلمان مجسٹریٹ میانوالی جیل سے لا رہے تھے۔ اس میں علم الدین کی لاش تھی۔ تابوت کافور کی مہک میں بسا ہوا تھا۔

۱۴ر نومبر کی تاریخ شروع ہو چکی تھی۔ ساڑھے چار بجے دھواں بکھیرتا انجن حرکت میں آیا۔ گاڑی چل پڑی۔ کسی اسٹیشن پر ٹھہرے بغیر رات گئے لالہ موسیٰ سے گزری۔ صبح پانچ بج کر ۳۵ منٹ پر لاہور چھاؤنی سے ہوتی ہوئی نہر کے اُس پل پر رک گئی جو سنٹرل جیل کے قریب تھا۔ یہاں جیل کی دو لاریاں پہلے سے موجود تھیں۔ میت کا صندوق ایک لاری میں رکھ دیا گیا۔

۱۴ر نومبر کا سورج طلوع ہوا۔ علامہ اقبال پونچھ ہاؤس کے باہر پہنچ گئے۔ ان کے ساتھ میاں سر محمد شفیع، بلدیہ کے صدر خان بہادر ملک محمد حسین، انجمن حمایت اسلام کے ناظم مولوی غلام محی الدین، غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک، ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین، خواجہ دل محمد، انجمن اسلامیہ کے عہدہ دار اور بلدیہ کے بعض دوسرے ارکان تھے۔ صبح پونے سات بجے میت کا صندوق جیل سے لا کر اِن کے حوالے کیا گیا۔ رسید لی گئی۔

پندرہ منٹ بعد میت چوبرجی پر چاندماری کے میدان پہنچ چکی تھی۔ یہاں پچھلی شام ہی سے صفیں کھڑی کرنے کی لکیریں بنائی جا چکی تھیں۔ علامہ نے پوچھا کہ جنازہ کون پڑھائے گا۔ کسی نے کہا کہ شہید کے والد سے پوچھو۔ طالعمند نے، جن کے گلے میں لوگوں نے پھولوں کے ہار ڈال رکھے تھے، جواب دیا کہ اُنہوں نے یہ حق علامہ اقبال کو دیا ہے۔ علامہ نے مسجد وزیر خاں کے خطیب مولانا دیدار علی کا نام لیا۔ وہ موجود نہ تھے۔ قاری محمد شمس الدین کا نام لیا گیا۔

یہ مقام شہر کی آبادی سے تین میل باہر تھا۔ یہاں آنے والی تمام سڑکیں اُس روز گاڑیوں، لاریوں، ٹمٹموں، تانگوں اور پیدل چلنے والوں سے بھری پڑی تھیں۔ "غازی علم الدین زندہ باد"، "نعرۂ تکبیر" اور "اسلام زندہ باد" کے نعرے لگ رہے تھے۔ زمیندار کے مطابق "آزاد ہندوستان زندہ باد" کے نعرے بھی لگائے گئے۔ ان کے سوا کوئی اور سیاسی نعرہ بلند نہ ہوا۔ عوام کی طرف سے علامہ اور دوسرے نمایندوں نے حکومت سے اس بات کا وعدہ کیا تھا۔ ہجوم میں عورتیں بھی بڑی تعداد میں شامل تھیں۔ گاڑیوں کو جنازہ گاہ سے ایک میل پہلے رُکنا پڑتا تھا۔ وہاں سے آگے صرف پیدل جا

سکتے تھے۔

جنازہ گاہ میں لاہور بھر کے سقے جمع تھے۔ بلدیہ کے آگ بجھانے والے انجن مشکوں میں پانی بھر رہے تھے۔ سقے نمازیوں کو وضو کروا رہے تھے۔ ایک دفعہ سڑک پر چھڑکاؤ بھی کر چکے تھے۔ لوگوں کی تعداد کی وجہ سے دوبارہ گرد اُڑنے لگی تھی۔ لاہور شہر میں مسلمانوں کی آبادی ڈیڑھ لاکھ کے قریب تھی۔ باہر سے بھی لوگ پہنچے ہوئے تھے۔ پندرہ بیس ہزار صرف امرتسر کے تھے۔ انبالہ، لدھیانہ، جالندھر، راولپنڈی اور وزیر آباد سے بھی آئے ہوئے تھے۔ زیادہ دُور کے لوگ اس لیے نہیں آسکے تھے کہ جنازے کا اعلان کل شام کے بعد ہوا تھا۔ حکومت کی شرائط میں شامل تھا کہ مہلت چوبیس گھنٹے سے کم ہو گی۔ دس بجے تک ہجوم دو لاکھ سے زیادہ ہو چکا تھا۔ ''یہ تحقیقی بیان ہے،'' غلام رسول مہر نے اگلے دن انقلاب کے قارئین کو یقین دلایا۔ ''اِسے عام اجتماعات کی تعداد کے متعلق سخن طرازی کا کرشمہ نہیں سمجھنا چاہئیے۔'' زمیندار نے بھی یہی تعداد لکھی۔

ہجوم کے سامنے لمبے لمبے بانسوں پر ایک چارپائی بندھی ہوئی تھی۔ اُس پر پھولوں کا بستر تھا۔ بستر پر لکڑی کا صندوق تھا جس میں میت تھی۔ صندوق پر ایک سادہ چادر پڑی تھی جس کے حاشیوں پر فارسی کا شعر لکھا ہوا تھا کہ سنا ہے مشکل گھڑی میں خدائے کریم نیک لوگوں کے ساتھ بروں کی بخشش بھی کر دے گا:

شنیدم کہ در روزِ اُمید و بیم   بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم

اس چادر پر لوگ عرقِ گلاب کی بوتلیں اُنڈیل رہے تھے۔ ٹوکریوں، جھولیوں اور ٹوپیوں میں پھول بھر بھر کر لا رہے تھے اور چادر پر پھینک رہے تھے۔ دو ڈھائی بالشت اونچی تہہ بن چکی تھی۔

دس بجے جنازہ پڑھایا گیا۔ عورتیں بھی موجود تھیں جنھوں نے ایک طرف علیحدہ صفیں بنائیں۔ اس کے بعد لوگ شہید کی میت اُٹھانے کے لیے آگے بڑھے۔ انہیں روک کر بتایا گیا کہ ابھی اور لوگ آرہے ہیں۔ دوسری دفعہ جنازہ پڑھا جائے گا۔ یہ لوگ منتشر ہوئے۔ قریباً اتنی ہی تعداد میں اور لوگ آ گئے۔

تمام راستے ''زندہ انسانوں کی دو بے پناہ موجوں کا رقص زار بنے ہوئے تھے،'' مہر کا بیان ہے، ''ایک موج شہر کی طرف آ رہی تھی اور دوسری موج میدان کی طرف جا رہی تھی۔'' مہر نے محسوس کیا کہ جو کچھ نگاہوں کے سامنے ہے اُسے بیان کرنے کے لیے الفاظ کافی نہیں ہو سکتے۔ ''شہادت۔ شہادت،'' انہوں نے سوچا، ''تو یہ ہے شہادت۔ یہ ہے زندہ گواہی۔ وہ گواہی جسے دنیا کی کوئی طاقت جھٹلا نہیں سکتی۔ حتیٰ کہ وہ عدالت بھی جھٹلا نہیں سکتی۔ جس کے حکم کے ماتحت شہید علم الدین نے ۳۱/ اکتوبر کی صبح میانوالی کی غربت میں جامِ شہادت نوش کیا... علم الدین شہید عالمِ دین نہ تھا۔ واعظ نہ تھا۔ کوئی مشہور یا غیر مشہور صوفی و متقی نہ تھا۔ کسی گروہ یا جماعت کا قائد نہ تھا۔ کسی ملک یا اس کے کسی حصے کا پادشاہ اور سلطان نہ تھا... چوبرجی میں جمع ہونے والے لاکھوں مسلمانوں میں سے شائد چند افراد کا ذاتی شناسا ہو گا۔ مگر اُس کی شہادت نے اور حرمتِ رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم پر اُس کی زندہ گواہی نے اُسے وہ مقامِ بلند عطا کیا جو ہزاروں اتقیائ ہزاروں سلاطین اور ہزاروں علمائ کو بھی نصیب نہیں ہوا جن کے آوازۂ شہرت میں ایک دنیا بہ رہی تھی۔ یہ ہے مقامِ شہادت، یہ ہے منصبِ بلند۔''[1]

ساڑھے دس بجے کے قریب جنازہ اُٹھایا گیا۔ ایک ہجوم آگے بڑھا تو ظفر علی خاں اور سر محمد شفیع بھیڑ میں آ گئے۔ انہیں مشکل سے نکالا گیا۔ بڑی تعداد میں لوگ جنازے کو کندھا دینا چاہتے تھے۔ بعض لوگوں نے اپنی پگڑیاں تابوت کے بانسوں میں ڈال دیں۔ جلوس میانی صاحب کے قبرستان کی طرف چلا۔ لوگ کلمۂ شہادت اور درود شریف پڑھ رہے تھے۔ کبھی کبھی اللہ اکبر، غازی علم الدین زندہ باد، اسلام زندہ باد اور ہندوستان زندہ باد کے نعرے سنائی دیتے۔ ہزاروں عورتیں راستے کے ٹیلوں اور چھتوں پر بیٹھی کلمہ پڑھ رہی تھیں۔

بارہ بجے جنازہ میانی صاحب کے قبرستان پہنچا۔ قبر تیار تھی۔ لوگوں نے اتنے پھول پھینکے تھے کہ قبر میں پھولوں کا ایک فرش بچھ گیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں میت قبر میں اُتار کر مٹی ڈالی گئی۔ فاتحہ پڑھی گئی۔ علم الدین کمیٹی کے رضاکاروں نے اعلان کیا کہ اگر کسی کی کوئی چیز کھو گئی ہے تو وہ کل کمیٹی کے

---

[1] انقلاب، ۱۹/ نومبر ۱۹۲۹ء بشکریہ امجد سلیم علوی

دفتر سے معلوم کر لے۔ انہیں بہت سی چیزیں ملی ہیں۔

ظفر نے نوجوانوں کو جمع کر کے خطاب کیا:

آج حکومت کو معلوم ہو گیا ہے کہ مسلمان صبر سے وہ کام کر سکتے ہیں جو حکومت جبر سے نہیں کر سکتی۔ میں نے تم سے جو عہد کیا تھا وہ آج ختم ہو گیا۔ میں تم سے نیا عہد لینا چاہتا ہوں۔ وہ ہندوستان کی آزادی کا مسئلہ ہے۔ دیگر اقوام کہہ رہی تھیں کہ مسلمان مردہ قوم ہے۔ آج اُنہیں معلوم ہو گیا ہو گا کس طرح موت سے زندگی اور اندھیرے سے نُور پیدا ہوتا ہے۔ اب تم اعلان کر دو کہ ہم ہندوستان کو آزاد کرا کے ہندو بھائیوں کو بھی اس غلامی سے نجات دلائیں گے۔ مسلمان ناموسِ رسولؐ اور اسلام پر پروانہ وار نثار ہونے کو تیار ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ میرے مذہب میں کسی قسم کی مداخلت نہ ہو۔ لیکن مذہب جب ہی آزاد ہو سکتا ہے جبکہ ہم خود آزاد ہوں۔ ہمارا مذہب ہمیں آزادی کی تعلیم دیتا ہے اس لیے ہمیں چاہئیے کہ آزادی کی جدوجہد میں ہم ہمسایہ اقوام سے چار قدم آگے رہیں۔

مہر نے لکھا:

سب سے اہم، ضروری اور خاص طور پر قابلِ غور سبق یہ ہے کہ اگر ملت کے تمام گروہ، تمام جماعتیں اور تمام افراد مل کر اور متحد ہو کر کام کریں تو تمام مقاصد پورے ہو سکتے ہیں... پھر کیا وجہ ہے کہ ہم اِسی طرح اپنے دوسرے ملّی مقاصد پورے نہ کریں؟ کیوں ایسے ہی اتحاد و اتفاق اور ایسی ہی یک جہتی و یک آہنگی سے اپنے سیاسی و ملکی حقوق کے حصول کے لیے سعی و جہد عمل میں نہ لائیں؟ اگر ایک شہر کے ڈیڑھ دو لاکھ مسلمانوں کا اتحاد حکومت کو اپنے سامنے جھکا سکتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ سات کروڑ مسلمانوں کا اتحاد و اتفاق ہندوؤں کو اور حکومت کو مسلمانوں کے جائز مطالبات کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور نہ کر دے... مسلمان آج تک اپنا سب کچھ افتراق و انتشار ہی سے برباد کرتے رہے ہیں۔ شہید علم الدین کی میت کے معاملہ نے انہیں از

سرِ نو صحیح راستہ بتا دیا ہے۔ کیا یہ توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ اِس راستے پر گامزن ہو کر
اپنے لیے دائمی خوز و فلاح کا بندوبست کر لینے پر آمادہ ہو جائیں گے؟[1]

36

۱۵ / نومبر کو برطانوی وزیرِ خارجہ آرتھر اینڈرسن نے افغان وزیرِ خارجہ کو تار بھیجا کہ نادر شاہ کی حکومت تسلیم کی جاتی ہے۔ اگلے ایک دو روز میں علامہ، سعادت علی خاں، حاجی میر شمس الدین اور انقلاب کی طرف سے مبارکباد کے تار بھیجے گئے۔

۱۷/ نومبر کو شام چار بجے خان سعادت علی خاں کی طرف سے سابق سفیرِ افغانستان سردار گل محمد خاں کے اعزاز میں چائے کی دعوت تھی۔ علامہ، حاجی میر شمس الدین، میاں عبدالعزیز، حافظ حسین بخش، شیخ محمد جان میونسپل کمشنر، ملک میراں بخش، مولانا عبدالمجید قرشی اور شیخ امیر علی شامل ہوئے۔ حاجی شمس الدین نے سردار گل محمد کی طرف سے سعادت علی خاں کا شکریہ ادا کیا۔ "بعد میں افغانستان ہلالِ احمر کے کام کے متعلق مشورے ہوتے رہے،" انقلاب نے لکھا۔[2]

اسی رات علامہ ٹرین سے روانہ ہوئے۔ عبداللہ چغتائی ہمراہ تھے۔ اگلی صبح علیگڑھ پہنچے۔ اسٹیشن پر کالج کے اساتذہ اور طلبہ اور شہر کے اکابرین استقبال کے لیے موجود تھے۔ پھولوں کے اتنے ہار علامہ کے گلے میں ڈالے گئے کہ چہرہ چُھپ گیا۔[3]

یونیورسٹی کے چانسلر سر سید کے پوتے سر راس مسعود نواب مسعود جنگ بہادر تھے۔ ایک ضروری کام سے بھوپال گئے تھے۔ اگلے روز آ رہے تھے۔ علامہ کے لیکچرز کی تاریخ ایک روز بڑھا دی گئی۔ علیگڑھ میں ڈاکٹر ظفر الحسن کے گھر ٹھہرنا تھا۔ شعبۂ فلسفہ کے چیئرمین تھے۔ علامہ موٹر میں بیٹھ کر وہاں پہنچے۔ ڈاکٹر ضیاؑالدین آئے۔ اپنی تازہ تصنیف اسلامی ہئیت کے بارے میں گفتگو کرتے رہے۔[4]

---

[1] انقلاب، ۱۹/ نومبر ۱۹۲۹ء بشکریہ امجد سلیم علوی۔ زمیندار ۱۷/ نومبر ۱۹۲۹ء؛ جعفر بلوچ (۱۹۹۵)، ص ۴۸-۵۰

[2] انقلاب ۱۹/ نومبر ۱۹۲۹ء؛ حمزہ فاروقی، اقبال کا سیاسی سفر، ص ۱۹۹، ۱۹۲-۱۹۱

[3] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸)، بحوالہ انقلاب ۲۳/ نومبر ۱۹۲۹ء

[4] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸)، بحوالہ انقلاب ۲۳/ نومبر ۱۹۲۹ء

پروفیسر فیروزدین مراد علیگڑھ میں شعبہ طبعیات کے چیئرمین تھے۔ ایف ڈی مراد کے نام سے مشہور تھے۔ سیالکوٹ سے تعلق تھا۔ وہاں ان کے بھائی شیخ ظہور الٰہی مراد مشہور وکیل تھے۔ مولوی سید میر حسن کے شاگردوں میں سے تھے۔ ایف ڈی مراد کی ایک تحریر اُردو کورس میں بھی شامل تھی جسے علامہ اور حکیم احمد شجاع نے مرتب کیا تھا۔ علامہ کو علیگڑھ یونیورسٹی کی سیر کروائی۔[1] "ایک نئی زندگی کا آغاز معلوم ہوتا ہے،" علامہ نے علیگڑھ یونیورسٹی کے بارے میں محسوس کیا۔[2]

شام کو ظفر الحسن نے علامہ کے اعزاز میں چائے کی دعوت دی۔ یونیورسٹی کے اساتذہ اور بعض دوسرے اکابر مدعو تھے۔ اُس کے بعد خواجہ غلام السیدین کی طرف سے دعوتِ طعام تھی۔[3]

اگلی صبح ملاقاتیوں کا تانتا بندھ گیا۔ شام چار بجے ظفر الحسن نے پھر چائے کی دعوت دی۔ راس مسعود واپس تشریف لے آئے۔ گزشتہ روز موجود نہ ہونے کی معذرت طلب کی۔ علامہ کو بہت مستعد آدمی معلوم ہوئے۔ یونیورسٹی کی زندگی میں ایک خوشگوار تبدیلی لانے کی اہلیت رکھتے تھے۔[4] علامہ اور ظفر الحسن کو ساتھ لے کر اسٹریچی ہال میں پہنچے۔ ظفر الحسن نے صدارتی تقریر کی۔ راس نے علامہ کے ساتھ عقیدت کا اظہار کیا۔ علامہ نے پہلا لیکچر پیش کیا۔ یہ وہی تھا جو پہلے مدراس اور دکن میں بھی پیش کیا جا چکا تھا۔ ظفر الحسن نے علامہ اور حاضرین کا شکریہ ادا کیا۔[5]

۲۰ نومبر کو علامہ سابق وائس چانسلر صاحبزادہ آفتاب احمد خاں کی عیادت کے لیے گئے۔ فالج کے مریض ہو گئے تھے۔ "علامہ موصوف کو دیکھتے ہی ہاہاہا کرنے لگے کیونکہ فالج کے باعث ان کی زبان چلنے سے رک گئی ہے،" چغتائی نے لکھا، "علامہ موصوف اس حالت کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئے

---

[1] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸)، بحوالہ انقلاب ۲۳ر نومبر ۱۹۲۹ء۔ فیروز دین مراد کے بارے میں معلومات کے لیے دیکھیے: Khurram Ali Shafique, (2015) *Waheed Murad: His Life and Our Times*

[2] مکتوب بنام عبد الماجد دریابادی ۵ر جنوری ۱۹۳۰ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۱۰۱-۱۰۰

[3] حمزہ فاروقی، حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، بحوالہ انقلاب ۲۳ر نومبر ۱۹۲۹ء

[4] مکتوب بنام عبد الماجد دریابادی ۵ر جنوری ۱۹۳۰ء محولہ بالا

[5] حمزہ فاروقی، حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، بحوالہ انقلاب ۲۳ر نومبر ۱۹۲۹ء

اور آب دیدہ ہو گئے۔"[1]

دوپہر کے کھانے کی دعوت ڈاکٹر ضیأالدین نے دی تھی۔ بہت سے مقتدر حضرات بھی شریک تھے۔ رشید احمد صدیقی ان دنوں بیمار پڑے تھے۔ علامہ ان کی عیادت کے لیے بھی گئے۔[2]

شام کے وقت سوئمنگ پول کے قریب لان پر شعبۂ فلسفہ کی طرف سے علامہ کو "ایٹ ہوم" دیا گیا۔ وائس چانسلر اور یونیورسٹی کے تمام ارکان موجود تھے۔ چھ بجے وہاں سے اُٹھے۔[3]

ظفر الحسن کے بنگلے سے ہوتے ہوئے اسٹریچی ہال پہنچے۔ دوسرا لیکچر دیا۔ یہ بھی پہلے مدراس اور دکن میں پیش کیا جا چکا تھا۔ لیکچر کے بعد "کسلمندی کی وجہ سے ڈاکٹر عطأ اللہ بٹ کے مکان پر چلے گئے،" چغتائی نے لکھا۔[4]

۲۱/ نومبر کی صبح بعض طلبہ گزشتہ لیکچروں کے بارے میں سوالات پوچھنے آئے۔ دوپہر کا کھانا علامہ نے راس مسعود کے یہاں کھایا۔ کھانے کے بعد دیر تک پروفیسر ایف ڈی مراد سے مکالمہ ہوتا رہا۔ شام سوا چھ بجے تیسرا لیکچر دیا۔ رات آٹھ بجے ختم ہوا۔ "رات گیارہ بجے تک پر لطف صحبت رہی،" چغتائی نے لکھا۔[5]

۲۲/ نومبر کی صبح پھر طلبہ سولات لے کر حاضر ہوئے۔ دن کا کھانا ڈاکٹر بشیر حسین زیدی کے یہاں تھا۔ شام کو ڈاکٹر عبداللہ بٹ کے یہاں پر تکلف دعوت تھی۔ لوگ علامہ سے ان کے اشعار سننا چاہتے تھے۔ علامہ نے پسند نہ کیا۔ صاحبزادہ حمید بٹ نے "یارب دلِ مسلم کو وہ زندہ تمنا دے" سنائی۔ رات کو چوتھا لیکچر ہوا۔ پچھلے تینوں لیکچر وہی تھے جو مدراس اور حیدرآباد میں دیئے جا چکے تھے۔ یہ

---

[1] ایضاً بحوالہ انقلاب ۲۷/ نومبر ۱۹۲۹ء

[2] ایضاً

[3] ایضاً

[4] حمزہ فاروقی، حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، بحوالہ انقلاب ۲۷/ نومبر ۱۹۲۹ء

[5] ایضاً

انسانی خودی اور جبر وقدر کے موضوع پر نیا لیکچر تھا۔[1]

اسلامی دینیات میں روح کا تصوّر عام طور پر کسی لطیف چیز کے طور پر پیش کیا جاتا ہے جو جسم سے علیحدہ ہے۔ اس قسم کے تصوّرات کا ماخذ قرآن نہیں بلکہ قرآن سے پہلے کے یونانی، نسطوری عیسائی، یہودی اور زرتشتی تصوّرات ہیں۔ ان کی سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ روح اور مادے کی ثنویت قبول کرنی پڑتی ہے۔ جدید یورپین فکر میں کے بجائے خودی (ego) کا تصوّر پیش کیا گیا لیکن اُسے غیر حقیقی (unreal) سمجھا گیا۔ علامہ سمجھتے ہیں کہ قرآن ہمیں روح کو ایک خودی ہی کی صورت میں پیش کرتا ہے: (وہ آپ سے روح کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دیجیے کہ روح میرے رب کے امر سے ہے؛ لیکن آپ کو اِس کا علم بہت کم دیا گیا ہے)۔ قرآن میں کائنات کے ساتھ خدا کے تعلق کے لیے خَلق اور اِنسان کے ساتھ تعلق کے لیے اَمر کا لفظ استعمال ہوا۔ اِس آیت میں بھی ''روح کی حقیقی ماہیت کا اظہار لفظ 'امر' ہی سے کیا گیا ہے، کیونکہ اس کا سرچشمہ بھی تو ذاتِ الٰہیہ ہی کی قدرت اور خلاقی ہے، گو ہم نہیں جانتے کہ امرِ الٰہی کی کارفرمائی نے اُن وحدتوں کی شکل کیسے اختیار کی جن کو ہم خودی سے تعبیر کرتے ہیں۔'' خودی کے بارے میں علامہ کے بنیادی نکات یہ تھے کہ یہ حقیقی (real) ہے۔ اپنے آپ کو ذہنی کیفیات کی وحدت کے ذریعے ظاہر کرتی ہے۔ ان میں سے ہر کیفیت ہمارے ذہن کا ایک مرحلہ ہے اور خود ذہن ایک پیچیدہ کُل ہے۔ خودی اس لحاظ سے خام ہے کہ فانی (finite) ہے۔ اس لیے ''ایک زیادہ ہمہ گیر، زیادہ موثر، زیادہ متوازن اور اپنے آپ میں زیادہ یکتا وحدت کی آرزو اس کی فطرت میں داخل ہے۔'' ہمیں معلوم نہیں ہے کہ اس منزل تک پہنچنے کے لیے کس کس ماحول (environment) سے گزرنا ضروری ہے۔ برزخ، جنت اور دوزخ وغیرہ ایسے ہی مراحل ہیں۔ جگہوں کے نہیں بلکہ حالتوں کے نام ہیں۔

---

[1] ایضاً

Human Ego—His Freedom and Immortality

[Excerpt]

Life offers a scope for ego-activity, and death is the first test of the synthetic activity of the ego. There are no pleasure-giving and pain-giving acts; there are only ego-sustaining and ego-dissolving acts. It is the deed that prepares the ego for dissolution, or disciplines him for a future career. The principle of the ego-sustaining deed is respect for the ego in myself as well as in others. Personal immortality, then, is not ours as of right; it is to be achieved by personal effort. Man is only a candidate for it. The most depressing error of Materialism is the supposition that finite consciousness exhausts its object. Philosophy and science are only one way of approaching that object. There are other ways of approach open to us; and death, if present action has sufficiently fortified the ego against the shock that physical dissolution brings, is only a kind of passage to what the Quran describes as Barzakh. The records of Sufistic experience indicate that Barzakh is a state of consciousness characterized by a change in the ego's attitude towards time and space. There is nothing improbable in it. It was Helmholtz who first discovered that nervous excitation takes time to reach consciousness. If this is so, our present physiological structure is at the bottom of our present view of time, and if the ego survives the dissolution of this structure, a change in our attitude towards time and space seems perfectly natural. Nor is such a change wholly unknown to us. The enormous condensation of impressions which occurs in our dream-life, and the exaltation of memory, which sometimes takes place at the moment of death, disclose the ego's capacity for different standards of time. The state of Barzakh, therefore, does not seem to be merely a passive state of expectation; it is a state in which the ego catches a glimpse of fresh aspects of Reality, and prepares himself for adjustment to these aspects. It must be a state of great psychic unhingement, especially in the case of full-grown egos who have naturally developed fixed modes of operation on a specific spatio-temporal order, and may mean dissolution to less fortunate ones. However, the ego must continue to struggle until he is able to gather himself up, and win his resurrection. The resurrection, therefore, is not an external event. It is the consummation of a life-process within the ego. Whether individual or universal it is nothing more than a kind of stock-taking of the ego's past achievements and his future possibilities…

However, according to the teachings of the Quran the ego's re-emergence brings him a 'sharp sight' (50: 22) whereby he clearly sees his self-built 'fate fastened round his neck.' Heaven and Hell are states, not localities. Their descriptions in the Quran are visual representations

of an inner fact, i.e. character. Hell, in the words of the Qur'an, is 'God's kindled fire which mounts above the hearts'—the painful realization of one's failure as a man. Heaven is the joy of triumph over the forces of disintegration. There is no such thing as eternal damnation in Islam. The word 'eternity' used in certain verses, relating to Hell, is explained by the Quran itself to mean only a period of time (78: 23). Time cannot be wholly irrelevant to the development of personality. Character tends to become permanent; its reshaping must require time. Hell, therefore, as conceived by the Quran, is not a pit of everlasting torture inflicted by a revengeful God; it is a corrective experience which may make a hardened ego once more sensitive to the living breeze of Divine Grace. Nor is Heaven a holiday. Life is one and continuous. Man marches always onward to receive ever fresh illuminations from an Infinite Reality which 'every moment appears in a new glory'. And the recipient of Divine illumination is not merely a passive recipient. Every act of a free ego creates a new situation, and thus offers further opportunities of creative unfolding.[1]

جلیل قدوائی کا بیان ہے کہ خطبات کے دوران علامہ نے "نہایت باوقار اور سنجیدہ بلکہ فلسفیانہ انداز سے" اظہارِ خیال کیا۔ "ایک نشست میں یونین ہال میں جہاں ان کی تقریر ہوئی تھی،" طلبہ نے کلام کی فرمایش کی۔ قدوائی کے مطابق:

> فرمایش سنتے ہی آپ کے مزاج کا اعتدال جاتا رہا اور آپ نے نہایت تلخ اور تیز بلکہ غصہ کے لہجہ میں نوجوانوں کو برا بھلا کہنا شروع کیا اور فرمایا کہ جس قسم کی شاعری موصوف [علامہ اقبال] نے کی وہ محفل گرم کرنے اور مشاعرہ بازی کے لیے نہیں بلکہ اصلاحِ احوالِ قوم کی خاطر تھی اور چونکہ اس کا خاطر خواہ نتیجہ بر آمد نہیں ہوا اس لیے آپ نے شعر کہنا بند کر دیا۔ آپ نے نوجوانوں کو تاکید کی کہ شعر گوئی اور شعر خوانی کی لغویت سے دُور رہیں۔[2]

رات کو دیر تک ڈاکٹر ظفر الحسن کے ساتھ گفتگو ہوتی رہی۔[3]

---

[1] Iqbal, *Reconstruction*

[2] جلیل قدوائی کا انٹرویو سیارہ لاہور مئی ۱۹۶۳ء؛ شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۲۸۰

[3] حمزہ فاروقی، حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، بحوالہ انقلاب ۲۷/ نومبر ۱۹۲۹ء

۲۳ر نومبر کو علامہ نے پانچواں لیکچر دیا ہو گا۔ رپورٹ موجود نہیں ہے۔ موضوع 'مسلم ثقافت کی روح' تھا۔ اس پر دو برس پہلے انجمن حمایت اسلام میں بھی لیکچر دے چکے تھے۔ غالباً اُسی کی ترقی یافتہ صورت تھی۔

The Spirit of Muslim Culture

[Excerpt]

A prophet may be defined as a type of mystic consciousness in which 'unitary experience' tends to overflow its boundaries, and seeks opportunities of redirecting or refashioning the forces of collective life. In his personality the finite centre of life sinks into his own infinite depths only to spring up again, with fresh vigour, to destroy the old, and to disclose the new directions of life. This contact with the root of his own being is by no means peculiar to man. Indeed the way in which the word *Wahy* (inspiration) is used in the Quran shows that the Quran regards it as a universal property of life; though its nature and character are different at different stages of the evolution of life. The plant growing freely in space, the animal developing a new organ to suit a new environment, and a human being receiving light from the inner depths of life, are all cases of inspiration varying in character according to the needs of the recipient, or the needs of the species to which the recipient belongs. Now during the minority of mankind psychic energy develops what I call prophetic consciousness– a mode of economizing individual thought and choice by providing ready-made judgements, choices, and ways of action. With the birth of reason and critical faculty, however, life, in its own interest, inhibits the formation and growth of non-rational modes of consciousness through which psychic energy flowed at an earlier stage of human evolution. Man is primarily governed by passion and instinct. Inductive reason which alone makes man master of his environment, is an achievement; and when once born it must be reinforced by inhibiting the growth of other modes of knowledge. There is no doubt that the ancient world produced some great systems of philosophy at a time when man was comparatively primitive and governed more or less by suggestion. But we must not forget that this system-building in the ancient world was the work of abstract thought which cannot go beyond the systematization of vague religious beliefs and traditions, and gives us no hold on the concrete situations of life.

Looking at the matter from this point of view, then, the Prophet of Islam seems to stand between the ancient and the modern world. In so

far as the source of his revelation is concerned he belongs to the ancient world; in so far as the spirit of his revelation is concerned he belongs to the modern world. In him life discovers other sources of knowledge suitable to its new direction. The birth of Islam, as I hope to be able presently to prove to your satisfaction, is the birth of inductive intellect. In Islam prophecy reaches its perfection in discovering the need of its own abolition. This involves the keen perception that life cannot for ever be kept in leading strings; that, in order to achieve full self-consciousness, man must finally be thrown back on his own resources. The abolition of priesthood and hereditary kingship in Islam, the constant appeal to reason and experience in the Quran, and the emphasis that it lays on Nature and History as sources of human knowledge, are all different aspects of the same idea of finality.[1]

ساڑھے آٹھ بجے علامہ، مسلم یونیورسٹی کی انٹر کالجیٹ یونین کے صدر، وائس چانسلر اور دوسرے عمائدین پر تکلف اہتمام کے ساتھ اسٹریچی ہال میں داخل ہوئے۔ تلاوتِ قرآن کے بعد علامہ کو یونین کی تاحیات رکنیت پیش کی گئی۔ پھولوں کے ہار پہنائے گئے اور نائب صدر نے انگریزی میں سپاسنامہ پڑھا: علامہ نے قدیم و جدید کے امتزاج سے اسلامی تہذیب کو زندہ کر دیا تھا۔ ان کی فلسفیانہ تشریحات بہترین ضابطۂ ہدایت تھیں جو دورِ حاضر میں پیش کی جا سکتی تھیں۔[2]

علامہ نے شکریہ ادا کیا۔ اپنے مشن کے اہم نکات کا اعادہ کیا:

ا یورپ بالخصوص انگلستان سے تعلقات قائم ہونے کے بعد جو چیزیں وہاں سے آئی ہیں اُن میں سے تین چیزیں انگریزی ادب، فکرِ ثقیل کی عادت (habit of concrete thought) اور جمہوریت ہیں۔

الف۔ انگریزی ادب بہت سے نوجوان مصنفین کے لیے تخلیق مضامین کا ذریعہ ہوا ہے۔ موجودہ نسل کی ذہنیت کی تشکیل و توضیح میں ان مضامین کا بہت حصہ ہے۔

ب۔ فکرِ ثقیل کی عادت اِس ملک کے لیے بہترین نعمت ہے۔ یہ ملک حسِ واقعہ سے محروم ہو چلا تھا۔ اُس عجمیت کی گرفت میں تھا جو محض خیال آرائیوں کو زندگی کا مقصد سمجھ

---

1 Iqbal, *Reconstruction*

2 B. A. Dar (1967), *Letters and Writings of Iqbal,* pp.98-101

بیٹھتی ہے۔

ج۔ مغرب سے درآمد شدہ جمہوریت مشتبہ قدر و قیمت کی چیز ہے۔ بہر حال اُس میں آزادیٔ بحث و تمحیص ایک نمایاں عنصر ہے۔ اس لیے کوئی نوجوان چاہے کہ کل دنیا فتح کر لے تو اُسے آج اچھا مقرر بن جانا چاہیے۔ یہ علیگڑھ اسٹوڈنٹس یونین کی روایت بھی ہے۔

۲ انکشافِ ماضی اہم ہے۔ حال اور مستقبل کے ساتھ اپنے رشتے کو سمجھا جائے۔ مسلمانوں کے ماضی کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ قرآن شریف نے اصولِ استقرائی کی نعمت عطا کی۔ اس کے استعمال سے علوم کی موجودہ صورت پیدا ہوئی۔ مثبت نتائج سامنے ہیں۔

۳ افکار کی تاریخ لکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ اس میں دکھانا چاہتے ہیں کہ جدید دنیا اُس مطمحِ نظر کی ترقی سے وجود میں آئی ہے جو قرآن شریف نے پیش کیا تھا۔

''میں چاہتا ہوں کہ آپ لوگ میرے ساتھ مل کر کام کریں،'' چغتائی نے علامہ کے الفاظ نوٹ کیے۔ ''گذشتہ چند سال سے میں صرف اپنے جسد خاکی کا مالک ہوں، میری روح ہمیشہ آپ کی خدمات کے لیے حاضر رہی ہے اور جب تک میں زندہ ہوں وہ آپ کی خدمت کرتی رہے گی۔'' نوجوانوں نے خوشی کے نعرے بلند کیے۔[1]

سمجھا جا سکتا ہے کہ چھٹا لیکچر ۲۴ نومبر کو دیا گیا ہو گا۔ یہ 'اسلام میں روحِ حرکت' یعنی اجتہاد کے موضوع پر تھا۔ درحقیقت اُس لیکچر کی ترقی یافتہ صورت تھا جو دسمبر ۱۹۲۴ء میں لاہور میں دیا گیا۔ اُسی کی شہرت سن کر مدراس کی انجمن نے باقی خطبات کی دعوت دی۔

علامہ کے نزدیک یہ بات اطمینان بخش تھی کہ مسلمانوں کے ذہن میں اجماع کی قدر و قیمت اور اس کے مخفی امکانات کا شعور بیدار ہو رہا ہے۔ اسلامی ممالک میں جمہوری روح کے نشو و نما کے ساتھ اجتہاد کا حق فقہی علمأ سے منتخب اسمبلیوں کو منتقل ہونا ایک اہم پیش رفت ہے۔ مسلمان فرقوں میں بٹے ہوئے ہیں اس لیے کسی اور طریقے سے اجماع ہو بھی نہیں سکتا۔ اسمبلی کے ذریعے اجتہاد کی

---

[1] ۱۰ دسمبر ۱۹۲۹ء؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتار اقبال، ص ۱۰۵-۱۰۲

صورت میں فرقوں کا اختلاف بتدریج کم ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے عام لوگوں کی آرا کی نمایندگی بھی ہو سکے گی جو اُن شعبوں پر علمائے دین کی نسبت زیادہ گہری نگاہ رکھتے ہیں۔ البتہ ہندوستان میں ایک غیر مسلم اسمبلی کو اجتہاد کا حق دینا شاید ممکن نہ ہو۔ ایران میں ۱۹۰۶ء کے دستور کے مطابق علمائے دین کی ایک الگ مجلس قائم کی گئی ہے جو اسمبلی کی سرگرمیوں پر نظر رکھے۔ شیعہ سیاسی نظریے کا تقاضا یہی تھا مگر ویسے یہ اقدام بہت خطرناک ہے۔

اِس طرح تمام اسلامی ممالک میں سے صرف ترکی ہی نے قدامت پرستی کی نیند سے بیدار ہو کر شعورِ ذات کی نعمت حاصل کی ہے۔ "آیئے دیکھتے ہیں کہ خلافت کے معاملے میں ترک اسمبلی نے اپنا حقِ اجتہاد کس طرح استعمال کیا،" علامہ نے کہا، "سُنّی نقطہ نظر سے خلیفہ یا امام کا منصب ایک امر واجب ہے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ کیا منصبِ خلافت کسی فرد واحد کا حق کا ہے؟ ترکوں کا اجتہاد یہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کی رُو سے یہ منصب افراد کی ایک جماعت بلکہ کسی منتخب اسمبلی کو بھی دیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، ہندوستان اور مصر کے علما نے اس سلسلے میں ابھی تک کوئی رائے ظاہر نہیں کی۔ ذات طور پر سمجھتا ہوں کہ ترکوں کا موقف اتنا درست ہے کہ اس کے لیے کسی دلیل کی ضرورت بھی نہیں۔ جمہوری طرز حکومت اسلام کی روح کے عین مطابق ہے۔ اس کے علاوہ جو قوتیں اس وقت عالم اسلام میں کام کر رہی ہیں، اُن کے پیشِ نظر یہ اور بھی ناگزیر ہو جاتا ہے۔"

دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ کیا تمام اسلامی ممالک ایک ہی خلیفہ کے ماتحت ہوں۔ ابن خلدون نے لکھا کہ اس کے بارے میں تین آرا ہیں۔ سُنّیوں کی عام رائے میں خلافت کا ادارہ لازمی ہے۔ معتزلہ کی رائے میں اس کا انحصار ضرورت اور مصلحت پر ہے۔ خوارج کے نزدیک اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ ابن خلدون کی اپنی رائے میں حالات کا تقاضا یہی تھا کہ ہر ملک اپنے حکمراں کو اپنی حد تک امام یعنی خلیفہ تسلیم کر لے۔ ترکوں کا استدلال یہ تھا کہ عالمگیر خلافت کا تصوّر عملاً کبھی کامیاب نہیں ہوا۔ جب تک اسلامی سلطنت قائم تھی، اس پر عمل ممکن تھا۔ اب ہر کہیں آزاد اور خود مختار ریاستیں قائم ہو گئی ہیں۔ ان حالات میں عالمگیر خلافت کا تصوّر مسلمانوں کے درمیان اتحاد کو فروغ دینے کے بجائے اس اتحاد کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ ایران ہمیشہ سے ترکوں سے الگ رہا

ہے۔ اُس نے کبھی ترکوں کی خلافت تسلیم ہی نہیں کی۔ مراکش نے ہمیشہ بے رُخی برتی۔ عربوں کے اپنے عزائم ہیں۔ ایسے میں عالمگیر خلافت کا شوشہ چھوڑنے کا مطلب ہے کہ ایک ایسی طاقت جو مدتوں پہلے رخصت ہو چکی ہے، اُس کے خالی خولی نشان کی خاطر مسلمان ایک دوسرے سے اُلجھ پڑیں۔

ترک اسمبلی نے فقہی دلائل کے بجائے اپنے تجربات سے استدلال کیا۔ پھر بھی جس نتیجے پر پہنچی اُس کی نظیر مسلم فکر میں پہلے سے موجود تھی۔ خلافت کو ضرورت اور مصلحت سے منسلک کر کے ترک اسلامی فکر کے دائرے سے نکلے نہیں، صرف سُنّی رائے سے ہجرت کر کے معتزلہ کی رائے کے قریب پہنچے ہیں۔

خومختار ریاستوں کو تسلیم کرنے کی بنیاد بھی ابنِ خلدون نے پہلے فراہم کر رکھی ہے۔ ابن خلدون کے نظریے کو اُس بین ُالاقوامی نصب ُالعین کی ایک دھندلی سی جھلک سمجھنا چاہیے جو ہمیشہ سے اسلام کا مقصد تھا۔ لیکن عرب شہنشاہیت نے اس پر پردہ ڈال دیا تھا۔ علامہ نے کہا، ''مجھے یوں لگتا ہے کہ خدا آہستہ آہستہ ہمیں یہ حقیقت سمجھا رہا ہے کہ اسلام نہ تو وطنیت ہے نہ شہنشاہیت بلکہ ایک جمعیتِ اقوام ہے جو ہماری بنائی ہوئی سرحدوں اور نسلی امتیازات کو تعارف کے ذریعے کے طور پر تو قبول کرتا ہے لیکن اس لیے نہیں کہ ان کی وجہ سے ارکان اپنا اجتماعی مطمحِ نظر محدود کر لیں۔'' فی الحال ہر مسلم ریاست کو اپنی ذات میں ڈوب کر ساری توجہ اپنے آپ پر مرکوز کر لینی چاہیے، یہاں تک کہ ان سب میں اتنی طاقت پیدا ہو جائے کہ مل کر اسلامی جمہوریتوں کی ایک برادری بن جائیں۔ ایک حقیقی اور زندہ وحدت کا وجود بہت سی آزاد اور خودمختار وحدتوں کی صورت میں ہو گا، جن کا مشترک روحانی نصب ُالعین ان کی نسلی رقابتوں پر حاوی ہو۔

The Principle of Movement in the structure of Islam

[Excerpt]

In Islam the spiritual and the temporal are not two distinct domains, and the nature of an act, however secular in its import, is determined by the attitude of mind with which the agent does it. It is the invisible mental background of the act which ultimately determines its character. An act is temporal or profane if it is done in a spirit of detachment from the infinite complexity of life behind it; it is spiritual if it is inspired by that

complexity. In Islam it is the same reality which appears as Church looked at from one point of view and State from another. It is not true to say that Church and State are two sides or facets of the same thing. Islam is a single unanalysable reality which is one or the other as your point of view varies. The point is extremely far-reaching and a full elucidation of it will involve us in a highly philosophical discussion. Suffice it to say that this ancient mistake arose out of the bifurcation of the unity of man into two distinct and separate realities which somehow have a point of contact, but which are in essence opposed to each other. The truth, however, is that matter is spirit in space-time reference. The unity called man is body when you look at it as acting in regard to what we call the external world; it is mind or soul when you look at it as acting in regard to the ultimate aim and ideal of such acting. The essence of 'tauhid', as a working idea, is equality, solidarity, and freedom. The state, from the Islamic standpoint, is an endeavour to transform these ideal principles into space-time forces, an aspiration to realize them in a definite human organization. It is in this sense alone that the state in Islam is a theocracy, not in the sense that it is headed by a representative of God on earth who can always screen his despotic will behind his supposed infallibility. The critics of Islam have lost sight of this important consideration. The Ultimate Reality, according to the Quran, is spiritual, and its life consists in its temporal activity. The spirit finds its opportunities in the natural, the material, the secular. All that is secular is, therefore, sacred in the roots of its being. The greatest service that modern thought has rendered to Islam, and as a matter of fact to all religion, consists in its criticism of what we call material or natural– a criticism which discloses that the merely material has no substance until we discover it rooted in the spiritual. There is no such thing as a profane world. All this immensity of matter constitutes a scope for the self-realization of spirit. All is holy ground. As the Prophet so beautifully puts it: 'The whole of this earth is a mosque.' The State, according to Islam, is only an effort to realize the spiritual in a human organization. But in this sense all state, not based on mere domination and aiming at the realization of ideal principles, is theocratic.[1]

ڈاکٹر سید ظفر الحسن نے انگریزی میں خطبۂ صدارت دیا۔ لیکچرز کی اہمیت واضح کر کے کہا:

حضرات! اس عظیم ادارے کا بانی ایک عالی دماغ اور دور اندیش شخص تھا۔ اسے عظیم تصورات سوجھتے تھے۔ وہ ان کے لیے محنت کرتا تھا اور ان کو مستحکم طور پر رواج دیتا

[1] Iqbal, *Reconstruction*

تھا۔ اس طرح اس نے اسلامی ہند کی آنے والی نسلوں کے لیے بالخصوص اور عالم اسلام کے لیے بالعموم کچھ اہداف عمل تجویز کیے۔ ڈاکٹر سر محمد اقبال ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے اور پروان چڑھے جو سر سید احمد خان کا معتقد تھا۔ آج وہ ایسے ہی اہداف عمل میں سے ایک کو بے مثال کامیابی سے پایۂ تکمیل تک پہنچا کر ہمارے ہاں تشریف لائے ہیں۔ یہ کام مہتم بالشان حیثیت کا حامل ہے۔ اسلام میں فلسفۂ دین کی تشکیل نو یا، بالفاظ دیگر، ایک نئے علمِ کلام کی تخلیق۔ اقبال وہ کام کر کے علیگڑھ لائے ہیں جو اِس ادارے کے عظیم بانی کی دلی خواہش تھی۔ سر سید کے مزار پر اِس سے بہتر نذرانۂ عقیدت اور کیا پیش کیا جا سکتا ہے... اہلِ علم حاضرین کی اس ساری جماعت سے مجھے یہ کہنا ہے کہ حضراتِ گرامی! یہ محاضرات صرف عظیم اصولوں کی شرح و بیان کے اعتبار سے ہی قابلِ قدر نہیں ہیں بلکہ "بار آور تجاویز" سے بھی لبریز ہیں۔ یہ بڑی کارآمد بات ہو گی کہ ہم ان تجاویز کو لے کر سچے اہلِ علم کی شان کے مطابق ان کا حل تلاش کریں۔ [1]

۲۵/ یا ۲۶/ نومبر کو علامہ واپس لاہور پہنچے ہوں گے۔ ارادہ تھا کہ تشکیلِ جدید کا دوسرا حصہ لکھیں گے۔ اُس میں شریعتِ اسلامیہ کے مسائل ہوں گے۔ [2]

جمہوریت کو مشتبہ قدر و قیمت کی چیز قرار دینے پر ہندو اخبار ملاپ نے لکھا، "اگر آپ جمہوریت پر یقین نہیں رکھتے تو پھر صاف بتائیے کہ چاہتے کیا ہیں، کیونکہ جمہوریت کے خلاف اعلانِ جنگ کرنا تو آسان ہے لیکن اُس سے بہتر حل دریافت کرنا ممکن نہیں۔" [3]

37

پنجاب کی مجلس وضع قوانین کا موسمِ سرما کا اجلاس لاہور میں ۲۵/ نومبر کو شروع ہوا۔ ۲۸/ اور ۲۹/

---

[1] محمد سہیل عمر، خطباتِ اقبال نئے تناظر میں

[2] حمزہ فاروقی، حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۸۳ بحوالہ انقلاب

[3] حمزہ فاروقی، حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۴۳۱ بحوالہ کالم 'افکار و حوادث' انقلاب ۷/ دسمبر ۱۹۲۹ء

نومبر اور ۲، ۳، ۵/ اور ۶/ دسمبر کو بھی ہوا۔[1]

۶/ دسمبر کو شام سات بجے اسلامیہ کالج لاہور کے ہال میں جماعت احمدیہ لاہور کے مولانا محمد علی [لاہوری] نے انگریزی میں اسلام پر لیکچر دیا۔ علامہ اقبال صدارت کر رہے تھے۔ نواب ذوالفقار، نوابزادہ خورشید علی خاں، چودھری محمد حسین، شیخ دین محمد ایڈووکیٹ، مولانا سید حبیب شاہ، مولانا سید عنایت شاہ، مولانا قریشی، مولانا غلام مصطفیٰ حیرت، پروفیسر سید عبدالقادر شاہ اور ڈاکٹر سلطان محمد حاضرین میں شامل تھے۔ "مولانا محمد علی [لاہوری] نے تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک اسلام کی حقیقت و حقانیت پر نہایت عمدہ اور دلکش تقریر فرمائی اور ایک ایک نکتہ حاضرین کو اِس طرح سمجھایا، جس طرح کہ استاد طلبا کو سمجھایا کرتا ہے،" انقلاب نے لکھا۔

انقلاب کے مطابق اس کے بعد علامہ نے ایک مختصر تقریر کی اور کہا، "سب سے پہلے مذہب یا بالفاظِ صحیح تر مذہب اسلام اور قومیت کی تعریف ہو جانی چاہیے۔ میں سال ہا سال کے مطالعے اور غور و فکر کے بعد اِس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ اسلام اُن معنوں میں ہرگز مذہب نہیں ہے، جن معنوں میں پرانے مذاہب سمجھے جاتے تھے۔" مثلاً اسلام نے انسانیت کو اتحاد کا ایک نیا ذریعہ دیا:

> روحانی رشتے پر اتحاد کی بنیاد رکھی۔ ابھی تک انسانیت کا نصب العین حاصل نہیں ہوا اور ابھی تو اسے دنیا میں آئے ہوئے صرف تیرہ سو سال ہی ہوئے ہیں۔ لیکن ان تیرہ صدیوں کے تجربے نے بتا دیا ہے کہ عیسائیت اور بدھ مت نے بدرجہا زیادہ مدت میں انسانیت کی اتنی خدمت انجام نہیں دی تھی جتنی کہ اسلام تیرہ سو سال میں دے چکا ہے اور ممکن ہے آئندہ ہزار سال میں یا اس سے کم مدت میں اسلام ساری انسانیت کو متحد کر دے اور آدم کی اولاد میں سے غیریت و اجنبیت بالکل دُور ہو جائے۔

"حضرت علامہ کی تقریر کے دوران بار بار چیئرز ہوتی رہیں،" انقلاب کا بیان ہے، "سوا نو بجے کے

[1] Mitra *The Indian Quarterly Register July-Dec. 1929,* pp.198-201

قریب یہ پر لطف صحبت ختم ہوئی۔"[1]

دہلی میں مطبع جامعہ کو مشکلات درپیش تھیں۔ پیامِ مشرق کے بقیہ نسخے بھی التوا میں پڑے ہوئے تھے۔ علامہ کو نذیر نیازی کا خط ملا کہ پوری تعداد میں طبع ہو جائیں گے۔ باقی تصنیفات کی طباعت نہ ہو سکے گی۔[2]

کسی معاملہ میں علامہ سے پانچ چھ سو روپے کا مطالبہ کیا جا رہا تھا۔ اس سلسلے میں ۷/ دسمبر کو دہلی کے وکیل اور لیگی رہنما مرزا اعجاز حسین کا خط ملا۔ علامہ نے اسی وقت جواب میں لکھا، "مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ میں کوئی کاغذات محفوظ نہیں رکھتا۔ میں کل صبح اپنے منشی سے معلوم کروں گا کہ آیا اس کی تحویل میں اس معاملہ سے متعلق کچھ کاغذات یا خطوط ہیں... یہ معاملہ اب کلّی طور پر آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ میں اس سے گلو خلاصی چاہتا ہوں۔"[3]

افغانستان کی طرف سے لندن میں متعین ہونے والے سفیر ہز ہائی نس سردار شاہ ولی خاں پشاور سے روانہ ہو رہے تھے۔ فاتحِ کابل کہلاتے تھے۔ نادر شاہ ہلالِ احمر کمیٹی لاہور کی طرف سے تار بھیجا گیا کہ چائے کی دعوت قبول کریں۔ ہز ہائی نس کے سکریٹری کا جواب آیا کہ لاہور میں قیام نہیں فرمائیں گے، "آپ ریلوے اسٹیشن لاہور پر تشریف لا کر سردار صاحب کو ممنون و مسرور فرمائیے۔" ہلالِ احمر کے سکریٹری سعادت علی خاں کی طرف سے اخبار کو اطلاع دیتے ہوئے کہا گیا، "مسلمانانِ لاہور کا فرض ہے کہ اسٹیشن پر سردار موصوف کا خیر مقدم کریں۔"

۶/ دسمبر کو رات آٹھ بجکر دس منٹ پر بمبئی میل لاہور ریلورے اسٹیشن کے پلیٹ فارم میں داخل ہوئی۔ علامہ کے ساتھ "مشتاقانِ زیارت کا جمِ غفیر" قطار بنائے کھڑا تھا۔ پائندہ باد استقلالِ افغانستان، زندہ باد نادر شاہ غازی اور زندہ باد سردار شاہ ولی خاں کے نعرے بلند ہوئے۔ سردار ولی

---

[1] انقلاب ۲۹ جون ۱۹۲۸ء۔ میر اماخذ حمزہ فاروقی، حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۴-۶ ہے۔

[2] سید نذیر نیازی (۱۹۵۷)۔ خط دسمبر کے آغاز میں لکھا گیا۔

[3] برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۹۶-۹۴

اسٹیشن سے نکل کر نادر شاہ کے بھانجے شہزادہ اسد اللہ خاں کی عیادت کو گئے۔ علامہ، حاجی شمس الدین، سردار گل محمد خاں، شہزادہ احمد علی خاں درانی، ضیا ہمایوں، ڈاکٹر محمد یعقوب، مولوی نورُ الحق، سید حبیب اور کچھ دوسرے سردار ولی کے ڈبے میں جا بیٹھے۔ واپس آ کر سردار ولی ان سے گلے ملے۔ نادر شاہ، سردار محمد ہاشم خاں اور سردار محمود جان کی طرف سے محبت کے پیغام دیئے۔ غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالک سے بھی ملاقات کی۔ مولوی نجف علی (معلم امان اللہ خاں)، شہزادہ محمد یوسف جان، مولانا اسمٰعیل غزنوی، سید عنایت شاہ اور آقائے مرتضٰی احمد خاں بھی اسٹیشن پر موجود تھے۔[1]

۹، ۱۰، ۱۲، ۱۳/ اور ۱۴/ دسمبر کو بھی پنجاب کونسل کے اجلاس ہوئے۔ پھر غیر معینہ طور پر برخاست ہوئی۔[2]

۱۴/ دسمبر کو لاہور ہائی کورٹ نے کسی عطا محمد کی اپیل منظور کی۔ مقدمہ ریمانڈ ہو گیا۔ علامہ پیروی کر رہے تھے۔ اپیل کسی اللہ بخش اور بعض دوسروں کے خلاف تھی۔ اُن کا دفاع بسنت کرشن کر رہے تھے۔ سماعت چیف جسٹس سر شادی لال اور جسٹس آغا حیدر نے کی تھی۔[3]

38

''انسان اس رنگارنگ دنیا میں ہر گھڑی چنگ کی طرح فریاد میں مصروف ہے۔'' جاویدنامہ کی بیاض میں 'مناجات' کا عنوان ڈال کر چھ اشعار لکھے۔ اس کے بعد 'تمہیدِ آسمانی' لکھی۔ ذیلی عنوان تھا، 'نکوہش می کند آسمان زمین را' یعنی آسمان زمین کو طعنہ دیتا ہے۔ عنوان کے اوپر لکھا: Prologue in Heaven۔ گوئٹے نے بھی فاؤسٹ کی ابتدا تمہیدِ آسمانی سے کی تھی۔ علامہ سمجھتے تھے کہ اُسے کالی داس کے ڈرامے شکنتلا سے یہ خیال آیا تھا۔ آغا حشر کاشمیری نے بھی خوبصورت بلا میں یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ علامہ کی 'تمہیدِ آسمانی' تخلیقِ کائنات کے بارے میں ایک جدید حکایت کی حیثیت

---

[1] انقلاب ۸/ دسمبر ۱۹۲۹ء؛ حمزہ فاروقی، اقبال کا سیاسی سفر، ص ۲۰۱-۲۰۰

[2] Mitra *The Indian Quarterly Register July-Dec. 1929,* pp.201-202

[3] ظفر علی راجا ایڈووکیٹ (۲۰۱۳) قانون دان اقبال، ص ۱۲۶

رکھتی تھی: زندگی نے غیب و حضور کی لذت میں یہ ظاہری دنیا تخلیق کی۔ آسمان پر ستارے جگمگائے۔ چاند چمکا۔ سورج روشن ہوا۔ تب آسمان نے زمین کو طعنہ دیا کہ اُس کے پاس صرف اندھیرے ہیں۔ اُس کی روشنی آسمان کی مانگی ہوئی ہے۔ زمین نے فریاد کی۔ آسمانوں کے پرے سے آواز آئی کہ زمین اپنی امانت سے بیخبر ہے۔ جان لے کہ اس کی مٹی سے وہ وجود تخلیق ہو گا جس کی روشنی سورج اور چاند سے بڑھ جائے گی۔ فرشتے گیت گانے لگے۔ یہ گیت زبورِ عجم سے تھا، ''ایک دن خاک کی مٹھی کا وجود روشنی کی مخلوق سے بڑھ جائے گا۔ زمین اُس کی تقدیر کے ستارے سے آسمان بن جائے گی...''

فروغِ مشتِ خاک از نوریاں افزوں شود روزے
زمیں از کوکبِ تقدیرِ اُو گردوں شود روزے[1]

39

سائمن کمیشن کی رپورٹ کے اقتباسات اخبار میں شائع ہوئے۔ پوری رپورٹ اگلے برس آنے والی تھی۔ علامہ نے محسوس کیا کہ ہندوستان میں سرمایہ داری کی بنیادیں مضبوط کر دی گئی ہیں۔[2]

نواب سر ذوالفقار علی خاں نے انڈین سنٹرل کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے سائمن کمیشن کی رپورٹ پر اختلافی نوٹ لکھا۔ ۱۸/ دسمبر کو برکت علی اسلامیہ ہال میں جلسۂ عام ہوا۔ علامہ نے صدارت کی اور کہا، ''نواب صاحب کی آج کی تقریر زیادہ مفصل و مبسوط تقریروں کا مقدمہ ہے جن سے آپ کو صحیح سیاسی حالات کا اندازہ ہوسکے گا اور آپ اپنی مستقبل کی سیاسی زندگی کے لیے صحیح نتیجہ اخذ کر سکیں گے۔'' بجلی کے نظام میں خرابی واقع ہو گئی۔ نواب ذوالفقار صرف مختصر تقریر کر سکے۔ جلسہ ملتوی ہو گیا۔ اگلی شام پھر ہوا۔ انقلاب کے مطابق علامہ نے اپنی افتتاحی تقریر میں کہا، ''تمام سٹیجوں کو جلا دو اور ایک متحدہ سٹیج بناؤ، اور آیندہ گول میز کانفرنس میں جانے سے پیشتر ایک کانفرنس کر لو۔ ہندوؤں کو ایک موقع دو، محض اتمامِ حجّت کے لیے تا کہ ان سے مفاہمت اگر ممکن ہو تو ہو

---

[1] بیاض جاوید نامہ

[2] انقلاب ۲۴/ دسمبر ۱۹۲۹ء؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتار اقبال، ص ۱۰۶-۱۰۵

جائے، گو مجھے اس کا یقین نہیں۔ [کانفرنس کے موقع پر] انگلستان متحد ہو گا، ہندوستان کو بھی متحد ہونا چاہیے اور متحد ہندوستان کو انگلستان کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ پہلے مسلمان آپس میں اتحاد کریں، پھر ہندو اور مسلم کا اتحاد ہو گا۔" اس کے بعد نواب ذوالفقار نے طویل تقریر کی۔[1]

کسی انوری بیگم نے اپنی کوئی تحریر علامہ کو بھیجی۔ علامہ نے مہر، سر محمد شفیع اور نواب ذوالفقار سے تذکرہ کرنے کے بعد ۲۱/ دسمبر کو انوری بیگم کو لکھا، "آپ کے خیالات پاکیزہ اور بلند ہیں... ایک دو روز کے بعد اخبار میں ان کی اشاعت ہو گی۔"[2] اسی ماہ حافظ کے ایک شعر کے بارے میں رشید احمد صدیقی کے استفسار کا جواب دیا۔[3]

۲۳/ دسمبر کو کانپور میں علمائے ہند کی کانفرنس سے مولانا محمد علی [جوہرؔ] نے خطاب کیا۔ انہوں نے کہا کہ "سیاسی اور اقتصادی حالتوں کی خرابی" تعلیم کی خرابی کی وجہ سے ہے۔ ایک وجہ یہ ہے کہ ہم اپنی تاریخ اور جغرافیہ بھی غیر زبان میں پڑھنے پر مجبور ہیں ("ہماری محکومیت نے ہمیں قوموں کی تعلیمی دَوڑ میں پاؤں باندھ کر دَوڑایا")۔ دوسری وجہ یہ کہ ہم نے اپنی درسگاہوں کو "محض کلرک اور محرّر وضع کرنے کی فیکٹریاں" سمجھا۔ مگر جن چیزوں پر ہمیں اختیار ہے اُن میں بھی بے حسی سے کام لیتے ہیں۔ کھانے، پہننے، رسومات اور عیاشی پر بہت صرف کرتے ہیں مگر قومی کاموں میں پیسہ نہیں لگاتے۔ اس کے علاوہ "وہ سدِّ سکندری جو دینداروں اور دنیاداروں کے درمیان قائم کر دی گئی ہے اُس نے ہمارے مدارس کی ترقی کو بھی مسدود کر دیا۔" سر سید احمد خاں نے علیگڑھ میں "اسلامی یونیورسٹی" کی اِس لیے بنیاد ڈالی کہ مسلمان جدید تعلیم ایسی درسگاہ میں حاصل کر سکیں جہاں دینی تعلیم بھی ساتھ ساتھ ملتی رہے۔ علمائے کرام کی وجہ سے یہ مقصد حاصل نہ ہوا۔ وہ سر سید سے سخت بد ظن تھے۔ اُن کی وجہ سے سر سید کو طلبأ کے والدین کو مطمئن کرنے کے لیے یہ کرنا پڑا کہ تعلیم کا انتظام کرنے والی

---

[1] ایضاً

[2] مکتوب بنام انوری بیگم ۲۱ دسمبر ۱۹۲۹ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۹۷

[3] مکتوب بنام رشید احمد صدیقی دسمبر ۱۹۲۹ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۹۴-۹۳

کمیٹی کے رُکن نہ بنیں۔ سر سید کی تحریریں بھی دینیات کی درسی کتابوں میں شامل نہ کی جائیں۔ ''شعبۂ دینیات ایسے لوگوں کے ہاتھ میں جاپڑا جن کی غفلت شعاری نے ہمارا کام تمام کر دیا۔'' شبلی نعمانی جب علیگڑھ میں تھے، اپنے طور پر اِس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی۔ ورنہ دینیات کی جو تعلیم وہاں دی جاتی تھی، محض ناکافی تھی۔ یہ علمائے کرام کی وجہ سے ہوا:

> قصہ مختصر آج دنیا کے کسی حصے میں ہماری تصنیف و تالیف، تحقیق و اِنکشاف کا انتظار نہیں کیا جاتا بلکہ نہ صرف دنیا کی بلکہ خود ہندوستان کی بھی پس ماندہ قوموں میں ہمارا شمار ہوتا ہے۔ اِسی حالت کو دیکھ کر میں نے یہ شعر لکھا تھا کہ
>
> اِس شانِ امتیاز کو دیکھو کہ اہلِ کفر   مومن سمجھ رہے ہیں ہمیں خوار دیکھ کر
>
> دنیاداروں کی اور خود دُنیوی علوم میں بے بضاعتی کا تو یہ حال ہے۔ اب دینی تعلیم پر بھی ایک نظر ڈال دیکھیں۔ بزرگانِ ملت! میں آپ ہی سے پوچھتا ہوں کہ کیا آپ آج علومِ دین کی تعلیم سے مطمئن ہیں؟ میں عالم نہیں اِس لیے علمائے کرام کی علمی مالامالی یا کم مائیگی پر کس طرح تبصرہ کر سکتا ہوں۔ البتہ ایک جاہل اور اُمی کی حیثیت سے یہ عرض کر سکتا ہوں کہ ہم جہلا، علومِ دین میں کس کس چیز کے محتاج ہیں جسے آپ نے اب تک کم از کم ہمارے لیے نہیں پہنچایا۔ ہم اُردو کو سارے ملک کی مشترکہ زبان تسلیم کرتے ہیں، حالانکہ آج کل دوسری ملتیں اور زبانوں کی طرف سے یہی دعویٰ پیش کر رہی ہیں، لیکن کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہم نے اُردو زبان میں کوئی قابلِ اعتماد ترجمۂ قرآنِ کریم بھی شائع کر دیا؟ خدا کی رحمتیں نازل ہوں شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ اور اُن کے خاندان پر کہ اُنہوں نے ہم جیسے جہلاؑ کو ایک حد تک اپنے ترجموں سے اِس قابل کر دیا کہ ہم جان سکیں کہ کلامِ الٰہی میں ہمارے لیے کیا کیا ہدایات موجود ہیں۔[1]

[1] ثنا الحق صدیقی (۱۹۹۰) مولانا محمد علی جوہر، حیات اور تعلیمی نظریات، ص ۲۵۷-۲۷۳

40

ضلع رحیم یار خاں کی تحصیل صادق آباد میں محمد آباد کے زمیندار سید مبارک شاہ جیلانی اُس برس صرف چونتیس برس کی عمر میں فوت ہوئے۔ غیر مطبوعہ مسودات چھوڑے۔ ان کے کاغذات میں ایک خط علامہ کا بھی تھا۔ تاریخ معلوم نہیں: "افسوس کہ میں آپ کے تعمیل ارشاد سے قاصر ہوں۔ مجھے فرصت نہیں ہے۔ اس کے علاوہ فرمایشی اشعار کیوں کر لکھے جاسکتے ہیں۔"[1]

ایم اسلم کی کتاب بقأ دوام اس برس شائع ہوئی۔ اگست ۱۹۲۶ء میں اُن کی لے پالک بیٹی کی وفات پر علامہ نے حیات و موت کا فلسفہ جس طرح بیان کیا اور مزید کتابیں مطالعے کے لیے فراہم کر کے اُن کی فکر کو جس راہ پر ڈالا، یہ کتاب اُس کا نتیجہ تھی۔[2]

سردار اُمراؤ سنگھ شیر گِل اب پیرس میں رہتے تھے۔ اِس برس شائع ہونے والی ایک فرانسیسی کتاب ۱۴/ نومبر ۱۹۲۹ء کے دستخط کے ساتھ علامہ کو بھجوائی:

Louis Massignon. *Recueil de Texts Indits.* Librarie Orenitaliste, Paris

اِسی برس شائع ہونے والی ایک اور کتاب کسی محمد عباس علی خاں نے ۶/ اکتوبر ۱۹۳۰ء کے دستخط کے ساتھ اگلے برس اقبال کو پیش کی:

Vasant G. Rele. Mysterious Kundalini - The Physical Basis of the Kundalini (Hatha) Yoga in Terms of Western Anatomy and Physiology. D. B. Taraporevala Sons, Bombay

فاؤسٹ کے اس برس شائع ہونے والے ایڈیشن کا ایک نسخہ وطن اسلامیہ ہائی اسکول کے کسی مقبول احمد کے ۲/ جون ۱۹۳۵ء کے دستخط کے ساتھ کبھی اقبال کے ذخیرۂ کتب میں شامل ہوا:

Goethe (in German). Faust. Der Verlag, Berlin

اِس برس شائع ہونے دوسری والی کتابیں جو کبھی اقبال کے ذخیرۂ کتب میں شامل ہوئیں یہ ہیں:

William McDougall. Modern Materialism and Emergent Evolution. Metheun, London

Herbert Farmer. Experience of God - A Brief Inquiry Into the Grounds of Christian Conviction. Student Christian Movement Press, London

---

1

2 شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۱۳۶

Doughlas W. Mackenzie. Man's Consciousness of Immortality. Harvard University Press, Cambridge
A. S. Eddington. The Nature of the Physical World. University Press, Cambridge
Frank Townshend. Earth. Knoff, London[1]

41

سید نذیر نیازی نذیر دسمبر کے وسط سے لاہور میں تھے۔ بہت دنوں تک علامہ سے ملاقات کا موقع نہ ملا۔ ''اکابرِ قوم مولانا محمد علی [جوہر]، مولانا شوکت علی، مولانا حسرت موہانی سب لاہور میں جمع تھے اور سب اِس امر پر متفق کہ مسلمانوں کی آیندہ سیاست کی اساس کسی مستقل اصول پر رکھی جائے،'' نذیر کا بیان ہے، ''میں حسبِ معمول علامہ کی خدمت میں حاضر ہوتا لیکن حضرت علامہ بڑے مصروف تھے اور اُن کی صحبتوں میں ہنگامی سیاست کے سوا کسی دوسری چیز کا دخل ہی نہیں تھا۔''[2]

۲۹، ۳۰/ اور ۳۱/ دسمبر کو نیشنل لبرل فیڈریشن (''لبرل پارٹی'') کا بارہواں اجلاس مدراس میں گوکھلے ہال میں ہوا۔ سر فیروز سیٹھنا نے خطبۂ صدارت میں کہا کہ ہندوستان کے لیے درجۂ مستعمرات (ڈومینین اسٹیٹس) مناسب ہے۔ کامل آزادی موزوں نہیں ہے۔ گول میز کانفرنس سے پہلے مسلمانوں، اچھوتوں اور دوسری اقلیتوں کے ساتھ کسی سمجھوتے پر پہنچنے کی ایک اور کوشش ضرور کرنی چاہیے۔ انہوں نے مسلم کانفرنس کے اس دعوے کی تردید کی کہ جداگانہ نیابت مسلمانوں کا حق ہے۔ اُن کے خیال میں یہ قومی وحدت کی راہ میں رکاوٹ تھی۔ صرف یہ بات ذہن میں رکھنے کی ضرورت تھی کہ مسلمان موجودہ حالت میں اس کی ضرورت محسوس کرتے تھے۔ اس حقیقت کو تسلیم کیے بغیر اُن کے ساتھ کسی سمجھوتے پر پہنچنا مشکل تھا۔[3]

---

[1] Muhammad Siddique, *Descriptive Catalogue*

[2] سید نذیر نیازی، مکتوباتِ اقبال، ص ۱۶-۱۵

[3] *Report of the National Liberal Federation of India Twelfth Annual Session Held at the Gokhale Hall, Madras, On the 29th, 30th and 31st December 1929.* Madras: G. A. Natesan & Co., George Town

اے جواہر! اے گاندھی!

از میاں بشیر احمد بی۔اے (آکسن) ایڈیٹر ہمایوں

اے جواہر! اے جوانمرد ہمارے آ جا　　آج ہے راج ترا راج دلارے آ جا
ہند تاریک ہے اے ہند کے تارے آ جا　　اے جواہر! اے جوانمرد ہمارے آ جا
اے مہا آتما سردار ہمارے گاندھی　　ساری دنیا کے سجن دیس کے پیارے گاندھی
دل کے گرمانے کو اُلفت کے شرارے آ جا　　اے مہا آتما سردار ہمارے آ جا
اے شجاعت کے سمندر کے چمکتے موتی　　خدمتِ قوم کی مالا کے دمکتے موتی
ملک کی اُٹھتی جوانی کے سہارے آ جا　　اے گہر! اپنے سمندر کے کنارے آ جا
بھائیو! آنا سرآنکھوں پہ تمہارا آؤ　　آؤ اور کام یہاں کر کے کوئی دکھلاؤ
خوب موقعہ ہے بڑھو اور بڑھائے جاؤ　　بھائیو! آنا سرآنکھوں پہ تمہارا آؤ
بہنو! آؤ کہ تمہیں سے ہے چمک محفل کی　　بہنو! آؤ کہ تمہیں سے ہے دلیری دل کی
عورتو! کام پہ مردوں کو ذرا اُکساؤ　　عورتو! قوم کی محفل کو ذرا چمکاؤ
ہندوؤ مسلمو عیسائیو سکھو آؤ!　　گیت بھارت کی محبت کا یہ مل کر گاؤ!

دریائے راوی کے بائیں جانب پارک تھا۔ اطراف میں جنگل تھا۔ حکومتِ پنجاب نے پچاسی ایکڑ کا علاقہ کانگریس کے چالیسویں اجلاس کے لیے کرایہ کے بغیر عطا کیا۔ اُسے لاجپت رائے نگر کا نام دیا گیا۔ جنگل کے درخت کاٹے گئے۔ آٹھ میل لمبی سڑک بچھائی گئی۔ چوڑائی چالیس سے پچاس فٹ تھی۔ کانگریس کے گزشتہ اجلاسوں کی طرح اس دفعہ بھی ایک چھوٹا سا شہر آباد ہو گیا۔

۲۹ر دسمبر کی شام پانچ بجے کانگریس کا اجلاس شروع ہوا۔ پنڈت جواہر لال نہرو صدارت کر رہے تھے۔ استقبالیہ کمیٹی کے چیئرمین ڈاکٹر سیف الدین کچلو تھے۔ انہوں نے کہا کہ مذہب سے انسان کی پیدائشی حقیقت اور قومیت نہیں بدل سکتی۔ ہندوستان کے حالات پھر عدم تعاون کا تقاضا کر رہے ہیں۔ ڈکٹیٹر کی ضرورت ہے۔ مہاتما گاندھی کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے

خطبۂ صدارت ہندی میں پیش کیا۔

پنجاب خلافت کمیٹی قریباً پانچ ماہ قبل ان تمام ارکان کو خارج کر چکی تھی جو نہرو رپورٹ کے حامی تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے مشورہ دیا کہ علیحدہ جماعت بنائیں۔ ۲۹/ دسمبر کو مجلسِ احرار وجود میں آئی۔ عطاﷲ شاہ بخاری، ظفر علی خاں، خواجہ عبدالرحمٰن غازی اور مولانا داؤد غزنوی شامل تھے۔[1]

علی برادران اور آل انڈیا خلافت کانفرنس کے بڑے رہنماؤں نے کانگریس کے اجلاس میں شرکت نہ کی۔ "[مسلمانوں کے] مختلف الخیال عناصر میں اتحاد پیدا ہو رہا ہے،" عبدالمجید سالک کا خیال تھا، "آج سے دو سال پہلے کون تصوّر کر سکتا تھا کہ مولانا محمد علی [جوہر]، مولانا شوکت علی اور مولانا حسرت موہانی کے پہلو بہ پہلو سر محمد شفیع، سر ذوالفقار علی خاں، سر محمد اقبال ایک موٹر میں بیٹھیں گے اور لاہور کے لاکھوں مسلمان ان سب کے لیے مساوی طور پر 'زندہ باد' کے نعرے لگائیں گے۔"[2]

۳۱/ دسمبر کو لاہور میں اسلامیہ کالج کے میدان میں شامیانے میں آل انڈیا خلافت کانفرنس کا اجلاس ہوا۔ نواب اسمٰعیل خاں صدر تھے۔ تلاوت کے بعد حاضرین نے نعرے لگائے۔ "انقلاب زندہ باد" کے نعرے شامل تھے۔ مولانا شوکت علی نے مذمت کی۔ گاندھی، موتی لال اور جواہر لال کے خلاف بھی کچھ کہہ ڈالا۔[3] نواب سر ذوالفقار علی خاں نے استقبالیہ خطبہ پیش کیا:

> ہندوستان کی آزادی اور ترقی کا انحصار اس بات پر ہے کہ مسلمانوں کو شمالی ہند میں ایسا علاقہ دے دیا جائے جو دو یا تین صوبوں پر مشتمل ہو یا انہیں مدغم کر کے ایک صوبہ بنا دیا جائے۔ اس صوبے میں مسلمانوں کی آبادی اسّی فیصد سے کم نہ ہونی چاہیے۔ اسی طرح مشرقی ہند میں بنگال کی ایسی تقسیم کر دی جائے کہ مسلمانوں کی آبادی وہاں اسّی فیصد ہو۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ حقوق کے بجائے علیحدہ وطن کا مطالبہ کریں۔[4]

---

[1] Jalal (2000), *Self and Sovereignty,* p.138

[2] 'افکار و حوادث' انقلاب ۲/ جنوری ۱۹۲۹ء؛ حمزہ فاروقی (۱۹۸۸)، ص ۴۳۱-۴۳۲

[3] Mitra: *Register Jul-Dec 1930*, p.24

[4] ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۴) زندہ رُود، ص ۴۰۲

۳۱؍ دسمبر کو دوپہر ایک بجے کانگریس کا کھلا اجلاس پھر شروع ہو چکا تھا۔ سب سے اہم کاروائی "قراردادِ سوراج" تھی۔ گاندھی نے پیش کی۔ قرارداد کے مطابق درجۂ استعمرات (Dominion Status) ناکافی تھا۔ ابھی تک "سوراج" کو مخصوص معانی نہ دیئے گئے تھے۔ قرارداد میں اس کا مطلب کامل آزادی (complete independence) قرار پایا۔ نہرو رپورٹ منسوخ ہوئی۔ صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں کے بائیکاٹ کا اعلان ہوا۔ آیندہ انتخابات میں حصہ نہ لینے کا حکم دیا گیا۔ کانگریس کمیٹی کو اختیار تھا کہ جب مناسب سمجھے، عدم تعاون کی تحریک شروع کر دے۔ ٹیکس کی عدم ادائیگی اس تحریک کا حصہ ہو گی۔

جواہرلال نے تائید کی۔ طویل بحث ہوئی۔ ہندومہاسبھا کے سابق صدر کیلکر نے کہا کہ سول نافرمانی ایک ڈھونگ ہے۔ اس کی حقیقت بہت پہلے فاش ہو چکی ہے۔ ظفر علی خاں اور دوسروں نے ترامیم پیش کیں۔ مسترد ہوئیں۔ قرارداد منظور ہوئی۔ مخالفت میں چھ ووٹ تھے۔[1]

دوسرا حصہ

42

"کانگرس آزادی کا اعلان کر چکی تھی اور مسلمان یہ سوچ رہے تھے کہ اُنہیں اپنی سیاسی جدوجہد کے لیے اب کس نہج پر قدم اٹھانا چاہیے،" نذیر نیازی کا بیان ہے، "حقیقتہً اب اُن کے سامنے کوئی مقصد نہیں تھا۔"[2] مسلم لیگ کے دونوں گروپوں میں سے کسی کا اجلاس بھی نہ ہو سکا تھا۔

معلوم ہوتا ہے کہ عبداللہ چغتائی کئی روز نہ آئے۔ "تمام لاہور میں اِس بات کا چرچا ہے کہ ماسٹر عبداللہ اعلانِ آزادی کے خوف سے کہیں بھاگ گئے ہیں،" علامہ نے ۷؍ جنوری کو لکھا، "کیا یہ واقعی

---

[1] INC, *Report of the 44th Annual Session*

[2] سید نذیر نیازی (۱۹۵۷)

درست ہے؟" روانی میں ۱۹۳۰ء کے بجائے ۱۹۲۹ء لکھ گئے۔[1]

نیاز فتحپوری نے ایک تحریر میں علامہ پر تنقید کی تھی۔ نیرنگِ خیال کے جنوری ۱۹۳۰ء کے شمارے میں حکیم یوسف حسن نے جواب دیا۔ رسالہ علامہ کو پیش کیا۔ "وہ اِن چیزوں سے بالاتر تھے،" یوسف کا بیان ہے، "وہ نوٹ پڑھ کر صرف مسکرا دیئے تھے۔ زبان سے کچھ نہ کہا۔ مجھ میں بھی ہمت نہ تھی کہ پوچھ لیتا کیسا رہا یہ اداریہ۔"[2]

43

ایک شام علامہ اقبال شہر سے نکل گئے۔ دل میں یہ غم تھا کہ ہمیشہ کی زندگی میسر نہیں۔ دریا کے کنارے مولانا روم کی غزل گانے لگے۔

جاویدنامہ کی بیاض میں 'تمہید زمینی' کے تحت یہی لکھ رہے تھے۔ حقیقت میں اس سے ملتا جلتا تجربہ ہو بھی چکا تھا۔ ۱۱/ نومبر ۱۹۱۷ء کو راوی کے کنارے جہانگیر کے مقبرے پر دوستوں کے ساتھ شام گزاری تھی۔ وہاں یہی غزل پڑھی تھی۔ ظفر علی خاں کہتے تھے کہ آخری تین اشعار "ہمیں وجد میں لے آئے۔"[3] اَسرار و رموز (یکجا) کے شروع میں بھی رکھے۔ جاویدنامہ کی بیاض میں پوری غزل شامل کی۔ مفہوم یوں تھا:

لب کھولیے کہ مجھے ڈھیر ساری شیرینی کی آرزو ہے۔ چہرہ دکھایے کہ مجھے باغ اور گلستان کی آرزو ہے۔

ایک ہاتھ میں شراب کا پیالہ اور ایک میں محبوب کی زلف۔ مجھے میدان کے بیچ اس طرح رقص کرنے کی آرزو ہے۔

---

[1] برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۵۰-۴۹۔ علامہ کے ہاتھ کی تحریر میں "۷/ جنوری ۱۹۲۹ء" نمایاں ہے۔ سیاق وسباق سے ظاہر ہے کہ خط ۷/ جنوری ۱۹۳۰ء کو لکھا گیا۔

[2] نقوش کے افسانہ نمبر (۱۹۶۸) میں محمد طفیل کے مضمون 'حکیم صاحب' سے حکیم یوسف کا بیان منقولہ رحیم بخش شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۵۲

[3] خرم علی شفیق، اقبال — درمیانی دور، ص ۳۴۳

آپ نے تنگ کر کہا تھا: ''بس اور تنگ مت کرو۔ بھاگ جاؤ۔'' آپ کا وہ کہنا کہ بس اور تنگ مت کرو، میری آرزو ہے۔

اے عقل! تو شوق کے ہاتھوں واہی تباہی ہانک۔ اے عشق! مجھے بکھری بکھری باتوں کی آرزو ہے۔

آسمان کی بخشی ہوئی یہ روٹی اور پانی تو سیلاب کی طرح آنی جانی ہے۔ میں مچھلی ہوں مگر مجھے دریا کی آرزو ہے۔

فرعون اور اُس کے ظلم سے میرا دل کڑھنے لگا۔ مجھے موسیٰؑ بن عمران کے سینے کے اُس عظیم نور کی آرزو ہے۔

کل شیخ چراغ لے کر شہر کا چکر لگا رہا تھا کہ میں بھوتوں اور جانوروں سے بیزار ہوں۔ مجھے انسان کی آرزو ہے۔

اِن بودے اور کم ہمت ہمراہیوں سے میرا دل بجھ گیا۔ مجھے شیر خدا اور رستم کی آرزو ہے۔

میں نے کہا کہ نہیں ملتا، ہم ڈھونڈ چکے ہیں۔ وہ بولا کہ جو نہیں ملتا مجھے اُسی کی آرزو ہے۔

غزل

از مولانا جلال الدین رومیؒ

بکشائے لب کہ قندِ فراوانم آرزوست — بنمائے رخ کہ باغ و گلستانم آرزوست

یکدست جامِ بادہ و یکدست زلفِ یار — رقصِ چنیں میانۂ میدانم آرزوست

گفتی زناز بیش مرنجاں مرا برو — آں گفتنت کہ بیش مرنجانم آرزوست

اے عقل تو زشوق پراگندہ گوئے شو — اے عشق نکتہ ہائے پریشانم آرزوست

ایں آب و نانِ چرخ چو سیل است بیوفا — من ماہیم، نہنگم و عمّانم آرزوست

جانم ملول گشت از فرعون و ظلمِ اُو — آں نورِ جیبِ موسیٰؑ عمرانم آرزوست

دی شیخ با چراغ ہمی گشت گردِ شہر　　کز دیو و دُد ملولم و انسانم آرزوست
زیں ہمرہانِ سست عناصر دلم گرفت　　شیر خدا و رستمِ دستانم آرزوست
گفتم کہ یافت می نشود جستہ ایم ما　　گفت آنکہ یافت می نشود آنم آرزوست

بیاض میں لکھا کہ مولانا روم کی روح ایک چھوٹی سی پہاڑی کے پیچھے سے بر آمد ہوئی۔ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ اُن کا چہرہ نورِ ازل سے روشن تھا۔ علامہ نے پوچھا، ”موجود اور ناموجود کیا ہے؟ خیر اور شر کی اصلیت کیا ہے؟“ مولانا نے جواب دیا، ”موجود وہ ہے جو ظاہر ہونا چاہتا ہے۔ اظہارِ وجود کا تقاضا ہے ... تم زندہ ہو، مردہ ہو یا مرنے والے ہو؟ تین گواہوں سے گواہی مانگو۔ پہلا گواہ، اپنا آپ کو جاننا۔ خود کو اپنے نور سے دیکھنا۔ دوسرا گواہ، غیر کا شعور۔ خود کو دوسرے کے نور سے دیکھنا۔ تیسرا گواہ، خدا کی معرفت۔ خود کو خدا کے نور سے دیکھنا۔ اگر تم اُس نور کے سامنے قائم رہے تو خود کو خدا کی طرح زندہ و پایندہ جانو۔ زندگی اپنے حقیقی مقام تک پہنچنا ہے۔ ذات کو بے پردہ دیکھنا ہے۔ مومن صفات پر نہیں رُکتا، مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ذات کے سوا کسی پر راضی نہ ہوئے۔ معراج کیا ہے؟ ایک محبوب کی آرزو۔ ایک محبوب کے رُوبرو آخری امتحان... اپنا امتحان کرو، 'موجود' ہو جاؤ۔“

علامہ نے پوچھا کہ خدا کے سامنے جانا کیسے ممکن ہے؟ مولانا نے قرآن کی اُس آیت کا حوالہ دیا جس پر علامہ نے کچھ عرصہ پہلے تحقیق کی تھی۔ کہنے لگے، ”اگر تمہیں 'سلطان' ہاتھ آجائے تو آسمانوں کو بھی چیرا جا سکتا ہے... تم پیدایش کے ذریعے اس محدود دنیا میں آئے۔ پیدایش ہی کے ذریعے اس سے باہر نکل سکتے ہو... لیکن یہ پیدایش مٹی اور پانی سے نہیں ہے۔ اِسے تو وہی باہمت سمجھے گا جو دل والا ہے۔ وہ پیدایش مجبوری سے ہے اور یہ اختیار سے۔ وہ کئی پردوں میں پوشیدہ، یہ بے حجاب۔ وہ روتے ہوئے، یہ ہنستے ہوئے، یعنی وہ تلاش کرنے والی اور یہ پانے والی۔ وہ کائنات میں کبھی چلنا اور کبھی تھم جانا ہے، یہ جہات سے باہر سیر ہی سیر! وہ روز و شب کی محتاج ہے اور یہ دوسری زمانے کی سواری ہے! بچہ پیٹ چاک کر کے پیدا ہوتا ہے۔ باہمت، دنیا میں شگاف ڈال کر پیدا ہوتا ہے۔ دونوں پیدایشیں اذان سے جانی جاتی ہیں مگر وہ اذان منہ سے کہی جاتی ہے اور یہ روح کی گہرائی سے۔ جب ایک جاگتی روح جسم

میں آنکھ کھولتی ہے، اِس پرانے بتخانے میں لرزہ پڑ جاتا ہے۔"

مولانا نے اس پر مزید روشنی ڈالی۔ پھر کہا، "معراج کیا ہے؟ شعور میں انقلاب! جذب اور شوق سے شعور میں انقلاب۔ جذب اور شوق، اوپر نیچے کی قید سے آزاد۔ یہ جسم ہماری روح کا ساتھ نہیں پکڑ تا۔ مٹھی بھر مٹی پرواز سے نہیں روکتی۔"[1]

مولانا روم کی گفتگو سے علامہ کی روح بیتاب ہو گئی۔ جسم کے ہر ذرّے میں تڑپ پیدا ہو گئی۔ اچانک آسمان روشنی کے بادل میں غرق ہو گیا۔ مشرق اور مغرب کے بیچوں بیچ اس بادل سے ایک عظیم فرشتہ اترا۔ دو چہرے تھے۔ ایک آگ جیسا اور دن کی طرح روشن تھا، اور آنکھیں کھلی ہوئی تھیں۔ دوسرا دھوئیں جیسا اور رات کی طرح تاریک تھا، اور نکھیں بند تھیں۔ پروں پر کئی رنگوں کی لکیریں تھیں، سرخ، زرد، سبز، سفید، نیلی، لاجوردی۔ مزاج میں خیال جیسی تیزی تھی۔ زمین سے کہکشاں تک ایک پل میں پرواز کرتا تھا۔ ہر گھڑی ایک تازہ دھن، ایک نئی فضا میں پرواز تھی۔

فرشتے کا نام زروان تھا۔ زمان و مکان کی روح تھا۔ مسافر کو دوسری دنیا کی سیاحت پر لے جانے آیا تھا۔ آنحضورؐ نے فرمایا تھا کہ خدا کے ساتھ میرا ایک ایسا وقت مقرر ہے جس میں کوئی مقرب فرشتہ بھی مخل نہیں ہوتا۔ زروان نے اپنا تعارف کروایا اور کہا، "ہر تدبیر میری تقدیر سے بندھی ہوئی ہے۔" اس کے بعد حضورؐ کی حدیث کا حوالہ دے کر کہا، "جس کے دل میں لی مع اللہ نقش ہو گیا اس جوانمرد نے میرا جادو توڑ دیا۔ اگر تم چاہتے ہو میں حائل نہ ہوں تو روح کی گہرائیوں سے لی مع اللہ کا ورد کرو۔"

زروان کی نگاہ میں کچھ تھا کہ پرانی دنیا علامہ کی نظر سے غائب ہو گئی۔ نہیں معلوم وہ دنیا بدل گئی تھی یا کوئی نئی دنیا نمودار ہوئی تھی۔ ہنگاموں سے پاک ایک دنیا میں جنم لیا۔ ایک دنیا کے کھو جانے پر روح تڑپی۔ ایک دوسری دنیا پیدا ہوئی۔ جسم پھول اور روح بجلی بن گئی۔ دل کی آنکھ کھل گئی۔ چھپی ہوئی چیزیں حجاب سے نکل کر ظاہر ہو گئیں۔

ستاروں کا گیت سنائی دیا۔ بیاض میں لکھا، 'نغمۂ انجم (پیامِ مشرق)'۔ پیامِ مشرق سے 'سرودِ

---

[1] بیاض جاوید نامہ۔ ترجمہ از احمد جاوید بہ تغیر۔ مطابق بہ مطبوعہ (مسودہ)

انجم، نقل ہونی تھی۔ پھر اُس کے بجائے نیا گیت لکھ دیا، چار چار شعر کے تین ترکیب بند: تمہاری عقل زندگی کا حاصل، تمہارا عشق کائنات کا راز! مٹی کے پتلے، جہات کی دنیا کے اِس طرف آنا مبارک ہو!

پیکرِ خاک! خوش بیا ایں سوے عالم جہات عقلِ تو حاصلِ حیات، عشقِ تو سرِ کائنات[1]

44

بانگِ درا کا تیسرا اڈیشن لاہور ہی سے شائع کرنے کا ارادہ کیا۔ تعداد دس ہزار ہو۔ اُمید تھی کہ دو ماہ بعد طباعت مکمل ہو جائے گی۔[2]

سید نذیر نیازی ملاقات کے لیے آئے۔ دہلی واپس جا رہے تھے۔ اُن کا کہنا ہے کہ خطبات کے اُردو ترجمے کی تجویز پیش کی۔ علامہ نے پوچھا کہ کون کرے گا۔ نذیر نے ڈاکٹر سید عابد حسین کا نام لیا۔ علامہ نے کہا کہ اُن سے پوچھ لیا جائے، ''اُن کا ترجمہ کامیاب رہے گا۔''[3]

45

معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کے مسلمان اساتذہ اور علماٗ کی صوبائی کمیٹی نے اسلامی انسائیکلوپیڈیا مرتب کرنے کا عزم کیا تھا۔ ایک جلد مکمل ہوئی۔ کم از کم تین ہزار روپیہ سالانہ آمدنی کا یقین ہونے پر منصوبہ فوراً شروع کیا جا سکتا تھا۔ علامہ نے ۳؍ جنوری کو امین جنگ حیدر آباد دکن کے نام ارسال کرتے ہوئے مدد کی درخواست کی، ''اس کا مقصد ایشیا میں مسلم تہذیب و تمدن کی بازیافت اور تحفظ ہے۔ خیال یہ ہے کہ صرف اس طریقہ سے ہم اپنے اہلِ وطن کو متاثر کر سکتے ہیں اور ان حضرات میں کچھ ایقان پیدا کر سکتے ہیں جو اسلامی تمدن کی حیات بخش قوت کے بارے میں شک و شبہ میں مبتلا نظر آتے ہیں۔''[4]

اسی روز عثمانیہ یونیورسٹی کے مسجل (رجسٹرار) حمید احمد انصاری کا خط ملا۔ مہینے کے اواخر میں

---

[1] بیاض جاوید نامہ

[2] مکتوب بنام عبدالماجد دریابادی ۵؍ جنوری ۱۹۳۰ء محولہ بالا

[3] سید نذیر نیازی، مکتوباتِ اقبال، ص ۲۱

[4] مکتوب بنام امین جنگ ۳؍ جنوری ۱۹۳۰ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۹۹-۹۸

آنے کی دعوت دی تھی۔ علامہ نے معذرت کر لی۔ اتنے طویل عرصے کے لیے دوبارہ لاہور سے غیر حاضر نہ ہو سکتے تھے۔[1]

۴ر جنوری کو عبد الماجد دریابادی کا خط ملا۔ اگلے روز جواب دیتے ہوئے لکھا کہ کبھی کبھی علیگڑھ جا کر مذہبی مضامین پر طالب علموں سے گفتگو کیا کریں:

> باوجود بہت سی مخالف قوتوں کے جو ہندوستان میں مذہب کے خلاف (اور بالخصوص اسلام کے خلاف) اس وقت عمل کر رہی ہیں، مسلمان جوانوں کے دل میں اسلام ہی کے لیے تڑپ ہے۔ لیکن افسوس ہے کوئی آدمی ہم میں نہیں جس کی زندگی قلوب پر موئثر ہو...

مشکل ایں نیست کہ بزم از سرِ ہنگامہ گذشت
مشکل ایں است کہ بے نقل و ندیم اندہمہ[2]

۹ر جنوری کو نادر شاہ کے بھانجے شہزادہ اسد اللہ جان اور بھتیجے سردار محمد نعیم جان کابل روانہ ہو رہے تھے۔ شام چار بجے شہزادہ اسد نے نیڈو ہوٹل میں معززین کو چائے کی دعوت دی۔ علامہ کے علاوہ سردار علی شاہ جان، شہزادہ گل، شہزادہ احمد علی خاں درانی، شہزادہ محمد یوسف جان سدوزئی، غلام رسول مہر، عبد المجید سالک، سید حبیب، غلام محی الدین اور سدوزوئی خاندان کے شہزادے مدعو تھے۔[3]

46

''بھائیو! میں آپ سے کہہ رہا ہوں، جاگتے رہو، جو جاگتا رہے گا اُس کو شیر نہیں کھائے گا مگر جو سو جائے گا اُسے شیر کھا جائے گا، اِس لیے جاگتے رہو۔ بھائیو! میں آپ سے کہہ رہا ہوں۔'' جاوید نے نجانے کیا سوچ کر پنجابی میں یہ جملے ترتیب دیے تھے۔ وسیمہ مبارک کا بیان ہے کہ علامہ جاوید سے فرمائش

---

[1] مکتوب بنام حمید احمد انصاری ۳ر جنوری ۱۹۳۰ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۱۰۰-۹۹

[2] مکتوب بنام عبد الماجد دریابادی ۵ر جنوری ۱۹۳۰ء محولہ بالا

[3] ۱۱ر جنوری ۱۹۲۹ء؛ حمزہ فاروقی، اقبال کا سیاسی سفر، ص ۲۰۲-۲۰۱

کرتے۔ وہ ہاتھ ہلا ہلا کر تقریر کرتے۔ علامہ خاموشی سے سنتے۔ خوشی سے چہرہ دمکنے لگتا۔ جاوید کو پیار کر کے کہتے، ''شاباش! بیٹے شاباش! انشأاللہ ہم جاگتے رہیں گے۔'' سردار بیگم سے کہتے، ''انشأاللہ ہمارا جاوید بڑا بیباک مقرر بنے گا۔''[1]

47

۱۸ر جنوری ۱۹۳۰ء کو صاحبزادہ آفتاب احمد خاں فالج کے دوسرے حملے میں فوت ہو گئے۔

۱۹ر جنوری کو انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کا اجلاس ہوا۔ میاں محمد شفیع صدارت کر رہے تھے۔ علامہ اقبال جنرل کونسل کے رکن منتخب ہوئے۔ والئ بہاولپور نواب صادق علی خاں سے ملاقات کر کے عطیہ حاصل کرنے کے لیے وفد بنا۔ علامہ سربراہ تھے۔ ارکان خان بہادر سردار حبیب اللہ خاں بیرسٹر، خان بہادر شیخ امیر علی اور حاجی شمس الدین تھے جو انجمن کے بانیوں میں سے تھے۔[2]

۲۵ر جنوری کو یوپی کے گورنر سر میلکم ہیلی نے مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کے طلبہ سے کہا کہ مسلم ملّت میں رہنماؤں کا فقدان ہو چلا ہے۔ مسلمانوں کی مذہبی زندگی اُن کی ثقافت کی روح ہے۔ اُن کا اپنا فلسفہ اور ادب ہے جو اُن کی قومی زندگی کا حصہ ہے لیکن اگر مسلم ہندوستان نے رہنما پیدا نہ کیے تو ملّت کے وجود کے لیے بہت بڑا خطرہ ہے۔ اگرچہ مسلم رہنماؤں کی اکثریت کانگریس سے الگ تھلگ ہے، پھر بھی ان میں سے بعض کانگریس کی طرف جھکتے جا رہے ہیں۔[3]

تقریر کا مضمون علامہ تک پہنچا۔ متفق ہوئے۔ رہنما سے وہ ایسی ہستی مراد لیتے تھے جسے نہ صرف اسلام کی روح اور موجودہ تاریخ کے رُخ کا اندازہ ہو بلکہ اسلام کی تقدیر پر بھی نگاہ ہو۔ سمجھتے تھے کہ ایسی ہستیاں قدرت کا عطیہ ہوتی ہیں۔ ضرورت کے وقت خود پیدا نہیں کی جا سکتیں۔ اُن کے نزدیک ہندوستان کی ملّتِ اسلامیہ کی مشکلات کی پہلی وجہ یہ تھی کہ ایسے لوگوں کا فقدان ہے۔

---

[1] صوفی، اقبال درونِ خانہ، ص ۸۰-۷۹؛ مصنف کے مطابق اُس وقت جاوید کی عمر بمشکل پانچ چھ برس رہی ہو گی۔

[2] انجمن کی قلمی روداد؛ محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶)، ص ۱۸۰، ۶۵۔ معلوم ہوتا ہے کہ یہ وفد نہ گیا یا کم سے کم علامہ بہاولپور نہ جا سکے۔ دسمبر میں نواب بہاولپور نے خود لاہور آ کر سالانہ جلسے کی صدارت فرمائی اور عطیہ دیا۔

[3] John W. Cell, *Hailey: A Study in British Imperialism,* p.181

دوسری خرابی اپنے بس میں تھی۔ برسوں پہلے ایک انگریز بیالوجسٹ نے اجتماع کی جبلت (herd-instinct) کا نظریہ پیش کیا تھا۔ اب نفسیات کے ماہرین میں مقبول نہ رہا تھا۔ مگر جس چیز کو اجتماع کی جبلت کہا گیا وہ اپنی جگہ ایک حقیقت تھی خواہ اُسے کسی اور طرح بیان کر دیا جائے۔ مراد یہ تھی کہ فرد کے لیے طبعاً وہ باتیں خوشگوار ہوں جو اُسے اپنے معاشرے کے دوسرے لوگوں سے قریب کرتی ہیں۔ وہ باتیں ناخوشگوار ہوں جو معاشرے سے ذہنی اور جذباتی علیحدگی کا باعث بن سکتی ہیں۔ علامہ سمجھتے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان اس حس سے محروم ہو چلے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ افراد اور گروہ الگ الگ راہوں پر نکل رہے ہیں۔ ان کی سرگرمیوں سے قوم کے عام فکر و عمل کے سرمائے میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔[1]

۲۸/ جنوری کو افغان قونصل جنرل ہدایت اللہ خاں دہلی سے لاہور آئے۔ اسٹفلز ہوٹل میں ٹھہرے۔ شام کو علامہ کے یہاں کھانے کی دعوت پر آئے۔ ان کے سکریٹری میر منشی محمد فاضل، مولانا شوکت علی، چودھری محمد حسین، غلام رسول مہر، عبدالمجید سالک اور خاور کے مدیر شمس الدین حسن بھی شریک تھے۔ ''مسائلِ مہمہ پر مذاکرے کا سلسلہ دیر تک جاری رہا اور سب احباب قونصل جنرل صاحب کی فراست و دانشمندی اور خیر خواہی سے بہت متاثر ہوئے،'' انقلاب نے لکھا۔[2]

۳۰/ جنوری کو پانچ بجے شام مجلس خلافت پنجاب کی طرف سے قونصل جنرل افغانستان کو چائے کی دعوت دی گئی۔ علامہ، مولانا شوکت علی، میاں سر محمد شفیع، میاں عبدالعزیز، مولانا عبدالمجید سالک، سید حبیب، مجید ملک اور مولوی نورُالحق کے علاوہ تمام کارکنانِ خلافت موجود تھے۔[3]

---

[1] خطبۂ الٰہ آباد۔ دیکھیے ۲۹/ دسمبر ۱۹۳۰ کے واقعات

[2] انقلاب ۳۱/ جنوری ۱۹۲۹ء؛ حمزہ فاروقی، اقبال کا سیاسی سفر، ص ۲۹۴-۲۹۳

[3] انقلاب یکم جنوری ۱۹۳۰ء؛ حمزہ فاروقی، اقبال کا سیاسی سفر، ص ۲۹۴

علامہ اقبال کی اجازت کے بغیر نظموں کی اشاعت

ناشر وطابع نے معافی مانگ لی

علامہ سر ڈاکٹر محمد اقبال صاحب القابہ کی چند ایک نظمیں ایک چھوٹے سے رسالے کی صورت میں جس کا حجم ۱۶ صفحہ کا تھا، ایک صاحب نے جن کا نام مبارک علی ساغر ہے اور جو ینگ مینز مسلم ایسوسی ایشن کراچی واقع باغیچہ ہاشم خاں متصل گاندھی باغ کے رُکن ہیں، الیکٹرک لیتھو اینڈ ٹائپ پریس اولڈ جیل روڈ کراچی شہر میں عزت خاں مدد خاں منیجر کی معرفت چھپوائی تھی اور اُن کا نام ''پیامِ انقلاب'' اپنی طرف سے رکھ لیا تھا۔ چونکہ یہ بات علامہ ممدوح کی اجازت حاصل کیے بغیر کی گئی تھی اور علامہ ممدوح کی جملہ تصانیف کا حق محفوظ ہے اور کوئی شخص اُن کی اجازت کے بغیر اُنہیں کسی شکل اور کسی نام سے نہیں چھپوا سکتا، اس لیے مبارک علی صاحب و عزت خاں مدد خاں صاحب یعنی پرنٹر و پبلشر کے خلاف قانونی کاروائی کرنے کے لیے ہر دو صاحبان کو نوٹس دیے گئے جس پر ہر دو صاحبان نے اپنی غلطی تسلیم کر کے اظہارِ افسوس کیا اور علامہ موصوف سے معافی مانگ لی ہے، لہٰذا یہ اطلاعاً شائع کرایا جاتا ہے کہ آیندہ کوئی صاحب ایسی جرأت نہ کریں کیونکہ بار بار معافی کی توقع رکھنا عبث ہو گا۔ (عظیم اللہ ایڈووکیٹ)۔

انقلاب، ۲۲/ فروری ۱۹۳۰ء

48

پنجاب کونسل کا بجٹ اجلاس ہونے والا تھا۔ علامہ نے سوالات کا نوٹس دیا:

۱ کیا آنریبل وزیرِ زراعت بتائیں گے: الف۔ پنجاب پی ڈبلیو ڈی ہائیڈرو الیکٹرک میں ایگزیکٹو انجینئر، اسسٹنٹ ایگزیکٹو انجینئر، ٹرانسمشن لائن انجینئر اور اسسٹنٹ انجینئر کی گزٹڈ آسامیوں پر اِس وقت جو ہندو، سکھ اور مسلمان مقرر کیے گئے ہیں، اُن کی علیحدہ علیحدہ تعداد کیا ہے؟ ان آسامیوں میں ہر ایک قوم کی متناسب تعداد کیا ہے؟ ایگزیکٹو انجینئر، اسسٹنٹ ایگزیکٹو انجینئر، ٹرانسمشن لائن انجینئر، اسسٹنٹ انجینئر اور اپرنٹس انجینئر کے عہدوں کی

آسامیوں کی تعداد کیا ہے جو یکم ستمبر ۱۹۲۹ء کو ٹرانسمشن سرکل کے لیے منظور ہوئی ہیں؟ جو ہندو اور مسلمان مقرر کیے گئے ہیں اُن کی تعداد کیا ہے؟

۲ کیا آنریبل وزیرِ زراعت بتائیں گے کہ ماہ نومبر اور دسمبر میں مختلف اسلامی اخبارات میں جو مضامین شائع ہوئے اُن کی طرف حکامِ متعلقہ کی توجہ مبذول کرائی گئی ہے یا نہیں اور اگر کرائی گئی ہے تو مظلوم قوم کے حقوق کے تحفظ کے لیے کیا کاروائی کی گئی ہے؟

۳ کیا آنریبل وزیرِ زراعت بتائیں گے: کیا برانچ لائن ڈویژن کے قیام کے وقت سے اس کا چارج ہندو افسروں ہی کے ہاتھ میں رہا ہے؟ تعیناتوں کی تصدیق اور منظوری کے بعد کس قدر ہندو عہدیداروں اور مسلمان عہدیداروں کو برطرف کیا گیا ہے؟ اُن کی موقوفی کی وجوہ کیا ہیں؟

۴ کیا آنریبل وزیرِ زراعت بتائیں گے: ٹرانسمشن لائن اپرنٹس (امیدوار) انجینئروں کے عہدوں کی تعداد کیا ہے؟ اِن عہدوں پر کس قدر ہندو اور کس قدر مسلمان مقرر ہیں؟

۵ کیا آنریبل وزیرِ زراعت بتائیں گے: ہائیڈرو الیکٹرک برانچ کے عملے کی گزٹڈ افسر اور ماتحت عملے کی آسامیوں کا اوسط ماہوار کے حساب سے کیا خرچ ہے؟ ہندو، سکھ اور مسلم اقوام کا بحساب فیصدی کیا خرچ آیا؟

۶ کیا آنریبل فنانس ممبر بتائیں گے: کیا پنجاب میں کوئی ایسے مواضعات ہیں جہاں مسلمانوں کو اذان دینے کی اجازت نہیں؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو ایسے گاؤں کی تعداد کیا ہے؟ کیا حکومت کوئی ایسی کاروائی کرنا چاہتی ہے جس سے یہ پابندیاں جہاں عائد ہیں دُور ہو جائیں؟ اگر ایسا ہے تو وہ کیا کاروائی کرنا چاہتی ہے؟[1]

اجلاس لاہور میں ۲۵ر فروری کو شروع ہوا۔ ۲۷ر فروری کو بھی ہوا۔[2]

---

[1] انقلاب ۱۵ر فروری ۱۹۳۰ء؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۱۴۹-۱۴۷

[2] Mitra *The Indian Annual Register July-Dec. 1930,* p.256

لوکل سیلف گورنمنٹ کی وزارت ملک فیروز خاں نون کے پاس تھی۔ ۲۷ر فروری کو پنجاب سول میڈیکل سروس کے سلیکشن بورڈ کے ممبروں کا اعلان ہوا۔ علامہ اقبال شامل تھے۔ ان کے علاوہ پنجاب کونسل کے ممبروں میں سے چودھری ظفراللہ خاں، سردار ہربخش سنگھ اور دیوان بہادر راجہ نرندرناتھ تھے۔ کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج کے پرنسپل بھی شامل تھے۔ سول ہسپتالوں کے انسپکٹر جنرل بورڈ کے صدر تھے۔ تمام ممبر ایک برس کے لیے منتخب ہوتے تھے یا جب تک وہ پنجاب لیجسلیٹو کونسل کے رکن ہوں۔[1]

۲۸ر فروری کو بھی کونسل کا اجلاس ہوا۔[2]

۲۸ر فروری کو دہلی میں آل انڈیا مسلم لیگ کے جناح گروپ کی کونسل کا اجلاس ہوا۔ جناح نے میاں سر محمد شفیع کے گروپ کے لوگوں کو بھی دعوت دی۔ جناح نے قرارداد پیش کی کہ شفیع گروپ والی لیگ واپس آجائے۔ میاں شفیع نے تائید کی۔ قرارداد متفقہ طور پر منظور ہوئی۔ آل انڈیا مسلم لیگ دوبارہ ایک ہوگئی۔ ڈاکٹر سیف الدین کچلو اور نیشنلسٹ مسلمان لیگ سے ہمیشہ کے لیے چلے گئے۔ جناح نے سر محمد یعقوب سے درخواست کی کہ کچلو کی جگہ اعزازی سکریٹری بن جائیں۔ وہ بن گئے۔[3]

49

سائنس فکشن میں عام طور پر دوسرے سیاروں کی مخلوق کو منفی انداز میں پیش کیا گیا۔ ایچ جی ویلز کا ناول وار آف دی ورلڈز (۱۸۹۸) *(The War of the Worlds)* اس کی مشہور مثال تھا۔ جاویدنامہ میں ایسا نہ ہونے والا تھا۔ پہلے باب، 'فلکِ قمر' میں علامہ نے لکھا، "یہ زمین اور آسمان خدا کی ملکیت ہیں۔ یہ چاند اور ستارے سب ہماری میراث ہیں۔ اِس راہ میں جو کچھ نظر آئے اُسے اپنوں کی آنکھ سے دیکھو۔"

ہر سیارے کا ایک مخصوص ماحول بیان کرنے والے تھے۔ سفر کے کسی نہ کسی مرحلے کی

---

[1] پنجاب گزٹ مارچ ۱۹۳۰ء حصہ اول، صفحہ ۲۷۵ اور ۲۱ر فروری حصہ اول صفحہ ۲۱۵؛ شاہد (۱۹۷۷)، ص ۱۵۰-۱۵۱

[2] Mitra *The Indian Annual Register July-Dec. 1930,* p.256

[3] Hasan, *Plain Mr. Jinnah,* p.50

نمایندگی کرتا۔ چاند کی طرف جاتے ہوئے یہ تجربہ ہوا کہ جو پہلے اوپر تھا اب نیچے دکھائی دینے لگا۔ مولانا روم نے کہا، ''آسمانوں کے چلن سے مانوس ہو جاؤ۔'' علامہ کو ساتھ لے کر چاند کے ایک غار میں اُتر گئے۔ ایسا اندھیرا تھا کہ سورج بھی چراغ کا محتاج ہو۔ وہم اور شک نے یلغار کر دی۔ ہوش اُڑ گئے۔ دل حق اور یقین کی لذت سے خالی ہو گیا۔

تب چھُپے ہوئے اَنوار آنکھوں پر روشن ہوئے جیسے طلوعِ آفتاب کے بغیر ہی ایک روشن صبح آ جائے۔ دیکھا کہ ایک وادی میں ہیں۔ اونچے اونچے درخت یوں کھڑے ہیں جیسے وادی کے ہر پتھر نے زُنّار باندھ رکھا ہو۔ ہوا میں شراب کی سی کیفیت تھی۔ روشنی کے کنارے پر کہیں اندھیرا نہ تھا۔ سایہ بھی روشن ہو جاتا تھا۔ ایک درخت کے نیچے قدیم ہندوستان کے ایک گیانی بیٹھے تھے۔ یہ وشوامتر تھے۔ ان کے نام کو فارسی میں ترجمہ کر کے ''جہاں دوست'' لکھا۔

یہ بات معنی خیز تھی کہ وہ جاوید نامہ میں آسمانی سفر کے پہلے مرحلے کے آغاز پر نمودار ہوئے۔ گایتری منتر انہی سے منسوب تھا۔ علامہ نے ۱۹۰۲ء میں اس کا ترجمہ 'آفتاب' کے عنوان سے کیا۔ وشوامتر کے بارے میں ہندوؤں کا عقیدہ تھا کہ انہوں نے اپنے لیے خود جنّت تعمیر کر کی تھی۔ جاویدنامہ میں علامہ نے یہ حوالے نہ دیئے مگر لکھا، ''مٹی اور پانی سے بالاتر شخص! دنیا اُس کے تخیل کے صنم خانے کا ایک پیکر!'' حلیہ یوں بیان کیا کہ آنکھوں میں سرمہ تھا۔ بال ایک جُوڑے کی شکل میں بندھے تھے۔ جسم بے لباس تھا۔ ایک سفید سانپ ان کے گرد کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔

مولانا روم نے ان سے علامہ کا تعارف یوں کروایا:

ایک جواں مرد کھوج میں سرگرداں۔ سیارے کی فطرت رکھنے والا ایک ستارہ۔
اپنے کچے پن سے اس کا کام اور پکا۔ میں اس کی ناتمامیوں پر شیدا۔
اپنا پیالہ رکھنے کے لیے آسمان میں طاق بنانے والا۔ اس کی فکر جبریل سے منہ دکھائی مانگتی ہے۔
مہر و ماہ پر عقاب کی طرح جھپٹتا ہے۔ نَو آسمانوں کے طواف میں سرگرم۔
اس نے زمین والوں سے رِندوں کی طرح کلام کیا۔ حور اور جنت کو بت اور بت خانہ قرار دیا۔
میں اس کے دھویں میں شعلے دیکھتا ہوں۔ اس کے سجدوں میں مجھے کبریا دکھائی دیتا ہے۔

ہر وقت شوق کے ہاتھوں بانسری کی طرح روتا رہتا ہے۔ اس کے لیے جدائی بھی جان لیوا ہے اور صال بھی۔

میں نہیں جانتا اس کی مٹی میں کیا چھپا ہے۔ مجھے اس کے مرتبے کی خبر نہیں ہے۔

وشوامتر نے کہا، ”کائنات کی اصل رنگ ہے اور حق بے رنگی ہے۔ کائنات کیا ہے؟ انسان کیا ہے؟ خدا کیا ہے؟“ مولانا روم نے جواب دیا، ”انسان شمشیر ہے اور حق شمشیر زن۔ کائنات اس شمشیر کے لیے سان! اگلے وقتوں کے عارف اپنے آپ سے کٹ گئے۔ خدا کو دیکھا مگر انسان کو نہ دیکھا۔“

عارفِ عہدِ کہن از خود برید — اُو خدا را دید و آدم را ندید

اس شعر کے پہلے مصرعے کو بعد میں یوں کر دیا کہ پیرِ مشرق خدا کے حضور میں تڑپتے رہے:

پیرِ مشرق در حضورِ حق تپید

پھر پورا شعر کاٹ کر لکھا کہ مشرق نے حق کو دیکھا مگر کائنات کو نہ دیکھا۔ مغرب کائنات سے جڑ گیا اور حق سے مڑ گیا:

مشرق حق را دید و عالم راندید — غرب در عالم خزید از حق رمید

مولانا روم اس کی تشریح کرتے رہے، ”حق پر نظر جمائے رکھنا بندگی ہے۔ اپنی حقیقت کو دیکھنا زندگی ہے...“ وشوامتر نے کہا کہ مشرق نے ان حقائق کو کم ہی دیکھا ہے لیکن وہ مشرق کے مستقبل سے مایوس نہیں ہیں۔ گزشتہ روز انہوں نے دیکھا کہ آسمان سے ایک فرشتہ چاند کے پہاڑ قشمرود کی چوٹی پر نازل ہوا۔ ہماری زمین کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ جہاں دوست کے پوچھنے پر کہا، ”مشرق کے عروج کی گھڑی ہے۔ ایک نیا سورج اس کے آغوش میں ہے... اس کے یوسف، کنویں سے نکل آئیں گے... عرش والوں کے لیے وہ لمحہ صبحِ عید ہے جب کسی قوم کی آنکھ کھل جاتی ہے۔“

وشوامتر نے ذرا دیر کو دَم سادھا۔ پھر بیتاب ہو کر علامہ کی طرف دیکھا اور پوچھا، ”عقل کی موت؟“

علامہ نے کہا، ”فکر کو چھوڑ دینا۔“

وشوامتر نے پوچھا، "دل کی موت؟"

علامہ نے کہا، "ذکر کو چھوڑ دینا۔"

وشوامتر نے پوچھا، "بدن؟"

علامہ نے کہا، "راستے کی گرد سے پیدا ہو گیا۔"

وشوامتر نے پوچھا، "روح؟"

علامہ نے کہا، "لا الٰہ کا بھید۔"

وشوامتر نے پوچھا، "انسان؟"

علامہ نے کہا، "اُس کے رازوں میں سے ایک راز ہے۔"

وشوامتر نے پوچھا، "دنیا؟"

علامہ نے کہا، "وہ جو کچھ ہے سامنے ہے۔"

وشوامتر نے پوچھا، "یہ علم و ہنر؟"

علامہ نے کہا، "چھِلکا۔" جہاں دوست نے دلیل مانگی تو علامہ نے کہا، "محبوب کا چہرہ۔"

وشوامتر نے پوچھا، "عامیوں کا دین؟"

علامہ نے کہا، "سنی سنائی۔"

وشوامتر نے پوچھا، "عارفوں کا دین؟"

علامہ نے کہا، "دیکھنا۔"

وشوامتر کی روح اور لہر میں آ گئی۔ علامہ سے کچھ نکتے بیان کرنے لگے۔ علامہ نے بیاض میں 'ہفت اسرار از عارفِ ہندی' کی سرخی جمائی یعنی ہندی گیانی کے سات اَسرار۔ جب نکتے سات سے زیادہ ہونے لگے تو سرخی بدل کر 'نکات از عارفِ ہندی' کر دی۔ اکیس نکات ہوئے۔ بعد میں کبھی کاٹ کر صرف نَو رہنے دیے اور عنوان "نُہ تا سخن از عارفِ ہندی" کر دیا۔ یہ معلوم نہیں ہے کہ مقصد وشوامتر سے 'گلشنِ راز جدید' کے سوالوں کے جواب دلوانا تھا۔ اقوال اُسی ترتیب میں تھے۔

ہندی گیانی کے ۹/ اقوال

۱

یہ کائنات ذاتِ حق کا حجاب نہیں ہے۔ پانی پر بننے والا نقش غوطہ لگانے میں روک نہیں بنتا۔

۲

ایک اور عالم میں جنم لینا اچھا ہے تاکہ ایک دوسری جوانی ہاتھ آجائے۔

۳

حق تعالیٰ موت سے ماورا اور حیات ہی حیات ہے۔ بندہ جب مرتا ہے تو وہ نہیں جانتا کہ یہ کیا ہے!
اگرچہ ہم بے پروبال پرندے ہیں، موت کے علم میں خدا سے بڑھے ہوئے ہیں۔

۴

وقت کیا ہے؟ زہر ملی شیرینی، قہر میں گندھی ایک رحمت عام!
تم شہر اور بیابان کو اس کے قہر سے خالی نہیں دیکھو گے۔ اس کی مہربانی یہی ہے کہ تم کہو کہ گزر گیا۔

۵

کافری تو موت ہے، اے پاک فطرت! مردے سے جہاد کرنا کب غازی کے شایانِ شان ہے!
مومن زندہ ہے اور اپنے ساتھ برسرِپیکار۔ خود پر جھپٹتا ہے جیسے ہرن پر چیتا۔

۶

بت کے سامنے اپنے دل کو حاضر رکھنے والا کافر اُس دیندار سے اچھا ہے جو کعبے میں سو گیا۔

۷

یہ تو اندھی آنکھ ہے جو برائی کو دیکھتی ہے۔ سورج کبھی رات نہیں دیکھتا۔

۸

مٹی کی صحبت دانے کو درخت بنا دیتی ہے۔ انسان مٹی کی صحبت سے سیاہ روز!
دانہ مٹی سے کس بل لیتا ہے تاکہ سورج کی کرنوں کو شکار کرے۔

۹

میں نے پھول سے کہا، "اے سینہ چاک رکھنے والے! تم ہوا اور مٹی سے کس طرح رنگ اور خوشبو حاصل کرتے ہو؟"

پھول نے جواب دیا، "اے عقلمند دیوانے! تم خاموش بجلی سے کیسے پیغام وصول کر لیتے ہو؟ ہمارے جسم میں رُوح، اِسے اور اُسے جذب کرنے کی وجہ سے ہے۔ تمہارا جذب ظاہر اور میرا چھُپا ہوا ہے۔

50

وشوامتر نے گفتگو ختم کی۔ اپنے آپ میں کھو گئے۔ مایا جال سے نکل کر وجود کی مملکت میں چلے گئے۔

تب چاند کی رات کے طلسم میں ایک خوبصورت وجود نمودار ہوا۔ اس کی زلفیں دونوں طرف سے کمر تک پہنچی ہوئی تھیں۔ وادی اور پہاڑ اُس کے چہرے سے روشن ہو گئے۔ بن پیئے مستی میں وہ ایک گیت گا رہا تھا۔ مولانا روم نے بتایا کہ یہ سروش ہے۔ قدیم زرتشتی دیومالا میں آسمانوں سے پیغام لانے والا فرشتہ۔ انہوں نے کہا، "یہ خدائے پاک کے خیال میں پیدا ہوا۔ اپنے آپ کو ظاہر کرنے کے ذوق سے بیتاب ہو کر دنیا میں آ گیا۔ تقدیریں اس کے نغمے سے ہیں۔ شہر، ویرانے اور تعمیریں اُس کے نغمے سے ہیں۔ میں نے بھی اس کے نغمے میں ایک نئی دنیا دیکھی تھی۔ ذرا اُس کی سانس کی فضا میں آرام سے بیٹھ جاؤ۔"

بیاض کے اس حصے میں بڑی قطع و برید ہوئی۔ 'نغمۂ سروش' کی سرخی جما کر لکھا، "با نشّۂ درویشی، در ساز و دمادم زن الخ (زبور عجم)"۔ زبورِ عجم سے وہ ٹکڑا نقل کر کے یہاں سروش کے نغمے کے طور پر استعمال کرنا تھا۔ چاند کی بقیہ سیر کے لیے 'قصرِ نبوت' کا عنوان ڈالا۔ اُسے تبدیل کر کے لکھا، 'حرکت بہ وادیٔ قصرِ نبوت کہ ملائکہ اُورا بتیغہائے بے نیام محافظت می کنند' یعنی "قصرِ نبوت کی وادی کی طرف حرکت کہ فرشتے ننگی تلواروں کے ساتھ اُس کی حفاظت کرتے ہیں۔" اُس وادی کے لیے اشارے درج کیے: 'طواسین۔ طاسینِ گوتم۔ زرتشت۔ طاسینِ مسیح۔ طاسینِ محمدؐ'۔ ان طواسین کے احوال بھی

لکھنے شروع کیے۔ 'لوحِ محمد' کا عنوان ڈال کر ابوجہل کی طرف سے ایک نوحہ لکھا۔ لوحِ گوتم، لوحِ زرتشت اور لوحِ مسیح لکھیں۔ پھر پورے متن میں ردوبدل ہوا۔

سروش کے سامنے ایک گھومتا ہوا فانوس خیال دکھایا۔ تقدیر کی طرح ہر ہنر سے آراستہ۔ اُس فانوس میں عجیب عجیب تماشے تھے، شکرہ چڑیا پر جھپٹ رہا تھا اور چیتا ہرن پر۔ سروش کے نغمے کے لیے زبورِ عجم کے ٹکڑے کے بجائے ایک نئی غزل لکھی۔ سات اشعار کی ہوئی۔ اس میں وہ بات بھی آ گئی جو کبھی گرامی مرحوم کو خط میں لکھی تھی کہ مسلمانوں کی آیندہ تاریخ کے واقعات قرآن شریف میں موجود ہیں" اور استدلال ایسا صاف و واضح ہے کہ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ تاویل سے کام لیا گیا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و کرم ہے کہ اس نے قرآن شریف کا یہ مخفی علم مجھ کو عطا کیا ہے۔" سروش کی غزل میں کہلوایا کہ جب میں نے آنکھ سے رازی کا سرمہ دھوڈالا تب اُمتوں کی تقدیر قرآن میں چھُپی ہوئی دیکھی:

چوں سرمۂ رازی از دیدہ فرو شُستم　　　تقدیرِ اُمم دیدم پنہاں بکتاب اندر

بیاض میں لکھا کہ سروش کی اس غزل کے بعد مولانا روم نے کہا، "اگر شعر کا مقصود انسان کی تشکیل ہے تو شاعری بھی پیغمبری کی وارث ہے۔" علامہ نے کہا کہ پیغمبری کے بارے میں ارشاد فرمایئے۔ مولانا روم نے کہا کہ پیغمبری سوچ کو "بالِ جبریل" یعنی جبریل کی پرواز عطا کرتی ہے۔ چاند پر یرغمید کی وادی میں نبوت کی طاسین دیکھی جا سکتی ہے۔ علامہ بڑے شوق سے اُس وادی کی طرف بڑھے کیونکہ شوق بھی "بالِ جبریل" ہوتا ہے۔

وادیٔ یرغمید میں چار پیغمبروں کے طواسین تھے — گوتم بدھ، زرتشت، حضرت عیسیٰؑ اور محمد مصطفیٰؐ۔ بیاض میں طاسین کے لیے 'لوح' کا لفظ بھی ملتا ہے۔ غالباً یہ طواسین تختیوں کی صورت میں تھے۔ ہر ایک پر متعلقہ پیغمبر کا پیغام ایک واقعے کی صورت میں دکھائی دے رہا تھا۔

'لوحِ گوتم' کے لیے لکھا، 'تائب شدن زنِ عشوہ فروش "امباپالی" (مغنیہ)'۔ امباپالی، جسے امرپالی بھی کہتے ہیں، بدھ مت کی کہانیوں میں پٹنہ کے قریب ریاست ویشالی کی شاہی رقاصہ تھی۔ اتنی

حسین تھی کہ اُس کی خاطر ریاستوں کے درمیان خونریز جنگیں ہوئیں۔ اُس کا محل بعض راجاؤں کے محلات سے بڑھ کر تھا۔ گوتم بدھ کی بھگت بن گئی۔ محل اُن کی نذر کر دیا۔[1] علامہ نے گوتم کی طاسین پر پہلے گوتم کا پیغام لکھا۔ زبورِ عجم کے ٹکڑے 'مے دیرینہ و معشوقِ جواں چیزے نیست' کے آخر میں ایک شعر کا اضافہ کر کے ترکیب بند بنایا۔ ایک نئے بند کا اضافہ کیا۔ اب گوتم کہہ رہے تھے کہ دنیا میں رہو بھی اور نہ بھی رہو۔ امباپالی کا جواب زبورِ عجم کے ایک ٹکڑے پر مشتمل تھا: فرصتِ کشمکش مدہ ایں دلِ بیقرار را۔ یعنی میرے بیقرار دل کو کشمکش کا موقع مت دیجیے!

دوسری طاسین زرتشت کی تھی۔ اہرمن، جو پارسی مذہب میں شر کی قوّت کا مظہر تھا، زرتشت سے کہہ رہا تھا کہ ولایت پیغمبری سے بہتر ہے۔ انسانیت کو پیغام دینے کے چکر میں نہ پڑیں۔ عوام نے پیغمبروں کی قدر نہیں کی ہے۔ انہیں ان کے حال پر رہنے دیا جائے۔ زرتشت جواب دے رہے تھے کہ روشنی کے سمندر میں مجھ جیسا طوفان کبھی نہ اُٹھا تھا۔ میں پیغام ضرور پہنچاؤں گا۔

تیسری طاسین عیسیٰ مسیح علیہ السلام کی تھی۔ ان کا ذکر قرآن میں بھی تھا اس لیے احتراماً انہیں براہِ راست دکھانے سے گریز کیا۔ ان کی طاسین پر رُوسی مفکر ناول نگار لیو ٹالسٹائی کا خواب دکھایا۔ اُس خواب کو ہسارِ ہفت مرگ تھے۔ پارے کی ایک ندی میں وہ شخص سزا پا رہا تھا جس نے حضرت عیسیٰؑ کو دشمنوں کے حوالے کیا تھا۔ کنارے پر نازک سی ایک عورت کھڑی تھی۔ نام افرنگین تھا۔ مغربی تہذیب کی علامت تھی۔ اس نے سزا پانے والے کو طعنہ دیا۔ وہ تڑپ اٹھا اور کہا کہ میں نے مسیح کے ظاہری سلوک کے ساتھ جو کچھ کیا، وہ تم نے اُن کی روح کے ساتھ کیا ہے۔ تمہاری موت دُنیا والوں کے لیے زندگی ہے۔ اب دیکھنا تمہارا انجام کیا ہوتا ہے۔

آخری طاسین حضرت محمد مصطفیٰؐ کی تھی۔ یہاں بھی احتراماً پیغمبرؐ کو دکھانے سے گریز کی گئی۔

---

[1] ہندوستان میں اس کے بارے میں ناولوں اور ٹیلی وژن کے پروگراموں کے علاوہ فلمیں بھی پیش کی گئی ہیں۔ فلم امرپالی (۱۹۴۵) میں سبیتا دیوی نے اور اِسی نام کی ۱۹۲۶ء کی فلم میں وجنتی مالا نے یہ کردار ادا کیا۔ ہیما مالنی بھی ٹیلی وژن پر یہ کردار ادا کر چکی ہیں۔ جاویدنامہ کے مسودے اور مطبوعہ نسخے میں صرف ''رقاصۂ عشوہ طراز'' درج ہے مگر بیاض میں نام لے کر ''امباپالی (مغنیہ)'' لکھا تھا۔

خانۂ کعبہ میں ابوجہل کی روح کو نوحہ کرتے دکھایا۔ اُن بتوں کے سامنے گڑگڑا رہا تھا جو کعبے سے ہٹائے جانے والے تھے۔ اُسے افسوس تھا کہ محمدؐ بن عبداللہ کا دین اخوت، مساوات اور آزادی کو فروغ دیتا ہے۔ ابوجہل کی رُوح بتوں سے کہہ رہی تھی کہ مت جاؤ۔ کعبے سے جاتے بھی ہو تو دل سے مت جاؤ۔[1]

51

مدراس اور علیگڑھ والے لیکچروں کے مجموعے کا عنوان دی ری کنسٹرکشن آف ریلجس تھاٹ اِن اسلام (*The Reconstruction of Religious Thought in Islam*)۔ عنوان کا بامحاورہ ترجمہ "تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ" بنتا۔ اوئل مارچ تک یہ مجموعہ پریس میں پہنچ چکا تھا۔[2] سمجھا جا سکتا ہے کہ اسی موقع پر دیباچہ تحریر ہوا ہو گا۔

The Reconstruction of Religious Thought in Islam

PREFACE

The Quran is a book which emphasizes ‘deed’ rather than ‘idea’. There are, however, men to whom it is not possible organically to assimilate an alien universe by re-living, as a vital process, that special type of inner experience on which religious faith ultimately rests. Moreover, the modern man, by developing habits of concrete thought—habits which Islam itself fostered at least in the earlier stages of its cultural career—has rendered himself less capable of that experience which he further suspects because of its liability to illusion. The more genuine schools of Sufism have, no doubt, done good work in shaping and directing the evolution of religious experience in Islam; but their latter-day representatives, owing to their ignorance of the modern mind, have become absolutely incapable of receiving any fresh inspiration from modern thought and experience. They are perpetuating methods which were created for generations possessing a cultural outlook differing, in important respects, from our own. ‘Your creation and resurrection,’ says the Quran, ‘are like the creation and resurrection of a single soul.’[3] A living experience of the kind of biological unity, embodied in this verse,

---

[1] بیاضِ جاوید نامہ

[2] ۴؍ مارچ ۱۹۳۰ء کو عبدالجمیل منگلوری کے نام خط میں لکھا: “My lectures are in the press.”

[3] Quran, 31:28

requires to-day a method physiologically less violent and psychologically more suitable to a concrete type of mind. In the absence of such a method the demand for a scientific form of religious knowledge is only natural. In these lectures, which were undertaken at the request of the Madras Muslim Association and delivered at Madras, Hyderabad, and Aligarh, I have tried to meet, even though partially, this urgent demand by attempting to reconstruct Muslim religious philosophy with due regard to the philosophical traditions of Islam and the more recent developments in the various domains of human knowledge. And the present moment is quite favourable for such an undertaking. Classical Physics has learned to criticize its own foundations. As a result of this criticism the kind of materialism, which it originally necessitated, is rapidly disappearing; and the day is not far off when Religion and Science may discover hitherto unsuspected mutual harmonies. It must, however, be remembered that there is no such thing as finality in philosophical thinking. As knowledge advances and fresh avenues of thought are opened, other views, and probably sounder views than those set forth in these lectures, are possible. Our duty is carefully to watch the progress of human thought, and to maintain an independent critical attitude towards it.

M.I.[1]

52

یکم مارچ کو انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کے اجلاس کی صدارت خان بہادر سردار حبیب اللہ خاں بیرسٹر نے کی۔ نواب بہاولپور سے عطیہ حاصل کرنے والے چار رکنی وفد کی توثیق ہوئی۔ ۱۹/ جنوری کے اجلاس میں مقرر کی گئی تھی۔ علامہ وفد کے سربراہ قرار پائے تھے۔[2]

۴/ مارچ کو عبدالجمیل بنگلوری کی طرف سے عید کارڈ ملا۔ اگناک گولڈزہر (۱۸۵۰-۱۹۲۱) (Ignác Goldziher) جرمن یہودی تھا۔ اسلام پر بہت کچھ لکھا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ عبدالجمیل نے اُس کی انگریزی تصنیفات کے بارے میں بھی دریافت کیا۔ علامہ نے فوراً جواب دیتے ہوئے لکھا کہ جہاں تک انہیں معلوم ہے، انگریزی میں اُس کی کوئی تصنیف نہیں ہے۔ اُس کی جرمن تصنیفات

---

[1] Iqbal (1934), *Reconstruction,* pp.v-vi

[2] انجمن کی قلمی روداد؛ محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶)، ص ۱۸۰،۶۵

علامہ کی نظر سے گزری ہیں۔ اُن میں کچھ نہیں رکھا۔ انہیں یورپی مستشرقین پر زیادہ اعتماد نہیں ہے۔ ان کی کتابیں زیادہ تر پروپیگنڈا یا تبلیغ کے مقاصد کے تحت لکھی جاتی ہیں۔ افغانستان کے بارے میں لکھا کہ وہاں حالات معمول پر آرہے ہیں۔ نادر شاہ افغانوں میں مقبول ہیں۔ ملک کی ترقی کے لیے پوری کوشش کر رہے ہیں۔ امان اللہ کی واپسی کا امکان نہیں ہے۔ افغان اُنہیں پسند نہیں کرتے۔ ہندوستان میں بہت کم لوگوں وہاں کی بغاوت کے اصل اسباب سے واقف ہیں۔ لیکچرز دو ماہ میں شائع ہو جائیں گے۔ علامہ بھول جائیں تو اپریل کے اواخر تک جمیل یاد دلا دیں۔[1]

۶/ مارچ کو پنجاب یونیورسٹی نے علامہ کی عام فیلوشپ کی ۱۶/ مارچ سے تجدید کی۔ گورنر پنجاب کے پرائیویٹ سیکرٹری میجر آر لارنس کی طرف سے حکم جاری ہوا:

> No. 1118:- In exercise of the Powers rested in him under section 6(2)(c) of the Indian Universities Act 1904, the chancellor of the Punjab University is pleased to re-nominate Dr. Sir Muhammad Iqbal, Kt, M.A., Ph.D., M.L.U., Bar-at-Law Lahore to be an ordinary Fellow of the said University with effect from 16th of March 1930.[2]

اُس روز لاہور کونسل کا اجلاس ہوا۔ صوبے کے بجٹ پر بحث شروع ہوئی۔ اگلے روز بھی جاری رہی۔ علامہ نے بھی تقریر کی۔[3] کونسل میں اُن کی آخری تقریر تھی۔ انہوں نے کہا کہ مسلسل تین برس سے بجٹ خسارے میں جا رہا ہے۔ بڑی وجہ انتظامیہ کا موجودہ نظام ہے۔ بڑی بڑی تنخواہوں کی ضرورت پڑی ہے۔ ان کے لیے صوبے کے عوام سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ صرف تین متبادل موجود ہیں۔ اول، اس نظام کو تمام خرابیوں سمیت جاری رکھا جائے۔ دوم، اسے جڑ سے اُکھاڑ پھینکیں۔ سوم، اسے برقرار رکھا جائے مگر عوام کے پاس اختیار ہو کہ وہ اس کے لیے کم قیمت ادا کریں۔ ہم انتظامیہ پر دنیا کے کسی اور ملک سے زیادہ خرچ کرتے ہیں یا بہر حال اُس سے زیادہ ہی خرچ

---

[1] مکتوب بنام عبدالجمیل منگلوری (انگریزی) ۴/ مارچ ۱۹۳۰ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۱۰۴-۱۰۳

[2] ڈاکٹر حسن اختر ملک، اقبال: ایک تحقیقی مطالعہ، ص ۸۷

[3] Mitra *The Indian Annual Register July-Dec. 1930,* p.257

کرتے ہیں جتنا ہماری آمدنی اجازت دیتی ہے۔ صنعت پر شاید ہی کچھ خرچ کرتے ہیں جبکہ یہی بیروزگاری سے نجات دلا سکتی ہے۔ تعلیم پر بہت خرچ کیا گیا لیکن نتیجہ حوصلہ افزا نہیں ہے۔ رپورٹ میں درج ہے کہ طلبہ کی تعداد میں ستائیس ہزار کی کمی ہوئی ہے۔ اسکولوں کی تعداد میں ہزار کی کمی ہوئی۔ اس کی وجہ بتائی گئی ہے کہ اسکول انسپکٹرز نے مناسب پروپیگنڈا نہیں کیا۔ یہ اصل وجہ نہیں ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ تعلیمی فنڈ صوبے کی ملّتوں میں اُن کی آبادی کے تناسب سے تقسیم نہیں کیے جا رہے۔[1]

۸ / مارچ کو بھی اجلاس ہوا۔[2]

53

نوجوان پروفیسر محمد عبدالغنی مورس کالج ناگپور میں پڑھاتے تھے۔ بابر اور ہمایوں کی سوانح عمریاں لکھی تھیں۔ علامہ کو بھجوائیں۔ ۱۵/ مارچ کو علامہ نے شکریے کا خط لکھا:

> I find them interesting reading and I have no doubt that the series you have undertaken to write will supply a long-felt want. It is a great pleasure to me to see young scholars of India active in research work.[3]

۱۷/ اور ۱۸/ مارچ کو بھی صوبائی کونسل کے اجلاس ہوئے۔[4]

یوسف سلیم چشتی سے روایت ہے کہ ۱۹/ مارچ کو شام چھ بجے علامہ کی کوٹھی پر حاضر ہوئے۔ اسپنوزا کے بارے میں پوچھا۔ علامہ نے اس کی تعلیمات کو حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات سے برتر قرار دیتے ہوئے کہا کہ ایک اونچی قسم کی وحدت الوجود کا قائل تھا۔ یوسف کا بیان ہے کہ علامہ نے کہا،

---

[1] Sherwani

[2] Mitra *The Indian Annual Register July-Dec. 1930,* p.258

[3] برنی (۱۹۹۳) کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۱۰۵-۱۰۴

[4] Mitra *The Indian Annual Register July-Dec. 1930,* p.258

"جناب مسیحؑ کی ولادت بھی عام انسانوں کی طرح ہوئی تھی۔"[1]

۲۰/ اور ۲۱/ مارچ کو صوبائی کونسل کے اجلاس ہوئے۔ پھر غیر معینہ طور پر برخاست ہوئی۔[2]

54

انقلاب میں فلاسفیکل سوسائٹی کے سیکرٹری مفتی محمد افضل کی طرف سے شائع ہونے والے اعلان کے مطابق ۲۳/ مارچ کو شام سات بجے اسلامیہ کالج کے حبیبیہ ہال میں علمی مباحثہ ہو رہا تھا۔ عنوان تھا، 'مذہب، سائنس و فلسفہ'۔ علامہ صدارت کرنے والے تھے۔ مقررین کی تعداد بارہ تھی: ملک برکت علی، چودھری ظفراللہ خاں، ڈاکٹر نندلال بیرسٹر، پنڈت نانک چند بیرسٹر، شیخ محمد عظیم اللہ ایڈووکیٹ، محمد یعقوب خاں ایڈیٹر لائٹ، پروفیسر عبدالمجید خاں، پروفیسر دیوان چند شرما، پروفیسر وید ویاس، پروفیسر منیرالدین، محمد امین بیرسٹر اور رائے صاحب جھانکی رام۔ داخلہ مفت تھا۔[3]

انقلاب میں اس مباحثے کی مزید تفصیل نہیں ملتی۔ ہفت روزہ لائٹ (لاہور) کے یکم اپریل کے شمارے میں اسلامیہ کالج لاہور کی فلاسفی سوسائٹی کے زیرِ اہتمام مباحثے کی رپورٹ ملتی ہے۔ صدارت علامہ اقبال نے کی۔ عنوان تھا:

Philosophy and Science suffice to discard religion as the supreme guide for moral and spiritual perfection

علامہ اقبال کرسیٔ صدارت پر تھے۔ مذہب کے خلاف تقریر کرنے والوں نے دلیل پیش کی کہ مذہب انسانوں کے درمیان نفرت پیدا کر کے جنگ و جدل اور خون خرابے کا سبب بنا۔ سیاسی استعمار کی طرح ایک قسم کا روحانی استعمار ہے۔ بیجان نظریات (dogmas) کا مجموعہ ہے جس کے ذریعے پروہتوں کا طبقہ عوام کا استحصال کرتا ہے۔ مذہب کا دفاع کرنے والوں نے جواب دیا کہ یہ خامیاں مذہب کے پیروکاروں کی غلطی کا نتیجہ ہیں۔ خود مذہب نے محبت ہی کا درس دیا ہے، خواہ ہندومت ہو، عیسائیت ہو

---

[1] ہاشمی و دیگر، اقبالیات کے سو سال، ص ۸۰

[2] Mitra *The Indian Annual Register July-Dec. 1930,* p.259-260

[3] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸)، حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے ص ۲۷۷ بحوالہ انقلاب ۲۳/ مارچ ۱۹۳۰ء

یا اسلام ہو۔ مذہبی جنگوں میں جتنا خون خرابہ ہوا اُس سے کہیں زیادہ موجودہ زمانے میں سائنس اور فلسفے سے پیدا ہونے والے نظریات کے سبب ہو چکا ہے۔ جنگِ عظیم اس کی ایک مثال ہے۔ روس کی لادین بالشویک حکومت بھی عوام کی آزادیٔ اظہار سلب کر رہی ہے۔ مذہبی عقائد رکھنے کی پاداش میں موت کی سزا بھی دیتی ہے۔ کمیونزم کا فلسفہ جس نے زاریت کا خاتمہ کیا، ایک نئی قسم کی زاریت کی بنیاد بن رہا ہے۔ بربریت میں زار سے کم نہیں ہے۔

آخر میں حاضرین کی رائے معلوم کی گئی۔ مذہب کی حمایت کرنے والے زیادہ تھے۔ علامہ کی صدارتی تقریر تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہی۔ حاضرین نے دلچسپی سے سنا۔ انہوں نے کہا کہ قرآن خدا کی طرف سے نازل ہونے والی آخری وحی ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ سچائی کی آخری حد آ گئی ہے۔ خدا اب بھی اظہار کرتا ہے لیکن اس کا ذریعہ وحی نہیں ہے۔ اس کے لیے قرآن نے ہماری توجہ بزمِ فطرت (Nature) کی طرف مبذول کروائی ہے۔ اُس کے ہر مظہر کو "آیت" کہا ہے۔[1]

55

گزشتہ برس یکم اپریل سے اس برس ۳۱ مارچ تک علامہ کی تشخیص شدہ آمدنی ۱۳۴۱۰ روپے ہوئی تھی۔ اس میں یونیورسٹیوں سے ۱۵۶۲ روپے، وکالت سے ۸۰۶۲ روپے، چھ خطباتِ مدراس سے ۵۰۰ روپے، رائلٹی سے ۱۵۸۷ روپے اور پیامِ مشرق کی فروخت سے ۳۴۶۳ روپے کی آمدنی شامل تھی۔ ۶۲۸ روپے ٹیکس لگا۔[2]

اس برس پنجاب یونیورسٹی کے لیے جو پرچے جانچ رہے تھے، یہ تھے: ایم اوایل فارسی پہلا پرچہ؛ ایم اوایل فارسی تیسرا پرچہ۔[3]

---

[1] Shaheen, Rahim Bakhsh. [*n.d.*] *Mementos of Iqbal,* pp.5-7

[2] صفدر محمود (۱۹۷۳) 'علامہ اقبال کا گوشوارۂ آمدنی (انکم ٹیکس ریکارڈ کی روشنی میں)'، ص ۱۸، ۱۷

[3] ڈاکٹر حسن اختر ملک، اقبال، ایک تحقیقی مطالعہ، ص ۱۳۲۔ ان کا ماخذ پنجاب گزٹ کے مختلف شمارے ہیں۔

56

علامہ نے مولانا شوکت علی کو خط لکھا جو بمبئی میں تھے۔ کئی روز تک جواب نہ آیا۔

خطبات کے بارے میں خیال تھا کہ ۱۰/اپریل کے قریب چھپ کر تیار ہو جائیں گے۔ لاہور میں کوئی شخص 'گلشنِ راز جدید' کی شرح لکھنا چاہتا تھا۔ علامہ دہلی کے امیر حمزہ شامی کو اجازت دے چکے تھے۔ اِس شرط پر کہ علامہ سے مشورہ نہ کریں۔ اُس کے بعد شامی نے رابطہ نہ کیا۔ ۴/اپریل کو نذیر نیازی کے نام خط میں علامہ نے استفسار کیا۔ خطبات کے ترجمے کے حوالے سے پوچھا کہ کیا عابد لاہور آ سکیں گے۔ "اگر وہ نہ آ سکتے ہوں تو آپ خود یہ کام کرنے کو تیار ہیں یا نہیں،" علامہ نے مزید پوچھا، "ترجمہ بلا معاوضہ نہ ہو گا۔" یہ بھی لکھا کہ مولانا شوکت علی سے خط کے بارے میں پوچھ لیں۔ [1]

غلام جیلانی برق کی روایت ہے کہ علامہ نے یہ تمام خطبات لاہور میں اسلامیہ کالج ریلوے روڈ کے ہال میں بھی پیش کیے۔ یہ محال ہے۔ برق نے لکھا ہے، "میں اُن دنوں اسلامیہ کالج میں پڑھتا تھا۔ اس لیے نہایت باقاعدگی سے ان مجالس میں شامل ہوتا رہا۔" انہی کے مطابق اس کالج میں وہ ۳۱-۱۹۳۰ء میں تھے۔ اس لحاظ سے وہاں خطبات جنوری سے اپریل ۱۹۳۰ء کے عرصے میں کبھی دیئے گئے (مئی ۱۹۳۰ء کے آغاز میں تو کتابی صورت میں شائع ہو چکے تھے)۔ برق کے مطابق پہلے جلسے کی صدارت شیخ عبدالقادر نے کی، مولانا ظفر علی خاں اور پطرس بخاری سے کہا کہ اہم نکات نوٹ کرتے جائیں اور خاتمے پر حاضرین کو اُردو میں سمجھائیں۔ خطبے کے بعد ظفر "مائیک پر آئے اور یہ کہہ کر بیٹھ گئے کہ یہ خطبہ میرے ناقص فہم سے بہت بلند تھا۔ اس لیے میں معذرت چاہتا ہوں۔" اِس قسم کا جملہ ظفر کی زبان سے زندگی کے کسی دَور میں بھی نکلنا مشکل تھا مگر ۱۹۳۰ء میں تو وہ علامہ کے خلاف سیاسی محاذ پر بھی ڈٹے ہوئے تھے اور کچھ عرصہ پہلے اُن کا اخبار علامہ کو نیچا دکھانے کی سر توڑ کوشش بھی کر چکا تھا۔ خطبات کا مسودہ بھی تیار تھا، اِس لیے یہ سمجھنا مشکل ہے کہ اگر ظفر اور پطرس نے خطبے کا خلاصہ پیش کرنا تھا تو اُنہیں پہلے سے کیوں نہ دیا گیا۔ بعض خطبات کے خلاصے اخبارات میں بھی آ چکے تھے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پہلا خطبہ تو علامہ نے مدراس جانے سے بھی بہت پہلے ۸/اپریل

---

[1] مکتوب بنام سید نذیر نیازی ۴/اپریل ۱۹۳۰ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۱۰۹-۱۰۶

۱۹۲۸ء کو لاہور ہی میں انجمن حمایت اسلام کے اجلاس میں پیش کر دیا تھا۔ اُس کی صدارت عبد القادر ہی نے کی تھی۔ البتہ برق اپنے بیان کے مطابق اُس زمانے میں لاہور میں نہ تھے۔ اس سے پہلے ۱۳/ دسمبر ۱۹۲۴ء کو عبد القادر نے علامہ کے اجتہاد والے مقالے کی صدارت بھی کی۔ اُس وقت برق لاہور میں بھی تھے اگرچہ اسلامیہ کالج نہیں بلکہ سنٹرل ٹریننگ کالج کے طالب علم تھے۔ [1]

57

۶/ اپریل کی صبح تھی۔ گجرات کے ساحل پر چھوٹا سا گاؤں ڈانڈی مغربی میڈیا کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ گاندھی وہاں تھے۔ چوبیس روز پہلے ۲۴۰/ میل دُور سابر متی آشرم سے پیدل چلے تھے۔ اُنہتر لوگ ساتھ تھے۔ زیادہ تر ہندو تھے۔ دو مسلمان تھے۔ ارادہ تھا کہ ساحل کے پانی سے نمک حاصل کریں۔ قانوناً منع تھا۔ صرف حکومت ہی نمک بنانے اور فروخت کرنے کا اختیار رکھتی تھی۔

اب ہزاروں ڈانڈی میں جمع تھے۔ صبح ساڑھے چھ بجے گاندھی نے نمک آلود سمندری مٹی کا ایک ڈھیلا اُٹھایا۔ برطانوی راج کی بنیادیں ہلانے کا اعلان کیا۔ مٹی کو سمندر کے کھارے پانی میں ابالا۔ نمک تیار ہوا۔ گاندھی نے کہا کہ ہندوستان بھر میں جہاں بھی ہو سکے اسی طرح نمک تیار کیا جائے۔ سول نافرمانی کی نئی لہر کا آغاز تھا۔

58

۱۴/ اپریل کو لاہور ہائی کورٹ نے کسی لکھا سنگھ کی اپیل منظور کر لی۔ بشن نرائن اور رام لال آنند پیروی کر رہے تھے۔ کسی غلام محمد اور بعض دوسروں کے خلاف تھی۔ اُن کا دفاع علامہ اور خورشید زمان کر رہے تھے۔ سماعت جسٹس ٹیک چند اور جسٹس آغا حیدر نے کی تھی۔ [2]

59

قریباً ساٹھ ہزار لوگ گرفتار ہو چکے تھے۔ ان میں کانگریس کے بڑے بڑے رہنما شامل تھے۔

---

[1] گورنمنٹ کالج سرگودھا کے ضیأبار اقبال نمبر ۱۹۷۳ء میں برق کا مضمون 'میں اور اقبال'؛ شاہین، اوراق، ص ۱۹۱–۱۹۳

[2] ظفر علی راجا ایڈووکیٹ (۲۰۱۳) قانون دان اقبال، ص ۱۲۷

جواہر لال نہرو بھی جیل میں تھے۔ سول نافرمانی کرنے والے نمک بناتے اور بیچتے تھے۔ حکومت کے نمک کے ذخیروں پر دھاوا بولتے تھے۔ شراب اور درآمد شدہ کپڑے پر پابندی کا مطالبہ بھی کر رہے تھے۔

لبرل یعنی اعتدال پسند ہندو تحریک میں شامل نہ تھے۔ سر تیج بہادر سپرو اور شری نواس شاستری جیسے سرکردہ رہنما انگریزوں کے ساتھ تعاون کر کے آزادی حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ہندو مہاسبھا آزادی چاہتی تھی۔ سول نافرمانی کے حق میں بھی تھی۔ البتہ عدم تشدد تک محدود رہنے کی قائل نہ تھی۔ بعض تنظیمیں ''دہشت پسندی'' کا نظریہ پیش کرتی تھیں۔

۱۵؍ اپریل کو کلکتہ میں ٹرام جلائی گئی۔ سرکاری اہلکاروں پر حملے ہوئے۔ اگلے روز کرچی میں عدالت کے شیشے ٹوٹے۔ وکیلوں پر پتھراؤ ہوا۔ گاندھی نے آٹھ برس پہلے چوری چورا میں تشدد کا ایک واقعہ پیش آنے پر تحریک بند کر دی تھی۔ اس دفعہ نہ کی۔ ۱۷؍ اپریل کو کہا، ''عدم تشدد کو سرکاری تشدد کے ساتھ ساتھ عوامی تشدد کا مقابلہ کرنا پڑے تب بھی اسے اپنا بھاری فرض نبھانا چاہیے۔ مجھے گریز کی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔''[1]

چٹاگانگ میں ریل کی پٹری اُکھاڑ کر مال گاڑی اُلٹ دی گئی۔ آسام بنگال ریلوے ہیڈ کوارٹرز کے افسرِ اعلیٰ کو گولی ماری گئی۔ پھر بندوق کے بٹ مار مار کے اُس کا سر کچلا گیا۔ پولیس کے اسلحہ خانے پر متعین تمام سنتریوں کو گولی مار کر ہلاک کیا گیا۔ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی گاڑی پر گولیوں کی بوچھاڑ ہوئی۔ وہ بچ گیا مگر محافظ ہلاک ہوا۔ اگلے روز سینئیر پولیس انسپکٹر اور کئی سپاہیوں کو ہلاک کیا گیا۔[2]

مسلمانوں کے نمایندے بار بار تحریک سے لاتعلقی کا اعلان کر رہے تھے۔ مسلم آل پارٹیز کانفرنس کے صدر مولانا محمد علی [جوہر] تھے۔ کانفرنس نے باقاعدہ قرارداد منظور کی تھی۔ مسلمان سول نافرمانی کی تحریک میں شریک نہیں ہو سکتے۔ یہ آزادی کی تحریک نہیں ہے۔ اصل مقصد یہ ہے کہ حکومت کو خوفزدہ کر کے مجبور کر دیا جائے کہ وہ ہندوستان کو درجۂ استعمار ہی دینے پر تیار ہو جائے۔

---

[1] Mitra, *Register*, Jan-June 1930, p.38

[2] ایضاً

اقلیتوں کے بارے میں نہرو رپورٹ کی سفارشات منظور کر لے۔ جوہر نے کہا کہ مسٹر گاندھی کی تحریک در حقیقت ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں کو ہندو مہاسبھا کی غلامی میں لانے کے لیے ہے:

> We refuse to join Mr. Gandhi, because his movement is not a movement for the complete independence of India but for making the seventy millions of Indian Musalmans dependent on the Hindu Mahasabha.[1]

اب بھی جو مسلمان کانگریس کا ساتھ دے رہے تھے، ''نیشنلسٹ مسلمان'' کہلاتے تھے۔ صوبہ سرحد کے خان عبدالغفار خاں بھی تھے۔ ۲۳/ اپریل کو بعض ساتھیوں سمیت گرفتار ہوئے۔ پشاور میں زبردست احتجاج ہوا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس اور ڈپٹی کمشنر نے مشکل سے جان بچائی۔ زخمی ہوئے۔ ایک ڈاکیا ہلاک ہوا۔ اُس کی لاش کے ساتھ دو بکتر بند گاڑیاں بھی نذرِ آتش کی گئیں۔ معاملہ پولیس کے بس میں نہ رہا۔ فوج طلب کی گئی۔ ہجوم پر گولی چلی۔ سرکاری اعلان کے مطابق ہلاک ہونے والوں کی تعداد بیس تھی۔ ہندوستانی دعوے کے مطابق سیکڑوں میں تھی۔[2]

صوبے میں برطانوی راج کے قیام کے بعد سے ایسی بغاوت نہ دیکھی گئی تھی۔ علامہ سمجھتے تھے کہ صوبے میں دستوری اصطلاحات کا نفاذ نہ ہونا اس بےچینی کی بنیادی وجہ ہے۔[3]

60

مولانا گرامی کی بیوہ نے، جن کا نام اقبال تھا اور ترک تخلص کرتی تھیں، مرحوم شوہر کے کلام کی اشاعت کا ارادہ کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کسی حبیب اللہ نے ان سے رابطہ کیا اور پھر بیگم گرامی کا کوئی رشتہ دار علامہ سے ملا۔ علامہ نے وعدہ کیا کہ رباعیات کے انتخاب میں مدد دیں گے۔ پھر بیگم گرامی کے خط سے معلوم ہوا کہ سارا کلام شائع کروانا چاہتی ہیں۔ ۲۱/ اپریل کو علامہ نے جواب میں لکھا کہ

---

[1] *Times of India*, 24 April 1930 quoted in Qureshi, *Struggle for Pakistan,* pp.50-51; see also Mitra, *Register Jan-June 1930,* pp.347-348

[2] Mitra, *Register Jan-June 1930,* pp.140-142

[3] خطبۂ الٰہ آباد۔ دیکھیے ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کے واقعات

حبیب اللہ سے معاہدہ کر لیا جائے۔ بعض تفصیلات بھی دریافت کیں۔[1]

معلوم ہوتا ہے کہ جواب میں بتایا گیا کہ کلام پانچ ہزار کی تعداد میں شائع ہو گا۔ تین ہزار روپیہ معاوضہ پانچ برس کے عرصے میں ادا کیا جائے گا۔ علامہ نے ۲۵/ اپریل کو جواب دیا کہ رقم پانچ ہزار ہونی چاہیے اور مدتِ ادائیگی معاہدے کی تاریخ سے شروع ہو، کتاب کے طبع ہونے کی تاریخ سے نہیں۔ نیز معاہدہ تحریر ہونا چاہیے۔[2]

61

نذیر نیازی خط میں بتا چکے تھے کہ ڈاکٹر سید عابد حسین مصروفیت کی وجہ سے خطبات کا ترجمہ نہیں کر سکیں گے۔ نذیر خود تیار تھے اگرچہ معاضے کے خیال سے نہیں۔ جامعہ کی تعطیلات میں لاہور آنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ امیر حمزہ شامی نے بھی 'گلشن راز جدید' کی شرح لکھنے سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ ۲۷/ اپریل کو علامہ نے نذیر کے نام خط میں لکھا کہ خطبات چھپ چکے ہیں۔ ۶/ مئی تک جلد بندی ختم ہو جائے گی، "کیا جامعہ کے بند ہونے پر آپ لاہور آنے کا قصد رکھتے ہیں؟ میرا خیال ہے کہ آپ تشریف لائیں اور نمونۃً ایک آدھ لیکچر کا ترجمہ کریں۔ پھر فیصلہ ہو سکے گا۔ اِس کام میں اور احباب کی مدد بھی جہاں تک ممکن ہو آپ کے شاملِ حال ہو گی۔"[3]

62

حکومت کی طرف سے انڈین سینٹرل بینکنگ انکوائری کمیٹی (The Indian Central Banking Inquiry Committee) قائم کی گئی تھی۔ بینکاری سے متعلق تجاویز مرتب کر رہی تھی۔ ٹائمز آف انڈیا (Times of India) نے مقالہ افتتاحیہ لکھا۔ بیان کیا کہ قدیم ہندوستان میں سلطنت سود کی شرح پر قید لگایا کرتی تھی۔ اسلامی عہد میں ہندوستان کی اسلامی ریاستوں نے شرحِ سُود پر کوئی پابندی

---

[1] مکتوب بنام بیگم گرامی ۲۱/ اپریل ۱۹۳۰ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۱۱۱-۱۰۹

[2] مکتوب بنام بیگم گرامی ۲۵/ اپریل ۱۹۳۰ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۱۱۱

[3] مکتوب بنام سید نذیر نیازی ۲۷/ اپریل ۱۹۳۰ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۱۱۳

عائد نہ کی حالانکہ اسلام میں رقوم پر سُود لیناواضح طور پر منع ہے۔
علامہ کے نزدیک اِس بات سے مسلم یا اسلامی ریاست کی نوعیت کو سمجھا جا سکتا تھا۔[1]

63

آسمانی سفر کی دوسری منزل عطارد تھا۔جاویدنامہ کے دوسرے باب میں مولانا روم کی زبانی اسے اولیأ اللہ کا سیّارہ کہلوایا۔ اس کی کیفیت یہ دکھائی کہ ہماری خاک سے زیادہ قدیم ایک دنیا جہاں پہاڑ، جنگل، سمندر اور خشکی ہیں۔ یہاں ایسے امکانات پوشیدہ ہیں جو ابھی ظاہر نہیں ہوئے۔ اذان کی آواز سنائی دی۔ مولانا روم نے کہا کہ جب آدم جنت سے رخصت ہوئے، یہاں ایک دو دن پڑاؤ کیا۔ اِن فضاؤں نے اُن کی آہوں کا سوز دیکھ رکھا ہے۔ یہاں کی زیارت کرنے والے فضیلؒ، ابی سعیدؒ، جنیدؒ اور بایزیدؒ جیسے پاکباز عارف ہیں۔ آگے بڑھے تو سید جمال الدین افغانی نماز پڑھا رہے تھے۔ پیچھے سعید حلیم پاشا کھڑے تھے۔ مولانا روم نے خوش ہو کر کہا، ”مشرق نے اِن دونوں سے بہتر آدمی نہیں پیدا کیا۔۔۔“ مولانا روم اور علامہ بھی نماز میں شامل ہو گئے۔ افغانی نے سورۂ نجم کی تلاوت کی۔ چھُپے ہوئے راز علامہ پر کھلنے لگے۔ اُم الکتاب بے حجاب ہو گئی۔ نماز کے بعد افغانی کا ہاتھ چوم لیا۔ مولانا روم نے افغانی سے علامہ کا تعارف کرواتے ہوئے کہا، ”اِس نے کسی کو دل نہ دیا۔ ہر بند سے آزاد ہے، وجود کی وسعتوں میں تیزی سے قدم اُٹھانے والا! میں اسے ہنسی میں ’زندہ رُود‘ کہتا ہوں۔“

ایران میں ایک دریا کا نام بھی زندہ رُود ہے۔ لغوی معانی ہیں، زندہ دریا۔ ایسی ندی جو بہتی ہی رہے۔ جاوید نامہ کی بیاض کے شروع میں بھی ناصرِ خسرو اور بھرتری ہری کے ساتھ زندہ رُود کا مکالمہ ملتا ہے۔ اگر واقعی وہ صفحات پہلے لکھے گئے تو پھر یہ لقب بھی پہلے سے ذہن میں رہا ہو گا۔ کہانی میں اِسی مقام پر متعارف کروایا گیا ہے۔ باقی جاویدنامہ میں علامہ نے اپنے لیے یہی نام استعمال کیا۔

---

[1] علامہ نے خطبۂ الٰہ آباد میں متعلقہ اقتباس نقل کیا(دیکھیے ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کے واقعات)۔ ٹائمز آف انڈیا اور علامہ نے انگریزی میں مسلم عہد(Muslim times)اور مسلم ریاست(Muslim state)کی تراکیب استعمال کی تھیں۔ مولانا غلام رسول مہر نے انقلاب کے لیے خطبۂ الٰہ آباد کا ترجمہ کرتے ہوئے "مسلم" کی جگہ "اسلامی" کا لفظ استعمال کیا۔ اُس زمانے میں یہ عام قاعدہ تھا۔

افغانی نے علامہ سے حالاتِ حاضرہ پوچھے۔ علامہ نے کہا کہ مسلمانوں کے دل میں دین اور وطن کی کشمکش ہے، "یقین کی کمزوری سے روح بدن میں مردہ! دینِ مبین کی قوت سے مایوس! ترکی، ایران اور عرب، سب فرنگ کے متوالے! ہر کسی کے گلے میں فرنگ کا کانٹا پھنسا ہوا ہے۔ مشرق، مغرب کے استعمار سے تباہ حال ہے۔ اشتراکیت نے دین و ملت کو مٹا کر رکھ دیا ہے۔"

بیاض میں افغانی کا طویل جواب دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلے حصے کا عنوان 'دین و وطن' اور دوسرے کا 'اشتراک و ملوکیت' ہے۔ پہلے حصے میں افغانی وطنیت کے سیاسی تصوّر پر تنقید کرتے ہیں۔ دوسرے میں ملوکیت اور کمیونزم دونوں کو مغرب کے ہتھکنڈے قرار دیتے ہیں۔ کارل مارکس کے ذکر سے شروع کرتے ہوئے کہتے ہیں:

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے تعلق رکھنے والا کتاب سرمایہ کا مصنف، وہ پیغمبر جس پر وحی نہیں اتری!

چونکہ اُس کے باطل میں حق چھپا ہوا ہے، "اُس کا دل مومن اور دماغ کافر ہے۔"

اہل مغرب آسمانوں کو بھلا بیٹھے ہیں۔ جانِ پاک کو پیٹ میں تلاش کرتے ہیں۔

جانِ پاک بدن سے نہیں پھلتی پھولتی۔ اشتراکیت بس جسم سے کام رکھتی ہے۔

اس حق ناشناس پیغمبر کا دین پیٹ کی مساوات پر بنیاد رکھتا ہے۔

چونکہ اخوت کا مرکز دل میں ہے، اس کی بنیاد بھی دل ہے نہ کہ مٹی اور پانی۔

ملوکیت بھی بس بدن کا مٹاپا ہے۔ اس کا بے نور سینہ دل سے خالی ہے۔

کسی شہد کی مکھی کی طرح جو پھول کا رس چوستی ہے۔ پتیوں کو چھوڑ دیتی ہے اور ان کا شہد لے اڑتی ہے۔

پھول کی ڈالی، پنکھڑی، رنگ اور خوشبو وہی۔ اس کے جمال کے لیے بلبل کی درد بھری پکار اسی طرح۔

اس کے رنگ و بو کے طلسم سے نکل جاؤ۔ صورت سے گزر جاؤ اور معنی میں دھیان کرو۔

اگرچہ باطن کی موت کو دیکھنا مشکل ہے۔ اسے پھول مت کہو، وہ حقیقت میں دھول ہے۔

دونوں کی روح بے صبری اور جلد باز۔ دونوں خدا سے بیخبر اور انسان کو فریب دینے والے۔
زندگی اِس کے لیے بغاوت ہے، اُس کے لیے خراج۔ انسان ان دونوں پاٹوں کے بیچ شیشہ۔
یہ علم، دین اور فنون لطیفہ کو ڈھا دیتی ہے۔ وہ بدن سے روح، ہاتھ سے روٹی چھین لیتی ہے۔
میں نے دونوں کو دلدل میں دھنسا ہوا دیکھا۔ دونوں کا تن اجلا ہے اور من کالا۔
زندگی؟ جلانا اور بنانا۔ مٹی میں دل کا بیج بونا!

اِشتراک وملوکیت

صاحبِ سرمایہ از نسلِ خلیلؑ — یعنی آں پیمبر بے جبرئیل
زانکہ حق و باطلِ اُو مضمر است — 'قلبِ اُو مومن دماغش کافر است'
غربیاں گم کردہ اند افلاک را — در شکم جویند جانِ پاک را
رنگ و بو از تن نگیرد جانِ پاک — جز بہ تن کارے ندارد اشتراک
دینِ آں پیغمبرِ حق ناشناس — بر مساواتِ شکم دارد اساس
تا اخوت را مقام اندر دل است — بیخِ او در دل نہ در آب و گِل است
ہم ملوکیت بدن را فربہی است — زینۂ بے نورِ اُو از دل تہی است!
مثلِ زنبورے کہ بر گُل می چرد — برگ را بگذارد و شہدش برد
شاخ و برگ و رنگ و بوئے گل ہماں — بر جمالش نالۂ بلبل ہماں
از طلسمِ رنگ و بوے او گذر — ترکِ صورت گوے و در معنی نگر
مرگِ باطن گرچہ دیدن مشکل است — گُل مخواں اُو را کہ در معنی گِل است
ہر دو را جاں ناصبور و ناشکیب — ہر دو یزداں ناشناس، آدم فریب!
زندگی ایں را خروج آں را خراج — درمیانِ ایں دو سنگ آدم زجاج!
ایں بہ علم و دین و فن آرد شکست — آں برد جاں را ز تن، ناں را ز دست

غرق دیدم ہر دو را در آب و گِل　　ہر دو را تن روشن و تاریک دل!
زندگانی سوختن با ساختن　　در گِلے تخمِ دلے انداختن!

مارچ ۱۹۲۹ء میں افغانی اور سعید حلیم پاشا کے جو مکالمے لکھے تھے، انہیں عطارد والے باب میں شامل کر دیا۔ فروری ۱۹۲۹ء میں افغانستان کے حالات سے متاثر ہو کر جو نظمیں لکھی تھیں، اُن کے اکثر حصے پہلے ہی اِس مکالمے کا حصہ بنائے جا چکے تھے۔ سعید حلیم پاشا کے مکالمے میں 'مشرق و مغرب' کا عنوان ڈالا۔ اس کے بعد افغانی کی زبان سے وہ اشعار کہلوائے جو بہت پہلے 'مثنوی حصہ سویم' کی 'تمہید' میں لکھے تھے، جس کا موضوع یہ تھا کہ ملّتِ اسلامیہ "کیا کیا واقعات و حوادث آیندہ صدیوں میں دیکھنے والی ہے اور بالآخر ان سب واقعات کا مقصود و غایت کیا ہے۔"[1]

ایک دنیا جو ابھی ہمارے سینے میں گم ہے۔ ایک دنیا جو ابھی قُم کے انتظار میں ہے۔
ایک دنیا جہاں رنگ و نسل کی تفریق نہیں! اُس کی شام فرنگ کی صبح سے زیادہ روشن!
ایک دُنیا بادشاہوں اور غلاموں سے پاک! مومن کے دل کی طرح بیکراں!
ایک حسین دنیا کہ ایک نگاہ کے فیض نے اُس کا بیج حضرت عمر فاروقؓ کی روح میں بویا تھا!
میں نے اُسے ستاروں کی طرح چمکتے دیکھا۔ میں نے اُسے لامکاں کے باطن سے جھانکتے دیکھا۔

عالمے در سینۂ من گم ہنوز　　عالمے در انتظارِ قُم ہنوز
عالمے بے امتیازِ خون و رنگ　　شامِ او روشن تر از صبحِ فرنگ
عالمے پاک از سلاطین و عبید　　چوں دلِ مومن کرانش ناپدید
عالمے رعنا کہ فیضِ یک نظر　　تخمِ او افگند در جانِ عمرؓ
صورتِ انجم درخشاں دیدمش　　از ضمیرِ لامکاں دزدیدمش

یہ نئی دنیا جو مستقبل میں قرآن کے بطن سے برآمد ہونے والی تھی، اس کے چار بنیادی اصول — 'محکماتِ عالمِ قرآنی' — بھی افغانی ہی کی زبان سے بیان کروائے۔ مارچ ۱۹۲۹ء کے متن میں سعید حلیم

[1] دیکھیے ۱۷ر سے ۲۷ر ستمبر ۱۹۲۳ء کے واقعات

پاشا کی زبانی "تہذیبِ قرآنی" کے چار اُصولوں کے طور پر لکھے گئے تھے: خلافتِ آدم، الحکم للہ، الارض للہ، ومن یوت الحکمہ فقد اوتی خیرا کثیرا۔

اس کے بعد افغانی نے رُوسی قوم کے لیے نصیحت کی کہ مادیت کو چھوڑ کر روح کی طرف متوجہ ہوں۔ مولانا روم نے فرمایش کی کہ زندہ رُود غزل سنائے۔ زندہ رُود نے وہ غزل سنائی جو بیاض کے ابتدائی صفحوں میں لکھی تھی: مشکل یہ نہیں کہ رِندوں کی محفل ہائے وہو سے خالی ہو گئی۔ مشکل یہ ہے کہ سب ہاتھ پر ہاتھ دھرے اکیلے بیٹھے ہیں۔

مشکل ایں نیست کہ بزم از سرِ ہنگامہ گذشت   مشکل ایں است کہ بے نقل و ندیم اند ہمہ [1]

تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ

حضرت علامہ اقبال کے چھ فاضلانہ خطبات

انگریزی میں چھپ کر طیار ہو گئے

حضرت علامہ اقبال نے مدراس میں اسلام کی الٰہیات کی تشکیلِ جدید کے متعلق جو چھ لیکچر ارشاد فرمائے تھے، وہ انگریزی میں چھپ کر طیار ہو گئے ہیں۔ یہ مجموعہ ڈھائی سو صفحات پر ختم ہوا ہے اور نہایت نفیس و دبیز کاغذ اور بہترین سامانِ طباعت کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اس کی جِلد بھی نہایت خوشنما ہے۔ قیمت غالباً چھ روپے ہو گی جو اِس گنجِ معانی کے عوض میں بالکل بے حقیقت ہے۔ اِن لیکچروں پر عنقریب ایک مبسوط تبصرہ "انقلاب" میں شائع کیا جائے گا۔ اُردو ترجمے کا انتظام بھی کیا جا رہا ہے، جو اِن شاٗاللہ تین چار ماہ کے بعد شائع ہو جائے گا۔ انگریزی کتاب کے ملنے کا پتہ یہ ہے۔ شیخ مبارک علی تاجرِ کتب اندرون لوہاری دروازہ۔ لاہور۔

انقلاب ۳۰/ اپریل ۱۹۳۰ء [2]

---

[1] غزل کے لیے دیکھیے اپریل ۱۹۲۷ء کے واقعات؛ مکتوب بنام عبدالماجد دریابادی ۵/ جنوری ۱۹۳۰ء میں بھی یہ شعر نقل ہوا۔

[2] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸) حیات اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۳۰۵

باب ۹

مئی سے دسمبر ۱۹۳۰ء

SIX LECTURES
ON
THE RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS
THOUGHT IN ISLAM

BY
SIR MOHAMMAD IQBAL
BARRISTER-AT-LAW
LAHORE

PRINTED AT
THE KAPUR ART PRINTING WORKS, LAHORE

1930

کتاب کی قیمت پانچ روپے تھی۔[1] کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس لاہور سے چھپی تھی۔ مبارک علی تاجر کتب لوہاری گیٹ سے مل سکتی تھی۔[2] ایک دیباچے اور چھ لیکچرز پر مشتمل تھی:

---

[1] رفیع الدین ہاشمی (۲۰۰۱)، ص۳۱۷۔ نیز حمزہ فاروقی (۱۹۸۸) حیات اقبال کے چند مخفی گوشے ص ۱۷ بحوالہ انقلاب ۱۵/ مئی ۱۹۳۰ء جس میں چھپا کہ کتاب ''قریباً ایک ہفتہ ہوا زیورِ طبع سے مزین ہو کر شائقین کے ہاتھوں تک پہنچ رہی ہے۔

[2] مکتوب بنام عباس علی خاں لمعہ ۲۰/ مئی ۱۹۳۰ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص۱۱۸-۱۱۷

Preface
Lecture I—Knowledge and Religious Experience
Lecture II—The Philosophical Test of the Revelations of Religious Experience
Lecture III—The Conception of God and the Meaning of Prayer
Lecture IV—The Human Ego—His Immortality and Freedom
Lecture V—The Spirit of Muslim Culture
Lecture VI—The Principle of Movement in the Structure of Islam[1]

اُسی برس کسی وقت بانگِ درا کا تیسرا ایڈیشن شائع ہوا۔[2]

1

یکم مئی کو وائسرائے نے لاہور سازش کیس کے لیے آرڈیننس نافذ کیا۔ ایک خصوصی ٹریبونل ملزموں اور اُن کے وکیلوں کی غیر حاضری میں سماعت کر سکتا ہے۔ فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ میں اپیل نہیں کی جا سکتی۔ صرف انگلستان کی پریوی کونسل میں ہو سکتی ہے۔ مرکزی اسمبلی سے آرڈیننس کی توثیق کی اُمید نہ تھی۔ چھ ماہ بعد ختم ہو جاتا۔ لاہور ہائی کورٹ کی بار ایسوسی ایشن نے جائزہ لینے کے لیے چھ ارکان کی سب کمیٹی بنائی۔ علامہ اقبال کے علاوہ گوکل چند نارنگ، برکت علی، نانک چند، سر موتی ساگر اور جگن ناتھ پر مشتمل تھی۔

۴/ مئی کو گاندھی گرفتار کیے گئے۔ ۵/ مئی کو علامہ نے پروفیسر آر اے نکلسن کو بھیجنے کے لیے ری کنسٹرکشن کے ایک نسخے پر دستخط کر کے تاریخ ڈالی۔ ۶/ مئی کو سر مانٹیگو بٹلر کے لیے دستخط کر کے تاریخ ڈالی۔[3]

۵/ مئی سے تین ججوں کے ٹریبونل کے سامنے لاہور سازش کیس کی سماعت ہونے لگی تھی۔ چھ ماہ بعد آرڈیننس کے ساتھ ہی ٹریبونل بھی ختم ہو جاتا۔ مقدمہ جلدی میں بڑی بے قاعدگی کے ساتھ

---

[1] Iqbal, *Six Lectures*

[2] رفیع الدین ہاشمی (۲۰۰۱)، ص ۲۶

[3] رفیع الدین ہاشمی (۲۰۰۱)، ص ۳۱۷

نمٹایا جا رہا تھا۔ قریباً پانچ سو گواہ پیش ہو رہے تھے۔ وکیلِ صفائی کو مناسب جرح کا موقع نہ دیا جا سکا۔ بھگت سنگھ اور اُن کے ساتھی ٹریبونل کے سامنے غزل گاتے رہے۔ خیال ہے کہ محمد حسن بسمل عظیم آبادی نے ۲۱-۱۹۲۰ء کی تحریکِ ترکِ موالات کے زمانے میں لکھی تھی۔ رام پرشاد بسمل نے پھانسی پانے سے پہلے ساتھیوں میں متعارف کروائی۔ اب شہرۂ آفاق ہو گئی:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے — دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے
اے شہیدِ ملک و ملّت میں تیرے اوپر نثار — لے تری ہمت کا چرچا غیر کی محفل میں ہے
آج پھر مقتل میں قاتل کہہ رہا ہے بار بار — آئیں وہ شوقِ شہادت جن کے جن کے دل میں ہے
وقت آنے دے دکھا دیں گے تجھے اے آسماں — ہم ابھی سے کیا بتائیں کیا ہمارے دل میں ہے
اب نہ اگلے ولولے ہیں اور نہ ارمانوں کی بھیڑ — صرف مٹ جانے کی حسرت اِک دلِ بسمل میں ہے

2

"ہمارے اور سورج کے نُور کے درمیان تہہ در تہہ فضا کے پردے حائل تھے جنہیں آگ نے لپیٹ رکھا تھا،" علامہ نے جاوید نامہ کے تیسرے باب کے آغاز میں لکھا۔ یہ باب زہرہ سیارے سے متعلق تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس آسمانی سفر کے وقت زہرہ سورج کے دوسری طرف تھا۔ وہاں کی کیفیت علامہ نے، جو اَب "زندہ رُود" تھے، یوں بیان کی کہ دوستوں سے جدائی کا احساس شدت اختیار کر گیا۔ وصال سے بھی ڈر تھا کہ شوق کی موت واقع نہ ہو جائے۔ خبر نہ تھی کہ کہاں ہیں۔ مولانا روم نے کہا، "سامنے دیکھو، ہم زہرہ کے نواح میں ہیں۔" پانی اور مٹی سے گندھی ہوئی ایک دنیا پر دھند اور دھواں چھائے ہوئے تھے۔ کعبے کی طرح سیاہ غلاف میں لپٹی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ مولانا روم نے کہا، "یہاں تم قدیم زمانوں کے دیوتاؤں کو دیکھو گے۔ میں ایک ایک کو پہچانتا ہوں۔ بعل، مردوخ، یعوق، نسر، فسر، رم خن، لات، منات، عسر، غنسر..." اِس فہرست میں کسی ایسے مذہب کے معبود شامل نہ کیے گئے جن کے پرستش کرنے والے ابھی موجود ہوں، مثلاً ہندومت کے دیوتاؤں کی طرف اشارہ بھی نہ کیا گیا۔ صرف اُن دیوی دیوتاؤں کا ذکر ہوا جنہیں انسان مدتوں پہلے مسترد کر چکا تھا۔ ان کے ماننے والے

باقی نہ تھے۔ اب یہ صرف اس بات سے اپنے وجود پر دلیل لاتے تھے کہ آج کا زمانہ ابراہیمی مزاج سے محروم ہے۔ ایک شاداب وادی میں جمع ہو کر خوشی منا رہے تھے۔ مردوخ نے کہا، ''انسان خدا سے بھاگ گیا... اُسے آثارِ قدیمہ کی چاٹ لگی ہے۔ ہمارے خدائی انوار کا تذکرہ کرتا رہتا ہے۔ اب زمینی دنیامیں ساز گار ہوا چل پڑی ہے۔''

بعل خوشی سے جھوم کر گانے لگا۔ بیاض کے ایک علیحدہ صفحے پر 'نغمہ خداوندان دنیائے قدیم' کا عنوان ڈالا گیا۔ پھر کبھی اسے 'نغمہ بعل' کر دیا۔ بڑی محنت ہوئی۔ پہلے ساڑھے پانچ اشعار لکھے۔ بعد میں ترتیب بدلنے کے لیے ان پر نمبر لگائے۔ پھر یہ بند کاٹ دیا۔ اس کے مختلف اشعار کے مضامین لے کر علیحدہ علیحدہ بند لکھے۔ آخر میں نمبر لگا کر ترتیب دی گئی۔ بعل کے نغمے کی حتمی صورت بر آمد ہوئی۔ مفہوم یوں تھا:

اِنسان نے اِس نیلے پردے کو چاک کر دیا۔ آسمان کے پار کوئی خدا دکھائی نہ دیا۔

انسان کے دل میں بس خیالات کے سوا اور کیا ہے! موج کی طرح جس نے سر ابھارا اور غائب ہو گیا۔

اُس کی روح سامنے کی چیزوں سے تسکین حاصل کرتی ہے۔ شاید گزرا ہوا زمانہ پھر سے ظہور کرے۔

مغرب کا مستشرق جیتا رہے جس نے ہمیں قبر سے نکال لیا!

اے پرانے خداؤ! مژدہ ہو کہ اب ہمارا دَور ہے!

دیکھو وہ توحید کا حلقہ ٹوٹ گیا۔ ابراہیمؑ کی اولاد پیمانِ الست سے بیگانی!

وہ جو جبریل کی لائی ہوئی شراب سے مست تھا، اُس کی صحبت پراگندہ، اُس کا پیالہ ریزہ ریزہ۔

آزاد انسان مشرق و مغرب کے پھندے میں پھنس گیا۔ وطن سے جڑ گیا اور خدا سے ٹوٹ گیا!

مشرکوں کی شان و شوکت سے اُس کا خون خشک! اس لیے پیرِ حرم نے زنّار باندھ لی۔

اے پرانے خداؤ! مژدہ ہو کہ اب ہمارا دَور ہے!

دنیا میں خوشی کے دن لوٹ آئے۔ ''دین وطنیت اور قوم پرستی سے مار کھا گیا۔''
مصطفیٰ کے چراغ کا کیا ڈر کہ اُس پر تو سیکڑوں بولہب پھونک مار رہے ہیں!
اگرچہ لا الہ کی صدا آ رہی ہے، جو دل سے چلا گیا وہ ہونٹوں پہ کب ٹھہرے گا!
مغرب کے جادو نے اہرمن کو زندہ کر دیا۔ یزدان کا دن، رات کے خوف سے پیلا!
اے پرانے خداؤ! مژدہ ہو کہ اب ہمارا دَور ہے!
ہمارا بندہ تو ہر قید سے آزاد بندہ تھا۔ اُس کی گردن سے دین کا جوا اُتار دینا چاہیے۔
چونکہ نماز اس پر شاق گزرتی ہے، ہم بس ایک رکعت کا تقاضا کرتے ہیں اور وہ بھی سجدوں کے بغیر۔
جذبات نغمے سے اُٹھان پکڑتے ہیں، پس گانے بجانے سے خالی نماز میں کیا مزا!
اُس خدا سے جسے غیب سزاوار ہے، وہ شیطان بہتر ہے جو دکھائی دیتا ہے۔
اے پرانے خداؤ! مژدہ ہو کہ اب ہمارا دَور ہے!

نغمۂ بعل

آدم ایں نیلی تتق را دربرید　　　آنسوے گردوں خداے را ندید
در دلِ آدم بجز افکار چیست　　　ہمچو موج ایں سرکشید و آں رمید!
جانش از محسوس می گیرد قرار　　　بو کہ عہدِ رفتہ باز آید پدید
زندہ باد افرنگیِ مشرق شناس　　　آنکہ ما را از لحد بیروں کشید!
اے خدایانِ کہن وقت است وقت!
در نگر آں حلقۂ وحدت شکست　　　آلِ ابراہیم بے ذوقِ الست!
صحبتش پاشیدہ، جامش ریز ریز　　　آنکہ بود از بادۂ جبریل مست!
مردِ حُر افتاد در بندِ جہات　　　باوطن پیوست و از یزداں گسست!

خونِ او سرد از شکوہِ دیریاں لاجرم پیرِ حرم زنّار بست!

اے خدایانِ کہن وقت است وقت!

در جہاں باز آمد ایّامِ طرب 'دیں ہزیمت خوردہ از ملک و نسب'!

از چراغِ مصطفیؐ اندیشہ چیست؟ زانکہ اُو را پف زند صد بولہب!

گرچہ می آید صدائے لا الٰہ آنچہ از دل رفت کے ماند بہ لب!

اہرمن را زندہ کرد افسونِ غرب روزِ یزداں زردرُو از بیمِ شب!

اے خدایانِ کہن وقت است وقت!

بندِ دیں از گردنش باید کشود بندۂ ما بندۂ آزاد بُود

تا صلوات او را گراں آید ہمے رکعتے خواہیم و آں ہم بے سجود

جذبہ ہا از نغمہ می گردد بلند پس چہ لذّت در نمازِ بے سرود!

از خداوندے کہ غیب اُو را سزد خوشتر آں دیوے کہ آید در شہود!

اے خدایانِ کہن وقت است وقت!

زندہ رود اور مولانا روم ایک پہاڑ کی چوٹی سے یہ منظر دیکھ رہے تھے۔ مولانا روم نے ایک غزل سنائی۔ باطل دیو تا سجدے میں گر پڑے، جیسے ابراہیم نے دوبارہ ضرب لگائی ہو۔

اِس غرض سے ایک خاص غزل بیاض میں لکھی گئی کہ اے میری فکر و اِدراک، ذرا خلوت خانے میں آجاؤ، "در غیب پر ایں سُو مپر اے طائرِ چالاکِ من"۔ چھ اشعار ہوئے۔ پھر کبھی اسے کاٹ دیا۔ اس کے بجائے دکھایا کہ مولانا روم زبورِ عجم کی ایک غزل گا رہے ہیں، "ماضی و مستقبل پر پھر سے نظر ڈالنی چاہیے۔ ہاں، اٹھو کہ ہمیں نئے سرے سے غور و فکر کرنا چاہیے!"

باز بر رفتہ و آیندہ نظر باید کرد ہلّہ برخیز کہ اندیشہ دگر باید کرد[1]

---

[1] بیاض جاوید نامہ میں صرف پہلی غزل درج ہے۔ مسودے میں اس کی بجائے "باز بر رفتہ" والی ہے۔

یہ بات معنی خیز تھی کہ مولانا روم دورِ حاضر میں واپس آ کر زبورِ عجم کی غزل سنائیں۔ اس کی تاثیر سے وہ دیوتا منہ کے بل گر پڑیں جنہیں نئے زمانے میں دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

3

۷/مئی کو جمعیت العلمائے نے فتویٰ دیا کہ مسلمان کانگریس کا ساتھ دیں۔ اس لیے کہ اب کانگریس کامل آزادی کا نصب العین اپنا چکی ہے۔ شاردا ایکٹ شریعت کے منافی ہے۔ حکومت نے اسے مسلمانوں پر بھی نافذ کر دیا ہے۔ ملک کی آزادی اور اسلامی شخصی قوانین کے تحفظ کے لیے مسلمان آزادی کی غیر متشدد تحریک میں حصہ لیں۔ مولانا کفایت اللہ، مولانا عطا اللہ شاہ بخاری اور مولانا محمد نعیم پر مشتمل کمیٹی لائحہ عمل تشکیل دے گی۔[1]

جمعیت نے مسلم کانفرنس کی قراردادِ دہلی پر دستخط کیے تھے۔ یہ انحراف تھا۔

4

جرمن سیاح ہرمن کالب لاہور میں تھے۔ اسلامیہ کالج کی ایجوکیشنل یونین نے ۱۴/مئی کی شام پونے آٹھ بجے کالج کے حبیبیہ ہال میں ان کے لینٹرن لیکچر کا اہتمام کیا۔ موضوع تھا، 'اسلامی ممالک میں سیاحت'۔ علامہ نے جلسے کی صدارت قبول کی۔[2]

۱۵/مئی کے انقلاب میں ری کنسٹرکشن پر مضمون شائع ہوا۔ بنیادی نکات یوں تھے:

۱ "دنیا کی تمام قدیم و جدید اور مستقبل کی سائنس" کی بنیاد رکھنے والی شخصیت محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی کہ آپؐ نے "بنی نوعِ انسان کے دل و دماغ کو توہمات اور مظاہرِ قدرت کے رعب و اثر سے نجات دلا کر اُسے تحقیق و تسخیرِ عالم کے قابل بنایا۔" اِس لحاظ سے "اسلام ہنوز ایک ایسی تحریک ہے جو اپنی تکمیل کو نہیں پہنچی۔"

۲ یہ کتاب اسلامی مذہبی فکر کو از سرِ نو اُن بنیادوں پر اُستوار کرنے کی غرض سے لکھی گئی ہے

---

[1] Mitra, *Register Jan-Jun 1930,* p.43

[2] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸)، ص۲۷۸ بحوالہ انقلاب ۱۵/مئی ۱۹۳۰ء۔ جلسے کی روداد موجود نہیں ہے۔

جن پر اِس عمارت کی بنیاد آغازِ اسلام میں رکھی گئی تھی... علامہ اقبال حکمائے اسلام میں پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے عقائدِ اسلام کے صحیح عقلی دلائل دنیا کے سامنے پیش کیے ہیں۔" امام غزالی نے بھی احیأ العلوم کے ذریعے یونانی فلسفے کے مقابل اسلامی عقائد کی بالادستی قائم کی۔ لیکن انہوں نے معرفت کو بنیاد بنایا، "عقلی دلائل سے بڑی حد تک گریز کیا۔" امام غزالی فلسفے کو مکمل طور پر رد کرتے تھے۔ وہ یونانی فلسفہ تھا۔ علامہ بھی غزالی کی طرح صحیح علم کا منبع معرفت ہی کو قرار دیا ہے لیکن وہ "علمِ وحی (معرفت) اور علمِ حواسِ ظاہری (یعنی سائینس) کو اپنی اصل و انتہا میں ایک ہی سمجھتے [ہیں]۔"

۳ اقبال نے اسرار و رموز میں کہا تھا کہ انحطاط کے دور میں اجتہاد سے تقلید بہتر ہے۔ لیکن یہ "منعِ اجتہاد" کا زمانہ اُتنا طویل بھی نہیں ہونا چاہئیے جتنا کہ ہو گیا ہے۔ انحطاط سے مخلصی پانے کا طریقہ بھی اجتہاد و تحقیق ہی ہے۔ آج اُن غیر ضروری عقائد کی الجھنوں سے نکلنے کی ضرورت ہے جو غیر اسلامی فلسفے کی بدولت رائج ہوئے۔

۴ یہ کتاب "صرف اسلامی عقائد کے احیأ و تجدید کا باعث نہ ہو گی بلکہ خود نفسِ مذہب کو مادیت کے... بے باکانہ حملوں سے بچائے گی۔" یہ رائے مدراس کے نقادوں اور ماہرینِ فلسفہ نے اُسی وقت پیش کر دی تھی جب وہاں جنوری ۱۹۲۹ء میں صرف پہلے تین لیکچر پیش کیے گئے۔

۵ اقبال "وہ دن دیکھنے کے متمنی ہیں جب وحی اور سائنس کا واحد منبع سے پیدا ہونا خود سائنس ہی کے ذریعے سے ثابت ہو جائے گا اور یہی وہ وقت ہو گا جب اسلام کا وقار عقائد اور علوم و فنون کے اعتبار سے تمام دنیا پر کامل طور پر قائم ہو جائے گا اور سیاسی اور تمدنی لحاظ سے بھی اسلام دنیا پر فوقیت حاصل کر چکے گا۔"

دینِ فطرت اپنے حقیقی جلوہ میں—علامہ اقبال مجدّدِ دین کی حیثیت میں—امام غزالی کے عہد کی یاد تازہ ہو گئی

ایک مبصر کے قلم سے

[اقتباس]

کتاب کے پہلے دو بابوں میں نہایت شرح وبسط کے ساتھ موجودہ فلسفہ اور فزکس (طبعیات) کی تحقیقات کی روشنی میں اس حقیقت کو پایۂ ثبوت تک پہنچانے کی کوشش کی گئی ہے کہ وہ علم جو خاص خاص انسان بذریعہ وحی و الہام حاصل کرتے ہیں، وہ بھی ویسا ہی قابلِ یقین اور حقیقت پر مبنی ہے جیسا کہ وہ علم جو انسان کو تجربہ اور مشاہدہ سے حاصل ہوتا ہے یا جس کی بنا محض عقلیات پر ہوتی ہے اور اُس کے حصول کے موجب حواسِ ظاہری ہوتے ہیں۔ مغرب کے بہترین محققین کی آرا پر نکتہ چینی کر کے اور ذرائعِ حصولِ علم کی آخری سائنٹیفک تحقیقات پر صحیح تنقید کر کے علامہ ممدوح نے وحی والہام کے صحیح منبع علوم ہونے کی حیثیت کو عقلی اعتبار سے درست ثابت کر دیا ہے اور آپ کے نزدیک وہ زمانہ اب دُور نہیں جب علومِ وحی اور علومِ سائنس اپنے آپ کو ایک دوسرے سے متخالف نہ پائیں گے اور معرفت یا عرفان Intuition or Religious Experienceاور صحیح عقلی علوم اپنی انتہا میں ایک ہی منبع سے پیدا ہونے والے ثابت ہوں گے۔ کتاب کے یہ دو حصے فی الواقع دنیا میں نفسِ مذہب کے تحفظ کے ضامن ہیں اور ہم اُمید کرتے ہیں کہ جس وقت یہ کتاب مغربی فلاسفر اور حکما کے ہاتھوں تک پہنچی تو وہ یقیناً علامہ اقبال کی اس حیرت انگیز قابلیت کے معترف ہوں گے جس سے آپ نے فلسفہ اور مذہب کی شاندار خدمت انجام دی ہے۔ آپ غالباً دنیا کے پہلے ایسے فلاسفر سمجھے جائیں گے جو فلسفہ اور مذہب کے اتحاد کے علمبر دار ہو کر موجودہ مادیات کے خلاف جہاد کے لیے اُٹھے ہیں اور انسان کو صحیح عقائد، صحیح علوم اور صحیح اخلاق کی نعمتوں سے از سرِ نو بہرہ یاب کرنے کے لیے اپنی تمام کوششیں صرف کر رہے ہیں۔ یورپ کے حکما اقبال کی اس تحقیق کو یقیناً فلسفہ اور مذہب کی دنیا میں ایک نیا انقلاب تصوّر کریں گے۔

کتاب کے باقی ماندہ چار حصے اُن اہم مسائل پر مشتمل ہیں جن کا تعلق اسلام کے اصولی عقائد اور

اُس کی حقیقی اسپرٹ سے ہے۔ یہ وہ مسائل ہیں جن کی اصل کنہ سے آج مسلمان غافل ہو چکے ہیں۔ جن کے متعلق مختلف تاویلیں کر کے عام علما قوم کو فرقوں اور جماعتوں میں تقسیم کر چکے ہیں۔ یہی عقائد ہیں جو آج اپنی مسخ شدہ صورت میں ہمارے موجودہ تعلیم یافتہ لوگوں کو اسلام سے بد ظن کر رہے ہیں۔ توحید کیا ہے؟ ذاتِ باری کے متعلق صحیح عقیدہ کیا ہونا چاہئیے؟ توحید کے متعلق صحیح قرآنی دلائل کیا ہیں؟ دعا کی حقیقت کیا ہے؟ انسانی انا کیا ہے؟ اُس کے غیر فانی اور آزاد ہونے کی کیا صورت قرآن نے بتائی ہے؟ حقیقی اسلامی کلچر کس قسم کے افراد پیدا کرتی ہے؟ زمان و مکان کی کیا حقیقت ہے؟ قرآن کے نزدیک زمان و مکان کیا ہیں؟ اصولِ حرکت تقویمِ اسلام میں کہاں تک کار فرما ہے؟ اسلام افراد کو اور تمام نوعِ انسان کو حقیقی زندگی کس طریق پر بخشتا ہے؟ یہ ایسے مسائل نہیں کہ ان کے متعلق جو کچھ اقبال نے لکھا ہے، اُس پر اِس مختصر تبصرے میں کوئی تفصیلی روشنی ڈالی جا سکے اور نہ اُس وقت تک اِن مسائل پر کوئی بحث کار آمد ہو سکتی ہے جب تک تبصرہ پڑھنے والوں نے پہلے کتاب نہ پڑھی ہو۔ یہ وہ مسائل ہیں جو ہندوستان میں گزشتہ بیس تیس سال سے ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ مسلمانوں کو متزلزل کر رہے ہیں۔ کوئی وعظ اور کوئی لیکچر اُن کی تسلی نہیں کر سکتا، اس لیے کہ خوش قسمتی یا بد قسمتی سے موجودہ علوم نے اُنہیں کچھ سائنس اور عقلِ ظاہری کی باتیں سکھا دی ہیں اور علمائے اسلام ان مسائل کی حقیقت کو اُن کے پیشِ نظر رکھنے میں قاصر رہے ہیں۔ ہم دعوے سے کہتے ہیں کہ ہمارے سائنس داں نوجوان اپنی سائنس دانی اور عقل و فکر میں حیرت انگیز انقلاب دیکھیں گے اگر ایک دفعہ بھی انہیں اس کتاب کے مطالعہ کی توفیق میسر آ سکی۔ اسلام کو اُس کے اصلی لباس میں اگر علما پیش کر سکتے تو یہ دلخراش اعتراض اسلام پر اپنے اور بیگانے نہ کرتے جو آج ہر طرف سے ہو رہے ہیں... کیا یہ ممکن ہے کہ اگر اسلامی حکمت و شریعت کو اُس کے اصلی اور صحیح رنگ میں پیش کرنے والے حکما و علما پیدا ہوتے رہتے اور اجتہاد کا دروازہ بند نہ ہوتا تو آج تُرک شریعت سے بیزاری کا اظہار کرتے یا ہندوستانیوں پر "قومیت پرستی" کی آڑ میں "لامذہبیت" کے ڈورے ڈالے جاتے اور ہم تمدن و معاشرت اور اقتصادی فلاح و بہبود کے لیے راستے اختیار کرنے سے ہچکچاتے؟[1]

---

[1] حمزہ فاروقی (۱۹۸۸) حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۷۱-۸۳ بحوالہ انقلاب ۱۵/ مئی ۱۹۲۹ء

5

مولوی صالح محمد ادیب تونسوی کا تعلق تونسہ شریف سے تھا۔ اسکول میں ہیڈماسٹر تھے۔ ایک سجادہ نشین خواجہ نظام الدین سے قریبی تعلق تھا۔ ۹ر مئی کو علامہ نے صالح کو خط لکھا کہ پاک پتن شریف میں بابا فرید الدین گنج شکر کے عرس میں شریک نہ ہو سکیں گے۔ پھر فیصلہ کیا کہ جانا چاہیے۔ "اس واسطے آپ کی خدمت میں عرض ہے کہ میں حاضر ہوں گا،" اگلے روز لکھا، "میرے ایک دو دوست اور بھی ہوں گے۔"[1]

بیگم گرامی نے مرحوم شوہر کے کلام کی خود ہی اشاعت کروانے کا فیصلہ کیا۔ معلوم ہوتا ہے کہ علامہ سے کہا کہ ذمہ داری قبول کریں۔ ۱۸ر مئی کو علامہ نے لکھا، "کاغذ کا خریدنا، کسی اچھے کاتب کے زیرِ نگرانی کام کرانا پھر کتاب کا پریس میں جانا اور پروف وغیرہ دیکھنا یہ کام آسان نہیں اور مجھ کو اِس کام سے قطعاً واقفیت نہیں۔" ان کی تصانیف کے لیے یہ کام دوسرے لوگ کرتے تھے۔ سات برس سے چودھری محمد حسین کر رہے تھے۔ علامہ نے حفیظ جالندھری کا نام تجویز کیا۔ گرامی کے شاگرد بھی تھے۔ دیباچہ لکھوا کے دینے میں حفیظ کی مدد کرنے کا وعدہ کیا۔[2]

عباس علی خاں لمعہ نے کوئی کتاب بھیجی۔ پھر والد کا انتقال ہو گیا۔ اُس کی خبر دی۔ کسی امریکن دوست کا تذکرہ کیا جسے اسلام سے دلچسپی تھی۔ ۲۰ر مئی کو علامہ نے انگریزی میں تعزیت کرنے کے بعد لکھا، "... میرے لیکچر شائع ہو گئے ہیں۔ اگر آپ کا امریکن دوست زمانۂ حال کے اسلام سے دلچسپی رکھتا ہے تو اُسے اِن کا مطالعہ کرنا چاہیے۔"[3]

معلوم ہوتا ہے کہ بیگم گرامی نے پہلے یہ سمجھا تھا کہ گرامی کے کلام کی اشاعت علامہ اپنی نگرانی میں کروا دیں گے۔ شکایت آمیز خط لکھا۔ شاید یہ لکھا کہ انہیں علامہ کے جواب سے رنج ہوا ہے۔

---

[1] مکتوب بنام مولوی صالح محمد، ۱۰ر مئی ۱۹۳۰ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۱۱۹–۱۱۸

[2] مکتوب بنام بیگم گرامی ۱۸ر مئی ۱۹۳۰ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۱۱۷–۱۱۵

[3] مکتوب بنام عباس علی خاں لمعہ ۲۰ر مئی ۱۹۳۰ء محولہ بالا

بنام بیگم گرامی

جناب بیگم گرامی صاحبہ

آپ کا خط ابھی ملا ہے جسے پڑھ کر مجھے کوئی رنج نہیں ہوا۔ عورتوں کو کسی معاملے کے متعلق مشورہ دینا آسان کام نہیں کیونکہ ان کو معاملات کی سمجھ نہیں۔ اس کے علاوہ وہ فطرتاً بد ظن ہوتی ہیں اور خواہ کتنی ہی سچی بات کیوں نہ کہی جائے ان کو اس پر اعتبار کرنے میں تامل ہوتا ہے۔ آپ کے عزیز سے میں نے کبھی وعدہ نہیں کیا کہ کتاب کی کتابت طباعت کا کام میں اپنے ذمہ لوں گا۔ میں اس کام کی قطعاً واقفیت نہیں رکھتا اور جو صاحب ازراہِ عنایت میرے لیے یہ کام کر دیا کرتے تھے وہ اس زحمت کو گوارا کرنے سے قاصر ہیں۔ ہاں انہوں نے دیباچہ میری زیرِ نگرانی لکھ دینے کا وعدہ کیا ہے سو یہ کام ہو جائے گا۔ اب اس خط میں پھر مفصل لکھتا ہوں کہ بات آپ کی سمجھ میں آ جائے۔

۱۔ دیباچہ میں اپنے زیرِ نگرانی لکھوا دوں گا جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں۔

۲۔ رباعیات وغیرہ اگر میرے مشورے کے مطابق منتخب شائع ہوتیں تو میں انتخاب بھی کر دیتا۔ مگر چونکہ آپ سارا کلام چھپوانا چاہتی ہیں اس واسطے اس کام کی اب ضرورت نہیں۔ اسی بات کا آپ کے عزیز سے وعدہ کیا تھا جس سے آپ کو غلط فہمی ہوئی۔

۳۔ کاغذ خریدنا اور اس کے متعلق آپ سے روپیہ منگوانا اور آپ کو حساب دینا یہ کام مجھ سے نہ ہو گا۔ میں نے حفیظ صاحب کا نام لکھا تھا۔ مگر معلوم ہوتا ہے آپ کو اُن پر اعتماد نہیں۔ اگر وہ آپ کو پسند نہیں تو کسی اور صاحب مثلاً سالک صاحب مدیر انقلاب کو اس کام کے لیے مقرر کیا جائے۔ مگر اس کام کے لیے ابھی جلدی نہیں۔ پہلے کتاب کی کتابت ہونی چاہیے اور اس میں تین چار ماہ بلکہ زیادہ مدت لگ جائے گی۔

۴۔ کاتب اور پریس کا انتخاب، جہاں سے میں چھپواتا ہوں میرے خیال میں وہ پریس اچھا ہے۔ عبدالمجید کاتب بھی میرے نزدیک لاہور میں سب سے بہتر ہے۔ انہی سے آپ کام لے سکتی ہیں۔ مگر کاتب اور پریس سے اُجرت کا طے کرنا اور اس کی ادائیگی کی ذمہ داری لینا یہ

کام اُس آدمی کے سپرد ہو جس کا ذکر میں نے نمبر ۳ میں کیا ہے۔

۵۔ پروف دیکھنا اور اس سے پہلے کاتب سے لے کر کاپی دیکھنا اس کے متعلق آپ خود ہی لکھتی ہیں کہ تم کو زحمت نہ دی جائے گی جس کے لیے میں آپ کا شکر گزار ہوں یہ کام مجھے آتا بھی نہیں۔ میں اپنی کتابوں کے پروف خود نہیں دیکھتا۔ جو صاحب دیکھتے ہیں ان سے کہا تھا کہ مدد کریں۔ مگر ان کے حالات اس قسم کے ہیں کہ وہ مشکل سے میرے زیر نگرانی دیباچہ لکھنے پر راضی ہوئے۔

مختصر یہ کہ پروف و کاپی دیکھنے کے علاوہ ان سارے معاملات کا جو پہلو روپیہ کی ادائیگی اور خرید و فروخت وغیرہ سے تعلق رکھتا ہے اس کی ذمہ داری قبول کرنے سے قاصر ہوں اور یہ بات بھی زیادہ تر آپ کی ہی ہمدردی کی وجہ سے کہتا ہوں۔ کیونکہ روپیہ پیسہ کے معاملے میں بالکل نابلد ہوں۔ اور جس طرح آپ کو اِس معاملے میں اعتماد کرنے میں تامل ہوتا ہے اسی طرح مجھ کو بھی ہے۔ چونکہ سالک اور حفیظ دونوں لاہور میں ہیں اور یہیں رہتے ہیں اس واسطے ان میں سے کسی ایک کا انتخاب مذکورہ بالا معاملات کے لیے موزوں ہوگا۔ یہ کام کسی لاہور سے باہر رہنے والے آدمی سے نہ ہو سکے گا۔ آپ اس کام کو شاید معمولی تصور کرتی ہیں یہ بڑی سر دردی کا کام ہے۔ میں اس سے آج تک عہدہ برآ نہیں ہو سکا اور اگر چودھری محمد حسین مدد و معاون نہ ہوتے تو میری ایک کتاب بھی شائع نہ ہو سکتی۔ اب تو مدت سے میں نے ان کو بھی تکلیف نہیں دی۔ کیونکہ کسی نئی کتاب کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ ایک دفعہ کتاب چھپ کر نکل جائے تو پھر آسانی ہو جاتی ہے۔ یہی صاحب میری زیر نگرانی دیباچہ لکھیں گے۔ چونکہ وہ صبح سے شام تک دفتر میں رہتے ہیں۔ اس واسطے پروف دیکھنے کی زحمت ان کو دینا مناسب بھی نہیں اور وہ اس کا وعدہ بھی نہیں کرتے۔ مختصر یہ کہ آپ کسی آدمی کو مسودہ دے کر لاہور بھیج دیجیے جو کاتب کے ساتھ معاملہ اُجرت وغیرہ طے کر کے اسے مسودہ دے جائے اور اگر کاتب اپنی اُجرت کا کچھ حصہ پیشگی مانگے تو پیشگی دی جائے۔ اس کے علاوہ لاہور میں ایک آدمی مقرر کر جائے جو کاتب سے کام جلد کرائے اور کاپی ساتھ ساتھ دیکھتا جائے تاکہ بعد میں اُسے پروف دیکھنے میں آسانی ہو اور غلطیاں کم ہوں۔ جب یہ کام ختم ہو جائے تو کاپیاں پریس میں دے کر کاغذ خریدے اور پریس سے جلد کتاب

چھپوائے اور جب کتاب کی طباعت قریب الاختتام ہو تو مجھے اطلاع دے تا کہ میں دیباچہ لکھواؤں۔
والسلام
محمدؐ اقبال[1]

6
بیگم گرامی نے لکھا کہ محرم کے بعد کسی کے ہاتھ مسودہ بھجوا دیں گی۔

علامہ سمیت پنجاب کونسل کے ستائیس مسلمان ممبروں کا مشترکہ بیان شائع ہوا۔ کانگریس کا نام لیے بغیر اُن لوگوں کی مذمت کی "جنھوں نے قانون کی ارادتاً خلاف ورزی کرنا اپنے سیاسی پروگرام کا جزو بنالیا ہے" جبکہ "ہر شہری کا یہ اولین فرض ہے کہ وہ حکام اور قانون کی عزت برقرار رکھنے میں امداد دے۔" اِس بات پر زور دیا کہ "صوبوں اور دوسرے علاقوں کو اپنے اندرونی معاملات کے آخری فیصلہ کرنے کے متعلق پورا حق دیا جائے"۔ اُس کے بعد ہی "پورے طور پر خود مختار صوبوں کو ایک دوسرے سے ملحق کر کے ایک فیڈرل نظامِ حکومت قائم کیا جائے۔" آیندہ دستور میں "مسلمان رعایا کے سیاسی، دینی اور مذہبی حقوق... مسلمانوں کے منشا کے مطابق" محفوظ کیے جائیں۔ شمال مغربی صوبے کے تازہ حادثات کے متاثرین سے ہمدردی کا اظہار کیا۔ حکومت سے "فوری اور غیر جانبدار تحقیقات" کا مطالبہ کیا۔ "ہمیں یقین ہے کہ شمال مغربی سرحدی صوبہ کی تازہ بدامنی کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ کچھ عرصہ سے اس صوبہ کے لوگوں کو سخت مایوسی ہو گئی تھی کہ گزشتہ بیس سال کے عرصے میں حکومت نے اُن کی جائز سیاسی خواہشات کو متواتر نظرانداز کیے رکھا ہے۔" آیندہ دستور میں اُس صوبے کو "دوسرے صوبوں کے ساتھ مساویانہ اور مناسب جگہ" دی جائے۔[2]

۳۰ مئی کو پنجاب کونسل کی تعلیم کی اسٹیڈنگ کمیٹی کے ناموں کا اعلان ہوا۔ وزیر تعلیم منوہر لال، نامزد رُکن آر سانڈرسن آئی ای ایس کے علاوہ پچھلی کمیٹی کے منتخب ارکان میں سے علامہ اقبال،

---

[1] برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۱۵۶–۱۵۰

[2] انقلاب ۲۸ مئی ۱۹۳۰ء؛ محمد حنیف شاہد، اقبال اور پنجاب کونسل، ص ۱۵۰–۱۴۹

پنڈت مہر چند اور پنڈت نانک چند شامل تھے۔ نئے ارکان سردار بشن سنگھ، شیخ عبدالغنی، لابھ سنگھ، چودھری دُلی چند اور سردار ہری سنگھ تھے۔ علامہ کونسل میں منتخب ہونے کے بعد ہر سال کمیٹی میں شامل ہوئے تھے۔ اس دفعہ مالی سال ۱۹۳۰-۱۹۳۱ء کے لیے بنی تھی۔ نومبر میں نئے انتخابات ہونے والے تھے۔ کونسل کی رُکنیت ختم ہونے پر کمیٹی کی رکنیت بھی ختم ہونے والی تھی۔

صالح ادیب تونسوی نے پیامِ مشرق کی رباعیات کی شرح لکھی۔ مسودہ علامہ کو بھیجا تھا۔ علامہ نے حاشیے میں نوٹ لکھے۔ صالح کا ایک اور خط ملا۔ علامہ کو بہت متاثر کیا۔ ۳۰ مئی کو مسودہ واپس بھیجتے ہوئے علامہ نے لکھا:

> مجھ کو یہ خیال ہمیشہ تکلیفِ روحانی دیتا ہے کہ آنے والی مسلمان نسل کے قلوب ان واردات سے یکسر خالی ہیں جن پر میرے افکار کی اساس ہے۔ لیکن آپ کے خط سے مجھے ایک گونہ مسرت ہوئی۔ ان اشعار کی دِقّت زبان کی وجہ سے نہیں۔ مَیں تو اتنی فارسی ہی نہیں جانتا کہ مشکل زبان لکھ سکوں۔ دِقّت جو کچھ بھی ہے، واردات و کیفیات کے فقدان کی وجہ سے ہے۔ اگر کیفیات کا احساس ہو تو مشکل زبان بھی سہل ہو جاتی ہے۔ بہر حال آپ کی کوشش ایک مبارک فال ہے لیکن یہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جذباتِ انسانی کی تخلیق یا بیداری کے کئی ذرائع ہیں، جن میں سے ایک شعر بھی ہے۔ اور شعر کا تخلیقی یا ایقاظی [جگانے والا] اثر محض اس کے مطالب و معانی کی وجہ سے نہیں بلکہ اس میں شعر کی زبان اور زبان کے الفاظ کی صورت اور طرزِ ادا کو بھی بہت بڑا دخل ہے۔ اس واسطے ترجمے یا تشریح سے وہ مقصد حاصل نہیں ہوتا جو مترجم کے زیرِ نظر ہوتا ہے۔ بہر حال اس تشریح میں آپ کو ان لوگوں کی کیفیات و خیالات کا بغور مطالعہ کرنا چاہیے جن کے قلوب میں آپ 'پیام' [پیامِ مشرق] کے جذبات پیدا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بات 'پیام' کے مطالعہ سے بھی زیادہ ضروری ہے۔
>
> اس کے علاوہ یہ بھی گُر کی بات ہے کہ مجھ سے مشورہ نہ کیجیے۔ جس شعر کا جو اثر آپ کے دل پر ہوتا ہے، اُسی کو صاف و واضح طور پر بیان کرنے کی کوشش کرنا چاہیے۔

مصنّف کا مفہوم معلوم کرنا بالکل غیر ضروری بلکہ مضر ہے۔ ہاں، ایک ضروری شرط ہے اور وہ یہ ہے کہ جو تشریح آپ کریں، اس کی تائید شعر کی زبان سے ہونی چاہیے۔ ایک ہی شعر کا اثر مختلف قلوب پر مختلف ہوتا ہے بلکہ مختلف اوقات میں بھی مختلف ہوتا ہے۔ اس اختلاف کی وجہ قلوبِ انسانی کی اصلی فطرت اور انسانی تعلیم و تربیت اور تجربہ کا اختلاف ہے۔ اگر کسی شعر سے مختلف اثرات مختلف قلوب پر پیدا ہوں تو یہ بات اس شعر کی قوت اور زندگی کی دلیل ہے۔ زندگی کی اصل حقیقت تنوع اور گوناگونی ہے۔[1]

7

تعطیلات کے باوجود سید نذیر نیازی کو دہلی میں ٹھہرنا پڑ گیا تھا۔ خط لکھ کر علامہ کو اطلاع دی۔ یکم جون کو جواب دیتے ہوئے علامہ نے لکھا، "ترجمہ کا خیال بدستور ہے بلکہ بعض اصحاب کی طرف سے تقاضا ہے کہ جلد کیا جائے۔ گو مجھے اس پر شبہ ہے کہ عام لوگ اِس سے مستفیض ہو سکیں گے۔ ہاں علمأ جنہوں نے فلسفہ کا خاص طور پر مطالعہ کیا ہے وہ میرا مقصد سمجھ سکیں گے۔"[2]

عبداللہ چغتائی نے لین (Lane) کی ڈکشنری سے کوئی اقتباس بھیجنے کا وعدہ کیا۔ ۵/جون کو علامہ نے یاددہانی کا رُقعہ بھیجا۔[3]

8

الٰہ آباد کا قدیم نام پراگ تھا۔ گنگا اور جمنا کے سنگم کے قریب واقع تھا۔ ہندو عقیدے کے مطابق تیسرا گمشدہ دریا سرسوتی بھی یہیں سے گزرتا تھا۔ دیومالائی راجہ ہریش چندر کی بہن یہاں دیوتاؤں کو نذر پیش کرنے آیا کرتی تھی۔ ہندوؤں کے نزدیک یہ شہر مقدس تھا۔[4]

پنڈت موتی لال نہرو کا گھر یہاں تھا۔ پہلے آنند بھون نام تھا۔ جب گاندھی سابرمتی سے ڈانڈی

---

[1] برنی (۱۹۹۳) کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، سوم، صص ۱۱۹–۱۱۸

[2] مکتوب بنام سید نذیر نیازی یکم جون ۱۹۲۹ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۱۲۱

[3] مکتوب بنام عبداللہ چغتائی، ۵/جون ۱۹۳۰ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیاتِ مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۱۲۱

[4] Nadeem Shafiq Malik (2013), pp.35-38

روانہ ہوئے تو موتی لال نے اِسے قوم کی نذر کر دیا۔ سوراج بھون نام دیا گیا۔ کانگریس کمیٹی کا صدر دفتر بن گیا۔ ۴، ۶ر اور ۷ر جون کو کمیٹی کا اجلاس ہوا۔ جواہر لال نہرو جیل میں تھے۔ والد موتی لال نے صدارت کی۔ دس قراردادیں منظور ہوئیں۔ ایک میں جمعیت العلمأ کے ۷ر مئی والے فتوے کا خیر مقدم ہوا۔ ایک اور قرارداد میں کہا گیا کہ مسلمان تحریک میں حصہ لے رہے ہیں۔ صرف سرکار اور رجعت پسند (reactionary) اُنہیں روکنے کی کوشش کر رہے ہیں:

> This committee repels the charge of apathy to the national movement levelled by Government officials and interested persons against the Mussalmans of India and notes with satisfaction the patriotic part taken by them in the movement throughout the country, notwithstanding the strenuous efforts of officials and reactionaries to keep them out of it.[1]

نواب سلطان جہاں بیگم، جنہیں عباسی عہد کی ملکہ زبیدہ سے تشبیہ دی جاتی تھی، ۱۱ر مئی کو فوت ہوئی تھیں۔ ۹ر جون ۱۹۲۶ء کو بھوپال کی حکومت سے اپنے بیٹے نواب حمید اللہ خاں کے حق میں دستبردار ہو چکی تھیں۔ بغداد کا ایک نوجوان علامہ کے ملاقاتیوں میں سے تھا۔ اُس کی تلاوت کے بارے علامہ کا کہنا تھا، ''مجھے اُن خاموش اور بے راستہ ریگستانوں کی یاد آ جاتی ہے جن کی بے پناہ خاموشی میں خدا نے خود کو انسانوں کے سامنے سب سے پہلے آشکار کیا تھا۔''[2] نوجوان نے عربوں کی روایت کے مطابق بیگم صاحبہ کا مرثیہ لکھا۔ کئی بار علامہ سے خواہش ظاہر کی کہ نواب حمید اللہ کے حضور پڑھ کر سنانا چاہتا ہے۔ ۱۱ر جون کو علامہ نے محمد شعیب قریشی کے نام تعارفی خط لکھ دیا۔ حال ہی میں شعیب قریشی کی شادی ہوئی تھی۔ اس کی مبارکباد بھی دی۔[3]

بیگم گرامی کا خط آیا۔ شکایت تھی کہ علامہ نے پچھلے خط کا جواب نہ دیا۔ علامہ نے ۱۱ر جون کو لکھا کہ کوئی ایسی بات نہ تھی جس کا جواب لکھا جاتا۔ محرم کے بعد جب مسودے کے ساتھ کسی کو

---

[1] Mitra, *Register July-December 1930,* pp. 439-442

[2] مکتوب بنام محمد شعیب قریشی ۱۱ر جون ۱۹۳۰ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۱۲۵-۱۲۳

[3] ایضاً

بھیجیں گی تو اُسے کاتب سے ملوادیں گے۔[1]

۱۳ر سے ۲۴ر جون تک سائمن کمیشن کی رپورٹ قسطوں میں شائع ہوئی۔ ان دنوں علامہ ایک نایاب کتاب کی تلاش میں تھے۔ جاویدنامہ کے لیے ضرورت تھی۔ صالح تونسوی اور خواجہ صاحب تلاش کر رہے تھے۔ صالح کا خط ملا۔ کتاب نہ ملی تھی۔ ایک اور تصنیف سرّ السمأ کا ذکر کیا۔ اُن کے والد کی نظر سے گزری تھی۔ ۱۹ر جون کو علامہ نے لکھا کہ شاید بہاولپور سے مل جائے۔[2]

علامہ اقبال، گوکل چند نارنگ، برکت علی اور نانک وائسرائے کے یکم مئی والے آرڈیننس کے بارے میں، جس کے تحت لاہور سازش کیس کی سماعت ہو رہی تھی، اس نتیجے پر پہنچے کہ آرڈیننس مروجہ دستور کی دفعہ ۷۲ کے تحت نافذ کیا گیا۔ اُس دفعہ کے مطابق یہ ضروری ہے کہ (الف) کوئی ایمرجنسی موجود ہو؛ اور (ب) آرڈیننس، امن اور اچھی حکومت (peace and good Government of India or any part of it) کے مفاد میں ہو۔ ویبسٹر ڈکشنری (Webster Dictionary) کے مطابق ایمرجنسی ایسی چیز کے رونما ہونے کو کہتے ہیں جس کا پہلے سے اندازہ نہ رہا ہو، اور اُس کی وجہ سے پیدا ہونے والے حالات فوری عمل کا تقاضا کرتے ہوں ("an unforeseen occurrence creating a combination of circumstances which call for an immediate action")۔ ایسی کوئی صورت حال موجود نہ تھی۔ حکومت نے صرف بعض مشکلات کی نشاندہی کی ہے، ایمرجنسی کی نہیں۔ آرڈیننس، امن و حکومت کے مفاد میں بھی نہیں ہے بلکہ اُسے نقصان پہنچاتا ہے۔ ہائی کورٹ سے اپیل کی سماعت کا اختیار لے کر قانون کی توہین کی گئی۔ عوام کے دلوں یہ احساس پیدا ہوا کہ انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہو رہے۔ حکومت کی مقبولیت میں کمی ہوئی۔ آرڈیننس بالکل غیر آئینی اور غیر مناسب ہے:

> The undersigned, having carefully gone into the matter, are unanimously of the opinion that the said Ordinance is ultra vires of the Governor-General and, therefore, invalid; that, in any case,

---

[1] مکتوب بنام بیگم گرامی ۱۱ر جون ۱۹۳۰ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۱۲۳

[2] ؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۱۲۶-۱۲۵

> its promulgation was inexpedient and inadvisable; and that there was no justification whatsoever for depriving the High Court of its power of hearing the appeal from the final order of the Special Tribunal constituted under the Ordinance … [This Ordinance] has brought not only the administration of law and justice into contempt but has also gone a great way in making the Government unpopular … [and] has further considerably shaken the confidence of the people in the unpartiality [sic. impartiality] of the present trial … In our opinion the Ordinance is not only invalid in view of Section 72 of the Government of India Act but is a most ill-advised measure…

۱۹/ جون کو علامہ اقبال، گوکل چند نارنگ، برکت علی اور نانک چند کے ساتھ لاہور ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کی سب کمیٹی کی رپورٹ پر دستخط کیے۔ کمیٹی کے باقی دونوں ارکان، سر موتی ساگر اور جگن ناتھ نے کاروائی میں حصہ نہ لیا تھا۔[1]

جسٹس سید آغا حیدر ٹریبونل میں شامل تھے۔ استغاثہ کے گواہوں سے چبھتے ہوئے سوال پوچھتے تھے۔ ۲۱/ جون کو ٹریبونل سے ہٹا دیئے گئے۔ سر شیخ عبدالقادر لائے گئے۔ اسی برس ہوئی کورٹ کے جج بنے تھے۔[2]

مسلم آؤٹ لک کے ۲۱/ جون کے شمارے میں ری کنسٹرکشن کو انسانی تاریخ کی عظیم ترین کتابوں میں شمار کیا گیا۔[3]

عبدالرشید طارق کا بیان ہے کہ ۲۳/ جون کو شام سات بجے کے قریب اپنے بھائی مجید کے ساتھ علامہ سے ملنے گئے۔ دادا حاجی احمد بخش نے حجاز سے علامہ کے لیے ایک مخملی جائے نماز، سفید سیپ کی تسبیح اور مدینہ کی بغیر گٹھلی والی کھجوریں بھجوائی تھیں۔ وہ پیش کیں۔ قریباً دس بجے تک بیٹھے رہے۔[4]

---

[1] Noorani (2001) *The Trial of Bhagat Singh,* pp.298-301

[2] *Ibid,* pp.157-158

[3] Anonymous (1930) *Lectures on the Reconstruction of Religious Thought in Islam – Some Opinions,* p.4

[4] عبدالرشید طارق، 'مے شبانہ'، ص۲۵۵-۲۵۱

Report of the Indian Statutory Commission
[Excerpts]

Apart altogether from any question of an ultimate federal union between the Indian States and British India, there are, we think, very strong reasons for the reconstruction of the Indian constitution on a federal basis. We recognise that a change from a unitary to a federal system is unusual. Federation has often been an intermediate process whereby independent States have agreed to relinquish part of their sovereignty before they were ready to merge their separate identities in a unitary State. The general tendency in federation once formed has been towards increasing centralisation. It may well be asked why the reverse process is recommended to-day. The answer is to be found in the peculiar features of the Indian problem. India is gragually moving from autocracy to democracy. As soon as an instalment of self-government was introduced, it was found necessary to accompany it with a measure of devolution, because the practical difficulties of applying the principles of western democracy so large a unit as British India were insuperable. There is a very definite correspondence between dimenions of area and population and the kind of constitution that can be operated successfully. There have been autocratically governed States comparable in size and population to India, but a democracy of nearly 250 million people is unprecedented. The largest and most populous State democratically governed, the United States of America, has less than half that population, and despite its high level of education, its possession of a common language and culture and the long political experience of its people, it consists of 48 States united in a federation. To imagine that a constitutional structure suitable for 45 millions of British people, mainly urban, will serve equally well for 250 millions of Indians spread over a sub-continent and living in half a million villages is unreasonable. If self-government is to be a reality, it must be applied to political units of a suitable size, after taking into account all relevant considerations. Representative democracy as it is understood in Britain depends for its success on the possibility of a close contact between elector and elected person. Unless this is secured, it is not real representation at all.[1]

علامہ سائمن کمیشن رپورٹ کے بغور مطالعے کی ضرورت محسوس کر رہے تھے۔ ۲۴ رجون کو نمایاں خصوصیات پر نواب سر ذوالفقار علی خاں کے ساتھ مشترکہ رائے جاری کی۔ مختصر تجزیے کے بعد کہا:

Indian Statutory Commission (1930), *Report,* Vol.2, pp.14-15[1]

> رپورٹ کی سفارشات کی تہہ میں جو پالیسی کار فرما ہے، اس کا مطلب ہمارے نزدیک اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مسلمانوں کے اہم مطالبات کو ٹھکرا کر انتہا پسند ہندوؤں کو خوش کرنا مقصود ہے۔ اس وقت جو فوری مسئلہ مسلمانوں کے پیش نظر ہے وہ یہ ہے کہ آیا ان حالات میں وہ اقلیت کی حیثیت سے گول میز کانفرنس میں شرکت کریں یا نہ کریں۔ ہماری رائے صاف طور پر یہ ہے کہ جب تک حالات ایسی صورت اختیار نہ کرلیں جو مسلمانوں کے مطالبات کے لیے مفید ہو، کانفرنس میں ہماری شرکت سے قوم کو بجائے فائدے کے نقصان ہو گا۔
>
> ہم مسلمانانِ ہندوستان سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ فی الفور ایک جداگانہ طریق عمل پر گامزن ہونے کے لیے اپنی طاقتوں کو مرتکز کریں۔[1]

ایک مثبت خصوصیت یہ تھی کہ وفاقی (federal) طرزِ حکومت تجویز کیا گیا تھا۔ تجویز پیش کی گئی کہ مرکزی مجلسِ قانون ساز کے بجائے فیڈرل اسمبلی قائم ہو۔ اُس کے دو ایوان ہوں۔ دونوں کے اراکین صوبائی کونسلوں کے ذریعے متناسب نمایندگی کی بنیاد پر منتخب کیے جائیں۔ اسمبلی کی ترتیب، ''جہاں اقلیتوں کے تحفظ کا سامان نہایت خوبی کے ساتھ کیا گیا ہے، جس کی انہیں کسی اور طرح سے امید نہ ہو سکتی تھی''، علامہ کی نظر میں ایک جدت تھی۔

اس قسم کے وفاق کے لیے ضروری تھا کہ صوبوں کی نئی سرحدیں متعین کی جائیں۔ نہرو رپورٹ میں بھی مطالبہ ہو چکا تھا۔ وہاں صرف لسانی اصول پیشِ نظر تھا۔ سائمن رپورٹ میں بھی صوبائی سرحدوں میں تبدیلی کی تجویز کی گئی۔ بعض اہم پہلو نظر انداز کر دیئے گئے:

۱ معلوم ہوتا تھا کہ برطانیہ کی دلچسپی صرف اس بات میں تھی کہ مرکزی حکومت ہندوستانیوں کے حوالے کرنے سے پہلے اُس کے اختیارات محدود کر دیئے جائیں۔ اس لیے مابقی اختیارات (residuary powers) صوبوں کو تفویض کر دیئے گئے۔ یہ اچھی

---

[1] ۲۶/جون ۱۹۳۰ء؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۱۰۹-۱۰۶

بات تھی لیکن صوبوں کی خود اختیاری واضح اور نمایاں نہ کی گئی۔ یہ وفاق کے بنیادی اصول کی نفی کرنے کے مترادف تھا۔

۲ موجودہ ترتیب کے مطابق ہندوستان میں آٹھ صوبے تھے۔ ان میں سے چھ میں ہندوؤں کی اکثریت تھی۔ وہاں وہ اپنی حکومت قائم کر سکتے تھے۔ مسلمان صرف پنجاب اور بنگال میں اکثریت رکھتے تھے۔ رپورٹ کی تجاویز میں انہیں دونوں صوبوں میں اکثریت سے محروم کر دیا گیا۔ پنجاب میں مساویانہ درجہ ملا۔ بنگال میں اقلیت میں تبدیل کر دیئے گئے۔ یہ عذر پیش کیا گیا تھا کہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کو اکثریت دینے سے دونوں صوبوں میں فرقہ وار حکومت قائم ہو جائے گی۔ علامہ کو تعجب تھا کہ "کمیشن نے نہایت آسانی سے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا ہے کہ اسی قسم کی فرقہ وار حکومت باقی چھ ہندو صوبوں میں بھی تو قائم ہو جائے گی۔"

۳ سندھ کی علیحدگی کے مسئلے سے عملی طور پر بے پروائی کا اظہار کیا گیا۔ علامہ سمجھتے تھے، "یہ متنازعہ فیہ مسئلہ ہندوستانی مسلمانوں کو اس وقت تک چین سے بیٹھنے نہ دے گا، جب تک نئے دستور کے نفاذ سے قبل اس کا کوئی اطمینان بخش تصفیہ نہیں ہو جاتا۔"

۴ شمال مغربی سرحدی صوبے اور بلوچستان کے بارے میں بھی تجاویز پیش کی گئی تھیں۔ وہ ان دونوں صوبوں کو دوسرے صوبوں کے برابر جمہوریت عطا نہیں کرتی تھیں۔ صوبۂ سرحد کو مکمل جمہوریت نہ دینے کے حق میں کمیشن نے یہ دلیل پیش کی تھی کہ فوجی اعتبار سے صوبہ ایک خطرناک مقام پر واقع ہے۔ کوئی شخص بارود خانے میں کھڑا ہو تو اُسے سگریٹ سلگانے کی بنیادی آزادی سے محروم رہنا ہی پڑتا ہے۔ علامہ متفق نہ ہو سکے۔ اُن کے نزدیک سیاسی ترقی آگ نہیں بلکہ روشنی تھی۔

علامہ رپورٹ کا بغور مطالعہ کرنا چاہتے تھے۔ اس کے بعد کچھ اور پہلو بھی ان کے لیے اہمیت اختیار کر گئے۔ رپورٹ نے وفاقی اسمبلی میں دیسی ریاستوں کے نمایندوں کو بھی جگہ دی تھی۔ اس طرح اصل اقتدار بدستور برطانیہ کے ہاتھ میں رہتا۔ ہندو رہنما اس بات سے خوب واقف تھے مگر دیسی ریاستوں

میں مسلمان حکمرانوں کی تعداد بہت کم تھی۔ غالب اکثریت ہندوؤں پر مبنی تھی۔ مرکزی مقننہ میں ہندوؤں کی تعداد میں اچانک ایک اچھا خاصا اضافہ ہو سکتا تھا۔ علامہ کے نزدیک یہ برطانوی سامراج کی طرف سے ہندو قیادت کے لیے ایک اشارہ تھا۔ وہ ہندوستان میں برطانوی مفادات کی حفاظت کریں۔ برطانیہ ہندوستان میں حقیقی جمہوریت کے بجائے ہندوؤں کی حکومتِ معدودی (oligarchy) قائم کر دے گا۔ علامہ کے نزدیک اس کا ایک ہی حل تھا۔ مرکزی مقننہ میں ۳۳فیصد نمایندگی مسلمانوں کا پرانا مطالبہ تھا۔ اب اس کا مطلب اسمبلی کی کُل تعداد کا ۳۳فیصد ہونا چاہیئے۔ پانچ ممکنہ صوبوں میں جہاں ان کی اکثریت ہو سکتی تھی، انہیں واضح اکثریت اور تمام مابقی اختیارات بھی ملنے چاہئیں۔

کمیشن کی رپورٹ یہ تقاضے پورے نہ کرتی تھی۔ مسلمانوں کے لیے صرف دو متبادل تجویز کیے تھے۔ اگر پنجاب اور بنگال میں آبادی کے تناسب سے نشستیں چاہئیں تو بقیہ صوبوں میں انہیں ایک اقلیت کے طور پر جو اضافی نشستیں ملی ہوئی ہیں، اُن سے دستبردار ہو جائیں۔ ورنہ پنجاب اور بنگال میں ہندوؤں کی بات مان لیں اور بقیہ صوبوں میں اپنی مراعات برقرار رکھیں۔ علامہ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کے لیے ان دونوں میں سے کوئی بھی متبادل قابلِ قبول نہ ہو گا۔

علامہ سمجھتے تھے کہ ایک کامیاب وفاق کے لیے ضروری ہے کہ اُس کی اپنی فوج ہو۔ اس وقت کوئی ہندوستانی کپتان کے عہدے سے اوپر نہ تھا۔ ان افسروں میں سے بھی کم ہی تھے جنہوں نے برطانیہ کے سینڈہرسٹ کالج میں تربیت حاصل کی ہو جو مزید ترقی کے لیے ضروری تھی۔ زیادہ تر گزشتہ جنگِ عظیم میں خدمات کی وجہ سے افسر بنائے گئے تھے۔ فوج میں ہندوستانی افسروں کی تعداد بڑھانے کے لیے کئی برسوں سے حکومت مختلف تجاویز مرتب کرتی رہی تھی۔ نہرو رپورٹ میں بھی مطالبہ کیا گیا تھا۔ علامہ سمجھتے تھے کہ فوجی تربیت اور ترقی کے لیے وقت درکار ہوتا ہے۔ فوج کو ہندوستانی بنانے کا عمل خاصا طویل ہو سکتا تھا مگر سائمن کمیشن کی تجاویز میں یہ عمل طویل ہی نہیں کبھی مکمل نہ ہونے والا دکھائی دے رہا تھا۔ نہرو رپورٹ کی یہ تجویز بھی مسترد کر دی گئی تھی کہ دوسرے جمہوری ممالک کی طرح فوج کا بجٹ اور بندوبست منتخب اداروں کے ماتحت لایا جائے۔

علامہ کی تجویز تھی کہ وفاق میں شامل صوبوں کی اپنی اپنی افواج کے علاوہ ایک ہندوستانی

سرحدی فوج (Indian Frontier Army) تشکیل دی جاسکتی تھی۔ یونٹ ہر صوبے سے بھرتی کیے جائیں۔ افسران میں ہر مذہب کے افراد شامل ہوں۔ یہ فوج شمال مغربی سرحد پر تعینات کی جائے۔ بحری دفاع پر بھی خاص توجہ دی جائے۔ اسے سائمن کمیشن نے نظر انداز کر دیا تھا۔ علامہ سمجھتے تھے کہ اگر وفاقی حکومت قائم ہوئی تو وفاق میں شامل مسلم یُونٹ بخوشی اس کی بری اور بحری افواج کی تشکیل میں حصہ لیں گے۔ مغل عہدِ حکومت میں بھی ہندوستان کی حفاظت ایک ایسی ہی فوج کرتی تھی جس میں ہر مذہب کے افراد شامل ہوتے تھے۔ اکبر کے زمانے میں تو سرحد پر تعینات افواج پوری طرح ہندو افسران ہی کے تابع تھیں۔

رپورٹ میں اعتراف کیا گیا کہ ہندوستانی کسان اپنی آمدنی کا خاصا بڑا حصہ ریاست کی نذر کرتا ہے۔ علامہ سمجھتے تھے کہ اس کے بدلے میں اُسے صرف امن اور تحفظ، تجارت کے ذرائع اور ذرائع ابلاغ و آمدورفت ملتے ہیں۔ ان کا حاصل صرف یہ تھا کہ لگان زیادہ موثر طریقے سے لگائے جائیں۔ مشینوں سے تیار کی ہوئی اشیأ کے ذریعے دیہی معیشت تباہ ہو۔ فصلیں اس طرح تجارتی مفادات کے غلبے میں آئیں کہ کسان ہمیشہ سود خوار مہاجن اور تجارتی گماشتوں کا غلام بنا رہے! پنجاب میں مسئلہ زیادہ سنگین تھا۔ ہندوستان میں اسلام کے روشن مستقبل کے لیے ضروری تھا کہ پنجاب کے کسان کو سچی آزادی نصیب ہو۔[1]

9

سردار محمد رب نواز خاں ضلع ڈیرہ غازی خاں میں وہوا میں درانی پٹھانوں کے کھتران قبیلے کے تمندار تھے۔ آنریری مجسٹریٹ درجہ اول، وائسرے کے درباری اور بلوچی جرگہ کے رکن بھی تھے۔ اڑتیس برس کے تھے۔ عربی فارسی سے اچھی خاصی اور انگریزی سے معمولی واقفیت تھی۔ سردیوں میں گھر پر الاؤ کے گرد بیٹھے سب گھر والوں کو علامہ کا کلام سناتے تھے۔ زبانی یاد تھا۔ کلامِ اقبال کی قرآن شریف

---

[1] اِس بحث کے ماخذ ہیں: علامہ کا بیان ۲۴/ جون مطبوعہ انقلاب ۲۶/ جون ۱۹۳۰ء، افضل (۱۹۸۶) ص ۱۰۹-۱۰۶؛ خطبۂ الٰہ آباد (دیکھیے ۲۹/ دسمبر ۱۹۳۰ء کے واقعات؛ خطبۂ لاہور، (1977) Sherwani

اور احادیث کے ساتھ تطبیق کرتے تھے۔ علامہ سے مراسم تھے۔ لاہور آتے تو ملاقات کرتے۔

روایت ہے کہ اس برس حکومت نے ڈیرہ غازی خاں کے تمنداروں کو پندرہ پندرہ مربعہ اراضی "لینڈڈ جنٹری گرانٹ" (Landed Gentry Grant) کے ضمن میں دی۔ سردار محمد رب نواز کو محروم رکھا کہ بلوچ نہیں بلکہ پٹھان تھے۔ انہوں نے علامہ سے درخواست کی کہ میاں سر فضل حسین سے سفارش کر دیں۔ علامہ نے خود سر فضل سے ملنے کا مشورہ دیا۔ ملاقات کامیاب رہی۔ سردار رب نواز نے اطلاع دی۔ علامہ نے ۲۶ جون کو مبارکباد کا خط لکھا۔[1]

10

بیگم گرامی کی طرف سے کوئی شخص مسودہ لے کر پہنچا۔ ساتھ ہی اشتہار تھا۔ علامہ کے حوالے سے بھی عبارت شامل تھی۔ علامہ نے اسے کاٹ کر یوں کر دیا، "دیوان کی طباعت و کتابت وغیرہ کے متعلق ڈاکٹر اقبال صاحب سے مشورہ کیا گیا ہے۔" یکم جولائی کو بیگم گرامی کے نام خط میں اس کی اطلاع دی۔ مشورہ بھی دیا، "یہ اشتہار طباعت ختم ہونے سے ایک دو ماہ پہلے اخبارات میں دینا چاہیے۔"[2]

11

آل انڈیا مسلم لیگ کے اراکین میں سے پچھتر کو بھی کسی جگہ اکٹھا کرنا مشکل ہوتا تھا۔ روپیہ نہ تھا۔ سیکڑوں کا قرض تھا۔ بار بار چندے کی درخواست پر بمشکل ستاسی (۸۷) روپے جمع ہوئے۔ محمد علی جناح کی فراخدلی اور جوائنٹ سیکرٹری ایس ایم عبداللہ کے قرضِ حسنہ پر گزارا تھا۔ آفس سیکرٹری سید شمس الحسن کسی نہ کسی طرح جماعت کو زندہ رکھے ہوئے تھے۔

گزشتہ برس لیگ سالانہ جلسہ منعقد نہ کر سکی۔ اعزازی سیکرٹری ڈاکٹر سیف الدین کچلو کے عہدے کی معیاد ۳۱ دسمبر کو ختم ہوئی۔ ہفتوں کسی کا تقرر نہ ہو سکا۔ آخر جناح کی درخواست پر مولوی

---

[1] ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی (۱۹۷۶)، خطوط اقبال، ص۱۹۶-۱۹۴؛ ڈاکٹر ہاشمی نے خط کی تاریخ ۲۶ جولائی درج کی ہے۔ برنی (۱۹۹۳)، ص۱۲۷-۱۲۶ کے مطابق عکس میں ۲۶ جون پڑھا جاتا ہے۔

[2] مکتوب بنام بیگم گرامی یکم جولائی ۱۹۳۰ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص۱۲۸

یعقوب نے عہدہ قبول کیا۔ اب وہ اور شمس الحسن کوشش کر رہے تھے کہ سالانہ جلسہ ہو جائے۔ پُونا کے مسلمانوں نے پیشکش کی۔ لیگ کی میٹنگ میں قبول نہ ہوئی۔ جولائی میں شملہ میں قانون ساز اسمبلی کا اجلاس ہو رہا تھا۔ تجویز ہوئی کہ اسی موقع پر وہاں لیگ کا جلسہ کر لیا جائے۔ اگست میں مشکل ہو گا کیونکہ ستمبر میں انتخابات ہیں۔ اکتوبر میں سیاسی رہنما گول میز کانفرنس کے لیے لندن جا رہے ہیں۔

۴/ سے ۶/ جولائی تک شملہ میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے ایگزیکٹو بورڈ کا اجلاس ہوا۔ مولانا شوکت علی نے صدارت کی۔ انہوں نے کہا کہ ہندوستان کے آٹھ کروڑ مسلمان کمزور ہیں۔ بکھرے ہوئے ہیں۔ سائنسی علم میں بہت پیچھے ہیں۔ لیکن ایک ہنر ہر مسلمان کے پاس ہے۔ وہ حکومت کرنے کا ہنر ہے۔ یہ ایسی چیز ہے جو مسلمانوں کی تیرہ سو سالہ زندگی میں ہمیشہ اُن کے پاس رہی ہے۔ ہندوستان میں بھی اُن کی حکومت کا زمانہ برا نہیں تھا۔ اب دفعہ ۱۴۴/ اور تعزیراتِ ہند کے بکھیڑے میں اُلجھ کر اپنی تاریخی حس سے محروم ہو رہے ہیں۔ اِسی تاریخی حس کا مظاہرہ بچۂ سقا نے کیا جب صرف ستائیس گھڑ سواروں کے ساتھ کابل فتح کیا۔ یا جب نادر خاں اور اُن کے بھائیوں نے بچۂ سقا کو شکست دی اگرچہ کچھ بھی پاس نہ تھا۔ اجلاس میں طے پایا کہ دوسری آل انڈیا مسلم کانفرنس جولائی کے وسط میں لکھنؤ میں منعقد ہو۔ مولانا محمد علی [جوہر] صدارت کریں۔ بیمار تھے۔ اُس وقت تک صحت یاب نہ ہو سکیں تو مولانا شوکت علی صدر ہوں۔

جناح چاہتے تھے کہ علامہ اقبال لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کریں۔ گول میز کانفرنس سے پہلے مسلمانوں کا متفقہ مطالبہ سامنے آ جائے۔[1] ۱۳/ جولائی کو شملہ میں لیگ کی کونسل میں طے پایا کہ اکیسواں سالانہ اجلاس لکھنؤ میں ۱۶/ اور ۱۷/ اگست کو ہو۔ علامہ سے صدارت کی درخواست کی جائے۔ قبول نہ کریں تو بالترتیب ہز ہائی نس سر سلطان محمد شاہ آغا خاں، مولوی فضل الحق اور صاحبزادہ عبدالقیوم سے کہا جائے۔ اُسی روز جناح نے ٹیلی گرام کے ذریعے علامہ سے درخواست کر دی۔[2]

---

[1] Hasan (1976) *Plain Mr Jinnah,* p.50-51

[2] Nadeem Shafiq Malik (2013), pp.5-9

سید نذیر نیازی لکھتے ہیں کہ علامہ کے اُستاد سر ٹامس واکر آرنلڈ کے انتقال کی خبر ۱۵/ جولائی کو ہندوستان پہنچی۔ اُسی روز نذیر بھی دہلی سے لاہور پہنچے۔ علامہ کے پاس گئے۔ آرنلڈ ۹/ جون کو لندن میں فوت ہوئے تھے۔ سوئے ہضم کی بیماری میں حرکتِ قلب بند ہوئی تھی۔ نذیر سے روایت ہے کہ علامہ نے کہا، "افسوس اقبال اپنے استاد اور دوست سے محروم ہو گیا۔" نذیر نے عالمِ اسلام کے ساتھ سر ٹامس کی ہمدردی کا ذکر کیا۔ تعجب کیا کہ مسلمان کیوں نہ ہو گئے۔ علامہ ہنس پڑے۔ وسیع المشربی کے معانی سمجھائے۔ انسان اپنے عقیدے پر قائم رہتے ہوئے بھی دوسرے مذاہب کی صداقت سے انکار نہیں کرتا۔ اس طرح بعض انسان ایک دوسرے سے قریب آ سکتے ہیں۔ اجتماعی اعتبار سے اتحادِ انسانی کا کوئی پہلو نہیں نکلتا۔ یہ قوموں کے درمیان تصادم کا علاج نہیں۔ ایک عالمگیر معاشرے کی تعمیر کا ذریعہ نہیں۔ آرنلڈ وسیع المشرب تھے۔ لیکن ایک انگریز عیسائی تھے۔ وفاداری صرف انگلستان کے ساتھ تھی۔ چاہتے تھے کہ انگلستان اور مسلم ممالک کے درمیان دوستانہ روابط قائم ہوں۔[1] آرنلڈ کے پسماندگان میں بیوہ اور ایک بیٹی نینسی تھیں۔ علامہ نے ۱۶/ جولائی کو لیڈی آرنلڈ کے نام خط لکھا کہ خدا آرنلڈ کی روح کو دائمی سکون عطا فرمائے:

> It is impossible for me to tell you and Nancy of the terrible shock which came to us all when the news of the untimely death of Sir Thomas Arnold arrived in India. As you know he was loved by pupils and all those who came into contact with him other-wise. I know words expressive of grief can bring but little consolation to you; but I assure you that your grief is shared by people in England, India and all those countries where his work as a great Orientalist was known. Indeed his death is a great loss to British scholarship as well as to the world of Islam whose thought and literature he served with unabated zeal till the last moment of his earthly life. To me his loss is personal, for it was his con-tact that formed my soul and put it on the road to knowledge.
>
> No doubt from our point of view that luminous flame of life is now extinguished, but it is my firm conviction that to those

---

[1] نذیر نیازی، دانائے راز، ص۹۶-۹۷۔ لکھا ہے کہ آرنلڈ کی وفات کی خبر ۱۵/ جولائی کو ہندوستان پہنچی اور وہ بھی اُسی روز دہلی سے لاہور پہنچے۔ دوسری جگہ لکھا کہ جون کے اوائل میں پہنچے۔

who, like him, devote their life to love and service, death means only 'more light'.

I earnestly pray that God may grant eternal peace to his loving soul and may give you and Nancy fortitude enough to bear with patience the loss caused by his untimely death.

کسی خاتون کی طرف سے معاشرتی اصلاح سے متعلق ایک اسکیم موصول ہوئی۔ علامہ نے ۱۸ر جولائی کو "محترمہ جناب بیگم صاحبہ" کہہ کر جواب دیا۔ اس کے علاوہ کوئی تفصیل معلوم نہیں ہے:

آپ کی سکیم عمدہ ہے مگر اس کا زیادہ تر تعلق معاشرتی اصلاح سے ہے... میرے خیال میں اس کو بروئے کار لانا جمیعت العلما کا کام ہے۔ ایک آدمی بہت سے کام نہیں کر سکتا اور نہ ایک جماعت ہی ہر کام کے اہل ہو سکتی ہے۔ پنجاب میں اس وقت زیادہ توجہ کے مستحق پولیٹیکل امور ہیں اور ایک مدت تک غالباً یہی امور جاذب توجہ رہیں گے۔ سوشل اصلاح صوبہ وار ہو تو بہتر ہے کیونکہ صوبوں کے حالات ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اگر ملک کے ایک حصے میں اسلامی اسٹیٹ قائم ہو جائے تو معاشرتی زندگی جلد سنور سکتی ہے۔[1]

نذیر نے خطبات کے ترجمے کا کام علامہ کی نگرانی میں شروع کر دیا۔ علامہ نے اُردو میں عنوان تجویز کیا: تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ۔ ایڈورڈ کارپنٹر کی کتاب تہذیب: اسباب اور علاج *(Civilisation: Its Cause and Cure)* پڑھنے کا مشورہ دیا۔ مولوی محمد شفیع کے نام تعارفی خط دیا کہ دہلی واپسی کے بعد یونیورسٹی لائبریری میں ریڈرز ٹکٹ بنوا سکیں۔ زبان اور اصطلاحات کے بارے میں علماً سے مشورے کی تاکید کی کیونکہ ترجمے کی اصل افادیت ان لوگوں کے لیے ہے جنہیں انگریزی نہیں آتی۔ تیسرے خطبے کے سلسلے میں خودی کی بحث کے حوالے سے حلاج کی کتاب الطواسین کپڑھنے کا مشورہ دیا۔ اپنی کتابیں عام طور پر کسی کو نہیں دیتے تھے۔ یہ کتاب یونیورسٹی کی لائبریری میں نہ تھی۔

---

[1] برنی کلیاتِ مکاتیبِ اقبال سوم، ص ۱۳۳-۱۳۱؛ ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی (۱۹۷۶)، خطوط اقبال، ص ۱۹۳ پر ہے، "خط کی عکسی نقل انجام کراچی میں شائع ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ 'علامہ کا ایک غیر مطبوعہ خط' کے سوا کوئی تفصیل نہیں دی گئی۔ اس لیے اس خط کی مکتوب الیہ کا نام اور خط کا پس منظر وغیرہ کچھ بھی معلوم نہیں ہو سکا۔"

ذاتی نسخہ نذیر کو پڑھنے کے لیے دیا۔[1]

ایک دفعہ ذکر چھڑا کہ ڈاکٹر عابد حسین نے فاؤسٹ کے صرف پہلے حصے کا ترجمہ کیا ہے۔ ''حضرت علامہ کا خیال تھا دوسرے حصے کا ترجمہ بھی ہونا چاہیے،'' نذیر کا بیان ہے، ''بلکہ ایک دفعہ مجھ سے فرمایا دوسرا حصہ بہت کم لوگوں کی سمجھ میں آتا ہے۔ اس میں متعدد اصطلاحات کیمیا گری کی ہیں۔ بعض اسمأ اور مصطلحات بھی اس طرح کے ہیں جن کو اہلِ مشرق تو خوب سمجھتے ہیں لیکن اہلِ مغرب بہت کم... عابد صاحب چاہیں تو دوسرے حصے کے ترجمے میں میں اُن کا ہاتھ بٹا سکتا ہوں۔'' یہ بھی چاہتے تھے کہ ترجمے کے ساتھ ایک مفصل مقدمہ شامل کیا جائے۔[2]

12

لیگ کو علامہ کی طرف سے جناح کے ٹیلی گرام کا جواب موصول نہ ہوا تھا۔ ایک رکن اعجاز علی نے ٹیلیفون پر فیروز خاں نون سے دریافت کیا۔ انہیں بھی علامہ کے فیصلے کا علم نہ تھا۔ ۲۰ر جولائی کو شمس الحسن نے سر محمد یعقوب کو لکھا کہ جلسے کی تاریخ قریب آ رہی ہے۔ دعوتی رقعہ کی قریباً تین ہزار کاپیاں بھیجی جانی ہیں۔ برما اور مدراس جیسے دور دراز علاقوں کے لوگ شکایت کریں گے کہ سفر کی تیاری کے لیے کافی وقت نہیں ملا۔ رقعہ ٹائپ کیا جا چکا تھا۔ صدر کے نام کی جگہ خالی چھوڑی گئی تھی۔ بعد میں علم سے پُر کی جا سکتی تھی۔[3]

اُس روز لکھنؤ کے گنگا پرشاد ہال میں نیشنلسٹ مسلمانوں کی کانفرنس ہوئی۔ ڈاکٹر انصاری نے صدارت کی۔ چودھری خلیق الزماں نے سول نافرمانی کی حمایت میں قرارداد پیش کی۔ مسلم قومیت پر اصرار کرنے والوں کی مذمت کی۔ کانفرنس کے شرکائیں سید حسن امام، مہاراجہ محمود آباد، مفتی کفایت

---

[1] سید نذیر نیازی، مکتوباتِ اقبال، ص ۲۷-۲۶

[2] نیازی (۱۹۵۷)۔ ان کا بیان ہے کہ ڈاکٹر عابد حسین سے ذکر کیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور چاہا کہ علامہ سے ملاقات کا موقع ملے تو دوسرے حصے کا ترجمہ بھی کر ڈالیں مگر بعض موانع کی بنا پر دوسرے حصے کے ترجمے کی نوبت نہیں آئی۔

[3] Nadeem Shafiq Malik (2013), pp.90-99

اللہ، مولانا عطااللہ شاہ بخاری، شیخ مشیر حسین قدوائی اور مولانا حسین احمد نمایاں تھے۔ [1]

۲۰ اور ۲۱ جولائی کو الٰہ آباد میں تنظیم کانفرنس ہوئی۔ مولانا شوکت علی نے صدارت کرتے ہوئے کہا کہ ہر مسلمان تنہا پوری آل انڈیا کانگریس کمیٹی سے بہتر سیاسی بصیرت اور تاریخی حس رکھتا ہے۔ دنیا کے چالیس کروڑ مسلمانوں میں ہندوستان کے مسلمان صرف آٹھ کروڑ ہیں۔ مگر یہی ہیں جنہوں نے باقی مسلمانوں کو سکھایا ہے کہ تمام مسلمان ایک ہیں۔ اس لیے باقی دنیا کے مسلمان ان کے شکر گزار ہیں۔ ساری دنیا کی نگاہیں ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف اُٹھی ہوئی ہیں۔ ہند مسلم تعلقات میں موجودہ کشیدگی کے ذمہ دار گاندھی اور موتی لال نہرو ہیں۔ [2]

ایک دفعہ پھر انتخابات کی آمد آمد تھی۔ ستمبر میں ہونے والے تھے۔ علامہ نے امیدوار نہ ہونے کا فیصلہ کیا تھا لیکن عملی سیاست سے پوری طرح وابستہ تھے۔ ۲۱ جولائی کو میر غلام بھیک نیرنگ کے حلقے کے انتخابات کے سلسلے میں سید محمد حنیف ایڈووکیٹ کو خط لکھا، "اگر میر صاحب یا آپ کی جماعت میں سے کوئی صاحب کھڑے ہوں تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو تو مہربانی کر کے اپنی جماعت کے فیصلے سے مجھے آگاہ فرمائیں کہ صورت حال کیا ہے۔" [3]

۲۳ جولائی کے انقلاب میں، جو ۲۱ کی شام کو منظرِ عام پر آیا ہو گا، خبر چھپی کہ لیگ کی طرف سے علامہ کو صدارت کی دعوت دی گئی ہے۔ علامہ نے ابھی فیصلہ نہیں کیا ہے۔ [4]

13

۲۲ جولائی کو لندن میں ایسٹ انڈیا ایسوسی ایشن کا اجلاس ہوا۔ دادابھائی ناروجی نے ۱۸۶۶ء میں قائم کی تھی۔ انڈین لبرل فیڈریشن کے رہنما شری نواس شاستری نے انگریزی میں مقالہ پڑھا، "سائمن کمیشن کی رپورٹ" ('The Report of the Simon Commission')۔ وفاقی طرزِ حکومت کو

---

[1] Mitra, *Register Jul-Dec 1930*, pp.331-332

[2] Mitra, *Register Jul-Dec 1930*, pp.328-329

[3] مکتوب بنام سید محمد حنیف ۲۱ جولائی ۱۹۳۱ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۱۳۵-۱۳۴

[4] Nadeem Shafiq Malik (2013), pp.9۔ انقلاب ۲۳ جولائی کے حوالے سے۔

ہندوستان کے لیے غیر مناسب قرار دیا۔ یہ محض بہانہ ہے تاکہ دیسی ریاستوں (princely states) کے نمایندے مرکزی اسمبلی کا حصہ بھی ہوں مگر ہندوستان کے بجائے بدستور تاجِ برطانیہ کو جواب دہ رہیں۔ مسلمان اس لیے حمایت کر رہے ہیں کہ شمال مغربی سرحد سے متصل صوبوں پر تصرف چاہتے ہیں تاکہ ہنگامی حالات میں برطانوی حکومت پر دباؤ ڈال سکیں۔ سامعین میں سے وارث امیر علی اور ابراہیم رحمت اللہ نے اعتراض کیا۔ شاستری نے کہا کہ یہ بات خود سنی ہے۔[1]

اُس روز شملہ میں اسمبلی چیمبر میں پنجاب کی مجلس وضع قوانین کا اجلاس شروع ہوا۔ موجودہ کونسل آخری دفعہ اکٹھی ہو رہی تھی۔ ۲۳/ اور ۲۴/ جولائی کو بھی اجلاس ہوئے۔[2]

دہلی میں لیگ کے دفتر میں ٹائپ شدہ رقعے پر صدر کی جگہ علامہ کا نام درج ہوا۔ مولوی یعقوب نے دستخط کیے۔ ۲۴/ جولائی کی تاریخ ڈال کر رقعہ تمام اراکین کو بھیج دیا گیا۔[3] علامہ اقبال لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرنے والے تھے۔ ۲۶/ جولائی کا انقلاب اُسی شام آیا ہو گا۔ اُس میں بھی خبر تھی کہ علامہ نے خطبۂ صدارت لکھنا شروع کر دیا ہے۔

اُس رات علامہ کے یہاں احباب کا مجمع تھا۔ علامہ کا بیان ہے، ''مسلمانانِ ہندوستان کی عام روحانیت کا ذکر تھا اور بہت سے احباب مسلمانوں کے موجودہ انحطاط سے متاثر ہو کر اُن سے مایوسی کا اظہار کر رہے تھے، اس سلسلے میں میں نے ریمارک کیا کہ جس قوم سے خواجہ سلیمان تونسوی، شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی اور خواجہ فرید چاچڑاں شریف والے اب اس زمانے میں بھی پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس کی روحانیت کا خزانہ ابھی ختم نہیں ہوا۔''[4] اگلے روز مولوی صالح محمد کا خط ملا۔ انہیں جواب لکھتے ہوئے یہ واقعہ درج کیا۔ جاویدنامہ کے حوالے سے لکھا، ''جہاں تک میرا علم ہے کسی اسلامی زبان میں اس قسم کی کتاب اس سے پہلے نہیں لکھی گئی۔ کتاب نظم میں ہے۔ زبان فارسی، مثنوی مولینا روم

---

[1] Srinivasa Sastri (1930), pp.658, 668, 671, 673۔ علامہ نے خطبۂ الٰہ آباد میں بھی ذکر کیا۔

[2] Mitra *The Indian Annual Register July-Dec. 1930,* p.259-260

[3] Nadeem Shafiq Malik (2013), pp.90-92

[4] مکتوب بنام مولوی صالح محمد، ۲۵/ جولائی ۱۹۳۰ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۱۳۶-۱۳۵

کی بحر میں ہے۔"[1]

۲۵/ اور ۲۶/ جولائی کو شملہ میں پنجاب کی صوبائی کونسل کے اجلاس ہوئے۔ آخر میں گورنر پنجاب نے کونسل کی کارکردگی کی تعریف کی۔[2] پھر کونسل ہمیشہ کے لیے برخاست کر دی گئی۔

علامہ کی طرف سے دوبارہ منتخب ہونے کی کسی خواہش کا علم نہیں ہے۔ مجلس خلافت کے کارکن حکیم عبدالمجید عتیقی لکھتے ہیں کہ علامہ "یہ کہہ کر واپس آ گئے کہ یہاں اصلاحِ احوال کے لیے کام کرنے کا کوئی موقع نہیں ہے۔"[3]

مرزا جلال الدین کہتے ہیں کہ علامہ کو کونسل میں بھیجنے کا نتیجہ "حوصلہ شکن اور مایوس کُن" تھا۔ کونسل کی کارروائیوں سے "اُسی بے رُخی سے کام لیا جو اُن کا معمول تھی۔ اِس پر اُن کے متعلق طرح طرح کی چہ میگوئیاں ہونے لگیں اور اُن پر غیر عملی اور تساہل پسند ہونے کا الزام دیا جانے لگا۔"[4] خلیفہ عبدالحکیم بھی لکھتے ہیں، "کچھ سال کے تجربے کے بعد اُن کو محسوس ہوا، 'میں عملی سیاست کا مردِ میدان نہیں بن سکتا۔'"[5]

حقائق اِس کی نفی کرتے ہیں کہ علامہ نے کونسل کی کارروائیوں سے بے رُخی برتی۔ یہ بھی درست نہیں ہے کہ کونسل کی رکنیت ختم ہونے کا مطلب میدانِ عمل سے منہ موڑنا تھا۔ عملی سیاست کے ساتھ تعلق اُستوار رہا۔ اُس وقت بھی لیگ کے سالانہ اجلاس کا خطبۂ صدارت لکھ رہے تھے۔

14

۲۷/ جولائی کو مولوی یعقوب کی طرف سے لیگ کا سرکلر اخبارات کو بھی جاری کر دیا گیا۔ متن وہی تھا

---

[1] ایضاً

[2] Mitra *The Indian Annual Register July-Dec. 1930,* p.261-263

[3] حکیم عبدالمجید صدیقی کا مضمون 'کچھ پھول کچھ کانٹے'، ہفت روزہ شہاب لاہور ۸/ مارچ ۱۹۶۴ء منقولہ شاہین (۱۹۷۶) اوراقِ گم گشتہ، ص ۲۷۳

[4] مرزا جلال الدین، 'میرا اقبال'، ص ۹۳۔ شیلا میکڈونا نے بھی یہی الزام دہرایا ہے۔

[5] خلیفہ عبدالحکیم (۱۹۴۴) 'اقبال کی زندگی'، ص ۲۸-۲۷

جو تین روز پہلے لیگ کے اراکین کو بھیجا گیا تھا۔ دوبارہ ٹائپ کیا گیا تھا۔ علامہ کا نام بھی ٹائپ ہی میں درج تھا۔ اُردو ترجمہ بھی جاری کیا گیا۔ نچلے کونے میں ''جنید پریس (دہلی)'' لکھا تھا۔

اللہ اکبر

دفتر آل انڈیا مسلم لیگ

بلی ماران

دہلی مورخہ ۲۷/جولائی ۱۹۳۰ء

جنابِ والا

دلی مسرّت کے ساتھ میں آپ کی خدمت میں یہ اطلاع بھیج رہا ہوں کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کے اجلاس منعقدہ ۱۳/جولائی میں جو شملہ میں ہوا تھا یہ فیصلہ ہوا ہے کہ لیگ کا اکیسواں سالانہ اجلاس لکھنؤ میں ۱۶- اور ۱۷- اگست ۳۰ء کو منعقد ہو۔ اس اجلاس کی صدارت کے لیے ڈاکٹر سر محمد اقبال صاحب کا انتخاب عمل میں آیا ہے۔

غالباً مجھے آپ کی خدمت میں یہ عرض کرنے کی تو ضرورت نہیں کہ ملک کے موجودہ نازک سیاسی حالات کی وجہ سے عموماً اور صوبہ سرحد کے حالات کی وجہ سے خصوصاً جو اہم تبدیلیاں حکومتِ ہند کے دستورِ اساسی میں ہونے والی ہیں، نیز اس اختلافِ رائے کی وجہ سے جو سائمن کمیشن کی رپورٹ اور مجوزہ گول میز کانفرنس کے متعلق پیدا ہو چکا ہے، لیگ کا یہ اجلاس اپنی ایک بہت ہی مخصوص اہمیت رکھتا ہے۔

جیسا کہ جناب کو بھی معلوم ہے، آل انڈیا مسلم لیگ نے گزشتہ چوبیس سال کے دوران میں ملک کے اور جماعتِ مسلمہ کے مفاد کی بہت کچھ خدمت کی۔ لیگ کی یہ حیثیت کہ صرف وہی ایک ایسی جماعت ہے جسے مسلمانانِ ہند کی سیاسی انجمن کہا جاسکے اب عام طور پر تسلیم کی جاچکی ہے۔ اس کے دروازے ہر شخص کے لیے کھلے ہوئے ہیں، وہ ایک ایسی مجلس ہے جہاں ہر قسم کی سیاسی رائیں آزادانہ ظاہر کی جاسکتی ہیں، اور اپنے قواعد وضوابط کے مطابق اسکے فیصلے کثرتِ رائے کے ذریعہ سے

ہوتے ہیں۔ اسلئے سیاسی دوراندیشیوں کا مقتضیٰ یہی ہے کہ ہر گروہ اور ہر خیال کے لوگ لکھنؤ کے اجلاس میں شریک ہوں اور ٹھنڈے دل سے حالاتِ حاضرہ پر غوروخوض کرنے کے بعد اپنے متفقہ مطالبات کا اعلان آل انڈیا مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے کریں۔

اِن حالات کو مد نظر رکھ کر جناب سے یہ دلی استدعا ہے کہ اپنی سیاسی انجمن کے اس اہم ترین اجلاس میں شرکت فرمانے اور اپنی رہنمائی سے اسے مستفید کرنے کے اس موقع کو آپ ہرگز ہاتھ سے نہ جانے دیں گے۔ ملک کے سیاسی مستقبل کے ایک طویل مدت کے لیے بننے اور بگڑنے کا بہت کچھ انحصار اس لیگ کے فیصلہ پر ہے اور میں انتہائی اصرار کے ساتھ جناب سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنی سیاسی تاریخ کے اس نازک ترین موقع پر آپ قوم کو اپنی بیش قیمت رائے سے محروم رکھ کر مسلمانانِ ہند کے مستقبل کو خطرہ میں ڈالنا ہرگز ہرگز گوارانہ فرمائیں۔ میں آپ سے یہ بھی درخواست کروں گا کہ ازراہِ کرم آپ لیگ کے دفتر کو اپنے لکھنؤ پہنچنے کی صحیح تاریخ اور وقت سے نیز دورانِ قیام کے متعلق اپنی مخصوص ضروریات سے مطلع فرما کر رہینِ منّت فرمائینگے۔ تاکہ مناسب اور بروقت انتظامات کئے جاسکیں۔

خادمِ ملّت

محمد یعقوب۔ ناظمِ اعزازی[1]

15

۳۱ر جولائی کی شام نذیر نیازی دہلی واپسی کے لیے رخصت لینے پہنچے۔ کتاب الطواسین جو علامہ نے پڑھنے کے لیے دی تھی، ساتھ نہ لائے تھے۔ علامہ نے پوچھا۔ نذیر کے دوست چوہدری محمد اسمٰعیل وارثی پڑھنے کے لیے لے گئے تھے۔ نذیر نے وعدہ کیا کہ اسمٰعیل صبح تک پہنچا دیں گے۔ ان کا بیان ہے، ”علامہ نے فرمایا بہتر۔ لیکن میں نے دیکھا کہ بہتر کہتے ہوئے ان کا چہرہ کچھ متغیر سا ہو گیا...“ لاہور میں ایک دوست سے کہا کہ اسمٰعیل سے کہیں کہ کتاب فوراً علامہ تک پہنچا دیں۔ اگلے روز دہلی

[1] Nadeem Shafiq Malik (2013), pp.95-100

پہنچ کر دوبارہ دوست کو تار دیا۔[1]

نادر خاں ہلالِ احمر فنڈ کے تحت جمع کی ہوئی رقم شملہ میں قونصل جنرل افغانستان خواجہ ہدایت اللہ خاں کی وساطت سے بھجوائی گئی۔ افغانستان کی مجلس امدادیہ ملّی کے رئیس محمد ابراہیم اور ناظم محمد اسلم بلوچ کی طرف سے علامہ کو شکریے کا خط ملا۔ لکھا تھا کہ اعلیٰ حضرت نادر شاہ غازی اور ملّتِ افغانستان برادرانِ ہند کی اس ہمدردی کی بہت قدر کرتے ہیں۔ خط میں علامہ کی اس تعلیم کو سراہا گیا کہ مسلمانوں کو وطنیت اور قومیت کے جال میں نہ پھنسنا چاہیے۔ اول و آخر مسلمان ہی رہنا چاہیے۔ "آخر میں لکھا ہے کہ افغانستان کے باشندے آپ (علامہ اقبال) کی زیارت کا بے انتہا شوق رکھتے ہیں اور اگر آپ یہاں تشریف لائیں تو حکومت و ملت دونوں کی طرف سے آپ کی نہایت عزت و پذیرائی کی جائے گی،" یکم اگست کے انقلاب میں لکھا گیا۔[2]

16

ہندو پریس نے پروپیگنڈا شروع کیا کہ نیشنلسٹ مسلم پارٹی مسلمانوں میں سب سے زیادہ مقبول ہے۔ یہ بھی سنا گیا کہ نیشنلسٹ مسلمان ہنگامہ کر کے اجلاس کو ناکام بنانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ یکم اگست کو علامہ نے سر محمد یعقوب کے نام خط میں یہ خدشات ظاہر کیے اور لکھا کہ اجلاس ستمبر تک ملتوی کیا جا سکتا ہے۔ موسم بہتر ہونے کی وجہ سے پنجاب سے زیادہ لوگ لکھنؤ جا سکیں گے۔ علامہ خطبے کی پانچ سو کاپیاں شائع کروانے کا ارادہ رکھتے تھے۔

علامہ کو معلوم نہ تھا مگر لکھنؤ میں استقبالیہ کمیٹی تشکیل دی جا چکی تھی۔ منشی ابراہیم علی خاصے سرگرم تھے۔ ۲/ اگست کو لیگ کا دفتر بھی بیس روز کے لیے لکھنؤ منتقل ہو گیا۔ ۳/ اگست کو علامہ نے نذیر کو لکھا کہ کتابُ الطواسین واپس نہیں پہنچی۔ "یہ عتاب نامہ خلافِ معمول انگریزی میں تھا جس سے میں نے اندازہ کیا کہ مسائل فلسفہ یا زیادہ گہری علمی گفتگو کی طرح حضرت علامہ خفگی کا اظہار بھی

---

[1] نیازی، مکتوباتِ اقبال، ۲۷

[2] حمزہ فاروقی، اقبال کا سیاسی سفر، ص ۱۹۲

انگریزی ہی میں کرتے ہیں،" نذیر کا کہنا ہے۔

My Dear Niazi Sahib

I am Sorry to say that you made no arrangements for the return of the book I lent to you. I think it was your duty to see that the book was returned to me before your departure to Delhi. As a rule I do not part with my books, especially those which I keep constantly with me. I made an exception only in your case. Nothing is more painful to me than to be deprived of the use of a book in this way. Such carelessness is unworthy of a man who is himself fond of reading.

yours affly

Muhammad Iqbal[1]

نذیر کے دوست اسمٰعیل لکھنؤ چلے گئے تھے۔ کتابُ الطواسین ساتھ لے گئے تھے۔ نذیر نے انہیں لکھنؤ خط بھیجا۔

خطبۂ صدارت قریباً تیار تھا۔ علامہ نہیں چاہتے تھے کہ استقبال ہو۔ لکھنؤ میں پرانے دوست بیرسٹر محمد وسیم کے گھر ٹھہرنے کا فیصلہ کیا۔ تاکید کی کہ آمد کے وقت سے کسی کو آگاہ نہ کریں۔ شمس الحسن کا تار ملا کہ خطبے کا ترجمہ اردو میں بھی شائع ہو۔ وجہ مولوی یعقوب سے یوں بیان کی، "خطبہ صدارت کی اُردو کاپیاں بنوالینا نہایت ضروری ہیں۔ لکھنؤ میں جلسہ، ایک شاعر اس کا صدر ہے۔ 'ادبِ اُردو' کے ارکان اس سے نہایت جزبز ہوں گے۔"[2] ۴؍اگست کو علامہ نے سر محمد یعقوب کو لکھا کہ خطبہ قریباً تیار ہے۔ ایک ہزار کی تعداد میں شائع ہو گا۔ لیگ اُردو ترجمہ شائع کرے تو اعتراض نہیں۔ خود ترجمہ کرنا اور شائع کرنا بس سے باہر ہے۔ انقلاب کے مدیر ترجمہ کریں گے۔ اخبار ہی میں شائع ہو گا۔ پنجاب صوبائی مسلم لیگ کے سیکرٹری خلیفہ شجاع الدین کے نام خط لکھا جائے کہ لاہور سے لوگ زیادہ تعداد میں آئیں۔[3] شمس الحسن کا خط ملا۔ تصدیق کی کہ نیشنلسٹ اراکین کی طرف سے ہنگامے کی تیاری

---

[1] نیازی، مکتوباتِ اقبال، ص ۲۸-۲۹

[2] Malik (2013), pp.124-125, 178-179

[3] Nadeem Shafiq Malik (2013), p.122

کی خبر میں کچھ سچائی ہے۔[1] علامہ نے اُسی روز یعقوب کے نام ایک اور خط لکھا۔ تجویز کیا کہ اجلاس اکتوبر تک ملتوی کر دیا جائے۔ لکھنؤ میں نہ ہو سکے تو دہلی یا لاہور میں کیا جا سکتا ہے۔ گول میز کانفرنس کے نمایندے اکتوبر کے پہلے ہفتے انگلستان کے لیے روانہ ہو رہے تھے۔ وہ بیشک اجلاس میں شریک نہ ہوں۔ اجلاس کی قراردادیں بذریعہ تار بھیجی جا سکتی ہیں۔[2]

اگست کے وسط میں کابل میں جشنِ استقلال ہو رہا تھا۔ نادر شاہ غازی علامہ کو دعوت دینے کا ارادہ رکھتے تھے۔ افغان قونصل نے علامہ سے بات کی۔ اگست کے وسط میں لیگ کا اجلاس تھا۔ ''اگر اِس موقع پر کابل نہ جا سکا تو کسی اور موقع پر انشاًاللہ ضرور جاؤں گا،'' ۴؍ اگست کو صالح ادیب کو لکھا، ''آپ ساتھ ہوں تو اور بھی اچھی بات ہو۔''[3]

۸؍ اگست کو ناگپور میں اچھوتوں کی پہلی کانفرنس (All-India Depressed Classes Conference) ہوئی۔ ہندوستان کے چار کروڑ اچھوتوں کی نمایندگی کی دعویدار تھی۔ ڈاکٹر بھیم راؤ راجمی امبید کرنے صدارت کی۔ صوبجاتِ وسطی کی دلیت برادری میں پیدا ہوئے تھے۔ کولمبیا یونیورسٹی اور لندن اسکول آف اکنامکس کے فارغ التحصیل تھے۔ مارچ میں اچھوت مظاہرین کے ساتھ ایک مندر میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ پنڈتوں نے دروازے بند کر دیئے۔ خطبۂ صدارت میں اچھوتوں کے لیے آئینی تحفظات، جداگانہ انتخابات، مخصوص نشستوں اور دوسری مراعات کا مطالبہ کیا۔ سول نافرمانی کی موجودہ تحریک کی مخالفت کی۔ اُسے اچھوتوں کے مفاد کے خلاف قرار دیا۔[4]

کتابُ الطواسین لکھنؤ سے ڈاک کے ذریعے مل چکی تھی۔ ۹؍ اگست کو نذیر نیازی کے نام خط میں ذکر کیا۔ ''عابد صاحب سے یہ بھی پوچھیے کہ فاؤسٹ میں Prologemena in Heaven کا کیا اُردو

[1] شمس الحسن کے خط کا حوالہ علامہ نے اُس روز مولوی یعقوب کے نام خط میں دیا۔ شمس الحسن کا خط دستیاب نہیں ہے۔ مولوی یعقوب کے نام ان کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ اُن کا موقف یہ تھا کہ نیشنلسٹ پارٹی ضرور کوشش کرے گی مگر کامیاب نہ ہو گی۔

[2] Nadeem Shafiq Malik (2013), p.120

[3] برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیب اقبال، سوم، ص ۱۴۷-۱۴۶

[4] Mitra, *Register Jul-Dec 1930*, pp.367-374

ترجمہ اُنہوں نے کیا ہے؟"[1] سرّ السمأ کے بارے میں معلوم ہوا کہ بہاولپور میں ہے۔ مولوی احمد سعید کے پاس بھی ہے۔ محض ایک کتاب کے لیے والیٔ ریاست نواب بہاولپور کو براہِ راست خط لکھنا مناسب نہ سمجھا۔ مولوی احمد سعید سے توقع نہ تھی کہ عاریتاً دیں گے۔ مولوی شمس الدین کو لکھا۔ وہ جواب دینے میں سست تھے۔ ۹ر اگست کو صالح تونسوی کو لکھا کہ احمد سعید سے صرف کتاب دیکھنے کی اجازت مانگی جائے۔ کوئی شخص سیاروں اور متعلقہ امور کے متعلق قلبی مکاشفات کے نوٹ لے لے۔ اگر کتاب علمِ ہیئت کے متعلق ہو تو نوٹ نہ لیے جائیں۔[2] صالح کے نام ایک بلا تاریخ خط میں بھی کتاب کی تلاش کا ذکر ہے۔[3] ایک خط ڈاکٹر ناموس شجاع منعمی کو بھی لکھا گیا۔[4] ۹ر اگست کو سر محمد یعقوب کو لکھا کہ خطبۂ صدارت آیندہ روز مکمل ہو رہا ہے۔ دو تین روز میں طبع ہو جائے گا۔[5]

۱۰ر اگست کو بیگم گرامی کے استفسار کے جواب میں لکھا، "میری رائے میں رباعیات پر عنوان دینے کی ضرورت نہیں ہے۔"[6]

شمس الحسن کا خیال تھا کہ نیشنلسٹ پارٹی "عرصہ سے کوشش کر رہی ہے کہ یہ جلسہ ملتوی کر دیا جائے۔" لیگ کی کونسل میں اُن کے ارکان بہت کم رہ گئے ہیں۔ بہت سے جیل میں ہیں۔ "ممکن ہے کہ مقابلہ سے اپنے آپ کو عاجز سمجھ کر یہ لوگ سو دو سو وزیٹر ٹکٹ خرید یہاں کے شورہ پست لوگوں کو دے دیں اور جلسہ کو درہم برہم کرنے کی کوشش کریں۔" اس خدشے سے شمس الحسن نے وزیٹر ٹکٹ کی فروخت روک دی، "ہر چند لیگ کا مالی نقصان اس میں بہت ہے۔"[7]

---

[1] برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۱۵۸-۱۵۷

[2] مکتوب بنام مولوی صالح محمد، ۹ر اگست ۱۹۳۰ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۱۵۰-۱۴۹

[3] برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۱۲۰

[4] برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۱۳۷

[5] مکتوب بنام مولوی یعقوب ۹ر اگست ۱۹۳۰ء؛ Malik (2013), pp. 198-199

[6] مکتوب بنام بیگم گرامی ۱۰ر اگست ۱۹۳۰ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیب اقبال، سوم، ص ۱۵۰

[7] مکتوب شمس الحسن بنام مولوی یعقوب، ۶ر اگست ۱۹۳۰ء؛ Malik (2013), pp. 178-179

جناح کی طرف سے شمس الحسن اور مولوی یعقوب کو تار مل چکے تھے کہ انتخابی تیاریوں کی وجہ سے آنا مشکل ہے۔ اجلاس ملتوی کرنے کے لیے کونسل سے مشورہ کیا جائے۔[1] سر فیروز خاں نون (پنجاب)، نواب محمد یوسف (الٰہ آباد)، ڈاکٹر شفاعت (الٰہ آباد)، اے ایچ غزنوی (کلکتہ) اور سید مرتضیٰ (مدراس) تجویز کر رہے تھے کہ اجلاس ملتوی کیا جائے۔[2] مولوی یعقوب نے جناح کو لکھا کہ دشواری بھی ہو تو ضرور آئیں۔ ۱۱/ اگست کو شمس الحسن نے بھی تار دیا۔[3] اُس روز علامہ نے شمس الحسن کو تار دیا کہ جلسہ ملتوی کیا جا رہا ہے تو جلد اطلاع دی جائے۔[4] ۱۲/ اگست کو یعقوب کو جناح کا جواب بذریعہ تار موصول ہوا۔ انتخابی مصروفیات کی وجہ سے شرکت مشکل ہے۔ جلسہ ملتوی کیا جائے:

> Owing elections very inconvenient attend. Kindly postpone the sessions.[5]

لیگ کے لیڈروں کو تار کے ذریعے اطلاع بھجوائی گئی۔ علامہ کو بھی ملی۔ خطبہ ٔصدارت کی طباعت کا کام پروف شیٹ تک پہنچ چکا تھا۔ رکوا دیا۔[6] اخبارات میں بھی خبر دی گئی کہ جلسہ اکتوبر میں ہو گا۔[7]

آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی طرف سے دوسری آل انڈیا مسلم کانفرنس وسط اگست میں لکھنؤ میں ہونے والی تھی۔ وہ بھی ملتوی ہوئی۔ نومبر کے وسط میں طے پائی۔[8]

بعد میں شمس الحسن نے کہا کہ جناح چاہتے تھے کہ لیگ کا اجلاس گول میز کانفرنس سے پہلے ہو، سر فضلِ حسین نہیں چاہتے تھے۔ اُن کے پنجابی آلہ کاروں میں سے سر فیروز خاں نون نے "کسی نہ کسی طرح علامہ کو بھی ساتھ دینے پر تیار کر لیا... تب معاملہ جناح کے سامنے پیش کیا گیا، جو علامہ اقبال کی درخواست کی وجہ سے مان گئے اور جلسہ ملتوی کر دیا۔"[9] حقائق اِس کے برعکس ہیں۔ جناح انتخابی

---

[1] Nadeem Shafiq Malik (2013),pp.190-193

[2] Nadeem Shafiq Malik (2013),pp.184-185, 196-197, 230-233

[3] Nadeem Shafiq Malik (2013),pp.200-201, 210-211

[4] Nadeem Shafiq Malik (2013),pp.226-227

[5] Nadeem Shafiq Malik (2013),pp.228-229

[6] مکتوب بنام سید شمس الحسن، ۲۹/ اگست ۱۹۳۰ء؛ Nadeem Shafiq Malik (2013), pp.246-247

[7] Nadeem Shafiq Malik (2013), p23

[8] Mitra, *Register Jul-Dec 1930*, pp.348-351

[9] Hasan (1976) *Plain Mr Jinnah,* p.51

مصروفیات کی وجہ سے اجلاس میں آنے میں دشواری محسوس کر رہے تھے۔ التوا کی درخواستیں صرف پنجاب سے نہیں بلکہ اور جگہوں سے بھی آئی تھیں۔ جناح نے اجلاس ملتوی کرنے کا حکم دیتے ہوئے تار میں علامہ کی درخواست کا ذکر نہیں کیا۔ اپنی انتخابی مصروفیات کا ذکر کیا۔

شمس الحسن نے نہیں بتایا ہے کہ انہیں کیسے معلوم ہوا کہ علامہ کی طرف سے التوا کی درخواست کی وجہ یہ ہے کہ نون نے "کسی نہ کسی طرح" اُنہیں راضی کر لیا ہے۔ علامہ نے تو لکھا تھا کہ نیشنلسٹ مسلمانوں کی طرف سے ہنگامہ آرائی کا خدشہ ہے۔ خدشہ جائز بھی تھا۔ پچھلے برس اس گروہ نے لیگ کے جلسے میں ایسے حالات پیدا کیے کہ جناح اپنے چودہ نکات پیش نہ کر سکے۔ مارچ ۱۹۲۳ء کا اجلاس بھی انہی لوگوں کی وجہ سے ادھورا رہا تھا۔ اس دفعہ تو لیگ خاص طور پر نمایندہ حیثیت تسلیم کروانا چاہتی تھی۔ زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت تھی جبکہ جناح کی موجودگی کا امکان بھی کم تھا۔ علامہ کی طرف سے التوأ کی درخواست سے خود بخود نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ کسی نے راضی کر لیا تھا۔ لگتا ہے جیسے شمس الحسن علامہ کو شاعر سمجھ کر سیاسی بصیرت اور دُور اندیشی کی توقع کم رکھتے تھے۔

17

دہلی سے رسالہ پیشوا نکلتا تھا۔ مدیر عزیز حسن بقائی تھے۔ اگست میں رسولؐ نمبر شائع کیا۔ علامہ کو بھیجا۔ انہوں نے رائے دی، "آپ نے اس سال پیشوا کے رسولؐ نمبر کو سیرت رسولؐ کی انسائیکلوپیڈیا بنا دیا ہے۔ اس وقت جتنے رسولؐ نمبر شائع ہو رہے ہیں، ان سب سے بلند مرتبہ پیشوا کے 'تذکرۂ جمیل' کو ملنا چاہیے۔ یہی ایک ایسا رسولؐ نمبر ہے جو تعلیم یافتہ جماعت کے سامنے پیش کیا جا سکتا ہے۔"[1]

مطبع جامعہ نے ابھی تک پیامِ مشرق کے تیسرے ایڈیشن کی طباعت کا بل نہیں بھیجا تھا۔ اس میں پچاس کتابوں کی مناسبت سے ترمیم بھی کرنی تھی۔ ۱۴ ر اگست کو علامہ نے سید نذیر نیازی کو خط لکھ کر مطلع کیا کہ کتاب الطواسین لکھنؤ سے پہنچ گئی ہے۔ مطبع کے بِل کی یاددہانی کروائی۔ "عابد صاحب سے یہ بھی پوچھیے کہ فوسٹ میں Prologue in Heaven کا کیا اردو ترجمہ انہوں نے کیا ہے؟" اس

---

[1] برنی (۱۹۹۳)، ص ۱۶۰

دفعہ خط حسبِ معمول اُردو میں تھا۔[1]

18

علامہ کے والد شیخ نور محمد، جنہیں سب میاں جی کہتے تھے، قریباً ترانوے برس کے ہو چکے تھے۔ بینائی ختم ہو چکی تھی۔ کہتے ہیں کہ سارا وقت بستر پر بیٹھے ذکرِ الٰہی میں مشغول رہتے۔ کوئی قریب سے گزرتا تو وقت پوچھتے۔ کہتے کہ انہیں وقت ٹھیک نہیں بتایا جاتا۔[2] ۱۷/ اگست کو دن کے دو بجے وفات پا گئے۔[3] تجہیز و تکفین کے لیے علامہ سیالکوٹ گئے۔[4] میاں جی کو امام صاحب کے مقبرے کے قریب مرحومہ بیوی کے پہلو میں دفن کیا گیا۔[5] علامہ نے "اثرِ رحمت و آغوشِ لحد" سے تاریخِ وفات ۱۳۴۹ھ نکالی۔ لوحِ مزار کے لیے قطعۂ تاریخ لکھا:

پدر و مُرشدِ اقبال ازیں عالم رفت　　　ماہمہ را ہرواں ، منزل ما ملکِ ابد
ہاتف از حضرتِ حق خواست دو تاریخِ رحیل　　　آمد آواز "اثر رحمت و آغوش لحد"[6]

عبدالرشید طارق کا بیان ہے کہ اپنے بھائی کے ساتھ علامہ کی کوٹھی پر فاتحہ خوانی کے لیے گئے۔[7]

شمس الحسن کا خط ملا۔ ۲۹/ اگست کو جواب دیتے ہوئے علامہ نے پوچھا کہ ملتوی اجلاس کب منعقد ہو گا۔[8]

---

[1] برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیب اقبال، سوم، ص۱۵۸-۱۵۶

[2] خالد نظیر صوفی اقبال درونِ خانہ، ص۲۰

[3] عبدالمجید سالک (۱۹۸۳) ذکرِ اقبال، ص۱۰/ پر ہے کہ ۱۹۲۹ء میں وفات پائی۔ یہ درست نہیں۔

[4] ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۴)، زندہ رود، ص۳۹۷

[5] سالک (۱۹۸۳) ذکرِ اقبال، ص۱۰

[6] ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۴)، زندہ رود، ص۳۹۷

[7] عبدالرشید طارق، 'مے شبانہ'، ص۲۶۳

[8] مکتوب بنام سید شمس الحسن، ۲۹/ اگست ۱۹۳۰ء؛ Malik (2013), pp.246-247

19

۳۱/ اگست کو سردار بیگم نے ایک لڑکی کو جنم دیا۔ جاوید کا کہنا ہے کہ سردار بیگم کو جب علم ہوا کہ لڑکی ہوئی ہے تو شدید تذبذب کے عالم میں کہا، ”ہائے اس کا کیا بنے گا کیونکہ اُنہیں [یعنی علامہ اقبال کو] تو اِس کے لیے کوئی بر پسند ہی نہیں آنے کا۔“[1] روایت ہے کہ علامہ نے پہلی بار بیٹی کو دیکھا تو سر ہلا کر کہا، ”یہ تو بالکل معلمہ نظر آتی ہے۔“ منیرہ بیگم نام رکھا۔[2]

20

یکم ستمبر کو علامہ نے انقلاب میں اشاعت کے لیے مدیر کے نام خط لکھا:

> آپ کے بیش قیمت کالموں کی وساطت سے میں ان بے شمار احباب کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے میرے والد مرحوم کی وفات پر مجھ سے اور میرے اعزہ سے اظہارِ ہمدردی فرمایا۔ خدا تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے۔ چونکہ فرداً فرداً خطوط اور برقی پیامات کا جواب لکھنے سے قاصر ہوں۔ اس واسطے آپ سے درخواست ہے کہ میرا دلی شکریہ میرے احباب تک پہنچا کر مجھے ممنون فرمائیے۔[3]

شمس الحسن کا خط ملا تھا۔ لیگ کے جلسہ کے لیے ۷/ اور ۸/ اکتوبر کی تاریخیں طے کی جا رہی تھیں۔ یکم ستمبر کو علامہ نے لکھا کہ یہ مشکل ہو گا۔ ۷/ اکتوبر سے عدالتیں کھل جائیں گی۔ ۲۸/ اور ۲۹/ ستمبر بہتر ہے۔ ۲۸/ مہینے کا آخری سنیچر ہو گا۔ ۲۹/ اتوار ہو گا۔ پنجاب کی انتخابی سرگرمیاں بھی ۲۲/ ستمبر تک ختم ہو چکی ہوں گی۔[4]

علامہ کے مرحوم دوست فقیر سید افتخار الدین کے لڑکے فقیر سید سراج الدین پنجاب سول سروس کے امتحان میں کامیاب ہوئے۔ خط لکھ کر اطلاع دی۔ علامہ نے جواب دیتے ہوئے لکھا، ”مجھے

---

[1] ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۴)، زندہ رود، ص ۳۹۸-۳۹۷

[2] خالد نظیر صوفی، اقبال درونِ خانہ، ص ۸۰۔ مصنف نے اپنی والدہ وسیمہ مبارک سے روایت کی۔

[3] برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیب اقبال، سوم، ص ۱۶۱

[4] Nadeem Shafiq (2013), p.25

یقین ہے کہ ملازمت میں تم اپنے والد محترم کے نقش قدم پر چلوگے اور اپنے فرائض محنت اور دیانت سے ادا کروگے۔ صرف محنت ور دیانت ہی ترقی کی راہیں کھولتی ہیں۔"[1]

۷ر ستمبر کو انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کا اجلاس ہوا۔ مولوی فضل الدین صدارت کر رہے تھے۔ علامہ کو پھر جنرل کونسل کا رُکن منتخب کیا گیا۔ کالج کمیٹی میں اُن کا نام پھر شامل ہوا۔[2] حضور نظام سے عطیہ لینے کے لیے ایک وفد کو حیدرآباد دکن بھیجنے کا فیصلہ ہوا۔ علامہ اقبال اس وفد کے رکن بھی نامزد کیے گئے۔ انہیں معلوم ہوا تو انجمن کو لکھا کہ سر اکبر حیدری انگلستان میں ہیں۔ ان کی واپسی سے پہلے وفد بھیجنے کا فائدہ نہیں۔[3]

۸ر ستمبر کو بمبئی سے ابراہیم رحمت اللہ کا خط ملا کہ علامہ بھی مسلم وفد کے ساتھ گول میز کانفرنس میں شریک ہوں۔ وفد ۴ر اکتوبر کو روانہ ہو رہا تھا۔ علامہ نے انکار کر دیا۔ لیگ کا سالانہ جلسہ قریب تھا۔ اُسی روز سید شمس الحسن کو خط لکھا کہ اجلاس کی تاریخ جلد مقرر ہونی چاہیے تاکہ اخباروں کو مشہوری کرنے کے لیے وقت مل جائے۔[4]

آل انڈیا مسلم کانفرنس کا دوسرا سالانہ جلسہ ۱۶ر اکتوبر کو لکھنؤ میں ہو رہا تھا۔ مولانا محمد علی [جوہرؔ] صدارت کرنے والے تھے۔ علامہ کو جناح کا خط ملا۔ لکھا تھا کہ کونسل کی میٹنگ طلب کر کے تاریخ اور جگہ کا فیصلہ کیا جائے۔ قواعد کی رُو سے جلسے کی تاریخ لیگ کونسل کے اجلاس میں مقرر کی جاتی تھی۔ علامہ کے نزدیک صرف اس مقصد کے لیے میٹنگ بلانے کی ضرورت نہ تھی۔ صدر کی حیثیت میں جناح خود تاریخ مقرر کر سکتے تھے۔ ۲۴ر ستمبر کو علامہ نے سر محمد یعقوب کو خط لکھا۔ بہتر ہو تا کہ لیگ کا اجلاس کانفرنس سے ایک روز پہلے منعقد کیا جاتا۔ بہر حال اب ۱۸ر تاریخ ہی کو لکھنؤ

---

[1] برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیب اقبال، سوم، ص ۱۶۴-۱۶۱

[2] انجمن کی قلمی روداد؛ محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶)، اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص ۱۸۰، ۶۵

[3] انجمن کی قلمی روداد؛ محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶)، اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص ۱۸۱

[4] مکتوب بنام سید شمس الحسن، ۸ ستمبر ۱۹۳۰ء؛ Malik (2013), pp.254-255

میں منعقد کر لیا جائے۔[1]

نذیر نیازی کا بیان ہے، "یہی دن تھے جب مولانا محمد علی [جوہر] لاہور تشریف لائے اور حضرت علامہ سے امورِ سیاست میں تبادلۂ خیالات کرتے رہے۔"[2]

۱۱ر ستمبر کو لندن کے اخبار ٹائمز نے لٹریری سپلیمنٹ میں ری کنسٹرکشن پر تبصرہ شائع کیا:

The present Westernization of Islam he [the author] regards as the most remarkable phenomenon of modern history. He analyses with profound scholarship and great dialectical power the scientific and metaphysical thought of Europe and explains how its conclusions may be regarded as latent in or evolved from precepts of the Koran. Specially interesting are his remarks about the Turkish *risorgimento* [revival] and the Central Asian developments. The anti-religious policy of the Bolshevists is not directed only against Christianity: they are pressing Islam hard over a large part of Asia. Sir Muhammad ends with an appeal to Europeans to open their eyes to the inner meaning and destiny of Islam. His appeal is not likely to be without effect.[3]

۲۱ر ستمبر کو مدراس کے اخبار ہندو (*The Hindu*) نے لکھا کہ ہندوستان کے سیاسی مسئلے کے حل کے لیے ضرورت ہے کہ صرف مسلمان ہی نہیں بلکہ غیر مسلم بھی اسلام کی عالمگیر قوت کو اُس طرح سمجھیں جس طرح اس کتاب میں سمجھایا گیا ہے:

The Indian problem is essentially a problem of interracial and intercommunal understanding and amity; and Sir Muhammad Iqbal has made a very valuable contribution towards Hindu-Muslim rapprochement.

In these lectures Sir Muhammad Iqbal has made a valuable contribution to a right understanding of the principles of Islamic culture not only by the followers of the religion of the Prophet but by others as well, thereby helping to a better appreciation of its spirit and value by the world at large.

He has made an earnest attempt to bring its ancient tenets and tendencies under the searchlight of modern science and

---

[1] Nadeem Shafiq Malik (2013), p.26, 266-267

[2] سید نذیر نیازی (۱۹۵۷)

[3] Anonymous (1930) *Lectures…,* p.4

philosophy; and the reader, especially the Hindu reader, will find ample food for thought. There is always something admirable in the simplicity and austerity of Quranic teachings: and the Theistic India can have no fault to find with, but has readily accepted, their concepts of God and prayer. In spite of centuries of a close living in India, Islam as has been intolerance of religious symbolism in general and Hindu symbolism in particular. This amounts almost to bigotry in the minds of its common followers. Sir Mahomed's attempt is to be welcomed, among other reasons, so far as it is likely to clear any misunderstanding in the minds of the learned as to the true aims and ideals of Islam as a world force.[1]

سراج الدین آزر گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج پسرور میں پڑھاتے تھے۔ اُن کے نام علامہ کا خط ۲۵ستمبر کا لکھا ہوا موجود ہے۔ کسی انتخاب کے سلسلے میں آزر نے اپنا ووٹ ڈاک سے علامہ کو بھجوایا تھا۔ موصول نہ ہوا تھا۔[2]

۲۹ستمبر کو علامہ نے شمس الحسن کو خط لکھا۔ لیگ کے جلسے کے بارے میں پوچھا اور تاکید کی کہ اب وقت کم رہ گیا ہے۔

یوسف سلیم چشتی لکھتے ہیں کہ ۳۰ستمبر کو علامہ کی کوٹھی پر گئے۔ بقائے روح اور شوپنہار پر گفتگو ہوئی۔ علامہ نے کہا، ''خواہشات کو فنا مت کرو بلکہ اُن کو احکامِ شریعت کے تابع کر دو۔''[3]

21

نذیر نیازی کی طرف سے خاموشی تھی۔ یکم اکتوبر کو علامہ نے خط لکھ کر پوچھا کہ خطبات (ری کنسٹرکشن) کے ترجمے میں پیش رفت ہوئی یا نہیں۔ مطبع جامعہ کے بِل کے لیے یاددہانی کروائی۔[4]

یوسف سلیم چشتی کہتے ہیں کہ اُس روز علامہ کی کوٹھی پر گئے۔ علامہ نے کہا، ''شیخ اکبر ابن عربی حلول کے قائل نہیں تھے کیونکہ یہ نظریہ اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔'' الہام کے بارے میں کہا کہ

---

[1] Anonymous (1930) *Lectures…,* p.4

[2] برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۱۶۶،۷۲۸

[3] ہاشمی و دیگر، اقبالیات کے سو سال، ص ۸۰

[4] مکتوب بنام سید نذیر نیازی یکم اکتوبر ۱۹۳۰ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیب اقبال، سوم، ص ۱۶۹-۱۶۸

ایسی عبارت میں بھی ہو سکتا ہے جو گرامر کے لحاظ سے غلط ہو۔ اپنے بارے میں کہا، "میں نے کبھی ایسا کوئی شعر نہیں کہا جسے اپنے قلب میں محسوس نہ کیا ہو، اور محض عقل کے زور سے کہہ دیا ہو۔ یعنی میرے اشعار میں فکر اور جذبہ دونوں کا امتزاج پایا جاتا ہے۔"[1] ۳/ یا ۴/ اکتوبر کو بھی آئے۔ گزشتہ صدی کے جرمن ماہرِ دینیات فریڈرک شلائرمیخر (Friedrich Schleiermacher) نے لکھا تھا کہ مذہب کی بنیاد عقل پر نہیں، جذبے پر ہے۔ چشتی نے علامہ سے پوچھا۔ علامہ نے جواب دیا:

> یہ سوال ہی غلط ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ایگو [خودی] اپنے ارد گرد کی دنیا کا جائزہ لیتی ہے تو اُس میں جذبہ، شعور اور ارادہ تینوں کارفرما ہوتے ہیں۔ مذہب کا تعلق انسان سے ان تینوں پہلوؤں سے ہے۔ کوئی جذبہ ایسا نہیں جس میں خودی کے دوسرے پہلو شامل نہ ہوں۔ انسان خالص جذبات یا خالص شعور یا خالص ارادے سے ناآشنا ہے۔[2]

۳/ اکتوبر کو علامہ نے سید شمس الحسن کے نام خط لکھا کہ اگر لیگ کی کونسل کے اجلاس کا فیصلہ ہو چکا ہو تو تاریخ اور مقام سے مطلع کیا جائے۔[3]

۴/ اکتوبر کو محکمہ انکم ٹیکس نے علامہ کے سالانہ حسابات کی پڑتال کے بعد حکمنامہ جاری کیا۔ پڑتال کے لیے حسبِ معمول منشی طاہر الدین حاضر ہوئے تھے۔[4]

یوسف کا کہنا ہے کہ ۵/ اکتوبر کو پھر کوٹھی پر گئے۔ مذہب اور نظریۂ حلول میں فرق پوچھا۔ حلول سے اُن کی مراد پینتھی ازم (pantheism) تھی۔ علامہ نے جواب دیا کہ اُس نظریہ کی رُو سے خدائے مشخص کا وجود نہیں ہے۔ مذہب کی تعلیم کہ خدا ایک شخص (person) ہے جو سنتا ہے، جواب دیتا ہے۔ یوسف نے حال ہی میں ری کنسٹرکشن کا مطالعہ کیا تھا۔ تعریف کی تو علامہ نے کہا، "اگر یہ کتاب المامون کے عہد میں لکھی گئی ہوتی تو تمام دنیائے اسلام میں ایک غلغلہ برپا ہو جاتا۔ دراصل

---

[1] ہاشمی و دیگر، اقبالیات کے سو سال، ص ۸۰–۸۱

[2] ہاشمی و دیگر، اقبالیات کے سو سال، ص ۸۱

[3] مکتوب بنام سید شمس الحسن، ۳/ اکتوبر ۱۹۳۰ء؛ Malik (2013),pp.260-261

[4] صفدر محمود، 'علامہ اقبال کا گوشوارۂ آمدنی (انکم ٹیکس ریکارڈ کی روشنی میں)'، ص ۳۲

میری یہ کتاب آیندہ فلسفۂ اسلام پر قلم اُٹھانے والوں کے لیے ایک مقدمے کا کام دے گی۔"[1]

اُس روز دہلی میں متعین افغان سفیر ہدایت اللہ خاں کی طرف سے علامہ کو تار ملا کہ نادر شاہ کے فرزند شہزادہ محمد ظاہر خاں فرانس سے افغانستان آتے ہوئے فرنٹیئر میل کے ذریعے بمبئی سے پشاور کے سفر میں ۸؍اکتوبر کو لاہور سے گزریں گے۔ علامہ نے اخبار میں خبر بھجوادی۔[2]

مولانا محمد علی [جوہرؔ] گول میز کانفرنس کے لیے لندن روانہ ہوگئے۔ آل انڈیا مسلم کانفرنس کا اجلاس لکھنؤ بھی ہونا تھا۔ صدارت کی کرسی خالی ہوگئی۔ ۷؍اکتوبر کے انقلاب میں لکھا گیا کہ اگر لیگ کا اجلاس ملتوی ہو رہا ہے تو علامہ سے گزارش کی جائے کہ کانفرنس کی صدارت کریں۔ تاکہ اس اہم مرحلے پر قوم اُن کے خیالات سے واقف ہوجائے۔[3]

22

۷؍اکتوبر کو جسٹس ہلٹن، جسٹس ٹریپ اور جسٹس سر شیخ عبدالقادر نے لاہور سازش کیس کا فیصلہ سنایا۔ گزشتہ ماہ بھگت سنگھ کے والد کشن سنگھ نے درخواست گزاری تھی کہ قتل کے روز بھگت سنگھ لاہور میں نہ تھے۔ کلکتہ میں تھے۔ ثبوت موجود ہے۔ پیش کرنے کا موقع دیا جائے۔ بھگت سنگھ نے والد کو منع کر دیا۔

ٹریبونل نے متفقہ طور پر بھگت سنگھ، سُکھ دیو اور راج گرو کی پھانسی کا حکم دیا۔ باقی ملزموں کو مختلف سزائیں ہوئیں۔[4] ٹریبیون نے سلسلہ وار مضامین میں دلائل پیش کیے کہ کشن سنگھ کا بیان درست ہے۔ قتل بھگت سنگھ نے نہیں کیا۔[5]

"سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا،" چھبیس برس پہلے علامہ اقبال نے کہا تھا۔ آج بار

---

[1] ہاشمی و دیگر، اقبالیات کے سو سال، ص ۸۲

[2] انقلاب ۷؍اکتوبر ۱۹۳۰ء؛ حمزہ فاروقی، اقبال کا سیاسی سفر، ص ۲۰۳-۲۰۲

[3] Nadeem Shafiq Malik (2013),, pp.27-28

[4] Noorani (2001) *The Trial of Bhagat Singh,* pp.164, 179, 185-186, 304-307

[5] مضامین ۹؍سے ۱۷؍اکتوبر ۱۹۳۰ء تک شائع ہوئے؛ Noorani (2001), p.185-186

ایسوسی ایشن کے پلیٹ فارم سے اُس ٹریبونل کو غیر قانونی قرار دے چکے تھے جو مقدمے کی سماعت کر رہا تھا۔ 'ترانۂ ہندی' کو مخزن میں شائع کرتے ہوئے مدیر نے نوٹ میں لکھا تھا، ''جذباتِ دل کے ایک سینے سے دوسرے پر منعکس ہونے کا بھی عجیب قانون ہے... اگر میں نظم لکھتا تو لندن سے وہ خیالات ظاہر کرتا جو اقبال نے لاہور میں بیٹھے ہوئے کیے ہیں۔'' وہ مدیر شیخ عبدالقادر تھے۔ تاریخ کی ستم ظریفی تھی کہ بھگت سنگھ کے قتل کے پروانے پر تین دستخطوں میں سے ایک اُن کا تھا۔

رُستم و سہراب

آغا حشر کاشمیری، ۱۹۳۰ء

[اقتباس]

مَیدانِ جنگ میں رُستم اُداس چہرے اور غمگین دِل کے ساتھ مایُوس نِگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھ رہا ہے۔

رُستم: (دُعا مانگتا ہے) پروردگار! میں نے کبھی تیرے قہر و غضب کو حقیر نہیں سمجھا۔ کبھی تیری طاقت کے سامنے اپنی فانی طاقت کا غرور نہیں کیا۔ پھر اِس ذلّت کی شکل میں تُو نے مجھے میرے کس گناہ کی سزا دی ہے؟ اے درد مندوں کی دوا اور کمزوروں کی طاقت! اے نااُمیدوں کی اُمید! میں نے کل ساری رات تیرے حضور میں سجدہ ہائے نیاز کے ساتھ آنسو بہا کر مدد کے لیے التجا کی ہے۔ اپنے عاجز بندے کی التجا قبول کر۔ اِس بڑھاپے میں دنیا کے سامنے میری شرم رکھ اور ایک بار میری جوانی کا زور و جوش مجھے دوبارہ واپس دے دے:

عطا کر دے وہی طاقت جو پہلے تھی مرے دل میں
جوانی کا لُہو پھر جوش مارے میری نس نس میں
تری قدرت پلٹ سکتی ہے سارے کارخانے کو
پھر اِک دن کے لیے تُو بھیج دے پچھلے زمانے کو

(سہراب کا داخلہ)

سہراب: (خود کلامی) صبح ہو گئی۔ ممکن ہے کہ آج کی صبح اُس کی زندگی کی شام ثابت ہو۔ نہ جانے کیا سبب ہے کہ اُس کی موت کا خیال آتے ہی میری رُوح کانپ اُٹھتی ہے (رُستم کو دیکھ کر) تُو آ گیا۔ جنگ کے نقارے کی پہلی چوٹ سے تیری نیند ٹُوٹ گئی۔

رُستم: بہادر اپنا وعدہ نہیں بھولتا۔ میں آدھی رات سے صبح ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔

سہراب: آج لڑائی کا دُوسرا دن ہے۔ جانتا ہے اِس جنگ کا نتیجہ کیا ہو گا؟

رُستم: ہم دونوں میں سے ایک کی موت۔

سہراب: شیر دل بوڑھے! میرا دل تیری موت دیکھنے کے لیے راضی نہیں ہوتا۔ ایک غیبی آواز بار بار مجھے اس جنگ سے روک رہی ہے۔ اگر ایران کی گود بہادر فرزندوں سے خالی نہیں ہے تو جا، واپس جا، اور اپنے عوض کسی اور ایرانی دلیر کو بھیج دے۔ میں تجھے زندگی اور سلامتی کے ساتھ لوٹ جانے کی اجازت دیتا ہوں۔

رُستم: کل کی اتفاقی فتح پر غرور نہ کر۔ ہر نیا دن انسان کے لیے نئے انقلاب لے کر آتا ہے۔ تقدیر کا پہیہ ہمیشہ ایک ہی سمت میں نہیں گھومتا:

گھڑی بھر میں بدلنا ہو گا تجھ کو پیرہن اپنا
منگا کر پاس رکھ لے جنگ سے پہلے کفن اپنا

(جنگ شروع ہوتی ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد سہراب ہاتھ روک لیتا ہے۔)

سہراب: آج میں تجھ میں نیا جوش اور نئی قوّت دیکھ رہا ہوں۔ جواں ہمت بوڑھے! مجھے پھر شک ہوتا ہے کہ تُو رُستم ہے۔ میں تیری عزت کا واسطہ اور تیری بہادری کی دُہائی دے کر ایک بار پھر تیرا نام پوچھتا ہوں۔ زور سے نہیں، منّت سے نہیں، غرور سے نہیں، عاجزی سے!

رُستم: تُو میرا نام ہی جاننا چاہتا ہے تو سُن، میرا نام ہے...

سہراب: (خوشی کی گھبراہٹ سے) رُستم؟

رُستم: نہیں، سہراب کی موت!

سہراب: افسوس، تُونے میرے رحم کی قدر نہ کی۔

(دوبارہ جنگ شروع ہوتی ہے۔ رُستم سہراب کو گِرا کر سینے پر چڑھ بیٹھتا ہے۔)

رُستم: بس اِسی ہمت، اِسی طاقت پہ تھا اِتنا غرور؟
تُو کوئی شیشہ نہ تھا پھر ہو گیا کیوں چُور چُور!
کیا ہوا زورِ جوانی؟ اُٹھ اجل ہے گھات میں
دیکھ لے اب کس قدر قوّت ہے بوڑھے ہاتھ میں

سہراب: آہ! اے آنکھو! تمہارے نصیب میں باپ کا دیدار نہ تھا۔ کہاں ہو، پیارے باپ کہاں ہو؟ پیارے باپ کہاں ہو؟ آؤ آؤ کہ مرنے سے پہلے تمہارا سہراب تمہیں ایک بار دیکھ لے:

کیا خبر تھی کہ بگڑ جائے گی تقدیر اپنی
آخری وقت دِکھا دو مجھے تصویر اپنی

رُستم: کیا اپنی جوانی کی موت پر ماتم کرنے کے لیے باپ کو یاد کر رہا ہے؟ اب تیرے باپ کی محبت، اُس کی دُعا، اُس کے آنسو، اُس کی فریاد، کوئی تجھے دُنیا میں زندہ نہیں رکھ سکتی:

مرہم کہاں جو رَکھ دے دلِ پاش پاش پر
آیا بھی وہ تو روئے گا بیٹے کی لاش پر

سہراب: بھاگ جا، بھاگ جا۔ اِس دُنیا سے کسی دُوسری دنیا میں بھاگ جا۔ تُونے سام و نریمان کے خاندان کا چراغ بجھا دیا ہے۔ تاریک جنگلوں میں، پہاڑوں کے غار میں، سمندر کی تہہ میں، تُو کہیں بھی جا کر چُھپے، لیکن میرے باپ رُستم کے انتقام سے نہ بچ سکے گا۔

رُستم: (چونک کر کھڑا ہو جاتا ہے) کیا کہا؟ کیا کہا؟ تُو رُستم کا بیٹا ہے؟

سہراب: ہاں۔

رُستم: تیری ماں کا نام؟

سہراب: تہمینہ۔

رُستم: تیرے اِس دعوے کا ثبوت؟

سہراب: ثبوت اِس بازو پر بندھی ہوئی میرے باپ رُستم کی نشانی۔

رُستم: جھوٹ ہے، غلط ہے، تُو دھوکا دے رہا ہے۔ مجھے پاگل بنا کر اپنے قتل کا انتقام لینا چاہتا ہے (گھبراہٹ کے ساتھ سہراب کے بازو کا کپڑا پھاڑ کر اپنا دیا ہوا مہرہ دیکھتا ہے)۔ وہی مہرہ، وہی نشانی! (سر پٹک کر) کیا کِیا! کیا کِیا! اندھے، پاگل جلّاد! یہ کیا کیا۔ شیر جیسا خونخوار، بھیڑیے جیسا ظالم، ریچھ جیسا موذی حیوان بھی اپنی اولاد کی جان نہیں لیتا۔ لیکن تُو اِنسان ہو کر حیوان سے بھی زیادہ خُونی اور جہنّم سے بھی زیادہ بے رحم ہے:

خون میں ڈوبا ہے وہ، جس سے مزہ جینے میں تھا
دل کے بدلے کیا کوئی پتھر ترے سینے میں تھا
توڑ ڈالا اپنے ہی ہاتھوں سے اے ظالم اُسے
تیرا نقشہ، تیرا ہی چہرہ جس آئینے میں تھا[1]

23

۹/ اکتوبر کو رات ساڑھے نو بجے نادر شاہ کے فرزند شہزادہ محمد ظاہر خاں فرنٹیئر میل پر لاہور ریلوے اسٹیشن سے گزرے۔ "ہزارہا مسلمان آپ کی زیارت کے لیے دیوانہ وار ایک دوسرے پر گرے پڑتے تھے،" انقلاب کا بیان ہے، "پے در پے نعروں سے اسٹیشن گونج اُٹھا۔" علامہ، سعادت علی خاں، چودھری دین محمد، چودھری فتح محمد، چودھری عبدالکریم، خان بشیر حسین خاں، میر سردار حسین، حکیم سید ظفریاب علی، میاں محمد دین (حزب الاحناف)، سید عنایت علی شاہ، مولانا غلام مرشد، مولانا نجم الدین، غلام رسول مہر، حاجی الدین کے صاحبزادے میر حبیب اللہ، شہزادہ احمد علی درانی، شہزادہ صالح محمد خاں، شہزادہ محمد یوسف خاں، سردار عبدالرحمٰن محمد زائی اور دوسرے شہزادے، علمائے کرام اور معززین موجود تھے۔ شہزادے کو پھولوں کے ہار پہنائے گئے۔ افغان قونصل جنرل

---

[1] عشرت رحمانی، آغا حشر کے ڈرامے، جلد پنجم، ص ۳۴۶-۳۴۲

اور افغان سفارت خانے کے حکام شہزادے کے ساتھ تھے۔ سید حبیب نے ان کے لیے "نہایت پر تکلف" کھانے کا انتظام کیا تھا۔ شہزادے نے علامہ اور دوسروں سے "نہایت پر تپاک" ملاقات کی۔ عبدالمجید سالک سے کہا کہ ان کی طرف سے سب مسلمانوں کی اس تکلیف فرمائی اور محبت کا شکریہ ادا کریں۔ سالک نے تعمیل کی۔[1]

۱۴/اکتوبر کو بمبئی کرانیکل میں ری کنسٹرکشن پر تبصرہ شائع ہوا۔ ٹائمز لٹریری سپلیمنٹ اور مدراس کے اخبار ہندو کے علاوہ لاہور کے ہفت روزہ لائٹ میں بھی تبصرے شائع ہو چکے تھے۔ کیمبرج سے پروفیسر سورلے اور پروفیسر نکلسن، لیڈن ہالینڈ سے پروفیسر وینسنک اور لیبزگ جرمنی سے پروفیسر آگسٹ فشر (Prof. August Fischer) کے تعریفی خطوط موصول ہوئے تھے۔ جسٹس سر سلیمان نے بھی تعریف کی تھی۔ تبصروں کے اقتباسات پر مبنی چار صفحات کا ایک کتابچہ دستیاب ہے۔ علامہ نے بنگلور میں اپنے مداح جمیل کو بھجوایا تھا۔ سمجھا جا سکتا ہے کہ اقتباسات کا انتخاب علامہ نے کیا ہو گا۔ کتابچہ شیخ مبارک علی نے شائع کیا ہو گا۔[2]

یوسف سلیم چشتی کا بیان ہے کہ ۲۱/اکتوبر کو شام پانچ بجے علامہ کی کوٹھی پر حاضر ہوئے۔ ملوکیت پر گفتگو ہوئی۔ علامہ نے کہا کہ اسلام اس کی ہر صورت کو مذموم قرار دیتا ہے۔ دوسروں پر حکومت کرنے کے لیے طاقت حاصل کرنے کا جذبہ ملوکیت کی بنیاد ہے۔ اس کے لیے قوم میں تقسیم اور تفریق کا رنگ پیدا کیا جاتا ہے۔ پھر بادشاہ ثالث کا فرض ادا کرتا ہے۔ لڑنے والے گروہوں کو یقین ہو جاتا ہے کہ اُن کی عافیت کے لیے بادشاہ کا وجود ضروری ہے۔ نتیجہ یہ کہ محکوم قوم میں فسق و فجور پیدا ہو جاتا ہے۔ اعلیٰ، ادنیٰ اور ادنیٰ، اعلیٰ ہو جاتے ہیں۔ محکوم قوم رفتہ رفتہ اخلاقِ حسنہ سے محروم ہو جاتی ہے۔ ملکۂ سبا کا قول مطالعے کے لائق ہے جو قرآن میں ہے، "بیشک جب بادشاہ کسی شہر میں داخل ہوتے ہیں تو وہ اس میں فساد برپا کرتے ہیں اور اس شہر کے معزز افراد کو ذلیل کر دیتے ہیں۔"[3]

---

[1] انقلاب ۱۱/اکتوبر ۱۹۳۰ء؛ حمزہ فاروقی، اقبال کا سیاسی سفر، ص ۲۰۴-۲۰۳

[2] Anonymous (1930) *Lectures* ...

[3] ہاشمی و دیگر، اقبالیات کے سو سال، ص ۸۲-۸۳

24

وسیمہ مبارک کہتی ہیں کہ علامہ کے گھر کوئی مہمان ٹھہرے ہوئے تھے۔ کہیں جانے لگے تو جاوید نے ضد کی۔ پانچ یا چھ برس کے تھے۔ مہمان انہیں موٹر میں ساتھ لے گئے۔ خیال رہا ہو گا کہ جلد ہی لوٹ آئیں گے۔ گھر میں کافی دیر تک جاوید نظر نہ آئے تو علامہ کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا۔ "ملازموں کو اِدھر اُدھر دوڑایا، خود بھی کوٹھی سے باہر نکل کر دیکھتے رہے،" وسیمہ کا بیان ہے، "پریشانی میں کبھی اِدھر جاتے اور کبھی اُدھر... آخر تھک ہار کر برآمدے میں پریشانی کے عالم میں سر جھکا کر بیٹھ گئے۔ اندر چچی جان [سردار بیگم] کی حالت بھی غیر ہو رہی تھی۔" مہمان کافی دیر بعد واپس آئے۔ علامہ کی نظر موٹر میں بیٹھے جاوید پر پڑی۔ لپک کر گئے اور جاوید کو کھینچ کر سینے سے لگا لیا۔ گود میں اُٹھا کر اندر لائے۔ سردار بیگم کے حوالے کیا۔ وسیمہ کہتی ہیں، "اُس وقت دونوں پر کچھ ایسی کیفیت طاری تھی کہ ایک لفظ بھی زبان سے اَدا نہ ہوا۔ چچی جان تو جاوید کو سینے سے لگا کر رونے لگیں اور چچا جان [علامہ اقبال] جلدی سے باہر چلے گئے کیونکہ اُن کی نمناک آنکھیں بھی چھلکنے کے قریب ہی تھیں۔"[1]

وسیمہ کا بیان ہے کہ ایک دفعہ صحن میں کھیلتے ہوئے جاوید ٹھوکر کھا کر منہ کے بل گرے۔ ہونٹ کٹ گیا۔ خون بہنے لگا۔ اتفاق سے علامہ پہنچ گئے۔ وسیمہ کہتی ہیں، "چند لمحوں تک ساکت و مبہوت کھڑے دیکھتے رہے، اور پھر اُن کے قدم ڈگمگائے اور دھڑام سے بیہوش ہو کر گر پڑے۔"[2] "طاقت، قوت اور جہاد کے داعی ہونے کے باوجود اُن کی رقتِ قلب کا یہ عالم تھا کہ خون بہتا دیکھ نہ سکتے تھے،" جاوید نے بڑے ہو کر لکھا۔[3]

روایت ہے کہ گھر میں کام کرنے والی ملازمہ کا بچہ صحن میں کھیل رہا تھا۔ علامہ نے کہا، "جاوید اور اِس بچے میں اِس وقت کوئی خاص فرق نہیں، کیونکہ سب بچے برابر ہوتے ہیں، لیکن بڑے ہو کر اِن دونوں میں زمین و آسمان کا فرق پیدا ہو جائے گا۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جاوید کسی اعلیٰ قسم سے

---

[1] خالد نظیر صوفی، اقبال درونِ خانہ، ص ۳۸-۳۹

[2] خالد نظیر صوفی، اقبال درونِ خانہ، ص ۳۸

[3] ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۴)، زندہ رود، ص ۲۱۹

تعلق رکھتا ہے بلکہ بات صرف اِتنی سی ہے کہ اُسے اپنی زندگی میں ایسے مواقع میسر آئیں گے کہ وہ پڑھ لکھ کر ایک بڑا آدمی بن سکے لیکن دُوسرا بچہ اپنی زندگی میں کسی غیر معمولی اتفاق کے فقدان کی بنا پر وہیں کا وہیں رہ جائے گا حالانکہ اگر اِس کو بھی ایسے مواقع میسر آ جائیں تو اِس کے پوشیدہ جوہر بھی کھل سکتے ہیں اور سنگِ راہ کی بجائے یہ بھی آسمانِ شہرت پر درخشندہ ستارہ بن سکتا ہے۔"[1]

25

منشی ٹریننگ کالج میسور کے عبدالسلام سلیم ہزاروی نے اپنے عربی قصائد کا مجموعہ علامہ کو بھجوایا۔ ۵/ نومبر کو علامہ نے لکھا، "آپ کے عربی قصائد بہت دل کش ہیں۔ اللہ کرے حسنِ رقم اور زیادہ۔ ۔ ۔"[2]

نذیر نیازی نے بتایا کہ ترجمے کا کام چھوٹے بھائی کی بیماری کی وجہ سے رکا ہوا ہے۔ ۸/ نومبر کو علامہ نے خط لکھ کر مطبع کے بل کی یاددہانی کروائی۔[3]

اُس شام ساڑھے چار بجے ہیلی ہال میں پنجاب یونیورسٹی کی سینٹ کا اجلاس ہوا۔ وائس چانسلر اے سی ولز صدارت کر رہے تھے۔ علامہ اقبال ۱۶/مارچ کو عام فیلو نامزد ہو چکے تھے۔ شریک ہوئے۔ یہ پنجاب یونیورسٹی کی سینٹ کا آخری ایسا اجلاس تھا جس میں علامہ کی شرکت کا ثبوت موجود ہے۔[4] اُس شام مسلم کانفرنس کے سلسلے میں ایک روز کے لیے مرادآباد گئے۔[5]

اس برس انجمن نے مدرسہ تدریبُ المبلغین کھولا تھا۔ عام زبان میں اشاعتِ اسلام کالج کہلاتا تھا۔ زیادہ تر طلبہ میٹرک پاس تھے۔ انہیں مذہبی اور دینی تعلیم دی جاتی۔ ایسے مبلغین پیدا کرنے تھے ہندوستان اور ہندوستان سے باہر اسلام کی خدمت اور تبلیغ کر سکیں۔[6] نصاب کی بعض کتب استعداد

---

[1] خالد نظیر صوفی، اقبال درونِ خانہ، ص ۸۰

[2] برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۱۷۴-۱۷۳

[3] مکتوب بنام نذیر نیازی ۸/ نومبر ۱۹۳۰ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۱۷۵-۱۷۴

[4] ڈاکٹر حسن اختر ملک، اقبال، ایک تحقیقی مطالعہ، ص ۸۷

[5] مکتوب بنام سید نذیر نیازی ۸/ نومبر ۱۹۳۰ء محولہ بالا

[6] انجمن کی قلمی روداد؛ محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶)، اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص ۱۸۰، ۶۵، ۳۲

سے باہر تھیں۔ ردوبدل کے لیے ۹/ نومبر کو انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کے اجلاس میں پانچ ارکان کی کمیٹی بنائی گئی۔ علامہ اقبال، مولوی اصغر علی، شیخ عظیم اللہ، ایوب احمد مخدومی اور یوسف سلیم چشتی شامل تھے۔[1]

26

لندنمیں ہندوستانی رہنما گول میز کانفرنس کے لیے جمع تھے۔ ریاستوں کے حکمراں یا اُن کے نمایندے بھی بلوائے گئے تھے۔ کانگریسی رہنما ہندوستانی جیلوں میں تھے۔ مدعو نہیں کیے گئے۔ دریائے ٹیمز کے کنارے ویسٹ منسٹر پیلس تھا۔ عرفِ عام میں ہاؤسز آف کامنز کہلاتا تھا۔ برطانوی پارلیمنٹ یہیں ہوتی تھی۔

۱۲/ نومبر کو پیلس کی شاہی گیلری میں کانفرنس کا افتتاحی اجلاس ہوا۔ شاہِ برطانیہ جارج پنجم نے خطاب کیا۔ مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔ اس یادگار لمحے کی تاریخی اہمیت پر زور دیا۔ دس برس پہلے ہندوستان میں دستوری اصلاحات پیش کرتے ہوئے کہا گیا تھا کہ دس برس بعد نظرِ ثانی ہو گا۔ وہی ہو رہا ہے۔ خطاب کے بعد بادشاہ سلامت رخصت ہو گئے۔ مہاراجہ پٹیالہ نے وزیرِ اعظم برطانیہ ریمزے میکڈونلڈ سے درخواست کی کہ کانفرنس کی صدارت قبول فرمائیں۔ ہز ہائی نس آغا خاں نے تائید کی۔

میکڈونلڈ نے صدارت قبول کی۔ تمہیدی کلمات کے بعد کہا کہ سول بدامنی (civil disorder) ایک رجعتی (reactionary) رویہ ہے۔ یہ اُس سماجی رویے ہی کو ختم کر دیتا ہے جو تمام آئینی ترقی کی جڑ ہے اور جس پر مستحکم داخلی انتظامیہ کی بنیاد بھی ہے۔ دولتِ مشترکہ کی تمام قوموں کی تاجِ برطانیہ کے ساتھ وفاداری اور عقیدت کے رشتے کی مضبوطی ہی نہیں بلکہ اس کی لچک بھی اس افتتاحی اجلاس میں ملک معظم کی آمد سے واضح ہو جاتی ہے۔ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے، وہ ملتوں، زبانوں اور مفادات کے اختلاف کے باوجود ایک وحدت ہے۔ برطانیہ عظمیٰ کے ساتھ تعلق قائم ہونے کے بعد وہ اثرات بہت بڑھ گئے ہیں جو ہندوستان کو متحد کرتے ہیں مگر درحقیقت متحدہ ہندوستان

---

[1] انجمن کی قلمی روداد؛ محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶)، اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص ۱۸۰

کا خواب وہاں کے حکیموں اور حکمرانوں کے ذہنوں میں اُس وقت بھی موجود تھا جب کسی انگریز تاجر نے وہاں قدم نہ رکھا تھا:

> … I am mindful, it is true, of India's different communities and languages and interests, but I am reminded still more of the quickening and unifying influences which have grown up irresistibly from her contact with Great Britain, and also, and still deeper, of the aspirations for a united India which were in the minds of her philosophers and her rulrs before the first English trader set foot on her shores.

ہندوستانی مندوبین کی طرف سے مہاراجہ بڑودہ، مہاراجہ جموں و کشمیر، سر محمد اکبر حیدری، شرینواس شاستری اور جناح نے تقاریر کیں۔ برما کے نمایندے بھی آئے تھے۔ اُن کی طرف سے باپے نے تقریر کی۔ برطانوی ہند سے برما کی علیحدگی کا فیصلہ کانفرنس میں ہونا تھا۔

کانفرنس کی رہنمائی کے لیے سولہ ارکان کی کمیٹی بنائی گئی: مہاراجہ الور؛ بن؛ مہاراجہ بیکانیر؛ سر ربرٹ کر؛ کرنل ہسکر؛ سر سیموئیل ہور؛ سر اکبر حیدری؛ سر مرزا محمد اسماعیل؛ جیکار؛ جناح؛ سر بھوپندرناتھ متر؛ مارکوئیس آف ریڈنگ؛ سر تیج بہادر سپرو؛ سر محمد شفیع؛ شرینواس شاستری؛ سردار اُجل سنگھ۔

اگلے روز ۱۳؍ نومبر کو دہلی سے حکومتِ ہند نے سائمن کمیشن رپورٹ کے بارے میں اپنی یادداشت شائع کی۔[1] اسے ۲۰؍ ستمبر کو وزیرِ ہند کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔[2] اپنی جگہ ایک مختصر سی رپورٹ تھی۔ بعض اعتبار سے سائمن کمیشن پر پیش رفت تھی۔ علامہ کے نزدیک مسلمانوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافی کا ازالہ نہ ہوا۔ حکومت نے اعتراف کیا تھا کہ سائمن کمیشن کی رپورٹ نے مسلمانوں کے سامنے جو متبادل پیش کیے مسلم رائے عامہ نے اُن میں سے کسی کو بھی قبول نہیں کیا ہے۔ یہ بھی کہا گیا کہ پنجاب اور بنگال میں آبادی کے تناسب سے نمایندگی نہ ملنے پر مسلمانوں کی شکایت بجا ہے۔ پھر بھی پنجاب کے معاملے میں حکومتِ پنجاب کے سرکاری اراکین کی تیار کردہ ایک اسکیم کی

---

[1] Mitra, *Register Jul-Dec 1930,* p.392

[2] Irvin, *et. al*., *Government of India's Despatch,* p.1

تائید کی۔ اس کے مطابق مسلمانوں کو صوبائی کونسل میں مسلمانوں کو ہندوؤں اور سکھوں کی مجموعی تعداد سے دو نشستیں زیادہ مل سکتی تھیں مگر کونسل میں اُن کا مجموعی تناسب ۴۹ فیصد ہو جاتا۔ اس طرح عملاً پنجاب میں وہ اپنی اکثریت سے محروم ہو جاتے۔ علامہ کے نزدیک حکومتِ پنجاب کے مسلمان سرکاری اراکین کا اس اسکیم کو قبول کرنا میثاقِ لکھنؤ کے بعد دوسری سیاسی غلطی تھی۔

صوبۂ سرحد کا مسئلہ بھی حل نہ ہو سکا۔ حکومت نے صوبے میں کسی حد تک جمہوری حکومت کے قیام کی تائید کی مگر دوسرے صوبوں کے برعکس اسے چیف کمشنر کے ماتحت رکھنے کی سفارش کی۔ علامہ سرحدی صوبے کو دوسرے صوبوں کے برابر اختیارات کا مستحق سمجھتے تھے۔[1]

لندن میں گول میز کانفرنس کے سامنے ہندو مہاسبھا کی طرف سے ڈاکٹر مونجے نے مسلمانوں کے مطالبات کی مخالفت میں بارہ نکات پیش کیے:

۱ جداگانہ نیابت نیشنلزم کے منافی ہے۔ جداگانہ انتخابات ختم ہونے چاہئیں۔ منتخب اداروں اور درسگاہوں میں کسی اقلیت کے لیے نشستیں مخصوص نہیں ہونی چاہئیں لیکن کوئی اقلیت بہت اصرار کرے تو صرف اسمبلیوں میں کچھ عرصے کے لیے نشستیں مخصوص کی جاسکتی ہیں۔ اکثریتی ملّت کے لیے کسی صوبے میں نشستیں کسی حال میں بھی مخصوص نہ کی جائیں۔ صوبوں کی موجودہ سرحدوں میں تبدیلی کا مقصد کسی ملّت کو اکثریت دینا نہ ہو۔ بقیہ تجاویز کی بنیاد یہی اصول ہیں۔

۲ سندھ کو علیحدہ صوبہ نہ بنایا جائے۔

۳ بلوچستان اور صوبہ سرحد میں فوراً ہی دوسرے صوبوں کے برابر آئینی اصلاحات قابلِ عمل تجویز نہیں ہے۔

۴ سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں یا کسی بھی ملّت کے لیے حصہ مقرر نہ کیا جائے۔

۵ کابینہ میں بھی مسلمانوں کے لیے کوئی نشستیں مخصوص نہ کی جائیں۔

---

[1] حکومتِ ہند کی دستاویز کے بارے میں نکات خطبۂ الٰہ آباد سے ماخوذ ہیں۔ دیکھیے ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کے واقعات

۶ صوبائی اور مرکزی اسمبلیوں میں زیادہ سے زیادہ اگلے دو انتخابات تک اقلیتوں کے لیے نشستیں مخصوص کی جاسکتی ہیں۔ انتخاب بہر حال مخلوط ہوں۔

۷ بقایا اختیارات صوبوں کے نہیں بلکہ مرکز کے پاس رہیں۔ مرکزی حکومت زیادہ سے زیادہ مضبوط ہو۔

۸ تمام ملتوں کو پوری مذہبی آزادی حاصل ہو بشرطیکہ یہ حق دوسروں کو اشتعال دلانے کے لیے استعمال نہ کیا جائے۔ مذہبی آزادی سے مراد عقیدے، عبادت، رسومات اور تہوار، تبلیغ، تبدیلئ مذہب اور مذہبی تعلیم کی آزادی مراد ہے۔

۹ اگر مسلمان ہر حال میں جداگانہ نیابت پر مصر ہیں تو پھر میثاقِ لکھنؤ پر قائم رہیں۔ اُس سے زیادہ طلب مت کریں۔

۱۰ مسلمان اپنے لیے وہ مراعات طلب نہیں کر سکتے جو جمعیتِ اقوام کے مطابق اقلیتوں کا حق ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد خاصی ہے اس لیے اُن کے پاس اپنی حالت بہتر بنانے کے ذرائع موجود ہیں۔ جمعیتِ اقوام اقلیتوں کے جن حقوق کو تسلیم کرتی ہے، اُن کی مستحق صرف ہندوستان کی دوسری اقلیتیں ہیں جیسے اچھوت، عیسائی، پارسی وغیرہ۔

۱۱ ہندو مسلم مسئلے کا تصفیہ کسی غیر جانبدار شخص یا جمعیتِ اقوام جیسے کسی ادارے سے کروایا جاسکتا ہے جسے اس قسم کے سوالوں کا تجربہ ہو۔

۱۲ یاد رہے کہ جمعیتِ اقوام اقلیتوں صرف مذہب، ثقافت اور سماجی رسوم و رواج کی حد تک اقلیتوں کے حقوق کی حمایت کرتی ہے۔ ایک قوم کے افراد کے درمیان مذہب، ثقافت یا زبان کی بنیاد پر ویسے امتیازات کی نہیں جن کا مطالبہ مسلمان کر رہے ہیں۔[1]

ہندوستانی اخبارات میں خبر شائع ہوئی کہ سر محمد شفیع کی تجویز پر مسلمان مندوبین جداگانہ نیابت چھوڑنے پر راضی ہوئے ہیں۔ بنگال اور پنجاب میں اکثریتی حقوق پر اصرار بھی چھوڑ دیا ہے۔ علامہ نے

---

[1] Mitra, *Register July-Dec 1930*, pp.324 (c), 324(d)

۱۵/ نومبر کو آغا خاں کے نام تار بھیجا۔ اصل متن دستیاب نہیں ہے۔ ترجمہ انقلاب میں شائع ہوا:

> تازہ ترین خبریں اضطراب انگیز آرہی ہیں۔ مسلمانان پنجاب کی رائے عامہ دہلی مسلم کانفرنس کی منظور کردہ قراردادوں پر قائم ہے۔ اور ان میں ردوبدل کو ناقابل برداشت خیال کرتی ہے۔ اگر کوئی ردوبدل کیا گیا تو مسلم مندوبین پر اعتماد نہیں رہے گا۔ اگر ہندو مسلم مطالبات کو نہیں مانتے تو مسلمان کانفرنس کو چھوڑ کر چلے آئیں۔

اِسی سے ملتے جلتے تار ہندوستان کے دوسرے مسلمان رہنماؤں کی طرف سے بھی جا رہے تھے۔ ان میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اجلاس لکھنؤ کے صدر نواب اسماعیل بھی شامل تھے۔[1]

۱۶-۱۵/ نومبر کو لکھنؤ میں دوسری آل انڈیا مسلم کانفرنس منعقد ہوئی۔ مولانا محمد علی [جوہر] نے صدارت کرنی تھی۔ وہ گول میز کانفرنس کے لیے انگلستان میں تھے۔ نواب اسماعیل خاں نے صدارت کی۔ مجلس استقبالیہ کے چیئرمین سید علی ظہیر تھے۔ شریک ہونے والوں میں راجہ صاحب سلیم پور، نواب محمد یوسف، مولانا شفیع داؤدی، سید ظہر احمد اور ملک فیروز خاں نون نمایاں تھے۔ نواب اسماعیل نے خطبۂ صدارت میں کہا:

> ☆ کانفرنس کے پہلے اجلاسِ دہلی میں منظور ہونے والی قرارداد مسلمانوں کے کم سے کم مطالبات کا مجموعہ ہے۔ محمد علی جناح کے چودہ نکات بھی اسی سے ماخوذ ہیں۔ گول میز کانفرنس میں مسلمانوں کے نمایندوں پر لازم ہے کہ اسی قرارداد کی بنیاد پر تصفیہ کریں۔
>
> ☆ کانفرنس کے خلاف پروپیگنڈا کیا جا رہا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ اس کا مقصد مسلم لیگ کی اہمیت کم کرنا ہے۔ رجعت پسندوں کی جماعت ہے جنہیں لیگ نے اپنے دامن میں جگہ نہ دی تھی۔ حکومت کی پروردہ جماعت ہے جس کا مقصد ہندو مسلم اختلافات کو ہوا دینا ہے۔ ان تمام الزامات میں کچھ حقیقت نہیں۔

---

[1] ۱۸/ نومبر ۱۹۳۰ء؛ افضل (۱۹۸۶)، ص۱۰۹۔ حکومتِ ہند کی یادداشت سے موازنہ علامہ نے مسلم آؤٹ لُک کے نمایندے سے انٹرویو میں کیا جو افضل (۱۹۸۶)، ص۱۱۱-۱۰۹ پر بحوالہ انقلاب ۲۳/ نومبر ۱۹۳۰ء ہے۔

☆ صوبہ سرحد میں دوسرے صوبوں کے مساوی آئینی اصلاحات نافذ کی جائیں۔ پشاور کے سانحہ کی تحقیقات کے لیے کمیٹی مقرر کی جائے۔
☆ یہودی اپنے بارسوخ حامیوں کے ساتھ انگلستان کی لیبر حکومت پر دباؤ ڈال رہے ہیں کہ بالفور ڈکلیریشن کی تشریح ان کی مرضی سے کی جائے۔ خطے میں یہودی ریاست قائم ہو۔ جواباً فلسطین کے عربوں نے کہا ہے کہ ڈکلیریشن ہی واپس لیا جائے۔ ہم تائید کرتے ہیں۔ فلسطین کے مسئلے پر ہمارا موقف ہمیشہ یہی رہا ہے کہ حکومت برطانیہ اپنے مینڈیٹ سے دستبردار ہو جائے۔ خطے میں رہنے والے عرب اور یہودی اپنے معاملات خود طے کریں۔

کانفرنس میں منظور ہونے والی قراردادوں میں اصرار کیا گیا کہ گزشتہ مسلم کانفرنس کی قرارداد ہی مسلمانوں کا متفقہ مطالبہ ہے۔ یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو دہلی میں منظور ہوئی تھی۔ گول میز کانفرنس کے مسلمان اراکین کسی اور گفتگو میں شریک ہونے سے پہلے تین نکات منظور کروائیں: (۱) وفاقی نوعیت کا آئین جس میں اختیارات صوبوں کو تفویض کرنے کا رجحان ہو۔ (۲) صوبوں کے لیے مکمل خوداختیاری؛ (۳) مسلمانوں کے لیے تحفظات کا آئین میں شامل ہونا۔[1]

27

افتتاحی اجلاس کے بعد گول میز کانفرنس لندن ہی میں سینٹ جیمز پیلس میں منتقل ہوئی۔ ۱۷ نومبر کو عام اجلاس (plenary session) شروع ہوا۔ ۲۱ نومبر تک جاری رہنا تھا۔ فیصلہ کرنا تھا کہ ہندوستان کا آئین وفاقی ہو یا وحدانی۔ ہندوستان کی آزاد ریاستوں (princely states) کے حکمراں یا اُن کے نمایندے بھی موجود تھے۔ مہاراجہ بیکانیر نے اعلان کیا کہ اگر ہندوستان ایک وفاق بنے تو وہ اُس میں شامل ہونے پر تیار ہیں۔ ریاستوں کے باقی نمایندے اپنی اپنی باری پر یہی موقف دہرانے لگے۔[2]

علامہ کے مطابق ہندوستان میں اس خبر نے اقلیتوں کو خاص طور پر حیرت میں مبتلا کیا۔ والیانِ

---

[1] Mitra, *Register Jul-Dec 1930*, pp.348-351
[2] IRTC, *Proceedings*

ریاست کے تاجِ برطانیہ کے ساتھ براہِ راست معاہدے تھے۔ اُن کے وفاق میں شامل ہونے کا مطلب تھا کہ مرکزی حکومت میں تاجِ برطانیہ کا عمل دخل باقی رہے گا۔ والیانِ ریاست زیادہ تر ہندو تھے۔ علامہ کے خیال میں یہی وجہ تھی کہ ہندو رہنماؤں نے اچانک وفاق کی مخالفت ترک کر دی۔[1]

۱۹ر نومبر کو مولانا محمد علی [جوہر] کی باری تھی۔ شدید علالت کی وجہ سے بیٹھ کر تقریر کی۔ ہمیشہ کی طرح آغاز ہلکے پھلکے انداز میں کیا۔ سفر کی مختصر روئیداد سنائی۔ مزاح سے بھرپور تھی۔ ہندوستان میں وہی دوست جو کل تک انہیں حریت پسند کہتے تھے، آج غدار کہہ رہے تھے کہ کانگریس کی مخالفت کے باوجود گول میز کانفرنس میں شریک ہو کر گویا حکومت کے ساتھ "تعاون" کر رہے ہیں۔ شیطان کے ساتھ تعاون کرنے پر بھی تیار تھے بشرطیکہ خدا کے کام کے لیے ہو۔ اس کے بعد کہا کہ ہر حال میں آزادی کا پروانہ لے کر جائیں گے۔ اگر وزیرِاعظم انگلستان اس پر تیار نہیں تو پھر تدفین کے لیے تھوڑی سی زمین دینی ہو گی۔ غلام وطن میں واپسی کی بجائے انگلستان کی آزاد سرزمین پر مرنا بہتر سمجھیں گے:

> I hope you will forgive this long introduction about my ill-health and ailments and all sorts of things; but the fact is that to-day the one purpose for which I came is this—that I want to go back to my country if I can go back with the substance of freedom in my hand. Otherwise, I will not go back to a slave country. I would even prefer to die in a foreign country so long as it is a free country, and if you do not give us freedom in India you will have to give me a grave here.[2]

اُس روز علامہ نے مطبع جامعہ کے مہتمم حامد علی خاں کو خط لکھا۔ حامد نے پچھلے بل کے مطابق خط لکھا تھا۔ علامہ پہلے ہی وہ بل ترمیم کے لیے واپس بھجوا چکے تھے۔[3] اگلے روز نذیر نیازی کا خط آیا۔ بل کے سلسلے میں مجیب کی طرف سے پیغام تھا۔ علامہ نے لکھا کہ درست بل یا نقل بھجوائی جائے۔[4]

---

[1] Iqbal, *Presidential Address,* p.11-12

[2] IRTC, *Proceedings,* pp.89-99

[3] مکتوب بنام نذیر نیازی ۲۰ر نومبر ۱۹۳۰ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۱۷۷-۱۷۴

[4] مکتوب بنام نذیر نیازی ۲۰ نومبر ۱۹۳۰ء۔ نیازی کہتے ہیں کہ مطبع نے تعمیل کر دی؛ نیازی، مکتوباتِ اقبال

میاں سر محمد شفیع کی صاحبزادی اور علامہ کے دوست میاں شاہنواز کی بیگم، جہان آرا شاہنواز کانفرنس کے مندوبین میں تھیں۔ ۲۰ نومبر کو تقریر کرتے ہوئے کہا کہ کانفرنس کی خواتین شرکا بھی وفاقی طرزِ حکومت کی حمایت کرتی ہیں:

> Provincial genius in every sphere of life will better flower amidst its own native surroundings, and will thus spread its perfume all over the country and the world. A Tagore in Bengali and a Muhammad Iqbal in Urdu, by writing in their respective languages, could enrich the world with such gems of thought and literature.[1]

شری نواس شاستری وفاقی طرزِ حکومت کی مخالفت میں سرگرم رہے تھے۔[2] اب کہا کہ اس معاملے میں اُن کا عقیدہ تبدیل ہو گیا ہے۔[3] اگلے روز عام اجلاس کے آخر میں وزیرِ اعظم میکڈونلڈ نے تقریر کی۔ شاستری کو مخاطب کر کے کہا کہ صرف آپ ہی کا عقیدہ تبدیل نہیں ہوا۔ ہر نئی حقیقت جو یہاں آشکار ہو رہی ہے، تقاضا کرتی ہے کہ ہم اپنے لائحہ عمل میں اُسے بھی جگہ دیں:

> Mr. Sastri, you are not the only man who has changed his opinion within the last few days. We want opinions to change, not in fundamentals, not in aspirations, not in ideals, not in those great basic human claims; but we want opinions to change in this sense, that every new fact brought before us challenges us to accommodate it in the practical systems which I hope we are going to construct before we leave this Table.[4]

لاہور میں علامہ اِن الفاظ کی معنی خیزی پر خصوصی توجہ دیئے بغیر نہ رہ سکے۔[5] لندن میں طے ہوا کہ آیندہ آئین وفاقی ہو گا۔ نو موضوعات پر سب کمیٹیاں بنائی گئیں: وفاقی ڈھانچہ، صوبائی دستور، اقلیتیں، برما، صوبہ سرحد، رائے دہندگی، دفاع، ملازمتیں اور سندھ۔ ہندوستان میں شمالی ہند کے

---

[1] IRTC, *Proceedings,* p.107

[2] دیکھیے ۲۰ جولائی ۱۹۳۰ء کے واقعات

[3] IRTC, *Proceedings,* p.142۔ علامہ نے خطبۂ الٰہ آباد میں حوالہ دیا۔

[4] IRTC, *Proceedings,* p.171

[5] خطبۂ الٰہ آباد، دیکھیے ۲۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کے واقعات

مسلمانوں کی کانفرنس (Upper India Conference) کا مطالبہ اخبارات میں آنے لگا۔ مسلم آؤٹ لک کے نمایندے نے ملاقات کی تو علامہ نے کہا:

> یہ تجویز پیش ہو چکی ہے کہ شمالی و مغربی ہند اور پنجاب کے مسلمان لاہور میں ایک اجلاس منعقد کر کے بیان کردہ مفاہمت کے متعلق اپنی رائے کا پرزور طریق پر اظہار کریں۔ جن صوبوں میں مسلمانوں کو باعتبار آبادی اکثریت حاصل ہے، ان میں حصول اکثریت کے لیے اصرار ضروری ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ میں کسی طرح کی زاید از استحقاق نیابت کا حامی نہیں ہوں۔ مجوزہ کانفرنس میں پنجاب کے مسلمانوں کو یہ فیصلہ کرنا چاہیے کہ مندوبین کے متعلق ان کی روش کیا ہو گی، نیز یہ کہ ان کے کیے ہوئے سمجھوتے کو قبول کر لینا چاہیے یا مسترد کر دینا چاہیے۔[1]

۲۲/ نومبر کو سالک اور مہر کو لکھا، "کل برکت علی محمڈن ہال میں مجوزہ کانفرنس کے متعلق جلسہ ہے۔ اگر تجویز متفقہ طور پر قرار پا گئی تو استقبالیہ کمیٹی وہیں بن جائے گی۔"[2]

۲۳/ نومبر کو جلسے کا وقت صبح گیارہ بجے تھا۔ تئیس افراد شامل ہوئے اور کانفرنس کی مجلسِ استقبالیہ کے رُکن قرار پائے — علامہ؛ سالک؛ مہر؛ محمد علی، امیر جماعت احمدیہ (لاہوری گروپ)؛ خان سعادت علی خاں رئیس اعظم؛ حکیم محمد شریف؛ مولانا غلام محی الدین؛ میاں حق نواز؛ حاجی میر شمس الدین (بانی انجمن حمایت اسلام)؛ سید محسن شاہ؛ ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین؛ مولوی فضل الدین؛ سردار حبیب اللہ خاں؛ ملک محمد دین؛ میاں فیروز الدین؛ مولانا سید حبیب شاہ؛ سید مراتب علی شاہ گیلانی؛ فضل کریم؛ عبداللہ؛ محبوب الٰہی؛ خان بہادر میر عزیز الدین؛ خانصاحب خیر الدین؛ مجید ملک مدیر مسلم آؤٹ لک۔ علامہ صدر، مجید ملک سیکرٹری اور خان سعادت علی خان فنانشل سیکرٹری ہوئے۔ علامہ نے کہا، "حالات حاضرہ کے اعتبار سے شمالی ہند کے مسلمانوں کی ایک خاص کانفرنس کا انعقاد

---

[1] انقلاب ۲۳/ نومبر ۱۹۳۰ء؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتار اقبال، ص ۱۱۱-۱۰۹

[2] برنی (۱۹۹۳)، کلیاتِ مکاتیبِ اقبال سوم، ص ۱۷۸-۱۷۷

ضروری ہے جس میں صوبہ سرحد، بلوچستان، پنجاب وسندھ کے نمایندے شریک ہوں اور ان صوبوں کے مسلمانوں کو اسلامی حقوق کے حصول کے لیے منظم بنانے اور ان میں جوش عمل پیدا کرنے کی تدابیر اختیار کی جائیں۔"[1]

اگلی شام ساڑھے چھ بجے لاہور کے وائی ایم سی اے ہال میں جلسہ ہوا۔ جسٹس سر شیخ عبدالقادر نے علامہ کی فارسی شاعری پر مضمون پڑھا۔ ڈاکٹر گوکل چند نارنگ نے صدارت کی۔ عبدلقادر نے کہا، "اقبال زمانہ ٔ آیندہ کا شاعر ہے جو بین الاقوامیت کو قوم پرستی کے تنگ خیال پر ترجیح دیتا ہے اور جو زیادہ آزاد اور زیادہ اُمید افزاانسانیت پر نظریں جمائے ہوئے ہے۔" ڈاکٹر گوکل چند نارنگ نے کہا:

> علامہ اقبال نے مسلمانانِ ہند کی مردہ ہڈیوں میں ایک نئی روحِ حیات پھونک دی ہے... افسوس میرا ملک اور میری قوم کسی ہندو اقبال کو پیدا نہ کر سکی جو ہندوستان کے ہندوؤں کی مردہ ہڈیوں میں بھی از سرِ نو تازگی ٔ حیات پیدا کر دیتا... اقبال جغرافیائی قومیت پرستی سے اظہارِ نفرت کر کے 'بین الاقوامیت' کا جو وعظ فرماتے ہیں، اُس سے مجھے کامل اتفاق ہے لیکن میں یہ نہیں سمجھ سکتا کہ اقبال نے بین الاقوامی اخوت کے متعلق اپنے مطمحِ نظر کو صرف ایک مذہب کے پیروؤں تک محدود کیوں رکھا اور اُس میں سارے عالمِ انسانیت کو کیوں شامل نہ کیا... سر عبدالقادر کو چاہیے کہ اس معاملے میں میرا اطمینان کرادیں۔

ڈاکٹر نارنگ نے جلسے میں موجود کسی صاحب کا حوالہ دیا جو کہہ رہے تھے کہ ٹیگور نے تمام انسانوں کی اخوتِ عامہ کا درس دیا ہے اور اس معاملے میں ٹیگور اقبال سے زیادہ بلند ہے۔ شیخ عبدالقادر نے یہ بحث کسی اور موقع کے لیے رکھ چھوڑی۔[2]

۲۵ نومبر کو ڈی اے وی کالج ہال میں جلسہ ہوا۔ علامہ نے صدارت کی۔ پنڈت برج موہن

---

[1] ۲۵ نومبر ۱۹۳۰ء؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۱۱۲-۱۱۱

[2] حمزہ فاروقی، حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے، ص ۱۰۶-۱۱۳

کیفی نے 'اُردو شاعری میں انقلاب' پر مقالہ پڑھا۔[1]

اُنہی دنوں جسٹس آغا حیدر کی صدارت میں 'اقبال و ٹیگور اور اُن کا تصوف' پر لیکچر ہوا۔ آغا نے اپنے صدارتی ریمارکس میں تصوف پر روشنی ڈالی اور کہا کہ اقبال اور ٹیگور دونوں کے حق میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔ انقلاب میں کسی مجذوب عدم آبادی نے لکھا کہ عبدالقادر اور آغا جج ہیں۔ اقبال اور ٹیگور کے موازنے پر اپنا فیصلہ "محفوظ" رکھا۔ مگر "اقبال کا تصوف جو کچھ بھی ہے، وہ اُن کے مطبوعہ انگریزی لیکچروں میں آ چکا ہے۔ شاعری سے اُسے اخذ کرنے کی تکلیف کی ضرورت نہیں رہی۔"[2]

علامہ کو معلوم ہوا کہ انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کے ۲۳ر نومبر کے اجلاس میں وہ جنرل کونسل اور کالج کمیٹی کے رُکن مقرر کیے گئے۔ ۳۰ر نومبر کو معذرت کرتے ہوئے لکھا، "غیر حاضریوں کی وجہ سے میں اس امر کا مستحق نہیں تھا کہ مجھے دوبارہ انتخاب کیا جاتا لہٰذا میں ملتمس ہوں کہ میری جگہ کسی اور صاحب کو منتخب کیا جائے جو باقاعدہ حاضر ہوا کریں۔ اگر مجھے اعتماد ہوتا کہ آیندہ حاضر ہو سکوں گا تو یہ عریضہ نہ لکھتا لیکن کئی وجوہ سے اس باقاعدگی کا یقین نہیں..." انجمن کی جنرل کونسل کے اجلاس میں خط پیش کیا گیا۔ شیخ عبدالقادر نے کہا، "ہمارے خیال میں ایسے اصحاب کا ممبر رہنا انجمن اور ہمارے لئے باعثِ عزت ہے۔ ہم ان کو جُدا نہیں کر سکتے۔" حاجی محمد حفیظ نے تحریک کی کہ علامہ اقبال کو انجمن کا لائف پریذیڈنٹ بنایا جائے۔ شیخ عبدالقادر اور حاضر ممبران نے تائید کی۔ قلمی روداد میں لکھا گیا، "ڈاکٹر شیخ سر محمد اقبال صاحب لائف پریذیڈنٹ انجمن منتخب کیے جائیں۔"[3]

افغانستان سے علامہ کے نام اعلیٰ حضرت نادر شاہ غازی کا خط شہزادہ احمد علی جان کے ہاتھ پہنچا۔ ۲۹ر نومبر کو لکھا گیا تھا۔ فارسی میں تھا۔ انقلاب نے ترجمے کے ساتھ شائع کیا:

افغانستان کے لیے آپ ہمیشہ جن صمیمانہ احساسات کا اظہار فرماتے ہین اور دورِ

---

[1] ایضاً، ص ۱۰۶

[2] ایضاً، ص ۱۱۲-۱۱۳ بحوالہ انقلاب ۱۱ر دسمبر ۱۹۳۰ء

[3] محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶)، اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص ۱۲۱

انقلاب میں آپ کی طرف سے اور ہندوستان کے مسلمان بھائیوں کی طرف سے ہمدردی و دوستی کے جن جذبات کا عملی اظہار ہوا ہے، اُن کے لیے میں ممنون ہوں اور ملّتِ افغانستان بھی ہندوستان کے مسلمان بھائیوں کی ہمدردی کی ممنون ہے۔

خدا کا شکر ہے کہ میری حالت بہت اچھی ہے۔ میرے وطنِ عزیز کے حالات رُو بہ ترقی ہیں۔ آپ اطمینان رکھیں۔[1]

28

سارنگ پنجابی رسالہ تھا۔ ایک ہندو نوجوان ایس ایل پراشر مدیر تھے۔ دسمبر کے شمارے میں ان کا مضمون 'سر اقبال دے نال میل' شائع ہوا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ پہلے علامہ کی کوٹھی کی بیٹھک میں ملاقات ہوئی تھی۔ گفتگو پنجابی ہی میں ہوئی ہو گی۔ پراشر نے چودھری محمد حسین سے سُن رکھا تھا کہ علامہ پنجابی شاعری سننے پڑھنے کا شوق رکھتے ہیں۔ ایک دفعہ غلام قادر کی چٹھیاں سنتے ہوئے رو پڑے تھے۔ پراشر سے کہا کہ عام طور پر کم پڑھے لکھے لوگ ہی پنجابی کو پڑھتے لکھتے رہے ہیں۔ اس لیے یہ اس وقت علمی زبان نہیں ہے۔ اس میں ''جٹکا پن'' یعنی گنوار پن بہت ہے۔ نثر کم ہے۔ شاعری میں ''بنتر'' (form) پر کافی زور نہیں دیا جاتا۔ بحروں کا لحاظ قائم نہیں رہتا۔ تشبیہات میں بعض اوقات مذاق پست ہو جاتا ہے۔ پھر بھی پنجابی شاعری اعلیٰ شاعری ہے۔ اس میں صوفیانہ اشعار، وطن کی محبت کے پرجوش گیتوں، فوجی گیتوں، عام لوگوں کے گیتوں اور ''بولیوں'' کی کوئی کمی نہیں۔ یہ شاعری جذبات میں بھیگی ہوئی ہے۔ زبان بڑی سیدھی سادھی، نرم اور میٹھی ہوتی ہے۔ جذبات سچے ہوتے ہیں۔ بڑے کھلے الفاظ میں بیان کیے جاتے ہیں۔ یہ چیزیں اُردو میں موجود نہیں یا بہت کم ہیں۔ اُردو شاعری میں قوّت اور پاکیزگی ضرور ہے جسے پنجابی میں بھی پیدا کرنا چاہیے۔ پڑھے لکھے آدمیوں کی ہمت سے اس زبان میں لطافت اور نزاکت پیدا کی جا سکتی ہے۔ بہاولپور کے شاعر احمد یار نے تھوڑی بہت ہمت کی ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ نثر کے لکھے جانے سے یہ علمی زبان نہ بن سکے۔ پراشر نے خلاصہ

---

[1] ۱۴/ دسمبر ۱۹۳۰ء؛ حمزہ فاروقی، اقبال کا سیاسی سفر، ص ۲۰۵-۲۰۴ پر سال غلطی سے ۱۹۲۸ء لکھا گیا ہے۔

یوں سمجھا کہ ''پنجابی شاعری کی بنیاد عام لوگوں کی زندگی پر ہے اور اُردو شاعری کی بنیاد امیروں اور مصاحبوں کی زندگی پر۔''

پراشر نے پوچھا، ''کیا آپ نے یہ محسوس نہیں کیا تھا کہ اپنی شخصیت کا پورا اظہار اپنی زبان کے سوا اور کسی زبان میں نہیں ہو سکتا؟'' علامہ نے جواب دیا، ''میں نہیں مان سکتا کہ اپنی زبان کے سوا آدمی اور کسی زبان میں اپنا مطلب پوری طرح بیان نہیں کر سکتا... خواہ کوئی زبان ہو صرف مشق ہونی چاہیے... اصل چیز تو خیال ہے۔'' پراشر نے کہا، ''کیمبرج یونیورسٹی کے پروفیسر رچرڈ کا خیال ہے کہ کوئی بدیشی آدمی کسی دوسرے ملک کی شاعری سے پوری طرح لطف نہیں اُٹھا سکتا۔'' اس پر علامہ نے کہا، ''میں ایسی شاعری کو شاعری نہیں سمجھتا۔ اصل شاعری روح کی شاعری ہے اور وہ ساری دنیا کے لیے ہوتی ہے۔''

علامہ نے سورۂ آلِ عمران کی آیت پڑھی جس میں اہلِ کتاب کو مسلمانوں کے ساتھ توحید پر متفق ہونے کی دعوت دی گئی تھی۔ مطلب یوں سمجھایا، ''ہم سب خدا کو مانتے ہیں۔ ہمیں مل جل کر رہنا چاہیے۔ اس لحاظ سے جو بھی خدا کو مانتا ہے، وہ مسلمان ہے۔'' پراشر نے پوچھا، ''تو پھر آپ کی شاعری میں خطاب ایسے ہی مسلمانوں سے ہوتا ہے؟'' علامہ کا جواب تھا، ''ہاں آپ نے ٹھیک بوجھ لیا ہے... میں اپنے ہندو اور سِکھ دوستوں سے کہا کرتا ہوں کہ آپ [میرے اشعار میں] مسلمان ہادیوں اور پیغمبروں کے ناموں کی جگہ شوق سے ہندو اور سِکھ بزرگوں کے نام استعمال کر لیا کیجیے۔'' پراشر نے مضمون میں لکھا:

> آج ڈاکٹر سر اقبال کا نام دنیا میں بڑے فخر سے لیا جاتا ہے۔ سارے ہندوستان کو اس کی ذات پر ناز ہے۔ واقعی اقبال نے پنجاب کو سر اونچا کرنے کے قابل بنا دیا ہے، لیکن عجیب بات یہ ہے کہ ہم لوگوں کو بہت کم یہ خیال آتا ہے کہ اقبال پنجاب کا رہنے والا اور پورا پکا پنجابی ہے... اس کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اُس کی شاعری کا پیغام کسی

خاص ملک کے لوگوں کے لیے نہیں، بلکہ ساری دنیا کے لیے ہے۔[1]

جرمن مصنف جوزف ہل (Joseph Hell) کی جرمن کتاب تہذیبِ عرب کئی زبانوں میں ترجمہ ہو رہی تھی۔ علامہ کے نام اُن کا خط آیا۔ ری کنسٹرکشن کے بارے میں لکھا تھا:

Your book is one of the most important phenomena in modern times.[2]

29

۲؍ دسمبر کو وائسرائے لارڈ اِروِن مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں تھے۔ اپنے خطاب میں کہا کہ ہندوستان کی ملّتِ اسلامیہ کو قابل رہنماؤں کی جتنی ضرورت آج ہے پہلے کبھی نہ تھی۔[3]

بابا خلیل احمد بنارس کے ایک ممتاز مسلمان تھے۔ تحریکِ صلوٰۃ قائم کر رکھی تھی۔ بنارس میں وکٹوریہ پارک کے علاقے میں جماعتِ خدامِ اسلام کا دفتر تھا۔ اُس سے وابستہ تھے۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس کرسمس کی چھٹیوں میں بنارس میں ہونے والا تھا۔ اُس کے مہمانوں کی میزبانی بابا خلیل نے اپنے ذمے لی تھی۔ ان دنوں اجمیر میں خواجہ معین الدین چشتی کی درگاہ پر تھے۔ مولوی یعقوب نے شمس الحسن کو دوڑایا۔ بابا خلیل سے درخواست کی گئی کہ مسلم لیگ کے سالانہ جلسے کی میزبانی بھی قبول کریں۔ مہمان زیادہ تر وہی ایجوکیشنل کانفرنس والے ہوں گے۔ اس لیے خرچہ زیادہ نہ ہو گا۔ کچھ مہمانوں کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ تب بابا خیل کی عظمت مسلمانوں کی نگاہ میں اور بھی بڑھ جائے گی۔ مسلم لیگ حکومت کی مخالف نہیں ہے۔ کانگریس کی عدم تعاون تحریک کی مذمت کرتی ہے۔ گورنمنٹ کے اعلیٰ حکام بھی اچھی نظر سے دیکھیں گے۔ بابا خلیل نے اجمیر سے خط لکھا۔ حامی بھر لی تاکہ مسلمان "اپنے انتشار کو دُور کر کے متحد ہوں اپنی کھوئی ہوئی عظمت کو حاصل کریں اور نصرت اور فتح کے وارث بنیں۔" مولوی یعقوب نے اخبارات کو خبر بھجوائی۔ ۴؍ دسمبر کے انقلاب

---

[1] حامد علی خاں، 'سر اقبال دے نال میل'، ص ۳۳-۲۸

[2] مکتوب بنام نذیر نیازی ۱۱؍ دسمبر ۱۹۳۰ء؛ برنی، کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۱۸۵

[3] Lord Irwin (1931), pp.259, 263 خطبۂ الٰہ آباد میں حوالہ دیا گیا۔ دیکھیے ۲۹؍ دسمبر ۱۹۳۰ کے واقعات

میں بھی شائع ہوئی۔[1]

بالائی ہند کے مسلمانوں کی کانفرنس کے بارے میں کچھ لوگ سوال اُٹھا رہے تھے۔ مسلم اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو کیوں نظرانداز کیا جا رہا ہے؟ بنگال بھی مسلم اکثریتی صوبہ ہے۔ وہاں کے مسلمانوں کو دعوت کیوں نہیں دی گئی؟ سالک کے صاحبزادے عبدالسلام خورشید کہتے ہیں:

> حضرت علامہ کی طرف سے انقلاب نے پہلے سوال کا جواب دیا کہ ساری مخالفت مسلم اکثریتی صوبوں کے مسلمانوں کے خلاف مرتکز ہے۔ جہاں تک مسلم اقلیتی صوبوں کا تعلق ہے، وہاں کے مسلمانوں کو ویٹج یا پاسنگ (آبادی کے تناسب سے زیادہ نیابت) دینے پر نہ ہندوؤں نے کوئی خاص اعتراض کیا ہے، نہ حکومتِ ہند نے اور نہ سائمن کمیشن نے۔ ایسے میں مسلم اکثریتی خطوں کے رہنماؤں کے درمیان اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے مشاورت ضروری ہو جاتی ہے۔ دوسرے سوال کے جواب میں کہا گیا کہ بنگال کو محض اس لیے مدعو نہیں کیا گیا کہ فاصلے طویل ہیں۔ بہر حال اگر وہاں کے مسلمان ایسی ہی کانفرنس منعقد کریں تو شمالی خطے کے مسلمان ان کی ہر ممکن مدد کریں گے۔[2]

۴/ دسمبر کو علامہ اقبال کی کوٹھی پر بالائی ہند کے مسلمانوں کی کانفرنس کی مجلس استقبالیہ کا اجلاس ہوا۔ سیاست کے مدیر مولانا سید حبیب سیکرٹری منتخب ہوئے۔ طے پایا کہ اجلاس دسمبر کی بجائے جنوری کے آخری ہفتے میں لاہور میں ہو۔ اخبارات میں اپیلیں شائع کروائی جائیں۔[3]

دہلی میں نذیر نیازی خطبات کا ترجمہ کرتے ہوئے اکثر عبارتیں جامعہ ملیہ کے اساتذہ مولانا محمد السُّورتی اور مولانا اسلم جیراج پوری کو پڑھ کر سناتے تھے۔ تیسرے خطبے کے ابتدائی حصے میں آیۂ نور پر علامہ کا موقف سن کر مولانا اسلم نے کہا کہ ڈاکٹر صاحب نور کو مادی معنوں میں استعمال کر رہے ہیں۔

---

[1] Nadeem Shafiq Malik (2013), p.29, 276-283

[2] عبدالسلام خورشید، سرگذشتِ اقبال، ص ۱۱۲-۱۱۱۔ دونوں سوالات آج تک اٹھائے جا رہے ہیں لیکن سوال اُٹھانے والے عام طور پر اِن جوابات کا حوالہ نہیں دیتے جو بالکل شروع میں ہی فراہم کر دیئے گئے تھے۔

[3] انقلاب ۱۹/ دسمبر ۱۹۳۰ء؛ افضل (۱۹۸۶)، ص ۱۱۳-۱۱۲

اصرار کیا کہ اُن کا یہ خیال مصنف تک پہنچا دیا جائے۔ پہنچا دیا گیا۔[1] علامہ کی طرف سے ایک چیک جامعہ کے "بک ڈپو" کو بھیجا جا چکا تھا۔ مراد شاید مطبع جامعہ تھی۔ رسید نہ آئی تھی۔ ۹/ دسمبر کو علامہ نے تقاضا کرنے کے بعد لکھا:

> مولانا کا ارشاد بجا ہے۔ مگر اِس آیت کو تاریخی نقطۂ نگاہ سے دیکھنا چاہیے۔ اِس مضمون کی آیات قریباً تمام قدیم کتبِ سماوی میں موجود ہیں۔ اس کا مقصود یہ نہیں کہ خدا مادی معنوں میں نور ہے(Light dealt with in physical science)نور محض ایک استعارہ ہے جسے قدیم کتبِ سماوی میں *Pantheistic* اغراض کے لیے استعمال کیا گیا تھا یعنی وجودِ باری کی ہمہ گیر *pervasiveness* ظاہر کرنے کے لیے۔ قرآن نے میری رائے ناقص میں اس قدیم استعارہ کو وجودِ باری کی *absoluteness* پر اِشارہ کرنے کے لیے استعمال کیا ہے کیونکہ عالمِ مادی میں زمانہ حال کی تحقیق کی رُو سے صرف نور ہی ایک ایسی چیز ہے جو relatively absolute ہے– معلوم ہوتا ہے تیسرے خطبے میں جو کچھ آیت مذکورہ پر میں نے لکھا ہے آپ اُسے اچھی طرح سمجھ نہیں سکے ورنہ مولانا اسلم اِس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوتے کہ میرے خیال میں آیتِ قرآنی میں خدا تعالیٰ نے اپنے آپ کو نور (مادی معنوں میں) قرار دیا ہے۔[2]

علامہ نے یہ بھی لکھا کہ مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ بنارس میں ہو گا۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ پروگرام پھر بدل چکا ہے۔ مولوی یعقوب کو معلوم ہوا تھا کہ بابا خلیل نے صرف کھانے کی ذمہ داری لی ہے۔ مہمانوں کے خیموں کا کرایہ اور جلسہ گاہ میں کرسیوں کی فراہمی لیگ کے ذمے ہوں گی۔ کرایہ فی کرسی ایک آنہ یومیہ تھا۔ یہ اخراجات لیگ کی استطاعت سے باہر تھے۔ اسی وقت الہ آباد سے حاجی سید محمد حسین بیرسٹر کا تار آیا کہ تمام انتظامات کرنے پر تیار ہیں۔ جلسہ الہ آباد میں کیا جائے۔ ۱۰/

---

[1] سید نذیر نیازی، مکتوباتِ اقبال

[2] مکتوب بنام سید نذیر نیازی ۹/ دسمبر ۱۹۳۰ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۱۸۲–۱۷۹

دسمبر کو لیگ کی کونسل کا ہنگامی اجلاس ہوا۔ متفقہ فیصلہ ہوا۔ فوراً علامہ کو خبر دی گئی۔[1]

"میں نے مولانا کو حضرت علامہ کا مکتوب پڑھ کر سنا دیا،" نذیر کا بیان ہے، "اُن کی تسلی نہ ہوئی۔ فرمایا اللہ تعالیٰ کا اپنے آپ کا نور السمٰوٰت و الارض کہنا اس لیے نہیں کہ یہاں نور سے مراد وہ نور ہے جو مرئی کے ساتھ قائم ہے اور جسے قرآن پاک میں نصاً مخلوق کہا گیا ہے بلکہ یہ وہ نور ہے جو رائی کے ساتھ قائم ہے یعنی جس سے اس عالم کی ہستی محسوس ہوتی ہے... بیت سے مراد ہے دین، طاق سے مردِ مومن، زجاج سے ایمان، زجاجہ سے قلب، زیت سے آسمانی تعلیم۔" یہ تاویل خط کے ذریعے علامہ تک پہنچا دی گئی۔ کسی اور آیت کے بارے میں کوئی نکتہ بھی بھیجا۔ ۱۱ر دسمبر کو علامہ نے لکھا:

> آیہ نور کے متعلق میں نے جو کچھ لکھا ہے اُسے تاویل کہنا صحیح نہیں۔ تاویل کا لفظ اس وقت صحیح ہوتا ہے جب کسی آیت کے الفاظ کے عام معنی چھوڑ کر کوئی اور معانی لیے جائیں۔ میں نے تو لفظ نور کے وہی معنی لیے ہیں جن میں یہ لفظ عام طور پر لیا جاتا ہے۔ اگر آپ کہیں کہ اس آیہ میں نور علیٰ ہذا القیاس زجاج وغیرہ سے کچھ اور مراد ہے تو یہ تاویل ہو گی۔ میں نے اپنے تمام لیکچروں میں اِس قسم کی تاویل سے پرہیز کی ہے اور الفاظ کو اُنہی معنوں میں لیا ہے جن میں وہ عام طور پر مستعمل ہوتے ہیں۔ میرا عقیدہ یہ ہے کہ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی طریق تھا۔ یہی طریقِ بحث ابن حزم کا ہے ... باقی رہی دوسری آیت جس کا ذکر آپ نے اپنے آخری خط میں کیا ہے سو عرض یہ ہے کہ ایک اعتبار سے یہ کہنا بالکل درست ہے کہ کائنات کے تمام حوادث پہلے سے متعین ہیں۔ میرے لیکچروں کا مشکل ترین حصہ غالباً یہی بحث ہے۔ اس کو غور سے پڑھنا چاہیے۔ میں نے اس حصہ میں eternity اور time کے تناقص کو رفع کرنے کی کوشش کی ہے۔ Time کے اعتبار سے حوادث متعین نہیں، eternity کے اعتبار سے ان کو متعین تصور کرنا بالکل بجا اور درست ہے۔ اس مسئلہ پر غالباً جدید سائنس مزید روشنی ڈال سکے گا Einstein سے اس بحث کا آغاز سمجھنا چاہیے۔

[1] Nadeem Shafiq Malik (2013), p.30-31

علما کے اعتراضات و استفسارات سے زیادہ سروکار نہ رکھنا چاہیے۔ آپ کو وضعِ اصطلاحات کی فکر کرنا چاہیے۔ آخر یہ مباحث فلسفیانہ ہیں اور فلسفہ ایک متحرک شے ہے۔ اس کی کوئی دلیل جیسا کہ میں نے دیباچہ میں لکھ بھی دیا ہے قطعی اور آخری قرار نہیں دی جا سکتی۔ علمِ انسانی کی ترقی کے ساتھ ساتھ انسانی تصوّرات بھی improve ہوتے جاتے ہیں۔ فلسفہ محض حقائق کو تصور کرنے کی کوشش کا نام ہے۔

یہ بھی لکھا کہ جلسہ الٰہ آباد میں ہو گا۔ ۲۷ ر تاریخ کو روانہ ہونے کا ارادہ تھا۔[1]

یوسف سلیم چشتی کا بیان ہے کہ ۱۳ ر دسمبر کو علامہ کی کوٹھی پر گئے۔ ہیگل کا ذکر ہوا تو علامہ نے کہا، ''حقیقی معنی میں صرف خدا ہی موجود ہے۔ انسان موجود ہونے کی کوشش کر رہا ہے۔'' یہ بھی کہا، ''موت بھی زندگی ہی کا ایک رُخ (aspect) ہے۔ اس لیے اُس سے ہراساں نہیں ہونا چاہیے۔''[2]

اپیل

از دفتر اَپر انڈیا مسلم کانفرنس لاہور مورخہ ۱۶ ر دسمبر ۱۹۳۰ء

برادران اسلام، السلام علیکم! آپ مسلم آؤٹ لک، سیاست، انقلاب اور دیگر اخبارات کے ذریعے سے یہ خبر سن چکے ہوں گے کہ جنوری ۱۹۳۱ء میں ہم لوگ لاہور میں مسلمانوں کے ایک اجتماع کا بندوبست کر رہے ہیں، جس کا نام بالائی ہند کے مسلمانوں کی کانفرنس (اپر انڈیا مسلم کانفرنس) تجویز کیا گیا ہے۔ اس اجتماع میں شمولیت کے لیے ہم (۱) شمال مغربی سرحدی صوبہ، (۲) بلوچستان، (۳) سندھ، اور (۴) پنجاب کے مسلمان نمایندوں کو دعوت دینا چاہتے ہیں اور جن نمایندوں کو مدعو کرنے کا ارادہ ہے ان کی تفصیل یہ ہے:

۱ ان صوبوں کے وہ مسلمان بزرگ جو کونسل آف سٹیٹ یا اسمبلی کے ارکان ہیں۔ ان صوبوں میں سے جن میں مجالس آئین ساز (کونسلیں) موجود ہیں ان کے مسلمان

---

[1] مکتوب بنام سید نذیر نیازی ۱۱ ر دسمبر ۱۹۳۰ء؛ برنی (۱۹۹۳) کلیات مکاتیبِ اقبال، سوم، ص ۱۸۷-۱۸۳

[2] ہاشمی و دیگر، اقبالیات کے سو سال، ص ۸۳

ارکان۔

۲ ان صوبوں میں جہاں ڈسٹرکٹ بورڈ یا بلدیات یا مشتہرہ علاقہ جات (نوٹی فائڈ ایریاز) یا پنچایتیں یا دوسری ایسی جماعتیں موجود ہیں جو بروئے قانون ملک معرض وجود میں آئی ہوں ان کے مسلمان ارکان۔

۳ مقتدر مسلم جماعتوں کے نمایندے۔

۴ دیگر معزز مسلمان اکابر۔

اس کانفرنس کے طلب کرنے کا مقصد یہ ہے کہ ان صوبجات کے مسلمانوں کو حالاتِ حاضرہ اور آج کی سیاسی تحریکات سے آگاہ کیا جائے اور ہماری ہمسایہ اقوام اور ہندوستان کی حاکم قوم کی حکمت عملی سے واقف کرکے ان خطرات سے آگاہ کیا جائے، جن سے اس وقت ملتِ مرحومہ دوچار ہے اور اس کے بعد مسلمانانِ ہند کی اس کثرت کو، جو ان صوبجات میں ہے، جن کو خدائے حکیم و علیم و خبیر نے یقیناً مصلحت، نہیں بلکہ کسی ایسی مصلحت کے لیے جو اربابِ دانش و بینش پر روز بروز عیاں ہوتی چلی جارہی ہے، یکجار کھا ہے؛ اور ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کے لیے سرگرمِ عمل ہونے کا پیغام دیا جائے۔

آپ جیسے باخبر حضرات کو خطاب کرتے ہوئے سیاسیاتِ حاضرہ پر تفصیلی بحث کرنے کی ضرورت نہیں۔ دور کیوں جایئے، نہرو رپورٹ کے اِجرا کے زمانے کے بعد سے جو سیاسی تغیر رونما ہوئے اور سیاسیات کے بحرِ زخار میں جو تموّج پیدا ہوئے آپ اُن کے اسباب و علل، تاثرات اور یقینی نتائج سے ناآگاہ نہیں ہوسکتے۔ آپ نے دیسی ریاستوں کے متعلق بٹلر کمیٹی کی رپورٹ اور ہندوستان کے آیندہ دستورِ اساسی کے انصرام کے واسطے سائمن کمیشن اور اس کی امدادی کمیٹیوں کی تگ و دو کا مطالعہ کیا ہوگا۔ اس کے بعد جس طرح سر جان سائمن نے دیسی ریاستوں اور برطانوی ہند کے اتحاد کی لم پیدا کی اور حکومتِ ہند نے سائمن رپورٹ پر تبصرہ کیا، اُس سے بھی آپ کا واقف ہونا غیر مشتبہ ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ جس وقت وائسرائے کے نامزد کردہ مسلمان مندوب گول میز کانفرنس کی شرکت کے لیے لندن کو سدھارے تھے تو ہم مسلمان چاہتے تھے کہ

۱ ہندوستان کا نظامِ حکومت فیڈرل ہو۔
۲ پنجاب و بنگال کی مسلم اکثریتیں قائم رہیں۔
۳ بلوچستان، سرحد اور سندھ کے مسلمان صوبوں کو مکمل اصلاحات ملیں۔
۴ وزارتوں اور ملازمتوں میں مسلمانوں کا حصہ بروئے دستورِ اساسی محفوظ کر دیا جائے۔
۵ شریعتِ حقّہ، تمدنِ اسلام، تعلیمِ اسلام اور مسلمانوں کا انفرادی قانون غیر مسلم دسترس سے بروئے دستورِ اساسی محفوظ کر دیا جائے۔
۶ غیر مصرحہ اختیارات (residuary powers) صوبجات کے قبضہ میں رہیں۔ اور
۷ مرکز کی مجالس آئین ساز اور وزارت میں ہمارا حصہ ایک تہائی ہو۔

یہ مختصر سی روئداد ہے ان مسلم مطالبات کی جو مسٹر جناح کے چودہ نکات یا دہلی کی اُس مشہور قرارداد کے نام سے معروف ہیں، جو سر آغا خان کی صدارت میں آل انڈیا مسلم کانفرنس ۱۹۲۹ء کے پہلے روز منظور کی گئی تھی۔ لیکن آج ہم دیکھتے ہیں کہ لندن میں دیسی ریاستوں کو فیڈرل نظامِ ہند میں شمولیت کی دعوت دی جارہی ہے اور دیسی ریاستوں کی طرح تمام برطانوی ہند کو اس نظام کا ایک صوبہ یا جزو تسلیم کرانے کی سعی کی جارہی ہے۔ اگر ایسا ہوا تو ہندوستان کے موجودہ صوبجات کی حیثیت وہی ہو گی جو پنجاب کے کسی ضلع کو اپنے صوبہ کے اندر حاصل ہے۔ یوں جہاں ہم مسلمان فیڈرل نظام کے تسلیم کیے جانے پر اظہارِ مسرت کر رہے ہیں وہاں ہم بلاشبہ اِس حقیقت سے ناآگاہ ہیں کہ اِس لفظی ٹٹی کی آڑ میں ہمیں شکار بنایا جارہا ہے۔ پھر جن صوبوں میں مسلمانوں کی تعداد اقلیت میں ہے ان کو قدرے زیادہ نشستیں دے کر شطرنجِ سیاست پر سکھوں کے مہرہ کو بڑھایا جارہا ہے۔ اور ہمیں شاہ مات دینے کی کوشش کی جارہی ہے۔

ڈاکٹر سر محمد اقبال؛ مسٹر مجید ملک مدیر مسلم آؤٹ لک؛ مولانا سید حبیب مدیر سیاست؛ خان سعادت علی خان؛ مولانا غلام رسول مہر؛ مولانا عبدالمجید سالک؛ مولوی محمد علی؛ حکیم محمد شریف؛ مولانا غلام محی الدین؛ ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین؛ مسٹر عبداللہ؛ مولوی محبوب الرحمن؛

خان بہادر میر عزیز الدین[1]

30

علامہ نے خطبۂ صدارت گوراں دِتا کپور کے کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس میں شائع کروایا۔ تاریخ نہ چھپوائی۔ مقرر نہ ہوئی تھی۔[2] طے ہو چکا تھا کہ مہر ترجمہ کر کے انقلاب میں شائع کریں گے۔[3]

شمس الحسن کے خیال میں محمد حسین بیرسٹر کچھ زیادہ مستعد ثابت نہ ہوئے تھے۔ لیگ کا جلسہ ۲۸ / اور ۲۹ / دسمبر کو ہونا تھا۔ ۲۲/ دسمبر تک تاریخ حتمی نہ ہوئی تھی۔ شہر میں اعلانات نہ ہوئے تھے۔ شمس الحسن نے مولوی یعقوب کو لکھا کہ جلسہ ملتوی کیا جائے۔ اگلے برس مارچ میں ہو۔ یعقوب آمادہ نہ ہوئے۔ فوراً الٰہ آباد پہنچنے کو کہا۔[4] لاہور میں ۲۵/ دسمبر کے انقلاب نے خبر شائع کی کہ جلسے کی تاریخیں ۲۹، ۳۰/ اور ۳۱/ دسمبر ہیں۔ علامہ ۲۷/ کی شام روانہ ہوں گے۔[5]

۲۶/ دسمبر کو تین بجے بعد دوپہر لاہور کے ٹاؤن ہال میں جلسہ ہوا۔ علامہ موجود تھے۔ تین روز قبل پنجاب یونیورسٹی کنووکیشن میں ایک طالب علم نے گورنر پر گولی چلائی تھی۔ گورنر کی کمر اور بازو پر زخم آئے۔ پولیس کے دو افسر اور ایک لیڈی ڈاکٹر بھی زخمی ہوئے۔ جلسہ مذمت میں تھا۔ میاں عبدالعزیز صدر بلدیہ نے صدارت کی۔ حملے کی مذمت کی۔ زخمیوں سے ہمدردی کی دو قراردادیں پیش کیں۔ خان بہادر سردار حبیب اللہ، سنگدت رامپوری، کپتان سکندر حیات خاں، میاں شاہنواز، ملک فیروز خاں نون اور اوون رابرٹس (Owen Roberts) نے تقاریر کیں۔ آخر میں علامہ نے کہا، ”نہ صرف اِس وجہ سے کہ ایسے افعال امنِ عام کے لیے نقصان دہ اور سیاسی بےچینی اور اختلال کا موجب ہوتے ہیں بلکہ اِس وجہ سے بھی یہ فعل قابلِ نفرین ہے کہ یہ واقعہ ہماری بہترین فلسفیانہ روایات کے

---

[1] انقلاب ۱۹ دسمبر ۱۹۳۰ء؛ محمد رفیق افضل (۱۹۸۶) گفتارِ اقبال، ص ۱۱۶-۱۱۲

[2] ایک نسخہ اقبال اکادمی پاکستان کی لائبریری میں موجود ہے۔

[3] مکتوب بنام مولوی یعقوب ۴/ اگست ۱۹۳۰ء

[4] Nadeem Shafiq Malik (2013),pp.321-326

[5] حمزہ فاروقی، اقبال کا سیاسی سفر

خلاف ہے۔ اس لیے ایسے ذرائع اختیار کرنے چاہئیں کہ ایسے واقعات ناممکن ہو جائیں۔"[1]

اُسی روز انجمن حمایت اسلام کی جنرل کونسل کا اجلاس شیخ عبد القادر کی صدارت میں ہوا۔ طے پایا کہ علامہ اگلے روز انجمن کے سالانہ جلسے میں نواب بہاولپور کو سپاسنامہ پیش کریں۔[2]

31

اس برس شائع ہونے والی ایک کتاب مصنف نے لاہور کے کسی سید محمد محسن شاہ ایل ایل بی کو پیش کی اور بعد میں کبھی اقبال کے ذخیرۂ کتب میں شامل ہوئی۔ احمدی موقف پر مبنی تھی:

Maulvi Mustafa Khan, B.A., M.R.A.S., The Kingdom of Heaven. Islamic World Library, Lahore

اس برس شائع ہونے والی دوسری کتابیں جو کبھی اقبال کے ذخیرۂ کتب میں شامل ہوئیں یہ ہیں:

Margaret Smith. An Introduction to the History of Mysticism. Macmillan, London

Sir Mohammad Shafi. Some Important Indian Problems. Modern Electric Press, Lahore

Harry Elmer Barnes. World Politics in Modern Civilization: the contributions of Nationalism, Capitalism, Imperialism and Militarism to Human culture and International anarchy. Alfred A. Knoff, New York

Ludwell Denny. America Conquers Britain - a record of economic war. Alfred A. Knoff, London

A. M. Ghani. A History of Persian Language and Literature at the Mughal Court (with a brief survey of the growth of Urdu language) Babur toAkbar - Part II: Humayun. Indian Press, Allahabad

A. M. Ghani. A History of Persian Language and Literature at the Mughal Court (with a brief survey of the growth of Urdu language) Babur toAkbar - Part III: Akbar. Indian Press, Allahabad[3]

32

۲۷ دسمبر کو ریاست بہاولپور کے حکمراں اعلیٰ حضرت رکن الدولہ حافظ الملک نصرت جنگ مخلص

---

[1] انقلاب ۲۷ دسمبر ۱۹۳۰ء۔ بشکریہ امجد سلیم علوی

[2] محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶)، اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص ۱۲۱

[3] Muhammad Siddique, *Descriptive Catalogue*

الدولہ ہز ہائی نس کیپٹن حاجی نواب سر صادق علی خاں عباسی خامس، کے سی ایس آئی، کے سی وی او انجمن حمایتِ اسلام کے سالانہ جلسے کی صدارت کے لیے تشریف لائے۔ نواب بہاولپور کا تعلق خلفائے بنو عباس کے خاندان سے تھا۔ ریاست بہاولپور مدت سے انجمن حمایت اسلام کی مالی امداد کر رہی تھی۔ ۱۹۰۸ء میں اسلامیہ کالج کی تعمیر کے لیے پچھتر ہزار اور ہوسٹل کی تعمیر کے لیے یکمشت تیس ہزار دیئے۔ دو ہزار روپے سالانہ بھی مل رہے تھے۔

خیر پور کے میر اور نواب ڈھاکہ بھی موجود تھے۔ شیخ عبدالقادر نے انجمن حمایت اسلام کے اراکین اور لاہور کے مسلمانوں کی طرف سے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا، "قبل اس کے کہ سر شیخ محمد اقبال ایڈریس پیش کریں، میں چند الفاظ کہنا چاہتا ہوں۔ یہ بات ہمارے لیے صد گونہ موجبِ افتخار ہے کہ آج یہاں قرآن السعدین دو تاجوَر [بہاولپور اور خیر پور] جلوہ فرما ہیں۔ نیز یہ بات بھی قابلِ فخر ہے کہ نواب صاحب ڈھاکہ تحریکِ صدارت فرمائیں گے۔"

علامہ نے سپاس نامہ پڑھا۔ "لاہور شاداں ہے کہ آج اُسے شمالی ہند کے سب سے بڑے اسلامی فرمانروا کی پابوسی کا شرف حاصل ہے،" علامہ نے کہا، "علوم و فنون نے عباسیوں کے ظلِ عاطفت میں جنم لیا اور عباسیوں ہی کے دودمانِ بخشش و نواش میں ان کا نشو و نما ہوا۔۔۔ اس لیے کہ یہ دُودمانِ عالی افقہُ الناس حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی یادگار ہے جنہیں خواجۂ دوجہاں سرورِ عالم و عالمیان صلی اللہ علیہ وسلم نے خیرُ الاُمت کے لقب سے ممتاز فرمایا اور افتاحِ ابوابِ علم کی وغا سے شرف بخشا۔ ہم اِس مبارک وقت اور سعید تقریب پر جتنا بھی فخر کریں بجا ہے کہ ہماری گردنیں آج اُس جواں بخت فرمانروا کی بارگاہ میں جھک رہی ہیں۔۔۔" انجمن حمایت اسلام کے بارے میں کہا:

> انجمن حمایتِ اسلام پرورشِ علم و فن کی انہی فقید المثال روایات کو زندہ رکھنے کے لیے کوشاں ہے جو سب سے بڑھ کر دودمانِ عالیہ عباسی کی ممنونِ احسان ہیں۔ چھیالیس سال ہوئے کہ چند دردمندانِ قوم نے نہایت ہی حقیر سامان کے ساتھ اِس انجمن کی بنیاد ڈالی تھی۔ آج خدا کے فضل و کرم سے اس کے ارکان کی تعداد چار ہزار ہے۔ اس کے مختلف علمی ادارات میں پانچ ہزار لڑکے اور لڑکیاں علم کی دولت سے مالامال ہو رہے

ہیں۔ اس کا ایک عظیم الشان کالج ہے۔ چار ہائی سکول ہیں۔ دو مڈل سکول، ایک زنانہ مڈل سکول، چھ زنانہ مدارس ہیں۔ ایک طبیہ کالج ہے، ایک جی اے وی ٹریننگ کالج ہے۔ ایک مردانہ یتیم خانہ ہے، ایک زنانہ یتیم خانہ۔ علاوہ ازیں انگریزی و یونانی شفاخانے ہیں۔ اخبار حمایتِ اسلام ہے۔ کالج کی ایک عظیم الشان لائبریری ہے جو ہماری بے بضاعتی کے باوجود صوبے کے تمام سرکاری و غیر سرکاری ادارات کے کتب خانوں میں خاص حیثیت رکھتی ہے۔ ایک ادارۂ تالیف و طبع ہے جس کے زیرِ اہتمام دینیات اور اُردو فارسی کی مفید کتب کا وسیع سلسلہ مرتب ہو کر چھَپ چکا ہے اور اِس وقت مختلف مدارس میں بطور نصاب رائج ہے۔ ایک وسیع مطبع ہے۔ حال ہی میں انجمن نے اشاعتِ اسلام کالج کے نام سے ایک نئی درسگاہ قائم کی ہے، جس میں طلبہ کو دینی تعلیم دی جائے گی اور ان کو اشاعتِ اسلام کے اہم مقاصد کے لیے تیار کیا جائے گا۔ اس درسگاہ کے فارغ التحصیل طلبہ جہاں دینیات کے ماہر ہوں گے وہاں جدید مغربی علوم سے بھی انہیں واقفیت حاصل ہو گی اور اس طرح تبلیغ و اشاعت کے فریضہ کو بطریقِ احسن انجام دینے کا راستہ صاف ہو جائے گا۔ اِس وقت انجمن کا خرچ کم و بیش چھ لاکھ روپے سالانہ ہے اور سالِ آیندہ کی آمد و خرچ کا اندازہ دس لاکھ کے قریب کیا گیا ہے... لیکن ابھی بہت سی نئی منزلیں درپیش ہیں...

اولاً ایک انڈسٹریل کالج اور سائنٹیفک ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ کا قیام ہے۔ آج محض علوم کی تعلیم قوم کی تمام ضروریات کی کفیل نہیں بن سکتی۔ جب تک صنعت و حرفت کی تعلیم کا اعلیٰ پیمانہ پر انتظام نہ کیا جائے گا۔ نہ افرادِ قوم کا معتدبہ حصہ بیکاری و بیروزگاری کی مصیبت سے نجات پائے گا۔ نہ قوم زمانہ حاضرہ کی ضروریات کے مطابق ترقی کے مراحل خوش اسلوبی سے طے کر سکے گی۔

ثانیاً اِس بات کی ضرورت ہے کہ شہر سے باہر اسلامیہ کالج کے لیے ایک وسیع عمارت کا انتظام کیا جائے۔ اِس لیے کہ موجودہ عمارت کالج کے طلبہ کی روزافزوں تعداد

کے لیے کافی نہیں ہے۔

ثالثاً انگریزی وضع کے ایک پبلک سکول کا قیام ضروری ہے جس میں عام تعلیم کے ساتھ ساتھ اعلیٰ انداز کی تربیت بھی ہوتی رہے۔

رابعاً ایک زنانہ ہائی سکول فی الفور بن جانا چاہیئے جو ایک اسلامی زنانہ کالج کے لیے اساس کا کام دے سکے۔

''یہ انجمن کی فوری ضروریات ہیں،'' علامہ نے کہا، ''خدا کے فضل و کرم سے اُمید ہے کہ انجمن کی تازہ ضروریات بھی اسی طرح پوری ہو جائیں گی جس طرح کہ اب تک اور صدہا ضروریات پوری ہوتی رہی ہیں۔ علمی اعتبار سے عباسی فرمانرواؤں کا فیض ہمیشہ عام رہا ہے۔۔۔''

نواب بہاولپور نے پچیس ہزار روپے کا عطیہ عنایت فرمایا۔ نواب ڈھاکہ نے تقریر کی۔ ہائی کورٹ کے ریٹائرڈ جج خان بہادر مرزا ظفر علی نے تحریکِ صدارت پیش کی۔ حاضرین نے اللہ اکبر کے نعرے لگائے۔ نواب بہاولپور کرسیٔ صدارت پر بیٹھے۔ علامہ نے ایک غریب مسلمان کی طرف سے ایک جائے نماز اور مسلمانانِ لاہور کی طرف سے قرآن پاک کے تحائف پیش کرتے ہوئے کہا:

سرکارِ والا! شہر لاہور کے مسلمانوں نے مجھے ہدایت کی ہے کہ میں کلامِ الٰہی کا ایک نسخہ بطور ہدیہ آپ کو پیش کروں۔۔۔ یہ وہ مبارک کتاب ہے جس سے عزیز متاع مسلمانانِ عالم کے پاس موجود نہیں۔ یہ پیش کش ایسی ہے جیسے کہ اپنے محبوب کے سامنے کوئی اپنا دل نکال کر رکھ دے۔ اِس تحفہ کو آپ کے لیے منتخب کرنے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ آپ کے جدِ امجد اِس کتاب کے سب سے پہلے محقق تھے۔ میری مراد حضرت ابنِ عباسؓ سے ہے۔۔۔ مسلمانانِ پنجاب بلکہ مسلمانانِ عالم اگر آپ سے محبت سے رکھتے ہیں تو اِس کی وجہ صرف یہ ہی نہیں کہ آپ ایک بڑی اسلامی ریاست کے فرمانروا ہیں بلکہ اس کی وجہ یہ بھی ہے کہ آپ دینی اعتبار سے ہمارے بزرگ اور مخدوم ہیں۔

نواب بہاولپور نے سیدھے کھڑے ہو کر تحفہ قبول کیا، بوسہ دیا اور آنکھوں سے لگایا۔[1]

33

پرانے دیوتا سجدے میں گرے ہوئے تھے۔ مولانا روم نے زندہ رُود سے کہا، ''اُٹھو بیٹا! میرا دامن پکڑ لو۔'' جاوید نامہ کے تیسرے باب میں سیارۂ زہرہ کی سیر دو حصوں پر مشتمل تھی۔ پہلے حصے میں مولانا روم زبورِ عجم کی غزل سنا کر پرانے دیوتاؤں کو شکست دے چکے تھے۔ دوسرے حصے میں ایک سبز سمندر تھا۔ اس میں موت کا ٹھہراؤ تھا۔ کوئی لہر، کوئی حرکت نہ تھی۔ پانی ہوا جیسا تھا۔ تہہ در تہہ اندھیرا تھا۔ مولانا روم نے سورۂ طٰہٰ کی تلاوت کی۔ اس میں موسیٰؑ اور فرعون کا قصہ بیان ہوا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے سمندر کا سینہ چاک کیا تھا۔ مولانا روم بھی علامہ کا ہاتھ پکڑ کر اُنہیں سمندر کی تہہ میں لے گئے۔ وہاں فرعون اور برطانوی افواج کا سابق کماندارِ اعلیٰ لارڈ کچنر حیران پریشان موجود تھے—خدائے غائب کے منکر اور بتانِ حاضر کے پجاری، ایک مشرق سے اور دوسرا مغرب سے۔ دونوں ہی سمندر میں غرق ہو کر مرے۔ فرعون کو حضرت موسیٰ سے جنگ مہنگی پڑی۔ کچنر نے سوڈان کی تحریکِ آزادی سختی کے ساتھ کچل ڈالی۔ کہتے تھے کہ مجاہدِ آزادی مہدی کا مزار بھی کُھدوایا۔

مولانا روم کی تلاوتِ قرآن سے زہرہ کے سمندر میں روشنی ہوئی تو فرعون اور کچنر حیران ہوئے۔ مولانا روم نے کہا، ''یہ روشنی یدِ بیضا کی ہے۔'' وہ حضرت موسیٰؑ کا معجزہ تھا۔ اُن کے ہاتھ سے روشنی پھوٹتی تھی۔ فرعون نے سرد آہ بھری اور کہا، ''میں نے اُس نُور کو پہچاننے میں غلطی کی اور عقل و دین کی بازی ہار بیٹھا۔ اے بادشاہو! اے خسارے کا سودا کرنے والو! میری طرف دیکھو۔ ایک لالچ سے اندھی قوم ہمارے مقبرے کھود کر ہیرے جواہرات لے اڑتی ہے۔ ہماری لاش عجائب گھر میں رکھی ہے۔ اُس کے خاموش ہونٹوں پر ایک کہانی ہے۔ ملوکیت کے راز فاش کر رہی ہے۔ اندھوں کی آنکھیں کھول رہی ہے۔ ملوکیت کا اصلی منصوبہ کیا ہے؟ تفرقہ پیدا کرنا۔ نفاق کی تدبیر سے اپنے قدم مضبوط کرنا۔ اگر میں دوبارہ کلیم اللہؑ کی زیارت کروں تو اُن سے ایک دلِ آگاہ مانگ لوں۔'' مولانا روم

---

[1] انجمن کی قلمی روداد؛ محمد حنیف شاہد (۱۹۷۶)، اقبال اور انجمن حمایت اسلام، ص ۱۲۶-۱۲۱

نے کہا، ''دل کی روشنی کے بغیر حکمرانی ناقص ہے۔ بادشاہی یدِبیضا کے بغیر حرام ہے۔''

لارڈ کچنر خاموش نہ رہ سکا۔ فرعون کو جواب دیتے ہوئے کہا، ''فرنگی قوم کا مقصد بلند ہے۔ ہیرے جواہرات کے لیے اہرام نہیں کھودے۔ تاریخی حقائق کی کھوج میں ایسا کیا ہے۔'' فرعون نے کہا، ''ہماری قبریں علم و حکمت نے کھودی ہیں لیکن مہدی کے مقبرے میں کیا تھا؟''

اسی لمحے پانی میں بجلی سی کوندی۔ لہریں اُٹھیں۔ چکر کھانے لگیں۔ جنت کے باغ سے خوشبو کی لپٹ آئی۔ مہدی سوڈانی کی روح نمودار ہوئی اور کہا، ''اے کچنر! اگر آنکھ رکھتے ہو تو ایک درویش کی قبر کا انتقام دیکھو! تقدیر نے تمہاری مٹی کو دو گز زمین بھی نہ دی۔ کھارے پانی کے سوا تمہیں قبر نصیب نہ ہوئی۔'' مہدی کی آواز بھرّا گئی۔ آہ بھری اور پکارا:

اے روحِ عرب، جاگ! اپنے آباواجداد کی طرح زمانوں کی خالق بن جا۔
اے فواد! اے فیصل! اے ابنِ سعود! کب تک دھوئیں میں لپٹے رہو گے؟
سینے میں وہ آگ زندہ کرو جو بجھ چکی ہے۔ دنیا میں پھر سے وہ دن لے آؤ جو بیت چکا ہے۔
اے بطحا کی مٹی، کوئی دوسرا خالدؓ پیدا کر! دوبارہ توحید کا ترانہ چھیڑ دے!
تیرے صحرا کے کھجور سربلند رہیں، کیا تیری مٹی سے کوئی اور فاروق نہ اُٹھے گا؟
اے سیاہ فام مومنوں کی سرزمیں! مجھے تجھ سے ابدیت کی خوشبو آتی ہے۔
اوپر اُٹھنے کی لگن کے بغیر جینا کب تک! تیری تقدیر غیر کے ہاتھ میں کب تک!
کب تک اپنے مقام پر نہ آؤ گے؟ میری ہڈیاں سمندر میں بانسری کی طرح فریاد کر رہی ہیں۔
مصیبت سے ڈرتے ہو؟ رسول اکرمؐ کا ارشاد ہے، ''جوانمرد کے لیے مصیبت کا دن ڈُھل جانے کا دن ہے۔''
اے ساربان! دوست یثرب میں ہیں اور ہم نجد میں۔ وہ حُدی کہاں ہے جو اُونٹنی کو وجد میں لے آئے؟

بادل برسا، زمین سے سبزہ پھوٹا۔ شاید اسی لیے اونٹنی کا پاؤں سست پڑ رہا ہے۔

میری روح جدائی کے درد سے چلا رہی ہے۔ وہ راستہ اختیار کرو جو سبزے سے خالی ہو۔
اُونٹنی سبزے کی متوالی ہے اور میں دوست کا دیوانہ! وہ تمہارے ہاتھ میں ہے اور میں دوست کے قبضے میں!
پانی کو صحرا پر حلال کر دیا گیا۔ پہاڑیوں پر کھجور کے پتے دُھل گئے۔
وہ دیکھو! دو ہرن ایک دوسرے کے پیچھے ٹیلے سے اتر رہے ہیں،
ایک پل کو صحرا کے چشمے سے پانی پیتے ہیں۔ پھر مسافر کی طرف دیکھتے ہیں۔
صحرا کی ریت بھیگ کر پھولدار ریشم کی طرح نرم! اونٹ پر راستہ بھاری نہیں ہے۔
گھومتے بل کھاتے، تیتر کے پر جیسے بادل! بارش سے خوف آتا ہے کیونکہ ہم ٹھکانے سے دُور ہیں۔
اے ساربان! دوست یثرب میں ہیں اور ہم نجد میں۔ وہ حُدی کہاں ہے جو اُونٹنی کو وجد میں لے آئے![1]

34

"حضرت علامہ اقبال صدر مسلم لیگ ۲۷/ دسمبر کی شام کو لاہور سے روانہ ہوں گے اور ۲۸ کو تین بجے بعد دوپہر الٰہ آباد پہنچیں گے،" انقلاب نے لکھا۔[2] "حضرت علامہ کے ساتھ لاہور اور پنجاب کے دوسرے شہروں کے متعدد اکابر اجلاسِ لیگ میں شامل ہونے کے لیے جا رہے ہیں... آل انڈیا تنظیم کانفرنس بھی انہی دنوں [الٰہ آباد میں] منعقد ہو گی[3]... حاجی سیٹھ عبداللہ ہارون صدر تنظیم کانفرنس ۲۶ کو کراچی سے روانہ ہو کر حضرت علامہ اقبال کے ساتھ الٰہ آباد پہنچیں گے۔ سیٹھ عبداللہ ہارون کے صاحبزادے یوسف عبداللہ ہارون بھی اپنے والدِ ماجد کے ساتھ الٰہ آباد جا رہے ہیں۔"[4]

۲۸/ دسمبر کی شام کو نکلنے والے انقلاب کے پرچے پر حسبِ معمول دو روز بعد کی تاریخ ۳۰/

---

[1] بیاضِ جاوید نامہ سے ترجمہ
[2] انقلاب ۲۸/ دسمبر ۱۹۳۰ء؛ حمزہ فاروقی، اقبال کا سیاسی سفر، ص ۲۲۷
[3] انقلاب ۲۷/ دسمبر ۱۹۳۰؛ ایضاً ص ۲۲۷
[4] انقلاب ۲۸/ دسمبر ۱۹۳۰ء؛ ایضاً ص ۲۲۷

دسمبر ۱۹۳۰ء درج تھی۔[1] پہلے صفحے پر جلی قلم میں سرخی تھی، ''الہ آباد میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس—علامہ اقبال کا بصیرت افروز خطبۂ صدارت''۔[2] پورے صفحے پر علامہ کے خطبۂ صدارت کے ترجمہ کا پہلا حصہ شائع کیا گیا۔ دوسری اور آخری قسط اگلے روز شائع ہو رہی تھی، جب الٰہ آباد میں خطبہ پڑھا جانا تھا۔[3] بعد میں قیاس کیا گیا کہ علامہ نے ''روانگی سے قبل...اس کی چند کاپیاں لاہور کے مسلمان اخبارات کے مدیروں کے حوالے کر دی تھیں۔''[4] صرف مدیر انقلاب کے حوالے کرنے کی شہادت موجود ہے۔[5] دوسرے مسلم اخبارات کے بارے میں اندازے لگانے کی کوشش ہی کی جا سکتی ہے۔ مسلم آؤٹ لُک اور سیاست کے مدیران ''شمالی ہند کانفرنس'' میں علامہ کے ہمنوا تھے۔[6] ظفر علی خاں کانگریس کی طرف ہو چکے تھے۔[7]

تین روز پہلے انقلاب میں آیا تھا کہ عبداللہ ہارون ''غالباً ۲۹/ دسمبر کو الٰہ آباد پہنچیں گے۔''[8] لیگ کی دستاویزات میں فتح پور کے لیگی رکن امیر حسن خاں کا ۲۷/ دسمبر کا خط ہے، ''اگر ڈاکٹر اقبال ۲۹/ کی صبح اِس رستے سے گزریں تو میں اسٹیشن پر اُنہیں زبردست استقبالیہ دینے کا ارادہ رکھتا

---

[1] یہ اُس زمانے میں دیسی اخبارات کا معمول تھا۔ ۳۰/ اور ۳۱/ دسمبر کے شماروں میں داخلی شہادت بھی موجود ہے کہ بالترتیب ۲۸/ اور ۲۹/ دسمبر کو شائع ہوئے، مثلاً جس شمارے پر ۳۱/ دسمبر ۱۹۳۰ء کی تاریخ ہے، اُس میں ۲۹/ دسمبر کی ڈیٹ لائین کے ساتھ خبر درج ہے، ''علامہ سر محمد اقبال نے بھی انگریزی میں خطبۂ صدارت سنایا، جس کا ترجمہ انقلاب کی اشاعتِ دیروزہ و امروزہ میں مفصل شائع کیا گیا۔'' حمزہ فاروقی، اقبال کا سیاسی سفر، ص ۲۲۹

[2] انقلاب ۲۸/ دسمبر ۱۹۳۰ء؛ بشکریہ امجد سلیم علوی

[3] حمزہ فاروقی، اقبال کا سیاسی سفر، ص ۲۱۴ کے اس جملے میں تصحیح کی ضرورت ہے، ''جس روز مسلم لیگ کے اجلاس میں خطبۂ صدارت پڑھا گیا، اُسی روز اُس کا ترجمہ انقلاب میں شائع ہوا تھا۔'' ترجمہ دو قسطوں میں شائع ہوا۔

[4] حمزہ فاروقی اقبال کا سیاسی سفر، ص ۲۱۴

[5] مکتوب بنام مولوی یعقوب ۴/ اگست ۱۹۳۰ء محولہ بالا

[6] دیکھیے ۲۳/ نومبر اور ۱۴/ دسمبر ۱۹۳۰ء کے واقعات

[7] دیکھیے ۳۱/ دسمبر ۱۹۲۹ء کے واقعات؛ ظفر علی خاں کانگریس کے تاریخی اجلاس میں شریک تھے۔

[8] انقلاب ۲۷/ دسمبر ۱۹۳۰ء؛ ایضاً ص ۲۲۷

ہوں۔"[1] اس کے بعد انقلاب میں آیا کہ علامہ اور عبداللہ ہارون ۲۸/ دسمبر کو الٰہ آباد پہنچیں گے۔ ۲۸/ دسمبر کو تصدیق کی گئی کہ اُس روز پہنچ رہے ہیں۔ اِس دفعہ گاڑی کا نام پنجاب میل بتایا گیا۔[2] جن لوگوں نے الٰہ آباد میں علامہ کو دیکھا اُن میں سے سید شمس الحسن، احمد الدین مارہروی، عبداللہ چغتائی اور حفیظ جالندھری نے یادداشتیں تحریر کی ہیں۔[3] مفتی فخر السلام، عبدالحیٔ عباسی اور ریاض خیر آبادی نے زبانی روایات بیان کیں۔[4] ان میں سے کسی نے نہیں بتایا ہے کہ علامہ کس تاریخ کو الٰہ آباد پہنچے۔ الٰہ آباد کے ہفتہ روزہ اسٹار نے "بہت تفصیل سے خیر مقدم، جلوس اور جلسے کا حال شائع کیا۔"[5] ناپید ہے۔ بعد میں کسی حوالے کے بغیر کہا گیا کہ ۲۹/ دسمبر کی صبح پہنچے۔[6] اس صورت میں ۲۸/ دسمبر کو لاہور سے روانہ ہوئے ہوں گے۔ ورنہ ۲۷/ دسمبر کو انجمن حمایت اسلام میں نواب بہاولپور کو سپاسنامہ پیش کر کے اُسی رات روانہ ہوئے۔ ۲۸/ دسمبر کو تین بجے بعد دوپہر پہنچے۔[7] اس صورت میں ممکن ہے کہ اس شام لیگ کی کونسل کا اجلاس ہوا ہو۔ انقلاب نے لکھا تھا کہ ۲۸/ دسمبر کو ہو گا۔[8]

۲۷/ دسمبر کو مسلم لیگ کا دفتر ایک ہفتے کے لیے الٰہ آباد منتقل ہوا تھا۔ شمس الحسن اور مولوی

---

[1] Nadeem Shafiq Malik (2013), p.334-335

[2] انقلاب ۳۰/ دسمبر ۱۹۳۰؛ ایضاً ص ۲۲۸

[3] بالترتیب: Hasan (1976) *Plain Mr. Jinnah,* pp.50-52؛ احمد الدین ماہروی (۱۹۶۷) 'جلسۂ الٰہ آباد کا آنکھوں دیکھا حال'؛ عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۱۸۹-۱۸۷؛ اور عزیز ملک (۲۰۰۰) حفیظ جالندھری، ، ص ۶۶-۶۵

[4] مختار زمن، 'دوازدہ منزل سے منزل پاکستان تک'، ص ۵۰۵-۴۹۹

[5] احمد الدین ماہروی، 'جلسۂ الٰہ آباد کا آنکھوں دیکھا حال'، ص ۳۷

[6] جاوید اقبال، زندہ رود، ص ۴۵۶ پر "۱۹/ دسمبر" سہوِ کتابت ہے۔ ۲۹/ دسمبر مراد لینی چاہیے۔ شمس الحسن کی محولہ بالا کتاب کا حوالہ دیا گیا ہے مگر وہاں تاریخِ ورود درج نہیں ہے۔ یہی تاریخِ ورود علی احمد فاطمی (۲۰۱۰) اقبال اور الٰہ آباد، ص ۱۲ پر کسی حوالے کے بغیر دی گئی ہے۔

[7] حمزہ فاروقی اقبال کا سیاسی سفر، ص ۲۱۴ پر "لاہور سے ۲۷/ دسمبر کو روانگی" کا ذکر ہے مگر کوئی حوالہ نہیں دیا گیا۔

[8] انقلاب، ۳۰/ دسمبر ۱۹۳۰ء؛ حمزہ فاروقی، اقبال کا سیاسی سفر، ص ۲۲۸

یعقوب آئے تھے۔ اکبر الہ آبادی کی وفات کے بعد یہاں مسلمانوں کی سب سے ممتاز شخصیت ڈاکٹر شفاعت احمد خاں تھے۔ الہ آباد یونیورسٹی میں تاریخ پڑھاتے تھے۔ مرادآباد کے حلقے سے صوبائی کونسل کے رُکن تھے۔ اپنے خرچ پر ہفت روزہ اسٹار شائع کرتے تھے۔ مسلمانوں کے نقطۂ نظر کا ترجمان تھا۔ اشاعت دو سو سے کم تھی۔[1] ان دنوں گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن میں تھے۔ استقبالیہ کمیٹی کے صدر حاجی سید محمد حسین بیرسٹر تھے۔[2] خان بہادر حافظ غضنفرُ اللہ ممبر کونسل اور اُن کے بھائی ذوالفقارُ اللہ خاص طور پر مدد کر رہے تھے۔[3] لیگی رہنما نواب سر محمد یوسف، امارت اور شان و شوکت کے لیے مشہور تھے۔ علامہ اور عبداللہ ہارون اُن کی کوٹھی پر قیام کرنے والے تھے۔[4] باقی مہمان مجیدیہ ہائی اسکول میں ٹھہرائے جا رہے تھے۔ اُس کے سامنے کُھلے میدان میں اجلاس تھا۔[5] مجلسِ استقبالیہ کی فیس دس روپے تھی۔ مہمانوں اور مندوبین کی فیس پانچ روپے تھی۔[6] احمد الدین مارہروی الہ آباد یونیورسٹی کے شعبۂ تاریخ میں ریسرچ اسکالر تھے۔ اُن کا کہنا ہے کہ اسٹار میں خبروں کا انتخاب اور ترتیب ان کے سپرد تھی۔ اسٹار کے مدیر رحم علی ہاشمی کے ساتھ مل کر جلسے کی تشہیر کا ذمہ لیا۔ لکھتے ہیں، "ہم نے اخبارات، پوسٹر اور دستی اشتہارات کے ذریعے خوب پروپیگنڈا کیا۔"[7]

علامہ کے ساتھ سیٹھ عبداللہ ہارون اور یوسف ہارون آئے تھے۔ عبداللہ چغتائی کہتے ہیں، "میں بھی آپ کے ہمراہ تھا اور لاہور سے والنٹیرز کی ایک جماعت بھی آپ کے ساتھ الہ آباد گئی تھی جس میں چودھری محمد حسین، لعل دین قیصر اور مصطفیٰ حیرت وغیرہ شامل تھے۔"[8] حفیظ جالندھری کہتے

---

[1] احمد الدین ماہروی، ص ۳۴

[2] Mitra, *Register Jul-Dec 1930*, p.334

[3] ماہروی، ص ۳۴؛ علی احمد فاطمی (۲۰۱۰) اقبال اور الہ آباد، ص ۱۵

[4] انقلاب ۳۰/ دسمبر ۱۹۳۰ء؛ حمزہ فاروقی، اقبال کا سیاسی سفر، ص ۲۲۸

[5] ایضاً

[6] انقلاب ۲۷/ دسمبر ۱۹۳۰ء؛ ایضاً، ص ۲۲۷

[7] ماہروی، ص ۳۴

[8] عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۱۸۸

ہیں کہ وہ بھی گئے۔[1] پہلے جب اجلاس لکھنؤ میں ہونے والا تھا، حکیم محمد شریف آئی ڈاکٹر بھی لاہور کے وفد میں شامل تھے۔[2] امکان ہے کہ الہ آباد بھی آئے ہوں۔

مارہروری نے لکھا ہے کہ علامہ کے ساتھ آنے والوں میں سے صرف شیخ عبدالقادر کو مخزن کی وجہ سے پہلے سے جانتے تھے۔[3] کوئی اور شہادت موجود نہیں ہے کہ شیخ عبدالقادر گئے تھے۔ لگتا ہے کہ مارہروی کو عبدالقادر قصوری کے نام کی وجہ سے غلط فہمی ہوئی۔

ریلوے اسٹیشن پر زبردست ہجوم تھا۔ ''شاعرِ اعظم زندہ باد'' کے نعرے سنائی دے رہے تھے۔ مارہروی لکھتے ہیں کہ علامہ ''کے نام اور اُن کے کلام کی عالمگیر مقبولیت نے جادو کا کام کیا اور ... تمام شہر اُمڈ آیا۔'' ہندو بھی خاصی تعداد میں تھے۔ شہر کے بزرگ کہتے تھے کہ پہلے کبھی اتنا مجمع کبھی نہ دیکھا تھا۔ ''پلیٹ فارم، پُل، مال گاڑی کے ڈبّوں کی چھت، حتیٰ کہ سٹیشن کے باہر بھی تل دھرنے کو جگہ نہ تھی،'' مارہروی کا بیان ہے:

> ایک صاحب مال گاڑی کے ڈبّے پر دُوربین لیے کھڑے تھے... اِردگرد کے ساتھیوں کو اپنی پاٹ دار آواز میں خیر مقدم اور خوش آمدید کی چھوٹی سے چھوٹی تفصیل بتا رہے تھے اور لوگ اُن کا بیان اِس توجّہ اور انہماک سے سُن رہے تھے کہ اگر کوئی بیچ میں بولتا، تو اشارے سے اُسے خاموش کر دیتے۔

علامہ پلیٹ فارم پر اُترے۔ قصاب برادری نے نعرۂ تکبیر کے ساتھ اپنی لاٹھیاں اس منظم طریقے سے زمین پر ماریں کہ ''پورے پلیٹ فارم کو متزلزل کر دیا۔'' کچھ لوگ گھبرا کر بھاگے۔ انسانوں کے سمندر میں ہلچل سی پیدا ہوئی۔ علامہ مسکرائے۔ دُوربین والے نے اعلان کیا کہ شاعرِ اعظم مسکرا رہے ہیں۔ لوگ بھی مسکرانے لگے۔ یونیورسٹی کے مسلم ہاسٹل کے گیارہ نوجوان شاعروں کی ٹیم علامہ کی شان میں نظم سنانے کے لیے کھڑی تھی۔ ہجوم کی وجہ سے بکھر گئی۔ اسلامیہ اسکول کے طالبِ علموں نے

---

[1] حفیظ کا بیان ہے کہ وہ اجلاس میں موجود تھے؛ عزیز ملک، حفیظ جالندھری، ص۶۶-۶۵

[2] Malik (2013), pp.104-105

[3] مارہروی، ص۳۴

چندہ کر کے علامہ کے لیے تحائف خریدے تھے۔ "تحائف کے متعلق تو معلوم نہیں کہ اُنہیں زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا،" مارہروی نے لکھا ہے، "البتہ دھینگامشتی میں دو طلبہ کے بازو ٹوٹ گئے اور اُنہیں کئی ہفتے ہسپتال میں گزارنے پڑے۔"[1]

"خیر مقدم کی طرح جلوس بھی نہایت کامیاب رہا،" مارہروی لکھتے ہیں، "راستے میں درختوں، چھتوں اور دیواروں پر اتنا ہجوم تھا کہ منتظمین کو بھی راہ ملنی مشکل ہو گئی۔ جن لوگوں نے علامہ کی جھلک دیکھ لی، وہ عرصے تک اس پر فخر کرتے رہے اور جو محروم رہ گئے، وہ اپنی بدبختی پر دیر تک رویا کیے۔"[2] شمس الحسن کہتے ہیں، "الہ آباد پہنچنے پر علامہ اقبال کا شاندار خیر مقدم ہوا اور جلوس نکالا گیا۔"[3] انقلاب میں پہلے سے جو پروگرام شائع ہوا تھا، اُس کے مطابق اسٹیشن پر علامہ کا خیر مقدم ۲۸ر کی سہ پہر اور جلوس ۲۹ر دسمبر کی صبح نکلنا تھا۔ اب یہ جاننے کا کوئی ذریعہ موجود نہیں ہے کہ واقعات اسی پروگرام کے مطابق ہوئے یا اسٹیشن سے ساؤتھ روڈ پر نواب محمد یوسف کی کوٹھی تک سفر ہی جلوس بن گیا۔ یہ فاصلہ دوڈھائی میل تھا۔[4] بہر حال تصویر بھی کھنچی۔ علامہ کے گلے میں پھولوں کے ہار ہیں۔ موٹر میں بیٹھے ہیں۔ ہمراہیوں میں سیٹھ عبداللہ نمایاں ہیں۔[5] روایت ہے، "کوٹھی کے عظیم الشان پھاٹک پر نواب یوسف نے خود پیش قدمی کر کے علامہ کا استقبال کیا اور بڑے تزک و احتشام سے کوٹھی کے اندر لے گئے ..."[6]

35

شیر شاہ سوری کی بنائی ہوئی گرینڈ ٹرنک روڈ کے کنارے الہ آباد کا محلہ یاقوت گنج تھا۔ وہاں ایک

---

[1] مارہروی، ص ۳۵-۳۴

[2] مارہروی، ص ۳۵

[3] Hasan (1976) *Plain Mr. Jinnah,* p.52

[4] فاصلے کا تعین: علی احمد فاطمی، اقبال اور الہ آباد، ص ۱۳۔ یہ بھی لکھا ہے کہ اب کوٹھی مسمار کر کے بس اسٹینڈ اور اُس کا دفتر بنایا جا چکا ہے۔

[5] Khurram Ali Shafique, *Iqbal: An Illustrated Biography,* p.133

[6] فاطمی، اقبال اور الہ آباد، ص ۱۴

مسلمان تاجر شیخ رحیم بخش رہتے تھے۔ تمباکو کا کاروبار کرتے تھے۔ تعلیم یافتہ تھے۔ صوفیوں اور علمائے کرام کی صحبت میں بیٹھنا پسند کرتے تھے۔ حویلی دومنزلہ تھی۔ کالیون ہسپتال کے سامنے واقع تھی۔ وسیع صحن کے بر آمدوں میں بارہ دروازے تھے۔ دوازدہ منزل کہلاتی تھی۔[1] ''میں نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ مسلم لیگ کا جلسہ کہیں اور ہونے والا تھا لیکن میرے دادا کی کوششوں سے جلسے کا انتظام دوازدہ منزل میں ہوا،'' رحیم بخش کے پوتے نے بعد میں کہا۔[2] مارہروی کہتے ہیں، ''الہ آباد کے جلسے عموماً میوہال میں ہوا کرتے تھے جو شہر کے باہر ایک وسیع باغ میں واقع تھا۔ مسلم لیگ کا یہ اجلاس بھی وہیں منعقد ہونے والا تھا لیکن یکایک معلوم ہوا جلسے کا انتظام شہر کے اندر... خسرو باغ کے نزدیک ایک حویلی میں کیا گیا ہے جو بالکل غیر معروف جگہ تھی۔''[3] مارہروی کے حافظے نے غلطی کی ہے۔ اجلاس پہلے میوہال میں نہیں ہو رہا تھا۔ مجیدیہ اسکول کے سامنے کھلے میدان میں ہونے والا تھا۔[4] مارہروی نے لکھا ہے کہ جگہ کی تبدیلی کی ''دو وجہیں بتائی جاتی ہیں۔ اوّل یہ کہ مقامی گروہ بندی کے سبب مخالف جماعتوں کی طرف سے مظاہرے اور تصادم کا احتمال تھا۔ دوسرے وقتی سیاست کو دیکھتے ہوئے گمان غالب یہی تھا کہ بہت کم لوگ اس میں شرکت کریں گے۔''[5]

وہ لکھتے ہیں، ''باہر سے آنے والے مندوبین اور مہمانوں... کی تعداد دونوں ہاتھوں کی انگلیوں پر گنی جا سکتی تھی۔''[6] انڈین اینوئیل رجسٹر (*Indian Annual Register*) نے اگلے برس لکھا، ''یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ ملک کے دوسرے حصوں سے الہ آباد پہنچنے والے مندوبین کی تعداد کتنی تھی۔'' اُس کے مطابق صبح کی نشست (غالباً مراد پہلے دن کی نشست) میں مقامی مندوبین کے علاوہ ایک

---

[1] مختار زمن، ص ۵۰۰-۴۹۹؛ علی احمد فاطمی، ص ۱۲-۱۰: Hasan (1976), p.52

[2] مختار زمن، ص ۵۰۰

[3] مارہروی، ص ۳۵

[4] انقلاب، ۳۰/ دسمبر ۱۹۳۰ء؛ حمزہ فاروقی، اقبال کا سیاسی سفر، ص ۲۲۸

[5] مارہروی، ص ۳۵

[6] مارہروی، ص ۳۵

حیدرآباد سندھ، ایک بہار، کچھ کراچی، کچھ لاہور اور زیادہ تر یو پی سے تھے۔[1] علامہ اقبال، مولوی مولوی یعقوب اور سید شمس الحسن کے علاوہ شیخ عبدالمجید (حیدرآباد سندھ)؛ شاہ نذیر حسن ممبر کونسل (بہار)؛ سید حسین امام (گیا)؛ سیٹھ عبداللہ ہارون (کراچی)؛ سیٹھ طیب علی (کراچی)؛ ڈاکٹر مفتی محمد صادق (قادیان)؛ سید حبیب (لاہور)؛ مولانا عبدالقادر (قصور)؛ نواب اسماعیل خاں (میرٹھ)؛ مولوی علاالدین (میرٹھ)؛ مولانا ابوالخیر (غازی پور)؛ خان بہادر برکت اللہ (غازی پور)؛ محمد عظیم (غازی پور)؛ مولوی عبدالکافی (کانپور)؛ مولوی عبدالصمد (بدایوں)؛ مولانا عبدالماجد (بدایوں)؛ اظہر علی ممبر اسمبلی (لکھنؤ)؛ سید ذاکر علی (لکھنؤ) اور حفیظ الرحمٰن شامل تھے۔[2] امکان ہے کہ امیر حسن خاں (فتح پور) بھی آئے ہوں۔[3]

الہ آباد کی نمایاں شخصیات میں سے استقبالیہ کمیٹی کے صدر حاجی سید محمد حسین بیرسٹر کے علاوہ نواب سر محمد یوسف، شیخ ظہور احمد، حاجی غضنفر اللہ، حاجی ذوالفقار اللہ، شیخ رحیم بخش اور ڈاکٹر ایس یو جنگ موجود تھے۔ مفتی فخر السلام سے روایت کیا گیا، "اس جلسے میں ڈاکٹر سر شفاعت احمد خاں بہت پیش پیش تھے" اور "ڈائس پر موجود تھے"۔[4] یہ درست نہیں ہے۔ سر شفاعت اُس وقت لندن میں گول میز کانفرنس میں تھے۔[5] باہر کے حاضرین میں سے چودھری محمد حسین، عبداللہ چغتائی، حفیظ جالندھری، ملک لال دین قیصر اور مصطفیٰ حیرت کے نام معلوم ہیں۔ یوسف ہارون بھی رہے ہوں گے۔[6] مقامی حاضرین میں سے رحم علی الہاشمی، احمد الدین مارہروی، نوجوان لیگی کارکن عبدالحئی عباسی،

---

[1] Mitra, *Register Jul-Dec 1930*, p.334

[2] Mitra, *Register Jul-Dec 1930*, p.334۔ لیگ کی منظور شدہ قراردادوں کی دستاویز Malik (2013),pp.352-256

[3] انہوں نے ۲۷ دسمبر ۱۹۳۰ء کو مولوی یعقوب کو قرارداد یں بھیجتے ہوئے اجلاس میں انہیں خود پیش کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی؛ Nadeem Shafiq Malik (2013), pp.334-335

[4] م ختار زمن، ص ۵۰۱

[5] IRTC, *Proceedings,* p.7

[6] اپنے والد عبداللہ ہارون کے ساتھ سفر کر رہے تھے جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا۔

ایل ایل بی کے طالب علم مفتی فخر السلام اور اسکول ماسٹر ریاض اللہ آبادی کے نام دریافت ہوئے ہیں۔[1] انڈین اینوئیل رجسٹر کے مطابق کئی اعزازی مجسٹریٹ اور سرکاری افسر بھی آئے۔[2] مارہروی نے کچھ اور حاضرین کا ذکر کیا ہے، ''بعض تہمد پوش حضرات... جن کے متعلق وثوق سے کہا جاسکتا تھا کہ وہ نہ انگریزی کا ایک لفظ جانتے ہیں نہ ان میں سیاسی مسائل کو سمجھنے کی اہلیّت ہے (بعد میں معلوم ہوا یہ لوگ اس جلسے کو مشاعرہ سمجھ کر علّامہ کا کلام سننے آئے تھے)''؛ ''مسلم ہوسٹل کے طلبہ کی ایک ٹولی''؛ ''ایک بیرسٹر''۔[3]

انڈین اینوئیل رجسٹر نے حاضرین کی کُل تعداد قریباً چھ سو بتائی ہے۔[4] سینتالیس برس بعد مفتی فخر السلام کے حوالے سے کہا گیا، ''مفتی صاحب کے بیان کے مطابق جلسے میں مشکل سے چار سو یا پانچ سو آدمی موجود تھے۔'' ''عبدالحئی عباسی کے حوالے سے بتایا گیا'' کہ شاید اس سے بھی کم آدمی رہے ہوں گے۔''[5] اس تعداد میں اور انڈین اینوئیل رجسٹر کے معاصرانہ بیان میں کم سے کم ایک سو اور زیادہ سے زیادہ دوڈھائی سو کا فرق ہے۔ یہ روایات قریباً نصف صدی بعد حافظے کے بھروسے پر پیش کی گئیں۔ محض ان کی وجہ سے انڈین اینوئیل رجسٹر کی بتائی ہوئی تعداد میں شبہ کرنا درست نہ ہو گا۔ بعد میں حفیظ جالندھری نے لکھا کہ ہزاروں لوگ موجود تھے۔[6] مارہروی کہتے ہیں کہ دوازدہ منزل کے صحن میں ''بمشکل دو سو آدمیوں کے بیٹھنے کی جگہ ہو گی۔''[7] مختار زمن نے معائنے کے بعد لکھا، ''میرے خیال میں کرسیوں پر ہزار بارہ سو سے زیادہ آدمی نہیں آسکتے۔'' ایک رنگین تصویر بھی اس کی

---

[1] مارہروی؛ مختار زمن، ص ۵۰۳-۵۰۱

[2] Mitra, *Register Jul-Dec 1930*, p.334

[3] مارہروی، ص ۳۶-۳۵

[4] Mitra, *Register Jul-Dec 1930*, p.334

[5] زمن، ص ۵۰۱

[6] عزیز ملک، حفیظ جالندھری، ص ۶۶-۶۵

[7] مارہروی، ص ۳۵

تصدیق کرتی ہے۔[1] مارہروی کے "بمشکل دو سو" اور حفیظ کے "ہزاروں" کو بھی حافظے کی غلطیاں قرار دینا پڑتا ہے۔ مارہروی لکھتے ہیں، "جب جلسہ گاہ میں پہنچ کر حاضرین پر نظر پڑی... نصف کُرسیاں خالی پڑی ہوئی... تھیں۔" خطبے کے اختتام تک "جلسہ گاہ کی تمام نشستیں پُر ہو چکی تھیں اور جن لوگوں کو جگہ نہ مل سکی وہ دائیں بائیں یا پیچھے صف بستہ کھڑے تھے۔"[2] یہ معلوم نہیں ہے کہ کتنی کرسیاں رکھی گئی تھیں جو جلسے کے اختتام تک سب کی سب پُر ہو چکی تھیں۔ اِس لیے اس بیان سے بھی حاضرین کی کُل تعداد پر روشنی نہیں پڑتی۔

"علامہ اقبال نواب یوسف کی موٹر پر اُن کے ساتھ ہی دوازدہ منزل تشریف لائے،" مفتی فخر الاسلام سے روایت کی گئی ہے۔ ایل ایل بی کے طالب علم تھے۔ علامہ کو دیکھنے اور تقریر سننے کا شوق تھا۔ اپنے لیگی دوست عبدالحیٔ عباسی کے ساتھ آئے تھے۔[3] رواج کے مطابق ڈائس بنایا گیا تھا۔ نمایاں مہمانوں کی کرسیاں وہاں رکھی گئی تھیں۔[4]

آل انڈیا مسلم لیگ کے اکیسویں سالانہ اجلاس کی کاروائی ۲۹/ دسمبر ۱۹۳۰ء کو صبح گیارہ بجے کے قریب شروع ہوئی۔[5] مفصل روئیداد دستیاب نہیں ہے۔ امکان ہے کہ اجلاس کا آغاز تلاوت سے کیا گیا ہو۔[6] فتح پور کے لیگی رکن امیر حسن خاں نے دو روز قبل مولوی یعقوب کو لکھا تھا، "میں نے مولانا محمد ابراہیم سے موقع کی مناسبت سے نظم لکھوائی ہے اور جو نظم انہوں نے لکھی ہے، شاندار ہے۔ آپ کو معلوم ہے کہ وہ فردوسیٔ ہند کہلاتے ہیں اور قابلِ اعتنا شہرت رکھتے ہیں۔"[7] ممکن ہے کہ یہ نظم پیش کی

---

[1] مختار زمن، ص ۵۰۰؛ فاطمی (۲۰۱۰) میں صفحہ ۱۶/ اور ۱۷/ کے درمیان رنگین تصویر موجود ہے۔

[2] مارہروی، ص ۳۵

[3] مختار زمن، ص ۵۰۰

[4] مختار زمن، ص ۵۰۱ آخری صفحے پر پرنٹ لائن موجود ہے۔ تعداد درج نہیں۔

[5] Mitra: *Register*, Jul-Dec 1930, p.334

[6] ڈاکٹر جاوید اقبال، زندہ رُود، ص ۴۵۶ پر تلاوت کا ذکر ہے مگر کوئی حوالہ نہیں دیا گیا۔

[7] Malik (2013), pp.334-335؛ ملک (۲۰۱۳)، ص ۶۷؛ مؤلف نے دونوں کتابوں کے حاشیے میں لکھا ہے کہ دستیاب دستاویزات میں نظم پڑھنے کا ذکر نہیں ملتا۔ یہ درست ہے لیکن دستیاب دستاویزات نامکمل بھی ہیں۔

گئی ہو۔ حفیظ جالندھری کا بیان ہے کہ انہوں نے بھی اجلاس میں شاہنامۂ اسلام کے اقتباسات سنائے۔[1]

استقبالیہ کمیٹی کے صدر کی حیثیت میں محمد حسین بیرسٹر نے حاضرین کو خوش آمدید کہا۔ خطبۂ استقبالیہ کی تلخیص انگریزی میں ہم تک پہنچی ہے۔ مفہوم یوں ہے:

> مسلمانوں نے ہر ممکن کوشش کی ہے کہ ہندوؤں کے ساتھ کسی سمجھوتے پر پہنچ سکیں۔ نہیں پہنچ سکے۔ یہ الزام درست نہیں ہے کہ مسلمان اپنی ملّیت کی وجہ سے ملک کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔ اسلام اور غلامی دو متضاد چیزیں ہیں، اور ایک مسلمان کبھی کسی کا غلام نہیں ہونا چاہتا۔
>
> آج اگر ہندوؤں کی ذہنیت تبدیل ہو جائے اور مسلمانوں کو یقین ہو جائے کہ اُن کی روایات، اُن کا مذہب، اُن کی تعلیم اور اُن کی زبان ختم نہیں کر دیئے جائیں گے، اور مسلمانوں کے ساتھ بھی ہندوستان کے دوسرے سپوتوں جیسا سلوک کیا جائے گا، تو مسلمان کبھی اپنے حقوق کا سوال زبان پر نہ لائیں۔ لیکن ماضی میں مقامی اداروں اور انتظامیہ کے ہر شعبے بلکہ تجارت میں بھی اُن کا تجربہ اس کے برعکس رہا ہے۔
>
> راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے مسلم مندوبین کا رویہ قابلِ تحسین ہے۔ لیکن حکومت کو جان لینا چاہیے کہ اگر کانفرنس میں مشکلات کا کوئی حل دریافت نہ ہو سکا تو مسلمان اپنے مطالبات کے حصول کی خاطر کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے۔[2]

انڈین اینوئیل رجسٹر نے لکھا ہے، ''اِس کے بعد ڈاکٹر سر محمد اقبال نے اپنا خطبۂ صدارت سنایا۔'' ظاہر ہے کہ بعض تفصیلات چھوڑ دی گئی ہیں۔ رواج تھا کہ خطبۂ استقبالیہ کے بعد جماعت کے سیکرٹری کی طرف سے گزشتہ برس کی کارکردگی کی رپورٹ پیش کی جاتی تھی۔ لیگ کے فائل میں مولوی محمد یعقوب کی لکھی ہوئی ایک ٹائپ کی ہوئی بیحد مختصر رپورٹ موجود ہے۔ اس پر ۲۵ دسمبر کی تاریخ اور

[1] عزیز ملک (۲۰۰۰) حفیظ جالندھری ص ۶۶-۶۵

[2] Mitra, *Register*, Jul-Dec 1930, p.334

مقام الٰہ آباد درج ہے۔ قریباً یقینی ہے کہ اجلاس میں پڑھ کر سُنائی گئی ہو گی۔[1]

عام طور پر سیکرٹری کی رپورٹ کے بعد اُن لوگوں کے پیغامات سنائے جاتے تھے جو شریک نہ ہو سکے مگر نیک تمنائیں بھیجی ہوں۔ لیگ کے ریکارڈ میں بشیر احمد (گورداسپور) کی طرف سے ایسا پیغام موجود ہے۔ جب اجلاس بنارس میں ہونے والا تھا، اُس زمانے میں بھیجا ہوا طفیل احمد (علیگڑھ) کا معذرت نامہ ہے۔ اُس سے پہلے لکھنؤ کے موقع کے ابن حسن (علیگڑھ)، عبدالجبار (اجمیر) اور عبدالوہاب (خیرپور) کے معذرت نامے ہیں۔[2]

قاعدے کے مطابق تحریکِ صدارت پیش کی گئی ہو گی۔ کسی نے تائید کی ہو گی۔ اُس کے بعد بیرسٹر محمد حسین نے کرسیٔ صدارت خالی کر کے علامہ سے درخواست کی ہو گی کہ کرسی قبول کریں۔

خطبۂ صدارت انگریزی میں چھپا ہوا بائیس صفحات پر مشتمل کتابچہ تھا۔ علامہ لاہور میں گوراں دِتّا کپور کے کپور آرٹ پرنٹنگ ورکس سے کاپیاں چھپوا کر ساتھ لائے تھے۔ تعداد معلوم نہیں ہے۔[3] ”علامہ کا خطبۂ صدارت انگریزی میں چھپا ہوا تقسیم کیا گیا،“ مارہروی نے لکھا ہے۔ کچھ لوگوں نے ”نہایت اطمینان سے اس کو ایک طرف رکھ دیا... کچھ نے پڑھنے کی کوشش کی، مگر سمجھ نہ سکے اور آخر تک پہلا ہی صفحہ کھولے بیٹھے رہے۔ بعض پہلا صفحہ پڑھ کر... فوراً ہی آخری صفحے پر پہنچ گئے۔“ طالب علموں اور پچیس تیس افراد نے ”علامہ کی تقریر کے ساتھ ساتھ خطبے کا بالاستیعاب مطالعہ کیا۔“[4]

---

[1] Malik (2013), pp.360-369

[2] Malik (2013), pp.140-141, 144-145, 306-307, 332-333

[3] Iqbal (1930) *Presidential Address,* p.22

[4] مارہروی، ص ۳۵

آل انڈیا مسلم لیگ

اجلاس الٰہ آباد دسمبر ۱۹۳۰ء

خطبۂ صدارت از ڈاکٹر سر محمد اقبال

بیرسٹر ایٹ لاء، لاہور

[انگریزی سے ترجمہ][1]

حضرات!

میں آپ کا بیحد شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے ایسے موقع پر آل انڈیا مسلم لیگ کی صدارت کا اعزاز بخشا ہے، جو ہندوستان میں مسلم سیاسی فکر کی تاریخ کے نازک ترین لمحات ہیں۔ بلاشبہ اِس عظیم اجتماع میں ایسے اصحاب موجود ہیں جو میرے مقابلے میں وسیع تر سیاسی تجربہ رکھتے ہیں اور جن کی معاملہ فہمی کا میں بیحد احترام کرتا ہوں۔ اس لیے بڑی جسارت ہو گی کہ جن سیاسی فیصلوں کے لیے وہ یہاں جمع ہوئے ہیں اُن کے سلسلے میں اُن کی رہنمائی کا دعویٰ کروں۔ میں کسی جماعت کا رہنما نہیں ہوں اور نہ ہی کسی رہنما کا پیرو ہوں۔ میں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اسلام، اس کے قانون اور سیاسیات، اس کی ثقافت، اس کی تاریخ اور اس کے ادبیات کے مطالعے میں صرف کیا ہے۔ میرا خیال ہے کہ روحِ اسلامی اور اس کے بتدریج اظہار کے ساتھ مسلسل تعلق نے مجھے اسلام کو ایک عالمگیر حقیقت کی حیثیت سے دیکھنے کے لیے ایک خاص بصیرت عطا کی ہے۔ اس بصیرت کی قدر و قیمت جو بھی ہو، اسی کی روشنی میں اور یہ فرض کرتے ہوئے کہ ہندوستانی مسلمان اسلام کی روح کو برقرار رکھنے کا عزم رکھتے ہیں، میں یہ معمولی سا کام انجام دینا چاہتا ہوں کہ آپ کے فیصلوں میں آپ کی رہنمائی کرنے کے

---

[1] اس ترجمے کا بیشتر حصہ جہانگیر عالم کے ترجمے سے نقل کیا گیا ہے۔ بعض جگہوں پر دوسرے تراجم اور انگریزی متن کی روشنی میں ترمیم کی جا رہی ہے۔ جہانگیر عالم کا ترجمہ پہلی دفعہ مجلہ اقبال لاہور کے جولائی ۱۹۸۴ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ اسے جزوی ترمیم کے ساتھ ندیم شفیق ملک نے علامہ اقبال کا خطبۂ الٰہ آباد (۲۰۱۳)، ص ۱۴۸-۹۳، میں استعمال کیا جو میرا ماخذ ہے۔ انگریزی متن کے ترچھے (italicized) الفاظ کے ترجمے کو میں نے خط کشیدہ کر دیا ہے۔

بجائے آپ کو اُس بنیادی اصول کا صحیح اور واضح ادراک کروادوں جس پر میری رائے میں آپ کے فیصلوں کا عموماً انحصار ہونا چاہیے۔

اسلام اور تصوّرِ قومیت

اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ بطور ایک اخلاقی نصبُ العین اور سیاسی نظام کے — اور اِس اصطلاح سے میرا مطلب ایک ایسا معاشرہ ہے جس کا نظم و ضبط ایک خاص نظامِ قانون اور مخصوص اخلاقی نصبُ العین کے ماتحت عمل میں آیا ہو — اسلام ہی مسلمانانِ ہند کی تاریخ کا اہم ترین جزوِ ترکیبی رہا ہے۔ اسلام ہی نے وہ بنیادی جذبات اور وفا کیشی فراہم کی جو بکھرے ہوئے انسانوں اور گروہوں کو بتدریج متحد کرتی ہے اور بالآخر انہیں ایک متمیز قوم میں تبدیل کر دیتی ہے۔ در حقیقت یہ کہنا کوئی مبالغہ نہیں کہ دنیا بھر میں صرف ہندوستان ہی ایسا ملک ہے جہاں اسلام ایک "قوم ساز" قوت کی حیثیت سے بہترین کام کیا ہے۔ دوسرے ممالک کی طرح ہندوستان میں بھی اسلام کے نظامِ ترکیبی نے معاشرے میں جو صورت اختیار کی ہے، اُس کی وجہ صرف یہی ہے کہ اسلام ایک ایسی ثقافت کے طور پر موئثر ہوا ہے جس کی پشت پر ایک مخصوص اخلاقی نصبُ العین کارفرما ہے۔ میرے کہنے کا مقصد یہ ہے کہ مسلم معاشرہ اپنی نمایاں ہم آہنگی اور اندرونی اتفاق کے ساتھ اُن قوانین اور اداروں کا رہینِ منّت ہے جو اسلامی ثقافت سے وابستہ ہیں۔ لیکن یورپ کی سیاسی فکر نے جن خیالات کا پرچار کیا ہے، اُن کے باعث ہندوستان اور ہندوستان کے باہر مسلمانوں کی موجودہ نسل کا نقطۂ نظر بدلتا نظر آتا ہے۔ ہمارے نوجوان ان خیالات سے متاثر ہو کر یہ چاہتے ہیں کہ ان کے ملک میں بھی ایسے ہی خیالات زندہ و متحرک قوت بن جائیں۔ لیکن وہ اُن حقائق کی طرف گہری نظر سے توجہ نہیں دیتے جن کی بنا پر یورپ میں یہ صورت حال پیدا ہوئی۔ یورپ میں مسیحیت محض ایک رہبانی نظام تھا جو رفتہ رفتہ ایک وسیع کلیسائی نظام میں تبدیل ہو گیا۔ لُوتھر کا احتجاج دراصل اسی کلیسائی نظام کے خلاف تھا۔ وہ دنیاوی نوعیت کے کسی سیاسی نظام کی مخالفت نہ کر رہا تھا کیونکہ ایسا کوئی سیاسی نظام عیسائیت سے متعلق تھا ہی نہیں۔ اور اس نظام کے خلاف لُوتھر کی بغاوت حق بجانب تھی۔ گو میرے خیال میں لُوتھر کو اِس امر کا

احساس نہ تھا کہ یورپ میں جو صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی اُس کے پیشِ نظر اُس کی بغاوت کا نتیجہ یہ ہو گا کہ حضرت عیسیٰ کے عالمگیر اخلاقی نظام کی جگہ متعدد اور مختلف النوع ''قومی'' نظام پیدا ہو جائیں گے جن کا حلقہ بہت محدود ہو گا۔ گویا رُوسو اور لُوتھر جیسے لوگوں نے جو ذہنی تحریک شروع کی اُس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایک وحدت ٹوٹ کر ایک غیر مربوط اور منتشر کثرت میں تبدیل ہو گئی۔ ایک عالمگیر انسانی مطمح نظر کی جگہ قومی مطمح نظر نے لے لی، جس کے لیے ایک زیادہ محسوس و مرئی اساس مثلاً وطنیت کے عقیدے کی ضرورت تھی، اور جس کی تعبیر ایسے مختلف قسم کے سیاسی نظاموں سے ہوتی جو قومی بنیادوں پر نشو و ارتقا حاصل کرتے — اس بنیاد پر کہ صرف جغرافیائی حدود ہی سیاسی اتحاد کا واحد باعث ہو سکتی ہیں۔ اگر آپ یہ سمجھ بیٹھیں کہ مذہب کا تعلق صرف آخرت سے ہے تو مسیحیت کا جو حشر یورپ میں ہوا وہ بالکل قدرتی امر تھا۔ حضرت عیسیٰؑ کی عالمگیر اخلاقیات کی جگہ قومی اخلاقیات اور سیاسی نظاموں نے لے لی۔ اس کی وجہ سے یورپ اس نتیجے پر پہنچنے پر مجبور ہوا کہ مذہب ہر فرد کا ذاتی معاملہ ہے، جس کا دنیاوی زندگی سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام انسان کی وحدت کو مادے اور روح کی متصاد دُوئی میں تقسیم نہیں کرتا۔ اسلام میں خدا اور کائنات، روح اور مودہ، کلیسا اور ریاست ایک کُل کے مختلف اجزا ہیں، انسان کسی نجس دنیا کا باشندہ نہیں ہے جسے کسی ایسی روحانی دنیا کی خاطر ترک کرنا پڑے جو کہیں اور واقع ہے۔ اسلام کے نزدیک مادہ، روح کی وہ شکل ہے جو زمان و مکان میں ظاہر ہوتی ہے۔ غالباً مانوی فکر کے زیرِ اثر یورپ نے روح اور مادے کی دُوئی کو غور و فکر کے بغیر قبول کر لیا۔ آج اُس کے بہترین مفکر اِس ابتدائی غلطی کو محسوس کر رہے ہیں۔ لیکن اس کے سیاست دان بالواسطہ دنیا کو مجبور کر رہے ہیں کہ اسی اصول کو بے چون و چرا مسلمہ عقیدے کے طور پر قبول کر لے۔ دراصل روحانی اور دنیاوی زندگی میں امتیاز کرنے کا یہی غلط اصول ہے جس نے یورپ کے مذہبی اور سیاسی افکار کو متاثر کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا ہے کہ یورپی ریاستوں سے عملاً مسیحیت بالکل بے دخل ہو چکی ہے اور مختلف غیر مربوط ریاستیں قائم ہو گئی ہیں۔ ان میں انسانی جذبے کے بجائے قومی اغراض کی بالادستی ہے۔ لیکن یہی غیر مربوط ریاستیں مسیحیت کے اخلاق و عقائد کو پاؤں تلے کچل ڈالنے کے بعد اب ایک وفاقی یورپ کا خواب دیکھ رہی ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ مسیحی کلیسا کے ادارے نے انہیں اتحاد بخشا تھا۔

حضرت عیسیٰؑ کے انسانی اخوت کے عالمگیر تصوّر کو اُنہوں نے مضبوط و مستحکم کرنے کے بجائے لُوتھر کے زیرِ اثر برباد کر دیا اور اب پھر اُس اتحاد کی ضرورت کو محسوس کر رہے ہیں۔ دنیائے اسلام میں کسی لُوتھر کا ظہور ممکن نہیں۔ اس لیے کہ اسلام میں ایسا کوئی کلیسائی نظام موجود نہیں ہے جیسا کہ ازمنہ وسطیٰ کی مسیحی دنیا میں موجود تھا۔ اور جس کو توڑنے کی ضرورت محسوس کی گئی تھی۔ دنیائے اسلام میں ایک عالمگیر نظامِ سیاست موجود ہے جس کے بنیادی نکات وحی کا نتیجہ ہیں۔ لیکن چونکہ عرصۂ دراز سے ہمارے فقہا جدید دنیا سے بے تعلق رہے ہیں اس لیے اس نظام کو نئے سرے سے مرتب کر کے مستحکم کرنے کی ضرورت ہے۔ میں نہیں جانتا کہ قومیت کے تصوّر کا اسلامی دنیا میں آخرکار کیا حشر ہو گا۔ کیا اسلام اسے اپنے جذب کر کے اس کی اُسی طرح قلب ماہیت کر دے گا جیسے کہ پہلے بہت سے ایسے تصوّرات کی کر چکا ہے جو اسلام سے مختلف تھے؟ یا خود اسلام کے اندر کوئی زبردست تغیر رونما ہو جائے گا؟ اس بارے میں پیش گوئی کرنا مشکل ہے۔ لیڈن (ہالینڈ) کے پروفیسر وینسنک نے حال ہی میں مجھے لکھا، ''مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسلام ایک ایسے بحران میں داخل ہو رہا ہے کہ جس نازک دور میں عیسائیت کو داخل ہوئے ایک صدی سے زیادہ (عرصہ) گزر چکا ہے۔ سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ قدیم تصورات کو ترک کر دینے کے ساتھ ساتھ مذہب کی بنیادوں کو کس طرح محفوظ رکھا جائے۔ میرے لئے کچھ کہنا مشکل ہے کہ اس کا نتیجہ عیسائیت کے حق میں کیا ہو گا اور اسلام کے متعلق کوئی پیش گوئی کرنا اور دشوار ہے۔'' اس وقت قومیت کے نظریے نے مسلمانوں کے نقطہ نگاہ کو نسل پرستی سے آلودہ کر دیا ہے اور اس طرح (یہ نظریہ) اسلام کے انسانیت پرور مقاصد میں بری طرح حائل ہو رہا ہے۔ ممکن ہے کہ نسل پرستی کے احساسات کی ترقی ایسے معیاروں کا محرک ہو جو اسلام کے معیار سے مختلف بلکہ متضاد ہو۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ مجھے اس بظاہر علمی بحث کے لئے معاف فرمائیں گے۔ آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اس اجلاس کی صدارت کے لئے ایک ایسے شخص کو منتخب کیا ہے جو اس امر سے مایوس نہیں ہے کہ اسلام اب بھی ایک زندہ قوت ہے جو انسان کے تصور کو جغرافیائی حدود سے آزاد کرا سکتی ہے جس کا یہ عقیدہ ہے کہ مذہب کو فرد اور ریاست کی زندگی میں بے انتہا اہمیت حاصل ہے اور جس کا ایمان ہے کہ اسلام بجائے خود تقدیر ہے اور کسی دوسری تقدیر کے

تابع نہ ہو گا۔ ایسا شخص مجبور ہے کہ معاملات کو خود اپنے ہی نقطہ نگاہ سے دیکھے۔ یہ خیال نہ کریں کہ جس مسئلے کی طرف میں اشارہ کر رہا ہوں وہ محض ایک نظری مسئلہ ہے۔ یہ ایک زندہ اور عملی مسئلہ ہے جس سے اسلام کے دستورِ حیات اور نظامِ عمل کے تار و پود متاثر ہو سکتے ہیں۔ ہندوستان میں ایک ممتاز ثقافتی وحدت کی حیثیت سے صرف اس مسئلے کے صحیح حل پر آپ کے مستقبل کا انحصار ہے۔ ہماری تاریخ میں اسلام پر آزمائش کا ایسا سخت دور کبھی نہیں آیا تھا جیسا کہ آج درپیش ہے۔ ایک قوم کو یہ حق تو حاصل ہے کہ وہ اپنے معاشرتی ڈھانچے کے بنیادی اُصولوں میں ترمیم کرے یا ان میں نئے معنی تلاش کرے یا انھیں بالکل مسترد کر دے، لیکن نئے تجربات کرنے سے پہلے واضح طور پر یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہو گا۔ میں نہیں چاہتا کہ جس انداز سے میں اس اہم مسئلے کو دیکھ رہا ہوں، اس سے یہ خیال پیدا ہو کہ جن حضرات کی سوچ میری سوچ سے مختلف ہے، میں ان سے جھگڑا کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کا اجتماع مسلمانوں کا اجتماع ہے۔ میرا خیال ہے کہ آپ اسلام کے مقاصد اور اس کی روح سے وفادار رہنے کے خواہش مند ہیں۔ میرا واحد مقصد یہ ہے کہ موجودہ صورتِ حال کے بارے میں جو میری دیانت دارانہ رائے ہے اس کا صاف صاف اظہار کر دوں۔ میرے خیال میں صرف یہی ایک صورت ہے کہ میں آپ کے سیاسی عمل کی راہوں کو اپنے عقائد کی روشنی سے منور کر سکوں۔

ایک ہندوستانی قوم کا اتحاد

اب سوال یہ ہے کہ اصل مسئلہ اور اس کی صحیح حیثیت کیا ہے۔ کیا مذہب صرف ایک ذاتی معاملہ ہے؟ کیا آپ چاہتے ہیں کہ ایک اخلاقی اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے اسلام کا بھی وہی حشر ہو جو مغرب میں عیسائیت کا ہوا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی نصب العین تو باقی رکھیں لیکن اس کے نظامِ سیاست کو رد کر کے نظریہ قومیت کی بنیاد پر سیاسی نظامات اختیار کر لیں جن میں مذہبی رجحان کو کوئی کردار ادا کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی؟ ہندوستان میں یہ سوال خصوصی اہمیت کا حامل ہے کیونکہ مسلمان یہاں اقلیت میں ہیں۔ یہ دعویٰ کہ مذہب صرف انفرادی اور ذاتی واردات کا معاملہ ہے، اہلِ مغرب کی زبان پر تعجب خیز معلوم نہیں ہوتا۔ یورپ میں عیسائیت کا تصور ہی مشرب رہبانیت

ہے، جس میں مادی دنیا سے منہ موڑ کر اپنی تمام تر توجہ روحانی دنیا پر مرکوز کی جاتی ہے۔ اس سے وہی منطقی نتیجہ مرتب ہوتا ہے جس کا اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن رسولِ اکرمؐ کے مذہبی واردات کی نوعیت جیسا کہ قران پاک میں بتایا گیا ہے بالکل مختلف ہے۔ یہ محض حیاتیاتی نوعیت کی واردات نہیں جس کا تعلق صرف تجربہ کرنے والے کی اندرونی ذات سے ہو اور اس کے معاشرتی ماحول پر کوئی رد عمل نہ ہو۔ یہ انفرادی واردات ایک معاشرتی نظام کی تخلیق کا باعث ہوئی۔ اس کا فوری نتیجہ ایک ایسے نظام سیاست کے بنیادی اُصولوں کی صورت میں ظاہر ہوا جس میں قانونی تصورات مضمر تھے اور جس کی معاشرتی اہمیت کو محض اس لئے نظر انداز نہیں کیا جاسکتا کہ ان کی بنیاد وحی والہام پر ہے۔ اس لئے اسلام کا مذہبی نصب العین اس کے معاشرتی نظام سے مربوط و منسلک ہے جو خود اس کا اپنا پیدا کردہ ہے۔ اگر ایک کو رد کیا گیا تو دوسرا خود بخود مسترد ہو جائے گا اس لئے ایک مسلمان اس بات کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ نظام سیاست کو ایسے قومی خطوط پر مرتب کیا جائے جس سے اسلام کے اُصول اتحاد کی نفی ہو جائے۔ یہی مسئلہ اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کے سامنے ہے۔ رینان کا قول ہے، ”انسان نہ نسل کی قید گوارا کر سکتا ہے نہ مذہب کی، نہ دریاؤں کے بہاؤ کی، نہ پہاڑی سلسلوں کی۔ لوگوں کا ایک بڑا گروہ جو سمجھ دار اور دلوں میں گرمی جذبات رکھتا ہو، اپنے اندر ایک اخلاقی شعور پیدا کر لیتا ہے، جسے قوم کا نام دیا جاتا ہے“۔ اس قسم کی ترکیب بالکل ممکن ہے۔ اگرچہ یہ ایک طویل اور صبر آزما عمل ہے، اس لئے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کی یکسر نئی تشکیل کی جائے اور ان کے لئے نئے احساسات و جذبات مہیا کئے جائیں۔ اگر اکبر کا دین الٰہی یا کبیر کی تعلیمات اس ملک کے عوام میں مقبول ہو جاتیں تو ممکن ہے کہ ہندوستان میں یہ ایک حقیقت بن جاتی، لیکن تجربے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی متعدد ذاتوں اور مذہبوں میں ایسا کوئی رجحان موجود نہیں ہے کہ وہ اپنی انفرادی حیثیت کو ترک کر کے ایک وسیع تر جماعت کی صورت اختیار کر لیں۔ ہر گروہ اپنی الگ اجتماعی حیثیت کو برقرار رکھنے کے لئے مضطرب ہے۔ اس قسم کا اخلاقی شعور جو رینان کے نقطہ نظر کے مطابق قوم کی تخلیق کے لئے ناگزیر ہے، ایسی قربانی کا طالب ہے جو ہندوستان کے لوگ دینے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ اس لئے ہندوستانی قوم کا اتحاد جماعتوں کی نفی میں نہیں بلکہ ان کے باہمی اشتراک اور ہم آہنگی سے حاصل ہو سکتا ہے۔ صحیح تدبر کا

تقاضا ہے کہ حقائق کو نظر انداز نہ کیا جائے خواہ وہ کتنے ہی ناخوش گوار کیوں نہ ہوں۔ عملی راہ یہ نہیں کہ ایسی صورت حال کو فرض کر لیا جائے جو فی الواقع موجود نہ ہو بلکہ (طریق کار یہ ہونا چاہیے کہ) حقائق کو تسلیم کرتے ہوئے ان سے حتی الامکان فائدہ اُٹھانے کی کوشش کی جائے۔ ہندوستان اور ایشیا کی تقدیر کا انحصار صرف اس بات پر ہے کہ ہندوستانی قوم کا اتحاد اسی نہج پر قائم کریں۔ ہندوستان چھوٹا ایشیا ہے۔ اس کے لوگوں کا ایک حصہ مشرق میں بسنے والی اقوام کے ساتھ اور دوسرا حصہ وسطی اور مغربی ایشیا کی اقوام کے ساتھ ثقافتی روابط رکھتا ہے۔ گر ہندوستان میں اشتراک و تعاون کے موثر حصول کی راہ نکل آئی تو اس قدیم سرزمین میں جو اپنے باشندوں کی کسی فطری کم زوری کی وجہ سے نہیں بلکہ اپنے تاریخی عمل کی وجہ سے ایک طویل عرصے سے مصائب کی شکار رہی ہے، امن و امان پیدا ہو جائے گا اور اسی وقت یہ اُصول ایشیا کے تمام مسائل بھی حل کر دے گا۔

اس کے باوجود یہ امر تکلیف دہ ہے کہ باہمی تعاون کے حصول کی تمام کوششیں بے کار ثابت ہوئیں۔ ان کی ناکامی کا سبب کیا ہے؟ شاید ہم ایک دوسرے کی نیتوں پر شک و شبہ کرتے ہیں اور دل میں ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنے کے خواہش مند ہیں یا یہ ممکن ہے کہ باہمی تعاون کے بلند مقاصد کے لئے ہم اتنا ایثار بھی نہیں کر سکتے کہ جو اجارہ داریاں (اختیارات) حالات نے ہمارے ہاتھوں میں سونپ دی ہیں، ان سے دست بردار ہو جائیں۔ ہم اپنی انانیت کو قوم پرستی کے پردے میں چھپاتے ہیں۔ بظاہر ہم فراخ دل اور حب الوطنی کے دعوے دار ہیں مگر بہ باطن ہم ذات پات اور قبیلہ پرستی کی تنگ نظری میں مبتلا ہیں۔ غالباً ہم یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں کہ ہر گروہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی تہذیبی روایات کے مطابق آزادی کے ساتھ ترقی کرے۔ لیکن ہماری ناکامی کے اسباب کچھ بھی ہوں میں اب بھی پر اُمید ہوں واقعات کا رحجان داخلی ہم آہنگی کی طرف بڑھتا ہوا نظر آتا ہے اور جہاں تک میں مسلمانوں کے ذہن کو سمجھ سکا ہوں مجھے یہ اعلان کرنے میں کوئی تامل نہیں ہے کہ اگر فرقہ وارانہ اُمور کے مستقل تصفیہ کے لئے اس اُصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ ہندوستانی مسلمان کو اپنی روایات اور ثقافت کے مطابق اپنے ہندوستانی وطن میں مکمل اور آزادانہ ترقی کرنے کا حق حاصل ہے تو وہ ہندوستان کی آزادی کے لئے اپنا سب کچھ قربان کرنے پر تیار ہو جائے گا۔ یہ اُصول

کہ ہر گروہ اپنے عقیدے کے مطابق آزادانہ ترقی کرنے کا حق رکھتا ہے تنگ نظرانہ فرقہ پرستی کے جذبے پر مبنی نہیں ہے۔ فرقہ پرستی کی بھی کئی صورتیں ہیں۔ جو فرقہ دوسرے فرقوں کی طرف بد خواہی کے جذبات رکھتا ہو وہ ہیچ اور ذلیل ہے۔ میں دوسری قوموں کے رسوم، قوانین، معاشرتی اور مذہبی اداروں کا بے حد احترام کرتا ہوں۔ یہی نہیں بلکہ قرآن پاک کی تعلیم کے مطابق ضرورت پڑے تو ان کی عبادت گاہوں کی حفاظت بھی میرا فرض ہے۔ اس کے باوجود مجھے اس جماعت سے محبت ہے جو میری حیات اور میرے اوضاع و اطوار کا سرچشمہ ہے اور جس نے مجھے اپنا مذہب، اپنا ادب، اپنی فکر اور اپنی ثقافت دے کر میری تشکیل اس صورت میں کی ہے کہ جیسا میں ہوں، اور اس طور پر میرے ماضی کو از سرِ نو زندہ کر کے وہ میرے شعور کا ایک زندہ و فعال عنصر بن چکی ہے۔ نہرو رپورٹ کے مرتبین نے بھی فرقہ پرستی کے اس اعلیٰ و ارفع پہلو کا اعتراف کیا ہے۔ سندھ کی علیحدگی پر بحث کرتے ہوئے وہ کہتے ہیں، ''یہ کہنا کہ قومیت کے وسیع نقطہ نگاہ کے ماتحت کسی فرقہ وارانہ صوبے کا قیام مناسب نہیں، بالکل ایسا ہے جیسے یہ دعویٰ کہ وسیع تر بین الاقوامی نقطہ نگاہ کے مطابق علیحدہ قوموں کا وجود مناسب نہیں، ان دونوں بیانات میں ایک حد تک صداقت موجود ہے لیکن بین الاقوامیت کے بڑے سے بڑے حامی کو بھی اس امر کا اعتراف کرنا پڑے گا کہ قوموں کی خود مختاری کے بغیر بین الاقوامی ریاست کا قیام مشکل ہے۔ اسی طرح مکمل تمدنی آزادی کے بغیر، اور فرقہ پرستی اپنی اعلیٰ و ارفع سطح پر تمدن ہی ہے، ایک ہم آہنگ قوم کی تشکیل مشکل ہے۔''

ہندوستان میں مسلم ہندوستان

لہٰذا ہندوستان جیسے ملک میں ایک ہم آہنگ کل کی تشکیل کے لئے ارفع و اعلیٰ سطح پر فرقہ پرستی کا وجود ناگزیر ہے۔ یورپ کے ممالک کی طرح ہندوستانی معاشرے کی اکائیاں علاقائی نہیں ہیں۔ ہندوستان ایک براعظم ہے جس میں مختلف نسلوں، مختلف زبانیں بولنے والے اور مختلف مذاہب کے پیروکار آباد ہیں۔ ان کے اعمال و افعال میں وہ احساس موجود نہیں ہے جو ایک ہی نسل کے لوگوں میں ہوتا ہے، یہاں تک کہ ہندو بھی کوئی متجانس جماعت نہیں ہیں۔ ہندوستان میں یورپی جمہوریت کے اُصول کا

اطلاق مذہبی فرقوں کے وجود کو تسلیم کئے بغیر ممکن نہیں ہے۔ لہٰذا مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ ہندوستان کے اندر ایک مسلم ہندوستان قائم کیا جائے بالکل حق بجانب ہے۔ میری رائے میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس منعقدہ دہلی کی قرارداد کا محرک یہی بلند نصب العین ہے کہ ایک ہم آہنگ کل کے قیام کے لئے ضروری ہے کہ اس کے اجزا کی انفرادیت کا گلہ گھونٹنے کی بجائے انھیں مواقع دیے جائیں کہ وہ ان ممکنہ قوتوں کو بروئے کار لا سکیں جو ان میں پوشیدہ ہیں اور مجھے یقین ہے کہ یہ ایوان مسلم مطالبات کی، جو اس قرارداد میں موجود ہیں، پورے شد و مد سے تائید کرے گا۔ میں ذاتی طور پر ان مطالبات سے بھی ایک قدم آگے جانا چاہتا ہوں جو اس قرارداد میں پیش کئے گئے ہیں۔ میری خواہش ہے کہ پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک ریاست بنا دیا جائے۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ کم از کم ہندوستان کے شمال مغرب میں ایک مربوط مسلم ریاست، خواہ یہ ریاست سلطنت برطانیہ کے اندر حکومت خود اختیاری حاصل کرے یا اس کے باہر، ہندوستان کے شمالی مغربی مسلمانوں کا آخر کار مقدر ہے۔ یہ تجویز نہرو کمیٹی کے سامنے پیش کی گئی تھی۔ انھوں نے اسے اس بنا پر مسترد کر دیا کہ اگر اس پر عمل درآمد کیا گیا تو بڑی وسیع ریاست وجود میں آ جائے گی جس کا انتظام مشکل ہو گا۔ جہاں تک رقبے کا تعلق ہے یہ بات درست ہے، لیکن آبادی کے لحاظ سے مجوزہ ریاست بعض موجودہ ہندوستانی صوبوں سے چھوٹی ہو گی۔ انبالہ ڈویژن اور شاید کچھ ایسے اضلاع کو جہاں غیر مسلموں کی اکثریت ہے الگ کر دینے سے اس کی وسعت اور بھی کم ہو جائے گی اور آبادی میں مسلمان زیادہ ہوں گے۔ اس طرح (ان اضلاع کی) علیحدگی سے اپنی حدود کے اندر یہ مربوط ریاست غیر مسلموں کے حقوق کی حفاظت بہتر طریق سے کر سکے گی۔ اس تجویز سے نہ ہندوؤں کو پریشان ہونا چاہیے نہ انگریزوں کو۔ ہندوستان دنیا میں سب سے بڑا اسلامی ملک ہے۔ اسلام کو بحیثیت ایک تمدنی قوت کے زندہ رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ وہ ایک مخصوص علاقے میں اپنی مرکزیت قائم کر سکے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے اس سب سے زیادہ جاندار حصے کو جس نے برطانیہ کے ناروا سلوک کے باوجود فوج اور پولیس میں شریک ہو کر انگریزوں کی حکومت کو اس ملک میں ممکن بنایا ہے، ایک جگہ مرکوز کرنے سے نہ صرف ہندوستان بلکہ ایشیا کا مسئلہ بھی حل ہو جائے گا۔ اس سے ان کا احساسِ ذمہ داری قوی اور

حب الوطنی کا جذبہ گہرا ہو جائے گا۔ ہندوستان کے جسد سیاسی کے اندر رہتے ہوئے اگر انھیں نشو و نما کا پورا موقع دیا گیا تو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمان بیرونی حملوں کے خلاف، خواہ وہ سنگینوں سے کئے جائیں یا افکار سے، ہندوستان کے بہترین محافظ ثابت ہوں گے۔ پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی ۵۶ فیصد ہے، لیکن ہندوستان کی پوری فوج میں ان کا تناسب ۵۴ فی صد ہے۔ اگر انیس ہزار گورکھوں کو جو نیپال کی آزاد ریاست سے بھرتی کئے جاتے ہیں، نکال دیا جائے تو فوج میں پنجاب کا تناسب ۶۲ فی صد ہو جائے گا۔ اس اندازے میں وہ چھ ہزار جنگ جو شامل نہیں جو شمال مغربی سرحدی صوبہ اور بلوچستان سے بھرتی کئے جاتے ہیں۔ اس سے آپ ان تمام امکانات کا اندازہ لگا سکتے ہیں جو غیر ملکی جارحیت کے خلاف ہندوستان کے دفاع کے سلسلے میں شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں۔ عزت (مآب) جناب سری نواس شاستری کا خیال ہے کہ شمال مغربی سرحد کے ساتھ ساتھ خود مختار مسلم ریاستوں کے قیام کے لئے مسلمانوں کا مطالبہ اس خواہش سے پیدا ہوا ہے کہ ضرورت پیش آئے تو حکومت ہند پر دباؤ ڈالا جا سکے۔ میں واضح طور پر بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کے دل میں ایسا کوئی جذبہ موجود نہیں ہے جس کا وہ ہم پر الزام لگا رہے ہیں۔ ان کا مدعا صرف یہ ہے کہ وہ آزادانہ ترقی کر سکیں جو اس قسم کی وحدانی حکومت میں ممکن نہیں جس کا تصور قوم پرست ہندو سیاست دانوں کے ذہن میں ہے اور جس کا اظہار پورے ہندوستان میں ان کا مستقل فرقہ وارانہ غلبہ حاصل کرنا ہے۔

ہندوؤں کو خوفزدہ نہیں ہونا چاہیے کہ خود مختار مسلم ریاستوں کے قیام سے ایک طرح کی مذہبی حکومتیں قائم ہو جائیں گی۔ اس سے پہلے میں بتا چکا ہوں کہ اسلام میں مذاہب کا مفہوم کیا ہے۔ حقیقتاً اسلام میں کلیسیائی نظام نہیں ہے۔ یہ ایک ایسی ریاست ہے جس کا اظہار روسو سے بھی بہت پہلے معاہدہ عمرانی کی صورت میں ہو چکا تھا۔ اس کے پیچھے ایک اخلاقی نصب العین ہے جو انسان کو کسی خاص علاقے کی سرزمین سے وابستہ نہیں سمجھتا بلکہ وہ ایک روحانی ہستی ہے جو ایک اجتماعی معاشرتی نظام کا زندہ و متحرک جزو اور چند حقوق و فرائض کا حامل ہے۔ مسلم ریاست کے کردار کا اندازہ ٹائمز آف انڈیا کے اس اداریے سے لگایا جا سکتا ہے جو کچھ روز پہلے ہندوستانی بینکوں کی تحقیقاتی کمیٹی کے بارے میں لکھا گیا تھا۔ اخبار لکھتا ہے کہ "قدیم ہندوستان میں سود کی شرح کے متعلق حکومت نے قوانین بنائے

جب کہ اسلام میں سود لینا صریحاً ممنوع ہے، لیکن مسلم دور میں ہندوستان کی مسلم حکومتوں نے سود پر کوئی پابندیاں عائد نہیں کیں" اس لئے میں ہندوستان اور اسلام کی فلاح و بہبود کے لئے ایک متحدہ مسلم ریاست کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں۔ اس سے ہندوستان کے اندر توازن قوت کی بدولت امن و امان قائم ہو جائے گا اور اسلام کے لئے ایک موقع فراہم کرے گا کہ وہ ان اثرات سے آزاد ہو جائے جو عربی شہنشاہیت نے اس پر ڈال دیے تھے اور اپنے قوانین، اپنی تعلیم اور اپنی ثقافت کو حرکت میں لا کر ان کی اصل روح اور عصر جدید کی روح سے رابطہ قائم کر سکے۔

وفاقی ریاستیں

اس طرح یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ چونکہ ہندوستان میں آب و ہوا، نسلوں، زبانوں، عقاید اور معاشرتی نظاموں کے کثیر اختلافات موجود ہیں، اس لئے ایسی خود مختار ریاستوں کا قیام جن کی بنیاد زبان، نسل، تاریخ، مذہب کی یکسانیت اور اقتصادی مفاد کے اشتراک پر ہو، ہندوستان میں ایک مستحکم آئینی نظام حاصل کرنے کا واحد راستہ ہے۔ سائمن رپورٹ میں وفاق کا جو تصور پیش کیا گیا ہے اس کے تحت ضروری ہے کہ مرکزی قانون ساز اسمبلی کو عوام کی منتخب کردہ اسمبلی کی حیثیت سے ختم کر دیا جائے اور اسے وفاقی ریاستوں کے نمائندوں پر مشتمل اسمبلی کی صورت دی جائے۔ سائمن رپورٹ میں یہ بھی مطالبہ کیا گیا ہے کہ ان ہی اُصولوں پر جن کا میں نے ذکر کیا ہے، صوبوں کی از سر نو تقسیم ہونی چاہیے اور 'رپورٹ' میں دونوں (تجاویز) کی سفارش کی گئی ہے۔ میں اس نقطہ نظر کی دل سے تائید کرتا ہوں بلکہ یہ تجویز پیش کروں گا کہ سائمن رپورٹ کی سفارش کے مطابق صوبوں کی از سر نو تقسیم کرتے وقت دو شرطوں کو پورا کرنا ضروری ہے۔ (اولاً) یہ تقسیم نئے دستور کے اجرا سے پہلے عمل میں آنی چاہیے اور (دوم) یہ اس طرح ہونی چاہیے کہ فرقہ وارانہ مسئلہ ہمیشہ کے لئے طے ہو جائے۔ صوبوں کی مناسب تقسیم سے مخلوط اور جداگانہ انتخاب کا مسئلہ ہندوستان کے آئین کے بارے میں نزاع کو خود بخود ختم کر دے گا۔ اس نزاع کا باعث بڑی حد تک صوبوں کی موجودہ تقسیم ہے۔ ہندو کا خیال ہے کہ جداگانہ انتخاب قومیت کے منافی ہے کیونکہ اس کے خیال میں لفظ قوم کا مفہوم یہ ہے کہ

ہندوستان کے تمام باشندے باہم اس طرح خلط ملط ہو جائیں کہ ان کے اندر کسی مخصوص ملت کا انفرادی وجود باقی نہ رہے، لیکن صورت حال ایسی نہیں ہے اور نہ ہی ہم چاہتے ہیں کہ ایسی ہو۔ ہندوستان میں مختلف مذاہب اور نسلیں موجود ہیں۔ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کی عام معاشی پستی، ان کی بے حد مقروضیت خصوصاً پنجاب میں، اور صوبوں کی موجودہ تقسیم کے مطابق بعض صوبوں میں ان کی ناکافی اکثریت کو مد نظر رکھیے تو آپ پر روشن ہو جائے گا کہ مسلمان جداگانہ انتخاب کے لئے کیوں مضطرب ہیں۔ ایسے ملک اور ان حالات میں علاقہ وارانہ انتخاب سے تمام مفادات کی مکمل نمائندگی ممکن نہیں ہے۔ اس کا نتیجہ صرف یہ ہو گا کہ ایک گروہ کا غلبہ قائم ہو جائے گا۔ اگر صوبوں کی تقسیم اس طور پر ہو جائے کہ ہر صوبے میں کم و بیش ایسے گروہ بستے ہوں جن میں لسانی، نسلی، تمدنی اور مذہبی اتحاد پایا جاتا ہے تو مسلمانوں کو علاقہ وارانہ انتخاب پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا۔

سائمن رپورٹ کا تصوّرِ وفاق

لیکن جہاں تک مرکزی وفاقی ریاست کے اختیارات کا تعلق ہے انگلستان اور ہندوستان کے پنڈتوں کے تجویز کردہ دساتیر میں جو باریک اختلاف ہے، اس سے دونوں کی نیتوں کا اظہار ہو جاتا ہے۔ ہندوستان کے پنڈت مرکزی حکومت کے موجودہ اختیارات میں کوئی تبدیلی نہیں چاہتے۔ ان کی صرف یہ خواہش ہے کہ یہ حکومت پوری طرح مرکزی مقننہ کے سامنے جواب دہ ہو جس میں ان کی اکثریت اس وقت اور بھی زیادہ طاقت ور ہو جائے گی جب نامزد اراکین کا طریقہ ختم ہو جائے گا۔ اس کے بر عکس انگلستان کے پنڈتوں نے یہ محسوس کرتے ہوئے کہ اگر جمہوریت کا اطلاق مرکز میں کیا گیا تو یہ ان کے مفاد کے خلاف ہو گا اور ذمہ دارانہ طرز حکومت کی جانب پیش قدمی کی صورت میں تمام اختیارات ان کے ہاتھوں سے نکل جائیں گے۔ اس لئے انھوں نے مرکز کی بجائے صوبوں میں جمہوریت کا تجربہ منتقل کر دیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انھوں نے وفاق کے اُصول کو رائج کیا ہے اور اس کے متعلق کچھ تجاویز پیش کر کے بظاہر آغاز کر دیا ہے لیکن ان کی سوچ کے مطابق اس اُصول کی جو قدر و قیمت ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے جو مسلم ہندوستان کے پیش نظر ہے۔ مسلمان وفاقی طرز حکومت کا مطالبہ اس

لئے کرتے ہیں کہ یہ ہندوستان کے سب سے مشکل مسئلہ یعنی فرقہ وارانہ مسئلہ کا حل ہے۔ وفاق کے بارے میں شاہی کمیشن کا نقطہ نگاہ اگرچہ اُصولاً درست ہے، لیکن اس سے وفاقی ریاستوں میں ذمہ دارانہ حکومت کا قیام مقصود نہیں ہے۔ اس کا مدعا بجز اس کے کچھ نہیں کہ ہندوستان میں جمہوریت کے نفاذ سے انگریزوں کے لئے جو صورت حال پیدا ہو گئی ہے اس سے کسی طرح فرار حاصل کیا جائے اور فرقہ وارانہ مسئلے کا یا تو بالکل اس میں خیال ہی نہیں کیا گیا یا اسے ویسے ہی چھوڑ دیا ہے۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ جہاں تک حقیقی وفاق کا تعلق ہے سائمن رپورٹ نے وفاق کے اُصول کی فی الواقع نفی کر دی ہے۔ 'نہرو رپورٹ' نے یہ دیکھتے ہوئے کہ مرکزی اسمبلی میں ہندوؤں کی اکثریت ہے، وحدانی حکومت کی سفارش کی کیونکہ اس سے تمام ہندوستان میں ہندوؤں کا غلبہ ہو جائے گا۔ سائمن رپورٹ ایک غیر حقیقی وفاق کے باریک پردے میں موجودہ برطانوی اقتدار کو قائم رکھنا چاہتی ہے۔ اس کی وجہ کچھ تو یہ ہے کہ قدرتی طور پر برطانیہ اس اقتدار کو چھوڑنا نہیں چاہتا جو اب تک اسے حاصل رہا ہے اور کچھ اس لئے کہ اگر فرقہ وارانہ مسئلے کا فیصلہ نہ ہوا تو پھر اقتدار اپنے قبضے میں رکھنے کے لئے برطانیہ کو اچھا بہانہ مل جائے گا۔ میں خود مختار ہندوستان میں وحدانی حکومت کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ جنھیں 'باقی ماندہ اختیارات' کہا جاتا ہے وہ خود مختار ریاستوں کو ملنے چاہئیں۔ مرکزی وفاقی ریاست کے پاس صرف ایسے اختیارات ہونے چاہئیں جو وفاق تشکیل کرنے والی ریاستیں اپنی رضا مندی سے واضح طور پر اس کے سپرد کریں۔ میں ہندوستان کے مسلمانوں کو کبھی یہ مشورہ نہیں دوں گا کہ کسی ایسے نظام حکومت پر خواہ وہ برطانوی ہو یا ہندوستان میں وضع کیا گیا ہو، اظہار رضامندی کریں جو حقیقی وفاق کے اُصول کی نفی کرے یا ان کے جداگانہ سیاسی وجود کو تسلیم نہ کرے۔

گول میز کانفرنس اور وفاق

مرکزی حکومت کے نظام میں تبدیلی رائج کرنے سے قبل انگریزوں نے بہت پہلے اس کے بارے میں سوچ لیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ آخر کار یہ اعلان کیا گیا کہ گول میز کانفرنس میں والیان ریاست کی شرکت ضروری ہے۔ ہندوستان کے لوگوں بالخصوص اقلیتوں کو اس سے ایک نوع کی حیرت ہوئی کہ والیان

ریاست نے گول میز کانفرنس میں ڈرامائی طور پر یہ اعلان کر دیا کہ وہ کل ہند وفاق میں شامل ہونے کو تیار ہیں۔ ان کے اس اعلان کے بعد ہندو مندوبین نے جو اب تک وحدانی طرز حکومت کے زبردست حامی تھے چپکے سے وفاق کی سکیم کو منظور کر لیا۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے جناب شاستری نے سر جان سائمن کو ہندوستان کے لئے وفاق کی سکیم کی سفارش کرنے پر ہدفِ تنقید بنایا، لیکن دفعتاً وہ بھی وفاق پر رضامند ہو گئے اور کانفرنس کے ابتدائی اجلاس میں اپنی رضامندی کا اظہار کر دیا جس سے انگلستان کے وزیر اعظم کو موقع ملا کہ وہ اپنی اختتامی تقریر میں چند نہایت ہی برجستہ اشارات کر سکیں۔ یہ تمام باتیں انگریزوں کے لئے بھی ایک خاص مفہوم رکھتی ہیں جو وفاق میں والیان ریاست کی شرکت کے خواہاں تھے اور ہندوؤں کے لئے بھی جنہوں نے بلا تامل کل ہند وفاق کے قیام کو منظور کر لیا۔ حقیقت یہ ہے کہ وفاق کی سکیم میں والیان ریاست کی شرکت سے، جن میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے، دو مقصد حاصل ہوتے ہیں۔ ایک طرف تو اہم ترین مقصد ہے کہ ہندوستان میں برطانوی اقتدار تقریباً اسی طرح قائم رہے گا جیسے اب ہے اور دوسری طرف کل ہند وفاقی اسمبلی میں اس سے ہندوؤں کو بڑی بھاری اکثریت حاصل ہو جائے گی۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مرکزی حکومت کی آخری شکل کے بارے میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں جو اختلاف موجود ہے برطانوی سیاست دان والیان ریاست کے ذریعے نہایت چالاکی کے ساتھ اس سے فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔ خود والیانِ ریاست کو اس سکیم میں اپنی مستبدانہ حکومت کا تحفظ نظر آتا ہے۔ اگر مسلمانوں نے خاموشی کے ساتھ اس قسم کی سکیم کو منظور کر لیا تو ہندوسان میں ان کا سیاسی وجود بہت جلد ختم ہو جائے گا۔ اس طرح ہندوستانی وفاق کی پالیسی ہندو والیان ریاست کے ہاتھوں میں ہو گی جن کی مرکزی وفاقی اسمبلی میں اکثریت ہو گی۔ دولت برطانیہ کے مفاد کے معاملات میں وہ ہمیشہ انگریزوں کا ساتھ دیں گے اور جہاں تک ملک کے اندرونی نظم و نسق کا تعلق ہے وہ ہندوؤں کے تسلط اور اقتدار کو قائم رکھنے اور مضبوط کرنے میں مدد دیں گے۔ بالفاظ دیگر یہ سکیم برطانوی سامراج اور ہندو ہندوستان کے درمیان ایک قسم کی مفاہمت ہے یعنی اگر تم میرا اقتدار ہندوستان میں قائم رکھو تو میں اس کے بدلے میں ایسی ہندو حکومت قائم کرنے دوں گا جو دوسرے ہندوستانی فرقوں پر دوامی تسلط رکھے گی۔ اس لئے اگر برطانوی ہندوستان کے صوبوں کو حقیقی

خود مختار ریاستوں میں تبدیل نہ کیا گیا تو وفاق میں والیان ریاست کی شمولیت کا مطلب صرف یہی لیا جا سکتا ہے کہ برطانوی سیاست دانوں نے اپنے اختیارات سے دست بردار ہوئے بغیر نہایت چالاکی سے تمام جماعتوں کو خوش کرنے کی کوشش کی ہے، مسلمانوں کو لفظ وفاق، ہندوؤں کو مرکز میں اکثریت دے کر اور برطانوی سامراجیوں کو (خواہ وہ ٹوری پارٹی سے ہو یا لیبر پارٹی سے) حقیقی اختیارات کی قوّت سے۔

ہندوستان میں ہندو ریاستوں کی تعداد مسلم ریاستوں سے کہیں زیادہ ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ مسلمانوں کا یہ مطالبہ کہ انھیں مرکزی وفاقی اسمبلی میں ۳۳ فی صد نشستیں حاصل ہوں ایسے ایوان یا ایوانات میں کیوں کر پورا کیا جائے گا جو برطانوی ہندوستان اور ریاستوں کے نمائندوں پر مشتمل ہوں گے۔ مجھے اُمید ہے کہ مسلمان مندوبین وفاق کی سکیم کے منشا کو، جس پر گول میز کانفرنس میں بحث ہوئی ہے، خوب اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ مجوزہ کل ہند وفاق میں مسلمانوں کی نیابت کا مسئلہ ابھی زیر بحث نہیں آیا۔ رائٹر کی مختصر اطلاع میں بتایا گیا ہے کہ "عبوری رپورٹ کے مطابق وفاقی مقننہ کے دو ایوان تجویز کیے گئے ہیں جن میں برطانوی ہندوستان اور ریاستوں کے نمائندے شریک ہوں گے لیکن ان کی تعداد کے تناسب پر بعد میں غور کیا جائے گا جب کمیٹی اور عنوانات پر غور کرے گی جن کو ابھی سب کمیٹی کے سپرد نہیں کیا گیا"۔ میری رائے میں تناسب کا سوال نہایت اہم ہے اور اسمبلی کی ہیئت ترکیبی پر بحث کے ساتھ ساتھ ہی اس موضوع پر بحث ہونی چاہیے تھی۔

میرے خیال میں سب سے بہتر طریقہ یہ تھا کہ ابتدا صرف ہندوستان کے وفاق سے کی جاتی۔ جو وفاقی سکیم جمہوریت اور استبداد کے ناپاک اتحاد سے پیدا ہوگی، اس کا نتیجہ سوائے اس کے اور کچھ نہیں ہوگا کہ برطانوی ہندوستان بدستور وحدانی مرکزی حکومت کے خطرناک چکر میں پھنسا رہے گا۔ اس قسم کی وحدانی حکومت انگریزوں، والیان ریاست اور ہندوستان کے اکثریتی فرقے کے لئے تو بے حد مفید ہو سکتی ہے لیکن مسلمانوں کے لئے بے فائدہ ہے، جب تک کہ انھیں ہندوستان کے گیارہ میں سے پانچ صوبوں میں اکثریتی حقوق مع 'باقی ماندہ اختیارات' کے حاصل نہ ہوں اور مرکزی اسمبلی کی کل تعداد میں انھیں ۳۳ فی صد نشستیں حاصل نہ ہو جائیں۔ جہاں تک برطانوی ہندوستان کے صوبوں

میں حاکمانہ اختیارات کے حصول کا تعلق ہے ہز ہائی نس نواب بھوپال، سر اکبر حیدری اور جناح صاحب کا رویہ بالکل حق بجانب ہے۔ چونکہ اب والیانِ ریاست بھی وفاق میں شریک ہو رہے ہیں لہٰذا اب سوال برطانوی ہندوستان کی اسمبلی میں مسلمانوں کے تناسب کا نہیں رہا بلکہ یہ مسئلہ کل ہند وفاقی اسمبلی میں مسلمانوں کی نمائندگی کا ہے۔ ہمارا مطالبہ یہ ہونا چاہیے کہ مسلم ریاستوں کے علاوہ جو وفاق میں شریک ہوں ہمیں کل ہند وفاقی اسمبلی میں ۳۳ فی صد نشستیں حاصل ہوں۔

دفاع کا مسئلہ

ہندوستان میں وفاقی طرز حکومت کی کامیاب کارکردگی کے سلسلے میں دوسرا مشکل مسئلہ ہندوستان کے دفاع کا مسئلہ ہے۔ شاہی کمیشن کے اراکین نے اس مسئلے پر بحث کرتے ہوئے ہندوستان کی تمام کمزوریوں کا ذکر کیا ہے تاکہ فوج کا نظم و نسق برطانوی حکومت کے ہاتھ میں رہے۔ کمیشن کے اراکین نے لکھا ہے کہ "ہندوستان اور برطانیہ کا تعلق کچھ ایسا ہے کہ ہندوستان کے دفاع کا مسئلہ نہ اس وقت اور نہ مستقبل قریب میں محض ہندوستانی مسئلہ تصور کیا جا سکتا ہے۔ فوج کا نظم و نسق برطانوی حکومت کے نمائندوں کے ہاتھ میں رہنا چاہیے۔" کیا اس کا لازمی مطلب یہ نہیں ہے کہ جب تک برطانوی افواج اور برطانوی افسروں کی مدد کے بغیر دفاع کے اُمور کو بہتر طور پر سرانجام دینے کی صلاحیت پیدا نہ ہو جائے، برطانوی ہندوستان میں ذمہ دارانہ حکومت کے قیام میں مزید پیش رفت نہیں ہو سکتی؟ موجودہ صورت آئینی ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ نہرو رپورٹ میں جس رویے کا اظہار کیا گیا ہے کہ آئندہ جو بھی تبدیلی ہو گی اس میں فوج کا نظم و نسق ایک منتخب اسمبلی کے ماتحت ہو تو اس بات کی تمام اُمیدیں نامعلوم مدت تک کے لئے خطرے میں پڑ جائیں گی کہ مرکزی حکومت اس آخری منزل کی طرف ترقی کرے جو ۲۰/ اگست ۱۹۱۷ء کے اعلان میں تجویز کی گئی تھی۔ اپنی دلیل کو اور مضبوط بنانے کے لئے وہ اس بات پر زور دیتے ہیں کہ مختلف مذاہب اور متصادم نسلوں میں، جن کی صلاحیتیں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں، مقابلے کی دوڑ ہے، اور یہ کہہ کر اس مسئلے کو ناقابل حل بنانے کی کوشش کی ہے کہ "ہندوستان اس طرح کی ایک قوم نہیں جس طرح قدرتی طور پر قومیں

ہوتی ہیں اور مروجہ اصطلاح میں مراد لی جاتی ہیں۔ یہ بات اور بھی واضح ہو جاتی ہے جب ہم ہندوستان کی جنگ جو نسلوں اور بقیہ لوگوں میں فرق دیکھتے ہیں۔'' مسئلے کے ان پہلوؤں پر زور دینے کا مقصد یہ ہے کہ برطانیہ صرف بیرونی خطرات سے ہندوستان کی حفاظت نہیں کر رہا بلکہ امن و امان کا بھی 'غیر جانبدار محافظ' ہے۔ تاہم وفاق کا جو تصور میرے ذہن میں ہے (اس کے مطابق) وفاق ہند میں مسئلے کا ایک پہلو یعنی بیرونی دفاع باقی رہ جائے گا۔ صوبائی افواج کے علاوہ جو اندرونی امن و امان قائم رکھنے کے لئے ضروری ہیں، ہندوستان کی وفاقی کانگریس شمال مغربی سرحد پر ایک طاقتور سرحدی فوج متعین کر سکتی ہے جس میں ہر صوبے کے سپاہی شامل ہوں اور جس کی قیادت ہر فرقے کے لائق اور تجربہ کار افسروں کے ہاتھ میں ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ ہندوستان میں لائق افسر نہیں ہیں اور اسی کو عذر بنا کر شاہی کمیشن کے اراکین کہتے ہیں کہ افواج کا انتظام دولت برطانیہ کے پاس رہے، لیکن میں اسی 'رپورٹ' کا ایک اور اقتباس پیش کئے بغیر نہیں رہ سکتا جو میرے خیال میں کمیشن کے اراکین کے دعوے کے خلاف بہترین دلیل ہے۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے ''اس وقت کوئی ہندوستانی جسے بادشاہ کی طرف سے کمیشن ملا ہے کپتان سے زیادہ اونچے عہدے پر فائز نہیں ہے۔ ہمارے خیال میں کپتانوں کی مکمل تعداد انتالیس ہے جن میں سے پچیس معمولی رجمنٹوں میں تعینات ہیں۔ ان میں سے بعض کی عمر اس قدر زیادہ ہے کہ اگر وہ ریٹائرمنٹ سے پہلے ضروری امتحانات پاس بھی کر لیں تو بہت زیادہ اونچے عہدے حاصل نہیں کر سکیں گے۔ ان میں سے اکثر سینڈہرسٹ نہیں گئے بلکہ انھیں جنگ عظیم میں کمیشن ملا تھا۔'' اب یہ خواہش کتنی ہی سچی اور صورت حال میں تبدیلی کی کوشش کتنی ہی مخلصانہ کیوں نہ ہو، اسکین کمیٹی (جس کے صدر اور فوجی سیکرٹری کے علاوہ تمام اراکین ہندوستانی تھے) نے نہایت مؤثر طریق پر ان الفاظ میں اظہار کیا ہے: ''ترقی کا انحصار اس پر ہے کہ ہر مرحلے پر کامیابی حاصل کی جائے اور جنگی قابلیت کو قائم رکھا جائے۔ گو یہ صورت بہرحال تدریجی اور سست ہو گی۔ موجودہ ہندوستانی افسروں کو جو جونیئر عہدوں پر ہیں اور محدود تجربہ رکھتے ہیں قلیل مدت میں اعلیٰ کمان کے لائق بنانا مشکل کام ہے۔ جب تک افسری کے ہندوستانی اُمیدواروں کی مختصر سی تعداد میں بہت زیادہ اضافہ نہ ہو جائے، اور ہم اس اضافے کے خواہش مند ہیں، جب تک ہندوستانیوں کی کافی تعداد اس قدر تجربہ اور

مہارت حاصل نہ کر لے جس سے وہ کچھ ہندوستانی رجمنٹوں کی افسری سنبھال سکیں، جب تک یہ رجمنٹیں عملاً اس آزمائش میں کامیاب نہ ہو جائیں جس سے ان کی قابلیت کا اندازہ ہو سکے اور جب تک ہندوستانی افسر کامیاب فوجی ملازمت میں اعلیٰ کمان حاصل کرنے کے قابل نہ ہو جائیں، اس وقت تک یہ ممکن نہ ہو گا کہ فوج کے نظم ونسق کو ہندوستانیوں کے ہاتھ میں دینے کی پالیسی اس حد تک کامیاب ہو جائے کہ پوری فوج ہندوستانی ہو جائے۔ اس طرح بھی اس کام کی تکمیل میں برسوں لگیں گے۔"

اب میں اس سوال کی جرأت کرتا ہوں کہ اس صورت حال کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا اس کی وجہ ہماری جنگ جو قوموں کی کوئی فطری کمزوری ہے یا فوجی تربیت کی سست رفتاری ہے؟ ہماری جنگ جو قوموں کی فوجی صلاحیتوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ فوجی تربیت کی رفتار دوسری قسم کی تربیتوں کے مقابلہ میں سست ہو سکتی ہے۔ میں اس معاملے کا فیصلہ کرنے کے لئے فوجی ماہر نہیں ہوں لیکن ایک عام آدمی کی حیثیت سے کہہ سکتا ہوں کہ اس دلیل کو جس انداز سے پیش کیا گیا ہے اس سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ سلسلہ لامتناہی ہے۔ اس کا مطلب ہندوستان کی مستقل غلامی ہے۔ لہٰذا یہ اور بھی ضروری ہے کہ 'نہرو رپورٹ' کی تجویز کے مطابق سرحدی فوج کا نظم ونسق ایک دفاعی کمیٹی کے سپرد کر دیا جائے جس کے ارکان کا فیصلہ باہمی تصفیہ سے ہو۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ سائمن رپورٹ میں بری سرحدوں کو غیر معمولی اہمیت دی گئی ہے لیکن اس کی بحری صورت حال کے متعلق صرف سرسری اشارے کئے گئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہندوستان کو ہمیشہ بری سرحدوں کی طرف سے آنے والے حملوں کا مقابلہ کرنا پڑا ہے، لیکن یہ بھی ظاہر ہے کہ اس کے موجودہ حاکم اس کے غیر محفوظ ساحلوں کی وجہ سے قابض ہوئے تھے۔ ایک خود مختار اور آزاد ہندوستان کو بری سرحدوں کے مقابلے میں اپنے ساحلوں کی زیادہ حفاظت کرنی ہو گی۔

مجھے اس بات میں شبہ نہیں ہے کہ اگر وفاق قائم ہو جاتا ہے تو مسلم وفاقی ریاستیں ہندوستان کے دفاع کی خاطر غیر جانب دار ہندوستانی بری اور بحری افواج کے قیام پر خوشی سے رضامند ہو جائیں گی۔ مغلوں کے دور حکومت میں ہندوستان کے دفاع کے لئے اس قسم کی غیر جانب دار فوج واقعتاً موجود تھی، بلکہ اکبر کے زمانے میں سرحدی فوج تمام کی تمام ہندو جرنیلوں پر مشتمل تھی۔ مجھے پکا یقین ہے

کہ وفاق ہندوستان میں ایک غیر جانب دار فوج کی سکیم سے مسلمانوں کے حب الوطنی کے جذبات اور زیادہ مضبوط ہو جائیں گے اور اگر کوئی ایسی بدگمانی ہے کہ ہندوستانی مسلمان سرحد پار سے آنے والے مسلمان حملہ آوروں کے ساتھ مل جائیں گے تو وہ ہمیشہ کے لئے دور ہو جائے گی۔

مسلم مطالبات

میں نے مختصراً اس طریق کار کی نشان دہی کر دی ہے جس کی روشنی میں مسلمانانِ ہند کو ہندوستان کے دو اہم ترین دستوری مسائل کو دیکھنا چاہیے۔ مسلمانان ہند کا سب سے بڑا مطالبہ یہ ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلے کے مستقل تصفیے کے لئے برطانوی ہندوستان کی از سرِ نو تقسیم کی جائے۔ لیکن اگر فرقہ وارانہ مسئلے کا علاقائی حل نظر انداز کر دیا جاتا ہے تو پھر میں نہایت شد و مد سے مسلمانوں کے ان مطالبات کی تائید کروں گا جس پر آل انڈیا مسلم لیگ اور آل انڈیا مسلم کانفرنس نے بار بار زور دیا ہے۔ ہندوستان کے مسلمان کبھی ایسی دستوری تبدیلی پر ضامند نہیں ہوں گے جس سے پنجاب اور بنگال میں ان کے اکثریتی حقوق پر اثر پڑے جو جداگانہ انتخاب کے ذریعے حاصل کئے جائیں گے یا مرکزی اسمبلی میں ان کی ۳۳فی صد نمائندگی کی ضمانت نہ دی جائے۔ مسلمان سیاسی لیڈر دو گڑھوں میں گر چکے ہیں۔ پہلا گڑھا مسترد شدہ 'میثاق لکھنو' تھا جو ہندوستانی قومیت کے غلط تصور کی پیداوار تھا۔ اس سے مسلمان ہندوستان میں سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے تمام مواقع سے محروم ہو گئے۔ دوسرا گڑھا پنجاب کی نام نہاد دیہاتی آبادی کی خاطر اسلامی اتحاد کی عاقبت نااندیشانہ قربانی تھی جس کا اظہار ایک ایسی تجویز میں ہوا جس سے پنجاب کے مسلمان اقلیت میں رہ جاتے ہیں۔ مسلم لیگ کا فرض ہے کہ وہ میثاق اور تجویز دونوں کی مذمت کرے۔

سائمن رپورٹ نے مسلمانوں کے لئے پنجاب اور بنگال میں آئینی اکثریت کی سفارش نہ کر کے بہت بڑی ناانصافی کی ہے۔ اس طرح یا تو مسلمان 'میثاق لکھنو' کے پابند رہیں یا مخلوط انتخاب کی سکیم کو اختیار کر لیں۔ سائمن رپورٹ کے متعلق حکومت ہند کے مراسلے میں اس امر کا اعتراف کیا گیا ہے کہ اس دستاویز کی اشاعت کے بعد مسلم قوم نے رپورٹ میں تجویز کردہ کسی ایک کو بھی پسند نہیں کیا ہے۔

مراسلے میں تسلیم کیا گیا ہے کہ مسلمانوں کی یہ شکایت بجا ہو سکتی ہے کہ پنجاب اور بنگال کی کونسلوں میں آبادی کے تناسب کے مطابق انھیں نمائندگی سے اس لئے محروم کر دیا گیا کہ دوسرے صوبوں میں مسلم اقلیتوں کو پاسنگ دیا گیا ہے، لیکن حکومت ہند کے مراسلے میں سائمن رپورٹ کی اس ناانصافی کی تلافی نہیں کی گئی۔ جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے اور یہ اہم نکتہ ہے، رپورٹ اس نام نہاد 'محتاط و متوازن سکیم' کی تائید کرتی ہے جو پنجاب کی حکومت کے سرکاری ممبروں نے تیار کی ہے، جس کے مطابق مسلمانانِ پنجاب کو ہندو اور سکھ اراکین کی مجموعی تعداد پر صرف دو کی اکثریت حاصل ہوتی ہے اور پورے ایوان میں ان کا تناسب ۴۹ فی صد ہو گا۔ یہ ظاہر ہے کہ پنجاب کے مسلمان پورے ایوان میں واضح اکثریت سے کم پر مطمئن نہیں ہوں گے۔ بہر حال لارڈ ارون اور ان کی حکومت یہ تسلیم کرتی ہے کہ فرقہ وارانہ انتخابات کو اس وقت تک ختم نہ کیا جائے جب تک رائے دہندگی کا حق اتنا وسیع نہ ہو جائے کہ ہر قوم کا تناسب آبادی واضح طور پر اس کے نمائندوں سے ظاہر ہو سکے اور جب تک صوبائی کونسلوں کے مسلمان ممبر دو تہائی اکثریت سے بالاتفاق جداگانہ انتخاب سے دست بردار ہونے کو تیار نہ ہو جائیں۔ لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا کہ مسلمانوں کی شکایات کو بجا سمجھنے کے باوجود حکومت ہند کو اتنی جرأت کیوں نہ ہوئی کہ وہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کے لئے آئینی اکثریت کی سفارش کرتی؟

ہندوستان کے مسلمان کسی ایسی تبدیلی پر رضامند نہیں ہوں گے جس کے تحت سندھ کو علیحدہ صوبہ نہ بنایا جائے اور شمال مغربی سرحدی صوبہ کو سیاسی حیثیت سے کم تر درجہ دیا جائے۔ میرے خیال میں کوئی وجہ نہیں کہ سندھ کو بلوچستان سے ملا کر کیوں نہ ایک الگ صوبہ بنا دیا جائے۔ احاطہ بمبئی اور سندھ میں کوئی چیز بھی تو مشترک نہیں۔ شاہی کمیشن کی رائے میں زندگی اور تمدن کے لحاظ سے سندھ ہندوستان کے مقابلے میں عراق اور عرب سے زیادہ ملتا جلتا ہے۔ عرصہ ہوا مسلمان جغرافیہ دان مسعودی نے اس مشابہت کو دیکھتے ہوئے لکھا کہ: "سندھ وہ ملک ہے جو بلاد اسلامیہ سے قریب تر ہے۔" پہلے اموی حکمران کا مصر کے متعلق قول ہے کہ "مصر کی پشت افریقہ کی جانب ہے اور چہرہ عرب کی جانب" مناسب رد و بدل کے ساتھ یہی کچھ سندھ کے متعلق کہا جا سکتا ہے کہ اس کی پشت

ہندوستان کی طرف ہے اور چہرہ وسط ایشیا کی طرف ہے۔ علاوہ ازیں اگر سندھ کے زرعی مسائل کی نوعیت کو مدنظر رکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ بمبئی کی حکومت کو اپنے لامحدود تجارتی امکانات کو دیکھتے ہوئے اس سے کوئی ہمدردی نہیں ہے اور اس بات کے پیش نظر کہ کراچی بڑھتے بڑھتے لازماً ہندوستان کا دوسرا سب سے بڑا شہر ہو گا تو میرے خیال میں یہ مصلحت کے خلاف ہے کہ اسے احاطہ بمبئی سے ملحق رکھا جائے۔ بے شک آج اس کا رویہ دوستانہ ہے لیکن تھوڑے ہی عرصہ کے بعد حریفانہ ہو جائے گا۔ ہم سے کہا جاتا ہے کہ مالی مشکلات اس کی علیحدگی کے راستے میں حائل ہیں۔ اس کے متعلق کوئی مستند بیان میری نظر سے نہیں گزرا، لیکن یہ تسلیم کرتے ہوئے کہ ایسی مشکلات موجود ہیں، کوئی وجہ نہیں ہے کہ حکومت ہند اُمید افزا صوبے کو اپنی آزادانہ ترقی کی جدوجہد کے لئے مالی امداد نہ دے۔

جہاں تک شمال مغربی سرحدی صوبے کا تعلق ہے، یہ امر تکلیف دہ ہے کہ شاہی کمیشن کے اراکین نے (اس بات سے) عملاً انکار کر دیا ہے کہ اس صوبے کے باشندوں کو اصلاحات کا حق حاصل ہے۔ ان کی سفارشات برے کمیٹی سے بھی کم ہیں اور ان کی تجویز کردہ کونسل چیف کمشنر کی مطلق العنانی کے لئے محض آڑ کا کام دے گی۔ افغانوں سے سگریٹ جلانے کا پیدائشی حق محض اس لئے سلب کر لیا گیا ہے کہ وہ بارود خانے میں رہتے ہیں۔ شاہی کمیشن کے اراکین کی یہ لطیف دلیل خوش کن تو ہے، لیکن تسلی بخش نہیں ہے۔ سیاسی اصلاح آگ نہیں روشنی ہے اور ہر شخص کو خواہ وہ بارود خانے میں رہتا ہو یا کوئلے کی کان میں، روشنی حاصل کرنے کا حق حاصل ہے۔ افغان بہادر اور ذہین ہیں اور اپنے جائز مقاصد کے لئے تکلیف برداشت کر سکتے ہیں۔ وہ ہر ایسی کوشش کی مزاحمت کریں گے جو ان کو آزادانہ ترقی کے مواقع سے محروم کرے گی۔ ایسے لوگوں کو مطمئن رکھنا ہندوستان اور انگلستان دونوں کے لئے مفید ہے۔ حال ہی میں اس بدقسمت صوبے میں جو کچھ ہوا ہے وہ محض یہاں کے باشندوں کے ساتھ سوتیلی ماں کے سے سلوک کا نتیجہ ہے جو بقیہ ہندوستان میں حکومت خود اختیاری کے اُصول کو نافذ کرنے کے بعد شروع ہوا۔ مجھے اُمید ہے کہ برطانوی مدبرین اس صورت حال سے آنکھیں بند کر کے اپنے آپ کو اس فریب میں مبتلا نہ ہونے دیں گے کہ صوبے میں جو بے چینی ہے وہ خارجی اثرات کا نتیجہ ہے۔

حکومت ہند کے مراسلے میں شمال مغربی سرحدی صوبے کے لئے جن اصلاحات کے نفاذ کی سفارش کی گئی ہے وہ بھی تسلی بخش نہیں ہے۔ بے شک یہ مراسلہ سائمن رپورٹ سے ایک قدم آگے ہے کیونکہ اس میں ایک طرح کی نمائندہ کونسل اور نیم منتخب کابینہ کی سفارش کی گئی ہے، لیکن اس مراسلے میں اس اہم صوبے کو دوسرے ہندوستانی صوبوں کے برابر درجہ دینے کا ذکر نہیں ہے، حالانکہ افغان فطری طور پر ہندوستان کے دوسرے لوگوں کے مقابلے میں جمہوری اداروں کے زیادہ اہل ہیں۔

گول میز کانفرنس

میرا خیال ہے کہ اب مجھے گول میز کانفرنس کے متعلق کچھ کہنا چاہیے۔ ذاتی طور پر مجھے اس کانفرنس کے نتائج سے زیادہ اُمید نہیں ہے۔ خیال یہ تھا کہ فرقہ وارانہ رزم گاہ سے دور اور ایک بدلی ہوئی فضا میں ہوش مندی سے کام لیا جائے گا اور ہندوستان کے دو بڑے فرقوں کے درمیان حقیقی صلح و صفائی کے بعد ہندوستان کی آزادی کی صورت نکل آئے گی، لیکن واقعات اس کے برعکس ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ لندن میں فرقہ وارانہ سوال پر بحث میں پہلے سے زیادہ واضح ہو گیا ہے کہ ہندوستان کی دو بڑی تہذیبی اکائیوں میں کتنا گہرا اختلاف ہے، لیکن انگلستان کے وزیر اعظم بظاہر اس امر سے انکار کرتے ہیں کہ ہندوستان کا مسئلہ قومی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ انھوں نے کہا ہے ''میری حکومت کے لئے یہ مشکل ہے کہ پارلیمنٹ میں جداگانہ انتخابات کو برقرار رکھنے کی سفارش کرے کیوں کہ مخلوط انتخابات برطانوی جمہوریت پسندی کے جذبات سے زیادہ مطابقت رکھتے ہیں۔'' بظاہر انھیں یہ بات نظر نہیں آتی کہ برطانوی جمہوریت کی مثال ایسے ملک میں فائدہ مند ثابت نہیں ہو سکتی جہاں بہت سی قومیں آباد ہوں اور جداگانہ انتخاب کا طریقہ مسئلے کے جغرافیائی حل کا صرف ایک گھٹیا بدل ہے۔ نہ ہی یہ اُمید ہے کہ اقلیتوں کی سب کمیٹی کسی تسلی بخش تصفیے پر پہنچے گی۔ یہ سارا معاملہ برطانوی پارلیمنٹ میں پیش کرنا پڑے گا اور ہمیں اُمید رکھنی چاہیے کہ برطانوی قوم کے بالغ نظر نمائندے اکثر ہندوستانی سیاست دانوں کے برعکس حالات کی تہہ تک پہنچ جائیں گے اور ہندوستان جیسے ملک میں امن و سلامتی کے مسئلے کی اصل بنیاد کو دیکھ لیں گے۔ اس نظریے پر مبنی دستور بنانا کہ ہندوستان میں ایک

قوم بستی ہے یا برطانوی طرز کی جمہوریت کے اُصولوں کا ہندوستان پر اطلاق کرنا دراصل نادانستہ طور پر ہندوستان کو خانہ جنگی کے لئے تیار کرنا ہے۔ جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں ملک میں اس وقت تک امن نہیں ہو سکتا جب تک کہ ہندوستان کی تمام قوموں کو اپنے ماضی سے یکایک رشتہ منقطع کئے بغیر جدید اُصولوں پر آزادانہ ترقی کے مواقع فراہم نہ کئے جائیں۔

مجھے یہ کہتے ہوئے مسرت حاصل ہوتی ہے کہ ہمارے مسلمان مندوبین کو اس مسئلے کے صحیح حل کی اہمیت کا پورا پورا احساس ہے، جسے میں ہندوستان کا بین الاقوامی مسئلہ کہتا ہوں۔ ان کا یہ اصرار بالکل بجا ہے کہ مرکزی حکومت میں ذمہ داری کا مسئلہ طے کرنے سے پہلے فرقہ وارانہ مسئلے کا تصفیہ ضروری ہے۔ کسی مسلمان سیاسی راہنما کو 'فرقہ پرستی' کے طعن آمیز پروپیگنڈے کا خیال نہیں کرنا چاہیے، اس لئے کہ یہ اصطلاح، بقول وزیر اعظم، برطانوی جمہوریت پسندی کے جذبات سے باقاعدہ فائدہ اُٹھانے کے لئے وضع کی گئی ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ انگلستان ایک ایسی صورت حال کو تسلیم کرے جو واقعتاً ہندوستان میں موجود ہی نہیں ہے۔ بہت بڑے مفادات خطرے میں پڑے ہوئے ہیں۔ ہم سات کروڑ ہیں اور ہندوستان کے دوسرے باشندوں کے مقابلے میں ہم میں سب سے زیادہ ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ حقیقتاً ہندوستان کے صرف مسلمان باشندوں ہی کو جدید اصطلاح میں صحیح طور پر ایک قوم کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ ہندو تقریباً تمام معاملات میں ہم سے آگے ہیں، لیکن انھوں نے وہ ہم آہنگی حاصل نہیں کی جو ایک قوم بننے کے لیے ضروری ہے۔ جو اسلام کا آپ کو بلا قیمت عطیہ ہے۔ بے شک وہ ایک قوم بننے کے لیے مضطرب ہیں لیکن ایک قوم بننے میں بڑی مشکلات پیش آتی ہیں اور جہاں تک ہندوستان کے ہندوؤں کا سوال ہے ان کے سماجی ڈھانچے کو یکسر تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔ مسلمان راہ نماؤں اور سیاست دانوں کو اس باریک لیکن مغالطہ انگیز دلیل سے متاثر نہیں ہونا چاہئے کہ ترکی، ایران اور دوسرے مسلم ممالک بھی علاقائی قومیت کے اُصولوں پر آگے بڑھ رہے ہیں۔ ہندوستان کے مسلمان ان سے بالکل مختلف حالت میں ہیں۔ ہندوستان کے علاوہ دیگر اسلامی ممالک کی ساری آبادی مسلمانوں کی ہے۔ وہاں کی اقلیتیں قرآن کے الفاظ میں ''اہل کتاب'' میں سے ہیں۔ کسی یہودی، عیسائی یا زرتشتی کے چھونے سے مسلمان کا کھانا ناپاک نہیں ہوتا اور اسلامی قانون

اہل کتاب کے ساتھ مناکحت کی اجازت دیتا ہے۔ حقیقت میں اسلام نے پہلا قدم انسانیت کے اتحاد کی طرف اُٹھایا، وہ یہی تھا کہ جن لوگوں کا اخلاقی نصب العین ایک سا تھا انھیں اتحاد و اتفاق کی دعوت دی۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے: ''اے اہل کتاب! آؤ ایک ایسی بات کی طرف جو ہمارے اور تمہارے درمیان (مسلم ہونے میں) برابر ہے۔''[1] مسلمانوں اور عیسائیوں کی جنگوں اور اس کے بعد مختلف صورتوں سے یورپ کی جارحیت کے باعث دنیائے اسلام میں اس آیت کے لامحدود معنوں میں عمل نہ ہو سکا۔ آج بلادِ اسلامیہ میں یہ مقصد مسلم قومیت کی شکل میں بتدریج پورا ہو رہا ہے۔

مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ ہمارے مندوبین کی کامیابی کا اندازہ صرف اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کانفرنس کے غیر مسلم مندوبین سے قرارداد دہلی کے مطالبات کہاں تک منوا لیتے ہیں۔ اگر یہ مطالبات تسلیم نہیں کیے جاتے تو ہمارے لئے ایک بڑا دور رس نتائج کا حامل مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔ اگر آپ اپنے مقاصد اور نصب العین کے بارے میں واقعی سنجیدہ ہیں تو آپ کو اس قسم کے عمل کے لئے تیار رہنا چاہیے۔ ہمارے سربر آوردہ لوگوں نے سیاسی مسائل پر کافی غور و خوض کیا ہے۔ ان کے غور و فکر سے ہم کسی حد تک ان قوتوں سے آشنا ہوئے ہیں جو ہندوستان اور اس کے باہر اقوام کی قسمتوں کی تشکیل کر رہی ہیں۔ لیکن میں پوچھتا ہوں کہ آیا اس غور و فکر نے ہمیں اس قابل بنا دیا ہے کہ مستقبل قریب میں جو صورت حال پیدا ہو ہم اس کے مقابلے کے لئے تیار ہوں۔ مجھے بلا تکلف کہنے دیجئے کہ اس وقت ہندوستان کے مسلمان دو امراض میں مبتلا ہیں۔ اوّل، ان میں قحط الرجال ہے۔ سر میلکم ہیلی اور لارڈ ارون کی تشخیص بالکل صحیح تھی جب انھوں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں کہا کہ قوم راہ نما پیدا کرنے میں ناکام رہی ہے۔ راہ نماؤں سے میری مراد ایسے افراد ہیں جو اعانت ایزدی یا اپنے وسیع تجربے کی بدولت اسلام کی روح اور تقدیر کے بارے میں گہرا ادراک رکھتے ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ جدید تاریخ کے رجحانات سے بھی پورے واقف ہوں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن پر عوام الناس کی ہمت اور قوت عمل کا انحصار ہوتا ہے اور یہ بنائے نہیں جاتے بلکہ خدا کی طرف سے عطیہ ہوتے ہیں۔

---

[1] يَاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ

دوسرا مرض جس میں ہندوستان کے مسلمان مبتلا ہیں وہ یہ ہے کہ قوم جذب باہم کے جذبے سے محروم ہے۔ اسی وجہ سے بعض افراد اور گروہ الگ الگ راہ پر گامزن ہیں اور قوم کی اجتماعی سوچوں اور سرگرمیوں میں شریک نہیں ہیں۔ ہم سیاست کے میدان میں وہی کچھ کر رہے ہیں جو ہم صدیوں سے مذہب کے میدان میں کرتے چلے آئے ہیں، لیکن مذہبی گروہ بندیوں سے ہمارے اتحاد کو اتنا زیادہ نقصان نہیں پہنچا۔ اس سے کم از کم اتنا تو ظاہر ہوا کہ ہمیں اس اُصول سے جس پر قوم کی تعمیر و ترکیب کا انحصار ہے دلچسپی ہے۔ مزید بر آں یہ اُصول اس قدر وسیع ہے کہ کوئی ایک گروہ اس حد تک باغی نہیں ہوا کہ وہ جسد اسلامی سے قطعی طور پر علیحدہ ہو جائے، لیکن ایسے وقت میں جب کہ قوم کے مفاد کی خاطر اتحاد عمل کی ضرورت ہو تو سیاسی عمل میں اختلاف ہلاکت خیز ثابت ہو سکتا ہے۔ پھر ان دونوں امراض کے علاج کی کیا صورت ہے؟ پہلے مرض کا علاج ہمارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ جہاں تک دوسرے مرض کا تعلق ہے، میرے خیال میں اس کا علاج ممکن ہے۔ اس موضوع پر میرا مخصوص نقطہ نظر ہے، لیکن میرے خیال میں بہتر ہو گا کہ اس اظہار کو اس وقت تک ملتوی رکھا جائے جب تک ایسی صورت حال پیدا نہ ہو جائے جس کا خطرہ ہے۔ اگر ایسی صورت حال پیدا ہو جائے تو ہر مکتب فکر کے سر بر آوردہ مسلمان باہم متحد ہو کر صرف قرار دادیں منظور نہ کریں بلکہ حقیقی مقصد کے حصول کے لئے مسلمانوں کا رویہ متعین کریں اور انھیں راستہ دکھائیں۔ اس تقریر میں میں نے اس امر کا تذکرہ محض اس لئے کیا ہے کہ یہ بات آپ کے ذہن میں رہے اور آپ اس دوران میں نہایت سنجیدگی سے اس پر غور کریں۔

اختتامیہ

حضرات! میری تقریر ختم ہوئی۔ آخیر میں میں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ تاریخ ہندوستان کے موجودہ نازک دور میں مسلمانوں کو مکمل تنظیم اور اتحاد عزائم و مقاصد کی ضرورت ہے جو بحیثیت قوم آپ کے اور ہندوستان کے مجموعی مفاد کے لئے ضروری ہے۔ ہندوستان کی سیاسی غلامی پورے ایشیا کے لئے لامتناہی مصائب کا سرچشمہ تھی اور اب بھی ہے۔ اس نے مشرق کی روح کو کچل ڈالا ہے اور اس اظہار

ذات کی مسرت سے پوری طرح محروم کر دیا ہے جس کی بدولت کبھی ایک بڑا اور شان دار تمدن پیدا ہوا تھا۔ ہم پر ایشیا بالخصوص مسلم ایشیا کی طرف سے بھی ایک فرض عائد ہوتا ہے۔ ایک ہی ملک میں سات کروڑ مسلمانوں کی موجودگی تمام مسلم ایشیا کے مسلمانوں کے مقابلے میں اسلام کے لئے ایک قیمتی سرمایہ ہے۔ ہمیں ہندوستان کے مسئلے پر صرف مسلمانوں کے نقطہ نگاہ سے ہی نہیں ہندوستانی مسلمانوں کے نقطہ نگاہ سے بھی دیکھنا چاہیے۔ ایشیا اور ہندوستان کی طرف سے عائد شدہ فرض ہم اس وقت تک وفاداری کے ساتھ ادا نہیں کر سکتے جب تک ہم ایک مخصوص مقصد کے لئے منظم عزم نہ کر لیں۔ اگر آپ ہندوستان کی دوسری سیاسی جماعتوں میں اپنا ایک سیاسی وجود برقرار رکھنا چاہتے ہیں، تو آپ کے لئے اس قسم کا بندوبست قطعی ضروری ہے۔ ہماری منتشر حالت کے باعث ایسے سیاسی مصالح الجھ گئے ہیں جو کہ ہماری ملی زندگی کے لئے ناگزیر ہیں۔ میں فرقہ وارانہ تصفیے سے مایوس نہیں ہوں، لیکن میں اپنا یہ احساس آپ سے پوشیدہ نہیں رکھ سکتا کہ موجودہ بحران سے نبٹنے کے لئے ہماری ملت کو مستقبل قریب میں ایک آزادانہ راہ عمل اختیار کرنی پڑے گی اور آزادانہ سیاسی راہ عمل ایسے نازک وقت میں صرف ان لوگوں کے لئے ہی ممکن ہے جو عزم کے مالک ہوں اور جن کی قوت ارادی ایک مقصد پر مرکوز ہو۔ کیا آپ کے لیے یہ ممکن ہے کہ متحدہ عزم کے لئے منظم کاملیت حاصل کر لیں؟ بے شک یہ ممکن ہے۔ فرقہ بندی اور نفسانیت کی قیود سے آزاد ہو جایئے۔ اپنے انفرادی اور اجتماعی اعمال کی قدر و قیمت کا اندازہ کیجئے خواہ وہ مادی اغراض ہی سے متعلق کیوں نہ ہوں۔ اس نصب العین کی روشنی میں، جس کی آپ نمائندگی کر رہے ہیں، مادہ سے گزر کر روحانیت کی طرف آیئے۔ مادہ کثرت ہے۔ روح نور ہے، حیات ہے، وحدت ہے، مسلمانوں کی تاریخ سے میں نے ایک سبق سیکھا ہے کہ آڑے وقتوں میں مسلمانوں کو اسلام نے بچایا ہے، مسلمانوں نے اسلام کی حفاظت نہیں کی۔ اگر آج آپ اپنی نظریں اسلام پر جما دیں اور اس کے زندگی بخش تخیل سے متاثر ہوں تو آپ اپنی پراگندہ قوتوں کو از سر نو جمع کر لیں گے اور اپنی صلابت کردار کو دوبارہ حاصل کر لیں گے۔ اس طرح آپ اپنے آپ کو مکمل تباہی سے بچا لیں گے۔ قرآن مجید کی ایک نہایت معنی خیز آیت یہ ہے کہ پوری انسانیت کی موت و حیات بھی فرد واحدہ کی موت و حیات کی طرح ہے۔ کوئی وجہ نہیں کہ آپ جو سب سے پہلے

انسانیت کے اس بلند و ارفع تصور پر عمل پیرا ہوئے، اسی اُصول پر جئیں اور آگے بڑھیں اور اپنے آپ کو ایک نفس واحد کی طرح رکھیں۔ میں جب یہ کہتا ہوں کہ ہندوستان کی حالت وہ نہیں ہے جو بظاہر نظر آتی ہے تو میرا مقصد کسی کو حیرت میں ڈالنا نہیں ہے۔ بہر حال اس کے صحیح معنی آپ پر اس وقت آشکارا ہو جائیں گے جب آپ ان کے مشاہدے کے لئے ایک صحیح اجتماعی خودی پیدا کر لیں گے۔ قرآن کے الفاظ ہیں: ''اپنی خودی کا استحکام کرو۔ اگر تم خود صحیح راستے پر گامزن ہو گے تو کوئی غلط راستہ پر چلنے والا تمھیں نقصان نہیں پہنچا سکے گا۔'' (۵:۱۰۴)[1]

36

''سٹیج سے اگر کسی نے تالی بجائی تو مجمع نے بھی داد دے دی، ورنہ ایک مبہم سی خاموشی اور بے کیف سا سکوت طاری رہا،'' مارہروی کہتے ہیں:

> علامہ خطبہ پڑھتے جاتے اور جگہ جگہ رُک کر کبھی کسی تشریحی جملے سے، کبھی کلامِ پاک کی آیت اور کبھی حدیث سے مطالب کی وضاحت فرماتے جاتے تھے... میرے سامنے کی نشست پر ایک بیرسٹر صاحب بیٹھے دیر سے پہلو بدل رہے تھے۔ آخر اُن سے نہ رہا گیا تو مجھ سے مخاطب ہو کر کہنے لگے، "It's all Greek to me" (میرے لیے یہ سب ناقابلِ فہم ہے)۔ حسنِ اتفاق دیکھیے کہ اُسی وقت علّامہ نے خطبے سے یہ فقرہ پڑھا: ''مجھے اُمید ہے آپ مجھے اِس علمی بحث کے لیے معاف فرماویں گے۔'' اس پر بیرسٹر صاحب ایسے خاموش ہوئے کہ آخر تک لبوں پر مہرِ خاموشی لگی رہی... جب علامہ نے اکبر اور کبیرؔ کی اُن ناکام کوششوں کا ذکر کیا جو اُنہوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو متّحد کرنے کے لیے کی تھیں، تو مجمع میں سے کسی تحریک کے بغیر اللہ اکبر کے نعرے کی صدا بلند ہوئی اور علامہ کی تیوری پر چند بل پڑ گئے، کچھ وقفے کے لیے رُکے اور خطبے کو میز پر رکھ دیا... جب اِس فقرے پر پہنچے کہ مسلمانوں کی طرف سے ہندوستان کے اندر ایک

---

[1] عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ

اسلامی سلطنت قائم کرنے کا مطالبہ بالکل حق بجانب ہے، تو ایک لمحے کے لیے رُک کر اُنھوں نے تشریحاً ایک عجیب سیاسی اصطلاح استعمال کی جو اِس سے قبل ہم نے کبھی نہ سُنی تھی۔ اُنھوں نے فرمایا:

By this I mean: an imperium in imperio.

ہماری زبان سے بیساختہ سبحان اللہ نکلا اور ہال تالیوں سے گونج اُٹھا، علامہ کا چہرہ دمک اُٹھّا اور گردن کے اشارے سے انہوں نے یہ داد قبول فرمائی۔

اس کے بعد قدرے بلند آواز سے آل پارٹیز مسلم کانفرنس دہلی کے رزولیوشن کی تائید میں وہ تجویز پیش کی جس میں پنجاب، شمال مغربی سرحدی صوبہ، سندھ اور بلوچستان کو یکجا کر کے برطانوی سلطنت کے اندر یا باہر ایک مضبوط اسلامی ریاست کے قیام کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔[1]

لیگی کارکن اور صحافی حسن ریاض کہتے ہیں، "تاریخ کا ایک گم شدہ صفحہ نکال کر اُنہوں نے مسلمانوں کے سامنے رکھ دیا اور اُس مستقبل کی طرف رہنمائی کی جو پیدا ہونے والا تھا... اُن کے خطبۂ صدارت کے ساتھ ہی اہلِ فکر مسلمانوں کی نظروں کے سامنے پریشاں خیالی کے وہ پردے ہٹ گئے جو اُن کے اور آئندہ نصب العین کے درمیان حائل تھے۔"[2] علیگڑھ تحریک کے ساتھ تسلسل محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے۔ "سرسید کے زمانے میں... کسی کو یہ توقع نہیں ہو سکتی تھی کہ [انگریز] کبھی اس ملک کی سلطنت سے دست بردار ہوں گے،" حسن نے بعد میں لکھا، "اِس لیے سرسید نے مسلمانوں کی جداگانہ قومیت کی حقیقت کا ذکر مقابلے کے امتحانوں، مجالس واضعانِ قانون اور لوکل سیلف گورنمنٹ کے اداروں میں ان کے حقوق کے جداگانہ تعین اور تحفظ کے سلسلے میں کیا۔ محسن الملک اور وقار الملک کے زمانے میں بھی اس کے کوئی آثار نہیں تھے کہ انگریز ہندوستان سے جائیں گے لہٰذا اُس وقت صرف جداگانہ انتخاب اور تعدادِ نیابت میں توازن پر زور رہا۔ اقبال کے زمانے میں صوبائی

---

[1] مارہروی، ص ۳۷-۳۶

[2] سید حسن ریاض (۱۹۹۲) پاکستان ناگزیر تھا، ص ۱۸۰

خود مختاری یقینی ہو چکی تھی اور کامل آزادی کا مطالبہ زبانوں پر تھا اس لیے انہوں نے شمال مغرب میں مسلم اکثریت کے صوبوں کی متحدہ ریاست کا خیال پیش کیا۔"[1]

خطبہ مکمل کر کے علامہ "بیٹھے بھی نہ تھے کہ... حاضرین نے یک زبان ہو کر مطالبہ کیا کہ کوئی غزل سنایئے... جب بہت اصرار ہوا، تو بادلِ نخواستہ بہت تھکی اور پست آواز میں خودی کے متعلّق چند اشعار سنائے۔" دوبارہ مطالبہ ہوا تو "بہت پر خلوص لہجے میں کہنے لگے، 'اب میں ایک حدیث سناؤں گا اور اگر آپ لوگوں نے اِس پر غور کیا تو قوم کے تمام مسائل حل ہو جائیں گے: مَن عَرَفَ نَفسَہ فَقَد عَرَفَ رَبَّہ (یعنی جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اُس نے خدا کو پہچان لیا)۔'"[2]

مارہروی کہتے ہیں، "اِتنا کہہ کر علامہ بیٹھ گئے اور لوگوں نے دروازے کا رُخ کیا۔ جلسہ خود بخود برخاست ہو گیا۔"[3] یہ درست نہیں ہے۔ انڈین اینوئیل رجسٹر نے لکھا کہ علامہ کے خطبۂ صدارت کے خاتمے پر مولوی یعقوب نے اُردو میں خلاصہ پیش کیا کیونکہ حاضرین کی بڑی تعداد انگریزی سے نابلد دکھائی دیتی تھی۔[4] انقلاب نے اُس روز کے اجلاس کی خبر کے آخر میں لکھا، "مولوی محمد یعقوب ایم۔ ایل۔ اے سکریٹری مسلم لیگ نے اِس خطبہ کا ترجمہ اُردو زبان میں حاضرین کو سنایا۔"[5]

مفتی فخرُالاسلام سے روایت کہ انہوں نے اور اُن کے دوستوں نے علیحدگی میں چپکے سے علامہ سے کہا، "آپ اِن ٹوڈیوں میں کہاں آ پھنسے؟" علامہ نے جواب دیا، "تم لوگ گھبراؤ مت، یہ لوگ باقی رہنے والے نہیں ہیں، قوم باقی رہے گی۔"[6]

---

[1] سید حسن ریاض، پاکستان ناگزیر تھا، ص ۲۴۹

[2] مارہروی، ص ۳۷-۳۵

[3] مارہروی، ص ۳۷؛ فاطمی (۲۰۰۰)، ص ۲۱ پر ہے، "خطبہ کے خاتمے پر مولوی یعقوب نے ناواقف لوگوں کے لیے خطبہ کے مرکزی خیالات کو اُردو میں پیش کیا لیکن مجمع اُکھڑ چکا تھا اور لوگ بے ہنگم طریقہ سے باہر جانے لگے۔" اِس روایت کے لیے کوئی حوالہ نہیں دیا گیا۔

[4] Mitra, *Register Jul-Dec 1930*, p.334

[5] انقلاب ۳۱/ دسمبر ۱۹۳۰ء؛ حمزہ فاروقی، اقبال کا سیاسی سفر، ص ۲۲۹

[6] زمن، ص ۵۰۱

37

”قرار دادیں آج رات کو منظور کی جائیں گی،“ انقلاب نے اُس دن کی خبر میں لکھا، ”معلوم ہوتا ہے کہ لیگ مسٹر جناح کے چودہ نکات کی تائید و حمایت کرے گی۔“[1] انڈین اینوئیل رجسٹر نے لکھا ہے کہ سبجکٹس کمیٹی کی میٹنگ دوپہر کے بعد (afternoon) ہوئی۔[2]

”علامہ اقبال نے صرف دو دن الٰہ آباد میں قیام کیا،“ ایک روایت ہے۔ اِس کے مطابق، ”ایک دن سہ پہر کو وہ ظہور احمد بیرسٹر کے ساتھ پیدل اس علاقے میں گھومتے رہے اور بہت سے لوگوں نے اور دوکانداروں نے اُن سے مصافحہ کیا۔ اگلے دن جسٹس سر شاہ محمد سلیمان نے اُنہیں کھانے پر مدعو کیا مگر وہ لاہور واپسی کا پروگرام بنا چکے تھے۔“[3] اگر واقعی دو دن قیام کیا، ایک دن سہ پہر کو پیدل گھومے، جس کے اگلے دن واپسی تھی، تو وہ سہ پہر ۲۹ / دسمبر ہی کی ہو سکتی ہے۔ اس صورت میں سبجکٹس کمیٹی کی میٹنگ رات کو ہوئی، جیسا کہ انقلاب نے اعلان کیا تھا۔ روایت سینتالیس برس بعد عبدالحئی عباسی سے سُن کر لکھی گئی۔ اُنہوں نے نہ بتایا کہ کیسے معلوم ہوئی، نہ یہ کہا کہ خود ساتھ تھے۔ مارہروی کے مطابق تو صرف ایک روز پہلے علامہ کا نام سُنتے ہی لوگوں نے اسٹیشن سے ساؤتھ روڈ تک ہجوم کر دیا تھا۔ یقین کے ساتھ نہیں کہا جا سکتا کہ سہ پہر کو پیدل گھومنے والی بات درست ہے اور کمیٹی کی میٹنگ سہ پہر کے وقت نہ ہوئی۔ عبداللہ چغتائی لکھتے ہیں، ”الٰہ آباد میں جب علامہ کی آمد کی خبر شائع ہوئی تھی تو وہاں کے اکثر شعرا نے آپ سے ملنے کی کوشش کی تھی۔ ہم لوگوں نے الٰہ آباد کا قلعہ اور گنگا و جمنا دریا کی بھی سیر کی تھی۔“[4]

جسٹس سر شاہ محمد سلیمان، الٰہ آباد ہائی کورٹ کے جج تھے۔ علیگرھ تحریک سے پوری طرح وابستہ تھے۔ ریاضی، سائنس اور نظریۂ اضافیت ان کی دلچسپی کے اہم موضوعات تھے۔ عارضی طور پر

---

[1] انقلاب ۳۱/ دسمبر ۱۹۳۰ء؛ حمزہ فاروقی، اقبال کا سیاسی سفر، ص ۲۲۹

[2] Mitra, *Register Jul-Dec 1930*, p.345

[3] زمن، ص ۵۰۳

[4] عبداللہ چغتائی، اقبال کی صحبت میں، ص ۱۸۸

الٰہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس بھی رہ چکے تھے۔ بعد میں مستقل ہو گئے۔ ہندوستان کے مسلمانوں میں علم اور قابلیت کی روشن مثالوں میں سے تھے۔[1] اُن کی دعوت قبول کرنے سے معذوری کا افسوس علامہ کو ضرور ہوا ہو گا، "البتہ اُنہوں نے اِس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ اکبر الٰہ آبادی کے مزار پر جا کر فاتحہ پڑھنا چاہتے ہیں۔" روایت ہے کہ مفتی فخرُ الاسلام پرانا کالا ڈانڈا کے قبرستان لے گئے۔ دوازدہ منزل سے ڈھائی تین میل دُور تھا۔ قبر کی حالت اچھی نہ تھی، "علامہ نے قبر کو دیکھا تو افسوس کے ساتھ کہا، 'اِتنے بڑے آدمی کی قبر اور اُس کی یہ حالت!'"[2]

روایت ہے کہ مہمانوں کے کھانے پینے اور رہنے کے بندوبست کی دیکھ بھال مسلم لیگ کونسل کے رکن حاجی غضنفر اللہ، اُن کے بھائی ذوالفقار اللہ اور ساتھی کر رہے تھے۔[3] ۲۹/ دسمبر کی شام غضنفر اور ذوالفقار نے اپنی کوٹھی نُور منزل میں علامہ کی دعوت کی۔ محمد حسین بیرسٹر اپنی کار میں علامہ کو نواب یوسف کی کوٹھی سے نور منزل لائے۔ کار خود چلا رہے تھے۔ علامہ پچھلی سیٹ پر بیٹھے تھے۔[4]

لاہور میں اُس شام انقلاب میں علامہ کے خطبے کے ترجمے کی دوسری اور آخری قسط شائع ہوئی۔ حسبِ معمول دو دن بعد کی تاریخ درج تھی۔[5]

سبجکٹس کمیٹی کی میٹنگ میں قریباً پچیس ارکان شریک ہوئے۔[6] روئیداد موجود نہیں ہے۔ لیگ کے ریکارڈ میں اِس اجلاس کے فائل میں غیر متعلق کاغذات بھی رکھے ہیں۔ ایک پر ۹/ دسمبر ۳۰ء کی تاریخ ہے۔ "اِس خصوصی اجلاس" میں تِلک کی وفات پر تعزیت اور پسماندگان سے ہمدردی کا اظہار ہے۔[7] رام گنگادھر تلک یکم اگست ۱۹۲۰ء کو فوت ہوئے۔ دس برس بعد کے فائل میں یہ کاغذ

---

[1] کراچی میں اسٹیڈیم سے ناظم آباد جانے والی سڑک ان کے نام پر ہے۔

[2] زمن، ص ۵۰۳

[3] Nadeem Shafiq Malik (2013), pp.35-38

[4] فاطمی، اقبال اور الٰہ آباد، ص ۱۵

[5] انقلاب ۳۱/ دسمبر ۱۹۳۰ء؛ بشکریہ امجد سلیم علوی

[6] Mitra, *Register Jul-Dec 1930*, p.345

[7] Nadeem Shafiq Malik (2013),pp.35-351

غلطی سے آیا ہے۔ ایک اور دستاویز پر صفحہ ۲ کا نمبر پڑا ہے، پہلا صفحہ نہیں ہے۔ نہرو رپورٹ میں ترمیم کا مطالبہ ہے۔ تجویز کرنے والے اے آر غازی ہیں۔ تائید کرنے والے تصدق علی خان شیر وانی اور طفیل احمد ہیں۔[1] اس کا بھی ۱۹۳۰ء کی میٹنگ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہو سکتا۔

جو کاغذات ۱۹۳۰ء کے اجلاس سے متعلق ہو سکتے ہیں، اُن میں ایک ہاتھ سے لکھی ہوئی قرارداد ہے۔ آیندہ دستور میں دیسی ریاستوں اور برطانوی ہندوستان کے باہمی تعلقات پر ہے۔[2] ایک ٹائپ شدہ دستاویز پر ہے، "مندرجہ ذیل قراردادیں ۲۹ / دسمبر کو صبح دس بجے سبجکٹ کمیٹی میں پیش کی جائیں گی۔"[3] میٹنگ افتتاحی اجلاس سے پہلے نہ ہو سکتی تھی۔ دستاویز ایک دو ہفتے پہلے تیار کی گئی ہو گی جب افتتاح ۲۸ / دسمبر کو متوقع تھا۔[4] معلوم نہیں کہ جن کے نام درج ہیں اُن میں سے کون کون آیا:

- سندھ کو علیحدہ صوبہ بنانے کا مطالبہ؛ تجویز ایم ایم عالم (پشاور)؛ تائید چودھری عبدالمجید
- بلوچستان اور صوبہ سرحد میں اصلاحات؛ تجویز مظفر حسین چودھری؛ تائید ڈی اے خان
- تمام نئے صوبوں میں اصلاحات پرانے صوبوں کے برابر ہوں؛ تجویز عبداللہ الکافی
- مردم شماری میں اچھوتوں اور نچلی ذاتوں کو ہندوؤں سے علیحدہ شمار کیا جائے؛ تجویز ڈی اے خان؛ تائید ابو طاہر محمد احمد[5]

معلوم ہوتا ہے کہ اِس کے بعد 'ڈرافٹ رزولیوشنز' تیار کی گئیں۔ علیحدہ کاغذ پر ٹائپ کی ہوئی ہیں:

۱ بعض لیگی رہنماؤں کی وفات پر تعزیت کا اظہار

۲ گول میز کانفرنس کے مسلم مندوبین کی تحسین؛ اُنہیں جناح کے چودہ نکات کا پابند نہ کیا جائے اگرچہ وہ نکات مسلمانوں کا متفقہ مطالبہ ہیں

۳ آیندہ دستور جمہوری ہو؛ مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے حقوق کا خیال رکھا جائے

---

[1] *Ibid.* pp. 338-340

[2] *Ibid.* pp.348-349

[3] *Ibid.* pp.338-339

[4] دیکھیے ۲۲ / دسمبر کے واقعات

[5] Nadeem Shafiq Malik (2013),pp.338-339

۴ صوبہ سرحد میں اصلاحات کے نفاذ کا مطالبہ
۵ کابینہ اور حکومت میں مسلمانوں کو شامل کرنے کا مطالبہ
۶ سول نافرمانی کی تحریک کی مذمت، جو "کمیونزم اور اَنارکی" کی طرف لے جارہی ہے، جنہیں لیگ ملک کے مفاد کے خلاف سمجھتی ہے[1]

اس کے بعد فتح پور سے امیر حسن خاں نے چار قراردادیں بھیجیں—ہندوؤں کی طرفداری پر برطانوی وزیراعظم کی مذمت، گول میز کانفرنس کے مسلم شرکا کی تحسین، ریاست جے پور کی طرف سے مسلمانوں کو کلمہ اور اذان سے منع کرنے کے خلاف احتجاج، اور فرانس کی طرف سے بربروں اور اطالویوں کی طرف سے طرابلس کے مسلمانوں پر سختی مظالم کی مذمت۔[2]

سمجھا جا سکتا ہے کہ سبجکٹس کمیٹی کی میٹنگ میں سات قراردادیں تشکیل پا کر منظور ہوئیں جنہیں اگلے روز کھلے اجلاس میں پیش کیا گیا۔ ایک قرارداد مسلم کانفرنس کی جنوری ۱۹۲۹ء کی مشہور قرارداد کی تائید میں تھی۔ مسلم کانفرنس کی قرارداد میں جناح کے چودہ نکات میں سے دس کا احاطہ ہو جاتا تھا۔ جناح کے بقیہ چار نکات کی تائید میں بھی قراردادیں تشکیل دی گئیں۔ کچھ قراردادیں حالاتِ حاضرہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ ان سب نکات کا احاطہ علامہ نے خطبہ صدارت میں کیا تھا۔ اجلاس کے صدر کی حیثیت میں سبجکٹس کمیٹی کی میٹنگ میں بھی نمایاں کردار ادا کیا ہو گا۔ مسلم کانفرنس کی قرارداد، جناح کے چودہ نکات، علامہ کا خطبہ صدارت اور کھلے اجلاس کی سات قراردادیں ایک مسلسل وحدت بن گئیں، جیسے ہندوستانی مسلمان دو برس بالکل سیدھے چلتے ہوئے یہاں پہنچے ہوں۔ اس دوران میں ہندو قیادت بارہا پٹڑی بدل چکی تھی۔

چودھری خلیق الزماں موجود نہ تھے۔ نیشنلسٹ مسلمانوں کے ساتھ تھے، جن کی مخالفت کے خوف سے اجلاس کھلے میدان کے بجائے چار دیواری میں کیا گیا۔ بعد میں خطبہ صدارت کے بارے میں کہا، "اجلاس میں کسی ایک فردِ واحد نے بھی اس کا کوئی نوٹس نہ لیا اور نہ کسی نے اپنی تقریر میں اس

---

[1] *Ibid.* pp.342-347
[2] *Ibid.* pp.336-337

کی تائید میں کوئی تجویز پیش کی ... شاید وہ جلسہ ہی اس قابل نہ تھا کہ اُس میں وہ جواہر پارے بکھیرے جائیں۔"[1] یہ درست نہ تھا۔

38

۳۰ر دسمبر کو صبح دس بجے کے قریب دوسری نشست کا آغاز ہوا۔[2] حاضرین کی تعداد گزشتہ روز سے بہت کم تھی۔[3] پہلی قرارداد علامہ کی طرف سے پیش کی گئی۔ مولوی مظہر الحق، صاحبزادہ آفتاب احمد خاں، مرزا علی محمد خاں، سر ابراہیم ہارون جعفر اور سید جالب کی وفات پر تعزیت اور پسماندگان سے ہمدردی کا اظہار تھا۔ دوسری قرارداد سید حبیب شاہ (لاہور) کی طرف سے پیش کی گئی:

> آل انڈیا مسلم لیگ، گول میز کانفرنس کے مسلم نمایندوں کو مسلمانوں کے جذبات کی صحیح ترجمانی کی متفقہ کوشش پر سراہتے ہوئے یکم جنوری ۱۹۲۹ء کو سر آغا خاں کے زیرِ صدارت دہلی میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اجلاس میں منظور ہونے والی قراداد کی مکمل حمایت کرتی ہے۔ اور اُمید کرتی ہے کہ مسلمان ممبران اس قرارداد پر عمل درآمد کے پابند رہیں گے۔[4]

چند روز پہلے امیر حسن (فتح پور) نے جو قرارداد بھیجی، اُس میں گول میز کانفرنس کے مسلم مندوبین کو صرف خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔ ڈرافٹ رزولیوشن نمبر ۲ر میں انہیں ہر بندش سے آزاد کیا گیا۔ یہ قرارداد اُنہیں ہندوستانی مسلمانوں کے فیصلے کا پابند بناتی۔ جنوری ۱۹۲۹ء کی مسلم کانفرنس کے بعد پہلی دفعہ لیگ کا اجلاس ہو رہا تھا۔ لیگ کی طرف سے مسلم کانفرنس کی قرارداد کی توثیق بھی تھی۔ اِسے

---

[1] شاہراہِ پاکستان از چودھری خلیق الزماں، ص ۵۰۹؛ منقولہ زمن،، ص ۵۰۲۔

[2] Mitra, *Register Jul-Dec 1930*, p.346؛ لکھا ہے کہ سر محمد اقبال قریباً ایک گھنٹہ صدارت کرنے کے بعد گیارہ بجے قریب اجلاس سے رخصت ہو گئے۔

[3] Mitra, *Register Jul-Dec 1930*, p.3465

[4] Mitra, *Register Jul-Dec 1930* نے اسے تیسری قرارداد بتایا ہے مگر لیگ کی طرف سے شائع ہونے والی منظور شدہ قراردادوں میں یہ دوسرے نمبر پر ہے؛ Nadeem Shafiq Malik (2013),pp.352-356

اجلاس کی خاص قرارداد کہا گیا۔ خطبۂ صدارت کے ساتھ گہرا تعلق ظاہر ہے۔ سید حبیب نے کہا کہ گول میز کانفرنس کے مندوبین کا انتخاب مسلمانوں نے نہیں کیا۔ پھر بھی مسلمانوں کے مطالبات کا دفاع کر رہے ہیں۔ اچھی بات ہے۔ لیکن آیندہ دستور کے بارے میں لندن میں جو بھی فیصلہ ہو، اُسے قبول کرنے یا مسترد کر دینے کا اختیار ہندوستانی مسلمانوں کے پاس ہے۔ کسی ایسے فیصلے کی پابندی نہ کریں گے جس میں اُن کے حقوق کا تحفظ نہ ہو۔[1]

شیخ ظہور احمد (الٰہ آباد) نے تائید کی۔ ڈاکٹر مفتی محمد صادق (قادیان) نے حمایت کی۔[2] ڈاکٹر ایس یو جنگ (الٰہ آباد) نے ترمیم پیش کی:

> قرار پایا کہ اگرچہ جناح کے ۱۴؍ نکات مسلمانوں کا کم سے کم مطالبہ ہیں، پھر بھی ملک کے وسیع تر مفاد کی خاطر، مسئلے کی پیچیدگی کے پیشِ نظر اور ناگہانی مشکلات کی وجہ سے جو موقع پر پیدا ہو سکتی ہیں، آل انڈیا مسلم لیگ مناسب نہیں سمجھتی کہ [گول میز کانفرنس] کے مسلم ارکان کے سمجھوتہ کرنے کے مکمل اختیار کو محدود کرے۔[3]

یہ اصل میں ڈرافٹ رزولیوشن نمبر ۲؍ تھی۔ لگتا ہے کہ گزشتہ روز سبجکٹس کمیٹی نے مسترد کر دیا۔ طے پایا ہو گا کہ ڈاکٹر جنگ اسے کھُلے اجلاس میں آزما کر دیکھ لیں۔ وضاحت کرتے ہوئے ان حالات کا ذکر کیا جن کے تحت مسلمانوں کے ایک گروہ نے ۲۹-۱۹۲۸ء میں دہلی میں مسلم کانفرنس بلوائی۔ لیگ زیادہ پرانی ہے۔ اُس کے وقار کے خلاف ہے کہ مسلم کانفرنس کی قرارداد اپنا لے۔ وہ قرارداد جناح کے ۱۴؍ نکات کے مقابلے میں محدود سوچ کی عکاسی کرتی ہے، مثلاً مسلم اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں کی نمایندگی کو مسلم اقلیتی صوبوں میں ویٹیج کے مسئلے سے علیحدہ کرنے میں ناکام ہے۔

سیٹھ عبداللہ ہارون نے ترمیم کی مخالفت کی اور کہا کہ گول میز کانفرنس کے ارکان کو اختیارات نہیں دیئے جا سکتے۔ انہیں مسلمانوں نے منتخب نہیں کیا۔ مسلمانوں نے لندن نہیں بھیجا۔ مسلمانوں کے مطالبات اُن ارکان کے سامنے ہیں۔ وہ سمجھوتہ کرنا چاہتے ہیں تو کر لیں۔ سمجھوتے کی شرائط پر غور

---

[1] Mitra, *Register Jul-Dec 1930*, p.346

[2] Nadeem Shafiq Malik (2013),pp.352-353

[3] Mitra, *Register Jul-Dec 1930*, p.346

کیے بغیر ہندوستانی مسلمان قبول نہ کریں گے۔ حفیظ الرحمٰن نے شدت کے ساتھ اعتراض کیا کہ ڈاکٹر جنگ، مسلم کانفرنس کی نمایندہ حیثیت کا انکار کر رہے ہیں۔[1]

"اِس مرحلے پر سر محمد اقبال، صدر، نشست سے رخصت ہو گئے،" انڈین اینوئیل رجسٹر نے لکھا، "اِس لیے کہ اُنہیں الٰہ آباد سے روانہ ہونا تھا۔" کرسیٔ صدارت کے لیے نواب محمد اسماعیل کو منتخب کیا گیا۔[2]

مولوی یعقوب نے کہا کہ مسلم کانفرنس کی قراردادِ دہلی اور جناح کے چودہ نکات میں در حقیقت کوئی فرق نہیں۔ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے مسلم ارکان کی نمایندہ حیثیت پر تنقید نہ کرنی چاہیے۔ حکومت کے سامنے اُن کی پوزیشن کمزور ہو جائے گی۔ محمد حسین بیرسٹر نے کہا کہ حکومت نے خود منتخب کیا۔ غیر نمایندہ نہیں کہہ سکتی۔ الزام اُسی پر آئے گا کہ غیر نمایندہ ارکان کیوں منتخب کیے۔ قرارداد ترمیم کے بغیر منظور کی جائے۔ محمد عظیم (غازی پور) نے بھی ترمیم کی مخالفت کی۔ سید حبیب نے بحث کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ گول میز کانفرنس کے ارکان کو تصفیے کا اختیار کیوں دیا جائے۔

نواب اسماعیل نے قرارداد پر ووٹ لینے چاہے۔ ڈاکٹر جنگ نے کہا کہ لیگ کے قواعد کے مطابق کم سے کم سترّ ارکان ضروری ہیں۔ اس وقت کم ہیں۔ قورم پورا نہیں ہو را۔ نواب اسماعیل نے کہا کہ اعتراض صرف پہلے روز اُٹھایا جا سکتا تھا۔ آج کی نشست اُس کا تسلسل ہے۔ قورم کی ضرورت نہیں۔ اعتراض مسترد کیا۔ ووٹ لیے۔ ڈاکٹر جنگ کی ترمیم مسترد ہو گئی۔ اصل قرارداد منظور ہوئی۔[3] تیسری قرارداد سید حسین امام نے پیش کی:

> قرار پایا کہ چونکہ حکومتِ ہند کا مراسلہ برائے آئینی اصلاحات ملک کے لیے با اختیار حکومت کی تشکیل کرنے میں ناکام رہا ہے، اس لیے اس کی سفارشات اہلِ ہند کی خواہشات کو بالعموم اور مسلم مطالبات کو بالخصوص پورا نہیں کر سکیں گی۔[4]

---

[1] Mitra, *Register Jul-Dec 1930*, p.347

[2] *Ibid.* p.346-347

[3] *Ibid.*

[4] Mitra, *Register Jul-Dec 1930* نے اسے دوسری قرارداد بتایا ہے مگر لیگ کی طرف سے شائع ہونے والی

حکومتِ ہند کا مراسلہ ۱۳ نومبر کو جاری ہوا۔ میٹنگ سے پہلے کی دستاویزات میں اس موضوع پر کوئی قرارداد نہیں ہے۔ علامہ نے خطبۂ صدارت میں تفصیل سے بات کی تھی۔ کم و بیش وہی رائے دی جو قرارداد میں ہے۔ ڈاکٹر جنگ نے تائید کی۔ منظور ہوئی۔ چوتھی قرارداد مولوی یعقوب نے پیش کی:

> قرار پایا کہ آل انڈیا مسلم لیگ شمال مغربی سرحدی صوبے کے مخصوص حالات کا مکمل ادراک رکھتے ہوئے اور اس کے دفاع کے لیے خصوصی اقدامات کی ضرورت کو تسلیم کرنے کے باوجود اِس خیال کی پُرزور حامی ہے کہ صوبے میں جاری مسلسل سیاسی بےچینی دُور نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی مقامی رائے عامہ مطمئن ہو سکتی ہے، جب تک انتظامی منصوبہ ملک کے دوسرے صوبوں کے مقابلے میں صوبہ سرحد کو کم تر حیثیت دیتا ہو۔

یہ ڈرافٹ رزولیوشنز میں موجود تھی۔ خطبۂ صدارت میں یہی موقف پیش کیا گیا تھا۔ مولانا عبدالماجد (بدایوں) نے تائید کی۔ منظور ہوئی۔ پانچویں قرارداد سید حسین امام نے پیش کی:

> قرار پایا کہ آل انڈیا مسلم لیگ اِس امر کو ضروری اور لازم خیال کرتی ہے کہ سرکاری ملازمتوں اور کابینہ میں مسلمانوں کی معقول نمائندگی کے لیے آئینی تحفظات فراہم کیے جائیں۔[1]

ڈرافٹ رزولیوشنز میں اس قرارداد کی صورت کچھ اور تھی۔ سوراج کے حصول کے ساتھ منسوب تھی۔ محمد عظیم نے تائید کی۔ ڈاکٹر جنگ نے مخالفت کی۔ اجلاس کی خاص قرارداد (دوسری قرارداد) کے مطابق مسلمان پانچ صوبوں اپنی حکومت قائم کرنے والے تھے۔ وہاں انہیں آزادی ہو گی کہ غیرمسلموں کو سرکاری ملازمتوں اور کابینہ میں نمایندگی نہ دیں۔ مجوزہ قرارداد کے تحت مسلمانوں نے ملازمت اور حکومت میں حصہ مانگا تو جہاں اکثریت میں ہوں گے، وہاں غیرمسلموں کو حصہ دینا پڑے گا۔ سید حبیب شاہ نے جواب دیا کہ کوئی ملّت دوسری ملّتوں کو شریک کیے بغیر کسی صوبے میں حکومت

---

[1] Nadeem Shafiq Malik (2013),pp.353-354
منظور شدہ قراردادوں میں یہ تیسرے نمبر پر ہے۔ Malik (2013),pp.352-353

نہیں کر سکتی۔ [1] قرارداد منظور ہوئی۔ چھٹی قرارداد سندھ کے نوجوان رہنما شیخ عبدالمجید نے پیش کی۔

> قرار پایا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کی رائے میں ہندوستان کے مسلمان ایسے کسی آئین سے مطمئن نہ ہوں گے جس میں یہ ضمانتیں موجود نہ ہوں: (الف) پنجاب اور بنگال کی مجالس قانون ساز میں آبادی کی بنیاد پر مکمل مسلم نمایندگی؛ (ب) سندھ کو فوراً اور غیر مشروط طور پر علیحدہ صوبے کی حیثیت دی جائے؛ اور (ج) صوبہ سرحد اور بلوچستان کو مکمل اختیارات عطا کیے جائیں۔
>
> یہ لیگ اعلان کرتی ہے کہ مسلمان ہندوستان کے لیے صرف اس وفاقی آئین کو قبول کریں گے جس میں وفاق کے مذکورہ بالا صوبوں کو بھی صوبائی خود مختاری کے لحاظ سے وفاق کے دوسرے اجزا کے مساوی رکھا جائے گا۔

یہ دستاویزات میں موجود کئی قراردادوں کا مجموعہ ہے۔ جس صورت میں پیش کی گئی وہ بیحد جاندار ہے۔ خطبۂ صدارت کی روح کے ساتھ ایک خاص مناسبت دیکھی جا سکتی ہے۔ مولوی عبدالقادر (قصور) نے تائید کی۔ منظور ہوئی۔ آخری قرارداد سید ذاکر علی شاہ نے پیش کی:

> قرار پایا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے دستور کی نظرِ ثانی اور ترامیم کے لیے درجِ ذیل ممبران پر مشتمل مجلس قائم کی جائے جو اسے لیگ کے آیندہ اجلاس میں پیش کرے گی: نواب محمد اسمٰعیل خان (میرٹھ)؛ قاضی مسعود حسین (میرٹھ)؛ مولوی [سر] محمد یعقوب۔ [2]

شیخ ظہور احمد نے تائید کی۔ منظور ہوئی۔ مولوی یعقوب اور ظہور احمد نے صدر اور جلسے کا انتظام کرنے والوں کا شکریہ ادا کیا۔ یعقوب نے کہا کہ پچھلے جلسوں کے برابر شرکت نہ ہوئی۔ وجہ صرف یہ ہے کہ رہنماؤں کی بڑی تعداد ملک سے باہر ہے۔ اس موقع پر کوئی بھی تنظیم جلسہ کرے تو حال زیادہ مختلف نہ ہو گا۔ نشست برخاست ہوئی۔ قریباً تین گھنٹے جاری رہی تھی۔ [3] آل انڈیا مسلم لیگ کا اکیسواں سالانہ

---

[1] Mitra, *Register Jul-Dec 1930*, p.348

[2] Nadeem Shafiq Malik (2013),pp.355-356

[3] Mitra, *Register Jul-Dec 1930*, p.348

اجلاس الٰہ آباد میں اختتام کو پہنچا۔

39

"خطبۂ الٰہ آباد ایک ایسا دھماکا تھا جس نے پوری گول میز کانفرنس کو ششدر کر دیا،" عبدالمجید سالک کے صاحبزادے عبدالسلام خورشید کا بیان ہے۔ بمبئی کے انڈین ڈیلی میل کے نامہ نگار نے لندن سے تار بھیجا، "ڈاکٹر اقبال کے خطبۂ صدارت پر وزیرِ اعظم برطانیہ جناب ریمزے میکڈانلڈ بیحد ناراض ہوئے ہیں۔"[1] ۳۱ر دسمبر کو ٹریبیون کے ایک مضمون کی سرخی تھی، 'ہندوستان میں مسلم ہندوستان کا قیام' ('Creation of a Muslim India within India')۔[2] ہندو مہاسبھا کے رہنما ڈاکٹر مونجے لندن میں تھے۔ ۳۱ر دسمبر کو گول میز کانفرنس کی اقلیتوں کی سب کمیٹی میں مذمت کی۔[3] ایک تلخ بحث کا آغاز تھا۔ جلد ہی شدّت اختیار کر گئی۔[4]

بعد میں کچھ لوگوں نے کہا کہ اُس زمانے میں الٰہ آباد کے خطبے پر ردِ عمل نہ ہوا۔ شمس الحسن لکھتے ہیں، "خطبے میں پیش کی گئی سیاسی تجاویز میں زیادہ دلچسپی نہ لی گئی۔"[5] مارہروی نے لکھا ہے، "اگلے دن اخبارات نے خطبے کی صرف چند سطریں شائع کر دیں اور بس۔ بات رفت و گزشت ہو گئی۔"[6] فخر الاسلام نے کہا، "اگلے دن پریس میں بھی کوئی خاص تبصرہ نہیں ہوا۔"[7] جاوید نے بھی بڑے ہو کر سوچا، "اقبال نے اپنے خطبے میں جن اُمور کا ذکر کیا، اُن پر زیادہ توجہ نہ دی گئی۔"[8]

الٰہ آباد میں اُس دن جو خواب پیش کیا گیا، اُس کی صحیح تعبیر پر بحث جاری ہے۔ جواب کی تلاش

---

[1] عبدالسلام خورشید، سرگذشتِ اقبال

[2] Nair, 'Partition and Minority Rights in Punjabi Hindu Debates…', p.69

[3] IRTC, *Proceedings of Sub-Committees* Vol.3, pp.43-44

[4] ڈاکٹر جاوید اقبال، زندہ رود، ص ۴۶۰-۴۵۸

[5] Hasan (1976), p.52

[6] مارہروی، ص ۳۷

[7] زمن، ص ۵۰۱

[8] ڈاکٹر جاوید اقبال (۲۰۰۴) زندہ رُود، ص ۴۵۶

میں نکلنے والوں میں سے ایک شخص قدرت کی اِس ادا پر توجہ دیئے بغیر نہ رہ سکا کہ پنڈت جواہر لال نہرو الٰہ آباد میں رہتے تھے۔ دسمبر ۱۹۲۹ء میں لاہور جا کر کانگریس کے اجلاس میں آزاد ہندوستان کی کامل آزادی کا مطالبہ پیش کیا۔ علامہ اقبال لاہور میں رہتے تھے۔ اگلے برس الٰہ آباد آ کر خطبہ دیا جو پاکستان کی بنیاد فراہم کر گیا۔[1]

الٰہ آباد میں ان کی آمد کی طرح وہاں سے روانگی کی تاریخ بھی واضح نہیں ہے۔ کہہ چکے تھے کہ ۳۱/ دسمبر کو لاہور واپس پہنچنا ہے۔انڈین انوئیل رجسٹر نے لکھا کہ ۳۰/ دسمبر والے اجلاس سے اسی لیے اُٹھے۔ امکان ہے کہ اُسی دن روانہ ہوئے۔[2] یہ معلوم نہیں ہے کہ جو لوگ لاہور سے ساتھ گئے تھے، ساتھ ہی واپس آئے یا رُک گئے۔ چودھری محمد حسین ساتھ ہی واپس آئے ہوں گے۔

ریلوے اسٹیشن پر ریاض الٰہ آبادی نے دیکھا کہ پلیٹ فارم پر دو چار لوگ علامہ کے گرد کھڑے ہیں۔ پنجاب میل اُس روز لیٹ تھی۔ انتظار کر رہے تھے۔ ریاض کا بیان ہے، ''میں نے علامہ اقبال کو سلام کیا اور کہا کہ میں ایک معمولی طالب علم ہوں۔ بچوں کو پڑھاتا ہوں۔ ایک اسکول میں ملازم ہوں۔ آپ کا ایک شعر میری سمجھ میں نہیں آیا۔ اُس کا مطلب پوچھنا چاہتا ہوں... علامہ نے انتہائی اخلاق سے میرا ہاتھ پکڑا اور سامنے فرسٹ کلاس وٹینگ رُوم میں لے گئے۔ ہم دونوں وہاں جا کر بیٹھ گئے۔ انہوں نے پوچھا، 'کون سا شعر ہے؟''' ریاض نے کہا:

اجل ہے لاکھوں ستاروں کی اِک ولادتِ مہر
فنا کی نیند مئے زندگی کی مستی ہے

علامہ نے جواب دیا، ''میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ قومیں فنا نہیں ہوتیں، اپنا قائم مقام پیش کر دیتی ہیں۔ اور اُن کی حالت پہلے سے بہتر ہو جاتی ہے۔ ستارے فنا نہیں ہوتے۔ اپنا قائم مقام سورج کی شکل میں

[1] محمد احمد خاں، اقبال کا سیاسی کارنامہ، ص ۲۱۸

[2] ڈاکٹر جاوید اقبال نے زندہ رود میں ۳۱/ دسمبر کی روانگی لکھی ہے مگر حوالہ نہیں دیا؛ ص ۴۵۶

اُنہوں نے پیش کر دیا۔ جو روشنی میں ستاروں سے برتر ہے۔"[1]

ریل گاڑی آگئی۔ علامہ اقبال رخصت ہو گئے۔

[1] مختار زمن، ص ۵۰۳

ALL-INDIA MUSLIM LEAGUE
ALLAHABAD SESSION
DECEMBER-1930
PRESIDENTIAL ADDRESS
BY
DR. SIR MUHAMMAD IQBAL
BARRISTER-AT-LAW,
LAHORE

Gentlemen,

I am deeply grateful to you for the honour you have conferred upon me in inviting me to preside over the deliberations of the All-India Muslim League at one of the most critical moments in the history of Muslim political thought and activity in India. I have no doubt that in this great assembly there are men whose political experience is far more extensive than mine, and for whose knowledge of affairs I have the highest respect. It will, therefore, be presumptuous on my part to claim to guide an assembly of such men in the political decisions which they are called upon to make today. I lead no party; I follow no leader. I have given the best part of my life to a careful study of Islam, its law and polity, its culture, its history and its literature. This constant contact with the spirit of Islam, as it unfolds itself in time, has, I think, given me a kind of insight into its significance as a world-fact. It is in the light of this insight, whatever its value, that, while assuming that the Muslims of India are determined to remain true to the spirit of Islam, I propose, not to guide you in your decisions, but to attempt the humbler task of bringing clearly to your consciousness the main principle which, in my opinion, should determine the general character of these decisions.

Islam and nationalism

It cannot be denied that Islam, regarded as an ethical ideal plus a certain kind of polity—by which expression I mean a social structure, regulated by a legal system and animated by a specific ethical ideal—has been the

chief formative factor in the life-history of the Muslims of India. It has furnished those basic emotions and loyalties which gradually unify scattered individuals and groups, and finally transform them into a well-defined people, possessing a moral consciousness of their own. Indeed it is no exaggeration to say that India is perhaps the only country in the world where Islam, as a people-building force, has worked at its best. In India, as elsewhere, the structure of Islam as a society is almost entirely due to the working of Islam as a culture inspired by a specific ethical ideal. What I mean to say is that Muslim society, with its remarkable homogeneity and inner unity, has grown to be what it is, under the pressure of the laws and institutions associated with the culture of Islam. The ideas set free by European political thinking, however, are now rapidly changing the outlook of the present generation of Muslims both in India and outside India. Our younger men inspired by these ideas, are anxious to see them as living forces in their own countries, without any critical appreciation of the facts which have determined their evolution in Europe. In Europe, Christianity was understood to be a purely monastic order which gradually developed into a vast Church-organisation. The protest of Luther was directed against this Church-organisation, not against any system of polity of a secular nature, for the obvious reason that there was no such polity associated with Christianity. And Luther was perfectly justified in rising in revolt against this organisation; though, I think, he did not realize that in the peculiar conditions which obtained in Europe his revolt would eventually mean the complete displacement of universal ethics of Jesus by the growth of a plurality of national and hence narrower systems of ethics. Thus the upshot of the intellectual movement initiated by such men as Rousseau and Luther was the break-up of the one into a mutually ill-adjusted many, the transformation of a human into a national outlook, requiring a more realistic foundation, such as the notion of country, and finding expression through varying systems of polity evolved on national lines, i.e., on lines which recognize territory as the only principle of political solidarity. If you begin with the conception of religion as complete other-worldliness, then what has happened to Christianity in Europe is perfectly natural. The universal ethics of Jesus is displaced by national systems of ethics and polity. The conclusion to which Europe is consequently driven is that religion is a private affair of the individual, and has nothing to do with what is called man's temporal life. Islam does not bifurcate the unity of man into an irreconcilable duality of spirit and matter. In Islam God and the universe, spirit and matter, church and state, are organic to each other. Man is not the citizen of a profane world to be renounced in the interest of a world of spirit situated elsewhere. To Islam

matter is spirit realizing itself in space and time. Europe uncritically accepted the duality of spirit and matter probably from Mannichaean thought. Her best thinkers are realizing this initial mistake to-day, but her statesmen are indirectly forcing the world to accept it as an unquestionable dogma. It is, then, this mistaken separation of spiritual and temporal which has largely influenced European religious and political thought, and has resulted practically in the total exclusion of Christianity from the life of European states. The result is a set of mutually ill-adjusted states dominated by interests, not human but national. And these mutually ill-adjusted states, after trampling over the moral and religious convictions of Christianity, are to-day feeling the need of a federated Europe, i.e. the need of a unity which the Christian Church-organisation originally gave them, but which, instead of reconstructing in the light of Christ's vision of human brotherhood, they considered it fit to destroy under the inspiration of Luther. A Luther in the world of Islam, however, is an impossible phenomenon; for here there is no Church-organisation, similar to that of Christianity in the middle ages, inviting a destroyer. In the world of Islam we have a universal polity whose fundamentals are believed to have been revealed, but whose structure, owing to our legists' want of contact with the modern world, stands today in need of renewed power by fresh adjustments. I do not know what will be the final fate of the national idea in the world of Islam, whether Islam will assimilate and transform it, as it has assimilated and transformed before many ideas expressive of a different spirit, or allow a radical transformation of its own structure by the force of this idea, is hard to predict. Professor Wensinck of Leiden (Holland) wrote to me the other day: 'It seems to me that Islam is entering upon a crisis through which Christianity has been passing for more than a century. The great difficulty is how to save the foundations of religion when many antiquated notions have to be given up. It seems to me scarcely possible to state what the outcome will be for Christianity, still less what it will be for Islam.' At the present moment the national idea is racialising the outlook of Muslims, and thus materially counteracting the humanising work of Islam. And the growth of racial consciousness may mean the growth of standards different and even opposed to the standards of Islam.

I hope you will pardon me for this apparently academic discussion. To address this session of the All-India Muslim League you have selected a man who is not despaired of Islam as a living force for freeing the outlook of man from its geographical limitations, who believes that religion is a power of the utmost importance in the life of individuals as well as states, and finally who believes that *Islam is itself Destiny and will not suffer a*

destiny! Such a man cannot but look at matters from his own point of view. Do not think that the problem I am indicating is a purely theoretical one. It is a very living and practical problem calculated to affect the very fabric of Islam as a system of life and conduct. On a proper solution of it alone depends your future as a distinct cultural unit in India. Never in our history Islam has had to stand a greater trial than the one which confronts it today. It is open to a people to modify, reinterpret or reject the foundational principles of their social structure; but it is absolutely necessary for them to see clearly what they are doing before they undertake to try a fresh experiment. Nor should the way in which I am approaching this important problem lead anybody to think that I intend to quarrel with those who happen to think differently. You are a Muslim assembly and, I suppose, anxious to remain true to the spirit and ideals of Islam. My sole desire, therefore, is to tell you frankly what I honestly believe to be the truth about the present situation. In this way alone it is possible for me to illuminate, according to my light, the avenues of your political action.

The unity of an Indian nation

What, then, is the problem and its implications? Is religion a private affair? Would you like to see Islam, as a moral and political ideal, meeting the same fate in the world of Islam as Christianity has already met in Europe? Is it possible to retain Islam as an ethical ideal and to reject it as a polity in favour of national polities in which religious attitude is not permitted to play any part? This question becomes of special importance in India where the Muslims happen to be in a minority. The proposition that religion is a private individual experience is not surprising on the lips of a European. In Europe the conception of Christianity as a monastic order, renouncing the world of matter and fixing its gaze entirely on the world of spirit, led, by a logical process of thought, to the view embodied in this proposition. The nature of the Prophet's religious experience, as disclosed in the Quran, however, is wholly different. It is not mere experience in the sense of a purely biological event, happening inside the experient and necessitating no reactions on its social environment. It is individual experience creative of a social order. Its immediate outcome is the fundamentals of a polity with implicit legal concepts whose civic significance cannot be belittled merely because their origin is revelational. The religious ideal of Islam, therefore, is organically related to the social order which it has created. The rejection of the one will eventually involve the rejection of the other. Therefore, the construction of a polity on national lines, if it means a displacement of the Islamic principle of solidarity, is simply unthinkable to a Muslim. This is a matter which at the present moment directly concerns the Muslims of India. 'Man,' says Renan, 'is enslaved neither by

his race nor by his religion, nor by the course of rivers, nor by the direction of mountain ranges. A great aggregation of men, sane of mind and warm of heart, creates a moral consciousness which is called a nation.' Such a formation is quite possible, though it involves the long and arduous process of practically re-making men and furnishing them with a fresh emotional equipment. It might have been a fact in India if the teachings of Kabir and the Divine Faith of Akbar had seized the imagination of the masses of this country. Experience, however, shows that the various caste units and religious units in India have shown no inclination to sink their respective individualities in a larger whole. Each group is intensely jealous of its collective existence. The formation of the kind of moral consciousness which constitutes the essence of a nation in Renan's sense demands a price which the peoples of India are not prepared to pay. The unity of an Indian nation, therefore, must be sought, not in the negation, but in the mutual harmony and cooperation of the many. True statesmanship cannot ignore facts, however unpleasant they may be. The only practical course is not to assume the existence of a state of things which does not exist, but to recognize facts as they are, and to exploit them to our greatest advantage. And it is on the discovery of Indian unity in this direction that the fate of India as well as of Asia really depends. India is Asia in miniature. Part of her people have cultural affinities with nations in the East, and part with nations in the middle and west of Asia. If an effective principle of cooperation is discovered in India it will bring peace and mutual goodwill to this ancient land which has suffered so long, more because of her situation in historic space than because of any inherent incapacity of her people. And it will at the same time solve the entire political problem of Asia.

It is, however, painful to observe that our attempts to discover such a principle of internal harmony have so far failed. Why have they failed? Perhaps, we suspect each other's intentions, and inwardly aim at dominating each other. Perhaps, in the higher interests of mutual cooperation, we cannot afford to part with monopolies which circumstances have placed in our hands, and conceal our egoism under the cloak of a nationalism, outwardly simulating a large-hearted patriotism, but inwardly as narrow-minded as a caste or a tribe. Perhaps, we are unwilling to recognize that each group has a right to free development according to its own cultural traditions. But whatever may be the causes of our failure, I still feel hopeful. Events seem to be tending in the direction of some sort of internal harmony. And as far as I have been able to read the Muslim mind, I have no hesitation in declaring that, if the principle that the Indian Muslim is entitled to full and free development on the lines of his own culture and tradition in his own Indian homelands is recognized

as the basis of a permanent communal settlement, he will be ready to stake his all for the freedom of India. The principle that each group is entitled to free development on its own lines is not inspired by any feeling of narrow communalism. There are communalisms and communalisms. A community which is inspired by feeling of ill-will towards other communities is low and ignoble. I entertain the highest respect for the customs, laws, religious and social institutions of other communities. Nay, it is my duty, according to the teachings of the Quran, even to defend their places of worship if need be. *Yet I love the communal group which is source of my life and behaviour; and which has formed me what l am by giving me its religion, its literature, its thought, its culture, and thereby recreating its whole past, as a living operative factor, in my present consciousness.* Even the authors of the Nehru Report recognize the value of this higher aspect of communalism. While discussing the separation of Sind they say: 'To say from the larger view-point of nationalism that no communal provinces should be created is, in a way, equivalent to saying from the still wider international viewpoint that there should be no separate nations. Both these statements have a measure of truth in them. But the staunchest internationalist recognizes that without the fullest national autonomy it is extraordinarily difficult to create the international state. *So also without the fullest cultural autonomy, and communalism in its better aspect is culture, it will be difficult to create a harmonious nation.'*

Muslim India within India

Communalism, in its higher aspect, then, is indispensable to the formation of a harmonious whole in a country like India. The units of Indian society are not territorial as in European countries. India is a continent of human groups belonging to different races, speaking different languages and professing different religions. Their behaviour is not at all determined by a common race consciousness. Even the Hindus do not form a homogeneous group. The principle of European democracy cannot be applied to India without recognising the fact of communal groups. The Muslim demand for the creation of a Muslim India within India is, therefore, perfectly justified. The resolution of the All-Parties Muslim Conference at Delhi is, to my mind, wholly inspired by this noble ideal of a harmonious whole which, instead of stiffling the respective individualities of its component wholes, affords them chances of fully working out the possibilities that may be latent in them. And I have no doubt that this house will emphatically endorse the Muslim demands embodied in this resolution. Personally I would go further than the demands embodied in it. *I would like to see the Punjab, North-West Frontier Province, Sind and Baluchistan amalgamated into a single state.*

Self-Government within the British Empire, or without the British Empire, the formation of a consolidated North-West Indian Muslim state appears to me to be the final destiny of the Muslims at least of the North-West India. The proposal was put forward before the Nehru Committee. They rejected it on the ground that, if carried into effect, it would give a very unwieldy state. This is true in so far as the area is concerned; in point of population the state contemplated by the proposal would be much less than some of the present Indian provinces. The exclusion of Ambala Division and perhaps of some districts where non-Muslims predominate, will make it less extensive and more Muslim in population—so that the exclusion suggested will enable this consolidated state to give a more effective protection to non-Muslim minorities within its area. The idea need not alarm the Hindus or the British. India is the greatest Muslim country in the world. The life of Islam as a cultural force in this country very largely depends on its centralisation in a specified territory. This centralisation of the most living portion of the Muslims of India whose military and police service has, notwithstanding unfair treatment from the British, made the British rule possible in this country, will eventually solve the problem of India as well as of Asia. It will intensify their sense of responsibility and deepen their patriotic feelings. Thus, possessing full opportunity of development within the body-politic of India, the North-West Indian Muslims will prove the best defenders of India against a foreign invasion, be that invasion the one of ideas or of bayonets. The Punjab with fifty-six per cent Muslim population supplies fifty-four per cent of the total combatant troops in the Indian Army, and if the nineteen thousand Gurkhas recruited from the independent state of Nepal are excluded, the Punjab contingent amounts to sixty two per cent of the whole Indian Army. This percentage does not take into account nearly six thousand combatants supplied to the Indian Army by the North-West Frontier Province and Baluchistan. From this you can easily calculate the possibilities of the North-West Indian Muslims in regard to the defence of India against foreign aggression. The Right Hon'ble Mr. Srinivasa Sastri thinks that the Muslim demand for the creation of autonomous Muslim states along with North-West border is actuated by a desire 'to acquire means of exerting pressure in emergencies on the Government of India.' I may frankly tell him that the Muslim demand is not actuated by the kind of motive he imputes to us; it is actuated by a genuine desire for free development which is practically impossible under the type of unitary government contemplated by the nationalist Hindu politicians with a view to secure permanent communal dominance in the whole of India.

Nor should the Hindus fear that the creation of autonomous Muslim states will mean the introduction of a kind of religious rule in such states.

I have already indicated to you the meaning of the word religion, as applied to Islam. The truth is that Islam is not a church. It is state, conceived as a contractual organism long before Rousseau ever thought of such a thing, and animated by an ethical ideal which regards man not as an earth-rooted creature, defined by this or that portion of the earth, but as a spiritual being understood in terms of a social mechanism, and possessing rights and duties as a living factor in that mechanism. The character of a Muslim state can be judged from what the *Times of India* pointed out sometime ago in a leader on the Indian Banking Inquiry Committee. 'In ancient India,' the paper points out, 'the state framed laws regulating the rates of interest; but in Muslim times, although Islam clearly forbids the realization of interest on money loaned, Indian Muslim states imposed no restrictions on such rates.' I therefore demand the formation of a consolidated Muslim state in the best interests of India and Islam. For India it means security and peace resulting from the internal balance of power; for Islam an opportunity to rid itself of the stamp that Arabian Imperialism was forced to give it, to mobilize its law, its education, its culture, and to bring them into closer contact with its own original spirit and with the spirit of modern times.

Federal states

Thus it is clear that in view of India's infinite variety in climates, races, languages, creeds and social systems, the creation of autonomous states, based on the unity of language, race, history, religion and identity of economic interests, is the only possible way to secure a stable constitutional structure in India. The conception of federation underlying the Simon Report necessitates the abolition of the Central Legislative Assembly as a popular assembly, and makes it an assembly of the representatives of federal states. It further demands a redistribution of territory on the lines which I have indicated. And the Report does recommend both. I give my whole-hearted support to this view of the matter, and venture to suggest that the redistribution recommended in the Simon Report must fulfil two conditions. It must precede the introduction of the new constitution, and must be so devised as to finally solve the communal problem. Proper redistribution will make the question of joint and separate electorates automatically disappear from the constitutional controversy of India. It is the present structure of the provinces that is largely responsible for this controversy. The Hindu thinks that separate electorates are contrary to the spirit of true nationalism, because he understands the word nation to mean a kind of universal amalgamation in which no communal entity ought to retain its private individuality. Such a state of things, however does not exist. Nor is it desirable that it should exist. India is the land of racial and religious variety. And to this, the

general economic inferiority of the Muslims, their enormous debt, especially in the Punjab, and their insufficient majorities in some of the provinces as at present constituted, and you will begin to see clearly the meaning of our anxiety to retain separate electorates. In such a country and in such circumstances, territorial electorates cannot secure adequate representation of all interests, and must inevitably lead to the creation of an oligarchy. The Muslims of India can have no objection to purely territorial electorates if provinces are demarcated so as to secure comparatively homogeneous communities possessing linguistic, racial, cultural and religious unity.

Federation as understood in the Simon Report

But in so far as the question of the powers of the Central Federal States is concerned, there is a subtle difference of motive in the constitutions proposed by the Pandits of India and the Pandits of England. The Pandits of India do not disturb the central authority as it stands at present. All that they desire is that this authority should become fully responsible to the Central Legislature which they maintain intact, and where their majority will become further reinforced on the nominated element ceasing to exist. The Pandits of England, on the other hand, realizing that democracy in the centre tends to work contrary to their interests, and is likely to absorb the whole power now in their hands, in case a further advance is made towards responsible government, have shifted the experiment of democracy from the centre to the provinces. No doubt, they introduce the principle of federation and appear to have made a beginning by making certain proposals, yet their evaluation of this principle is determined by considerations wholly different to those which determine its value in the eyes of Muslim India. The Muslims demand federation because it is pre-eminently a solution of India's most difficult problem i.e. the communal problem. The Royal Commissioners' view of federation, though sound in principle, does not seem to aim at responsible government for federal states. Indeed it does not go beyond providing means of escape from the situation which the introduction of democracy in India has created for the British, and wholly disregards the communal problem by leaving it where it was.

Thus it is clear that, in so far as real federation is concerned, the Simon Report virtually negatives the principle of federation in its true significance. The Nehru Report realizing Hindu majority in the Central Assembly reaches a unitary form of government because such an institution secures Hindu dominance throughout India; the Simon Report retains the present British dominance behind the thin veneer of an unreal federation, partly because the British are naturally unwilling to part with

the power they have so long wielded, and partly because it is possible for them, in the absence of an inter-communal understanding in India, to make out a plausible case for the retention of that power in their own hands. To my mind a unitary form of Government is simply unthinkable in a self-governing India. What is called 'residuary powers' must be left entirely to self-governing states, the Central Federal State exercising only those powers which are expressly vested in it by the free consent of federal states. I would never advise the Muslims of India to agree to a system, whether of British or of Indian origin, which virtually negatives the principle of true federation, or fails to recognize them as a distinct political entity.

Federal scheme as discussed in the Round Table Conference

The necessity for a structural change in the Central Government was seen probably long before the British discovered the most effective means for introducing this change. That is why at a rather late stage it was announced that the participation of the Indian Princes in the Round Table Conference was essential. It was a kind of surprise to the people of India, particularly the minorities, to see the Indian Princes dramatically expressing their willingness at the Round Table Conference to join an All-India Federation and, as a result of their declaration, Hindu delegates—uncompromising advocates of a unitary form of government—quietly agreeing to the evolution of a federal scheme. Even Mr. Sastri who, only a few days before, had severely criticised Sir John Simon for recommending a federal scheme for India, suddenly became a convert and admitted his conversion in the plenary session of the Conference—thus offering the Prime Minister of England an occasion for one of his wittiest observations in his concluding speech. All this has a meaning both for the British who have sought the participation of the Indian Princes, and the Hindus who have unhesitatingly accepted the evolution of an All-India Federation. The truth is that the participation of the Indian Princes—among whom only a few are Muslims—in a federation scheme serves a double purpose. On the one hand it serves as an all-important factor in maintaining the British power in India practically as it is, on the other hand it gives overwhelming majority to the Hindus in an All-India Federal Assembly. It appears to me that the Hindu-Muslim differences regarding the ultimate form of the Central Government are being cleverly exploited by British politicians through the agency of the Princes who see in the scheme prospects of better security for their despotic rule. If the Muslims silently agree to any such scheme it will simply hasten their end as a political entity in India. The policy of the Indian Federation, thus created, will be practically controlled

by Hindu Princes forming the largest group in the Central Federal Assembly. They will always lend their support to the Crown in matters of Imperial concern; and in so far as internal administration of the country is concerned they will help in maintaining and strengthening the supremacy of the Hindus. In other words the scheme appears to be aiming at a kind of understanding between Hindu India and the British Imperialism—you perpetuate me in India, and I in return give you a Hindu oligarchy to keep all other Indian communities in perpetual subjection. If therefore the British Indian provinces are not transformed into really autonomous states, the Princes' participation in a scheme of Indian federation will be interpreted only as a dexterous move on the part of British politicians to satisfy, without parting with any real power, all parties concerned—Muslims with the word federation, Hindus with a majority in the centre, and British Imperialists—whether Tory or Labourite—with the substance of real power.

The number of Hindu States in India is far greater than Muslim states; and it remains to be seen how the Muslim demand for 33 per cent seats in the Central Federal Assembly is to be met within a House or Houses constituted of representatives taken from British India as well as Indian states. I hope the Muslim delegates are fully aware of the implications of the federal scheme as discussed in the Round Table Conference. The question of Muslim representation in the proposed All-India Federation has not yet been discussed. 'The interim report,' says Reuter's summary, 'contemplates two chambers in the Federal Legislature—each containing representatives both of British India and States, the proportion of which will be a matter of subsequent consideration under the heads which have not yet been referred to the Sub-Committee.' In my opinion the question of proportion is of the utmost importance, and ought to have been considered simultaneously with the main question of the structure of the Assembly.

The best course, I think, would have been to start with a British Indian Federation only. A federal scheme born of an unholy union between democracy and despotism cannot but keep British India in the same vicious circle of a unitary Central Government. Such a unitary form may be of the greatest advantage to the British, to the majority community in British India and to the Indian Princes; it can be of no advantage to the Muslims unless they get majority rights in five out of eleven Indian Provinces with full residuary powers, and one-third share of seats in the total House of the Federal Assembly. In so far as the attainment of sovereign powers by the British Indian Provinces is concerned the position of H.H. the Ruler of Bhopal, Sir Akbar Hydari and Mr. Jinnah is unassailable. In view, however, of the participation of the Princes in the Indian Federation we

must now see our demand for representation in the British Indian Assembly in a new light. The question is not one of Muslim share in a British Indian Assembly, but one which relates to representation of British Indian Muslims in an All-India Federal Assembly. Our demand for 33 per cent must now be taken as a demand for the same proportion in the All-India Federal Assembly exclusive of the share allotted to the Muslim states entering the Federation.

The problem of defence

The other difficult problem which confronts the successful working of a federal system in India is the problem of India's defence. In their discussion of this problem the Royal Commissioners have marshalled all the deficiencies of India in order to make out a case for Imperial administration of the army. 'India and Britain,' say the Commissioners, 'are so related that India's defence cannot *now or in any future which is within sight,* be regarded as a matter of purely Indian concern. The control and direction of such an army must rest in the hands of agents of the Imperial Government. Now, does it necessarily follow from this that further progress towards the realization of responsible Government in British India is barred until the work of defence can be adequately discharged without the help of British officers and British troops? *As things are, there is a block on the line of constitutional advance.* All hopes of evolution in the Central Government towards the ultimate goal described in the declaration of 20th August 1917 are in danger of being indefinitely frustrated if the attitude illustrated by the Nehru Report is maintained that any future change involves the putting of the administration of the army under the authority of an elected Indian Legislature.' Further to fortify their argument they emphasise the fact of competing religions and rival races of widely different capacity, and try to make the problem look insoluble by remarking that 'the obvious fact, that India is not, in the ordinary and natural sense, a single nation is nowhere made more plain than in considering the difference between the martial races of India and the rest.' These features of the question have been emphasised in order to demonstrate that the British are not only keeping India secure from foreign menace but are also the 'neutral guardians of internal security.' However, in federated India, as I understand federation, the problem will have only one aspect, i.e. external defence. Apart from provincial armies necessary for maintaining internal peace, the Indian Federal Congress can maintain, on the North-West Frontier, a strong Indian Frontier Army, composed of units recruited from all provinces and officered by efficient and experienced military men taken from all communities. I know that India is not in possession of efficient military

officers, and this fact is exploited by the Royal Commissioners in the interest of an argument for Imperial administration. On this point I cannot but quote another passage from the Report which, to my mind, furnishes the best argument against the position taken up by the Commissioners. 'At the present moment,' says the Report, 'no Indian holding the King's Commission is of higher army rank than a captain. There are, we believe, 39 captains of whom 25 are in ordinary regimental employ. Some of them are of an age which would prevent their attaining much higher rank, even if they passed the necessary examination before retirement. Most of these have not been through Sandhurst, but got their Commissions during the Great War. Now, however genuine may be the desire, and however earnest the endeavour to work for this transformation the overriding conditions so forcibly expressed by the Skeen Committee (whose members, apart from the Chairman and the Army Secretary, were Indian gentlemen) in the words, "Progress... must be contingent upon success being secured at each stage and upon military efficiency being maintained throughout" must in any case render such development measured and slow. A higher command cannot be evolved at short notice out of existing cadres of Indian officers, all of junior ranks and limited experience. Not until the slender trickle of suitable Indian recruits for the officer class—and we earnestly desire an increase in their numbers—flows in much greater volume, not until sufficient Indians have attained the experience and training requisite to provide all the officers for, at any rate, some Indian regiments, not until such units have stood the only test which can possibly determine their efficiency, and not until Indian officers have qualified by a successful army career for high command, will it be possible to develop the policy of Indianisation to a point which will bring a completely Indianised army within sight. Even then years must elapse before the process could be completed.'

Now I venture to ask who is responsible for the present state of things? Is it due to some inherent incapacity of our martial races or to the slowness of the process of military training? The military capacity of our martial races is undeniable. The process of military training may be slow as compared to other processes of human training. I am no military expert to judge this matter. But as a layman I feel that the argument, as stated, assumes the process to be practically endless. This means perpetual bondage for India, and makes it all the more necessary that the Frontier Army, as suggested by the Nehru Report, be entrusted to the charge of a committee of defence the personnel of which may be settled by mutual understanding.

Again it is significant that the Simon Report has given extraordinary importance to the question of India's land frontier, but has made only

passing references to its naval position. India has doubtless had to face invasions from her land frontier; but it is obvious that her present masters took possession of her on account of her defenceless sea coast. A self-governing and free India, will, in these days have to take greater care of her sea coast than her land frontiers.

I have no doubt that if a Federal Government is established, Muslim federal states will willingly agree, for purposes of India's defence, to the creation of neutral Indian military and naval forces. Such a neutral military force for the defence of India was a reality in the days of Mughal Rule. Indeed in the time of Akbar the Indian frontier was, on the whole, defended by armies officered by Hindu generals. I am perfectly sure that the scheme of a neutral Indian army, based on a federated India, will intensify Muslim patriotic feeling, and finally set at rest the suspicion, if any, of Indian Muslims joining Muslims from beyond the frontier in the event of any invasion.

The alternative

I have thus tried briefly to indicate the way in which the Muslims of India ought, in my opinion, to look at the two most important constitutional problems of India. A redistribution of British India, calculated to secure a permanent solution of the communal problem, is the main demand of the Muslims of India. If, however, the Muslim demand of a territorial solution of the communal problem is ignored, then I support, as emphatically as possible, the Muslim demands repeatedly urged by the All-India Muslim League and the All-India Muslim Conference. The Muslims of India cannot agree to any constitutional changes which affect their majority rights, to be secured by separate electorates, in the Punjab and Bengal, or fail to guarantee them 33 per cent representation in any Central Legislature. There were two pitfalls into which Muslim political leaders fell. The first was the repudiated Lucknow Pact which originated in a false view of Indian nationalism, and deprived the Muslims of India from chances of acquiring any political power in India. The second is the narrow-visioned sacrifice of Islamic solidarity in the interest of what may be called Punjab Ruralism resulting in a proposal which virtually reduces the Punjab Muslims to a position of minority. It is the duty of the League to condemn both the Pact and the proposal.

The Simon Report does great injustice to the Muslims in not recommending a statutory majority for the Punjab and Bengal. It would either make the Muslims stick to the Lucknow Pact or agree to a scheme of joint electorates. Despatch of the Government of India on the Simon Report admits that since the publication of that document the Muslim community has not expressed its willingness to accept any of the

alternatives proposed by the Report. The despatch recognizes that it may be a legitimate grievance to deprive the Muslims in the Punjab and Bengal of representation in the councils in proportion to their population merely because of weightage allowed to Muslim minorities elsewhere. But the despatch of the Government of India fails to correct the injustice of the Simon Report. In so far as the Punjab is concerned—and this is the most crucial point—it endorses the so-called 'carefully balanced scheme' worked out by the official members of the Punjab Government which gives the Punjab Muslims a majority of two over the Hindus and Sikhs combined, and a proportion of 49 per cent of the Houses as a whole. It is obvious that the Punjab Muslims cannot be satisfied with less than a clear majority in the total House. However, Lord Irwin and his Government do recognize that the justification for communal electorates for majority communities would not cease unless a two-third majority of the Muslim members in a provincial council unanimously agree to surrender the right of separate representation. I cannot however understand why the Government of India, having recognized the legitimacy of Muslim grievance, have not had the courage to recommend a statutory majority for the Muslims in the Punjab and Bengal.

Nor can the Muslims of India agree to any such changes which fail to create at least Sind as a separate province and treat the North-West Frontier Province as a province of inferior political status. I see no reason why Sind should not be united with Baluchistan and turned into a separate province. It has nothing in common with the Bombay Presidency. In point of life and civilization the Royal Commissioners find it more akin to Mesopotamia and Arabia than India. The Muslim geographer Mas'udi noticed this kinship long ago when he said, 'Sind is a country nearer to the dominions of Islam.' The first Omayyad ruler is reported to have said of Egypt: 'Egypt has her back towards Africa and face towards Arabia.' With necessary alterations the same remark describes the exact situation of Sind. She has her back towards India and face towards Central Asia. Considering further the nature of her agricultural problems which can invoke no sympathy from the Bombay Government, and her infinite commercial possibilities, dependent on the inevitable growth of Karachi into a second metropolis of India, it is unwise to keep her attached to a Presidency which, though friendly to-day, is likely to become a rival at no distant period. Financial difficulties, we are told, stand in the way of separation. I do not know of any definite authoritative pronouncement on the matter. But, assuming there are any such difficulties, I see no reason why the Government of India should not give temporary financial help to a promising province in her struggle for independent progress.

As to the North-West Frontier Province, it is painful to note that the

Royal Commissioners have practically denied that the people of this province have any right to reform. They fall far short of the Bray Committee, and the council recommended by them is merely a screen to hide the autocracy of the Chief Commissioner. The inherent right of the Afghan to light a cigarette is curtailed merely because he happens to be living in a powder house. The Royal Commissioners' epigrammatic argument is pleasant enough, but far from convincing. Political reform is light, not fire; and to light every human being is entitled whether he happens to live in a powder house or a coal mine. Brave, shrewd and determined to suffer for his legitimate aspirations, the Afghan is sure to resent any attempt to deprive him of opportunities of full self-development. To keep such a people contented is in the best interest of both England and India. What has recently happened in that unfortunate province is the result of a step-motherly treatment shown to the people since the introduction of the principle of self-government in the rest of India. I only hope that the British statesmanship will not obscure its view of the situation by hoodwinking itself into the belief that the present unrest in the province is due to any extraneous causes.

The recommendation for the introduction of a measure of reform in the N.W.F.P. made in the Government of India's despatch is also unsatisfactory. No doubt the despatch goes further than the Simon Report in recommending a sort of representative Council and a semi-representative cabinet, but it fails to treat this important Muslim province on an equal footing with the other Indian Provinces. Indeed the Afghan is, by instinct, more fitted for democratic institutions than any other people in India.

Round Table Conference

I think I am now called upon to make a few observations on the Round Table Conference. Personally, I do not feel optimistic as to the results of this conference. It was hoped that away from the actual scene of the communal strife, and in a changed atmosphere, better councils would prevail; and a genuine settlement of the differences between the two major communities of India would bring India's freedom within sight. Actual events, however, tell a different tale. Indeed the discussion of the communal question in London has demonstrated, more clearly than ever, the essential disparity between the two great cultural units of India. Yet the Prime Minister of England apparently refuses to see that the problem of India is international and not national. He is reported to have said that 'his Government would find it difficult to submit to Parliament proposals for the maintenance of separate electorates, since joint electorate were much more in accordance with British democratic sentiments.' Obviously he did

not see that the model of British democracy cannot be of any use in a land of many nations; and that a system of separate electorates is only a poor substitute for a territorial solution of the problem. Nor is the Minorities Sub-Committee likely to reach a satisfactory settlement. The whole question will have to go before the British Parliament; and we can only hope that the keen sighted representatives of the British nation, unlike most of our Indian politicians will be able to pierce through the surface of things and see clearly the true fundamentals of peace and security in a country like India. To base a constitution on the concept of a homogenous India, or to apply to India principles dictated by British democratic sentiments, is unwittingly to prepare her for a civil war. As far as I can see, there will be no peace in the country until the various people that constitute India are given opportunities of free self-development on modern lines without abruptly breaking with their past.

I am glad to be able to say that our Muslim delegates fully realize the importance of a proper solution of what I call India's international problem. They are perfectly justified in pressing for a solution of the communal question before the question of responsibility in the Central Government is finally settled. No Muslim politician should be sensitive to the taunt embodied in that propaganda word—communalism—expressively devised to exploit what the Prime Minister calls the British democratic sentiment, and to mislead England into assuming a state of things which does not really exist in India. Great interests are at stake. We are seventy million, and far more homogenous than any other people in India. Indeed, the Muslims of India are the only Indian people who can fitly be described as a nation in the modern sense of the word. The Hindus, though ahead of us in almost all respects, have not yet been able to achieve the kind of homogeneity which is necessary for a nation and which Islam has given you as a free gift. No doubt they are anxious to become a nation but the process of becoming a nation is a kind of travail, and in the case of Hindu India, involves a complete overhauling of her social structure. Nor should the Muslim leaders and politicians allow themselves to be carried away by the subtle but fallacious argument that Turkey and Persia and other Muslim countries are progressing on national i.e. territorial lines. The Muslims of India are differently situated. The countries of Islam outside India are practically wholly Muslim in population. The minorities there belong, in the language of the Quran, to the 'people of the Book. There are no social barriers between Muslims and the 'people of the Book.' A Jew or Christian or a Zoroastrian does not pollute the food of a Muslim by touching it, and the Law of Islam allows intermarriage with the 'people of the Book.' Indeed the first practical step that Islam took towards the realization of a final combination of humanity was to call upon peoples

possessing practically the same ethical ideal to come forward and combine. The Quran declares, 'O people of the Book! Come let us join together on the 'word' (Unity of God), that is common to us all.' The wars of Islam and Christianity, and, later, European aggression in its various forms, could not allow the infinite meaning of this verse to work itself out in the world of Islam. Today it is being gradually realized in the countries of Islam in the shape of what is called Muslim Nationalism.

It is hardly necessary for me to add that the soul test of the success of our delegates is the extent to which they are able to get the non-Muslim delegates of the Conference to agree to our demands as embodied in the Delhi Resolution. If these demands are not agreed to, then a question of a very great and far-reaching importance will arise for the community. Then will arrive the moment for an independent and concerted political action by the Muslims of India. If you are at all serious about your ideals and aspirations you must be ready for such an action. Our leading men have done a good deal of political thinking, and their thought has certainly made us, more or less, sensitive to the forces which are now shaping the destinies of peoples in India and outside India. But I ask, has this thinking prepared us for the kind of action demanded by the situation which may arise in the near future? Let me tell you frankly that, at the present moment, the Muslims of India are suffering from two evils. The first is the want of personalities. Sir Malcolm Hailey and Lord Irvin were perfectly correct in their diagnosis when they told the Aligarh University that the community had failed to produce leaders. By leaders I mean men who, by Divine gift or experience, possess a keen perception of the spirit and destiny of Islam, along with an equally keen perception of the trend of modern history. Such men are really the driving forces of a people, but they are God's gift and cannot be made to order. The second evil from which the Muslims of India are suffering is that the community is fast losing what is called the herd-instinct. This makes it possible for individuals and groups to start independent careers without contributing to the general thought and activity of the community. We are doing today in the domain of politics what we have been doing for centuries in the domain of religion. But sectional bickerings in religion do not do much harm to our solidarity. They at least indicate an interest in what makes the sole principle of our structure as a people. Moreover, this principle is so broadly conceived that it is almost impossible for a group to become rebellious to the extent of wholly detaching itself from the general body of Islam. But diversity in political action, at a moment when concerted action is needed in the best interest of the very life of our people, may prove fatal. How shall we, then, remedy these two evils? The remedy of the first evil is not in our hands. As to the second evil I think it is possible to discover a remedy. I have got

definite views on the subject; but I think it is proper to postpone their expression till the apprehended situation actually arises. In case it does arise leading Muslims of all shades of opinion will have to meet together, not to pass resolutions, but finally to determine the Muslim attitude and to show the path to tangible achievement. In this address I mentioned this alternative only because I wish that you may keep it in mind, and give some serious thought to it in the meantime.

The conclusion

Gentlemen, I have finished. In conclusion I cannot but impress upon you that the present crisis in the history of India demands complete organisation and unity of will and purpose in the Muslim community, both in your own interest as a community, and in the interest of India as a whole. The political bondage of India has been and is a source of infinite misery to the whole of Asia. It has suppressed the spirit of the East, and wholly deprived her of that joy of self-expression which once made her the creator of a great and glorious culture. We have a duty towards India where we are destined to live and die. We have a duty towards Asia, especially Muslim Asia. And since 70 millions of Muslims in a single country constitute a far more valuable asset to Islam than all the countries of Muslim Asia put together, we must look at the Indian problem not only from the Muslim point of view but also from the standpoint of the Indian Muslim as such. Our duty towards Asia and India cannot be loyally performed without an organised will fixed on a definite purpose. In your own interest, as a political entity among other political entities of India, such an equipment is an absolute necessity. Our disorganized condition has already confused political issues vital to the life of the community. I am not hopeless of an intercommunal understanding but I cannot conceal from you the feeling that in the near future our community may be called upon to adopt an independent line of action to cope with the present crisis and an independent line of political action, in such a crisis, is possible only to a determined people, possessing a will focalised by a single purpose. Is it possible for you to achieve the organic wholeness of a unified will? Yes, it is. Rise above sectional interests and private ambitions, and learn to determine the value of your individual and collective action, however directed on material ends, in the light of the ideal which you are supposed to represent. Pass from matter to spirit. Matter is diversity; sprit is light, life and unity. One lesson I have learnt from the history of Muslims. At critical moments in their history it is Islam that has saved Muslims and not vice versa. If today you focus your vision on Islam and seek inspiration from the ever-vitalising idea embodied in it, you will be only reassembling your scattered forces, regaining your lost integrity, and thereby saving

yourself from total destruction. One of the profoundest verses in the Holy Quran teaches us that the birth and rebirth of the whole of humanity is like the birth and rebirth of a single individual. Why cannot you who, as a people, can well claim to be the first practical exponent of this superb conception of humanity, live and move and have your being as a single individual? I do not mystify anybody when I say that things in India are not what they appear to be. The meaning of this, however, will dawn upon you only when you have achieved a real collective ego to look at them. In the words of the Quran, 'Hold fast to yourself; no one who erreth can hurt you, provided you are well-guided.' (5:104)

ماخذ

قلمی نوادرات

علامہ اقبال میوزیم لاہور میں موجود نوادرات کے عکس اقبال اکادمی پاکستان کے پاس موجود ہیں جن سے میں نے استفادہ کیا۔ ان پر میوزیم کے اندراج کے نمبر موجود نہیں ہیں۔ اس لیے کتاب کے حواشی میں انہیں بیان کرنے پر ہی اکتفا ہے اور یہاں ان کی فہرست پیش کرنا مشکل ہے۔ بالخصوص جن قلمی مخطوطوں کا حوالہ کتاب میں زیادہ آیا ہے وہ بیاض زبورِ عجم، بیاض جاوید نامہ، مسودہ جاوید نامہ اور بیاض بال جبریل ہیں۔

کتابیں

احمد، شیخ اعجاز۔ ۱۹۸۵ء۔ مظلوم اقبال۔ کراچی [شائع کنندہ: مصنف]

احمد، سلیم۔ ۱۹۹۹۔ اقبالیات کے نقوش۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان

احمد، سید شکیل۔ 'اقبال حیدر آباد آرکائیوز میں'؛ اقبال ریویو (اقبال اکیڈیمی حیدر آباد)، ص ۷۰-۱

احمد، میاں بشیر۔ 'اقبال کی یاد میں'۔ ۱۹۷۷۔؛ ابواللیث صدیقی (مرتب)۔ ۱۹۷۷۔ ملفوظات اقبال۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ص ۵۵-۳۹

اختر النسأ۔ ۲۰۱۰۔ اقبال اور زمیندار۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان

اختر، ڈاکٹر سلیم۔ ۱۹۷۸۔ اقبال ممدوحِ عالم۔ لاہور: بزمِ اقبال

افضل، محمد رفیق (مرتب)۔ ۱۹۸۶۔ گفتارِ اقبال۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان

اقبال، علامہ سر محمد[1]۔ ۱۹۲۳۔ پیامِ مشرق (طبع اول)۔ لاہور [شائع کنندہ: مصنف]
ــــ ۱۹۲۳۔ پیامِ مشرق (طبع دوم)۔ لاہور [شائع کنندہ: مصنف]
ــــ ۱۹۲۳۔ اَسرار و رموز (یکجا طبعِ اول)۔ لاہور [شائع کنندہ: مصنف]
ــــ ۱۹۲۴۔ بانگِ درا (طبع اول)۔ لاہور [شائع کنندہ: مصنف]
ــــ ۱۹۲۶۔ بانگِ درا (طبع دوم)۔ لاہور [شائع کنندہ: مصنف]
ــــ ۱۹۲۷۔ آئینۂ عجم۔ لاہور: عطر چند کپور اینڈ سنز
ــــ؛ اور حکیم احمد شجاع (مرتبین)۔ اُردو کورس پانچویں جماعت کے لیے۔ لاہور: گلاب چند کپور اینڈ سنز بک سیلرز پبلشرز
ــــ اُردو کورس چھٹی جماعت کے لیے۔ لاہور: گلاب چند کپور اینڈ سنز بک سیلرز پبلشرز
ــــ اُردو کورس ساتویں جماعت کے لیے۔ لاہور: گلاب چند کپور اینڈ سنز بک سیلرز پبلشرز
ــــ اُردو کورس آٹھویں جماعت کے لیے۔ لاہور: گلاب چند کپور اینڈ سنز بک سیلرز پبلشرز
اقبال، ڈاکٹر جاوید۔ ۲۰۰۳۔ مئے لالہ فام۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان
اقبال، ڈاکٹر جاوید۔ ۲۰۰۴۔ زندہ رُود۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز
امر تسری، ثناٗاللہ۔ [تاریخ ندارد]۔ مقدس رسول ؐ بجواب رنگیلا رسول۔ مبوناتھ بھنجن: مکتبہ الفہیم
امر تسری، عرشی۔ 'حیاتِ اقبال کا ایک گوشۂ پنہاں'۔ اقبالیات، جولائی ۱۹۷۴ء
بٹالوی، ڈاکٹر عاشق۔ 'علامہ اقبال کی خدمت میں چند لمحے'؛ غلام دستگیر رشید (مرتب)۔ ۱۹۴۴۔ آثارِ اقبال۔ حیدر آباد (دکن): ادارۂ اشاعتِ اُردو، ص ۴۴-۳۵
برنی، مظفر حسین برنی (مرتب)۔ ۱۹۸۹۔ کلیات مکاتیب اقبال، جلد اول۔ دہلی: اُردو اکادمی
برنی، مظفر حسین برنی (مرتب)۔ ۱۹۹۱۔ کلیات مکاتیب اقبال، جلد دوم۔ دہلی: اُردو اکادمی
برنی، مظفر حسین برنی (مرتب)۔ ۱۹۹۳۔ کلیات مکاتیب اقبال، جلد سوم۔ دہلی: اُردو اکادمی

[1] علامہ کی مختلف تصانیف پر مختلف طریقوں سے نام لکھا ہے۔ یہاں سب کو علامہ سر محمد اقبال کے تحت رکھا جا رہا ہے۔

ماخذ

بلوچ، جعفر۔ ۱۹۹۵۔ علامہ اقبال اور مولانا ظفر علی خاں۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان

جاوید، احمد (مترجم)۔ ۲۰۰۰۔ پیامِ مشرق۔ الحمر اپبلشنگ، اسلام آباد

چودھری محمد حسین (مترجم)۔ ۱۹۲۳۔ خلافتِ اسلامیہ۔ لاہور: ظفر برادرس تاجرانِ کتب

خواجہ، مشفق (مرتب)۔ ۲۰۰۶۔ اقبال از احمد دین۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان

خورشید، عبد السلام۔ ۱۹۷۷۔ سرگزشتِ اقبال۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان

جالندھری، حفیظ۔ [تاریخ ندارد]۔ نغمہ زار۔ دہلی: مکتبہ اُردو

جاوید، یونس (مرتب)۔ ۱۹۸۶۔ صحیفۂ اقبال۔ لاہور: بزمِ اقبال

جلال الدین، مرزا۔ 'میرا اقبال'؛ ابو اللیث صدیقی (مرتب)۔ ۱۹۷۷۔ ملفوظاتِ اقبال۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ص ۱۲۵-۸۲

چغتائی، عبد اللہ۔ ۱۹۷۷۔ اقبال کی صحبت میں۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان

چغتائی، عبد اللہ۔ 'علامہ اقبال کا جنوبی ہند کا سفر (بسلسلۂ خطبات)'۔ مشمولہ ڈاکٹر سید عبد اللہ۔ ۱۹۷۷۔ متعلقاتِ خطباتِ اقبال۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان؛ ص ۱۷-۴۵

چغتائی، عبد اللہ۔ 'لاہور میں علامہ اقبال کی قیام گاہیں'؛ یونس جاوید (مرتب: ۱۹۸۶) صحیفۂ اقبال، لاہور: بزمِ اقبال، ص ۲۳۹-۲۳۱

چغتائی، عبد اللہ (مرتب)۔ ۱۹۸۹۔ روایاتِ اقبال۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان

حسرت، چراغ حسن۔ [تاریخ ندارد]۔ اقبال نامہ۔ لاہور: تاج کمپنی لمیٹڈ

حیدر آبادی، نظر۔ ۱۹۸۱۔ اقبال اور حیدر آباد۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان

حسین، احضاد۔ 'اعترافِ کمال پر طعنہائے دلخراش'؛ سلیم اختر (مرتب: ۱۹۷۷)، اقبالیات کے نقوش۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ص ۳۴۱-۳۳۷

حسین، چودھری محمد۔ 'تبصرہ بر تذکرہ'۔ زمیندار (لاہور)، ۳۱/ اگست، یکم ستمبر، ۳/ ستمبر اور ۵/ ستمبر ۱۹۲۴ء

حسین، خواجہ منظور۔ 'اقبال کا ایک غیر مطبوعہ خط'؛ یونس جاوید (مرتب: ۱۹۸۶) صحیفۂ اقبال، لاہور: بزمِ اقبال، ص ۱۵-۱۴

حسین، ڈاکٹر سید سلطان محمود۔ ۱۹۸۱۔ شمس العلمأ سید میر حسن حیات و افکار۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان

خاں، حامد علی۔ 'سر اقبال دے نال میل'؛ یونس جاوید (مرتب: ۱۹۸۶) صحیفۂ اقبال، لاہور: بزمِ اقبال، ص ۳۳-۲۸

خاں، محمد احمد۔ ۱۹۷۷۔ اقبال کا سیاسی کارنامہ۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان

خاں، سعادت علی۔ 'بزمِ اقبال'؛ ابو اللیث صدیقی (مرتب)۔ ۱۹۷۷۔ ملفوظاتِ اقبال۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ص ۲۳۸-۲۳۴

خاں، سر سید احمد۔ ۱۹۹۳۔ مرتب: اسماعیل پانی پتی۔ مقالاتِ سر سیّد حصہ سیزدہم۔ لاہور: مجلس ترقیٔ ادب

خورشید، عبد السلام۔ ۱۹۹۶۔ سرگذشتِ اقبال۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان

دریابادی، عبد الماجد۔ ۱۹۷۹۔ اقبالیاتِ ماجد۔ حیدر آباد (اے پی، انڈیا): اقبال اکیڈیمی

ڈار، بشیر احمد ڈار (مرتب)۔ ۱۹۷۷۔ اَنوارِ اقبال۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان

راجا، ظفر علی۔ ۲۰۱۳۔ قانون دان اقبال۔ لاہور: جمہوری پبلیکیشنز

راہی، اختر۔ ۱۹۷۸۔ اقبال سید سلیمان ندوی کی نظر میں۔ لاہور: بزمِ اقبال

راہی، اختر۔ 'علامہ اقبال اور مولوی الف دین نفیس'۔ اقبالیات، جولائی ۱۹۹۰ء، جنوری ۱۹۹۱ء، ص ۲۶۹-۲۵۹

رحمانی، عشرت۔ ۲۰۰۴۔ آغا حشر کے ڈرامے، جلد پنجم۔ لاہور: مجلسِ ترقیٔ ادب

رفیع الدین، ڈاکٹر محمد۔ ۲۰۰۶۔ حکمتِ اقبال۔ اسلام آباد: ادارہ تحقیقاتِ اسلامی بین الاقوامی یونیورسٹی اسلام آباد

ماخذ

رفیق افضل، محمد (مرتب)۔ ۱۹۸۶۔ گفتارِ اقبال۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان

ریاض، سید حسن۔ ۱۹۹۲۔ پاکستان ناگزیر تھا۔ کراچی: شعبہ تصنیف و تالیف جامعہ کراچی

رشید، غلام دستگیر (مرتب)۔ ۱۹۴۴۔ آثارِ اقبال۔ حیدر آباد (دکن): ادارۂ اشاعتِ اُردو

زمن، مختار۔ 'دوازدہ منزل سے منزل پاکستان تک'؛ نقوش—اقبال نمبر شمارہ ۱۲۱، ستمبر ۱۹۷۷ء، ص ۴۹۹-۵۰۴

زمن، مختار۔ 'خطبۂ الٰہ آباد (ایک تاریخ ساز خطبہ)'؛ نقوش—اقبال نمبر شمارہ ۱۲۱، ستمبر ۱۹۷۷ء، ص ۵۰۵-۵۲۲

زیب النسأ۔ ۱۹۹۳ء۔ نگارشاتِ اقبال۔ لاہور: مکتبہ تعمیرِ انسانیت

سالک، عبد المجید۔ ۱۹۸۳۔ ذکرِ اقبال۔ لاہور: بزمِ اقبال

سعید اللہ، ڈاکٹر۔ 'اقبال کے ہاں ایک شام'؛ ابو اللیث صدیقی (مرتب)۔ ۱۹۷۷۔ ملفوظات اقبال۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ص ۱۳۰-۱۴۷

شاہد، دوست محمد۔ ۲۰۰۷۔ تاریخِ احمدیت جلد چہارم۔ قادیان: نظارتِ نشر و اشاعت

شاہد، محمد حنیف۔ ۱۹۷۵۔ اقبال چودھری محمد حسین کی نظر میں۔ لاہور: سنگِ میل پبلی کیشنز

شاہد، محمد حنیف۔ ۱۹۷۶۔ اقبال اور انجمن حمایت اسلام۔ لاہور: کتب خانہ انجمن حمایت اسلام

شاہد، محمد حنیف۔ ۱۹۷۷۔ اقبال اور پنجاب کونسل۔ لاہور: مکتبۂ زریں

شاہجہانپوری، ابو سلمان۔ ۱۹۹۳۔ علامہ اقبال اور مولانا محمد علی۔ کراچی: مکتبہ شاہد

شفیق، خرم علی۔ ۲۰۱۰۔ اقبال: تشکیلی دور۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان

شفیق، خرم علی۔ ۲۰۱۲۔ اقبال: درمیانی دور۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان

شاہین، رحیم بخش۔ ۱۹۷۵۔ اوراقِ گم گشتہ۔ لاہور: اسلامک پبلیکیشنز لمیٹڈ

شاہین، رحیم بخش۔ 'مکاتیبِ اقبال بنام صوفی غلام مصطفٰی تبسم'۔ اقبالیات، جولائی ۱۹۸۹ء، جنوری ۱۹۹۰ء، ص ۳۲۹-۳۵۵

صدیقی، ابواللیث (مرتب)۔ ۱۹۷۷۔ ملفوظاتِ اقبال۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان

صدیقی، ثنأالحق۔ ۱۹۹۰۔ مولانا محمد علی جوہر، حیات اور تعلیمی نظریات۔ کراچی: آل پاکستان ایجوکیشنل کانفرنس

صدیقی، رشید احمد۔ ۱۹۷۶۔ اقبال شخصیت اور شاعری۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان

صوفی، خالد نظیر۔ ۱۹۸۳۔ اقبال درونِ خانہ۔ لاہور: بزمِ اقبال

صوفی، خالد نظیر۔ ۲۰۰۳۔ اقبال درونِ خانہ [جلد دوم][1]۔ اقبال اکادمی پاکستان۔ لاہور

عابد، سید عابد علی۔ 'دو ملاقاتیں'؛ ابواللیث صدیقی (مرتب)۔ ۱۹۷۷۔ ملفوظاتِ اقبال۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ص ۲۲۷-218

عبدالحکیم، خلیفہ۔ 'اقبال'؛ ہمایوں (اقبال نمبر)، ۱۹۳۲ء

عبدالحکیم، خلیفہ۔ 'اقبال کی زندگی'؛ غلام دستگیر رشید (مرتب)۔ ۱۹۴۴۔ آثارِ اقبال۔ حیدرآباد (دکن): ادارۂ اشاعتِ اُردو، ص ۳۴-۱۷

عبدالحمید، پروفیسر خواجہ۔ 'اقبال کے علمی جواہر ریزے'؛ غلام دستگیر رشید (مرتب)۔ ۱۹۴۴۔ آثارِ اقبال۔ حیدرآباد (دکن): ادارۂ اشاعتِ اُردو ۸۴-۵۳

عبدالحمید، ڈاکٹر قاضی۔ 'اقبال کی شخصیت اور اُس کا پیغام'؛ اُردو۔ اقبال نمبر، اکتوبر ۱۹۳۸، ص ۲۲۲-۱۹۲

عبدالرزاق، مولوی محمد (مرتب)۔ ۱۹۲۴۔ کلیاتِ اقبال یعنی ترجمانِ حقیقت سر ڈاکٹر محمد اقبال کے اُردو کلام کا مجموعہ۔ حیدرآباد دکن: عماد پریس

عبداللہ، ڈاکٹر سید۔ ۱۹۷۷۔ متعلقاتِ خطباتِ اقبال۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان

عبدالوحید، خواجہ۔ 'یادِ ایّام'؛ ابواللیث صدیقی (مرتب)۔ ۱۹۷۷۔ ملفوظاتِ اقبال۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ص ۱۸۲-۱۷۳

عرشی، محمد حسین۔ 'علامہ اقبال کی صحبت میں'؛ ابواللیث صدیقی (مرتب)۔ ۱۹۷۷۔ ملفوظات

---

[1] کتاب پر جلد نمبر درج نہیں مگر درحقیقت یہ جلد دوم ہے، جیسا کہ پیش لفظ سے بھی ظاہر ہے۔

ماخذ

اقبال۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ص ۸۱-۵۶

عروج، عبد الرؤف۔ ۱۹۷۸۔ اقبال اور بزمِ اقبال حیدر آباد دکن۔ کراچی: دارُ الاَدب، پاکستان

عزیز ملک۔ ۲۰۰۰۔ حفیظ جالندھری۔ اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان

علوی، امجد سلیم (مرتب)۔ ۱۹۸۸۔ اقبالیاتِ مہر۔ لاہور: مہر سنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

عمر، محمد سہیل۔ ۲۰۰۲۔ خطباتِ اقبال نئے تناظر میں۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان

طارق، عبد الرشید۔ 'مے شبانہ'؛ ابو اللیث صدیقی (مرتب)۔ ۱۹۷۷۔ ملفوظاتِ اقبال۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ص ۲۷۵-۲۳۹

فاروقی، محمد حمزہ۔ ۱۹۸۸۔ حیاتِ اقبال کے چند مخفی گوشے۔ ادارۂ تحقیقات پاکستان، دانشگاہ پنجاب، لاہور

فاروقی، محمد حمزہ۔ ۱۹۹۲۔ اقبال کا سیاسی سفر۔ لاہور: بزمِ اقبال

فاطمی، علی احمد۔ ۲۰۱۰۔ اقبال اور الہ آباد۔ الہ آباد: ادارۂ نیا سفر

فراقی، ڈاکٹر تحسین۔ ۱۹۹۲۔ نقدِ اقبال حیاتِ اقبال میں۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان

فوق، محمد الدین۔ 'ڈاکٹر شیخ سر محمد اقبال'؛ نیرنگِ خیال - اقبال نمبر، ستمبر - اکتوبر ۱۹۳۲، ص ۵۲-۲۵

قرشی، حکیم محمد حسن۔ 'حکیمِ مشرق'؛ ابو اللیث صدیقی (مرتب)۔ ۱۹۷۷۔ ملفوظاتِ اقبال۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان، ص ۲۹۱-۲۷۶

قریشی، محمد عبد اللہ۔ 'حیاتِ اقبال کی گمشدہ کڑیاں'؛ اقبال، اپریل ۱۹۵۶ء۔

قریشی، محمد عبد اللہ۔ ۱۹۸۶۔ اقبال بنام شاد۔ لاہور: بزمِ اقبال

قریشی، محمد عبد اللہ۔ 'اقبال کی باتیں اور ملاقاتیں'؛ یونس جاوید (مرتب؛ ۱۹۸۶) صحیفۂ اقبال، لاہور: بزمِ اقبال، ص ۱۵۵-۱۰۶

گونڈوی، اصغر۔ [تاریخ ندارد]۔ سرودِ زندگی۔ لاہور: تاج کمپنی لمیٹڈ

گھوش، اجئے۔ بھگت سنگھ اور اُن کے ساتھی (دوسرا ایڈیشن)۔ لاہور: قومی دارُ الاشاعت

مارہروی، احمد الدین۔ 'جلسہ الہ آباد کا آنکھوں دیکھا حال'؛ اُردو ڈائجسٹ جلد ۷، شمارہ ۶، اپریل ۱۹۶۷، ص ۳۸-۴۳

مجیب، پروفیسر محمد۔ 'ڈاکٹر اقبال'؛ غلام دستگیر رشید (مرتب)۔ ۱۹۴۴۔ آثارِ اقبال۔ حیدر آباد (دکن): ادارۂ اشاعتِ اُردو، ص ۹۸-۹۱

محمود، صفدر۔ 'علامہ اقبال کا گوشوارۂ آمدنی (انکم ٹیکس ریکارڈ کی روشنی میں)'؛ صحیفہ اکتوبر ۱۹۷۳ء (شمارہ ۵۶، اقبال نمبر حصہ اول)، ص ۵۱-۱۳

معینی، سید عبدالواحد؛ اور محمد عبداللہ قریشی (مرتبین)۔ ۱۹۶۶۔ باقیاتِ اقبال۔ ۱۹۶۶۔ لاہور: آئینۂ ادب

منور، پروفیسر محمد۔ ۲۰۰۳۔ میزانِ اقبال۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان

ملک، ڈاکٹر حسن اختر۔ ۱۹۸۸۔ اقبال، ایک تحقیقی مطالعہ۔ لاہور: یونیورسل بُکس

ملک، ڈاکٹر ندیم شفیق۔ ۲۰۱۳۔ علامہ اقبال کا خطبۂ الہ آباد ۱۹۳۰ء (مقدمہ، حوشی، تعلیقات، دستاویزات)۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان

ندوی، سید سلیمان۔ ۱۹۸۳۔ خطباتِ مدراس۔ لاہور: ادارۂ اسلامیات

نفیس، ڈاکٹر ثاقب (مرتب)۔ 'چودھری محمد حسین مرحوم کی ڈائری کے چند اَوراق'۔ اقبال، شمارہ اپریل-اکتوبر ۲۰۰۸، ص ۲۲۵-۲۰۷

نفیس، ڈاکٹر ثاقب (مرتب)۔ 'چودھری محمد حسین مرحوم کی ڈائری کے چند اَوراق'۔ اقبال، شمارہ نومبر ۲۰۰۸-مارچ ۲۰۰۹، ص ۱۵-۹

نفیس، ڈاکٹر ثاقب (مرتب)۔ ۲۰۰۴۔ مکتُوباتِ اقبال (بنام چودھری محمد حسین)۔ دہلی: کتابی دنیا

نگینہ، ظفر اقبال۔ ۱۹۸۸۔ غازی علم الدین شہید۔ لاہور: جنگ پبلشرز

نعمانی، شبلی۔ ۱۹۹۱۔ شعر العجم حصہ پنجم۔ اعظم گڑھ: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی

ماخذ

نیازی، سید نذیر۔ ۱۹۸۸۔ دانائے راز۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان

نیازی، سید نذیر (مترجم)۔ ۱۹۸۶۔ تشکیلِ جدید الٰہیاتِ اسلامیہ۔ لاہور: بزمِ اقبال

نیازی، سید نذیر (مرتب)۔ ۱۹۷۷۔ مکتوباتِ اقبال بنام سید نذیر نیازی۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان

وحید الدین، فقیر سید۔ ۱۹۸۸۔ روزگارِ فقیر، جلد اول۔ لاہور: آتش فشاں پبلی کیشنز

وحید الدین، فقیر سید۔ [بلا تاریخ]۔ روزگارِ فقیر، جلد دوم۔ لاہور: مکتبہ تعمیرِ انسانیت

ہاشمی، ڈاکٹر رفیع الدین (مرتب)۔ ۱۹۷۶۔ خطوطِ اقبال۔ لاہور: مکتبہ خیابانِ ادب

ہاشمی، رفیع الدین۔ 'اقبال کے پانچ غیر مدوّن خطوط'؛ یونس جاوید (مرتب؛ ۱۹۸۶) صحیفۂ اقبال، لاہور: بزمِ اقبال، ص ۳۸۸-۳۸۰

ہاشمی، ڈاکٹر رفیع الدین۔ ۲۰۰۱۔ تصانیف اقبال کا تحقیقی و توضیحی مطالعہ۔ لاہور: اقبال اکادمی پاکستان

ہاشمی، ڈاکٹر رفیع الدین۔ محمد سہیل عمر۔ ڈاکٹر وحید عشرت۔ ۲۰۰۲۔ اقبالیات کے سو سال۔ اسلام آباد: اکادمی ادبیات پاکستان

Afzal, Muhammad Rafique. 2013. *A History of the All-India Muslim League 1906-1947.* Karachi: Oxford University Press

Aghnides, Nicolas P.1916. *Mohammedan Theories of Finance: With an Introduction to Mohammedan Law and a Bibliography*. New York: Faculty of Political Sciences, Columbia University

Ahmad, Prof. Dr. Riaz. 2006. *All India Muslim League and the Creation of Pakistan: A Chronology (1906-1947).* Islamabad: National Institute of Historical and Cultural Research, Centre of Excellence, Quaid-i-Azam University

[AIML] All India Muslim League. *Resolutions of the All India Muslim League From May 1924 to December 1936.* Published by (Nawabzada) Liaquat Ali Khan, M.A. (Oxon), M.L.A (U.P.) Barrister-at-Law, Honorary Secretary All India Muslim League

All Parties Conference 1928 (a). *Report of the Committee appointed by the Conference to determine the principles of the Constitution for India* [also known as the *Nehru Report*]. Allahabad: General Secretary, All India Congress Committee

All Parties Conference 1928 (b). *Summary of Proceedings Fourth Session – Lucknow* [also known as the Lucknow Conference]. Allahabad: General Secretary, All India Congress Committee

All Parties National Convention. *The Proceedings of the All Parties National Convention.* Allahabad: Rafi Ahmad Kidwai, Secretary, All Parties National Convention

Anonymous. 1923. 'No. *32782', The London Gazette (Supplement), 29 December 1922.* London: The Stationery Office. Retreived June 17, 2017, https://www.thegazette.co.uk/London/issue/32782/supplement/

Anonymous. 1924. 'The Abolition of the Caliphate' in *The Economist*, March 8, 1924. London. Retrieved Oct 20, 2015 http://www.economist.com/node/11829711

Anonymous. [1930]. *Lectures on the Reconstruction of Religious Thought in Islam—Some Opinions.* Lahore: Sh. Mubarak Ali

Anonymous. 1930. *Proceedings and Transactions of the Fifth Indian Oriental Conference November 19, 20, 21 and 22, 1928.* In Two Volumes. Lahore: University of the Panjab

Anonymous. [*n.d.*]. *The Proceedings of the All Parties National Convention.* Allahabad: Rafi Ahmad Kidwai, Secretary, All Parties National Convention

Aslam, Qazi Muhammad (1970). 'Iqbal at a College Reception in Lahore' in *Iqbal Review*, Vol. 11, No.3. Lahore: Iqbal Academy Pakistan, October 1970

Bakshi S. R, et. al. (Ed.). 2005. *Modern India: Early Aryans to Swaraj, Volume 10.* New Delhi: Sarup & Sons

Bamzai, P. N. K. 1994. *Cultural and Political History of Kashmir. Volume 1: Ancient Kashmir.* New Delhi: M D Publications Pvt. Ltd

Becker, Mary Louise. 2013. *The All-India Muslim League, 1906-1947*. Karachi: Oxford University Press

Bergson, Henri. Arthur Mitchell, tr. 1922. *Creative Evolution*.London: Macmillan & Co., Ltd

Bergson, Henri. F. L. Pogson, tr. 1910. *Time and Free Will: an Essay on the Immediate Data of Consciousness*. London: George Allen & Unwin, Ltd., 1950

Broad, C. D. 1923. *Scientific Thought*. London: Kegan Paul, Trench, Trubner & Co., Ltd.

Browne, Edward G. 1920. *A History of Persian Literature Under Tartar Dominion (A.D. 1265-1502)* [referred to as *Literary History of Persia, Voume 3*]. Cambridge: University Press

Browne, Edward G. 1959. *A Literary History of Persia, Volume 4—Modern Times (1500-1294)* [first published in 1924 as *A History of Persian Literature, 1500-1924*. Cambridge: University Press

Carr, Wildon. 1922. *A theory of monads; outlines of the philosophy of the principle of relativity.* London: Macmillan & Co., Ltd

Carr, Wildon. 1922. *The General Principle of Relativity.* London: Macmillan & Co., Ltd

Cell, John W. 1992. *Hailey: A Study in British Imperialism, 1872-1969.* Cambridge: Cambridge University Press

Coatman, J. 1928. *India in 1926-27.* Calcutta: Government of India Central Publications Branch

Crook, Tim. 2010. *The Secret Lives Of A Secret Agent: The Mysterious Life and Times of Alexander Wilson*. Essex, UK: Kultura Press.

Dar, B. A (ed.). 1978. *Letters of Iqbal.* Lahore: Iqbal Academy Pakistan

Das, C. R. 1922. *Freedom through Disobedience.* Madras: Arka Publishing House

Dowden, Edward. 1918. *Shakespeare—A Critical Study of His Mind and Art. New edition with an introduction and a brief bibliography by Will David Howe.* New York: Harper & Brothers Publishers

Durant, Will. [*n.d.*] *The Story of Philosophy (New Revised Edition).* New York: Garden City Publishing Co., Inc.

Field, Harry H. 1929. *After Mother India.* London: Jonathan Cape

Follett, Mary Parker. 1918. *The New State—Group organization the solution of popular government.* New York: Longmans, Green and Co.

Gandhi, M. K. 1999. *The Collected Works of Mahatma Gandhi (Electronic Book), 98 Volumes.* New Delhi: Publications Division Government of India. Retrieved 20 October 2015 http://gandhiserve.org/e/cwmg/cwmg.htm

Hale, Ruth. 'A Sick Book and a Healthy One' in *Bookman,* September 1923, pp.77-78. Retrieved on 1 July 2017 http://www.unz.org/Pub/Bookman-1923sep-00077

Hasan, Syed Shamsul. 1976. *Plain Mr Jinnah.* Karachi: Royal Book Company

Henderson, Archibald. 'Henry Arthur Jones, Dramatist: Self-Revealed'. *VQR,* Autumn 1925. Retrieved 1 June 2017 http://www.vqronline.org/essay/henry-arthur-jones-dramatist-self-revealed

Hoernlé, R. F. Alfred. 1923. *Matter, Life, Mind and God: five lectures on contemporary tendencies of thought.* New York: Harcourt, Brace and Company

Ihrig, Stefan. *Ataturk in the Nazi Imagination.* London: The Belknap Press of Harvard University Press, 2014

Imperial Conference. 1927. *Summary of proceedings*. Wellington: Govt. Printer

Imran N. Hosein (1996) *The Caliphate, the Hejaz and the Saudi-Wahhabi Nation-State.* New York: Masjid Darul Quran

[INC] Indian National Congress. 1924. *Report of the Thirty-Eighth Indian National Congress held at Cocanada on the 28th, 29th, 30th and 31st December 1923 and 1st January 1924.* Cocanada: Bulusu Sambamurti, General Secretary, Reception Committee

— 1925. *Report of the Indian Natinal Cogress Thirty-Ninth Session Belgaum 1924*

— 1926. *Report of the Indian Natinal Cogress Fortieth Session Cawnpore 1925.* Madras: The General Secretary, All India Congress Committee

— 1927. *Report of the Indian National Congress Forty-First Session Gauhati (Assam) 1926.* Madras: Published by the General Secretary, All India Congress Committee

— 1928 (a). *The Indian National Congress 1927 Being the resolutions passed by the Congress, the All India Congress Committee and the Working Committee during the year 1927.*

— 1928 (b) *Report of the Forty-Second Indian National Congress. Held at Madras 1927.* Madras: The Reception Committee The Forty-Second Indian National Congress

— 1929. *Forty-Third Indian National Congress Calcutta 1928*

— 1930. *Report of the 44th Annual Session Held at Lajpat Rai Nagar, Lahore, on December 25-31, 1929.* Issued on behalf of the Reception Committee by Dr. Gopi Chand Bhargava, General Secretary

[IRC] Indian Round Table Conference. 1931. *Proceedings.* Calcutta: Government of India Central Publication Branch

[IRTC] Indian Round Table Conference. 1931. *Proceedings of Sub-Committees*. Volume 3—Sub-Committee No.3 (Minorities). Calcutta: Government of India Central Publication Branch

Indian Statutory Commission. 1930. *Report of the Indian Statutory Commission.* Volume 1—Survey. London: His Majesty's Stationery Office

Indian Statutory Commission. 1930. *Report of the Indian Statutory Commission.* Volume 2—Recommendations. London: His Majesty's Stationery Office

Indian Statutory Commission. 1930. *Report of the Indian Statutory Commission.* Volume 16—Selections from Memoranda & Oral Evidence by Non-Officials (Part 1). London: His Majesty's Stationery Office

Iqbal, Afzal (ed.). 1987. Select Writings and Speeches of Maulana Mohamed Ali (Second Edition). Lahore: Islamic Book Foundation.

Iqbal, Dr. Sir Muhammad.[1] 1930. *Six Lectures on the Reconstruction of Religious Thought in Islam.* Lahore: The Kapur Art Printing Works

[1] Name has been standardized in this bibliography.

—. 1930. *All-India Muslim League, Allahabad Session, December—1930, Presidential Address.* Lahore [self-published]

—. 1934. *The Reconstruction of Religious Thought in Islam.* London: Oxford University Press

—Dr. Javid Iqbal & Khurram Ali Shafique, ed. 2006. *Stray Reflections*. Lahore: Iqbal Academy Pakistan

Irwin, Lord, *et al.* 1930. *Government of India's Despatch on Proposals for Constitutional Reform.* Simla: Government of India Press

Irwin, Lord. 1931. *Speeches of Lord Irwin.* Volume 2—From 30th October 1929 to 18th April 1931. Simla: Government of India Press

Jalal, Ayesha. 2000. *Self and Sovereignty—Individual and Community in South Asian Islam Since 1850.* London: Routledge

Khan, Zulfiqar Ali. 1922. *A Voice from the East.* Lahore: The Mercantile Electric Press

Kramer, Martin. 1986. *Islam Assembled—The Advent of the Muslim Congresses.* New York: Columbia University Press

Latif Ahmad Sherwani. 1995. *Speeches, Writings and Statements of Iqbal.* Iqbal Academy Pakistan , Lahore.

Latif, Sayyid ‘Abdul. 1924. *The Influence of English Literature on Urdu Literature.* London: Forster Groom & Co., Ltd

Malik, Dr. Nadeem Shafiq. 2013. *The All-India Muslim League and Allama Iqbal's Allahabad Address, 1930 (Archives of Freedom Movement Volumes No. 153 & 154).* Lahore: Iqbal Academy Pakistan

— *Allama Iqbal As Reported in the Police Abstract of Intelligence, Punjab (1904-1935).* Lahore: Fiction House

Mitra, Nripendra Nath. 1926. *Full Proceedings of the Cawnpure Congress 1925 and all other Conferences of the Congress Week.* Calcutta: Annual Register Office

— *The Indian Quarterly Register July-Dec. 1925.* Calcutta: The Annual Register Office

— *The Indian Quarterly Register January-June 1926.* Calcutta: The Annual Register Office

— *The Indian Quarterly Register July-Dec. 1926.* Calcutta: The Annual Register Office

— *The Indian Quarterly Register Jan.-June 1927.* Calcutta: The Annual Register Office

— *The Indian Quarterly Register July-Dec. 1927.* Calcutta: The Annual Register Office

— *The Indian Quarterly Register Jan.-June 1928.* Calcutta: The Annual Register Office

— *The Indian Quarterly Register July-Dec. 1928.* Calcutta: The Annual Register Office

— *The Indian Quarterly Register Jan.-June 1929.* Calcutta: The Annual Register Office
— *The Indian Quarterly Register July-Dec. 1929.* Calcutta: The Annual Register Office
— *The Indian Annual Register Jan.-June 1930.* Calcutta: The Annual Register Office
— *The Indian Annual Register July-Dec. 1930.* Calcutta: The Annual Register Office
— *The Indian Annual Register, Jan.-June 1931.* Calcutta: The Annual Register Office
Mitra, Prof. Harendra Nath (ed.). & Mitra, Nripendra Nath. *The Indian Quarterly Register January-June 1925.* Calcutta: The Annual Register Office
Mitra, Prof. Harendra Nath (ed.). *The Indian Annual Register 1923, Vol. 1: All India Reports*. Calcutta: The Annual Register Office
— *The Indian Annual Register 1923, Vol. 2: India in Home Polity & Abroad.* Calcutta: The Annual Register Office
— *The Indian Quarterly Register Jan.-Mar. 1924.* Calcutta: The Annual Register Office
— *The Indian Quarterly Register July-Dec. 1924.* Calcutta: The Annual Register Office
Nayar, Kuldip. 2000. *The Martyr: Bhagat Singh Experiments in Revolution.* New Delhi: Har-Anand Publications
NLF [National Liberal Federation]. *Report of the National Liberal Federation of India Twelfth Annual Session held at the Gokhale Hall, Madras, On the 29th, 30th and 31st December 1929*. Madras: G. A. Natesan & Co., George Town
— *Report of the Proceedings of the Eighth Session of the National Liberal Federation of India held at Calcutta on December 28, 39 and 30, 1925.* Calcutta: Bani Press
— *Report of the Proceedings of the Eleventh Session of the National Liberal Federation of India held at Allahabad on December 30 and 31, 1928*
— *Report of the Proceedings of the Ninth Session of the National Liberal Federation of India held at Akola, 1926*
— *Report of the Proceedings of the Seventh Session of the National Liberal Federation of India held at Lucknow on the 26th, 27th and 28th December, 1924.* Allahabad: Secretary, Reception Committee
— *Report of the Proceedings of the Tenth Session of the National Liberal Federation of India held at Bombay, 1927*
Mango, Andrew. 2000. *Ataturk.* London: John Murray
Mayo, Katherine. [1935]. *The Face of Mother India.* London: Hamish Hamilton Ltd

Mayo, Katherine. 1927. *Mother India* [British Edition;8th impression]. London: Jonathan Cape

Mayo, Katherine. 1931. *Mother India* [American Edition; 33rd printing]. New York: Blue Ribbon Books

Mayo, Katherine. 1931. *Volume Two.* London: Jonathan Cape

Morgan, C. Lloyd. 1923. *Emergent Evolution.* London: Williams and Norgate, 1927

Nair, Neeti. 'Partition and Minority Rights in Punjabi Hindu Debates, 1920-1947'; *Economic and Political Weekly,* Vol.XLVI, No.52, December 24, 2011, pp.61-69

National Liberal Federation of India. 1924. *Report of the Proceedings of the Sixth Session of the National Liberal Federation held at Poona on December 26, 27 and 28, 1923.* Poona: The Arya-Bhushan Press

Noorani, A. G. 2001. *The Trial of Bhagat Singh—Politics of Justice.* Karachi: Oxford University Press

Noorani, A. G. *The Trial of Bhagat Singh: Politics of Justice.* Delhi: Oxford University Press, 2005

Pasha, Said Halim. 'The Reform of Muslim Society' (translated by *Islamic Culture); Islamic Culture,* Vol.1, No.1, January 1927, pp.111-135

Pickthall, Muhammad Marmaduke. 1927. *The Cultural Side of Islam.* Madras: The Committee of "Madras Lectures on Islam"

Pirzada, S. S. (ed.) (1982 Indian edition) *Foundations of Pakistan: All-India Muslim League Documents: 1906-1947.* Vol. II. New Delhi: Metropolitan Book Company

Qarshi, Afzal Haq. 'A Rare Writing of Iqbal'. Dr. Sir Muhammad Iqbal. Edited by Dr. Javid Iqbal & Khurram Ali Shafique. 2006. *Stray Reflections*. Lahore: Iqbal Academy Pakistan

Qureshi, Ishtiaq Husain. 2013. *The Struggle for Pakistan.* Karachi: Bureau of Composition, Compilation and Translation University of Karachi

Rai, Lala Lajpat. 'The Hindu Muslim Problem' ['Reproduced from the *Tribune* of 26, 28, 30 November and 3,5,7,10,11,12,13,14,16,17 December 1924'] in Chandra Joshi (ed.). 1966. *Writings and Speeches, vol. 2, 1920-1928.* Delhi: University Publishers, pp. 170-222

Rafiuddin, Dr. Muhammad. 2000. *The Meaning and Purpose of Islamic Research* in *The Qur'anic Horizons* 5:1, pp.12-33

Rahman, Hafizur. *Report of the All-India Muslim Conference held at Delhi on 31st December, 1928, and 1st January, 1929.* Aligarh: Aligarh Printing Works

Razzaqi, Shahid Hussain (ed.). 2003. *Discourses of Iqbal.* Lahore: Iqbal Academy Pakistan

Reading, the Earl of. 1926. *Speeches by the Earl of Reading. Vol. 2—From 15th June 1923 to 1st April 1926.* Simla: Government of India Press

Remy, Arthur F. J. 1901. *The Influence of India and Persia on the Poetry of Germany.* New York: The Columbia University Press

Renan, Ernest. 'What is a Nation?' in Eley, Geoff and Suny, Ronald Grigor, ed. 1996. *Becoming National: A Reader.* New York and Oxford: Oxford University Press, 1996: pp. 41-55

Richard, Paul. Translated by James B. Pond with an Introduction by Rabindranath Tagore. 1917. *To the Nations.* New York: James B. Pond

Saksena, Ram Babu. 1940. *A History of Urdu Literature.* Allahabad: Ram Narain Lal

Servier, Andre. Moss-Blundell (tr.). 1924. *Islam and the Psychology of the Musulman.* London: Chapman & Hall Ltd.

Shafique, Khurram Ali. 2014. *Iqbal: His Life and Our Times.* Nottingham: Libredux

—. 2015. *Waheed Murad: His Life and Our Times.* Nottingham: Libredux

Shaheen, Rahim Bakhsh. [*n.d.*] *Mementos of Iqbal.* Lahore: All-Pakistan Islamic Educational Congress

Sheikh, M. Saeed (ed.). 2003. *Allama Muhammad Iqbal: The Reconstruction of Religious Thought in Islam.* Lahore: Institute of Islamic Culture

Siddique, Muhammad. *Descriptive Catalogue of Allama Iqbal's Personal Library.* Iqbal Academy, Lahore

Smith, Wilfred Cantwell. 1946. *Modern Islam in India.* London: Victor Gollancz

Toynbee, Arnold J. 'Where is a Turk his own master?' in *Time Magazine,* Vol. 1, No.4, March 24, 1923

Whinfield, E. H. 1880. *Gulshan-i-Raz: The Mystic Rose Garden of Sa'd du din Mahmud Shabistari.* London: Trubner & Co., Ludgate Hill

Wilson, Alexander. 2015. *The Devil's Cocktail*. Kindle edition from Alison and Busby

Wolpert, Stanley. 1984. *Jinnah of Pakistan*. New York: Oxford University Press

Zwemer, Samuel M. [*n.d.*] *An Analysis of a Bibliography of Islam.* Princeton, N.J.: The Falcon Press

Zwemer, Samuel M. [*n.d.*] *Report of a Visit to Mesopotamia, the Persian Gulf and India.* New York: The American Christian Literature Society for Moslems Committee on Field Work